دور
۲۵
تیر ۱۸۸۱
اپریل ۱۹۵۹ء

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۱
چیتر ۱۸۸۱ شک
اپریل ۱۹۵۹ء

ایڈیٹر و پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

جوائنٹ ایڈیٹر
صباح الدین عمر

شائع کردہ
پرکاشن شاکھا
محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر
ایم ۔ جی ۔ شوم
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری
اترپردیش لکھنؤ

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

عنوانات

اپنی بات

ایک سال ہوئے "نیا دور" کا سائز بدل دیا گیا تھا۔ موجودہ سائز پر "نیا دور" کو شایع ہوتے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے اور موجودہ شمارہ سے دوسرا سال شروع ہو رہا ہے "نیا دور" کے ناظرین نے یہ ظاہری تبدیلی ہی نہیں پسند کی بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا اور متعدد ادیبوں شاعروں اور اہلِ ذوق نے اس کی تعریف کرتے ہوئے ہمیں خطوط لکھے۔ "نیا دور" اپنے قدر دانوں کا ممنون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "نیا دور" کو جو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اس کا باعث ہمارے قلمی معاونین ہیں اور ہمارے لئے یہ امر یقیناً باعثِ طمانیت ہے کہ ہمیں اردو کے ممتاز اہلِ قلم کا روز افزوں تعاون حاصل ہوتا جا رہا ہے۔

ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں اور آج بھی اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ اردو میں تنقیدی مضامین اور افسانوں کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی کافی لکھنے کی ضرورت ہے۔ ان موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اُن میں تاریخ، سائنس و فنون لطیفہ وغیرہ سب ہی موضوع شامل ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے معاونین ان موضوعات پر بھی نیا دور کے لئے خصوصی طور پر لکھتے رہیں گے۔

اپریل ۱۹۵۹ء سے ہمارے دوسرے پنج سالہ منصوبہ کا تیسرا سال بھی شروع ہو رہا ہے۔ منصوبہ بندی کا مقصد عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنا اور قومی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے ذرائع فراہم کرنا ہے۔ ہندوستان اور اتر پردیش کے پنج سالہ منصوبے تیار کرنے والوں نے بھی منصوبہ بندی کرتے وقت ان مقاصد کو پیش نظر رکھا تھا اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان مقاصد کے حصول میں خاطر خواہ کامیابی ہو رہی ہے۔ جگہ جگہ کارخانے کھل رہے ہیں، باندھ بن رہے ہیں، بجلی گھر تعمیر ہو رہے ہیں، اسکول اور کالج قائم ہو رہے ہیں، پل تیار ہو رہے ہیں، سڑکیں نکل رہی ہیں، اسپتال کھولے جا رہے ہیں۔ غرض ہر طرف تعمیری سرگرمیاں جاری ہیں اور نہ صرف شہروں بلکہ دیہاتوں میں ایک نئی زندگی کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ چہل پہل اور یہ ترقیاتی کام ایک خوشگوار مستقبل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور آنے والے زمانہ کا پتہ دے رہے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمارے سامنے جو عظیم الشان پروگرام ہے اس کی تکمیل کے لئے کافی اخراجات کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ہمیں سرمایہ بھی فراہم کرنا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم کسی کے سامنے دستِ طلب دراز کریں۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہم اپنی آمدنی میں سے کچھ رقم پس انداز کرتے رہیں اور اسے ترقیاتی کاموں میں لگاتے رہیں۔ حکومت نے اس سلسلہ میں چھوٹی بچت کی کئی اسکیمیں بنائی ہیں مثلاً پوسٹ آفس سیونگس بینک سرٹیفکیٹ، ۱۲ سالہ نیشنل پلان سیونگس سرٹیفکیٹ۔ دس سالہ ٹریژری سیونگس سرٹیفکیٹ، ۱۵ سالہ اینوئٹی سرٹیفکیٹ وغیرہ۔ یہ سرٹیفکیٹ معمولی رقم کے بھی ہوتے ہیں اور بڑی رقم کے بھی۔ انھیں زیادہ آمدنی والے بھی خرید سکتے ہیں اور معمولی آمدنی والے بھی۔ ان سرٹیفکٹوں میں جو روپیہ لگایا جائے گا وہ ترقیاتی کاموں میں کام آئے گا۔ روپیہ لگانے والے کو اس سے یہ فائدہ ہے کہ اُس کا روپیہ محفوظ رہے گا اور مقررہ مدت کے بعد وہ زائد رقم کے ساتھ واپس بھی مل جائے گا۔ بعض شرائط کے ماتحت یہ روپیہ پہلے بھی واپس مل سکتا ہے۔ ان اسکیموں میں روپیہ لگانے والوں کو انکم ٹیکس کی بھی کچھ سہولتیں مل جاتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں چھوٹی بچت کی مہم میں حصّہ لینا "ہم خرما و ہم ثواب" کے مصداق ہے۔ اس سے اپنا بھی بھلا ہے، اپنے بچوں کا بھی اور اپنے ملک کا بھی۔

ہمیں امید ہے کہ اتر پردیش کا ہر شہری اس قومی فریضہ کی طرف توجہ دے گا اور قومی بچت کی اسکیموں میں روپیہ لگا کر اپنے ملک کی تعمیر میں حصّہ لے گا۔

ایڈیٹر

حفیظ دہلوی

تمکین کاظمی

دکن کا تعلق شعر و سخن علم و ادب سے بہت پرانا ہے۔ ایک طرف اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اردو شاعری کا باوا آدم ولی اسی کے دامن دولت کا پروردہ ہے تو دوسری طرف یہ عزت بھی نصیب ہے کہ اردو کی سب سے پہلی صاحب دیوان شاعرہ ماہ لقا بائی چندا اسی کی گود کی پلی ہوئی ہے۔ شاہان بہمنیہ، سلاطین قطب شاہیہ، بادشاہان عادل شاہیہ نے ایران سے بڑے بڑے علماء فضلاء اور شعراء کو بلا کر اپنے دربار کو زینت دی۔ نواب نظام الملک آصف جاہ اعظم نے بھی ایران اور بخارا سے علماء و شعراء کو طلب کر کے اپنے دربار کو آراستہ کیا۔ نواب نظام علی خاں اور ان کے وزیر باتدبیر نواب ارسطو جاہ نے بڑی فیاضی کے ساتھ علماء و شعراء کی سرپرستی کی اور اپنے زمانے کے چوٹی کے علماء و شعراء کو اپنے دربار میں جگہ دی۔ نواب سکندر جاہ اور ان کے وزیر کا کیا کہنا بقول شیخ حفیظ۔

شاہ ہے رشک سکندر غیرت حاتم وزیر
عرصۂ عالم میں ہے کم یاب یہ جوڑا بہت

سکندر جاہ بہادر کو علماء کی صحبت بہت پسند تھی اور ان کے وزیر مہاراجہ چندو لال تو شعراء کے عاشق تھے انہوں نے اپنے دربار کو مشہور اور بے نظیر شعراء سے سنوارا تھا۔ خود بھی بڑے اچھے شاعر اور قابل آدمی تھے ان کے دربار میں علماء فضلاء کے علاوہ صرف شعراء تین سو سے زائد تھے جن کی تنخواہیں ایک سو روپے سے ایک ہزار روپے ماہوار تک تھیں۔ مہاراجہ چندو لال نے شاہ نصیر، شیخ حفیظ اور ذوق کو حیدرآباد بلایا۔ شاہ نصیر اور شیخ حفیظ تو آ گئے مگر ذوق سے دلی کی گلیاں نہ چھٹیں تنخواہ کھا کر رہ گئے بقول شیفتہ افسوس کہ

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بہت قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

حافظ شتاق بھی دکن آ گئے اور چندو لال کا دربار گلدستہ بن گیا۔

شیخ حفیظ دلی کے شرفاء اور سپاہ پیشہ بزرگوں میں سے تھے۔ آبا و اجداد تیغ و جمدھر باندھتے تھے مگر حفیظ نے تیغ زبان کو سان دیکر قلم کان پر رکھ لیا باضابطہ تعلیم پائی سند فراغت حاصل کر کے شاعری شروع کی۔ مولانا عبدالجبار صوفی ملکاپوری اپنے تذکرۂ شعراء دکن جلد اوّل میں لکھتے ہیں۔

"علماء و فضلاء کی خدمت میں ضروری لیاقت حاصل کر کے فن شاعری کی طرف متوجہ ہوئے آپ کی طبیعت تیزی میں شعلۂ جوالا تھی طبع والا و فکر رسا سے شعر موزوں کہنے لگے کلام شیریں و رنگین ہونے لگا۔ معاصرین دیکھ کر تعجب کرتے تھے رفتہ رفتہ آپ درجۂ استادی کو پہنچ گئے سب شعراء معاصرین آپ کی استادی کے قائل ہوئے"۔ (ص ۳۵۲)

دلی میں حفیظ کی شہرت زیادہ نہیں ہوئی اس لئے بھی انہوں نے وطن چھوڑنا پسند کیا

ہوا ہوں گرم سفر اس لئے بر نگ گہر
کہ آبرو کو کرے ہے مری وطن ٹھنڈا

دلی سے نکل کر اورنگ آباد پہنچے وہاں مہپت رام تھے جنہوں نے آنکھیں بچھا دیں مہپت رام کا طوطی جب تک بولتا رہا حفیظ بھی بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے رہے مگر جب مہپت رام ہی کا کام بگڑا تو حفیظ نے حیدرآباد کا رخ کیا۔ یہاں مہاراجہ چندو لال نے ہاتھوں ہاتھ لیا، ہزار روپیہ تنخواہ ماہوار مقرر کی ملک الشعراء کے خطاب سے معزز کیا اور بڑے ہی اعزاز و اکرام سے رکھا۔

مؤلف تاریخ گلزار آصفیہ کا بیان ہے۔

"مصاحب چندو لال مہاراجہ بہادر شدہ پسند خاطر گردیدہ و خلیق مزاج

شد و بسیار کساں را نوکر کنانیدہ ممنون منت ساخت و سخن خیر در باب
ہر آشنا و بیگانہ فرو گزاشت نمی کرد بد ماہہ یک ہزار روپیہ ماہ بہ ماہی
سرفراز بود، ہر روز پوشاک نو بنو حاضر دربار شدے ۔۔۔۔۔۔ ہمہ
شعر ش تشنگان مضامین را حکم آب سرد شیریں با گلاب دارد (ص ۳۴۹)

مولانا ملکاپوری کا بیان ہے کہ حفیظ نے ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا۔ افسوس کہ تذکرہ نویسوں نے حفیظ سے کوئی اعتنا نہیں کی ہے اور ان کے حالات عام تذکروں میں ملتے ہی نہیں۔ نہ تو حفیظ کے خاندان کا حال معلوم ہوتا ہے اور نہ ان کے تلمذ کا پتہ چلتا ہے۔ شیر محمد خاں ایماؔن کے کلام کا انتخاب شائع کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد قادری نے حفیظ کو ایماؔن کا شاگرد ظاہر کیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ ان کے اس ادعا کا ماخذ کیا ہے۔ سید صاحب کو یقیناً تسامح ہوا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ حفیظ ایماؔن کی وفات (۱۲۲۰ھ) سے پہلے حیدر آباد آئے ہوں مگر ان کی شاگردی ثابت نہیں ہے۔ ایماؔن کی غزلوں پر حفیظ نے غزلیں کہی ہیں اور ان کے بعض مصرعے بھی اپنے مقطعوں میں استعمال کئے ہیں مگر اس سے شاگردی ثابت نہیں ہوتی۔ حفیظ کا تو یہ حال تھا کہ وہ میر تقی میر کو خاطر میں نہ لاتے تھے بھلا ایماؔن پر کیا ایمان لاتے ؟

میر پر بڑے مزے کی چوٹیں کی ہیں ؎

حفیظ اشعار ہیں معجز نما اہل کشش ایسے
کہ گویا گور سے تم نے جناب میرؔ کو کھینچا

حفیظ اقبال شادآں سے لکھی ہے وہ غزل تم نے
جسے تعویذ کر ڈالیں جناب میرؔ گردن میں

ہے بجائے سخن بزم جہاں ورنہ تہ خاک
کیا جانئے کس فکر میں ہیں میرؔ اکیلے

ممکن ہے کہ حیدر آباد کے قیام اور درباری تعلقات کی وجہ سے حفیظ کی دوستی ایماؔن سے ہو گئی ہو مگر حفیظ جیسے "ملحد ادب" کے لئے جو دکن کی اردو ہی کو سرے سے خاطر میں نہ لاتا ہو ایک دکنی شاعر کی شاگردی قرین قیاس نہیں۔

اردوئے خاص کیوں نہ ہو میری زباں پہ اے حفیظ
ساکن ملک ہند ہوں اہل دکن تو میں نہیں

حفیظ اپنی زبان کو معیار اردوئے خاص تصور کرتے تھے۔ ساکن ملک ہند ہونے پر فخر تھا اور اہل دکن کی زبان کو ہیچ جانتے تھے حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں دکن کی زبان بالکل دکنی تھی جو دہلی کی زبان سے بہت مختلف تھی۔ حافظ مشتاق وغیرہ نے لکھنؤ سے آ کر اور حفیظ وغیرہ نے دہلی سے آ کر دکن کی اردو کو سنوارا اور اردو کی بڑی خدمت کی۔ حفیظ کو

مرزا علی لطف صاحب تذکرۂ گلشن ہند سے بھی عقیدت تھی چنانچہ ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے ؎

حفیظ الطاف ہے مرزا علی لطف کا مجھ پر
سبب یہ ہے کہ بندہ ہوں جناب شاہ مرداں کا

حفیظ کی یکجائی حیدر آباد میں لطف سے رہی ہوگی اسی لئے دونوں کے مراسم تھے مگر شاگردی کا تعلق نہ تھا۔ بعض لوگوں سے میں نے سنا ہے کہ حفیظ کا انتقال حیدر آباد ہی میں ہوا اور وہ یہیں دفن ہوئے مگر نہ تو ان کی قبر کا پتہ ہے اور نہ دوسری تفصیلات ہی ملتی ہیں۔
حفیظ کے ایک فرزند شیخ حیدر تھے جو حیدرؔ تخلص کرتے تھے یہ حیدر آباد ہی میں رہے۔ ان کے سینکڑوں شاگرد تھے چنانچہ مظفر الدین معلیٰ مرحوم شیخ حیدر ہی کے شاگرد تھے۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد حیدر آباد میں تھی اور ان کے سر فہرست سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شادؔ کا نام ہے۔
مشہور ہے کہ شیخ حفیظ کے چار دیوان ہیں۔ دو قلمی دیوان تو خود میرے پاس ہیں، ایک کسی خوش نویس کے ہاتھ کا صاف کیا ہوا ہے اور ایک معمولی خط میں روا روی میں لکھا ہوا ہے جس میں جا بجا کاٹ چھانٹ بھی ہوئی ہے۔ یہ دونوں دیوان الگ الگ مستقل اور مکمل ہیں ثانی الذکر نسخے کے متعلق میرا گمان ہے کہ کہیں حفیظ ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہ ہو۔ اصلاح و اضافہ ممکن ہے کہ انہیں کے قلم کا ہو۔ ایک دیوان کتب خانۂ آصفیہ میں بھی موجود ہے جس میں متفرق غزلیں ہیں یہ دیوان سابق الذکر دونوں نسخوں سے بالکل الگ اور مستقل ہے اس طرح تین دیوان تو میری نظر سے گزرے ہیں مگر چوتھا دیوان کہیں نظر نہیں آیا۔
والد مرحوم حضرت تجلی فرماتے تھے کہ شیخ حیدر کی اولاد موجود ہے مگر انہوں نے کسی کا پتہ نہیں دیا ممکن ہے ان کی اولاد کے قبضے میں پورے دواوین ہوں مگر اب یہ خاندان گمنام ہو گیا اور کوئی اہل علم یا صاحب ذوق اس گھرانے میں نہیں رہا۔
دونوں دیوانوں کے مطلعے حمد میں ہیں جو نقل کئے جاتے ہیں ؎

یہ کون و مکاں عکس ہے آئینۂ کن کا
کیا کیا نظر آتا ہے طلسمات سخن کا

یہ آسماں حباب ہے دریائے ذات کا
خورشید ایک ذرہ ہے اس کے صفات کا

ان دونوں دیوانوں میں دو شعر حمد میں دو ایک نعت میں اور ایک آدھ منقبت

میں ہیں، معلوم ہوتا ہو کہ انھیں حمد و نعت و منقبت سے زیادہ دلچسپی نہ تھی ؎

اے حسینِ علی راہبر سالکین سدرہ
پیدا نہ ہوا کوئی بشر آپ کی وہن کا

ہو غبار اس کا کیمیا جس کو
الفتِ بوتراب نے کھینچا

چونکہ حفیظ دربار سکندر جاہ کے ملک الشعرا رہے تھے اس لئے سکندر جاہ کی مدح میں کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے

صد شکر حفیظ اس در دولت کا گدا ہوں
دارا جسے کہتا ہے سکندر مرے داتا

مگر حفیظ کا مستقل تعلق مہاراجہ چندو لال سے تھا اس لئے تقریباً ہر غزل کے مقطع میں چندو لال کا ذکر نظر آتا ہے ؎

بقول حضرت شاداں حفیظ دیکھ لے کل
زمانہ رنگ بدلتا ہے آن آن نیا

زر افشاں ہو تمہارا پنجۂ خورشیدِ شاداں
کہ ہم نے آپ کو اس وقت کا راجہ کرن پایا

مقدر ہو تو شاداں موتیوں میں تول دیتے ہیں
وہ شادہ چیز کیا ہو مال کیا کمخواب کا جوڑا

معلوم ہوتا ہو کہ یہ قطعہ باریابی کے وقت مہاراجہ کے ملاحظہ میں پیش کیا گیا ؎

خواہاں ہنر یار ہیں بازار جہاں میں
اسباب مہیا ہے یہاں بے ہنری کا
تو ہو جو خریدار تو خاطر جمعی ہو
سرشتہ ہوں عالم کی پریشاں نظری کا

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے حفیظ کی زندگی افلاس تنگ دستی میں بسر ہوئی تھی۔

جائے مے خون پیا میکدۂ دنیا میں
مجھ سا تو ایک تو اے چرخِ بلا نوش نکال

سختی تو سے سدا در پیش آیا آسماں
مل گیا ہاتھ اپنا جس سے پنجۂ فولاد تھا

سرگزشت اپنی سناتا کس کو عالم میں حفیظ
جس کو دیکھو شمع ساں سرگرم کار خویش تھا

مگر آدمی ہمت والے تھے اور یہ سب برداشت کرنے پر تیار تھے ؎

گردشِ گردوں ہے راحت بے نیازوں کے لئے
طفل سو جاتا ہو جب گردش میں آیا پالنا

دکن میں جو عروج شیخ حفیظ کو نصیب ہوا ان سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہوا تھا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھیں ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ ان کے بعد استاد داغ کو ایک ہزار ماہوار تنخواہ ملی اور کوئی اس ایک ہزاری اعزاز تک پہنچ نہ سکا البتہ جلیل مانک پوری (فصاحت جنگ) بھی اسی سلسلہ میں معزز و ممتاز ہوئے مگر ہزار روپیہ ماہوار تک نہ پہنچ سکے شمالی ہند کے شعرا میر سے امیر تک فاقہ کشی میں مبتلا رہے۔ بہادر شاہ سے ذوق کو ملک الشعرائی کی تنخواہ ابتداً پانچ روپے مقرر ہوئی، آخر میں سو روپے پر معراج ہو گئی۔ غالب بھی دربار دہلی سے سو پچاس ہی تک محدود رہے۔

لوگ خانخاناں کو بھی شاعر مانتے اور ان کی فارغ البالی اور ثروت کو بھی شعرا کی فارغ البالی شمار کرتے ہیں مگر یہ غلط ہے خانخاناں نے شاعر کی حیثیت سے فارغ البالی یا ثروت نہیں حاصل کی تھی البتہ نعمت خان عالی اس صف میں ضرور آتے ہیں شاعر کی حیثیت سے اگر کسی نے عروج پایا تو وہ نعمت خان عالی، شیخ حفیظ، شاہ نصیر، استاد داغ اور جلیل تھے ان کے بعد کسی کو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی۔

معلوم ہوتا ہو کہ حفیظ خود دار اور غیور شخص تھے باوجود ایک ہزار روپے تنخواہ ہونے کے ضمیر مطمئن نہ تھا ؎

مردودِ بارگاہ قناعت کیا مجھے
خانہ خراب ہو ہوسِ عز و جاہ کا

یہ طوقِ غلامی ان کے پسند نہ تھا، آزادی کے مشتاق تھے ؎

یاد ایام کہ تھا ساتھ سبک ساروں کا
اپنا جوں نکہتِ گل پھاندنا دیواروں کا

معلوم ہوتا ہے کہ عمر بھی خاصی پائی تھی اور بڑھاپے میں بھی شاعری جاری تھی۔

دل کو ہے عالمِ پیری میں خیالِ خوباں
اب بھی اس خاک تلے ڈھیر ہے انگاروں کا

آنکھوں میں تصورِ رمِ پیری ہے بتاں کا
برخاست قریب آگئی دربار بھرا ہے

مگر ان میں مذاقِ حسن پیدا ہوگیا تھا اور "نقادِ حسن" بن گئے تھے ۔

میں جس پہ ڈالتا ہوں آنکھ گر جاتا ہے نظروں سے
خدا جانے مرا دل کس بتِ دلخواہ پر آیا

حفیظ کے متعلق مشہور ہے کہ سنت الجماعت تھے مگر ان کے مذہب کے متعلق کوئی تحقیق نہ ہوسکی حیدرآباد کے بعض پرانے فقیر عرسوں اور محرم میں بعض منقبت حفیظ کے نام سے سناتے ہیں اور ان کا بیان ہے کہ یہ ملک الشعراء شیخ حفیظ ہی کے ہیں۔ حفیظ کے کلام سے ان کی وسیع المشربی کا پتہ چلتا ہے ۔

بود و باش حرم و دیر رہی اس ڈھب سے
برہمن نے شیخ، مجھے شیخ برہمن دیکھا

شیخ حرم سمجھتا ہے ہر برہمن مجھے
اور شیخ جانتا ہے دیا سومنات کا

مگر آخر میں حفیظ کو شیخ و برہمن دونوں سے نفرت ہوگئی تھی ۔

نہ دیکھی ہم نے بوئے دوستی شیخ و برہمن میں
جینؤ مدتوں ڈالے رہے خرقہ پہن دیکھا

حفیظ کی طبیعت میں اوباشی اور رندی نہ تھی بلکہ اخلاقی عنصر غالب تھا ۔

وصفِ گہر و لعل پہ کب اس کی نظر ہے
جو شخص خریدار ہے انسان کے گن کا

آئینہ سے اخذ کر نظارۂ عالم کا لطف
صورت ہستی ہو جب تک دیکھنا اور بھالنا

اے دل جو ہی طلب آبرو تو مضطر رہ
وہی ہے گوہرِ غلطاں جو بے قرار رہا

وہ لوگ ہیں دنیا میں حفیظ اہلِ قناعت
مطلب نہ کہیں جو شہ اورنگ سے مل کر

سرِ نیاز ہے یاں اور غرورِ تاج ہے واں
ہے آسمان و زمیں کا گدا و شاہ میں فرق

جب تلک جان ہے تصویر نظر آتا ہے
ورنہ کب دید کے قابل ہے بشر کا خاکہ

عبرت سے جانبِ رخِ محبوب دیکھنا
ناپائیدار ہے یہ حسن خوب دیکھنا

ہر تنزل کو ہے اک رنگ ترقی دہر میں
اب جہاں گلشن نظر آتا ہے آگے بیشہ تھا

حفیظ کی طبیعت منجھی ہوئی تھی اور دنیا کے گرم و سرد نے ایک گداز بھی پیدا کر دیا تھا ۔

میں جو کوچے میں گیا شیشہ گروں کے اک روز
پوچھا اک شخص نے کیا دل ہے تمہارا ٹوٹا
جب میں دکھلایا تو کہنے لگا افسوس افسوس
اس کی کیا خاک ہو تدبیر کہ سارا ٹوٹا

ہم عدم میں آپ کو بیٹھے تھے یکسو کھینچ کر
ہستیِ فانی کہاں لائی ہمیں تو کھینچ کر

مجھے دین و دنیا کی کب جستجو ہے
تری آرزو ہے تری آرزو ہے

ہزاروں رنگ کی نیرنگیوں میں روبرو آیا
غرض ہم نے بھی تاڑا یار جس قالب میں تو آیا

یوں تو حفیظ کا سارا کلام استادانہ اور کہنہ مشقی کا نمونہ ہے مگر بعض شعر غضب کے کہے ہیں۔ دیکھئے کتنا صاف شعر ہے اس کو ایک سو تیس سال پہلے کا شعر کون کہے گا۔

بیٹھے بٹھائے مفت میں کاہش جان مول لی
اے دل نا سخن شنو کاش کہ ہو بُرا ترا

ایسا ہی اور ایک صاف شعر سنئے ؎

ہم کو کنجِ قفس سے بو آئی
کیا نسیم بہار تو آئی؟

یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہزاروں نالۂ محشر نما تہہ لب تھے — کسی کا پاسِ ادب تھا کہ میں خموش رہا

نالۂ محشر نما کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

خرمن دہر پھونک دوں برقِ فغانِ گرم سے
نالۂ بے اثر کروں مرغِ چمن تو میں نہیں

شعر ملاحظہ ہو کیا موتی پروئے ہیں۔ اس پامال مضمون کو اس نئے انداز سے باندھنا حفیظ ہی کا کام تھا ؎

تجھ سے اے نیساں مسلسل بن سکے موتی کہاں
سیکھ آنکھوں سے مری سلکِ گہر کا ڈھالنا

اور ایک پامال مضمون کس عمدگی سے بندھا ہوا ؎

اپنے میں رقیبوں میں اک فرق سراپا ہے
دستار کے ہم گل ہیں وہ پاؤں کے چھالے ہیں

دستار کے گل کہہ کر اپنی سربلندی ضرور جتائی ہے مگر یار کے عزیز خاطر جو رقیب رہے تو انھیں پاؤں کے چھالے بنا ڈالے کیا یار انھیں ٹھیس تک لگنے نہیں دیتا۔ کتنا نفیس خیال ہے۔

اشک ریزی سے ایک مضمون اور پیدا کیا ہے ؎

بوقتِ اشک ریزی کب اٹھا سکتے ہیں گردن ہم
کہ جیتے ہیں تمہارے نام کی آنکھوں سے بکرن ہم

ٹلک کا استعمال بھی حفیظ نے بہت کیا ہے مگر نہایت ہی عمدگی سے۔

اس دستِ حنائی کو کھینچا تو لگے کہنے
ٹک دیکھ تو اے ناداں یہ پھول کی ڈالی ہو

کل جو نکلا گھر سے وہ غارت گر ایماں نکلا
دل لئے ہاتھ میں ہر گبر و مسلماں نکلا

غالب اپنے محبوب سے خواہش کرتے ہیں کہ تم خود ہی عالمِ مستی میں کھل جاؤ ورنہ مجھے دراز دستی کر کے چھیڑنا پڑے گا مگر حفیظ کا عالم ہی اور ہے۔ محبوب کے پاس پہنچے ہیں تو وہ لیٹا ہوا نظر آتا ہے اور انھیں دیکھ کر اپنے آپ کو سوتا ہوا یا سویا ہوا ظاہر کرتا ہے۔

دم چرا کے آپ جو لیٹے ہیں مجھ کو دیکھ کر
یہ گماں ہے خواب کا اس کو یقیں ہو جائیگا
آپ منہ کھولیں تو کھولیں اپنا اپنے ہاتھ سے
ورنہ پھر گستاخ خدمت کمتریں ہو جائے گا

آج تک دل کے جھٹکنے کا مضمون کسی کے پاس دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ حفیظ جو دل پکڑ کر جھٹکتے ہیں تو ہر ایک زخمِ دل سے پیکاں نکلتے ہیں۔ یہ بالکل نیا مضمون ہے۔

ترکش تیر مژہ تھا دلِ صد چاک اسیر
دل جو جھٹکا تو ہر اک زخم سے پیکان نکلا

غالب کا شعر ہے ؎

روا ہو کون سے مذہب میں یہ اے عشق نا منصف
دلِ پرویز خوش ہو خاطرِ فرہاد محزوں ہو

اسی مضمون کو حفیظ یوں ادا کرتے ہیں مگر کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے کہ حفیظ نے سرقہ کیا ہو یا غالب سے مضمون لیا ہے۔ یہ شعر غالب سے پہلے کا کہا ہوا ہے۔

جانِ فرہاد گئی وصل ہوا خسرو کو
عقل حیراں ہو مری عشق کے انصاف کو دیکھ

مومن کا ایک مایۂ ناز شعر ہے جس پر غالب اپنا پورا دیوان نثار کرنے کو تیار تھے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اسی مضمون کو حفیظ نے یوں ادا کیا ہے۔ مومن کی بات تو پیدا نہ ہو سکی مگر شعر اپنے رنگ میں لاجواب ہے ؎

شکل آنکھوں سے تری جاتی نہیں
کروٹیں لیتا ہوں نیند آتی نہیں

ایک اور صاف شعر سنئے۔

دل بستگی ہے زندگی مستعار سے
میکر خیالِ خام کا اسلوب دیکھنا

چند صاف شعر اور سنیئے

کب جنوں چاہتا ہے خودداری
ہوش آتے ہی عشق کے کھسکا

ہم آکے یاں چمن خلد میں اداس ہے
کہ عندلیب نئے گل نیا ہے باغ نیا

تنگ آغوش میں لیا کس نے
تو جو اے گل عرق عرق ہو آج

اسیری ہے آرائشِ حسنِ خوباں
لگا کر حنا دست و پا باندھتے ہیں

کیا گلستاں سے کھلے آفت رسیدہ آدمی
غنچۂ تصویر ہے خاطر کشیدہ آدمی

سیا چاکِ جگر تارِ نگاہِ یار سے اپنا
بحمد اللہ کہ اس وحشی کو اندازِ رفو آیا

گلشن میں مئے ہو ابر ہو ساقی ہو اے حفیظ
ایسے میں کوئی برق کا پرکالہ چاہیئے

شاہ نصیر اور ناسخ کے تصدق میں اُس زمانے کی شاعری الفاظ کا گورکھ دھندا اور قافیہ پیمائی بن گئی تھی اور یہ بلا دکن پر بھی مسلط تھی۔ دربار چندولال میں ادق گوئی اور مشکل قافیوں میں خیال آرائی شاعری کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ مجبوراً حفیظ کو بھی یہی طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ مگر چونکہ حفیظ استاد اور حقیقی معنی میں ملک الشعراء تھے اس لئے ادق زمینوں اور مشکل قافیوں میں بھی معاصرین کے دانت کھٹے کر دیئے پھر بھی اپنا رنگ باقی رکھا۔ بہل شعر نہیں کہے

خیتر ۱۸۸۱

اپنے سرمایہ کی کرتے ہیں حفاظت خاکسار
دانۂ خرمن ہمارا مور کا انڈا ہوا

میں عدم میں بھی نہ دردِ عشق سے آزاد تھا
داغ جوں لالہ مرے سینے پہ مادر زاد تھا

ہے کس کو تقاضائے جفا چرخ کہن سے
کرتا ہے جواں مرد کہیں پیر سے جھگڑا

نجد میں تکیہ بنایا قیس بھی درویش تھا
چھوڑ بیٹھا پہلے ہی دنیا مآل اندیش تھا

واہ رے جوشش جنوں تیری سلاسل شکنی
حلقۂ زنجیر کا کرتے ہی اشارہ ٹوٹا

ہے بزرگوں کو رہ انصاف میں سنجیدگی
کوہ میزانِ عدالت کا دھڑا بن جائے گا

عرشِ اعلیٰ پہ چڑھا آہ رسا کا باوٹا
باندھتا ہے کیا ہوا اپنا ہوا کا باوٹا

ہے برسرِ پرواز سدا مرغِ معانی
ہر چند اسے پنجۂ ادراک میں دابا

دل کو منظور ہے اس ابروئے خمدار کی موت
آبرو مردِ سپاہی کو ہے تلوار کی موت

لے چل اے جوش جنوں جانب صحرائے وسیع
دامن دل کو مرے جانب گلزار نہ کھینچ

ہے گرم سوزِ آتشِ عشقِ بتاں سے دل
جوشِ شرارِ سنگ سے ہے جو یہ کبابِ مرغ

گھوڑے کی اگر باگ لے میدان میں شاداں
عرصہ نظر آتا ہے ابھی تنگِ ہوا پر

ترش روئی سبب قطعِ ملاقات ہوئی
شاید اس چینِ جبیں کے ہی شکن میں مقراض

زخم گویا ہیں تنِ عاشقِ دلگیر کے پھول
ہیں یہ کترے ہوئے قاتل تری شمشیر کے پھول۔

صانع نے عجب حسن سے پیوند کئے ہیں
ہر چند ہیں اعضائے بشر خاک کے ٹکڑے

دیکھئے کیسی کیسی سنگلاخ زمینوں میں گل فشانی کی ہے اور کیسے کیسے پھول کھلائے ہیں۔ قافیوں کی غرابت اور ردیفوں کی ثقالت کے باوجود ایسے شستہ و رفتہ شعر کہنا حفیظؔ ہی کا کام تھا۔

زبان پر حفیظ کو بڑا عبور تھا، محاوروں کا استعمال بہت کرتے تھے مگر محاورے کی خاطر شعر کو مہمل نہیں بنا دیتے تھے۔ روزمرہ کا کیا کہنا نہایت ہی صاف ستھرا تھا۔ چند شعر نقل کرتا ہوں ؎

اس نے برقعہ اٹھا دیا جوں ہی
انفعال آفتاب نے کھینچا

آہ پروانۂ بچارہ شمع کی لو میں موا
عاشقِ جانباز تھا اپنی تگ و دو میں موا

دل کو جب وہ مانگتا ہو جی کہے ہو ٹالنا
اور غیرت کا تقاضا ہو اسے دے ڈالنا

دے ہے جنابِ خضر کو تعلیمِ رہبری
واماندہ کاروانِ محبت کی راہ کا

چمن میں صبح خراماں جو وہ نگار رہا
نہ گل کو ضبط نہ بلبل کو اختیار رہا

تپش دل کو نہیں ذوق ہوا داری سے
نمِ مژگاں ہے مرے واسطے خس کا پنکھا

جو سر میں جنوں رہا کرے گا
آنکھوں میں بھی خوں رہا کرے گا

گر جانتا ہو جائینگے دشمن مرے غمخوار
کاہے کو کسی شوخ سے میں آنکھ لڑاتا

ناتواں دل کو محبت کا قرینہ آیا
مور کے ہاتھ سلیماں کا نگینہ آیا

نہ اس وحشت سرا میں کارواں تھمتا نظر آیا
جمایا جس نے بستر آج کل رمتا نظر آیا

میں نے چاہا کہ کروں عرض لگے فرمانے
کشف ہیں دل پہ مرے آپ کے اظہار تمام

وقت پر آپ نہ آئے تو نہ آئے صاحب
خیر انکا نہ رہا بندۂ سرکار کا کام

تا بہ ساحل آ چکے تھے دیکھنا برگشتگی
پھیر لائی گردشِ تقدیر ہچوں بیچ میں

دورِ اوّل سے رہیں آخر تلک سرشاریاں
واہ رے جامِ محبّت تیری صنعت کاریاں

ہے تصوّر اس کا ان آنکھوں میں آجائے نہ خواب
ہم اسی وسواس میں آٹھوں پہر سوتے نہیں

دل کی خوبی کہوں کہ آنکھ کا وصف
ہائے خانہ خراب ہیں دونوں

پی کے پیمانہ مئے ہوش میں آ!
شمع رو خانہ آغوش میں آ!

مشتاقِ غفلت اے دل رہنا نہ اس سرا میں
سنتا ہے او مسافر سویا یہاں سو چوکا

جوشِ جنوں یہ ہے کہ کسی غمگسار نے
دامن مرا سیا کہ گریبان پھٹ گیا

میں نے حفیظ کے اشعار ذرا فراخدلی سے نقل کئے ہیں کیوں کہ نہ تو ان کا کوئی دیوان ہی طبع ہوا ہے اور نہ تذکروں ہی میں کلام ہے آیندہ بھی ان کے کلام کی طباعت کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

حفیظ کے کلام میں کہیں کہیں سرسری فلسفہ اور کچھ تصوف بھی پایا جاتا ہے جو کھانے میں نمک کے برابر سہی مگر ہے ضرور ؎

ہر تنزّل کو ہے اک رنگ ترقی دہر میں
اب جہاں گلشن نظر آتا ہے آگے بیشہ تھا

مانعِ دیدار تھا پردہ تعیّن کا حفیظ
اٹھ گیا جس دم کہ وہ پھر اور ہی نظّارہ تھا

نفسیات کا مطالعہ بھی حفیظ نے تھوڑا بہت کیا تھا۔

مشکور ہو آپ سے مل جائے اگر خلد
یاں حور بھی اترے تو چڑھاتا ہو بشرناک

جہاں تک سخت دل ہیں فی الحقیقت صاف ظاہر ہیں
کہ ان کافر بتوں کا ہم نے آئینہ بدل دیکھا

مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ حفیظ کی طبیعت میں خشونت بھی نہ تھی بلکہ زندہ دلی اور خوش باشی کا موڈ نظر آتا تھا ؎

چلنے پھرنے جب لگا ان کا مریضِ عشق کچھ
آپ فرمانے لگے ہنس ہنس کے مسٹنڈا ہوا

رکھا تھا ہاتھ نبض پہ اس نے کہ ہنس پڑا
بیمارِ عشق دیکھ کے چہرہ حکیم کا

فکرِ دوزخ کچھ نہیں درد و الم پر ہے معاش
ساکنِ کوئے بتاں بیکنٹھ باشی لوگ ہیں

عجب مستانہ موسم ہو کہ بیباکانہ ہر گلرو
اڑاتا ہے گلال ایک ایک پر کہتا ہے ہولی ہو

حفیظ نے ایک لفظ گھر بسے یعنی گھر کے بسنے والے بمعنی خانہ نشیں یا پردہ نشین اکثر استعمال کیا ہے۔

کر کے ان گھر بسوں کا عشق حفیظ
دل مرا مفت میں خراب ہوا

آخر میں حفیظ کا ایک قطعہ اور پڑھ لیجئے۔

خط میں کچھ حسنِ طلب تھا نہ سوا اس کے جیسے
بالخیر اور سلامت بشما کہتے ہیں
تس پہ تشہیر کیا قاصدِ بیچارہ کو
آپ فرمائیے قبلہ! اسے کیا کہتے ہیں

نانی اماں

آدا سرہ

بھری پُری گرستی میں جہاں اور سب کچھ ہے وہاں اللہ رکھے ایک عدد جیتی جاگتی نانی بھی ہیں جو اب برتنے میں تو نہیں آتیں صرف شوبھا کے لئے گھر کے صدر دالان میں تیوں مد بحساب "اندر" بھی رہتی ہیں۔ نری نانی نہیں مجھے پالا ہے "ماں بھی ہیں اور اس دہرے ناتے کے بارے میں انھیں ملا جلا کر نانی اماں کہتا ہوں۔ یہ پالا بھی نہیں تو کیا ہے کہ خدا کی دین میں آپ درجن بھر نواسے نواسیوں کا نانا ہونے پر بھی ان کے نزدیک میٹوں میٹوں چلتا ہوں، اور دودھ بھات کھاتا ہوں۔ وہ اب بھی میری سالگرہ اس ٹھاٹ سے مناتی ہیں گویا میں بڑی مان گون، منت مرادوں کا چھوٹا بچہ ہوں۔ اس تقریب کے سلسلے میں برادری کی بیویوں کو بلاوا جاتا ہے اور دیا بتی ہوتے ہی ڈولی پہ ڈولی اترنے لگتی ہے۔ اب رات ہے اور ڈومنیوں کا اودھم۔ ڈھولک پٹتی ہے اور اس کی لے تال پر گلگلے تلے جاتے ہیں۔ اس کام کے لئے الگ ایک سہ دری وقف ہے جسے نانی اماں پلنگڑی پر پڑے پڑے اپنی آنکھوں تلے چھوٹی مٹی سے لپواتی پتواتی، اور لوبان کی دھونی دلواتی ہیں۔ پھر مجال ہے نہائے دھوئے اور ان سے پوچھے بغیر اس اچھوتی سہ دری میں کوئی پھٹک جائے۔ ایک بار کہیں، جانور ہی تو "میرا شیرازی بلیوں کا جوڑا اچھلا گیا تھا۔ گرجی تھیں، برسی تھیں، اور اسی دم ہنکوا کے نخاس بھیجا گیا تھا جہاں پچاس روپے جوڑے کی بیسوا سہاگن بلیاں ایک نیارے دلال نے بکوادی تھیں اور دوانی روپیہ اپنا کمیشن کاٹ کر پونے نوگھر کی ماما کے ہات دھرے تھے اور ماما صاحبہ نے لال کتاب کی سند سے یہ آمدنی نحس ٹھیرا کے خیرات تو کیا اپنے ڈب میں رکھ لی تھی۔ سہ دری کی پھر سے لپائی پتائی پر جو خرچ ہوا وہ نانی اماں کے بٹوے سے گیا تھا۔

ہاں تو رات بھر کی دھما چوکڑی کے بعد صبح کی جون میں کہ مرفانہ بولنے پائے، پوکھوں کی روشنی میں محلے کی مسجد کا طاق گلگلوں اور اللہ میاں کے رحم سے بھرا جاتا ہے۔ برس برس کی یہ منت پوری کرکے بیویاں باسی نہیں ہونے پاتیں جو دن نکل آتا ہے اب سورج ڈھلے، دھوپ ڈھلے یہ سوانگ رچا جاتا ہے کہ میں دولہا بنایا جاتا ہوں، جس کا سر تو سر، سارا سراپا ہی کھچڑی ہو چکا ہے۔ بالا کے یا گلبدن کا پاجامہ سر پہ سلمے کی بھاری پٹاری دار ٹوپی، چکن جالی کے کرتے پہ [illegible] تن زیب کا انگرکھا، اور پاؤں میں لال زری کا منڈا جوتا، منہ پہ [illegible] سہرا، اور گلے میں موتیا کی بدھیاں ڈالے سجے ہوئے گھوڑے پہ ڈھول تاشے کی تشتر تشتر، جھنجھم جھنجھم کے ساتھ محلے میں گشت کرایا جاتا ہوں۔ نواسے نواسیوں کی بھیڑ ایلٹن جلوس میں ہوتی ہے، [illegible] گھر کا پرانا نوکر مدار بخش رکاب پکڑے ایک ایک کو بتا کر سلام کراتا، اور لپ بھر بھر کے پیسے نچھاور کرتا جاتا ہے۔ قدم قدم پہ "نانا میاں، دیکھئے چنوں نے میرا پیر کچل دیا"۔ "نانا ابا، ہم بھی

گھوڑے پہ بیٹھیں گے۔" آج ہمارے نانا میاں کا بیاہ ہے"۔ یا "ابا لی! آج نانا میاں نے جھم جھم تے تیڑے پہنے ہیں"، اور جیسے مجھے سونگھ کر دنیا بھر کے لینڈی کتے بورا گئے ہوں عف عف کرتی بھونکتی برات کی برات ان کی بھی جلوسیوں میں ہوتی ہے تو سچ کہتا ہوں جی میں آتا ہے زمین پھٹے اور میں سما جاؤں، یا یہ جتنے نکلے ٹھینگے "نانا میاں، نانا میاں" کی گہار ڈالے دم کے پیچھے ہیں، ان سب کا ٹیٹوا مسل دوں۔ مگر بندھا خوب مار کھاتا ہے کچھ نہیں کر سکتا۔ گھوم گھام کر مدار میاں کی یہ میدنی اپنے دوار پر آتی ہے۔ تقریب کا یہ تیسرا مرحلہ یعنی خیر سے نانی اماں کو سلام کرنا ہے۔ اس کے جواب میں ان کے دونوں ہات میرے ریشائیں چہرے کی طرف بڑھتے ہیں، اور سہرے کے سنہری تاروں میں لپٹ کر داڑھی کے پہلے بالوں کو گنگا جمنی بنا کے الٹے پاؤں لوٹتے ہیں اور نانی اماں کی کن پٹیوں کے پاس ہی دسوں انگلیوں کی چٹ چٹ سے گویا سال بھر سلامتی سے بیتنے کی خوشی میں سلامی ہوتی ہے۔ غرض کہ یہ اور ایسی ہی بیسیوں خرافات میں رہ کر میں نواسا اور یہ نانی اماں دونوں جئے جا رہے ہیں۔

ان کے سن کی ناپ تول تو آپ نے میری باتوں سے ہی کر لی ہوگی۔ اتنا اور کہہ دوں کہ نانی اماں کے دانت دسرا کے نکلے ہیں، گنا بے دھڑک چوس لیتی ہیں، چنے چبا سکتی ہیں، آنکھوں میں اب بھی جگنوؤں کی جوت دمکتی ہے، سر کے بال البتہ گنے چنے رہ گئے ہیں۔ جو ہیں، ان کی روز چوٹی گندھتی ہے، اور گرمیوں میں مہینے مہینے مہندی بھی لگتی ہے۔ دن رات اپنی پلنگڑی پر گاؤ تکیے کے سہارے رکھی رہتی ہیں۔ ان کی ایک ہستی مجھ پر، میرے بچوں پر، بچوں کے بچوں پر، کبوتروں پر، مرغیوں پر، بطخوں پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی چوں تو کر جائے مرغا بانگ تو دے لے۔ خود میں، تو یوں سمجھئے کہ نواسہ نہیں نانی اماں کا بندھوا ہوں۔ باہر جاؤں تو کہہ کر۔ پھر یہ بھی بتاؤں کہ کب تک لوٹوں گا، لوٹوں تو پھر حاضری لکھاؤں۔

یہ بھی انھیں کی بات ہے۔ ایک دن دیر ہو گئی تھی، گھر میں قدم رکھا تھا کہ نانی اماں کی کیوں، کہاں، کب نے بوکھلا دیا۔ "آٹھ کا گھڑیال کب کا بج چکا۔ کہکشاں کب کی چھٹک گئی۔ ملاکی روٹی گئے دیر ہوئی۔ تو اب آیا ہے؟" "نہیں تو نانی اماں۔ گجر بجا تب میں گھڑونچی کے پاس کھڑا کلی کر رہا تھا۔"

نانی اماں کو اپنی بات کٹنے کی تاب کہاں۔ وہ تو میں تھا، نہیں تو پٹی سے لگی لٹھیا لیتیں، اور بلد مار دوسرے کا بلیھن نکال دیتیں پھر بھی "وقت" پر "ہاں نہیں" ہوتی رہی۔ سوچا اور دل ہی دل میں خوش ہوا کہ روز کے اس جھنجھٹ سے چھٹکارا پانے کا نسخہ ہات آگیا یعنی بڑی بحث مباحثے کے بعد میں انھیں اس بات پر منا پایا کہ ایک اچھی مضبوط اور جس پر انھوں نے زیادہ زور دیا ــــ پل پل کا صحیح وقت بتانے والی گھڑی لا دی جائے، اور روز روز کی اس کھٹ کھٹ سے جان چھوٹے۔ گھڑی آ گئی!

اسے سمجھنا، وقت پہچاننا، کوکنا، ملانا تو ابھی "دلی دور" ہی تھا جو نانی اماں نے پہلا اعتراض جڑا کہ "ناٹھی روپئے برابر گھڑی کے لئے بالشت برابر کا ڈبہ لانا کون سی عقلمندی تھا۔ پھر یہ مونڈی کاٹی وقت بتانے کو آئی ہے یا بوبو بن کے پردے میں بیٹھنے کو؟" حکم ہوا "اپنی ڈبیہ اپنے پاس رکھو، گری گری پانوں کی صافی، اور جاڑوں میں چھالیہ تمباکو کا بٹوا کیا برا ہے"۔ پھر یہ تجویز پیش کی کہ اس میں کہیں چھوٹی سی گھنٹی بھی لگ جاتی تو اور بھی آرام ملتا۔" ان کی مخالفت میں ہلکی سی مسکراہٹ بھی اپنی شامت کو دعوت دینا تھا۔ میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "جی لاتا تو وہی، مگر آپ کو رات رات بھر سونا حرام کر دیتی۔ منٹ منٹ پر ٹن ٹن کرتی"۔ خوش ہوئیں کہ نواسے برخوردار نے کام کی بات کی۔ اب گھڑی دیکھنے میں نانی اماں کو میں نے اپنا شاگرد بنایا۔ دوسرے دن ٹھیک دوپہر کی چابی مجھ سے دلوا کر گھڑی کا افتتاح کیا۔ بتاشوں پر بزرگوں اور گھڑی بنانے والے کی نیاز دلائی، اور بٹوے سے ایک چٹا نکال کر مجھے بخشا، جو آپ سمجھ لیں کہ میں نے لے تو لیا، مگر پچا نہ سکا۔ یوں کہ اب ادھر انھیں سبق کا دھیان آیا، ادھر میری پکار ہوئی۔ "کیوں؟" تو، "میرے لال ذرا چابی دے کے پھر تو دکھانا۔"

اس فن میں باریکیاں تو بہت ہیں مگر میں نے نانی اماں کو تین دن کی لگاتار مشقت اٹھا کے وقت دیکھنے کی ترکیب سکھا دی، اور دن کے بارہ بجے سے لے کر دوسرے دن کی دوپہر تک چھوٹی بڑی سوئیوں کا چلنا پھرنا دکھا دیا۔ البتہ پل کی سوئی کا مصرف میں نے جان کر نہیں بتایا۔ ان کی کرید پر اتنا ضرور جتا دیا کہ گھڑی چلنے کی پہچان کے لئے یہ سوئی رکھی گئی ہے، اور بس۔ پھر اڈھے پوتے بھی سمجھائے۔ ایک داؤں یعنی گھڑی ملا نے بیچارے کھا اور اپنی جان گنگا نہا لیا۔ توبہ کیجیے، اور سنئے۔ نانی اماں نے گھڑی کا وقت پہچاننا کیا سیکھا، ایک دنیا سے لڑائی مول لے لی۔ تھانے کا گھنٹہ بولا۔ گھڑی نکالی، وقت دیکھا۔ "لو اور سنو۔ یہاں چار بج کے بڑی سوئی اتنے لمبے پر چلی گئی۔ وہ نکھلے نویس، اب پینک سے چونکے ہیں۔" مرغا بولا۔ گھڑی نکلی۔ بے ایمان، وقت ہوا نہیں، کلپنے لگا اپنی جان کو۔ تیری حلقیا میں ڈاٹ لگے خدا کرے۔ کل تک برابر ملا کے ساتھ بولا کیا۔ آج بہرے کو سنائی نہیں دیا۔" خود ملا کی جان غضب میں تھی۔ "موئے بوبک سے کہو جا کے، شامت نے تو نہیں گھیرا۔ سب کی عاقبت میں کیڑے ڈلوائے گا کیا؟ گھڑی دیکھ، چھوٹی بڑی دونوں سوئیاں تلے اوپر ایک جان ہو رہی ہیں۔ بارہ بجے ہی اذان دیدی۔" نانی اماں کی گھڑی میں بے شک ۱۲ ہی بجے تھے مگر اسے کیا کیجیے کہ بڑی بی کو تماکو کی طلب اٹھی نہیں۔ ہوا کھلا نہیں گھڑی کی چابی پوری ہو چکی تھی۔ کیا کرتی بند ہو گئی۔ اب چار بجے تھے اور ملا غریب نے دو چار منٹ ادھر اُدھر عصر کی اذان دی تھی۔

اس جنجال میں کوئی مہینہ بھر نانی اماں کے ساتھ سارا گھر، اڑوس پڑوس، اور سب سے بڑھ کر میں خود پھنسا رہا۔ آج سوئے بھاگ جاگے کہ گھڑی نے بالکل ہی چپ سادھ لی بہتیرا ہلایا ڈلایا۔ گھمایا پھرایا۔ آخر پچھلا ڈھکنا کھول کر دیکھا تو یہ طرفہ تماشا نظر آیا کہ سارے کل پرزوں میں تماکو کا سفوف اٹا پڑا تھا"

اطمینان سے اب دکان دار کے پاس جاتا ہوں۔ آدھے تہائی داموں گھڑی اسی کے گلے منڈھوں گا اور نانی اماں کہتے سنے گا گھنٹی لگانے بیٹھی

☆

غزل

میکش اکبر آبادی

محبت سے مری اُکتا کے جانا یاد آتا ہے
وہ نادانستہ اُن کا روز آنا یاد آتا ہے

میں خود زنجیر اپنے در کی کھٹکاتا ہوں وحشت میں
مجھے اس در سے جب اُن کا بُلانا یاد آتا ہے

تمنا روز حل کرتی تھی اپنی حل شدہ مشکل
توجہ کر کے اُن کا بھول جانا یاد آتا ہے

اُسی دامن کو اب کعبہ بنا کر پوجتا ہوں میں
کسی کے ہاتھ سے دامن چھڑانا یاد آتا ہے

زمانہ دیکھتا تھا اُن کو میری سی نگاہوں سے
اب اُن کی یاد سے سارا زمانا یاد آتا ہے

تقاضا حسن کا کیا تھا کسے معلوم ہے لیکن
مرے پاس آ کے اُن کا روٹھ جانا یاد آتا ہے

جو چپ رہیئے تو ممکن ہے کہ وہ کافر نہ پہچانے
جو کچھ کہیئے تو پھر بھولا فسانا یاد آتا ہے

نہیں ہوتی کسی کو قدر اپنے حال کی میکش
بھلا ہو یا بُرا گزرا زمانا یاد آتا ہے

غزل

شاد عارفی

چھوٹ سکتی تھی کہیں سیر گلستاں ہم سے
ہم گریباں سے ڈرتے ہیں گریباں ہم سے

ہیں کئی دن سے "یہ اندازِ نگہباں ہم سے"
کوئی خواہش، کوئی حسرت۔ کوئی ارماں ہم سے

سُن کے "بے حاصلیٔ" قصۂ جاناں ہم سے
کہیں ناراض نہ ہو جائیں غزلخواں ہم سے

"غلط اندیشیٔ فرمائے بہاراں"..... والے
پوچھ پائیں گے نہ انجامِ بہاراں ہم سے

آیئے آج اسی بات پہ کچھ شرط رہے
لائیے ڈھونڈھ کے کچھ بے سر و ساماں ہم سے

کہہ رہی ہے یہی بیگانہ روئی خوباں
نہ کہے کوئی ابھی حالِ پریشاں ہم سے

آج اِس طرح مقدر نے دکھائی آنکھیں
خود بخود چھوٹ گیا دامنِ امکاں ہم سے

کیوں اُسے عہد کرم یاد دلایا جائے
بس یہی .... نا .... کہ وہ ہو جائے پشیماں ہم سے

بے زری کا یہی احسان بہت ہے اے شاد
نہ ہوا کوئی بھی شرمندۂ احساں ہم سے

پریم چند کی حُب الوطنی

قمر رئیس

وطن کی محبت ایک فطری اور پاکیزہ جذبہ ہے۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اپنے ارد گرد کی جن چیزوں اور جن لوگوں سے مانوس ہوتا ہے ان سے پیار اور انھیں بہتر دیکھنے کی خواہش شیوۂ انسانیت ہے۔ عہد قدیم سے لے کر آج تک ہر ملک کے شاعروں نے ارض وطن کی محبت کے نغمے گائے ہیں لوک گیتوں میں مقامی موسموں، فصلوں اور تہواروں کا ذکر اسی جذبہ کا والہانہ اقرار ہے۔ لیکن اس جذبہ کا اظہار و ارتقاء انسان کے دوسرے جذبات کی طرح ہمیشہ حالات اور ماحول کا تابع رہا ہے۔ مختلف زمانوں میں انسانی سماج کے تغیر کے ساتھ ساتھ اس کی صورت بھی بدلتی رہی ہے اگر ہم گزشتہ صدی کے تاریخی حقائق کو نظر میں رکھیں تو اس کی دو صورتیں سامنے آئیں گی۔ ایک وہ جو خاک وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا سمجھ کر اس کی پرستش کرتی ہے۔ انسان کا مصنوعی وجود اس جذبہ کی شدت میں ڈوب جاتا ہے۔ حب الوطنی کی دوسری صورت انسانی شعور کی پیداوار ہوتی ہے۔ پریم چند کی تصانیف میں اس جذبہ کی دونوں صورتیں ملتی ہیں اور وطن پرستی کا جذبہ ان کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کا محور اور محرک رہا ہے۔

پریم چند نے جب قلم اٹھایا تو ہندوستانی ادب کی فضا بنکم بابو کے نغمے 'بندے ماترم' سے معمور تھی۔ اُردو میں اقبالؔ اور چکبستؔ ایک والہانہ لَے میں ہندوستان کی محبت اور اس کی دیرینہ عظمت کے گیت گا رہے تھے۔ ان کے دل وطن کی محبت سے سرشار تھے اور ان کی روح ہر ہندوستانی کو سربلند دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنی شاعری سے وہ ہم وطنوں کے دلوں میں اپنے اسلاف کی شجاعت، حمیت اور برگزیدگی کا احساس اور زندگی کی نئی تعمیر و ترقی کا ولولہ پیدا کر رہے تھے۔ شعر و ادب میں حب الوطنی کے جذبات اور خیالات دراصل اس عہد کی قومی اور معاشرتی زندگی کا ہی عکس تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال اور مہاراشٹر سے لے کر شمالی ہند تک مختلف تحریکیں جاری تھیں۔ ان تحریکوں کے ذریعہ تعلیم یافتہ طبقہ میں وطنیت، قومیت اور اصلاح معاشرت کے جذبات اور خیالات عام ہو رہے تھے۔ پریم چند بھی ان عصری تحریکوں سے متاثر تھے۔ اس لئے ان کی حب الوطنی کے تصورات کو سمجھنے کے لئے اس عہد کی قومی تحریکوں کے کردار کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

یہ ایک عبوری دَور تھا۔ قدیم سماجی نظام ٹوٹ رہا تھا۔ ایسے زمانہ میں ہر ملک کی قومی تحریکوں میں "افراط و تفریط کا راہ پا جانا فطری ہوتا ہے۔ لوگوں کی حب الوطنی کبھی تو اپنے قدیم تہذیبی اور تمدنی اثاثہ کو سینے سے لگاتی ہے اور اس میں عظمت کے پہلو ڈھونڈتی ہے اور کبھی اُسے ہر قدیم سے نفرت اور ہر جدید سے محبت پر اکساتی ہے۔ ہندوستان کی قومی تحریکوں میں بھی یہ عناصر ایک دوسرے سے کچھ اس طرح پیوستہ ہیں کہ ان کو علیحدہ کرنا اور ان کے درمیان کوئی حد فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ موجودہ

صدی کے عشرہ اوّل تک ہماری تمام قومی تحریکوں کے مقاصد اصلاحی نوعیت رکھتے تھے۔ کانگریس کے قیام کے بعد بھی شروع شروع میں اس کے مقاصد، ملکی نظم و نسق میں اصلاح تک محدود تھے۔ اس عہد کے رہ نما اعتدال پسند کہے جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ انتہاپسندوں کا طبقہ پیدا ہونے لگا۔ برہمو سماج، علیگڑھ تحریک، رانا ڈے، گوکھلے اور دوسرے اعتدال پسند رہنما یہ ضرور چاہتے تھے کہ نظم و نسق میں ہندوستانیوں کو کافی حصہ لینے کا موقع دیا جائے مگر اسی کے ساتھ وہ انگریزی حکومت کی وفاداری پر بھی ایمان رکھتے تھے لیکن اس سے قطع نظر ان کی وطن دوستی کا ایک ترقی پسند پہلو یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے عہد کی معاشرت اور زندگی کو ایک تنقیدی انداز نظر سے دیکھا اور فرسودہ رسم و رواج، ذات پات کی تفریق اور توہم پرستی کے خلاف جرأت کے ساتھ آواز بلند کی۔ اس طرح ان کی پیہم کوششوں نے ہندوستان نئی تہذیب اور مغرب کے نئے علوم سے روشناس ہوا۔ دوسرے یعنی انتہاپسند گروہ کے رہ نما تلک تھے۔ یہ گروہ غیرملکی سامراجی حکومت سے کسی تعاون اور مفاہمت کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی حریت پسندی اپنے ملک اور قوم سے ان کی وابستگی کا پاکیزہ مظہر تھی لیکن سماجی اور تہذیبی امور میں اس گروہ کے اکثر افراد کے خیالات ایک حد تک قدامت پسندانہ تھے۔ وہ اکثر نئی سائنسی تہذیب اور علوم کی نیچریت اور مادیت سے بیزار تھے۔ اور قوم کے روحانی کردار کی تعمیر میں ہی اس کی نجات سمجھتے تھے۔ اس سے ان تحریکوں کا کچھ تضاد ضرور ظاہر ہوتا ہے لیکن ان میں جیسے جیسے ہندوستان کی اجتماعی زندگی کا شعور بڑھتا گیا، اور مہاتما گاندھی کی کوششوں سے قومی کارکن عوام کی زندگی سے قریب آتے گئے یہ تضاد بھی مٹتا گیا۔

پریم چند کی تصانیف ہندوستان کی قوم پرستی اور وطن دوستی کے اسی ارتقا کی داستان ہیں۔ ان کے دل میں وطن کی محبت کا مقدس جذبہ دوسرے تمام جذبات سے زیادہ توانا اور فراواں تھا۔ اس لئے ان کے فکر و فن کے نشوونما میں اس کے دوررس اثرات آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اپنے افسانوں کے پہلے مجموعہ "سوزِ وطن" (۱۹۰۹ء) کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"ہر قوم کا علم و ادب اپنے زمانہ کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغ کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت ۔ ۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغیت کے زینہ پر۔۔ قدم بڑھایا ہے اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے ہیں یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں ..... ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں [1]

اس مجموعہ کی تمام کہانیاں کسی نہ کسی پہلو سے حب وطن کی عظمت کا نقش اُبھارتی ہیں۔ ارض وطن کی حفاظت کرتے ہوئے ہنستے کھیلتے جان دے دینا ہی ان کے نزدیک زندگی کا مقصد و منتہا ہے اور خون کا وہ آخری قطرہ جو وطن کے تحفظ میں گرے دُنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔ اس مجموعہ کی ایک کہانی میں پریم چند نے اطالیہ کے جانباز محب وطن میزنی کی زندگی کے حالات قصہ کے پیرایہ میں لکھے تھے اور دکھایا ہے کہ اس نے اپنے ملک کی آزادی کے لئے کتنی اذیتیں سہیں کیسی قربانیاں دیں اور بالآخر غلامی کی ذلتوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہوگیا۔ ان کہانیوں کا مقصد، جیساکہ پریم چند نے لکھا ہے نوجوانوں کے دلوں میں حب وطن کے جذبات اُبھارنا اور اس طرح انھیں غیرملکی حکومت کے جبر و ظلم کے خلاف متحد کرنا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے کتاب ضبط کرکے نذرِ آتش کردی۔ لیکن پریم چند کے دل میں غلامی کی اذیتوں سے تڑپتی ہوئی قوم کے لیے ہمدردانہ جذبات کی جو آگ سلگ رہی تھی اسے کوئی بجھا نہ سکا۔ وہ اسی طرح بڑھتی اور پھیلتی رہی بلکہ اس واقعہ نے غالب کے اس شعر کے مصداق ان کی طبیعت کی روانی اور جذبات کی جولانی کچھ اور تند و تیز کردی۔ ؎

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

---

[1] سوزِ وطن (دوسرا اڈیشن)، صفحہ ۳، ۴۔

اس عہد میں پریم چند کے ذہن پر آریہ سماجی خیالات کا گہرا اثر تھا، اگرچہ اسی دور میں انھوں نے "زمانہ" کانپور میں سوامی وویکانند اور گوکھلے پر مضامین لکھ کر ان کے مسلک سے بھی ہمدردی اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے ناول "جلوہ ایثار" (۱۹۱۲ء) کا ہیرو پرتاپ چند کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر جنگل میں ریاضت کرکے اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پاتا ہے۔ وہاں وہ اپنے گرو سوامی برہمانند کے اپدیش سن کر اور یوگ سادھن کے وسیلہ سے غیر معمولی روحانی قوت حاصل کرلیتا ہے۔ پھر وہ سوامی بالاجی بن کر نگر نگر گھومتا ہے اور قوم کو روحانی قوت اتحاد اور عظمت کا پیغام دیتا ہے۔ اس کے نزدیک قوم کے زوال اور محکومی کا اصل سبب اس کا جسمانی ضعف، مذموم مذہبی رسم و رواج اور ذاتوں کی بے جا تفریق ہے۔ اس لئے وہ ان کے خلاف جہاد کرتا ہے اور ارجن سبھاؤں کے ذریعہ گاؤں گاؤں قومی بیداری کا پیغام پہنچاتا ہے۔ یہاں پریم چند ہندوستان کے قدیم روحانی نظام کے احیاء پر زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں تزکیہ نفس ریاضت اور جسمانی صحت وہ اوصاف ہیں جو قوم کو خوشحالی اور آزادی کا راستہ دکھا سکتے ہیں اس کے مضمحل جسم کی رگوں میں قومی اصلاح اور تعمیر کا نیا جوش و ولولہ پیدا کرسکتے ہیں۔ یہی نہیں اس دور میں پریم چند نے بعض تاریخی کہانیاں (مثلاً روٹھی رانی، رانی سارندھا وغیرہ) لکھ کر راجپوتوں کی شجاعت جانبازی اور حریت پسندی کے گیت بھی گائے ہیں اور ہندو عورت کی پاکبازی، عزت نفس اور قومی حمیت کے بے مثل قصے بھی سنائے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ پریم چند بھی اپنے عہد کے بعض دوسرے قومی رہنماؤں کی طرح ایک جذباتی اور تقلیدی رنگ میں سوچ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں آزادی کا ایک رومانی تصور تھا، اور اس کا حصول قومی حمیت کا فطری تقاضہ۔ وہ اپنے زمانہ اور زندگی کی بعض مذمومات کا شعور رکھتے تھے اور ان کے دل میں اپنی قوم کو ان سے پاک دیکھنے کی آرزو بھی بیتاب تھی لیکن ان مذمومات کے سماجی اسباب ابھی ان کے ذہن میں واضح نہیں تھے۔ پھر بھی ان کی حب الوطنی کا ایک تابناک پہلو یہ ہے کہ وہ اس دور میں بھی غیر ملکی حکومت سے کسی تعاون کے لئے آمادہ نہ ہوتے۔ غلامی کی ذلت کا احساس اور اس کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات کا اظہار کرنے میں انھوں نے ذرا بھی پس و پیش نہ کیا۔

جنگ عظیم کے بعد ساری دنیا کے سماجی اور سیاسی حالات نے کروٹ بدلی۔ ہندوستان میں بھی عوامی طاقتوں نے سر اٹھایا مزدوروں اور کسانوں کی تحریکیں منظم ہوئیں اور اسی کے ساتھ پریم چند کی حب الوطنی کا مزاج اور تصور بھی بدلا۔ وہ اپنے ملک کی سماجی اور سیاسی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہے تھے۔ سامراجی حکومت کا جبر و تشدد انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ننگے اور بھوکے کسانوں پر ساہوکاروں، زمین داروں اور سرکاری عہدہ داروں کے مظالم دیکھ کر ان کا حساس دل تڑپ اٹھتا تھا۔ مزدوروں اور متوسط طبقہ کی معاشی بدحالی اب ان کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی۔ بدلتے ہوئے حالات کے شعور نے ان کی حب الوطنی کو بھی ایک نیا آب و رنگ دیا۔ ان کے اپنے تجربات نے اس جذبہ کی تہذیب و تربیت میں حصہ لیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ ارض وطن کی آزادی اور خوشحالی کے لئے صرف انگریزوں کی حکومت سے نجات حاصل کرنا کافی نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کو یکسر بدلا جائے اور ان کل پرزوں کو نکالا جائے جو سامراج کی دین ہیں اور جو ملک میں پھیلی ہوئی معاشی لوٹ، سماجی بے انصافی اور اخلاقی بے راہ روی کا اصل سبب ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ۱۹۱۶ء کے بعد پریم چند نے اپنے ذہنی ارتقاء کی ہر منزل پر مہاتما گاندھی کی شخصیت سے روشنی اور رہبری حاصل کی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے عہد کی زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل کے بارے میں ان کے اپنے خیالات نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کو ہمیشہ ایک بیدار ذہن اور ناقدانہ نظر سے دیکھا تھا۔ وہ اپنے عہد کی ان سماجی اور سیاسی تحریکوں سے مطمئن نہیں تھے جن کی رہنمائی اعلیٰ طبقہ کے افراد کر رہے تھے اور جنھیں تعلقداروں زمین داروں اور ملکی سرمایہ داروں کی سرپرستی حاصل تھی۔ پریم چند ان کی حب الوطنی کو خلوص سے عاری دیکھتے

تھے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کے طبقاتی مفاد اور بقا کا انحصار سامراجی حکومت کے استحکام پر ہے۔ "گوشۂ عافیت" "چوگانِ ہستی" "میدانِ عمل اور گئودان" میں انھوں نے اسی طبقہ کی کھوکھلی قوم پرستی کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا ہے۔ رائے کملا نند، راجہ مہندر، چندر پرکاش کھنا اور رائے اگرپال سنگھ سب قوم پرستی کے دعوے دار ہیں اور قومی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سامراجی حکومت کے وفادار ہیں اور نادار محنت کش انسانوں کو لوٹ کر اپنے محلوں میں عیش کی محفلیں گرماتے ہیں۔ ان کی حب الوطنی محض ایک فریب ہے، ایک پردہ ہے ان کی چیرہ دستیوں کو چھپانے کا۔ پریم چند قومی آزادی کی تحریک کو اس طبقہ کے اجارہ سے نکال کر خود عوام کے ہاتھوں میں یا متوسط طبقہ کے ایسے باشعور لوگوں کی رہنمائی میں دینا چاہتے تھے جن کے مفاد عوام کے مفاد سے وابستہ ہوں اور جو کسی منزل پر بھی ان کے ساتھ غداری نہ کریں۔

مکمل آزادی یا سوراج کا واضح مطالبہ کانگریس نے ۱۹۲۹ء میں کیا تھا۔ اس سے قبل "ڈومینین اسٹیٹس" قسم کی آزادی کا تصور ہی عام تھا۔ پریم چند اس آزادی کی حقیقت جانتے تھے انھیں یہ ادراک حاصل تھا کہ اس نوع کی آزادی میں ایک طرف تو سامراجی استحصال اور ان کے مفاد ہندوستان میں برقرار رہیں گے اور دوسری طرف اس کی برکتیں صرف اقتدار رکھنے والے اعلیٰ طبقہ کا اجارہ ہوں گی۔ ہندوستان کے اسّی فیصدی محنت کش انسان اسی طرح غلامی کی لعنتوں میں سسکتے رہیں گے۔ وہ ایسی آزادی کے خواہاں تھے جو محنت کش عوام کو ہر قسم کے جبر و ظلم اور زبردستی سے نجات دے سکے۔ اپنے ایک ہندی مضمون میں لکھتے ہیں۔

> "ڈومینین اسٹیٹس کی حمایت کو غور سے دیکھئے تو اس میں ہمارے راجے مہاراجے، زمیندار اور سرمایہ دار بھائی ہی زیادہ نظر آتے ہیں کیا اس کا یہ سبب نہیں کہ... سوراج کی صورت میں انھیں دب کر رہنا ہوگا۔ سوراج میں مزدوروں اور کسانوں کی آواز اتنی کمزور نہ رہے گی۔ کیا وہ لوگ اسی آواز کے خوف سے کانپ رہے ہیں یہ سوچ کر کہ ان کے مفادات کا تحفظ انگریزی اقتدار میں ہی ممکن ہے؟ سوراج کبھی انھیں غریبوں کو کچلنے اور ان کا خون چوسنے کی اجازت نہ دے گا۔"[۱]

آزادی کا یہ تصور اس سوشلسٹ سماج کے قیام کی طرف اشارہ ہے جسے پریم چند نے آخر دور میں اپنا نصب العین بنایا تھا۔ اپنے وطن کی آزادی اور بہتری کے لئے وہ نہ صرف غیر ملکی سامراج بلکہ ان طبقوں کا استیصال بھی ضروری سمجھتے تھے جن کا مفاد محنت کش طبقہ کے مفاد سے متصادم تھا۔

پریم چند کا یہ طبقاتی شعور کسی "ازم" پر ایمان لانے کا منطقی نتیجہ نہ تھا۔ یہ ان کی انسان دوستی اور پرخلوص وطن پرستی کا ثمرہ تھا۔ عام انسانوں کی زندگی سے قریب رہنے ان کے دکھ درد کو سمجھنے اور ان کے بنیادی مسائل پر ہمدردی اور گہرائی سے غور و فکر کرنے کا ردِ عمل تھا۔ ان کی حب الوطنی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ مسلسل بیماری اور معاشی دقتوں کے باوجود وہ ۱۹۲۲ء میں اپنی مستقل سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر عوام کی اس جد و جہد میں شریک ہو گئے جو غیر ملکی سامراج کے خلاف مختلف مورچوں پر جاری تھی۔ بقول شورانی پریم چند، وہ سیاسی جلسوں میں باضابطہ شریک ہوتے تھے اور کئی کئی دن تک سیاسی و سماجی کارکنوں کے ساتھ دیہاتوں کا دورہ کرتے تھے۔ استعفیٰ کے بعد وہ ایک مدت تک اپنے گاؤں لمہی (بنارس) میں رہ کر کسانوں میں سودیشی کا پرچار کرتے رہے اور انھیں قومی آزادی کی تحریک میں شامل ہونے کا عزم و حوصلہ دیتے رہے۔ اس کے بعد اپنے رسالوں "ہنس" اور "جاگرن" کے ذریعہ انھوں نے اس وطنی فریضہ کو انجام دیا۔ "ہنس" کے اداریے اور انتخاب مضامین اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ کس وقت نظر کے ساتھ قومی زندگی کے اہم مسائل پر سوچتے تھے۔ ان کی تحریروں اور تصانیف کا ہر لفظ ملک و قوم کی محبت کے پاکیزہ جذبات سے معمور ہے۔ پریم چند کے صاحبزادے

---

۱ ہنس، مارچ ۱۹۳۰ء

شری امرت رائے اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں۔

"ان کا ایک ایک حرف بول رہا ہو کر جن ہاتھوں نے انھیں لکھا ہے وہ کتنے پیار سے اپنے وطن کی، اپنے گاؤں کی مٹی کو چھوتے تھے کتنی ممتا اور کیسی محبت سے اپنے دیش کے پودوں، پتوں اور ان کے پھولوں کو چھوتے تھے..... انھوں نے جو کچھ لکھا وطن میں لوگوں کی حکومت اور عوامی نظام زندگی قائم کرنے کیلئے لکھا ہے" [1]

پریم چند ہندوستان کی سیاسی غلامی سے زیادہ اس کی ذہنی غلامی سے دکھی تھے۔ وہ مغرب کی سائنسی ترقیوں، علوم اور ادب سے فائدہ اٹھانا جائز اور مستحسن سمجھتے تھے لیکن مغربی معاشرت کی تقلید اور مغربی ذہن سے سوچنا ان کے مسلک میں روا نہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ تعلیم یافتہ نوجوان مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ کر ایک خاص عصبیت اور احساس برتری کا شکار ہیں اور اس نے انھیں ہندوستان کے ان کروڑوں انسانوں سے منقطع کر دیا ہے جنکی بود و باش قدیم ہندوستانی طرز کی ہے۔ پریم چند محسوس کرتے تھے کہ اس ذہنی خلیج نے مغرب کے ان پرستاروں کو عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے دور کر دیا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے دل میں اپنے ہم وطنوں کے لئے ہمدردی کے سچے جذبات اور قومی تعمیر کا صحیح ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔ پریم چند کا عقیدہ تھا کہ مغرب کے سیاسی اقتدار سے آزادی بے مصرف ہوگی اگر ہم نے ذہنی طور پر مغرب کی غلامی سے نجات حاصل نہ کی۔ اپنی کہانیوں اور ناولوں میں انھوں نے مغرب زدگی کے رجحان پر بار بار طنز کیا ہے۔ ان کے نمایندہ کردار وہی ہیں جو اپنی اعلیٰ تہذیبی روایات اور اپنی معاشرت سے محبت کرتے ہیں۔ پریم شنکر، چکردھر، سورداس، امرکانت اور ہوری سب کی تخلیق ہندوستان کی مٹی، مزاج اور ماحول سے ہوئی ہے۔ اپنے وطن سے پریم چند کا یہ والہانہ پیار مغربی قوموں کے خلاف تحقیر اور نفرت کا کوئی جارحانہ جذبہ نہ تھا۔ اس کی تہ میں یہ شعور بھی کار فرما تھا کہ مغرب کی تہذیب جس ماحول، جن جغرافیائی حالات اور سماجی ارتقا کے جس دور کی پیداوار ہے وہ ہندوستان سے بہت دور ہے۔ اس لئے اسے اپنانا ہندوستان کی تعمیر و ترقی کی راہ میں ممد و معاون ہونے کے بجائے رکاوٹ ثابت ہوگا۔ پھر یہ حقیقت بھی ان سے چھپی نہیں تھی کہ انگریزوں کا مقصد (ہندوستان میں آنے والی دوسری قوموں کی طرح) یہاں رہنا بسنا اور مل جانا نہیں بلکہ حکومت کرنا اور اس ملک کی دولت کو اپنے ملک منتقل کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پریم چند آخر وقت تک ان کی تہذیب اور حکومت سے کسی سمجھوتہ کیلئے آمادہ نہ ہوئے۔ انھوں نے وہ سرنگیں دیکھ لی تھیں جن کے وسیلہ سے ہندوستان کی دولت انگلستان کے بینکوں اور مل مالکوں کی تجوریوں میں پہونچ رہی تھی اور ہندوستان غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

پریم چند قدیم ہندوستان کی روحانی فتوحات اور اس کی انسان دوستی پر ناز کرتے تھے۔ انھیں فخر تھا کہ ہندوستان کے مذاہب نے ایسے دور میں دنیا کو امن انصاف اور انسانی مساوات کا پیغام دیا ہے جب ہر طرف سماجی بے انصافی جنگ اور بہیمیت کا بازار گرم تھا۔ بدھ، مہاویر اور کرشن نے نہ صرف انسانوں بلکہ تمام جانداروں کیلئے پیار، ایثار اور ہمدردی کی تلقین کی ہے۔ وہ شیخ سعدی کے پرستار اس لئے تھے کہ ان کے اخلاقی پیغام میں انھیں انسانیت کا وہ آدرش نظر آیا جو ہندوستان کی قدیم تہذیب کا سرمایہ ناز رہا ہے۔

پریم چند ہندوستان کو آزاد، متحد اور مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ اس راہ میں انھیں جو شے بھی حائل نظر آئی اس کے خلاف انھوں نے آواز بلند کی۔ انھوں نے مذہب کے نام پر انسانوں کی لوٹ کھسوٹ کا پردہ فاش کیا، ذات پات کی تفریق اور اچھوتوں کے ساتھ ہونے والی بے انصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ہندوستانی عورت کی شخصی پامالی اور اس کی معاشی غلامی پر بار بار طنز کیا، اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کی، لایعنی رسم و رواج اور مریضانہ عقائد کے خلاف جہاد کیا۔ الغرض ہندوستان کی قومی زندگی کا کوئی بنیادی مسئلہ ایسا نہیں جو ان کے غور و فکر سے محفوظ رہا ہو اور جسے انھوں نے اپنی تصانیف کا موضوع نہ بنایا ہو۔ یہ مسائل آج بھی ہندوستان کے بنیادی مسائل ہیں اور آج کی قومی حکومت جیسے جیسے ان کو حل کرنے میں کامیاب ہو رہی ہے ہم اس "آزاد اور پرشکوہ ہندوستان" سے قریب آتے جاتے ہیں جو پریم چند کی زندگی کا سب سے حسین خواب تھا۔

---

[1] شانتی کے جودھا، پریم چند صفحہ ۲۴۔

بجو خاں اور دوسرے شہداء کے مزارات

روہیلکھنڈ کا ایک ساکھا

محمود نیازی

"ساکھا" ہندی لفظ ہے جس کے معنی جنگ، جدل اور ہتھیاروں سے دست بدست لڑائی کے ہیں لیکن روہیلکھنڈ کی عوامی اصطلاح میں ساکھا اس لوک گیت کو کہتے ہیں جس میں کسی مشہور لڑائی کے واقعات کی نظم بندی کی گئی ہو۔ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے تو مقامی لوگ اور آس پاس کے دیہات کے باشندے اس کا ساکھا (نظم) بنا لیتے تھے اور پھر اس ساکھے کو تہواروں، میلوں اور فصل کٹنے کے موقعوں پر فخریہ طور پر گایا جاتا تھا۔ یہ ساکھے روہیلکھنڈ میں اب بھی مشہور ہیں اور میلوں، تہواروں وغیرہ کے موقعوں پر لوگ اسے گاتے ہیں۔ ساکھے بنانے کا مقصد خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن آنے والی نسلوں کے لئے اپنے بزرگوں کے زرین کارناموں سے واقف ہونے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی تحریک پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ ضرور ہیں۔ اس قسم کے جو ساکھے یا رزمیہ لوک گیت روہیلکھنڈ کے دیہاتوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک **بجو خاں کا ساکھا** بھی ہے اس ساکھے میں بجو خاں روہیلہ کی بے نظیر بہادری اور "جنگ بجو خانی" کے تمام واقعات دیہات کی سیدھی سادی زبان میں موجود ہیں۔ عبارت آرائی کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے۔ اس ساکھے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ روہیلکھنڈ کی عوامی بولی میں ہے اور اس اعتبار سے روہیلکھنڈ کی کھڑی بولی کا مستند شاہکار ہے۔ بجو خاں کے ساکھے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اسکو اُردو کے عوامی لٹریچر میں بھی ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اردو زبان پر عام طور پر یہ

الزام ہو کہ وہ صرف رات اور زلف گل اور بلبل کی کہانی ہو اور اس نے گردوپیش کے اہم تاریخی واقعات کی عکاسی نہیں کی ہو۔ اس ساکھے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہو کہ اردو لٹریچر بھی اپنے ملک کی داستانوں سے مالامال ہو۔ اس کے علاوہ اس ساکھے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں عوام کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت اور آزادی کے جذبات کا احساس موجود تھا۔ یہ ساکھا ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نمونہ ہو جس کو پڑھ کر اب بھی ہمارے زنگ آلود ذہنوں پر صیقل ہو سکتا ہے۔ ہماری آزادی کے سلسلہ میں جو لٹریچر مرتب کیا گیا ہے اس کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس قسم کے وہ تمام ساکھے اور لوک گیت قلمبند نہ ہو جائیں جو ابھی تک عوام کے سینوں میں محفوظ ہیں اور اس سلسلہ میں یہ میری پہلی کوشش ہے جو "نجوخاں کے ساکھے" کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہو۔ یہ ساکھا اب موضع نریاپور (ضلع بریلی) کے ایک بوڑھے کسان کو یاد ہے جس کی عمر نوّے سال سے زیادہ ہے۔ بوڑھے کسان "مرھتی ناتھ" کے مرنے کے بعد یہ اہم تاریخی ساکھا بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جاتا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ اس ساکھے کو قلمبند کر لوں لیکن بوڑھے کی تنک مزاجی کی وجہ سے اس کی تکمیل نہ ہوتی تھی۔ بیسوں بار بوڑھے سے سن کر میں نے اس ساکھے کو پورا کیا ہے اور لطف یہ ہو کہ ہر بار اس میں دو چار اشعار کا اضافہ ہوتا گیا جو اس کو پچھلی بار یاد نہیں رہے تھے مجھے یقین ہو کہ اب بھی یہ ساکھا نامکمل ہو اور اس کے کچھ اشعار باقی رہ گئے ہیں لیکن اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ بوڑھے کے پاس جا کر اسے بار بار تنگ کر دوں اور نہ اب وہ سنانے پر آمادہ ہی ہوگا کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار خفا ہو چکا ہے۔ اصل ساکھے کو پیش کرنے سے پہلے یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "جنگ نجوخانی" کے مستند واقعات اختصار کے ساتھ پیش کر دیئے جائیں تاکہ جو لوگ روہیلکھنڈ کی تاریخ سے ناواقف ہیں ان کو بھی اس ساکھے کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ تمام اقتباسات اخبار الصنادید سے ماخوذ ہیں:-

بارہویں صدی ہجری کے وسط میں روہیلکھنڈ کے حکمراں نواب سید فیض اللہ خاں بہادر تھے ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد میں اتفاق نہ رہ سکا اور کئی سال تک خانہ جنگیوں اور بغاوتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ جب ان کے بڑے لڑکے نواب سید محمد علی خاں کو ان کی فوج نے

انگریزوں کے اشارہ پر شہید کر دیا تو ۱۲ محرم ۱۲۰۹ھ کو مقتول نواب کے چھوٹے بھائی نواب سید غلام محمد خاں تخت نشین ہوئے یہ تخت نشینی انگریزوں اور نواب وزیر اودھ کو بہت ناگوار ہوئی کیونکہ ان دونوں کا مدت سے روہیلکھنڈ پر دانت تھا۔ انگریزی حکومت نے سید محمد علی خاں کے لڑکے کو چچا کے خلاف بھڑکایا اور اس کا استغاثہ آصف الدولہ کے دربار میں پیش کرا دیا۔ روہیلکھنڈ کو ہڑپ کرنے کے لئے اتنا ہی واقعہ کافی تھا۔ انگریزوں نے آصف الدولہ کے مشورہ پر سید غلام محمد کی جانشینی کو جائز تسلیم نہ کیا اور آخر میں یہ تجویز ہوئی کہ نواب سید فیض اللہ کا سارا ملک ان کے بیٹے سے چھین کر اور پوتے کو محروم کر کے نواب وزیر اودھ کو دے دیا جائے اور روہیلوں کا بے شمار خزانہ انگریزوں کے ہاتھ آ جائے۔ اس کام کے لئے گورنر جنرل کے حکم پر "سر رابرٹ ابرکرمبی" فرخ آباد سے فوج لے کر چلا۔ عمادت السعادت میں لکھا ہے کہ اس انگریزی فوج میں دو پلٹین گوروں کی اور بارہ پلٹین تلنگوں کی تھیں یہ فوج بریلی سے آگے سات میل پچھم کی طرف سنکھا ندی کے پاس مقیم ہوئی بریلی کا صوبیدار شمبھو ناتھ بھی پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ انگریزی فوج میں آ کر شامل ہو گیا۔ دوسری طرف نواب آصف الدولہ بھی انگریزوں کی مدد کے لئے اپنی فوج لے کر اودھ سے روانہ ہو گیا۔

نواب سید غلام محمد خاں کو جب ان واقعات کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے بہنوئی اور روہیلہ سردار مصطفےٰ خاں عرف نجوخاں کی مدد سے فوج کی بھرتی شروع کر دی۔ سید ولی اللہ نے تاریخ فرخ آباد میں لکھا ہو کہ روہیلہ فوج تربیت یافتہ نہ تھی اور اس کے پاس عمدہ سامان جنگ تک نہ تھا بہرحال تاریخ آصفی کے قول کے مطابق پچاس یا ساٹھ ہزار اور گزیٹیر اور جام جہاں نما کے مطابق بالترتیب پچیس یا تیس ہزار روہیلوں کی فوج نواب صاحب کے ساتھ روانہ ہوئی اور اس کا پہلا مقام ٹانک میں ہوا۔ نواب صاحب نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو ایک مہینہ کی پیشگی تنخواہ میں اشرفیاں دیں۔ نواب صاحب نے جنرل ابرکرمبی کو صلح کے لئے بھی لکھا لیکن انگریزوں نے صلح کی پہلی شرط یہ رکھی کہ نواب فیض اللہ خاں کا سارا خزانہ ان کے سپرد کر دیا جائے اور یہ شرط روہیلوں کے لئے قابل قبول نہ تھی اس لئے روہیلہ فوج ٹانک سے چل کر تین روز میں میر گنج کے پاس پہنچ گئی اور اس نے دیوالی کے روز دوجوڑہ ندی کو عبور کر لیا اور ۲۴ اکتوبر ۱۷۹۴ء مطابق

ربیع الاول سنہ ۱۱۸۹ھ جمعہ کے روز جنگ شروع ہوگئی۔ انگریزی فوج کے ایک گولے سے نواب صاحب کی فوج کے بارود کا چھکڑا اڑ گیا جس سے ساری بارود ختم ہوگئی جنگنامہ معظم میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :۔

فرنگی نے گولے غلامی کے کھا ۔۔۔ دیا اس کی بارود کو بس اڑا
وہ چھکڑہ جو بارود کا اڑ گیا ۔۔۔ ہر اک کا ہوا رنگ اس دم ہوا
دیا توڑ منہ ضرب سے ضرب کا ۔۔۔ گئی ٹوٹ لیکن وہیں ضرب کھا

اسی وقت کپتان رامزی کو نواب صاحب کی فوج پر دھاوا کرنے کا حکم ملا لیکن کپتان مذکور یا تو اس حکم کو بھول گیا یا گھبرا گیا۔ وہ اس طرح روہیلہ فوج کی طرف بڑھا کہ اس کے سپاہی انگریزی فوج کے محاذ کے بالکل سامنے آگئے اس حالت کو دیکھ کر مصطفےٰ خاں عرف بنجو خاں پندرہ سو جوانوں کے ساتھ انگریزی فوج پر ٹوٹ پڑا اور اس نے باز کی طرح اپنے شکار پر حملہ کر دیا۔ رامزی کے سپاہی توپوں کے سامنے تھے اس لئے انگریزی توپیں بھی اس وقت بالکل بیکار ہوگئیں۔ بنجو خاں نے کپتان رامزی کو بری طرح شکست دی اور اس کو کیمپ تک لتاڑتا ہوا چلا گیا۔ انگریزی فوج کا داہنا بازو ٹوٹ گیا۔ بائیں بازو کی فوج کو لفٹیننٹ گاہن اور ریچارڈسن نے دوبارہ صف آرا کیا لیکن روہیلے غول باندھ کر انگریزی کیمپ میں گھس آئے اور تلوار، نیزہ اور تبروں سے مردانہ وار لڑنے لگے۔ بنجو خاں اور بلند خاں نے کھیرے ککڑی کی طرح انگریزوں کو کاٹ ڈالا۔ عمادت السعادت میں لکھا ہے کہ اس جنگ میں بنجو خاں کے دستہ نے ڈھائی سو گورے۔ پچاس سردار اور سترہ سو کے قریب تلنگوں کو قتل کیا نواب سید غلام محمد خاں اس ٹیلے پر جہاں آج کل انگریز کشتوں کی یادگار میں پتھر نصب ہے اپنے بھائیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے بنجو خاں کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے کپتان رامزی کی شکست دیکھ کر قبل از وقت فتح کے نقارے بجوا دیئے اور اس طرح بنجو خاں اور اس کے ساتھیوں کو مدد نہ پہونچ سکی جو اس وقت انگریزی کیمپ میں گھرے ہوئے تھے۔ ایک عام روایت یہ بھی مشہور ہے کہ ایک لنگڑا انگریز توپچی زندہ رہ گیا تھا اس نے بجائے گراپ کے توپ میں اشرفیاں بھر کر میدان کی طرف چھوڑیں روہیلہ سپاہی تو اشرفیوں پر ٹوٹ پڑے اور اس نے بنجو خاں کے دستے پر گولہ باری شروع کر دی۔ بنجو خاں کے سینہ میں گولہ لگا اور وہ شہید ہوگیا۔ اسی وقت شکست خوردہ انگریزی فوج بھی لوٹ پڑی اور اس نے روہیلوں پر گولہ باری کی اور روہیلوں کی جیتی ہوئی بازی الٹ گئی۔ اسی ہنگامہ میں ایک نمک حرام اور غدار روہیلہ سردار دلیر خاں اپنی پانچ ہزار فوج کو لے کر میدان سے ہٹ گیا۔ اس کے ہٹتے ہی میدان جنگ میں بھاگڑ پڑ گئی۔ نواب صاحب نے ہر چند روکنے کی کوشش کی لیکن فوج کے قدم اکھڑ چکے تھے۔ انجام کار روہیلوں کو کامل شکست ہوئی اور ذرا سی دیر میں سارا میدان ان سے خالی ہوگیا۔ تذکرہ حکومت المسلمین میں اس محاربہ کو "جنگ بنجو خانی" کہا گیا ہے اور عنبر خاں نے بنجو خاں کے مارے جانے کی تاریخ یہ کہی تھی :۔

مصطفےٰ خاں آنکہ بنجو خاں بود نامش بعرف ۔۔۔ شد شہادت یاب چوں بر فوج اعدا در زدہ
بہر تاریخ شہادت وقت قتل دشمنان ۔۔۔ ہاتفم و زن سر دم از زبانش سر زدہ

مولف تاریخ آصفی کا کہنا ہے کہ اگر ایسی ضرب نواب وزیر اودھ کی فوج کو لگتی تو وہ اتنی تباہ ہو جاتی کہ انگریزوں سے بھی اس کا تدارک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس جنگ میں بڑے بڑے انگریز افسران مارے گئے تھے۔ گورنر جنرل کے حکم سے جارج برگنٹن کی قبر پر جو پتھر نصب ہے اس سے مندرجہ ذیل انگریز مقتولوں کے نام ملتے ہیں جو سب بڑے بڑے افسر تھے :۔

کرنل جارج برگنٹن۔ میجر تھامس پالٹن۔ کپتان جان موبی۔ کپتان نارمکلید۔ کپتان جان مرڈنٹ۔ لفٹیننٹ ایڈ بروکنگن۔ لفٹیننٹ ایڈمنڈ ویلز لفٹیننٹ ولیم ہنگسن۔ لفٹیننٹ جاسف ریچارڈسن۔ لفٹیننٹ جان بلمبر لفٹیننٹ برج۔ لفٹنٹ ولیم آڈیل۔ لفٹیننٹ ایڈورڈ بجگہ۔ لفٹیننٹ فایر ورکر لفٹیننٹ جیمس ملفر۔

اس فتح کی یادگار میں انگریزوں نے اس مقام کا نام "فتح گنج" رکھا جو اب ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ وہ میدان جہاں جنگ ہوئی تھی "بنجو خاں کا کھیڑہ" کہلاتا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ شہیدوں کا خون گرنے سے کئی میل مربع کا وہ قطعہ زمین ناقابل کاشت ہوگیا ہے اور اس وقت سے اب تک غیر آباد اور بنجر ہے۔ انگریزوں کی قبروں کے پاس ہی ایک اونچا مینار اب بھی ہے "فتح کا مینارہ" کہلاتا ہے اس کے قریب ہی روہیلہ شہیدوں کے مزارات ہیں جو آج بھی مظلومیت کی داستان زبان حال سے سناتے ہیں۔

اب بنجو خاں کا ساکھا ملاحظہ فرمایئے :۔

ساکھا

اول نام کھدا کا لیجئے دوجے نبی رسول
(خدا)
تیجے نام برہی کا لیجئے بات جاؤں نہ بھول
(شاعر کا نام)
کنٹھ سرسوتی میں تو کنٹھ بیٹھ جائے میرے
(شاعری کی دیوی)
بجو خاں کا ساکھا کتنا سرن جاؤں میں تیرے

شہر رامپور عجب دوانہ اسمیں بسیں روہیلے
کھوسیاں بیٹھی راج کریں چوپٹ کھیلیں پھانسے
(رانیاں) (پانسے)
اوڑھیں خاصے سال دوسالے لمبے باندھیں سیلے
(سردار) (شال دوشالے)
چڑھ اسوار پھریں دولھوں سے پیدل ہیں البیلے
پھیج اللہ خاں نواب گازی مرتے ہی بھیتن میں
(نواب فیض اللہ خاں)
بگڑی اور بکھر گیو بھنگا

مت کوئی وجیر جیتی آدے مت کوں کھیلے جنگا
(ایسا نہ ہو کہ نواب وزیر اودھ فیض‌آبادی جنگ کرے)
جوڑ کچہری نباب بیٹھے بجو خاں بلوائے
بجو خاں ہو۔ ہوشیار فرنگی غول بنائے
بجو خاں ہوئے اسوار چلے ماتا کو سمجھائے
اب تو ماتا میرا دودھ بکھیدے دولا مولا بھلی کریگا
(بخشدے)
جب میں منھ دکھلاؤں

جب نا ڈرے پتا ہمارے اب کیا ناک کٹاؤں
تین ونا کا پھاکر رکھ کر پورا دیا جھیتا
لال بنیتی جین براجے کوتل ہین لاگے
(لال بانات) (زین) (ہنہنانے لگے)
جمادار تب بن بن آویں نکلے پیلی پھانٹے
غلام محمد نئی سی بندی ٹھارے کرمے جھنڈا
(فوج)
تازی ترکی لیں البیلیں چھوڑ رامپور چلے روہیلے
آئے پلک میں ڈیرا تانے میر گنج کے دھورے
جھنڈا گاڑ دیو کھیت میں میر گنج سے آگے
شہر بریلی کانپن لاگی چلے روہیلے آدیں
ہاٹ پینٹھ نہ کھولیں بنین بند کریں دروازے
(بازار)
آٹا ملے نہ دار سپاہی صوبا پہ فریادے
(دال) (صوبیدار) (فریاد کرنے لگے)
پکر بریلی صوبا باہر ڈیرا تانے
(بریلی کا صوبیدار شمبھو ناتھ)

ترجمہ

پہلے نام خدا کا لیجئے پھر نبی رسول کا
تیسرا نام برہی (شاعر) کا لیجئے ایسا نہ ہو کہ یہ نام بھول میں پڑ جائے۔
اے سرسوتی دیوی (شاعری اور علوم کی دیوی) تیرے گلے کی مٹھاس مجھ میں جائے
کیونکہ میں بجو خاں کا ساکھا کہہ رہا ہوں میری عزت و آبرو تیرے ہاتھ ہے۔
رامپور بھی عجب شہر ہے جس میں روہیلہ قوم آباد ہے وہاں
ہر طرف بے فکری اور عیش و مسرت کا دور دورہ ہے لوگ کھیل کود میں مصروف
رہتے ہیں۔ روہیلہ سردار دوشالے اوڑھتے ہیں اور لمبے لمبے سیلے باندھتے ہیں۔
سوار دولھوں کی طرح سڑکوں پر پھرتے ہیں وہاں کے پیدل بھی البیلے ہیں۔
نواب سید فیض اللہ کے مرتے ہی ان کے لڑکوں میں اتفاق نہ رہا
اور حکومت کا شیرازہ بکھر گیا

اگر باہمی رنجش کا یہی عالم رہا تو ایسا نہ ہو کہ نواب وزیر اودھ ریاست پر قبضہ کرلے
یہ دیکھ کر نواب سید غلام محمد خاں نے دربار کیا اور اپنے بہنوئی اور روہیلہ سردار
مصطفےٰ خاں عرف بجو خاں کو بلا کر انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر سنائی
بجو خاں وہاں سے رخصت ہو کر اپنی ماں کے پاس گئے اور انھوں نے دودھ
بخشنے کی درخواست کرتے ہوئے جنگ کی اجازت مانگی اور کہا کہ دعا کیجئے
کہ ہماری فتح ہو میں دشمنوں کو نیست و نابود کر کے ہی آپ کو منھ دکھاؤنگا
جب ہمارے بزرگ کبھی جنگ سے نہ ڈرے تو میں پیچھے ہٹ کر اپنی ناک کیوں کٹاؤں
اس کے بعد بجو خاں نے فوج کی نئی بھرتی شروع کردی اور سپاہیوں کو پیشگی تنخواہ دی
لال بانات کی زینیں تیار ہوئیں اور گھوڑے ہنہنانے لگے فوج کے
جمعداروں کے دن بھی پھرے اور لوگ ان کی خوشامدیں کرنے لگے۔
غلام محمد رسالدار نے نئی فوج تیار کرلی اور اس پر روہیلہ جھنڈا لہرانے لگا
اور اس شہر رامپور کو چھوڑ کر روہیلے روانہ ہوگئے۔ پہلا قیام
انھوں نے میر گنج کے قریب پلک میں کیا۔ پھر میر گنج سے آگے
انھوں نے ایک کھیت میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ روہیلہ
فوج کی خبر سن کر بریلی شہر ان کے خوف سے کانپنے لگا۔
بنیوں نے بازار بند کرلئے اور اپنی دوکانوں کے دروازے بند کرکے بیٹھ گئے۔
بریلی میں جب سپاہیوں کو آٹا دال نہ ملا تو انھوں نے بریلی کے صوبیدار
سے فریاد کی صوبیدار شمبھو ناتھ اپنی پانچ ہزار فوج لے کر بریلی سے

کوس بھرے پہرے راکھے من میں بہت ڈرائے
وہ ہلکارا یہاں چھوٹے پہونچے وجیر کے دھورے
وجیرنیوں اٹھ بولا کیسے غلو ہیں اوڑھے
تلواروں کا جور جلم ہے پیسے بہت جوڑے ہیں
لڑنے کو تیار روہیلے غلو باندھ کر بیٹھے ہیں
دھر گُتہ وجیر کو لاگی پھوجوں کے دل جوڑے ہیں
جب میں بھر دل ارادا پہلی چوٹ اڑاؤں
کیا مگدور روہیلوں کا جو سنکھ سے لڑائی
ہل ہل کر کے چلا فرنگی اس کے ہل ہل تلنگے
بارہ پلٹنیں بڑی دھوم کی کپو کے دل گاڑتے
کمر باندھ کے چلا فرنگی غول باندھ تلنگے
شہر بریلی کی گلیوں میں پھرتے مارے مارے
چھوڑ بریلی چلے فرنگی سنکھا ندی پر ڈیرا تانے
وہ ہلکارا یہاں چھوٹے پہونچے نباب کے دھورے
نباب ہو ۔ ہوشیار فرنگی غول بنائے
جوڑ کچہری نباب بیٹھے جمادار بلوائے
اور پھر کہنے گے

مہروں کے تو چھٹے دوں گا میری سرن اب تمہارے ہاتھ
عنبر خاں تو یوں اٹھ بولا سنو روہیلوں بھائی
ہم تو بنا لڑے نہیں مائیں پوچھو نجو خاں سے وہ کیا کہتے ہیں!
نجو خاں تو یوں اٹھ بولا ہم تو تیار ہیں لڑنے کو
اٹھ باندھو پھینٹ کمر کس کے سر پہ آفت آئی
تلواروں پہ باڑھ دھرالیو گھوڑوں کو دانہ
بندھی پھینٹ نہ کھولو جوانو آج رن ہے بھاری
مت کوں رات کو گورے ستاویں گھر کی کردیں کھواری
جمادار تو نالت دے گا جل دے گا تاری
اب تو دل میں یہی آوے ۔ کہ مار کے مر جانا
پھر تو

انگریزوں کی مدد کے لئے نکل آیا لیکن روہیلوں کے خوف سے بھی بریلی نہ پہنچ سکا
روہیلوں کی اطلاع دینے کے لئے دو ہرکارے نواب وزیر اودھ کے پاس
پہونچے ۔ وزیر یہ کہنے لگا کہ کیا غل کر رکھا ہے ۔ ہرکاروں نے کہا
روہیلوں نے پیسے بہت اکٹھے کر لئے ہیں اسی لئے یہ آفت ڈھا رہے ہیں
ہرکاروں نے یہ بھی خبر سنائی کہ روہیلے لڑنے کو تیار ہو کر آئے ہیں۔
وزیر نے جب یہ سنا تو اس کو بہت غصہ آیا ۔ اس نے کہا میں
اگر اپنی فوج لے کر چلا تو ایک ہی حملہ میں ان کا صفایا کردونگا
روہیلوں کی اتنی مجال نہیں ہو کہ وہ میرے مقابلہ پر ٹک سکیں۔
دوسری طرف انگریز اور تلنگوں کی فوج بریلی روانہ ہوگئی
یہ بارہ پلٹنیں تھیں جن میں کمپو کے سپاہی بھی تھے ۔ انگریزوں
نے کمر بندی کی اور تلنگے بھی غول باندھ کر ان کے ساتھ ہوگئے
اور اس وقت بریلی کی گلیوں میں یہی فوجی پھرتے نظر آنے لگے۔
اس کے بعد انگریزی فوج بریلی سے روانہ ہو کر سنکھا ندی پر پہونچی۔
دو قاصد بریلی سے نواب غلام محمد کے پاس پہونچے اور انھوں نے
انگریزی فوج کی اطلاع ان کو دی ۔ نواب صاحب نے فوراً
دربار کیا اور اپنی فوج کے افسران کو اکٹھا کر کے
فرنگیوں کی خبر سنائی پھر کہنے لگے میں اشرفیوں کے چھٹے
بانٹوں گا لیکن اب میری عزت و آبرو بھی تمہارے ہاتھ ہے
عنبر خاں رسالدار نے روہیلہ سپاہیوں سے کہا ہم تو اب بغیر
لڑے نہیں مانیں گے ۔ نجو خاں سے بھی پوچھ لو ان کی کیا رائے ہے۔
نجو خاں نے کہا کہ ہم تو لڑنے کو بالکل تیار ہیں بس اب
خدا کا نام لے کر کمر بندی کر : کیوں کہ اب دشمن سر پر آگیا ہے
تلواروں کو صیقل کر لو اور گھوڑوں کو دانہ دے کر تیار کر لو ۔
آج بہت بھاری رن ہوگا اس لئے اپنی کمریں کس کر تیار رہو۔
ایسا نہ ہو کہ رات کو گورے شبخون ماریں اور ہمارے گھروں کی
خواری کر دیں اسی وقت جمعدار تو لعنت دے گا اور رعایا ہماری
بے خبری پر تالی بجائے گی ۔ اب تو ہم نے یہی فیصلہ کر لیا ہو کہ ماریں گے اور مر جائیںگے

اور پھر

لو دھندوں میں مصروف

ش میں متعدد گھریلو صنعتیں قائم ہیں۔ ان کی
کو عالمگیر شہرت حاصل ہو اور دنیا کے ہر
ن کی مانگ ہو۔ اترپردیش کے لاکھوں رہنے والے
کسی نہ کسی صنعت میں لگے ہوئے ہیں اور یہی
ار ہے۔ ان صفحات پر کچھ صنعت کاروں کی
ی جا رہی ہیں۔ جو اپنے کام میں مصروف ہیں

وارانسی کی صنعت تارکشی دور دور مشہور ہے۔ تصویر میں کچھ لڑکے،
جنھیں بچپن ہی میں اس صنعت کی تربیت مل چکی ہو، تارکشی کر رہے ہیں۔

لکھنؤ میں عورتیں چکن کا کام کر رہی ہیں

ایک پکچر تانبے کے برتن پر
مرادآبادی نقش نگار کا کام کر رہا ہے
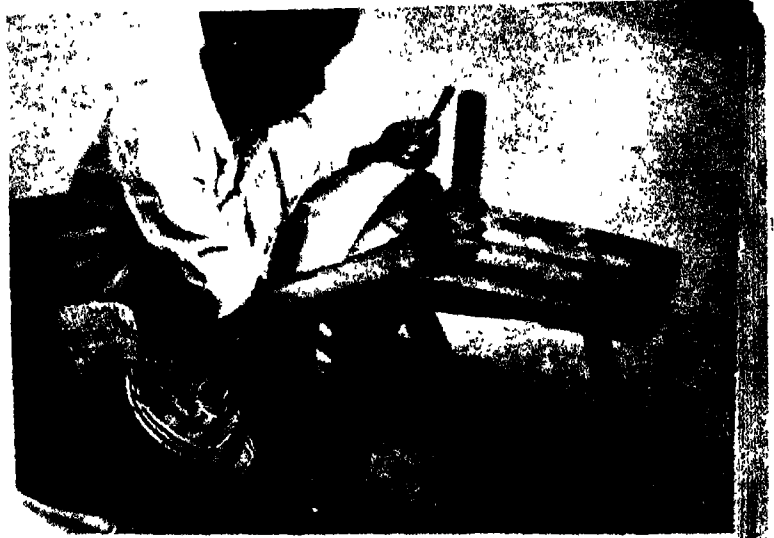
الموڑہ میں خوا
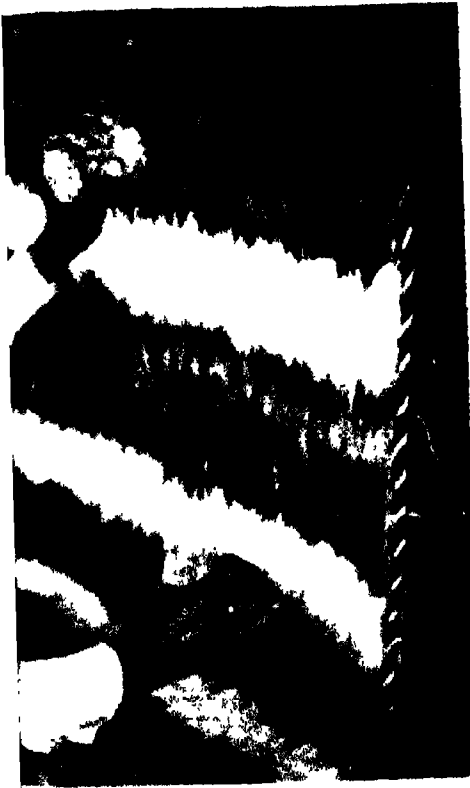
مرزاپور میں قالین سازی کا کام ہو رہا ہے

خورجہ کے مشہور برتن
تیار ہو رہے ہیں.

میرٹھ میں کافی لوگ کھیل کود کا
سامان تیار کرنے لگے ہیں

علی گڑھ میں قفل بنائے جا رہے ہیں

آگرہ میں سیکڑوں آدمی جوتے بنانے کا پیشہ کرتے ہیں

تلی فوج کھیتوں میں ٹھاڑی بھشتی پانی پیا دے
توپ شتابی پیچئے (پھٹنے لگی) لاگی چھوٹن لاگے گولے
گئے جیں سے لاگ روہیلے اوپر برسیں گولے
جب ہی شتابی کھالی دیکھی پینٹ پڑی اسواری
گئے پیٹری کاٹ روہیلے گوروں مکھ پر پہونچے
گورے کیا تلوار چلا دیں توپن کے بل پھرتے
بنو خاں تارا سا ٹوٹا کچھ جا کے دے کچھ واکے دے
کرتا پھرتا ریلا کا پیلا
لاکھوں لوگ تماسا دیکھیں بنو خاں رن کھیلا
رمجی فرنگی یوں اٹھ بولا سن بنو خاں بانکے
(کپتان رامزی)
تیری جان بخش دے میں کروں معاملہ تیرا
بنو خاں نے ایک نہ مانی مار کے لاس بکھیری
جنرل کرمبٹی سر دے مارا کٹا ہمارا بھائی
(جنرل ایبرکرمبی)
کیا حکم دے کمپنی کو کپور ہا چوتھیائی
کلکتا (کلکتہ) لڑتے آئے اور یہاں لڑائی ہارے
سنکھا ندی پر بنو خاں نے مارے
ایک فرنگی لنگڑا رہ گئیو اس نے مہریں
بہت بکھیریں
روہیلے ٹوٹے مہرن (اشرفیاں) پر نباب رہ گئے اکیلے
بنو خاں کے گولہ لاگو دلیر خاں کی کائی (غداری)
جیتی لڑائی بنو خاں ہارے
سمرئی سیتا رام کو (یاد کرو)

روہیلہ فوج بھی تیار ہو کر مقابلہ پر آگئی بھشتی پانی پلانے لگے
توپوں میں شتابیاں پڑنے لگیں اور گولہ باری ہونے لگی
گولوں سے بچنے کے لئے روہیلہ فوج زمین سے لگ گئی اسی وقت
کسی وجہ سے توپیں چھوٹنا بند ہوگئیں اور روہیلوں کو موقعہ ملا
وہ کاوہ کاٹ کر گوروں کے سر پر جا پہونچے گورے تلوار
چلانا کیا جانتے وہ تو توپوں کے بھروسے پر رہتے تھے۔
بنو خاں بجلی کی مانند ٹوٹ پڑا کبھی یہاں کبھی وہاں۔
اسی طرح اس نے انگریزی لشکر میں ابھل ڈال دی لاکھوں
لوگ بنو خاں کی لڑائی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔
کپتان رامزی نے عاجز ہو کر بنو خاں سے کہا کہ اگر تم
میری جان بخش دو تو میں صلح کی کوشش کروں لیکن
بنو خاں نے نہ سنی اور اس کو قتل کر کے چھوڑا جنرل
کرمبی نے جب یہ دیکھا تو اس کا دل ہل گیا اب وہ
فوج کو کیا حکم دیتا کیونکہ تین چوتھائی فوج قتل ہو چکی تھی
اس کو یہی افسوس تھا کہ کلکتہ سے اب تک ہماری فتح ہوئی
اور یہاں سکھا ندی پر بنو خاں سے ہم ہار گئے۔ اسی وقت
ایک لنگڑے انگریز نے توپ میں اشرفیاں بھر کر چھوڑیں
روہیلے اشرفیوں پر ٹوٹ پڑے اور نواب اکیلے رہ گئے
انگریزی فوج نے دوبارہ گولہ باری شروع کر دی اور بنو خاں
کے گولہ لگا۔ دلیر خاں کی غداری سے بنو خاں جیتی ہوئی
لڑائی ہار گئے۔

یاد کرو سیتا رام کو

ایک رات کی بات

مسیح الحسن رضوی

فلیٹ کے دوسرے حصہ میں ہر وقت دھاچوکڑی مچی رہتی۔ اس دن اوشا جب اسکول سے لڑکیوں سے مغز مار کر لوٹی تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ برابر کے حصہ میں طوفان بدتمیزی مچا ہوا تھا۔ روز کی طرح بچوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ زور زور سے میز پیٹ رہے تھے۔ بے ہنگم آوازیں نکال رہے تھے "سی، اے، ٹی، کیٹ — کیٹ معنی بلی۔ آر، اے، ٹی۔ ریٹ، ریٹ معنی چوہا...... دل ہے میرا تیرے پنجے میں تو کیا ہوا.. "پھر اوشا سے نہ رہا گیا اس نے اپنے کمرے کے دروازوں کو بند کر دیا۔" اے بھگوان ان پڑوسیوں سے نجات دے دے مالک میرے۔"

نسبتاً آوازیں آنا کم ہو گئی تھیں، مگر اوشا کے دماغ پر ہتھوڑے چل رہے تھے "دل ہے میرا تیرے پنجے......" اس نے سوچا یہ پڑوس والی عذرا بھی عجیب حماقت ہے۔ اتنے بچے پیدا کر ڈالے ہیں کہ بھگوان ہی سمجھے۔ پھر نہ ان کی تربیت کا خیال، نہ دوسروں کی راحت کی فکر، شکایت کرو تو الٹی برا مانتی ہے۔ اس سے زیادہ اس کی ساس برا مانتی ہے۔ وہ اپنے گول گول دیدے نکال کر اسے گھورتی ہے۔ "ہمارے بچوں سے جو جلے تو خدا ہی اسے سمجھے گا۔" اتنا کہہ کر وہ زور زور سے اپنی تسبیح کھٹکھٹانے لگتی ہے۔ اوشا لاجواب ہو کر رہ جاتی ہے اور اپنے شوہر سے مکان بدلنے پر زور ڈالتی ہے پر مکانوں کی جو قلت ہے اس سے وہ بھی واقف ہے۔ اس لئے وہ صبر سے کام لیتی ہے

اور پڑوس کے رہنے والوں کو عقل سلیم عطا کرنے کی خدا سے دعائیں مانگنے لگتی ہے۔ پھر اسے عذرا سے محبت بھی تو ہو گئی ہے۔ یہ اٹھائیس سالہ عذرا جس نے گذشتہ بارہ برس میں چھ عدد بچے پیدا کر ڈالے ہیں — اُف بھگوان — دوسری طرف کے کمرے میں عذرا کے بچے برابر انگریزی کے حروف ہجی کی مشق کر رہے تھے۔ سی، اے، ٹی، کیٹ .... معنی بلی پھر ایک دم سناٹا سا ہو گیا۔ یہ سناٹا کوئی لمحہ بھر رہا۔ پھر بہت ہی زور سے ایک دھماکہ ہوا۔ ایسا معلوم پڑا کہ جیسے یہ بلڈنگ مع اپنے مکینوں کے گر جائے گی۔ اوشا نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ وہ انگلیاں دیئے کانوں میں بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی نے اس کے دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ دھب، دھب، دھب۔ "موسی دروازہ کھولو موسی۔" اس نئی مصیبت نے تو اوشا کے اوسان ہی خطا کر دیے۔ وہ تھوڑی دیر سناٹے میں بیٹھی رہی۔ کیا کرے، کیا نہ کرے کہ باہر سے دروازے کو اور زور سے پیٹنا شروع کر دیا گیا۔ "موسی، موسی، موسی —"

اوشا کھڑی ہو گئی۔ اس نے چہرہ پر مصنوعی غصہ پیدا کیا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ عذرا کا بڑا لڑکا منہ پر کالک تھوپے ہونٹوں کو لال کئے کھڑا تھا اس کے پیچھے اس کے دوسرے بھائی بہن کھڑے تھے۔

"نکل جاؤ —" وہ زور سے چلائی اور بچے بالکونی کے پتھر کے فرش پر تیزی سے بھاگتے ہوئے اپنے کمرہ میں جا گھسے۔ دوسری طرف سے عذرا اور اس کی ساس کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ "ناشدنی، مردود،

کم بخت مرتے بھی نہیں ہائے ہائے شیشے کا جگ توڑ دیا۔"

ادشا ہولے سے مسکرا دی۔ بچے زور سے دھاڑے۔ ان سب نے مل کر اونچی آوازوں میں رونا اور چلانا شروع کر دیا۔ ادشا کے چہرہ پر کرب کے آثار پیدا ہوئے۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتی تھی یہ تو روز کا معمول تھا۔ بچے شور مچاتے، راہ گیروں پر ڈھیلے چلاتے، کنکوے لوٹتے اور پھر ماں کی مار کھاتے اور دادی کا ڈلار اس وقت پھٹ پڑتا۔ وہ چیل کی طرح بہو پر جھپٹتی اور سب بچوں کو اپنے پروں میں سمیٹ کر بیٹھ جاتی۔ پھر بچوں کا باپ تھکا ہارا دفتر سے لوٹتا، اور بچے جو غلیل لئے بالکونی پر کھڑے ہوتے پھر مار کھاتے۔ دن میں کئی کئی بار کی مار اور دھتکار نے ان سب کو بے حیا او نکما بنا دیا تھا۔ ان کی ڈھٹائی پوری بلڈنگ میں ضرب المثل بن گئی تھی۔

ادشا کر ہی کیا سکتی تھی۔ یہ تو نوشتۂ تقدیر تھا جس سے نجات کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ابھی ایک معرکہ تو اور ہونا باقی تھا۔ جب وہ ناشتہ کر کے اپنے دو بچوں اور شوہر کو ساتھ لے کر سیر کے لئے نکلے گی تو عذرا کے فلیٹ میں ایک ہنگامہ اور ہوگا بچے اپنی ماں سے سیر کا تقاضا کریں گے ماں باپ کو طعنہ دے گی۔ دن بھر کا تھکا ہارا باپ پاگل کتے کی طرح پہلے بچوں پر اور پھر بیوی پر جھپٹ پڑے گا۔ "سیر کو جاؤ گے مردودوں۔ یہ لو یہ لو" اور اتنا کہہ کر وہ بچوں کو روئی کی طرح دھنک کر ڈال دے گا اور جب ادشا سیر سے واپس ہوگی تو عذرا کے فلیٹ میں موت کا سناٹا ہوگا۔ "اے بھگوان عذرا دیدی اتنی اچھی، اتنی خوبصورت ہیں پر ان بچوں اور شوہر نے ان کی زندگی نرک بنا دی ہے۔ اے بھگوان"۔ اتنے میں اسکے بچے مانٹیسوری سے واپس آ گئے۔ اس نے ان دونوں بچوں کا منھ دھلایا، ناشتہ کرایا اور سیر کے لئے تیار کر دیا۔ جب ہنستا اور مسکراتا شوہر واپس آیا تو ادشا کی آنکھوں میں مسرت اور آسودگی کی چمک آ گئی۔ وہ ذرا دیر پہلے کے طوفان بدتمیزی کو بھول گئی اور سب سیر کے لئے نکل گئے۔

جب یہ قافلہ سیر سے واپس آیا تو خلاف معمول عذرا کے گھر میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ شوہر بالکونی پر منھ لٹکائے کھڑا ہوا تھا اور کمرہ سے نسوانی آوازیں آ رہی تھیں۔ ادشا تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھی۔ کیا بات ہے، بھائی جی اس نے مشترکہ بالکونی پہ پہونچکر عذرا کے شوہر سے دریافت کیا مگر وہ خاموش رہا۔ اس نے صرف ہاتھ سے کمرہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ ادشا ذرا دیر متامل کھڑی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر عذرا کے فلیٹ کی طرف مڑ گئی۔ پہلے کمرہ میں بچے سہمے سمٹائے بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کا منھ خوف سے تاکے جا رہے تھے۔ انھوں نے ادشا کی طرف بھی خوف زدہ آنکھوں سے تاکا۔ اب صورتِ حال ادشا کی سمجھ میں آئی۔ کیونکہ دوسرے کمرہ کے دروازہ پر اسے ایک سفید پوش نرس نظر آئی۔ جب وہ کمرے کے اندر پہونچی تو عذرا انڈھال اپنے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ ساس اس کے اوپر جھکی ہوئی کوئی دعا پڑھ رہی تھی۔ عذرا کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ ادشا کچھ دیر کمرے میں کھڑی رہی۔ اب صورت حال پوری طرح اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ ہائے بیچاری عذرا دیدی۔ کسی طرح نجات ہی نہیں پاتیں۔ تو جیل میں آیا، ہا! بیچاری!!

لیکن اس بار کوئی آیا نہیں تھا سبحان رستے ہی سے رخصت ہو گیا تھا۔ عذرا کے فلیٹ سے جب ادشا اپنے فلیٹ پر پہونچی تو شوہر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ بچے کپڑے اتار کر میز پر بیٹھے ڈرائنگ بنا رہے تھے۔ ادشا نے اشارہ سے عذرا کی بپتا سنائی۔ شوہر بھی ایک بار سناٹے میں آ گیا۔

"ابھی تو کچھ دن ہی کی بات ہے ——"

"ہاں کچھ ہی دن کی بات تو تھی جب عذرا کے یہاں ولادت ہوئی تھی۔ ایک مریل، منحوس صورت لڑکی۔ جو چھ مہینے دنیا کی ہوا کھا کر، ماں باپ اور اس سے زیادہ دادی کو رلاتی ہوئی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اب اسکے کچھ ہی دنوں بعد، ادشا کو پتہ بھی نہیں چلا کہ یہ آفت آن کھڑی ہوئی۔ برابر کے فلیٹ سے ابھی تک آوازیں آ رہی تھیں۔ کھانسنے کی آوازیں، کراہنے کی آوازیں اور ہلکے ہلکے بولنے کی آوازیں۔ اچانک ادشا کو خیال آیا کہ عذرا کے بچوں اور شوہر نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ کیونکہ جب وہ جا رہی تھی تو چھ ہی بجے تھے۔ عذرا اور اس کی ساس کھانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ دن بھر کی تکان نے اب اسے چور چور کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ بچوں سے جا کر کھانے کو پوچھے یا ٹال جائے اس نے سوچا کہ شوہر سے مشورہ کرے، مگر اسے فوراً خیال آیا کہ شوہر ٹال جانے کا مشورہ دے گا۔ بھلا اتنی رات گئے کھانے کا انتظام کیونکر ممکن ہو سکے گا۔

یہ سوچ کر وہ الٹے پاؤں فلیٹ کی طرف لوٹنے لگی۔ شوہر نے اسے واپس ہوتے ہوئے دیکھا تو دریافت کیا کہ کہاں چلیں۔

"عذرا دیدی کے بچوں نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ ذرا دیکھتی آؤں۔"

شوہر نے جاتی ہوئی اوشا کو محبت کی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کی اس افتادِ طبع سے، اس کے مزاج سے، اس کے اخلاق سے پوری طرح واقف تھا۔ گو اس نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ دل ہی دل میں اوشا کے کردار کے اس پہلو کا پرستار تھا۔

پہلا کمرہ بچوں ہی والا تھا۔ سب بچے ایک پلنگ پر سہمے [illegible] خوف زدہ بیٹھے ہوئے تھے۔ باپ ایک بید کے مونڈھے پر [illegible] خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ [illegible] کے اندر گئی۔ اس نے شوہر [illegible] نہیں کیا۔ وہ سیدھی بچوں کے پاس پہونچی۔ "چلو اٹھو آؤ ہم سب چل کر کھانا کھائیں آپ بھی چلئے بھائی جی۔"

عذرا کے شوہر نے ذرا تامل کیا۔ وہ اپنے مونڈھے پر کسمسایا۔ بچوں نے بھی باپ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ابھی تک خوف زدہ تھے۔

"اٹھو جلدی کرو۔" اوشا نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ اتنے میں ڈھائی تین سال کا سب سے چھوٹے سے بڑا لڑکا زور سے دھاڑا۔ "ہمیں بھوک لگی ہے۔"

عذرا کا شوہر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو اوشا دیدی"

عذرا کے تین سالہ بچہ کو گود میں اٹھائے اوشا سب مہمانوں کو لیکر اپنے فلیٹ میں آگئی۔ اس کا شوہر عذرا کے شوہر کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آئیے حنیف صاحب۔" حنیف صاحب، کچھ افسردہ، کچھ شرمندہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے اوشا سے تین سالہ لڑکے کو لے کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ سب سے چھوٹا اور سب سے کھوٹا بچہ دادی کے پاس سوتا فلیٹ میں رہ گیا تھا۔

حنیف اور اوشا کا شوہر تقریباً ہم عمر تھے۔ ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ ایک ہی گریڈ تھا۔ لیکن دونوں کی زندگیوں میں بڑا فرق تھا۔ اوشا انٹرمیڈیٹ پاس کر کے ایک اسکول میں ملازم تھی اور اس طرح گھر کی آمدنی بڑھانے میں حصہ دار تھی۔ اس کے برعکس عذرا تھی۔ جس نے اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو بی۔ اے کر لیا ہوتا۔ اب محض بچے پیدا کرتی تھی اور اپنی قسمت کو روتی تھی۔ حنیف کو زندگی کے اس فرق کا کبھی

اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ عذرا کو اور اس سے پیدا ہونے والے بچوں کو خدا کی دین سمجھتا اور اپنے حالات پر قانع تھا۔ مگر جب وہ آج ایک جذباتی انسان کے روپ میں اوشا کے گھر آکر بیٹھا اور اس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے پراٹھے کھائے تو زندگی کے اس بین فرق کو وہ سمجھے بغیر نہ رہ سکا۔ صاف ستھرا کمرہ، اوسط درجے کا ریڈیو سیٹ اور صوفے، بجلی کا پنکھا، صاف ستھری مسہریاں، کھونٹیوں پر قرینے سے ٹنگے ہوئے کپڑے اور الماریوں میں کتابیں اور رسالے۔ اس کا اپنا یہ حال تھا کہ اگر کبھی عذرا نے کسی رسالے کے منگوانے کا تقاضا بھی کیا تو اس نے بڑا سا منہ بنا کر ٹال دیا۔ پھر اس کے اپنے بچے خدا کی پناہ اتنے ڈھیٹ، اتنے نکھٹو کہ سارے علاقہ کے لوگ پناہ مانگتے تھے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ وہ اوشا کے دو بچوں کو دیکھ کر سوچتا رہا جو کھانا کھانے کے بعد اب میز پر بیٹھ کر پھر ڈرائنگ بنانے لگے تھے۔ اوشا نے حنیف کی الجھنوں کو بھانپ لیا۔ اس نے آہستہ سے ریڈیو کی گھنڈی گھما دی۔ کہیں دور کے دیس سے بڑی پیاری دھن میں ہوا کے دوش پر سوار ستار کی گت اس کے کانوں میں گھلی جا رہی تھی۔ اس نے احسان مندانہ نظروں سے اوشا کو دیکھا اور جانے کی اجازت مانگی۔

جب وہ اپنے کمرہ میں واپس آیا تو زندگی کا یہ فرق اور نمایاں ہوگیا۔ اس کی ماں اس کی بیوی پر برابر دعائیں دم کئے جا رہی تھی۔ سب سے چھوٹا اور کھوٹا بچہ ایک میلے سے گدے پر پڑا سو رہا تھا۔ اس کا پیٹ خراب تھا جس کی وجہ سے وہ سوتے میں برابر منہ بسورے جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس بچہ کو ٹھیک سے غذا نہیں ملتی ہے۔ جب ہی تو یہ سوکھ کر کانٹا ہو رہا ہے۔ دوسرے بچے تو [illegible] اچھے ہیں۔ سب کی صحتیں خراب غذا کی کمی کے مارے۔ [illegible] اور پھر ماں ہے اس کی صحت بھی کون [illegible] ہے اور اسے وہ دن یاد آگئے جب عذرا کی شادی کو ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ سرخ بھبوکا گال، آنکھوں میں جوانی اور صحت کی چمک، بات بات پر ہنسنا، قہقہے لگانا اور اب یہ حال ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو رو دیتی ہے۔ خون کی کمی نے چڑچڑا کر دیا ہے اور ان سب پر مستزاد سال کے سال ولادت۔ ماں کوئی دعا دم کر کے، اپنے پلنگ پر جا بیٹھی تھی اور اپنے گول گول دیدوں سے سارے فلیٹ کو گھورے جا رہی تھی۔ اس بیچاری نے بھی کون سے اچھے دن دیکھے تھے۔ بیوگی

اپنے لڑکے کو پالتے تعلیم دیتے بیت گئی اور اب بڑھاپا قسمیں کھاتے اور بہو پر دعائیں دم کرتے بیتا جا رہا ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جو اوشا میں ہے اور عذرا میں نہیں۔ حنیف میں نہیں اور سکینہ میں ہے؟ وہ بڑی دیر تک اس سوالیہ نشان پر غور کرتا رہا۔

بچے سو گئے۔ ماں بھی گرما گرمی مار کر بہو کے پائنتی سو گئی اور وہ سوچتا رہا۔ جب پاس کے گھڑیال کا ایک کا گھنٹہ بجا تب بھی وہ جاگ رہا تھا اور جب اس نے دو کا گھنٹہ بجایا تب بھی وہ چونک کر، جاگ پڑا اور پھر بڑی دیر تک جاگتا رہا۔ کئی بار بچوں کو اٹھا اٹھا کر پانی پلایا۔ باپ کی شفقت سے برسوں بعد، انھیں پچکارا اور ان کے سروں کو تکیوں پر رکھا ایک بار وہ چپکے سے اٹھا اور عذرا کے کمرہ تک بھی ہو آیا۔ اسے جھک کر دیکھتا رہا۔ ایک بار اس کی پیشانی چومنے کا خیال، ایک بے پناہ خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ وہ جاگ جائے گی وہ اپنے کمرہ کو لوٹ پڑا۔ راستے میں اس نے اس کے کراہنے کی جب آواز سنی تو اس کا دل بے چین ہو گیا۔ شاید عذرا نے غیر شعوری طور پر اس کی آمد کا احساس کر لیا تھا اور وہ جاگ گئی تھی۔ گھڑیال نے ٹن ٹن ٹن پانچ بجا دیئے وہ اپنے کمرہ میں کھڑا رہا۔ پھر جب وہاں دل نہیں لگا تو بالکونی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اوشا جاگ گئی تھی اور وہ بھی بالکونی میں کھڑی انگیٹھی سلگا رہی تھی۔ "نمستے بھائی جی، دیدی کیسی ہیں؟" اوشا نے حنیف کی طرف محبت اور ہمدردی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"رات کو سوتی رہیں غالباً اچھی ہی ہوں گی۔" اس نے جواب دیا۔

"میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔"

حنیف کا سر عقیدت سے ایک بار پھر جھک گیا تو اوشا اتنے صبح عذرا کے خیال سے اٹھ گئی تھی۔ غریب اوشا اسے تو دن بھر لڑکیوں سے منہ مارنا ہے۔ شوہر کے لئے کھانا تیار کرنا ہے۔ بچوں کو اسکول بھیجنا ہے۔ وہ وہاں کھڑا یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ اوشا بیئرے گل کی طرح غائب ہو گئی۔ وہ کمرہ میں پھر لوٹ آیا۔ بچے ابھی تک پڑے سو رہے تھے وہ رات کو دیر تک جاگے تھے۔ اُن کے سروں پر دھول تھی، جن پر بالوں کی جھاڑ گردن تک پڑی تھی۔ پیر گندے اور میلے تھے۔ ہاتھ کے ناخنوں میں دنیا بھر کی گندگی بھری ہوئی تھی۔ ان کی ناقدری پر اس کا دل بھر آیا۔

ان سب باتوں کا ذمہ دار کون تھا؟ وہ خود یا ان کی ماں یا دادی؟ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس لئے وہ کسی کو بھی ان سب باتوں کا ذمہ دار نہ ٹھہرا سکا۔ پھر کون ذمہ دار تھا؟ یہ سوال ابھی اس کا دماغ حل بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اوشا ٹرے لئے سامنے آن کھڑی ہوئی اس نے ایک پیالی چائے اس کے ہاتھ میں دے دی اور بغیر کچھ کہے سنے عذرا کے کمرہ کی طرف بڑھ گئی۔

اور جب اوشا دس بجے کے قریب عذرا کے سر میں تیل ڈال کر اور کنگھا کر کے اپنے اسکول جا رہی تھی تو اسے یقین ہو گیا کہ اب سب خیریت ہے۔ کیونکہ باپ کے دفتر جانے کے بعد بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ بڑا لڑکا اسکول جانے کی تیاریاں کر رہا تھا اور زور زور سے "لیلیٰ کرے گا مجنوں سے نہیں ڈرے گا۔" گا رہا تھا اور اسکے ساتھ دوسرے بچے بھی سُر سے سُر ملا کر گا رہے تھے۔ "بوٹ پالش کرے گا۔" اوشا ہونے سے مسکرا دی اسے عذرا کی بیماری کا خیال آیا پر وہ اب کر ہی کیا سکتی تھی۔ اسکول پہونچنا بھی تو ضروری تھا۔ اوشا نے سوچا کہ اگر یہی لیل و نہار رہیں تو عذرا دیدی شام تک پھر بیمار پڑ جائیں گی اور واپس آنے پر اس کے سر میں درد شروع ہو جائے گا، جس کے دور کرنے کے لئے اسے دوا کھانا پڑے گی اور بچوں کی سیر کا پروگرام ملتوی ہو جائے گا اسے بھگوان وہ کہاں چلی جائے؟ لیکن اس خیال کو اس نے فوراً دور کر دیا اور عذرا کا مرجھایا ہوا چہرہ پھر اس کے سامنے آ گیا۔ یقیناً عذرا کی مشکلات اسکے مقابلہ میں دہ چند تھیں۔

دفتر میں حنیف کا دل بالکل نہیں لگا۔ رات کے واقعات نے ایک بار اس کو خواب سے جیسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی مشکلات کا حل کھوجتا رہا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ اس نے شروع سے ہی زندگی کو غلط ڈھرے پر ڈال دیا ہے۔ جس کو بدلنے کی اس میں اب ہمت نہیں۔ اتنے غدار شہر دلی میں وہ رہتا ہے اور اسے اب تک اس کا علم نہیں کہ قطب کہاں ہے؟ مہرولی کہاں ہے؟ جامع مسجد کا اُردو بازار، بلی ماران اور فتحپوری ان ہی چند جگہوں کو وہ دلی سمجھتا ہے یا پھر دفتر جاتے ہوئے کناٹ سرکس سے وہ سائیکل پر گزر جاتا ہے اور بس۔ اس طرح اس نے اپنے کو بالکل ہی محدود کر دیا ہے جس کی وجہ سے زندگی سے اس کی دلچسپیاں ختم ہو گئی ہیں

وہ کولہو کا بیل ہے جو آنکھوں پر اندھیری لگائے گھومے جا رہا ہے۔
اپنے مستقبل اور منزل سے بے خبر۔

جب وہ شام کو دفتر سے لوٹا تو عذرا اپنی خفیف آواز میں تکیہ پہ لیٹی اوشا سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اوشا کھڑی ہو گئی۔

"آئیے بھائی جی میں چلی۔"

اتنا کہہ کر اوشا تیزی سے اپنے فلیٹ کو لوٹ گئی۔ حنیف بہت دیر تک عذرا سے بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ برسوں بعد آج اس نے عذرا کو ایک انسان کی حیثیت میں جانا تھا اور اس سے رفاقت کی باتیں کی تھیں۔ اس کی ماں تخت پر بیٹھی کھٹا کھٹ تسبیح پڑھ رہی تھی اور بہو کی صحت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اسے اپنے پوتے کے ضائع ہو جانے کا بڑا دکھ تھا — بڑا صدمہ کہ اس جنم جلی دکھیاری بیوہ کا حنیف اکلوتا لڑکا تھا۔

پھر ان واقعات کو پندرہ دن گزر گئے۔ فلیٹ میں عذرا کے بچوں کا شور، دھا چوکڑی اور دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ اوشا کو سر کے درد کو دور کرنے کے لئے دوا کی ضرورت پیش آنے لگی۔ عذرا ایک بار سنبھل کر پھر اسی راہ پر چل پڑی کہ اوشا نے ایک دن اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے شرم اور مروت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ "دیدی بہت ہوا، اب نہیں دیکھا جاتا۔"

عذرا نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا نہیں دیکھا جاتا اوشا؟"

اوشا ہولے سے مسکرا دی۔ "مجھے بتلانے کی ضرورت ہے؟"

عذرا نے شرما کر اپنا سر ایک طرف جھکا دیا۔ "تم میری بات مانو دیدی اپنے اوپر رحم کرو۔ بھائی جی کو بھی سمجھاؤ۔"

عذرا نے پھر اوشا کی طرف حیران نظروں سے دیکھا اور پھر دونوں زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اور بوڑھی ساس نے تسبیح کے دانوں کو تیزی سے گھمانا شروع کر دیا۔

"اے رب العزت اوشا سے میرے پوتی پوتا نہیں دیکھے جاتے۔ وہ انھیں ہونستی ہے یا اللہ میرے بچے کی جوانی، بہو کی کوکھ پر رحم کرنا۔"

دونوں سہیلیاں برابر ہنسے جا رہی تھیں۔

اور بوڑھی ساس مصلے پہ بیٹھے بیٹھے زور زور سے دعائیں مانگنے لگی۔ "اے رب العزت اے دکھیاروں کے سہارے ..."

اسی دن شام کو عذرا ایک نئے عزم سے اوشا کے ساتھ اپنے بچوں کو لے کر سیر کے لئے نکلی۔ اس کا شوہر دور تک اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا۔

✡

تُلسی داس اور رامائن

پرتاپ چندر آزاد

ہندی کے شاعرِ اعظم تُلسی داس جی سمبت ۱۵۸۳ یا ۱۵۸۹ وکرمی میں مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اُن کے گرو سوامی نرہری نند تھے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اُن کی شادی ہو گئی۔ انھیں بیوی سے بڑی محبت تھی مگر کہا جاتا ہے کہ ایک دن بیوی کے ایک جملہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ گھر بار چھوڑ کر باقی زندگی رامچندر جی کی بھگتی میں صرف کر دی۔ ایودھیا میں اُنھوں نے سمبت ۱۶۳۱ کو رام نومی کے دن رام چرت مانس لکھنا شروع کیا اور دو برس سات مہینے چھبیس دن میں اُس کی تکمیل ہوئی۔ رام چرت مانس کے علاوہ، ونے پتریکا، گیتاولی، کویتا ولی، دوہاولی وغیرہ تُلسی داس کی دوسری مشہور تصانیف ہیں۔ تُلسی داس جی فارسی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ سمبت ۱۶۸۰ وکرمی کو اُنھوں نے وفات پائی۔

ہندی شعرا میں تُلسی داس کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو فارسی میں فردوسی اور نظامی کو حاصل ہے۔ ان کی بہترین تصنیف "رام چرت مانس (رامائن)" ہے جس کا مقابلہ ہم فردوسی کے شاہنامہ سے کر سکتے ہیں۔ رام چرت مانس کا ترجمہ دنیا کی قریب قریب سبھی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ کئی اُردو شعرا نے بھی رامائن کے بعض کرداروں کو نظم کیا ہے۔ چکبست نے "رامائن کا ایک سین" کے عنوان سے شری رام چندر جی کی بن واس یاترا کو نہایت ہی رقت آمیز لہجہ میں نظم کیا ہے۔ اسی طرح حضرت سرور جہان آبادی نے بھی رامائن کے کئی کردار نظم کیے ہیں۔ انقلاب وطن میں "راون کی لکشمن کو نصیحت" کے عنوان سے ایک سین نہایت موثر پیرایہ میں نظم کیا گیا ہے جس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

میں بُرائی چھوڑنے پر آجکل کرتا رہا — اور بدی کی راہ پر ہر ایک پل کرتا رہا
کل کبھی آیا نہ میری وہ بُرائی جا سکی — میری فطرت میں نہ دنیا کی بھلائی آ سکی
اپنے دشمن کو نہ سمجھو یہ کبھی چھوٹا سا ہے — جو سمجھتا ہے اُسے یہ واقعی دھوکا سا ہے
میں نے سمجھا رام کو وہ ہیں مرے دشمن حقیر — بس یہی دوں گا انھیں دن پھیر میں ہیں یا کہ تیر
کیا ہوا انجام وہ تاب و تواں پا تے رہے — اور ہم ناکام ہی دُنیا سے چل جاتے رہے

تُلسی داس کی شاعری کا عروج شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہوا۔ یوں تو اُن کی اور بھی تصانیف ہیں مگر ان کی شہرت کا باعث رام چرت مانس ہے۔ رام چرت مانس جس زبان میں لکھی گئی ہے وہ اودھی ہے اور اُس کا انداز بہت سلیس ہے۔ اسی لئے شہر اور دیہات ہر جگہ مقبول عام ہے۔ اس کتاب میں شری رامچندر جی کی پیدائش سے لیکر اُن کی وفات تک کے حالات کو نہایت موثر اور دل کش پیرایہ میں نظم کیا گیا ہے۔ کتاب کئی حصوں میں منقسم ہے اور ان حصوں کو "کانڈ" کہا جاتا ہے جس کا ترجمہ اردو میں لفظ "باب" سے کیا جا سکتا ہے۔ پہلا کانڈ (باب) بال کانڈ ہے جس میں شری رامچندر جی کی پیدائش سے لے کر ان کی شادی تک کے واقعات نظم کئے گئے ہیں۔ دوسرا

کانڈ (باب) ایودھیا کانڈ ہے جس میں شادی کے بعد سے لے کران کے بنواس تک کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ تیسرا کانڈ آرنیہ کانڈ ہے جس میں ان کے بنواس کے حالات نہایت ہی رقت آمیز لہجہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ چوتھا کشکندھا کانڈ ہے جس میں شری رامچندر جی کی ہنومان اور سگریو سے ملاقات کی داستان بیان کی گئی ہے۔ پانچواں سندر کانڈ ہے جس میں ہنومان جی کی مدد سے سیتا جی کی تلاش اور لنکا پر فوج کشی کے واقعات کا ذکر ہے۔ چھٹا باب لنکا کانڈ کے نام سے مشہور ہے جس میں لنکا کے راجہ راون پر رام چندر جی کی فتح اور لنکا کی تباہی اور سیتا جی کی رہائی کے واقعات نظم کئے گئے ہیں۔ ساتواں باب اُتر کانڈ کے نام سے مشہور ہے جس میں رام چندر جی کا بنواس کے ایام ختم کرکے اپنے وطن ایودھیا کو لوٹنے اور جشن تاجپوشی کے مناظر کو بیان کیا گیا ہے۔

تُلسی داس نے شاعری کو ایک مکالمہ کی شکل دی ہے۔ انھوں نے رامائن میں مختلف واقعات اور کرداروں کو ایک نئے اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے اس میں چوپائی اور دوہے کی بحریں استعمال کی گئی ہیں اور کتاب کے انداز بیان کو دیکھتے ہوئے یہی بحریں سب سے زیادہ موزوں تھیں۔ منظر نگاری کے ساتھ ہی دلچسپ تشبیہات اور استعارات کا حسین استعمال ان کی شاعری کی ایک خصوصیت ہے۔ انھوں نے معمولی مناظر کا نقشہ جس دلکش پیرایہ میں کھینچا ہے وہ دوسرے شاعروں کے کلام میں مشکل سے ملتا ہے۔ شری رامچندر جی بن میں ہیں۔ برسات کا موسم ہے اور وہ اپنے بھائی لکشمن سے اس کا بیان کر رہے ہیں ؎

बूँद अघात सहैं गिरि कैसे
खल के बचन सन्त सह जैसे

بُوند اگھات سہیں گِر کیسے
کھَل کے بچن سنت سہ جیسے

(پہاڑ موسم برسات میں آسمان سے گرتی ہوئی بوندوں کے حملہ کو اس طرح برداشت کر رہا ہے جیسے کہ نالائق آدمیوں کے کلمات بزرگانِ کرام برداشت کر لیتے ہیں اور ان کا جواب نہیں دیتے۔

दामिनि दमकि रही घन माहीं
खल की प्रीति जथा थिर नाहीं

دامن دمک رہی گھن ماہیں
کھَل کی پریت یتھا تھر ناہیں

(دامن بجلی کو کہتے ہیں اور یتھا تھر معنی مستقل ہونا مطلب یہ ہے کہ آسمان پر بجلی اس طرح چمک کر غائب ہو جاتی ہے جیسے نااہل اور بے اُصولے انسانوں کی دوستی ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔)

छुद्र नदी भरि चलि उतराई
जिमि थोरेइ धन खल बौराई

چھُدر ندی بھر چل اُترائی
جِم تھورے ہُ دھن کھل بَورائی

(چھُدر چھوٹی چیز کو کہتے ہیں اور کھل معنی نااہل۔ کہتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی ندیاں موسم برسات میں اپنے کناروں کے اوپر ہو کر اس طرح سے بہہ رہی ہیں جیسے کہ نااہل اور تنگدل انسان ذرا سی دولت پاکر ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اپنے برابر کسی دوسرے کو نہیں سمجھتے)

भूमि परत भा डाबर पानी
जिमि जीहिं माया लपटानी

بھوم پرت بھا، ڈابر پانی
جِم جیو ہیں مایا لپٹانی

(ڈابر معنی گندا۔ موسم برسات کا منظر بیان کرتے ہوئے تلسی داس فرماتے ہیں کہ برسات کا پانی زمین پر گرتے ہی گندا ہو جاتا ہے جیسے کہ انسان دنیا میں پیدا ہوتے ہی دُنیاوی باتوں میں پھنس جاتا ہے۔)

منظر نگاری میں تلسی داس نے جو کمال حاصل کیا ہے اُس کی متعدد

مثالیں رامائن کے ہر باب (کانڈ) میں پائی جاتی ہیں۔ اجودھیا کانڈ میں ایک جگہ سیتاجی، رامچندرجی کے ساتھ جنگل میں جانے کا اصرار کرتی ہیں اور رامچندرجی جنگل کے خوفناک مناظر کا نقشہ کھینچ کر انھیں وہاں جانے سے منع کرتے ہیں۔ تلسی داس نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

भालु, बाघ बृक केहरि नागा
करहें नाद सुन धीरज भागा

بھالو، باگھ، برک کیہری ناگا
کر ہیں ناد، سُن دھیرج بھاگا

(ناد معنی بھیانک آواز کے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جنگل میں شیر ریچھ اور باگھ جیسے بھیانک جانور موجود ہیں جن کی خوفناک آواز سن کر انسانوں کے دل دہلنے لگتے ہیں اور ان کے ہوش و حواس غائب ہو جاتے ہیں)

دوسری خصوصیت تلسی داس جی کی شاعری کی اُن کا فلسفہ ہے انھوں نے حیات و کائنات کے اہم مسئلوں کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سُلجھایا ہے جس سے ان کی قابلیت اور ان کے وسیع مطالعہ کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انسان کیا ہے' اس موضوع پر ایک جگہ رامائن میں تلسی داس جی کہتے ہیں۔

छिति जल पावक गगन समीरा
पंच रचित यह अधम सरीरा

چھِت ۔ جَل ۔ پاوَک ۔ گگن ۔ سمیرا
پنچ رَچِت یہ اَدھم سَریرا

(چھِت معنی خاک۔ جل معنی پانی پاوک معنی آگ۔ گگن معنی خلا اور سمیرا معنی ہوا۔ یعنی انسان کا جسم خاک۔ آب۔ آتش خلا اور ہوا کا ایک مجموعہ ہے۔)

وہ تقدیر کے بہت بڑے قائل تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ قانون قدرت دُنیا کے تمام قانون سے زیادہ برتر اور حاوی ہے۔ ان کا یہ

بھی خیال تھا کہ قدرت کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اسی خیال کو انھوں نے ایک دوہے میں بیان کیا ہے ؎

सुनहु भरत भावी प्रबल बिलखि कहेउ मुनि नाथ
हानि लाभ जीवन मरन जस अपजस विधि हाथ

سُنہُ بھرت بھاوی پربل بلکھ کہیو مُنی ناتھ
ہان۔ لابھ۔ جیوَن۔ مرَن۔ جس اپجس بدھ ہاتھ

(شری رامچندرجی کے گرو، بھرت سے ان کے والد بزرگوار کی وفات حسرت آیات پر فرماتے ہیں کہ اے بھرت دنیا میں قدرت کا لکھا ہوا کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ نفع۔ نقصان۔ زندگی اور موت شہرت اور بدنامی یہ تمام قدرت کے ہاتھ کی باتیں ہیں ان پر انسان کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے ان کے لئے رونا یا ملال کرنا بیکار ہے۔)

تیسری نمایاں خصوصیت تلسی داس جی کی شاعری کی پند و موعظت ہے۔ انھوں نے رامائن میں نصیحت کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے واقعی وہ اچھوتا اور بے مثال ہے جو کسی دوسرے ہندی شاعر کو نصیب نہ ہوسکا جنگل میں رامچندرجی کی سگریو سے ملاقات ہوتی ہے اور رامچندرجی سگریو کے اشارہ پر سگریو کے بھائی بالی پر تیر چلاتے ہیں اس وقت بالی رامچندرجی سے دریافت کرتا ہے ؎

मैं वैरी सुग्रीव पियारा
कारन कवन नाथ मोही मारा

میں بیری سُگریو پیارا
کارن کَوَن ناتھ موہی مارا

(اے رامچندرجی کیا سبب ہے کہ آپ نے مجھے ہلاک کیا۔ میں آپ کا دشمن اور سگریو آپ کو عزیز' یہ کیوں؟

بالی کے اس سوال کا جواب رام چندرجی یوں دیتے ہیں ؎

अनुजवधू भगिनी सुत नारी
सुनु सठ यह कन्या समचारी
इनहि कुद्राष्ट विलोकइ जेई
ताहि वधे कछु पाप न होइ

اَنُج وَدھو بھگِنی سُت ناری
سُن سَٹھ یہ کنّیا سمچاری
اِن ہی کُندرِشٹ بلو کے جیئی
تاہِ بدھے کچھُ پاپ نہ ہوئی

(انُج وَدھو معنی چھوٹے بھائی کی بیوی' بھگنی معنی بہن۔
سُت ناری معنی لڑکے کی بیوی۔ بالی نے اپنے چھوٹے بھائی سگریو
کی بیوی کو اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ اس کا حوالہ دے کر رامچندر جی
کہتے ہیں کہ اسے بالی چھوٹے بھائی کی بیوی' اپنی بہن' اور لڑکے کی بیوی
یہ تینوں اپنی لڑکی کے مانند ہیں۔ جو انسان ان میں سے کسی کو بُری نگاہ
سے دیکھتا ہے اس کو ہلاک کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔)
اسی طرح ایک مقام پر دوست۔ اور بیوی کے فرائض کے متعلق کہتے ہیں

धीरज धर्म मित्र अरु नारी
आपत काल परखिए चारी

دھیرَج' دَھرم' مِتر ارو ناری
آپت کال پَرکھئے چاری

(انسان کو مصیبت کے زمانے میں صبر اور فرائض کے ساتھ
ساتھ اپنے دوست اور اپنی بیوی کے امتحان کا بھی موقعہ ملتا ہے۔
یعنی اگر مصیبت میں انسان کے ساتھی دوست اور اس کی بیوی نہیں
تو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکامیاب ثابت ہوئے۔)
تلسی داس کی رامائن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں
معمولی پڑھے لکھے اور عالم و فاضل سب کیلئے فکر و نظر کا سامان مہیا ہے
اسی لئے وہ نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہات کے معمولی پڑھے لکھے لوگوں
میں بھی مقبول ہوئی۔ رام چرت مانس کا انداز بیان' فلسفہ' تشبیہات
واستعارات وغیرہ سے اگر خواص اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو تو
سلاست اور سادہ بیانی کے عوام اور پڑھے لکھے لوگ بھی
گرویدہ ہیں۔

✡

"دنیا نے بہت سے زبردست راجہ اور طاقتور بادشاہ پیدا کئے لیکن آج ان کا نام و نشان بھی
نہیں۔ برخلاف اس کے شاعر لافانی اور امر ہے۔ ہر زمانے میں اس کا چراغ فکر روشن رہتا ہے
اور حوادثِ دہر کا کوئی جھکڑ اسے بجھا نہیں سکتا۔ آج نہ غالب موجود ہے اور نہ اس کے ہم عصر
لیکن اس کا دیوان زندہ ہے اور تشنگانِ شعر کے ذوق کو نسلاً بعد نسل سیراب کر رہا ہے۔
جیسے جیسے دن گذرتے جا رہے ہیں غالب کی ذہانت اور اس کی فکر و نظر لوگوں پر آشکار ہوتی
جا رہی ہے۔ لیکن غالب کی عظمت سمجھنے کے لئے صرف کتابوں کی ورق گردانی ہی کافی نہیں
بلکہ اُس کی فکر کی رفعت اور جذبہ کی گہرائی تک پہونچنے کی بھی ضرورت ہے۔"

— گوپال ریڈی
وزیر امور اقتصادیات حکومت ہند

میر کا تصوف

شکیب رضوی سیتاپوری

اگر کسی بھی فنکار کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے اور اس کے خیالات کا تجزیہ کیا جائے تو ان حالات کا بھی جائزہ لینا پڑے گا جس کے زیر اثر اس کے فن پارے وجود میں آئے ہیں۔ کسی بھی شاعر کے کلام پر اظہار خیال کرتے وقت اس کے ماحول پر ضرور نظر رکھنی ہوگی کیونکہ اس کے خیالات کا ماخذ اس کا ماحول ہی ہوتا ہے اور شاعر کا کلام اس کے حالات سے اتنا ہم آہنگ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے ذکر کے بات نہیں بنتی یہ بات قریب قریب ہر دور کی شاعری میں پائی جاتی ہے اس طرح اگر ہم بحیثیت مجموعی میر کے کلام کا جائزہ لیں تو ہمکو ان حالات کا جائزہ لینا پڑے گا جو میر کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر میں کارفرما ہیں۔ میر کے ہاں تصوف کا جو عنصر ملتا ہے اس میں بھی ان کی ذاتی زندگی ان کی تعلیم و تربیت اور ماحول کا بہت بڑا دخل ہے۔

میر کے بچپن کی زندگی کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس ماحول میں ان کی تربیت ہوئی وہ فقیروں اور درویشوں کا ماحول تھا۔ ان کے والد خود ایک بہت بڑے صوفی تھے ہر وقت عبادت حق میں مشغول رہتے اور صوفیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ عشق حقیقی ہی ان کی زندگی تھی اور وہ اسی میں فنا ہو کر گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے یاد الٰہی میں مگن رہتے تھے میر کو بھی شروع میں انھوں نے اسی قسم کی تعلیم دی اور اسی عشق کی ترغیب دی تھی عشق کو وہ عین حیات اور اسرار حیات بتاتے تھے۔ ماسوا عشق کے دنیا ان کے لئے کچھ نہیں تھی اور یہ انھیں کے خیالات ہیں کہ میر کہتے ہیں ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

والد کے انتقال کے بعد میر کی پرورش و دیکھ بھال جو ان کے منہ بولے چچا امان اللہ نے کی وہ بھی صوفی تھے اور میر محمد علی متقی کے مرید۔ وہ بھی صوفیوں کی صحبت میں رہتے اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے گھر پر بھی بہت سے درویشوں کا ہجوم رہتا تھا صوفیوں نے انھیں اتنی محبت تھی کہ وہ خود اکثر صوفیوں سے ملنے جاتے تھے اور چوں کہ میر کو ہر وقت اپنے ہمراہ رکھتے تھے اس لئے جہاں بھی وہ صوفیوں سے ملنے جاتے تھے میر ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ذکر میر میں بہت سے ایسے صوفیوں کا نام ملتا ہے جن سے وہ اپنے چچا کے ہمراہ ملنے گئے وہ صوفی میر محمد علی متقی کے بیٹے ہونے کی وجہ سے ان سے بہت محبت کرتے تھے اور طرح طرح کی نصیحتیں بھی کرتے تھے جن کا ذکر بھی تفصیل سے ذکر میر میں ملتا ہے۔ اس سلسلے میں بایزید کا ذکر خاص طور پر میر نے کیا ہے کیونکہ وہ انھیں بہت چاہتے تھے اور اکثر اپنے چچا کے ہمراہ ان کے یہاں جاتے تھے۔ بہت دھیان سے ان کی نصیحتیں سنتے تھے اور بہت ہی ادب سے پیش آتے تھے۔ بایزید کے بھی دل میں وہی عشق حقیقی کی آگ سلگ رہی تھی اور اسی آگ میں ان کا انتقال ہوا۔ میر کے والد بھی اسی عشق کے آزار میں مرے۔ غرض میر کی زندگی کے یہ اولین نقوش ان کے ذہن پر ایسے گہرے جمے کہ وہ عمر بھر نہ مٹ سکے اور انھیں سے میر کو تصوف کا سبق ملا۔

اسی کے ساتھ اگر ہم خارجی حالات کو دیکھیں تو میر کا دور وہ

دور تھا جب کہ ساری زندگی میں ایک تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ ایک تمدن جو کہ بہت قدیم تھا اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا اور وہ جاگیردارانہ نظام جس میں میر نے آنکھیں کھولیں بالکل مردہ اور بے جان ہو چکا تھا۔ مختصراً ایک ایسی تہذیب کا خاتمہ ہو رہا تھا جس کو لوگ کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھے کیونکہ اس سے ان کی زندگی وابستہ تھی۔ یہ تہذیب اور تمدن تو دم ضرور توڑ رہا تھا اور پرانا نظام بھی قریب قریب ختم ہو رہا تھا۔ مگر اسکی جگہ ابھی کوئی نیا نظام نہ آیا تھا۔ کوئی تمنا تازہ بطن گیتی سے پیدا نہ ہوا تھا۔ کوئی نیا سورج سطح زمین سے بلند نہ ہوا تھا۔ شب کی طرب انگیز فضائیں ختم ہو چکی تھیں مگر صبح نو نمودار نہ ہوئی تھی۔ اس لئے لوگ ڈوبے ہوئے تاروں کا ہی ماتم کر رہے تھے۔

یہ دور ایک تاریخی خلا تھا جہاں روح انسانی بھٹکتی پھر رہی تھی اور اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر نگاہیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے مگر امید کا کوئی ٹمٹماتا ہوا دیا بھی ان کو نظر نہ آتا تھا۔ سماجی حالات روز بروز ابتر ہوتے جا رہے تھے مغلیہ سلطنت کا زوال تیزی سے ہو رہا تھا اور جو لوگ ان درباروں سے وابستہ تھے وہ پریشان تھے۔ مالی بدحالی اور سماجی انتشار کی وجہ سے ساری حقیقتیں بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی تھیں۔ بڑھتی ہوئی اور روزافزوں مفلسی نے لوگوں کے اخلاق کو گرانا شروع کر دیا تھا۔ اچھے اچھوں کی پگڑیاں اچھالی جا رہی تھیں اور اس بحرانی دور میں ان کو کوئی سہارا نظر نہ آتا تھا۔

ان حالات میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ مذہب کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو میر کے دور کے قریب قریب ہر شاعر کے یہاں تصوف کا عنصر نمایاں طور پر ملتا ہے جس میں نمایاں مثالیں خواجہ میر درد وغیرہ کی مل سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ شاعری کے مزاج میں روایات کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اردو کی شاعری فارسی کے زیر سایہ پرورش پا رہی تھی اس لئے وہی خیالات و تصورات جو کہ فارسی شاعری میں تھے اردو شاعری میں بھی آ گئے اور جب کہ شاعری پروان چڑھ رہی تھی اس وقت فارسی شاعری میں تصوف کی حکمرانی تھی۔ آخری دور کے فارسی شعرا باستثنائے چند تمام تر صوفیانہ خیالات کے حامل تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی خیالات اردو شاعری کی بھی روایات بن گئے اور ان خیالات سے اردو کے شعرا اپنا دامن نہ بچا سکے میر بھی اس سے متاثر ہوئے اور بڑی حد تک متاثر ہوئے۔

غرض یہ تھے وہ حالات جیکے توسل سے میر کے کلام میں تصوف داخل ہوا۔ پھر بھی ان میں سب سے زیادہ ہاتھ ان کے بچپن کی تعلیم و تربیت کا تھا۔ اگر اس پس منظر سے مدد نہ لی جائے تو میر کی شاعری پورے طور سے سمجھی نہیں جا سکتی اور سرور صاحب نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ میر کی شاعری کی خصوصیات کو ہم اٹھارھویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ اور اسکے پس منظر کی روشنی ہی میں سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں ایک مشترک تہذیب کا جادو اور جمال ہے جو مغلوں کے دور کا عطیہ ہے۔ اس میں وہ تصوف ہے جو ایران اور ایشیا کے تمدنی اثرات کے بیج ہندوستان میں بو کر ایک پوری فصل تیار کر چکا تھا۔

ان باتوں سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میر بھی دیگر صوفیاء کی طرح ایک بہت بڑے صوفی تھے اور ان کا کلام سارے کا سارا تصوف سے بھرا پڑا ہے، ماسوا تصوف کے ان کی شاعری میں اور کچھ ہے ہی نہیں یہ خیال یکسر غلط ہوگا۔ نہ تو میر عام صوفیوں کی طرح تھے اور نہ ان کی شاعری محض صوفیانہ شاعری ہے۔ وہ اپنے دور کے عام شاعروں کی طرح تھے اور ان کی شاعری میں صرف صوفیانہ خیالات ہی نہیں بلکہ متعدد خیالات کا اظہار ہے۔ ان میں بوقلمونی اور ہمہ گیری ہے۔ متعدد رنگوں کی آمیزش ہے۔ انھوں نے طرح طرح کی تصویریں پیش کی ہیں اور بڑی گل افشانیاں کی ہیں۔ ان ہی میں ملے جلے تصوف کے نقوش بھی ہیں جو کہیں کہیں بہت گہرے بھی ہو گئے ہیں۔

میر نے اپنے زمانے کو سمجھنے کی کوشش کی اور ادراک حقیقت کی جستجو کی جس کے لئے دو ہی راستے تسلیم کئے گئے ہیں جو فلسفہ اور حکمت سے قریب ہیں۔ ایک طریقہ بحث و نظر یعنی عقل و دانش کا سہارا لے کر حقیقت کی جستجو کرنے کا ہے ... کلا
میر چونکہ صوفیانہ روایات کے وار ... ریب
تصفیۂ قلب کا طریقہ زیادہ مناسب تھا۔ انھوں نے بتایا کہ حقیقت کی رسائی کے لئے دل کی منزل سے گذرنا اور عشق کا سہارا لینا ہوتا

ہے اِس وادی میں عقل کی رہنمائی بے سود ہے سچا عرفان دل کے صفائے، ریاضت اور تصفیۂ باطن سے حاصل ہوتا ہے ؎

دل کا مطالعہ کر اسے آگہہِ حقائق!!!

ہیں فنِ عشق کے بھی مشکل بہت دقائق

چونکہ صوفیانہ شاعری میں یہ چیز عام ہے۔ اس لئے میرؔ نے بھی دل کے برکات اور فیوض کی بار بار تعریف کی ہے۔ دل کو طریق عشق کا رہنما بتایا ہے۔ قبلہ و پیمبر جانا ہے اور کبھی کبھی خدا تک بھی کہہ دیا ہے۔

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل　　پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

ان کے نزدیک دل سب کچھ ہے یہ نہ صرف جذبات کا مرکز ہے بلکہ طریقت کے عملی پہلوؤں کا بھی ایک رہنمائے کامل ہے ؎

دل عجب نسخۂ تصوف ہے　　ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے

جس فلسفہ پر تصوف کی بنیاد ہے وہ فلسفہ وحدت الوجود ہے۔ جس کی رو سے خدا کا وجود، وجودِ اصل ہے اور ماسوا خدا کے کچھ بھی ہیں۔ سارے عالم میں اسی کا پرتو ہے۔ ذرّے ذرّے میں اسی کا حسن ہے۔ میرؔ بھی عام صوفیوں کی طرح وحدۃ الوجود اور توحیدِ محض کے بے انتہا معتقد تھے۔

تصوف میں جب ڈال دیتے ہیں بات

خدا بس کہیں ہیں یہ توحید ہے!!!

مظاہر سب اس کے ہیں ظاہر وہ ہے

تکلف ہے یاں جو چھپاتے ہیں لوگ

اس صوفیانہ توحید کا مطلب ہمیشہ یہی سمجھا گیا ہے کہ نہ صرف خدا ایک ہے بلکہ کائنات میں اس کے سوا کوئی موجود نہیں لَامَوجُودَ اِلَّا اللہ۔ یہ عام صوفیوں کا عقیدہ ہے اور میرؔ بھی ان کے ساتھ شریک ہیں ؎

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا!!

خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

صوفیوں کی توجیہہ عالم کے بارے میں یہ ہے کہ عالم خدا کی ذات کا ایک جز تھا جسے خدا نے اپنے شوقِ ظہور سے اپنے کل سے جدا کیا اور کائنات کو وجود عطا کیا اور اس پر اپنا عکس ڈالا۔ اس کا نام عالم امکان ہے۔ اس کا وجود گو کہ عارضی ہے مگر ہے ضرور۔ مطلق وجود تو اس واجب الوجود کا ہی ہے۔ باقی جو کچھ ہے عارضی اضافی ہے۔ صوفیوں کے نزدیک عالم ایک آئینہ خانہ ہے جس میں ذاتِ حقیقی پر تو فگن ہے۔

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم

یا عالم آئینہ ہے اس یار خود نما کا!!

تصوف کا خمیر عشق حقیقی ہے۔ میرؔ نے جا بجا اس موضوع پر متصوفیانہ نظر ڈالی ہے "درد ہی خود ہے خود دوا ہے عشق"۔ دیگر صوفیہ کی طرح وہ بھی عشق کو بڑے رتبے دیتے ہیں ؎

عشق ہے طرز و طورِ عشق کے تئیں

کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق

عشق حقیقی کا زینہ عشق مجازی بھی ہو سکتا ہے "المجاز قنطرۃ الحقیقت" مگر عشق مجازی ہی کو منزل نہ سمجھ لینا چاہئے۔ اصل مراد معبود حقیقی ہی ہونا چاہئے۔ اس خیال کو یوں نظم کیا ہے ؎

گر پرستش خدا کی ثابت ہے

کسو صورت میں ہو بھلا ہے عشق

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا

ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

اس دنیا میں محبت ہی اصل چیز ہے بلکہ محبت ہی کی بنا پر عالم کا وجود ہوا ہے اگر محبت نہ ہوتی تو اس عالم ظاہری کا وجود بھی نہ ہوتا۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور　　نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب، محبت سبب　　محبت سے آتے ہیں کارِ عجب

مگر تصوف میں محبت مذہب اور ملت کی پابند نہیں رہتی۔ اس مسلک میں تفریقِ مذہب و ملت کو روا نہیں سمجھا جاتا۔ میرؔ نے محبت کو انہیں بسیط معنوں میں نظم کیا ہے۔

مذہب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اور
میں اور یار اور مرا کاروبار اور

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سلام کیا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

میر کو اہل مذہب کے خلاف بڑی شکایت ہے یہ لوگ بعض اوقات جزوی باتوں کو اصولی باتوں پر ترجیح دیتے ہیں اور مذہب کا تعمیری مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب کا اصل فریضہ یا نصب العین قلوب میں نیاز پیدا کرنا ہے اور نیاز کی روحانی کیفیت کے بغیر مذہب، انسانیت، کلچر کوئی شے بھی تکمیل نہیں پا سکتی۔

تصوف میں ادراک کا محل دل ہے۔ انسان اپنے ہی دل میں محبوب کا جلوہ دیکھ سکتا ہے اور اِدھر اُدھر بھٹکنے سے کچھ حاصل نہیں جب سارے کائنات کے پردے ہٹ جاتے ہیں تو محبوب کی صورت دل میں آجاتی ہے اُس کی اصل جلوہ گاہ دل ہے اس لئے دیر و حرم کی خاک چھاننا بے سود ہے ؎

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلہ پہ سیر و سفر ہمارا

غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے
وہ گنج اسی کنجِ خرابہ میں نہاں تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا!
نہ سمجھا میں کہ اُس قالب میں تو تھا

اس عالم کی مادی اشیاء بالکل بے بنیاد ہیں جو چیزیں ہم دیکھتے ہیں وہ صرف چند پردے ہیں جو ہمارے اور اصل ذات کے درمیان ہیں اس لئے صوفیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کا اپنا وجود ہی انسان کے اور اس کے خدا کے درمیان حجاب ہے جس کی نفی سے وہ پھر اصل سے مل سکتا ہے ؎

جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں، زمانہ میں
گل پھول کو ہے ان نے پردہ سا بنا رکھا

گل و رنگ و بہار ہیں پردے
ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ

صوفیائے کرام ذات باری میں شامل ہو جانے کو معراجِ زندگی تصور کرتے ہیں اور فنا ہو جانا ان کے لئے عینِ حیات ہے ؎

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

معبود طرح طرح سے اپنی خود نمائی کرتا ہے وہ بت ہزار شیوہ اور گلشن صد رنگ ہے کبھی ایک شکل میں ظاہر نہیں ہوتا ؎

گہہ گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو
آتا نہیں نظر وہ طرحدار ایک طرح

میر نے اور صوفیوں کی طرح "ہستی" پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے ہستی کے متعلق ان کے خیالات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک لہر تو ان عقیدوں پر چل رہی ہے کہ ہستی موہوم اعتبار کی ہے جو عام صوفیوں کا تصور ہے۔ اس سے ملی ہوئی دوسری لہر یہ ہے کہ ہستی بڑی ہی دلکش ہے مگر یہ سب فانی اور عارضی ہے۔ ایک اور بات یہ بھی ملتی ہے کہ دنیا بدی ہی بدی ہے اور اس میں چند اچھائیاں جو ہیں وہ بھی فانی ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر انہوں نے کئی جگہ کیا ہے۔ دنیا کو حسین تو سمجھتے ہیں مگر اس کا افسوس بھی ہے کہ اس کا ہر ایک نقش فانی ہے ؎

چار دیواریٔ عناصر میر   خوب جاگہ ہے پر ہے بے بنیاد

کہنے کا مقصود یہ ہے کہ میر حسن پر تو فریفتہ ہیں مگر ان کو حسن کے فانی ہونے کا گہرا رنج ہے ان کا دل دنیا کی حسین چیزوں میں لگتا ہے مگر پھر یہ سمجھ کر اس سے منھ موڑ لیتے ہیں کہ یہ بھی اک سرائے فانی ہے۔ یہاں ہر ایک چیز بے بنیاد ہے جس سے دل لگانا بے سود ہے۔

عشق کی منزل میں اک ایسا بھی مقام آتا ہے کہ انسان یادِ الٰہی میں اتنا بے خود ہو جاتا ہے کہ اپنے سے بالکل بے نیاز اور بے پروا ہو جاتا

ہے وہ اک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جو اس عالم آب و گل سے بہت پرے ہے۔ وہ عالم آب و گل سے گذر کر عالم غیر مادی میں پہنچ جاتا ہے جس کو تصوف کی اصطلاح میں عالم لاہوت کہتے ہیں ؂

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

انسان میر کا ایک اہم موضوع ہے اور بقول ڈاکٹر عبداللہ کے انسان کے متعلق ان کے تصورات میں ایک اثباتی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس اثبات میں کچھ جذبہ کچھ عقلی تجزیہ اور کچھ تخیل کارفرما ہے۔ ان کے اس تصور کا اصل سرچشمہ تصوف کے افکار سے پھوٹتا ہے کیونکہ صوفیوں نے انسان کی فضیلت اور فوقیت پر بڑا زور دیا ہے۔ میر نے بھی اس معاملہ میں روایتی عقیدے کو شاعری کا جامہ پہنایا ہے ؂

آدمی کو ملک سے کیا نسبت
شان ارفع ہے میر آدم کی

اور حدود پھر اُسی صوفیانہ تصور سے مل جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ انسان انسان نہیں اس میں ذات الٰہی جلوہ گر ہے ؂

پھر نہ شیطاں سجود آدم ہو   شاید اس پردہ میں خدا ہووے

کھینچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو
اس پردے میں خیال تو کر ٹک خدا نہ ہو

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ   آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں   مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

انسان کی عظمت کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ انسان بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے اور کئی منازل سے گزرنے کے بعد وہ اس قابل ہوتا ہے کہ انسان کہا جائے ؂

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب ہم سا کوئی صاحب۔ صاحب نظر بنے ہے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مگر دوسری طرف جب انھوں نے انسان کی ہستی پہ نظر ڈالی ہے تو پھر انھیں صوفیانہ خیالات کی طرف آ گئے ہیں۔ انھوں نے انسان کو مخلوق اور خدا کو برتر ہستی قرار دیا ہے۔ اور خدا کے احسان کو مانا ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا اور ساری مخلوق پر فضیلت دی ؂

میرے مالک نے میرے حق میں یہ احسان کیا
خاک ناچیز تھا میں سو مجھے انسان کیا

اس سے ملے ہوئے ڈانڈے فلسفۂ جبر کے ہیں جس کی رو سے انسان ایک مجبور ہستی ہے اور وہ اس عالم فانی میں اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ انسان کی فنا اور بقا خدا کے ہاتھ میں ہے ؂

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور صبح کو جوں توں شام کیا

دوسرے صوفیوں کی طرح میر بھی حیات جاوداں کے معتقد ہیں اور انکا خیال ہے کہ زندگی موت کے بعد بھی فنا نہیں ہوتی بلکہ اس کو حیات ابدی مل جاتی ہے۔ میر کا یہ بھی خیال ہے کہ موت کی کوئی حقیقت نہیں۔ موت راہ حیات کی ایک منزل ہے زندگی موت کے بعد فنا نہیں ہوتی بلکہ اس کو ابھی اور بھی بہت سی منزلیں طے کرنی رہ جاتی ہیں۔ موت ان کے نزدیک ایک وقفہ اور اس وقفہ کے بعد پھر زندگی کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ ؂

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے
عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم

مرگ کیا منزلِ مراد ہے میرؔ
یہ بھی اک راہ کا توقف ہے

غرض ان سب باتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کے یہاں تصوف کافی ہے۔ ان کے خیالات وہی قدیم صوفیوں کے خیالات ہیں۔ اور وہی مضامین وجود۔ واجب الوجود۔ وحدت الوجود عالمِ باطن۔ نفس انسانی تھا اور خود کا صوفیانہ تصور۔ شرف انسانی اور انسانی فضیلت۔ عالمِ رنگ و بو کا فانی ہونا وغیرہ۔

ان خیالات اور فلسفیانہ تصورات کے ساتھ میرؔ کے یہاں غور و فکر کی عادت بھی بہت ہے۔ وہ ہر مسئلہ پہ رُک کر سوچتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ عام صوفیانہ خیالات سے کچھ الگ بھی ہو جاتے ہیں اور تعقل کے سہارے سے ہر ایک چیز پر غور کرتے ہیں مگر یہ غور و فکر ان کو کبھی خاص منزل پر نہیں پہنچاتا اور کوئی خاص نتیجہ خیز بات بھی نہیں ملتی تو پھر بقول ڈاکٹر عبداللہ کے بالآخر ان کی تان عام صوفیانہ خیالات پہ ٹوٹتی ہے کہ اللہ کے ماسوا کچھ نہیں ہے۔

ہے ماسوا کیا جو میرؔ کہیے　　آگاہ سارے اس سے ہیں آگاہ

اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ان خیالات سے الگ ہو کر کبھی زندگی کو ایک اصل چیز بھی قرار دیتے ہیں اس کی رنگینی کو اصل رنگینی سمجھتے ہیں اور اسے دل لگانے کے قابل قرار دیتے ہیں۔ وہ مرنا نہیں چاہتے کیونکہ زندگی کی دیدہ زیبیاں ان کو پسند ہیں۔ یہاں پر ان کے تصورات جمالی اور رجائی صوفیوں سے اس معنی میں مختلف ہیں کہ ان کے نزدیک زندگی کے اندر تلخی کا بھی احساس نہیں اور مرنے کے بعد تو راحت ہی راحت ہے۔ مگر میرؔ کے نزدیک زندگی کا سفر بہت طویل ہے اور بعد الموت راحت کا واضح تصور وہ دلا نہیں سکتے۔ پھر بھی جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ وہ آگے چل کر پھر انھیں صوفیانہ خیالات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور گھوم پھر کر انھیں کا اظہار کرتے ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو میرؔ نے اپنی شاعری میں انھیں عام صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے جو ان کے دور کے صوفی شاعروں کے یہاں ملتے ہیں مگر میرؔ کی انفرادیت اس سے قائم ہوتی ہے کہ انھوں نے ان باتوں کو نئے انداز اور اسلوب میں بیان کیا ہو جو کہ ان کا ایجاد کردہ ہے۔

✡

غزل

کوثر جاشی

شوخی پہ تبسم کے لپکے ہوئے پہلو میں — بجلی ہے کہ تُلتی ہے پھولوں ترازو میں
اندازِ نظر اُن کا بیگانہ سا تھا لیکن — دل محو رہا برسوں اُمید کے جادو میں
تشہیرِ غمِ دل کی ترتیب نظر آئی — کھِلتے ہوئے غنچے میں اُڑتی ہوئی خوشبو میں
تابائیِ ماضی کا افسانہ سُناؤں کیا — گم ہے یہ ستارہ بھی میرے کسی آنسو میں
زاہد ترے ایماں کی تقدیر بدل دوں میں — سجدوں کی جو فرصت ہو پھر مایۂ اَبرو میں
لمحاتِ مسرت کی اللہ ری سبک گامی — ایسی نہ ادا ہوگی شایدرمِ آہو میں
راہوں سے تری بچ کر طوفانِ بلا گذرے — غیرت ہو جو تیور میں بجلی ہو جو بازو میں
جس سے مری وحشت کی تصدیق نہ ہوتی ہو — اِک لفظ نہیں ایسا افسانۂ گیسو میں

ہم جذب تصور پر مائل ہوں اگر کوثر
گلزار کا دل دھڑکے ویرانے کے پہلو میں

غزل

ناظر الحسینی کلکتوی

جلو میں لے کر مسرتوں کو چلا ہوں اس طرح والہانہ
نفس نفس ہے سرور و مستی قدم قدم ہے شراب خانہ

حیاتِ نَو گنگنا رہی ہے، اُمید دل مُسکرا رہی ہے
تصوراتِ حسیں سے دل کو بنا رہا ہوں نگارخانہ

ہمیں تعجب سے دیکھتا ہے جہانِ کُہنہ کا ذرّہ ذرّہ
شکست خاموشی میں ہماری چھپا ہے انداز فاتحانہ

حسین صبحوں کی یاد لے کر رہِ محبت پہ گامزن ہوں
کبھی بہ شکلِ مسافرانہ کبھی بہ انداز رہبرانہ

جنوں کو ہر راز کی خبر ہے، جنوں کی ہر بات معتبر ہے
نہیں یہ ہوش و خرد کی جُرأت نگاہ ڈالے جو ناقدانہ

ہمارے ہی دم سے آج ناظر حیات کی شمعیں جل رہی ہیں
ہمارے ہی دم سے چل رہا ہے، ازل سے اب تک یہ کارخانہ

اتر پردیش شاہ راہ ترقی پر

اردو مصنفوں کو انعام ••• سماجی تعلیم کی رفتار ••• خواتین کی بہبود و ترقی ••• امداد باہمی تحریک ••• امداد باہمی مارکٹنگ سوسائٹیوں کی سرگرمیاں ••• صحت مرکز کا قیام ••• لیتھرزم بیماری کی روک تھام ••• صنعتی اور فنی تعلیم کی رفتار ترقی ••• بدعنوانیوں کا تدارک ••• تعلیم بالغان کی توسیع ••• بحری ٹیکس میں کمی ••• معدنیات کی تلاش

ریاستی حکومت نے ۵ مصنفین کو ان کی ممتاز ترین تصانیف پر ۷،۴۰۰ روپیہ کی رقم بطور انعام دی ہے۔ یہ انعامات ریاستی حکومت کی جانب سے مقررہ اردو مشاورتی کمیٹی کی سفارشات پر دیئے گئے ہیں۔

یہ انعامات ہندی اور ریاستی زبانوں کی ترقی کے فنڈ سے دیئے گئے ہیں۔ ہندی سمیتی راج بھون لکھنؤ کے سکریٹری اس رقم کو نکالیں گے اور متعلقہ اشخاص کو انعام دینے کا انتظام کریں گے۔ انعام پانیوالوں کو انعام کی رقم کا ۷۵ فی صدی نقد اور ۲۵ فی صدی چھوٹی بچت اسکیم کے تحت گفٹ کوپن کی صورت میں دیا جائے گا۔

مصنفین کے نام ان کی تصانیف اور انعام کی رقم حسب ذیل درج ہے۔

شری سید مسعود حسن رضوی لکھنؤ (رزم نامہ انیس اور لکھنؤ کا شاہی اسٹیج)۔ ۲۰۰۰ روپیہ۔ شری خورشید الاسلام علی گڑھ (تنقیدیں) ۷۵۰ روپیہ۔ شری مشیر الدین رضوی میرٹھ (رہبر علاج بے خوابی اور اس کا علاج دافع حسیات علاج اور روش علاج بالادویہ) ۵۰۰ روپیہ شری جے کرشن چودھری آئی۔ اے۔ ایس ریوہ (کالی داس اور تلسی داس) ۵۰۰ روپیہ۔ شری متی صالحہ عابد حسین علی گڑھ (قطرہ سے گہر ہونے تک) ۵۰۰ روپیہ۔ شری آفر لکھنوی لکھنؤ (نوبہاراں) ۵۰۰ روپیہ۔ شری اختر علی تہری شاہجہاں پور (تنقیدی شعور) ۴۰۰ روپیہ۔ شری سید احتشام حسین لکھنؤ (ہندوستانی لسانیات کا خاکہ) ۴۰۰ روپیہ۔ شری محمد رضا انصاری لکھنؤ (مجذوب اور اس کا کلام) ۲۵۰ روپیہ۔ شریمتی صدیقہ بیگم سہارودی علی گڑھ (ٹھیکرے کی مانگ)۔ ۲۵۰ روپیہ۔ شری قیصر تمکین لکھنؤ (جگ ہنسائی)۔ ۲۵۰ روپیہ۔ شری علیم اختر، مظفر نگری نئی دہلی (نکہت گل)۔ ۲۵۰ روپیہ۔ شری سید کلب مصطفٰے لکھنؤ (فن خطابت) ۲۵۰ روپیہ۔ شری اختر انصاری علی گڑھ (یہ زندگی)۔ ۲۵۰ روپیہ شری مسیح الزماں الہ آباد (حرف غزل)۔ ۲۵۰ روپیہ۔

•••

مشاہدہ اصل یقین ہے۔ یہ مقولہ دیگر ترقیاتی میدان عمل کے مقابلہ میں سماجی ترقی پر زیادہ صادق آتا ہے۔ سماجی تعلیم کی بے شمار برکتوں سے جو ہزاروں گاؤں والے مستفید ہو رہے ہیں اس کا مشاہدہ ضلع الہ آباد کے پھولپور بلاک کے مواضعات میں کیا جاسکتا ہے جہاں اگر ایک طرف کھیتوں میں ہلوں کے چلنے کا منظر نظر آتا ہے تو دوسری طرف تعلیم بالغان کے مرکزوں میں مرد اور عورتیں پڑھنے لکھنے میں منہمک دکھائی دیتی ہیں۔

دیہات کے ان اسکولوں میں مخلوط تعلیم کے بارے میں پرانا تعصب ختم ہوگیا ہے۔ یہاں کے مرد اور عورتیں نہ صرف واجبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بلکہ اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے مکمل تعلیم حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے کوشاں رہتے ہیں۔ گاؤں والے اپنی روزمرہ زندگی میں خود اپنی زبان میں اس

حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں سے بہت ساری معلومات ازبر کر لینا صحیح طریقہ تعلیم نہیں ہے۔ اب تک بلاک کے مختلف مرکزوں میں ۱۸۷۵ بالغوں کو خواندہ بنایا جا چکا ہے۔

گاؤں والے دن بھر کے کام کاج کے بعد اجتماعی مرکزوں میں ریڈیو سننے کے لئے جمع ہوتے ہیں جہاں وہ پنچایت گھر۔ گانوں اور ڈراموں وغیرہ کے دلچسپ پروگرام سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔

ہندوستان میں عام طور پر عورتوں کو چاہے وہ شہروں کی ہوں یا دیہاتوں کی گھریلو کام کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن پھولپور میں عورتیں گھریلو کاموں کے علاوہ صحت مند مشغلوں میں بھی اپنا وقت گزارتی ہیں۔ بڑے پیمانہ پر ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کے لئے ۱۶ مہیلا سمیتیاں کام کر رہی ہیں۔ زندگی کو پُرکیف بنانے کے لئے رقص و موسیقی کے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔

ان سمیتیوں کی جانب سے سلائی اور کشیدہ کاری کی تربیت دی جاتی ہے۔ اور ایک سند یافتہ خاتون معاون ترقیاتی افسر لڑکیوں کو سلائی اور بُنائی کی تربیت دیتی ہے تاکہ وہ اپنے فاضل اوقات میں روپیہ کما سکیں۔

بغیر دھوئیں کے چولھے۔ دھوئیں سے بسا اوقات بینائی پر مضر اثر پڑتا ہے۔ بغیر دھوئیں کے چولھے گاؤں والوں کے لئے نعمت ثابت ہوئے ہیں اور اس بلاک کے گاؤں کے ہر دوسرے گھر میں ایسے چولھے موجود ہیں۔ پھولپور بلاک کے مواضعات میں کل ایسے ۱۳۰ چولھے استعمال ہو رہے ہیں۔

متوازن غذا۔ دیہات والوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ اچھی صحت کے لئے متوازن غذا از حد ضروری ہے۔ اس لئے انھوں نے سائنسی طریقہ سے متوازن غذا تیار کرنا سیکھ لیا ہے۔

بلاک کے دیہاتوں میں سند یافتہ خواتین ٹیچر عورتوں کو کھانا پکانے کی تربیت دیتی ہیں۔ یہاں کی عورتیں حد درجہ خوش ذائقہ اور اشتہا انگیز کھانا تیار کرتی ہیں۔

اورائی بلاک۔ پھولپور کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا اطلاق اورائی بلاک پر بھی ہو سکتا ہے۔ دیہاتوں میں نسکل دل یوتھ کلبوں اور بال منگل دل کے قیام کے ذریعہ اجتماعی ترقیاتی پروگرام پر عملدرآمد کی رفتار تیز تر کر دی گئی ہے۔ ان اداروں کی کوششوں سے اسکول کے احاطوں اور دوسرے مقامات میں ترکاری کی کاشت ہونے لگی ہے۔ طلبا اور مدرسین پود گھروں کے قیام اور کسانوں کو پودے فروخت کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہفتہ وار کلاس۔ بالغوں کے ہفتہ وار کلاسوں میں اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے پرچار کے سلسلہ میں طلبا اور مدرسین ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ مدرسین کی جماعتیں اپنے اپنے علاقوں میں اتوار اور دوسری تعطیل کے دنوں میں طلبا سے ملتی ہیں اور توسیعی پروگرام کے سلسلہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ مدرسین کی یہ جماعتیں گھر گھر جا کر کسانوں کو کھیتی کے جدید طریقوں سے روشناس کرتی ہیں۔

سماجی تعلیم کی توسیع میں بلاک کے علاقوں میں عورتیں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ لڑکیوں کے کلبوں اور صحتی مرکزوں میں دیگر موضوعات کے علاوہ بچوں کی فلاح اور بہبود۔ زچگی کے بعد کی دیکھ بھال اور کنبہ منصوبہ بندی کے بارے میں تعلیم دی جاتی ہے۔ بلاک کے علاقوں میں جدید طریقوں سے کاشت، سماجی تعلیم اور دوسرے میدان عمل میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ یہ تبدیلی اس قدر نمایاں ہے کہ ہر فرد اس کو محسوس کر سکتا ہے۔

بہادر آباد بلاک۔ اتر پردیش میں بہادر آباد بلاک ہردوار کے قریب ضلع سہارنپور میں واقع ہے۔ سماجی تعلیم کی توسیع کے سلسلہ میں اس بلاک میں نمایاں کام ہوئے ہیں۔ یہاں ۴ اجتماعی مرکز ۲ ریڈنگ روم ۶ لائبریریاں۔ نوجوانوں کے ۲۹ کلب اور ۶ منڈلیاں قائم ہیں۔ آٹھ گرام سیوکائیں عورتوں کو بنائی، کشیدہ کاری اور سلائی کی تربیت دیتی ہیں۔

بہادر آباد کے قریب جہان پور میں بچوں کے گروپ کو دیکھ کر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی شرارت پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہ شبہ جلد ہی دور ہو جاتا ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کا یہ گروپ بیلچے وغیرہ لے کر کچن گارڈن میں کام کرنے جا رہا ہے۔ یہ کام ختم کرنے کے بعد بچے کھیل کود میں لگ جاتے ہیں اور بعد ازاں وہ اپنے اسکولوں اور مکانوں کی صفائی کرتے ہیں۔ کلب کے نوجوان ممبران مہینہ میں دو بار یکجا ہوتے ہیں اور اپنے پروگرام پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ اور وہ نیچ

لیڈروں کو اس مقصد سے مدعو کرتے ہیں کہ وہ ان کو اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔

●●●

یہ مسلمہ امر ہے کہ فلاحی ریاست کا خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک خواتین کسی ترقی پسند تحریک کی ہراول نہ ہوں۔ ہندوستان کو بھی فلاحی ریاست بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ یہاں بھی عورتیں ترقی پسند تحریکوں میں پیش پیش رہیں۔ ہندوستانی خواتین کی عظمت کا بیان زمانہ قدیم سے لوک گیتوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ رگ وید کے ایک اشلوک میں کہا گیا ہے کہ "جہاں خواتین کی عزت کی جاتی ہے وہیں خدا رہتا ہے"۔

جیسا کہ ماہر نفسیات کہتے ہیں کوئی مرد یا عورت پیدائشی گنہگار نہیں ہوتی۔ بعض اوقات حالات عورت کو بے نوا و بے سہارا بنا دیتے ہیں۔ ایسی بدقسمت عورتوں کو سنبھالنے کا سوال سماج اور حکومت کے لئے ایک چیلنج ہے۔ مہر شلپ ودیالیہ متھرا اترپردیش کا ایک ایسا ادارہ ہے جس نے اس چیلنج کو جرأت کے ساتھ قبول کیا ہے۔ ۱۹۴۴ء سے، جب سے یہ ادارہ قائم کیا گیا ہے، اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش جاری ہے۔ اس ادارہ میں ۳۰۰۰ خواتین کو سماج میں باعزت مقام دلانے کے لئے فن اور دستکاری کی تربیت دی گئی ہے۔ پہلے پہل اس ادارہ کو جھلا کلیان سنگھ دھرم شالہ متھرا میں آشرم کے طور پر شروع کیا گیا تھا جہاں ۱۵۰ خواتین کو فن اور دستکاری کی تربیت دی جاتی تھی۔

۱۹۵۵-۵۶ء میں اس ادارہ کا نیا دور شروع ہوا اور یہاں گرام سیوکاؤں کے لئے ایک تربیتی کلاس شروع کیا گیا تاکہ یہ گرام سیوکائیں اجتماعی ترقیاتی پروگرام میں سرگرمی کے ساتھ کام کر سکیں اور دیہات سدھار کے کام میں دیہی خواتین کا ہاتھ بٹائیں۔ مذکورہ بالا سال میں اس ادارہ میں ۴۵ گرام سیوکاؤں کو تربیت دی گئی جو کہ اس وقت ریاستی حکومت اور کل ہند کھادی بورڈ کی ملازمت میں ہیں۔ سال رواں میں ۷۸ گرام سیوکاؤں کو تربیت دی گئی۔ مرکزی سماجی فلاح بورڈ نے اس ادارہ کو ۷۱۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد دی ہے۔

اس ادارہ نے بے سہارا خواتین کے لئے ایک آشرم قائم کیا ہے جہاں انھیں خود کفیل بنانے کی غرض سے بنائی اور دیگر دستکاریوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ ریاستی حکومت کی ۲۲۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد کی وجہ سے جو ودیالیہ کو دوسرے پنجسالہ منصوبہ کی مدت میں دی گئی ہے موجودہ ۲۵ خواتین کے علاوہ دیگر ۱۵ خواتین کو دستکاریوں کی تربیت دی جا رہی ہے۔

اس دیش میں یہ ودیالیہ اپنے قسم کا تنہا ادارہ نہیں ہے جہاں بدقسمت خواتین کو نئی زندگی شروع کرنے میں مدد دی جا رہی ہے بلکہ ایسے متعدد معلوم و نامعلوم ادارے موجود ہیں جو بے سہارا خواتین کو سماج میں بحال کرنے میں کوشاں ہیں۔ مذکورہ بالا ودیالیہ کی مثال اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اترپردیش اس تحریک کو کامیاب بنانے میں پیش پیش ہے۔

●●●

ریاست میں امداد باہمی تحریک کی رفتار ترقی کے متعلق ڈائرکٹر ریاستی محکمہ اعداد و شمار کے ایک حالیہ جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ ریاست کے بلاک کے علاقوں کی مختلف امداد باہمی انجمنوں میں جنوری ۱۹۵۹ء میں مجموعی طور پر ۲۳۰۰۰ سے زیادہ نئے ممبر بنائے گئے جس سے ممبرسازی کے سالانہ مقررہ نشانہ کے ۵۰٫۵ فی صدی کی تکمیل ہوئی۔ ان انجمنوں کے سرمایہ حصص میں ۳٫۸۹ لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا جس سے مقررہ سالانہ نشانہ کے ۶۱٫۲ فی صدی کی تکمیل ہوئی۔ علاوہ ازیں زیر نظر ماہ میں تقریباً ۳۱ لاکھ روپیہ کے قرضے دیئے گئے اور اس سلسلہ میں مقررہ نشانہ کے ۶۳٫۱ فی صدی کی تکمیل ہوئی۔

اضلاع میں امداد باہمی انجمنوں میں مجموعی طور پر ۵۶ ہزار نئے ممبر بنائے گئے جس سے سالانہ مقررہ نشانہ کے ۷۲٫۸ فی صدی کی تکمیل ہوئی۔ نئے ممبر بنانے کے سلسلہ میں بجنور، ایٹہ، اور گونڈہ بالترتیب پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہے۔

ریاست کے بلاک کے علاقوں میں توسیع تعلیم کی رفتار ترقی کے سلسلہ میں جنوری ۱۹۵۹ء میں ۶۴ نئے اسکول قائم کئے گئے اس کے علاوہ ۲۵۹ اجتماعی مرکز اور ۶۴۴ تعلیم بالغان کے مرکز قائم کئے

گئے۔ ان مرکزوں میں ۲۳۲۷۴ بالغان کو خواندہ بنایا گیا۔

زیر نظر ماہ میں اضلاع میں تعلیم بالغان کے ۴۷۸ مرکز قائم کئے گئے جہاں ۴۴۴۲ بالغان کو خواندہ بنایا گیا۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زیر نظر ماہ میں بلاک کے علاقوں میں کاشتکاروں کے لئے شرمدان کے ذریعہ ۲۵ میل لمبی کچی سڑکیں تعمیر کیں اور ۱۰۰ میل لمبی سڑکوں کی مرمت کی۔

اس کے علاوہ زیر نظر مدت میں بلاکوں کے علاقوں میں اینٹوں کے پانچ بھٹے قائم کئے گئے جہاں تقریباً ۴ لاکھ اینٹیں تیار ہوئی ہیں اسکے علاوہ ۴۰۳ چرخے تقسیم کئے گئے۔

زیر نظر ماہ میں اضلاع میں ۵ تربیتی کلاسیں ایک پیداواری مرکز اور ایک کھادی ترقیاتی مرکز قائم کیا گیا۔

بلاک کے علاقوں میں جنوری ۱۹۵۹ء میں چھوٹی بچت مہم کے تحت ۳٫۲۵ لاکھ روپیہ اور اضلاع میں ۲۵٫۷۶ لاکھ روپیہ جمع ہوا۔

زیر نظر ماہ میں بلاک کے علاقوں میں عوام نے محنت اور نقدی کی صورت میں جو تعاون کیا اس کی مالیت ۳۴ لاکھ روپیہ تھی۔ اضلاع میں عوام کے تعاون کی مالیت ۳٫۰۵ لاکھ روپیہ تھی۔

●●●

اترپردیش میں متعدد امداد باہمی مارکیٹنگ سوسائٹیاں اپنی ممبروں کی غذائی پیداوار کی فروخت پر اب ان کو نقد بونس ادا کر رہی ہیں۔

صدر مقامات پر موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق ضلع مرادآباد کے بھوجپور اور چندوسی۔ ضلع بریلی کی آنولہ۔ شاہجہانپور ہاتھرس اور تورنگا (ضلع کانپور) کی امداد باہمی مارکیٹنگ سوسائٹیوں نے اپنے ممبروں کو نقد بونس ادا کرنے کا اعلان کیا ہے۔

اترپردیش میں کل ۸۸ امداد باہمی مارکیٹنگ سوسائٹیوں میں سے کچھ کو چھوڑ کر بقیہ سوسائٹیوں کو ۵۸-۱۹۵۷ء میں منافع ہوا ہے اور ان سوسائٹیوں نے منافع میں سے اپنے ممبروں کو نقد بونس ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ان مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۲٫۱۳ لاکھ ہے اور ان کا سرمایہ حصص ۳۱٫۳۶ لاکھ روپیہ ہے جس میں حکومت کے حصص کی مالیت ۱۵٫۱۰ لاکھ روپیہ ہے۔

بیوپاریوں کی منظم مخالفت کے باوجود ان سوسائٹیوں نے ربیع اور خریف کی فصلوں میں کئی لاکھ من غلہ کا لین دین کیا۔

دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت مجوزہ امداد باہمی اصول پر مارکیٹنگ اترپردیش میں ایک نیا اقدام ہے۔ اس اسکیم کے مسائل کو حل کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً منطقائی سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں۔

بیشتر مارکیٹنگ سوسائٹیاں اپنے نجی سرمایہ سے کام چلا رہی ہیں۔ ہر سوسائٹی کا نجی سرمایہ تقریباً ۳۲ ہزار روپیہ ہے۔ ان سوسائٹیوں کو ان کے علاقوں کے امداد باہمی بینکوں سے روپیہ ملتا ہے۔

پرادیشک کوآپریٹو فیڈریشن مارکیٹنگ سوسائٹیوں کو دوسری منڈیوں میں بیوپاریوں سے رابطہ قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ضلع کوآپریٹو فیڈریشن کانپور اپنی ایک کمیشن ایجنسی کے ذریعہ اپنے علاقہ کی مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے مال کی فروخت میں مدد دیتا ہے۔

ان سوسائٹیوں کی مقامی طور پر نگرانی کے علاوہ ہیڈ کوارٹرز سے بھی ان کے کاموں کی سخت نگرانی کی جاتی ہے۔

●●●

اترپردیش کے وزیر صحت ٹھاکر حکم سنگھ نے حال ہی میں نشاط گنج لکھنؤ میں "صحت اور دولت مندر" کے نام سے ایک صحت مرکز کا افتتاح کیا۔ یہ مرکز کل ہند خواتین کانفرنس کی لکھنؤ شاخ کی جانب سے قائم کیا گیا ہے۔

اس مرکز کا خاص مقصد ماؤں اور ۵ سال کی عمر تک کے بچوں کی صحت کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اس مرکز سے ۵ ہزار کی آبادی مستفید ہوگی۔ مرکز کے ذریعہ ان کو منصوبہ بندی کے متعلق مشورے دیئے جائینگے۔ ان کے مکانوں اور قرب وجوار کی صفائی کا خیال رکھا جائیگا اور بچوں کو کھیل کود کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ علاوہ ازیں اس مرکز کے ذریعہ متعلقہ علاقہ کے لوگوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے خواتین کو صابن بنانے قالین اور نواڑ کی بنائی۔ کشیدہ کاری اور لفافے بنانے وغیرہ کی تربیت دی جائے گی اور ان کی مصنوعات کو امداد باہمی اصول پر فروخت کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔

مرکز کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر صحت نے ایسے مفید مرکز کے قیام پر کل ہند خواتین کانفرنس کی لکھنؤ شاخ کو مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کی ۶ کروڑ سے زیادہ آبادی کو علاج معالجہ کی سہولتیں بہم پہنچانا بہت عظیم کام ہے جسے ریاستی حکومت دوسرے اداروں کے تعاون کے بغیر تنہا انجام نہیں دے سکتی انھوں نے امید ظاہر کی کہ دوسرے ادارے بھی اس اقدام کی تقلید کریں گے۔

ٹھاکر حکم سنگھ نے کہا کہ ریاستی حکومت کو اس کا پورا احساس ہے کہ خواتین کو خاطر خواہ طبی سہولتیں دستیاب نہیں ہیں لیکن حکومت اپنے محدود وسائل کے اندر ان سہولتوں میں اضافہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں بلاک ہیڈ کوارٹروں میں ابتدائی صحتی واحدوں کے قیام کا ذکر کیا۔ ہر واحدہ زچہ و بچہ بہبود کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ تعداد کافی نہیں کیونکہ ہر ابتدائی صحتی واحدہ کو ۶۶ ہزار کی آبادی کو سہولتیں بہم پہنچانا ہوتی ہیں۔ مرکزی حکومت ہر بلاک میں ایک کے بجائے دو ابتدائی صحتی واحدے قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔

لکھنؤ شاخ کی صدر بیگم اعزاز رسول ایم۔ ایل سی نے "صحت اور دولت کا مندر" کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی۔

یہ مرکز کل ہند خواتین کانفرنس کی لکھنؤ شاخ کی ڈسپنسری سے ملحق ہوگا۔ اس ڈسپنسری کے ذریعہ گزشتہ دو برسوں میں ۱۵ ہزار سے زیادہ مریضوں کا علاج کیا گیا ہے۔

●●●

اس امر کا پتہ لگانے کے لئے کہ چھوٹی مٹری میں کس حد تک سمیت موجود ہے۔ پورے طور پر کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ دال جس سے لیتھرزم (ٹانگوں وغیرہ کا سخت ہو جانا) کی بیماری ہوتی ہے اتر پردیش کے چند سیلاب زدہ علاقوں میں پیدا ہوتی ہے۔ کچھ علاقوں میں غریب کسان سیلاب کے بعد چھوٹی مٹری بوتے ہیں۔ حال ہی میں ریاستی محکمۂ صحت کی جانب سے جو جانچ کی گئی اس کے مطابق ضلع اناؤ کے ۱۸ مواضعات میں بھی یہ بیماری پائی جاتی ہے۔

سابقہ جائزوں کے مطابق یہ بیماری جو کساری یا کسی اور لتری یا چھوٹی مٹری کی دال کے زیادہ استعمال سے پیدا ہوتی ہے بدایوں بستی۔ غازیپور۔ دیوریا۔ گورکھپور اور وارانسی کے کچھ علاقوں میں پائی جاتی تھی۔

اس جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ ضلع اناؤ میں ۱۱ سے ۴۰ سال تک کی عمر کے لوگوں میں اس بیماری کا زیادہ زور ہے۔ متاثرہ علاقوں کی ۶۴۰۰ کی آبادی میں اس بیماری کے ۸۰ واقعات کا پتہ لگا۔ زیادہ تر غریب طبقہ کے لوگ اس بیماری کے شکار ہوتے ہیں جو یا تو بے زمین ہوتے ہیں یا ان کے پاس کھیتی کے لئے بہت کم زمین ہوتی ہے۔ ستمبر کے مہینہ میں اس بیماری کا بہت زیادہ زور رہا۔ دسمبر و جنوری فروری۔ مارچ اور اپریل کے دوران میں اس بیماری میں کوئی مبتلا نہیں ہوا۔ اس بیماری سے متاثر بیشتر کنبوں نے بتایا کہ وہ سال میں ۸ مہینوں تک چھوٹی مٹری کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ دودھ۔ مچھلی گوشت۔ انڈا اور ہری سبزیاں وغیرہ بالکل استعمال نہیں کرتے۔

ضلع اناؤ کے یہ ۱۸ مواضعات جو اس بیماری سے متاثر ہیں تقریباً ۵۰ مربع میل کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ برسات کے زمانہ میں دریائے گنگا کی سطح بڑھ جانے سے اس علاقہ کا بیشتر حصہ زیر آب رہتا ہے۔

ریاست میں اس بیماری سے متاثر تقریباً تمام علاقوں کے حالات یکساں ہیں۔ اس بیماری کی روک تھام در حقیقت ایک زراعتی مسئلہ ہے۔ مسلسل سیلاب کی وجہ سے خریف کی فصلیں برباد ہو جاتی ہیں اور پانی جمع ہو جانے سے ربیع فصل کی نشو و نما نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں کسان مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ چھوٹی مٹری بوئیں جس کے لئے کھیت کی جتائی کرنے اور اس میں کھاد دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ریاستی محکمہ زراعت کی جانب سے اس کی جگہ دوسری فصل دریافت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

●●●

اتر پردیش میں ۵۸-۱۹۵۷ء کے دوران میں صنعتی اور فنی تعلیم کی رفتار ترقی سے متعلق ریاستی نظامت صنعت کی تازہ ترین رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۵۸-۱۹۵۷ء کے بجٹ میں فنی تعلیم کیلئے

۲۰۱۱،۰۹ لاکھ روپیہ کی رقم رکھی گئی۔ اس رقم میں سے مختلف تعلیمی اداروں کے طلبا کو وظائف دینے کے لئے ۲۴ء۱۱ لاکھ روپیہ اور قرضے دینے کے لئے ۲ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ اس وقت صنعتی اور فنی تعلیم مفت دی جاتی ہے لیکن ہوسٹل میں رہنے والے طالب علم سے ایک روپیہ سے تین روپیہ ماہانہ تک فیس لی جاتی ہے۔ اس رقم میں بجلی اور نوکر کے اخراجات شامل ہیں۔ فہرست مندرجہ اقوام کے طلبا کو خاص سہولتیں دی جاتی ہیں۔ فہرست مندرجہ اقوام کے لئے ۲۰ نشستیں محفوظ ہوتی ہیں اور انھیں ہوسٹل فیس بھی ادا نہیں کرنا ہوتی۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ایچ۔ بی ٹیکنالوجی کل انسٹی ٹیوٹ کانپور میں ریسرچ کرنے کے لئے پوسٹ گریجوئٹ طلبا کو ۱۵۰۔۱۵۰ روپیہ کے ۶ فیلو شپ دئے گئے۔

زیر نظر مدت میں طلبا کو ہندوستان اور غیر ممالک میں سائنسی اور فنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قرضے دئے گئے ہندوستان میں حصول تعلیم کے لئے ۵ ہزار روپیہ اور غیر ممالک میں حصول تعلیم کے لئے ۱۰ ہزار روپیہ تک ایک روپیہ سالانہ شرح سود پر قرضے دئے گئے۔ ۵۸-۱۹۵۷ء میں ۱۲۸۳۰۰ روپیہ قرضے دئے گئے۔

●●●

ریاستی حکومت نے شکایتوں سے متعلق پولیس ادارہ میں توسیع کر دی ہے۔ یہ ادارہ فروری ۱۹۵۶ء میں قائم کیا گیا تھا جو ریاستی محکمہ پولیس کا ایک حصہ ہے۔ ریاست کے ہر ضلع میں شکایتوں سے متعلق ڈپٹی پولیس سپرنٹنڈنٹوں کی تقرری کی گئی جو غیر گزیٹیڈ سرکاری ملازمین کے خلاف شکایتوں کے سلسلہ میں تحقیقات کرتے ہیں۔

اب تک محکمہ پولیس کے علاوہ دوسرے محکموں کے سرکاری ملازمین کے خلاف شکایتیں متعلقہ محکمہ کے اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کی جاتی تھیں جو یہ فیصلہ کرتا تھا کہ ان شکایتوں کی تحقیقات مذکورہ ادارہ کے ذریعہ کرائی جائے یا نہیں۔ مگر اب حکومت نے یہ احکام جاری کر دئے ہیں کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ متعلقہ محکمہ کے افسر اعلیٰ کی اجازت حاصل کئے بغیر ہر شکایت کو تحقیقات کیلئے اس ادارہ سے متعلق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو بھیجدے گا۔ یہ ادارہ تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ متعلقہ محکمہ کے افسر اعلیٰ کو پیش کرے گا جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس امر کی اطلاع دے گا کہ اس سلسلہ میں ملازم کے خلاف کیا کارروائی کی گئی ہے اور اس کو کیا سزا دی گئی ہے۔

محکموں کے اعلیٰ افسروں کو بد عنوانی کی جو شکایتیں براہ راست موصول ہوں گی وہ اس ادارہ کے ذریعہ تحقیقات کیلئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھی دی جائیں گی۔ اگر اعلیٰ افسر خود تحقیقات کرے تو اسے اس کی وجہ بتانا ہوگی کہ اس نے تحقیقات کا کام شکایات کے ادارہ کے سپرد کیوں نہیں کیا۔

●●●

ریاست میں تعلیم بالغان کی سرگرمیوں کے متعلق اپنی تازہ ترین رپورٹ میں ڈائرکٹر محکمہ اعداد و شمار نے بتایا ہے کہ بلاک کے علاقوں میں دسمبر ۱۹۵۸ء کے دوران میں ۱۱۷۷ بالغوں کے تعلیمی مرکز قائم کئے گئے اور جن میں ۲۷ ہزار سے زیادہ بالغوں کا داخلہ کیا گیا اور تقریباً پانچ ہزار بالغوں کو خواندہ بنایا گیا۔

اجتماعی ترقی کے کاموں کے سلسلہ میں ۸ میل پکی سڑکیں تعمیر کی گئیں اور ۹ میل سڑکوں کی مرمت کی گئی اس کے علاوہ ۸۱ میل اور ۱۲۴ میل کچی سڑکوں کی تعمیر و مرمت کی گئی۔

پکی سڑکوں کی تعمیر کے سلسلہ میں زیر نظر ماہ میں دہرہ دون غازی پور اور علی گڑھ میں مقررہ سالانہ نشانوں کے بالترتیب ۲۰۴۔ ۱۴۱ اور ۱۲۵ فیصدی کی تکمیل ہوئی۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ زیر نظر ماہ میں بلاکوں میں اینٹوں کے ۸ نئے بھٹے اور ۴ تعلیمی کلاس قائم کئے گئے۔ اس کے علاوہ ۴۸۱ چرخے تقسیم کئے گئے۔ اسی ماہ میں اضلاع میں ۹ تعلیمی کلاس ۳ پیداواری مرکز اور ۱۳ کھادی ترقیاتی مرکز قائم کئے گئے۔ زیر نظر ماہ میں بلاکوں میں چھوٹی بچت مہم کے تحت ...۱۵۱

روپیہ جمع ہوا جبکہ اس سے پہلے ماہ میں ۱۵۰۰۰۰ روپیہ جمع ہوا تھا۔

اس ماہ میں اضلاع میں چھوٹی بچت کے تحت ۲۰،۷۲،۰۰۰ روپیہ جمع ہوا۔ سال کے آغاز سے گزشتہ دسمبر تک اضلاع میں کل ۳۰،۱ لاکھ روپیہ جمع ہوا۔

●●●

یو۔پی کابینہ نے ریاست میں ہوزری صنعت کی ترقی کے پیش نظر یکم اپریل ۱۹۵۹ء سے ہوزری کے سامان پر بکری ٹیکس میں کمی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلہ کے مطابق اب ہوزری کے سامان پر ایک آنہ فی روپیہ ایک جگہ پر عائد ہونے والے بکری ٹیکس کو کم کرکے کئی جگہوں پر عائد ہونے والا دو نئے پیسہ فی روپیہ کر دیا گیا ہے۔

یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اس اقدام سے جس سے ریاستی حکومت کو تقریباً ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا نقصان ہوگا صنعتی ترقی میں مدد ملے گی۔

کابینہ کے دوسرے فیصلہ کے مطابق آئندہ یکم اپریل سے دیسی اسپرٹ پر بکری ٹیکس ختم کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ اسپرٹ پر موجودہ چنگی میں ۱۰ فیصدی اضافہ کر دیا جائے گا اس فیصلہ کا اطلاق جھانسی ضلع پر نہ ہوگا کیوں کہ وہاں چنگی گھروں کو شرح چنگی کے سلسلہ میں مدھیہ پردیش کے چنگی گھروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اس اضافہ سے اس سرحدی علاقہ میں اسپرٹ کی اسمگلنگ شروع ہونے کا اندیشہ ہے۔

کابینہ نے کھنڈساری شکر تیار کرنے والوں کیلئے لائسنسنگ قانون ۱۹۵۸ء کو جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے تحت بجلی سے چلنے والے کولھوؤں اور بیلوں کیلئے لائسنس لینا ضروری ہوگا۔ اس ضمن میں بیل کا مطلب راب تیار کرنے والے ایسے واحدوں سے جہاں ۲۵۰ من گنا روزانہ پیرا جاسکتا ہو یا سات یا اس سے زیادہ بیلوں کے ذریعہ کولھو چلائے جاتے ہوں۔ قانون کے تحت کولھوؤں کو استعمال کرنے والوں کو فارم اے اور بیل کے لئے فارم "بی" کے لائسنس لینا ہوں گے۔

فارم "اے" کے لئے ۲۵۰ من روزانہ گنا پیرنے پر ۳۰۰ روپیہ ۲۵۰ سے ۵۰۰ من تک ۴۵۰ روپیہ اور ۵۰۰ من سے زیادہ گنا پیرنے پر ۶۰۰ روپیہ فیس لی جائے گی۔ فارم "بی" کے لائسنس کیلئے ۳۰۰ روپیہ فی بیل کے حساب سے فیس لی جائے گی۔

شکر کے متعلق ریاستی کمشنر کو یہ لائسنس جاری کرنے کا مجاز کیا گیا ہے۔

●●●

جیالوجیکل سروے آف انڈیا کی ایک اسکیم کے تحت ضلع بارہ بنکی میں معدنیات کی تلاش کے لئے ایک تعلیمی اور تربیتی پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک معاون ماہر ارضیات اس ضلع میں ۲ ماہ تک دورہ کریں گے اور گاؤں گاؤں جاکر مختلف مفید معدنیات کی پہچان اور ان کی دریافت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں گے۔

اس اسکیم کا مقصد معدنیات کی تلاش میں عوام کی دلچسپی کو بڑھانا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ۸ معدنیات کے نمونے کے بکس ضلع کے اہم مقامات پر رکھے جائیں گے تاکہ دیہی عوام ان معدنیات سے واقفیت حاصل کریں۔ اس سلسلہ میں سلائیڈوں کا بھی استعمال کیا جائے گا۔

سال رواں میں معدنیات کی تلاش کے لئے ملک میں پانچ اضلاع کا انتخاب کیا گیا ہے۔ دوسرے منصوبہ کی مدت میں ایسے ۲۵ پر چار واحدے قائم کرنے کی تجویز ہے۔

معاون ماہر ارضیات شری ایس سی کپور ۱۵ مارچ کو ضلع بارہ بنکی کے موضع مسولی سے دورہ شروع کریں گے اور ۲ ماہ کے اندر زیادہ سے زیادہ دیہاتوں کا دورہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

✡

نیا دور
لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۲

ویشاکھ ۱۸۸۱ شک
مئی ۱۹۵۹ء

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش لکھنؤ

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

چندہ سالانہ: تین روپئے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

عنوانات

اپنی بات

ہمارے قارئین "نیا دور" کی گزشتہ اشاعت میں پڑھ چکے ہوں گے کہ حکومت اتر پردیش نے حسب سابق اس سال بھی اردو تصنیفات پر اُن کے مصنفوں کو ۳۰۰۰ روپیہ کی مجموعی رقم بطور انعام دی ہے۔ آیندہ انعامات دینے کے لئے بھی اردو کی نئی تصنیفات متعلقہ شعبہ کو موصول ہو چکی ہیں۔ اردو مصنفین کو اُن کی تصنیفات پر انعام دینے کے علاوہ ڈاکٹر سمپورنانند کی حکومت معذور اور مستحق اردو ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد بھی دیتی رہتی ہے۔

اس سلسلہ میں محکمۂ اطلاعات حکومت اتر پردیش کی ایک تازہ پیشکش کا ذکر بھی ضروری ہے جس کا اشتہار نیا دور کی اسی اشاعت کے کوَر کے چوتھے صفحہ پر دیا جا رہا ہے اور جو اردو ادب میں حقیقتاً ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ ہماری مراد "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" سے ہے جو محکمۂ اطلاعات نے حال ہی میں شایع کی ہے۔ چار سو صفحات سے زیادہ کی یہ کتاب مشتمل ہے اُن قومی نظموں پر جو اردو میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں پر اور مختلف ادوار میں کہی گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے مجموعے اب سے پہلے بھی شایع ہو چکے ہیں لیکن "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" کی اہمیت اور خصوصیت یہ ہے کہ اول تو جامعیت کے لحاظ سے کوئی اور مجموعہ اس تک پہنچ نہیں پاتا، دوسرے اُس میں بعض نظمیں ایسی شامل ہیں جو مطبوعہ شکل میں کہیں دستیاب نہیں ہیں اور جنھیں بڑی جستجو کے بعد دہلی، رام پور، لکھنؤ وغیرہ کی لائبریریوں کی خاک چھان کر حاصل کیا گیا ہے۔ کتاب کے مرتب علی جواد زیدی صاحب ہیں اور شروع میں اردو شاعری کے سیاسی اور قومی رجحانات پر اُن کا ایک سیر حاصل تبصرہ بھی شامل ہے۔ کتاب کی قیمت صرف پانچ روپیہ ہے اور محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش سے مل سکتی ہے۔

یہ دیکھا جا رہا ہے کہ بعض شاعر یا مضمون نگار حضرات اپنی غزل یا مضمون بہ یک وقت متعدد رسائل اور اخبارات کو بہ غرض اشاعت روانہ کر دیتے ہیں اور وہ غزل یا مضمون یا تو بیک وقت مختلف جرائد اور اخبارات میں شایع ہو جاتا ہے یا ایک مہینہ کسی رسالہ میں چھپ جاتا ہے اور دوسرے مہینہ دوسرے رسالہ میں۔ پڑھنے والوں کو اس سے بجا طور پر یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جس رسالہ میں غزل یا مضمون بعد میں شایع ہوا وہ دوسرے رسالہ سے بغیر حوالہ کے نقل کر لیا گیا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی رسالہ اُس غزل یا مضمون کا کچھ معاوضہ پیش کرتا ہے تو وہ بخوشی منظور کر لیا جاتا ہے حالانکہ وہی غزل یا مضمون دوسرے اخبار یا رسالہ میں بغیر معاوضہ کے یا تو ایک مہینہ قبل شایع ہو چکا ہوتا ہے۔ یا اسی مہینہ دوسرے جریدے میں بھی ساتھ ساتھ چھپ رہا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدیران جرائد سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان کے ہر شاعر یا مضمون نگار کی غزل یا مضمون کے متعلق اسے یہ معلوم ہو کہ وہ اس سے قبل کسی دوسرے اخبار یا رسالہ میں چھپ چکا ہے۔ جس رسالہ کے مدیر کے پاس کوئی غزل یا مضمون بغرض اشاعت پہنچتا ہے اُس کے متعلق یہی سمجھا جاتا ہے کہ بھیجنے والے نے یہ غزل یا مضمون صرف اسی رسالہ کو بھیجا ہے۔ نیا دور کے پاس جو مضامین یا غزلیں وغیرہ موصول ہوتی ہیں اُن کے متعلق بھی یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ نیا دور کو مخصوص طور پر بھیجی گئی ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے کچھ قلمی معاونین اس صحافتی اصول پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ ہم ان حضرات سے یہ استدعا کرنا چاہتے ہیں کہ نیا دور میں جو مضمون یا غزل بھیجی جائے وہ صرف نیا دور کے لئے ہو۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری اس گزارش پر توجہ کی جائے گی اور ہمیں آیندہ شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ نیا دور میں شائع ہونے والی ہر غزل کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہو۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے اگر وہ تنقیدی ہوں تو اُن میں کسی ایسے پہلو پر لکھا جائے جس پر اس سے قبل زیادہ روشنی نہ پڑی ہو۔ فرسودہ مباحث پر اور ایسے موضوعات پر جن پر کافی لکھا جا چکا ہے، بار بار لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ نیا دور سیاسی نوعیت کے یا ایسے مضامین بھی شائع نہیں کرتا جن میں مختلف فیہ مسائل حاضرہ سے بحث کی گئی ہو۔ جیسا کہ کئی بار انھیں کالموں میں لکھا گیا ہے، اردو میں دوسرے موضوعات مثلاً مصوری، موسیقی، رقص، تعمیرات، سنگ تراشی، فلکیات، نجوم، تاریخ، فلسفہ، سائنس، ہند قدیم اور اتر پردیش کی ثقافت وغیرہ پر بھی بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے اور ہمیں امید ہے کہ نیا دور کو ان موضوعات پر بھی اوریجنل (ترجمہ نہیں) مضامین موصول ہوتے رہیں گے۔

ایڈیٹر

نواب سالار جنگ کے کتبخانہ میں واجد علی شاہ کی تصانیف

نصیر الدین ھاشمی

اودھ کے حکمران جان عالم واجد علی شاہ کو انگریز مورخ ایک رنگین مزاج، عیش و عشرت پسند، طرب و نشاط کا دلدادہ، بزم شاہد و ساقی کا متوالا ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کی اچھی باتوں اور نیک کرداری کا تذکرہ تو کیا اشارہ بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ ادیب، شاعر، اور مصنف بھی تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، آرٹ کی سرپرستی کی، موسیقی اور رقص کی قدر دانی فرمائی اور اردو ڈرامہ ان کی وجہ سے وجود میں آیا۔ اس لحاظ سے ان کے کارنامے قابل قدر ہیں۔ واجد علی شاہ جن کتابوں کے مترجم یا مصنف ہیں وہ نظم میں بھی ہیں اور نثر میں بھی۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب "ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں واجد علی شاہ کی حسب ذیل اکتیس کتابوں کا تذکرہ کیا ہے :-

چھ دیوان : شیوع فیض۔ قمر مضمون۔ سخن اشرف۔ گلدستہ عاشقان، ماہ ملک۔ نظم نامور۔

چھ مثنویاں: حزن اختر۔ خطاب بہ محلات۔ بنی۔ ناجو دولہن۔ دریائے عشق۔

مراثی: تین جلد۔ دفتر غم۔ سرمایۂ ایمان

قصائد المبارک۔ مباحثۃ النفس والعقل۔ صحیفۂ آسمانی۔ نفایح اخری عشق نامہ۔ رسالہ ایمان در بیان مصائب اہلبیت۔ دفتر پریشان۔ مقبل معتبر دستور واجدی۔ صورت المبارک ہیئت حیدری۔ جوہر عروض۔ ارشاد خاقانی

ان کتابوں میں سے ایک بڑا حصہ یعنی تین قلمی نسخے اور پندرہ مطبوعات، نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا تذکرہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے نہیں کیا ہے۔ مثلاً حیات القلوب، قصہ شہزادۂ ماہ پیکر۔ ہوگا طوائف شہزادۂ ماہ پیکر۔ حیات القلوب اور ناجو قلمی کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کا میں نے اپنی تالیف "کتب خانہ سالار جنگ کی وضاحتی فہرست" میں ذکر کیا ہے اس لئے یہاں تفصیلی طور پر صراحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی مگر چونکہ وضاحتی فہرست کا مطالعہ ہر ایک شخص نہیں کر سکتا اس لحاظ سے ان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۱) قصۂ شہزادۂ ماہ پیکر و ملکہ سیمتن۔ جو مطبوعات کتب خانہ ہذا میں ہیں ان میں یہ مثنوی شامل نہیں ہے۔ یہ ایک ضخیم مثنوی ہے جو ۱۰ x ۸ سائز کے ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک داستان نظمائی گئی ہے۔ داستان قدیم طرز کی حامل ہے۔ یعنی بادشاہ اور اس کا شہزادہ، عشق کی نیرنگیاں، معشوق کی تلاش میں سرگردانی، مصائب اور آلام کا پیش آنا، دیووں سے جنگ، پریوں کی امداد، طلسم کشائی اور بالآخر کامیاب وطن کی واپسی۔

اس مثنوی میں جو اشعار درج ہیں ان سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ یہ واجد علی شاہ کی پہلی تصنیف ہو ممکن ہو کہ یہ قیاس غلط ہو۔ لیکن پہلی تصنیف ہونے کے ثبوت میں حسب ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جو سبب تصنیف میں درج ہیں۔

غرض ایک دن دل میں یہ آیا خیال — کہ کچھ شعر موزوں کروں حسب حال
یہ بحر تقارب ہے بے شک وظن — یہی بحر دل میں ہوئی موجزن
ہوا دل جو غواص دریائے فکر — ہوئی آشنا تھاہ سے پاسے فکر

کچھ اشعار عشقیہ موزوں کئے　　پڑھا اُن کو نی الجملہ آواز سے
حسن یار خاں شاعر انتخاب　　کہ ہے شعر کا علم عیب و صواب
سخنداں، سخن رس، سخن سنج ہیں　　بہ ہر نیک سب سے وہ بے رنج ہیں
فصاحت بلاغت میں ایسا کہاں　　معانی اشارت میں کر دیں بیاں
مرے وہ بہت دن سے دمساز ہیں　　ملازم ہیں شفقت سے ممتاز ہیں
بہ قصد یوں ہوئے وہ کہ بہر خدا　　یہ اشعار پھر آپ پڑھیئے ذرا
پڑھے جب غرض اُن کے آگے جو شعر　　بہت مدح کی اور کہا ہے یہ سحر
اک ارشاد ہو مثنوی جاں فزا　　رہے نام نامی کا جس سے پتا
کہا میں نے کیا کہتے ہوا ے جناب　　کہاں میں کہاں نظم کا یہ عذاب
وہ دینے لگے مجھ کو قسمیں کمال　　کہا کیجیئے مثنوی کا خیال
ملازم جو مخصوص تھے پانچ چار　　ہوئے میرے درپے وہ سب ایکبار
غرض جب وہ مجمع بہ قصد سب ہوا　　تو میں ان کا جو یائے مطلب ہوا
مگر میں نے صاف اُن سے یہ کہدیا　　مجھے کچھ سلیقہ نہیں نظم کا
یہ بحر طبیعت نے مارا تھا جوش　　اسی وجہ سے بس یہ سارا تھا جوش
سخن میں یہ کہتے ہی چپ ہو رہا　　مگر نظم کا دھیان مجھ کو رہا
اُنہیں روزوں ایک امر ایسا ہوا　　کہ دل پر محبت کا صدمہ ہوا
ہوا ٹکڑے ٹکڑے دل ناصبور　　یہ شیشہ ہوا سنگ الفت سے چور
اسی دھن میں یہ قصہ کہنے لگا　　جگر خون ہو ہو کے بہنے لگا
جب اس مثنوی کو کہا صبح و شام　　ہوئی پندرہ دن میں آخر تمام

. . . .

تخلص جو اختر مقرر ہوا　　خدا کی عنایت سے اختر ہوا

اس مثنوی میں حسب منہاج قدیم اولاً حمد و نعت و منقبت ہے اور سبب تصنیف کے بعد نفس مضمون شروع ہوا ہے۔ آغاز یہ ہے۔

کروں حمد اللہ میں تر زباں　　اسی کی ہے توصیف میں ہر زباں

پروفیسر مسعود حسن صاحب نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ یہ مثنوی شایع ہو چکی ہے اور واجد علی شاہ کے ولی عہدی کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ زیر بحث نسخہ میں کئی صفحوں پر تصاویر کے لئے جگہ سادہ چھوڑی گئی ہے، مگر تصاویر بنائی نہیں گئی ہیں۔ پہلی سادہ جگہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے "اگر اینجا کشیدن تصویر منظور باشد جا برائے تصویر سادہ بگذارند" کاغذ دبیز، عمدہ ہے۔ جدول سنہری ہے۔ ممکن ہے کہ شاہی کتب خانہ کے لئے لکھا گیا ہو۔

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

ہر اک بیت جنت کی ہے انجمن　　ہر اک مصرع تر ہے سرو چمن
ہر اک لفظ گل ہے بلا گفتگو　　معانی الفاظ ہیں گل کی بو
رہے اس کا نام و نشاں حشر تک　　ہو مطبوع طبع جہاں حشر تک

(۲) حیات القلوب یا ریاض القلوب۔ یہ مخطوطہ بڑے سائز کے ۴۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ در اصل یہ فارسی حیات القلوب کا اردو ترجمہ ہے جس کو ریاض القلوب سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس طرح واجد علی شاہ اس کتاب کے مصنف نہیں بلکہ مترجم ہیں۔

یہ کتاب شایع ہو چکی ہے اور اس کے دو مطبوعہ نسخے بھی اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔ مگر اس مخطوطہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں واجد علی شاہ نے جلا وطنی کلکتہ کی تفصیل پیش کی ہے اور تاریخ وار بتایا ہے کہ کب وطن سے روانہ ہوئے اور کب کلکتہ پہنچے، کون کون ان کے ہمراہ تھے وغیرہ۔ یعنی یہ شاہی خود نوشتہ روزنامچہ ہے۔ مطبوعہ نسخہ میں یہ اضافہ نہیں ہے۔ اس روزنامچہ کا آغاز یہ ہے "تاریخ انتزاع سلطنت موروثی بست و ہفتم رجب المرجب ۱۲۷۲ھ شب پنجشنبہ۔ تاریخ داخل شدن دار الامارۃ کلکتہ۔ ہفتم ماہ رمضان ۱۲۷۲ھ"

یہ قلمی نسخہ نہایت نفیس کاغذ پر ہے۔ کاغذ پر سنہری گلکاری اور نقاشی میں جا بجا پھول پتوں، چرند و پرند کے نقشے ہیں۔ نہایت اہتمام سے اور پاکیزگی سے لکھا گیا ہے۔ ان امور سے واضح ہوتا ہے کہ شاہی کتب خانہ کا نسخہ ہے۔

(۳) ناجو۔ یہ کتاب فن موسیقی کے بارے میں ہے اور بڑے سائز کے ۲۸۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیباچہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ پندرہ باب میں کتاب تقسیم ہوئی ہے۔ ہر باب کو "صدا" سے اور فصل کو "آواز" سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

باب اوّل۔ اس میں تین فصلیں ہیں۔
باب دوم۔ دھرپد اس میں ۲۲ فصلیں ہیں۔
باب سوم۔ ساویرا۔ اس میں پانچ فصلیں ہیں۔
باب چہارم۔ سرگم۔ اس میں تین فصلیں ہیں۔
باب پنجم۔ چترنگ۔ اس میں دو فصلیں ہیں۔
باب ششم۔ ہوری۔ اس میں ۱۵ فصلیں ہیں۔

باب ہفتم ۔ خیال ۔ اس میں ۳۴ فصلیں ہیں ۔
باب ہشتم ۔ ترانہ ۔ اس میں ۵ فصلین ہیں ۔
باب نہم ۔ کچھ ۔ اس میں ۵ فصلیں ہیں ۔
باب دہم ۔ ٹھمری ۔ اس میں ۱۲ فصلیں ہیں ۔
باب یازدہم ۔ چاچر ۔ اس میں ۶ فصلیں ہیں ۔
باب دوازدہم ۔ ساتون ۔ اس میں ۲ فصلیں ہیں ۔
باب سیزدہم ۔ دادرا ۔ اس میں ۱۳ فصلیں ہیں ۔
باب چہاردہم ۔ ٹھمکہ ۔ اس میں ۹ فصلیں ہیں ۔
باب پانزدہم ۔ دوہرا ۔ اس میں ایک فصل ہے ۔

اس مخطوطہ میں فنِ موسیقی کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ہے بلکہ راگ اور راگنیوں کے تحت گیت لکھے گئے ہیں ۔ اس کا سن تصنیف ۱۲۶۵ھ ہے اور کتابت سن ۱۲۷۰ھ کی ہے ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ واجد علی شاہ نے اس کتاب کو ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف "نورس" کے مقابلہ میں لکھی ہے ۔ کتاب کے خاتمہ پر وزیر السلطان محمد امیر علی خاں کے تاریخی قطعے درج ہیں ۔ ایک قطعہ حسب ذیل ہے ۔

شبے گفتم ظہوری را کہ بر تو فضل من ایں بس
کہ مدوحم ز ممدوح تو آمد افضل و انفس
بگفتا کیست ممدوح تو گفتم رشک ممدوحت
شہ واجد علی سلطان عالم خسرو اقدس
بگفتا "نورس" ممدوح من ہم دیدۂ گاہے
بگفتم نام "ناجو" را مگر نشنیدۂ از کس
بگفتا وصف آں گفتم بہ از تالیف ممدوحت
بگفتا سال تاریخش بگفتم غیرت نورس

جس طرح ابراہیم عادل شاہ نے نورس میں مختلف راگ اور راگنیوں کے تحت گانے کے لئے گیت لکھے ہیں اسی طرح واجد علی شاہ نے اس کتاب میں مختلف راگوں کے تحت گانے کے لئے گیت لکھے ہیں ۔

واجد علی شاہ کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد حسب ذیل ہے ۔

(۱) دیوان اختر (۲) کلیات اختر (۳) مجموعہ رباعیات (۴) نظم ناجو (۶) ملک اختر (۷) دریائے عشق (۸) بحر الفت (۹) حیات القلوب (۱۰) ... اختر (۱۱) ہیئت حیدری (۱۲) ارشاد خاقانی (۱۳) مرثیہ (۱۴) مجموعہ مراثی (۱۵) بنی (۱۶) دولہن

ان کتابوں کی مختصر صراحت یہاں درج کی جاتی ہے ۔

(۱) دیوان اختر ۔ یہ واجد علی شاہ کا دیوان ہے جو ایام شہزادگی یعنی سنہ ۱۲۵۹ھ میں مطبع محمدی میں طبع ہوا ۔ اس کا سائز ۱۰ × ۶ ہے ۔ یہ ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس دیوان میں ردیف وار غزلیات ہیں ۔ چونکہ یہ پہلا دیوان ہے اس لئے اس میں زیادہ کلام نہیں ہے ۔ اس دیوان کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ۔

الٰہی عشق ترا میرے دل سے دور نہ ہوگا گناہ گار ہوں پر اب کبھی قصور نہ ہوگا

اور دیوان کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے ۔

مداد نالۂ دل سے سیاہ اختر ہیں ہمارے صفحۂ دیوان میں رات اتنی ہو

خاتمہ دیوان کے بعد ایک عبارت درج ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ دیوان شہزادہ ٔ نامدار کا ہے ۔ مرزا مہدی علی قبول نے اس کو محمد حسین کے مطبع محمدی میں طبع کیا ہے ۔ "آئینہ دل خجستہ کلام" سے تاریخ بھی نکالی ہے ۔ اس کا مختصر اقتباس ملاحظہ ہو ۔

"الحمد اللہ کہ دیوان فیض بنیانِ شاہزادہ نامدار گردوں اقتدار قطب شوکت ذوالجلال مرکز دائرہ دولت و اقبال : . . . . کاشفہ خصائص معقولٗ منقولٗ مرزا مہدی علی قبول کے کہ نمک خوار قدیم اس بارگاہ جم جاہ کا ہے پنچ تاریخ پندرھویں شہر شوال سنہ ۱۲۵۹ھ کے مطبع محمدی میں محمد حسین نے چھاپا . . . . . . "

(۲) کلیات اختر ۔ یہ واجد علی شاہ کے کلام کا مجموعہ ہے جو سنہ ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوا ہو ۔ مطبع کا نام درج نہیں ہے ۔ اس کا سائز ۱۵ × ۹ ہے اور ۹۹۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں مختلف النوع کلام شامل ہے ۔ قصائد ہیں ۔ غزلیات اور رباعیات بھی ہیں ۔ مسدس بھی ہیں ۔ مخمس بھی ہیں لیکن بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے ۔ آخر میں کئی اصحاب کے تاریخی قطعات بھی شامل ہیں ۔ غزلیات ردیف وار ہیں اور ہر غزل پر اولاً غزل کی بحر کی صراحت کر دی گئی ہے ۔

کلیات کا آغاز قصاید سے ہے ۔ پہلا قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے ۔

تمہارے چہرے سے ہوتا میں رشک صبح بلور بہشت مجھکو دکھاتا جمال دیدۂ حور

آنحضرت صلعم کی مدح اور حضرت علیؓ کی منقبت بھی ہے ۔ یہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہیں ۔ اس کے بعد غزلیات صفحہ ۳۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۸۹۹ تک پھیلی ہیں ۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں ۔

رخ اپنا اس کو دکھلایا تو ہوتا ذرا سورج کو شرمایا تو ہوتا

رہنے نہ دیا باپ کا سر گود میں ان کے   توڑا تھا لعینوں نے یہ بے پیماں سکینہ
گلزار حسینی ہوا پامال حوادث   پژمردہ خزاں سے ہے گلستان سکینہ

تیسرا دفتر غزلیات پر مشتمل ہے جو ردیف دار ہیں۔ یہ غزلیات سابقہ کلیات کے مابعد کی ہیں اس لئے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

رنگِ گل گلشن کو کہیں یاد نہ کرنا   اے مرغِ قفس شکوۂ صیاد نہ کرنا

سخاوت ایسی تو اچھی نہیں ہے اے اختر   جو دل بھی دیدیا آ کے کوئی لٹائے گا

ایک شب کی مجھے اے قاتل ناداں مہلت
مانگتا تیغ نظر سے ہوں میری جاں مہلت

کیا عفت و عصمت تری مشہور جہاں ہے
اے پردہ نشیں نام سے کرتا ہے قسلم آڑ

کھٹکتا ہے دل میں یہ مضمون رنگیں   نگاہوں میں اُس گل کے کیوں خار ہم ہیں
پائے الفت تری صورت سے پھسل جاتا ہے
بات رہ جاتی ہے اور وقت نکل جاتا ہے

اس نسخہ میں صفحہ ۲۸۵ و ۲۸۶ نہیں ہے۔ خاتمہ پر چند تاریخی قطعے ہیں جو مختلف شعرا کے کہے ہوئے ہیں۔ آخر میں مہتاب الدولہ کی ایک تضمین ہے جو واجد علی شاہ کے ایک شعر پر کی گئی ہے۔
ایک قطعۂ تاریخ کا آخری مصرعہ یہ ہے۔

ہے یہ کیا خوب لاجواب سخن

(۵) ہجو گنگا طوائف۔ یہ ہجو گنگا طوائف کے متعلق ہے۔ اس مثنوی کے ۲۰۰ شعر ہیں۔ آغاز یہ ہے:

میں ولیعہد جن دنوں میں تھا   اس زمانے کا ہے یہ سب قصا
فن الفت میں میں بھی یکتا تھا   محفل عشق میں تماشا تھا
نام سلطان عالم اپنا ہے   اپنی الفت کا سب میں چرچا ہے
اک زن فاحشہ تھی گنگا نام   راحت جاں بھی تھی وہ خوش انجام

اس میں جان عالم نے یہ واضح کیا ہے کہ ایک طوائف ان پر عاشق

ہوئی اور شوہر سے طلاق لے کر شاہی محل میں آ گئی۔ مگر نو دس سال کے بعد ایک شاہی مصاحب غلام رضا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ خاتمہ کے تین شعر یہ ہیں۔

بس خموش اختر خجستہ خصال   کس کا گھر کس کی بات کس کا وصال
زندگی یوں بسر کرو صاحب   اس کی الفت کو گھر کرو صاحب
گر سمجھی ہے مگر نصیحت ہے   فائدہ مند یہ نصیحت ہے

(۶) ملک اختر۔ یہ کتاب ۱۰×۶ سائز کے ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں رباعیات۔ قطعات۔ مرثیے۔ سلام۔ غزلیات اور مثنویات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ نثر بھی ہے۔ مسائل شرعی بھی ہیں۔ غرض ایک معجون مرکب ہے۔ کتاب ۱۲۹۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور طباعت کلکتہ میں ۱۲۹۶ھ میں ہوئی ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب میں منقسم ہے۔ ہر باب کو "صوبہ" سے موسوم کیا گیا ہے۔ پہلے صوبہ میں بحریں ہیں، ان کے وزن ہیں اور ان کی مثالیں دی گئی ہیں۔ دوسرا باب یا صوبہ رباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے تیسرا باب یا صوبہ فرد۔ مخمس۔ مسدس پر حاوی ہے۔ چوتھا صوبہ سلام اور غزلوں پر مشتمل ہے جو ردیف وار ہیں۔ پانچواں صوبہ مثنویات و رقعات پر مشتمل ہے۔ چھٹا صوبہ نثر اور جواب استفسار پر مشتمل ہے نمونہ ملاحظہ ہو۔
بحر مجتث مثمن مخبون۔ مفاعلن۔ فعلاتن۔ مفاعلن۔ فعلاتن۔

غم حسین کبھی مجھ سے بے اصول نہ ہوگا   سوائے درد جگر اور کچھ شمول نہ ہوگا
اگر نمائش ظاہر کے واسطے ہو یہ گریہ   تو پیش رب جہاں مطلقاً قبول نہ ہوگا

رباعیات تمام تر شہادت حضرت حسین علیہ السلام سے متعلق ہیں۔

ممکن نہیں دنیا میں الم سے ہو فراغ   لالے کا جگر ہے رنج و غم سے پر داغ
وہ خار عزائے گل حیدر ہے مجھے   جنگل نظر آتا ہے گلستان و باغ

غزلیات کے بعض شعر ہیں۔

عجب فسوں نگاہ کرشمہ ساز ہوا   کہ اک نظر سے یہ بندہ تو بے نیاز ہوا
مقابلہ ترے دل سے نہیں مرے دل کو   کبھی نہ ہمسر محمود بشہ ایاز ہوا
مصیبت میں، الم میں، رنج میں۔ آفت میں۔ کاہش میں
رہے گا نجم اختر تا کجا اے چرخ گردش میں

(۷) دریائے عشق۔ یہ ایک مثنوی ہے جو ۱۰×۶ انچ کے ۱۲ صفحا

پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں مطبع کانپور میں طبع ہوئی ہے۔ آغاز اس طرح ہوا ہے۔

کرتا ہوں میں حمد اس خدا کی ۔۔۔ جس نے ہستی کی یہ بِنا کی
حادث ہیں سبھی قدیم ہے وہ ۔۔۔ بے علم ہیں سب علیم ہے وہ
قدرت کی کچھ اس کے ہیں عجب رنگ ۔۔۔ انسان تو کیا فلک ہیں یاں دنگ

حمد و نعت و منقبت حضرت علی کے بعد سبب تصنیف ہے۔ اس کے بعد داستان کا آغاز ہوا ہے۔ سبب تصنیف یہ بتایا گیا ہے۔

اس وقت بلائیں میری لے کر ۔۔۔ کہنے لگی ایک ماہ پیکر
اچھے میرے پیارے جانِ عالم ۔۔۔ قربان تمہارے جانِ عالم
اک مثنوی نظم کر اور کہہ دو ۔۔۔ دنیا میں نہیں ہے تم سا خوش گو
قبل اس کے جو مثنوی کہی ہے ۔۔۔ وہ عشق سے سب بھری ہوئی ہے
افسانۂ عشق اس کا ہے نام ۔۔۔ آغاز بھی خوب اور انجام

داستان کی ہیروئن بادشاہ کی بیٹی کا غزالہ نام ہے اور ہیرو کا بھی ماہ رو نام ہے۔ یہ قدیم طرز کی عشقیہ داستان ہے۔ داستان میں دیو اور پریاں بھی شامل ہیں۔ ماہ رو غزالہ اور بعض پری کے ساتھ کامیاب وطن کو واپس ہوتا ہے اور ماں باپ سے ملتا ہے۔ ہر عنوان ساقی نامہ سے شروع ہوتا ہے بعض شعر یہ ہیں۔

ساقی کوئی ایسی مے پلادے ۔۔۔ مطلوب سے جو ہمیں ملا دے

اے ساقی آفتاب طلعت ۔۔۔ اے جام شراب عیش و عشرت

ساقی! مے وصل کا کوئی جام ۔۔۔ فرقت کے بہت سہے ہیں آلام

(۸) بحر الفت۔ یہ ۱۱ × ۷ اِنچ سائز پر ۲۲۳ صفحات کی مثنوی ہے۔ سلطان المطابع میں طبع ہوئی ہے تاریخ طباعت درج نہیں ہے۔ آغاز اس طرح ہوا ہے۔

اے قلم حمد اس خدا کی کر ۔۔۔ جس نے پیدا کئے ہیں شمس و قمر
ہر کواکب کی اس سے تزئین ہے ۔۔۔ روشنی بخش ماہ و پروین ہے

طویل حمد و نعت و منقبت حضرت علی کے بعد "مخاطب نمودن سامعین" کا عنوان ہے۔ اس کے بعد سبب تصنیف کا عنوان ہے۔ اس کے بعد داستان شروع ہوتی ہے۔ سبب تالیف کی صراحت سے

واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں واجد علی شاہ بادشاہ ہو گئے تھے اور اس مثنوی کے پہلے دو مثنویاں لکھ چکے تھے جن میں سے ایک فسانۂ عشق سے موسوم تھی۔ دوسری مثنوی کا نام درج نہیں کیا ہے۔ بعض اشعار یہ ہیں۔

قبل بھی کہہ چکا ہوں دو قصے ۔۔۔ دوستوں نے لگا لئے حصے
ایک کا نام ہے فسانۂ عشق ۔۔۔ درحقیقت ہو کارخانۂ عشق
سادہ دل مجھ کو جانتے تھے غریب ۔۔۔ یار سب لے گئے وہ نظم عجیب
بحر الفت ہوا جو نام اس کا ۔۔۔ مثل دریا ہوا کلام اس کا

قصے کا ہیرو شہزادہ حمر یرد ہے اور ہیروئن ماہ پروین ہے۔ دیو، پریاں، طلسم کشائی، سب کچھ داستان کے لوازمات میں شامل ہیں۔ مثنوی ساقی نامہ سے شروع ہوتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ساقیا بد مزاج ہو نہ ذرا ۔۔۔ یاد ہے عشق کا ہمیں تو مزا
شاہوں کو یہ فقیر کرتا ہے ۔۔۔ یہ گدا کو امیر کرتا ہے
نقش اس کا جگر پہ آفت ہے ۔۔۔ دو دلوں کے لئے قباحت ہے

(۹) حیات القلوب۔ اس کے قلمی نسخہ کا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے۔ مطبوعہ دو نسخے ہیں جن کی طباعت سنہ ۱۳۰۲ھ میں مطبع سلطانی میں ہوئی ہے۔ یہ کتاب کئی فصل میں منقسم ہے۔ آغاز میں چودہ شعر ہیں۔ اس کے بعد پوری کتاب نثر میں ہے۔ کتاب کے ترجمہ کرنے کی صراحت اور تاریخ ترجمہ بھی اس میں درج ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

جو ہے فارسی میں حیات القلوب ۔۔۔ جو اردو میں ہو تو نہایت ہو خوب
وہیں ترجمہ اس کا کرنے لگا ۔۔۔ مے ناب پیالوں میں بھرنے لگا
رکھا نام اس کا ریاض القلوب ۔۔۔ نہ ہو جس سے اختر کا طالع غروب
جواب بارہ سو پر ہوں اٹھانوے ۔۔۔ سن ہجری اے خوش سیر جان لے

حیات القلوب کا ترجمہ زمانہ مابعد میں "شفاء الصدور یدا لکریب" کے نام سے سید مجتبیٰ حسین نے بھی کیا ہے اور یہ کتاب مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ میں سنہ ۱۳۰۶ھ میں طبع ہوئی ہے۔ کتب خانہ میں اس کے بھی متعدد نسخے ہیں۔

(۱۰) حزن اختر۔ یہ مثنوی ۱۲ × ۸ سائز کے ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حمد و نعت و منقبت حضرت علی کے بعد اپنے قید خانہ کا حال اور اس کی تکالیف کو بیان کیا ہے اور پھر اپنی سلطنت

سے علیحدہ کئے جانے کا تذکرہ ہے یہ مثنوی عنوانات کے تحت ہے جو فارسی میں ہیں۔ چنانچہ آغاز نفس مضمون کا عنوان یہ ہے۔ "شروع داستان در انتزاع سلطنت و ہجرت"۔ اس عنوان کے بعد اس سلسلہ کے دوسرے جزئی عنوان ہیں۔ جو جو اصحاب اور بیگمات اور فرزند وغیرہ ہمراہ تھے ان کی تفصیل مختلف عنوانات کے تحت دی گئی ہے۔ اس کو واجد علی شاہ کی خود نوشتہ داستان حیات کہنا چاہیئے۔ اپنی گرفتاری کا عنوان یہ قرار دیا ہے۔ "گفتار در آمدن فوج انگریزی بنا بر گرفتاری راقم"۔

انگریزی فوج کی آمد پر جب شور و غل مچا تو ؎

کہا میں نے کیا شور و غوغا ہے یہ   یہ کون آیا ہے کیسا چرچا ہے یہ

کوئی بولا کیا کہیئے اے بادشاہ   علی نقی خاں ہوئے قید آہ

کہا میں نے اتنا توقف تو کر   نہا لوں الگ میں ذرا آن کر

سبھوں نے کہا غسل کر لیجئے   جو کرنا ہو وہ بعد پھر کیجئے

سکتر جو تھے لاٹ کے پیشکار   وہ کہنے لگے مجھ سے اے شہریار

کہ چلیے میرے ساتھ یہ حکم ہے   نہ کیجے سوا اس کے اب کوئی شے

کہا میں نے کیا وجہ فرمایئے   قصور آپ بندے کا بتلایئے

کہا حکم سرکار ہے یہ ہوا   کہ کچھ شبہ سرکار کو آگیا

جو تھا اڈمنسٹن سکتر کا نام   میں کرنے لگا ان سے پھر یوں کلام

کہ میرا تو ہرگز نہیں ہے قصور   میں گھنگروں سو رہتا ہوں تو دور دور

مفصل تو بتلایئے اس کا حال   مجھے رنج ہے اس سخن سے کمال

کہ مجھ سے ایسی ہوئی کیا خطا   ہوئے لاٹ صاحب جو مجھ پر خفا

انہوں نے کہا اتنا معلوم ہے   کہ غیروں کی شرکت کی کچھ ہو معلوم ہے

یہ مثنوی سنہ ۱۲۷۹ھ میں کلکتہ میں طبع ہوئی۔

(۱۱) بیعت حیدری۔ یہ مثنوی ۱۳ × ۸ ½ سائز کے ۱۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ٹائیٹل کا صفحہ اور خاتمہ کا صفحہ شریک نہیں ہے۔ یہ مثنوی "حملۂ حیدری" کا ترجمہ ہے۔ یہ مثنوی بھی عنوانات کے تحت ہے۔ عنوانات اردو میں لکھے گئے ہیں۔ حمد و نعت کے بعد حضرت علیؓ کی پیدائش کا بیان ہے۔ پھر مناجات ہے۔ اس کے بعد اپنا مختصر حال نظم کیا ہے۔ اس کے بعد نفس مضمون شروع ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ سنہ ۱۲۶۵ھ میں ہوا ہے۔ چنانچہ اس کو شعر میں بیان کر دیا گیا ہے۔

کہی نظم جب میں نے اے نکتہ سنج   تو ہجرت سے تھے بارہ سو شصت و پنج

"حملۂ حیدری" کو اردو کا جامہ پہنانے کی صراحت یہ ہے۔

کہ وہ کر جو ہو بعد نام آوری   لگا دیکھنے حملۂ حیدری

زبس فارسی نظم تھی بے شمار   دکھاتا تھا باغ امامت بہار

میرے دل میں تجویز یہ آگئی   اکیلی طبیعت جو گھبرا گئی

مضامین خوش اس میں بھر لیجئے   اسے نظم اردو میں کر لیجئے

نفس مضمون کا آغاز یہ ہے۔

"آغاز داستان صدق بیان مبعوث ہونا سرور کائنات، خلاصۂ موجودات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا واسطے ہدایت خلق کے"

نگارندۂ داستان کہن   یہ لکھتے ہیں راوی شیریں دہن

وہ قصہ سناؤں کہ ہو جس میں رنگ   طبیعت میں ہو دوستوں کی اُمنگ

وہ قصہ کہ دل جس سے مسرور ہو   وہ قصہ سراسر جو پُر نور ہو

وہ قصہ چمن کی دکھائے بہار   یہ قصہ جہاں میں رہے یادگار

یہ رکھتے تھے عادت شہ انبیا   نہ رکھتے تھے اکثر بدولت سرا

حرا تھا پہاڑوں میں جس کا لقب   وہاں جاتے تھے شاہ عالی نسب

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے یہ نسخہ نامکمل ہے کیونکہ جن اشعار پر کتاب ختم ہوئی ہے وہ یہ ہیں۔

تری رہنمائی کا طالب ہوں میں   غرور اور نخوت سے تائب ہوں میں

ترے حکم سے دین جاری کیا   سبک تیر کو میں نے بھاری کیا

اس کے بعد کے اشعار اس نسخہ میں نہیں ہیں یعنی جنگ بدر کے حالات تک یہ مثنوی ہے۔

اس مثنوی کا نمونہ پیش کرنا طوالت کا موجب ہے۔ صرف چند شعر لکھے جاتے ہیں۔ ابو طالب آنحضرت صلعم کو قریش کے ارادے سے مطلع کرنے اور دین اسلام کی دعوت کو چندے موقوف کرنے کی خواہش کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا جواب ملاحظہ ہو۔

کہا سرورؐ پاک نے اے چچا   مجھے حکم افشا ہے اس راز کا

نہ تھا حکم افشا عبادت کا جب   بجا لایا اخفا وہ سب حکم رب

جدا ہو اگر تن سے میرا یہ سر   مجھے کچھ نہیں اس کا خوف و خطر

میرے ساتھ فضل الٰہی رہے   نصیب عدو روسیاہی رہے

خدا فلک پہ مرے اسباب ہے   خدا میرا ہر دم مددگار ہے

(۱۲) ارشاد خاقانی۔ یہ کتاب ۱۱ ½ × ۶ ½ سائز کے ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تصنیف ۱۲۶۹ھ میں ہوئی اور "حکم اختر" اس کی تاریخ تصنیف ہے۔ کتاب میں علم عروض اور قوافی کا بیان ہے۔ کتاب کئی باب اور فصلوں میں منقسم ہے۔

باب کو رکن سے موسوم کیا گیا ہے۔ نیز سولہ بحروں کا ذکر ہے۔ ہر ایک بحر کے متعلق پوری تفصیل دی گئی ہے۔

(۱۳) مرثیہ در حال شہادت جناب امام حسین علیہ السلام۔ اس میں صرف ایک مرثیہ ہے جس کے ۸۹ بند ہیں۔ مطبع سلطانی میں طبع ہوئی ہے۔ تاریخ طباعت درج نہیں ہے۔ صرف یہ عبارت ہے۔
"در مطبع سلطانی باہتمام خانہ زاد رئیس الدولہ زیور طبع آراست۔"

پہلا بند یہ ہے۔

روئے شہ دیں مصحف ربِّ دوسرا ہو   قرآں یہ ناطق ہو وہ خامہ سے لکھا ہے
یہ شرح ہو وہ متن، وہ شرط اور یہ جزا ہو   وہ راہِ خداوند ہے یہ راہ نما ہے
شبیرؑ سے فرقان کے اوصاف عیاں ہیں
مجمل جو معانی کے ہیں وہ صاف عیاں ہیں

یہ مرثیہ بڑے سائز کے ۳۱ صفحے میں آیا ہے۔

(۱۴) مجموعہ مراثی۔ یہ کتاب ناقص ہے یعنی ٹائیٹل کا صفحہ نہیں ہے۔ پہلے صفحہ سے ایک مرثیہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے ۱۰۰ بند ہیں جو صفحہ ۴۳ پر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد صفحہ کا نشان ۸۲۹ دیا گیا ہے۔ صفحہ ۸۲۹ سے جو مرثیہ شروع ہوتا ہے وہ تیرھواں بند ہے۔ ۱۳۴۴ صفحہ پر کتاب ختم ہوتی ہے۔ اس میں کئی طویل مرثیے ہیں۔ مرثیے الگ الگ عنوان کے تحت لکھے گئے ہیں اور سب کے سب مسدس ہیں۔ پہلے مرثیہ میں تو فارسی کی آمیزش بہت زیادہ ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے۔

لباس سنج سے پوشیدہ ماہ نو پایا   پیام حزن ملک آسمان سے لایا
فلک ورد سے کروبیوں کو غش آیا   شب سیاہ ہوا آفتاب کا سایا
جہاں چرخ پہ ہنگام کرب بیزی ہے
مجور سنج کرو وقت اشک ریزی ہے

آخری بند کے بعد حسب ذیل عبارت ہے۔

"الحمد للہ والمنۃ کہ مرثیہ نو تصنیف حضرت اقدس و اعلیٰ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ بتاریخ بست و پنجم ماہ ذی الحجہ ۱۲۸۷ ہجری در مطبع سلطانی باہتمام خانہ زاد رئیس الدولہ طبع پوشید۔"

اس کے بعد ۸۲۹ کے نشان سے آغاز ہوا ہے۔ پہلا بند حسب ذیل ہے۔

ہاں اے قلم عطر فشاں دیکھنا ہشیار   لکھ اس کا سراپا کہ جو ہو گل کا مددگار
ہے شکل خوش اقبال دلِ حیدر کرار   سوتا ہے عبث، کھول ذرا دیدۂ بیدار
کون آتا ہے یہ کس کے سراپا کا بیاں ہے
گردوں پہ خمیدہ قلم کا کہکشاں ہے

یہ مرثیہ ۱۳۶ بندوں پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد خاتمۂ کتاب تک کئی اور مرثیے ہیں۔ کتاب کا خاتمہ جس مرثیہ پر ہوتا ہے اس کے ۹۵ بند ہیں۔ آخری بند اور خاتمہ کتاب یہ ہے۔

اب اشک ابر قلم ہو سیاہی روتی ہو   بحور رنج میں دل کو فنا ڈبوتی ہے
ہر ایک جو مصیبت سے جان کھوتی ہو   نہ آنکھ چین سوا اس درد و غم میں سوتی ہے
خموش اختر غم کیں الم کی شدت ہے
وفور حزن و تعب سے جنوں کی نوبت ہے

اس کے بعد کوئی صفحہ نہیں ہے۔ کتاب پر ایک بڑی مہر بھی ثبت ہے مگر پڑھی نہیں جاتی۔

(۱۵) بنی۔ یہ موسیقی کی کتاب ہے جو ۱۰ × ۷ سائز کے ۴۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبع سلطانی کلکتہ میں طبع ہوئی ہے۔ اس میں چھ باب ہیں اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ گتوں کی تفصیل بھی ہے۔ کتاب نثر میں ہے گتوں کے نام بھی رکھے گئے ہیں اور ان کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ سولہ گتیں ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) سلامی گت۔ (۲) دہنا بشنہ گت (۳) بایاں بسۃ گت (۴) فرمائی گت (۵) مودب گت (۶) نازک گت (۷) غمزہ گت (۸) پیشوا نہ گت (۹) کٹلی گت (۱۰) لکھنوا گھونگھٹ گت (۱۱) سادھا گھونگھٹ گت۔ (۱۲) بنگالہ گھونگھٹ گت (۱۳) بندی سلامی گت (۱۴) داہنی بانکی گت (۱۵) بائیں بانکی گت (۱۶) پیاری گت۔ ہر تصویر کے بعد تفصیلی صراحت بھی ہے۔ ان کے علاوہ اور پانچ گتوں کا ذکر ہے جو یہ ہیں۔
پھری گت۔ بھنگا گت۔ ٹھینگا گت۔ لنگا گت۔ من سکھ گت۔

دوسرا باب تال اور ضیاشے ہے۔ اس میں دو فصلیں ہیں۔ تیسرا باب ناچ اور ضیاشے ہے۔ اس میں دو فصلیں ہیں۔ چوتھا باب رہس کے بیان میں ہے۔ اس میں دو فصلیں ہیں۔ پانچواں باب بھنڈیتوں اور مضحک نقلوں کا ہے۔ اس میں دو فصلیں ہیں۔ چھٹا باب خطاب بہ محلات و بیگمات پر مشتمل ہے۔ اس میں دو فصلیں ہیں۔

اس صراحت سے واضح ہوگا کہ آخری دو فصلیں موسیقی سے بالکلیہ غیر متعلق ہیں۔ خاتمہ کتاب پر کئی تاریخیں ہیں۔ ۱۸ صفر ۱۲۹۴ھ میں کتاب ختم ہونے کی تاریخ درج ہے۔

(۱۶) دولہن۔ یہ بھی موسیقی کی کتاب ہے اور ۱۰×۶ سائز کے ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ میں گیت لکھے گئے ہیں۔ آخر میں تاریخی قطعے درج ہیں جو ۲۰ صفحے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ ایک کتاب تاریخ غزالدین بھی ہے۔ یہ کتاب واجد علی شاہ اور ان کے بیگمات کے خطوط پر مشتمل ہے۔ ایک اور کتاب جو واجد علی شاہ کے حکم سے لکھوائی گئی تھی "سرور سلطان" ترجمہ شمشیر خانی ہے۔ اسے رجب علی سرور نے واجد علی شاہ کے حکم سے مرتب کیا تھا۔ اس کے تین نسخے سالار جنگ لائبریری میں ہیں جو تین مختلف مطابع میں مختلف سنین میں طبع ہوئے ہیں یعنی ایک نسخہ ۱۲۶۸ھ میں مطبع مسیحائی میں مسیح الزماں نے طبع کیا۔ دوسرا نسخہ مولوی محمد حسین نے مطبع محمدی میں طبع کیا۔ تیسرا نسخہ مطبع سلطانی میں لکھنؤ میں طبع ہوا۔ آخر الذکر دونوں کا سن طباعت درج نہیں ہے۔

✡

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ (۱۹۵۶ میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "نیا دور" کے حقوق مالکانہ وغیرہ کے بارے میں حسب ذیل تفصیل شائع کی جاتی ہے۔

۱۔ شائع ہونے کی جگہ ... ... لکھنؤ

۲۔ اوقات اشاعت ... ... ماہوار

۳۔ پرنٹر کا نام اور قومیت اور پتہ ۔ شری ایم جی بھوم : ہندوستانی ۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری ۔ اتر پردیش ۔ الہ آباد

۴۔ پبلشر کا نام اور قومیت اور پتہ ۔ شری بھگوتی شرن سنگھ ۔ ہندوستانی ۔ ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات اتر پردیش ۔ لکھنؤ

۵۔ اڈیٹر کا نام اور قومیت ۔ شری صباح الدین عمر ہندوستانی محکمہ اطلاعات لکھنؤ

۶۔ اُن اصحاب کے نام جو اس اخبار کے مالک یا حصے دار ہیں یا اس کے تمام سرمایہ کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصے دار ہیں ۔ } "نیا دور" سرکاری جریدہ ہے اس لئے اس بارے میں اُن اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس اخبار کے مالک ہیں یا حصے دار ہیں یا اس کی ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصے دار ہیں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں بھگوتی شرن سنگھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیل میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہے۔

دستخط) بھگوتی شرن سنگھ

پبلشر

غزل

آل احمد سرور

مری نوا میں تلاطم بھی ہے قرار بھی ہے
خرد کا پاس بھی خوابوں کا کاروبار بھی ہے

ہزار بار بہاروں نے دُکھ دیا ہم کو
نہ جانے کیا ہے بہاروں کا انتظار بھی ہے

جہاں میں ہوگئی ناحق تری جفا بدنام
کچھ اہلِ شوق کو دار و رسن سے پیار بھی ہے

مرے لہو میں اب اتنا بھی رنگ کیا ہوتا
طرازِ شوق میں رنگِ رُخِ نگار بھی ہے

مرے سفینے کو ساحل کی جستجو ہی نہیں
ستم یہ ہے کسی طوفاں کا انتظار بھی ہے

چمن میں اِک نہیں آئینہ میری مستی کا
گواہ جوشِ جنوں کی زبانِ خار بھی ہے

غرورِ عشق، غرورِ وفا، غرورِ نظر
سرور تیرے گناہوں کا کچھ شمار بھی ہے

غزل

نشورؔ واحدی

اپنی بھی داستانِ محبت یوں ہی چلی
کچھ دن وہ ملتفت نہ ہوئے بے رُخی چلی

گزرا تھا اُس گلی سے کہ زخمی ہوئی حیات
جانے کہاں سے پھول گرے پنکھڑی چلی

سب منتظر تھے جلوہ گہِ ناز کے قریب
جس زندگی کو آپ نے آواز دی، چلی

کہنے کو بے وفا ہے نسیمِ سحر، مگر
مُڑ مُڑ کے وہ بھی سوئے چمن دیکھتی چلی

آخر کو منزلِ غمِ دوراں میں رہ گئی
دو چار گام ساتھ مرے زندگی چلی

تاریک تر ہیں کوچہ مشرق کے پیچ و خم
روشن ہوا جہاں تو اِدھر روشنی چلی

ہے تیرے دم سے رونقِ منزل کی داستاں
اے گردِ راہ ساتھ مرے تو بھلی چلی

جب عاشقی میں وقت پڑا اہلِ شوق پر
نے عقل کام آئی نہ دیوانگی چلی

پھولوں کی انجمن کا وہاں ذکر کیا نشورؔ
کانٹوں پہ پاؤں رکھ کے جہاں زندگی چلی

✡

لکھنؤ کے ادبی چوراہے

نادم سیتاپوری

ادیبوں، شاعروں، مصنفوں، ناشروں اور کتب فروشوں میں ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ جب تک چھاپہ خانے ایجاد نہیں ہوئے کتب فروشی باقاعدہ کاروبار کی شکل اختیار نہ کر سکی۔ پھر اس دور کے خواص عام طور پر عوامی زندگی سے کچھ ایسا قریب بھی نہیں تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت یا تو امراء اور جاگیرداروں کے درباروں میں گذرتا یا خوددارانہ قناعت اور فقر و فاقے میں۔

پہلی جنگ آزادی یا ۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب کا سماجی اور تہذیبی ردعمل یہ ہوا کہ جو لوگ عوامی زندگی سے دور ہو چکے تھے آہستہ آہستہ عوام سے قریب آنے لگے۔ ہوٹلوں اور کلبوں کا تو زیادہ رواج تھا نہیں، ادبی اور علمی زندگی چھوٹے موٹے اخبارات اور رسائل کے بے ترتیب اور غیر منظم دفتروں کی طرف متوجہ ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی بیس پچیس سال کے اندر اندر لٹے ہوئے لکھنؤ اور تباہ حال دلی کا جمود بہت کچھ دور ہو گیا۔ نولکشور پریس گو اپنی عظیم افادیت اور اہم کارکردگی کے لحاظ سے اس وقت ایک بہت بڑی خصوصیت رکھتا تھا مگر اس کے دفاتر مرکزی شہر سے کچھ اتنا دور تھے کہ وہاں کسی قسم کی ادبی زندگی میں کوئی اجتماعی جماؤ نہ پیدا ہو سکا۔ اس کے برخلاف وسطی شہر میں جن اخبارات و رسائل کے دفتر یا کتب فروشوں کی دکانیں قائم تھیں ان میں اچھی خاصی ہماہمی رہتی۔

انقلاب اٹھارہ سو ستاون سے پہلے سارے لکھنؤ میں دس بارہ چھاپے خانے اور غالباً گنتی کی دو ہی چار کتابوں کی دکانیں تھیں۔ اس دور کے مشہور کتب فروشوں میں منشی محمد بخش خاں مالک مطبع محمدی اور منشی مصطفےٰ خاں، مالک مصطفائی پریس کا ذکر اب بھی کبھی کبھی سننے میں آجاتا ہے۔ منشی محمد بخش خاں خواجہ آتش کے خاص دوستوں میں تھے۔ خواجہ کا دیوان سب سے پہلے انھیں کے مطبع محمدی میں چھپا تھا اور گوشہ نشین و قناعت پسند آتش اپنی زندگی میں اگر وضعداری اور پابندی کے ساتھ روزانہ کسی کے یہاں جاتے رہے تو وہ بھی یہی منشی خدا بخش خاں ہی تھے۔ مشہور ہے[1] کہ حسب معمول ایک دن خواجہ منشی صاحب کے مطبع محمدی واقع تکیہ شاہ فصیح میں بیٹھے ہوئے تھے، گڑگڑی سامنے رکھی ہوئی تھی کہ دلی کے ایک صاحب تشریف لائے اور "دیوان آتش" کی ایک جلد طلب کی۔ منشی صاحب

---

[1] بعض لوگ اس واقعہ کو منشی مصطفےٰ خاں مالک مطبع مصطفائی کی طرف منسوب کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے کیونکہ مطبع مصطفائی ۱۸۶۱ء میں قائم ہوا اور خواجہ آتش ۱۸۴۷ء میں وفات پا چکے تھے۔

نے دہلوی گاہک کے سامنے دیوان آتش پیش کرتے ہوئے کہا۔ اور ناسخ کا دیوان بھی موجود ہے اگر فرمائیے تو پیش کروں۔؟

"جی نہیں ـــــ" دہلوی گاہک نے دیوان آتش کی قیمت ادا کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ کم بخت آتش جیسا کہہ جاتا ہے، کوئی دوسرا کیا کہے گا"؟

خواجہ کی نازک مزاجی ضرب المثل تھی۔ منشی صاحب ڈر رہے تھے کہیں خواجہ کو جلال نہ آجائے۔ بارے ان کا اندیشہ غلط ہی ثابت ہوا۔ خواجہ بدستور گڑگڑی سے شغل فرماتے رہے۔ جب دہلوی گاہک نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو زور سے قہقہہ لگایا "بھئی واللہ ـــ مجھے تو ساری زندگی کبھی ایسی داد نہیں ملی"۔

اس کے بعد جب لکھنؤ دوبارہ اجڑ کر بسا تو چوک اور نخاس کے وسطی علاقے میں ادبی زندگی بھرپور انگڑائیاں لینے لگی۔ کتب فروشوں کی بہت سی نئی دکانیں کھل گئیں۔ کئی درجن اخبارات و رسائل جاری ہوگئے۔ اشفاق حسین نامی ایک شخص نے اخبارات کی ایجنسی بھی لے لی۔ اب تک لکھنؤ بھر میں کوئی اخباری نمائندہ نہیں تھا۔ انھیں اشفاق حسین نے نامہ نگاری کا کام بھی شروع کردیا یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے لکھنؤ میں جگہ جگہ ادبی محفلیں جمنے لگیں جہاں اس دور کے تمام عہد آفریں مشاہیر اور کاملان روزگار سمٹ آئے تھے۔

"اودھ پنچ" کا دفتر تو منشی سجاد حسین مرحوم کے مکان واقع نوان دوگا میں تھا مگر انھوں نے شام اودھ پریس، گولہ گنج میں قائم کیا تھا۔ کٹرہ ابوتراب خاں میں امیر مینائی کا مکان بھی ایک اہم ادبی مرکزیت کا حامل تھا جہاں سے امیر کے صاحبزادے محمد احمد قمر مینائی ایک ہفتہ وار اخبار "رہنما" اور دوسرا ماہانہ گلدستہ "دامن گلچیں" نکالا کرتے تھے۔ "ظریف" اور "دلگداز" کا دفتر مولوی عبدالحلیم شرر کے مکان جھوائی ٹولہ پر تھا۔ اسی طرح اخبار لدکہلہ حاجی محمد اشرف سکریٹری انجمن علمی کا اختر ہند پریس اور انجمن کا دفتر کٹرہ محمد علی خاں (محمود نگر) میں تھا۔ ۱۸۸۲ء میں منشی نثار حسین نے ماہانہ "پیام یار" جاری کیا۔ ان کے اخلاق میں نہ جانے کیسی مقناطیسی کشش تھی کہ چند ہی روز میں لکھنؤ کے تمام ارباب کمال ان کے گرویدہ ہوگئے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، حکیم ضامن علی جلال، پیارے صاحب رشید، منشی سجاد حسین، لڈن صاحب خورشید، ابو صاحب جلیس، شوق قدوائی، مولانا شبلی نعمانی غرضیکہ کوئی مصنف، ادیب یا شاعر ایسا نہیں تھا جو ان کی چھوٹی سی عطر کی دکان پر نہ پہونچتا ہو جو بہ یک وقت لکھنوی عطریات کی دکان بھی تھی اور ہندوستان کے مشہور گلدستہ شعر و سخن "پیام یار" کا دفتر بھی۔ جن لوگوں نے انیسویں صدی کے آخری دور میں لکھنؤ کی بہاریں دیکھی ہیں وہ منشی نثار حسین کی اس چھوٹی سی دکان کو لکھنؤ کا سب سے بڑا "ادبی چوراہہ" بیان کرتے ہیں جہاں صرف لکھنؤ ہی کے نہیں سارے ہندوستان کے مشاہیر کبھی نہ کبھی ضرور پہونچے ہیں۔

"پیام یار" کی ہندوستان گیر شہرت اور مقبولیت نے چند ہی سال کے اندر لکھنؤ سے درجنوں "گلدستے" نکلوا دئے۔ انجمن تہذیب کی طرف سے "بہار انجمن" جاری کیا گیا۔ عاشق حسین عاشق نے "رعنا" اور "مرقع نگار" نکالے۔ عباس حسین ہوش نے "فیض سخن" منشی درگا پرشاد نے "خنجر عشق" سعادت علی موج نے "انتخاب" تصور حسین خاں نے "گلدستہ عشاق" اور معصوم علی محشر (مالک کارخانہ زردوزی) نے "تحفۂ عشاق" جاری کیا۔ کارخانۂ اصغر علی محمد علی" کی طرف سے مرزا محمد تقی (عرف مچھو بیگ عاشق) کی ادارت میں ماہنامہ "بہار ہند" کے اجراء کا اعلان ہوا۔ مگر "پیام یار" کی شہرت اور مقبولیت میں شمہ برابر کمی نہ ہوئی۔ منشی نثار حسین کی دکان تقریباً نصف صدی تک بدستور لکھنؤ کا سب سے اہم ادبی مرکز بنی رہی۔

"ہسٹری آف اردو لٹریچر" (رام بابو سکسینہ) کے مترجم جناب مرزا محمد عسکری مرحوم مولانا شبلی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا (شبلی) میرے حال پر ایک خاص نظر عنایت و شفقت رکھتے تھے۔ مجھ کو ان کے استغراق کتب بینی کا ایک چشم دید واقعہ یاد ہے جس کا ذکر اس موقع پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

منشی نثار حسین مرحوم ایڈیٹر "پیامِ یار" مولانا (شبلی) سے ایک بے تکلف دوست تھے۔ ان کی چوک میں عطر کی دکان تھی۔ جب مولانا (شبلی) لکھنؤ میں قیام کرتے تو "سبزی منڈی" میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر احباب کمال کا مجمع ہو جاتا تھا جس میں مولوی عبدالحلیم شرر، شوق قدوائی، لڈن صاحب خورشید، ابو صاحب جلیس اور شہنشاہ حسین رضوی وکیل مرحوم اور بے تکلف احباب جمع ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے۔ وزیر تمبولی کی خوش ذائقہ گلوریاں اور حسین بخش ساقی کے معطر حقے سے احباب کی ضیافت کی جاتی۔ کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ پتلون ڈالے عینک لگائے آنکھیں چمکاتے اور ہنستے اس جلسے میں شریک ہو جاتے اور اپنی پر لطف باتوں سے سب کو محظوظ کرتے۔

"ایک دن یہ سب یارانِ طریقت جمع اور مولانا (شبلی) بھی تشریف فرما تھے۔ شاید چھٹی یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی، وقت ۰ ۰ ۔ مبجے شام۔ چوک میں بڑا مجمع تھا۔ تعزیے مع جلوس اور باجوں وغیرہ کے نکل رہے تھے۔ شور و غل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی سب لوگ اس سیر میں مشغول مگر مولانا (شبلی) دکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مقابلے میں جو کسی کاتب سے لکھائی گئی تھی اسقدر مشغول اور منہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا اور اپنا کام کرتے رہے یہاں تک کہ پوری کتاب اسی حالت میں تقریباً دس گیارہ بجے تک ختم کر دی۔" (فٹ نوٹ صفحہ ۶۰۶ "تاریخ ادب اردو" مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ)

میں نے جب ہوش کی آنکھ کھولی تو نہ منشی نثار حسین باقی تھے نہ ان کی عطر کی دکان ــــ اور نہ "پیام یار"۔ــــ خواجہ عبدالرؤف عشرت بھی چراغِ سحر کی طرح آخری ہچکی کے منتظر تھے۔ کوئی ستر بہتّر سال کی عمر ہوگی جب میں نے چوک کی ایک چھوٹی سی دکان میں انھیں پہلی بار دیکھا تھا۔ گاڑھے کا سفید کرتا، بڑی موری کا پائجامہ، خشخشی داڑھی۔ گورا چٹا رنگ ابتیسی ختم ہو چکی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں کثرتِ مطالعہ سے دھنس گئی تھیں۔ دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔

دوسری بار بوڑھے ریاض (خیرآبادی) کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا۔ عشرت اور ریاض کی نگاہوں سے ایک پرشباب ماضی کے دھندھلکے جھانک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سامنے والے کوٹھے سے جوان سال اور پاکباز ریاض پر نگاہ ناز کے ترکش خالی کئے جا رہے ہیں اور "شاعرِ خمریات" ایک پُر وقار سنجیدگی کے ساتھ ایک چپ میں ہزار بلائیں ٹال رہا ہے۔ پھر میری نگاہیں ماضی کے اس رومان تک پہونچ گئیں جب یہی ریاض سفید جامدانی کا انگرکھا پہنے ہوئے اسی کوٹھے کے نیچے سے گذر رہا ہے۔ اوپر سے پان کی پیک ہولی کے رنگ کی طرح سر سے پاؤں تک شرابور کر دیتی ہے۔ ریاض نے مخمور نگاہیں اٹھائیں ــــ طوائف اسی ایک نگاہ کی منتظر تھی۔ مسکرا کر پوچھا۔

"کیا ہے؟"

ریاض کے چہرہ پر نہ تو مسکراہٹ تھی نہ غصہ۔ سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"تھوک ہے ــــ!"

اور آگے بڑھ گئے ــــ!

خواجہ عشرت سراپا انجمن تھے۔ ان کے پاس بیٹھ جانے کے بعد اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ قدیم لکھنؤ کی تاریخ تھے۔ ہزاروں تاریخی اور نیم تاریخی واقعات انھیں اس طرح یاد تھے جیسے خود ان کی آنکھوں کے سامنے گذر رہے ہوں۔ منشی نثار حسین کے بعد وہ جمی جمائی بساط خواجہ عشرت کی دکان پر اٹھ آئی تھی۔ باہر سے جو لوگ لکھنؤ آتے وہ خواجہ عشرت سے ضرور ملتے۔ شبلی نعمانی اور ریاض خیرآبادی کے لئے تو ممکن ہی نہیں تھا کہ لکھنؤ میں ہوں اور سہ پہر کو عشرت کی دکان پر نہ پہونچیں۔ روزانہ "ہمدم" کی ادارتی ذمہ داریوں کے باوجود سید جالب دہلوی بھی

چکن کے دار ترکی ٹوپی پہنے ہوئے کسی نہ کسی طرح ضرور پہونچتے۔ مرزا ثاقب، مرزا کاظم حسین محشر، محسن علی آبر، مرزا محمد ہادی عزیز، مقبول حسین ظریف، صفدر مرزا پوری، حکیم منے آغا آفتاب، ظفر الملک علوی، عبدالباری آسی، تھوڑے بہت فرق کے ساتھ روزانہ سبھی پہونچتے۔ اس چھوٹی سی دکان میں بعض وقت تل رکھنے کی گنجائش نہ رہتی۔ ریاض اور شبلی کی مخصوص جگہیں تھیں اور آنے جانے والے اس کا خاص لحاظ رکھتے تھے کہ یہ لوگ جب بھی آئیں تو ان کی جگہ انھیں خالی ملے۔ مشہور ادیب و صحافی محترمی سید محمد یوسف صاحب قیصر بھوپالی بیان فرماتے تھے کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں رسالہ "الناظر" کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہوگیا تھا۔ ڈالی گنج میں لوہے والے پل کے قریب رہتا تھا۔ ڈالی گنج اور چوک میں کافی فاصلہ ہے لیکن سہ پہر کو خواجہ عشرت کی دکان پر پہونچنا اتنا ہی ضروری تھا جیسے نماز۔ ایک دن جو پہونچا تو مرزا محمد ہادی عزیز اور ریاض میں ایک ادبی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ شبلی اور شرر بھی موجود تھے لیکن دونوں خاموش جیسے بحث کے آخری نتیجہ کے منتظر ہوں۔ بحث لفظ "چُہل" کے بارے میں تھی۔ ایک فریق کا کہنا تھا کہ لفظ "چہل" میں "ہائے مختفی" ساکن نہیں ہے، دوسرا بضد تھا کہ ہائے مختفی" ساکن ہے۔ میں جو پہونچا تو ریاض مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ جیسے میرا ہی انتظار تھا۔ چند ہی منٹ میں الجھے ہوئے مسئلہ کی ساری نوعیت میرے سامنے تھی لیکن قبل اس کے کہ میں اس سلسلہ میں کوئی اظہار خیال کروں ریاض مجھے سامنے والے کوٹھے کی طرف کھینچے گئے: "چلو چودھرائن سے اس مسئلہ پر فیصلہ کرالائیں۔"

میں پس و پیش میں تھا مگر ریاض کب ماننے والے۔ کھینچ کر زبردستی چودھرائن کے زینے پر کھڑا کر دیا۔ "واللہ پہلے آپ" کی تکرار میں بھی مجھی کو شکست ہوئی۔ لیکن زینے کی آخری سیڑھی پر پہونچ کر جو دیکھتا ہوں تو ریاض غائب! میں عجیب شش و پنج کے عالم میں تھا۔ سامنے چودھرائن نظیر جان[1] استقبال کو بڑھ چکی تھیں۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ "قہر درویش ..... " آگے بڑھا۔ مکلف چوکے پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ پھر بھی نیچے کی سانس نیچے تھی اور اوپر کی اوپر۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ سلسلۂ کلام کس طرح شروع کروں۔ بالآخر چودھرائن نے میری مشکل آسان کر دی۔ "معاف فرمائیں حضور۔ دیکھتی تو رہتی ہوں سرکار کو لیکن اسم عالی سے واقف نہیں۔ شاید حضور کہیں باہر سے تشریف لائے ہیں۔"

میں نے کہا: "جی ہاں آپکا خیال درست ہے میں بھوپال کا رہنے والا ہوں۔"

اور اس کے بعد میں نے "چہل" کی ادبی بحث کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ غالباً آپکے ذہن سے مرزا شوق مرحوم کا وہ مصرعہ اتر گیا۔ مثنوی "زہر عشق" ہی میں تو ہے۔

چُہلیں آپس میں کرتی جاتی تھیں

قیصر صاحب فرماتے تھے۔ میں جیسے چونک پڑا۔ سامنے کی بات تھی مگر کسی کے ذہن میں نہ آئی۔ میں پان کھا کر جلدی سے نیچے آیا اور "سند" میں یہی مصرعہ سنا دیا۔ چنانچہ یہ بحث ختم ہوگئی۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے غالباً سنہ ۳۰ء یا سنہ ۳۱ء میں خواجہ عبدالرؤف عشرت کا انتقال ہوا اس کے بعد کچھ دنوں تک یہ دکان کھلتی ضرور رہی مگر نہ وہ لوگ تھے نہ وہ ادبی چہل پہل۔[2]

---

[1] اس زمانہ تک متعدد بالانشیان چوک کے کمرے، ایک طرح کے ادبی کلب ہوا کرتے تھے۔ شریف اور پڑھے لکھے لوگ وہاں جاتے اور شعر و شاعری پر گفتگو کرتے۔ زبان اور محاورہ کی بحثیں ہوتیں اور ان بحثوں میں صاحب خانہ جنھیں خود بھی زبان اور شعر و شاعری سے خاصا لگاؤ ہوتا تھا حصہ لیتی تھیں نشست و برخاست اور بات چیت میں شرافت، تہذیب و اخلاق کے تمام اصول ملحوظ رکھے جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ لکھنؤ کے اکثر شرفا اپنے بچوں کو آداب محفل سیکھنے کی غرض سے کچھ دیر کے لئے ان باوقار خاتون پر بھیجا کرتے تھے۔ نظیر جان، لکھنؤ کی طوائفوں کی سرگروہ تھیں اور اسی لئے انھیں چودھرائن کہا جاتا تھا۔ چودھرائن اور ان کا گھر اپنی اعلیٰ تہذیب، لکھنؤ کی زبان اور آداب محفل وغیرہ کے لئے مشہور تھا۔ اسی لئے اس زمانہ کے اکثر ادیب اور شاعر زبان وغیرہ کے مسئلہ میں کبھی کبھی ان سے رجوع کرتے تھے۔ — ایڈیٹر

[2] لکھنؤ میں اس قسم کے ادبی چوپال اب بھی پائے جاتے ہیں جہاں ادیب اور شاعر جمع ہوتے ہیں اور علمی اور ادبی مباحث میں حصہ لیتے ہیں۔ — ایڈیٹر

میر باقر علی داستان گو

سراج آزر یزدانی

انسان کی فطرت میں اپنی برتری اور بہتری کا احساس اور اس کے اظہار کا جذبہ ہے اور اس جذبہ کی تسکین اور ہر ممکن طریقہ سے کرتا رہتا ہے چنانچہ جب انسانی معاشرہ خاندانوں میں تقسیم تھا اور شہریت پورے طور پر رونما نہیں ہوئی تھی تو انسان نے اپنے جذبہ برتری کی تسکین کے لئے اپنے خاندان کے نسب اور خاندان کے اہم افراد کی روایات کو یاد رکھنا اور انہیں دوسروں کے سامنے بڑھا چڑھا کر اور فخر کے ساتھ بیان کرنا سیکھا۔

یہ ابتدا ہے ان روایات اور کہانیوں کی جو آج ہر قوم کے ادب میں ایک اہم جزو کی حیثیت سے موجود ہیں۔ یہ تمام ادب جو ہمارے پیشرؤں نے ہمیں دیا ہے یہی ظاہر کرتا ہے کہ انسان خواہ برف پوش پہاڑوں کی قدرتی گپھاؤں سے نکل کر سرسبز میدانوں میں آیا ہو یا تپتے ہوئے ریگ زاروں سے قصر حمرا اور قصر زہرا تک پہنچا ہو، روایات اور پھر داستان اس کے تمدن میں اہم جزو کی حیثیت سے موجود ہیں اور اس میں مشرق و مغرب کا کوئی امتیاز نہیں۔

یہ سچ ہے کہ آج کے تمدن میں داستان کے لئے جگہ باقی نہیں رہی لیکن یہ قصور فن کا نہیں فنکاروں کا ہے کہ انھوں نے زمانہ کی منشا کے مطابق چلنے کی کوشش نہیں کی ورنہ داستان ہمارے معاشرے کی تفریح اور اخلاقی تعلیم کا ایک سستا ذریعہ تھی جسے موجودہ دور کی فلمی تفریح اور ریڈیائی ریکارڈنگ کے بعد بھی مرنا نہیں چاہئے تھا۔ میر باقر علی ایک ایسے ہی داستان گو تھے جنھوں نے داستان کو موجودہ دور کے موافق بنانا چاہا۔

اٹھائیس اونتیس برس گذرے میر باقر علی داستان گو کے انتقال کو کیونکہ یہ واقعہ ۱۹۲۸ء کا ہے یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۳۰ء کا۔ مجھے بخوبی یاد ہے یہ جیسے کل کی بات ہو میں بیس اکیس برس کا تھا کہ میر باقر علی کے انتقال پر نیرنگ خیال لاہور میں ان کے فن کے متعلق معلومات افزا مقالے شائع ہوئے تھے جو میری نظر سے بھی گذرے تھے کیا خبر تھی کہ خود مجھے کبھی میر صاحب پر لکھنا پڑے گا اور اس وقت ڈھونڈھے سے بھی کوئی ایسا نہ مل سکے گا جو میر صاحب کے والد کا نام اُن کی عمر اور ان کے انتقال کی صحیح تاریخ بتا سکے۔ یوں تو میر صاحب کے دیکھنے والے ابھی موجود ہیں اور ایسے جو اس قسم کی باتوں کی اہمیت سے پوری طرح واقف ہیں مثلاً جناب ملا واحدی صاحب، حضرت اشرف صبوحی اور غالباً خواجہ محمد شفیع بھی۔

ملا واحدی تو وہ ہیں جنھوں نے موضوع دے کر میر صاحب سے کہانیاں لکھوائیں اور اپنے اخبارات میں اُن کو شائع بھی کیا۔ جناب اشرف بھی ان کی داستان سننے اور ان کی خدمت میں خصوصی نیاز رکھنے کے مدعی ہیں۔ لیکن میں نے ان سب لوگوں سے رجوع کیا تو خواجہ محمد شفیع نے جناب حیرت شملوی کے واسطے سے مجھے صرف اتنا بتایا کہ میں نے اپنی کتاب "دلی کا سنبھالا" میں جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اب یہ میری قسمت کہ محولہ کتاب میں میر صاحب کے ماموں میر کاظم علی کا ذکر تو ہے لیکن میر صاحب کا ذکر ہی نہیں ہے اور میر کاظم علی صاحب کا ذکر بھی ایسے اجمال کے ساتھ ہے کہ اس سے نہ ان کا حلیہ ظاہر ہوتا ہے نہ عادات و اخلاق نہ ان کے فن

پر کوئی روشنی پڑتی ہے۔

ملا واحدی صاحب نے اوّل تو لکھا کہ میر باقر علی کے متعلق مجھے جتنا علم ہے وہ اپنی کتاب "میرے زمانے کی دلی" میں لکھ دیا ہے اور جب میں نے جناب خیرت سے اس کتاب کے فرمے لے کر دیکھے اور ملا صاحب سے بعض امور کی وضاحت چاہی تو ۱۲ اپریل ۵۹ء کو انھوں نے مختصر جواب دیا کہ میر باقر علی سے جتنی داستانیں لکھوائی تھیں وہ میرے پرچوں میں چھپ گئی تھیں اب تو یہ بھی بتانا مشکل ہے کہ کس کس پرچے میں چھپی تھیں۔ اس وقت ایک ماہوار، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور روزانہ بہت سے پرچے چلا رہا تھا۔

اب رہے جناب اشرف صبوحی تو اس میں شک نہیں کہ انھوں نے مجھے بہت مفید معلومات فراہم کیں لیکن میرے مزید استفسار پر انھوں نے بھی ۵ ستمبر ۵۸ء کو لکھ دیا کہ میر باقر علی صاحب مرحوم کے والد کا نام کبھی سننے میں نہیں آیا نہ کبھی اس کے معلوم کرنے کی نوبت آئی۔ یہاں ایک معمر دہلوی سے معلوم کیا انھوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر کسی حالت میں ساٹھ سے کم نہ تھی، متجاوز ہو سکتی ہے۔ جہاں تک خیال ہے ان کا انتقال سنہ ۲۹ء یا سنہ ۳۰ء میں ہوا۔

آپ اسے یوں سمجھئے کہ میر باقر علی نام کے دلی میں ایک داستان گو تھے ضرور اور جب وہ تھے تو ان کے والد بھی ضرور تھے۔ فراموش کار زمانے نے ان کے والد کا نام تو بھلا دیا ہے اور اب خود انھیں اور ان کے فن کو بھولنے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔

اگر ہم سنہ ۲۹ء کو ان کا سن رحلت مان لیں اور مرتے وقت ان کی عمر ساٹھ پینسٹھ کی مان لیں تو وہ لگ بھگ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۹ء تک کسی سال میں پیدا ہوئے۔ ظاہر ہے کہ دہلی کے قدیم خاندانوں پر اس زمانہ میں کیا بہت بری تھی اور دہلی ۱۸۵۷ء جیسے انقلاب آفریں دور کے دوررس نتائج سے کس قدر متاثر تھی۔ وہ تمدن جس میں داستان گوئی کا فن بھی شرفاء کے "اشغال شب" میں ایک شریفانہ درجہ رکھتا تھا ایک نئے تمدن کے ہاتھوں پھانسی پر لٹک کر دم توڑ چکا تھا اور داستان اور داستان گوئی کی زندگی کا کوئی خفیف سا احتمال اس کے دامن دولت میں نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ اردو داستانوں کی طباعت اور اشاعت کا سارا کام ۱۸۵۷ء کے بعد ہی نول کشور پریس کے ہاتھوں سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک ہوتا رہا اور دہلی میں بوستان خیال کے ترجمہ کا کام مطبع بدر الدجیٰ اور اکمل المطابع سے سنہ ۱۲۷۵ھ میں بھی ہوا یعنی تقریباً ۱۸۵۸ء میں لیکن جہاں تک داستان گوئی کے فن کا تعلق ہے تو وہ لکھنؤ میں منشی احمد حسین قمرؔ پر اور دہلی میں میر باقر علی پر ختم ہو گیا۔

جناب اشرف صبوحی سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ داستان گوئی میر صاحب کا آبائی پیشہ نہیں تھا بلکہ میر باقر علی کے نانا میر امیر علی لال قلعہ میں قصہ خوانی پر ملازم تھے اور میر صاحب کے ماموں یعنی میر کاظم علی نے قصہ خوانی سے ایک قدم آگے بڑھ کر داستان گوئی شروع کی اور اس فن کو اتنی ترقی دی کہ باید و شاید۔ افسوس اس کا ہے کہ دہلی میں بقول غالب ۱۸۵۷ء کے بعد زبان کی بھی مٹی پلید ہو رہی تھی اور کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جو نول کشور پریس کی طرح ان جواہر کو رول کے ہمیشہ کے لئے ان کی آب و تاب باقی رکھنے کی کوشش کرتا۔ نتیجہ یہ کہ میر کاظم علی کے جواہر پارے بھی ان کے ساتھ دفن ہو گئے اور میر باقر علی کے بھی۔ ورنہ میر کاظم علی اس پایہ کے داستان گو تھے کہ ان کی ہزار داستانی کا شہرہ دلی سے حیدرآباد پہنچا اور سر آسمان جاہ کی فن نوازی نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آخر میر کاظم علی تو وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ رہے ایسے ماموں کے بھانجے اور شاگرد میر باقر تو ظاہر ہے کہ ماموں نے حقیقی بھانجے کو شاگرد کیا ہوگا تو کیا کچھ اٹھا رکھا ہوگا۔ شفیق ماموں اور مہربان استاد نے سکھایا اور چہیتے بھانجے نے سیکھا۔ اب جناب اشرف صبوحی کی زبان سے سنئے!

> "ماموں کو ہم نے سنا نہیں، بھانجے کو سنا ہے اور پیٹ بھر کر سنا ہے کیا کہنا۔ وہ اس فن کے خاتم تھے۔ وہ کیا مرے کہ یہ فن ہی مر گیا۔ میر کاظم علی تو خیر میر باقر علی جیسا شاگرد چھوڑ گئے لیکن میر باقر علی نے نام کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔ لڑکا کوئی ان کا نہ تھا۔ ایک لڑکی تھی جسے انھوں نے قابلہ (دائی) کی تعلیم دلائی تھی۔"

دوسرے داستان گویوں کے خلاف میر باقر علی میں یہ صلاحیت تھی کہ آپ انھیں کوئی موضوع دے دیجئے۔ وہ اس موضوع پر داستان سنا دیتے تھے جیسا کہ جناب اشرف صبوحی کے خط سے معلوم ہوتا ہے۔ بوستان خیال سناتے انھیں کبھی نہیں دیکھا گیا البتہ ان کی داستانیں

"داستان حمزہ" کا ضمیمہ ہوتی تھیں ــ وہی عمرو عیار اور اس کی عیاریاں وہی اسد اور ان کی طلسم کشائیاں"۔ اس موقع پر یہ سوال میرے دل میں پیدا ہوا تھا کہ "داستان حمزہ" کے ضمیمہ سے کیا مطلب ہے۔ اور میں نے صبوحی صاحب سے پوچھا تھا کہ ضمیمہ سے یہ مقصد تو نہیں کہ کرکیٹروں کے نام تو حمزہ۔ عمرو عیار اور اسد نوجوان ہوں اور کردار و افعال دوسرے۔ اس کا جواب مجھے یہ ملا کہ ضمیمہ سے مراد وہی ہے جو میں نے سمجھی ہے اور بات یوں صاف ہوئی کہ "میر باقر علی مرحوم اپنی خداداد ذہانت سے داستانوں میں اپنی طرف سے کچھ اس طرح اضافہ کرتے چلے جاتے تھے کہ سننے والا اپنی محویت میں یہ محسوس ہی نہیں کرتا تھا کہ میر صاحب نے کہاں کہاں اپنی طرف سے پیوند لگایا ہے"۔

گویا میر صاحب کیا مرے کہ نئے قسم کی داستان حمزہ، اک نئی قسم کی طلسم ہوش رُبا مرگئی۔ میں نے نئی قسم کی طلسم ہوش رُبا اور نئی قسم کی "داستان حمزہ" کے الفاظ یوں استعمال کئے کہ ایک تو یہ رائے اس کسی کی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ "امیر حمزہ اور عمرو عیار کے تقریباً سارے قصے میں نے پڑھے ہیں" (مراد جناب اشرف سے ہے) دوسرے میر باقر علی کی ایک تصنیف ہے جس کا نام "رسالہ کیر گگد" ہے۔ اس رسالہ میں بتایا گیا ہے کہ گاڑھے خاں نے ململ جان کو کیوں طلاق دی اور یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب ولایتی مال کا بائیکاٹ زوروں پر تھا۔ گاڑھے خاں سے مراد ہندوستان تھا اور ململ جان سے غیر ملکی حکومت یا انگریز اور اس کہانی کی اشاعت پر حکومت کی طرف سے بازپرس بھی ہوئی تھی۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ میں نے اپنے زمانہ تعلیم میں جو ۱۹۲۵ء پر ختم ہو کر مطالعہ کی صورت میں آج تک باقی ہے کسی کتاب میں میر باقر علی کی ایک کہانی دیکھی تھی۔ عنوان تو یاد نہیں رہا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اس میں ایک بھیڑیے اور ایک ارنا بھینسے کی لڑائی کا حال تھا۔ کہانی کیا تھی الفاظ کا ایک طوفانی اور طلسماتی زعفران زار تھا۔ ممکن نہیں کہ روتے کے آگے پڑھو اور وہ ہنس نہ دے۔ ناممکن ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ اور متین سے متین کے سامنے پڑھا جائے اور وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ نہ ہو جائے۔ مجھ میں یہ ہمت آج بھی نہیں کہ میر صاحب کی طرح الفاظ کا ابر گہر بار برساؤں اور نقل کو اصل کر کے دکھاؤں۔ بہرحال کہانی کچھ اس طرح تھی کہ:-

"کسی جنگل میں ارنا بھینسے کا اک جوڑا رہتا تھا۔ جنگل کی کاٹو قضا نہ کھانے پر پابندی نہ پینے پر قید۔ ہری ہری گھاس قدم قدم پر لہلہاتی ہوئی صاف اور میٹھے پانی کے چشمے اِدھر اُدھر جا بجا۔ جب چاہو اور جتنا چاہو کھاؤ جب چاہو پیو۔ دھو کا دھو ہو گیا تھا۔ اور ایسے ہاتھ پاؤں نکالے تھے اس جوڑے نے کہ لندھور کی سواری کا فیل میمون مبارک اس سے پناہ مانگتا اور طہماس دیو پرور کا گینڈا اس سے دور بھاگتا۔ اور اس جنگل کے بادشاہ میاں شیر کی تو یہ حالت تھی کہ اس جوڑے کو دیکھ کر ہونٹ چاٹتے ہوئے کترا جاتے تھے۔

ایک دن ارنا بھینسے کی مادہ کو اپنی پیٹھ پر کھجلی سی محسوس ہوئی تو پیڑ کے تنہ سے آ کر اپنی پیٹھ رگڑنے لگی۔ قضائے کار اس پیڑ پر ایک پدے کا گھونسلا تھا۔ دو چار رگڑے جو لگے تو درخت پر جیسے بھونچال آ گیا۔ بیخ و بن لرزنے لگی۔ پدے کے بچے اول تو چیخے پھر سہم گئے۔ وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ گھونسلا ذرا اونچا تھا ورنہ پہلے ہی رگڑے میں گر کر پامال ہو جاتے۔ میاں پدے تو کہیں چگنے چگانے تشریف لے جا چکے تھے۔ بی پدی گھر میں تھیں۔ انھوں نے جو یہ قیامت دیکھی اور بچوں کا حال غیر ہوا تو ممتا کی آگ سے گھبرائیں اور اول تو بچوں کو سینے سے لگا کر "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کیا لیکن جب دیکھا کہ جھٹکے کسی طرح نہیں رکتے تو سوچیں کہ دیکھا تو چاہئے کہ یہ قیامت کیا ہے۔ پھدک کے گھونسلے سے باہر آئیں اور ارنا بھینسی کا یہ ظلم دیکھ کر غصہ سے بیر بہوٹی ہو گئیں۔ غصہ سے منہ چقندر۔ عضو عضو مارے طیش کے کانپتا ہوا مگر کیا کرتیں۔ سمجھیں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اس وقت بات کو بڑھانا نہیں چاہئے۔ آخر بولیں کہ واہ بی وا۔ ایسا بھی کیا اندھیر۔ یہ تم کیا ستم ڈھا رہی ہو۔ کسی دوسرے کے گھر اور اس کے بال بچوں کا بھی خیال کرو۔ جنگل پر سب کا حق ہے۔ ہم بھی اسی جنگل کے باسی ہیں۔ ایسی بھی کیا زبردستی کہ آؤ دیکھو نہ تاؤ اور دوسرے کا گھر ڈھا کر چوپٹ میدان کر دو۔ وہ تو بڑی خیر یہ ہوئی کہ وہ اس وقت گھر میں

نہیں ہیں ورنہ ابھی خون خرابے ہو جاتے۔ بڑا خونی جنونی مردوا ہے۔ میں ہی ایسی مری مٹی کی تھی کہ ایسے جلاد کو جھیل رہی ہوں۔ اب آتا ہی ہوگا۔ لے اب ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر کو سدھارو۔ اگر اس نے یہ حال دیکھ لیا تو زمین آسمان ایک کر دے گا۔ غرض بی بدّی ہزار چیخیں چلائیں۔ بدّے کا خوف بھی دلایا مگر مادہ کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ آخر بی بدّی جھک مارتے مارتے ہار گئیں اور یہ سوچ کر اپنے گھونسلے میں آ لیٹیں کہ آج انھیں آنے دو۔ اگر انھوں نے بھی اس ظلم کا بدلا نہ لیا تو پھر وہ جانیں اور ان کا گھر۔ میں تو اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ اللہ رکھے پانچ بھائیوں کی بہن، کوئی ناٹھی نگوڑی تھوڑی ہوں۔

قضائے کار میاں بدّے آئے تو ارنا بھینسی کبھی کی جا چکی تھی۔ دیکھا کہ بچے الگ سہمے پڑے ہیں اور بیوی الگ، اٹھوائی کھٹوائی لئے پڑی ہے۔ سمجھے کہ عورت بد مزاج تو ہے ہی، آج کسی بات پر بچوں کی الگ درگت بنائی اور اب نخرے بگھار رہی ہے۔ خیر کئی بچوں کی ماں ہو گئی ہے تم ہی دب جاؤ۔ یہ سوچ کر بیوی کے بستر کے پاس کھڑے ہو کے اور نرم لہجے میں بولے "بیگم، خیر تو ہے۔ یہ تم آج چپ چپ کیوں لیٹی ہو، مزاج تو اچھا ہے؟" بیوی تو بھری بیٹھی تھیں۔ تڑخ اٹھیں کہ اب اس جنگل میں ہم رہیں گے یا ارنا بھینسا کیوں کہ اب اس جنگل میں تو عزت کی زندگی ملتی نہیں۔ اگر آج کے ستم کے بعد بھی تمھیں غیرت نہ آئی تو میں تو اس جنگل سے اپنا منھ کالا کر لوں گی۔ غضب خدا کا ایسی توہین ایسی بے عزتی۔ اس سے تو کتے کی موت بھلی۔ الغرض میاں نے بیوی کی لیچا پوچی کر کے سارا حال سنا مگر حال سن کر انھیں بھی تاؤ آ گیا۔ بولے اس جوڑے نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔ میاں تیس مار خاں ہوں گے تو اپنے گھر کے۔ لو صاحب ذرا سی طاقت کیا جسم میں آ گئی کہ اسفندیار بن گئے۔ زمین پر پاؤں رکھنا چھوڑ دیا۔ ابھی جاتا ہوں۔ اگر دونوں نے آ کر تمھاری خوشامد نہ کی تو جب ہی کہنا۔ مگر تم بھی جب تک خوب ناک نہ رگڑوا لو معاف نہ کرنا کہ آگے کو کان

تو ہو جائیں۔ اب بیوی سوچیں کہ جنگ دو سرداروں۔ خدا نہ کرے خدا نہ کرے میرے منھ میں خاک، اگر کچھ اور بات ہو گئی تو گھر کی بڑے گی۔ "سنو تو، سنو تو" کہہ کے روکنے دوڑیں مگر جب تک بیوی دوڑیں دوڑیں میاں پھدک کے نظر سے غائب ہو گئے۔ بیوی تو گھونسلے میں بیٹھی اپنے پر نفریں کرتی رہیں کہ مردوا تھکا تھکایا آیا تھا میں نے کیوں اسے آتے ہی بھر دیا۔ جب ٹھنڈا ہو جاتا تو کہنا تھا۔ یا اللہ بچوں کے باپ کی خیر۔ اب میاں بدّے کا حال سنئے کہ یہ جو گھونسلے سے باہر نکلے تو مارے غصہ کے پھولے دوش پر سوار۔ تیر جیسے کمان سے نکلے۔ دور جا کر نظر جو اٹھائی تو ارنا بھینسا بے فکر و غش چرنے میں مصروف تھا اور میٹھی میٹھی گھاس کے گچھے پر گچھے ٹھوسے جا رہا تھا۔ آپ اچک کے اس کے سینگ پر جا بیٹھے اور للکارے کہ کیوں جی یہ جنگل کیا صرف تمھاری جاگیر ہے کہ تم جیسے چاہو وہ یہاں رہے اور نہ چاہو نہ رہے۔ آخر زندگی کا کوئی نظام بھی یہاں ہے کہ نہیں۔ دوسروں کا بھی اس جنگل پر حق ہے یا نہیں۔ یا جو تم چاہو گے ہوگا خواہ دوسرے مریں کہ جئیں۔ ارنا بھینسے کے کانوں نے یہ لفظ کبھی شیر سے بھی نہ سنے تھے۔ بھڑک کے بولا کہ تو کون ہے اور کیا بکتا ہے۔ اس پر بدّے نے ارنا بھینسی کی زیادتی کا پورا قصہ اسے سنایا اور مطالبہ کیا کہ تم دونوں میاں بیوی چل کر میری گھر والی سے معافی مانگو اور آئندہ امن سے رہنے کا وعدہ کرو۔ ارنا بھینسے کو اپنی طاقت کا بل تھا ان مطالبوں پر ابل پڑا اور بگڑ کر کہنے لگا کہ میاں بدّے کیا تم اور کیا تمھارا شوربہ۔ ہم میاں بیوی جنگل کے بادشاہ کو تو کچھ سمجھتے نہیں، تم کس شمار میں ہو۔ وہ حضرت تو ہمیں دیکھ کر کنی کاٹ جاتے ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو جاؤ اس سے فریاد کر دیکھو۔ دیکھیں وہ ہمارا کیا بنا لیتا ہے۔ معافی مانگے ہمارا ٹھینگا۔ بدّے نے جھلا کر جواب دیا کہ بادشاہ پاس فریادی وہ جائے جس کو اپنی طاقت پر بھروسہ نہ ہو۔ ہم اپنی طاقت کے بل پر تم سے معافی منگوانے آئے ہیں۔ ارنا بھینسے نے

جواب دیا کہ پھر کرو جو تم سے ہو سکے۔ میاں پدے اس کے سینگ پر تو روق افروز ہی تھے، یہ سُن کر سینگ سے جو پھدکے تو ارنا بھینسے کے کان میں۔ اُس نے کان بھٹ پھڑائے تو یہ دو قدم آگے کو سرک گئے۔ اس نے گردن کو جھٹکا دیا تو دو قدم اور آگے کو ہو لئے۔ یہاں تک کہ دماغ کے پردے تک پہنچ گئے۔ اب تو ارنا بھینسے کا بُرا حال ہو گیا، سر ٹپکنے لگا۔ جب کان میں پھر پھراتے ہیں اس کے دم پر بن جاتی ہے۔ آخر کو بیقرار ہو کر اس نے اپنی مادہ کو آواز دی۔ وہ دوڑی آئی تو اس سے یہ تمام ماجرائے مصیبت بیان کر کے کہا کہ کم بخت جلدی چل کے پدی سے معافی مانگ، نہیں تو میرا دم گیا۔ الغرض دونوں دوڑے دوڑے آئے۔ پدی سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگی اور پدی نے ہزار نخروں اور وعدہ وعید کے بعد معاف کر دیا تو میاں پدے کان سے اکڑتے ہوئے نکلے اور دونوں کو حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنے گھونسلے میں جا بیٹھے۔

ہنسی میں ٹال دیجئے تو خیر۔ ورنہ غور سے دیکھئے تو اس کہانی میں کیا نہیں۔ سوشل نظام کا جیتا جاگتا تصور، ایک مملکت میں ہر فرد کو آزادانہ زندگی کا یکساں حق، طاقت پر بے جا غرور کا نتیجہ دوسروں کے حق کو پامال نہ کرنیکا سبق مقابلہ کے وقت طاقت نہیں بلکہ تدبیر کے دلیل کامیابی ہونے کی دلیل، غرضکہ آج کی دنیا اور اس کی سیاست کا ہر پہلو اس چھوٹی سی کہانی میں موجود ہے پھر میں نے کیا غلط کہا کہ میر باقر علی کے ساتھ نئی دنیا کی ایک جیتی جاگتی داستان حمزہ اور طلسم ہوش ربا ان کے مدفن میں دفن ہو گئی۔

میر باقر علی منحنی آدمی تھے دُبلے تپلے دھان پان قد بھی معمولی تھا۔ لیکن ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ زمانہ کے ساتھ چلنا چاہتے تھے اور ہر وقت اپنی معلومات کو ترقی دیتے رہتے تعلیم باضابطہ تو کچھ نہیں تھی لیکن ذاتی معلومات سے اس مقام پر آگئے تھے کہ اہل علم کے مجمع میں بے تکان بولتے تھے۔ داستانوں میں طب، علم الارض، علم الافلاک اور طبعیات وغیرہ کے نکات بیان کرتے اور بڑے دلچسپ طریقہ سے انھیں صرف مروجہ داستانیں ہی یاد نہیں تھیں بلکہ زیادہ تر ان کی داستانیں طبع زاد ہوتی تھیں۔ ملا واحدی صاحب نے ان کو عنوان دے کر بارہا ان سے داستانیں لکھوائیں اور اپنے پرچوں میں شائع کی ہیں اور بقول ملا صاحب اپنی ضرورت مندی کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔ اگر داستان سے کچھ نہ ملتا ہوتا تو دو ایک دستکاریوں سے واقف تھے ان کے ذریعہ اپنا پیٹ پال لیتے ہمیشہ اجلا پہنتے خندہ پیشانی سے رہتے، اخلاق بھی شریفانہ ذات کے بھی کھرے سید، ملنے جلنے اور ہر معاملہ میں وضع کے پابند آخر میں ہر جمعہ کو اپنے گھر داستان کہتے آٹھ آنے یا روپیہ فی کس ٹکٹ مقرر ہوتا لوگ جوق جوق ان کے گھر پہنچتے اور ان کی داستان سُنتے اسی میں اللہ اتنا دے دیتا تھا کہ وضع داری نبھ جاتی اور گذر بسر ہو جاتی۔

میر صاحب کی تصنیفات سیکڑوں تھیں جو فی زمانہ صاحب تصنیف کی طرح خود بھی ناپید ہو چکی ہیں چند کے متعلق پتہ چل سکا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) خلیل خاں اور فاختہ۔ ایک بوڑھے کی شادی کا مضحکہ خیز قصہ۔

(۲) ارار ادھوں۔ فن داستان گوئی کے تحت پُرانے زمانے کے ہتھیاروں کے نام، کشتی کے داؤں پیچ فن سپہ گری وغیرہ کا بیان۔

(۳) مولا بخش ہاتھی۔ آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ کے ہاتھی کا قصہ۔

(۴) رسالہ کپڑ گند۔ اس کی کیفیت لکھی جا چکی ہے۔

(۵) پاجی پڑوسی۔ نام سے کیفیت ظاہر ہے۔

(۶) اُستانی (تین حصوں میں) اس میں لڑکیوں کو گھر داری کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۷) آدب آداب۔ اس میں بچوں کو بزرگوں اور دوسروں کے ادب کے طریقوں کی تعلیم دی گئی ہے۔

ان تصانیف سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ میر باقر علی کا راستہ دوسرے داستان گویوں سے جدا تھا اور وہ اس فن کو محض حمزہ صاحبقراں کے فرضی کارناموں تک محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ داستان کو وقت کے تقاضوں کی تعلیم کا ذریعہ بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے جس کا ان کے علاوہ نہ کسی دہلی کے داستان گو کو خیال آیا نہ کسی لکھنؤ کے داستان گو کو۔

✡

نیا دور

یحییٰ اعظمی

ہے بادۂ تعمیر سے مخمور نیا دور — اِک نشاۂ تازہ سے ہے مسرور نیا دور

ہر لحظہ نیا شوق، نیا ولولۂ کار — یعنی ہے نئے عزم سے بھرپور نیا دور

ہیں بامِ بلندی کی طرف اس کے قدم تیز — معراجِ ترقی سے نہیں دور نیا دور

کرتا ہے ہر اِک برگِ گل و لالہ پہ مسطور — خوش حالی و اقبال کا منشور نیا دور

ہر ذرّۂ پامال ہے پھر مائلِ پرواز — ہے مژدۂ بیدارئ جمہور نیا دور

دہقان بھی مسرور ہے مزدور بھی سرخوش — ہے حامئ ہر بیکس و مجبور نیا دور

اللہ رے تعمیر و ترقی کے مظاہر — ہر گوشۂ عالم میں ہے مشہور نیا دور

شق سینۂ کہسار ہے، دریا ہیں مسخّر — فطرت کے عناصر سے ہے منصور نیا دور

ابر و مہ و خورشید و فلک، سب ہیں مساعد — خدمت پہ وطن کی ہے جو مامور نیا دور

چھائی تھی جو صدیوں سے وہ ظلمت ہوئی کافور — بجلی کے چراغوں سے ہے پُر نور نیا دور

تہذیب نئی ہے، نئے آئین، نئے طور — لایا ہے نئی زیست کا دستور نیا دور

کیا اس کو کسی اور خزانہ کی ضرورت؟
خود "لعل و جواہر" سے ہے معمور نیا دور

لکھنؤ کی چکن

ایچ۔ آر۔ وادھوانی

کشیدہ کاری ہندوستان کا ایک قدیم فن ہے۔ اس کی قدامت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ویدوں، رامائن اور مہابھارت میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ کالی داس نے اپنے ڈراموں میں مختلف قسم کے ایسے لباسوں کا ذکر کیا ہے جن پر کشیدہ کاری ہوتی تھی۔ بانسر نے بھی جس نے ہرش کی سوانح حیات لکھی ہے کڑھائی کے خوبصورت ڈیزائنوں کی تعریف کی ہے۔ موہن جودڑو کی مورتیوں کے لباس اور سانچی بربہٹ اجنتا کی مورتیوں کا مطالعہ کرنے سے بھی کشیدہ کاری کے فن اس کی قدامت اور اُس کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں اس فن کو شاہی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ مغل شہنشاہوں کے دربار میں ایسے فنکار ملازم تھے جو سونے اور چاندی کے تاروں سے کپڑا تیار کر کے اسے قیمتی ہیروں سے مزین کرتے تھے۔ یہ فنکار اس کے علاوہ باغیچوں کی جھول وغیرہ پر کشیدہ کاری کرتے تھے اور شاہی خیموں اور شامیانوں کے لئے بھی خوبصورت کپڑے تیار کرتے تھے۔ مغل حکمرانوں کے دورِ حکومت میں اس فن کے کئی مرکز قائم ہو گئے تھے۔ ہر مخصوص مرکز یا علاقہ میں کشیدہ کاری کے فن میں نمایاں خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں جن کا رنگوں اور ڈیزائنوں کے اعتبار سے ایک خاص درجہ تھا۔ کشیدہ کاری میں کشمیر ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ کشمیر میں کشیدہ کاری زیادہ تر ریشمی اور اونی کپڑوں پر کی جاتی ہے۔ اس میں لاتعداد ڈیزائن ہوتے ہیں جو پھول، پتیوں، پھل اور پرندوں سے بنائے جاتے ہیں۔ پنجاب "پھلکاری" کے لئے مشہور ہے۔ پھلکاری کے لئے سفید یا زرد ریشم استعمال کیا جاتا ہے جس سے کپڑے کی زمین بالکل ڈھک جاتی ہے۔ کچھ اور کاٹھیاواڑ میں شیشوں سے مزین اتنی خوبصورت اور رنگین کشیدہ کاری ہوتی ہے جو شاید دنیا کے کسی حصہ میں نہ ہوتی ہو۔ وادی کانگڑہ میں واقع کچھ خوبصورت رومالوں کی وجہ سے مشہور ہے جن پر پھول، بیل، جانوروں اور انسان کی تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ بنگال کے کنتھے شاید بنگال کے عوامی فن کا بہترین نمونہ ہیں۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ بھوپال اور حیدرآباد طلائی اور نقرئی تاروں کی کشیدہ کاری، اور کرناٹک کسوتی اور جودھ پور، جے پور، چمڑے کے جوتوں اور تھیلیوں پر کشیدہ کاری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ لیکن لکھنؤ میں چکن کے کام کو اپنی دلکشی اور خوبصورتی کی بنا پر ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ چکن کے کام میں سادگی کے ساتھ پُرکاری ہے اور کشیدہ کاری میں عام طور سے رنگ کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن چکن میں سفید ململ پر بیشتر سفید دھاگوں سے ہی کشیدہ کاری ہوتی ہے جو سوزن کاری کا نفیس ترین نمونہ ہے۔

چکن کا کام دراصل اتر پردیش میں شروع ہوا اور یہیں اسے فروغ حاصل ہوا۔ اب بھی اسے ریاست بھر کی دستکاریوں میں نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ لفظ "چکن" کے ماخذ کے بارے میں تو پتہ نہیں چل سکا لیکن اس قدر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ فارسی کا لفظ ہے۔

چکن کی صنعت کو نوابین اودھ کے زمانہ میں نمایاں ترقی ہوئی

چکن کے کچھ نمونے

چکن ترقی اسکیم کے ماتحت چکن سازی کا ایک مظاہرہ

چکن کی مختلف چیزیں

میز پوش

پلنگ کا بٹ

نیپکن
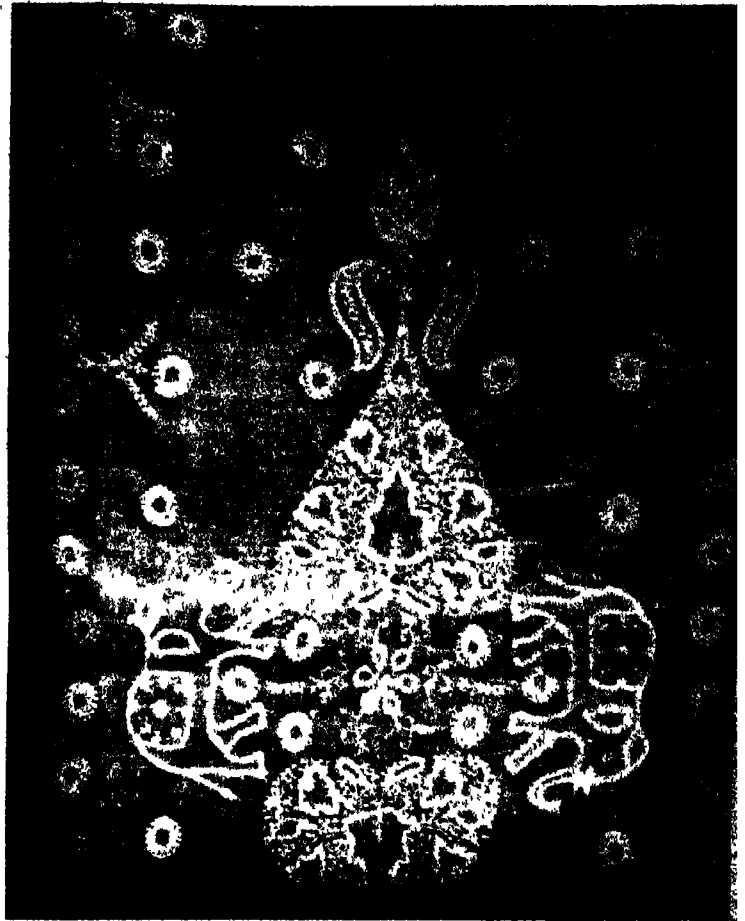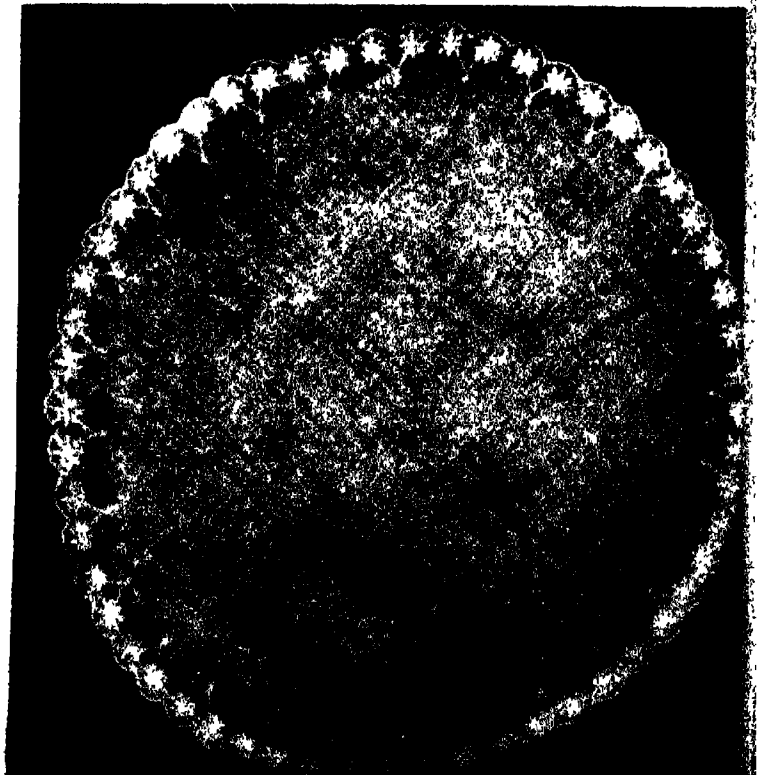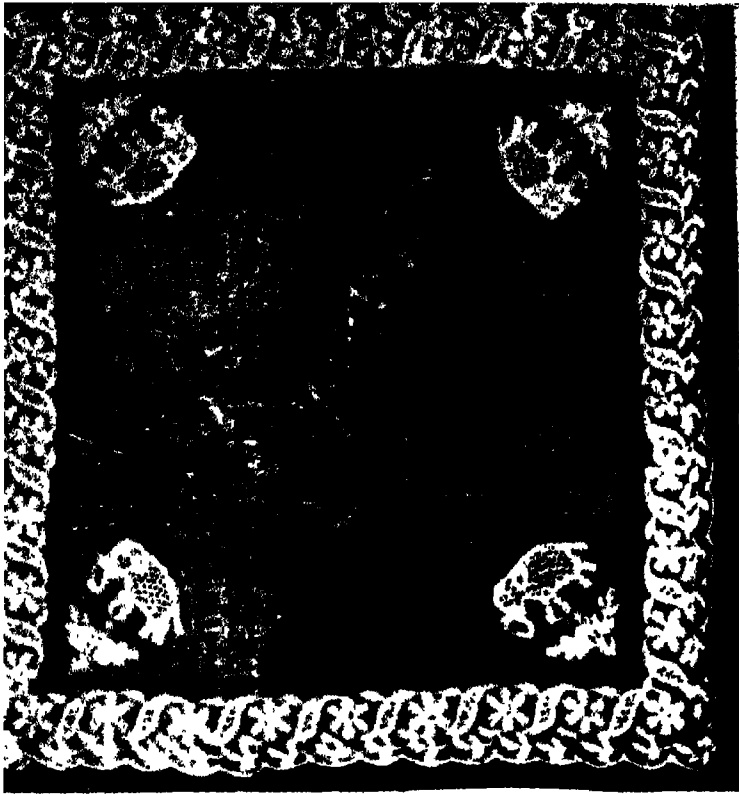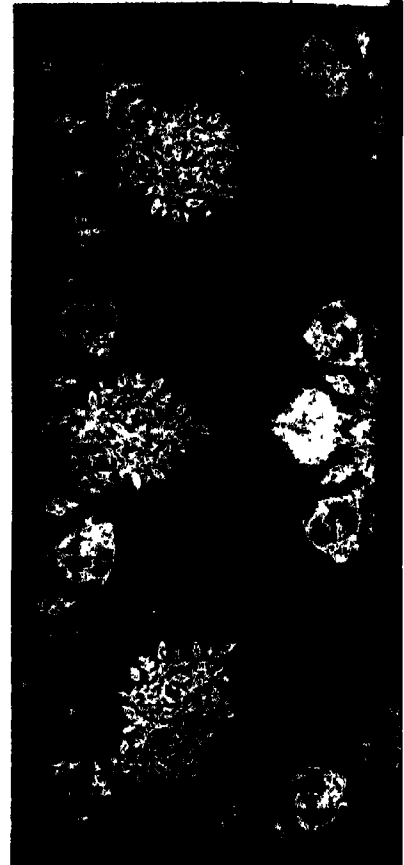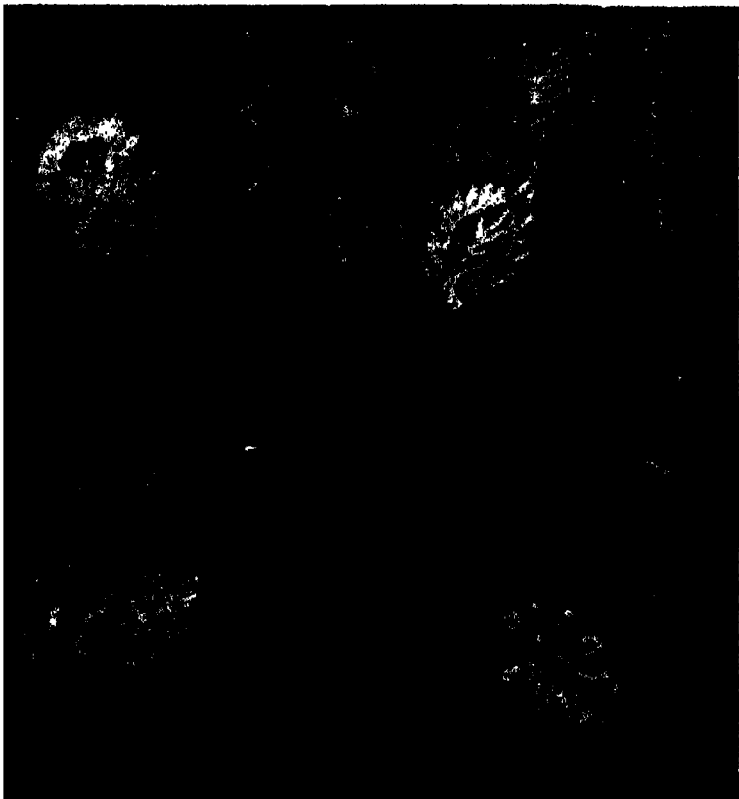
رومال

دوپلی ٹوپیاں اور ساری کا کونہ
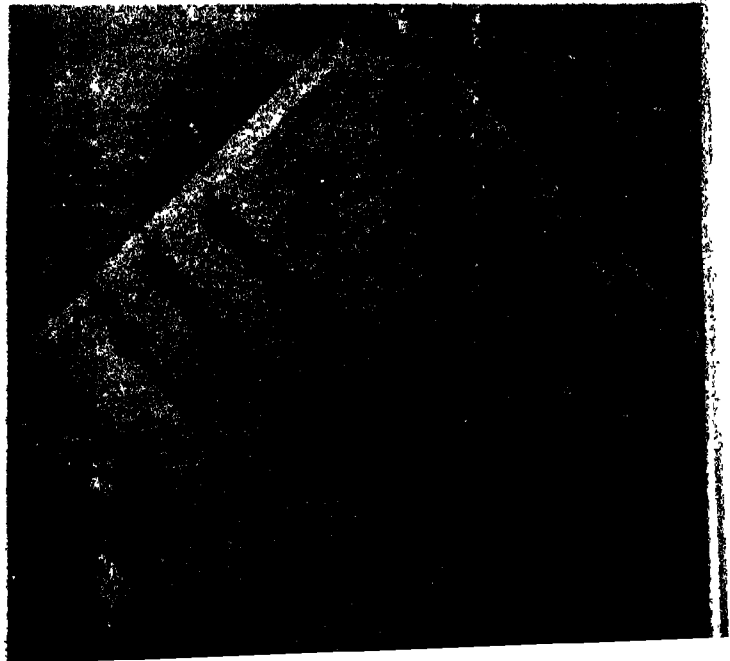
چکن کے رومالوں کا ایک سٹ

نوابین اودھ اُس کے بڑے سرپرست تھے اور اس صنعت کے متعدد ماہر شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ اُن دنوں جن چیزوں پر چکن کا کام ہوتا تھا ان میں دوپلی ٹوپی، کرتا، انگرکھا اور جبّہ شامل ہیں۔

نوابین اودھ کی حکومت ختم ہونے کے بعد چکن کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا۔ ایک تو چکن کے کپڑوں کا رواج کم ہونے لگا۔ دوسرے چکن نے جو قدردان تھے وہ عسرت کا شکار ہونے لگے۔ چکن کے روایتی کرتوں کی مانگ اب بھی تھی لیکن کاریگروں کو اب خاطر خواہ اجرت نہیں ملتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چکن کے کام میں وہ نفاست اور باریکی بھی ختم ہونے لگی جس کے لئے لکھنؤ مشہور تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں کپڑا بھی بازار میں کم آنے لگا جس کی وجہ سے چکن کی صنعت کو اور نقصان ہوا۔ چکن سازی ابھی اس نازک دور سے گذری تھی کہ ہندوستان آزاد ہو گیا اور آزاد اترپردیش کی حکومت نے اس صنعت کو زندہ رکھنے اور اُسے ترقی دینے کے فوری اقدامات کئے۔

حکومت نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ۴۸-۱۹۴۷ء میں اُس نے چکن کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے ایک اسکیم وضع کی جس کے تحت کاریگروں کو باقاعدہ ملازمت اور مناسب اجرت دینے، فنی معیار کو بہتر بنانے اور ہندوستان اور غیر ممالک میں چکن کے مال کی کھپت کے سلسلہ میں مناسب کارروائیاں کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں اس صنعت نے تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے اور اب چکن کے کام کی مانگ غیر ممالک میں بھی بڑھ گئی ہے۔ خواتین میں بھی اب چکن کے کپڑے کا استعمال بڑھتا جاتا ہے۔ عوام کے بدلتے ہوئے ذوق اور ضروریات کے پیش نظر نئی چیزیں بھی تیار کی جا رہی ہیں جیسے ریشمی ساڑیاں، بلاؤز کے ٹکڑے، فراک، رومال، پنجین سیٹ، میز پوش، کشتی پوش، نیپکن، ٹی کوزی، وغیرہ۔ گورنمنٹ یو۔پی ہینڈی کرافٹس نے چکن کو ہندوستان اور غیر ممالک میں مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

لکھنؤ میں چکن کا کام زیادہ تر چوک کے علاقہ میں ہوتا ہے اور کاریگروں کی اکثریت اسی علاقے کی باشندہ ہے۔ ان کاریگروں کی تعداد تقریباً ۲½ ہزار ہے۔ اس میں زیادہ تر پردہ نشین خواتین ہیں۔ شہر لکھنؤ کے علاوہ چکن کا کام کاکوری، ملیح آباد، سنڈیلہ، اناؤ، کرسی اور امیٹھی ایسے قصبات میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ نفیس کام لکھنؤ میں ہی ہوتا ہے۔ لکھنؤ اور قریبی قصبات کے کاریگروں کی مجموعی تعداد تقریباً ۴۰۰۰ ہے۔ یہ لوگ سال بھر میں تقریباً ۲۰ لاکھ روپیہ کا مال تیار کرتے ہیں جس میں سے ۲ لاکھ روپیہ کی مالیت کی چیزیں برآمد کی جاتی ہیں۔

چکن سازی ایسا فن ہے جس کے لئے خصوصی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختلف قسم کے ٹانکوں وغیرہ کے لئے مختلف کاریگر کام کرتے ہیں۔ کچھ ایسے پیچیدہ ٹانکے بھی ہیں جن کا کام کرنے والے کاریگر اب عنقا ہیں یا تعداد میں بہت ہی کم ہیں۔ چکن کا کام مکمل ہو جانے پر اچھے دھوبی کپڑا دھوتے ہیں اور ماہر کاریگران پر استری کرتے ہیں۔ تب یہ کپڑے بازار میں بکنے آتے ہیں۔ یعنی اس صنعت سے متعلق لوگوں میں ڈیزائن بنانے والے، لکڑی کے ٹھپے بنانے والے، چھاپنے والے، ہاتھ سے سلائی کرنے والے، چکن بنانے والے اور دھوبی سبھی شامل ہیں۔

چکن کے کام کی خوبصورتی اور نفاست مخصوص قسم کے ٹانکوں پر منحصر ہے۔ ٹانکوں کی مختلف قسمیں جو چکن کے کام میں استعمال کی جاتی ہیں یہ ہیں۔ تیپچی۔ بخیہ۔ کٹاؤ۔ مرّی۔ پھندا اور جالی۔ تیپچی سب سے آسان ٹانکا ہے۔ یہ ٹانکہ رفو قسم کا ٹانکا ہے۔ سب سے مشکل اور پیچیدہ ٹانکا بخیہ ہے۔ یہ ٹانکا اس قدر مہین اور نفیس ہوتا ہے کہ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ انسانی انگلیوں نے اسے تیار کیا ہے۔ اس ٹانکے کا کام سیدھی طرف سے نہیں کیا جاتا۔ بخیہ ہی اصل چکن کا کام کہلاتا ہے۔ پھندا۔ بخیہ کی طرح سپاٹ نہیں ہوتا بلکہ گرہ دار ٹانکا کہلاتا ہے۔ مرّی کا ٹانکا چاول یا چھوٹی گاجر کی شکل کا ہوتا ہے۔ سوراخوں کا وہ جال جو ململ کے دھاگوں کو کس دینے سے بنتا ہے، جالی کہلاتا ہے لیکن اس جالی کے لئے دھاگے نکالے نہیں جاتے بلکہ ڈیزائن کے مطابق ململ میں سوئی ڈال کر سوراخ بنا لیا جاتا ہے اور انھیں دھاگوں سے کس دیا جاتا ہے۔

چکن کے کام کے لئے عام طور پر ململ وائل اور کیمبرک کا کپڑا استعمال کیا جاتا ہے۔ مخصوص مانگ پر جارجٹ کی ساریوں پر بھی چکن کا کام کیا جاتا ہے کیونکہ اس کپڑے کے سلسلہ میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہوتی

(بقیہ مضمون صفحہ ۷)

تلخیٔ حیات

اچل سنگھ

"ارے میکو!"

"جی، سیٹھ جی آیا۔"

میکو بغل والی پان کی دوکان سے اٹھ کر سیٹھ جی کے سامنے عادتاً ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ جی گدی پر براجمان تھے دیسی کرتا دھوتی پہنے ہوئے تھے جو پانچ چھ روز پہلے انھوں نے پہنا تھا۔ آٹھ دن میں ایک بار کپڑے تبدیل کرتے تھے ورنہ دھوبی کے خرچ میں اضافہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

"کیا کر رہا تھا میکو؟" سیٹھ جی نے دریافت کیا۔

"سیٹھ جی! ذرا پان والے کی دوکان تک چلا گیا تھا۔ بہت باتونی ہے ایک بات ختم نہیں ہوتی دوسری شروع کر دیتا ہے۔ ابھی کہہ رہا تھا "ارے میکو تم نے تو سنا ہی ہوگا وہ عبداللہ کی لونڈیا ہے نا۔ ۲۵ برس کی ہونے کو آئی ہے مگر وہ شادی کا نام ہی نہیں لیتا۔ میکو اس زمانے میں جوان بیٹی کو گھر میں بٹھائے رکھنا کہاں کی عقلمندی ہے [illegible] نازک ہے بھئی۔ تم تو جانتے ہو، دنیا بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیتی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا" اور سیٹھ جی بس میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ ویسے سیٹھ جی آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میری بٹیا گنگا سولھویں برس میں ہے۔ بھگوان جانتا ہے رات بھر نیند نہیں آتی۔ ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ کب بھگوان چاہیں میں گنگا کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ یہ کہکر میکو نے ایک سرد آہ بھری۔

سیٹھ کیدار ناتھ بہت بڑے سیٹھ تو نہ تھے لیکن پھر بھی کافی روپے والے تھے۔ شہر میں چھ سات مکانات تھے۔ ان کا کرایہ آتا تھا، پرچون کی بہت بڑی دکان تھی اور سودا اُدھار دینے کی وجہ سے اچھی خاصی چل رہی تھی۔ سود پر بھی روپیہ چلاتے تھے۔ مزدوروں کے لئے اسپرٹ فروخت کرنے کا لائسنس تھا۔ قرض دیتے وقت کبھی زبان میں شیرینی پیدا ہو جاتی تھی اور کبھی تلخی کبھی معذوری کا اظہار کرتے تھے اور کبھی مستعدی دکھاتے تھے۔ بغرض جیسی صورت ہوتی اور جس قسم کے قرضخواہ ہوتے اُسی انداز سے پیش آتے۔ دھرم کے نام پر چندہ بھی دیتے تھے۔ تین لڑکے تھے۔ ایک ایم اے میں تھا، دوسرا نویں درجہ میں پڑھتا تھا اور تیسرا خورد سال تھا۔

میکو نے بات ختم ہی کی تھی کہ سیٹھ جی ذرا بگڑ کر بولے۔

"تم خود بہت بات کرتے ہو اور نام لیتے ہو دوسروں کا۔ میں نے تم کو یہ دیا کھیان سننے کے لئے نہیں بلایا تھا۔ یہ بتاؤ تم بابو گنیش لال جی کے یہاں گئے تھے یا نہیں۔ کیا کہا انھوں نے؟"

"سیٹھ جی کیا بتاؤں۔ آدمی تو شریف معلوم ہوتے ہیں لیکن کہنے لگے کہ بھئی میکو اس بار ہم پھر قسط نہ دے پائیں گے۔ بچوں کا امتحان سر پر آگیا ہے امتحان کی فیس دینے کے علاوہ گرم کپڑے بھی بنوانا ہیں۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ بہانے کرتے ہیں۔ جب روپیہ قرض لینے آتے ہیں تو خوشامد کرتے ہیں اور نہایت عاجزی سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہر ماہ باقاعدگی سے قسطیں ادا کریں گے لیکن جب روپیہ لوٹانے کا وقت آتا ہے تو سو سو بہانے کرتے ہیں" سیٹھ جی نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

"پتہ نہیں، سیٹھ جی کیا بات ہے مگر بابو گنیش لال آدمی تو بہت اچھے

معلوم ہوتے ہیں"۔ میکو نے دبی زبان میں کہا۔

"تم کیا جانو میکو ان لوگوں کو۔ ہم برسوں سے ان سے بھگتتے آرہے ہیں۔ اور سنو۔ رام لال کے ہاں گئے تھے وہ بھی ایک ہی کائیاں ہے۔ سال بھر ہوگیا پچاس روپے نہیں لوٹا پایا۔ لاٹ صاحب کے دفتر میں کلرک ہے۔ سو روپیہ تنخواہ پاتا ہے لیکن پچاس روپیہ نہیں لوٹا سکتا" سیٹھ جی نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کے یہاں پھر جانا اور ذرا سختی سے کہنا کہ روپیہ کل تک نہ ملا تو اچھی بات نہ ہوگی"۔

میکو سیٹھ جی کے ہاں دس برس سے کام کر رہا تھا۔ ایماندار اور سیدھا آدمی تھا۔ سیٹھ جی اس پر کافی اعتبار کرتے تھے۔ پھر بھی میکو جب کبھی یہ اطلاع دیتا کہ فلاں صاحب گھر پر نہیں ملے یا وہ اس بار قسط ادا نہ کر پائیں گے تو ایک بار سیٹھ جی کے دل میں شک پیدا ہوجاتا کہ کہیں میکو نے روپیہ آٹھ آنے رشوت تو نہیں لے لی لیکن سیٹھ جی نے اس خیال کا کبھی اظہار نہیں کیا۔

دسمبر کی ایک شام تھی۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ میکو کے دانت سے دانت بج رہے تھے۔ سیٹھ جی کے چھوٹے لڑکے کو بخار آگیا تھا۔ جب تک بخار ہلکا تھا وہ کھیلتا رہا اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ جب آٹھ بجے کے قریب بخار تیز ہوگیا تو وہ خود پلنگ پر لیٹ گیا اُسے سست دیکھ کر کسی نے اُسے چھوا تو معلوم ہوا کہ پنڈا جل رہا ہے۔ سانس گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ آرہی تھی۔ گھر میں سبھی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سیٹھ جی کو دوکان سے فوراً بلوایا گیا اور میکو ڈاکٹر لانے کے لئے دوڑا۔ ڈاکٹر بھٹناگر شریف آدمی تھے سیٹھ جی کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ بچے کو دیکھ کر بتایا کہ نمونیہ ہوگیا ہے۔ دوا بھجوائے دیتا ہوں اور ایک انجکشن ابھی دیئے دیتا ہوں۔ پلاسٹر بھی بھجوا دوں گا۔ بچے کے سینے پر لگا دیجئے گا۔ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائے گا"۔

میکو رات کو اپنے گھر چلا جاتا تھا مگر اُس رات وہ سیٹھ جی کے گھر ہی پر رہا۔ آنکھوں آنکھوں میں رات نکالی۔ تین تین گھنٹہ کے بعد بچے کو دوا پلاتا رہا۔ سیٹھ جی نے بھی دو ایک بار اُٹھ کر بچے کو دیکھا لیکن انھیں اطمینان تھا کہ جب میکو یہاں موجود ہے تو انھیں فکر د[illegible]

تشویش کی چنداں ضرورت نہیں۔ دوسرے روز بچہ بہتر تھا اور مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ سیٹھ جی نے خوشی میں انعام کے طور پر میکو کو ایک روپیہ بچوں کو مٹھائی کھلانے کے لئے دیا۔ میکو نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ "نمستے سیٹھ جی" کہکر لے تو لیا لیکن اس کے دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہوا کہ یہ ایک روپیہ کسی نہ کسی طریقہ سے کہیں میرے حساب میں مجرا نہ ہوجائے۔ اس کے کچھ دنوں بعد میکو کا بچہ بھی بیمار پڑگیا۔ میکو کی بیوی بھی سیٹھ جی کے ہاں کام کرتی تھی گھر میں جھاڑو لگاتی اور برتن صاف کرتی پانچ روپئے اُسے بھی مل جایا کرتے تھے۔ لیکن بچے کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو اپنے بجائے اپنی بڑی لڑکی گنگا کو کام پر بھیجنا شروع کر دیا۔ گنگا کام میں ہوشیار تھی۔ جتنی دیر میں اس کی ماں چوکا برتن کرتی اس سے آدھے وقت میں گنگا زیادہ صفائی اور پھرتی کے ساتھ ختم کر دیتی اور کھانا پکانے والا مہاراج اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا رہ جاتا۔ سیٹھ جی نے بھی گنگا کو اپنے کمرہ کے سامنے سے مور کی سی ناچتی ہوئی چال میں جاتے دیکھا تھا۔ سوکھی روٹی چاول اور ارہر کی دال کھانے والی گنگا ساون کے مہینے میں سیلاب کے پانی کی طرح سو سو بل کھا کر جوانی کی منزلیں طے کر رہی تھی۔

میکو کے بچے کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ اور میکو نے تھوڑا بہت جو جمع کیا تھا وہ دوا علاج میں لگ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ گھر کا سودا اُدھار آنے لگا۔ وید جی برابر دوا دے رہے تھے مگر بچہ کو افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ میکو کی پریشانی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں رہ گئی تھی کہ کسی بڑے ڈاکٹر یا حکیم کو دکھاتا۔ سیٹھ جی سے وہ پوری تنخواہ لے چکا تھا اور ۴۰ روپئے قرض بھی۔ اس سے زیادہ ملنے کی اُسے امید بھی نہ تھی۔ آخرکار اس نے بیوی کے چاندی کے زیور بھی گروی کر دئے لیکن ابھی اُس کی پریشانیوں میں اور اضافہ ہونا تھا۔ ایک صبح جب وہ سیٹھ جی کی دوکان پر پہنچا تو سیٹھ جی کا مزاج برہم پایا۔ لالی کا لڑکا منیش حساب کتاب درست کر رہا تھا۔ آج وہ کالج نہیں گیا تھا۔ میکو نے سیٹھ جی کو نمستے کیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

"میکو!" سیٹھ جی نے غصہ کے عالم میں پکارا۔

"جی سیٹھ جی" میکو حسب معمول ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"اب تک کہاں تھے؟ معلوم ہے دس بج گئے ہیں۔ یہاں کام کون کرےگا۔

میں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں۔ تم ٹھیک سے کام نہیں کرتے ہو۔ کبھی دیر سے آتے ہو اور کبھی جلدی چلے جاتے ہو۔ جہاں کام پر بیٹھتا ہوں گھنٹوں لگا دیتے ہو۔ اب تم کام میں لاپروائی برتنے لگے ہو۔ اگر تمھیں کام نہیں کرنا ہے تو تم چلے جاؤ۔ میں اپنی دکان کا نقصان نہیں کرانا چاہتا۔ پندرہ دن سے تمھاری بیوی بھی کام پر نہیں آرہی ہے۔ اس لڑکی کو بھیج دیتی ہے۔ وہ کیا کام کرے گی۔ مہاراج ہر روز شکایت کرتا ہے کہ برتن ٹھیک سے صاف نہیں کرتی۔ بس آندھی کی طرح آئی اور بگولے کی طرح چلی گئی۔ یہ کام کرنے کے ڈھنگ ہیں؟"

سیٹھ جی غصہ میں بولتے چلے گئے۔ جب تھکے تو میکو نہایت عاجزی سے بولا "لیکن سیٹھ جی....."

ابھی جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ سیٹھ جی بول اٹھے "کیا ہے؟ میں سب جانتا ہوں جب کسی کو باقاعدہ تنخواہ ملنے لگے تو اس کی آنکھوں میں سرسوں پھولنے لگتی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمھارے بغیر دکان پر کام نہ چلے گا؟ تم سے زیادہ ہوشیار اور عقلمند نوکر مل سکتے ہیں۔"

"لیکن، سیٹھ جی میری بات تو سنئے" میکو نے گڑگڑا کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تو آئے لیکن چھلک نہ سکے۔ اس کا ننھا سا بچہ بستر مرگ پر تھا اور وہ اس کے لئے کچھ نہ کرسکتا تھا۔ وہ تو سیٹھ جی سے دس روپے اُدھار لینے آیا تھا۔

"میں تمھاری کوئی بات سُننے کو تیار نہیں ہوں۔ ایک ذرا بچہ کیا بیمار ہوگیا اور یہاں سب کام چوپٹ کر دیا۔ کسی اسامی کے پاس تین مہینے کی وصولی نہیں کی۔ یہ سب کیا ہے؟ چھوٹے لوگوں کو سر پر چڑھانا بھی غلطی ہے۔ جاؤ سیدھے کندن لعل کے ہاں جاؤ۔ پچھلے تین مہینے کی قسطیں نہیں دی ہیں۔ فوراً روپیہ لے کر آؤ۔" سیٹھ جی نے ڈانٹتے ہوئے حکم صادر فرمایا۔

میکو نے جاتے جاتے سیٹھ جی سے درخواست کی کہ اُسے دس روپے دے دیں تاکہ وہ راستہ میں اپنے بچہ کے لئے کچھ لیتا جائے۔ اتنا سننا تھا کہ سیٹھ جی بپھر گئے۔ غصّہ سے چہرہ سرخ ہوگیا۔

"میں تو تمھیں کندن لعل کے پاس بھیج رہا ہوں کہ روپیہ لے آؤ اور تم ہو کہ مجھ ہی سے دس روپے مانگ رہے ہو۔ ابھی ہفتہ بھر نہیں ہوا تم اپنی بیوی کی تنخواہ لے گئے ہو۔ وہ سب کیا ہوئی۔ کیا سب کی دوا آگئی؟ جاؤ کام کرو۔" میکو چپکے سے وہاں سے چلا گیا۔

سیٹھ جی نے ایک نظر اپنے جوان بیٹے پر ڈالی۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اسے میکو سے واقعی ہمدردی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میکو جھوٹ نہیں بولتا۔ اس کا بچہ ضرور بیمار ہوگا اور اسے دوا کے لئے روپیہ چاہئے۔ لیکن اپنے پتا جی کے سامنے وہ ایک لفظ بھی اس کی حمایت میں نہیں کہہ سکتا تھا۔ سیٹھ جی پھر بھی بیٹے کی دل کی بات سمجھ گئے اور کہنے لگے "بیٹا رمیش تم نہیں جانتے۔ یہ چھوٹے آدمی تبھی کام کرتے ہیں جب ان سے سختی سے پیش آیا جائے۔ انھیں منھ لگانا ٹھیک نہیں۔ شام کو اسے پیسے دے دئے جائیں گے۔"

کندن لعل کے یہاں جانے کے بجائے میکو اپنے گھر چلا گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کے بچے کی حالت بہت خراب ہے۔ اس وقت اسے اپنے بچے کے پاس ہونا چاہئے۔ ویسے بھی جب کبھی اُسے موقع مل جاتا تو اپنے گھر پر بچہ کو دیکھنے دوڑ جاتا۔ آج صبح ویدجی نے دوا اُدھار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ "بھلا دوائیں بھی کبھی ادھار دی جاتی ہیں۔ یہ بھی کوئی دال چاول ہے جو اُدھار دے دیں۔ اور پھر اُدھار دینے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" ویدجی نے ایک مریض کی نبض دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

گھنٹہ بھر بعد رمیش دوکان سے حساب کتاب ٹھیک کرکے گھر کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں اسے میکو ملا۔ اُس کا چہرہ زرد، ہونٹ خشک اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ رمیش اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے میکو کی مصیبت کا اندازہ کر لیا تھا۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا۔ جیب خرچ کے لئے دس روپیہ کا جو نوٹ وہ اپنے پتاجی سے لایا تھا وہ اُس نے میکو کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میکو نے نوٹ پکڑ تو لیا مگر ایک لمحہ کے بعد ہی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اب اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آخر اُس کے ہونٹ کانپے۔

"بھیا جی، آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گا مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔"

قدیم ہندوستان میں تجارت

سید سخی حسن

ہندوستان کے خارجی ممالک سے تجارتی تعلقات بہت قدیم زمانہ سے چلے آرہے ہیں. جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وادیٔ سندھ میں رہنے والے، تین ہزار برس قبل مسیح میں، بیرونی ممالک سے تعلقات رکھتے تھے. توریت میں اہل ہند اور اہل شام کے درمیان تجارتی تعلقات کا حوالہ ملتا ہے. محکمۂ آثار قدیمہ نے جو انکشافات کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدی قبل مسیح میں ایک طرف ہندوستان سے، اور دوسری طرف شام عرب فنیقیا اور مصر سے تجارتی لین دین ہوا کرتا تھا. چوتھی صدی قبل مسیح سے ان تعلقات، اور اسی کے ساتھ ہندوستان کی بحری سرگرمیوں میں کافی ترقی ہوگئی اور موریہ راجاؤں نے جہاز رانی کی تنظیم کے لئے باقاعدہ محکمے قائم کئے.

عہد قدیم میں سمندر پر ہندوستان کا اقتدار تھا. اسی اقتدار کے باعث ہندوستانیوں نے ہندی مجمع الجزائر میں نوآبادیاں قائم کیں. اس کے فوراً بعد ہندوستان اور چین کے درمیان، سمندر کے ذریعہ بھی اور خشکی کے ذریعہ بھی، مستقل آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہوگیا. ۳۲۷ تا ۳۲۵ ق.م. سکندر اعظم کا حملہ ہوا، جس کے نتیجہ میں ہندوستان کا یونانی دنیا سے رابطہ پیدا ہوا. مصر و شام کے یونانی فرمانرواؤں نے موریہ دربار میں سفیر بھیجے اور اس کے جواب میں راجہ اشوک نے پانچ یونانی سلطنتوں میں اپنے مبلغ بھیجے. سکندر کی موت کے بعد اس کی سلطنت میں طوائف الملوکی پھیل گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارتھیا میں ایک اور سلطنت وجود میں آئی. مصر کے حکمران ٹالمی فلیڈلفس (۲۸۵ - ۲۴۶ ق.م.) نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بحر احمر کے ذریعہ مصری تجارت کو خوب فروغ دیا. بہت سے بندرگاہ بنوائے گئے. تمام تجارتی راستے ان بندرگاہوں پر آکر ملتے تھے. انہیں میں ایک بندرگاہ ہرمز تھا جو ہندوستان سے تجارت کا مرکز تھا. ٹالمی فلیڈلفس کے جلوسوں میں "ہندوستانی عورتیں، ہندوستانی شکاری کتے، ہندوستانی گائیں اور ہندوستانی مسالے اونٹوں پر لدے ہوئے ہوتے تھے". مصر کے اس یونانی فرمانروا کے شاہی جہاز میں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں ہندوستانی ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے. مصر کے ٹالمی بادشاہوں نے، اور اس کے بعد رومن شہنشاہوں نے، ہندوستان کے ساتھ براہ راست تجارت کو کافی فروغ دیا. قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسوی سن کے شروع ہونے سے بہت پہلے ہندوستان اور مغربی ممالک کے درمیان ساحل افریقہ تک بڑی کثرت کے ساتھ بحری تجارت کا سلسلہ جاری تھا. سکندریہ اس زمانہ میں بھی ایک عظیم تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا.

غیر ملکی تجارت کو فروغ دینے کے لئے ہندوستانی راجاؤں نے اشیاء درآمد پر ہر قسم کا محصول معاف کر رکھا تھا. جہازوں کے افسر اعلیٰ (ناؤادھیکش) کو ہدایت تھی کہ وہ بندرگاہ پر آنے والے تمام ان جہازوں کے ساتھ جو راستہ میں کچھ نقصان اٹھائیں یا جن کا مال راستہ میں پانی کے اثر سے کچھ خراب ہو جائے، مربیانہ شفقت سے پیش آئیں اور ان سے مہربانی اور ہمدردی کا سلوک کریں.

عیسوی سن کے شروع ہونے سے کئی صدی پہلے، شمالی اور جنوبی

ہندوستان سے ہندی چین تک تاجروں اور سوداگروں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا اور انھوں نے وہاں تجارتی مرکز اور نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں[1] اس زمانہ میں ہندوستان کی سیاہ مرچ اور خوشبودار چیزوں کی چین میں بڑی مانگ تھی جس کے عوض وہاں سے ریشم اور شکر یہاں لائی جاتی تھی چین کا ریشمی سامان تبت کے پلیٹو کو پار کر کے لھاسا اور بکم کے ذریعہ دریائے گنگا تک لایا جاتا تھا جہاں سے کشتی کے ذریعہ تامر لپتی پہونچایا جاتا تھا جو اس وقت بنگال کا مشہور ترین بندرگاہ تھا۔ یہاں سے خشکی کے ذریعہ یا جہازوں میں بھر کر سمندر کے راستہ سے سامان مشرقی ساحلوں کے بندرگاہوں تک پہونچایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ چین کا ریشمی سامان ہندی چین کے ذریعہ بھی جنوبی ہندوستان میں پہونچتا تھا۔ اسی طرح ہندوستانی کشتیوں کے ذریعہ مغرب کو بھی کافی سامان بھیجا جاتا تھا۔ ہندوستانی جہاز یہ تمام سامان بحر احمر کے ساحلی بندرگاہوں تک پہونچاتے، وہاں سے وہ خشکی کے راستہ سے دریائے نیل تک لے جایا جاتا، اور وہاں سے اسے سکندریہ تک پہونچایا جاتا تھا۔

جب آگسٹس نے ۳۰ ق۔م۔ میں مصر کو فتح کیا تو اس نے ہندوستان سے براہ راست تجارت جاری رکھنے کی کوشش کی۔ مگر اس میں اسے بہت محدود کامیابی ہوئی۔ وہ عرب و افریقہ کے قبائل پر قابو نہ پاسکا جو تجارتی حد فاصل کی حیثیت رکھتے تھے پھر بھی تجارت کو کافی فروغ ہوا اور ۲۰ ق۔م۔ میں ۱۲۰ جہاز تک موجودہ موصل سے ہندوستان آتے تھے۔ ان تجارتی تعلقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان نے روم کے شہنشاہ آگسٹس کے دربار میں ۲۵ ق۔م۔ اور ۲۱ ق۔م۔ میں سفارتیں بھیجیں۔ ایک سفارت شمالی ہند سے بھیجی گئی تھی جو اپنے ساتھ یونانی زبان میں ایک مراسلہ کے علاوہ تحفے تحائف لے گئی تھی۔ ان تحائف میں ہندوستانی سانپ، ایک بہت بڑا بندر اور چیتے شامل تھے۔ ایک دوسری سفارت میں شرامن آچاریہ نامی ایک فلسفی شامل تھا جس نے ایتھنس میں اپنے کو نذر آتش کر دیا تھا۔ اس کی سمادھی پر یہ عبارت کندہ کی گئی: "یہاں زرمنو چگس[2] برگوزہ کا ایک ہندوستانی آرام کر رہا ہے جس نے اپنے ملک کے رواج کے مطابق اپنے نام کو دوام بخشا۔" جنوبی ہند کے چیرا، پانڈیہ اور چولا راجاؤں نے بھی بیرونی ممالک کو سفارتیں بھیجیں۔

ہندوستان سے افریقہ تک کا بحری سفر اس زمانہ میں ایک نہایت پُرخطر مہم کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے جہاز راں اپنے جہازوں کو ساحل سے لگا کر چلنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے لیکن ۴۵ء میں ایک یونانی ملاح ہپیلس[3] کی اس دریافت کے بعد کہ مانسون ہوائیں بحر ہند میں برابر چلتی رہتی ہیں، جہاز بحر ہند کو پار کر کے افریقہ تک سیدھے پہونچنے لگے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور روم کی تجارت کو حیرت انگیز ترقی ہوئی۔

ایک عظیم کتاب جس کا نام "رہنمائے بحر ہند" ہے ۸۰ء میں تصنیف ہوئی۔[4] اس کا مصنف ایک مصری۔یونانی سوداگر تھا۔ یہ مشرق اور مغرب کی منظم تجارت کی پہلی دستاویز ہے۔ اس میں ہندوستان اور روم کے درمیان تجارت کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی کتاب سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سوراشٹر کے ساحل سے گیہوں، لوہا، بلور، سوتی کپڑا، دامرا (کنول)، چاول، گھی، تل کا تیل، اور گڑ بیدستان لینڈ کو بھیجے جاتے تھے اور وہاں سے اس کے بدلہ میں ہاتھی دانت، کچھوے کی پشت، اور لوبان وغیرہ ہندوستان آتے تھے۔ سوراشٹر کا خاص بندرگاہ بھاروکچھ تھا۔ اس کی اشیاء برآمد میں سوتی کپڑا، سنگ سلیمانی (سنگ سلیمانی)، دیسی تن زیب، سن کا کپڑا، جٹاماسی (سنبل الطیب)، ادرک، بادبرنگ (دیلم)، اور چینی ریشم تھا۔ اشیاء درآمد میں شراب، تانبا، ٹین، سیسہ، مونگا، عقیق، گھٹیا کپڑا، رنگین کمربند، عنبر، میٹھی دوب (پیتیا گھاس)، بلور، سنکھیا (ربیع الفار)، جستی، سونے اور چاندی

---

[1] جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۳۹ تا ۲۳۲۔ [2] معلوم ہوتا ہے یونانیوں نے شرامن آچاریہ کو بگاڑ کر زرمنو چگس کہا۔ یہ ایک جین گرو تھے اور ان کی خودکشی "سلیکھنا" کا ایک طریقہ تھی جو انسان تمام خواہشات دنیا کو ترک کرنے کے بعد اختیار کرتا ہے۔ [3] Hippalus. [4] "The Periplus of Erythraean Sea" یا "Guide to the Indian Ocean"

کے سکے اور مرہم شامل تھے۔

عرب کے بندرگاہوں کو ہندوستان سے رنگ برنگا کپڑا، زعفران[۴]، تن زیب، چاول، گیہوں، اور تل کا تیل جاتا تھا۔ اور تبادلے میں وہاں سے عود و عنبر، لوبان، اور کچھوے کی پشت ہندوستان لائی جاتی تھی خلیج فارس کے بندرگاہوں سے یہاں سفید موتی، کھجوریں، مختلف قسم کی شرابیں، سونا اور خواصیں جنھیں "یاونا" کہتے تھے، لائی جاتی تھیں جو ہندوستان کے شاہی خاندانوں میں ملازمت کرتی تھیں۔ اس کے عوض ہندوستان سے وہاں تانبا، صندل، ساگون، اور آبنوس کی لکڑی بھیجی جاتی تھی۔ اسی طرح سندھ کے بندرگاہوں کی اشیاء برآمد ادرک، ولیم (باؤبڑنگ)، بالچھڑ، فیروزہ، اونی کھالیں، چینی اور تبتی اون، سوتی کپڑا، ریشمی دھاگا، اور نیل وغیرہ تھیں اشیاء درآمد کپڑا، عقیق، مرجان، عنبر، لوبان، شیشہ کے برتن، اور چاندی سونے کی طشتریاں تھیں۔ ان میں سے بعض جنوبی ہند سے آئی ہوئی بھی ہوتی تھیں۔

آندھرا کے خاص بندرگاہ سپارا اور کلیان تھے۔ آندھرا کے بعد تامل گام کا نمبر تھا جس سے پریپلس کا مطلب چیرادیس سے ہے اس کے بندرگاہوں کی خاص خاص اشیاء برآمد تھیں۔ موتی، ہاتھی دانت، چین کا ریشمی کپڑا، جٹاماسی، ہیرے، نیلم اور دوسرے شفاف پتھر، اور ملکا کچھوا! اشیاء درآمد تھیں سکے، عقیق، سن کا چھپا ہوا کپڑا، سرمہ، مونگا، کچا شیشہ، تانبا، ٹین، سیسہ، سنکھیا، ہڑتال۔ پانڈیہ دیس کا بندرگاہ کوچی (کورکی) تھا جسے "موتیوں کی کان" کہا جاتا تھا۔ چولا بندرگاہوں میں بیشتر مصری مصنوعات آتی تھیں۔ پریپلس میں مشرقی ساحل کی تجارت کا حال بہت مختصر ہے۔ البتہ خشکی کے راستہ سے کافی چیزوں کی آمد و رفت کا حال اس میں مندرج ہے۔ مثلاً بندر، چیتے، بھینسیں، ہاتھی، طوطے، مینا، تیتر اور مور۔

غرض یہ کہ عیسوی سن کی پہلی صدی میں روم کے ساتھ ہندوستانی تجارت نے اس قدر ترقی کر لی تھی کہ ۲۲ء میں ٹائبیریس[۵] نے روم کی مجلس مشاورت سے شکایت کی کہ بیش قیمت ہندوستانی جواہرات کے باعث رومی عورتوں میں خود نمائی کی ہوس خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ نیرو (۵۴ء تا ۶۸ء) نے زمرد کا ایک پیالہ دس لاکھ سیسترسی[۶] کے عوض خریدا جس کے بارے میں رومیوں نے کہا، "یہ ہندوستان کی قسمت کا تھا۔" نیرو کے مرنے کے بعد اس تجارت میں قدرے کمی آگئی لیکن بہت جلد وہ پھر زور پکڑ گئی۔ ۷۷ء میں پلائینی[۷] نے لکھا کہ "ہندوستان روم کو ہر سال دس لاکھ سیسترسی سے کنگال کر دیتا ہے یہاں تک کہ روم میں سکہ کا قحط پڑ گیا ہے اور بادشاہ کو اس سے کم قیمت کا سکہ جاری کرنا پڑا۔"

ڈیون کرائسوسٹم[۸] اپنے ایک خطبہ میں کہتا ہے کہ "ہندوستانیوں کی ایک بڑی نوآبادی ۱۰۰ء میں محض تجارت کے نقطۂ نظر سے سکندریہ میں مستقل طور پر قائم ہو گئی تھی"۔ روم کے گماشتے ساحل مالابار پر موسیری میں رہتے تھے۔ مدورائی میں انھوں نے اپنے بادشاہ آگسٹس کی یاد میں ایک مندر تعمیر کرایا تھا۔ یہاں تانبے کے سکے جو رومی لوگ اپنے استعمال میں لاتے ہوں گے، کثیر تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اس قسم کے سکے چولا شہروں میں بھی برآمد ہوئے ہیں۔ روم کے سپاہی، فوجی انجینیر اور بڑھئی، تامل راجاؤں کے ہاں ملازم تھے۔ یہ بات تامل ادب کی کلاسکی کتابوں سے ثابت ہوتی ہے۔ ان رومیوں کو "یاونا" کہتے تھے۔ ان میں رومی اور یونانی دونوں قوموں کے لوگ شامل تھے۔

ہندوستان کی روم سے تجارت کا سلسلہ ۲۱۵ء تک جاری رہا۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ تمام تجارت شروع سے آخر تک روم کے مقابلہ میں ہمیشہ ہندوستان کے لئے زیادہ منفعت بخش ثابت ہوئی۔ سوائے مرجان، شراب، سیسہ، اور ٹین کے ہندوستان کو خارجی ممالک سے کسی چیز کے لینے کی ضرورت نہ تھی۔ برخلاف اس کے مغربی ممالک میں ہندوستانی سامان عیش و عشرت کی کافی مانگ رہی۔

فاہیان جو پانچویں صدی کے اوائل (۳۹۹ء۔ ۴۱۴ء) میں ہندوستان آیا بنگال کے قدیم مشہور بندرگاہ تامرلپتی سے ہندوستان کے ایک تجارتی جہاز میں سوار ہو کر لنکا ہوتا ہوا جاوا پہونچا تھا، اور وہاں سے چین چلا گیا

---

[۵] Tiberius: ۴۲ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۷ء میں انتقال کیا۔ [۶] Sesterces: رومی سکہ۔ [۷] ۲۳ء میں پیدا ہوا اور ۷۹ء میں انتقال کیا۔ اس کی کتاب ۷۷ء میں شائع ہوئی۔ [۸] Dion Chrysostom: ۵۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۱۷ء میں انتقال کیا۔ اس کے تقریباً ۸۰ خطبے آج تک موجود ہیں۔

تھا۔ اس نے بھی لنکا، چین، اور ہندوستان کے درمیان تجارت کی تصدیق کی ہے۔ اس نے چولا بندرگاہ کاویری پٹنم، اور پلادہ بندرگاہ ماملاپورم، اور کرشنا، گوداوری، اور کلنگ کے بندرگاہوں سے تجارتی جہازوں کی چین، انام، سیام، برما، اور ملایا تک آمد و رفت کا ذکر کیا ہے۔

ہندوستان کی بیرونی ممالک سے تجارت کا حال سکندریہ کے کوزمس نامی ایک ہندوستانی جہاز راں[9] کے سفرنامہ میں ملتا ہے جو اگرچہ بہت مختصر ہے مگر بہت دلچسپ اور کارآمد ہے۔ اپنی کتاب "ٹاپ اوگرافیہ کرسٹیانہ" میں جو ۵۴۷ء میں لکھی گئی اس نے ہندوستان اور لنکا سے تجارت کے متعلق بہت سی کارآمد باتیں بیان کی ہیں۔ اس نے ہندوستان کے مختلف قسم کے جانوروں کا ذکر کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ لنکا کے بارے میں وہ کہتا ہے، "یہ جزیرہ تجارت کا مرکز ہے۔ یہاں ہندوستان، عرب، اور الحبشہ سے جہاز سامان لے کر آتے جاتے ہیں اس سے زیادہ دور کے ملکوں سے بھی اس میں ریشمی کپڑے، عود واگر، لونگ، اور صندل وغیرہ آتے ہیں۔ یہ اشیاء یہاں سے مالابار، کلیان، اور سندھ جاتی ہیں۔ مالابار میں سیاہ مرچ کثرت سے ہوتی ہے اور باہر کو بھیجی جاتی ہے۔ کلیان سے پیتل اور لکڑی کے شہتیر اور دیگر اشیاء، اور سندھ سے مشک اور جٹاماسی باہر کو بھیجی جاتی ہیں۔" کوزمس نے اس کے بعد ہندوستان کے مشرقی اور مغربی ساحل کے بندرگاہوں کے نام گنائے ہیں۔ لنکا کے راجہ کے بارے میں لکھا ہے، "تامل علاقے سے وہ گھوڑے منگاتا ہے اور ان لوگوں کو خاص مراعات دیتا ہے جو گھوڑوں کی تجارت کرتے ہیں۔" اس نے افریقہ سے ہاتھی دانت کے ہندوستان آنے کا بھی ذکر کیا ہے۔

اسی طرح ہیون سانگ نے جو ۶۳۰ء میں ہندوستان آیا ہندوستان کی خارجی اور داخلی تجارت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے، "سونا، چاندی، دیسی تانبا، سنگ سفید، اور موتی اس ملک کی قدرتی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ نایاب ہیرے، جواہرات، اور مختلف قسم کے قیمتی پتھروں کی، جو ساحلی جزیروں میں جمع کئے جاتے ہیں، یہاں بہتات ہے۔ ان چیزوں کا یہ لوگ دوسرے سامان سے تبادلہ کر لیتے ہیں اور یہ لوگ ہمیشہ تبادلے سے خرید و فروخت کرتے ہیں۔" ہیون سانگ اس کے بعد کہتا ہے، "کپیشا میں ہر خطہ کا سامان تجارت پایا جاتا ہے جو فارس اور اس سے آگے کے ملکوں سے تجارت کا مرکز ہے۔" اڑیسہ کے بارے میں وہ کہتا ہے، "یہاں سے سوداگر دور دراز ملکوں کو روانہ ہوتے ہیں اور غیر ملکی لوگ راستہ میں یہیں قیام کرتے ہیں۔ یہاں ہر قسم کا نایاب اور بیش قیمت سامان مل جاتا ہے۔" دبھی کے متعلق کہتا ہے، "یہاں تقریباً سو گھرانے کروڑپتی ہیں۔ دور و دراز ملکوں کی نایاب اور بیش قیمت چیزیں یہاں آسانی سے مل جاتی ہیں۔"

نویں صدی عیسوی سے تجارت کی باگ ڈور مغربی دنیا سے نکل کر کلیتاً عربوں کے ہاتھ میں آگئی۔ ہندوستان میں جو کتبے دریافت ہوئے ہیں ان سے مختلف تاجروں اور ان کی تجارتی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ ویسالی کے قدیم شہر میں جو مہریں برآمد ہوئی ہیں ان میں بہت سے تاجروں، ساہوکاروں اور سوداگروں، اور مختلف بیوپار منڈلوں کے نام مندرج ہیں۔ ڈاکٹر بلاک جنھیں یہ مہریں دستیاب ہوئیں اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ "اس وقت شمالی ہند کے ایک بڑے تجارتی مرکز، غالباً پاٹلی پتر، میں آجکل کے اُدیوگ منڈل جیسی کوئی چیز موجود تھی۔" جنوبی ہند کے بیوپاری بھی اسی قسم کی جماعتوں میں منسلک تھے۔ ہم "۵۰۰ بیوپاریوں کی جماعت" اور "۷۹ ضلعوں کے ۱۰ پرگنوں کے بیوپار منڈل" کا اکثر ذکر سنتے ہیں۔ ایک کتبہ سے معلوم ہوا ہے کہ "یہ لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں، دنیا بھر میں گھومتے پھرتے ہیں، اور مختلف قسم کی چیزوں مثلاً گھوڑے، ہاتھی، قیمتی پتھر، عطریات، اور دوائیوں کی خواہ تھوک سے، یا پھٹکر سے، تجارت کرتے ہیں۔" انہیں سے بعض منڈلوں کو سرکار کی طرف سے بڑی رعایتیں اور سیاسی حقوق حاصل ہوتے تھے۔

قدیم ہندوستان میں خارجی ممالک سے تجارت کا یہ عظیم الشان سلسلہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ملک کے اندر بھی تجارتی سرگرمیاں کچھ کم نہ تھیں مہد دور میں شمالی اور جنوبی ہندوستان کے درمیان تجارت بڑے پیمانہ پر پہونچ گئی تھی۔ ارتھ شاستر میں لکھا ہے کہ کوڑیاں، موتی، ہیرے، نیلم،

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۳ پر)

---

[9] یہ ایک ہندوستانی جہاز راں تھا جو سکندریہ میں پیدا ہوا چھٹی صدی عیسوی کا یہ ایک بہت بڑا تاجر تھا۔ اس نے عرب، ہندوستان اور الحبشہ سے ایک مدت تک تجارت کی۔

اُردو میں مرثیہ کی ابتدا اور اُس کی ہیئت

شارب ردولوی

اردو زبان ایک سائنٹفک اور صحت مند ادب کی حامل ہے' اس میں اتنی سکت Potentiality ہو کہ وہ ہر اچھی چیز کو بڑی آسانی سے اپنے اندر سمو لیتی ہو۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے میں اس کو اس طرح ملا لیتی ہو کہ اس بات کا احساس تک فنا ہو جاتا ہو کہ یہ چیز کسی دوسری جگہ کی پیداوار ہو یا کہیں اور سے لی گئی ہو۔ اگر ہم تمام اصناف کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہو کہ اردو ادب غزل اور قصیدہ گوئی کے لئے فارسی زبان و ادب کا ممنون ہے اور فن تنقید اور ڈرامہ کے لئے انگریزی ادب کا احسان مند ہو۔ اسی طرح مرثیہ عربی کی پیداوار ہے لیکن آج ہمارے ادب میں مرثیے نے جو بلند مقام حاصل کر لیا ہو اور جتنی ترقی کر لی ہو اس کی وجہ سے یہ خیال تک ذہن میں نہیں آتا کہ ہم نے کس زمانہ میں اس صنفِ شاعری کی نقل کی ہوگی۔

اردو شاعری کی باقاعدہ ابتدا دکن سے ہوتی ہے اسی لئے ابتدائی شاعری کے تمام نمونے ہم کو دکن ہی میں ملتے ہیں۔ مرثیہ بھی سب سے پہلے وہیں کہا گیا۔ ابتدا میں مرثیہ کو کوئی ادبی اہمیت حاصل نہ تھی۔ خالص مذہبی نقطۂ نظر کے ماتحت مرثیے لکھے جاتے تھے۔ مقصد صرف امام حسین علیہ السلام اور دوسرے شہداء کا غم منانا اور واقعۂ کربلا کی یاد تازہ رکھنا تھا۔

بہر حال دکن کے عادل شاہی اور قطب شاہی حکمراں چونکہ شیعہ تھے اور سلطنت کا مذہب بھی شیعہ مذہب قرار دیا گیا تھا' اس لئے اردو مرثیہ کو وہاں بہت فروغ ہوا۔

لیکن یقینی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ اردو میں سب سے پہلا مرثیہ کس نے لکھا۔ اب تک اس سلسلہ میں جو نتیجے نکالے گئے ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اظہر علی فاروقی' مسیح الزماں اور کچھ دوسرے حضرات نے قطب شاہی خاندان کے پانچویں حکمراں محمد قلی قطب شاہ کو جو صاحب دیوان بھی تھا اردو کا پہلا مرثیہ نگار قرار دیا ہے۔ گارساں دتاسی نے نوری کو' جس کا زمانہ ابو الفضل اور فیضی کا زمانہ ہو' اردو کا پہلا مرثیہ گو مانا ہے۔ لیکن اسی تخلص کا ایک شاعر ابوالحسن تانا شاہ (۱۶۷۲-۱۶۸۷ء) کے عہد میں بھی ملتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کے متعلق اس وقت تک کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی جب تک دونوں کے کلام دستیاب نہ ہو جائیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" (تیسرا ایڈیشن صفحہ ۱۱۳) میں دکنی مرثیے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا

> "اس وقت تک قدیم سے قدیم جو مرثیہ دستیاب ہوا ہے وہ گولکنڈہ کے مشہور و معروف شاعر وجہی کا ہے۔ اس کے بعد گولکنڈہ اور بیجاپور کے دیگر شعراء اور مرثیہ گوؤں کے مرثیے ہیں۔"

وجہی ابراہیم قلی کا درباری شاعر تھا۔ ابراہیم نے ۱۵۵۰ء سے ۱۵۸۰ء تک حکومت کی۔ ابراہیم قلی کے بعد سلطان قلی قطب شاہ تخت پر بیٹھا وجہی نے طویل عمر پائی تھی اور ابراہیم قلی کے بعد سلطان قلی قطب شاہ کے عہد

سے بھی متعلق تھا۔ لیکن اس کے جو مراثی ملے ہیں ان کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کس کے زمانہ میں کہے تھے۔ "دکن میں اردو" کا جب چوتھا ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تو اس میں نصیر الدین ہاشمی صاحب نے وجہی کے بجائے شیخ اشرف کو اردو کا پہلا مرثیہ نگار مانا۔ شیخ اشرف نظام شاہی دور حکومت میں ہوا ہے۔ نظام شاہی دور حکومت ۱۴۹۰ء سے ۱۵۹۹ء تک رہا۔ شیخ اشرف اس حکومت کے آخری دور میں گزرے ہیں۔ ان کی ایک مثنوی "نوسرہار" بھی ملی ہے جو واقعہ کربلا سے تعلق رکھتی ہے اس کے ساتھ مرثیہ بھی دستیاب ہوا ہے جس کی تاریخ کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی کہ یہ مرثیہ کب لکھا گیا تھا اور آخری دور سے ہاشمی صاحب نے کیا مراد لی ہے۔ سنہ ۱۵۸۰ء میں سلطان محمد قلی قطب شاہ تخت پر بیٹھ چکا تھا اس سے قبل قطب شاہی حکومت کا فرمانروا ابراہیم قطب تخت نشین تھا اور وجہی اس کا درباری شاعر تھا۔ اس کے پیش نظر ہاشمی صاحب کا اشرف کو پہلا مرثیہ نگار مان لینا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر وہ نظام شاہی کا آخری دور ۱۵۸۰ کے قریب قرار دیتے ہیں (اس لئے کہ ۱۵۹۹ء میں نظام شاہی دور ختم ہو گیا تھا) تو ابراہیم قطب شاہ کے یہاں وجہی پہلے سے درباری شاعر کی حیثیت سے موجود تھا۔ مجالس عزا کی ابتدا اس سے پہلے دکن میں ہو چکی تھی ایسی صورت میں وجہی کا اس زمانہ میں مرثیہ نہ لکھنا جب کہ وہ ایک شیعہ حکمراں کے دربار سے متعلق تھا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا اور اگر وجہی کے مرثیے اس زمانے کے ہیں تو ہاشمی صاحب کا شیخ اشرف کو پہلا مرثیہ گو لکھنا غلط ہو جاتا ہے۔ بہرکیف یہ ایسی باتیں ہیں جن کے بارے میں فیصلہ کن طریقہ پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر کسی کی تحقیق میں کوئی تیسرا نام آئے اور لوگ اسے اتفاق رائے سے تسلیم کر لیں۔

اس زمانے میں مرثیوں نے معنوی یا صوری حیثیت سے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی تھی۔ اس وقت نہ تو ان کی کوئی ہیئت تھی نہ لوازمات اور نہ کوئی تکنیک ہی بن سکی تھی۔ ان میں غلطیاں بھی بہت ہوتی تھیں۔ اغلاط سے مرثیوں کو مرزا علی ندیم نے پاک کیا۔ ان اغلاط کے سلسلہ میں قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے:-

"چوں در شاعری مرثیہ غلطیٔ الفاظ بسیار یافتم لہذا ایں مختصر نمودم۔"

مصحفی نے بھی "طرز ایشاں را مطلقاً ناپسندیدہ" لکھا ہے۔ اس طرح وہ صنف شاعری جو غلطی الفاظ سے پُر اور مطلقاً ناپسندیدہ تھی میر و سودا اور مسکین کے دروں پر جبیں سائی کرتی ہوئی میر ضاحک اور میر حسن کی سحر بیانیاں دیکھتی ہوئی خلیق اور ضمیر کے گلشن کی خوشبو بن کر اڑی۔ انیس و دبیر نے اپنا خون دل دے کر اس میں وہ بالیدگی اور تازگی پیدا کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ذہن اردو پہ چھا گئی اور اپنا ایسا اثر چھوڑا کہ غلطی کا امکان اور ناپسندیدگی کا شائبہ تک نہ باقی رہ گیا۔

جہاں تک مرثیہ کی ہیئت کا تعلق ہے ہم اس پر دو طریقوں سے غور کر سکتے ہیں۔ ایک اس کی باطنی ہیئت دوسری ظاہری ہیئت عام طور سے مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں مرنے والے کی تعریف و توصیف کی جائے اور اس کے مرنے پر اظہار افسوس ہو۔ مخصوص طور سے مرثیہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا حال دردانگیز پیرائے میں نظم کرنے کو کہتے ہیں۔ شروع میں نہ تو اس کی کوئی باطنی ہیئت متعین تھی اور نہ ظاہری ہیئت ہی کا کوئی تعین تھا۔ مختلف بحروں میں غزل یا سلام کی طرح مرثیے لکھے جاتے تھے جس کی مثال ہمیں مندرجہ ذیل شاعروں کے کلام میں ملتی ہے۔

یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پہ کھینچے خنجر
کافر کئے کیسے قہر لو زخم کاری وائے وائے
آؤ مل کر ماتیاں سب اس غم تے لہو روئیں
وا اماماں یا اماماں کر کر دل کھوئیں

سب دکھا کون انت ہوا اس دکھ کے تائیں انت تئیں
فاطمہ کے پوت بن اس جگ سے تئیں نور کہیں

--- (محمد قلی قطب شاہ)

حسین کا غم کرو عزیزاں انجو نین سو جھڑو عزیزاں

--- (ملا وجہی)

روتے ملک سب عرش تلک رج بسار اپنا جھلک
مشرق سے تا مغرب تلک اندکار پایا ہائے ہائے

(غواصی)

یہ تمام مرثیے مختلف بحروں میں غزل کی طرح لکھے گئے ہیں جن کا ہر شعر

دوسرے شعرت مختلف ہو لیکن عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل ثانی کے زمانے سے اس میں تھوڑا سا فرق پیدا ہو گیا بحریں تو اس زمانہ میں بھی مختلف رہیں اور غزل ہی کی صورت میں مرثیے لکھے گئے لیکن ان میں تسلسل کا اضافہ ہو گیا۔ ہمیں اس دور کے جو مرثیے ملتے ہیں ان میں ایک پورا واقعہ تسلسل کے کے ساتھ نظم کیا ہوا ہو۔

گولکنڈہ اور بیجاپور میں شیعہ ریاستیں ختم ہونے کے بعد اردو شاعری اور ادب کا مرکز دکن کے بجائے دہلی ہو گیا۔ ولی کے زمانہ ہی سے دہلی میں شعر و شاعری کا چرچا ہو گیا تھا لیکن مرثیے کسی نے نہیں لکھے تھے سب سے پہلے شمالی ہند میں مصطفےٰ خاں یکرنگ نے مرثیہ لکھا۔ میر تقی میر نے ان کے مرثیہ کے چند اشعار نمونتاً لکھے ہیں۔ وہ بھی غزل ہی کی طرح ہیں لیکن زبان صاف اور مرثیہ میں تسلسل ہو سے

زخمی بہ رنگ گل ہیں شہیدان کربلا
گلزار کی نمط ہو بیابان کربلا
کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ
دھو ہاتھ زندگی سنتی مہمان کربلا

(یکرنگ)

شمالی ہند کے شعرا دکن کے مرثیہ گو شعرا سے واقف تھے۔ اس فن نے وہاں جتنی ترقی کی تھی اس سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا تذکروں میں بھی اکثر مرثیہ گو شعرا کا ذکر ملتا ہے

"عبداللہ قطب شاہ . . . . اکثر در مرثیہ حضرت ابی عبداللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام شعری گفت" (مخزن نکات) یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند پہونچ کر بہت جلد مرثیے کی ہیئت میں فرق آ گیا۔ سودا کے زمانے کے مشہور مرثیہ گو شاعر میاں مسکین نے مربع طرز میں مرثیے لکھے جن میں مطلع کے چار مصرعے ایک قافیہ میں لکھے جاتے تھے پھر ٹیپ کا ایک شعر کہتے تھے۔ اس کے بعد تین مصرعے ایک قافیہ میں لکھ کر چوتھے مصرعے میں مطلع کے اسی قافیہ کا اعادہ کرتے تھے پھر ٹیپ کا شعر کہتے تھے۔ مرثیہ کہنے کا یہ طرز سید انشار کے زمانہ تک بہت مقبول رہا۔ میر تقی میر نے بھی بہت سے مرثیے کہے جن میں مطلع کے چار مصرعے ایک قافیے میں ملتے ہیں بعد کے بند میں تین مصرعے ایک قافیہ میں اور چوتھا مصرعہ مطلع کے قافیہ میں ملتا ہے نمونہ کے طور پر دو بند پیش ہیں سے

وقت رخصت کے جو روتی تھی کھڑی زار بہن
بولے شہ روؤ نہ بس اے مری غمخوار بہن
کیا کروں جان کے دینے میں ہوں ناچار بہن
اب رہا روز قیامت ہی پہ دیدار بہن
جن عزیزوں نے کیا تھا مرے ساتھ اک جوگ
دیکھتے دیکھتے ہی چل بسے وہ سارے لوگ
لطف اس جینے کا کچھ ہو کہ رکھا کریئے سوگ
ہو چکے کس کس کے لئے آہ عزادار بہن
قضا نے اس کو کہا فاطمہ کے بیٹے آ!
یہ دشت سونا ہو تجھ بن اسے تو آ کے بسا
زمیں سے تم کو بلایا ہے اس میں آ کے سما
اور اپنا نام تو اس میں رکھا حسین غریب

(مسکین)

مرثیوں کو مسدس کی شکل سودا نے دی۔ اسکے علاوہ انھوں نے مربع اور مخمس میں بھی مرثیے لکھے۔ میر و سودا کا زمانہ اردو شاعری کا زریں زمانہ کہا جاتا ہے لیکن اس زمانہ میں بھی مرثیے نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ لوگ مرثیہ کہتے ہچکچاتے تھے "بگڑا شاعر مرثیہ گو" سمجھا جاتا تھا۔

مرثیہ کی ظاہری ہیئت میر ضمیر کے زمانہ میں معین ہوئی اور یہی پہلے شخص تھے جنھوں نے اس صنف شاعری کو موجودہ خلعت سے آراستہ کیا اور مرثیہ گو کو بگڑا شاعر کے الزام سے بچایا۔

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کو ہی ہم اس کی ظاہری ہیئت کہیں گے۔ انیس کے زمانہ تک یہ ہیئت پوری طرح مکمل ہو چکی تھی اور مندرجہ ذیل چیزیں مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں داخل ہو چکی تھیں۔

۱۔ چہرہ : اس میں مرثیہ گو تمہید بیان کرتا ہے جس طرح قصیدے کو شاعر تشبیب سے شروع کرتا ہے اور اپنے مقصد سے پہلے بہار کا موسم یا دوسری چیزوں کا ذکر کرتا ہے بالکل اسی طرح مرثیہ گو چہرے میں صبح کا منظر، حمد، منقبت، مناجات، رات کا سماں وغیرہ پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کبھی کبھی چہرے میں اپنی شاعری کی تعریف، دنیا کی بے ثباتی وغیرہ مضامین بھی نظم کرتا ہے۔

۲۔ سراپا: سراپا میں عام طور سے امام حسین علیہ السّلام اور اُن کے اعزا اور رفقا کی رفتار و گفتار، صورت و شکل، انداز تکلم وغیرہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس میں ممدوح کے ایک ایک خد و خال، اس کی وضع قطع حتی کہ لباس کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ مختلف شعرا مختلف طریقوں سے اپنے ممدوح کا سراپا نظم کرتے ہیں۔

۳۔ رخصت: رخصت بذات خود ایک بڑا اندوہگیں لفظ ہے۔ جدائی کا خیال ہی تکلیف دہ ہوتا ہے پھر میدان جنگ کی رخصت جبکہ اس بات کا یقین ہو کر جانے والا واپس ہی نہیں آئے گا۔ کربلا کی رخصت کو شعرا نے بڑے پر درد الفاظ میں نظم کیا ہے اس میں امام حسین سے جنگ کی اجازت لینے، اعزا سے رخصت ہونے اور رخصت کے وقت اعزا وغیرہ کے دلی جذبات و کیفیات کو نظم کیا جاتا ہے۔

۴۔ آمد: ہیرو کا جنگ کے لئے اجازت لیکر میدان کو چلنا۔ اس کا گھوڑے پر سوار ہونا اور اس کی شان کو نظم کرتے ہیں۔ اسی میں گھوڑے کی تعریف بھی لکھی جاتی ہے۔ کبھی کبھی گھوڑے کی تعریف جنگ کے مناظر کے ساتھ بھی نظم کرتے ہیں۔

۵۔ رجز: ایک فریق میدان جنگ میں فریق مخالف کے سامنے اپنی نسلی خاندانی اور شخصی بہادری و برتری ظاہر کرتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا خاصہ یہ رہا ہے کہ دو قبیلوں میں ذرا سی بات پر برسوں تک تلواریں چلتی رہتی تھیں۔ مرثیہ نگار نے اس سے بھی بہت فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے ذریعہ مرثیہ میں ایک شاندار اضافہ کیا ہے۔ رجز میں ہیرو کی اخلاقی عظمت، روحانی بزرگی، شجاعت، صفات آبا و اجداد کی بہادری، خاندان رسالت سے تعلق وغیرہ نظم کیا جاتا ہے۔

۶۔ جنگ: حسینی جماعت کا جو فرد جنگ کے لئے آتا ہے اس حصہ میں اس کی بہادری کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ تلوار کی تعریف اور اس کی کاٹ بھی اسی میں نظم کرتے ہیں۔ کبھی کبھی گھوڑے کی تعریف بھی جنگ کے ساتھ نظم کی جاتی ہے۔

۷۔ شہادت: ہیرو کا لڑتے ہوئے گر کر شہید ہونا دکھایا جاتا

ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں مرثیہ میں المیہ کی سب سے بڑی خصوصیت رحم و خوف (Pity & Horror) کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ بین: لاش پر اعزا و اقربا اور احباب کی گریہ و زاری و اہلبیت کا بکا کرنا دکھایا جاتا ہے۔ اسی حصہ پر مرثیہ ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت علی اکبرؑ۔ حضرت عباسؑ۔ حضرت عونؓ و محمدؓ۔ حضرت قاسمؑ اور حضرت امام حسین علیہ السّلام کی شہادت کے سلسلے میں جو بین نظم کئے گئے ہیں وہ بالعموم مرثیوں کے سب سے زیادہ موثر اور درد انگیز حصے ہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ یہ عناصر ترکیبی سودا کے بعد مقرر ہوئے اور مرثیہ کی اس ہیئت کو میر انیسؔ نے پایۂ تکمیل تک پہونچایا ہے۔

جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے مرثیہ میں امام حسین کی شہادت اور حادثۂ کربلا سے متعلق باتیں ملتی ہیں۔ اگر ایک نگاہ میں ان واقعات کا جائزہ لیا جائے تو صرف چند باتیں ذہن میں آتی ہیں امام حسین علیہ السّلام کا مدینہ سے سفر کرنا، راستہ میں رسالۂ حر کا ملنا اور انھیں کربلا لے جانا اہلبیت پر پانی بند کیا جانا۔ ۱۰ محرم کو فوج یزید سے جنگ ہونا اور حسین کے ساتھیوں کا شہید ہونا۔ بعض مرثیوں میں شعرا نے کربلا سے اہلبیت رسولؐ کا اسیر ہو کر شام جانا، زندان شام میں قید ہونا اور ہندہ کا انھیں رہائی دلا کر مدینہ بھیجنا بھی نظم کیا ہے۔ خود میر انیسؔ کے کئی مرثیے ایسے ہیں جن میں قید اور رہائی تک کے حالات ملتے ہیں۔

مرثیہ کا نام آتے ہی ذہن امام حسینؑ کی شہادت اور کربلا کے واقعات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے حالانکہ بالعموم مرثیہ کسی بھی مرنے والے پر لکھی گئی نظم کو کہتے ہیں جس میں اُس کی توصیف کی گئی ہو اور اس کے انتقال پر افسوس کا اظہار ہو۔ لیکن جدید دور میں مرثیے کے دو حصہ کر دیئے گئے ہیں۔ ایک سے مختصر وہی مرثیے مراد ہیں جن میں امام حسینؑ کی شہادت اور واقعات کربلا کا ذکر ہو۔ دوسرے مرثیے وہ ہیں جو کسی بڑے آدمی کے انتقال پر لکھے گئے ہوں جیسے غالبؔ کا مرثیہ عارفؔ، اقبالؔ کا مرثیۂ داغ اور حالی کا مرثیہ غالبؔ وغیرہ شخصی مرثیوں کی بہترین مثال ہیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ مرثیے کی ظاہری ہیئت کے مرتب کرنے میں خود واقعات کربلا کا کیا حصہ رہا ہے۔ ایک بار پھر ان عناصر ترکیبی پر نظر ڈالنا ہے گی جنھیں ہم مرثیے کی ظاہری ہیئت کہتے ہیں اور ان مرثیوں کو چھوڑ کر

جو واقعات کربلا سے غیر متعلق ہو کر لکھے گئے ہیں اور جن میں ان خصوصیات کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے کسی ایک مرثیہ کا بالخصوص مطالعہ کرنا پڑے گا۔

مرثیے کے عناصر کی ترتیب میں عرب کی مخصوص روایات کو شعراء نے خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھا ہے کسی بھی واقعہ کی ایک ابتدا یا تمہید ہوتی ہے جس میں ڈراما نگار ہو، ناول نویس ہو یا مرثیہ گو ہو اپنی بات پیش کرنے کے لئے ماحول بناتا ہے ڈرامہ میں اس حصہ کو "ایپی لاگ" (EPILOGE) کہتے ہیں۔ ناول میں اس کا کام پہلے باب سے لیا جاتا ہے۔ ناول نویس یا ناقدوں نے ناول کے اس باب کے لئے کوئی الگ نام نہیں رکھا ہے۔ وہ کہانی یا نفس قصہ میں اس طرح ملا رہتا ہے کہ اس کا کوئی الگ نام دینے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ پڑھنے والا خود اس حصہ کو پڑھ کر پہلے ہی باب میں ایک اندازہ کر لیتا ہے اور اس ماحول سے پوری طرح متعارف ہو جاتا ہے مرثیہ میں اس حصہ کو چہرہ کہتے ہیں۔ زیادہ تر مراثی میں شعراء نے مرثیہ کا اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے چہرہ نظم کیا ہے۔ بعض مراثی بغیر چہرہ کے بھی لکھے گئے ہیں۔ مرثیہ نگار اس حصہ کو اپنی ضرورت کے مطابق کئی طرح سے استعمال کرتا ہے۔ کبھی صبح کا سماں، کبھی صبح کی منظر کشی، کبھی تعلی یعنی اپنے کلام کی تعریف، کبھی وطن سے رخصت، کبھی حمد، نعت، منقبت وغیرہ۔ اس طرح وہ پڑھنے والے یا سامع کے ذہن کو دوسری فکروں سے اپنی طرف رجوع کر لیتا ہے اور جو بات وہ کہنا چاہتا ہے اس کے لئے ایک خاطر خواہ ماحول پیدا کر لیتا ہے بعض مراثی کا چہرہ واقعات سے شروع ہوتا ہے مثلاً ؎

فرزند پیمبر کا مدینہ سے سفر ہے ؏ جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا

ان کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ واقعات نے خود عناصر ترکیبی کے بنانے میں بڑی مدد کی ہے جیسے اوپر کی مثال میں جو پہلا مصرع دیا گیا ہے اس میں شاعر نے سفر کے واقعات، تیاری اور اس وقت کے تاثرات کو چہرہ قرار دیا ہے۔

ان واقعات کا تصور کرنے پر ذہن میں ایک اس طرح کا خاکہ بنتا ہے کہ ایک قافلہ وطن سے روانہ ہوتا ہے۔ ایک جنگل میں اس سے ایک فوج سے جنگ ہوتی ہے ایک ایک آدمی جنگ کر کے شہید ہو جاتا ہے۔ جس طرح واقعات کی یہ ترتیب ذہن میں آتی ہے اسی کے مطابق مرثیے کے عناصر ترکیبی بھی بنتے ہیں۔ ابتدا یا چہرہ، رخصت، جنگ اور شہادت یہی مرثیہ کے مخصوص عناصر ہیں۔ سراپا، بین اور دوسرے بعض عناصر کا ضرورتاً اضافہ کر دیا گیا ہے۔

عرب کا عام قاعدہ تھا کہ جب کسی سے جنگ ہوتی تھی تو فوج کا ایک ایک آدمی فرداً فرداً میدان میں آتا اور مبارز طلبی کرتا تھا۔ میدان جنگ میں جانے سے قبل وہ تمام اعزا، احباب اور متعلقین سے رخصت ہوتا تھا۔ یہ ایک بڑا دردناک سماں ہوتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ جانے والا زندہ واپس نہیں آئے گا۔ خود سپاہی کو یہ خیال رہتا تھا کہ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو آخری بار دیکھ رہا ہے۔ میدان جنگ میں پہنچ کر وہ اپنے خاندان، قبیلے اور اپنے اجداد کی فتوحات، بہادری اور شجاعت کا بیان کرتا تھا۔ رجز کے بعد جنگ ہوتی تھی اسکے بعد شہادت اور شہید کی لاش پر بین

☆

(لکھنؤ کی چکن۔ بقیہ صفحہ ۲۵)

ہے۔ اب رنگین دھاگوں کا استعمال ہونے لگا ہے اور رنگین وائل پر بھی چکن کا کام مقبول ہو رہا ہے لیکن سفید کپڑے پر سفید چکن کا روایتی کام جو دلکشی رکھتا ہے وہ کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ فیشن کے مطابق چکن کے ڈیزائن اور نمونے بھی بدلتے رہتے ہیں۔

سرکاری چکن اسکیم میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ چکن کی صنعت کو فروغ اور چکن کے کاریگروں کو صحیح طور پر امداد ملے۔ گزشتہ گیارہ برسوں کے اندر غیب سے اس اسکیم پر عمل درآمد ہو رہا ہے کام کا معیار بلند ہو گیا ہے اور نئے نئے ڈیزائن بھی سامنے آ رہے ہیں۔ سرکاری اسکیم کے تحت اس وقت ۸۰۰ کاریگر مستقل طور پر کام کرتے ہیں اور آئندہ چند برسوں میں ان کی تعداد بڑھا کر ۱۵۰۰ کر دی جائے گی۔ اسکیم کے ماتحت سے نئے ڈیزائن بنائے گئے ہیں۔ پردہ نشین خواتین کی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہو گیا ہے۔ اجرت کی شرح ڈیزائن، ٹانکا اور کوالٹی کی بنا پر مقرر کر دی گئی ہے، غیر ممالک کے لئے مخصوص ڈیزائن تیار کئے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس صنعت کی بدولت غیر ملکی زر مبادلہ میں اضافہ ہو گا۔

غزل

مخمور سعیدی

اپنے انجام کا آغاز ہوئی جاتی ہے — زندگی دُور کی آواز ہوئی جاتی ہے

لذتِ درد کی غماز ہوئی جاتی ہے — بے خودی پردہ درِ راز ہوئی جاتی ہے

ہے یہی منزلِ معراجِ محبت شاید — ہر تمنا نظر انداز ہوئی جاتی ہے

اے خوشا جذبِ محبت کہ مری خلوتِ شوق — رشکِ انجمنِ ناز ہوئی جاتی ہے

رخصت اے ہمقفسو! اب مری پروازِ جنوں — بے نیازِ پرِ پرواز ہوئی جاتی ہے

حسن یہ کس کا ہوا زمزمہ زن بربطِ دل — ہر نظر زمزمہ پرداز ہوئی جاتی ہے

یہ سکوتِ شبِ تنہائی یہ محویتِ شوق — دل کی دھڑکن تری آواز ہوئی جاتی ہے

نغمۂ شوق نہیں رہنِ تکلم مخمورؔ
خامشی ہی مری آواز ہوئی جاتی ہے

غزل

جاویدؔ وششٹ

بندگی میں نجات کی تلقین — ایک آزاد ذہن کی توہین

اہلِ دل کا نہ پوچھئے آئین — درد جس میں نہیں وہ دل بے دین

تم کو دیکھا تو اب ہوا معلوم — کس قدر ہے یہ کائنات حسین!

جل اُٹھے دیپ، گیت لہرائے — کس نے دیپک کی دُھن میں چھیڑی بین؟

حسن سے مہر و ماہ کی تشکیل — عشق سے کائنات کی تکوین

کائنات حیات پر ہے محیط — دل کا دستور، درد کا آئین

انجم و گل کا آئینہ خانہ — خود نمائی کی خواہش تزئین

مے ہے، مینا ہے، ماہ ہے، تم ہو — خواب دیکھا ہے آرزو نے حسین

کیسا درمانِ دردِ دل جاویدؔ
فکرِ درماں ہے درد کی توہین

ساقی

ہنس راج رہبر

چھن!

چھنانا چھن

چھن چھن چھن!

رقص اور سرود کی محفل گرم تھی نادر شاہ اور محمد شاہ رنگیلا پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ اس راگ رنگ سے وہ جو اثر قبول کر رہے تھے اور اُن دونوں کے احساسات میں جو فرق تھا اس کا اندازہ بخوبی ہو جاتا تھا۔ نادر شاہ فاتح تھا اس کے دل میں مسرتوں کی لہریں موجزن تھیں چہرہ گلاب کے شگفتہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا سر پر دستار بندھی تھی جس میں کوہ نور جگمگا رہا تھا۔ محمد شاہ مفتوح تھا اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوہ نور کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ نظر پڑ جاتی تو جی جل اٹھتا تھا، جیسے وہ ہیرا نہیں مجسم طنز ہو، تاریخی فیصلہ ہو اور اپنی خاموش زبان میں پھبتی کس رہا ہو۔

کچھ دیر پہلے یہی ہیرا خود محمد شاہ رنگیلا کی دستار کی زیبائش بنا ہوا تھا مگر نادر شاہ یہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا کہ یہ شہرۂ آفاق ہیرا مفتوح کی دستار میں چمکتا رہے۔ چنانچہ قتل عام بند کر دینے کا حکم دینے کے بعد اس نے محمد شاہ سے کہا۔ "اچھا اب صلح ہو گئی ہے۔ آئیے ہم اس صلح کو مستقل بنانے کے لئے دستار بدل کر بھائی بھائی بن جائیں"

محمد شاہ نادر شاہ کے مدعا کو خوب سمجھتا تھا لیکن کیا کرتا۔ من ہی من میں تلملا کر رہ گیا۔ دستار سر سے اتاری اور مسکرا کر کہا:۔ "آپ مجھے بھائی بنانے کا شرف بخشیں! اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟"

دوسرے ہی لمحہ ہندوستان کی شان کوہ نور ہیرا، ایرانی شہنشاہ کے سر پر چمکنے لگا۔

اس صلح کو اور بھی مستقل اور پائدار بنانے کے لئے یہ رقص و سرود کی محفل گرم ہوئی تھی۔ محمد شاہ کی ساری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی تھی۔ وہ اب تک اس قسم کی جانے کتنی محفلوں سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔ مگر آج۔ آج وہ اپنی ہی محفل میں بیگانہ اور اجنبی تھا۔ کوہ نور ہیرا اس کے دل میں تیکھا نشتر بن کر چبھ رہا تھا اور اپنی خاموش زبان میں تاریخی فیصلہ کا اعلان کر رہا تھا۔ محمد شاہ کا دل اس وقت یہ چاہتا تھا کہ وہ بہرا ہو جائے! ایک پتھر کے ٹکڑے میں مبدل ہو جائے تاکہ وہ اس تاریخی فیصلے کو نہ سن سکے، نہ سمجھ سکے اور اسے اپنی شکست کا، ہزیمت کا اور کسی بات کا احساس نہ ستائے۔

لیکن یہ احساس اس کے دل میں موجود ہی نہ تھا بلکہ اُس کی روح میں نشتر چبھو رہا تھا اور اسے آٹھ آٹھ آنسو رُلا رہا تھا۔ چھن۔ چھنانا چھن کی آوازیں اس کے دل پر ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح پڑ رہی تھیں پھر بھی محمد شاہ

اپنے معزز مہمان کی خوشنودی کے لئے مسکرا رہا تھا اور اس رقص و سرود کی محفل سے بظاہر محظوظ و مسرور نظر آ رہا تھا۔

اگر اس کا بس چلتا تو محمد شاہ کب کا اپنا گریبان پھاڑ کر جنگل کو بھاگ کھڑا ہوتا اور دنیا بھر پا اپنی دیوانگی کا اعلان کرتا۔ اس کا غرور شاہی مٹی میں مل چکا تھا اور تیغ تیموری نے دھول چاٹی تھی جب دلی کو اس کے بزرگوں نے دلہن کی طرح بنایا سجایا تھا وہ اس کی آنکھوں کے سامنے لٹ رہی تھی۔ بے عزت اور بے حرمت ہو رہی تھی۔ اس کی گلیوں میں بے گناہوں کے خون کی ندیاں بہہ نکلی تھیں اور جو شخص اس خونی اور انسانیت سوز ڈرامے کا ہیرو تھا جس نے دلی کی عصمت لوٹی تھی، جو قاتل اور لٹیرا تھا اور جس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے، اسی کے اعزاز میں رقص و سرود کی یہ محفل سجائی گئی تھی۔ دراصل اس وقت وہی مسکرا رہا تھا۔ محمد شاہ تو اس کی خوشنودی کے لئے اپنا کرب و اذیت مسکراہٹ میں مبدل کر رہا تھا۔

عیش و عشرت کی ساری زندگی اور مجبوری کے یہ لمحات! وہ سب خواب تھا اور یہ ایک حقیقت تھی۔ کاش! یہ حقیقت اتنی تلخ اور جانگداز نہ ہوتی! تیموری تلوار میں زنگ لگ چکی تھی اور محمد شاہ کو آج پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ جس شخص میں بہادری نہیں، شجاعت نہیں اور دشمن سے لوہا لینے کی ہمت اور طاقت نہیں وہ ہر طرح ناکارہ ہے۔ اس کے لئے شعر، نغمہ، حسن اور شراب سب بےکار ہے۔ وہ نہ ان کی اصل حقیقت سے آشنا ہے اور نہ ان سے لطف اندوز ہونے کا اہل ہے۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں نے اگر داد عشرت دی تھی تو وہ واقعی اس کے حقدار تھے کیونکہ انھیں تلوار بھی چلانا آتی تھی اور دشمنوں کو ناکوں چنے چبوانا جانتے تھے۔

یا پھر یہ نادر حقدار ہے جو ایران سے چل کر کابل اور پنجاب کو روندتا ہوا دہلی پہنچا ہے اور جس کی دستار میں ہندوستان کی شان کوہ نور جگمگا رہا ہے۔

چھن!

چھنا نا چھن!!

چھن چھن چھن!!

نادر شاہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا چہرہ خوشگفتہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ جس سُر اور جس تان پر جب چاہے جھوم اٹھتا تھا ورنہ گمبھیر اور متین بنا رہتا تھا۔ محفل اس کی تھی، راگ رنگ اس کا تھا اور محمد شاہ اپنے ہی گھر میں بیگانہ بنا ہوا تھا۔

انگوری شراب بلوری جاموں میں انڈیلی جا رہی تھی۔ مہ پارہ فیروزہ ساقی کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ وہ مدت سے یہی فرائض سرانجام دیتی آئی تھی اس لئے شاہی آداب سے بخوبی واقف تھی اور سراپا تہذیب و نزاکت کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ کیا جلوت میں اور کیا خلوت میں محمد شاہ کو ہمیشہ وہی اپنے دست نازک سے جام پیش کیا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بادشاہ کا دل ایک نازک آبگینہ ہے اس لئے وہ اسے کسی طرح کی ٹھیس سے معمولی سے معمولی صدمہ سے دور رکھتی تھی اور اسی لئے محمد شاہ بھی اسے جی جان سے چاہتا تھا۔ انعام اکرام اور صلہ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ اس کی ہر فرمائش بغیر کہے پوری ہو جاتی تھی۔ محمد شاہ کچھ یوں سمجھتا تھا کہ دلی کی جس سلطنت کا وہ بادشاہ ہے فیروزہ اس کی رونق ہے۔ وہ کوہ نور کو قربان کر سکتا تھا مگر فیروزہ کو قربان کر دینا ممکن نہیں تھا۔

شراب سے لبریز جام سامنے رکھے تھے لیکن آج وہ فیروزہ سے اٹھائے نہیں اٹھتے تھے۔ وہ تذبذب کی حالت میں سوچ رہی تھی۔ مگر جو مسئلہ درپیش تھا اس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ امتحان کا لمحہ تھا۔ جس آبگینے کی وہ اتنی مدت سے حفاظت اور نگہداشت کرتی چلی آئی تھی وہ آج اس کے اپنے ہی ہاتھوں، ٹوٹ جانے کا اندیشہ بھی لاحق تھا۔ اسے بچاتی ہے تو اپنی جان پر آ بنتی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی اور تذبذب میں مبتلا رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔

مسئلہ جو درپیش تھا وہ یہ تھا کہ محمد شاہ اور نادر شاہ دونوں میں سے پہلے وہ کسے جام پیش کرے۔ محمد شاہ آقا تھا اور اس کے لئے اب بھی بادشاہ تھا۔ جام سب سے پہلے اسی کو پیش کرنا تھا۔ اسے پہلے جام نہ دینا بادشاہ کی توہین تھی اور خود اس کی ساقی گری کی توہین تھی۔

دوسری طرف نادر شاہ تھا جس کی وحشت سے دلی تھرا رہی تھی اُسے پہلے جام پیش نہ کرنے کا مطلب تھا اس کے بے پناہ غصے کو مشتعل کرنا، قہر کو دعوت دینا اور نتیجہ معلوم۔ فیروزہ اسی لئے تذبذب میں پڑی تھی خوفزدہ تھی اور سوچ رہی تھی۔

چھن!

چھنا ننا چھن!!

رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ نادر شاہ کے چہرے سے مسرت ٹپک رہی تھی اور محمد شاہ کے دل پر ہتھوڑے کی ضربیں پڑ رہی تھیں: اس کے باوجود وہ مسکرانے کی، خوش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لال قلعے کی یہ محفل ایک عجیب محفل تھی اور ساقی کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

اہل محفل اس حالت کو اور ساقی کے تذبذب کو سمجھ رہے تھے اور سہمے ہوئے تھے صرف ایک نادر شاہ تھا جو شرارت سے مسکرا رہا تھا وہ اس وقت فاتح تھا اور وہی ایک شخص تھا جو ہر حالت سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔

چھن!

چھنا ناچھن!!

یکایک۔۔ ہاں، یکایک جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی کوند جائے ساقی کے ذہن میں ایک بات آئی اور اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ فیروزہ نے طلائی طشتری میں بلوری جام رکھا اور ناز و ادا سے مسکراتی ہوئی اٹھی۔ اس کی یہ مسکراہٹ قیامت برپا کر رہی تھی اور اس نازک گھڑی میں بھی ہر شخص کے دل میں یہ تمنا موجزن تھی کہ یہ جام مجھ تک آتا۔

فیروزہ، بادشاہ کے روبرو جا کر رکی۔ حاضرین پہلے سے بھی زیادہ سہم گئے اور محفل پر سناٹا چھا گیا۔ لیکن رقاصائیں اب بھی کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہی تھیں اور چھن چھنا ناچھن کی صدا متواتر آ رہی تھی۔

"بادشاہ سلامت!"

فیروزہ کے نازک ہونٹ کھلے۔ "معزز مہمان کی تواضع آپ اپنے دستِ مبارک سے فرمائیے۔"

اور اس نے جام محمد شاہ کے سامنے پیش کر دیا۔

چالاک اور ہوشیار فاتح سب کچھ سمجھ گیا اور اس نے محمد شاہ کے ہاتھ سے جام قبول کرتے ہوئے بلند اور مخصوص آواز میں کہا "میرے دوست! اگر تمہارے درباری بھی اتنے ہی ذہین اور عقلمند ہوتے جتنی تمہاری یہ ساقی ہے تو تمہیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔"

اور کہتے ہیں کہ نادر شاہ فیروزہ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ محمد شاہ کو کوہِ نور اور تختِ طاؤس کے چھن جانے اور پوری دلی کے لٹ جانے کا بھی اتنا ملال نہیں ہوا جتنا کہ ساقی کے جانے کا۔ فیروزہ کے بغیر اسے اپنی ہر محفل سونی سونی دکھائی دی اور شراب میں اسے پھر کبھی وہ لطف نہیں آیا جو پہلے آتا تھا۔ گویا نادر شاہ دھن دولت ہی نہیں مغل بادشاہوں کی مسرت بھی ہمیشہ کے لئے لوٹ لے گیا۔

✡

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

اتر پردیش میں کنبہ منصوبہ بندی مہم ● ● ● اونی مال کو بہتر بنانے کے اقدامات ● ● ● امداد باہمی انجمنوں کے غیر سرکاری ممبروں کی تربیت ● ● ● نانک ساگر کیمپ کے قیدی مزدور ● ● ● کولٹاس اور ہریجنوں کی حالت کا جائزہ لینے کے لئے کمیٹی کا تقرر ● ● ● شکر کی صنعت میں توسیع ● ● ● ایک کرور روپیہ سے زیادہ کی لاگت کا نیا پُل ● ● ● کھیل کود کی ہمت افزائی ● ● ● فنی تربیت حاصل کرنے والوں کا ایک جائزہ ● ● ● بچوں کے لئے کتابوں پر انعامات۔

اس امر کے پیش نظر کہ ملک کی آبادی میں روز افزوں اضافہ سے تمام ترقیاتی اسکیموں کا مقصد ہی فوت نہ ہو جائے اتر پردیش میں بڑے پیمانہ پر کنبہ منصوبہ بندی مہم شروع کی گئی ہے۔

اس مہم کے تحت ۳۱ مارچ ۱۹۵۹ء کو ختم ہونے والے سال میں دیہی علاقہ میں کنبہ منصوبہ بندی کے مزید ۲۰ کلینک اور شہری علاقوں میں مزید ۳ کلینک قائم کئے گئے۔ چنانچہ ریاست میں ایسے کلینکوں کی کل تعداد ۶۵ ہو گئی ہے جن میں سے ۵۵ کلینک دیہی علاقوں میں قائم ہیں۔ مالی سال رواں میں ایسے مزید ۴۰ کلینک قائم کئے جائیں گے اور دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے آخر تک ریاست میں ایسے کلینکوں کی تعداد ۱۰۵ ہو جائے گی۔

احکام جاری کر دئے گئے کہ تمام ضلع اسپتالوں میں قوت تولید ختم کرنے کے لئے مفت اپریشن کئے جائیں۔ اس سے قبل ایسے آپریشن کیلئے ۱۵۰ روپیہ کیا جاتا تھا۔

دیہی علاقوں کے کلینکوں میں ہر شخص کو فوم ٹیبلٹ اور شیشہ مفت فراہم کیا جاتا ہے۔ دیگر مانع حمل آلات ۱۰۰ روپیہ ماہانہ تک کی آمدنی والوں کو مفت، ۱۰۰ روپیہ سے ۲۰۰ روپیہ ماہانہ تک کی آمدنی والوں کو نصف قیمت اور ۲۰۰ روپیہ ماہانہ سے زیادہ آمدنی والوں کو اصل قیمت پر فراہم کئے جاتے ہیں۔

شہری علاقے کے ہر کنبہ منصوبہ بندی مرکز میں ایک لیڈی ڈاکٹر پورے وقت یا تھوڑے وقت کے لئے تھوڑے وقت کے لئے ایک مرد ڈاکٹر اور ایک تربیت یافتہ لیڈی سوشل ورکر ہوتے ہیں۔ دیہی علاقوں کے مرکز میں صرف ایک تربیت یافتہ لیڈی سوشل ورکر ہوتی ہے۔

لیڈی سوشل ورکر کو کنبہ بندی منصوبہ بندی کو مقبول بنانے کے لئے گھر گھر جانا پڑتا ہے۔ وہ کسانوں کے گھروں پر جاتی ہے اور سیمینار اجتماعی طور پر تبادلہ خیالات فلم شو اور لکچر کا انتظام کرتی ہے۔

کلینک کے لئے مناسب لیڈی سوشل ورکر اور عملے کی فراہمی کیلئے ریاستی حکومت لکھنؤ میں ایک اعلیٰ درجہ کا منطقائی کنبہ منصوبہ بندی تربیتی مرکز کے قیام کے لئے مرکزی حکومت سے خط و کتابت کر رہی ہے۔

ریاستی حکومت نے کنبہ منصوبہ بندی کے کاموں کی رفتار ترقی کا جائزہ لینے اور اس پروگرام کو آگے بڑھانے کے طریقوں پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک ریاستی کنبہ منصوبہ بندی بورڈ کی تشکیل کی ہے۔ اور پروگرام پر عملدرآمد اور اس کی سرگرمیوں میں رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک پورے وقت کے لئے ریاستی کنبہ منصوبہ بندی افسر مقرر کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں پرائیویٹ ڈاکٹروں سے بھی تعاون کی درخواست کی گئی ہے۔ مرکزی حکومت کے ڈائرکٹر کنبہ منصوبہ بندی لفٹیننٹ کرنل جی۔ ایل رینا نے جو گذشتہ ماہ لکھنؤ آئے تھے انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کی لکھنؤ برانچ کے ممبروں سے ملاقات کی اور یہ وعدہ

گیا تھا کہ ایسوسی ایشن کے ہر ممبر کو اس موضوع پر حسبہ مطبوعات فراہم کی جائیں گی۔ انھوں نے کہا کہ کھانے کی مانع حمل دوا دریافت کرنے کے لئے ملک میں ریسرچ کی جارہی ہے اور امید ہے کہ جلد ہی ایک موثر ٹکیہ تیار کی جاسکے گی۔

انھوں نے بتایا کہ کل ہند ادارہ حفظان صحت اور صحت عامہ کلکتہ میں ڈاکٹر سانیال کی دریافت کردہ کھانے کی دوا اینا زائلو ہائیڈرو کوئین کے متعلق کی گئی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ حیض کے بعد ۱۶ ویں اور ۲۱ ویں تاریخ کو ۴۰۰ ملی گرام یہ دوا استعمال کرنے سے حمل کے استقرار میں تقریباً ۵۰ فیصدی کمی ہو جاتی ہے۔ تاہم اس دوا کے عام استعمال کی سفارش کرنے کے لئے مزید تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

اس امر سے ہر شخص متفق ہے کہ ملک کو اقتصادی اعتبار سے مستحکم کرنے کے لئے کنبہ منصوبہ بندی پروگرام پر پوری تندہی سے عملدرآمد کرنا ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی میں ہر سال تقریباً ۵۰ لاکھ کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس طور سے آئندہ ۳۰ برس میں ہندوستان کی موجودہ آبادی دوگنی ہو جائے گی۔

اترپردیش میں جس کی آبادی ۶ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے ہر سال ۱۲-۱۳ اشخاص فی ہزار کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں روزانہ ۹ ہزار بچے پیدا ہوتے ہیں اور ۴۴۰۰ اشخاص روزانہ مرتے ہیں۔

●●●

اترپردیش کے پہاڑی اضلاع اور سرحدی علاقوں میں اون کی صنعت کی ابتدائی دشواریاں تقریباً ختم ہوگئی ہیں اب اعلیٰ درجہ کا اونی مال تیار ہوگا جس کی فوری کھپت ہو سکے گی۔

اونی مال کی کوالٹی بہتر بنانے کے لئے دھنائی کے پلانٹ خریدے گئے ہیں جن سے اضلاع میں استعمال ہونے والے تبت کے اون کی خامیاں دور کی جاسکیں گی۔ علاوہ ازیں تبت کے نفیس اون میں تھوڑا آسٹریلیا کا اون ملانے سے نفیس اور پائیدار اونی کپڑا تیار ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ آج سے ۶ سال قبل موجودہ پہاڑی اون اسکیم شروع کرنے سے پہلے ان اضلاع میں ایسا کھُردرا اور

✡

قدیم ہندوستان میں تجارت

(بقیہ صفحہ ۳۲)

سونے کی اشیاء، کمبل، اور سوتی کپڑا جنوبی ہند سے شمالی ہند کو آتا تھا جس کے عوض یہاں سے گھوڑے، خوشبودار چیزیں اور دوائیاں وغیرہ ادھر بھیجی جاتی تھیں۔ تجارت کا یہ سامان ستو ستو بیل گاڑیوں میں لاد کر کارواں کی صورت میں لے جایا جاتا تھا۔ ہم اکثر رضاکار پولس کا ذکر سنتے ہیں جو ان تجارتی کاروانوں کی چوروں اور ڈاکوؤں سے حفاظت کیلئے وقتی طور پر رکھ لی جاتی تھی۔

میگستھنیز کہتا ہے "راجہ نے تمام راستوں کو ایک دوسرے سے ایک بہت بڑی سڑک[1] کے ذریعہ ملا دیا ہے جو گاندھارا میں پشکلا وتی سے چل کر ٹکشیلا کا نیچ، ہستنا پور، ناور پریاگ ہوتی ہوئی پاٹلی پتر تک جاتی ہے اور وہاں سے بنگال کے مشہور و معروف بندرگاہ تامرلپتی کو چلی جاتی ہے"

اس بڑی سڑک کی ایک شاخ متھرا سے اُجین کو جاتی تھی اور وہاں سے دریائے سندھ کے دہانے پر بھاروکچھ اور پٹالہ تک پہونچتی تھی۔ ایک دوسری شاخ بھاروکچھ سے شروع ہو کر مغربی گھاٹیوں میں ہوتی ہوئی دوراہے کی صورت اختیار کرلیتی اور وہاں سے ایک دونوں کونڈا اور دوسری بعد یعنی مسولی پٹم کو چلی جاتی تھی۔ ایک تیسری شاخ کاویری پٹنم سے مدورئی تک جاتی تھی اور دریائے کاویری کو پار کر کے یہ بھی دوراہے میں تبدیل ہو جاتی تھی جس میں سے ایک شاخ کارور اور دوسرے چیر بندرگاہوں کو اور دوسری پانڈیہ بندرگاہوں کو دم بلیو اور مدورائی کو چلی جاتی تھی۔ اسکے علاوہ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی سڑکیں بھی تھیں اور دریاؤں کے ذریعہ کشتیوں میں بھر کر بھی سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے۔

---

[1] گرینڈ ٹرنک روڈ (Grand Trunk Road).

اونی کپڑا تیار ہوتا تھا کہ ان کی فروخت انہی اضلاع تک محدود تھی ۔ ان اضلاع میں تبت کا جو اون درآمد ہوتا ہے وہ معمولی قسم کا ہوتا ہے اور اس کے ریشے چھوٹے ہوتے ہیں ۔

ریاستی محکمہ صنعت کی جانب سے اس سلسلہ میں دو اسکیمیں شروع کی گئی ہیں ۔ ان میں سے ایک اسکیم پہاڑی اضلاع اور دوسری ہندوستان، تبت کے سرحدی علاقوں کے لئے ہے جہاں بھوٹیاؤں کو جدید مذاق کے مطابق اونی مال تیار کرنے کی تربیت دی گئی ہے ۔ موجودہ صورت حال میں پہاڑی اون اسکیم ۱۹۵۳-۵۴ء میں شروع کی گئی تھی ۔ اور ہندوستان، تبت کے سرحدی علاقوں کے لئے اون کی اسکیم مارچ ۱۹۵۵ء میں شروع کی گئی تھی ۔

ان اسکیموں پر اب تک تقریباً ۵ لاکھ روپیہ صرف ہوچکا ہے اور ۵،۰۰۰ کتائی کرنے والوں اور بنکروں کو تربیت دی گئی ہے ۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ وسیع علاقوں میں اس گھریلو صنعت کے ذریعہ ہر کنبہ کی آمدنی میں اضافہ ہورہا ہے ۔ ایک ایسے علاقے کے لئے یہ ایک اہم بات ہے جہاں صنعتوں کا فقدان ہے اور جو عرصہ دراز سے غذائی قلت کا علاقہ ہے

پہاڑی اون اسکیم کے تحت اس وقت کتائی کے ۹ ۔ بنائی کے ۸ اور ۷ تربیتی اور پیداواری مرکز قائم ہیں اور سرحدی علاقوں میں کتائی کے ۲۸ اور ۷ تربیتی اور پیداواری مرکز ہیں ۔ تربیت پانے والوں کو حکومت کی جانب سے وظیفے دئے جاتے ہیں ۔

تربیت پانے والوں کی امداد باہمی انجمنیں قائم کرنے کے سلسلہ میں ہمت افزائی کی جاتی ہے اور ان کو اون اور ضروری سازوسامان کی خریداری کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے ۔ اور اونی مال گاندھی آشرموں یا ریاستی نظامت صنعت یا کھادی اور دیہی صنعت کمیشن کی ایجنسیوں کے ذریعہ فروخت کیا جاتا ہے ۔

اسکیم کے تحت پانچ دھلائی کے پلانٹ لگائے جارہے ہیں ۔ الموڑہ اور باگیشور میں دو پلانٹ لگائے جاچکے ہیں اور پوڑی اور اترکاشی میں دو پلانٹ لگائے جارہے ہیں ۔ پانچواں پلانٹ درآمد کرنے کا لائسنس حاصل ہوگیا ہے اور یہ پلانٹ سرحدی علاقہ میں

دھراچولہ یا گوچر میں لگایا جائے گا ۔

امداد باہمی انجمنوں یا افراد کو اون اصلی قیمت پر نقد یا ادھار سپلائی کیا جاتا ہے ۔

پہاڑی اون اسکیموں کے ذریعہ ۳۰ ہزار سے زیادہ اشخاص کو براہ راست روزگار فراہم ہوتا ہے ۔

● ● ●

ریاستی محکمہ امداد باہمی کی جانب سے امداد باہمی انجمنوں کے غیر سرکاری ممبروں کو امداد باہمی اصولوں اور ان کو بروئے کار لانے کی تربیت دینے کا ایک جامع پروگرام عنقریب شروع کیا جائیگا آیندہ ماہ سے موجودہ ۷ تربیتی مرکزوں کے علاوہ مزید ۱۲ مرکزوں میں کام شروع ہوجائے گا ۔ آیندہ مالی سال کے آخر تک امداد باہمی انجمنوں کے ۲۵ ہزار غیر سرکاری ممبروں کو تربیت دینے کی تجویز ہے ۔

یہ نئے مرکز آگرہ ۔ الٰہ آباد ۔ دہرہ دون ۔ بلیا ۔ دیوریا ۔ ایٹہ فرخ آباد ۔ گڑھوال ۔ ٹہری گڑھوال ۔ غازی پور بستی ۔ سلطان پور بدایوں اور مرزا پور کے اضلاع میں قائم ہوں گے ۔ پرانے مرکز فیض آباد مین پوری ۔ جھانسی ۔ گورکھپور ۔ اعظم گڈھ ۔ الموڑہ ۔ اور سہارنپور کے اضلاع میں قائم ہیں ۔

اس اسکیم کا خاص مقصد ابتدائی امداد باہمی انجمنوں کے اعزازی عہدہ داروں کو امداد باہمی انجمنوں کے اصولوں، لائحہ عمل، ان کے قیام اور فرائض سے متعلق قوانین اور حساب کتاب رکھنے کے طریقوں وغیرہ کی تربیت دینا ہے ۔ ان تربیت یافتہ عملہ کے ذریعہ امید کی جاتی ہے کہ امداد باہمی انجمنیں جن کے امور میں اس وقت افسروں کو زیادہ دخل ہے حقیقی معنوں میں عوامی ادارے بن جائیں گی اور عوام کو پہل کرنے کے مواقع حاصل ہوجائیں گے ۔ امداد باہمی انجمنوں کی انتظامیہ کمیٹیوں کے ممبروں کو انجمنوں کے نظم اور نسق کے سلسلہ میں ان کے فرائض کی تربیت دینے کی بھی تجویز ہے ۔

کل ہند امداد باہمی یونین کی سفارش کے مطابق مرکزی حکومت عملہ اور لٹریچر کے اخراجات اور ریاستی حکومت میں تربیت پانے والوں کے وظائف اور دیگر ہنگامی اخراجات برداشت کرے گی ۔

کل ہند امداد باہمی یونین اس اسکیم کے اقدامات میں رابطہ قائم کرنے میں ضروری رہنمائی کرے گی اور ریاستی یونین اپنے علاقوں میں اس اسکیم پر عمل درآمد کی ذمہ دار ہوگی۔

اس اسکیم کو زیادہ موثر اور مفید بنانے کے لئے یہ ترمیمی پروگرام دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے امداد باہمی ترقیاتی منصوبوں اجتماعی ترقی کے پروگرام اور قومی توسیعی سروس اسکیموں سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ ابتدا میں مربوط کرنے کا پروگرام ایسے علاقوں میں شروع کیا جائے گا جہاں ۱۹۵۲ء میں اجتماعی یا قومی توسیعی سروس بلاک قائم کئے گئے تھے۔ ان اضلاع میں عوام اس ترمیمی پروگرام میں زیادہ دلچسپی لیں گے کیونکہ ان علاقوں میں گذشتہ کئی برسوں کے دوران میں ترقیاتی اقدامات کا تجربہ بہت افزا رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں یہ علاقے اقتصادی اعتبار سے امداد باہمی اسکیموں پر عملدرآمد کے لئے زیادہ موزوں ہیں علاوہ ازیں اس پروگرام کے ذریعہ اجتماعی ترقی کا جذبہ استوار ہوگا اور عوام کو امداد باہمی اصول کی بنیاد پر منظم کرنے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

●●●

ضلع نینی تال میں کھٹیما کے قریب نانک ساگر کے مقام پر بند کی تعمیر کے لئے کام کرنے والے تقریباً ۷۰۰ قیدیوں نے نومبر ۱۹۵۶ء سے دسمبر ۱۹۵۸ء تک ۸۴۴۸۰۰ روپیہ بطور مزدوری حاصل کیا۔ اس مدت میں ان قیدیوں نے کل ۷۹۰۶۰۷۰۰۰ مکعب فٹ مٹی کی کھدائی کا کام کیا۔

اس مدت میں تقریباً ۱۵۰ قیدیوں کو گھر جانے کے لئے چھٹی دی گئی اور یہ تمام قیدی مقررہ تاریخ پر کیمپ میں واپس آگئے۔ ان ۲ برسوں میں قیدیوں نے اپنی مزدوری میں سے ۱۰۹۵۰۰ سے زائد روپیہ اپنے گھر والوں کو بھیجا۔

کیمپ کے حکام کے ذریعہ کی گئی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ گذشتہ دو برسوں میں کیمپ سے رہا شدہ قیدیوں میں سے ۶۰ فیصدی سے زیادہ قیدی کاشتکاری یا دوسرے کاموں میں لگ گئے۔

چرک سیمنٹ فیکٹری پر کام کرنے والے کھلے کیمپ کے ۸۰۰ قیدیوں نے گذشتہ سال اپریل سے نومبر تک ۲۶۱۰۰۰ سے زیادہ روپیہ بطور مزدوری حاصل کیا۔ ان قیدیوں نے دوسرے مزدوروں کے مقابلہ میں زیادہ کام کیا جس کی وجہ سے وہ بونس پانے کے مستحق ہوگئے۔ فیکٹری کے حکام ان کے کام سے اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے کچھ قیدیوں کو فنی تربیت دینے کے لئے منتخب کیا۔ تربیت کی تکمیل کے بعد ان قیدیوں کو یہ اختیار دیا جائیگا کہ اگر وہ چاہیں تو فیکٹری میں مستقل طور پر کام کر سکیں۔

اس وقت ریاست میں مختلف مقامات پر ۴ کھلے کیمپ ہیں جن میں کل ۲۴۰۰ قیدی کام کر رہے ہیں۔ نانک ساگر میں یہ قیدی ایک بند تعمیر کر رہے ہیں۔ یہ کیمپ نومبر ۱۹۵۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ بند کی تعمیر کا کافی کام مکمل ہو چکا ہے اس لئے اس کیمپ کے مکینوں کی تعداد کم کر دی گئی۔ دوسرا کیمپ گذشتہ سال یکم جولائی کو مجھولا ضلع پیلی بھیت میں قائم کیا گیا۔ اس کیمپ میں ہر قیدی کو روزانہ اوسطاً ڈیڑھ روپیہ مزدوری ملتی ہے۔

چرک میں ۵۵۰ قیدیوں پر مشتمل تیسرا کیمپ مارچ ۱۹۵۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ بعد میں قیدیوں کی تعداد بڑھا کر ۸۰۰ کر دی گئی۔ اس کیمپ میں ہر قیدی کو روزانہ ۲ روپیہ ۲ آنہ مزدوری ملتی ہے۔

چوتھا کیمپ پھول باغ میں ہے جہاں نومبر ۱۹۵۷ء میں ۵۰ قیدیوں کو ریاستی زرعی فارم پر کام کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہاں ہر قیدی کو روزانہ ڈیڑھ روپیہ مزدوری ملتی ہے۔ ان کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے کی اجازت ہے۔ اور وہ اپنے ٹھہرنے اور کھانے کا خود انتظام کرتے ہیں۔ وہ یہاں بالکل آزاد انسانوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ یہ تجربہ بہت زیادہ کامیاب رہا کیونکہ اس کیمپ کے تمام قیدیوں کو ان کی عمدہ کارکردگی کے متعلق فارم کے حکام کی رپورٹ پر رہا کر دیا گیا۔ ان قیدیوں میں سے کسی نے بھی فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ فارم کے حکام کی درخواست پر ۵۰ قیدیوں کی ایک دوسری جماعت کو وہاں بھیجنے کے احکام جاری کئے گئے ہیں۔

یہ تجربات اس مقصد کے پیش نظر کئے جا رہے ہیں کہ یہ قیدی رہائی کے بعد مفید شہری بن سکیں۔ نظم اور نسق کے نقطہ نظر سے یہ

اقدام اس وجہ سے مفید ہے کہ ان قیدیوں پر حکومت کو کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ وہ اپنی مزدوری سے اپنے اخراجات پورے کر لیتے ہیں۔

ان کیمپوں میں قیدیوں کی عمدہ کارکردگی کے پیش نظر ریاستی حکومت غذائی پیداوار مہم کے سلسلہ میں قیدیوں سے کام لینے پر غور و خوض کر رہی ہے۔ اس قسم کی ایک تجویز ریاست کے وزیر سماجی تحفظ شری لکشمی رمن اچاریہ کے زیر غور ہے۔

•••

شری بلدیو سنگھ آریہ نائب وزیر حکومت اتر پردیش نے جو ضلع دہرہ دون کے جانسار باور کے علاقہ کے کولٹاس اور ہریجنوں اور ضلع شہری گڑھوال میں جون پور۔ روئیں کے ہریجنوں کی حالت کی جانچ کرنے کے لئے حال میں ریاستی حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی کے چیرمین ہیں حسب ذیل بیان جاری کیا ہے۔

ضلع دہرہ دون کے جانسار باور اور ضلع ٹہری گڑھوال کے جونپور روئیں کے علاقہ کے بیشتر لوگ خاص طور پر کولٹاس جن کی ایک منفرد تہذیب ہے۔ مسٹر ایم۔ اے۔ داس کے وضع کردہ "دستور العمل" کے مطابق نظم اور نسق کے امور وغیرہ سرانجام دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد مسٹر جے۔ سی برشن نے اصل قواعد میں بعض تبدیلیاں کرنے کی تجویز پیش کی جو بعد میں اصل قواعد میں شامل کر لی گئیں اور جملہ "دستور العمل" کو ہر کھٹ کے سیانوں نے قبول کیا اور اس پر دستخط کئے۔ جانسار باور میں ۳۹ کھٹ ہیں اور اس علاقہ کے ۳۸۲ مواضعات میں اب بھی گرام سبھاؤں کے ذریعہ نظم اور نسق ہوتا ہے۔

حکومت یہ محسوس کرتی ہے کہ کولٹاس اور ہریجنوں کو ہندوستان کا باعزت شہری بنانے کیلئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے حکومت نے چند انتظامی اور امدادی اقدامات کئے ہیں۔ اس امر کا اندازہ لگانے کے لئے کہ یہ اقدامات کس حد تک موثر ثابت ہوئے ہیں اور عوام کو ان سے کس قدر فائدہ پہونچا ہے ریاستی حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو حسب ذیل امور پر غور و خوض کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔

(۱) کولٹاس اور ہریجنوں کے سماجی اور معاشی حالات کا جائزہ لینا۔

(۲) کولٹاس اور ہریجنوں کی سماجی اور معاشی حالات بہتر بنانے کے لئے وسائل اور طریقے تجویز کرنا۔

(۳) اس امر پر غور کرنا کہ کولٹاس اور ہریجنوں کی سماجی اور معاشی ترقی کے لئے کوئی قانون وضع کرنا ضروری ہوگا یا نہیں۔

(۴) کولٹاس اور ہریجنوں کے علاقوں میں نظم اور نسق کو بہتر بنانے کے لئے تجاویز پیش کرنا۔

کمیٹی سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی تجاویز پیش کرتے وقت سارے علاقہ کی جملہ آبادی کے مفاد کو مد نظر رکھے۔

امید ہے کہ ان لوگوں کی بہبودی میں دلچسپی رکھنے والے اشخاص کمیٹی کو اس سلسلہ میں ہر ممکن معلومات بہم پہونچائیں گے تاکہ کمیٹی کو اپنے کام میں آسانی ہو۔ مجھے امید ہے کہ کمیٹی کو عوام کا تعاون حاصل ہوگا۔

کمیٹی نے ایک بہت جامع سوالنامہ مرتب کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ ماہرین اور غیر ماہرین سرکاری ملازمین اور عوامی کارکن بھی اس سوالنامہ میں گہری دلچسپی لینگے۔ اور کمیٹی عوام۔ ماہرین یا عوامی کارکنوں کی جانب سے سوالنامہ کے جو جوابات موصول ہو رہے ہیں ان کا تجزیہ کرے گی۔

•••

اتر پردیش میں دوسرے پنجسالہ منصوبہ کی مدت کے ختم تک ۱۱،۲۵ لاکھ ٹن شکر پیدا کرنے کے نشانہ کو پورا کرنے کے لئے حکومت ہند نے اتر پردیش میں موجودہ شکر ملوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے اور نئے کارخانے قائم کرنے کے لئے لائسنسوں کے اجرا میں نرمی برتنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لہٰذا مرکزی حکومت نے ریاست کی ۲۲ شکر ملوں کو لائسنس منظور کئے ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ حکومت ہند نے دوسرے پنجسالہ منصوبہ کی مدت کے لئے ملک بھر کے واسطے شکر کا نشانہ ۲۲،۵ لاکھ ٹن مقرر کیا ہے جس میں سے ۱۱،۲۵ لاکھ ٹن اتر پردیش کے لئے مقرر ہے۔

ریاست میں شکر کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت چار امداد باہمی شکر ملیں اور ایک جوائنٹ اسٹاک شوگر فیکٹری قائم کی جائے گی۔ بازپور (نینی تال)، سرساواں (سہارنپور) اور باغپت (میرٹھ) میں کارخانے قائم کرنے کے لئے حکومت ہند نے جو لائسنس منظور کئے ہیں ان میں سے بازپور امداد باہمی شکر مل میں کام

شروع ہو چکا ہے۔ باغپت امداد باہمی مل قائم کرنے کے لئے در آمدی لائسنس جاری کیا جا چکا ہے اور مشینری کے لئے آرڈر دیا جا چکا ہے۔ سرساواں مل کے لئے پرانی مشینری حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کچھا (نینی تال) میں ایک نئی جوائنٹ اسٹاک شوگر فیکٹری قائم کرنے کی تجویز ہے اور اس سلسلہ میں میسرز بنشٹ انڈسٹریل کارپوریشن نینی تال کو ۴۰ لاکھ روپیہ کا قرضہ دیا جا چکا ہے۔ ضلع میرٹھ میں واقع ہستناپور رفیوجی کالونی میں ایک شکر کا کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے اور عمارتوں کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔

●●●

گڑھ مکتیشور میں دریائے گنگا کے اوپر پل آئندہ سال جولائی کے آخر تک مکمل ہو جائے گا اور آمد و رفت کیلئے کھول دیا جائے گا۔ اس منصوبہ پر مجموعی طور پر تخمیناً ایک کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

اس بڑے پل کی تعمیر سے دہلی۔ میرٹھ اور پنجاب مرادآباد بریلی اور لکھنؤ کے درمیان براہ راست آمد و رفت ہو سکے گی جس سے خاص طور پر تجارت کو کافی فروغ ہوگا۔ علاوہ ازیں اس پل تک جانے والی سڑک سے یاتریوں کو بہت زیادہ سہولت ہوگی۔

اس پل کی کل لمبائی ۲۲۰۸ فیٹ ہوگی جو گڑھ مکتیشور میں ریلوے پل کے برابر ہے۔ پل کے اوپر سڑک ۲۴ فیٹ چوڑی ہوگی اور اس کے دونوں طرف ۵.۵ فیٹ چوڑا فٹ پاتھ ہوگا۔

اس وقت ۱۴ کنوؤں میں سے ۹ کنوؤں پر کام ہو رہا ہے۔ بقیہ کنوؤں پر آئندہ دو مہینوں میں کام شروع کیا جائے گا۔ تمام کنوؤں کی کھدائی ڈھانچہ اور کھمبوں وغیرہ سے متعلق کام آنے والے برسات کے موسم سے قبل ختم کرنے کی تجویز ہے۔ اصل پل اس کے بندوں اور اس کے دونوں جانب ایک ایک میل لمبی سڑک کی تعمیر پر ۷۸۹۷۰۰۰ روپیہ صرف ہوگا جب کہ کل منصوبہ پر ایک کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ دہلی۔ لکھنؤ قومی شاہراہ گڑھ مکتیشور کے مقام پر دریائے گنگا کو پار کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہر سال نومبر میں کشتیوں کا پل تیار کیا جاتا ہے اور مئی یا جون میں توڑ دیا جاتا ہے۔ اس مدت کے دوران میں بھی آمد و رفت میں کافی دقتیں درپیش ہوتی ہیں۔ برسات کے زمانہ میں گاڑیاں ایک ریلوے شٹل کے ذریعہ گڑھ مکتیشور اور گجرولہ کے درمیان چلتی ہے دریائے گنگا کو پار کرتی ہیں جو بہت گراں ہونے کے علاوہ عوام کے لئے کافی تکلیف دہ بھی ہے۔

ان تمام دقتوں کے پیش نظر اس پختہ پل کی تعمیر سے جس کے ذریعہ ہر موسم میں آمد و رفت ہو سکے گی اتر پردیش کے مغربی اضلاع کی تجارت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

یو۔پی اسپورٹس کونسل نے ۱۹۵۹ء کے لئے کھیل کود کی انجمنوں کو دی جانے والی مالی امداد میں اضافہ کیا ہے۔ ۱۳۴۶۰۰ روپیہ کے کل اخراجات میں علاقائی اسپورٹس کونسلوں کو ۳۰۶۰۰ روپیہ ریاستی اسپورٹس ایسوسی ایشنوں کو ۲۳۰۰۰ روپیہ اور سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم کے لئے ۴۵۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد شامل ہے۔ ۱۹۵۸ء کے لئے کل ۱۱۶۶۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی گئی تھی۔

۱۹۵۹ء میں تربیتی کیمپوں کے لئے ۱۶۰۰۰ روپیہ مرکزی کیمپوں کے لئے ۲۰۰۰۰ روپیہ اور امرت کور تربیتی اسکیم اور نیشنل فیڈریشن کیمپوں کیلئے ۵۰۰۰ منظور کیا گیا ہے۔

یو۔پی یونیورسٹی ٹورنامنٹ کے لئے ۳۶۰۰۰ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے جب کہ ۱۹۵۸ء میں صرف ۱۴۶۴۰ روپیہ مقرر کیے گئے تھے۔ ریاست کی مختلف انجمنوں کو ٹورنامنٹ منعقد کرنے کے لئے ۱۶۵۰۰ روپیہ کی مخصوص مالی امداد دی گئی ہے۔ ریاست میں اسٹیڈیم کی تعمیر کے سلسلہ میں ۲۵۱۵۰۰ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

یو۔پی اولمپک ایسوسی ایشن کو ۶۰۰۰ روپیہ اور یو۔پی اسپورٹس کنٹرول بورڈ کو ۴۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد دی گئی ہے۔ یو۔پی ٹینس ایسوسی ایشن اور یو۔پی کرکٹ ایسوسی ایشن کو چار چار ہزار روپیہ دینے کی تجویز ہے۔ یو۔پی بیڈمنٹن ایسوسی ایشن کو ۳۰۰۰ روپیہ اور یو۔پی ٹیبل ٹینس ایسوسی ایشن کو ۲۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد دی جائیگی۔

● ● ●

ایک حالیہ جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ مختلف سرکاری ٹیکنیکل اداروں میں جو تربیت دی جاتی ہے اس سے نہ صرف بیروزگاری دور ہونے میں مدد ملتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ملک میں نئی نئی صنعتوں کے لئے تربیت

یافتہ افراد کی قدر بھی ہوتی ہے۔

ریاستی نظامت تربیت اور روزگار کے پیشہ دارانہ رہنمائی کے شعبہ کی جانب سے ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۶ء کے دوران میں الموڑہ۔ علی گڑھ۔ الہ آباد۔ لکھنؤ۔ میرٹھ۔ رام پور اور وارانسی کے صنعتی تربیتی اداروں کے ایسے طلبا کا جائزہ لیا گیا جنھوں نے انجینئرنگ اور متعلقہ پیشوں کی تربیت حاصل کی تھی۔ اس جائزہ کے ذریعہ اس امر کا پتہ لگانا مقصود تھا کہ تربیت پانے والے اپنے دو سالہ کورس کی تکمیل کے بعد ملازمت حاصل کرنے یا خود اپنا کاروبار شروع کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ اس سلسلہ میں تربیت پانے والوں یا ان کے سرپرستوں سے براہ راست معلومات [illegible] کی گئیں اور چونکہ روزگار دفتروں سے کہا گیا کہ وہ اس سلسلہ میں [illegible] سابق تربیت یافتہ افراد سے رجوع کریں۔ جانچ [illegible] والوں نے ان افراد کے گھروں پر جاکر ان سے سوال نامہ کے مطابق معلومات حاصل کیں۔

۲۲۱ سابق تربیت یافتہ افراد میں سے [illegible] ملاقات ہو سکی۔ ۱۱۰ افراد اس کام میں جس کی انھوں نے تربیت حاصل کی تھی یا متعلقہ کاروبار [illegible] ۴۰ افراد دیگر مختلف کاروبار میں لگے ہوئے تھے [illegible] افراد [illegible] اپرنٹس کی حیثیت سے اور [illegible] افراد دوسروں کے کاروبار میں کام کر رہے تھے۔ اور ۳ افراد [illegible] کورس کے لئے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ۳ افراد بے روزگار تھے۔

مذکورہ جائزہ سے معلوم ہوا کہ صرف ۵، یعنی ۲۳۰۳ فیصدی افراد منفعت بخش روزگار نہ حاصل کر سکے۔ ان میں سے ۱۳ افراد اپنی تربیت کی تکمیل کے بعد کچھ عرصہ کے لئے کام پر لگے رہے لیکن اس کے بعد بے روزگار ہو گئے اور ۳ افراد کے پاکستان چلے جانے کی اطلاع ملی۔ جائزہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ۱۳ افراد مرکزی حکومت اور ۷۷ افراد ریاستی حکومت ۳ افراد [illegible] بجلی گھر، ۳ لوکل باڈیز اور ۹۴ پرائیوٹ سیکٹر کے کارخانوں میں ملازم تھے۔ بحیثیت مجموعی جائزہ سے یہ معلوم ہوا کہ تربیت یافتہ افراد کے ۵، فیصدی افراد کو منفعت بخش روزگار ملا اور ۱۰ فیصدی نے ذاتی اپنا کاروبار شروع کیا یا اپرنٹس کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔

ان تربیتی اسکیموں کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ حال میں ہیوی الیکٹریکلس بھوپال نے اس ریاست کے اداروں کے ۱۳۰ تربیت یافتہ افراد کو اپنے یہاں کام پر لگایا۔

●●●

مرکزی وزارت تعلیم نے بچوں کے لئے کتابوں کے پانچویں کل ہند مقابلہ میں بہترین تصانیف پر ایک ایک ہزار روپیہ کے پانچ اور پانچ پانچ سو روپیہ کے ۲۵ انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مذکورہ پانچ انعامات میں سے دو ہندی کے لئے مخصوص ہیں۔

ان انعامات کے علاوہ ریاستی حکومتیں بھی علاقائی زبان میں بچوں کے ادب کے فروغ کے لئے اپنی جانب سے انعامات کی تعداد اور مالیت میں اضافہ کا اعلان کر سکتی ہیں انعام پانے والی ہر کتاب کے دو ہزار نسخے بچوں کی لائبریریوں وغیرہ کے لئے خرید کئے جائیں گے۔ انعامات کے لئے کتابوں کو بچوں کی عمر کے دو گروپ ہیں یعنی تین برس سے چھ برس اور سات برس سے ۱۴ برس کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے گا۔

ہر کتاب کے ساتھ مصنف کی جانب سے تین روپیہ کا اور ناشر کی جانب سے پانچ روپیہ کا خزانہ کا چالان منسلک ہونا لازمی ہے۔

ہر کتاب کے سرورق کی پشت پر مندرجہ باتیں ہندی یا انگریزی میں درج ہونا چاہیئے۔ کتاب کا عنوان بچوں کی عمر کا گروپ مصنف کا نام اور پتہ۔ ناشر کا نام اور پتہ۔ شائع ہونے کا سال زبان کم از کم قیمت خزانہ کا چالان نمبر۔ آیا تصنیف طبع زاد ہے یا کسی غیر ملکی تصنیف کا ترجمہ۔

ہندی۔ سندھی۔ اور اردو کی کتابیں اسسٹنٹ ایجوکیشن ایڈوائزر بی ۳ سکشن۔ ایجوکیشن منسٹری ایم بلاک نئی دہلی کے پاس اور دیگر علاقائی زبانوں کی کتابیں متعلقہ ریاست کے سکریٹری محکمہ تعلیم کے پاس ۲۵ مئی ۱۹۵۹ء تک موصول ہو جانا چاہیئے۔ مقابلہ کے نتائج کا اعلان ۱۴ نومبر ۱۹۵۹ء کو یوم اطفال کے موقعہ پر کیا جائے گا۔

✡

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش اُن سے بہر حال متفق ہو۔

نیا دور
لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۲

جیٹھ ۱۸۸۱ شک
جون ۱۹۵۹ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر
ایم ۔ جی ۔ شوم

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات اتر پردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

اتر پردیش کا پہلا ریاستی امداد باہمی کنونشن لکھنؤ میں ۲۰ اپریل ۱۹۵۹ء کو منعقد ہوا۔ اس کنونشن میں وزراء یونیورسٹی کے اساتذہ اور سرکاری حکام کے علاوہ ایک کثیر تعداد میں غیر سرکاری مندوبین نے بھی شرکت کی۔ کنونشن کا افتتاح اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند نے کیا اور اپنی تقریر میں امداد باہمی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ امداد باہمی محض ایک اقتصادی نظریہ نہیں بلکہ ایک فلسفہ حیات ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ امداد باہمی کو ایک "فلسفہ حیات" کی حیثیت سے ہندوستان نے آج نہیں بلکہ ہزاروں برس پہلے پیش کیا تھا اور اس کا ثبوت ویدوں، گیتا کے وہ اشلوک ہیں جن میں امداد باہمی کو سراہا گیا ہے۔ موجودہ دور میں جب کہ دنیا سیاسی اور اقتصادی الجھنوں میں گرفتار ہے اور ہمارا ملک بھی ایک نازک اقتصادی مرحلہ سے گزر رہا ہے امداد باہمی کی ضرورت اور اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ہندوستان کو اقتصادی حیثیت سے خوش حال اور مضبوط بنانے کے لئے پنج سالہ منصوبے بنائے گئے ہیں، دیہی علاقوں کو خود کفیل بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور اناج کی پیداوار میں اضافہ کے لئے کاشتکاروں کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچانے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ان کوششوں کے سلسلے میں اس بات کو محسوس کیا گیا کہ امداد باہمی ہماری اقتصادی حالت درست کرنے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس احساس کے بعد تحریک امداد باہمی کو ترقی دینا ہم سب کا فرض ہو گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ زمانہ بہت کچھ بدل چکا ہے اور اب ہمیں نئے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ اسی لئے امداد باہمی کی تحریک میں ہمیں ایک نیا جذبہ پیدا کرنا ہوگا اور ایک نئی روح پھونکنا ہوگی۔ حالات اس امر کے مقتضی ہیں کہ امداد باہمی انجمنوں کو ایسے اداروں میں تبدیل کیا جائے جو کاشتکاروں کی ہر ممکن خدمت کر سکے۔ اور اس کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر گاؤں میں خدمتی امداد باہمی انجمن قائم کی جائے جو دیہی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کر سکے۔ اس میں جبر کا کوئی سوال نہیں ہے بلکہ یہ خود کاشتکاروں کے حق میں ہے کہ اس طرح کی خدمتی امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں آئے۔

ہو سکتا ہے کہ کاشتکار شروع شروع میں امداد باہمی کاشت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں۔ لیکن جیسا کہ وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے کہا ہے کہ اگر کسانوں کو خلوص دل کے ساتھ اس کے متعلق سمجھایا جائے اور خدمتی امداد باہمی انجمنیں اپنی افادیت کا ثبوت دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کاشتکار امداد باہمی کاشت کو نہ اپنائیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ امداد باہمی تحریک میں حصہ لینے والوں کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ غرض اس سلسلہ میں ہم سب پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہندوستان کو اقتصادی حیثیت سے خوش حال بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور بہ قول ڈاکٹر سمپورنانند امداد باہمی ہمارے اس مقصد کے حصول کا بہترین طریقہ ہے۔

امداد باہمی کے ذکر کے ساتھ ہمارا ذہن تعمیری کاموں میں عوام کے رضاکارانہ تعاون کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ پہلے پنج سالہ منصوبہ کے دوران اور دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے پچھلے تین برس میں عوام نے ترقیاتی سرگرمیوں میں جس انہماک کے ساتھ اشتراک عمل کیا ہے وہ ہماری ریاست کے مستقبل کے لئے بہت امید افزا اور حوصلہ بخش ہے۔ تعمیری سرگرمیوں کا ایسا کوئی شعبہ نہیں جس میں عوام نے عملی دلچسپی نہ دکھائی ہو۔ ان کی رضاکارانہ محنت کی بدولت کتنی ہی سڑکیں پختہ ہو گئیں، کتنے ہی اسکول کھل گئے، کتنے ہی پنچایت گھر قائم ہوئے اور اسی طرح کے نہ معلوم کتنے کام ہو گئے۔ دیہات کے رہنے والوں نے چھوٹی بچت اسکیم میں روپیہ پس انداز کر کے بھی اپنے شعور اور پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عوام نے اشتراک عمل کے یہ دل خوش کن مظاہرے نہ کئے ہوتے تو بہت سے کام جو پایۂ تکمیل تک پہنچ چکے ہیں، ابھی تک ادھورے ہوتے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے عوام اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو برابر محسوس کرتے رہیں گے اور امداد باہمی کی تحریک کو تقویت پہنچا کر ایک نئے ہندوستان کی تعمیر میں اسی طرح برابر حصہ لیتے رہیں گے۔

ــــــــــــــــــ ایڈیٹر

غزل

آنند نرائن مُلّا

طوفانِ دل ہے اب آرمیدہ — اے وائے فصلِ مژگاں دریدہ
جورِ بُتاں کے قصّے نہ چھیڑو — آج اِک جہاں ہے مردم گزیدہ
مُطرب نہ اِترا، کتنے یہاں ہیں — لب پر لئے گیت اِک ناشنیدہ
بے حرف و بے صوت پیغامِ اُلفت — سینہ بہ سینہ دیدہ بہ دیدہ
نرمی بھی گرمی بھی اُس نظر میں — اِک تارِ شبنم شعلہ دمیدہ
مُدت کے بچھڑے اُن سے ملے تھے — دُہرائے قصّے کچھ چیدہ چیدہ
کیا تجھ پہ گزری بامِ فلک پر — اے ماہتابِ خاک آفریدہ
توڑی گئیں کتنی کلیاں کھلا تب — اک دلبرِ گلستاں خوش دمیدہ
جاتے ہیں دور اور مُڑ کر تبسم — آتے ہیں پاس اور دامن کشیدہ
دو دوست باہم ہنستے تھے ادرہم — کیا جانے کیوں ہو گئے آبدیدہ
ملتا نہیں آج محفل میں ساقی — اِک بادہ کش باصفا خوش عقیدہ
انجام تیرا اِک داغِ دامن — اے تاجِ مژگاں اے نورِ دیدہ
اللہ ری عقل کی حشر گامی — شب تک گماں صبح کا ہر عقیدہ

کیا جانے کب ٹوٹ جائے یہ تارا
مُلّا ہے اشکِ مژگاں دمیدہ

غزل

تلوک چند محرومؔ

زباں پر لذّتِ دردِ محبت کا بیاں کیوں ہو
جو اپنی زندگی کا راز ہے، سب پر عیاں کیوں ہو

جواب آیا کہ تابِ دید کے قابل بھی ہیں آنکھیں؟
کبھی جب پوچھ بیٹھے ہم کہ آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

تری بخشی ہوئی، قائم ترے لطف و کرم سے ہے
تو پھر یہ زندگی اپنے لئے بارِ گراں کیوں ہو

شبِ غم کا سحر کرنا تھا جوئے شیر کا لانا
ہمارے حوصلے کا اس سے آگے امتحاں کیوں ہو

دلِ ناآشنائے خرّمی کو غم کا خدشہ کیا
نہ ہو جب موسمِ گُل ہی تو احساسِ خزاں کیوں ہو

فلک پر اڑنے والوں کا بھی ہے مدفن زمیں آخر
مقامِ اوج پر نازاں کوئی رفعت نشاں کیوں ہو

ہم اُس کے — اور ساری کائناتِ بیش و کم اُس کی
یہ عالم ہو، تو پھر اندیشۂ سود و زیاں کیوں ہو

اُسی کی ذاتِ بے پایاں سے جب معمور ہے عالم
برائے سجدہ ریزی جستجوئے آستاں کیوں ہو

ہوا اپنے عمل سے فارسِ میدانِ آزادی
کبھی کا غاشیہ بردار اب ہندوستاں کیوں ہو

یہ ہے وہ آسماں جس کو تخیل چھو نہیں سکتا
زمینِ میرزا غالبؔ میں کوئی نغمہ خواں کیوں ہو

چلی آتی ہے آوازِ جرس محروم، سنئے تو
اٹھو، سوئے ہوئے وقتِ رحیلِ کارواں کیوں ہو

مشاعرۂ یومِ غالب (دہلی) زیرِ اہتمام انجمن ترقی اردو۔

[illegible]

چند عروضی غلطیاں

رشید حسن خاں

عروض ایک دلچسپ فن ہے۔ علم ریاضی کی طرح اس میں بھی غور و فکر اور کاوش و ایجاد کے لئے خاصا سر و سامان محفوظ ہے۔ اسی کے ساتھ ذراسی بے نیازی سے بات کچھ سے کچھ بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرے فنون شاعری کے ساتھ ساتھ اس کی طرف بھی آج کل بہت کم توجہ کی جاتی ہے، حالانکہ اس کے دامن میں دلچسپی کے مختلف سامان ہیں۔ میں اس مختصر سے مضمون میں کچھ ایسے مسامحات کا ذکر کروں گا جو فن عروض سے متعلق ہیں۔ اس سے جہاں کچھ لوگوں کے لئے دلچسپی کا سر و سامان فراہم ہوگا، وہاں دوسرے لوگوں کے لئے احتیاط و آگاہی کی صورتیں بھی سامنے آئیں گی۔ نیز اس فن کے طالب علموں کو بعض ان اغلاط سے واقفیت ہو جائے گی جو بصورت دیگر پریشانی یا غلط فہمی کا سبب بن سکتی ہیں۔ فن عروض کی بعض متداول کتب میں کہیں کہیں ایسی غلطیاں سامنے آتی ہیں جن سے ذہن مشوش ہو جاتا ہے اور بعض صورتوں میں ان سے خاصی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے نیز اس فن سے متعلق بعض مضامین میں بھی کہیں کہیں یہی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ فی الوقت ایسے چند مقامات کو پیش کرتا ہوں۔

صاحب بحر الفصاحت نے اوزان بحر متدارک کے ذیل میں ایک وزن (فاعلان فاعلن فاعلان فاعلن) بھی لکھا ہے اور مثال میں اپنا ایک شعر پیش کیا ہے۔ متعلقہ عبارت یہ ہے۔

"متدارک مثمن مذال۔ فاعلان فاعلن فاعلان فاعلن۔ دو بار بولفہ

میرے ساتھ باغ کو گل وہ رشک گل گیا
بس تمام دفتر رنج و درد دُھل گیا

تقطیع۔ میرے سات (فاعلان) باغ کو (فاعلن) گل وہ رشک (فاعلان) گھل گیا (فاعلن) الخ

ایک رکن مذال ہے اور ایک سالم (بحر الفصاحت صـ ۲۳)

قواعد عروض کے لحاظ سے یہ وزن بحر متدارک کا نہیں ہو سکتا۔ اس وزن میں صدر و ابتدا مذال ہے۔ علم عروض کا یہ مسلمہ ضابطہ ہے کہ اذالہ صدر و ابتدا میں نہیں آتا۔ خود صاحب بحر الفصاحت نے بیان زحافات میں اس کی تصریح کی ہے۔

"اذالہ، بحر رجز، متدارک، بسیط، کامل، سریع، منسرح مقتضب، مدید و جدید میں آتا ہے اور اکثر عروض و ضرب میں واقع ہوتا ہے۔ حشو میں کم، اور صدر و ابتدا میں بالکل نہیں آتا۔" (بحر الفصاحت صـ ۱۶۲)

حدائق البلاغت میں بھی اذالہ کے بیان میں لکھا ہے۔

"ایں زحاف در بحر رجز و متدارک و بسیط و کامل و سریع و منسرح و مقتضب واقع می شود۔ در عروض و ضرب بیشتر وقوع می یابد۔ در حشو کم تر۔ در صدر و ابتدا ممنوع۔"

(حدائق البلاغت صـ ۱۰۳)

اصل میں یہ وزن بحر ہزج سے متعلق ہے۔ اور اس کی صحیح صورت "فاعلن۔ مفاعلن۔ فاعلن۔ مفاعلن" ہے۔ اور یہ بحر ہزج مثمن اشتر مقبوض ہوگی۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ عام کتب عروض میں فروع بحر ہزج کے تحت یہ وزن مذکور نہیں ہے۔ اس کی ایک دوسری صورت "فاعلن۔ مفاعیلن۔ فاعلن۔ مفاعیلن" ہزج مثمن اشتر مذکور ہے۔ مفاعیلن میں زحاف قبض لاکر مفاعلن بنایا جاسکتا ہے۔

ادھر نشور واحدی کی ایک غزل سننے میں آئی جس کا ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی۔ میرے ایک کرم فرمانے اس طرف توجہ دلائی کہ نشور کی اس غزل کا وزن فاعلن مفاعلن دوبار ہوسکتا ہے لیکن یہ وزن ہے؟ نہیں۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ واقعی کتب متداول میں یہ وزن درج نہیں ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی غرابت یا اشکال نہیں ہے۔ زحاف قبض بحر ہزج میں مستعمل ہے۔ لہٰذا (ہزج اشتر مقبوض) کا وزن بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے۔

جناب اثر لکھنوی کے گرامی نامے سے معلوم ہوا کہ شوق قدوائی مرحوم کا ایک طویل قطعہ اسی وزن میں ہے۔ لیکن موصوف کو اس کا کوئی شعر یاد نہیں رہا۔ مصنف بحر الفصاحت نے اپنا جو شعر متدارک مذال کی مثال میں درج کیا ہے۔ وہ در اصل ہزج مثمن اشتر مقبوض میں ہے اس وزن میں ایک خاص قسم کا ترنم ہے اور اس وزن کو رائج ہونا چاہیئے۔

غیاث اللغات میں علم عروض کے بیان میں ایک مختصر سا رسالہ بھی شامل ہے۔ اس میں مولف غیاث نے بحر منسرح کے اوزان میں ایک وزن (مفعول فاعلات مفعول فاعلات) بھی درج کیا ہے متعلقہ عبارت یہ ہے:۔

"بحر منسرح مثمن اخرب۔ سیفی۔

سیفی ازاں گدا شد در شہر آں پری رو
تا روزہائے دوراں آید بجانب او

مفعول فاعلات مفعول فاعلات دوبار"

حقیقت یہ ہے کہ زحاف خرب بحر منسرح میں آتا ہی نہیں ہے۔ وہ صرف ہزج، مضارع، اور قریب سے مخصوص ہے۔ خود مولف غیاث نے اسی رسالے کی ابتدا میں زحافات کے بیان میں لکھا ہے۔ "اشتر و خرب ہر دو در بحر مضارع و ہزج افتد۔" جو وزن صاحب غیاث نے بحر منسرح کے ذیل میں لکھا ہے وہ در اصل مضارع مثمن اخرب کا وزن ہے۔ آگے چل کر صاحب غیاث نے ایک اور غلطی کی ہے۔ بحر مضارع کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

"بحر مضارع مثمن اخرب محذوف ؎

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی   بازار خویش و آتش ما تیز می کنی

مفعول فاعلات مفعول فاعلات۔"

حالانکہ اس شعر کا وزن "مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن" ہے۔ اور یہ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ صاحب غیاث نے زحاف خرب کے تحت لکھا ہے کہ "اشتر و خرب ہر دو در بحر مضارع و ہزج افتد"۔۔۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زحاف خرب صرف بحر مضارع اور بحر ہزج سے مخصوص ہے۔ حالانکہ یہ زحاف بحر قریب میں بھی آتا ہے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کسی تفصیل کے بجائے میں ذیل میں وہ اشعار پیش کرتا ہوں جو بحر قریب کے مختلف اوزان کے تحت کتابوں میں درج کیے گئے ہیں۔ ان سب میں زحاف خرب موجود ہے۔

اے روئے تو فرحت شادمانی   وصل تو بہ از فصل نوجوانی

با مردم ناسازگار طبع   بے چارہ شود مرد سازگار

کیوں کرتا ہے مجھ کو تو یار رسوا   پھر تجھ کو ملے گا نہ مجھ سا شیدا

اس شوخ سے پیدا ہو کیسے ربط   گستاخ ہیں ہم اور وہ بد مزاج

اے یار چلو باغ کی سیر کو   پر ساتھ نہ لے چلنا غیر کو

دکھ بھگتے اس عشق کی بدولت   مدت تک پائی نہ ہم نے راحت

صاحب حدائق البلاغت نے "الحدیقۃ الثالثہ فی علم العروض" میں ظہوری کے ایک شعر کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا مصرعہ اول ساقط الوزن ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"وبعضے از قدما ساکن دوم را کہ در وسط مصرع بیاید اگرچہ غیر حرف مد باشد نیز ساقط می نمایند۔ چنانچہ در کلام فردوسی

٭ اس بحر میں موجودہ دور کے دوسرے شعرا کے یہاں بھی غزلیں ملتی ہیں مثلاً ایک غزل کا ایک شعر ہے ؎

تھی رہ حیات میں زندگی خفا خفا   اک ترے خیال نے سارا غم بھلا دیا

وشیخ عطار قدس سرہ یافتہ می شود۔ اما متاخرین ایں را
نمی پسندند۔ ومولانا ظہوری در ساقی نامہ بیتے ازیں باب
آوردہ ومورد طعن شدہ۔ بیت مذکور ایں ست۔

بہ دستم دہ آں رشک یاقوت را   کہ سازم علاج عقل فرتوت را

جیم علاج را بہ ضرورت قطع باید کرد تا بیت موزوں شود۔"

مصنف کا یہ کہنا درست ہے کہ قدما قواعد زبان و عروض کا کچھ زیادہ لحاظ
نہیں رکھتے تھے۔ اور یہ کچھ فارسی سے مخصوص نہیں۔ ہر زبان کے دور اول
میں یہی ہوتا ہے۔ اردو میں بھی میر کے معاصرین یا ان سے قبل کے شعرا کے
دواوین اس پر گواہ ہیں۔ لیکن متوسطین یا متاخرین کے یہاں یہ عیوب نہیں
ہوتے ہیں۔ ظہوری کا شمار متقدمین میں نہیں ہے۔ اس کے یہاں وہ عیوب
یقیناً نہیں ہونا چاہیئے جو متقدمین سے مخصوص تھے۔ صاحب حدائق البلاغت
نے جس شعر کا حوالہ دیا ہے (کہ اس میں علاج کا ع ساقط ہو جاتا ہے)
یہ ساقی نامہ کا شعر ہے۔ لیکن اس میں مصرعۂ ثانی وہ نہیں ہے جو مصنف نے
درج کیا ہے۔ وہاں اس کی صورت یہ ہے۔

بہ دستم دہ آں رشک یاقوت را   کہ سازد جواں عقل فرتوت را

اور اس صورت میں کسی اعتراض کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری
ہے۔ حدائق البلاغت کی مندرجہ بالا عبارت پر (جس میں مصنف نے حسب
ظہوری کے شعر میں علاج کے ع کو ساقط بتایا ہے) مولوی عبدالاحد صاحب
شمشاد نے حاشیے میں لکھا ہے کہ اگر ساکن اول صرف مد ہو اور اسکے
بعد نون یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا حرف ہو تو اس کو قدما کبھی کبھی
ساقط کر دیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مطلب ایں کہ ساکن دوم اگرچہ غیر نون باشد ہم کہ بعد
واقع شود ساقط می نمایند۔ چنانچہ فخر الزماں بدر چاچی
پائے لفظ شتاب را در بیت قصیدہ "چیستاں قلم"
از تقطیع دور کردہ بیت مذکور ایں ہست۔

آں شاہد عروس نقاب آورد بدر چیں دو تاب
در سر در آمد از شتاب دریائے شاہ مخزن معجز نش
از تکرار رجز مثمن است وزنش مستفعلن هشت بار"

شمشاد صاحب کی رائے میں بدر چاچی کے مندرجہ بالا شعر میں لفظ شتاب
کی ب ساقط ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ بدر چاچی کے اس مصرعہ کا
وزن "مستفعلن مستفعلان مستفعلن مستفعلن" ہے۔ گویا اس کا
ایک رکن حشو مذال ہے۔ علم عروض کے ضابطے کے لحاظ سے بحر رجز میں
زحاف اذالہ آسکتا ہے اور اس تصرف سے مستفعلن مستفعلان بن
جائے گا۔ اذالہ کا استعمال بالعموم عروض و ضرب ہوتا ہے اور کبھی حشو میں
بھی۔ البتہ صدر و ابتدا میں ممنوع ہے۔ حشو میں اذالہ کم آتا ہے۔ لیکن ممنوع
نہیں ہے۔ آسکتا ہے۔ خود بدر چاچی نے متعدد جگہ حشو میں رکن مذال
استعمال کیا ہے۔ کتابوں کے حوالے یا مثالیہ اشعار پیش کرنے کے بجائے
میں بدر چاچی ہی کے یہاں سے اس کی کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اور وہ
بھی صرف ایک قصیدے میں سے۔ ملاحظہ ہو۔

زریں صدف تا در برہ نقرہ بہ عنبر ہم سرشت
واز ابر دریا در برست لولو بہ ہر جا ریختہ
آں شاہد بت لرزہ دار سرطانش چوں سازد نزار
آتش شود بہ خاک در تار از تف تمی ریختہ
درچاہ زہرہ نہ آفتاب دلو زر آرد ماہ تاب
تا گردد آب التہاب از روشے گرما ریختہ
بگرفتمش در بر چو چنگ من در نوازش او بہ جنگ
صد عنبر زنجیر رنگ از مشک دیبا ریختہ
خالت بہ چشم آں کافرست کز جور او مردم نہ رست
یک زنگی آتش پرست آب وو لالہ ریختہ

اگر شمشاد صاحب کا قول صحیح مان لیا جائے تو یہ سارے اشعار جن کے
حشو میں رکن مذال آیا ہے ساقط الوزن قرار پائیں گے۔ اور یہی نہیں
بہت سے اساتذہ عجم و ہند کو ناآشنائے فن ماننا پڑے گا اور اس کا
مہمل ہونا عیاں ہے۔

اس غلط فہمی میں اردو کے بعض ارباب نظر بھی مبتلا ہیں کہ رجز میں
حشو مذال نہیں آسکتا۔ مثلاً "انتقادیات" جلد اول میں نیاز صاحب نے
فراق کے ایک شعر پر ایسا ہی اعتراض کیا ہے۔ فراق کا
شعر تھا ے

پھر بھی سکونِ عشق پہ آنکھ بھر آئی بارہا
گو غمِ عشق بھی فراقؔ کچھ غمِ جاوداں نہ تھا

نیازؔ صاحب لکھتے ہیں:۔

"دوسرے مصرع میں فراق کا ق تقطیع سے گرتا ہے[1]
لیکن شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔" انتہا (اوپا؟)

اس اعتراض کی بھی وہی حیثیت ہے جو شمشادؔ صاحب کے اعتراض کی ہے فراقؔ کا مندرجہ بالا شعر "رجز مثمن مطوی مجنون" میں ہے۔ جس کے ارکان "مفتعلن۔ مفاعلن مفتعلن۔ مفاعلن" ہیں۔ اگر اس کے حشو کے ایک رکن کو مذال قرار دیا جائے تو وزن کی یہ صورت ہوگی "مفتعلن مفاعلان مفتعلن۔ مفاعلان" اور اس صورت میں فراقؔ کا (ق) شاملِ وزن رہے گا۔ میں توضیح مزید کے لئے ذیل میں چند امثلہ پیش کرتا ہوں۔ ان اشعار میں حشو کے دونوں ارکان یا ایک رکن مذال ہے۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی   سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
(غالبؔ)

تاکہ یہ گبر اور منبر و طاق پرست ہوں بتا   چھوڑ دیں شرک پر جا آتش و آب و خاک و با
(ذوقؔ)

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز   آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
(غالبؔ)

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی   جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
(غالبؔ)

داغؔ کے ایک شاگرد جناب محمود رام پوری کا مجموعہ کلام "جذباتِ محمود" کے نام سے جناب قمر رام پوری نے مرتب کیا ہے۔ اس دیوان کے صفحہ ۲۰ پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

تجھے دید ان کی نصیب ہے وہ نصیب قابلِ دید ہے
جو شبِ برات ہے رات اسے تو دن اسکے واسطے عید ہے

اس غزل میں مقطع نہیں ہے اور اس کی وجہ مرتب نے حاشیے پر یہ لکھی ہے۔

"چونکہ یہ غزل بحرِ کامل میں ہے اور اس بحر میں محمود تخلص نہیں آسکتا اس لئے مقطع نہیں ہے اور اس بحر کی کسی غزل میں مقطع نہیں ہے۔"

یہ قول مرتب کا ہے۔* محمود رام پوری، مرتب دیوان قمر رام پوری کے استاد اور قریب ترین عزیز تھے۔ اسی لئے خیال ہوتا ہے کہ استاد نے کسی موقع پر شاگرد سے یہ ذکر کیا ہوگا۔ کوئی بھی صورت ہو یہ خیال کہ بحرِ کامل میں محمود نظم نہیں ہو سکتا، درست نہیں۔

بحرِ کامل کا اصل وزن متفاعلن ۴ بار (ایک مصرع میں) ہے اس بحر میں ایک خاص زحاف اضمار آتا ہے۔ اضمار معروف زحاف ہے اور بحرِ کامل سے مخصوص ہے۔ اگر زحاف اضمار سے کام لیا جائے تو محمود یا اس کے ہم وزن دوسرے الفاظ بے تکلف آسکتے ہیں۔

سعدیؔ کہتے ہیں ؎

بلغ العلےٰ بکمالہٖ، کشف الدجےٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ، صلو علیہ و آلہٖ

اس میں "صلو علیہ و آلہٖ" بروزن مستفعلن متفاعلن ہے۔

بحرِ کامل میں متفاعلن کو جہاں چاہیں مستفعلن سے بدل سکتے ہیں مثلاً

نہ ہوئی کبھی مجھ سے خطا نہ ہوا کرو مجھ پہ خفا
نہ دیا کرو تم گالیاں نہ کیا کرو مجھ پہ جفا

اس شعر میں ایک رکن سالم اور ایک مضمر ہے علی الترتیب۔ شعر میں بعض رکن سالم اور بعض مضمر بلا ترتیب بھی لانا درست ہے مثلاً ؎

اس خوب رو کو دیکھ لے یہ مجال کیا ہے حور کی
کہ وہ سیم تن تو تمام خدا اللہ پر ہے ڈھلی نور کی

بہر حال بحرِ کامل میں محمود جیسے پانچ حرفی الفاظ بہ آسانی آسکتے ہیں۔

اسی مجموعے میں صفحہ ۲۶ پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

---

* جہاں تک ہمارے علم میں ہے یہ غزل صاحبزادہ واجد علی خاں اشکؔ رام پوری کی ہے اور اس کا مقطع بھی موجود ہے ؎

ہوا حشر میں مرا سامنا تو یہ بولے، واجدِ با وفا!   تو کرے ہمارا یہاں گلا تو یہ بات تجھ سے بعید ہے

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

کوئی فرق حسن میں کیا کرے ترے اور یوسفِ مصر کے   مگر اتنی بات ضرور ہے کہ یہ دید ہے وہ شنید ہے

پردہ کشائے رازِ عشق یہ دلِ بے قرار ہے
مظہرِ سوزشِ دروں دیدۂ اشکبار ہے

اس کے حاشیے پر یہ بھی لکھا ہے کہ "اس غزل میں تخلص نہیں آتا۔"

یہ بحرِ رجز مطوی مخبون ہے۔ اس کے ارکان مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ہیں (مصرع اول کا ایک رکن مذال ہے) عروض کے مسلمہ قاعدے کے لحاظ سے مفتعلن کو تسکین اوسط کے واسطے سے مفعولن سے تبدیل کر سکتے ہیں۔ ناسخ کا شعر ہے ؎

ناسخ قول ہے بجا حضرتِ میر درد کا
حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبالِ گوش ہے

پہلے مصرع کا رکن اول مفتعلن کے بجائے مفعولن ہے۔ اس طرح مصرع اول کا وزن "مفعولن مفاعلن مفتعلن مفاعلن" ہوگا۔ اور اس صورت میں محمود یا س کا ہم وزن کوئی بھی لفظ آسانی کے ساتھ نظم کیا جا سکتا ہے۔ میں صرف بہ طور مثال اسی وزن پر ایک مصرع ذیل میں لکھتا ہوں ؎

محمود اس مثال سے آپ کا مدعا ہو کیا

یہ وہی وزن ہے جس میں محمود صاحب کی غزل ہے صرف رکن اول مفتعلن کے بجائے مفعولن ہے۔

بحرِ رجز کے بیان میں مصنف حدائق البلاغت لکھتے ہیں۔

"بحرِ رجز۔ و دریں بحر را فصحائے عجم اکثر مثمن سالم استعمال کردہ اند بہ خلاف شعرائے عرب کہ مثمن کم تر آوردہ اند
مسدس و مربع و مثلث و مثنیٰ بیش تر۔ و شعرائے عجم مسدس
ایں را ہم نیاوردہ اند۔" (ص ۱۱۱)

مصنف کا یہ لکھنا کہ بحرِ رجز کو شعرائے فارس نے مسدس استعمال نہیں کیا ہے صحیح نہیں۔ اساتذۂ فارس کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ یا تو اس عبارت میں دراز دستیِ کاتب کارفرما ہے۔ یا پھر مصنف مرحوم سے ہی مسامحت ہوئی ہو۔ اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بحرِ رجز ہی کے بیان میں مصنف نے رجز مسدس کے مندرجۂ ذیل دو اوزان درج کتاب کئے ہیں

(۱) رجز مسدس سالم ؎

اے از رخت ماہِ فلک گشتہ خجل
پیشِ قدت سروِ سہی پاشے بگل

(۲) رجز مسدس مطوی ؎

در برم آں ماہ نیاید نفسے
شکوہ ازاں ماہ مرا بست بسے

یہ اس قول یا غلطی کا سب سے دلچسپ پہلو ہے۔

علم عروض کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ حرف ساکن کو تقطیع میں متحرک کر سکتے ہیں[28]۔ لیکن اس سے نفسِ حرکت کے لحاظ سے اس لفظ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً لفظ آرد کی رَا ساکن ہے۔ تقطیع میں اس کی رَا متحرک ہو جائے گی۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آرد کی رَا ساکن نہیں متحرک ہے۔ مولف نور اللغات نے لفظ آرد میں ایسا ہی دھوکا کھایا ہے۔ منیر کا شعر ہے۔

اگرچہ گندمی رنگوں کو پیا اس جزیرے نے
نہ پائی ایک دن بھی آردِ گندم کی ارزانی

یہ شعر بحرِ ہزج مثمن سالم میں ہے۔ تقطیع میں آرد کی رَا متحرک ہو جاتی ہے[29]۔ (ردے گندم۔ بر وزن مفاعیلن) اس سے وہ سمجھے کہ یہ لفظ صحیح بہ فتح را ہے اور بہ سکون را غلط سے لوگ صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر انھوں نے نور اللغات میں لکھا ہے۔ "آرد بہ سکون دوم غلط اور بہ فتح دوم صحیح اور فتحہ کی سند میں منیر کا مندرجہ بالا شعر پیش کیا ہے۔ اور اس قول کا غلط ہونا عیاں ہے۔ فارسی رَا بالاتفاق ساکن ہے۔ منیر نے بھی بہ رائے ساکن ہی استعمال کیا ہے۔ رَا کا فتحہ محض کرشمۂ تقطیع ہے اور بس۔

اس غلط فہمی کا ایک پہلو دلچسپ تر ہے۔ مولف نور اللغات نے منیر کے مذکورہ بالا شعر سے آرد بہ فتحِ را کی سند حاصل کر کے آرد بہ سکونِ را کو غلط قرار دیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنی کتاب "تحقیقات" میں منیر پر اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے آرد بہ فتحِ را غلط استعمال کیا ہے۔ حالانکہ دونوں حضرات نے علم عروض کے اس معمولی سے قاعدے سے بے نیاز ہو کر دادِ سخن دی ہے۔ اور منیر مرحوم پر خواہ مخواہ ایک الزام لگایا ہے۔

---

[28] ہر حرف ساکن کو متحرک نہیں کر سکتے بلکہ جب کسی لفظ کے آخر دو حروف ساکن ہوں تو ساکنِ آخر کو متحرک مان لیتے ہیں۔ دراصل عروضیوں کی اصطلاح میں حرف ساکن اس حرف کو کہتے ہیں جس کا حرف ماقبل متحرک ہو۔"

[29] تقطیع میں رُکن کے لحاظ سے شعر کے جو ٹکڑے کئے جاتے ہیں ان میں ہر ٹکڑے کا حرف اول متحرک ہو جاتا ہے خواہ وہ اپنی اصلی شکل میں ساکن ہی کیوں نہ رہا ہو مثلاً نہ پائی اے۔ (مفاعیلن) ک دن بی آ۔ (مفاعیلن) ردے گندم۔ (مفاعیلن) کر ارزانی (مفاعیلن)

آپ شیرانی کی مشہور مثنوی "سحرِ حلال" صنعت دو بحرین میں ہے۔ یعنی اس مثنوی کا ہر شعر دو اوزان میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مثلاً

اے شدہ در خانۂ جاں منزلت خانہ جاں یافتہ زاں منزلت

اس کا ایک وزن "فاعلاتن فاعلاتن فاعلن" ہے (بحرِ رمل مسدس محذوف) دوسرا وزن ہے "مفتعلن مفتعلن فاعلن" (بحرِ سریع، مسدس، مطوی، مکسوف) اس مثنوی کے سب اشعار ان دونوں اوزان میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کا مندرجہ ذیل شعر جو "در موعظت" کی فصل میں ص۲۵ پر درج ہے۔

ہر کہ شد در طاعتِ حق پیشتر فیض دے از رحمتِ حق بیشتر

اس تعریف میں شامل نہیں ہے۔ اس کا مصرع اول صرف بحرِ رمل میں آتا ہے۔ بحرِ سریع میں نہیں۔ البتہ دوسرا مصرع دونوں اوزان پر مشتمل ہے۔ اگر یہ غلط الکاتب نہیں ہے تو بڑی فروگذاشت ہے۔

غالب نے ایک خط میں (جو چودھری عبدالغفور سرور کے نام ہے اور عودِ ہندی میں شامل ہے) رباعی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"رباعی کے باب میں بیان مختصر یہ ہے کہ اس کا ایک وزن معین ہے۔ عرب میں دستور نہ تھا سوائے عجم کے، یہ بحر ہزج میں سے نکالا ہے "مفعول مفاعلن فعولن" (ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور) اس وزن پر فعلن اور بڑھا دیا ہے۔ مفعول مفاعلن فعولن فعلن۔ زحافات اس میں بعض کے نزدیک اٹھارہ اور بعض کے نزدیک چوبیس ہیں۔ اور وہ سب جائز اور روا ہیں اور اس بحر کا نام رباعی ہے۔ رباعی پیچ ہے کہ سوائے اس بحر کے اور بحر میں کہی نہیں جاتی۔"

مرزا کا یہ قول عجیب تر ہے۔ رباعی کے وہ دس ارکان جن کی باہمی ترکیب سے رباعی کے چوبیس اوزان بنتے ہیں۔ یہ ہیں۔ مفاعیلن۔ مفعولن۔ مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعیل۔ فعول۔ فعل۔ فع۔ فاعلن۔ فاع۔ انھیں ارکان کی ترتیب سے رباعی کے متعینہ اوزان حاصل ہوتے ہیں۔ بعض شعرا نے ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف پر فعلن (بہ کسرِ عین)

اور فعْلن (بہ سکونِ عین) بڑھا کر مندرجہ ذیل تین اوزان نکالے ہیں۔

[مفعول مفاعلن فعولن فعْلن (عین ساکن)

[مفعول مفاعلن فعولن فعِلن (عین متحرک)

[مفعول مفاعلن فعولن فعلات

اسی طرح ہزج اخرم اشتر محذوف سے بھی تین اوزان کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ علمائے عروض نے لکھا ہے۔ یہ اوزان رباعی کے چوبیس مقررہ اوزان سے متباین نہیں ہیں۔ صرف متباین ارکان سے ہے مثلاً مرزا غالب نے جس وزن کا ذکر کیا ہے۔ (مفعول مفاعلن فعولن فعلن) اس میں اگر فعلن کے عین کو متحرک مانا جائے تو یہ رباعی کا ایک متعینہ وزن "مفعول مفاعلن مفاعیل فعل" ہے۔ غلطی سے مفاعیل کے آخر سے لام کم کر کے فعولن بنا لیا ہے۔ اور اس لام کو فعل سے ملا کر فعِلن (بہ کسرِ عین) کر لیا ہے۔

اسی طرح مفعول مفاعلن فعولن فعْلن (بہ سکونِ عین) اصل میں رباعی کا ایک دوسرا وزن (مفعول مفاعلن مفاعیلن فع) ہے۔ مفاعیلن کے آخر سے ایک سببِ خفیف کم کر کے مفاعیلن کو فعولن بنا لیا۔ اور اس سبب کو فع سے ملا کر فعْلن (بہ سکونِ عین) سے بدل لیا۔ یہی حال دوسرے اوزان کا ہے۔

بہر حال غالب نے جو رباعی کا وزن اپنے خط میں لکھا ہے (مفعول مفاعلن فعولن فعلن) وہ رباعی کا حقیقی وزن نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور مسامحت کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ غالب نے اپنے خط میں (جس کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے) "مفعول مفاعلن فعولن" کو ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور لکھا ہے۔ اور یہ درست نہیں۔ مفاعیلن مقصور ہو کر مفاعیل رہے گا۔ اس لیے ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور در اصل (مفعول مفاعلن مفاعیل) ہوگا۔ البتہ مفاعیلن محذوف ہو کر فعولن سے تبدیل ہو جائے گا۔ اس طرح (مفعول مفاعلن فعولن) کو ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف کہیں گے۔ نہ کہ ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور جیسا کہ غالب نے لکھا ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۴۳ پر)

اُردو شاعری میں ہندوستانی تہوار اور مذہبی پیشوا

سلام سندیلوی

تاریخ عالم کا ہر دَور اس امر کا شاہد ہے کہ جب دو قوموں میں رابطہ قائم ہوجاتا ہے تو دونوں ایک دوسرے کی تہذیب و معاشرت سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جب ہندو اور مسلمانوں میں رابطہ پیدا ہوا تو یہ دونوں بھی ایک دوسرے کی تہذیب اور رسم و رواج سے متاثر ہونے لگے۔ شروع شروع میں جب عرب ہندوستان آئے تو انھوں نے ریاضی، نجوم، فلسفہ وغیرہ پر سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور اس طرح ان علوم کے بارے میں ہندوستان سے بہت کچھ سیکھا۔ عربوں کے بعد جب افغانستان کی طرف سے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی تو فارسی زبان کا اثر ہندوستانی زبانوں پر پڑنے لگا۔ اس کا ثبوت پرتھوی راج کے درباری شاعر، چندر بردائی کی تصنیف راج راسو سے ملتا ہے جس میں عربی اور فارسی کے متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ یہ اتحاد باہمی اس حد تک بڑھا کہ ہندو، مسلمان فقیروں پر اعتقاد رکھنے لگے اور مسلمان ہندو جوگیوں کو اپنا گرو ماننے لگے۔ یہ اتحاد خلجی حکومت، تغلق حکومت، سید حکومت اور لودی حکومت میں اور مستحکم ہوگیا۔ چنانچہ اسی دور میں پاکپٹن کے فرید شکر گنج، دہلی کے نظام الدین اولیا اور دکن کے شیخ گیسو دراز وغیرہ فقراء نے اپنے علم باطن کا چراغ روشن کیا جس کے اُجالے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے راہ نجات تلاش کی۔ دوسری طرف بھگتی کی تحریک شروع ہوئی اور رامانج، رامانند، ولبھ چاریہ، چیتنیہ وغیرہ نے ذات پات کی تفریق کو باطل قرار دیا۔ ان لوگوں کی تحریک سے ہندو اور مسلمان یکساں متاثر ہوئے۔ یہ محبت مغلوں کے عہد میں بادۂ ناب بن گئی جس کے خمار نے من و تو کے فرق کو مٹا دیا۔ ہندوؤں نے فارسی کی مہارت حاصل کی اور مسلمانوں نے سنسکرت اور ہندی سے دلچسپی دکھانا شروع کی چنانچہ اس دور میں عبدالرحیم خانخاناں نے ہندی میں دوہے کہے۔ رس کھان نے کرشن جی کی تعریف کی۔ میرزا حسین علی نے بنگالی زبان میں کالی دیوی کی مدح کی۔ ملک محمد جائسی نے پدماوت لکھی۔ نیز مہابھارت وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔

آخر میں اس اتحاد باہمی کا نتیجہ اُردو کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو ایک ساتھ رہتے رہتے اور ایک دوسرے کی تہذیب، معاشرت اور رسم و رواج سے متاثر ہوتے ہوتے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے اس باہمی میل جول کا اثر اردو شاعری پر بھی پڑا۔ چنانچہ اُردو شاعری کا دامن ایسے اشعار سے مالا مال ہے جن میں ہندوستانی تہواروں، ہندوستانی رسم و رواج اور ہندوستان کے مذہبی پیشواؤں کا ذکر احترام و عقیدت سے کیا گیا ہے۔ ان اشعار کے کہنے والے ہندو ہی نہیں مسلمان بھی تھے مگر اس مضمون میں اُردو کے صرف مسلمان شعرا کا ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ مکمل نہیں کہا جا سکتا ہے ہاں اس سے اردو شاعری کے ایک پہلو پر تھوڑی بہت روشنی ضرور پڑتی ہے۔

اس سلسلہ میں ہم کو تین قسم کے شعرا نظر آتے ہیں پہلی قسم کے شعرا وہ ہیں جو عارفانہ اور متصوفانہ نظر رکھتے تھے اور اس طرح سے ان کی نگاہ میں کفر و دین کا امتیاز قطعی نہیں تھا۔ یہ شعرا زیادہ تر اردو کے ابتدائی دور میں پائے جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے شعرا وہ ہیں جو یا تو خود بادشاہ یا رئیس تھے یا کسی بادشاہ یا رئیس کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ بادشاہ یا رئیس کی رواداری کی وجہ سے خود اس کی شاعری میں نیز ان کے درباری شعرا کے کلام میں یہی ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ ایسے شعرا زیادہ تر دور متوسطین میں نظر آتے ہیں۔ تیسری قسم کے شعرا وہ ہیں جو دورِ جدید سے تعلق رکھتے ہیں مگر شعرا کی اس طرح کی تقسیم اور حد بندی سختی کے ساتھ نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ صوفی شعرا کا تعلق صرف ابتدائی دور سے نہیں ہے بلکہ وہ قریب قریب ہر دور میں نظر آتے ہیں۔ ہاں درباری شعرا کا تعلق دورِ متوسط سے بڑی حد تک ہے۔

زمرۂ اول کے شعرا میں سرفہرست امیر خسرو کا نام آتا ہے۔ انکی شاعری کا آغاز بلبن کے عہد میں ہوا جو غلام خاندان کا بادشاہ تھا۔ وہ خان شہید کے دربار سے زیادہ وابستہ رہے لیکن انھوں نے خلجی دورِ حکومت اور تغلق دورِ حکومت کو بھی دیکھا۔ امیر خسرو کو ہندوستان سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہندی بھاشا کے بھی پریمی تھے۔ انھیں ہندو مذہب سے بھی بڑی عقیدت تھی اور کبھی کبھی خواجہ نظام الدین اولیا کے ساتھ لب دریا ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا منظر دیکھتے تھے۔ ان کو ہندوستانی تیوہاروں سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے "بسنت" پر دو نظمیں کہی ہیں جو تصوف میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان نظموں کا روئے سخن خواجہ نظام الدین اولیا کی طرف ہے مگر ان کی تخئیل کی عمارت ایک ہندو تیوہار پر قائم ہے۔ یہاں "بسنت" کی پہلی نظم کا پہلا بند درج کیا جاتا ہے جو جواہر خسروی سے ماخوذ ہے۔

حضرت کھاجا سنگ کھیلئے دھمال
بائیس کھاجا مل بن بن آیو رے
حضرت رسول صاحب جمال حضرت کھاجا ......
عرب یار تیرو بسنت بنایو
سدا رکھیے لال گلال حضرت کھاجا ......

اس زمرہ کے دوسرے شاعر نظیر اکبرآبادی ہیں۔ انھوں نے ہولی دیوالی۔ راکھی۔ گرو نانک۔ جنم کنھیا جی۔ بالپن بانسری بجیا۔ بانسری۔ ہو و لعب کنھیا۔ شادی کنھیا۔ رَس کتھا۔ ہر کی تعریف میں۔ بلدیو جی کا میلہ۔ درگا جی کے درشن تعریف بھیروں اور مہادیو جی کا بیاہ وغیرہ نغموں کی تخلیق کی۔ نظم "ہولی" کا پہلا بند ملاحظہ فرمائیے۔

آ جھمکی عیش و طرب کیا کیا، جب حسن دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خرسند کیا، ہر دل کو لبھایا ہولی نے
دف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

بسنت پر بھی نظیر نے ایک سے زیادہ نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک مشہور نظم کا آخری بند ہے۔

خوش بیٹھے ہیں سب شاہ و وزیر آج اہاہا	دل شاد ہیں امتی و فقیر آج اہاہا
بلبل کی چہکتی ہے صفیر آج اہاہا	کہتا ہی پھرتا ہے نظیر آج اہاہا

سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

کرشن جی کے بالپن پر انھوں نے جو نظم کہی ہے اس کا ایک بند ملاحظہ کیجئے ؎

یارو سنو یہ دودھ لٹیا کا بالپن	اور مدھ پوری نگر کے بسیا کا بالپن
موہن سروپ نرت کریا کا بالپن	بن بن کے گوال گؤ چریا کا بالپن

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کرشن کنھیا کا بالپن

ایسے صوفی شعرا اردو کے ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ اترپردیش کے متعدد صوفیائے کرام نے سری کرشن جی، ہولی اور بسنت وغیرہ پر گیت لکھے ہیں۔ ان میں شاہ بو تراب کاکوروی اور بیدم شاہ وارثی کے نام قابل ذکر ہیں۔ موجودہ صوفی شعرا میں حضرت انغر موہانی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ اُن کی دو نظمیں "بسنت اور کنھیا" ان کی عقیدت کی مظہر ہیں۔ نظم کنھیا کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

میں صدقے تھے ترے حق کے پیارے کنھیا   زمیں پر خدا کے اُتارے کنھیا
نہیں ایک گوکل پہ موقوف جلوے   ترے ہر کہیں ہیں نظارے کنھیا
عجب کیا مظالم کی تاریکیوں میں   زمانہ تجھے پھر پکارے کنھیا

دوسرے زمرہ میں وہ شعرا شامل ہیں جو یا تو خود بادشاہ، نواب یا رئیس تھے یا شاہی درباروں سے وابستہ تھے۔ ہندوستان کے اکثر مسلمان بادشاہ ہندوؤں کے میلوں اور تیوہاروں میں شرکت کرتے تھے، ہندوؤں کے عقیدوں اور ان کے رہنماؤں کو وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار اکثر شعر کی صورت میں کرتے تھے۔ چنانچہ قطب شاہی خاندان کے مشہور بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں یہ رنگ نمایاں طور پر موجود ہے اور ان کے کلیات میں سات غزلیں بسنت کے عنوان پر موجود ہیں پہلی غزل کے چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا   تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں تارا
نچ مل کند ا ب کے تاراں رنگ چھوٹا   بندی ہوں چھند بند سوں کر سنگارا
شفق رنگ جھینے میں تارے گلُ بوٹا   سرج کرنا ممن زر زر تارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شہ   رنگیلا ہور ہیا ترلوک سارا

محمد قلی قطب شاہ کے بعد ہم کو فائز دہلوی کی ایسی کئی نظمیں ملتی ہیں جن میں ہندوستانی تہواروں اور مذہبی پیشواؤں کا ذکر ہے۔ فائز دہلی کے ایک رئیس تھے جن کا اصل نام نواب صدرالدین خان بہادر تھا۔ انھوں نے ہولی کی تعریف میں بھی نظم کہی ہے اور ہند و مذہب سے بھی اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے "ہولی" کے دو اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ ؎

آج ہے روزِ بسنت اے دوستاں   سرو قد ہیں بوستاں کے درمیاں
سب کے تن میں ہے لباس کیسری   کرتے ہیں صد برگ سوں ہمسری

اس سلسلہ میں میر تقی میر کا بھی نام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک دور وہ تھا جب وہ نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے۔ نواب آصف الدولہ ہولی بہت اہتمام کے ساتھ مناتے میر تقی میر نے "مثنوی در بیان ہولی" میں نواب آصف الدولہ کے [illegible] کا منظر پیش کیا ہے۔ اس مثنوی کے چند اشعار بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر   رنگ صحبت سے عجب ہیں خورد و پیر
جشن نوروزی اہل ہند سب   ہے یہی تب مو عشرت ہیں گے اب
رنگ اخشانی سے پڑتی ہے پھار   رنگ باراں تھا مگر ابر بہار
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال   جس کے لگتا آ کر پھر منہ ہی لال

میر کے ساتھ انشا کا بھی ذکر ضروری ہے کیونکہ وہ بھی پہلے دلّی کے بادشاہ شاہ عالم سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ میں سعادت علی خاں کی ملازمت حاصل کر لی۔ انشا کی دو غزلیں "بسنت" کے عنوان سے ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ یہاں دو اشعار پہلی غزل کے پیش کئے جاتے ہیں۔

تو نے لگائی آ کے یہ کیا آگ اے بسنت
جس سے کہ دل کی آگ اٹھی جاگ اے بسنت

ہر شاخ زرد و سرخ و سیہ ہجر یار میں
ڈستے ہیں دل کو آن کے جوں ناگ اے بسنت

اسی زمرہ میں خاندان مغلیہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر بھی شامل ہیں جنھوں نے فقیری میں شہنشاہی کرنے کے بجائے شہنشاہی میں فقیری کی۔ ان کی زندگی ایک بے بسی اور مجبوری کی زندگی تھی لیکن ظفر بھی نہایت غیر متعصب بادشاہ تھے۔ چنانچہ وہ عید اور بقر عید کے ساتھ ساتھ ہولی اور دیوالی بھی مناتے تھے۔ ہولی پر اُن کی نظم بھی ہے نوابین اودھ کے آخری دور میں بھی لکھنؤ کے متعدد شاعروں نے ہندوستانی تیوہاروں پر نظمیں لکھی ہیں۔ بسنت پر امانت کے اشعار بہت مشہور ہیں ؎

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی   پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی
کیا فصل بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے   معشوق ہیں پھرتے سرِ بازار بسنتی
گیندا ہے کھلا باغ میں میدان میں سرسوں   صحرا وہ بسنتی ہے یہ گلزار بسنتی
منہ زرد دوپٹے کے نہ آنچل سے چھپاؤ   ہو جائے نہ رنگِ گل رخسار بسنتی
رت پھر گئی عالم میں چلی باد بہاری   میخواروں کو بھاتے ہیں میخوار بسنتی
کیا لطف حسینوں کی دو رنگی کا امانت   دو چار گلابی ہیں تو دو چار بسنتی

پہلی جنگ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد اردو شاعری میں یہ رنگ

اور زیادہ اُبھرنا شروع ہوا۔ اُردو شعرائے اردو شاعری کی عمارت کو ،
گیتا کے تقدس اور جلال کی رفعت سے آراستہ کیا اور اس میں انھوں نے
سری کرشن کی معرفت بانسری کے راگ چھیڑے، کبھی رام اور نانک کی محبت
کے گیت گائے، کبھی دیوالی کے چراغ جلائے اور کبھی ہولی کے رنگوں سے
بیل بوٹے بنائے۔ بہرحال اس دور میں ہم کو سب سے نمایاں چیز
اقبال کا ہندی ترانہ ملتا ہے جس کا پہلا شعر ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

یہ اتنی مشہور نظم ہے کہ اس کے اور اشعار لکھنے کی ضرورت نہیں
اقبال نے اس نظم کے علاوہ ہندوستان کے متعدد روحانی پیشواؤں
رامچندر جی، سوامی رام تیرتھ اور گرو نانک کی تعریف میں نظمیں کہیں۔
یہاں ان کی نظم "رام" کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اقبال کے علاوہ علامہ سیماب اکبرآبادی نے سری کرشن۔
گرو نانک۔ سداما، گوتم بدھ اور دیوالی وغیرہ پر نظمیں کہی ہیں سیماب
کو سری کرشن سے خاص طور سے بہت محبت ہے۔ انھوں نے "کرشن
گیتا" کے دیباچہ میں اس محبت کے پانچ اسباب لکھے ہیں ۔ وہ تحریر
فرماتے ہیں :-

"مجھے ہندو مذہب کے قدیم اوتاروں میں سری کرشن سے بڑی
عقیدت و محبت ہے۔ اس کا ایک سبب تو میرا شاعرانہ ذوق
ہے کہ مجھے سری کرشن کی زندگی یکسر رومانی اور مطلق محبت
نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں پریم اور پریت یعنی عشق و
محبت کے جتنے نغمے پھیلے ہیں ان کا سرچشمہ میں سری کرشن
کی مشہور بانسری ہی کو سمجھتا ہوں۔"

دوسرا سبب سری کرشن سے محبت کا انھوں نے یہ بتایا ہے کہ
"آگرہ (اکبرآباد) برج کی سرحد پر واقع ہے اور میں اکبرآبادی ہونے کی
حیثیت سے برج باشی ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا مگر اس کا ہمسایہ
ضرور ہوں۔ اس لئے مجھ پر سری کرشن کا روحانی اثر ایک فطری اور عمرانی
چیز ہے۔" سری کرشن سے محبت کا تیسرا سبب انھوں نے یہ بتایا ہے کہ
"میں سری کرشن کی زندگی میں ایشیا کے بعض دوسرے پیغمبروں سے
مماثلت پاتا ہوں۔ ان کے ابتدائی حالات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے
ملتے جلتے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور سری کرشن دونوں اپنے ابتدائی سوانح
حیات میں خصوصاً اتنے قریب ہیں کہ فرق و امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔"
اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

"چوتھا سبب میری عقیدت مندی کا یہ ہے کہ بھگوت گیتا کی تعلیم
ہر انسان کے لئے مجھے یکساں مفید اور قابلِ عمل نظر آتی ہے اور
میں اس کے اشلوکوں میں سرتاسر روحانیت پاتا ہوں۔" انھوں نے
پانچواں سبب کرشن جی سے الفت کا یہ بتایا ہے کہ "ایسی نظموں
کی ترویج سے میں ہندوستان میں متحدہ قومیت کے لئے رواداری
اور بے تعصبی کی بنیاد رکھ رہا ہوں۔"

یہاں پر سیماب اکبرآبادی کی نظم "گوتم بدھ" کے چند اشعار درج
کئے جاتے ہیں۔ گوتم بدھ سے مخاطب ہو کر وہ کہتے ہیں ؎

بند آنکھیں کرکے اس دنیا کے مکروہات سے
تو نے حاصل کی ضیائے دل تجلیات سے
برہمن زادوں کو ترے انفاس نے گرما دیا
تختِ شاہی کو ترے احساس نے ٹھکرا دیا
یاد تیری آج بھی ہندوستاں میں تازہ ہے
چین، جاپان اور تبت تک ترا آوازہ ہے
روشنی جس کی نہ ہوگی ماند وہ مشعل ہے تو
سرزمینِ ہند کا "عرفانِ اول" ہے تو

ہندوستان کے روحانی پیشواؤں کے ساتھ یہ عقیدت ہمیں مولانا
حسرت موہانی کے کلام میں بھی بہت ملتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی
ایک سیاسی لیڈر اور زبردست اردو شاعر ہونے کے علاوہ بڑے صوفی بھی

تھے اور انھیں سری کرشن جی سے خاص محبت و شیفتگی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے دیوان بہ نظم کے مقدمے میں لکھتے ہیں

"حضرت سری کرشن علیہ الرحمۃ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور اپنے پیروں کے پیر حضرت سید عبدالرزاق ہانسوی قدس اللہ سرہٗ کے مسلک عاشقی کا پیرو ہے۔"

اُن کے دو شعر ہیں ؎

کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرتِ کرشن
اقلیم عشق آپ کے زیر قدم ہے خاص

حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص

متھرا پر اُن کی جو نظم ہے اس کے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا — دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
وہ نورِ سیاہ تھا کہ حسرت — سرچشمہ فروغِ آگہی کا

ہولی پر بھی حسرت موہانی کی نظم ہے۔
باسط بسوانی نے بھی "ہولی" اور "کرشن و جسودا" نظمیں کہی ہیں جو ان کے مجموعۂ کلام "شاہد معنی" میں موجود ہیں۔ "کرشن و جسودا" نظم کا پہلا بند یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

آغوش میں جسودا کی ہے دیوکی کا لال
خوش رنگ، خوش نصیب، خوش انداز، خوش جمال
وہ یوں زبان شوق سے کرتی ہے عرض حال
واری ہزار جاں سے، سُن اے ماہ بے مثال
دُنیا یہ جانتی ہے کہ تو نند لال ہے
دراصل دیوکی کا مگر نونہال ہے

موجودہ شعرا میں ثاقب کانپوری، ساغر نظامی، نشور واحدی، نہال سیوہاروی، شمیم کرہانی اور نظیر لدھیانوی وغیرہ کے کلام میں بھی ہندوستانی تہواروں اور بزرگوں پر نظمیں پائی جاتی ہیں۔ ثاقب کانپوری نے "گنگا اشنان" پر نظم کہی ہے۔ نشور واحدی نے "بسنت" کا نغمہ گایا ہے۔ نہال سیوہاروی نے "سری کرشن" کے حضور میں عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں۔ شمیم کرہانی نے ہولی، دیوالی، بسنت نظمیں کہی ہیں۔ نظیر لدھیانوی نے "بسنت" اور "گنگا کا گیت" گایا ہے۔ مگر ساغر نے ان موضوعات پر سب سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو نے ان کے مجموعہ کلام "بادۂ مشرق" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "ساغر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کے لئے ہندوستانی زندگی۔ ہندوستانی تجربات اور ہندوستانی جذبات کے عام عنوانات کو منتخب کرتا ہے۔" ساغر کی نظمیں "رام"،
"سری کرشن" اور "گوتم بدھ"
اس لئے ان نظموں میں بے حد خلوص موجود ہے۔
کے چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

اے مرے پیارے وطن کے راہبِ عالی مقام
آج بھی کلمہ ترا پڑھتی ہے دنیا صبح و شام
تیرا اک اک لفظ ہے اک کلیہ اخلاق کا
کردیا تو نے مدوّن فلسفہ اخلاق کا
تیری تعلیمات پر ہندوستاں کو ناز ہے
ہند کو کیا ناز ہے، سارے جہاں کو ناز ہے

آل احمد سرور کے مجموعۂ کلام "ذوق جنوں" میں دیوالی پر ایک نظم موجود ہے۔ غلام ربانی تاباں نے بھی دیوالی پر نظم کہی ہے جو ان کے مجموعۂ کلام "سازِ لرزاں" میں شامل ہے۔ اگرچہ ان شعرا کا انداز فکر اور اسلوب بیان ان سے قبل کے شعرا سے جداگانہ ہے تاہم انھوں نے اپنی تخئیل کے لئے مواد ہندو تیوہاروں سے حاصل کیا ہے۔ ان شعرا نے دیوالی اور ہولی کو مرکز مان کر تخئیل کے وسیع دائرے کھینچے ہیں جن کے تحت انسان کے سماجی اور سیاسی مسائل کو چھو لیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں رمزیت اور اشاریت پائی جاتی ہے مگر اس کے پس پردہ ہندوستان کا روایتی اور مذہبی تصور ہے جس سے کوئی ہندوستانی شاعر گریز نہیں کرسکتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ہے اس مضمون میں ایسے موضوعات پر اُردو کے ہندو شعرا کے کلام کا نمونہ نہیں دیا گیا ہے۔ مسلمان شعرا کا بھی بہت سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو میں ایسے

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۲ پر)

غزل

شمیم کرہانی

نئی سحر کی تمنا نہیں تو کچھ بھی نہیں
تری حیات میں فردا نہیں تو کچھ بھی نہیں

نظر نواز و دل آرا سہی جمال ترا
کوئی جو محو تماشا نہیں تو کچھ بھی نہیں

نہ صبح وادیٔ رنگیں نہ شام چشمۂ گل
جنونِ بادیہ پیما نہیں تو کچھ بھی نہیں

فلک شکن سہی ذرات کی توانائی
غمِ زمیں کا مداوا نہیں تو کچھ بھی نہیں

نہ موجِ گل، نہ خرامِ صبا، نہ جوئے شفق
جو دل میں تیری تمنا نہیں تو کچھ بھی نہیں

حسین شیشہ و مینا، لطیف پیمانے
مگر خلوص کی صہبا نہیں تو کچھ بھی نہیں

عروسِ خلوتِ ساحل سہی تری کشتی
حریفِ شورشِ دریا نہیں تو کچھ بھی نہیں

سخن میں عالمِ معنی سہی شمیم مگر
حیاتِ نو کا تقاضا نہیں تو کچھ بھی نہیں

غزل

نریش کمار شاد

بدگماں مجھ سے نہ اے فصلِ بہاراں ہونا
میری عادت ہے خزاں میں بھی گل افشاں ہونا

میرے غم کو بھی دل آویز بنا دیتا ہے
تیری آنکھوں سے مرے غم کا نمایاں ہونا

کیوں نہ پیار آئے اسے اپنی پریشانی پر
سیکھ لے جو تری زلفوں سے پریشاں ہونا

یہ تو ممکن ہے کسی روز خدا بن جائے
غیر ممکن ہے مگر شیخ کا انساں ہونا

اپنی وحشت کی نمائش مجھے منظور نہ تھی
ورنہ دشوار نہ تھا چاکِ گریباں ہونا

کیوں گریزاں ہو مری جان پریشانی سے
دوسرا نام ہے جینے کا پریشاں ہونا

رہروِ شوق کو گمراہ بھی کر دیتا ہے
بعض اوقات کسی راہ کا آساں ہونا

جن کو ہمدرد سمجھتے ہو، ہنسیں گے تم پر
حالِ دل کہہ کے نہ اے شاد پشیماں ہونا

بعض اشعار کا غلط انتساب (۳)

حنیف نقوی سہسوانی

حسب بالا عنوان کے ماتحت "نیا دور" کی دو اشاعتوں میں کچھ مشہور اشعار پیش کئے گئے تھے جن کے کہنے والے دوسرے ہیں مگر وہ غلطی سے منسوب دوسروں سے ہوگئے ہیں۔ آج اس سلسلہ کی تیسری قسط پیش کی جا رہی ہے۔ ایڈیٹر

"جلوۂ خضر" مصنفۂ صفیر بلگرامی میں زیب النسا مخفی کے نام سے حسب ذیل تین اشعار نقل ہوئے ہیں۔

(۱) جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں یار سے جدا نہ کرے

(۲) آکر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے
خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

(۳) کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

زیب النسا مخفی بنت شہنشاہ اورنگ زیب فارسی زبان کی شاعر تھی لیکن چند تذکرہ نگاروں نے اسے خواہ مخواہ اردو شعرا کی صف میں لانے کے لئے مختلف شعرا کے یہ تین شعر اس سے منسوب کردئے ہیں جسے ان کی تساہل پسندی اور تحقیق سے بے اعتنائی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ تاہم اولاً قابل قبول سماعی یا تحریری روایات کی تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں خواہ ان کو کتنا ہی حقیقت اور واقعیت کا رنگ دے کر پیش کرنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ اسی چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے نواب نصیر حسن خیال کا یہ قول ملاحظہ فرمائیے۔

"زیب النسا مخفی تخلص کرتی اور فارسی میں اپنے جذبات ظاہر کرتی تھی گو اردو میں بھی اس نے جو کچھ کہا وہ اس زبان کا سرمایۂ ناز سمجھا جاتا ہے شہزادی کا زیادہ تر کلام تلف ہوگیا۔ ...... اس کا اردو کلام اب نایاب ہے مشہور فرنچ تذکرہ نویس ڈیسی تاسی خبر دیتے ہیں کہ زیب النسا کی اردو نظمیں میں نے دیکھی اور پڑھی ہیں۔ صاحب تذکرۂ جلوۂ خضر (سید فرزند احمد صاحب بلگرامی) فرماتے ہیں کہ ایک پرانی بیاض میں شہزادی کے اردو شعر ہماری نظر سے گزرے ہیں.....؟"

(مغل اور اردو صفحہ ۴۱)

محمود اکبرآبادی رقمطراز ہیں

"زیب النسا دختر عالمگیر کو عموماً فارسی کی شاعرہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس نے اردو میں بھی کہا ہے گارسن دتاسی اور جلوۂ خضر کے مصنف دونوں نے شہزادی کا اردو کلام دیکھا ہے جلوۂ خضر میں اس کے تین شعر درج ہیں:"

(صحیفۂ تاریخ اردو صفحہ ۱۰۸)

مولہ بالا بیانات اور حوالے محققانہ شان اور ناقدانہ بصیرت کے فقدان کی غمازی کرتے ہیں۔ زیب النسا کو اردو کی شاعرہ ثابت کرنے کی

بجز اس قدر صاف، شستہ اور ترقی یافتہ زبان میں کہے گئے اشعار کا ان سے انتساب ایک صریح غلطی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان شعروں میں پہلا شعر میر کلیم اللہ لسان کا ہے اور مرزا علی لطف نے "گلشن ہند" میں ان کے نام سے نقل کیا ہے۔ فتح علی گردیزی نے "تذکرۂ ریختہ" میں لسان کے متعلق لکھا ہے کہ "چندے برفاقت فقیر بسر برد" اور اس غزل کے چار شعر نقل کئے ہیں۔ مطلع کے علاوہ باقی تین اشعار یہ ہیں ؎

توجب تلک کرے انکار وعدہ مجھ سو سجن
غضب ہے عمر اگر تب تلک وفا نہ کرے
سجن جو تجھ سے ہوا آشنا سو جی سے گیا
خدا کسو کے تئیں تجھ سے آشنا نہ کرے
گناہ مرنے میں لساں کے چارہ گر کا نہیں
طبیب کیا کرے، تاثیر جب دوا نہ کرے

دوسرا شعر قاضی عبدالودود صاحب کی تحقیق کے مطابق عظیم دہلوی کا ہے۔ "مجموعہ نغز" (حکیم قدرت اللہ قاسم) میں اس زمین میں عظیم کے یہ دو شعر ملتے ہیں جن سے اس خیال کو تقویت پہونچتی ہے ؎

آباد رہیو پیر مغاں اب یہ میکدہ
ہم بھی لبوں کو یاں سے تاک بار کر چلے
خواہی پیالہ خواہ سبو کھینچیو کلال
ہم تجھ کو اپنی خاک پہ مختار کر چلے

جمیل احمد بریلوی مولف "تذکرۂ شاعرات اردو" نے "تذکرۂ خواتین" کے حوالے سے یہ شعر گنا بیگم شوخ زوجہ غازی الدین خاں بہادر نظام، وزیر عالم گیر کے حالات میں لکھتے ہوئے ایک لطیفہ نقل کیا ہے کہ ایک بار غازی الدین بارہ دری میں سو رہے تھے۔ بیگم وہاں پہونچیں تو ان کی آنکھ کھل گئی اور فوراً یہ مصرع موزوں کرکے پڑھا "ظالم آکر ہماری نعش پہ کیا یار کر چلے" بیگم نے فی البدیہہ جواب دیا "ظالم خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے"۔ لیکن یہ روایت بھی سابقہ روایات کی طرح قطعی بے بنیاد ہے۔ یہ شعر نہ زیب النساء کا ہے اور نہ شوخ اور غازی الدین خاں کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ

البتہ قاضی صاحب کی رائے یقیناً قابل قبول ہے۔ تیسرے شعر کے متعلق مجھے اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس کا نتیجۂ فکر ہے تاہم یہ یقین کامل ہے کہ زیب النساء کا کلام نہیں۔

رہیں جگر زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت بیباک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جان عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

"جلوۂ خضر" "صحیفۂ تاریخ اردو"، اور "مغل اور اردو" کے مصنفین نے ان دونوں اشعار کو ملکہ نورجہاں بیگم کی تخلیقات قرار دیا ہے۔ نواب نصیر حسین خاں خیال نے زیب النساء کی طرح نورجہاں کی اردو نوازی اور ریختہ گوئی کے متعلق بھی بڑی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

"نورجہاں جہانگیر کی حرم محترم تھی پہلے بھی اس نے محل شاہی میں پرورش پائی اور وہاں اردو سیکھی اور اب وہ حرم سرا کی ملکہ بنی ہوئی شاہی کر رہی تھی۔ اس زبان کا نوازنا اس کا فرض اور اسے سرفراز کرنا اس پر واجب تھا۔ اس میں وہ خموش کیونکر رہتی۔ مگر خدا کی قدرت ایرانی خوزادی ہندی رانیوں کو بھی مات کرے اور ان کی زبان میں بھی جو کچھ کہے وہ اردو دانوں کی دستار کا طرہ بنے . . ."

(مغل اور اردو صفحہ ۱۶)

مخمور اکبرآبادی کا قول ہے کہ
"جہانگیر کی چہیتی ملکہ نورجہاں فارسی کی سی قدرت کے ساتھ نئی زبان میں بھی شعر کہتی تھی۔" (صحیفۂ تاریخ اردو صفحہ ۲۲)

ان اقوال میں جن کو حقیقت اور اصلیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں، سراسر حسن عقیدت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ نورجہاں کو اردو شاعرہ تسلیم کرنا اور اس سے ایسے صاف، شستہ اور فصیح و بلیغ اشعار کہنے کی امید رکھنا قطعاً بعید از قیاس ہے۔ ہر اردو داں اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ آج سے ساڑھے تین سو سال قبل اردو زبان ارتقا کی اس منزل پر قطعی نہیں پہونچی تھی جہاں پہونچ کر یہ اشعار کہے گئے ہیں۔ یہ دونوں شعر فی الحقیقت مکین بدایونی

شاگرد مرزا رفیع سودا کے ہیں۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں اس غزل کے تین اشعار مبین کے ذکر میں نقل کئے ہیں جن میں زیر بحث دونوں اشعار بھی شامل ہیں۔

<u>نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں</u>
<u>جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں</u>

یہ مطلع اور اس غزل کے کئی دوسرے اشعار تحریر و تقریر میں عام طور پر بہادر شاہ ظفر کے نام سے نقل کئے جاتے ہیں اور ان کا زمانۂ تخلیق ظفر کا عہد جلا وطنی قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً عبد اللہ فاروقی ایڈیٹر خاتون مشرق اپنی تصنیف "بہادر شاہ ظفر کا افسانۂ غم" میں اس زمین کے تین شعر نقل کرنے سے قبل لکھتے ہیں کہ

"قلعہ معلیٰ کے اچھے دنوں کی شاعری کے سوا شاہ ظفر کے دور مصائب کا کلام جذبات و درد و الم کا آئینہ ہے اور براہ راست دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ دلی کی صاف سادہ اور ٹکسالی زبان میں طویل بحروں کے اندر روانی کے ساتھ حالِ دل بیان کر جانا صرف ظفر کا حصہ تھا۔ ذیل کے اشعار ان کی قید رنگون کی یادگار ہیں"۔

"بہادر شاہ ظفر" کے مصنف منشی امیر احمد علوی نے بھی یہی تینوں شعر اپنی کتاب میں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یہ شعر بھی قید رنگون کی یادگار ہیں اور جذبات کی صحیح ترجمانی ہے"۔

میں بھی اس غزل کو ظفر ہی کی تخلیق سمجھتا تھا لیکن ایک دن "شاعری میں اسلوب اور طرز ادا" کے موضوع پر گفتگو کے دوران میں جناب کوثر چاند پوری نے بتایا کہ یہ غزل ظفر کی نہیں مضطر خیرآبادی کی ہے۔ چنانچہ میں نے مزید اطمینان کی خاطر جان نثار اختر صاحب[1] سے اس سلسلے میں معلومات کی۔ موصوف نے کوثر صاحب کے قول کی تائید کرتے ہوئے لکھا کہ "یہ غزل مضطر کی ہے ظفر کی نہیں، ان کے نام سے غلط طور پر منسوب ہے"۔ علاوہ ازیں وہ اشعار بھی لکھ کر بھیج دئے جو انھیں زبانی یاد تھے۔ چونکہ مختلف کتابوں میں اس غزل کے اشعار میں جابجا لفظی اختلافات ہیں اس لئے میں ان کو صحیح اور اصلی صورت میں یہاں نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا بخت مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی شمع لا کے جلائے کیوں کہ میں بیکسی کا مزار ہوں
میں کہاں رہوں میں کہاں بسوں نہ یہ مجھ سے خوش نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں میں فلک کے دل کا غبار ہوں
نہ میں مضطر ان کا حبیب ہوں نہ میں مضطر ان کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

یہ غزل بلا خوف تردید مضطر خیرآبادی کی طبع زاد ہے لیکن سوز و گداز اور درد و اثر کی فراوانی کے پیش نظر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ ہندوستان کے بدنصیب آخری مغل تاجدار مرحوم بہادر شاہ کی آپ بیتی ہے ایسی صورت میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر شاعر کی طبیعت میں تفکر کا صحیح جوہر اور تخیل کا حقیقی عنصر موجود ہے تو وہ اپنے مفروضات غم میں بھی حقیقت اور واقعیت کا رنگ بھر سکتا ہے۔

میں نے شعر نمبر ۵ کے علاوہ باقی اشعار جان نثار صاحب کے مکتوب (موسومہ راقم الحروف) سے نقل کئے ہیں۔ پانچواں شعر "اردو کے چاند تارے" مولفہ امیر حسن نورانی سے لیا گیا ہے۔ نورانی صاحب نے تیسرے شعر کے علاوہ باقی پانچوں اشعار بہادر شاہ کے تذکرے میں نقل کئے ہیں۔ بمقطع کا مصرع اوّل ان کے یہاں اس طرح ہے "نہ ظفر کسی کا حبیب ہوں نہ ظفر کسی کا رقیب ہوں"۔ عبد اللہ فاروقی اور امیر احمد علوی کی مذکورہ تصانیف

---

[1] جان نثار اختر صاحب، مضطر خیرآبادی مرحوم کے فرزند ہیں۔ ایڈیٹر

میں اشعار نمبر ۲، ۳، ۴ ملتے ہیں۔

اٹھ گئے سے اٹھ گیا ساقی مزا بھی ہر جو پیمانہ
الٰہی کس طرح دیکھوں میں ان آنکھوں کو پہلے
بنائیں اٹھ گئیں اور غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو دیوانہ

اصغر حسین نظیر لدھیانوی نے "مختصر تاریخ ادب اردو" صفحہ ۹۰ پر سودا کے یہ شعر شرف الدین مضمون کے کلام کی حیثیت سے پیش کئے ہیں۔ سودا نے یہ اشعار غالباً مضمون کی وفات (۱۱۴۵ھ) پر ان کے کمال کے اعتراف اور اظہار عقیدت کی خاطر کہے تھے۔ غلط انتساب کے علاوہ نظیر صاحب نے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں ایک ہی قافیہ (پیمانہ) نقل کیا ہے جو قواعد فن اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے۔ کلیات سودا مرتبہ میر عبدالرحمن آہی شاگرد مومن مطبوعہ مطبع مصطفائی (۱۲۸۲ھ) میں اس شعر کا مصرع ثانی یہ ہے: "الٰہی اس طرح دیکھوں میں کن آنکھوں سے میخانہ"۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

یہ شعر بہت مشہور ہے اور میر انیس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن مجھے ایک عرصے سے تاریخی اعتبار سے اس انتساب کی صحت میں شبہ تھا کیونکہ میر انیس پر ان کے مرثیہ گو خاندان کی چوتھی پشت ختم ہوتی ہے نہ کہ پانچویں۔ چنانچہ اس سلسلے میں پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی سے استفسار کیا گیا۔ رضوی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ شعر میر انیس کا ہے لیکن اُس مرثیے میں، جو انھوں نے اپنے بیٹے میر عسکری رئیس کو لکھ کر دیا تھا لیکن بعد کو میر انیس کی تصنیف قرار پا گیا۔ یہ مصرع رئیس کی زبان سے ہے یعنی مرثیہ گوئی میں پانچویں پشت رئیس کی تھی نہ کہ انیس کی"

انیس کے بھتیجے میر وحید (خلف میر انس) کے مصرع "شعر شیر خدا ست پہ ہے یہ پانچویں صیقل" سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ انیس کا اپنے متعلق یہ کہنا کہ "پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں" تاریخ کی رو سے کسی طرح صحیح نہیں۔ لہٰذا یہ مانتے ہوئے بھی کہ یہ شعر میر انیس کی تخلیق ہے اس کو رئیس کی ملکیت قرار دیا جانا زیادہ مناسب ہے۔ اس کے برخلاف عشرت لکھنوی نے اپنے ایک تعارفی مضمون "میر نفیس لکھنوی" مطبوعہ ماہنامہ "ادیب" الٰہ آباد بابتہ جنوری ۱۹۱۳ء میں یہ شعر نفیس لکھنوی کے نام سے اپنے اس قول کی تائید میں پیش کیا ہے کہ "مرثیہ گوئی میں آپ کی پانچویں پشت تھی"۔ لیکن رضوی صاحب کا قول زیادہ قرین صحت ہے۔ موصوف اردو ادب اور خاص طور سے لکھنوی ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے کتب خانے میں بہت سی ادبی تخلیقات کے نادر اور معتبر ترین قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھادے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

یہ شعر سودا کا ہے مگر یوسف سلیم چشتی نے "شرح بال جبریل" صفحہ ۱۴۴ پر خواجہ میر درد کے نام سے منسوب کیا ہے

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

یہ شعر دنیائے اردو میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ "شرح بانگ درا" مصنفہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے صفحہ ۵۴ پر مرثیہ داغ کی تشریح کے سلسلے میں کلام داغ کی "جاذبیت، دلکشی، چستی بندش، قدرت زبان اور حسن الفاظ" وغیرہ کی مثال میں پیش کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں داغ کا نہیں انور دہلوی کا ہے۔ انور، ظہیر دہلوی (شاگرد ذوق) کے بھائی تھے یہاں ضمناً ظہیر کا یہ شعر بھی نقل کر دینا مناسب ہوگا ؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

شعر زبان زد خاص و عام ہے لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ ظہیر دہلوی کی تخلیق ہے:

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

محمود علی خاں جامعی نے "ضرب الامثال" میں یہ شعر رند سے منسوب کیا ہے جس سے نواب سید محمد خاں شاگرد آتش مراد ہیں لیکن شعر دراصل رند کا نہیں غالب کے ایک شاگرد رشکی جہانگیر آبادی کا ہے۔ اور تلامذۂ غالب

مصنفہ مالک رام میں ان کے انتخاب کلام میں شامل ہے۔

رخصت اے زندان جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

مصحفی نے "ریاض الفصحا" میں صفحہ ۳۱۹ پر ذوق کا یہ مطلع منیر خلف الرشید میاں نصیر سے منسوب کیا ہے لیکن چونکہ دیوان ذوق مرتبہ پروفیسر آزاد کے علاوہ دوسرے نسخوں میں بھی موجود ہے لہٰذا کسی انتساب یا آزاد کی بخشش بیجا کا شبہ باقی نہیں رہتا۔

چھیڑنے کا تو مزا تب ہے کہو اور سنو
بات میں ہم سے خفا ہو گئے لو اور سنو

نواب نصیر حسن خیال نے "مغل اور اردو" میں صفحہ ۱۰۹ پر یہ مطلع شاہ عالم بادشاہ آفتاب کے کلام کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ تذکرہ کریم الدین "وایف فیلن کے صفحہ ۱۸۱ پر بھی اسی انتساب کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن صفحہ ۲۰۵ پر اس کے برخلاف یہ شعر انشا کے نام سے ملتا ہے اور حقیقت میں انھیں کا طبعزاد بھی ہے۔

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

یہ شعر عام طور سے غالب سے منسوب کیا جاتا ہے اور ان کے کلام کے کسی انتخاب یا مجموعے (غالباً دیوان غالب مرتبہ نظامی بدایونی) میں بھی میری نظر سے گزرا ہے لیکن چونکہ دیوان غالب کے کسی مستند نسخے میں نہیں ملتا اس لیے یہ انتساب صحیح نہیں اگرچہ غالب نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے مگر یہ شعر ان کی تخلیق ہونے کی سعادت سے محروم ہے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

یہ مصرع ضرب المثل بن گیا ہے اور عموماً ذوق کی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ مشہور روایت ہے کہ انھوں نے وفات سے کچھ دیر پہلے یہ شعر کہا تھا

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غالباً اسی شعر کی بنا پر اس مصرع کے انتساب میں غلطی ہوتی ہے۔ دراصل یہ مصرع غالب کا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے ذوق نے اس پر تضمین کی ہے۔ غالب نے کہا ہے ؎

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مقطع میں "غالب" کے بجائے "اسد" کا استعمال اس وضاحت کے لیے کافی ہے کہ یہ غزل ذوق کے انتقال سے پہلے کہی جا چکی تھی کیونکہ مرزا ذوق کی زندگی ہی میں اسد سے غالب بن چکے تھے۔ اس توضیح سے قطع نظر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ مصرع کلام غالب سے ماخوذ یا مستعار نہیں بلکہ ذوق ہی کی تخلیق ہے اور دونوں اشعار کے آخری مصرعوں کی لفظ بہ لفظ مطابقت کو محض توارد ہی مانا جائے تب بھی یہ بات تسلیم کرنا پڑیگی کہ اس تخلیق میں شرف اولیت غالب ہی کو حاصل ہے لہٰذا یہ مصرع قاعدے میں ان ہی سے منسوب ہونا چاہیے۔

✡

اردو شاعری میں ہندوستانی تہوار

(بسلسلہ صفحہ ۱۵)

متفرق اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں جن میں بسنت، ہولی، دیوالی وغیرہ کا ذکر آیا ہے بلکہ "ہولی سنانا" وغیرہ اردو کے محاورے بن گئے ہیں۔ لیکن ایسے اشعار بھی نہیں دیئے گئے ہیں کیونکہ ان تمام اشعار کو لکھنا اور ہر اس شاعر کے کلام کو پیش کرنا جس نے ہندوستانی تہواروں وغیرہ پر اشعار کہے ہیں مضمون کو بہت طویل بنا دے گا۔ مختصر یہ کہ اردو کے ہندو مسلمان سبھی شاعروں نے اپنے اشعار میں ہندوستانی روایات، ہندوستانی تہوار اور ہندوستان کے روحانی بزرگوں کے ساتھ اپنی محبت، عقیدت اور خلوص کا اظہار کیا ہے اور اردو شاعری کا دامن، محبت اور عقیدت کے ان پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔

ڈرامہ

ہیرے کی کنی

کشور آرا بیگم

کردار

مظفر نواب	عمر تقریباً ۶۰ سال
گوہر آرا بیگم	مظفر نواب کی بیوی ۔ عمر پچاس سے متجاوز
اطہر	ایک بزنس مین
شیریں	مظفر نواب کی لڑکی

جوہری سیٹھ وغیرہ

مظفر نواب کے زنان خانے میں بیگم کا کمرہ جس میں مختصر سامان مگر ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی ۔ بیچ میں ایک چوکا جس پر میلی اور بوسیدہ چاندنی بچھی ہوئی ہے ۔ ایک طرف بیگم بیٹھی ہوئی ڈلی کاٹ رہی ہیں ۔ سامنے سے مظفر نواب آتے ہیں

مظفر نواب (زور سے) بیگم، ارے بیگم، اماں کہاں ہو ـــــ ؟

بیگم خدا خیر کرے آخر بات کیا ہے کچھ منھ سے تو کہو ـــــ !

مظفر نواب اوہ ۔ پھر وہی ۔ جب دیکھو ڈلی اور سروتہ ہمزاد کی طرح ساتھ ہے ۔ کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے تمہیں میرے خیال میں۔

بیگم اوئی ۔ گھر میں قدم کیا رکھا، سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا ایسی کیا آفت آ گئی ۔ بس یہ دو ٹکڑے نگوڑے باقی رہ گئے ہیں ۔ ابھی پانوں کے لئے حشر بلائے ہوئے تھے ۔ اب کہو تو سڑ ڈلی ڈال دوں ـــــ !

مظفر نواب (بات کاٹ کر) اچھا بابا معاف کرو میرے خیال میں۔ دیکھو طاہر کا خط آیا ہے ۔

بیگم کیا لکھا ہے ذرا میں بھی سنوں ۔

مظفر نواب اماں وہی پرانی کتھا ۔ کوشش کر رہا ہوں کہ شاید اگلے مہینہ تک کوئی نوکری مل جائے ۔ میرے خیال میں ۔

بیگم (ٹھنڈی سانس لے کر) ہاں ـــــ اس کو گئے یہ پانچواں چاند چڑھا ہے ۔ اس چودھویں صدی میں کوئی ایک وقت کے کھانے کا روادار نہیں، وہ بیچارہ بھلا کر کہاں تک دوستی کا حق پورا کرے گا ۔ بھئی اللہ میری مانو تو لکھ دو کہ بیٹا جم جم چلے آؤ ۔

مظفر نواب بس تم نے تو منھ سے نکال دیا ۔ میرے خیال میں ۔ اور کچھ نہیں پورا ہو گیا ۔ یہی تو لکھا ہے اس نے کہ کرایہ بھیج دو تو چلا آئے ۔

بیگم اے، تو کتنے کی ضرورت ہوگی ـــــ ؟

مظفر نواب میرے خیال میں تو تیس روپیوں سے کیا کم بھیجا جائے ۔

بیگم لئے گر کہاں سے ۔ میری سنو تو ارشد کو لکھ دو کہ وہ طاہر کو روپے بھیج دے ۔

مظفر نواب میرے خیال میں تو تم عورتوں کی عقل گدی میں ہوتی ہے ۔ ابھی تو اس نے پچیس روپے یہاں بھیجے ہیں ۔ پھر کہاں سے تمہارے لاڈلے کو بھیج دے ۔ میرے خیال میں کچھ تمہاری سمجھ میں آتا ہے کہ ڈیڑھ سو تو اس کی تنخواہ ہے ۔ پھر کلکتہ میں

بال بچوں میں نت رہتا۔ پھر بھی ہر مہینہ کچھ نہ کچھ تو بھیجتا رہتا ہے ایسا بھائی کہاں ملتا ہے آج کل — میرے خیال میں۔

بیگم — (جھنجھلا کر) اوئی تو پھر میں کیا کروں — نواب مجھ سے پان نہ مانگنا — یہی کل چار پان تھے وہ میں نے بنا دیئے، اب نہ ڈلی ہے نہ کتھا اور نہ پان — اور اس وقت کے لئے آٹا بھی نہیں ہے۔

مظفر نواب — ارے تو لالہ کے یہاں سے منگوا لو آٹا میرے خیال میں۔

بیگم — لالہ نے آج ٹکا سا جواب دیا ہے کہ جب تک پہلا حساب بیباق نہ ہوگا وہ ایک کوڑی کی چیز نہ دے گا —

مظفر نواب — (بڑی لمبی گہری سانس لے کر) ہوں —!—

(باہر سے آواز آتی ہے "نواب صاحب' مظفر نواب صاحب") — کون!— کون صاحب ہیں!! (کہتے ہوئے مظفر نواب باہر آتے ہیں)

مظفر نواب — اُخاہ' اطہر صاحب بھئی خوب آئے۔ تشریف رکھئے۔ اس کرسی کا پایہ مجھ سے اتفاقاً ٹوٹ گیا۔ بیٹھئے اطہر صاحب۔

اطہر — — میں بہت جلدی میں ہوں۔ (کرسی تڑسے ٹوٹتی ہے اور نواب بے اختیار ہنس دیتے ہیں)

مظفر نواب — معاف کیجئے گا — کہیں چوٹ تو نہیں آئی میرے خیال میں

اطہر — اجی معاف کیا کرنا ہے! پانچ سال ہو گئے اور آپ کے یہاں آٹھ سو روپیہ ابھی باقی ہے۔ بڑے دعووں سے لیا تھا کہ بھائی کی شادی ہے اور فوراً ہی ادا کر دیں گے — آپ کے ایسے دو چار آدمی اور مل جائیں تو اپنا کاروبار ہی بیٹھ جائے۔

مظفر نواب — (نرم عاجزانہ لہجے میں) خدا گواہ ہے اطہر صاحب کہ میرے —

اطہر — — (بات کاٹ کر) بزنس کے سلسلے میں آپ خدا کو نہ لایئے۔ اس کے یہاں تو ہر بات کے لئے حضرت ایوب جیسا صبر چاہیئے۔ ہونہہ۔ کان کھول کر سن لیجئے! اگر ایک ہفتے کے اندر اندر آپ نے روپیہ نہ ادا کیا تو میں مقدمہ دائر کر کے آپ کا یہ مکان قرق کرا لوں گا۔ سمجھے!

مظفر نواب — ارے سنئے تو اطہر صاحب میرے خیال میں —

اطہر — (تیزی سے) سن چکے — روپیہ کا انتظام کر رکھنا ورنہ اگلے ہفتے مکان قرق ہو جائے گا۔ روپیہ لینا جانتے ہیں دینا نہیں جانتے۔ ہونہہ بڑے نواب بنے ہیں۔ (اطہر چلا جاتا ہے) اور نواب گہری سوچ میں اندر مکان میں داخل ہوتے ہیں۔

بیگم — کیا بات ہے۔ کون تھا — ؟

مظفر نواب — (بڑی افسردہ اور یاس بھری آواز میں) اطہر — اگر اس کا روپیہ نہ دیا گیا تو اگلے ہفتے یہ مکان قرق ہو جائیگا۔ میرے خیال میں۔

بیگم — (بڑے اذیت دہ لہجہ میں) یا اللہ ایسی بے مروتی بھی ہوا اطہر خود مجھ سے آکر کپڑے پسند کرواتا تھا اور زبردستی اصرار کر کے تھان ڈیوڑھی پر ڈال جاتا تھا۔ یا اب یہ دن لگے ہیں۔

مظفر نواب — تم سمجھتی نہیں ہو بیگم میرے خیال میں۔ اس وقت ہم صرف نام کے نواب نہ تھے اور اطہر پھیری لگا کر کپڑے بیچنے والا تھا۔ اب وہ اطہر کلاتھ ہاؤس کا مالک ہے اور ہم — ہم — (آواز پھنس جاتی ہے)

بیگم — میں نے ہمیشہ تم سے کہا کریوں جو تم آنکھیں بند کر کے لٹاتے ہو اس کے لئے تو قاروں کا خزانہ بھی کم ہے۔ مگر مجھ نگوڑی کی کون سنتا ہے۔ موئی کنکوے بازی اور بٹیر بازی اور چیٹریوں کے لئے لاکھ کا گھر خاک کر دیا — لڑکے کو میرے مارے باندھے دو حرف پڑھوا دیئے اور بس۔

مظفر نواب — — تو میں کیا کرتا بیگم' میرے خیال میں تمہیں بتاؤ —

بیگم — اے میں نے ہزار بار سر پٹخا تھا — آگے کہ کوئی چھوٹی موٹی تجارت کر لو — پیسہ کا کیا ہے ہوا ہاتھ کا میل ہے۔ آج آیا کل گیا — بلا سے لوگ ہنسیں گے اپنی دو روٹیوں کا سہارا تو رہے گا —

مظفر نواب — (گھبرا کر) ارے بھئی معنی مافتی۔ اب اس وقت ان باتوں کا کیا ذکر ہے — دراصل میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی' پرورش پائی' میں نے اسی طرح سوچا سمجھا۔ (ٹھنڈی

سانس لے کر) کتنا اچھا زمانہ تھا کتنا تابناک ماحول تھا جیسے تراشا ہوا ہیرا قیمتی اور تابناک ۔

بیگم (طنزیہ انداز میں) ہاں سچ کہتے ہو لیکن یہ ہوا ہیرا سچا نہیں تھا ۔ امیٹیشن تھا ۔ ڈھول میں پول : چلو تم اسے سچا ہی مان لو تو آدمی کے لئے ہیرا ہوا ایسا قاتل زہر ہو کہ اللہ تیری پناہ ۔ اس سے ہم کو سوائے نقصان کے فائدہ کیا پہنچا ۔ جھوٹا غرور موئی نمائشی زندگی ملی ۔ محنت سے جان چرانا ۔ تعلیم کو لات مارنا اور کون سی اچھی بات ملی مجھے بتاؤ ، تمہارے ماحول سے ۔ سوائے زہر پھیلانے کے اور کون سے موتی رول دیئے تمہارے زمانے نے ــــ

مظفر نواب (سوچتے ہوئے) میرے خیال میں تو ـــــ

بیگم (بات کاٹ کر) کچھ نہیں میرے خیال میں ۔ مجھے اپنی بات پوری کرنے دو ۔ تمہارے جھوٹے غرور نے یہ گوارا نہ کیا کہ مظفر نواب صاحب ایک دوکان پر بیٹھیں ۔ تمہیں یہ نہیں گوارا ہوا کہ بیگم نواب قدر محلے کی بچیوں کو قرآن شریف پڑھا یا سلائی کر کے دو چار پیسے پیدا کرے ۔ گہنے پاتے بک گئے گھر کا سارا سازو سامان موئے سمیٹ لے گئے لیکن تم نے اجازت نہ دی ۔

مظفر نواب (بات کاٹ کر) بس اپنا وعظ بند کرو بیگم ، میرے خیال میں ــ ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے ۔ ذرا قریب سنو ۔

بیگم (کچھ گھبرا کر) کیوں ــ کیا بات ہے ــ تم تو مجھے ہولائے دیتے ہو ــ لو بیٹھ گئی ۔

مظفر نواب ذرا حساب تو کرو میرے خیال میں ــ بیگم کتنے روپئے قرض کے ادا کرنے ہیں ۔

بیگم (کچھ خوش ہو کر) کیوں کچھ انتظام ہو گیا کیا ـــ ؟

مظفر نواب ہاں یہی سمجھو میرے خیال میں ۔ ذرا جوڑو تو سہی ــ

بیگم لالہ کا آٹھ مہینہ کا حساب باقی ہے کوئی نو سو روپئے ۔ آٹھ سو روپئے الطر کا ۔ سترہ سو ۔ اور پندرہ ترکاری والے کے ہونگے ۔ دو مہینے سے گوشت والے کو پیسہ نہیں دیا ہے کوئی بیس اس کے ہوئے ۔ سترہ سو پینتیس اور تین مہینے سے نگوڑی مہترانی کی تنخواہ نہیں دی ہے چھ روپے اس کے آتے ہیں ستن ہی مہینے سے ضمیمن میری جان کو رو رہی ہے جو بیس روپیہ اس کا ہوا ۔ اور چار مہینے کا بجلی کا بل ہے ۔ ایک ہفتہ کے بعد بجلی کٹ جانے کا کاغذ بھی آ چکا ہے ۔ ساٹھ روپے کا بل ہے گنتے ہوئے اٹھارہ اور شنن کی ماں سے دس روپئے ہتھ پھیر لئے تھے ۔

مظفر نواب (چیخ کر) بس ــ بس کرو بیگم ۔ میرے خیال میں ــ

بیگم (حیرت سے) اے لو خود ہی حساب پوچھا اور خود ہی گرجنے لگے ۔ مجھ نگوڑی کی قسمت ہی ایسی ہے ۔

مظفر نواب (شرمندگی کے لہجے میں) نہیں بیگم میں خفا نہیں ہوتا میرے خیال میں ــ بس حساب کا اندازہ ہو گیا ۔ (لمبی ٹھنڈی سانس لیکر) بیگم اب تمہیں دو میں ایک سے ہاتھ دھونا پڑے گا ۔ یا تو مکان یا انگوٹھی ــ

بیگم (دلی کرب کے لہجے میں) وہ انگوٹھی ـــ ! نہیں ــ نہیں ۔ وہ انگوٹھی نہیں دوں گی ۔ وہ ایک خاندانی امانت ہے ۔ میری زندگی کے بہترین دنوں کی یادگار ہے ۔ میں نے ایک ایک چھلا ایک ایک پائی تمہیں بخوشی دے دی لیکن یہ انگوٹھی مجھ سے نہ چھینو ـــ

مظفر نواب (درد بھری آواز سے) ذرا میری بھی بات سنو بیگم ۔ میرے خیال میں یہ انگوٹھی مجھے بھی بہت پیاری ہے یہ ہماری خاندانی یادگار ہے ۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ ایک بار اس کی قیمت ایک جوہری نے دس ہزار تک لگائی ۔ اسکو بہت پسند آ گئی تھی لیکن والد مرحوم نے نہ دی ، حالانکہ اس کی مجموعی قیمت آٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی ۔ بیچ والا ہیرا پانچ ہزار کا اور گرد والے چھوٹے ہیرے کوئی تین ہزار کے ہوں گے ۔ والد مرحوم کی خاص وصیت تھی کہ یہ انگوٹھی کسی قیمت پر نہ نکالی جائے میرے خیال میں تو ۔

بیگم (بھرائی ہوئی آواز میں) اور تم اسے نکالنے پر آمادہ ہو ۔

مظفر نواب پھر کیا کروں بیگم ــ میرے خیال میں ــ مکان چلا
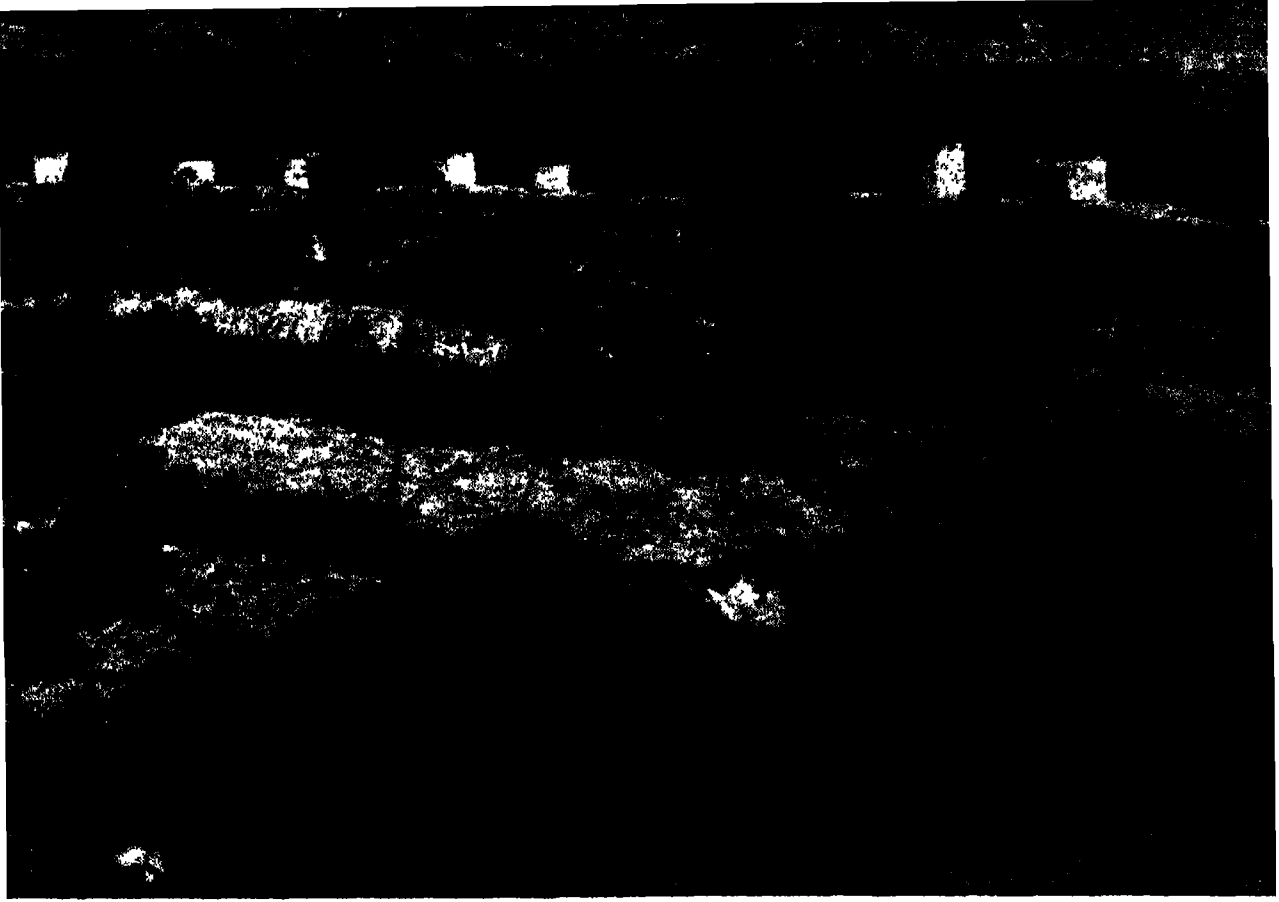
اتر پردیش کے چند پرفضا پہاڑی مقامات

اتر پردیش کے بعض پہاڑی مقامات ہندوستان گیر بلکہ عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مسوری، نینی تال، الموڑہ، رانی کھیت کا نام تو سبھی نے سنا ہوگا لیکن حقیقت یہ ہو کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں ان کے علاوہ ایسے متعدد روح پرور اور دلکش مقامات ہیں جو وہاں آنے والوں کے لئے تسکین روح و نظر کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ان صفحات پر چند ایسے ہی "جنت نگاہ" مناظر کی تصویریں پیش کی جا رہی ہیں۔

(اوپر) مینتل کھیت سے جو الموڑہ کے قریب ایک پرفضا تفریح گاہ ہے ہمالیہ کا نظارہ

ایک اور تفریح گاہ بھیم تال کی جھیل کا نظارہ

کوسانی کا ڈاک بنگلہ جہاں گاندھی جی نے ایک مرتبہ قیام فرمایا تھا
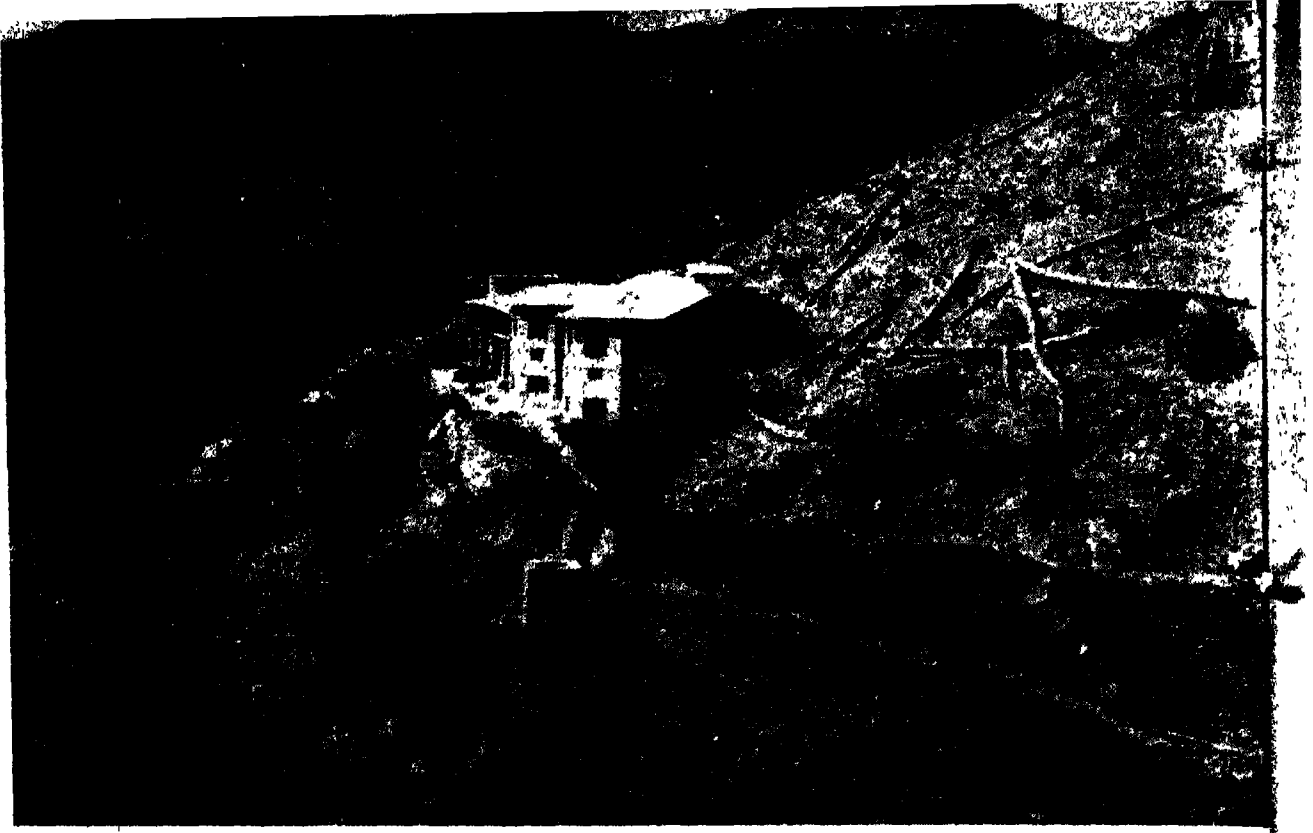
کوسانی میں مہاتما گاندھی کی یوروپین عقیدت مند مس سرلا بہن کی زیر نگرانی لڑکیوں کو تعلیم دینے والا ایک ادارہ قائم ہے۔ تصویر میں ادارہ کی عمارت اور اس کے گرد و پیش کا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔

ک
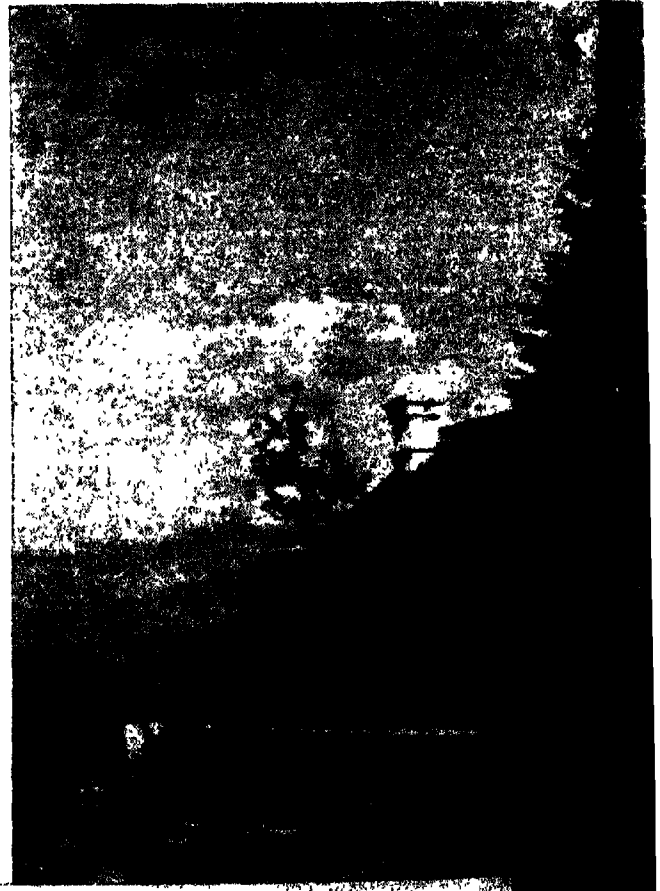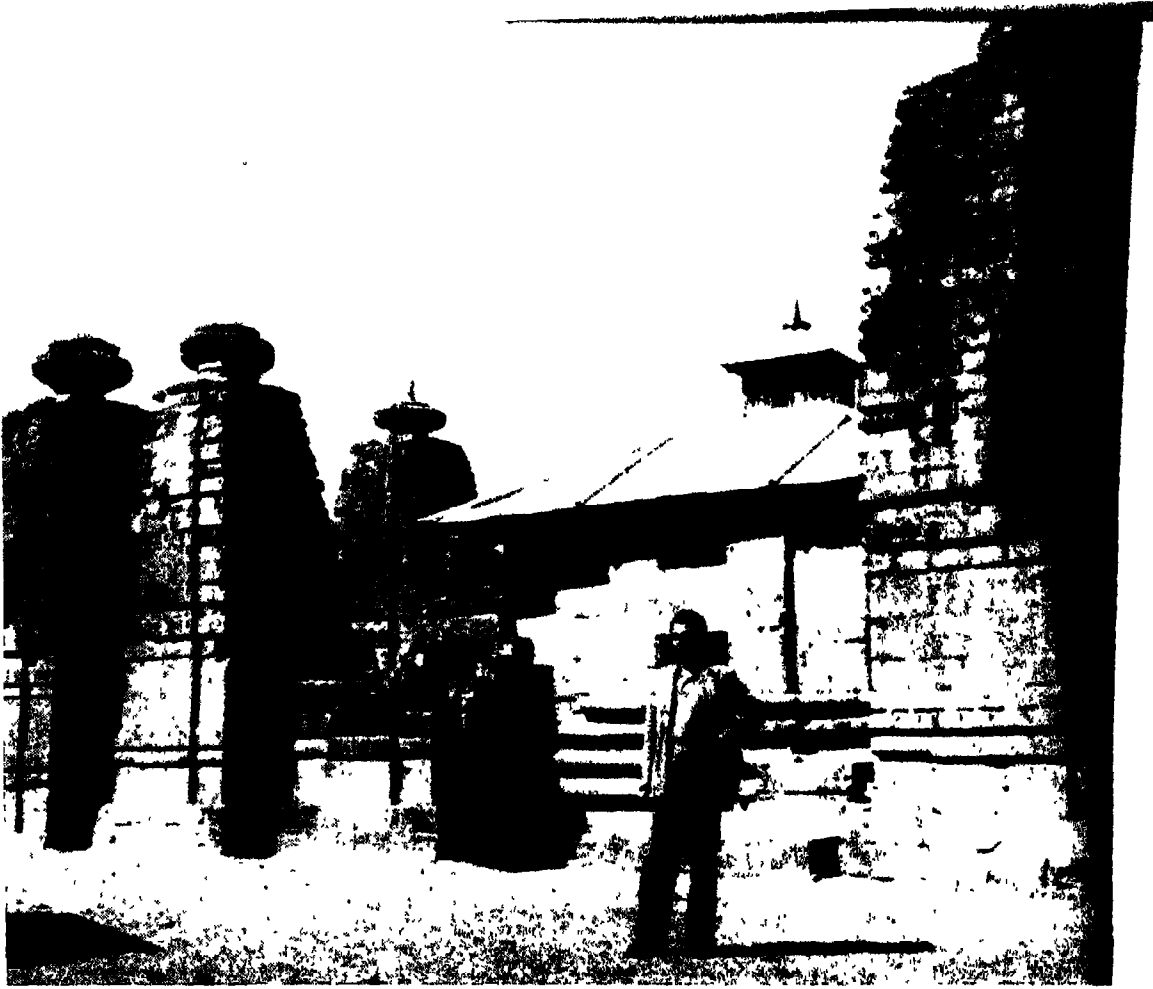
بیج ناتھ کے مندر

جائے گا تو رہنے کا ٹھکانا بھی تو نہیں رہے گا۔ اسی مکان میں میرے اباؤ اجداد نے، میں نے پہلی سانس لی ہے گھٹنیوں چلے ہیں۔ اس نے ہماری رخصت کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور آج ــــ (رک رک کر) ــ بیگم مکان چلا جائیگا تو کہاں سر چھپاؤ گی ــــ ؟

بیگم (سسکتے ہوئے) جو تمہاری خوشی ــ میں انگوٹھی لاتی ہوں۔

بیگم لو ــ (اور ساتھ ہی بیگم کے آنسو بھی چھلک پڑتے ہیں)

مظفر نواب روؤ نہیں بیگم میرے خیال میں ــــ لاؤ ــ میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں ــ مجھے معاف کر دو۔

بیگم (کچھ سنبھل کر) یہ بات نہیں ــ (گلوگیر آواز کے ساتھ) یہ انگوٹھی اس شب کی یادگار ہے جب تم نے مجھے اس گھر گرہستی کی ملکہ بنایا تھا اور یہ انگوٹھی یہی کہہ کر پہنائی تھی کہ یہ خاندانی امانت ہے اس کی حفاظت کرنا ــــ

مظفر نواب مجھے بھی یاد ہے بیگم میرے خیال میں۔ وہ مقدس رات بھی یاد ہے جب تم زندگی کے اس طویل سفر میں دوش بدوش چلنے کے لیے گھونگھٹ میں مسکرائی تھیں۔ وہ لطیف اور حسین تبسم بھی یاد ہے ۔

بیگم (کچھ جھینپ کر) اے لو بڑھاپے میں شاعری کرنے چلے ہیں ــ ہاں لے جاؤ بیچ آؤ۔ کم سے کم یہ موئے قرض کا بوجھ تو سر سے ہٹے گا ــــ

مظفر نواب ہاں اب تم حساب بولتی جاؤ میں لکھتا جاؤں ــــ دیکھو کتنا بچتا ہے ــــ ہوں ــ ہوں ۔ میرے خیال میں دو ہزار روپے تو ادا ہی کرنا ہیں ــ خیر یہ ادا کر کے بقیہ روپیوں سے تمہارے حکم کے مطابق میں کوئی چھوٹی موٹی تجارت شروع کر دوں گا ــ ہاں آج تو تم کوئی فرمائش کرو بیگم میرے خیال میں ــــ بہت دنوں کے بعد یہ موقع آیا ہے ــ بولو ــــ بولو نا ــــ تمہاری وہ پسندیدہ فرینچ خوشبو کی شیشی اور شیفان کا دوپٹہ ــ کیوں ــــ ؟

بیگم میرے لئے تو کچھ ضرورت نہیں تم اپنے لئے دو ایک قمیصوں کا کپڑا لے لینا ــــ

بیگم ہاں میں بھی بھولی جا رہی تھی۔ کتھا ڈلی سب ختم ہو گیا ہے ایک سیر ڈلی اور پاؤ بھر کتھا۔ ذرا اچھا دیکھ کر لینا۔ یہ موا لالہ تو دام ڈیوڑھے لیتا ہے اور چیز بد سے بدتر ــــ

مظفر نواب ہوں ــ اور کچھ میرے خیال میں ــــ بولو میں لکھتا جاتا ہوں ۔ لاؤ بیگم شیروانی دو ــــ

بیگم ہاں یہ لو ــ اپنے لئے ایک شیروانی کا کپڑا بھی لیتے آنا، یہ تو بالکل خستہ ہو چکی ہے اور اپنے دو پاجاموں کے لئے پانچ گز پھالیٹن لے لینا ۔ ذرا اچھی لینا ــــ

شیریں لیجئے ابا جان ــ یہ ناپ ہے میرے پیر کی ۔

مظفر نواب ہاں لاؤ ۔ اچھا بھئی لکھ لیا ۔ اب جا رہا ہوں ۔ ایک چار آنے پیسے تو دے دو کہ رکشا سے چلا جاؤں ۔ میرے خیال میں تو اب مجھ سے دو قدم بھی پیدل نہیں چلا جاتا ۔ ہانپنے لگتا ہوں ــــ

بیگم میرے پاس چار آنے کہاں سے آئے ۔ خیر دیکھو دیکھتی ہوں ۔ یہ لو ایک چونی مل گئی تمہاری قسمت سے ۔ ہاں ایک بات اور روپے احتیاط سے رکھنا جیب میں ۔ جیب پھٹی ہوئی ہے ۔ تھوڑے سے روپے اوپر رکھنا خریداری کے لئے یہ نہیں کہ سب کے سامنے نکال گڈی گننے لگے ۔

مظفر نواب ہاں بھئی ہاں ۔ میرے خیال میں ۔

بیگم اور ان موؤں الہٰی اور لالہ کا حساب ادھر ہی سے صاف کرتے آنا ۔ ذلیل، کمینے، دیکھو اسی دن کے لیے کہتی تھی قرض کیسی بری چیز ہے کہ اپنا روپیہ بھی دو اور ذلت بھی سہو ــ تقاضا لینے جاؤ تو موئے کیا کھیس نکال کر بات کرتے ہیں کہ گھن آتی ہے اور قرض دیتے ہیں تو سمجھتے ہیں بھیک دی ۔

مظفر نواب ارے بھئی دنیا کا یہی قاعدہ ہے ۔ خدا کسی شریف آدمی کو قرض کے چکر میں نہ ڈالے ۔ میں نے تو بابا اب کان پکڑے ۔ میرے خیال میں ۔

بیگم اچھا تو سدھارو ۔ سب کا قرض ادا کرتے آنا ۔

مظفر نواب: انشاءاللہ ۔ خدا حافظ ۔

بیگم: دہی مچھلی ۔ سونے کا ٹکا ۔۔ امام ضامن کی ضمانت میں دیا ۔ کہو قبول کیا ۔۔ ؟

مظفر نواب بازار پہنچ کر ایک جوہری کی دوکان میں داخل ہوتے ہیں ۔ اور جوہری پوچھتا ہے کہیں کیا چاہئیے نواب صاحب ؟

مظفر نواب: (ہکلا کر) یہ ۔۔ یہ ۔۔ انگوٹھی بیچنا ہے ۔۔

جوہری ۔ لائیے دیکھیں ۔۔ ہوں ۔۔ آپ کیا مانگتے ہیں اس انگوٹھی کا ۔۔ ؟

مظفر نواب: ۔۔ جی ۔۔ جی ۔۔ یہ تو آٹھ ہزار کی ہے لیکن میرے خیال میں ۔۔

جوہری ۔ (حیرت سے) ایں ۔ آٹھ ہزار ! نہیں صاحب اتنی قیمتی چیز ہم نہیں خرید سکتے ۔ آپ آگے دکھائیے ۔

مظفر نواب: (دوسری دوکان میں پہنچکر) سیٹھ جی ! یہ انگوٹھی دیکھئے ۔

سیٹھ: وہ جو بائیں طرف سیٹھ بیٹھے ہیں ان کو دکھائیے ۔۔

مظفر نواب: لیجئے سیٹھ جی (کچھ گھبرا کر) میں اس کو بیچنا چاہتا ہوں ۔ میرے خیال میں ۔

سیٹھ: ۔۔ ہوں ۔۔ تو کیا لیں گے آپ اس کا ۔ سونا تو اس میں مشکل سے بیس پچیس کا ہوگا ۔

مظفر نواب: اصل دام تو نگینے کے ہیں ۔ میرے خیال میں ۔۔

سیٹھ: ہاں تو نگینے کے کیا دام لگاتے ہیں آپ ۔۔ ؟

مظفر نواب: (کچھ جھینپتے ہوئے) ہے تو یہ آٹھ ہزار کا ویسے آپ ۔۔

سیٹھ: (ہنس کر) او ہو ۔۔ آپ تشریف لے جائیں ۔ آپ کی انگوٹھی ہم لوگ نہیں خرید سکتے ۔

مظفر نواب: (ہکلا کر) آخر کیا بات ہے سیٹھ جی ۔ میرے خیال میں ۔

سیٹھ: (تیزی سے) کچھ نہیں ۔ (دوسرے گاہک سے مخاطب ہو کر) ہاں مشرت صاحب وہ نیلم والی انگوٹھی پسند آئی آپکو ۔ !

مظفر نواب: (از خود) بس یہ آخری دوکان ہے دیکھوں تو قسمت کیا دکھاتی ہے ۔

مظفر نواب: سیٹھ جی یہ انگوٹھی دیکھئے ۔ میرے خیال میں ۔ ۔ ۔ ۔

سیٹھ: (نرمی سے) کیا بات ہے بیچنا چاہتے ہیں آپ اسے ؟

مظفر نواب: جی ہاں میرے خیال میں ۔ ۔ ۔

سیٹھ: بیٹھ جائیے ۔ رام سرن ذرا وہ آئی گلاس اٹھانا ۔ ہاں تو آپ اس کے کتنے روپئے لیں گے ۔۔ ؟

مظفر نواب: آپ ہی بتائیے ۔ میرے خیال میں ۔ ویسے تو آٹھ ۔ (رک جاتا ہے)

سیٹھ: ٹھیک ٹھیک بتاؤں ، دس نگینے کے لیجئے اور بیس نے کے ۔

مظفر نواب: (رک رک کر) کیا مطلب ۔ میرے خیال میں نگینے کے دس ہزار ۔۔ ؟

سیٹھ: کیا فرمایا نواب صاحب آپ نے ؟ دس ہزار ؟ معاف کیجئے گا ، ذرا یہ بتائیے کہ یہ انگوٹھی آپ تک کیسے آئی ہے ۔

مظفر نواب: یہ میری خاندانی ہے ۔ میرے خیال میں ۔ ۔ ۔ ۔

سیٹھ: کیا اس کی قیمت ہزاروں میں بتائی گئی تھی ؟

مظفر نواب: جی ہاں ۔ میرے خیال میں ۔ ۔ ۔ ۔

سیٹھ: معاف کیجئے گا نواب صاحب ! آپ کو سخت دھوکا ہوا ہے ۔ جس نے بھی اس کی قیمت ہزاروں میں بتائی وہ جانتا ہوگا کہ آپ اس کو بیچیں گے نہیں ۔ یہ ہیرا نہیں ہے بہت ہی اعلیٰ درجہ کا امیٹیشن ہے ۔ اسی لئے میں نے اس کے دس روپئے لگا دیئے ۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ امیٹیشن بہت ہی عمدہ ہے ۔۔ ارے ارے ! نواب صاحب کو شاید چکر آگیا ۔۔ سنبھالو ۔ ارے جلدی کرو ۔ دیکھو نواب صاحب شاید بیہوش ہو گئے ہیں ۔

☆ ☆

نیا ساز نیا انداز

نازش پرتاپگڑھی

سخن وروا کس طرف ہو، آؤ۔ میں تم کو آواز دے رہا ہوں　　تمھارے نغموں کے واسطے آج اِک نیا ساز دے رہا ہوں
تمھاری فکرِ سخن کی خاطر اِک اور انداز دے رہا ہوں　　تمھارا ہر شعر بول اُٹھے گا تمھیں وہ اعجاز دے رہا ہوں

یہ دیکھو اپنی زمیں کہ جس پر فلک کی رفعت نثار کر دیں
وطن کی اس خاکِ پاک پر ہم بہارِ جنت نثار کر دیں

نقوش اجنتا و ایلورا کے تخیلِ لاجواب جیسے　　یہ تاج، مستقبلِ وطن کا حسین و پُرکیف خواب جیسے
قطب کی یہ لاٹ۔ ایک شوقِ نگاہ ہو کامیاب جیسے　　یہ جامع مسجد کا حُسنِ سادہ، دعا کوئی مستجاب جیسے

نگارِ دلّی کی یہ سجاوٹ کتھا کلی کا ہو روپ جیسے
یہ لکھنؤ کی حسین شامیں کہ ہلکے جاڑے کی دھوپ جیسے

یہ لال قلعے کی سُرخ تعمیر، جم گیا ہو گلال جیسے　　ہمالیہ کی بلندیوں میں زمین کا ہو جلال جیسے
یہ ارضِ کشمیر۔ ایک شاعر کی منتہائے خیال جیسے　　سجی ہوئی یہ حسین وادی، کسی دُلھن کا جمال جیسے

یہاں کی جھیلوں کی وسعتیں ہیں کہ حُسنِ فطرت کے آئینے ہیں
ہیں کوہساروں کے سلسلے یا جوان سینے تنے ہوئے ہیں

اڑی ہے سنگم سے جب بھی خوشبو تو آبروئے ختن گئی ہے　　ہنسی ہے جب رات مالوے کی تو روشنی دل میں چھن گئی ہے
پٹھار ارضِ دکن کے ہیں یا نگاہِ محبوب تن گئی ہے　　کسی "اماوس" کی رات لہرا کے زلفِ بنگال بن گئی ہے

یہاں کی روحانیت کا جادو چلا کیا ہے چلا کرے گا
یہ وہ زمیں ہے جہاں ہمیشہ چراغ اُلفت جلا کرے گا

یہ رودِ سرجو ہے یا تقدس کی آنچ میں روح گل گئی ہے　　پوتر جمنا کے روپ میں بانسری کی اِک تان بہہ رہی ہے

یہ پاک گنگا کہ جس سے قلب و نظر کو آسودگی ملی ہے ۔۔۔ ہماری دھرتی نے ہاتھ پھیلا کے ہم کو آشیرواد دی ہے

یہ نرم موجیں ہیں یا کسی مہ جبیں کے ابرو کی جنبشیں ہیں

یہ ننھی لہروں کی ہے روانی کہ دل کی معصوم دھڑکنیں ہیں

یہ پھیلی بکھری ہوئی سی بیلیں کہ جیسے عاشق کی گفتگو ہو ۔۔۔ جھکے ہوئے خوشہ ہائے گندم کہ جیسے چشمِ بہانہ جو ہو

یہ دھان کی بالیاں کہ جیسے کسی کے سینے میں آرزو ہو ۔۔۔ یہ نازک اور سربلند پودے کہ جس طرح ماں کی آبرو ہو

یہ کیاریاں ہیں کہ ایک فنکار کے خیالوں کا سلسلہ ہے

جوان کھیتوں کا حُسنِ سادہ کہ جس میں دھرتی کا دل کھلا ہے

بہن کی خاطر بڑھے گا ہر "راکھی بند بھائی" کا ہاتھ اب بھی ۔۔۔ اجودھیا کی فضاؤں میں ہے وفائے سیتا کی بات اب بھی

ملے گا بدھ کے پیامِ حق میں وہی سکونِ حیات اب بھی ۔۔۔ حریمِ دل کی طرح مقدس ہے خطۂ ستارناتھ اب بھی

یہ شامِ گوکل جہاں پہنچ کر مشامِ جاں تک مہک اٹھا ہے

یہ صبحِ کاشی کہ جس میں ظلمت کدوں کا دل بھی چمک اٹھا ہے

ہر اک "جہانگیر" کے لیے اس جگہ ضروری ہے عدل گیری ۔۔۔ بہت کڑے امتحاں سے گذرا ہوا "ہریش چندر" کوئی جب بھی

یہیں کے سوزِ یقین و حق نے جلائی لنکا کی راجدھانی ۔۔۔ یہاں کرشن اٹھ کھڑے ہوئے ہیں دروپدی پر جب آنچ آئی

گزیدہ ماضی کی راکھ جس میں شعور کا جامِ جم ملے گا

انھیں روایات کے خزانے سے تم کو زورِ قلم ملے گا

وہی ادائیں ہیں "گوپیوں" کی "کرشن کی بانسری" وہی ہے ۔۔۔ "وفائے شاہِ جہاں" نے کی تھی جو "مرمریں شاعری" وہی ہے

یہ ہیر رانجھا کی سرزمیں جس میں "عشق" کی دلکشی وہی ہے ۔۔۔ پھٹتا ہے پنجاب کا کلیجہ مگر لبوں پر ہنسی وہی ہے

انھیں میں موضوعِ نظم ڈھونڈھو یہیں یہ مینارۂ ادب ہے

نگاہ اوروں کی سمت کیوں ہو وطن ہی گہوارۂ ادب ہے

ہماری آنکھیں

محمد اسحق صدیقی

ہزاروں سال سے انسان اپنے جسم کی ساخت کو سمجھنے کی کوشش کرتا چلا آ رہا ہے اور اس نے اس سلسلہ میں بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ آیئے آج ہم آپ کو جسم انسانی کے ایک نہایت چھوٹے سے حصے یعنی آنکھ کی سیر کرائیں۔

آنکھ کے گڑھے۔ آنکھ ہمارے جسم کا بڑا نازک حصہ ہے۔ اسی لئے قدرت نے اس کی حفاظت کا خاص انتظام کیا ہے۔ آنکھیں دو گڑھوں کے اندر گھومتی رہتی ہیں۔ ان گڑھوں کے چاروں طرف کی ہڈیاں ابھری ہوتی ہیں۔ اگر ہم منہ کے بل گر پڑیں تو ہمارے سر اور ناک میں چوٹ آتی ہے، تھوڑی چھل جاتی ہے لیکن آنکھیں بچ جاتی ہیں۔ اگر آنکھیں ان دو گڑھوں میں نہ ہوتیں تو وہ بھی زخمی ہو جاتیں۔ اگر انھیں ٹٹول کر دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ وہ گول ہیں۔ اگر وہ گول نہ ہوتیں تو ہم انھیں چاروں طرف گھما نہ سکتے۔ آنکھ کے ارد گرد چربی کی تہیں ہیں جو آنکھ کو ادھر ادھر گھومنے میں مدد پہونچاتی ہیں اور ہڈیوں کی رگڑ سے بھی انھیں بچاتی ہیں۔

آنکھ کے پٹھے۔ آپ نے کٹھ پتلی کا ناچ تو دیکھا ہی ہوگا۔ کٹھ پتلی کو چلانے پھرانے کے لئے ڈوریوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بالکل ایسی ہی ہماری آنکھوں کی ہے کہ ان کے پٹھے انھیں ادھر ادھر گھماتے رہتے ہیں۔ ان پٹھوں کا ایک سرا آنکھ کے ڈھیلے سے جڑا رہتا ہے اور دوسرا آنکھ کے گڑھے کی ہڈیوں سے۔

ہماری دونوں آنکھیں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ جدھر ایک آنکھ مڑتی ہے اسی طرف دوسری بھی مڑ جاتی ہے۔

بھویں اور پپوٹے۔ آنکھوں کی حفاظت کے لئے بھوؤں کی ہڈیاں سامنے کو بالکل اسی طرح ابھری ہوئی ہیں جیسے کھڑکی کے آگے سائبان۔ بھوؤں کے بال پسینے اور پانی کی بوندوں کو آنکھ میں جانے سے روکتے ہیں۔

ہر آنکھ کے سامنے دو پپوٹے ہوتے ہیں۔ یہ گویا کھڑکی کے پٹ ہیں جو آنکھوں کی حفاظت کیلئے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ اوپر کا پپوٹا نیچے والے سے بڑا ہوتا ہے اور زیادہ حرکت کرتا ہے پپوٹوں کو کھولنے بند کرنے کیلئے خاص طرح کے پٹھے لگے ہیں۔

جب آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو ہر ۶ سکنڈ کے بعد پپوٹے خود بخود کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اسی کو ہم پلک جھپکانا کہتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو پلکوں کے جھپکنے کو کچھ دیر کے لئے روک بھی سکتے ہیں۔ لیکن اس سے آنکھوں کو نقصان پہونچتا ہے۔

پلکیں۔ پپوٹوں کے آگے پلکوں کی جھالر ہوتی ہے جو گرد و غبار کو اندر جانے سے روکتی ہے۔ چنانچہ خاک اور دھوئیں سے بچنے کے لئے آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ ہم پلکوں کی آڑ سے دیکھتے بھی رہتے ہیں۔ اوپر کی پلکیں اوپر کی طرف اور نیچے کی پلکیں نیچے کی طرف مڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ آپس میں الجھ جاتیں اور آنکھوں میں گر دیتیں۔

گلٹیاں۔ ہر پپوٹے کے اندر موتی کی لڑیوں جیسی بیس سے لیکر تیس تک ننھی ننھی گلٹیاں ہوتی ہیں۔ ان سے ایک طرح کا تیل رسا کرتا ہے جو پپوٹوں کے کناروں اور پلکوں کو چکنا رکھتا ہے اور انھیں سوکھنے نہیں دیتا۔ جب ہمارے پپوٹوں میں جلن ہوتی ہے تب یہ گلٹیاں اپنا کام تیز کر دیتی ہیں اور ان کا تیل کیچڑ کی شکل میں پپوٹوں کے کنارے کنارے جمع ہو جاتا ہے۔

آنسو۔ ہر آنکھ میں باہر والے کونے کی طرف بھوؤں کے نیچے اور پپوٹے کے پیچھے ایک گلٹی ہوتی ہے جس سے آنسو رسا کرتے ہیں۔ آنسوؤں کا یہ غدود بادام کی شکل کا ہوتا ہے۔ جب ہم پلک جھپکاتے ہیں تو پپوٹے آنسوؤں کو آنکھوں پر پھیلا دیتے ہیں اور آنکھیں ویسی ہی صاف ہو جاتی ہیں جیسے تر کپڑے سے شیشہ صاف ہو جاتا ہے۔

آنسو بہہ کر آنکھ میں اندر والے کونے کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں دو نالیاں انھیں آنسوؤں کی تھیلی میں لے جاتی ہیں اور پھر یہ ایک دوسری نالی کے ذریعہ سے ناک کے اندر پہونچتے ہیں اور ناک کی جھلی کو تر رکھتے ہیں تاکہ وہ خشک نہ ہونے پائے۔

خوشی اور رنج کی حالت میں ہمارے آنسوؤں کے غدودوں پر دباؤ پڑتا ہے اور ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں کبھی کبھی اتنے زیادہ آنسو نکلتے ہیں کہ وہ سب کے سب نالیوں سے گزر کر ناک میں نہیں پہونچ پاتے بلکہ ہمارے گالوں پر بہنے لگتے ہیں۔

آنسو ہماری آنکھوں کے لئے بہت ضروری ہیں۔ وہ ہماری آنکھوں کو تر رکھتے ہیں۔ اگر ہماری آنکھ کا اگلا حصہ سوکھ جائے تو ہم اندھے ہو جائیں۔ آنسو ان جراثیم کو بھی مارتے ہیں جو ہماری آنکھوں میں کسی نہ کسی طرح پہونچ جاتے ہیں۔ آنسوؤں کی جراثیم مارنے والی طاقت اتنی زیادہ ہے کہ ... ۶ گنا پانی میں ملنے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔

آنکھ کی جھلی۔ ہر آنکھ کے سامنے ایک باریک جھلی ہوتی ہے جو اوپر کے پپوٹے، آنکھ کی سفیدی اور نیچے کے پپوٹے پر غلاف کی طرح چڑھی ہوتی ہے۔ اس میں اعصاب اور خون کی رگیں ہیں۔ یہی رگیں ہمیں آنکھ کے "لال ڈوروں" کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ آنسو کا غدود اس جھلی اور اوپر کے پپوٹے کے بیچ میں ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔

آنکھ کے پردے۔ جس طرح ربر کے گیند میں ہوا بھری ہوتی ہے اسی طرح ہماری آنکھ کا گولا خاص طرح کے ریشوں کا بنا ہوتا ہے اور اسکی خالی جگہوں میں خاص طرح کا پانی بھرا ہوتا ہے۔ ریشوں کی تین پرتیں ہیں جو ایک دوسرے پر لپٹی ہوتی ہیں انھیں پردے کہتے ہیں۔ پردے تین طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) باہری پردہ۔ اسے ہم آنکھ کی "سفیدی" کہتے ہیں۔ یہ مضبوط ریشوں کا بنا ہوتا ہے۔ آنکھ کی حفاظت اس کا کام ہے۔ اس کا اگلا حصہ گھڑی کے شیشے کی طرح ابھرا ہوتا ہے۔ اس اگلے حصے میں کئی درجن پرتیں ہیں۔ پھر بھی اس کے آرپار دیکھا جا سکتا ہے۔

(۲) درمیانی پردہ۔ یہ کالے رنگ کا پردہ ہوتا ہے۔ اس میں خون کی بہت سی رگیں ہوتی ہیں جو آنکھ کے مختلف حصوں کو غذا پہونچاتی ہیں اور فضلہ واپس لے جاتی ہیں۔ اس کا اگلا حصہ ہمیں ایک رنگین حلقے کی صورت میں

نظر آتا ہے جسے پتلی کہتے ہیں۔ اس کے بیچ میں ایک سوراخ ہوتا ہے جو سیاہ نقطے کی طرح نظر آتا ہے۔ یہ کالا پن آنکھ کے اندر کا اندھیرا ہے جو باہر سے دکھائی دیتا ہے۔

(۳) اندرونی پردہ۔ یہ پردہ روشنی کا اثر قبول کرتا ہے۔ جو چیزیں ہم دیکھتے ہیں ان کا عکس اسی پردے پر پڑتا ہے اور یہیں سے دماغ کو پہنچتا ہے۔ اس کی موٹائی بیچ میں ایک انچ کا پچاسواں حصہ اور کنارے پر سوواں حصہ ہے۔ تب بھی خوردبین سے دیکھنے پر اس میں گیارہ پرتیں نظر آتی ہیں۔

بینائی کا پٹھا۔ اندرونی پردہ ایک پٹھے کے ذریعہ دماغ سے جڑا ہوتا ہے۔ جسے "بینائی کا پٹھا" کہتے ہیں۔ یہ دس لاکھ ریشوں سے مل کر بنتا ہے۔ ان سب کی موٹائی زیادہ سے زیادہ اتنی ہے۔ یہ پٹھا ہماری آنکھ میں پہلی دو پرتوں کے آرپار پیچھے سے داخل ہوتا ہے۔ اس کے ریشے اندر پیالے کی صورت میں پھیلے ہوتے ہیں۔ انھیں ریشوں کے جال کو "اندرونی پردہ" کہتے ہیں۔

پتلی اور موٹی نلکیاں۔ اندرونی پردے کی پہلی آٹھ پرتوں میں خون کی رگیں، اعصاب اور خاص طرح کے خلیے[1] ہوتے ہیں۔ نویں پرت میں وہ خلیے پائے جاتے ہیں جو روشنی کا اثر قبول کرتے ہیں۔ یہ نلکی کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے اصطلاحی نام عصی خلیات (Rods) اور مخروطی خلیات (Cones) ہیں لیکن آسانی کے خیال سے ہم عصی خلیات کو پتلی نلکیاں اور مخروطی خلیات کو موٹی نلکیاں کہیں گے۔ ہر آنکھ کے اندرونی پردے میں تقریباً ۱۲ کروڑ پتلی نلکیاں اور ۷۰ لاکھ موٹی نلکیاں ہوتی ہیں۔

ہر موٹی نلکی کے لئے بینائی کے پٹھے میں ایک الگ ریشہ ہوتا ہے لیکن

[1] جس طرح بے جان چیز کے سب سے چھوٹے ٹکڑے کو ذرہ کہتے ہیں اسی طرح جاندار جسم کے سب سے چھوٹے ٹکڑے کو خلیہ (cell) کہتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ ہر خلیہ خود ایک ننھا سا جاندار ہے جو بغیر خوردبین کے نظر نہیں آتا۔ وہ ہماری طرح جیتا مرتا اور نسل بڑھاتا ہے۔ اسے بھی کھانے پینے اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا جسم بیشمار خلیوں کا بنا ہے۔ انھیں ہم اپنے جسم کی عمارت کی "جاندار اینٹیں" کہہ سکتے ہیں۔

پتلی نلکیاں چھوٹے چھوٹے گچھوں کی صورت میں بینائی کے ریشوں سے ملی ہوتی ہیں۔ چوں کہ ہر موٹی نلکی دماغ کو الگ الگ خبریں بھیجتی ہے اس لئے یہ خبریں بہت صاف ہوتی ہیں برخلاف اس کے کئی پتلی نلکیاں مل کر دماغ کو خبریں بھیجتی ہیں اس لئے یہ خبریں زوردار تو ہوتی ہیں لیکن واضح نہیں ہوتیں۔

پتلی نلکیاں کم سے کم روشنی کا اثر لیتی ہیں۔ اُن میں ایک طرح کا اودا رنگ پایا جاتا ہے جو روشنی کے پڑنے سے نارنجی ہو جاتا ہے، اس کے بعد پیلا، اور اگر روشنی بہت تیز ہوئی تو سفید پڑ جاتا ہے۔ لیکن جلد ہی دوبارہ اودا بن جاتا ہے۔ اس کے بننے اور بگڑنے سے ہی اندرونی پردے پر تصویریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اس اودے رنگ کے بننے کے لئے اندھیرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم اندھیرے کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو پہلے ہمیں کچھ نظر نہیں آتا لیکن چند منٹوں کے بعد جب آنکھ کا اودا رنگ بننے لگتا ہے تو ہمیں چیزیں آہستہ آہستہ نظر آنے لگتی ہیں تقریباً ۲۰ منٹ میں یہ اودا رنگ پوری طرح بن جاتا ہے اور تب اس میں روشنی کا اثر لینے کی طاقت ...۲ گنا تک بڑھ جاتی ہے۔

جس طرح پتلی نلکیاں اندھیرے میں کام کرتی ہیں اسی طرح موٹی نلکیاں روشنی میں کام کرتی ہیں ہر چیز کی جزئیات اور رنگ ہمیں موٹی نلکیوں سے نظر آتا ہے۔ خیال کیا جاتا کہ دھنک کے سات رنگوں میں سے ہر رنگ کے لئے الگ الگ موٹی نلکیاں ہوتی ہیں۔ بہر حال، انسانی آنکھ تقریباً ایک لاکھ رنگوں میں تمیز کر سکتی ہے۔ موٹی نلکیوں میں ایک طرح کا بے رنگ مادہ پایا جاتا ہے جو رنگوں کا اثر لیتا ہے۔ چوں کہ وہ اندھیرے میں کام نہیں کرتیں اس لئے ہم اندھیرے یا کم روشنی میں چیزوں کو پہچان تو لیتے ہیں لیکن ان کا رنگ نہیں بتا سکتے۔

پتلی نلکیاں سارے پردے میں برابر برابر فاصلے پر واقع ہیں۔ موٹی نلکیاں پردے کے بیچ میں سب سے زیادہ ہوتی ہیں اور کناروں کی طرف رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہیں۔

زرد نقطہ۔ پتلی کے ٹھیک سامنے اور اندرونی پردے کے بیچ میں ایک زرد نقطہ ہے۔ اس حصے میں پتلی نلکیاں نہیں ہیں لیکن موٹی نلکیاں بہت ہیں۔ ہر چیز کی جزئیات اس حصے سے نظر آتی ہیں۔ اس جگہ خلیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اتنی سی جگہ ● (ایک مربع ملی میٹر) میں تقریباً ۱۶۰،۰۰۰ خلیے پائے جاتے ہیں لیکن جتنا آگے جایئے خلیوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب ہم اندرونی پردے کے کناروں تک پہونچتے ہیں تو اتنی جگہ ● میں ہزار سے کچھ اوپر خلیے ملتے ہیں۔

زرد نقطے میں صرف موٹی نلکیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کے ارد گرد پتلی اور موٹی نلکیاں ملی جلی پائی جاتی ہیں لیکن جتنا اس جگہ سے دور ہوتے جایئے موٹی نلکیوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ صرف پتلی نلکیاں رہ جاتی ہیں۔

بیچ کا گڈھا۔ زرد نقطے کے بیچ میں اس نقطہ ● کے برابر ایک خفا سا گڈھا ہوتا ہے۔ اتنی سی جگہ میں تقریباً ۳۵۰۰ موٹی نلکیاں پائی جاتی ہیں۔ اندرونی پردے کے دوسرے حصوں میں روشنی کو پہلے آٹھ پرتوں سے گزرنا ہوتا ہے اور تب کہیں جا کر وہ نوبیں پرت تک پہونچتی ہے۔ لیکن اس حصے سے پہلی آٹھ پرتیں غائب ہو گئی ہیں اس لئے نویں پرت (جس میں موٹی نلکیاں پائی جاتی ہیں) بالکل اوپر آگئی ہے اسلئے روشنی اس پر بغیر کسی روک ٹوک کے پڑتی ہے۔ خون کی رگیں بھی یہاں نہیں ہیں۔ اسی لئے ہمیں اپنی آنکھ کے اس حصے سے جو باریک چیزیں نظر آتی ہیں وہ کسی دوسرے حصے سے نظر نہیں آتیں۔

اس حصے میں چوں کہ پتلی نلکیاں نہیں ہیں اس لئے اندھیرے میں یہ حصہ تقریباً بیکار ہو جاتا ہے۔ اندھیرے میں تو وہی حصہ پوری طرح کام کرتا ہے جہاں پتلی نلکیاں پائی جاتی ہوں۔ اگر آپ اندھیرے میں کسی چیز کو اپنی آنکھ کے مرکزی حصے سے دیکھنے کی کوشش کریں گے تو ناکام رہیں گے۔ وہ چیز آپ کو اسی وقت نظر آئے گی جب اسکا عکس آنکھ کے مرکز سے ہٹ کر ادھر اُدھر پڑے گا۔

اندھی جگہ۔ ہماری آنکھ میں ایک ایسی جگہ بھی ہے جہاں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا کیوں کہ نہ یہاں پتلی نلکیاں ہیں اور نہ موٹی نلکیاں۔ یہ جگہ زرد نقطے سے کچھ دور ہے۔ یہاں سے اندرونی پردے کے ریشے مل کر آنکھ سے باہر نکلنا شروع ہوتے ہیں اور باہر جا کر "بینائی کا پٹھا" بن جاتے ہیں۔

ہم اپنی آنکھ کی اس اندھی جگہ کو معلوم کر سکتے ہیں۔ آپ کی

دونوں پتلیوں کے درمیان تقریباً ڈھائی انچ کا فاصلہ ہوتا ہے! اسلئے ایک کاغذ پر ایک جگہ ایک نقطہ بنائیے اور اس کے داہنی طرف ڈھائی انچ کے فاصلے ایک صلیب بنائیے۔ اس طرح :

● ✝

اب آپ بائیں آنکھ بند کرکے دائیں آنکھ سے نقطے کو دیکھنا شروع کیجئے اور جس کاغذ پر یہ نقشہ بنا ہو اسے آہستہ آہستہ اپنی آنکھ سے قریب لائیے جب کاغذ آنکھ سے تھوڑی دور پر رہ جائیگا تو صلیب غائب ہو جائیگی اسی طرح اگر آپ دائیں آنکھ بند کرکے بائیں آنکھ سے صلیب کو دیکھیں اور اسے دیکھتے ہوئے نقشہ کو آہستہ آہستہ اپنی آنکھوں سے قریب لائیں تو نقطہ غائب ہو جائیگا۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب صلیب یا نقطہ کا عکس آنکھ کی "اندھی جگہ" پڑتا ہو۔

آنکھ کا رنگ۔ اندرونی پردے کی آخری تہہ کی بناوٹ شہد کی مکھی کے چھتے سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں چھ پہلو والے خلیے پائے جاتے ہیں جن میں خاص طرح کا رنگ بنتا رہتا ہے۔ جب اندرونی پردے پر روشنی پڑتی ہے تو یہ رنگ ننھی ننھی نلکیوں کے ذریعہ سے اوپر چڑھنے لگتا ہے۔ یہ نلکیاں روشنی کا اثر لینے والے خلیوں کو گھیرے ہوئے ہیں اس رنگ کے اوپر چڑھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ روشنی کا اثر لینے والے خلیوں کو روشنی کی تیزی سے بچالے۔

ہماری پتلیوں کا رنگ (نیلا، بھورا یا کالا) یہیں سے بن کر جاتا ہے بلکہ ایک خیال تو یہ ہے کہ ہمارے بال اور کھال کا رنگ بھی کافی مقدار میں یہیں بنتا ہے۔ گویا اندرونی پردے کی یہ تہہ کیا ہے ایک اچھا خاصا رنگ سازی کا کارخانہ ہے۔

آنکھ کا شیشہ۔ پتلی کے پیچھے مسور کی دال جیسا آنکھ کا شیشہ ہوتا ہے تقریباً اتنا بڑا ⬯ ہوتا ہے۔ اس کا پچھلا حصہ اگلے سے زیادہ ابھرا ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک شفاف تھیلی ہوتی ہے جس میں ایک طرح کا صاف اور گاڑھا مادہ بھرا ہوتا ہے۔ خوردبین سے دیکھنے پر اس میں بے شمار پرتیں نظر آتی ہیں جو ایک دوسرے پر اس طرح لپٹی ہوتی ہیں جیسے پیاز کے اندر پرتیں ہوتی ہیں۔ ہماری آنکھ کا یہ شیشہ معمولی شیشے کے برخلاف لچکدار ہوتا ہے۔

آنکھ کا پانی۔ اس شیشے نے ہماری آنکھ کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے پچھلا خانہ اگلے سے پانچ گنا بڑا ہوتا ہے۔ اگلے خانے میں ایک خاص طرح کا پانی بھرا ہوتا ہے جو برابر بنتا اور بہتا رہتا ہے۔ اس کے بنانے کیلئے خاص غدود ہیں اور نکاسی کے لئے دو نالیاں ہیں۔ اگر یہ پانی چوٹ لگنے یا آپریشن کی وجہ سے بہہ جائے اور آنکھ کا سوراخ بند کر دیا جائے تو یہ دوبارہ بن جاتا ہے۔ آنکھ کے پچھلے خانے میں بھی خاص طرح کا پانی بھرا ہوتا ہے۔ اگر یہ پانی کسی طرح خارج ہو جائے تو پھر نہیں بن سکتا ایسی صورت میں ہماری آنکھ ہوا نکلے ہوئے غبارے کی طرح پچک جائے گی۔

✡

چند عروضی غلطیاں

(بسلسلہ صفحہ ۱۰)

رباعی دوسرے اوزان میں نہیں کہی جا سکتی۔ یہ قول مرزا ہی کا نہیں عام علمائے عروض کا ہے کہ بحر ہزج سے رباعی کے جو چوبیس اوزان مستخرج ہیں ان کے علاوہ دوسرے کسی وزن میں رباعی نہیں کہی جا سکتی۔ یہ قول بھی ایک حد تک محل نظر ہے اور تفصیلی بحث چاہتا ہے۔

اسی ذیل میں ایک اور بحث طلب یا تفصیل طلب بات بھی ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ بحر ہزج سے رباعی کے جو اوزان نکالے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ

غزل

ذکیہ سلطانہ نیّر

شبِ غم صدا ان کی آنے لگی ہے مری رات پھر گنگنانے لگی ہے

گُل اُن کا تبسم چرانے لگے ہیں صبا ان کے پیغام لانے لگی ہے

مری آہ کے ساز پر گلستاں میں ہر اِک شاخِ گُل گنگنانے لگی ہے

جو تیرے شبستاں میں تھی ایک خوشبو وہ خوشبو مجھے دل سے آنے لگی ہے

مری آہ کی نارسائی تو دیکھو ستاروں سے آگے بھی جانے لگی ہے

جو ڈوبی ہوئی تھی اندھیرے میں غم کے وہ قوسِ قزح مسکرانے لگی ہے

جو پامالِ بے التفاتی تھی کل تک وہی خاک اَب مسکرانے لگی ہے

اُلٹ دی جنوں نے بساطِ محبّت خرد مات پہ مات کھانے لگی ہے

ہے کس پیکرِ حُسن کا یہ تصوّر فضا یک بیک مسکرانے لگی ہے

مبارک سرافرازئ عشق نیّر
مری یاد اب ان کو آنے لگی ہے

غزل

قیسی الفاروقی

فسردگئ شوق کا نہ کُھل سکا کوئی سبب نہ اب وہ صبحِ دلکشا نہ عالمِ سکوتِ شب

مآلِ جور و جبر کے فسانے کہہ رہی ہیں سب کبھی یزید کی زباں کبھی سرشتِ بولہب

کہیں غرورِ آگہی کہیں فریبِ بیخودی مگر مقامِ بندگی، ہنوز بندگی طلب

عجیب سی ہے زندگی یہ زاہدانِ خشک کی نہ ذوقِ حسن و دلبری نہ شوقِ حاصلِ طرب

یہ وعظ و پند سب بجا مگر کبھی تو ناصحا حیات جس سے جھوم اُٹھے وہ چھیڑ نغمۂ طرب

باایں ہجومِ رنج و غم مجسمہ ہے شکر کا
یہی ہے قیسیؔ حزیں فسردہ دِل شگفتہ لب

غالب کے اُردو قصیدے

آفتاب اختر

قصیدہ عربی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی بھیجے۔ سر کے گودے اور مغزِ غلیظ کے ہیں۔ قصیدے کو چونکہ بالعموم تمام اصنافِ شعر پر وہی برتری اور فوقیت حاصل ہے جو مغزِ سر کو انسانی جسم کے دوسرے اعضا پر ہے اس لئے اس صنفِ سخن کو قصیدے کا نام دیا گیا ہے بعض اربابِ فن کی یہ رائے ہے کہ قصیدہ، قصد سے مشتق ہے اور اسکے معنی ارادے کے ہیں۔ چونکہ اس صنفِ شعر میں مدح یا ذم وغیرہ کا قصد کیا جاتا ہے اس لئے اسے قصیدہ کہا جاتا ہے۔ قصیدے کی ہیئت، غزل کی ہیئت سے بلحاظ قافیہ و ردیف وغیرہ کے مختلف نہیں ہوتی۔ لیکن مقصد موضوع۔ تعداد اشعار اور تسلسل خیال کے نقطۂ نظر سے قصیدہ اور غزل مختلف ہو جاتے ہیں۔ غزل میں بھی مطلع مقطع، قافیہ اور ردیف کی پابندیاں ہوتی ہیں اور قصیدے میں بھی۔ البتہ غزل کی فضا اور غزل کا لہجہ نرم، سبک، میٹھا اور سہلنا ہوتا ہے اور قصیدے کا لہجہ وزنی، شاندار، فخیم و بلند ہوتا ہے۔

عربی شاعری کا بیشتر حصہ قصیدے ہی کی ہیئت میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ ایران پر عربوں کے قبضہ کے بعد فارسی شاعری کا جو دور گذرا اس میں عربی شاعری ہی کو سامنے رکھ کر مشقِ سخن کی گئی اور فارسی شاعری کے ہر اچھے بڑے شاعر نے اس صنفِ سخن میں اپنے کمالات کا مظاہرہ ضروری سمجھا۔ خاقانی۔ انوری۔ عرفی اور قاآنی وغیرہ کی شہرت کا دار و مدار بیشتر اسی صنفِ سخن پر ہے۔ اردو شاعری فارسی شاعری کا دودھ پی پی کر بڑھی پلی ہے۔ پھر وہ اپنی تکمیل کے لئے قصیدے کا سہارا کیوں نہ لیتی۔ اردو کے اکابر شعراء میں میر و انیس کے سوا سبھوں نے خاص اہتمام سے اور بڑی کاوش سے قصیدے کہے ہیں اور اپنی باریکیٔ نظر اور کمالِ سخن کا سکہ اس وقت کے اربابِ فکر و ذوق پر جمایا ہے سودا کے قصیدوں کی اردو ادب میں بہت زیادہ دھوم ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کے قصائد عجم کے نامور شعرا کے نتائجِ فکر کا پہلو دباتے ہیں۔ سودا کے بعد ذوق و مومن نے بھی صنفِ قصیدہ میں طبعِ رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔

مرزا غالب حقیقتاً فارسی کے شاعر تھے۔ ان کی تخئیل کا انداز خالص ایرانی تھا اور اپنی اس ذہنی مناسبت کی وجہ سے انہوں نے بیشتر قند عجم سے اپنی سخن آرائی کے کام و دہاں شیریں کیے ہیں چنانچہ انہوں نے فارسی میں بہت ہی شاندار قصائد کہے ہیں۔ ان کا آہنگ بھی دل کش ہے۔ اسلوب بھی پسندیدہ ہے۔ ان کے قصیدوں کے بارے میں مولانا حالی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے:۔ "مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عربی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں۔" ممکن ہے مولانا حالی کا یہ خیال کسی قدر ان کی استاد پرستی کے جذبہ کا نتیجہ ہو مگر اسے یکسر حقیقت پسندی سے معرا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے فکرِ شعر کی رفعت، ان کے خیالات کی ندرت، انہیں عجم کے باکمال شعراء کی صف میں منفرد جگہ دیتی ہے۔ غالب کے عہد میں غزل کو خاصی اہمیت حاصل ہو چکی تھی لیکن

خواص کی صحبتوں میں قصیدے ہی کو کافی اہمیت دی جاتی تھی۔ جبتک اس صنفِ سخن میں کوئی عروج حاصل نہ کرلیتا اُسے قابلِ احترام شاعر کا درجہ نہ دیا جاتا۔ ایسی صورت میں غالب کا اردو قصیدہ کی طرف ملتفت نہ ہونا تعجب خیز ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے اردو میں بھی قصیدے کہے۔

غالب کے اردو متداول دیوان میں چار قصیدے درج ہیں۔ اب کچھ اُن قصائد کا بھی پتا چلا ہے۔ چنانچہ مالک رام صاحب نے اپنے ترتیب دیئے ہوئے غالب کے اردو کلام کے مجموعہ کے آخر میں چار نئے قصیدے درج کئے ہیں۔

پہلے قصیدے کا مطلع ہے۔

ملاذِ کشور و لشکر پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالیِ ایلن برونِ والا جاہ

دوسرے قصیدے کا مطلع ہے۔

گھٹی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں سو ہزار گرہ

تیسرے قصیدے کا مطلع ہے۔

سحر تا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام

چوتھے قصیدے کا مطلع ہے۔

مرحبا سالِ فرخی آئیں
عید شوال و ماہ فروردیں

یہ آخری قصیدہ تقریباً ۲۶ یا ۲۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ اور باقی قصیدوں میں اس سے بھی کم شعر ہیں۔ ان قصائد میں فنی خصوصیات کا بھی چنداں لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ نہ تشبیب ہے نہ گریز۔ صرف اس وقت کے انگریز حاکموں یا نوابوں کی روکھی پھیکی مداحی ہے۔ جیسے کھینچ تان ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان قصائد میں کہیں کہیں فارسی ترکیبیں غالبیت کی ضرور نشاندہی کرتی ہیں لیکن عام طور سے ان میں غالب کی تخیل کی رعنائی موجود نہیں۔ اس لیے ان کا نظرانداز کر دینا ہی مناسب ہے۔ باقی چار قصیدوں میں سے پہلے دو قصیدے منقبت میں اور بعد کے دو قصیدے ظفر شاہ کی مدح میں ہیں۔ منقبت والے قصیدوں کا وہ رنگ نہیں ہے جو شاہ ظفر کی مدح والے قصیدوں کا ہے۔ دونوں قسم کے قصیدوں میں واضح فرق موجود ہے۔ جو منقبت سے جو قصیدے تعلق رکھتے ہیں ان کی ترکیبوں میں پیچیدگی ہے، اُلجھاؤ ہے، اغلاق ہے الفاظ مشکل اور ادق ہیں۔ اگرچہ تخیل میں بلندی اور رفعت ہے پھر بھی پرواز میں کہیں کہیں ٹیڑھا ترچھا پن نظر آتا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ غالب کے یہ قصائد اُن کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظفر کی مدح کے دونوں قصیدوں کا انداز دوسرا ہے۔ اُن میں شگفتگی بھی ہے، رعنائی بھی تیکھا پن بھی ہے اور نیا پن بھی۔

غالب کا پہلا قصیدہ "رائیہ" ہے۔ اس کی تشبیب بہاریہ ہے مگر اس سے بہار کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے نہیں آتا۔ پڑھنے والا مغلق فارسی ترکیبوں اور حدِ اعتدال سے بڑھے ہوئے مبالغوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔

آغاز ملاحظہ ہو ؎

ساز یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

مستیِ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

اس تشبیب کے دوسرے شعر بھی کیف مبالغے کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس سے فکر کی توانائی کا پتا ضرور چلتا ہے مگر حقیقت سنجی کی جھلک ان میں نہیں ہے ؎

کاٹ کر پھینکئے ناخن تو بہ اندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

بہار کی اس قسم کی بیرنگ تصویریں فارسی شاعروں کے یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ سودا نے بھی ان کی تقلید میں یہ رنگ بہت برتا ہے اور غالب نے بھی اس تشبیب کے لئے یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس کے بلند بانگ الفاظ اور شاندار ترکیبوں سے تو ہم مرعوب ہو سکتے ہیں لیکن محاکاتِ بہار سے کیف اندوز نہیں ہو سکتے۔ نامیہ کی قوت مسلم ہے مگر کٹے ہوئے ناخنوں پر اس کے اثر کا سوال نہیں۔ کاغذِ آتش زدہ کا کیسا ہی جال بنائیے مگر وہ طاؤس شکار نہیں ہو سکتا۔ مانی اندیشہ چمن کی تصویر کسی انداز سے کھینچے مگر اس کا نتیجہ نہیں برآمد ہو سکتا کہ خطِ پرکار سبز ہو جائے۔

گریز میں بھی مبالغہ کی یہی شان ہے لیکن بہار کے بیان کے

مقابلہ میں دل آویز ہے۔ بہار کا جوش جب "دامِ ہر کاغذ آتش زدہ" کو "طاؤسِ شکار" اور "خط پرکار" کو "مثلِ خطِ نوخیز" سبز بنا رہا ہے تو پھر اگر "طوطیٔ سبزِ کہسار" حضرت علی کی مدحت کے زمزموں کے لئے "لعل" سے "منقار" پیدا کر لے تو تعجب کی کوئی بات نہیں ؎

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

مدح میں سات شعر ہیں اور وہی پرانے رنگ کے مگر تخیل کے لحاظ سے نہایت شاندار اور غالب کی فکری بلند پروازی کے آئینہ دار۔

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا   چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور   رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار
خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا   چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

اس قصیدے میں خاتمہ اور دعا کی رسم برتی ہی نہیں گئی ہے اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

غالب کا دوسرا قصیدہ پہلے قصیدے سے زیادہ بلند اور زیادہ آن بان کا ہے اور غالب کی انفرادیت کا جلوہ تھا۔ اس کی تشبیب متصوفانہ رنگ کی اور انوکھی ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوا ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق   بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم   لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

اسی طرح کے آٹھ اور اشعار کے بعد گریز پر پہنچ جاتے ہیں۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ   یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر   یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

اس قصیدے میں مدح کا انداز بھی پہلے قصیدے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پُرشکوہ اور حقیقت سے ہم عناں ہے۔ تین چار شعر ملاحظہ ہوں ؎

مظہرِ فیضِ خدا جانِ دلِ ختمِ رسل   قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں
نسبتِ نام سے اس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے   ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب   شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیٔ ممدوحِ خدا   کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

دعا کو ایک شعر میں نظم کیا ہے اور بہت ہی عمدہ تیوروں سے نظم کیا ہے ؎

صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

تیسرا اور چوتھا قصیدہ ظفر شاہ کی مدح میں ہے۔ ان دونوں قصیدوں کی تشبیبیں بے مثل ہیں۔ ان سے غالب کی حسین تخیل کی رعنائیوں کی قد آدم تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اور غالب کی شعری انفرادیت کا گہرا نقش دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس قسم کی نادر و حیرت خیز تشبیب کسی دوسری جگہ شاید ہی مل سکے۔ ان میں پیچیدگی، ابہام اور ثقیل ترکیبیں نہیں ہیں۔ مبالغہ کی راہوں میں تخیل کا مسافر بھٹکتا نہیں پھرا ہے۔ اگرچہ اس میں الفاظ زیادہ بھاری بھرکم اور ثقیل نہیں ہیں لیکن جزالت ہر لفظ میں بھرپور موجود ہے۔ ان دو قصیدوں میں سے پہلے قصیدے کی تشبیب ملاحظہ ہو۔

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام   جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح   یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب   بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا   آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص   حبذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے   لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا   صبح جو جاوے اور آوے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا   تیرا آغاز اور تیرا انجام

اس قصیدے کی گریز تشبیب اور مدح سے غیر معمولی طور پر پیوست ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے فطری طور پر پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ تشبیب و مدح سے گریز کی اس قدر غیر معمولی پیوستگی کہ ایک کا دوسرے سے امتیاز مشکل ہو سحر و اعجاز کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہلالِ عید سے اس خطاب کے بعد

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا   تیرا آغاز اور تیرا انجام

شاعر کی فکرِ فسیم خرام یوں گل افشاں ہوتی ہے ؎

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے   مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں   ایک ہی ہے امید گاہ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش   غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو   تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ   قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایا روشناسی کا   جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو   پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون   مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے   اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص   گر تجھے ہے امید رحمت عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ   کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی   کر چکے قطع تیری تیزیٔ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر   کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز   اپنی صورت کا اک بلوریں جام

یہاں تک پہنچنے کے بعد غالب اسی قافیے میں تھوڑی سی غزل سرائی بھی فرماتے ہیں۔ یہاں ادب کے ساتھ اتنا عرض کردوں کہ درمیان میں غزل کی یہ مداخلت غیر ضروری جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اسے حذف کردیا جائے تو قصیدے کی شان میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال گریز کی آخری منزل ان اشعار سے شروع ہوتی ہے ؂

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ   اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا   ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن،   نام شاہنشہ بلند مقام

اس کے بعد سے مدح شروع ہوجاتی ہے۔ وہ پچیس شعر پر مشتمل ہے اس میں وہی مدح کی رسمی باتیں ہیں جنھیں اس وقت کا جاگیردارانہ ماحول کتنا ہی پسندیدہ قرار دیتا ہو لیکن ہیں وہ تملق اور خوشامد کی باتیں جن کی اخلاقی نصاب میں گنجائش ہی نہیں اور جن کی وجہ سے عام صنفِ قصیدہ ہی بلا تمیز مطعون کی جاتی ہے۔

فنِ صورت گری میں تیرا گرز   گر نہ رکھتا ہو دست گاہ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے   کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

شاہ ظفر کے زمانہ میں گرز کا نام اس وقت کے مستعملہ اسلحہ کی فہرست سے ہی کٹ چکا تھا۔ پھر اس کی تعریف غیر حقیقت پسندانہ اور بدمزہ قسم کی رسمیت پرستی کا مظاہرہ ہے۔ خاتمہ بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔

ہے ازل سے روائیٔ آغاز   ہو ابد تک رسائیٔ انجام

غالب کا چوتھا قصیدہ بھی اپنی لطیف تشبیب کی ندرت کے لحاظ سے اپنی مثل آپ ہے۔ اس میں بھی نادرہ کار تخیل کی اعجاز نمائیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ گریز بھی نہایت برجستہ اور برمحل ہے لیکن مقام مدح پر جاگیرداری کے خراب اثرات کا سایہ پورے طور سے پھیلا ہوا ہے۔ موجودہ مذاق اس منزل سے پیشانی پر شکنیں ڈالے بلا منہ بنائے بغیر نہیں گزر سکتا۔ اس قصیدے کی تشبیب کا رنگ ملاحظہ ہو۔

صبحدم دروازۂ خاور کھلا   مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں   شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود   صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو   موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر   اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا
تھی نظر بندی، کیا جب ردِّ سحر   بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

اب اسی جگہ سے گریز کی منزل کی طرف شاعر قدم بڑھا رہا ہے مگر کس لطف کے ساتھ ؂

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے   رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ   کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

یہیں سے پھر مدح شروع ہوجاتی ہے اور اس میں یہ مبالغے نظر آتے ہیں ؂

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے   رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں   مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے   عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

اس قسم کی مدحت آرائی کے بعد جو خاصی طولانی ہے بیچ میں

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۸۷ پر)

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

اترپردیش میں فنی تعلیم کی اعلیٰ پیمانہ پر توسیع ●●● مال گذاری کے تعین اور وصولی کے سدھار کی اسکیم ●●● ملیریا کی بیخ کنی کا پروگرام ●●● پانی اور نکاسی کی اسکیموں کے لئے ۲۹ لاکھ روپیہ ●●● کاغذ بنانے کے مرکز میں جدید ترین مشینیں ●●● منصوبہ کے لئے سرمایہ کی فراہمی میں عوام کا تعاون ●●● ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کے طلبا کو فنی تربیت کی سہولتیں ●●● خواتین کی بہبودی اسکیم میں توسیع ●●● بھیڑوں کی افزائش نسل اور اون کی ترقی ●●● دوسرے منصوبہ کے تحت طبی سہولتیں ●●● قومی توسیعی پروگرام کے لئے ۶۵۰ لاکھ روپیہ ●●● بھاری صنعتوں کے لئے ماسٹر پلان ●●● دوسرے منصوبہ کے تحت سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء کے لئے پچاس کرور روپیہ ●●● دیہی علاقوں میں ایک ہزار صنعتی امداد باہمی انجمنیں ●●● سال رواں میں ۳ بڑے خزانۂ آب

ریاستی حکومت نے اترپردیش میں مالی سال رواں میں صنعتی اور فنی تعلیم کی توسیع کے لئے ۲۰۱۳ کرور روپیہ کے ایک پروگرام پر عملدرآمد شروع کر دیا ہے۔

اس پروگرام کی خاص خاص باتوں میں آلہ آباد میں ایک منطقائی ڈگری انجینئرنگ کالج۔ کانپور۔ فیض آباد اور مرزاپور میں تین نئے ڈپلوما انسٹی ٹیوٹ کا قیام اور پانچ پالی ٹکنیک اسکولوں کو جونیئر ٹکنیکل اسکولوں میں تبدیل کرنا شامل ہے۔ علاوہ ازیں بڑے پیمانہ پر بہتر تربیتی سہولتوں کی فراہمی کے پیش نظر موجودہ فنی اور صنعتی اداروں کی نو تنظیم اور توسیع کی جائے گی۔

امید ہے کہ ان نئے اداروں کے قیام سے مزید ۰۰۰ جگہیں بڑھ جائیں گی جس سے حکومت کے زیر انتظام مختلف صنعتی اور فنی اداروں میں جگہوں کی تعداد مجموعی طور پر ۴۹۰۰ سے زیادہ ہو جائے گی۔ جس سے محکمہ صنعت اور محکمہ بجلی کے زیر انتظام اداروں میں جگہوں کی تعداد بڑھکر ۲۴۰۰ اور ۱۴۰۰ ہو جائے گی۔

تیسرے اور بعد کے پنجسالہ منصوبوں کے تحت مختلف ترقیاتی پروجکٹوں کے لئے فنی عملہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان اداروں کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔

اس پروگرام پر کل ۲۰۱۳ کرور روپیہ صرف کیا جائیگا جسمیں سے محکمہ صنعت ۹۹ لاکھ روپیہ اور محکمہ بجلی ۱۳۱ لاکھ روپیہ خرچ کرے گا۔

فی الحال ریاست میں تقریباً ۱۰۰ سرکاری اور حکومت سے مالی امداد پانے والے صنعتی اور فنی ادارے موجود ہیں جن میں سالانہ ۳۸۰۰ اشخاص کے داخلہ کی گنجائش ہے۔ ان اداروں میں سرٹیفکٹ سے لے کر پوسٹ گریجوٹ کے معیار تک کے مختلف انجینئرنگ کورسوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

الہ آباد میں منطقائی انجینئرنگ کالج فنی تعلیم کی کل ہند کونسل کے ایک پروگرام کے تحت قائم کیا جا رہا ہے جس کے تحت ملک میں ایسے ۹ کالجوں کے قیام کی تجویز ہے۔ اس کالج میں جہاں ۲۵۰ طلبا کے داخلہ کی گنجائش ہوگی سول میکینکل اور الکٹریکل انجینئرنگ میں ڈگری کورسوں کی تعلیم دی جائے گی۔

کانپور۔ فیض آباد اور مرزاپور میں قائم کئے جانے والے ڈپلوما انسٹی ٹیوٹوں میں جن کے قیام پر مجموعی طور پر ۶۷ء۹۹ لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا۔ جہاں سالانہ ۴۸۰ طلبا کا داخلہ کیا جائیگا۔ ان اداروں میں سول میکینکل۔ اور الکٹریکل انجینئرنگ میں ۳ سالہ ڈپلوما کورس کی تعلیم دی جائے گی۔ اس پروگرام کے تحت ایسے دو مزید

ادارے جن میں ۴۰ سے ۱۲۰ طلبا کے داخلہ کی گنجائش ہوگی اور جن کے قیام کے لئے گزشتہ سال منظوری مل چکی ہے جھانسی اور بریلی میں قائم کئے جا رہے ہیں۔

ریاست میں موجودہ ۱۰ سرکاری پالی ٹکنیک اداروں میں سے پانچ اداروں کو جونیر ٹکنیکل اسکولوں میں تبدیل کیا جائیگا تاکہ ۱۴ سے ۱۷ سال تک کی عمر کے لڑکوں کو مختلف انجینئرنگ پیشوں کی تربیت دی جا سکے۔ اس پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ عام تعلیم کے ساتھ ساتھ ۳ سال سے زائد مدت تک ٹکنیکل تعلیم دی جا سکے۔

تربیت پانے والے متعلقہ فنی پیشہ میں تربیت کے علاوہ عام مضامین میں ہائی اسکول کے معیار کی تعلیم حاصل کریں گے۔

مجوزہ جونیر ٹکنیکل اسکول الہ آباد۔ دورالا (میرٹھ) غازیپور۔ جھانسی۔ اور جونپور میں قائم کئے جائیں گے۔

تمام نئے اداروں کے قیام کے اخراجات کو مرکزی اور ریاستی حکومتیں برابر برابر برداشت کریں گی۔

اس پروگرام کی دوسری اسکیموں کے تحت موجودہ صنعتی اور فنی اداروں کی توسیع ۴ء۱۱ لاکھ روپیہ کے صرفے سے کی جائیگی۔ ہارکورٹ بٹلر ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور کی توسیع پر ۷ لاکھ روپیہ اور رڑکی یونیورسٹی پر ۶ لاکھ روپیہ انسٹی ٹیوٹ آف پرنٹنگ ٹیکنالوجی الہ آباد پر ۲۴ء۲ لاکھ روپیہ اور گورنمنٹ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ اور گورکھپور پر ۲۱ء۲ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا۔ اور ٹکنیکل تعلیم کے لئے سال رواں میں ۴ لاکھ روپیہ کے قرضے دے جائیں گے۔

فنی اداروں کے امتحانات کے انتظام کے لئے گزشتہ سال جو فنی تعلیم بورڈ قائم ہوا تھا وہ اپنا کام آئندہ سیشن سے شروع کر دیگا۔

کانپور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے قیام کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ یہ انسٹی ٹیوٹ جس پر ۵ کروڑ روپیہ صرف ہوگا حکومت ہند حکومت امریکہ کے اشتراک سے قائم کر رہی ہے۔

● ● ●

حکومت اترپردیش نے اس سال مالگزاری کے حصول کے سدھار کی اسکیم شروع کی ہے۔ اس اسکیم پر مکمل طور پر عملدرآمد ہونے پانے کے ذریعہ دو کروڑ روپیہ کی غیر متواتر رقم کے علاوہ ریاست کی مالگزاری کی آمدنی میں تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوگا۔

اس اسکیم کے تحت جس پر یکم اپریل سے عملدرآمد شروع ہوا ہے کاغذات آراضی کی غلطیوں اور جو چیزیں چھوٹ گئی ہیں انھیں درست کیا جائیگا تاکہ مالگزاری کے سلسلہ میں حکومت کو نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ اس اسکیم کے تحت کاغذات میں غلطیوں کو معلوم کرنے اور انھیں دور کرنے کے سلسلہ میں ضروری فارم اور تفصیلی طریقہ کار وضع کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ہر مرحلہ میں کام کی موثر نگرانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

اسکیم کے مطابق مالگزاری میں نقصانات کی اہم وجہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) باغات کے رجسٹر کے تمام اندراجات کا مکمل نہ ہونا اور مالگزاری سے مستثنیٰ باغات پر دوبارہ مالگزاری عائد نہ کرنا جن کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے۔

(۲) ایسے اشخاص جنھوں نے بارہ گنا لگان جمع کر کے بھومی دھری حقوق حاصل کر لئے ہیں اور جن کی مالگزاری پہلی قسط ادا کرنے کے بعد نصف کر دی گئی ہے اور جنھوں نے بقیہ قسطیں ادا نہیں کیں اور انکی سندیں یا تو منسوخ نہیں کی گئیں یا اگر منسوخ کی بھی گئیں تو بیشتر معاملات میں مطابق لگان نہیں عائد کیا گیا۔ چند مشترکہ جوتوں میں صرف ایک شریک دار کے پاس بھومی دھری کی سند ہے مگر غلطی سے پوری جوت کی مالگزاری نصف کر دی گئی ہے۔ سیر خود کاشت باغات و دوسری آراضی کے سلسلہ میں درمیانی اشخاص کے پاس جو زائد آراضی ہے اس کی حد بندی نہیں کی گئی ہے اور اس پر مالگزاری کا تعین نہیں کیا گیا ہے اور اس کا اندراج کھتونی میں نہیں ہے۔

(۳) قانون کے مطابق ۳۰ ایکڑ سے زیادہ آراضی اپنے قبضہ میں رکھنے والا ٹھیکیدار مستوجب بیدخلی ہے لیکن ریاست میں بڑی تعداد میں ایسے ٹھیکیدار موجود ہیں جن کے قبضہ میں مقررہ حد سے زیادہ آراضی ہے لیکن نہ تو انھیں بیدخل کیا گیا ہے اور نہ انھوں نے مالگزاری ادا کی۔

(۴) ایسی مرہونہ زمین کا مرتہن جو ۳۰ جون ۱۹۵۲ء کو اس کی نجی کاشت میں تھی ۵ سال کے اندر اس زمین کی موروثی شرح کے حساب سے ۵ گنا مالگزاری ادا کر کے اس کا سیردار بننے کا مستحق ہے۔ اگر ایسے مرتہن یہ مالگزاری نہیں ادا کرتے تو زمین بری تصور کی جاتی ہے اور مرتہن مستوجب بیدخلی ہو جاتا ہے۔ اور اگر بیدخلی کا مقدمہ دائر کرنے کی مقررہ میعاد ختم

ہو گئی ہے تو مرتہن مالگزاری ادا کرنے کا مستوجب ہو جاتا ہے ریاست میں بڑی تعداد میں ایسے مرتہن ہیں جن کی مالگزاری کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔

(۵) بہت سے ایسے اشخاص ہیں جو گاؤں سماج کی زمین پر بلا استحقاق قابض ہیں اور جو مقررہ قانونی میعاد کے اندر بیدخل نہیں کئے گئے ہیں بلکہ انھوں نے سیرداری کے حقوق حاصل کر لئے ہیں۔ ایسے اشخاص کی مالگزاری کا تعین خسرہ میں اندراج نہ ہونے کی وجہ سے نہیں کیا گیا

(۶) ادھی واسیوں کے صحیح طور پر درج رجسٹر نہ ہونے کی وجہ سے سیرداری حقوق حاصل ہونے کے بعد ان کی مالگزاری کا غلط تعین ہوا۔

● ● ●

ملیریا کی بیخ کنی پروگرام کے تحت اتر پردیش میں مزید ۲۷ واحدے قائم کئے گئے ہیں جس سے ریاست میں ۶۷ واحدوں کے قیام کا نشان پورا ہو گیا۔

یہ پروگرام گزشتہ سال شروع کیا گیا تھا جبکہ ریاست میں ۴۰ واحدے قائم کئے گئے تھے۔ ان ۴۰ واحدوں نے ڈی ڈی ٹی چھڑکنے کا کام گزشتہ یکم مئی سے شروع کر دیا ہے جو آئندہ ۱۵ جولائی تک جاری رہے گا۔

نئے ۲۷ واحدوں کا قیام ان علاقوں میں ہوا ہے جہاں ملیریا کا زور زیادہ نہیں ہوتا اور ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ ۱۵ جولائی اور ۳۱ اگست کی درمیانی مدت میں صرف ایک بار کیا جائے گا۔ ملیریا پھیلنے کی مدت عام طور پر سال میں دو بار ہوتی ہے یعنی برسات سے پہلے اور برسات کے بعد۔ ملیریا مادہ مچھر کے ذریعہ پھیلتا ہے۔ ایسے علاقوں میں جہاں ملیریا کا زور زیادہ ہوتا ہے موسم سرما میں بھی ملیریا پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے لہٰذا ایسے علاقوں میں سال میں تین بار ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ کرنا ہوگا۔ اتر پردیش میں ایسے علاقے بہرائچ۔ کھیری۔ نینی تال اور بجنور کے اضلاع میں واقع ہیں۔

اس پروگرام کا مقصد مادہ مچھروں کو ختم کرنا ہے۔ جو عام طور پر مکانوں کی دیواروں پر بیٹھتے ہیں انسانوں کا خون چوستے ہیں اور پھر دیواروں پر جا بیٹھتے ہیں اسی لئے پروگرام کے تحت دیواروں پر ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ چھڑکاؤ کا اثر تقریباً ۱۰ ہفتے رہتا ہے۔

یہ پروگرام اس مخصوص ملیریا کی بیخ کنی کے پروگرام سے مختلف ہے جس کے تحت پانی کی سطح پر مچھر کے انڈوں کو تباہ کیا جاتا ہے۔

بعض مغربی ممالک کے ماہرین کا خیال ہے کہ چھڑکاؤ کرنے کے کچھ

عرصہ بعد مچھروں میں ڈی ڈی ٹی کے خلاف قوت برداشت بڑھ جاتی ہے لیکن ملیریا پھیلانے والے مچھروں میں ایسی خصوصیت کا مشاہدہ نہیں ہوا ہے۔

گزشتہ سال ان ۴۰ واحدوں نے ۱۱،۱۵۷ دیہات میں چھڑکاؤ کیا اور اس سلسلہ میں مکانات مویشیوں کے باڑوں اور دیگر رہائش گاہوں کی تعداد ۱۴،۳۸،۷۴،۱۷ تھی۔

● ● ●

حکومت اتر پردیش نے ریاست کے ۱۶ میونسپل بورڈوں کو مالی سال ۱۹۵۹ء-۶۰ کے دوران میں پانی کی سپلائی اور نکاسی کی غیر مکمل اسکیموں پر عملدرآمد کے لئے ۲۹،۸۲ لاکھ روپیہ کے قرضے منظور کئے ہیں۔

آگرہ اور الٰہ آباد کے میونسپل بورڈ کو بالترتیب ۳،۵۰ لاکھ روپیہ اور دو لاکھ روپیہ دیا گیا ہے۔ بہرائچ۔ بارہ بنکی۔ بہیری۔ اٹاوہ۔ مہوبہ۔ کالپی۔ گولا گوکرن ناتھ۔ کھیری۔ شکوہ آباد۔ میرٹھ۔ چنار۔ بروت سلطانپور اور سیتا پور میں پانی کی سپلائی کی اسکیموں پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔

بہرائچ۔ بہیری۔ اٹاوہ۔ کالپی۔ گولا گوکرن ناتھ۔ میرٹھ۔ بروت چنار اور سلطانپور کے میونسپل بورڈوں کے لئے کل قرضہ کی یہ آخری قسط ہے جو ان بورڈوں کو دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت ملنا تھا۔

بارہ قصبوں یعنی بارہ بنکی۔ گونڈہ۔ رائے بریلی۔ سلطانپور۔ مہوبہ۔ بہیری۔ چنار۔ شکوہ آباد۔ بروت۔ نسیم پور کھیری۔ کالپی اور امروہہ میں مالی سال رواں کے دوران نئے واٹر ورکس تعمیر کئے جائیں گے۔ اور موا نہ میں ۲۰،۱۸ لاکھ روپیہ کی تخمینی لاگت سے پانی کی نکاسی کے لئے نئی نالیوں وغیرہ کی تعمیر کی جائے گی۔ جس سے ۱۹۵۹ء-۶۰ کے آخر تک شہری علاقوں میں واٹر ورکس کی تعداد ۷۳ سے بڑھ کر ۸۵ اور پانی کی نکاسی کی مکمل اسکیموں کی تعداد ۲۶ سے بڑھ کر ۲۷ ہو جائے گی۔

میونسپل بورڈ کو منظور شدہ قرضوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

آگرہ (۳،۵۰ لاکھ روپیہ)۔ الٰہ آباد (۲ لاکھ روپیہ)۔ بہرائچ (۸۹ ہزار روپیہ)۔ بارہ بنکی (۲ لاکھ روپیہ)۔ بہیری (۱،۱۸ لاکھ روپیہ)۔ اٹاوہ (۱ لاکھ روپیہ)۔ مہوبہ (۱ لاکھ روپیہ)۔ کالپی (۲،۵۲ لاکھ روپیہ)۔ گولا گوکرن ناتھ (۳ لاکھ روپیہ)۔ کھیری (۱،۹۱ لاکھ روپیہ)۔ شکوہ آباد (۲ لاکھ روپیہ)۔ میرٹھ (۲ لاکھ روپیہ)۔ بروت (۲،۹۶ لاکھ روپیہ)۔ چنار

(۶۹ ۲ء لاکھ روپیہ)۔ سلطانپور (۱ لاکھ روپیہ) اور سیتا پور (۱۷ ہزار روپیہ)۔

میونسپل بورڈوں سے قرضہ کی رقم ۳۰ برابر کی سالانہ قسطوں میں پانچ فیصدی سالانہ شرح سود کے ساتھ وصول کی جائے گی۔ قرضہ کی وصولی دوسرے پنجسالہ منصوبہ کی مدت میں منظور کئے گئے قرضہ کی آخری قسط کے ملنے کی تاریخ سے ایک سال بعد شروع ہوگی۔ تمام میونسپل بورڈ کو تمام قرضوں کی قسطوں پر ان کے ملنے کی تاریخ سے اس وقت تک سالانہ سادہ سود ادا کرنا ہوگا جب تک مساوی سالانہ قسطوں کی بنیاد پر قرضہ کی وصولی شروع نہ ہو جائے۔

میونسپل بورڈ قرضہ کی رقم اس مقصد کے لئے صرف کریں گے جس کے لئے یہ منظور کی گئی ہے۔

قرضہ کی رقم مارچ سنہ ۱۹۶۰ء کے آخر تک پورے طور پر خرچ ہو جانا چاہیے۔

● ● ●

ضلع جالون میں کالپی میں ہاتھ سے کاغذ بنانے کی صنعت کی ترقی کے لئے ریاستی حکومت کے اقدامات منفعت بخش ثابت ہو رہے ہیں ان مصنوعات کی مانگ میں اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ ریاستی حکومت نے ہاتھ سے کاغذ بنانے کے سرکاری مرکز کے شعبہ تحقیق اور تربیت میں توسیع کر کے بڑی مقدار میں عمدہ قسم کا گودا تیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں نئی عمارتیں تعمیر کرنے اور ۱۵،۳ لاکھ روپیہ کی لاگت سے کمیل عمل کے جدید ترین سازوسامان مہیا کرنے کی تجویز ہے جس کے ذریعہ روزانہ ڈھائی ٹن گودا تیار کیا جا سکے گا۔

کالپی میں ہاتھ سے کاغذ بنانے کی صنعت کے ذریعہ ریاست کے شکر کے کارخانوں اور چند کیمیکل فیکٹریوں کی فلٹر سے متعلق تقریباً تمام ضروریات پوری کی جا رہی ہیں جس سے کئی لاکھ روپیہ کی مالیت کے غیر ملکی تبادلہ زر کی بچت ہوتی ہے۔ یہ فلٹر پیپر درآمد شدہ فلٹر پیپر سے پانچ گنا سستا ہے۔

ہندوستان میں کالپی پہلا مقام ہے جہاں لفافوں کے لئے خاص قسم کا کاغذ تیار ہوتا ہے جس میں کپڑے کا جزو بھی ہوتا ہے۔ کالپی کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یو۔پی الہ آباد کے دفتر کی فائل اور جاذب وغیرہ کی ضروریات بازار کے نرخ کے مقابلہ میں کم نرخ پر پوری کی جاتی ہیں۔

کالپی میں اب نئے قسم کے کاغذ تیار ہونے لگے ہیں۔ اس صنعت کے ذریعہ ۱۵۰۰ مقامی دستکاروں کو مستقل روزگار فراہم ہونے کے علاوہ آس پاس کے مواضعات میں گودا سپلائی ہوگا جس سے مزید اشخاص کو روزگار مہیا ہوگا۔ کالپی میں ۲۰۰ کنبوں کی عورتوں کو کانپور کے دو ٹیکسٹائل ملوں کو پیکنگ کے کاغذ کی سپلائی کے ذریعہ تقریباً ۵۰ ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ یہ عورتیں کاغذ تیار کرنے کے لئے گودا خود ہی تیار کرتی ہیں۔ ایک غیر ہنرمند مزدور تقریباً ایک روپیہ اور ہنرمند مزدور تقریباً چار روپیہ یومیہ پیدا کرتا ہے۔

سرکاری پیداواری مرکز کے ذریعہ گودا سپلائی کرنے کے علاوہ دستکاروں کو تربیت اور فنی امداد بھی دی جاتی ہے۔ اس سال ۳۰ دستکاروں۔ چھ گریجویٹوں اور ۱۰ ماسٹروں کو تربیت دینے کی تجویز ہے۔

اس مرکز کو کھادی اور دیہی صنعت کمیشن کے ذریعہ مالی امداد ملتی ہے۔ اس وقت کمیشن کے ذریعہ کالپی کے مرکز سے روزانہ ۵۰۰ ریم کاغذ خریدا جا رہا ہے۔ کالپی کے مرکز کے علاوہ ریاست کے دوسرے حصوں میں ہاتھ سے کاغذ بنانے کے لئے امداد باہمی انجمنیں قائم کرنے کے لئے دستکاروں کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں گرور (المونڑہ) کالسی (دہرہ دون) رامپور۔ لکھنؤ۔ اور کرہ (الہ آباد) میں اس قسم کی امداد باہمی انجمنیں قائم کی گئی ہیں۔

● ● ●

اتر پردیش میں سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۵۸ء تک منصوبہ کے لئے سرمایہ کی فراہمی میں عوام کے تعاون کے ایک سرکاری جائزے کے مطابق ریاستی حکومت نے اس مدت میں تقریباً ۳۹۷،۱۲۶ لاکھ روپیہ قرضہ کے طور پر حاصل کیا۔ ان تمام قرضوں کے سلسلہ میں اس کے اجرا کے پہلے ہی دن مطلوبہ رقم سے زیادہ روپیہ حاصل ہوگیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام کو منصوبہ پر اعتماد ہے۔

جائزے میں مزید بتایا گیا ہے کہ دوسرے منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں مزید ۱۶ کرور روپیہ بطور قرضہ حاصل کرنے کی تجویز ہے۔

دیہی علاقوں کے لوگوں کی اقتصادی حالت اور اس امر کو مدنظر رکھتے

ہوئے کہ ایک گاؤں والا بینکوں کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں پس و پیش کرتا ہے، چھوٹی بچت مہم کی رفتار ترقی حیرت انگیز اور قابل تعریف رہی ہے۔ ۵۶-۱۹۵۵ء سے ۵۹-۱۹۵۸ء تک چھوٹی بچت میں جمع شدہ رقم میں سے ریاست کا حصہ ۲۰،۱ کروڑ روپیہ تھا۔ دوسرے منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں چھوٹی بچت کے ذریعہ ۲۳ کروڑ روپیہ جمع کرنے کی تجویز ہے۔

جائزے میں کہا گیا ہے کہ ۵۸-۱۹۵۷ء میں محنت، نقد اور جنس کی صورت میں جو شرم دان کیا گیا اس کی مالیت بالترتیب ۱۳۶،۱۹ لاکھ روپیہ اور ۱۰۰،۸ لاکھ روپیہ تھی۔

مفاد عامہ کے کاموں کے لئے عوام کے جوش و خروش کے اعتراف میں حکومت ۵۴-۱۹۵۳ء سے ۲ ہزار روپیہ فی ضلع کے حساب سے رقم منظور کرتی رہی ہے جو شرم دان مہم میں نمایاں ترین کارگزاری پیش کرنے والے گاؤں سبھا کو انعام کے طور پر دی جاتی ہے۔ اسی زمانہ سے ضلع کی سطح پر شرم دان کے کام کا جائزہ لینے کے لئے پانچ منطقائی کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں۔ مفاد عامہ کے کام کے اخراجات کے لئے ہر منطقہ میں بہترین کارگزاری پیش کرنے والے ضلع کو ۱۰ ہزار روپیہ انعام دیا جاتا ہے۔

جائزے میں مزید بتایا گیا ہے کہ سرمایہ۔ جدید ساز و سامان۔ غیر ملکی تبادلہ زر۔ فنی تربیت کی سہولتیں۔ سستی بجلی۔ کوئلہ اور لوہا کی کمی۔ بڑی خندک منصوبہ کے متعدد اسکیموں کی رفتار ترقی میں حائل ہونے کے علاوہ پرائیوٹ سیکٹر کی ترقی پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔

جائزے میں تحریک امداد باہمی کی رفتار ترقی پر اظہار اطمینان کیا گیا ہے۔ جوتوں کی چک بندی کو دیہی معاشیات کو بہتر بنانے کی جانب ایک اہم قدم قرار دیا گیا ہے۔

● ● ●

اتر پردیش میں فہرست مندرج اقوام۔ پسماندہ طبقوں اور سابق جرائم پیشہ قبائل کے طلبا کو موجودہ منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں فنی تربیت کی مزید سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ریاستی حکومت اس سلسلہ میں ، لاکھ روپیہ سے زیادہ رقم صرف کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔

بخشی کا تالاب لکھنؤ۔ گورکھپور اور نینی تال کے موجودہ فنی تربیتی مرکزوں کے علاوہ امید کی جاتی ہے مزید دو مرکز اس سال سے کام کرنے لگیں گے مالی سال رواں سے نینی تال کے مرکز میں الیکٹریشن اور میکینک کے کلاس شروع کرنے کی بھی تجویز ہے۔ ان مرکزوں کے لئے منصوبہ میں تقریباً تین لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے جس میں سے ۲،۶۲ لاکھ روپیہ دوسرے منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں صرف کیا جا چکا ہے۔

پسماندہ اقوام کے طلبا کو سہولتیں بہم پہونچانے کے مجوزہ پروگرام کے تحت ان کو ریاستی حکومت کے مختلف محکموں کے زیر انتظام چلائے جانے والے مختلف ٹکنیکل اداروں میں داخل کرنے کے انتظامات کئے جائیں گے۔ ایسے طلبا کو وظیفے اور مالی امداد دی جائے گی۔

موجودہ تربیتی مرکزوں میں طلبا کو سلائی۔ فٹنگ۔ بڑھئی کے کام کپڑے کی چھپائی۔ اور ٹیوب ویل وغیرہ کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان مرکزوں میں تربیت کی تکمیل کے بعد طلبا کو عملی تربیت کے لئے منظور شدہ کارگاہوں میں بھیجا جاتا ہے۔ ان تربیتی مرکزوں کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر سال ان مرکزوں میں بڑی تعداد میں طلبا تربیت حاصل کرتے ہیں سن ۵۸-۱۹۵۷ء میں ۱۴۱ تربیت پانے والوں کو ڈپلوما دئے گئے۔

بخشی کا تالاب کے تربیتی مرکز میں جنرل میکنک۔ موٹر میکنک بجلی کے کام۔ ڈھلائی۔ بڑھئی کے کام۔ دھات کے فنشنگ سلائی اور کپڑے کی چھپائی کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ تمام کورس دو سال کی مدت کے ہوتے ہیں اور ہر کورس میں سالانہ ۱۶ طلبا کا داخلہ ہوتا ہے۔

گورکھپور کا تربیتی مرکز ہریجنوں کو فنی تربیت دینے کے لئے شروع کیا گیا تھا۔ اس مرکز میں الیکٹریشن۔ ٹیوب ویل چلانے اور فٹر کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہر کورس میں جو ۲ سال کی مدت کا ہوتا ہے ۲۵ طلبا کا داخلہ کیا جاتا ہے۔ گزشتہ دو برسوں میں مختلف پیشوں میں تقریباً ۱۱۶ طلبا کو تربیت دی جا چکی ہے۔

سرکاری فنی تربیتی مرکز نینی تال میں اوور سیر کی تربیت کا انتظام کیا گیا ہے جہاں ۲۵ طلبا کا داخلہ کیا جاتا ہے۔ عارضی بورڈ کی سفارش پر اس مرکز کے کورس کی مدت ۲ سال تھی اب بڑھا کر ۳ سال کر دی گئی ہے۔

ان مرکزوں میں تربیت پانے والوں کو ۳۰ روپیہ ماہانہ سے لے کر ۳۵ روپیہ ماہانہ تک کے وظیفے دئے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں الکوہفت

قیام، طبی امداد، کھیل کود، ریڈنگ روم اور لائبریری وغیرہ کی بھی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔

ان تمام مرکزوں میں ۵۰ فیصدی فہرست مندرج اقوام، ۱۵ فیصدی پسماندہ طبقوں اور ۱۵ فیصدی دیگر اقوام کے طلبا کا داخلہ کیا جاتا ہے۔

● ● ●

مالی سال ۶۰-۱۹۵۹ء کے دوران میں دوسرے منصوبہ کے تحت اتر پردیش میں ۵۰ کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ جس میں سے اندھوں کے لئے ایک ادارہ کے قیام پر ۱۶۰ء۰ لاکھ روپیہ۔ خواتین کی بہبودی کی اسکیم کی مزید ۵ اضلاع میں توسیع پر ۷۵ء۱ لاکھ روپیہ۔ اور بہبودی کے توسیعی منصوبوں پر ۰۰ء۴ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ علاوہ ازیں ۹۵ء۰ لاکھ روپیہ کے تخمینی صرفہ سے ۲ محتاج خانہ تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ سماجی اور اخلاقی حفظان صحت اور بعد کی دیکھ بھال کی اسکیم پر ۳ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

گندی بستیوں کی صفائی کی اسکیم پر ۱۸ لاکھ روپیہ صرف ہونے کی امید ہے۔ صنعتی مزدوروں کے لئے مکانات کی تعمیر کی اسکیم کے لئے ۵۱ لاکھ روپیہ اور کم آمدنی والوں کے لئے تعمیر مکانات کی اسکیم کے لئے ۱۲۵ء۰۰ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ دیہی علاقوں میں مکانات کی تعمیر کی اسکیم پر ۰۴ء۱ لاکھ روپیہ اور چائے کے باغات کے مزدوروں کے لئے مکانات کی تعمیر کی اسکیم پر ۳۵ء۰ لاکھ روپیہ صرف گا۔

دیہی علاقوں میں ریڈیو سیٹوں کی فراہمی کی اسکیم پر کل ۸۵ء۶ لاکھ روپیہ اور مراکز اطلاعات پر ۵۵ء۱۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا لٹریچر کتابوں اور جریدوں کی اشاعت کے لئے ۴۳ء۳ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے اور کسان میلوں اور نمائشوں کے اخراجات کیلئے ۱۷ء۲ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

مزدوروں کی فلاح اور بہبود کی سرگرمیوں کی توسیع پر تخمیناً ۰۱ء۱۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ اور دستکاری مشینری کی توسیع کے لئے ۰۴ء۵ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

ہندوستان اور تبت کی سرحدی اسکیم کی توسیع کے لئے۔ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں میں دوسرے منصوبہ کے تحت ۶۰-۱۹۵۹ء کے دوران میں مویشیوں کی افزائش نسل پر ۶۳ء۱ لاکھ روپیہ بھیڑوں اور اون کے توسیعی مرکزوں پر ۳۲ء۱ لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک مویشی مارکیٹنگ سیکشن قائم کیا جائے گا جس پر ۲۲ء۰ لاکھ روپیہ صرف ہونے کا تخمینہ ہے۔

پولٹری ڈولپمنٹ اسکیم پر ۶۶ء۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا کلیدی دیہی اسکیم کے لئے ۶۶ء۱ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے اور گئوشالہ ترقیاتی اسکیم پر ۰۷ء۱ لاکھ روپیہ کی رقم صرف ہوگی۔

مویشیوں کے شفاخانوں کو صوبائی بنانے پر ۲۴ء۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ مذکورہ سال میں مویشیوں کی طفیلی بیماریوں کا اجتماعی طور پر علاج کرنے پر ۱۴ء۰ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا۔ متھرا میں مویشیوں کے تحقیقی مرکز کی توسیع پر ۱۲ء۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا ڈیری واحدوں کے تسلیمی اداروں کو منصوبہ کے تحت ۲۰ء۱ لاکھ روپیہ کی مالی امداد دی جائیگی۔ امداد باہمی ڈیری اور دودھ سپلائی اسکیم کے لئے ۶۶ء۱ لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔

ریاستی حکومت کی غذائی پیداوار کی مہم کے سلسلہ میں مالی سال ۶۰-۱۹۵۹ میں ۰۰ء۲ لاکھ روپیہ کی لاگت سے پانچ مچھلی مظاہرہ فارم جن کے ساتھ پرورش گاہیں ملحق ہوں گی قائم کرنے کی تجویز ہے۔ ماہی گیروں کی امداد باہمی انجمنوں کو ۸۰ء۰ لاکھ روپیہ کی مالی امداد دی جائے گی۔ مچھلی کی پرورش گاہوں کو بہتر بنانے کے لئے ۴۴ء۰ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ ترائی اسٹیٹ فارم میں مچھلیوں کی افزائش نسل پر ۲۰ء۱ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا۔

دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت ۶۰-۱۹۵۹ء میں جنگلات کی مختلف اسکیموں پر ۴۵ء۵ لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا۔ فارسٹرا ور فارسٹ گائیڈ کی تربیت پر ۹۰ء۱ لاکھ روپیہ اور جنگلی جانوروں کے تحفظ پر ۷۵ء۳ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ ان اسکیموں میں صنعتی اہمیت کے درخت لگانے کی اسکیم بھی شامل ہے جس پر ۳۷ء۲۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ اس کے علاوہ ۲۱ء۱۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے جنگلات میں رسل و رسائل کو ترقی دی جائے گی اور کمایوں کے درجہ اول جنگلات کی ترقی کے لئے ۲ لاکھ

روپیہ کی رقم صرف کی جائے گی۔

یو۔پی راجستھان سرحد پر اور کھادروں میں شجرکاری کی اسکیم کو بروئے کار لانے پر ۴۴،۵۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ لکھنؤ کے قریب رحمان کھیڑہ کے ریاستی مٹی کے تحفظ فارم میں ایک تربیتی مرکز قائم کیا جائے گا جس پر ۱۰،۰۷ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ زرعی اراضی کے تحفظ پر ۱۴،۵۰ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا۔ میرٹھ اور بلند شہر اضلاع میں گنگا اور جمنا کے آب گیر علاقوں میں شجرکاری پر ۳،۵۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ اسی طرح گڑھوال اور بجنور اضلاع میں گنگا اور اس کے معاونین کے آب گیر علاقوں میں بھی ایک لاکھ روپیہ کی لاگت سے درخت لگائے جائیں گے۔

• • •

مالی سال رواں کے لئے حکومت اترپردیش کے ۳۳۷،۵۲۶ لاکھ روپیہ کے منصوبہ میں دیگر اسکیموں کے علاوہ دیہی علاقوں میں طبی سہولتوں میں توسیع اور مہاتما گاندھی میموریل اینڈ اسوشی ایٹڈ اسپتال لکھنؤ میں سماجی اور انسدادی دوا کے شعبہ کے قیام کے لئے ۱۰،۰۱ لاکھ روپیہ کی مالی امداد دینے کی اسکیم شامل ہے۔ دوسرے منصوبہ کے چوتھے سال کے دوران میں ریاست میں کل ۵۰ کرور روپیہ صرف ہوگا۔

آگرہ میڈیکل کالج کو ۶،۸۳۴ لاکھ روپیہ کی امداد دی جائے گی۔ اس سلسلہ میں ریاستی حکومت ۳،۸۳۴ لاکھ روپیہ اور مرکزی حکومت ۳ لاکھ روپیہ مالی امداد کے طور پر دے گی۔

میڈیکل کالجوں میں پورے وقت کے تعلیمی واحدوں کو مجموعی طور پر ۵ لاکھ روپیہ کی مالی امداد دی جائے گی۔ میڈیکل کالج کے چند شعبوں کا درجہ بلند کرنے کے لئے ۱۰،۶۳ لاکھ روپیہ اور دائیوں کو تربیت دینے کے لئے ۱،۴۰ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اور تپ دق کے مریضوں کی بعد کی دیکھ بھال اور بحالی کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

ملیریا کی روک تھام کے اقدامات پر ۱۹،۱۸ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ اور ابتدائی صحتی واحدوں اور کنبہ منصوبہ بندی پر ۹۱،۴۴ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

ڈنٹل کالج لکھنؤ کی توسیع پر ۱۲۷،۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

لکھنؤ میڈیکل کالج میں بچوں کی رہنمائی کے لئے کلینک اور دماغی امراض کے معالجہ کے شعبہ کے قیام کی تجویز ہے جس پر ۰،۲۵ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ ریاستی آیورویدک کالج لکھنؤ کی توسیع پر ۳،۸۸۶ لاکھ روپیہ اور لکھنؤ میں ۶۰ پلنگوں پر مشتمل ایک ہومیوپیتھک کالج کے قیام پر تقریباً ۲ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ کوڑھ کی روک تھام کے لئے تقریباً ۱۱،۲۷ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے ۵ مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اور راجہ کالی شنکر گوشالہ کوڑھ گھر واقع وارانسی کو ۲،۶۹۰ لاکھ روپیہ کے تخمینی صرفہ سے صوبائی بنایا جائے گا۔

مالی سال رواں میں پانی کی سپلائی اور شہری دیہی علاقوں میں صفائی کے انتظام کی اسکیموں پر عملدرآمد ہوگا۔ جن کے لئے مرکزی حکومت ۶۵ لاکھ روپیہ قرضہ کے طور پر دے گی۔

• • •

ریاستی حکومت کے ۶۵۰،۷۱ لاکھ روپیہ کے قومی توسیعی پروگرام پر عملدرآمد سے سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء کے دوران میں قومی توسیعی اور اجتماعی پروگرام کے ایک اور مرحلہ کی تکمیل ہوگی۔ دوسرے منصوبہ کے تحت ریاستی حکومت سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء کے دوران میں مجموعی طور پر ۵۰ کرور روپیہ صرف کریگی۔

مرکزی حکومت اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے سلسلہ میں ۴۹۳،۲۸ لاکھ روپیہ دے گی جس میں سے ۲۱۱،۴۶ لاکھ روپیہ قرضہ اور ۲۸۱،۸۲ لاکھ روپیہ مالی امداد کے طور پر ہوگا۔

رہاند بند منصوبہ پر ۶۰۰ لاکھ روپیہ۔ ماتاٹیلہ بند کے دوسرے مرحلہ پر ۶۰ لاکھ روپیہ اور رام گنگا ندی منصوبہ پر ۳۰۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

آبپاشی کی نامکمل اسکیموں یعنی چندرپربھا بند۔ نوگڑھ بند۔ اور شاردا ساگر مرحلہ اول کے لئے بالترتیب ۲۶،۸۵ لاکھ۔ ۱۶،۶۱ لاکھ اور ۲۵،۴۹ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا ہے۔

سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء کے دوران میں جن اسکیموں پر عملدرآمد ہوگا ان میں جرگو خزانۂ آب۔ نانک ساگر۔ تریا خزانۂ آب۔ اور کمایوں پمپ نہر کی اسکیمیں شامل ہیں جن کے لئے بالترتیب ۳۰ لاکھ۔ ۱۲۵ لاکھ۔ ۲۰ لاکھ اور ۱۱،۴۲ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا ہے۔

مئو۔ سہاول اور گورکھپور کے بجلی گھروں کی پیداواری صلاحیت بڑھانے پر ۲۰،۰۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ کھٹیما ہائیڈل پاور اسٹیشن کے

لئے ۱۰ لاکھ روپیہ اور ستپھری ہائیڈل پاور اسٹیشن کے لئے ۷ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اور گنگا ٹرانسمیشن لائنز کے چوتھے مرحلہ کی تکمیل کے لئے ۵۰ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ دوسرے منصوبہ کے دوران میں ریاست میں ٹیوب ویلوں کو بجلی کی فراہمی پر ۹۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ اور ۱۰ لاکھ روپیہ کے تخمینی صرفہ سے ۳۸ قصبوں کو بجلی فراہم کی جائے گی۔

سرکاری سیمنٹ فیکٹری چوک مرزاپور میں ۷۶ لاکھ روپیہ کے تخمینی صرفہ سے توسیع کی جائے گی اور امداد باہمی شکر کے کارخانوں کو ریاستی حکومت کی جانب سے مالی امداد دینے کے لئے ۵ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے اور معدنیات کی ترقی کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

ہتہ کرگھا اسکیموں کے لئے ۴۰ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مرکزی حکومت تقریباً ۸ لاکھ روپیہ قرضہ اور ۳۲ لاکھ روپیہ مالی امداد کے طور پر دے گی۔

ریاست کے پس ماندہ اور نیم ترقی یافتہ علاقوں میں گھریلو صنعتوں کے فروغ کے لئے ۹۸ء۱۰ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے اور آگرہ اور کانپور میں صنعتی ریاستوں کے قیام کے لئے ۲۷ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا ہے۔

گورکھپور میں زیر نظر مدت کے دوران میں گنے اور انس کی صنعت کی ترقی کے لئے نئی اسکیمیں شروع کرنے کی تجویز ہے جن پر ۱۱۶۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا اور دستکاریوں کے لئے صنعتی امداد باہمی انجمنوں کے قیام پر ۴۰ء۱۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

● ● ●

اترپردیش میں بھاری صنعتوں کی ترقی کی جانب اولین اقدام کے طور پر ریاستی حکومت کی مقرر کردہ ۱۶ ممبروں پر مشتمل بھاری صنعت ننصوبہ کمیٹی ایک ماسٹر پلان مرتب کر رہی ہے۔ اس کمیٹی نے جس کے چیرمین محکمہ صنعت کے سکریٹری شری ایس۔ ایل ککڑ ہیں اپنے ایک جلسہ میں نئی صنعتیں قائم کرنے یا موجودہ صنعتوں میں پیداوار کے اضافہ کے لئے نئے طریقوں کو اپنانے کے لئے منصوبوں کے وضع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ماسٹر پلان میں آیندہ ۱۵ برسوں کے دوران میں ریاست میں پبلک اور پرائیوٹ سیکٹروں میں بڑی اور درمیانی صنعتیں قائم کرنے کی تجاویز شامل ہوں گی۔

کمیٹی مصنوعات کی درآمد پر ریاست کے انحصار اور خام مال کی دستیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف پروجکٹوں کا مطالعہ کرے گی۔ ماسٹر پلان کا مقصد ریاست میں خام مال صنعتی ساز و سامان اور دستیاب مادی وسائل کو پورے طور پر بروئے کار لانا ہوگا۔ ماسٹر پلان میں جن پروجکٹوں کو اولیت دی جائے گی ان کو ریاست کے تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں شامل کیا جائے گا۔

پروجکٹوں پر عملدرآمد کے سلسلہ میں کچھ پروجکٹوں پر پرائیوٹ سیکٹر اور دیگر پروجکٹوں پر مرکزی حکومت کے ذریعہ عملدرآمد ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں ریاست میں بھاری صنعت کارپوریشن قائم کرنے کی تجویز ہے۔

کمیٹی کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے شری ککڑ نے اس امر پر زور دیا کہ ریاست میں تیز تر صنعت کاری کے لئے ریاست کے فنی۔ سائنسی۔ مالی۔ معدنیاتی اور دیگر وسائل کو یکجا کرنا چاہئیے۔ انھوں نے کہا کہ بھاری اور درمیانی صنعتیں مختلف وسائل کو کام میں لانے اور روزگار کے مواقع میں اضافہ کا اہم ذریعہ ہیں۔

کاغذ کی صنعت کی ترقی کے لئے کام کرنے والے گروپ کے کنوینر حکومت اترپردیش کے انڈسٹریل کیمسٹ ڈاکٹر جے۔ بی لال۔ پلاسٹک اور متعلقہ صنعتوں کے گروپ کے کنوینر گورنمنٹ سنیٹرل ٹیکسٹائل انسٹی ٹیوٹ کانپور کے پرنسپل ڈاکٹر ای۔ ڈی۔ دارو والا ہیں۔ علاوہ ازیں کیمیاوی کھاد۔ دوا سازی۔ غذا اور متعلقہ صنعتوں۔ الیکٹریکل انجینئرنگ معدنیات اور چمڑا وغیرہ اور متعلقہ صنعتوں وغیرہ کے لئے بھی کام کرنے والے گروپ ہیں۔

● ● ●

ریاست کے دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت ۱۹۵۹-۶۰ء کے لئے ۵۰ء کرور روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے جس میں سے ۵۰ء۲۶ کرور روپیہ مرکزی حکومت مالی امداد کے طور پر دے گی اور باقی ۵۰ء۲۳ کرور روپیہ ریاستی حکومت اپنے وسائل سے صرف کرے گی۔

۱۹۵۹-۶۰ء میں زراعت پر جس میں چھوٹے پیمانہ پر آبپاشی اور

ترقی آراضی شامل ہے ۲۰،۰۵ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا۔ مرکزی حکومت کی امداد کا تخمینہ ۳۳۱،۰۵ لاکھ روپیہ ہے۔ گلائی کے ذریعہ کنووں کو بہتر بنانے پر ۸ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ رہٹ لگانے پر بھی ۸۰ لاکھ روپیہ کی رقم صرف کی جائے گی۔ نجی نل کنوؤں کی گلائی کے لئے ۲۵ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا ہے۔ پمپنگ سیٹ لگانے کیلئے ۱۰ لاکھ روپیہ کی رقم الاٹ کی گئی ہے۔ بندیلکھنڈ کے اضلاع میں بندھیوں کی تعمیر پر ۱۰،۰۵ لاکھ روپیہ اور پرانی بندھیوں کی مرمت پر ۲،۵۰ لاکھ روپیہ صرف کرنے کا تخمینہ ہے۔

لکھنؤ کے نزدیک بخشی کا تالاب میں کھال اتارنے کے کام میں توسیع پر ۱،۹۳ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا۔ بیل روگ کی ویکسین تیار کرنے کے لئے ۲،۲۰ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

اترپردیش کے میدانی علاقوں میں چھوٹے پیمانہ پر آبپاشی کی اسکیموں پر ۹۱،۰۳ لاکھ روپیہ اور اخراج آب کے ذرائع کو بہتر بنانے پر ۲۵،۰۴ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا۔

مذکورہ سال میں پہلی کیبنٹ نو آبادیاتی اسکیم پر ۱۶،۰۰۸ لاکھ روپیہ صرف کرنے کا تخمینہ ہے۔ اس سلسلہ میں مرکزی حکومت کی جانب سے ۱۱،۰۵ لاکھ روپیہ کی مالی امداد ملنے کی امید ہے۔ اس کے علاوہ تیری نو آبادیاتی اسکیم پر ۳،۹۲ لاکھ روپیہ صرف ہو گا۔ گنگا کھادر میرٹھ اور افضل گڑھ آبادیوں میں زمین کو قابل کاشت بنانے کے لئے ۱۰،۰ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ ترقی آراضی اور چک بندی کے سلسلہ میں ۱۶۰ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا جس میں سے ۴۰ لاکھ روپیہ کی مالی امداد مرکزی حکومت سے ملنے کی امید ہے۔

بہتر بیجوں کے پیدا کرنے، جمع کرنے اور تقسیم کرنے پر مذکورہ سال میں ۹۳،۰۵ لاکھ روپیہ صرف ہونے کا تخمینہ ہے۔ ہری کھاد کی فصلوں پر ۰،۹ لاکھ روپیہ صرف ہو گا۔ اسی طرح گیہوں اور دھان کی بہتر کاشت سے متعلق مہم پر ۱۱،۰۵ لاکھ روپیہ صرف کرنے کی تجویز ہے۔

مشرقی اضلاع میں زرعی پیداوار سے متعلق ایک مخصوص اسکیم پر ۹،۰۵ لاکھ روپیہ صرف کیا جائیگا۔

رودرپور زراعت یونیورسٹی کے قیام کے لئے ۳۳۱،۰ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

☆

غالب کے اُردو قصیدے

(بسلسلہ صفحہ ۳۸)

ایک غزل بھی ہے جس کا لہجہ اس قصیدے سے ہم آہنگ ہے۔ غزل کے بعض اشعار بڑے دل آویز ہیں مثلاً

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے　　یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

مندرجہ ذیل دعا پر قصیدے کا اختتام ہوا ہے ؎

تم کرو صاحب قرانی جب تلک　　ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

غالب کے ان اردو قصیدوں پر جو اجمالی نظر کی گئی ہے اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگرچہ غالب کے نتائج فکر اس صنف میں بہت کم ہیں لیکن بڑے سے بڑا ناقد بھی انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ تخیل کی گلکاری نے ان قصیدوں کی زمین میں جو بہار آفرینی کی ہے وہ شاعری کی جان ہے۔ اگر مدح بھی اسی رنگ و مزاج کی ہوتی تو پھر غالب کے یہ دونوں قصیدے شاعری کے خیرہ کن آیات کمال میں سے شمار کئے جاتے لیکن دقت یہ تھی کہ غالب کا ممدوح اس پایہ کا تھا ہی نہیں کہ وہ مدح کے اس زور دار لنگر کو سنبھال سکتا لہذا مدح کا یہ لباس اس پر زیب نہیں دیتا ایسی صورت میں قصیدہ نگاروں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ بزرگان دین ہی کو مدح و ثنا کا موضوع بنائیں۔ اس میں اگر ذرا سلیقہ سے کام لیا جائے تو مدح کا چہرہ بگڑ نہیں سکتا اور دوسروں کو اس پر منہ بنانے کا موقع بھی نہیں مل سکتا۔

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۴

آشاڑھ ۱۸۸۱
جولائی ۱۹۵۹ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ
گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات اترپردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

دوسرے پنج سالہ منصوبہ کی مدت ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء کو ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی اسکیموں پر عملدرآمد شروع ہوگا۔ مرکز اور ریاستوں میں اس تیسرے منصوبہ کے خاکے بننے لگے ہیں۔ حکومت اتر پردیش نے بھی ہر شعبہ میں منصوبہ کے خاکے بنانے کے لئے مختلف ورکنگ گروپوں کی تشکیل شروع کر دی ہے۔ ان گروپوں میں سرکاری حکام کے علاوہ غیر سرکاری ماہرین کو بھی شامل کیا جا رہا ہے یہ ورکنگ گروپ منصوبہ بندی کے ہر پہلو پر غور کریں گے اور اپنے مرتب کئے ہوئے خاکے حکومت کے سامنے جلد ہی پیش کرینگے۔

اتر پردیش میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنے کی غرض سے جولائی ۱۹۵۹ء سے ایک اسکیم پر عملدرآمد شروع ہو جائے گا۔ اس اسکیم کو بروئے کار لانے میں تقریباً ایک کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہو کہ دوسرے منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں دو ٹیچر والے ۳۲۲۸ اسکول قائم کئے جائیں اور اس طرح تقریباً ۶۰۰۰ تعلیم یافتہ اشخاص کو روزگار فراہم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں تجویز یہ ہے کہ اسکول ایسے مواضعات میں کھولے جائیں جہاں کے باشندے اسکول بنانے کے لئے زمین دیں اور اس امر کا یقین دلائیں کہ وہ اپنے وسائل سے اسکول کی عمارت بھی تعمیر کرا دیں گے۔

اتر پردیش کے متعدد اضلاع میں برسات کے زمانہ میں سیلاب آجاتا ہے۔ حکومت سیلاب کی روک تھام کے لئے ہر سال حتی الامکان ذرائع استعمال کرتی ہے اور سیلاب زدگان کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچاتی ہے۔ اس سال حکومت نے پردیش کے ۴۴ اضلاع کیلئے ۳ لاکھ ۴۰ ہزار روپیہ کی رقم منظور کی ہے اور اس سلسلہ میں ہر متعلقہ ضلع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دس ہزار روپیہ دیا ہے۔ حکومت نے ان اضلاع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ایک گشتی حکم نامہ بھی بھیجا ہے جس میں منجملہ دوسری ہدایتوں کے انھیں یہ ہدایت کی گئی ہو کہ وہ برسات شروع ہونے سے پہلے ہی سیلاب کی روک تھام اور سیلاب سے تحفظ کے تمام انتظامات مکمل کرلیں اور جہاں سیلاب آجائے وہاں بغیر کسی تاخیر کے امدادی کارروائی شروع کر دی جائے۔

"نیا دور" کا آئندہ شمارہ جو اگست میں شائع ہوگا، اسپیشل نمبر ہوگا۔ ہمیں امید ہو کہ حسب سابق اس نمبر میں ملک کے متعدد مشاہیر اردو کے مقالات اور نظمیں شامل ہوں گی۔ یہ نمبر حسب معمول "نیا دور" کی معمولی اشاعتوں سے زیادہ ضخیم ہوگا۔

"نیا دور" کی مئی کی اشاعت میں شارب ردولوی صاحب کا ایک مضمون اردو مرثیہ پر شائع ہوا تھا جس میں شارب صاحب نے نصیر الدین ہاشمی صاحب کی کتاب "دکن میں اردو" کے چوتھے اڈیشن کا حوالہ دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وجہی کے مقابلہ میں "... ہاشمی صاحب کا شیخ اشرف کو پہلا مرثیہ گو لکھنا غلط ہو جاتا ہے"۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اس سلسلہ میں لکھا ہے :- "قدیم ادب کی تحقیق کوئی ریاضی کا مسئلہ نہیں ہوتا جو ایک مرتبہ دریافت کے بعد بدلنا ناممکن ہے جیسے جیسے قدیم کتابیں ہمدست ہوتی ہیں نظریے بدل جاتے ہیں۔ جس وقت میری کتاب "دکن میں اردو" کا تیسرا اڈیشن شائع ہوا۔ اس وقت وجہی کا مرثیہ ہمدست ہو چکا تھا کیونکہ وجہی محمد قلی قطب شاہ کے پہلے اپنی مثنوی قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) میں لکھ رہے تھے اس لئے اس کو پہلا مرثیہ گو قرار دیا گیا ہے۔ جب دکن میں اردو کا چوتھا اڈیشن شائع ہوا تو اس وقت اشرف کی مثنوی "نوسرہار" ہمدست ہو گئی تھی اور یہ مثنوی جو شہادت نامہ ہے ۹۰۹ھ یعنی وجہی سے سو سال پہلے کی تصنیف ہے اس لئے اشرف کو پہلا دکنی مرثیہ گو قرار دیا گیا ہے۔

اشرف کو زیادہ تر احمد نگری نظام شاہی سلطنت سے تعلق رہا اور ۹۰۹ھ میں احمد نگری نظام شاہی سلطنت کا آخری زمانہ ہے اس کی صراحت "دکن میں اردو" میں کی گئی ہے اس سے واضح ہوگا کہ میرے بیان میں کوئی تناقص نہیں ہے۔"

ایڈیٹر

نوبہار یعنی قصّہ گل وصنوبر از مینی نارائن جہاں

قاضی عبدالودود

آنند رام مخلص کی مراۃ الاصطلاح (نسخۂ خدابخش) میں جو بارھویں صدی ہجری کے اواسط کی تالیف ہے "گل باصنوبر چہ کرد" کے تحت عبارت ذیل ملتی ہے :-

"گل[1] نام بادشاہزادہ بود کہ عاشق صنوبر معشوقہ بودہ وایں افسانۂ رنگین مشہور است کہ قصّہ پردازاں . . . میدانند . شاید کہ یکے از آں شعرا موزوں ہم کردہ وآنچہ در نثر نوشتہ بمطالعۂ راقم حروف نیز رسیدہ . بہر تقدیر سائر صفاہانی گوید . . .

زنام عشق و عاشق ایں زمانت ننگ می آید

بہ لب افسانۂ گل با صنوبر خواہمت دیدن"

فارسی قصّہ نثر میں ہو یا نظم میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ متیقن ہے کہ پرانا قصّہ نہیں اور گیارھویں صدی ہجری سے پیشتر اس کا وجود نہ تھا۔ اردو میں غالباً سب سے قدیم ترجمہ باسط خاں کا ہے (دیباچۂ نوبہار) مگر مجھے اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جہاں[2] کا نوبہار سنہ ۱۲۴۰ھ میں لکھا گیا تھا (دیباچہ)' اس کے بعد نیم چند کھتری نے غالباً سنہ ۱۸۳۶ء کے لگ بھگ تیسرا ترجمہ کیا' اور یہ چھپ بھی گیا ہے۔ اس کا قدیم ترین نسخہ جو میری نظر سے گزرا ہے اسی سن میں طبع ہوا تھا۔ یہ کتبخانۂ خدابخش میں موجود ہے۔ کنھیا لال عاشق نے اسے نظم بھی کیا تھا۔ "اس کا نام "باغ عاشق" ہے اور سنہ ۱۸۶۱ء کا مطبوعہ نسخہ میں نے دیکھا ہے۔ اردو میں قصّہ اور لوگوں نے بھی لکھا ہو تو عجب نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اس نام سے ایک بالکل مختلف داستان بھی ہے۔

"نوبہار" بہت کمیاب ہے اور اس کا واحد نسخہ جو میری نظر سے گزرا ہے' حکیم سید محمد تقی حسن بلخی صاحب متوطن فتوحہ ضلع پٹنہ کی ملک ہے اور فی الحال ادارۂ تحقیقات اردو کی ادبی نمائش کے لئے مستعار آیا ہوا ہے۔ اس کا صفحہ ۱ سادہ ہے اور صفحہ ۲ میں بعد بسم اللہ الخ ۸ سطریں ہیں۔ سطر اوّل یہ ہے : "خداوندا وہ دل دے مجھ کو پرجوش کروں میں"۔ سطر ۲ میں شعر کا باقی حصّہ "اپنے تئیں آپ ہی فراموش"۔ مسطر ۱۱ سطری ہے اور کتاب ص ۲۱۳ کے آخر میں تمام ہو گئی ہے۔ کتاب کے بعد اسی صفحہ میں یہ الفاظ ہیں "تمام شد قصّۂ گل وصنوبر" اور ص ۲۱۴ میں یہ عبارت ہے "در شہر کلکتہ بتاریخ شانزدہم ماہ چیت سنہ ۱۲۳۱ بنگلہ۔ الراقم مصنف مینی نارائن دہلوی" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب مینی نارائن ہی ہے' لیکن جا بجا املا غلط ہے' اور یہ ناممکن نہیں کہ مینی نارائن کے لکھے ہوئے نسخہ سے کسی اور نے نقل کی ہو اور

---

[1] گل معشوقہ تھی اور صنوبر عاشق۔ ان دونوں کا حال قصّہ میں ضمناً آیا ہے' اصل داستان اور ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر گیان چند نے اس قصے سے بحث کی ہو' مگر ان کی کتاب اس وقت پیش نظر نہیں۔ [2] تخلص "نوبہار" میں نہیں ہے۔

اس کے آخر میں جو عبارت تھی وہ بھی بجنسہ تحریر کر دی ہو۔ بہر حال دیباچہ کی عبارات ذیل ملاحظہ ہوں:

"پیغمبر آخر الزماں کو ہم گمراہوں کی رہنمائی کے لیے یہ ... زمین پر آشکار کیا اور آیہ لولاک لما خلقت الافلاک اسی کی شان پاک میں نازل فرمایا۔ اب سب مسلمانوں کو لازم ہے کہ سر اس کی اطاعت و فرمانبرداری سے نہ پھیریں۔

سبب تالیف اس قصۂ دلچسپ کا یوں ہے:

کہوں اب میں ظاہر اپنا احوال	مجھے غم نے کیا از بس کہ پامال
رہا ہندوستاں میں با دل شاد	بفضل حق تھا گھر میرا بھی آباد
حسد پر سپہر جو آیا یکایک	تو جوں خورشید دل میرا گیا پک
جو گردش نے مجھے وال سے اٹھایا	نصیبوں نے یہ کلکتہ دکھایا
ہوئی آنکھوں پہ فکر خور و نوش	ہمیشہ غم سے رہتا تھا ہم آغوش

جس میں کہ نواب مستطاب مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل ہندوستان سے سعادت فرما کر کلکتے "(کذا)" میں داخل ہوئے، برادر صاحب و قبلہ خداوند رائے کھیم نارائن بعہدۂ وکالت وزیر اعظم ہندوستان نواب سعادت علی خاں بہادر مرحوم کے ہمراہ رکاب جناب گورنر بہادر کے تشریف لائے تھے۔ یہ خاکسار بھی بھائی صاحب کے رکاب سعادت میں حاضر تھا۔ نام اس عاجز کا بینی نارائن کہتے ہیں۔ سن ۱۲۲۵ ہجری عہد دولت میں لارڈ منٹو کے ایک قصۂ رنگین و دلچسپ عبارت نظم و نثر زبان اردوئے معلیٰ میں تصنیف کرکے چار گلشن نام رکھا اور وسیلے سے کپتان ٹیلر دام اقبالہٗ کے حضور میں صاحبان کونسل کے گزرانا۔ وہ پسند خاطر صاحبان کونسل کے پڑا۔ بعد اس کے قصۂ دلآرام کو ... تصنیف کرکے شہر میں رواج دیا اور نام اس کا بہار عشق رکھا۔ پس بعد قصۂ یوسف زلیخا جو اوّل فارسی میں ہے اور کسی شخص نے ہندی میں بھی ترجمہ کیا ہے، عبارت اس کی مغلق (مغلق) و بے محاورہ تھی، اس سبب سے کسی نے پسند نہ کیا، سو اس ہیچمداں نے اس کو بھی نظم و نثر کا زیور پہنا کر زبان اردوئے معلیٰ میں تصنیف کیا اور نام اس کا گلزار حسن رکھ کر شہر میں رواج دیا۔ پس پیچھے بموجب فرمائش ... کپتان تھامس رئبک مرحوم کے اشعار شعرائے متقدمین و متاخرین کے جمع کیے اور دیوان جہاں نام رکھ کر دستگیری سے صاحب ممدوح کی حضور میں صاحبان کونسل کو گزرانا اور عنایت صلہ سے بھی سرفراز ہوا۔ اس کے بعد کتنی نقلیں ہندی کی جمع کیں اور بقیہ دیباچہ درست کرکے تفریح طبع نام رکھا۔ نقلیں اس کی جا بجا پہنچ گئیں۔ بالفعل کہ اب سنہ ۱۲۳۰ھ اور سنہ ۱۸۲۴ء میں، عہد دولت میں لارڈ امہرسٹ صاحب بہادر کے ایک دن منشی امام بخش کہ مدت کے عرصہ سے اس خاکسار کے ساتھ رابطۂ محبت دلی کا رکھتے ہیں، فرمانے لگے کہ سابق میں قصۂ گل و صنوبر کو منشی باسط خاں نے تصنیف کیا تھا۔ ظاہرا نامربوطی اور بے محاورگی الفاظ کے باعث صاحبان کالج کونسل کی نظر مبارک میں پسند نہ پڑا بلکہ انھیں کو واپس ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ اس زمانے میں مدرسۂ کمپنی انگریز بہادر یعنی کالج دارالضرب عالموں اور فاضلوں کا ہے۔ جو کتاب کہ وہاں کے صاحبوں کی پسند نہ پڑے، ورنا منظور ہو کر نکالی جائے، پھر اسے کون پوچھتا ہے؟ تم کو حق تعالیٰ نے طبع تند اور ذہن رسا عطا فرمایا ہے اور کئی ایک کتابیں تیری شہر میں مشہور ہوئی ہیں، بلکہ بہت لوگ خوش ہو کر بطریق تحفہ ملک بملک لے گئے، اب تجھ کو لازم ہے کہ اس قصۂ رنگین کو نثر و نظم سے آراستہ کرکے کانوں کو زیب و زینت بخشو (کذا)۔ ہر چند کہ یہ ہیچمداں اتنا شعور نہیں رکھتا

---

۲ بینی نارائن نے کامل طور پر مسلمانوں کا نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہے اور دتاسی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا لیکن مجھے یہ تسلیم نہیں۔ تبدیلیٔ مذہب ہوئی ہوتی تو اسلامی نام بھی ہوتا

۴۔ سفینۂ ہندی تذکرۂ فارسی گویاں (سال اتمام ۱۲۱۹ھ) میں مرقوم ہے: رائے کھیم نرائن از جد کلانش مہاراجہ کچھمی نرائن ... خود غلی در سرکار ... آصف الدولہ ... ماہانہ پانصد روپیہ ممتاز بودہ از چندے بکلکتہ رفتہ ... اردو میں کہتے تھے

صاحبان فارسی اور اردو ادب کی کتاب چھپ گئی ہے۔

۷۔ اس میں شعرا کے حالات بھی ہیں مگر بہت مختصر کلیم الدین احمد صاحب اسے شائع کر رہے ہیں۔

۸۔ پہلے جس کونسل کا ذکر آیا ہے کیا وہ بھی یہی ہے یا گورنر جنرل کی کونسل؟

لیکن بقول حضرت مصلح (کذا) الدین سعدی شیرازی کے کہ آزردہ کردن دلہا دیوانہ کا عمل ہے اور کفارہ دینا قول کا (کذا)، آسان اس بات کو بہ پاس خاطر منشی صاحب ممدوح کے قبول کیا اور دو ہفتے کے عرصے میں تمام قصۂ گل و صنوبر کو کتاب فارسی سے ترجمہ کیا۔"

آخر میں یہ عبارت نثر اور اس کے بعد دو شعر ہیں: "اس کہانی میں جو صنوبر شاہ اور گل بادشاہزادی کا ذکر ہے اس واسطے مصنف نے نام بھی اس کا نوبہار رکھا اور شہر میں رواج دیا۔ واللہ اعلم بالصواب بحرمت النبی وآلہ الامجاد۔ قطعہ

سدا زندگی کی ہے بیجا امید | ہمایہ رہے گا سیہ پر سفید
دعا سے مجھے ہے یہ کار ثواب | ہے لازم پڑھے جو کوئی یہ کتاب

ذیل میں نوبہار کی کچھ عبارتیں مختلف مقامات سے نقل کی جاتی ہیں کہ بینی نارائن کی زبان اور اس کے اسلوب کا اندازہ ہو سکے۔ یہ صرف دیباچے اور خاتمے کی عبارات منقولہ کے دیکھنے سے نہیں ہو سکتا:

"دو نقلوں کو بیان کرنے والوں اور قصے کے کہنے کاروں اور پستوں نے نشۂ شوق محبت کی اس پرانی شراب کو بیان کے نئے پیالے میں بھر کر عاشقوں کے مغز کو اس طرح معطر کیا ہے" (ص۱۲)

"بہت سے آدمی زر کے لالچ سے اس کو پکڑنے کے درپے ہوئے۔ ہرن یہ حالت دیکھ کر گھبرایا اور بھاگنے کے ارادے سے ہر چہار طرف دیکھنے لگا۔ شاہزادے نے فرمایا کہ جو کوئی اس ہرن کو جیتا پکڑ لادے تو بہتر والّا: (کذا) یہ ہرن جس کی طرف سے نکل جاوے گا وہ غضب سلطانی میں گرفتار ہوگا" ص۱۶

"قیموس شاہ ایک ایسی لڑکی رکھتا ہے کہ شاید حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ویسی خوبصورت پری روئے زمین پر نہ پیدا کی ہو:

گل بھی گر دیکھے اسے لے تو سوگل کھائے | زلف اس کی سے فقط تاب سنبل کھائے
گر اس شوخ کے زلف سیہ پر رشک کھایا ہے | پیچ و تاب کا نقشہ جوانی نے اڑایا ہے

غرض وہ نازنین ماہ جبیں ایسا حسن رکھتی ہے کہ بیان نہیں کیا جاتا۔ نام اس پری کا مہر انگیز کہتے ہیں اور سن بلوغ کو پہنچی ہے۔ بادشاہزادے اور امیرزادے ہر چہار طرف کے شہرہ اس کے حسن کا سن کر اس کی خواستگاری کی خواہش رکھتے ہیں۔ لیکن وہ لڑکی کمبخت ایک ایسا سوال درپیش کرتی ہے کہ اس کا جواب کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ سوال یہ ہو کہ "گل با صنوبر چہ کرد" (ص۲۴)

"جب صبح ہوئی اور شاہ خاور نے اپنے تخت زمردی رنگ پر جلوس فرما کر وسعت جہاں کو اپنے نور سے نورانی کیا، شاہزادے نے سب کارخانہ جات کے داروغوں کو واسطے تیاری سفر کے حکم کیا۔ ایک آن میں سبھی سب اپنے ساز و براق سے درست ہو کر پایۂ رکاب میں آحاضر ہوئے۔ شاہزادہ پوشاک لباس و ساز و براق سے مسلح (کذا) ہو کر سوار ہو بیٹھا اور بطریق ایلغار (یلغار) قطع منزلوں کا کرتا ہوا خاور زمین میں جا پہنچا۔ سر مقتولوں کے اس کے قلعے کے کنگوروں (کذا) پر ٹنگھے (کذا) تھے نظر آئے" ص۲۵

"اس جنگل خونخوار اور اس بلیعات (کذا) بیشمار میں کس طرح یہاں تک آن پہنچا اور یہ شخص کون ہے اور کیا مقصد رکھتا ہے۔ دائی جوہیں شاہزادے کے نزدیک آئی جھک کر سلام کیا اور کہا کہ اے جوان رعنا اور اے دلبر زیبا ہماری بی بی (کذا) صاحب آپ کو یاد فرماتی ہیں" (ص۵۲)

"الغرض غسل کرنے اور پوشاک پہننے سے شاہزادے (کا) حسن ایسا چمکا کہ جیسے بادل سے چاند باہر نکل آیا یا جگنو اندھیاری رات میں چمکتا نظر آتا ہے" ص۹۲

"اس خونخوار نے اپنے دم سے شہزادے کو گھیر لیا اور راہ جانے کا بند کیا چاہتا تھا کہ شاہزادے کو دم کی کشش سے اپنے حلق میں کھینچ لے۔ شاہزادے نے اس بات کو دریافت کیا اور تڑپکر (کذا) اسکے حصار نفس سے نکل بھاگا" (ص۱۲۷)

"جب دیکھا کہ یہ جوان اس خیال سے باز نہیں ہٹتا اور ہٹھ (کذا) اپنی نہیں چھوڑتا تب بلا چاری (کذا) حکم کیا کہ اس کتے کو حاضر کرو" (ص۱۵۲)

"آپ کی بیگم صاحب ہر روز رات کو اس پر سوار ہو کر

۸۔ ایک دوسری جگہ مہر افروز۔ نیم چند کی کتاب میں پہلے مہر انگیز اور اس کے بعد مہر افروز ہو۔ لیکن غلطنامے میں تصحیح کی کہ مہر انگیز درست اور مہر افروز غلط ہے۔

نکل جاتی ہیں اور تمام شب باہر رہ کر صبح ہوتے گھر آتی ہیں۔ تمام شب کی محنت سے گھوڑے دبلے (کذا) ہوئے جاتے ہیں اور کھانا پینا ان کے بدن میں نہیں لگتا" (ص۱۶۳)

"جو ہیں آہٹ اس کے پاؤں (کذا) کا ان حبشیوں کے کان میں پہنچا اسی مکان سے سات آدمی سونٹے ہاتھوں میں لئے نکلے اور گل کو بے تحاشا مارنے لگے۔ یہاں تک سونٹے بازی کی کہ اس قحبہ کو فرش زمین کر دیا۔ یہ نابکار۔ بدکردار سونٹوں کی مار کھاتی رہی ذرا (کذا) اف بھی نہ کیا۔ میں ایک طرف چھپا کھڑا رہا اور یہ تماشا دیکھا کیا۔ تب ان میں سے ایک حبشی بولا کہ اے قحبہ آج تو نے اتنی دیر کیوں لگائی؟ کیا تجھے میرا خوف نہ تھا؟ پس میں تمام رات تیرے انتظار میں بیٹھا رہا کروں؟ معلوم ہوتا ہے کہ میری خواہش تیرے دل میں نہیں رہی۔ جا اپنے صنوبر شاہ سے دل بہلایا کر۔ مجھے بھی تجھ سے بہتر سیکڑوں میسر ہیں، تو کیا بلا ہے۔ یہ بات اس لعین کی سن گل اس کے پاؤں (کذا) پر گر پڑی اور رو رو کر کہنے لگی کہ آج جس طرح سے ہو تقصیر اس لونڈی کی معاف کیجئے، ہر روز سویرے حاضر ہوا کروں گی۔ پھر وہ حبشی کہنے لگا کہ آج تو پوشاک رنگین پہن کے کیوں نہیں آئی؟ تب بولی کہ آج وہ صنوبر جوانا مرگ (کذا) گھر ہی میں تھا شکار کو نہ گیا تھا اس واسطے پوشاک بدل نہ سکی۔ یہ حالت دیکھ کر میں متعجب ہوا کہ یا اللہ ایک روز میں نے گل کو پھول کی چھڑی چھوائی تھی، اس کے صدمے سے سات روز تک پلنگ سے نہ اٹھ سکتی تھی اور ایک مہینہ تک مجھ سے ہم کلام نہ ہوئی تھی، آج ان سونٹوں کی مار کیونکر ہضم (کذا) کر گئی اور ذرا بھی نہ ہلکی" (ص۱۶۵)

"اس کے مکھڑے کی جوت سے خورشید تاباں شرمندہ اور چاند سے زیادہ چہرہ اس کا حسن کے جلوے کے سبب تابندہ ہے۔ حاصل کلام میں اس کے حسن جہاں افروز کو دیکھ کر بھچک رہ گیا... بعد تھوڑی (دیر کے) اپنے تئیں سنبھال کر دل میں سوچا اور فکر کیا کہ اگر تو اس جگہ اپنے تئیں کھووے گا تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھووے گا۔ آخرش ہوش و حواس درست کر کے اس پری کے چہرے کو نادیدوں کی طرح ٹکٹکی باندھ دیکھنے لگا۔ یکایک اس ماہ جبیں کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھتے ہی مجھ کو پوچھنے لگی کہ ارے تو کون ہے کہ چوٹٹوں کی طرح میرے گھر میں گھس کر ہر چہار طرف نگاہ کر رہا ہے" (ص۱۶۳)

✡

"قصۂ گل و صنوبر" مطبوعہ مجیدی پریس ۱۳۲۶ھ کے مطابق گل و صنوبر کی داستان کا خلاصہ حسب ذیل ہے: قیموس شاہ کی ایک حسین لڑکی مہر انگیز تھی۔ اس نے یہ شرط لگا رکھی تھی کہ جو آدمی اس کے اس سوال "گل با صنوبر چہ کرد" کا جواب دے گا وہ اسی سے شادی کرے گی۔ متعدد شہزادے اُس کے پاس شادی کی آرزو لے کر گئے مگر اُس کے سوال کا جواب نہ دے سکنے کی وجہ سے انھیں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تمثال پوش نامی بادشاہ کے چھ لڑکے بھی اسی طرح مہر انگیز کے حکم سے قتل ہوئے۔ ساتواں لڑکا الماس روح بخش بڑی مصیبتیں جھیل کر اور بہت مراحل طے کر کے صنوبر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ صنوبر نے اسے بتایا کہ گل اس کی بیوی کا نام ہے جس نے اسے دھوکا دے کر کچھ زنگیوں سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی اور ہر شب چپ چاپ کر ان کے پاس چلی جاتی تھی۔ صنوبر کو اس کا پتہ چل گیا۔ اُس نے ان زنگیوں کو گرفتار کر لیا اور گل کو بھی مقید کر کے یہ دستور بنا لیا کہ اپنے کتے کا جھوٹا اسے کھلوا رہا تھا۔ الماس روح بخش مہر انگیز کے سوال کا جواب پا کر اُس کے ملک گیا اور اسکے سوال کا جواب دیکر اس سے شادی کر لی ——— (ایڈیٹر)

فارسی شاعری عہدِ مغولِ متاخرین میں

منوہر سہائے انور

عہدِ مغولِ متاخرین کی تاریخ، سلطنتِ مغلیہ کے سیاسی زوال اور مالی انحطاط کی تاریخ ہے۔ یہ سلطنت، جو اورنگ زیب کے زمانے میں بلحاظ وسعت برطانوی حکومت ہند کے احاطۂ اقتدار کے لگ بھگ تھی، عالمگیر ثانی کے زیرِ نگیں آنے تک اتنی محدود ہو گئی کہ شہر دہلی کے ہموار علاقوں پر بھی اس کا اطلاق بمشکل کیا جا سکتا تھا۔ اس سلطنت کے انقراض کا آغاز عہدِ اورنگ زیب کے نصفِ آخر میں ہو چکا تھا اور دور بیں نگاہیں انجام سے بہت پہلے اُس کا دُھندلا سا نقش دیکھ چکی تھیں۔ اس مقالے میں جس زمانے سے سروکار رکھا گیا ہے وہ عہدِ اورنگ زیب کے نصفِ آخر سے شروع ہو کر تیسری جنگ پانی پت پر ختم ہو جاتا ہے۔

شعرا کا نقصان

شخصی حکومت میں سلطنت کا عروج و زوال خواص و عوام کی زندگی کے ہر شعبے پر اثرانداز ہوا کرتا ہے۔ مغول متاخرین کے عہد میں بھی یہی ہوا۔ یوں تو تغیرِ حال سے ہر طبقے کے لوگ بری طرح متاثر ہوئے، لیکن سب سے زیادہ نقصان شعرا کی جماعت کو پہنچا۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی شعرا نوازی اور زر افشانی قصۂ ماضی بن گئی تھی۔ اورنگ زیب اپنے پیش رووں کی روایات برقرار رکھ سکتا تھا، مگر فقیرِ صاحبِ شمشیر ہونے کے باعث اس کے امیال و عواطف اور ہی قسم کے تھے۔

جہاں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں ایران کے بہت سے شعرا ہندوستان کی طرف کھنچے چلے آئے اور انعام و اکرام پا کر مالا مال ہو گئے۔ وہاں مغول متاخرین کے عہد میں ان کی آمد مقابلۃً بہت کم ہو گئی اور ہندوستانی سخن سراؤں کی بھی وہ قدر نہ ہو سکی جو ہونی چاہیے تھی۔ اگرچہ ملک الشعرا کا عہدہ خالی رہا اور اُمرا بھی اپنی اقتصادی سقیم الحالی کی وجہ سے شعرا کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کرنے سے قاصر رہے، تاہم عوام کے شوقِ شعر و ادب میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا۔ اس عہد میں ایران، عراق اور افغانستان سے شعرا ہندوستان آئے تو سہی مگر انھیں اطمینانِ خاطر نصیب نہ ہو سکا۔ جو شعرا یہیں مقیم ہو گئے ان میں مرزا معزالدین فطرت، حکیم شیخ حسین شہرت، زاہد علی خاں یکتا، قزلباش خاں امید، عبدالرضا متین، علی قلی خاں والہ، شیخ محمد علی حزیں، وغیرہ شامل تھے۔ (محاکمات الشعرا، صفحہ ۱۱)

اُمرا سے توسل

اگرچہ اُمرا میں بھی داد و دہش کی پہلی سی استطاعت نہیں رہی تھی، پھر بھی شعرا کو کہیں نہ کہیں کوئی مربّی مل ہی جاتا تھا۔ شیخ حسین شہرت، مرزا عبدالقادر بیدل، میر محمد زماں راسخ اور حاجی محمد اسلم سالم شہزادہ محمد اعظم کے دربار سے متوسل تھے (سفینۂ خوش گو، جلد سوم، صفحہ ۳۶)۔ ناصر علی سرہندی کا مربّی ذوالفقار خاں تھا۔ خان آرزو، جن کی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا، پہلے موتمن الدولہ

نواب اسحاق خاں شوستری اور پھر اُن کے بیٹوں نجم الدولہ نواب محمد خاں اور نواب رشید خاں سالار جنگ کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شعرا نظر بحالات اپنا شغل تبدیل کر لیتے، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ تحسین و آفرین کی چاٹ بری ہوتی ہے۔ شاعر آدھے پیٹ روٹی کھا کر گزارہ کر سکتا ہے، مگر جی بھر کر داد لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ شعرا کی تعداد گھٹنے کی بجائے اور بڑھ گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ یک فنی تھے اور مصنوعی یا نقلی شاعری کر لینا کچھ مشکل کام نہ تھا۔ شیر خاں لودی کی عبارت، جو ۱۶۹۰ء میں لکھی گئی تھی، عام شعرا کی کیفیت پر خاصی روشنی ڈالتی ہے:-

> "زمانۂ حال کے شعرا علم عروض سے قطعاً ناآشنا ہیں، چنانچہ یہ ضروری علم یکسر متروک ہو گیا ہے۔ جو شخص کسی مشہور اُستاد کی طرز میں ایک شعر لکھ لے وہ کامل فن شاعر ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے۔" (مراۃ الخیال، ص ۹۴)

اس بیان میں جو تعمیم ہے وہ قابل قبول نہیں، کیونکہ قادر الکلام اور مسلّم الثبوت شعرا نایاب نہیں ہو گئے تھے۔ ایرانی شعرا کے علاوہ ناصر علی، بیدل، راسخ، واضح، رائج، سالم، ناجی، سرخوش، گلشن، بخیر، آرزو، فقیر، ثابت، قبول، آفرین، گرامی، آزاد، وارستہ، مخلص، خوشگو وغیرہ وغیرہ کا تعلق اسی عہد سے تھا۔

بے اطمینانی

اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی زرافشانیاں چونکہ ابھی فراموش نہیں ہوئی تھیں اور اُن کے جانشین اُن کی روایات قائم نہ رکھ سکے تھے، اس لیے شعرا کے گروہ میں بے اطمینانی البتہ پائی جاتی تھی۔ سرخوش نے ۱۰۹۳ھ میں لکھا تھا:-

> "ناصر علی اپنی اعلیٰ استعداد کے موافق مرتبہ نہ پا سکا: وہ بے قدری کے زمانے کا شاعر تھا، چنانچہ اس کی قدر جیسی ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی۔ وہ نازک خیالی کی بدولت اس امر کا حقدار تھا کہ اُسے ملک الشعرا مقرر کیا جاتا۔ جب میں اپنا دیوان دیکھتا ہوں تو مجھے اُس میں اول سے آخر تک ایسے عجیب و غریب مضامین نظر آتے ہیں جن تک دوسرے شعرا کی رسائی نہیں ہو سکتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس رنگ میں ایک مصرع بھی نہیں لکھ سکتے۔ مگر مجھے انعام دینے والا کوئی نہیں یا یوں کہیے کہ کوئی شخص میرے نتائج فکر کو گوشۂ چشم سے دیکھنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔" (کلمات الشعرا، ص ۷۴ تا ۷۵)

رائے رایان آنند رام مخلص نے، جو وزیر اعظم نواب قمرالدین خاں کا وکیل اور دولت مند شخص تھا، عہد محمد شاہی میں اپنے دل کا بخار یوں نکالا:-

> "پچھلے زمانے میں شعرا گرانقدر انعام پاتے تھے اور اُن کے کلام کی داد بڑی کشادہ دلی سے دی جاتی تھی، مگر اب اور ہی حالت ہے۔ اگر کوئی شخص کسی امیر کی مجلس میں یہ کہہ دے کہ فلاں شاعر کامل فن ہے تو اس سے کہا جائے گا:- ع ہزار بیت غزل پیش تجّہ حیرانست
> اور افسوس اس بات کا ہے کہ اس کے جواب میں کوئی یہ کہنے والا نہیں:- ع حضور ہیچ تو بے جوہرے کہ نادانست" (مراۃ الاصطلاح، صفحہ ۵۰)

خان آرزو کا خیال بھی یہی تھا۔ وہ لکھتے ہیں:-

> "ہمارے زمانے کے شعرا، جن کا کلام انعام و اکرام اور تعریف و توصیف سے محروم رہا، خوب جانتے ہیں کہ اہل ثروت کو شعر و سخن کا مذاق نہیں۔ شعرا کی حالت علی العموم نہایت سقیم ہے۔ الفاظ "امت مرحومہ" ان کس مپرس اور نادار اور بے قدر لوگوں کی جماعت پر خوب صادق آتے ہیں۔" (مجمع النفائس، صفحہ ۲۰۰)

یہاں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں:- ایک یہ کہ سلطنت مغلیہ کے عہد زوال میں شعرا کی وہ قدر افزائی ممکن نہ تھی جو اُس کے عہد عروج میں ہوتی رہی اور دوسری یہ کہ بڑے بڑے شاعر مفلوک نہ ہونے کے باوجود اپنے اذہان میں انعام و اکرام کے بارے میں وہی تصور رکھتے تھے جو اکبر سے لے کر شاہجہاں کے زمانے تک چلا آیا تھا۔

تقلیدی شاعری

اب یہ دیکھنا ہے کہ عہدِ مغول متاخرین میں شاعری کس قسم کی تھی۔

ظہوری اور نظیری ابھی تک بہت بڑے صاحبِ طرز شاعر مانے جاتے تھے اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے شعرا کا اندازِ سخن طرازی قابلِ تقلید سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ اس عہد میں شاعری تقلیدی ہونے کے لحاظ سے محض نقالی اور کاریگری رہ گئی تھی، اس لیے ہندستانی شعرا مشہور اُستادوں میں سے اپنی اپنی پسند کے مطابق کسی ایک کی تقلید اختیار کر لیتے تھے اور عمر بھر اُسی ڈگر پر چلتے رہتے تھے۔ ظہوری نظیری اور عرفی کی تصانیف کے ساتھ ساتھ شاپور، زلالی، طالب، شفائی، جلال اسیر، سلیم، کلیم، قدسی، دانش، ترکا مسیح، صائب، سالک، صیدی، قاسم دیوانہ، شوکت، شفیعائے اثر وغیرہ وغیرہ کا کلام نہایت غور سے پڑھا جاتا تھا اور بغرضِ تقلید ان کی خصوصیاتِ سخن سرائی کا باہمی مقابلہ کر کے ایک مفرد یا مرکب طرز منتخب کر لی جاتی تھی۔

معلوم ہوتا ہے ناصر علی اور بیدل پر ظہوری کا بڑا گہرا اثر تھا اور انھوں نے بقدرِ امکان اُس کی تقلید کی تھی۔ بقولِ شیر خاں لودی ناصر علی کی رائے تھی کہ ظہوری سے بڑا شاعر کبھی زمانے میں روئے زمین پر نہیں دیکھا گیا۔ (مراۃ الخیال، ص [illegible])۔ بیدل جو صرف خاطر نواز شاعری کو عمدہ شاعری قرار دیتے تھے، خوشگو کے بیان کے مطابق ظہوری سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور اُس کے کلام کو بہ نظرِ حیرت دیکھ کر اس پر رشک کرتے تھے۔ (سفینۂ خوشگو، جلد دوم، صفحہ ۱۲۶ و کلمات الشعرا، ص ۲۴)۔ خانِ آرزو بھی ظہوری کے بڑے مداح تھے۔ ان کے خیال میں کوئی شخص ظہوری کی تقلید کامیابی کے ساتھ نہ کر سکا۔ وہ شاعری میں کسی کو اُس کی ٹکر کا نہیں مانتے تھے۔ (مجمع النفائس، صفحہ ۲۴۱) خوش گو کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ خانِ آرزو شعرائے متقدمین یا متاخرین میں سے کسی کو ظہوری پہ ترجیح نہیں دیتے تھے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر بیدل کی طرز کا مطالعہ بہ امعانِ نظر کیا جائے تو وہ سر بسر ظہوری کے انداز کی نقل معلوم ہوگی۔ (سفینۂ خوشگو، جلد دوم، صفحہ ۱۲۶)

صائب بڑی خوبیوں کا شاعر سمجھا جاتا تھا اور اس کی طرز غنی کشمیری کی بدولت اور زیادہ مقبول ہو گئی تھی۔ جلال اسیر اور قاسم دیوانہ دقت پسندی اور پیچیدہ بیان کے اعتبار سے بہت مشہور تھے اور اُن کے مقلدوں کی تعداد خاصی تھی۔ اگرچہ ناصر علی اور بیدل کسی طرزِ خاص کے موجد نہ تھے، لیکن انھیں اپنی اپنی جگہ صاحبِ طرز خیال کیا جاتا تھا اور ان کے متبعین ہر جگہ بکثرت نظر آتے تھے۔ دوسرے ہندوستانی شعرا جن کی طرزوں کی تقلید کی جاتی تھی ماہر، واضح، نسبتی، رائج، سالم، سرخوش وغیرہ تھے۔
قصیدے میں عرفی اور مثنوی میں ظہوری اور زلالی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مسجع اور رنگین نثر میں ظہوری اور طغرا اور انشا اور بیانیہ تحریر میں عالم آرا اور روضۃ الصفا کے مصنفوں کے علاوہ شیخ ابوالفضل اور نواب حمیدالزماں بہترین رہنما مانے جاتے تھے۔ خانِ آرزو نے میر محمد محسن مصنف محاکمات الشعرا کو اس باب میں جو مشورہ دیا تھا اس کا ملخص بھی یہی ہے:
(محاکمات الشعرا صفحہ ۴)

سادگی سے وحشت

شاعری میں افکار اور الفاظ کی سادگی بالعموم ناپسند کی جاتی تھی اور سادہ اور صاف اشعار بے لطف سمجھے جاتے تھے۔ سرخوش کا خیال ملاحظہ ہو۔

"میں نے بینش کشمیری کا پورا دیوان دیکھا۔ مجھے اس میں صرف دو عمدہ دقیق اشعار نظر آئے .... چندر بھان برہمن متقدمین کی طرز میں صاف اشعار لکھا کرتا تھا .... حکیم حاذق کے اشعار قدما کے کلام کی طرح رنگینی سے خالی ہیں .... میر حشمتی ایک ضخیم دیوان چھوڑ گئے جس میں صرف ایک شعر کسی قدر پر لطف ہے .... بیدل کہا کرتے تھے کہ عجیب غریب مضامین ہی شاعری کی جان ہوتے ہیں۔" (کلمات الشعرا، ص ۱۸، ۳۰، ۲۱، ۶۰، ۳۴)

مزید برآں اس عہد کے شعرا بالخصوص ناصر علی، بیدل، واضح اور اُن کے مقلدوں کے کلام میں اس امر کی شہادت کے انبار موجود ہیں کہ سادگی اور صفائی ناپسند ہی نہیں کی جاتی تھی بلکہ اُسے وحشت ناک سمجھ کر اس سے بچے رہنے کا خیال رکھا جاتا تھا۔

ہر شاعر واردات اور جذبات کو قدرتی سادگی اور بے ساختگی سے بیان کرنے کے بجائے ایسے مضامین نظم کرتا تھا جو حقیقت

اور واقعیت سے یکسر مُعرّا ہوتے تھے اور اُن کے بیان کے لئے پُر پیچ زبان سے کام لیتا تھا جس سے اشعار میں کم وبیش اشکال پیدا ہو جاتا تھا۔ اس عہد کی شاعری کا سب سے زیادہ نمایاں عیب یہ تھا کہ وہ سراسر مصنوعی اور نقلی تھی۔ اگر اس شاعری کے مضامین اور اندازِ بیان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو خیالات قدما نہایت سادگی اور بے ساختگی سے بیان کر چکے تھے اُنھیں کو پیچ و خم دے کر پُر تکلف الفاظ اور تراکیب کی دھوم دھام سے کچھ کا کچھ کر دکھایا گیا ہے۔

جواب گوئی

کسی بڑے اُستاد کے شعر یا اُس کی پوری غزل کا جواب لکھنا بہت عام تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ رواج خود ایرانی شعرا ہندوستان میں لائے تھے۔ صائب ہی کا دیوان دیکھ لیجیے۔ اس میں جواب گوئی کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ عہدِ شاہجہانی میں شہزادہ دارا شکوہ کے ایک مشاعرے میں ہر شاعر نے دانش کے مندرجۂ ذیل شعر کا جواب پڑھا تھا۔

تاک را سیراب کن اے ابرِ نیساں در بہار
قطرہ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

خود شہزادے نے بھی جواب لکھا تھا جو یہ ہے:۔

سلطنت سہل است خود را آشنائے فقر کن
قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر شود

سرخوش لکھتا ہے:۔

"ملا محمد سعید اعجاز (ایرانی) نے لاہور جاتے وقت یہ مطلع لکھا تھا:۔

کشیدہ ام ز جنون ساغرے کہ ہوش نماند
دگر معاملہ با پیر مے فروش نماند

یہ مطلع تصوف میں ہونے کی وجہ سے خوب ہے۔ میں نے اس کے جواب میں حسبِ ذیل مطلع تحریر کیا۔

گداخت حیرتِ حسنِ تو ام کہ جوش نماند
چو برگِ گل ز تنم جز لبِ خموش نماند"

(کلمات الشعراء صـ ۶)

یہ تو عہدِ مغول متاخرین کے آغاز کی بات تھی۔ اب اس عہد کے تقریباً آخری ایام سے تعلق رکھنے والی جواب گوئی دیکھیے۔ قدسی کا مطلع تھا:۔

برنگِ غنچۂ صد برگ آسمانِ دو رنگ
بصد برہنہ دہد یک قبا و آں ہم تنگ

خوشگو (بندرابن، شاگردِ خانِ آرزو) نے اس کے جواب میں یہ مطلع لکھا:۔

برنگِ غنچۂ نرگس بہ گلشنِ نیرنگ
ز شش جہت شدہ بر اہلِ صدق قافیہ تنگ

اُس کا بیان ہے کہ خانِ آرزو نے اس جوابی مطلع پر چار صاد کیے۔
(سفینۂ خوشگو، جلد دوم، صفحہ ۱۸۳،۱۸۲)

جوابی دواوین

اس عہد میں جواب گوئی کا رواج اس حد تک ہو گیا کہ بعض بعض اشعار یا غزلیات سے نوبت گزر کر پورے کے پورے دواوین کے جوابوں تک پہنچ گئی۔ گلشن (خانِ آرزو کے پیر) نے شفیعائے اثر شیرازی کے دیوان کے جواب میں دیوان لکھا۔ (سفینۂ خوشگو، جلد سوم، صفحہ ۱۱)۔ اُن کے بعد خانِ آرزو نے اسی اثر کے دیوان کا جواب ایک دیوان کی شکل میں دیا۔ (مجمع النفائس، صفحہ ۳۲) خوشگو کا بیان ہے کہ گلشن، خانِ آرزو کے دیوان در جواب دیوانِ اثر کو دیوانِ اثر سے بڑھا ہوا سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک دونوں میں دس اور پندرہ کا فرق تھا۔

(سفینۂ خوشگو، جلد سوم، صفحہ ۱۱۱)

اس جوابی دیوان کے علاوہ خانِ آرزو نے جو اور اسی قسم کے دیوان لکھے اُن کے نام یہ ہیں:۔

دیوانِ آرزو در جواب دیوانِ فغانی۔
دیوانِ آرزو در جواب دیوانِ سلیم۔
دیوانِ آرزو در جواب دیوانِ کمال خجندی (تا ردیف دال)
دیوانِ آرزو در جواب دیوانِ شفیعائے اثر شیرازی نواب حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدر یار جنگ بہادر مرحوم کے کتب خانۂ حبیب گنج میں موجود ہے۔ دوسرے جوابی دیوان ایک بڑے ضخیم دیوانِ آرزو میں شامل ہیں۔ اس دیوان کی جوابی غزلوں کے شروع میں اس امر کی

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر)

غزل

ساغر نظامی

مدد کہ ہمتِ بے چارگی نہیں ہوتی
وہ سامنے ہیں مگر بات ہی نہیں ہوتی

نہیں مدام مرے جام ہی میں موجِ شفق
اُن انکھڑیوں میں بھی مے کی کمی نہیں ہوتی

جنابِ شیخ کے پندِ مدام کے باوصف
ہماری بادہ کشی میں کمی نہیں ہوتی

ہم اور خدا کی عبادت ندیم ہم سے تو
بتانِ دیر کی بھی بندگی نہیں ہوتی

زر و جواہر و لعل و گہر لٹا کر بھی
ترے خزانۂ لب میں کمی نہیں ہوتی

کبھی فراق میں یوں بھی بہار آتی ہو
کہ پھول ہوتے ہیں اور تازگی نہیں ہوتی

کبھی بہار کی راتوں میں یوں بھی ہوتا ہے
کہ شمع ہوتی ہے اور روشنی نہیں ہوتی

کبھی کبھی تو چمن یوں بھی مسکراتا ہے
کہ رنگ ہوتے ہیں اور دل کشی نہیں ہوتی

رباب و چنگ پہ اک وقت یہ بھی آتا ہے
کہ تار ہوتے ہیں اور نغمگی نہیں ہوتی

کبھی کبھی تو محبت میں یوں بھی ہوتا ہے
کہ ان سے مل کے بھی آسودگی نہیں ہوتی

ہزار پیرہنِ نور سرسراتے ہیں
ترے فراق میں جب چاندنی نہیں ہوتی

کفِ خزاں سے چھلکنے لگا ہے خوں پھر بھی
فروغِ لالہ و گل میں کمی نہیں ہوتی

جو شب کو صورتِ پروانہ رقص کرتی ہے
سحر کی گود میں وہ خاک بھی نہیں ہوتی

وہ بات جس کے لئے خود ہے ان کو بیتابی
ادا زباں سے وہ بات بھی نہیں ہوتی

جگر کے خون سے ہوتی ہے شاعری ساغرؔ
عروض ہی سے فقط شاعری نہیں ہوتی

ڈگریوں کی مصیبت

از پروفیسر آنند وٹل راؤ — مترجمہ ریاض الحسن

چارلس لیمبؔ سے اس کی بیوی نے ایک دن یہ سوال کیا "کیا آپ کو بچوں سے محبت ہے ؟" اس نے بے سوچے سمجھے یہ جواب دیا "ہاں مجھے ذرا بڑے بچے اچھے لگتے ہیں " مگر میں یہ کہوں گا کہ " ذرا بڑے " بچے تو شیرخوار بچوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دردِ سر ثابت ہوتے ہیں ۔ سال بھر کے بچے کی شرارتیں تو کسی نہ کسی طرح برداشت ہو سکتی ہیں ۔ یہ نہ تو بول سکتا ہے اور نہ کوئی سوال کر سکتا ہے ، اور اگر سوال بھی کرنے لگے تو آپ فوراً ریڈیو کھول دیجئے اور وہ کسی نہ کسی فیاض خاں کے گانوں یا کروسو (Caruso) کے نغموں سے بہل جائے گا ۔ کھلونے دے کر بھی جان بچائی جا سکتی ہے ۔ ذرا اس سے بڑی عمر کے بچوں کو مٹھائی دے کر بہلایا جا سکتا ہے ۔ اگر مٹھائی نہ دینا چاہیں تو پھر سفید جھوٹ بول کر ان سے گلوخلاصی کی جا سکتی ہے ۔ مگر بارہ تیرہ سال کے لڑکے کے سوالات کا جواب دینا اتنا آسان نہیں ہوتا ۔ اب اس سلسلہ میں ایک قصہ سنئے ۔

میری چچی کی عمر چالیس[1] سے تجاوز کر چکی تھی مگر باوجود اس کے انھیں فلم بینی کا بیحد شوق تھا ۔ خاص کر میٹنی شو میں جا کر خوفناک اور بھیانک فلمیں دیکھتی تھیں ۔ بچوں کو دھوپ میں لے جانا اور ایسی فلمیں دکھانا میرے نزدیک کسی طرح مناسب نہ تھا ۔ شامتِ اعمال دیکھئے کہ جس سال مجھے لکھنؤ یونیورسٹی کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد (Annual Convocation) میں ڈگری ملنے والی تھی ، چچی نے مجھ سے اپنے بیٹے جگدیش کو بھی اس موقع پر ساتھ لے جانے کے لئے بہت اصرار کیا ۔ میں نے جان بچانا چاہی ۔ وہ تھے تو ماشاءاللہ بڑے ہی ، سوال یہ تھا کہ میں ان کی خبر رکھتا ، گاؤن (Gown) سنبھالتا یا ڈگری لینے جاتا ۔ اس لئے میں نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ میرے پاس صرف ایک اجازت نامہ (Admission Card) ہے جسے دکھلا کر صرف میں جلسہ میں شریک ہو سکتا ہوں ، لڑکے کو کیونکر لے جاؤں گا ۔ مگر وہ کوئی حیلہ بہانہ سننے کے لئے تیار نہ تھیں ۔ کہنے لگیں " تم پریشان نہ ہو ، پچھلے سال کے اجازت نامہ سے کام چل سکتا ہے " حسنِ اتفاق کہ پرانا اجازت نامہ بھی میرے پاس موجود نہ تھا مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا ۔ لیکن انھیں کیسے چین پڑتی ، پوچھنے لگیں ۔ " ہاں تو تم نے کیا طے کیا ؟ اگر پرانا اجازت نامہ موجود نہ ہو تو صرف ایک خالی لفافہ جگدیش کے ہاتھ میں دے دینا ۔ اتنے بڑے مجمع میں کون اس کا خیال کرے گا کہ اس کے پاس اجازت نامہ ہے یا نہیں "

برا پھنسا تھا میں ۔ آخر یہ سوچ کر کہ " ہر سرِ اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد " میں نے جگدیش کو اپنے ساتھ لے جانا منظور کر لیا ۔ ایک ٹوٹے سے رکشہ پر سوار ہو کر ہم دونوں یونیورسٹی روانہ ہوئے ۔ میں راستہ بھر رکشہ کی ہڈیاں پسلیاں دیکھتا اور جان کی سلامتی کی دعائیں مانگتا ۔ دو بج کر چالیس منٹ پر یونیورسٹی پہنچا ۔ چچی کی شبھ کامنائیں اور دعائیں ساتھ تھیں اس لئے داخلہ

---

[1] انگریزی کا مشہور ادیب — ایڈیٹر

بہ آسانی ہوگیا۔ پنڈال میں مختلف حضرات کے بیٹھنے کے لئے الگ الگ بلاک تھے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رنگین جھنڈیاں اور بڑے بڑے خوبصورت شامیانے شادی کا منظر پیش کر رہے تھے۔

جگدیش نے مجھ سے کہا: "شیام! کتنا اچھا لگ رہا ہے! معلوم ہوتا ہے کہ ایک درجن شادیوں کا انتظام ہو رہا ہے"

میرے آگے ایک صاحب بیٹھے تھے۔ وہ یہ سُن کر بولے "نواب صاحب نے بھی کیا اہتمام کیا ہے۔ اس سال تو جلسہ گاہ پار سال سے بھی زیادہ سجایا گیا ہے"

جگدیش "نواب صاحب" کے نام پر چونکّا ہوگیا۔ کان کھڑے کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا: "شیام! یہ "نواب صاحب" کون ہیں؟" میں نے کہا "یہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ جگدیش" جگدیش نے پھر پوچھا "تو یہ نواب صاحب کا دربار لگا ہے؟" میں نے کہا "نہیں۔ یہ کنووکیشن ہے" جگدیش کی سمجھ میں اب تک نہ آیا کہ وائس چانسلر اور کانوکیشن . . . یہ دونوں کیا بلائیں ہیں۔ کہنے لگا "شیام! یہ تو بتاؤ کہ پہلی چیز یعنی وائس چانسلر کا دوسری چیز، کانوکیشن سے کیا سمبندھ ہے؟" میں نے اُسے بتایا کہ وائس چانسلر یونیورسٹی کے انتظامی امور کا سب سے بڑا افسر ہوتا ہے اور کانووکیشن انگریزی میں اس جلسہ کو کہتے ہیں جو یونیورسٹی میں ہر سال کامیاب طالب علموں کو اسناد، ڈگریاں اور انعامات تقسیم کرنے کے لئے منعقد کیا جاتا ہے۔ جگدیش نے پھر پوچھا "وہ طالب علم کہاں ہیں؟" میں نے فوراً ان کی قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ان میں ہر ایک سیاہ گاؤن اور رنگین ہُڈ پہنے ہوئے ہے یہی اس بات کی شہادت ہے کہ اسے آج ڈگری یا کوئی سند ملے گی۔ ان ڈگری پانے والوں میں کہ [illegible] رمیں اور لڑکیاں بھی شامل ہیں جگدیش نے پھر پوچھا "یہ لوگ کالا گاؤن کیوں پہنے ہیں؟ کالا رنگ تو رنج و غم کی علامت ہے۔ ہمارے اسکول میں کینڈر گارٹن کی استانیاں نیلے و سرخ رنگ کے گاؤن (Gown) پہنتی تھیں۔

چار پانچ منٹ کے بعد وہ پھر بولا: "شیام میں ڈگری وگری نہیں لونگا۔ اب گھر چلو!" میں نے یہ سن کر دل ہی دل میں اپنے آپکو کوسنا شروع کردیا کہ ناحق ان حضرت کو ساتھ لایا تھا جن کی ذہانت اور عقلمندی کی باتیں سُن سُن کر قریب میں بیٹھے ہوئے حضرات ہنس رہے ہیں اور مجھے بھی شرمندگی ہو رہی ہے۔ آخر میں نے اُسے بہت زور سے ڈانٹا "چپ رہو۔ کیا بکواس لگائے ہو۔ تم کو بغیر امتحان پاس کئے ڈگری کون دے گا اور اگر دے بھی تو تم قبول نہ کرنا" میرے ڈانٹنے پر وہ کچھ سٹ پٹا سا گیا اور شرمندگی مٹانے کے لئے کہنے لگا:۔ "شیام! ڈگری گئی چولھے بھاڑ میں۔ یہ تو بتاؤ کہ یہ ہوتی کیا بلا ہے؟ بھگوان نہ کرے کسی پر ڈگری ہو" یہ سن کر میں آگ بگولا ہوگیا۔ مگر موقعہ اس کا نہ تھا کہ میں اس پر ہاتھ صاف کر دیتا اس لئے صبر کرلیا اور اس سے کہا "دیکھو جگدیش! ڈگری (Degree) یونیورسٹی کی ایک سند ہوتی ہے جو طالب علموں کو کسی خاص امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد بطور شہادت عطا کی جاتی ہے۔ سند یا ڈگری پر اسی مضمون کی عبارت بھی لکھی ہوتی ہے۔ یہ عدالت والی ڈگری (Decree) نہیں ہے جو تم عمر بھر سنتے چلے آئے ہو" قریب میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے میری پوری بات سنے بغیر مجھ سے مخاطب ہوکر کہا کہ سند اور ڈگری (Degree) اور سرٹیفکٹ (Certificate) میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میں نے فوراً کہا کہ میرا مطلب سند یعنی سرٹیفکٹ (Certificate) ہی سے تھا مگر وہ ضد اور شرارت کے خیال سے میرا مذاق اڑاتا رہا۔ اس نے جگدیش کے دل میں یہ خیال پیدا کردیا کہ سند (Certificate) ڈگری (Degree) سے کم درجہ ہوتی ہے۔ میرا دل چاہا کہ ان حضرت کی ناک پر ایک گھونسہ ماروں تو ان کے مزاج درست ہوجائیں مگر موقع کی نزاکت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ جگدیش گھبرا کر الٹے سیدھے چند اور سوالات نہ کر بیٹھے۔ مثلاً یہ کہ "کیا اس جلسے میں لڑائی (Duel) کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ" تو شاید منہ چھپانے کی بھی جگہ ڈھونڈھے سے نہ ملے مگر خدا کا شکر تھا کہ اس نے صرف ڈپلوما (Diploma) یعنی سند دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے گاؤن اور ہُڈ پہنے ہوئے نوجوان مرد اور عورتوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا "وہ دیکھو! ان میں سے ہر مرد اور عورت ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا کاغذ لئے ہے . . . یہی سند، ڈگری (Degree) [illegible] ہے"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر جگدیش کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔ بولا:۔ "اگر یہی ڈگری ہوتی ہے تو آخر یہ سب لوگ اب یہاں انتظار کیوں کر رہے ہیں؟ ڈگری لینے کے بعد اپنے اپنے گھر کیوں نہیں جاتے؟"

وہ حضرت یہ سن کر پھر ہنسنے لگے۔ مگر میں ہنسی ضبط کئے بیٹھا رہا اور جواب دیا "جلدی ہی تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ان لوگوں کے ٹھہرنے کا کیا سبب ہے؟ سنو۔ میں بتاؤں۔ بات یہ ہے کہ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو چانسلر صاحب (Chancellor) کے سامنے جا کر یہ وعدہ کرنا باقی ہے کہ وہ اس ڈگری یا سند کے صحیح معنوں میں مستحق بنیں گے۔ پھر وہ ان کے سامنے سر خم کریں گے۔ اس کے بعد اپنی جگہوں پر واپس جائیں گے اور وہاں کھڑے رہیں گے۔ پھر چانسلر صاحب (Chancellor) یہ الفاظ ادا کریں گے: "(Do you promise......?) کہ کیا آپ لوگ (Same) "سیم" یعنی اس ڈگری کے اہل ثابت ہونے کی کوشش کیجئے گا؟"

"شیام! اس میں شرم (Shame) کی کیا بات ہے؟" جگدیش نے پوچھا۔ یہ سن کر دوسرے صاحب نے پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ میں نے ان سے کہا "حضرت! میں نے "شیم" (Shame) (شرم) نہیں، بلا لحاظ (Same.) (سیم) عرض کیا ہے۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ آپ تو سر پھروں کو اور بھی پاگل بنانا چاہتے ہیں۔

مگر وہ حضرت برابر ہنستے ہی رہے۔ آخر میں نے کہا کہ اب ہنسی بند کر دیجئے۔ میں ہار ہی مان گیا۔

غرض مجھے اس وقت بڑی ذلت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ خیریت یہ ہوئی کہ پنڈال میں لاؤڈ اسپیکر سے فلمی گانے نشر ہو رہے تھے جس کے شور میں ہم لوگوں کی باتیں دو ایک آدمیوں کے سوا کوئی اور نہیں سن پا رہا تھا ورنہ خدا جانے کتنی ندامت ہوتی۔

تین بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ چاروں طرف لڑکے گاؤن پہنے اور ہڈ لئے ہوئے ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے چل پھر رہے تھے۔ عورتیں اور لڑکیاں غازہ اور سرخی لگائے ہوئے تتلیوں کی طرح چمن میں نازک خرامی میں مصروف تھیں۔ لڑکے بھونروں کی طرح آگے پیچھے "بھن بھنانے" اور ہنسی مذاق کرنے میں مصروف تھے۔ اتنے میں جگدیش نے ایک بار پھر میری شیروانی پکڑ کر کہا: "شیام! عدالت کیا ہوتی ہے؟ کیا نواب صاحب واقعی دربار لگاتے ہیں؟ میں نے تم سے پہلے کہا تھا کہ یہ نواب صاحب کا دربار ہے تو تم نے انکار کر دیا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں یا نہیں؟" یہ سن کر میرے غصہ کا پارہ چڑھ گیا۔ دل چاہا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں مگر پھر ضبط کیا اور جواب دیا "جگدیش! دربار سینیلٹ کا ڈنسل کی طرح ہوتا ہے۔ سال بھر میں ایک بار اس کا جلسہ ہوتا ہے۔ اس میں ممبران سوالات کرتے ہیں۔ ان کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ مختلف تجاویز منظور کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد بارہ مہینے تک اس کی کوئی نشست نہیں ہوتی۔ اب سمجھ میں آیا؟ ایشور کے لئے اب کوئی سوال نہ کرنا"

مائیکروفون گرج رہا تھا۔ چند لڑکے کسی مذاق پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اچانک یہ فلمی نغمے بند ہوئے اور مائکروفون پر ایک آواز سنائی دی— "جلوس! (The Procession.)" اب جلسہ کی کارروائی شروع ہو رہی تھی۔ ہم سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ پنڈال میں یونیورسٹی کاؤنسل اور کورٹ کے ممتاز ممبران ڈین، پروفیسر، ریڈر اور رجسٹرار وغیرہ رنگ برنگے گاؤن پہنے ہوئے داخل ہونے لگے۔ چانسلر یعنی گورنر، وائس چانسلر اور مہمان خصوصی جو خطبہ تقسیم اسناد پڑھنے کے لئے مدعو تھے —— ان سب لوگوں کے لئے سنہری کرسیاں اور سرخ قالین بچھے تھے۔ سب سے آخر میں وائس چانسلر اور ان کے ہمراہ مہمان خصوصی آئے۔ کرسی پر جب یہ حضرات بیٹھ چکے تو مائکروفون پر یہ الفاظ سنائی دیئے:- ("Do you promise") "کیا آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ اپنے کو اس (سند) کا اہل ثابت کیجئے گا؟"

اس رسمی سوال کا جواب دیتے وقت بڑا شور ہوتا ہے اس لئے کہ سینکڑوں اور ہزاروں طلبا، بیک زبان یہ جواب دیتے ہیں:- "We do promise" (ہم لوگ اس کا وعدہ کرتے ہیں۔)

اسی شور میں جگدیش پھر مجھ سے پوچھنے لگا: "آخر لڑکے کیوں چیخ رہے ہیں؟ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟" مجھے پھر غصہ آیا مگر یہ موقع نہ تھا کہ میں اس کی مرمت کرنے لگوں۔ اس لئے پھر صبر کرتے ہوئے اسے بتایا کہ یہ لڑکے شرافت اور انسانیت کے ساتھ برتاؤ کرنے، باعزت زندگی بسر کرنے اور علم کی ہر جگہ زیادہ سے زیادہ اشاعت کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ اتنا بتا دینا کافی ہوگا۔ مگر وہ تھا بال کی کھال نکالنے والا۔ پھر پوچھ بیٹھا۔ "اور شیام! اگر یہ لوگ اپنا وعدہ پورا نہ کریں تو کیا ہوگا؟ کیا ان کی یہ ڈگریاں ضبط کر لی جائیں گی؟ یا بذریعہ عدالت ان پر سب ڈگری کرا دی جائے گی؟ ایسے دکھاوے پر تو لعنت ہے لعنت۔ یہ باتیں اور یہ اونچے اونچے وعدے تو نکاح بیاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ نکاح بیاہ تو مذہبی معاملہ

ہے۔ مگر وہ بھی ذرا ذرا سی بات پر توڑ دیا جاتا ہے اور طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ؟" میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا جیسے میں نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور کامیاب طلبا کے ناموں کا اعلان بغور سنتا رہا۔

دو تین منٹ تک جگدیش کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا "شیام! تم ہی نے اپنا وعدہ کب پورا کیا ہے ؟" میں پھر بہرا بن گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ ذرا دیر بعد میری شامت پھر آگئی اور وہ مجھ سے کہنے لگا: "اچھا شیام! یہ تو بتاؤ کہ آخر چانسلر صاحب ایک ہی جملہ بار بار کیوں دہراتے ہیں: "یعنی اس یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے میں آپ کو (فلاں درجہ) کے امتحان کی ڈگری عطا کرتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ زندگی میں اپنے کو اس کا اہل ثابت کریں گے" اور یہ راز سمجھ میں نہ آیا کہ لڑکے ان کے اس جملہ پر اتنا شور کیوں مچاتے ہیں ؟" میں نے کہا "یہ لوگ اس لئے اتنا شور مچاتے ہیں کہ بعض طلبا بدتمیز ہوتے ہیں۔ بعض شریفوں کی محفل میں اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا ذرا سلیقہ نہیں ہوتا۔ وہ کریں کیا ؟ ایسا کرنے کیلئے وہ مجبور ہیں۔ اتنے میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے پیچھے ایک بدصورت شخص بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا: ۔ ("Wasted in me") (مجھ میں ضائع کر دیا)۔

یہ سن کر مجھے اور بھی زیادہ غصہ آیا کہ طالب علموں کے علاوہ دوسرے حضرات کو بھی اتنی شوخی کی جرأت ہو سکتی ہے۔ دل تو چاہا کہ ایک طمانچہ رسید کر دوں ان کے، مگر خاموش رہنے کی مؤدبانہ التجا پر اکتفا کی۔ لیکن انہوں نے مذاق اڑانا شروع کر دیا اور کہا کہ "ایک جگہ چانسلر صاحب یہی الفاظ زبان کی لغزش کی وجہ سے کہہ گئے تھے۔ میں تو ان الفاظ کا ہمیشہ مذاق بناتا رہوں گا" یہ سن کر میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک اور صاحب نے کہا کہ کسی اور یونیورسٹی کے ایک چانسلر صاحب نے اپنے لئے وائس چانسلر کا لفظ استعمال کر دیا تھا جس سے حاضرین پر ہنسی کا زبردست دورہ پڑ گیا تھا۔

آخر کار خدا خدا کرکے کانووکیشن ختم ہوا۔ یونیورسٹی کے عمائدین کا جلوس واپس ہو گیا۔ ہم اور جگدیش دونوں گھر روانہ ہوئے۔ اتنی دیر گرمی میں بیٹھے بیٹھے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا اور جگدیش کی وجہ سے دوسروں سے بحث کرتے کرتے اور اپنی صفائی پیش کرتے کرتے کلیجہ منہ کو آگیا تھا۔ جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ بھی چلتے چلتے جگدیش نے پوری کر دی۔ کہنے لگا: "چلو شیام جلسہ ختم ہو چکا ہے۔ ٹی پارٹی چلیں" میں نے کہا: "دعوت تو صرف مہمانوں کی ہے، تمہاری دعوت نہیں ہے۔ تم تو بن بلائے مہمان ہو۔ صرف تماشہ دکھانے کے لئے تم کو چچی کی ضد سے ساتھ لے آیا تھا۔ تمہاری دعوت کیسی ؟ تم سے دعوت کے لئے کس نے کہا ؟ اگر تم دعوت میں شرکت کے خیال سے آرہے تھے تو تم نے یہاں آنے سے پہلے مجھ سے کیوں نہیں بتا دیا تھا ؟" وہ بولا "ماتا جی نے تو مجھ سے کہا تھا کہ مجھے یہاں کریم رول، بادام کی برفی، کیک، آئس کریم اور پھل کھانے کو ملیں گے۔ اور آپ بتا رہے ہیں کہ میری دعوت نہیں ہے۔ میں تو واقعی صرف دعوت میں شرکت کے خیال سے یہاں آیا تھا ورنہ مجھے کانووکیشن وانووکیشن اور ڈگریوں وگریوں سے کیا دلچسپی ؟ نہ مجھے یہاں کی پیچ دار باتوں اور تقریروں میں کوئی لطف آیا۔ اگر پہلے معلوم ہوتا تو زندہ عجائب گھر چلا جاتا اور وہاں زیادہ مزہ آتا۔ بھالو اور بندر کو کھلانے کے بہانے سے تھوڑی بہت مونگ پھلی تو مجھ کو مل جاتی"

"کاش تم وہیں چلے گئے ہوتے" میں نے جل کر جواب دیا اور رکشہ پر سوار ہو گیا۔

اس واقعہ سے میں اب کافی تجربہ حاصل کر چکا ہوں اور میری عقل زیادہ پختہ ہو چکی ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ بے چارے جگدیش کو وہ سب چیزیں نہ ملیں جن کا درحقیقت وہ ہم سب سے زیادہ مستحق تھا۔ اگر چچی ہر معاملہ میں ٹانگ نہ اڑا دیتیں تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ بہرحال جگدیش کا یہ دلچسپ واقعہ اب ہر سال مجھے کانووکیشن کے موقع پر یاد آتا ہے۔ پارٹی میں شریک ہونے کے لئے اس نے جس بے چینی کا اظہار کیا تھا اس کا خیال مجھے ہر اس دعوت میں آتا ہے جس میں میں شریک ہوتا ہوں۔ اس وقت مجھے یہ مصرع بے اختیار یاد آجاتا ہے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

یا پھر یہ مصرع گنگنا لیتا ہوں ؎

دل کی دل ہی میں رہے گی مجھے معلوم نہ تھا

✡

غزل

خلیل الرحمٰن اعظمی

وہ حسن جس کو دیکھ کے کچھ بھی کہا نہ جائے
دل کی لگی اسی سے کہے بن رہا نہ جائے

اس کی گلی کہ جس میں کسی سے چلا نہ جائے
میں جا رہا ہوں چاہے مرا نقش پا نہ جائے

کیا جانے کب سے دل میں ہے اپنے بسا ہوا
ایسا نگر کہ جس میں کوئی راستہ نہ جائے

ہاں اے غمِ حیات پلا ایسی کوئی مے
اک بار پی کے جس کا کبھی پھر نشہ نہ جائے

جس جانِ جاں کے قرب میں بھی سو عذاب ہیں
کیا قہر ہے اسی کا بچھڑنا سہا نہ جائے

آئی کچھ اس طرح سے کہ نیندیں اُچٹ گئیں
کچھ اور گل کھلا کے یہ بادِ صبا نہ جائے

آہٹ کوئی ہوئی ہے تو جی سسنا گیا
ہم کو زمانہ پھر کوئی ٹھوکر لگا نہ جائے

دامن رفو کرو کہ بہت تیز ہے ہوا
دل کا چراغ پھر کوئی آکر بجھا نہ جائے

نازک بہت ہے رشتۂ دل تیز مت چلو
دیکھو تمہارے ہاتھ سے یہ سلسلہ نہ جائے

مجھ کو بلا رہی ہے بہت بزمِ مہ وشاں
جانے کو میں تو جاؤں پہ میری بلا نہ جائے

میں آج سن رہا ہوں خود اپنی ہی سرگزشت
اے دل ذرا خموش کہیں کوئی آ نہ جائے

ہے کوئی کھیل جان گنوانے کا حوصلہ
خیر اب جو آگیا ہے تو یہ مرحلہ نہ جائے

یہ بھی بڑی ہے بات جو ہجر دوام ہو
میں سو رہا ہوں پھر کوئی آکر جگا نہ جائے

اک وہ بھی ہیں کہ غیر کا بُنتے ہیں جو کفن
اک ہم کہ اپنا چاکِ گریباں سیا نہ جائے

تم یوں ہی اپنی آگ میں جلتے رہو خلیلؔ
یہ آگ پر کسی کا نشیمن جلا نہ جائے

ادب میں سمبالسٹ تحریک

دیوندر سیالکوٹی

"ادب کی تمام تر عظیم تخلیقات تمثیلی ہیں اور اس باعث ان کی قوت گیرائی اور حسن میں اضافہ ہوا ہے"۔۔۔۔ کوزوڈ۔

ادب میں سمبالسٹ تحریک سائنس کی مادی اقدار اور سائنٹفک حقیقت نگاری کے خلاف بغاوت کی صورت میں شروع ہوئی۔ لیکن ان شاعروں کی بغاوت عارفانہ تھی۔ انھوں نے ایک کامل دنیا کے تصور کے تحت حقیقت نگاری کی تنقید کی۔ ان کی نظر میں یہ کامل دنیا اس دنیا سے زیادہ حقیقی ہے جس کا شعور محض حواس سے حاصل ہوتا ہے۔ ان کا مذہب، حسن (Le Beau) اور آدرش (Le Ideal) کا حسن کامل ہے۔

سمبالزم کی تحریک کا آغاز دراصل بودلیئر (Baudelaire) کی تحریروں سے ہی ہوگیا تھا۔ بودلیئر نے فطرت کو دیگر حقیقت کے سمبل (Symbol) کے روپ میں دیکھا تھا جس کا اثر سمبالسٹ شعرا پر بڑا گہرا پڑا ہے۔ بودلیئر کی نظم 'بدی کے پھول' (Les Fleau™ de Mal-1857) سمبالزم کی محرک ہے۔ بودلیئر نے ایڈگر ایلن پو (Edgar Allan Poe) کی تحریروں کے تراجم پیش کئے۔ پو کی تنقیدوں نے سمبالسٹ تحریک کو تقویت پہونچائی۔ یہ تحریک انیسویں صدی میں فرانس میں شروع ہوئی۔ ورلین (Verlain) ملارمے Paul Mallarme اور ریمبو (Slephen) (Rimbaud) اس تحریک کے روح رواں تھے۔

ملارمے کی شاعری میں الفاظ اور موسیقی کے مبہم تلازم کا امتزاج ملتا ہے جو الفاظ کے روایتی مفہوم سے زیادہ اہم ہے۔ ورلین کی شاعری میں موسیقی کی حسن اور ذہنی کیفیت کے نازک اشارے سمبالزم کے بہترین نمونے ہیں ورلین کی اشاریت اس کی نظم "رومانس بغیر الفاظ کے" (Romances Sans Paroles) میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس نظم کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ ورلین نے الفاظ اور اس کے معانی کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ تخلیق حسن کیلئے موسیقی پر زور دیا ہے۔ اس نے واضح اور غیر مبہم خیالات کے بجائے اشاروں اور کنایوں سے کام لیا ہے۔ ورلین نے سمبلز (Symbols) کو فطری طور پر پیش کیا ہے جس کے باعث وہ اس تحریک کا قابل تقلید شاعر بن گیا۔ ریمبو اس تحریک کا ممتاز ترین عنصر ہے جس نے ۲۰ برس کی عمر میں ہی شاعری ترک کردی۔ ریمبو کی مشہور ترین نظم (Bate en ivre) کو سمبالسٹ شاعری میں اہم مقام حاصل ہے۔

ملارمے اشاریت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہے: "میری رائے میں شاعری میں اشارات و کنایات کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اشیا کا تصور اور اشیا کے تصور میں فرق ہونے سے ان کی متحرک تصویروں کا بننا یہی شعر کی جان ہے۔ اب تک ہمارے فنکار اور شعرا اشیا یا احساس کو جوں کا توں بیان کرتے آئے ہیں جس کی وجہ سے ان کے کارناموں میں ابہام کا فقدان ہے۔ وہ قاری کے دماغ کو تخیل کی جولانی کی اس لذت سے محروم رکھتے ہیں جس سے کسی شے یا احساس کی تخلیق ہوتی ہے۔ کسی شے کو اس کے مروجہ نام سے پکارنا، شعر کے تین چوتھائی حسن کو فنا کردیتا ہے۔ سننے والے کے لئے شعر میں کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ شعر کا حسن اور اس کی

لذت یابی عبارت ہے اس مسرت سے جو ہمیں اس کے معنی کی تلاش میں قدم بقدم حاصل ہوتی ہے..... اشاروں ہی سے سوئے ہوئے خواب جاگ اٹھتے ہیں..... اس ابہام کے صحیح استعمال سے اشاریت وجود میں آتی ہے۔ بتدریج کسی شے کا ہیولیٰ تیار کرنا تاکہ ہم اس کی روح کو پا سکیں یا اس کے برعکس کسی شے کو لے کر تعبیرات کے ایک سلسلے سے اس کی روح کا جلوہ دکھانا اس ابہام اور اشاریت کا کمال ہے۔ شاعری میں ہمیشہ ایک چیستان چاہئے اور ادب کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ تخیل کی مدد سے اشیا کی تخلیق کرے"۔ (ترجمہ از محمد عبدالقادر)

سمبالسٹ شعرا حسن کامل کے تصور کو تسلیم کرتے ہیں جو فن کے ذریعہ شرمایب ہو سکتا ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدوں سے پرے ایک کامل جمالیاتی کیفیت کو محسوس کرتے ہیں اس لئے سمبالسٹ شاعروں نے الفاظ کے جامد اور رائج معانی پر زیادہ غور نہیں کیا۔ شاعری کا فریضہ سبق پڑھانا نہیں بلکہ اشارہ کرنا ہے، محسوسات کو تحریک دینا ہے، نہ کہ اشیا کے نام بتانا ہے۔ اس کا کام ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں ہم جمالیاتی مسرت حاصل کر سکیں۔ یہی شاعری کی روح ہے۔ شاعری میں اشاریت اور ابہام ناگزیر ہیں۔ ان کے بغیر روحانی تاثر پیدا ہی نہیں ہو سکتا اشاریت سے اسرار کی کیفیت پیدا کرنا ایک قابل قدر نصب العین ہے۔ سمبالسٹ شعرا نے مری اشیا کی اصطلاحات میں مابعد الطبعیاتی تجربے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے تقریباً ہر لفظ ہی مہمل ہے۔ اس لفظ کو عام رائج معنی میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان محسوسات کے باعث جو اس لفظ سے پیدا ہوتی ہیں، یہ محسوسات ہمارے حواس کو حقیقت سے پرے، نئی حقیقت کو آشکار کرتے ہیں سمبالسٹ شاعری نے اپنے مخصوص جمالیاتی تجربے کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے ایک صوفی اپنے عرفانی تجربے کی وجدانی کیفیت سے سرور حاصل کرتا ہے ایڈمنڈ ولسن (Edmund Wilson) کی رائے سے ہر بات واضح ہو جاتی ہے:-

"Symbolism may be defined as an attempt by carefully studied means — a complicated association of ideas represented by a medley of metaphors — to communicate unique personal feelings".

(تصورات کے مجموعہ میں منعکس تصورات کے پیچیدہ تلازم کے ذریعہ منفرد ذاتی محسوسات کے ابلاغ کی سعی سمبلزم ہے۔)

سمبالزم میں موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بقول ویلری (Valery)، سمبالزم کا مقصد اس موسیقی کو از سر نو حاصل کرنا ہے جس سے شاعر محروم ہو چکے ہیں۔ سمبالسٹ شاعر یہی کہتے ہیں کہ ہم الفاظ سے وہ آہنگ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ویگنر (Wagner) نے موسیقی کے سُروں سے کیا ہے۔ یہ ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔ ملارمے کے خیال میں تو شاعری موسیقی کی ایک فارم ہے۔

سمبالزم کا اثر انگلستان کے ادیبوں پر بھی پڑا۔ جمالیاتی شاعری کی شاعت میں سمبالسٹ تحریک کا اثر نمایاں ہے۔ روزیٹی (Rosetti) اور والٹر پیٹر (Walter Pater) نے اس تحریک میں اہم رول ادا کیا۔ روزیٹی کی شاعری میں حُسنِ کامل کا تصور شامل ہے۔ والٹر پیٹر نے اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"Where art is proclaimed as the end of life because it gives a quickened multiplied consciousness."

(سمبلزم میں فن کو زندگی کا مقصود قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ یہ زود رس شعور عطا کرتا ہے۔)

انگلستان کے شاعروں میں جمالیاتی تحریک اتنی ماورائی عارفانہ اور کامل نہیں تھی جتنا کہ فرانسیسی شاعری میں نظر آتی ہے۔ پیٹر (Pater) کے جمالیات میں داخلی اور تجرباتی عناصر شامل ہیں۔ اس نے تصوف یا مابعد الطبعیات کو پوری طرح قبول نہیں کیا۔

سمبالزم نے شاعروں کے ساتھ ساتھ ناول نگاروں کو بھی متاثر کیا مارسل پراست (Marcel Proust) اوّلین ممتاز ادیب ہے جس نے سمبالزم کو افسانوی ادب میں پیش کیا۔ وہ فطرت نگاری کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسکا ناول A La Recherche du Temps perdu (تحقیق زمانۂ قدیم) اس کی بہترین مثال ہے جیمز جوائس (James Joyce) کی "یولی سس" بھی سمبالسٹ ناول نگاری میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ایذرا پاؤنڈ (Ezra Pound) اور دوسرے عکس پرست (Imagist) شعرا جرمنی میں رلکے (Rilke) روس

میں انڈرے بیلز (Andrey Bely) (Boris Pasternak) بورس پاسترناک بلجین ڈرامہ نگار میترلنک (Maeterlinck) سمبالسٹ رجحانات کے نمائندہ شاعر ہیں۔

اردو کے شعرا بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے ہیں۔ میرا جی، راشد، اختر الایمان، قیوم نظر، یوسف ظفر اور مختار صدیقی نے اپنی شاعری میں اشاراتی طرز کے نئے نمونے پیش کئے ہیں۔ ان کی علامتیں نئی اور اچھوتی ہیں جس کے باعث ابہام بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان شاعروں نے صحیح طور پر اردو شاعری کو اشاراتی آہنگ سے روشناس کیا ہے۔ میرا جی سمبالسٹ تحریک کے امام ہیں۔ ان کا ذہن دیومالا کی تفسیر سے مالامال تھا۔ وہ موسیقی کا بھی علم رکھتے تھے۔ سُر ودیا کا گیان اور دیومالا کی اشاراتی (سمبالک) معنویت نے میرا جی کی شاعری کو اعلیٰ بنا دیا میرا جی کی ایک نظم "ترقی پسند ادب" سمبالسٹ شاعری کی نمائندہ نمونہ ہے۔

اُس کو ہاتھ لگایا ہوگا
ہاتھ لگانے والے نے
پھول ہے رادھا، بھنورا بھنورا
بھنورے نے ہاں کاہے نے
جمنا تٹ پر ناؤ چلائی
ناؤ چلانے والے نے
دھوکا کھایا دھوکا کھایا
دھوکا کھانے والے نے
سکھیاں کیتک ساج بجائیں
کچھ نہ سُنی متوالے نے
کام نہ آیا بات نہ رکھی
اپنے دل کے اُجالے میں

مختار صدیقی نے قدیم راگوں سے فیضان حاصل کر کے موسیقی اور شاعری کو ہم آہنگ کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں منظر بھی نظر آتا ہے اور سُر بھی سنائی دیتے ہیں۔ "انجام" میں ضیا جالندھری نے اس تاثر کو بہ کمال خوبی پیش کیا ہے۔

اک شانے پر کھلا تھا
اک پھول تیرا پیماں
اور اس پر ایک تتلی
وہ میرا سوچ ارماں
کچھ خشک پتیاں ہیں
اب خاک پر پریشاں
اور ان کے پاس دو پر
بے حس، شکستہ جاں

ضیا جالندھری نے تتلی اور پھول کی تمثیلات میں ایک المناک کیفیت کو الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ راشد نے "خودکشی" میں اسی اشاریت کو پیش کیا ہے۔

آ تا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اُس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و رخشاں لہو
بوئے مے میں بوئے خوں اُلجھی ہوئی
وہ ابھی تک خوابگہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری
جی میں آتا ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے بام کو
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائیگی

"خودکشی" میں راشد نے زندگی کو ایک محبوبہ کے روپ میں پیش کیا ہے جو عشوہ ساز و ہرزہ کار ہے۔ اسی لئے صدیوں سے انسان اس کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ لیکن جب دنیا کو اس کی بے وفائی اور اس کی جفا کاری کا شعور

حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس کے تحت خواب کے نیچے "تازہ درخشاں لہو" کو دیکھ لیتا ہے جس میں "بوئے مے الجھی ہوئی ہے" زندگی کی حسرتیں خون ہو چکی ہیں اور تمنائیں مٹ چکی ہیں تو وہ موت سے ہم کنار ہونے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان موت سے ہم کنار ہونے کے لئے عزم آخری کر لیتا ہے تو شعور کے دریچے سے جو "گوئے وبام" کا منظر پیش کرتا ہے وہ زندگی کی تلخ حقیقت کے باعث اُسے مسلسل فنا کرنے کی پیہم کوشش کرتا ہے۔ لیکن جو اسے مسلسل ڈستا رہتا ہے اسے وہ "ہم آغوشِ زمین کر دینا چاہتا ہے۔" خودکشی، ذہنی خودکشی کی علامت ہے، شعور کے فنا کی نشانی ہے جو فرار اور مراجعت کے لئے ضروری ہے۔

فیض کی شاعری میں بھی تمثیلی طرزِ فکر نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں فیض نے نئی اشاریت کو پیش کیا ہے وہاں انہوں نے میرا جی کی تمثیلوں کی طرح اسے غیر مانوس مبہم اور دور از کار نہیں ہونے دیا۔ "سیاسی لیڈر کے نام" سمبالسٹ نظم ہے لیکن اس میں سمبالسٹ شاعری کا ابہام نہیں۔

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر میں ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تری آس، یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دل
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

یوں تو ہر دور کی شاعری میں اشاریت کا عنصر شامل رہا ہے۔ لیکن ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں اب اس کا اثر غالب نہیں رہا۔ سمبالزم کا آغاز متصوفانہ قسم کی شاعری سے ہوا۔ اس لئے اس کی تکنیک پر مابعد الطبیعاتی اثر رہا ہے۔ اس تحریک کی شہرت کا سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ اس کے ذریعہ شاعر کو (self) کا اظہار کرنے کا پورا موقع ملا اور موسیقی کو شاعری کا جزو لاینفک بنا دیا گیا۔ یہ تحریک انگلینڈ، جرمنی، روس اور یورپ کے دوسرے دیشوں میں پھیل گئی۔ ظاہر ہے کہ جب ذاتی بصیرت (Vision) کو مقدم کو قرار دیا جائے تو فن زندگی اور عام لوگوں کے وسیع دائرے سے الگ ہو جائیگا اور یہی سمبالزم کے ساتھ ہوا ایک جمال پرست شاعر جو اپنے ناقابلِ گرفت تاثرات اور محسوسات کو دور از کار تمثیلوں کے ذریعے اچھوتے انداز میں پیش کرتا ہے اسے قبولِ عام حاصل نہیں ہوا۔ دراصل یہ جمالیاتی مراجعت (Aesthetic withdrawal) سمبالزم کی تحریک کے لئے ضروری ہے۔ سمبالسٹ شعرا کی یہ بدنصیبی رہی کہ انکے دور کے لوگ انھیں سمجھ نہیں پائے اور نئی نسلوں نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی ایسے حالات میں شاعر کا "انسپریشن" جلد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ کامل نظم کی تخلیق کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور تخلیق کم کرتے اسلئے انکا تخلیقی دور بہت کم عرصے کا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سمبالسٹ شاعروں نے موسیقی کو اہمیت تو دی لیکن وہ ویگنر کے ویژن کو شاعری میں پیش کرنے سے ناکام رہے۔ وہ یہ بھول گئے کہ الفاظ کے اپنے معانی ہوتے ہیں اور ان کی اپنی آزاد حیثیت ہے اس لئے موسیقی کی طرح شاعری سے خالص جمالیاتی حظ ممکن نہیں۔ شاعری موسیقی کا نعم البدل نہیں ہو سکتی بہرحال اس میں شک نہیں کہ سمبالزم نے شدتِ احساس اور الفاظ کی موسیقی کے سحر کو جگایا اور شاعری کو نیا ویژن عطا کیا۔ اس کے بارے میں ییٹس (YEATS) نے کہا تھا۔

"اٹھارویں صدی کی عقلیت پرستی کے خلاف
رد عمل میں انیسویں صدی کی مادیت پرستی کے خلاف
رد عمل شامل ہو گیا ہے جرمنی میں ویگنر، انگلینڈ
میں (Pre. Raphalites) اور فرانس میں
ویلیر لارے اور میتر لنک میں جو سمبالسٹ تحریک
تکمیل کو پہونچی ہے اور جس نے ابسن اور وینتو
کے تخیل کو محرک کیا ہے وہی ایک ایسی تحریک ہے
جو نئے تصورات پیش کر رہی ہے۔

گوتم بُدھ کا فلسفۂ نجات

شمس کنول

اِس کائنات میں چند ایسی ابدی، ازلی اور بنیادی چیزیں ہیں جن کے وجود اور صداقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ زمین اور آسمان، چاند اور تارے، سورج، درخت اور دریا ہم کو دکھائی پڑتے ہیں۔ گرمی، سردی اور ہوا کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جن کو ہم دیکھ نہیں پاتے اور نہ جن کو ہم محسوس کر سکتے ہیں مگر ان سے ہماری ذات متاثر ضرور ہوتی ہے اور ہم ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔ وہ ہیں سچ اور جھوٹ، محبت اور نفرت، نیکی اور بدی۔ انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اس وقت سے سچ اور جھوٹ، محبت اور نفرت، نیکی اور بدی کے نرغے میں ہے جب سے یہ عالم پیدا ہوا اور شاید اِس عالم کے خاتمہ (اگر خاتمے پر یقین کیا جا سکتا ہے) تک اِسی گھیرے میں گھرا رہے گا۔ سچ اور جھوٹ پر، نفرت اور محبت پر، نیکی اور بدی پر کسی کا قبضہ نہیں ہے۔ یہ کسی کی میراث نہیں۔ دُنیا کا کوئی قانون، کسی ملک کا کوئی آئین اور کوئی مذہب ان بنیادی چیزوں کو اپنی نجی ملکیت قرار نہیں دے سکتا اور نہ خود کو ان کا موجد کہہ سکتا ہے۔ یہ چیزیں ایک عالمی صداقت کا درجہ رکھتی ہیں اور ہر مذہب و ملت میں مشترک ہیں۔ دُنیا میں جتنے بھی مذہبی رہنما آئے، جتنے پیغمبر گذرے اور جتنے اوتاروں نے جنم لیا انھیں چیزوں کو بنیاد بنا کر اپنے اپنے مذہب کی داغ بیل ڈالی۔

دُنیا کی تاریخ اِس بات کی شاہد ہے کہ جب کبھی انسانی زندگی کا معیار پست ہوا، نیچر کے اُصولوں کی انسان نے خلاف ورزی کی، رُوحانی تعطل پیدا ہوا تو کوئی روحانی پیشوا، پیغمبر، اوتار یا ریفارمر ضرور پیدا ہوا۔ یہ ہر یُگ میں، ہر دور میں اور دُنیا کے ہر خطّے میں ہوتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ بھارت میں بھی ایک زمانہ ایسا آیا جب سوسائٹی پورے طور پر ایک مذہبی گروہ کے ہاتھ میں آ گئی۔ مذہب اور رسوم ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے اور مذہب کے نام نہاد رکھوالوں نے انسانی زندگی کو پورے طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دولت کے بَل بوتے پر ہونے والی ظاہری پوجا پاٹ نیک نامی کی سند قرار دی جانے لگی۔ عوام اس زمانہ میں دو طبقوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک وہ جو دنیاوی لذتوں کو ترک کر کے اپنی آخرت سنوارنے کے خواہشمند تھے۔ دوسرے وہ دولتمند انسان جو انتہائی پُرشکوہ انداز میں مذہبی رسوم ادا کرتے، زندگی عیش و آرام سے گذارتے اور مرنے کے بعد بھی سورگ میں جانے کی امید رکھتے۔ یہ تھا وہ زمانہ جب آج سے ڈھائی ہزار سال قبل گوتم بُدھ پیدا ہوئے۔

گوتم بُدھ کی زندگی (خصوصًا ابتدائی) پر جب نظر پڑتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اشرف المخلوق ہونے کے ساتھ مافوق البشر بھی تھے اور ایک غیر معمولی (ABNORMAL) دل اور دماغ پایا تھا۔ وہ عام انسانوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ حساس اور صاحبِ بصیرت انسان تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ابتدائی عمر میں جب انسانوں کو دُکھ میں مبتلا پایا، تکلیف دہ اور لاعلاج امراض کا شکار دیکھا اور زندگی کو موت سے ہمکنار ہوتے ہوئے پایا تو اُن کے خیالات میں ایک ردِعمل پیدا ہوا

اور اس ذہنی انقلاب کے بعد جو کچھ بھی انھوں نے کہا وہ اس دور کے عام اعتقادات، خیالات، اپنے شاہی خاندان، سوسائٹی، تعلیم و تربیت اور ملکی رسم و رواج سے بالکل الگ تھا۔ کافی ذہنی فکر، جستجو اور ایک بڑی ریاضت اور نفس ماری کے بعد اُن پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ اوّل اِس دنیا میں دُکھ کا وجود ہے، دویم دُکھ کا ایک سبب ہے، سویم یہ سبب قابل فہم ہے اور چہارم یہ کہ انسانی دُکھ قابل علاج ہے۔ یہی وہ چار بنیادی چیزیں ہیں جن پر گوتم بدھ کے پورے فلسفۂ نجات کی بنیاد ہے۔ انھیں چار چیزوں کی روشنی میں انھوں نے سچی نظر، سچی خواہش، سچی غور و فکر، حق گوئی، سچا عمل، سچا کردار، سچا خیال اور سچا کام جیسے واضح اصول ترتیب دئیے۔ بدھ کے خیال میں اِن اُصولوں کے تمام نتائج اور پہلوؤں کا اچھی طرح احاطہ ہو جانے کے بعد انسان کی منزل آسان ہو جاتی ہے اور انھیں اُصولوں پر بدھ دھرم کا سو فی صدی دار و مدار ہے۔

لیکن اِن حقائق کے باوجود بدھ مت دراصل کوئی مذہب نہیں ہے اور نہ اس کو "ازم" ہی کا مقام دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کو نفسیات یا فلسفہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔ اس کے اصول سائنس کے بھی بہت قریب ہیں۔ یہ اصول انسان کی ذہنی فکروں اور اعمال میں ایک ترتیب اور تنظیم پیدا کرتے ہیں اور یہی تنظیم ایک انسان کو آسان، بامقصد اور واضح زندگی بنانے کی راہ بتاتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ راہ کو روشن بھی رکھتی ہے۔

بدھ تبدیلی پر یقین رکھتا ہے اُس کو ہر چیز میں اتنی لچک دکھائی پڑتی ہے جو تبدیلی کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ اُس کے نظریہ کے مطابق اِس عالم کی ہر چیز ایک مسلسل حرکت میں مبتلا ہے۔ ایک لمحہ میں ایک چیز پیدا ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں وہ نابود ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسری چیز لے لیتی ہے اور پھر یہ سلسلہ یونہی قایم رہتا ہے لیکن تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ گوتم نے آجات اسنسکرت — आजात असंस्कृत — کو بنیاد مان کر غور کیا اور اِس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک نقش کو بھی زندگی بخشی جا سکتی ہے۔ ایک ضعیف اور بوڑھے انسان کی عمر اور وقت پر فتح پائی جا سکتی ہے اور ایک مریض اپنے مرض سے نجات پا سکتا ہے۔ گوتم ہر تبدیل ہونے والی چیز کو ایک حقیقت مانتا ہے اور جو تبدیل نہیں ہو سکتی وہ حقیقت نہیں۔ لیکن انسان اس حقیقت پر اُسی وقت فتح پا سکتا ہے جب وہ چند نیم — नियम — (قواعد و ضوابط) پر چلے۔ کیونکہ نیم ہی ایک چکرورتی راجہ ہے جو سب پر راج کرتا ہے اور پھر جس چیز کو ہم اَست — असत्य — (باطل) کہتے ہیں اُسی کے ذریعہ ہم ستیہ — सत्य — (صداقت) تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں جو مرتیو — मृत्य — (فانی) ہے وہی ہم کو اَمرتُو — अमरत्व — حیات ابدی تک لے جا سکتی ہے۔ اِسی آجات اسنسکرت کی روشنی میں ہم کو بدھ کے وہ آٹھ اصول نظر پڑتے ہیں جو انسانی زندگی کے لئے مشعل راہ کا کام کرتے ہیں اور انھیں اُصولوں کے ذریعہ پانی کے ایک قطرے کو سمندر میں ڈال کر خشک ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ مختلف انداز میں، مختلف زبان میں اور مختلف موقعوں پر وہ یہی کہتا ہے کہ آنکھ پر قابو رکھنا اچھا ہے، کان پر قابو رکھنا اچھا ہے، ناک پر قابو رکھنا اچھا ہے، جسم پر قابو رکھنا اچھا ہے، زبان پر قابو رکھنا اچھا ہے، ہر پہلو پر قابو پا لینا ہی اچھا ہے۔ ایک انسان جو اس طرح اپنی ہر خواہش اور کمزوری پر تسلط پا لیتا ہے وہ بدھ کے خیال میں ہر دُکھ سے دور رہتا ہے۔ دراصل مہاتما گاندھی نے بھی بدھ کی تحریک سے متاثر ہو کر نفرت کو نفرت سے نہیں بلکہ نفرت کو محبت سے جیتنے میں کامیابی حاصل کی اور اِسی عمل کا نام انھوں نے عدم تشدّد (اہنسا) رکھا۔

آٹھ بنیادی اُصولوں پر شدت کے ساتھ پابند رہنے پر زور دینے کے باوجود بدھ کے فلسفہ میں انتہا پسندی کو دخل نہیں دیا گیا ہے۔ ایک مقام پر گوتم خود اپنے بھکشوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے "اے بھکشوؤ! مجھے تم سے یہ بھی کہنا ہے کہ درمیانی راستہ ہی تمام خطروں اور خطرناک حدود سے دور رکھ سکتا ہے۔ تکلیف دہ ریاضت یا اذیت پسندی ہیجان اور ایک ذہنی بیماری کو دعوت دیتی ہے اور جب تکلیف دہ ریاضت بنیادی معلومات کا راستہ روک دے گی تو پھر اپنے حواس پر کیسے قابو پایا جا سکے گا؟ چنانچہ ظاہر ہے جو اپنا چراغ پانی سے بھر لے گا وہ تاریکی دور نہیں کر سکے گا۔ اور جو کوڑا کرکٹ سے آگ جلائے گا وہ ناکام رہے گا۔ کمزور اور نحیف جان کے بل پر وہ کیسے نجات پا سکتا ہے؟ اور پھر جو اپنے نفس کی آگ کو

ٹھنڈا نہیں کر پاتا وہ دنیاوی اور آسمانی راحتوں سے بھی محروم رہتا ہے۔ جو اپنی ذاتِ نفس کو فنا کر چکا ہے در اصل اُس کو پھر دنیاوی اور آسمانی آرام کی خواہش ہی نہ رہے گی اور یہ تسکین ہی اُس کے لئے ایک ناقابلِ بیان راحت بن جائے گی۔ بہر صورت انسان کو اعتدال پسند ہونا ضروری ہے اسکو اپنے جسم کی جائز ضرورت کے مطابق کھانا بھی چاہیئے۔ در اصل نفس پرستی ہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ خود پرست یا اپنی ذات سے لطف اندوز ہونے والا انسان اپنے جذبات کا غلام ہوتا ہے اور عیش کی جستجو ہی حماقت اور بے ہودگی کو راہ دکھاتی ہے۔ لیکن زندگی کی ضروریات کو انجام دینا بُرا نہیں ہے۔ بلکہ اپنے جسم کو تندرست رکھنا ایک فرض ہے۔ ورنہ ہم اپنے عقل کے چراغ کو روشن نہ رکھ سکیں گے اور اپنے ذہن کو صاف، قلب اور ضمیر کو پاک رکھنے میں ناکام رہیں گے۔ اِس لئے اے بھکشوؤ! جس طرح پانی کنول کو گھیرے رہتا ہے مگر اس کی پتیوں کو تر نہیں کر پاتا اِسی طرح ہم کو اِس سنسار میں رہنا ہے اور اس کے لئے صرف درمیانی راہ ہے جو ہمیں ہر طرح سے بچائے رکھتی ہے۔"

گوتم بدھ نے ایک اور موقع پر اپنے پانچ بھکشوؤں کے سامنے نِروان کی وضاحت کرتے ہوئے گاڑی کے ایک پہیے کی مثال دی۔ انھوں نے کہا:—

"پہیے کے ڈنڈے (spokes) نیک چلنی کے ڈنڈے ہیں۔ انصاف ان ڈنڈوں کی یکساں لمبائی کے مانند ہے۔ خاکساری اور انکساری پہیے کا وہ حلقہ ہے جس میں اپنی جگہ سے نہ ہلنے والا سچائی کا 'دُھرا' پڑا ہوتا ہے"۔ بدھ نے اسی سلسلے میں آگے چل کر کہا۔ "جو اپنے دکھ کو، دکھ کے کارن کو، اس کے تدارک کو اور اس کے انقطاع کی گہرائی کو سمجھ لیتا ہے وہ یقینی طور پر صحیح راستہ پر چل سکتا ہے۔ نیک نظر اس کی راہ کو روشن رکھے گی، نیک وچار اس کی رہنمائی کرے گا، نیک گفتگو اس کی راہ کو ہموار بنانے میں مدد دے گی، نیک برتاؤ اس کی چال کی رفتار کے اوسط کو برابر رکھے گا، اس کی تازگی اس کو روزی پیدا کرنا بتائے گی، نیک کام اس کے قدم ہوں گے، نیک تصور اس کا دم پھولنے نہ دیگا اور نیک خیال اس کو امن اور شانتی کا عطیہ پیش کریگا!"

بدھ کسی بھی جاندار شے کو تکلیف پہونچانے کے خلاف ہے یہاں تک کہ وہ خوراک میں بھی سبزی سے آگے بڑھنے کو سختی سے روکتا ہے۔ اس کے خیال میں کسی کی جان "جو ہم دے نہیں سکتے" لینے کا بھی حق نہیں رکھتے اور کسی جاندار کو تکلیف

پہونچانا تزکیۂ نفس میں بھی مانع آتا ہے۔ اسی پابندی کو بدھ کے فلسفہ میں 'اہنسا' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بدھ کے یہاں عمل کے بغیر علم کی کوئی اہمیت نہیں ہے بدھ کے خیال میں ایک بڑے سے بڑا عالم بھی اگر اپنے حاصل کئے ہوئے علم سے اپنی ذات کو فائدہ نہیں پہونچا سکا تو وہ اس گوالے کے مانند ہے جو گایوں کے ایک بڑے گلے کی حفاظت تو کرتا ہے لیکن گایوں کا دودھ گلے کے مالک کو ملتا ہے۔ بلکہ جو کم جانتا ہے اور عمل زیادہ کرتا ہے وہ زیادہ جاننے والے کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے۔ در اصل بدھ کی تعلیم کا مقصد علم برائے علم نہیں بلکہ علم برائے عمل ہے۔ اس نے کبھی علم برائے علم کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ جس علم کا کوئی مقصد نہیں وہ زندگی کیلئے بیکار ہے۔ اس کا تمام تر فلسفہ برائے زندگی ہے۔ اس کا طریقۂ کار ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے رہا ہے سوچنے کو اس نے کبھی اہمیت نہیں دی لیکن اس کے باوجود آزاد خیال اور وسیع الدماغ ہو کر غور کرنے پر بھی اس نے کوئی پابندی عائد نہیں کی آج نہرو کی "پنچ شیل" بھی گوتم کے اسی نظریے کے پیش نظر وجود میں آئی ہے اور "دھم پد" کی انھیں سطور سے "پنچ شیل" کو تقویت پہونچتی ہے کہ "فتحیابی سے غصے اور جلال کو اشارہ ملتا ہے اور جھوٹ کی فتح بھی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس لئے ایک انسان کو فتح اور شکست دونوں سے گریز کر کے امن اور شانتی سے رہنے اور رہنے کی اشاعت کرنا چاہیئے" کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان ہزار لڑائیاں لڑے ہزار بار فتح پائے اور ہزاروں انسانوں کو اپنا غلام بنائے لیکن حقیقی مسرت اس کو اس وقت تک حاصل نہ ہوگی جب تک کہ وہ اپنے آپ کو فتح نہ کرے سچی فتح اِسی کا نام ہے۔

بدھ خدا کے وجود کے سلسلے میں خاموش ہے۔ در حقیقت اس نے وہ سب سمجھانے کی کوشش نہیں کی جو وہ خود نہیں سمجھ سکا۔ اگر بدھ مت کو ایک دھرم کہا جا سکتا ہے تو یہ پورے طور پر دھرم یا دلیل ہے جس کے ایک اصول میں بھی عقیدے کو دخل نہیں اور اس کی ہر دلیل سائنٹفک منطق کی روشنی میں قابل فہم معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بدھ ذاتی اثر کو بھی کام میں لانے کا قائل نہیں۔ اس نے خود ایک مرتبہ اپنے بھکشوؤں سے سوال کیا تھا کہ "کیا وہ سب اس کی باتیں اس لئے مانتے ہیں کہ اس کو اپنے گرو اور اس کی باتوں پر اعتماد ہے؟" بغیر کسی پس و پیش کے اس کے شاگرد آنند نے برجستہ کہا "وہ اپنے گرو کی دی ہوئی تعلیم کو اس

لیے نہیں مانتے کہ وہ گرو کی ذات پر اعتماد رکھتے ہیں بلکہ وہ خود ان اصولوں کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ چکے ہیں!" یہی وجہ ہے کہ بدھ نے چونکہ کسی کے کہنے پر اپنے اصول نہیں مرتب کیے بلکہ اپنے عقلی تجربات اور مشاہدات کو یکجا کر کے تعلیم دینا شروع کی اس لئے عقیدے سے اس کو چڑ ہو گئی اور عقیدے کے زور پر وہ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ روح کے سلسلے میں بھی اس نے وضاحت نہیں کی لیکن "پنر جنم"[1] کے ذریعہ نروان حاصل کرنے پر اس نے زور ضرور دیا ہے اور نجات کے اس طریقے کو وہ پانی کے اس قطرے کے مانند خیال کرتا ہے جو سمندر میں ڈال کر امر بنایا جا سکتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں بھی خاموش ہے کہ خدا اور روح ایک چیز ہیں یا دو۔ یا ایک دو میں مشترک ہے۔ لیکن وہ "دیانت" سے منکر نہیں۔ اسی لئے وہ ایک جگہ کہتا ہے: "جب ہمارے اندر جذبۂ ہمدردی بیدار ہوتا ہے تو ہم اپنے آپ کو دوسروں کی ذات میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسرے ہماری ذات میں۔ اور جب ہم اپنے آپ کو سنگدل بنا لیتے ہیں تو ہم نابینا ہو جاتے ہیں۔ دراصل پیار اور رحم سے بھری ہوئی آب دیدہ آنکھیں ہی وہ سب کچھ دیکھ سکتی ہیں جو ہم کو دیکھنا چاہیئے۔ اور جب ہم اپنے اس جذبۂ رحم کو تحریک میں نہیں لاتے جو انسان کا سب سے بڑا قابل فخر سرمایہ ہے تو ہم بینائی سے محروم ہو جاتے اور دنیا تاریکی میں گم ہو جاتی ہے دراصل یہ خود غرضی ہی اندھاپن ہے!"

ہو سکتا ہو کہ گوتم بدھ پر خدا کی حقیقت کا پورے طور پر انکشاف نہ ہو پایا ہو اور جب تک کسی چیز کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے اس وقت تک نہ تو اس کو سراہا جا سکتا ہے اور نہ برا ہی کہا جا سکتا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے بدھ مت، دھرم کم اور فلسفہ زیادہ ہے اور فلسفہ خدا کی ذات کو مشتبہ بناتا ہے اور بدھ کی تمام زندگی اس بات کی شاہد ہو کہ بدھ نے کبھی بھی اور کسی بھی مشتبہ بات پر تبصرہ نہیں کیا۔ گوتم کا طریق تعلیم، طریق تبلیغ اور طریق اشاعت بھی دوسرے پیغمبروں اور اوتاروں سے بہت مختلف رہا ہے۔ اس نے بات کرتے وقت ہمیشہ یہ پیش نظر رکھا کہ وہ ایک عام انسان سے بات کر رہا ہے۔ اس نے اپنی گفتگو میں غیر مانوس زبان کے الفاظ استعمال نہیں لئے۔ اس نے انسانوں کے اجتماع میں کبھی بھی راجاؤں کی زبان میں تقریر نہیں کی، اس نے دوسرے مذہبی رہنماؤں یا راجاؤں کے کلمات، تقریریں اور اقوال کا حوالہ نہیں دیا۔ اس کے بولنے کا طریقہ انتہائی سادہ اور گھریلو رہا اور اس نے ہر بات اتنی صاف کی جتنی کہ دن کی روشنی ہوتی ہے۔ بدھ کا فلسفہ دوسرے مذاہب کی طرح کسی مخصوص چشمے سے خارج ہونے والا آب حیات نہیں ہے۔ گوتم نے خود بھی اپنے آپ کو کسی مذہب کا بانی یا کسی تحریک کا محرک نہیں کہا۔ اس نے اپنی بات ماننے والوں کے گروہ کو کوئی نام بھی نہیں بخشا۔ لیکن اس خاکساری اور انکساری کے باوجود وہ دوسرے اوتاروں اور پیغمبروں کی الہامی کتابوں کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ تحصیل علم پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے نظریے کے مطابق وہی علم قابل قدر اور قابل اعتماد اور مفید ہو سکتا ہے جو اپنی محنت سے اور اپنی دماغی قوتوں کے ذریعہ خود حاصل کیا گیا ہو۔

بدھ مت کو ایک عالمگیر کامیابی حاصل ہے۔ اس میں عالمگیر اپیل پائی جاتی ہے اور اس خوبی کے پس پردہ ایک فلسفیانہ نکتہ چھپا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ بدھ مت ایک فلسفہ ہے دھرم نہیں۔ یہ عقیدے سے نہیں بلکہ دلائل سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ گو بدھ دھرم بھی ایک تبلیغی اور اشاعتی دھرم ہے لیکن اس دھرم کی تبلیغ اور اشاعت میں کبھی تشدد سے کام نہیں لیا گیا۔ یہی دو خوبیاں اس دھرم کی وسعت اور درازیٔ عمر کا بڑا سبب ہیں۔

✡

[1] دوبارہ جنم

غزل

شہید فرنگی محلی

بصد انداز بے باکا نہ آیا
حریم شمع میں پروا نہ آیا
یہاں اس چشم فتاں کی تھیں باتیں
یہ کیوں ذکرِ مے و پیمانہ آیا
محبت ہے مدارِ ہر دو عالم
سمجھ میں ناصحِ فرزانہ آیا
زمیں تڑپی، فلک کانپا، ہلا عرش
جو لب پر نعرۂ مستانہ آیا
کھنچی آتی ہے دُنیا میکدے میں
قیامت آئی یا پیمانہ آیا
ہوائیں سرد کہساروں سے آئیں
کہ وحشت کا مجھے پروانہ آیا
قیامت میں قیامت آ رہی ہے
کہ محشر میں ترا دیوانہ آیا
رہِ دشوارِ الفت کا ہر اِک لطف
بقدرِ ہمّتِ مردانہ آیا
رہی بے پاسِ چشمِ مستِ ساقی
نہ گردش میں اگر پیمانہ آیا
یہ کیا ہے ہر مصیبت میں زباں پر
انھیں کا نام بے تابانہ آیا
سخی سرکار میں اِس کی کمی کیا
ہمیں کو ہاتھ پھیلانا نہ آیا
شہید اُٹھو مصلّے چھوڑ کر اب
کہ عہدِ ساغر و پیمانہ آیا

تجدید

حسرت سہروردی

جب بھی ہوتی ہے مرے پاس تو اے جانِ حیات
ہوش اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میں ہوں کہ نہیں
زندگی دردِ مسلسل ہی سہی کچھ بھی سہی
چند لمحوں کے لئے خود کو بھلا دیتا ہوں
مُہر لگ جاتی ہے احساس کے دروازوں پر

ہر نفس کو مرے قربت تری گرماتی ہے
تیرے ہر لمس سے ملتا ہے سکونِ جاوید
دلِ افسردہ مرا چشمِ فسوں ساز تری
جانے کس جادۂ منزل پہ رواں ہیں دونوں
کون جانے کہ کہاں جا کے یہ رُک جائیں گے

اب غمِ زیست کے احساس کی موہوم کرن
مجھ کو پہلو میں ترے دیکھ کے در آتی ہے
جانے کیا سوچ کے اِک بار یہ مشّاطۂ غم
لوٹ جاتی ہے کہاں کون سی منزل کی طرف
مجھ کو اس کا بھی تو احساس نہیں جانِ حیات

اب ترے غم کو غمِ زیست کے پہلو میں لئے
بڑھ چلا ہوں میں اُسی منزلِ دوراں کی طرف
جس جگہ آدمی انسان ہے حیوان نہیں
تیری قربت سے میں اب ہوش نہیں کھوتا ہوں
اِک نئے موڑ پہ لایا ہے ترا پیار مجھے

افسانہ

اونچا گاؤں

عسکری شہناز

نام تو اونچا گاؤں تھا لیکن آباد تھا بالکل نشیب میں۔ اب بزرگوں میں بھی کوئی ایسا نہیں رہا تھا جو اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتا گرمی اور جاڑے کا موسم تو بڑے مزے میں گذر جاتا تھا اور زرخیز زمین ہونے کی وجہ سے کسانوں کو زیادہ محنت بھی نہیں کرنا پڑتی تھی۔ لیکن برسات آتی تو قیامت کا روپ بھر کر آتی۔ گاؤں والے ہر سال اس موسم میں اپنے مکانوں اور جھونپڑوں کی تباہی کا دل دوز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور بے بس رہ جاتے۔ سال بھر کی محنت پر پانی پھر جاتا مگر کچھ نہ کرسکتے۔ اگرچہ اسی خوف کی وجہ سے مکانات زیادہ پائدار نہیں بنائے جاتے تھے مگر ان کے لئے ان کو محنت بھی کرنا پڑتی تھی اور پیسہ بھی خرچ کرنا پڑتا تھا۔

برسات گذرنے کے بعد گاؤں کا عجب نقشہ ہوتا۔ ایک دو پکے مکانوں کی چہار دیواری کے علاوہ جو ساہوکار اور چودھری کی ملکیت تھے وہاں کچھ باقی نہ رہتا۔ ہر سال مکانوں اور جھونپڑیوں کی نئی حد بندی ہوتی۔ ایسے موقع پر ساہوکار کو اپنا رسوخ جمانے کا اچھا موقعہ ہاتھ آجاتا۔ وہ پیسے صرف کرکے اپنی سرپنچی کی ساکھ قائم رکھتا اور بیچ میں پڑ کر گاؤں کے جھگڑے بھی نپٹاتا۔ حقیقت یہ تھی کہ زبان پر ہمدردی کے الفاظ ہوتے اور دل میں فصلوں کی کٹائی پر ایک کے چار وصول کرنے کی خواہش ــــــ کسان مجبور تھے مکان بنانے اور جھونپڑیاں ڈالنے کے لئے اور بیج قرض لے کر بونے کے لئے۔ ادھر ساہوکار کے دلال نے سرکاری گودام سے تقسیم ہونے والے بیج کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلا رکھی تھیں جس میں سیدھے سادے کسان مبتلا ہو کر ساہوکار کی جانب ہی دیکھتے رہتے۔

اپنا گاؤں اور زمین ہونے کے باوجود یہاں کے کسان خانہ بدوشی کی زندگی کے تلخ تجربات سے آشنا ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی تو برسات شروع ہوتے ہی چاندی میں اس زور کی باڑھ آتی کہ انھیں اپنی جانیں اور اپنے جانوروں کو لے کر بھاگنا مشکل ہو جاتا۔ وہ لوگ بہت خوش نصیب سمجھے جاتے جن کے جانور بھاگ کر جانیں بچا لیتے اور اپنے مالکوں کے پاس پہونچ جاتے۔ گائیں اور بیل کسان کی بہت بڑی دولت ہیں۔ ان کو صحیح و سالم دیکھ کر وہ دکھ درد کے عالم میں بھی مسکرا دیتے، اور ان کی باچھیں کھل جاتیں۔

ساہوکار اور چودھری بڑے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے دُہرے مکان بنا رکھے تھے۔ وہ اپنے گاؤں والے مکانوں کو برسات شروع ہونے سے پہلے چھوڑ دیتے اور نئی گڑھی والے مکانوں میں مع سارے سامان کے منتقل ہو جاتے۔ دوسرے لوگوں کے لئے گڑھی میں جا کر آباد ہو جانا آسان نہ تھا۔ وہ انتہائی مجبوری کے عالم میں گھروں سے قدم نکالتے۔ انھیں آخری لمحہ تک امید بندھی رہتی کہ اس مرتبہ ان کے گھر ضرور بچ جائیں گے اور دیوی کی ناراضگی انھیں تباہی تک نہیں پہونچائے گی۔ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی دیواریں اور پھوس سے چھائے ہوئے چھپر کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔ چوں کہ اس میں ان کا بے لوث فن اور بے پناہ خلوص صرف ہوتا ہے اس وجہ سے وہ ناقابل اظہار محبت کی آماجگاہ ٹھہرتے ہیں۔

گاؤں والے اس سیلاب کو بھگوان کی طرف سے بھیجا ہوا ایک عذاب سمجھتے آئے تھے جو دیوی کی ناراضگی کی وجہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ وہ دیوی کو منانے کے لئے بکروں کی بھینٹ چڑھاتے اور بھینٹ چڑھانے کی یہ تقریب ایک بڑے میلہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اس موقع پر بکرے کو اچھی طرح سجا کر، جوان بوڑھے، بچے ناچتے گاتے، خوشیاں مناتے گھاٹ پہونچتے۔ یہاں بکرے کی گردن اتار کر، اس کو ندی میں بہا دیا جاتا اور سب لوگ ٹھنڈی بالو پر سر جھکا دیتے۔ جیسے وہ سیلاب کی تباہی سے نجات پانے کا بردان مانگ رہے ہوں۔ اس تقریب میں یوں بھی زیادہ گرم جوشی سے حصہ لیا جاتا کہ لوگوں کو آئندہ سال اس خوشی میں شرکت کی بہت کم امید ہوتی۔ ان قربانیوں کا سلسلہ اس وجہ سے بھی قائم تھا کہ مہاندی میں کبھی کبھی باڑھ نہیں بھی آتی تھی اور یہ لوگ سمجھ لیتے تھے کہ ہماری بھینٹ قبول کر لی گئی۔ جب کبھی قربانی کے بعد بھی باڑھ کی تباہکاریاں گھنی آبادی کو ویرانہ میں بدل کر رکھ دیتیں تو بھی ان کی عقیدت پر دھچکا نہ لگتا اور یہ دل کو سمجھا لیتے کہ دیوی نے اس بار ان کی بھینٹ قبول نہیں کی۔ غرض کہ سیلاب آنے اور نہ آنے کی صورت میں ان کی وہ عقیدت مندی جو انھیں دیوی سے تھی اپنی جگہ قائم رہتی۔ اسی کمال عقیدت اور نیک شگون کی بنا پر اس میلہ میں لڑکی والے اپنی لڑکیوں کے لئے اچھے اور تندرست لڑکوں کا انتخاب کرتے اور برسات گذرنے کے بعد جب اس گاؤں میں نئے نئے گھر بنتے اور چھپر ڈالے جاتے تو شادیاں بھی رچائی جاتیں اور دل کھول کر خوشیاں منائی جاتیں۔ ان خوشیوں کو منانے کے پیچھے بھی اسی ساہوکار کا ہاتھ ہوتا جو اپنے کاروبار کی خاطر گڑھی کا مکان چھوڑ کر گاؤں میں آنا ضروری خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے مکان کی درستی اور مرمت بہت جلد ہو جاتی اور یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس پر باڑھ کا کچھ اثر ہوا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد گاؤں میں پھر پہلی سی زندگی کا آغاز ہو جاتا۔ بلکہ ہر مرتبہ کچھ نئی چہل پہل ہوتی اور مردم شماری میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ مردم شماری کے توازن کو قائم رکھنا ملیریا اور دوسری متعدی بیماریوں کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ موتوں کے بمقابلہ پیدائش کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہتی۔ اور یہ اضافہ گاؤں والوں کے لئے اطمینان بخش بھی تھا۔ سہ اپنے ننگے کھلے، میلے کچیلے بچوں کو بھی اسی پیار کی نظر سے دیکھتے جیسے ساہوکار یا چودھری اپنے اکلوتے بیٹے کو ——— وہ انھیں اللہ کی دین کو نیک شگون سمجھتے تھے۔ اور نئی پود کو دیکھ کر ان کی باچھیں کھل جاتی تھیں گویا ان کا سب سے بڑا دھن یہی ہو۔

ہر سال کی طرح اس مرتبہ کے میلہ میں بھی لڑکی والوں نے لڑکوں پر نظر ڈالی اور سگائی کی بات پکی کی۔ مگر نئی بات یہ ہوئی کہ ایک لڑکے پر بھوودھر کو دو لڑکیوں کے باپ بیک وقت داماد بنانے پر اڑ گئے۔ یہ لڑکا اس گاؤں میں نووارد تھا اور اپنے ایک دور کے رشتہ دار کے یہاں اسی گاؤں کے ذرائع معاش اختیار کر کے زندگی گذارنے کے لئے آیا تھا۔ اسکی تندرستی، مردانہ حسن، بات چیت اور رکھ رکھاؤ نے دونوں آدمیوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اپنے حسن اخلاق سے اس نے گاؤں والوں کے دل و دماغ کو پہلے ہی جیت لیا تھا۔ گاؤں والوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا شہر میں رہ کر اور وہاں سے تعلیم حاصل کر کے آیا ہے۔ غرض بھوودھر کی ہر دلعزیزی میں روز اضافہ ہوتا جاتا تھا اور بات یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ ساہوکار بھی اس کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو رقابت کا رنگ دینے پر مجبور تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں یہ رقابت بغاوت کے سانچے میں نہ ڈھل جائے۔ جب شام کو الاؤ گرم ہوتا، یا چوپال میں کچھ لوگ بیٹھ کر اپنا دکھ درد بیان کرتے، تو یہ لڑکا بہت اچھے ڈھنگ سے انھیں سمجھاتا اور بتاتا کہ انھوں نے خواہ مخواہ ساہوکار کی شخصیت کو اہمیت دیکر اُسے اپنے اوپر حاوی کر لیا ہے۔ اصل طاقت تو وہ خود ہیں جس کا اگر صحیح احساس ان کو ہو جائے تو وہ اپنی مرضی کے مطابق حالات کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو اس کی باتیں نوجوانوں کو کیا بلکہ بوڑھوں کو بھی عجیب سی لگیں کیوں کہ ان کے ذہنوں پر ساہوکار کی بڑائی اور اس کے پیسہ کی طاقت اپنی چھاپ لگا چکی تھی۔ اس چھاپ کا اثر دھیرے دھیرے ہی زائل ہو سکتا تھا۔ بھوودھر انھیں باتوں کو ہر مرتبہ نئے ڈھنگ سے دہراتا۔ گویا یہ اس کے دل کی آواز ہو جس کا گھونٹنا اس کے نزدیک جرم ہے۔

شکنتلا نے اس کی یہ باتیں اکثر سنی تھیں۔ اور شاید انھیں سے متاثر ہو کر اس نے اپنی اکتا دینے والی تنہائیوں میں اس کے خیالات، اس کی یاد اور اس کے دلکش خد و خال کو مداخلت کی اجازت دی تھی۔ بھوودھر کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ گاؤں کی ایک الھڑ دوشیزہ اس کے خیالات سے متاثر ہو کر اس

کے قریب تر آ رہی ہے۔ وہ تو کبھی کبھی آتے جاتے رجنی کو البتہ کنکھیوں سے دیکھ لیتا تھا جو اپنی شوخ اداؤں سے اس کو دعوت نظر دیتی تھی۔ دراصل یہ بات کھل کر میلے میں اس موقعہ پر سامنے آئی جب شکنتلا اور رجنی دونوں کے باپ بھودھر سے اپنی اپنی لڑکی کا رشتہ طے کرنے لگے اور جب ایک کو یہ پتہ چلا کہ دوسرا اس کا مقابلہ کر رہا ہے تو دونوں اپنی بساط سے زیادہ بولیاں بولنے لگے۔ دراصل ان دونوں نے بھودھر کو اپنانے کے سوال کو وقار کا سوال بنا لیا تھا۔ اور گاؤں کی ریت کے مطابق یہ بات ٹھیک بھی۔ وقار اور آن کی۔ کیوں کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ لڑکی والوں نے کبھی لڑکے کو چنا ہو اور وہ کسی وجہ سے پیچھے ہٹ گئے ہوں۔ جہاں تک رقم کا سوال تھا وہ اپنی بیٹیوں کے لئے ہر چیز کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جایا کرتے تھے۔

اس مسئلہ کی نزاکت نے بھودھر کو ایک نئی الجھن میں ڈال دیا۔ وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ جو بولیاں بولی جا رہی ہیں اس میں ساہوکار کی امداد کو بڑا دخل ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دونوں میں سے کوئی پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے اور بات بننے کے بجائے خود بخود بگڑتی جا رہی ہے۔ سوچتے سوچتے اس نے ایک راستہ نکالا۔

شام ہو رہی تھی۔ گاؤں والے ایک میدان میں اکٹھا ہو رہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی، بچے بھی، بوڑھے بھی۔ بھودھر نے گاؤں کے ہر مرد، عورت، سے درخواست کی تھی کہ ایک سبھا ہونے والی ہے جس میں ان سب کی شرکت ضروری ہے۔ بھودھر اس میں تقریر کرنے والا تھا۔ اس کی اس دعوت پر سبھی نے لبیک کہا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو بھودھر کھڑا ہوا اور کہنا شروع کیا: "کیا آپ لوگ اونچا گاؤں کے رہنے والے ہیں مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے خیالات نیچے ہیں۔ مجھے اس بات کا اور بھی افسوس ہے کہ جھگڑا میری سگائی کا ہے۔ سگائی تو کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گی مگر اس سلسلہ میں جو جذبہ دکھایا جا رہا ہے اسے کسی اور کام میں صرف ہونا چاہیئے۔"

یہ ایک چوٹ تھی جو گاؤں والوں کی دکھتی رگ پر لگائی گئی تھی لیکن اس کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ دو آدمیوں نے محسوس کیا۔ اگر اس نوجوان کی ساکھ نہ ہوتی تو اس بات پر خون خرابہ ہو جاتا۔ دونوں چوٹ کھا کر خاموش رہے۔ اور بھودھر کے تیز گونجتے ہوئے لہجے سے متاثر ہو کر بڑی بوڑھیوں کی آنکھیں حیرت میں اوپر اٹھ گئیں۔ جوان اور کنواری لڑکیوں کے گھونگھٹ انگلیوں کے سہارے سمٹنے لگے۔ مردوں کو سب سے زیادہ تعجب اس جوان کی جسارت پر تھا۔ ذرا سی دیر میں ادھر اُدھر پھیلے ہوئے مرد، عورتیں اور لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو گئیں، اور بات کی بات میں یہ ہنگامہ ایک مکمل سکوت میں تبدیل ہو گیا۔ گویا سب ایک زبان ہو کر پوچھنا چاہتے ہوں: "ہمارے نیچے خیالات کا اندازہ تم نے کس بات سے لگایا۔؟"

"سنئے!" اس نے ذہنوں کی تہہ کو پاتے ہوئے کہا: "آپ سب شادی بیاہ کے معاملات کو تو اپنی آن اور عزت کا سوال آسانی کے ساتھ بنا لیتے ہیں۔ لیکن ساہوکار سے قرضہ لیتے وقت، اور خاص طور سے اس کی ادائیگی کے موقعہ پر جب آپ کی عزت کو للکارا جاتا ہے تو آپ کے کان گونگے اور آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ آپ کی غیرت بوڑھے گیدڑ کے مانند اونگھنے لگتی ہے۔ گویا آپ انسان نہیں بلکہ بھیڑوں کا گلہ ہیں جس کو ساہوکار کا کارندہ کسی سمت بھی ہنکا کر لیجا سکتا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر نیچے خیالات کی کوئی اور علامت ہو سکتی ہے۔؟"

اتنے بڑے مجمع میں ہر سن و سال کی مرد اور عورتیں موجود تھیں مگر کسی میں یہ جرات نہ ہو سکی کہ اس کی اس حقیقت بیانی کی تردید میں کچھ کہتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سروں پر پرند بیٹھ گئے ہیں۔ اس کے آخری جملہ پر مجمع میں کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ وہ خود ہی سمجھ رہا تھا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ بہت کچھ ہے۔ آخر ایک آدمی اٹھا اور بولا: "جب تم نے ہمارا مرض پہچان لیا ہے تو اس کا علاج بھی تجویز کرو۔" یہ آدمی حسین شکنتلا کا باپ تھا۔ بھودھر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ اس گاؤں میں ایسے آدمی بھی ہیں جو اونچے خیالات کے ساتھ ساتھ نڈرپن کے بھی مالک ہیں۔ سنئے! اس کمزوری کا علاج بہت آسان ہے۔ یا تو آپ سب نے اپنا مقدر سمجھ لیا ہے۔ لیکن آپ چاہیں تو اپنے ہاتھوں اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ دنیا میں آپ کے بھائیوں نے پہاڑ کاٹے ہیں، دریاؤں کے رخ بدلے ہیں، جنگلوں کو صاف کر کے میدان بنائے ہیں —— چوٹیوں پر اپنے جھنڈے گاڑے ہیں —— سمندروں پر حکومت کی ہے —— آپ بھی ویسا

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

کلہن کی راج ترنگنی

اودے نارائن تیواری

راج ترنگنی سنسکرت کا مشہور رزمیہ (EPIC) ہے جس کا مصنف کشمیر کا شاعر اعظم کلہن ہے۔ کلہن نے ۱۱۴۸ء میں راج ترنگنی کی تصنیف شروع کی اور ۱۱۵۰ء میں یعنی دو سال کے عرصہ میں پوری کر دی۔ راج ترنگنی کے ہر باب کو شاعر نے "ترنگ" یعنی لہر کا نام دیا ہے۔

راج ترنگنی کے کچھ حصوں کا ترجمہ سب سے پہلے فارسی میں ہوا۔ یہ ترجمہ کشمیر کے بادشاہ زین العابدین (۱۴۲۱ - ۱۴۷۲) کے ایک درباری عالم نے کیا تھا جس کا نام خود مترجم نے بحر الاسمار رکھا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہانیوں کا سمندر۔ تقریباً سو سال بعد جب اکبر اعظم کے عہد میں کشمیر سلطنت مغلیہ کا ایک جز بنا تو بحر الاسمار اس کے ہاتھ لگی۔ اس نے مشہور مورخ عبد القادر بدایونی کو ۱۵۹۴ء میں اس ادھورے ترجمہ کو پورا کرنے کا حکم دیا۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ ترجمہ کا کام جب کچھ آگے بڑھا تو ایک دن شہنشاہ اکبر نے مجھے اپنے دیوان خاص میں بلایا اور پوری رات ترجمہ سنتے رہے۔ ترجمہ سننے کے بعد اکبر نے کہا کہ بحر الاسمار کی زبان بہت مشکل ہے جس کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ پھر اس نے اس سنسکرت رزمیہ (EPIC) کا آسان زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نے کشمیر کی قدیم تاریخ پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کلہن کے اس رزمیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اسے کلہن ہی کی تخلیق بتایا ہے۔ حیدر ملک نام کے ایک کشمیری رئیس نے بھی راج ترنگنی کا فارسی میں مختصر ترجمہ کیا ہے۔ ایک فرانسیسی ڈاکٹر فرانکوئس برنیر نے ۱۶۶۴ء میں کشمیر کا سفر کیا تھا۔ اس نے حیدر ملک کے ترجمہ کا تذکرہ کیا ہے۔ گزشتہ صدی کے شروع میں سر ولیم جانسن کو بھی کلہن کی راج ترنگنی کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا

سن ۱۸۱۹ء کے بعد سے کشمیر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ رنجیت سنگھ کے حکم سے مورکرافٹ ۱۸۲۲ء میں سری نگر گئے۔ انھیں کشمیری زبان میں لکھی ہوئی راج ترنگنی کا اصل مسودہ دستیاب ہوا۔ بعد میں اسی مسودے کو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے ۱۸۳۵ء میں کلکتہ سے کتاب کی شکل میں شائع کرایا۔ اسی اثنا میں ۱۸۲۵ء ڈاکٹر ایچ ایچ ولسن نے "کشمیر کی ہندو تاریخ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں راج ترنگنی کے پہلے چھ باب کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔

راج ترنگنی کا مکمل ترجمہ اصل سنسکرت سے پہلی بار فرانسیسی زبان میں شائع ہوا جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے یہ سنسکرت رزمیہ پہلے پہل کتابی شکل میں ۱۸۳۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے پانچ سال بعد کلکتہ سنسکرت کالج کے پرنسپل ایم ٹوردیز نے ابتدائی چھ باب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا۔ ۱۸۵۲ء میں انھوں نے اسے مکمل کیا۔ ۱۸۷۹ء کے آس پاس یوگیش چندر دت نے راج ترنگنی کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ شنکر پانڈورنگ پنڈت نے بھی اس کے کئی پدوں (اشعار) کا ترجمہ کیا ہے اور کلہن کی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ شنکر پانڈورنگ مرحوم رنجیت سیتا رام پنڈت کے چچا تھے جنھوں نے ۱۹۳۲ء میں راج ترنگنی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

کلہن کے اس معرکۃ الآرا رزمیہ (EPIC) کی اہمیت اس لئے

بھی ہے کہ اس زمانے کے سماجی اور معاشرتی حالات کی پوری جھلک اس میں موجود ہے۔ اونچے طبقے مثلاً راجپوتوں اور برہمنوں سے لے کر دبے کچلے طبقوں اور پس ماندہ قوموں۔ ڈوموں اور چنڈالوں تک کی جیتی جاگتی تصویر کلہن نے پیش کی ہے۔

کلہن نے راج ترنگنی کی کہانی گاندھار (مشرقی افغانستان) سے شروع کی ہے۔ گاندھار رگ وید اور اوستا کے زمانے سے بھی ہندوستان کے آریو اور ایرانیوں کا سنگم رہا ہے۔ یونانی حملے کے کئی صدی بعد تک گاندھار یونانی اور بودھ کلچر کا مرکز رہا ہے جس میں ایرانیوں نے بھی حصہ لیا۔ راج ترنگنی کے پہلے تین ابواب پر بودھ اثر صاف صاف نمایاں ہے۔ بدھ مذہب کے جذبات ترحم ان ابواب کے اشعار میں بیت بس سے گئے ہیں۔ ان میں عدم تشدد اور سب کچھ لٹا دینے کی ذہنیت دکھائی پڑتی ہے۔

راج ترنگنی کے واقعات یوں تو گونند سوئم (۱۱۹۴ قبل مسیح) سے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کے دور کے حوالے بھی ملتے ہیں جن سے دوسرے راجاؤں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ البتہ چوں کہ ان راجاؤں کے بارے میں کوئی خاص مواد نہیں تھا اس لئے کلہن ان کے سنہ میں تاریخیں بتانا مناسب نہیں سمجھتے۔ تیسرے باب تک یہی سلسلہ چلتا ہے۔ پھر چوتھے باب سے تاریخیں ملنی شروع ہو جاتی ہیں۔ جسے انھوں نے کوگک یگ (۶۱۴ سے ۴۴۳ عیسوی قبل مسیح تک) کا نام دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے بعد کلہن نے جو تاریخی تفصیل پیش کی ہے اس کی صداقت سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

راج ترنگنی کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کلہن سنگ تراشی، آثار قدیمہ اور دوسرے فنون کے بارے میں معلومات ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اس میں انھیں پوری دستگاہ بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ راج ترنگنی میں آثار قدیمہ، آرٹ اور فن سنگ تراشی کی جزئیات تک ملتی ہیں۔

راج ترنگنی کے بارے میں کلہن کا خود قول ہے کہ یہ محض ایک گرانقدر تاریخ ہی نہیں ہے بلکہ شاعرانہ تخلیق کا ایک بیش بہا نمونہ ہے۔ کلہن ایک مورخ ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک عظیم شاعر بھی تھے اور یہ سعادت انھیں بزور بازو نہیں نصیب ہوئی تھی۔ انھوں نے تاریخ کے تانے بانے سے شاعرانہ تخیل کے اعجاز دکھائے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو راج ترنگنی کشمیر کی قدیم تاریخ بھی ہے۔ کلہن خود کشمیری تھے اسی لئے ان بے شمار ادیبوں، شاعروں اور تاریخ دانوں کے برعکس جنھوں نے کشمیر کو موضوع بنا کر طبع آزمائی کی ہے یا ان کی تاریخ لکھی ہے، کلہن کے یہاں کہیں زیادہ گہرائی،

وسعت اور کلاسکی رنگ ملتا ہے۔ وہ عوام کو قدیم کلچر کا وارث سمجھتے ہیں، وہ انھیں رحیم اور جلاد، باوفا اور احسان فراموش، ارادوں کے مستحکم اور ہمت و استقلال کے پیکر کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ جب وہ عوام کو جلاد کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں یا ان کا تمسخر کرتے ہیں تو اس وقت بھی وہ انھیں ذلیل نگاہوں سے نہیں دیکھتے اور ان کے تمسخر میں بھی ہمدردی کا جذبہ جھلکتا ہے اور یہیں کلہن کی عظمت کے جوہر کھلتے ہیں۔ کلہن ایسے مورخ نہیں جو محض واقعات گنا کر الگ ہو جائیں۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ محب وطن بھی ہیں۔ انھیں مادر وطن سے پیار ہے۔ دیش کے جھرنوں اور اس کے سبزہ زاروں سے وہ محبت کرتے ہیں۔ انھیں کشمیر کے پہاڑوں، اس کی برف پوش چوٹیوں، گھاٹیوں، وادیوں، مرغزاروں، جھیلوں، باغوں، زعفران زاروں سے الفت ہے۔ انھیں کشمیر کی اس صبح شام سے بھی پیار ہے جو بے شمار گلابوں کو اپنے دامن میں لئے شاعر کے استقبال کے لئے تیار رہتی ہے۔

کلہن کے کردار اپنے زمانے کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ زمانہ قدیم کے بارے میں خاص معلومات ہمیں راج ترنگنی کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ کلہن نے اپنی تخیل سے کام لیکر قدیم زمانے کے لوگوں کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے ان کی وضع قطع، لباس، طرز ماندوبود، نشست و برخاست اور کھانے پینے کے طور طریقے، ان کے عقائد، مرد و عورت کے تعلقات، اپنے مسائل کو حل کرنے کے تدبیر و وسائل غرض سبھی چیزیں واضح اور معین شکل میں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کلہن صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک زبردست مفکر، عظیم ماہر نفسیات اور ایک بے مثل عالم بھی تھے جن کی دقیقہ سنج اور دور رس نگاہیں ماضی، حال اور مستقبل کا یکساں تجزیہ کر سکتی تھیں۔

کلہن نے اپنے اس تاریخی اور کلاسکی شاہکار کی ابتدا بارھویں صدی کے اس دور سے کی ہے جب پوروں کے مطلق العنان امرا ایک دوسرے سے برسر پیکار اور جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے۔ ان کا تخیل انھیں سری نگر پر بھی حملہ آور دیکھتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ان امرا کے سرداروں، سپاہیوں، آلات حرب، زرہ بکتر، گھوڑوں اور تلواروں کا بھی تذکرہ تفصیل سے کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ امرا اور سردار بچپن ہی سے فن سپہ گری حاصل کرتے تھے گویا تلوار چلانا ان کے لئے ایک کھیل تھا جو ان کی گھٹی میں پڑا ہوتا۔ اس ضمن میں کلہن ان امرا کے چالاک درباریوں، مصاحبوں، بھاٹوں اور ان

دوشیزاؤں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ان کی محفلوں اور خلوتوں کی زینت رہا کرتی تھیں، کشمیر کا ذکر آتے ہی ان کا دل عقیدت و احترام اور حب الوطنی کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اس جنت نظیر خطۂ ارض اور اس کے مختلف دل کش مقامات، مندروں، مشہور آشرموں کی تصویر ان کا جادو نگار قلم عجیب حسین انداز میں کھینچتا چلا جاتا ہے۔ اس تصویر کشی کے دوران وہ ہمیں ایک تاریخی نکتہ سے بھی روشناس کراتے ہیں کہ کشمیر کی بنیاد اشوک اعظم نے رکھی تھی۔

مناظر قدرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ تاریخ، جغرافیہ، ادب، کلچر، فنون لطیفہ، انسانی احساسات و جذبات، سماجی و معاشرتی حالات، قوانین حکومت غرض کوئی ایسا شعبہ اور پہلو نہیں ہے جو کلہن نے پیش نہ کیا ہو اور جو ان کے ہمہ گیر علم اور شاعرانہ عظمت کا سکہ پڑھنے والوں کے دلوں پر نہ بٹھا دیتا ہو۔

راج ترنگنی کے ہر باب کے شروع اور آخر میں جو بند دیں ہیں جو گریز نظر آتا ہے اس کا مقصد مناظر کی تبدیلی اور تخیل کی پیش کش کے لئے زمین ہموار کرنا یا اسٹیج تیار کرنا ہوتا ہے۔ بیچ بیچ میں قدرتی مناظر اور مختلف جانوروں اور پرندوں کی عادتوں کی جو شاعرانہ تصویر پیش کی ہے اس سے اور ان کے عادات و خصائل کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف تھے اور ان کی دلچسپی کو قائم رکھنے میں انھیں پوری پوری قدرت حاصل تھی۔ کلہن کو ہندوستان کی قدیم لوک کتھاؤں سے بڑی محبت تھی۔ سمندر منتھن (سمندر متھنے) گنگا وترن (اس دنیا میں گنگا جی کی آمد) کا ذکر اس کا ثبوت ہے۔ کشمیر میں آم، تاڑ، شیر اور گرد وغیرہ نہیں ہوتے لیکن راج ترنگنی میں ہمیں ان کا ذکر بھی دل کش انداز میں ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلہن پورے ہندوستان کو کتنا قریب سے جانتے تھے اور ان کی معلومات کتنی وسیع تھیں۔ راج ترنگنی کا شاعر اپنے ناظرین سے استدعا کرتا ہے کہ وہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں اور جلد بازی سے کوئی فیصلہ کرنا نہ واقعات و حقائق کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھیں اور فوری رائے قائم کر دیں۔ ہومر کی طرح کلہن بھی عالمگیر شاعر ہیں جن کی عظمت کبھی اور کسی زمانے میں کم نہیں ہو سکتی۔

راج ترنگنی کی تصنیف اس زمانے کی ہے جب مشرق اور مغرب دونوں سامنتی جنگل میں جکڑے ہوئے تھے۔ زور آور قومیں کمزور قوموں کو ختم کرتی جا رہی تھیں۔ دنیا اس وقت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی، زور آور ... انقلاب ہوئے آٹھ صدی پہلے کا زمانہ تب اس وقت تک بار بار اور نیا پہلو تھا نہ کبھی ایسا دھیں ہوئے تھے۔ زندگی کے مسائل اس وقت بھی تھے، حاکم و محکوم، غلام اور آقا، آجر و مزدور کا سوال اس زمانے میں بھی تھا لیکن اس وقت جمہوریت یا جمہوری نظام اور مساوات کا کوئی تصور نہ تھا اور نہ ان مسائل کو حل کرنے کا جذبہ بیدار ہوا تھا۔ پھر انسانی حقوق کی وکالت اور شخصی حکومتوں کے جبر و تشدد کے خلاف آواز بلند کرنے کا سوال ہی کیا تھا۔ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ادیب ہو یا شاعر اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ زندگی کے گوناگوں مسائل سے آنکھیں بند کر لے۔ کلہن جذبات کے شاعر نہ تھے، وہ گل و بلبل ہی کے افسانے نہیں سناتے تھے، عشق و محبت ہی کے گیت نہیں گاتے تھے بلکہ ان کی شاعری میں اس زمانہ کے حالات کی پوری جھلک نمایاں ہے۔ وہ ایک حساس دل پہلو میں رکھتے تھے۔ ظلم و جور، غلامی، انسانی حقوق کی پامالی، عدم مساوات کو دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ راجاؤں پر وہتوں اور ان کی صداقتوں کا ذکر پیش کرتے ہیں یا ان پر رائے زنی کرتے ہیں تو اس ذیل میں عام انسانی حقوق کا ذکر بھی ہوتا ہے اور زندگی کی کراہ بھی سنائی دیتی ہے۔ کلہن ایک وزیر کے لڑکے تھے۔ انھیں غریبی اور مفلسی کی کلفتوں اور مصیبتوں کا ذاتی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن ان کا دل غریبوں کے دکھ درد سے بے چین نظر آتا ہے۔ ان کیلئے بے پناہ ہمدردی کے جذبات کا قدم قدم پر اظہار ہوتا ہے۔ وہ بےگار کے رواج کی مذمت کرتے ہیں اور غلاموں کی خرید و فروخت کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ ایک مورخ اور شاعر کی حیثیت سے وہ سماج کے مساوی حقوق و فرائض کی بحث میں نہ پڑ کر انسانی فطرت کی گہرائی تک پہنچتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زندگی کے مسائل مثلاً قحط، اناج کی قیمتوں، ٹیکسوں، سکوں اور سماجی ڈھانچے سے انھوں نے دامن نہیں بچایا بلکہ ان پر بے باکانہ اظہار رائے کیا ہے۔ کلہن کے نظریے کے مطابق تاریخ محض پڑھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ ایسی چیز ہے جو عوام میں بیداری پیدا کرتی ہے اور زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت بخشتی ہے۔ انھوں نے جو تاریخ مرتب کی ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی ہستی کی کامیابی کو ایک سماجی ضرورت سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان

ہستیوں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس کے لئے حالات موافق تھے اور زمانہ سازگار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی حکمران یا اس کی حکومت کی غلطیوں اور خامیوں پر پردہ نہیں ڈالنا چاہتے۔

کلہن کے یہاں ایک اور اہم چیز جو واضح شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ ہے ان کی محدود قومیت کے خلاف بغاوت اور ایک وسیع قومی تخئیل۔ وہ بنگال کے ان بہادروں کی تعریف کرتے ہیں جنہوں نے اس زمانے میں جب کہ جدید ذرائع آمدورفت مہیا نہ تھے کشمیر کا سفر کیا اور جان کی بازی لگا کر اپنے راجہ کے قاتلوں سے انتقام لیا۔ (مشہور ہے کہ بنگال کے کسی راجہ کو کشمیر کے کسی حصہ میں دھوکے سے مار ڈالا گیا تھا۔)

راج ترنگنی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم بھارت میں آریوں نے جو سماجی نظام مرتب کیا تھا اس میں عورت کو پوری آزادی حاصل تھی۔ سنسکرت زبان میں "پردہ" کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ راجاؤں کے پاس کئی رانیاں ہوتی تھیں اور جہاں وہ رہتی تھیں اسے سنسکرت میں "انتھہ پور" یا "شدہانت" کہتے تھے۔ سنسکرت ادب اور ڈراموں کی طرح راج ترنگنی سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں میں پردے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ کشمیر کی رانیوں کا تخت راجاؤں کے تخت کے پہلو میں ہوتا تھا۔ رانیوں کا خزانہ اور ان کے وزیر علٰحدہ ہوتے تھے۔ رانیاں بھی حکومت کے کاموں میں عملی دلچسپی لیا کرتی تھیں۔ راج ترنگنی میں مختلف قوموں کے درمیان شادی بیاہ کے رواج کا بھی ذکر ہے۔ ایک راجہ کی لڑکی کی شادی ایک برہمن کے ساتھ ہوئی تھی۔ کلہن کے قول کے مطابق کشمیر کا سب سے قابل سب سے بہادر اور سب سے لائق بادشاہ کندراوت تھا۔ کندراوت اور اس کا بھائی للتادت دونوں ایک ایسے راجہ کی اولادیں تھیں جس کی بیوی دلی کے قریب روہتک کے ایک بنیا خاندان کی عورت تھی اور یہ دونوں اسی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ یہی نہیں شنکر رمن جو ایک بڑا بہادر اور جری راجہ گزرا ہے اس کی ماں بھی ایک پست طبقے کی لڑکی تھی۔ اس زمانے میں چھوت چھات کی لعنت سے لوگ ناواقف تھے۔ راجہ چکر ورمن نے ایک اچھوت لڑکی سے شادی کی تھی اور اسے رانی بنایا تھا۔ وہ اپنے درباریوں کے ساتھ سری نگر کے پاس رنسطرسوامی نامی ایک مقدس دشنو مندر میں درشن کے لئے جایا کرتی تھی۔ اس کے رشتہ داروں کو وزارتیں بھی دی گئی تھیں۔ راج ترنگنی کے مطابق کشمیر کے راجاؤں نے نہ صرف بھارت کی دوسری قوموں کے راجاؤں سے بلکہ کابل کے ایک خاندان میں بھی شادی بیاہ کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ کلہن کے نزدیک مذہب جغرافیہ کی پیداوار ہے اور سماجی صداقتوں کا عروج تاریخ کی اپج ہے۔

غرض راج ترنگنی ہندوستانی ادب کا ایک شاہکار ہے جس کی افادیت صدیاں گزر جانے کے بعد بھی برقرار ہے اور جس کا مصنف کلہن آج بھی اپنی شاعرانہ بلند پروازیوں، اپنے گہرے مطالعۂ فطرت اور اپنی حقیقت نگاری کی بدولت ہندوستان کے اکابر ترین مورخوں اور شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

✡

اونچا گاؤں (بسلسلہ صفحہ ۲۸)

ہی جسم رکھتے ہیں' آپ کے پاس بھی ویسے ہی دل و دماغ ہیں۔ اگر آپ ہر سال کی غیر ضروری محنت اور ساہوکار کی انسان دشمن امداد سے بچنا چاہتے ہیں تو ابھی سے گاؤں اور ندی کے درمیان باندھ بنانے کا عزم کر لیجئے۔ آپ نے اگر یہ کام کر لیا تو آپ کی آنے والی نسلیں اس سے فائدہ اٹھائیں گی اور درمیان سے یہ ساہوکاری کی علامت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہٹ جائے گی ——" یہ کہہ کر اس نے کسی اور کی بات کا انتظار کئے بغیر ایک پتھر کا بڑا سا ٹکڑا اٹھایا اور آگے چلا۔

مجمع خاموش تھا۔ یکایک شکنتلا کے باپ نے ایک پتھر اٹھایا اور بھودھر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گاؤں والوں نے حیرت سے دیکھا کہ اس کے پیچھے شکنتلا بھی ایک پتھر اٹھا کر چل رہی تھی۔ یہ صلائے عام تھی۔ اب گاؤں کے ہر شخص کے پاس ایک ایک پتھر تھا اور وہ سب بھودھر کے پیچھے چل رہے تھے!

ادھر گاؤں میں باندھ بن رہا تھا اور ادھر ساہوکار کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا اس کی سمادھی پر پتھر برسائے جا رہے ہیں۔ شکنتلا البتہ بہت زیادہ مگن تھی۔ کیوں کہ اس نے انسانی جرأت کو ابھار کر گاؤں کے ماتھے سے اس بدنامی کی کالک کو کھرچ کر ندی میں پھینک دیا تھا جو توہمات اور نیچ خیالات کے ہاتھوں برسوں سے لگتی چلی آئی تھی۔

طلسم نارنج

ایم۔ حبیب خاں

داستان گوئی بڑا دلچسپ اور پُرلطف فن ہے۔ ویسے تو یہ ہر ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے لیکن ہندوستان میں اس فن کی حیثیت خاص بلند رہی ہے۔ عرب میں بے شمار داستانیں لکھی گئیں لیکن جو شہرت الف لیلیٰ کو ملی وہ دوسری داستانوں کو کم نصیب ہوئی۔ اس کے کئی ترجمے اُردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ ترجموں میں ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد مرحوم کا ترجمہ سب سے اچھا ہے۔ یہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے ان سب جلدوں کو علیحدہ علیحدہ شائع کیا تھا۔ اصل میں عرب کی داستان گوئی کا شاہکار الف لیلیٰ ہی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں داستان گوئی کا رواج شباب پر تھا۔ لکھنؤ داستان گوئی کا سب سے بڑا مرکز تھا ویسے دہلی اور رامپور بھی داستان گوئی کے مرکز تھے۔

اس زمانہ میں منشی محمد حسین جاہؔ لکھنوی اور منشی احمد حسین قمرؔ لکھنوی بڑے مشہور داستان گو تھے۔ لکھنؤ میں ان کا بڑا دور دورہ تھا۔ جاہؔ نے منشی نولکشور مالک نولکشور پریس کی فرمائش پر "طلسم ہوش ربا" کی شروع کی چار جلدیں لکھی تھیں۔ ان چار جلدوں کی تکمیل کے بعد منشی نولکشور سے معاوضے کے سلسلے میں کچھ جھگڑا ہو گیا جس کی بنا پر وہ منشی گلاب سنگھ لاہوری کے مطبع میں چلے گئے۔ اس کے بعد "طلسم ہوش ربا" کی باقی جلدیں قمرؔ نے ترجمہ کیں۔ الغرض "طلسم ہوش ربا" کا کل سات جلدوں میں ترجمہ مکمل ہوا۔ اس کے بعد قمرؔ نے "بقیہ طلسم ہوش ربا" کے نام سے دو جلدیں علیحدہ سے تصنیف کیں "طلسم ہفت پیکر" (تین جلد) "ہومان نامہ" "طلسم خیال سکندری" (تین جلد) "طلسم فتنہ نور افشاں" (تین جلد)۔ "طلسم نارنج" اور "طلسم نوخیز جمشیدی" (تین جلد) جیسی ضخیم اور دلچسپ داستانیں بھی قمرؔ کے زور قلم کا نتیجہ ہیں اور اُنھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ قمرؔ "طلسم نوخیز جمشیدی" کے بعد "زعفران زار سلیمانی" لکھ رہے تھے کہ ۱۹۰۱ء میں اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ بالآخر اس داستان کی تکمیل تصدق حسین کے ہاتھوں سے ہوئی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ قمرؔ کی اور داستانوں کا تو ذکر آتا رہتا ہے "طلسم نارنج" کے متعلق کم واقفیت پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" جو انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوئی ہے اس موضوع پر بڑی قابل قدر کتاب ہے۔ مگر اس میں بھی "طلسم ہوش ربا" اور قمرؔ کی بقیہ داستانوں کا تو ذکر کیا گیا ہے لیکن "طلسم نارنج" کا کوئی ذکر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر گیان چند کی نظر سے نہیں گزری ورنہ قمرؔ کی دیگر داستانوں کے ساتھ اس کا بیان لازمی تھا۔ یہ کتاب قمرؔ نے "طلسم نوخیز جمشیدی" سے پہلے لکھی تھی اور ان کی حیات ہی میں ۱۹۰۰ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ یہ اُن کے آخری دور کی یادگار ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی مختصر ضخامت میں مضمر ہے۔ جو نقائص اور محاسن قمرؔ کی طویل داستانوں میں موجود ہیں وہی اس میں بھی ہیں لیکن اس کا اختصار مصنف کے زور قلم کی سب سے بڑی خوبی ہے کیونکہ قمرؔ کی لکھی ہوئی اور جلدیں ہزاروں صفحات پر

مشتمل ہیں "طلسم نارنج" دو سو آٹھ صفحوں کی مختصر سی داستان ہے اور "داستان امیر حمزہ" کے پہلے دفتر "نوشیرواں نامہ" کی دراصل ایک کڑی ہے۔ اس اختصار کے علاوہ داستان میں کوئی اور امتیازی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ ایک فرسودہ اور پامال سطح ہے جس کو آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک ایسی داستان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا ماحول تھوڑا بہت بدل جائے تاکہ زیادہ یکسانیت پیدا نہ ہو۔ رزم و بزم، سحر و جادو اور منظر طلسمات کا رنگ نیا ہو۔ مگر قمر نے "طلسم نارنج" میں اس اہم حقیقت کو ایک سرے سے نظر انداز کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "طلسم نارنج" اور داستانوں کی ایک نقل بن کر رہ گئی ہے۔

"طلسم نارنج" میں پلاٹ کو بہت بری طرح الجھا دیا گیا ہے۔ کردار نگاری بہت دھندلی اور غیر واضح ہے۔ ایک مقابلۃً مختصر سی داستان میں واقعات کی اس بے طرح تکرار ہے کہ حسن داستان میں ذرہ بھر بھی اضافہ نہیں ہو پاتا۔ ساحروں کے سحر بہت عام اور بھدا

طلسم نارنج" کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر حمزہ کی غیر موجودگی میں ملک یونان میں انکا لڑکا عمرو بن حمزہ یونانی پیدا ہوتا ہے۔ سات برس ہی کی عمر میں وہ کارہائے نمایاں انجام دینا شروع کرتا ہے۔ پہلوانوں سے جنگ آزمائی کرتے کرتے ایک مرتبہ ساحروں سے الجھ جاتا ہے اور طلسم نارنج کی ملکہ نارنج جادو سے مقابلہ پڑتا ہے۔ آخر خواجہ عمرو کہ سے مدد کے لئے آتے ہیں۔ آخر میں فتح عمرو کی ہی ہوتی ہے۔ داستان کے ہیرو عمرو بن حمزہ ہی ہیں اور یہی کردار ہے جو کچھ ابھر سکا ہے۔

اب اس داستان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:- "عمرو بن حمزہ درخت پر چھپ کر بیٹھے کہ یکایک ایک دریا میں تہلکا پڑا اور مرکب دریائی نکلا۔ چاہا چرنے کو جاؤں کہ عمرو بن حمزہ درخت سے کودے اور اس کی پشت پر جمے۔ وہ مرکب سواری سے آگاہ نہ تھا، بھاگا۔ عمرو بن حمزہ نے گھونسے مارنا شروع کئے۔ گھوڑے کی کاکلیں پکڑے ہوئے اپنے کو اس کی پشت پر جمائے ہوئے ہیں۔ مرکب سارے صحرا میں دوڑتا پھرتا ہے مگر شاہزادے نے اس قدر گھونسے مارے کہ مرکب عاجز ہو گیا۔ ایک نخل کے نیچے آکر ٹھہر لئے" معلوم نہیں قمر نے مرکب دریائی کا کیسے ذکر کیا۔ اس قسم کی کوئی شے سمندر میں نہیں پائی جاتی۔ "الف لیلہ و لیلہ" میں اسکا ذکر ضرور ہے اور قمر نے یہ خیال غالباً وہیں سے لیا ہے۔

طلسم نارنج میں داستان گو جغرافیہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ یونان

اور خوارزم جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہیں اتنے قریب آجاتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے شہزادے ایک ہی جنگل میں شکار کھیلتے نظر آتے ہیں۔

اس داستان میں "الف لیلہ و لیلہ" کا اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ منشی احمد حسین قمر کے الفاظ میں یہ ہو سکتی ہے:- "بابو جے نرائن صاحب ورما مہتمم اخبار نے اس حقیر کو طلب فرمایا اور منظور ہوا کہ "الف لیلہ" تحریر ہو پھر تجویز ہوا کہ "طلسم نارنج" تحریر کی جا دے۔ حقیر نے قلم اٹھایا اور مصروف تحریر ہوا۔" اب "طلسم نارنج" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے یہ معلوم ہوگا کہ "الف لیلہ" اس پر کہاں تک اثر انداز ہوئی ہے:- "..... دیکھا قلعہ میں سناٹا پڑا ہے۔ پھاٹک کھلا ہے۔ کوئی اندر بھی نہیں معلوم ہوتا۔ بسم اللہ کہکر شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کا عجب حال دیکھا کہ جو جس مقام پر ہے پتھر کا بنا ہوا کھڑا ہے یا بیٹھا ہے۔"

داستان میں میلے کا منظر اچھا دکھایا گیا ہے۔ داستان کو مختصر رکھنے کی غرض سے منظر بھی مختصر ہے اور اسی اختصار کی وجہ سے منظر دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:- "بازاروں میں ہنگامۂ عیش و نشاط گرم ہے کسی مقام پر فرش بچھا ہے۔ وہاں چند رئیس بیٹھے ہیں، تماشا میلے کا دیکھ رہے ہیں۔ ایک مقام پر بھٹی شراب کی ہے۔ میخوار جمع ہیں۔ لاؤ لاؤ کی صدا بلند ہے۔ کوئی جھوم رہا ہے، کوئی باتیں بنا رہا ہے، کوئی پکارتا ہے کہ اور شراب لاؤ، پی پی کر مست ہو رہے ہیں۔ ایک طرف تخت پر ساقنیں بیٹھی ہیں۔ لباس بھاری پہنے ہوئے، حقے سنہری سامنے رکھے ہیں۔ نیچے اوپر سرخ ہیں۔ ایک طرف آگ روشن ہے۔ جو کوئی جوان آیا اس نے کچھ پھینکا اور آواز دی۔ بی ساقن صاحبہ بیڑو کا لڑہ پلاؤ تاکہ مست ہو جائیں۔ ساقن نے بٹوا کمر سے نکالا اور لڑہ رکھ کر آگ رکھوا دی۔ پکار کر کہا لیجئے۔ جوان نے آواز دی ذرا منہ تو لگا دو ساقن نے ایک دم لگایا اور حقہ اس جوان کو دیا۔ اس بازار میں بھٹیاریوں کا عجیب ہنگامہ ہے۔ کسی طرف نٹنیاں، بھگتنیں ناچتی پھرتی ہیں۔ کسی جوان کو جو دیکھا دامن اس کا پکڑ لیا اور گانے لگیں۔ جوان نے چونی نکال کر دے دی، وہ آگے بڑھ گئیں۔ سارے میلے میں چرخ لگا رہی ہیں۔ حلوائیوں کی دوکانوں پر ہنگامہ ہے۔ پوریاں پکار رہے ہیں۔ کھانے والے لے رہے ہیں۔ صرافہ و بزازہ و جوہری بازار بڑے تکلف سے آراستہ، جوہری بچے دوکانوں پر بیٹھے ہیں۔

کان میں سونے کے بالے پہنے ہیں۔ ان میں مروارید بے بہا پڑے ہیں دھوتیاں باندھے بھاری انگرکھے پہنے ہوئے عمدہ دلال حاضر ہیں۔ گاہک کو راضی کر رہے ہیں۔"

تخیل کی بلند پروازی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔ "تھوڑی دور راستہ طے کر کے طرف آسمان کے سر اُٹھایا۔ دیکھا سات ستارے آسمان پر چمک رہے ہیں۔ شاہزادہ انھیں کے نشان پر چلا۔ ان ساتوں ستاروں میں اس قدر روشنی ہے کہ تمام صحرا روشن ہو رہا ہے۔ شاہزادہ انھیں ستاروں کی روشنی میں روانہ ہوا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ وہ ساتوں ستارے آسمان سے اُترے۔ ایک باغ تھا اس میں جا کر غائب ہوئے۔"

جس زمانے میں یہ داستان وجود میں آئی وہ ایک طرح سے ادبار کا زمانہ تھا۔ اُمرا اور عوام دونوں شمشیر زنی کو بھول چکے تھے اور دادِ عشرت دینے میں مشغول تھے۔ کبھی جنگ کا موقع پڑ جاتا تھا تو اپنے آپ کو کشت و خون سے علیحدہ رکھنے یا بزدلی کا مظاہرہ کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان داستانوں میں لڑائیوں اور جنگوں میں وہ صداقت بیانی نہیں پائی جاتی جو بزدلوں کا نقشہ کھینچنے میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ خیال آرائی میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو کسی سچی چیز کو دُہرانے میں مل سکتی ہے۔ داستان گو کو چونکہ اس قسم کے واقعات سے سابقہ پڑتا رہا ہے اس لئے وہ اس حقیقت کو زیادہ خوبی سے بیان کر سکا ہے۔

"وہ لوگ جو سفارشی تھے انھوں نے جو سُنا کہ صبح کو معرکہ آرائی ہے اور ساحروں سے لڑائی ہے ان کا اس خبر سے یہ حال ہوا کہ لحظہ بلحظہ بیٹھا بیٹھا درد پیٹ میں شروع ہوا۔ دمبدم پاخانے جانے لگے۔ ساتھ والوں سے کہہ رہے ہیں کہ سنو بھائیو یہ نوکری ملک الموت کا سامنا ہے۔ جان بچا کر نکل چلو اگر ان کی فتح ہوئی تو پلٹ آئیں گے۔ اگر کوئی پوچھے گا کہ تم لوگ کہاں تھے ہم کہہ دیں گے کہ میدان جنگ میں تھے۔ قضا نے بھی بچ گئے۔ دیکھیے اس سبب کیا خلعت ملتا ہے اور اگر شکست ہوئی تو خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست۔ سپاہی کے [illegible] جگہ بانگ کھائیں گے۔ کسی نے کہا میری خالہ [illegible] کہہ رہے ہیں کہ ہم تو اپنے زعم میں مرے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے ہمزاد کو دیکھا تھا کہ اس کے دھڑ پر سر نہیں ہے بعضے سوتے سوتے چیخیں مار کر اٹھ بیٹھے۔ کسی نے پوچھا بھائی خیر تو ہے۔ جواب دیا کہ نانی اماں کو ابھی روتے ہوئے دیکھا۔ بعضے سوتے سوتے ہائے وائے کرنے لگے کسی نے پوچھا کہ کیا ہوا کہا ہم نے ابھی خواب میں دیکھا کہ چار طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔ کہیں بھاگنے کی جگہ نہیں ملتی۔ یہ کہا اور چلّا کر اپنے چاکروں کو بلایا۔ کہا جلد گھوڑے پر زین کھینچو۔ اس نے کہا خداوند صبح کو لڑائی ہے یہ وقت سوار ہونے کا نہیں ہے بدنام ہو جائیے گا۔ اس کو جھلّا کر جواب دیا۔ تمہارا مطلب ہم سمجھے۔ تم چاہتے ہو کہ ہم مارے جائیں۔ تم ہمارا مال لیکر مزے اُڑاؤ۔ ہم تمہاری خوشی نہ کریں گے۔ ابھی بھاگے جاتے ہیں۔ یہ کہا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ بعضے بدحواس پھر رہے ہیں اتفاقاً طلایہ کے جو لوگ آئے سواروں کو دیکھا اور بیچ مشعلیں روشن دیکھ غل مچانے لگے کہ یارو ہوشیار ہو جاؤ۔ دشمن نے شب خون لیا ہے پھر تو کسی نے یہ تحقیق نہ کی کہ شب خون کدھر آیا۔ یہ کہتے ہوئے نکل گئے۔ گھبرا کر ہزاروں لینا لینا جانے نہ پائے کہکر اُٹھے اور چلے گئے۔ دم بھر میں سارا لشکر خالی ہو گیا۔ شاہزادہ اٹھ کر باہر آیا۔ دیکھا لشکر میں ہلڑ ہے۔ لوگ بھاگے جاتے ہیں۔ یکایک ستارہ سحری آسمان پر چمکا....."

"کہا دیکھو صاحبو اس شیر نے پیچھا نہ چھوڑا یہاں آ کر شب خون مارا۔ دیکھیں تقدیر کیا دکھائے۔ چند کس غلغلہ کرتے ہوئے بھاگے۔ جس طرف خیمے جل کر گر رہے تھے کچھ لوگ اس طرف سے بھاگے۔ بعضے پڑے ہوئے سو رہے تھے۔ آواز جو شاہزادے کی کان میں پہنچی گھبرا کے اُٹھے۔ چادر کے بدلے زیر جامہ کھینچا مگر لھنگا ہاتھ میں آیا۔ مہریوں میں ہاتھ ڈال دئے۔ بعضے لڑے بھڑے ہتھیار لگا کر اُٹھے۔ باہر آ کر گھوڑا تیار کیا۔ ہر مقام پر جنگ دیدہ و کار آزمودہ تھے گھوڑے پر سوار ہوئے مگر منہ طرف دُم کے کیا اور پشت طرف منہ کے..... ادھر سے نقابدار لڑتا بھڑتا آتا تھا۔ اس کے ساتھ والوں نے مارے تلوار کی مار کے ٹکڑے اُڑا دئے۔ اس طرح پر ہزاروں قتل ہوئے نقابدار نکل گیا۔"

نفس واقعہ میں کوئی ایسی بات نہیں جسے ہم ناممکن کہہ سکیں۔ یہ دونوں مناظر عجب ابتری کا عالم پیش کرتے ہیں۔ ان داستانوں کی ایک عجیب بات یہ ہے کہ قصے عرب و عجم کے ہوتے لیکن اُن کی عقبی زمین تمام تر ہندوستانی ہوتی ہے۔ طلسم نا‌ئج میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ چاندی کے کڑے۔ زمیندار۔ کمیدان دار۔ رسالدار وغیرہ قطعاً ہندوستانی ہیں۔

غزل

ھزار لکھنوی

سُنتا ہوں بہار آئی گلشن میں چراغاں ہے
اِک تیرے نہ ہونے سے دُنیا مری ویراں ہے

یہ عقل کے ہنگامے دُنیا کو مبارک ہوں
میرے لئے اِک نعمت میرا دلِ ناداں ہے

جن آنکھوں میں کہنے کو اِک اشک نہیں ممکن
مجھکو انھیں آنکھوں سے اندیشۂ طوفاں ہے

جُز اِک دلِ مستغنی سب ہیچ ہے دُنیا میں
کونین اسی کے ہیں جو بے سر و ساماں ہے

دُنیائے محبت کی ہر بات نرالی ہے
جینا ہے بہت مشکل مرنا یہاں آساں ہے

یہ ارض و سما مانا محکوم ملائک ہیں
اللہ غنی لیکن انسان پھر انساں ہے

ارباب خرد کو بھی دعویٰ ہے محبت کا
اے ذوقِ جنوں تھم جا یہ غم ابھی ارزاں ہے

کچھ لغزشیں کام آئیں ایماں کے سنورنے میں
ہم اہلِ محبت پر باطل کا بھی احساں ہے

مشاطۂ ہر حسنِ دوراں جسے ہونا تھا
وہ ہاتھ ہزار اب تک مشغولِ گریباں ہے

غزل

ساحر لکھنوی

غمِ زمانہ تقاضائے آگہی تو نہیں
جسے حیات سمجھتا ہوں موت ہی تو نہیں

جدھر نگاہ اُٹھاتا ہوں میں اُجالا ہے
یہ شمعِ بزمِ تمنا کی روشنی تو نہیں

بُتانِ تازہ ادا پر ہے جان و دل قرباں
کمالِ عشق کا مقصود کافری تو نہیں

نہ ملتفت ہو تری چشمِ ناز کیا معنے
کہیں مری ہی محبت میں کچھ کمی تو نہیں

فریبِ وعدہ، فریبِ نظر، فریبِ کرم
حیاتِ حُسن، مسلسل فریب ہی تو نہیں

نظارے اور بھی ہیں ذوقِ جستجو کے لئے
بہارِ لالہ و گُل حُسنِ دائمی تو نہیں

زمانہ کیوں مری مستی پہ طنز کرتا ہے
پرستشِ نگۂ ناز مے کشی تو نہیں

فضا پہ چھائی ہوئی ہے جو دلکشی بن کر
ترے ہی حُسنِ تکلم کی نغمگی تو نہیں

بہت اُداس ہے دل زلف و رُخ کی بات کرو
حیات صرفِ غمِ روزگار ہی تو نہیں

تکلفات سے بھرپور گفتگو کیسی
ترے لئے ترا ساحر اب اجنبی تو نہیں

شُتر مُرغ

عالیہ بیگم

شترمرغ، دنیا کی عجیب ترین مخلوقات میں سے ہے اور اُسکی سب سے دل چسپ چیز یہ ہے کہ وہ نہ تو دوسری چڑیوں کی طرح اُڑ سکتا ہے، نہ درختوں پر بسیرا کرتا ہے اور نہ چہچہاتا ہے، مگر اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ اُس کا پرندوں میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ اُسے دنیا کا سب سے بڑا پرندہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

دنیا کے اس سب سے بڑے پرندے کے لئے "شترمرغ" بڑا "اسم با مسمّیٰ" نام ہے۔ اس کے معنی ہیں "اونٹ جیسا مُرغ" اور وہ ہے بھی کئی باتوں میں اونٹ سے مشابہ۔ اُونٹ ہی کی طرح اس کی گردن لمبی ہوتی ہے۔ پیٹھ پر کوبڑ یا کوہان ہوتا ہے اور تلوے گدّے کی طرح نرم ہوتے ہیں۔ اس کی چال بھی ویسی ہی ہوتی ہے اور اونٹ کی طرح ریگستان کے سخت اور کٹیلے پودے بھی کھاتا ہے۔ شترمرغ کی چار قسمیں ہیں جن میں سے ایک شمالی افریقہ، شام (سیریا) اور عرب کے ریگستانوں میں پائی جاتی ہے اور باقی تین وسطی اور جنوبی افریقہ میں۔

شترمرغ سات سے لے کر آٹھ فیٹ تک اونچا اور ۳۰۰ پونڈ تک وزنی ہوتا ہے۔ مادہ نر سے کچھ چھوٹی ہوتی ہے۔ مادہ اور کمسن نر کے پر بھورے ہوتے ہیں اور جوان نر کے چمکدار سیاہ۔ نر کی دُم میں اور بازو کے کنارے کنارے جو پَر اُگتے ہیں وہ سفید اور لمبے ہوتے ہیں۔

شترمرغ کا سر بہت چھوٹا اور چپٹا ہوتا ہے۔ یہ اس کے جسم کا سب سے نازک حصہ ہے۔ گردن تقریباً ۴ فیٹ لمبی اور کافی مضبوط ہوتی ہے۔ سر اور گردن میں برائے نام روئیں ہوتے ہیں۔ ران کے نچلے حصے میں پَر نہیں ہوتے۔ گردن اور ران کی کھال کا رنگ گوشت کی طرح لال ہوتا ہے لیکن یہ خصوصیت شمالی افریقہ کے شترمرغ کی ہے۔ جنوبی افریقہ کے شترمرغ کی گردن اور ران کی کھال نیلگوں ہوتی ہے اور سومالی لینڈ کے شترمرغ کی ہلکی سُرمئی۔

اپنی لمبی گردن اور بڑی بڑی آنکھوں کی وجہ سے وہ میلوں تک دیکھ سکتا ہے۔ اس کے کان بھی بڑے تیز ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ ریگستانوں اور کُھلے میدانوں میں رہتا ہے اس لئے ذرا سی آہٹ پا کر ہوشیار ہو جاتا ہے۔ اگر وہ چوکنّا نہ رہے تو درندوں کا شکار ہو جائے۔

شترمرغ کے ہر پاؤں میں دو اُنگلیاں ہوتی ہیں۔ ایک بڑی، دوسری چھوٹی۔ بڑی انگلی اس کے سارے وزن کو سادھتی ہے۔ چھوٹی محض سہارے

سکے لئے ہے۔ شترمرغ کی لات گھوڑے کی لات سے زیادہ سخت ہوتی ہے اور یہی اُس کا خاص ہتھیار ہے۔ جب کوئی جانور اُس کی طرف رخ کرتا ہے تو وہ لاتوں ہی سے اُس کی خبر لیتا ہے۔ اس کی ایک ٹھوکر سے لگڑ بگھے اور بھیڑیے (بھیڑیے) کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے پاؤں کی انگلیوں سے پتھر بھی پھینک سکتا ہے اور جب حملہ کرتا ہے تو چونچ بھی استعمال کرتا ہے جو چھوٹی، چپٹی، چوڑی لیکن بہت مضبوط ہوتی ہے۔

شترمرغ بڑا طاقتور جانور ہوتا ہے وہ اپنی پیٹھ پر دو آدمیوں کو لے کر بھاگ سکتا ہے اور معمولی گاڑی کھینچنے کے لئے صرف دو شترمرغ کافی ہیں۔

شترمرغ کھاتا بھی بہت ہے۔ گھاس، پتیاں، پھل، کیڑے اور چھوٹی چڑیاں اس کی غذا ہیں۔ اگر اسے بھوک لگی ہو تو وہ کپڑے جوتے اور رسیاں بھی کھا جائے گا۔ کھانا ہضم کرنے کے لئے جیسے چڑیاں چھوٹی چھوٹی کنکریاں نگل جاتی ہیں اسی طرح شترمرغ بھی پتھر، اینٹیں، سکے، شیشے اور لوہے کے ٹکڑے (کیلیں، پیچ وغیرہ) نگل جاتا ہے۔ یہ چیزیں کھانے کو کوٹنے پیسنے میں مدد دیتی ہیں لیکن کبھی کبھی شترمرغ ان کے کھانے سے مر بھی جاتا ہے۔ کسان اس سے بہت ڈرتے ہیں کیونکہ اگر شترمرغ کا جھنڈ کھیت میں پہونچ جائے تو اُسے صاف کر کے رکھ دیتا ہے۔ شترمرغ ریگستان میں کئی دنوں تک بغیر پانی کے بھی زندہ رہ سکتا ہے لیکن جب پانی مل جاتا ہے تو بہت پیتا ہے اور خوب نہاتا ہے۔

شترمرغ مل جل کر رہنا پسند کرتے ہیں اور وہ دس بیس کا جھنڈ بنا کر زیبرا، زرافے، ہرن اور دوسرے چرندوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ جب انڈے دینے کا زمانہ آتا ہے تو وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ جاتے ہیں ہر نر دو سے لے کر سات مرغیوں کے ساتھ رہتا ہے۔ مادہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے شترمرغ عجیب نخرے کرتا ہے۔ اپنی گردن سیدھی کر کے ناچتا ہے۔ اپنے پروں کو پھیلا لیتا ہے۔ زمین پر بیٹھ کر اپنے بازوؤں سے مادہ کو ہوا دیتا ہے۔ عموماً وہ خاموش رہتا ہے اور اپنی مادہ کو مرعوب کرنے کے لئے البتہ کبھی کبھی آواز نکالتا ہے۔ اس کی آواز شیر سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ تجربے کار شخص ہی دونوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ دھاڑتے وقت اس کی گردن بہت پھول جاتی ہے لیکن چونچ بند رہتی ہے۔

شترمرغ بالو میں اپنی انگلیوں سے بالو کو کرید کر گڈھا بناتا ہے اور اس میں شترمرغ کی ہر مادہ تقریباً دس انڈے دیتی ہے۔ ہر مادہ دن میں باری باری انڈے سیتی ہے اور رات میں نر۔ چونکہ مادہ کے پروں کا رنگ بھورا ہوتا ہے اس لئے وہ دن میں بآسانی نظر نہیں آتی۔ نر کے پروں کا رنگ کالا ہوتا ہے اس لئے وہ رات میں دکھائی نہیں دیتا۔ غالباً حفاظت کے خیال سے قدرت نے انھیں یہ دلچسپ طریقہ سکھایا ہے۔ مشہور تو یہ ہے کہ جب شترمرغ ڈر جاتا ہے تو بالو میں اپنا سر چھپا لیتا ہے لیکن یہ بات غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ انڈے سیتے وقت اپنے سر اور لمبی گردن کو زمین پر رکھ لیتا ہے اور دُم اونچی کر لیتا ہے۔ غالباً وہ انڈوں کی حفاظت کے لئے یہ کرتا ہے کیونکہ اس حالت میں وہ دور سے گھاس پھوس کے درمیان پتھر کا ٹکڑا، دیمک کا ٹیلہ یا جھاڑی معلوم ہوتا ہے۔

شترمرغ کا انڈا کافی بڑا ہوتا ہے اور اس کا چھلکا موٹا اور سفید ہوتا ہے۔ جنوبی افریقہ کے باشندے ان چھلکوں کے پیالے بناتے ہیں۔ ایک انڈے کا وزن تقریباً ۲ پونڈ ہوتا ہے اور دو درجن مرغی کے انڈوں کے برابر ہوتا ہے۔ کھانے میں اس کا ذائقہ اچھا ہوتا ہے۔ اُسے پوری طرح اُبالنے میں چالیس منٹ لگتے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے باشندے اس کے انڈے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ اُسے پانی میں نہیں اُبالتے بلکہ آگ پر رکھ دیتے ہیں اور اوپر کی طرف سوراخ کر کے ایک کانٹے دار لکڑی سے اُسے ہلا ہلا کر تھی کی طرح پکاتے ہیں۔ انڈے نکالتے وقت وہ انڈوں کو ہاتھ سے نہیں چھوتے بلکہ ایک لمبی لکڑی کی مدد سے انھیں نکالتے ہیں تاکہ نر یا مادہ مداخلت کرنے والے کی بُو پا کر اپنا "گھونسلہ" نہ چھوڑ دیں۔ جب تک مادہ کو اس حرکت کا پتہ نہیں چلتا وہ اسی جگہ انڈے دیتی رہتی ہے۔ بسا اوقات نر مادہ دونوں انڈوں کو بالو سے ڈھک کر کہیں چلے جاتے ہیں اور دھوپ کی گرمی سے بچہ بنتا رہتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ سورج کی گرمی ہی سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ نر، مادہ شترمرغ محض حفاظت کے خیال سے انڈوں پر بیٹھتے ہیں۔ جب انڈوں پر سے نر مادہ شترمرغ دونوں غائب ہوتے ہیں تو گیدڑ کبھی کبھی ڈبلے پاؤں آ جاتا ہے، انڈوں کو ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے اور جب وہ ٹوٹ جاتے ہیں تو ان کی زردی اور سفیدی چاٹ جاتا ہے۔ بھیڑیے (بندر) بھی شترمرغ کو بہت ستاتے ہیں۔ وہ مادہ کے گرد بار بار گھومتے ہیں۔ اُسے نوچتے کھسوٹتے ہیں۔ وہ ہر بار اپنی گردن موڑ کر انھیں بھگانے کی کوشش

کرتی ہے اور جب پریشان ہو جاتی ہے تو انڈے چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے اور بیرون انڈے کھا لیتے ہیں۔

انڈوں سے بچے نکلنے میں ۶ ہفتے لگتے ہیں۔ ایک دفعہ میں مشکل سے بیس بچے نکلتے ہیں کیونکہ کچھ انڈے تو ٹوٹ جاتے ہیں اور کچھ چوری ہو جاتے ہیں۔ اگر انڈے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور نر کو اُن پر بیٹھنے میں دقت ہوتی ہے تو وہ چار چھ کو ٹھوکر مار کر گھونسلے سے باہر کر دیتا ہے۔ نر کچھ انڈے کھا بھی جاتا ہے اور کچھ اپنے بچوں کو توڑ کر کھلا دیتا ہے۔ شترمرغ کا بچہ انڈے سے نکلنے پر ہمارے یہاں کی عام مرغیوں کے برابر ہوتا ہے۔ بچے انڈے سے نکلتے ہی دوڑنے لگتے ہیں۔ اُن کے جسم پر زردی مائل سفید روئیں ہوتے ہیں جن میں کالی دھاریاں ہوتی ہیں۔ اُن کے ماں باپ اپنے بچوں سے بہت مانوس ہوتے ہیں۔ چھ مہینے میں بچے بڑھ کر اپنے والدین کے برابر ہو جاتے ہیں۔ شترمرغ کی اوسط عمر ۲۵ سال ہے لیکن بعض اس سے زیادہ جیتے ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا پرندہ ہوتے ہوئے بھی شترمرغ اُڑ نہیں سکتا لیکن دوڑ میں وہ عربی گھوڑے سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ پرندوں کے بازوؤں میں اُڑنے کی جو طاقت ہوتی ہے وہی طاقت قدرت نے اُس کی لمبی اور مضبوط ٹانگوں کو دے رکھی ہے۔ ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے اس کے بازو بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ دوڑتے وقت وہ اُن کو پھیلا لیتا ہے۔ وہ شترمرغ کے لئے بادبان کا کام کرتے ہیں اور زمین سے اس کا بوجھ اوپر اٹھانے میں مدد دیتے ہیں۔ جب شترمرغ دوڑنا شروع کرتا ہے تو اس کی رفتار کم سے کم ۶۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ وہ ایک جست میں ۲۵ فیٹ کا فاصلہ طے کرتا ہے لیکن جلد ہی سست پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی عام رفتار پچیس تیس میل فی گھنٹہ رہتی ہے۔ بحرالکاہل کے ساحل پر پاتو شترمرغوں کی دوڑ کا بھی رواج ہے جو گھوڑ دوڑ سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔

گھوڑوں پر سوار ہو کر اُس کا آسانی سے شکار کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ سیدھا نہیں دوڑتا۔ کمان کی طرح قوس بناتا ہوا دوڑتا ہے اور گھڑ سوار سیدھے جا کر اسے پکڑ سکتے ہیں۔ جب شترمرغ پریشان ہو جاتا ہے تو وہ ایک ہی جگہ چکر کاٹنے لگتا ہے اور اُس وقت اور زیادہ آسانی سے اُسے مار سکتے ہیں یا پھندا پھینک کر زندہ گرفتار کر سکتے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے باشندے

اُسے مارنے کے لئے ایک اور طریقہ کام میں لاتے ہیں یعنی شکاری شترمرغ کی کھال اوڑھ کر اس کی حرکات کی نقل کرتا ہے اور جب یہ سب کرتے کرتے وہ قریب پہنچ جاتا ہے تو تیروں سے اُسے مار گراتا ہے۔ عجائب گھروں میں بھیجنے کے لئے شترمرغ زندہ گرفتار کئے جاتے ہیں۔ اُس کا طریقہ یہ ہے کہ جیپ پر بیٹھ کر اس کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ ایک آدمی موٹر کے اگلے حصے پر ایک لمبا بانس پکڑے بیٹھا رہتا ہے۔ اُس بانس کے سرے پر پھندا ہوتا ہے جس میں وہ شترمرغ کی گردن پھنسانے کی کوشش کرتا ہے جیسے ہی شترمرغ اُس میں پھنس جاتا ہے موٹر روک لیا جاتا ہے۔ سب لوگ موٹر سے کود پڑتے ہیں اور شترمرغ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں مگر اسی کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ کہیں لات نہ مار دے۔ پکڑنے کے بعد اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے اور ایک ہوادار صندوق میں بند کر دیا جاتا ہے۔ ایک اچھے شترمرغ کی قیمت آج کل ۵۰۰ ڈالر (تقریباً ۲۵۰۰ روپے) ہوتی ہیں۔

جوان شترمرغ کا گوشت کھانے میں برا نہیں ہوتا لیکن بڑے شترمرغ کا گوشت روکھا سوکھا ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں روم کے شہنشاہ شترمرغ کے بھیجے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ شترمرغ کی کھال کے جوتے، سوٹ کیس بنتے ہیں لیکن اُس کے جسم کی قیمتی چیز اُن کے بازوؤں اور دُم کے سفید پر ہیں۔ نر کے بازوؤں کے پر خوشنما اور قیمتی ہوتے ہیں۔ مادہ کے پر گھٹیا اور سستے ہوتے ہیں۔ پر حاصل کرنے کے لئے شترمرغ کا شکار زمانۂ قدیم میں بھی ہوتا تھا۔ قدیم مصری لوگ انہیں زیبائش کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل یورپ اور امریکہ میں شترمرغ کے پروں کی بڑی مانگ تھی۔ انہیں ٹوپیوں میں لگایا جاتا تھا اور اُن کے پنکھے بنائے جاتے تھے۔ شترمرغ کے پر حاصل کرنے کے لئے انہیں پالا بھی جاتا ہے۔ شترمرغ سب سے پہلے ۱۸۶۵ء میں کیپ کالونی (جنوبی افریقہ) میں پالے گئے۔ اُس برس تو وہاں صرف ۸۰ شترمرغ پالے جا سکے لیکن اس کے بعد ان کی تعداد میں جتنا غیر معمولی اضافہ ہوا اس کا اندازہ حسب ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔

۱۸۶۵ء	۳۲۰۰۰
۱۸۹۱ء	۱۵۰۰۰۰
۱۹۰۴ء	۳۶۰۰۰۰

سال ۱۹۱۱ء ——— ...۷۵

جنوبی افریقہ شترمرغ کے پروں کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار سے معلوم ہوگا کہ شترمرغ کے پروں کی کتنی مقدار یہاں سے باہر بھیجی گئی اور اس کی کتنی آمدنی ہوئی۔

سال	وزن	قیمت
۱۸۸۲ء	۲۵۳۹۵۴ پونڈ	۱۰۹۴... پونڈ
۱۸۹۳ء	۲۵۹۹۲۳ پونڈ	۴۶۱۵.. پونڈ
۱۹۱۳ء	۱ پونڈ	۳ پونڈ

پہلی جنگ عظیم میں شترمرغ کے پروں کی مانگ بہت کم ہوگئی تھی اور جن پرندوں کی قیمت ۱۵۰ ڈالر تھی وہ ۵ ڈالر میں بکنے لگے تھے۔ جب بازار بہت گر گیا تو دو لاکھ سے اوپر شترمرغ مار ڈالے گئے۔ بہرحال جنوبی افریقہ میں اب بھی لاکھوں پالتو شترمرغ پالے جاتے ہیں۔ پالتو شترمرغ کے پر اس وقت سے کاٹے جاتے ہیں جب وہ چھ مہینے کا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر ساتویں مہینے یہ عمل ہوتا رہتا ہے لیکن اچھے پر چار سال کی عمر کے بعد ہی ملتے ہیں جب شترمرغ بالغ ہو جاتا ہے۔ انڈے دینے کے زمانے میں پر نہیں کاٹے جاتے کیونکہ ان سے انڈوں کو چھپانے میں مدد ملتی ہے۔

پر کاٹنے کے لئے شترمرغ کو ایک لکڑی کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا ہے جس میں صرف کھڑے ہونے کی جگہ ہوتی ہے۔ پر نوچے نہیں جاتے بلکہ تراشے جاتے ہیں۔ ان کی کھونٹیاں ایک یا دو مہینے کے بعد نکال دی جاتی ہیں یا اپنے آپ گر جاتی ہیں اور دوسرے پر نکلنے لگتے ہیں۔

شترمرغ کے ہر بازو سے تقریباً ۳۰ اور دم سے ۶۰ پر بیچنے کے لائق نکلتے ہیں۔ ہر شترمرغ کے جسم سے سالانہ ۱۸ سے ۲۱ آونس تک پر حاصل کئے جاتے ہیں۔ آدھ سیر میں ۱۲۰ سے لے کر ۲۰۰ تک پر چڑھتے ہیں ان کا بھاؤ ان کی مانگ پر منحصر ہے۔ گرم بازاری کے زمانے میں آدھ سیر پر ۱۰۰ پونڈ کے فروخت ہوتے ہیں۔ شترمرغ کے پروں کی مانگ یورپ اور امریکہ میں اب بھی بہت ہے۔ اس کا ۸۵ فی صدی حصہ جنوبی افریقہ کے فارموں سے آتا ہے۔ باقی ۱۵ فی صدی شمالی افریقہ (الجیریا، مصر وغیرہ) آسٹریلیا اور امریکہ مہیا کرتے ہیں۔ امریکہ میں شترمرغ کیلیفورنیا، ایریزونا اور دوسری ریاستوں میں پالے جاتے ہیں۔

فارسی شاعری عہد مغول متاخرین میں

(بسلسلۂ صفحہ ۱۰)

(بسلسلۂ صفحہ ۱۰)

صراحت ہے کہ کس شاعر کی غزل کے جواب میں ہے۔ جن غزلوں پر کوئی عبارت درج نہیں وہ غیر جوابی ہیں۔

خمسۂ نظامی کی تقلید میں بہت قدیم زمانے سے مثنویاں لکھی جا رہی تھیں۔ عہد مغول متاخرین میں خمسۂ نظامی کی طرز پر خمسے تو شاید نہیں لکھے گئے، لیکن بعض مثنویوں کے جواب میں مثنویاں بڑی کوشش و کاوش سے تصنیف کی گئیں۔ خان آرزو نے جو مثنویاں بطور جواب لکھیں ان کی تفصیل یہ ہے :-

شور عشق یا سوز و ساز در جواب محمود و ایاز زلالی۔
جوش و خروش در جواب سوز و گداز نوعی۔
عالم آب در جواب ساقی نامۂ ظہوری۔
عبرت فسانہ در جواب قضا و قدر سلیم۔

ان کے علاوہ خان آرزو کی مثنویاں اور بھی ہیں لیکن ان کی نوعیت جوابی نہیں۔

مشاعرے بکثرت منعقد ہوتے رہتے تھے جن میں بڑے بڑے شاعر اپنے شاگردوں کی جماعت کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ دہلی میں ناصر علی، بیدل اور گلشن کے عرسوں پر مشاعرے کا خاص اہتمام ہوتا تھا اور خان آرزو کے مکان نے مشاعرے کے دوسرے نام کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے خاکے تیار کرنے کے لئے ورکنگ گروپ ●●● دیہی علاقوں میں خواتین مدرسوں کے لئے رہائشی کوارٹر ●●● امداد باہمی کی ۳۲۱ انجمنیں ●●● تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو روزگار کی فراہمی ●●● مزید نارمل اسکول ●●● دیہی علاقوں میں بہتر بیج کی اسکیم ●●● صنعتی امداد باہمی انجمنوں کی بڑے پیمانہ پر توسیع ●●● دیہاتوں کو نیا روپ دینے کا منصوبہ ●●● دودھ فراہم کرنے والی امداد باہمی انجمنیں ●●● ہریجنوں اور پسماندہ اقوام کے لئے بہتر مکانات ●●● فنی تعلیم کے لئے قرض دینے کی رقم میں اضافہ۔

ریاستی حکومت نے سنہ ۱۹۵۹ء کے آخر تک تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے خاکے تیار کرنے کے پیش نظر زراعت۔ آبپاشی اور بجلی کے متعلق ورکنگ گروپ مقرر کئے ہیں۔ علاوہ ازیں مالی وسائل۔ دیہی اور گھریلو صنعتوں، تعلیم۔ صحت۔ تعمیر مکانات۔ سماجی بہبود اور پسماندہ طبقوں۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل۔ محنت۔ اجتماعی ترقی۔ کھیل کود اور سیر و سیاحت۔ آبادی اور معاشی حالت کے متعلق بھی ورکنگ گروپ مقرر کئے جا رہے ہیں۔

مرکزی وزارت غذا اور زراعت نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ زراعت کے متعلق ریاست کی سطح پر ورکنگ گروپ مقرر کئے جائیں۔ ریاستی محکمہ زراعت نے اس سلسلہ میں مختلف ورکنگ گروپ مقرر کئے ہیں جو متعلقہ مسائل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ امداد باہمی پر ورکنگ گروپ کی پہلی رپورٹ تیار ہو چکی ہے۔

ان ورکنگ گروپوں میں متعلقہ محکموں کے حکام کے علاوہ غیر سرکاری ماہرین جیسے یونیورسٹی کے پروفیسر، فنی اداروں کے افسران اعلیٰ اور صنعت اور انتظامی امور کے ماہرین کو شریک کیا جا رہا ہے۔

ورکنگ گروپ منصوبہ کے نصب العین کو ملحوظ رکھیں گے۔ تیسرے منصوبہ میں یہ خیال رکھا جائیگا کہ سابقہ دو منصوبوں میں جن تعمیری کاموں کا سلسلہ شروع کیا گیا ان کی رفتار تیز تر کر دی جائے۔ اس کے علاوہ ملک کی معاشیات کو مستحکم کرنے کے پیش نظر منصوبہ بندی کو نمایاں اہمیت دی جائیگی۔ تیسرے منصوبہ کے دیگر مقاصد میں قومی آمدنی میں سالانہ ۵-۶ فیصدی اور روزگار کے مواقع میں معقول اضافہ کرنا شامل ہیں۔

تیسرے منصوبہ میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ دوسرے منصوبہ کے مقابلہ میں کفایت شعاری سے کام لے کر زیادہ مالی وسائل پر قدرت حاصل کی جائے۔ ترقی کی رفتار آبادی میں اضافہ کی شرح کے مقابلہ میں تیز تر ہوگی۔ اس امر کی کوشش کی جائیگی کہ زراعت کے ذریعہ پیداوار میں اضافہ کیا جائے تاکہ دیہی عوام کا معیار زندگی بلند کیا جا سکے۔

آبادی اور معاشی حالت کے متعلق ورکنگ گروپ اتر پردیش میں آبادی کے اضافہ کی شرح سن ۱۹۶۵-۶۶ء تک عمر اور جنس کے گروپوں میں اس کی تقسیم اور تعداد اس مسئلہ پر غور کریگا کہ سن ۱۹۶۵-۶۶ء تک کس قدر زراعتی پیداوار کی ضرورت ہوگی۔ سن ۱۹۵۵-۵۶ء میں اتر پردیش میں زراعتی پیداوار کا تخمینہ ایک کرور ۱۶ لاکھ ٹن لگایا گیا تھا۔ منصوبہ بندی کمیشن نے سن ۱۹۶۰-۶۱ء میں مزید ۲۲ لاکھ ٹن اناج پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا۔ اس بنیاد پر سن ۱۹۶۵-۶۶ء کے لئے اناج کی پیداوار کا مقررہ نشانہ تقریباً ۲ کرور ٹن ہوتا ہے جب کہ سن ۱۹۵۸-۵۹ء میں اناج کی پیداوار کا تخمینہ ایک کرور ۳۰ لاکھ ٹن لگایا گیا۔ ورکنگ گروپ اس لئے ٹھیک نشانے مقرر کریگا۔

تمام ورکنگ گروپوں اور خاص طور پر دیہی علاقوں کے مسائل پر غور کرنیوالے ورکنگ گروپوں کو عوام کی قوتوں کو ملک کی ترقی کے لئے بروئے کار لانے کے سوال پر غور کرنا ہوگا۔

دیہی علاقوں میں ایسے بھی پروگرام ہوتے ہیں جن کی تکمیل کے سلسلہ میں عوام یا اس سے مستفید ہونے والوں پر ایک قسم کی قانونی پابندی عائد ہوتی ہے۔ ایسے پروگرام میں کھیتوں کی نالیوں کی دیکھ بھال اور ان کی کھدائی۔ میڑھ بندی اور مٹی کے تحفظ وغیرہ کے کام شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں مقامی لوگوں کو ایسی رواجی پابندیوں کو نافذ کرنے کی ذمہ داری محسوس کرنا چاہئے اور دیہی علاقوں میں پینے کے صاف پانی کی فراہمی، اسکولوں کی تعمیر اور گاؤں سے قریبی شاہراہ اور ریلوے اسٹیشن تک سڑک کی تعمیر کو کم سے کم سماجی خدمت تصور کرنا چاہئے۔

حکومت کی یہ پالیسی رہی ہے کہ سارے گاؤں کے اثاثہ جیسے تالاب، باغات اور چراگاہوں وغیرہ کو منفعت بخش بنانے کے لئے سہولتیں دی جائیں تاکہ دیہی پنچائتوں کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ علاوہ ازیں قرضوں کی سہولتوں کے ذریعہ اجتماعی ترقی کے پروگرام کو کامیاب بنانے کی خاص کوشش کی جائیگی۔

زراعت سے حاصل ہونے والی آمدنی قومی آمدنی کا نصف ہوتی ہے اس لئے مجموعی وسائل میں اس وقت تک کافی اضافہ نہیں ہو سکتا جب تک دیہی علاقوں سے حاصل ہونے والی آمدنی میں اور زیادہ اضافہ نہ ہو۔ اس لئے ورکنگ گروپ اس امر کے امکانات پر غور کرے گا کہ کچھ کاموں کی ذمہ داری مقامی حکام کے سپرد کر دی جائے اور مقامی حکام مزید ترقیاتی اقدامات کے لئے وسائل فراہم کریں۔ ریاست مدراس میں پنچائتوں کو ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری سپرد کرنے کے اقدامات کئے جا چکے ہیں۔

ورکنگ گروپ اس امر پر بھی غور کریں گے کہ مالگزاری پر مزید رقم اور ایسی زمینوں پر جن پر تجارتی فصلوں کی کاشت ہوتی ہے، مخصوص ابواب عائد کرنا کہاں تک قابل عمل ہوگا۔ علاوہ ازیں دیہی علاقوں میں بیمہ اسکیموں کی توسیع پر بھی غور و خوض کیا جائیگا۔

• • •

اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں دوسرے پنجسالہ منصوبہ کی بقیہ مدت میں خواتین مدرسین کے لئے تقریباً ۶۸۵ رہائشی کوارٹر تعمیر کئے جائیں گے۔ ان میں سے تقریباً ۲۳۰ کوارٹر مالی سال رواں کے دوران میں تعمیر کئے جائینگے۔

ریاستی حکومت نے ان کوارٹروں کی تعمیر کے لئے ۱۷٫۱۲ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی ہے۔ جس میں سے ۵٫۷۵ لاکھ روپیہ سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء اور ۱۱٫۳۷ لاکھ روپیہ سے زیادہ سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں صرف ہوگا۔

اس اقدام کا مقصد خواتین مدرسین کی دیہی علاقوں میں کام کرنے کے لئے ہمت افزائی کرنا ہے۔ یہ اسکیم ۹۱۱٫۰۸ لاکھ روپیہ کی اس اسکیم کا اہم جزو ہے جس کا مقصد تعلیم یافتہ اشخاص کی بے روزگاری کم کرنا اور ریاست میں ابتدائی تعلیم کی توسیع کرنا ہے۔ خواتین مدرسین کی رہائش کے بندوبست کا مسئلہ دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔

ایسے مواضعات میں جن کی آبادی ۲ ہزار سے زیادہ ہے اور جہاں کوئی اسکول نہیں ہے۔ لڑکیوں کے لئے پرائمری اسکول کھولنے کے لئے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ آئندہ جولائی سے جو ۱۴۲۰ پرائمری اسکول کھولے جائیں گے ان میں سے ۵۰۰ سے زیادہ اسکول لڑکیوں کے لئے ہوں گے۔ اتر پردیش میں اس وقت لڑکیوں کے لئے تقریباً ۳۲۱۸ پرائمری اسکول ہیں جن کے ذریعہ ۵٫۶۳ لاکھ سے زیادہ طلبا کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ ان اسکولوں پر تقریباً ۵ کرور روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔

اتر پردیش میں اس وقت خواتین مدرسین کی تعداد ۸ ہزار سے زیادہ ہے۔ لڑکیوں کے لئے نئے اسکولوں کے قیام سے ایک ہزار سے زیادہ خواتین مدرسین کو روزگار مہیا ہو جائیگا۔ خواتین مدرسین کے لئے کوارٹروں کی تعمیر دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کی توسیع میں بڑی حد تک معاون ہوگی۔

ہر ایک کوارٹر کی تعمیر پر تخمیناً ۲ ہزار روپیہ صرف ہوگا۔ ہر کوارٹر میں ایک کمرہ ایک باورچی خانہ، برآمدہ اور غسل خانہ ہوگا۔ مالی سال رواں کے دوران میں ۲۳۰ کوارٹر اور آئندہ سال ۴۵۵ کوارٹر تعمیر کئے جائیں گے۔

سن رسیدہ خواندہ خواتین بچوں کی تعلیم اور دیکھ بھال کے لئے مقرر کی جائیں گی۔ ان کو مدرسین کے ضروری تربیتی کورس سے مستثنیٰ کیا جائیگا۔

غیر سند یافتہ خواتین مدرسین کو تربیت دینے کے بھی اقدامات کئے جائیں گے۔ لڑکیوں کے لئے موجودہ ۱۷ بیسک نارمل اسکولوں کے علاوہ مرکزی اسکیم کے تحت اگلے تعلیمی سال کے دوران میں اتر پردیش

میں جو ۴۰۰ نارمل اسکول کھولے جائیں گے ان میں سے کافی تعداد میں اسکول لڑکیوں کے لئے ہوں گے۔

• • •

اترپردیش میں امداد باہمی کھیتی کی انجمنوں کی تعداد اب بڑھ کر ۳۲۱ ہو گئی ہے۔ ان انجمنوں میں ۲۱۱ مشترکہ کھیتی، ۹۶ بہتر کاشت کاشتکاری کی کھیتی کی ایک انجمن اور ۱۱۳ اجتماعی کاشت کی انجمنیں ہیں۔ ان انجمنوں کی زیر کاشت زمین کا کل رقبہ ۲۱۹۰۷ ایکڑ ہے۔ اور ان کا کل سرمایہ حصص ۱۷۲۶۵۴۷ روپیہ ہے۔ ان انجمنوں کے ذریعہ جمع کی گئی رقم بڑھا کر ۵۹۴۱۶۰۱ روپیہ ہو گئی۔

یہ انجمنیں اپنے آبپاشی کے وسائل بڑھانے پر زیادہ توجہ دے رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ضلع دہرہ دون میں رام نگر داندا کھیتی انجمن کے ذریعہ ایک تالاب اور ضلع سہارنپور کی مہراوان سوسائٹی کے ذریعہ ایک پختہ کنواں تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اور بلند شہر کی ذکمہ سوسائٹی اور ضلع اناؤ کی گرجانگر سوسائٹی کے ذریعہ ۲-۲ ٹیوب ویل لگائے جا چکے ہیں۔ ضلع جھانسی کی جیران اور گڑھا بھو دورا کی سوسائٹیوں کے ذریعہ ۲ بندھ تعمیر کئے جا رہے ہیں۔

کانپور کی گرونانک امداد باہمی کاشت انجمن نے آبپاشی کے لئے پکی گولوں کی تعمیر کا کام شروع کیا ہے۔

دہرہ دون کی دیر بھندرا امداد باہمی کاشت انجمن کے ذریعہ ریشم کے کیڑے پالنے کا ایک مرکز قائم کیا گیا ہے جس سے کسانوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور ضلع جھانسی کی جوڑا کھیتی انجمن نے ایک ڈیری کھولی ہے۔ اس انجمن نے ممبروں اور مقامی خریداروں کو دودھ مہیا کرنے کے لئے ۵ گائیں خریدی ہیں۔ کانپور کی ماڈرن کواپریٹو سوسائٹی نے صابن تیار کرنے کا کام شروع کیا ہے۔

• • •

اترپردیش میں جولائی سے تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو روزگار مہیا کرنے کے لئے ۹۱.۰۸ لاکھ روپیہ کی اسکیم شروع کی جائیگی۔ اسکیم کے تحت دیہی علاقوں میں ۳۲۲۸ دو ٹیچر والے اسکولوں میں جو دوسرے منصوبہ کے آخر تک قائم کئے جائینگے، ۶۷۰۰ سے زیادہ اشخاص کو ملازمت دی جائے گی۔ آئندہ تعلیمی سال سے ریاست میں ایسے ۱۴۲۸ پرائمری اسکول کھل جائینگے۔

مرکزی حکومت کی جانب سے شروع کی جانے والی اس اسکیم کا مقصد دوسرے منصوبہ کے دوران میں ملک بھر میں ۶۰ ہزار سے زیادہ تعلیم یافتہ اشخاص کو روزگار فراہم کرنا ہے۔ مختلف ریاستوں کے لئے ۶ سال سے ۱۱ سال کی عمر کے ایسے بچوں کی تعداد کے تناسب سے جن کے لئے تعلیمی سہولت مہیا نہیں ہے مدرسین کی تعداد مقرر کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں اترپردیش میں سن ۶۰-۱۹۵۹ء میں ۲۸۵۰ اور سن ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۳۸۰۰ مدرسین کی تقرری عمل میں آئے گی۔ ان مدرسین کے علاوہ آئندہ دو برسوں میں اسکولوں کے ۱۳۲ سب ڈپٹی انسپکٹر مقرر کئے جائینگے جن میں سے ۵۷ انسپکٹر مالی سال رواں میں مقرر کئے جائینگے۔ اس مقصد کے لئے کل ۳۱۹۲ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے جس میں سے سن ۶۰-۱۹۵۹ء میں ۱۱.۰۳ لاکھ روپیہ خرچ کیا جائیگا۔

اس اسکیم کے تحت تمام اسکول دیہی علاقوں میں کھولے جائیں گے۔ عارضی ضلع پریشدوں کو دو ٹیچر والے ۱۴۰۰ اسکولوں کے لئے فرنیچر اور دیگر سازوسامان کی فراہمی کے لئے ۲ لاکھ روپیہ دیا جا چکا ہے۔ آئندہ دو برسوں میں مزید ۱۴.۶۲ لاکھ روپیہ اس مقصد کے لئے صرف کیا جائیگا۔

دوسرے منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں پہلی یونٹ کے ۱۴۲۸ اسکولوں کے قیام پر ۳۱.۸۲ لاکھ روپیہ سے زائد خرچ ہوگا جس میں سے ۱۹۵۹ء میں ۱۳۴۲۷۷۵ روپیہ خرچ ہوگا۔ دوسری یونٹ کے ۱۹۰۰ اسکولوں پر جو جولائی ۱۹۶۰ء میں کھولے جائینگے صرف سن ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۱۷.۹۱ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔

مدرسین کی تربیت کا پروگرام بھی شروع کیا جائیگا۔ اس سلسلہ میں ہر تربیت پانے والے کو ۱۰ روپیہ ماہانہ کی مالی امداد دی جائیگی۔ آئندہ دو برسوں میں اس پروگرام پر ۱.۶۶ لاکھ روپیہ صرف ہوگا جس میں سے سن ۶۰-۱۹۵۹ء میں ۷۱۲۵۰ روپیہ صرف ہوگا۔

ان اسکولوں کے محل وقوع کے بارے میں فیصلہ ریاستی حکومت کے اس عزم کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جائیگا کہ دیہی علاقوں میں اتنی تعداد میں پرائمری اسکول قائم کئے جائیں کہ ہر گاؤں سے ایک میل کے دائرہ کے اندر کم سے کم ایک اسکول ہو جائے۔

اسکیم کے تحت ایسے مواضعات میں اسکول کھولنے کی تجویز ہے جہاں اسکول موجود نہیں ہیں اور جہاں مقامی باشندے اسکول کے لئے زمین بطور عطیہ دے سکیں اور مقامی وسائل سے اسکول کی عمارت تعمیر کرانے کا یقین دلائیں۔ اسکولوں کے لئے زمین حاصل کرنے کے لئے گرام پنچایتوں اور قومی توسیعی سروس بلاکوں کے وسائل اور تجربات کو بھی بروئے کار لایا جائیگا۔

● ● ●

اتر پردیش میں آئندہ جولائی سے مزید ۴۰ نارمل اسکول کھل جائینگے جس سے ریاست میں ایسے تربیتی اداروں کی مجموعی تعداد ۹۵ ہو جائے گی۔ ریاست میں موجودہ ۵۵ نارمل اسکولوں کے ذریعہ ۲۰۵۰ سے زیادہ طلباکو تربیت دی جاتی ہے اور ان اسکولوں پر تقریباً ۱۹،۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔

تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے آخر تک ۶ سے لیکر ۱۱ سال کے بچوں کو مفت لازمی تعلیم دینے کے متعلق حکومت کی پالیسی کے مطابق یہ اقدام کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے کافی تعداد میں مدرسین کی فراہمی کے لئے تیسرے منصوبہ کے آخر تک تقریباً ۱،۲۰ لاکھ مدرسین کو تربیت دی جائے گی۔

مرکزی حکومت کی جانب سے شروع کی گئی اس اسکیم کے تحت نئے نارمل اسکولوں کو سو فیصدی مالی امداد دی جائے گی۔ اتر پردیش میں نارمل اسکول کھولنے کے لئے سب سے زیادہ یعنی ۱،۳۱ کروڑ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ اس میں سے ۴۹ لاکھ روپیہ عمارتوں کی تعمیر، ۱۱،۶ لاکھ روپیہ فرنیچر اور دیگر سازوسامان کی فراہمی اور ۱۶ لاکھ روپیہ متواتر اخراجات کے لئے مخصوص کیا گیا ہے ہر اسکول کے قیام پر تقریباً ۲،۹۹ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ جس میں سے ۲،۳۰ لاکھ روپیہ عمارت کی تعمیر، ۲۹ ہزار روپیہ فرنیچر اور سازوسامان کی فراہمی اور ۴۰ ہزار روپیہ متواتر اخراجات کے لئے ہے۔

● ● ●

اتر پردیش میں بہتر قسم کی اناج کی پیداوار بڑھانے اور مقامی بیجوں کی کوالٹی بہتر بنانے کے لئے دیہی علاقوں میں امداد باہمی بیج گوداموں کے ذریعہ ہر سال کئی لاکھ من بہتر قسم کے بیج کسانوں کو تقسیم کرنے کی تجویز ہے۔

ریاست کے زراعت اور امداد باہمی کے محکموں نے بہتر بیجوں کی مناسب پیداوار، ذخیرہ اندوزی اور تقسیم کے لئے مشترکہ طور پر ایک حوصلہ مندانہ اسکیم شروع کی ہے۔ اس اسکیم کا مقصد تمام دیہی علاقوں میں ضرورت کے مطابق اول درجہ کے امداد باہمی بیج گودام قائم کرنا ہے۔

اس اسکیم کے مطابق ہر قومی توسیعی سروس بلاک میں دو امداد باہمی بیج گودام اور ایک زراعتی بیج گودام قائم کیا جائیگا۔ موجودہ پنجسالہ منصوبہ کے آخر تک ریاست میں ۸۰۶ قومی توسیعی سروس بلاک قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اس لئے محکمہ زراعت نے ۱۷۵۲ اور محکمہ امداد باہمی نے ۸۴۶ بیج گودام قائم کرنے کا نشانہ مقرر کیا ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر کہ بیج گوداموں کا انتظام عوام کے ہاتھ میں رہے ۱۵ سے لے کر ۲۰ مواضعات پر مشتمل بلاک کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جسکو موضع کی سطح پر تنظیم کی گئی پرائمری سوسائٹیوں کی امداد باہمی یونین کے زیر انتظام امداد باہمی بیج گودام کے ذریعہ بیج فراہم کئے جائینگے۔

ضلع کی امداد باہمی یونینوں کو ملاکر ضلع امداد باہمی فیڈریشن اور ضلع فیڈریشن کو ملاکر ریاستی سطح پر یو۔ پی امداد باہمی فیڈریشن کی تشکیل ہوتی ہے۔ امداد باہمی بیج گوداموں کے انتظامی، نگرانی اور کنٹرول سے متعلق امور متعلقہ یونینوں کے ڈائرکٹروں کا بورڈ سرانجام دیتا ہے۔ امداد باہمی فیڈریشن سے کہا گیا ہے کہ وہ ابتدائی مرحلوں میں یونینوں کے کام کو آگے بڑھانے اور ان کو ضروری سامان مہیا کرنے میں مدد دے۔

بیجوں کے خالص ہونے کی جانچ کرنے کے لئے تمام ریاستی زراعتی فارموں پر عملی مظاہرے کئے جا رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہر قسم کے اول درجے کے بیج مہربند بوروں میں ریسرچ فارموں کو بھیج دئے جاتے ہیں۔ تاکہ عملی مظاہروں کے ذریعہ زیادہ قابل اعتبار اعداد و حقائق حاصل ہو سکیں۔ اول درجہ کے بیجوں کی پیداوار بڑھانے کا یہ ایک مناسب طریقہ ہے جس سے اناج کی پیداوار بڑھانے میں بھی مدد ملے گی۔

امداد باہمی بیج گوداموں کے ذریعہ اب کسانوں کو سستے نرخ پر چارہ کاٹنے کی مشینیں، ہل اور کھاد وغیرہ فروخت کیا جا رہا ہے۔

بیج گوداموں کے لئے بڑی عمارتوں کا انتظام کیا جا رہا ہے تاکہ بڑے پیمانہ پر بیجوں کی تقسیم ہو سکے۔ حکومت نے ۱۰۳ بیج گوداموں کو عمارتوں کی تعمیر کیلئے پانچ پانچ ہزار روپیہ اور اس مقصد کے لئے قرضے دینے کے لئے ۱۰ لاکھ

روپیہ دیا ہے۔

● ● ●

دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں صنعتی امداد باہمی انجمنوں کے قیام کے مقررہ نشانہ کو اترپردیش میں دو سال سے کم عرصہ میں پار کر لیا گیا ہے جس سے گھریلو اور دیہی صنعتوں کے فروغ کے لئے بڑی تعداد میں امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ دوسرے منصوبہ کے تحت مزید ۸۰۰ صنعتی امداد باہمی انجمنوں کے قیام کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں منصوبہ کے پہلے دو برسوں میں ۸۶۹ انجمنیں قائم کی گئیں۔ منصوبہ کے تیسرے سال میں مزید ۵۲۹ انجمنوں کا قیام عمل میں آیا

مالی سال رواں کے دوران میں ۴۰۰ صنعتی امداد باہمی انجمنیں اور دوسرے منصوبہ کے آخری سال میں بھی اتنی ہی یا اس سے زیادہ تعداد میں انجمنیں قائم کرنے کی تجویز ہے جس سے ایسی انجمنوں کی مجموعی تعداد بڑھ کر ۲۰۰۰ سے زیادہ ہو جائے گی۔

صنعتی امداد باہمی انجمنوں کے قیام کے سلسلہ میں اترپردیش دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں پیش پیش ہے۔ اس ریاست میں سب سے زیادہ تعداد میں گھریلو اور دیہی صنعتیں قائم ہیں اور ان صنعتوں کے مناسب فروغ کے لئے امداد باہمی نظام ایک موثر وسیلہ ثابت ہوا ہے۔

اس وقت اترپردیش بھر میں ۲۴۵۰ صنعتی امداد باہمی انجمنیں قائم ہیں۔

مالی سال رواں میں صنعتی امداد باہمی انجمنوں کے قیام کے پروگرام پر تقریباً ۵۳ لاکھ روپیہ صرف ہوگا جس میں سے ۴۰ لاکھ روپیہ کل ہند کھادی اور دیہی صنعت کمیشن مالی امداد اور قرضہ کے طور پر اور ریاستی حکومت ۸۰ء۶ لاکھ روپیہ دے گی۔ علاوہ ازیں امید کی جاتی ہے کہ ریاستی قرضہ اور مالی امداد اسکیم کے تحت کافی رقم دی جائے گی۔

انہی اداروں میں یو۔ پی۔ انڈسٹریل کواپریٹیو بنک لمیٹڈ اور یو۔ پی۔ انڈسٹریل ایسوسی ایشن اپنی ممبر انجمنوں کو آسان شرائط پر قرضے دیتی ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دوسرے منصوبہ کے اختتام سے قبل تقریباً مزید ۳۰ ہزار دستکار صنعتی امداد باہمی انجمنوں کے دائرۂ اثر میں آجائیں گے۔

پہلے منصوبہ کے دوران میں صرف ۲۸۷ صنعتی امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا جس سے انجمنوں کی مجموعی تعداد ۱۰۹۲ ہو گئی لیکن دوسرے منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں مزید ۱۳۵۸ انجمنیں قائم کی گئیں۔ ان انجمنوں کے ۴۰ ہزار ممبر بنانے کا مقررہ نشانہ کو پار کیا جا چکا ہے اور اس وقت ان انجمنوں کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۶۱۰۰۰ ہے جبکہ پہلے منصوبہ کے آخر میں یہ تعداد ۱۱۹۵۹۳ تھی۔

ان انجمنوں کے کاروباری سرمایہ میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ ان کا کاروباری سرمایہ جو سنہ ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۸۷٫۲۰ لاکھ روپیہ تھا سنہ ۵۹-۱۹۵۸ء میں بڑھ کر ۳۱۵٫۱۴ لاکھ روپیہ ہو گیا۔ اس طرح مذکورہ مدت میں ان کا سرمایۂ حصص ۱۷٫۶۶ لاکھ روپیہ سے بڑھ کر ۳۸٫۷۹ لاکھ روپیہ ہو گیا۔

صنعتی امداد باہمی انجمنوں کے بڑھتے ہوئے کاروبار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ گذشتہ سال صرف کپڑے کی پیداوار اور مارکٹنگ سوسائٹیوں نے ۷٫۹۵ کروڑ روپیہ کی مالیت کا ہتھ کرگھا کا کپڑا تیار کیا۔ جبکہ سنہ ۴۹-۱۹۴۸ء میں ان سوسائٹیوں کے ذریعہ تیار کئے گئے کپڑے کی مالیت صرف ۷٫۶ لاکھ روپیہ تھی۔

اترپردیش کی دستکاریوں کے سرکاری ادارہ اور ان سوسائٹیوں کے ۱۶۱ فروخت کے مرکزوں سے سنہ ۵۹-۱۹۵۸ء کے دوران میں تقریباً ۲ کروڑ روپیہ کی مالیت کا کپڑا فروخت کیا گیا۔

ان انجمنوں کے ذریعہ گھریلو اور دیہی صنعتوں کے مالی طور پر مستحکم ہونے میں بہت مدد ملی ہے اور یہ صنعتیں بڑے پیمانہ کی صنعتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئی ہیں۔

● ● ●

ضلع اٹاوہ کے بھرئی پور، جھوالی پور، بیری کا پورہ اور اودت کا پورہ کے مواضعات کے عوام میں ایک نیا جذبۂ عمل پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنے جھونپڑوں کو ریاست کے قصبہ اور موضع کی منصوبہ بندی کے محکمہ کی تیار کردہ ڈیزائنوں کے مطابق از سر نو تعمیر کرنے میں پورے جوش اور خروش سے منہمک ہو گئے ہیں۔

اس جذبۂ عمل کا محرک دیہاتوں کی از سر نو منصوبہ بندی کا وہ منصوبہ ہے جو ریاستی ادارہ منصوبہ بندی تحقیق اور عمل لکھنؤ کی جانب سے شروع کیا گیا ہے۔

ان دیہاتوں کے لوگوں نے ادارہ مذکور کے عملہ کے مشورہ سے خود اینٹیں تیار کی ہیں۔ حکومت نے اس سلسلہ میں ان کو کوئلہ کا چورا مفت فراہم کیا۔ اس کے علاوہ محکمہ ہریجن سہائک کے فنڈ سے معذور۔ بیوہ اور غریب ہریجنوں کو مخصوص امداد دی گئی۔ اب تک ۲ کنبوں نے ٹاؤن اینڈ ویلیج پلاننگ ڈپارٹمنٹ کے مشورے سے تیار کی گئی ڈیزائنوں کے مطابق نئے مکان تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے۔

ان مواضعات کے لوگوں نے خود کوشی کو اپنا دستور العمل بنایا ہے۔ انھوں نے ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ کی مالیت کی ۴۰ لاکھ اینٹیں تیار کرنے کا عزم کیا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حکومت نے اس سلسلہ میں امداد کے طور پر ۳۲ ہزار روپیہ کی مالیت کا کوئلہ دیا ہے۔

اینٹیں تیار کرنے کے کام میں مصروفیت کے باوجود ان مواضعات کے باشندوں نے پانی کی نکاسی کی ۶۰۰ فیٹ لمبی نالیاں اور ۸۰۰ فیٹ لمبی گلیاں تعمیر کی ہیں اور جدید قسم کے ۸ کنویں بھی تعمیر کئے ہیں۔ ان کاموں پر تخمیناً ۱۶۵۰۰ روپیہ صرف ہوا ہے جس کا نصف ادارہ مذکور اور بقیہ نصف عوام نے نقد اور محنت کی صورت میں ادا کیا ہے۔

امداد باہمی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے بھرتی پور اور ہری کا پوروا کے مواضعات کے لوگوں نے گزشتہ ایک سال کی مدت میں دیہات کی از سر نو منصوبہ بندی کی ۲ امداد باہمی انجمنوں کی تنظیم کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے اینٹوں کے بھٹے بھی قائم کئے ہیں۔ ان لوگوں کے جوش و خروش کے پیش نظر یہ امید کی جاتی ہے کہ دوسرے مواضعات بھی بہت جلد تحریک امداد باہمی کے دائرۂ اثر میں آ جائیں گے۔

جدید نمونوں کے مطابق مکانات کی تعمیر کی اسکیم کو آگے بڑھانے کے لئے ریاستی حکومت نے موضع ہری کا پوروا کو ۲۵۲۵ روپیہ۔ موضع اودت کا پوروا کو ۱۵۰۰ روپیہ۔ موضع چنہٹ ضلع لکھنؤ کو ۲۳۷۵۰ روپیہ۔ اور بھرتی پور اور بھوالی پور کے مواضعات کو ۵۵۰۰ روپیہ کے قرضے دئیے ہیں۔ یہ امر اطمینان بخش ہے کہ جتنی اینٹوں کی ضرورت ہوگی گاؤں والوں نے اب تک اس کی ۳۲ فی صدی اینٹیں تیار کر لی ہیں۔

ضلع اناؤ کے مواضعات میں مکانات کی تعمیر کے علاوہ اجتماعی کام جیسے بہتر قسم کے کنوؤں۔ گلیوں۔ نالیوں اور مویشیوں کے باڑہ کی تعمیر کا کام کتنی دور میں مکمل کیا جائے گا۔

• • •

موجودہ پنجسالہ منصوبہ کے تحت دودھ کی سپلائی کی امداد باہمی انجمنوں کے پروگرام میں دیگر بڑے منصوبوں کے علاوہ آگرہ میں دودھ سپلائی کی بڑی اسکیم اور روزانہ ۲ ہزار من دودھ سپلائی کرنے کے لئے لکھنؤ کی دودھ سپلائی یونین کی توسیع شامل ہیں۔

ریاست کے دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں شہری علاقوں میں دودھ کی سپلائی کی ۵ اسکیموں۔ دودھ کے پاؤڈر کی ۲ فیکٹریوں دیہی علاقوں میں مکھن نکالنے کے دو کارخانوں اور دودھ کے ایک ریاستی بورڈ کے قیام اور دودھ کی موجودہ یونینوں کی توسیع کے لئے تقریباً ۱۲ کروڑ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔

اترپردیش میں دودھ کی ۷ امداد باہمی یونین لکھنؤ۔ کانپور۔ الہ آباد۔ وارانسی۔ میرٹھ۔ ہلدوانی اور الموڑہ میں قائم ہیں۔ ان یونینوں کو تقریباً ۱۰۵۰ مواضعات سے دودھ سپلائی ہوتا ہے جس میں سے ۳۵۷ مواضعات میں رجسٹرڈ امداد باہمی انجمنیں قائم ہیں اور بقیہ مواضعات میں انجمنیں قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مذکورہ ذرائع کے علاوہ لکھنؤ اور وارانسی کے دو سرکاری مشینی فارموں سے بھی دودھ حاصل کیا جاتا ہے۔

ان یونینوں کے قیام کے خاص مقاصد دیہی علاقوں سے دودھ حاصل کرنا۔ دودھ دینے والے بہتر مویشیوں اور چارہ کی خریداری کے لئے قرضے دینا شامل ہیں تاکہ گنجان قصبوں اور شہروں میں دودھ کی سپلائی میں اضافہ کیا جا سکے۔ جن مقامات پر دودھ کی یونین قائم ہیں وہاں دودھ کی سپلائی کی صورت حال بہتر ہو گئی ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۹۵۹ء میں کئے گئے تخمینہ کے مطابق اترپردیش میں فی کس ۹۷ء۹ آونس دودھ دستیاب تھا۔ اترپردیش کی آبادی میں تقریباً ۱ فی صدی سالانہ اضافہ ہو رہا ہے۔ دودھ کی کمی کی وجہ سے دودھ سے تیار ہونے والی اشیاء باہر سے منگانا پڑتی ہیں۔ اور کسی کسی سال ۸ یا ۹ کروڑ روپیہ کی مالیت کی اشیاء منگائی جاتی ہیں۔ دودھ کی نئی امداد باہمی انجمنوں سے صورت حال بہتر

ہوجائے گی۔

● ● ●

دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں ہریجنوں، پسماندہ اقوام اور سابق جرائم پیشہ قبائل کے لئے مکانات تعمیر کرنے کے پروگرام کو تیزی سے بروئے کار لایا جائے گا۔ اس سلسلہ میں تقریبًا ۵۰۰ مکانات تعمیر کرنے کے لئے ۲۱ء۱ لاکھ روپیہ کی ایک رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۲۵ء۲۶ لاکھ روپیہ کی رقم قومی توسیعی سروس بلاکوں میں رہنے والے ہریجنوں کے لئے تقریبًا ۳۵۰۰ مکانات کی تعمیر پر صرف کی جائے گی۔

ریاست کے تمام اضلاع میں پس ماندہ اقوام کے لئے بہتر مکانوں کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ ان اقوام کے لئے نوآبادکاری اور زمین کو قابل کاشت بنانے کے متعلق اسکیموں کے علاوہ دوسرے پنجسالہ منصوبہ کی مدت میں ۷۰۰۰، ۳ مکانات تعمیر کرنے کے لئے ۵ء۳۱ لاکھ روپیہ منظور کیا گیا ہے۔ اس رقم میں سے تقریبًا ۴ء۱۰ لاکھ روپیہ موجودہ منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں صرف کیا جا چکا ہے اور تقریبًا ۲۳۶۵ مکانات تعمیر کئے گئے اور ۴۶۶ مکانوں کی مرمت کی گئی۔

آگرہ، اٹاوہ، نینی تال، الہ آباد، بلیا، بدایوں اور سہارنپور اضلاع میں ۳ ہورش بستیاں تعمیر کی جا رہی ہیں جن کے لئے ۶۹۰۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے ۲۰ اضلاع میں فہرست مندرج اقوام کے غریب اور مستحق افراد کو زمین خریدنے اور مکانات تعمیر کرنے کے لئے ۴۰۹۰۰ روپیہ کی مالی امداد منظور کی گئی ہے۔

ریاست میں سابق جرائم پیشہ قبائل کے ۱۰۲ کنبوں کو پھر سے بسانے کے لئے ۵۵ء۲ لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔ ایسے کنبوں میں سے تقریبًا ۴۳ کنبوں کو تقریبًا ۸۰ ہزار روپیہ کے صرفہ سے بسایا جا چکا ہے۔ ضلع دہرہ دون میں ۲۰ کنبوں کو بسانے کے لئے ۴۰۰۰۰ روپیہ کی رقم صرف کی جا رہی ہے۔ دہرہ دون، نینی تال، الموڑہ، گڑھوال، ٹہری گڑھوال، باندہ، جھانسی اور مرزا پور اضلاع کے پس ماندہ اقوام کی فلاح کے لئے بھی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان اضلاع کے لئے دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت منظور شدہ ۱۰ لاکھ روپیہ کی رقم میں سے ۴۹ء۴ لاکھ روپیہ صرف کیا جا چکا ہے۔

پس ماندہ اقوام کی فلاح کی ان اسکیموں کے علاوہ قومی توسیعی سروس بلاکوں میں رہنے والے ہریجنوں کے لئے مکانات تعمیر کرنے کے سلسلہ میں مرکزی حکومت کی جانب سے بھی مالی امداد دی گئی۔ ان لوگوں کے لئے دوسرے منصوبہ کی مدت میں تقریبًا ۵ء۲۷ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے ۵ ہزار مکان تعمیر کرنے کی تجویز ہے تقریبًا ۱۵۰۰ مکانات زیر تعمیر ہیں جن کے لئے ۲۵ء۱۱ لاکھ روپیہ منظور کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سابق جرائم پیشہ قبائل کی نوآبادکاری کے لئے بھی ۳۰ لاکھ روپیہ منظور کیا گیا ہے۔

● ● ●

حکومت اترپردیش نے فنی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو دی جانے والی قرضہ کی رقم ۲ لاکھ روپیہ سالانہ سے بڑھا کر ۴ لاکھ روپیہ سالانہ کر دی ہے۔

فنی تعلیم کے لئے قرضہ دینے کی اسکیم کے ذریعہ جو ۱۹۵۰-۵۱ء سے زیر عمل ہے اب تک تقریبًا ایک ہزار طلبا مستفید ہو چکے ہیں۔ ان میں سے صرف ۱۹۵۸-۵۹ء کے دوران میں ۳۴۲ طلبا کیلئے مالی امداد منظور کی گئی۔ اسکیم کے آغاز سے مجموعی طور پر ۲۷ء۱۹ لاکھ روپیہ کے قرضے دیئے جا چکے ہیں۔

اس اسکیم کے تحت مستحق طلبا کو ملک کے اندر اور بیرونی ممالک میں فنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بالترتیب ۵ ہزار اور ۱۰ ہزار روپیہ تک کے قرضے ایک فی صدی سالانہ شرح سود پر دیئے جاتے ہیں۔

اس اسکیم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۷-۵۸ء میں اس مقصد کے لئے ایک لاکھ ۸۵ ہزار روپیہ دیئے گئے اور ۱۹۵۸-۵۹ء میں یہ رقم بڑھ کر ۳ لاکھ ۹۳ ہزار روپیہ ہو گئی۔ اس اسکیم کی افادیت کے پیش نظر ریاستی حکومت نے دوسرے پنجسالہ منصوبہ کی مدت میں اس مقصد کے لئے مقررہ رقم ۱۰ لاکھ روپیہ سے بڑھا کر ۱۴ لاکھ روپیہ کر دی ہے۔

ریاستی حکومت کی جانب سے اترپردیش کے باہر کے اداروں جیسے انڈین اسکول آف مائنس اینڈ جیالوجی دھنباد، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کھڑگپور اور سبحے اسکول آف آرٹس بمبئی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہر سال ۵۰ روپیہ ماہانہ کے ۳۰ وظیفے دیئے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایسے طلبا کو ۵۰ روپیہ ماہانہ سے لے کر ۱۵۰ روپیہ ماہانہ کے متعدد وظیفے دیے جاتے ہیں جو اداروں کی جانب سے کارخانوں میں اپرنٹس کی تربیت حاصل کرنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔

فنی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے دیگر اقدامات میں تعلیمی فیس کی معافی، فی کس فیس سے مستثنیٰ کرنا، فہرست مندرج اقوام اور پس ماندہ طبقوں کے طلبا کے لئے نشستوں کے تحفظات اور دیگر مخصوص سہولتوں کی فراہمی اور اہلیت کی بنا پر ۵ روپیہ تا ۲۵ روپیہ ماہانہ کے وظیفوں کی منظوری شامل ہے۔

• • •

متفرق

آیورویدک اور طب کے قلمی نسخوں کی اشاعت — آیوروید اور طب اکیڈمی اترپردیش کے صدر کے جاری کردہ پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ اکیڈمی نے آیوروید اور طب کے اعلیٰ معیاری نسخوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پریس نوٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس ایسا قلمی نسخہ موجود ہو اور وہ کسی وجہ سے اس کی اشاعت سے قاصر ہو تو وہ اس کو اکیڈمی کے صدر کو تلسی داس مارگ کے پتہ پر بھیج کر اس کی فروخت کے لئے خط و کتابت کر سکتا ہے۔

• • •

تصحیح

نیا دور کی اشاعت جون ۱۹۵۹ء میں "چند عروضی غلطیاں" کے عنوان سے رشید حسن خاں صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اسمیں تین جگہ ایڈیٹر نیا دور کی طرف سے فٹ نوٹ دیے گئے تھے مگر ان فٹ نوٹوں کے آخر میں لفظ ایڈیٹر کی کتابت نہیں ہوئی۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان فٹ نوٹوں کو ایڈیٹر کی رائے سمجھا جائے۔

مضمون کے آخری پیراگراف (صفحہ ۳۳) میں کاپی غلط جوڑ دی گئی اور پیراگراف کی شروع کی دو لائنیں آخر میں لگا دی گئیں۔ ناظرین کرام تصحیح کر لیں۔

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۵

شراونڑ ۱۸۸۱
اگست ۱۹۵۹ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش لکھنؤ

عنوانات

نوٹ۔ صفحہ ۸ اور صفحہ ۹ کے درمیان ۲ ورق مولانا آزاد کے خطوط کے بلاک ہیں۔

اپنی بات

پندرہ اگست ۱۹۵۹ء کو ہماری آزادی کی بارھویں سالگرہ ہے۔ بارہ برس پہلے اس دن ہم کو ایک غیر ملکی حکومت کے اقتدار سے نجات ملی تھی۔ اس دن کے لئے ہم نے برسوں جدوجہد کی۔ اس جدوجہد نے کبھی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی شکل اختیار کی اور کبھی مہاتما گاندھی کی زیر قیادت تحریک ترکِ موالات اور ستیہ گرہ کی۔ اس جدوجہد میں نہ معلوم کتنی جانیں قربان گاہِ آزادی پر بھینٹ کی گئیں اور نہ جانے کتنوں نے قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ استبدادیت نے ہماری ہر تحریک آزادی کو ہر طرح سے کچلنے کی کوشش کی مگر ہمارا جذبۂ آزادی کسی عنوان سے دبائے نہ دبا بلکہ "ذوق گنہ" ہر "سزا" کے بعد بڑھتا ہی گیا۔ تا اینکہ مجاہدینِ وطن کی قربانیاں بارآور ہوئیں، ہندوستان آزاد ہو گیا اور ملک میں ایک قومی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن آزاد ہندوستان کی قومی حکومت کو اپنے قیام کے ساتھ ہی متعدد پیچیدہ اور اہم مسائل کا سامنا کرنا پڑا مثلاً بے گھروں کی امداد و بحالی کا مسئلہ، اناج کا مسئلہ، ریاستوں کے انضمام کا مسئلہ وغیرہ۔ یہ مسئلے اتنے نازک تھے اور اُن کا حل اتنا دشوار تھا کہ بعض قنوطیت پسند حلقوں سے اس شک و شبہ کا اظہار کیا جانے لگا کہ ہندوستان کی حکومت ان کا حل تلاش نہ کر سکے گی اور ملک میں خلفشار پیدا ہو جائے گا۔ مگر قنوطیت پسندوں کی یہ خام خیالی تھی۔ ہماری مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے تمام دشواریوں کے باوجود اِن مسائل کا حل ڈھونڈھ نکالا اور ملک کو مستقل حیثیت سے ہر معنی میں خود کفیل بنانے، اُس کے باشندوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے اور اُس کی اقتصادی حالت درست کرنے کے لئے پنج سالہ منصوبے وضع کئے گئے۔

پہلے پنج سالہ منصوبہ کی مدت ختم ہو چکی ہے اور دوسرے منصوبہ کے تین سال پورے ہو چکے ہیں۔ اس مدت میں ہمیں اپنے مقاصد میں توقعات سے زیادہ کامیابی ہو رہی ہے۔ ہر طرف باندھ بن رہے ہیں۔ اسکول اور کالج کھل رہے ہیں۔ اسپتال قائم ہو رہے ہیں۔ پل بنائے جا رہے ہیں۔ بھاری صنعتوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ رسل و رسائل کے مزید ذرائع فراہم کئے جا رہے ہیں۔ صنعتی ترقی کے لئے بجلی گھر تیار کئے جا رہے ہیں۔ دیہی علاقہ میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک قائم کئے جا رہے ہیں، غرض ہر طرف تعمیری سرگرمیاں جاری ہیں اور سارے ملک میں حیات نو کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ اپنے وطن میں ایک نئی زندگی کے آثار دیکھ کر ہمارے دلوں میں مسرت کے جذبات موج زن ہونا ایک فطری امر ہے اور یوم آزادی اِس مسرت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ دن، اِس میں کوئی شک نہیں، ہمارے قومی تہوار کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے ساتھ ہر سال ایک درخشندہ تر اور تابناک تر مستقبل کا پیغام لاتا ہے۔ مگر اِسی کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں ایک اہم چیز کی یاد دلاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ابھی ہمارا سفر ختم نہیں ہوا۔ آزادی، ہمارے سفر کی پہلی منزل تھی اور منزلِ مقصود پر ہم اُس وقت پہنچیں گے جب ہمارا ملک اناج کے مسئلہ میں خود کفیل ہو جائے، جب ہمارا معیارِ زندگی بلند تر ہو جائے، جب ہم کسی بیرونی امداد کے محتاج نہ ہوں، جب ہمارے گھروں کا گوشہ گوشہ علم کی روشنی سے منور ہو جائے، جب ہماری اقتصادی بنیادیں مضبوط ہو جائیں اور جب ہندوستان کا شمار دنیا کے خوش حال ترین ملکوں میں ہونے لگے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمارے پیش روؤں نے ہمیں آزاد کرانے کے لئے جان و مال کی قربانیاں دیں۔ اِس آزادی کو مستحکم بنانا اور ملک کی اقتصادی اور سماجی حالت کو درست کرنا ہمارا فریضہ ہے اور یوم آزادی ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اِس مقدس فریضہ کو بحسن و خوبی انجام دیں۔ عوام کے تعاون اور کوششوں کی بدولت ہمارے پنج سالہ منصوبوں کو کامیابی ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ تعاون اور کوشش کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ راہ پُر خار ضرور ہے مگر ہمیں یقین ہے کہ ہمارے عوام پاؤں کے آبلوں سے گھبرا نہ جائیں گے اور منزلِ ترقی کی طرف بڑھتے ہی جائیں گے!

ہمیں مسرت ہے کہ "نیا دور" کے اسپیشل نمبر کے لئے مشاہیرِ اہلِ قلم نے ہماری قلمی معاونت فرمائی اور وقت کی کمی کے باوجود ہمیں اپنے خصوصی مقالات اور نظموں سے سرفراز کیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض دوسرے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے مقالات ہمیں بہت دیر میں موصول ہوئے اور ہم انہیں اِس اشاعت میں شامل نہ کر سکے۔ بہرحال "نیا دور" اپنے اِن تمام کرم فرماؤں کا شکر گزار ہے اور امید کرتا ہے کہ اسے اِن سب حضرات کی نیز دوسرے لکھنے والوں کی اعانت ہمیشہ حاصل رہے گی۔

ایڈیٹر

مولانا ابوالکلام آزاد کے چند غیر مطبوعہ خطوط

عبدالماجد دریابادی

غالی معتقدین تو اپنے ہیرو کو عرش معلیٰ پر ہی پہنچا کر دم لیتے ہیں لیکن احتیاط و اعتدال سے بھی پورا کام لینے کے بعد اتنا تو بہرحال ماننا ہی پڑتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے معاصرین میں ایک بڑا ممتاز مرتبہ رکھتے تھے اور نہ صرف ذہنی، فکری، علمی، ادبی، بلکہ بعض اخلاقی کمالات کے بھی مالک تھے۔

ان کی پبلک تحریریں جس معیار کی ہیں وہ تو ظاہر ہی ہیں۔ لیکن ان کی سیرت کے بعض جوہر ایسے ہیں جو ان کی خانگی یا نجی ہی تحریروں میں زیادہ چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان کی مطبوعہ تحریر سے الگ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ان سے بالکل مختلف ـ مثلاً

(۱) الہلالی دور کے مضمونوں اور مقالوں میں طنز و تعریض کا عنصر نمایاں و غالب نظر آئے گا لیکن عین اسی زمانہ کے مکتوبات میں یہ عنصر نام کو بھی نہیں نظر آتا۔ اور مولانا (ایڈیٹر الہلال سے الگ) تمام تر سادگی و سنجیدگی کی تصویر نظر آتے ہیں۔

(۲) اس دور کے مضمون اور مقالے جوش خطابت اور شعلہ بیانی کی نذر ہیں۔ مکتوبات میں اس کے برعکس، مولانا بجائے ایک جذباتی انسان کے ہر طرح متوازن و معتدل اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے والے انسان کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔

(۳) نکتہ چینوں کو اس دور کی مطبوعہ تحریروں میں بوئے انانیت محسوس ہوتی ہے، ذاتی خطوط کا نقشہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں جلوہ آرائیاں تواضع، انکسار و اخلاص ہی کی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پختہ عمری کے بعد مولانا کی پبلک تحریروں میں بھی یہ رنگ ایک حد تک آچلا تھا، پھر بھی یہ رنگ نمایاں خطوط ہی میں ہے اور ابتدائی اور درمیانی دور کی مطبوعہ تحریریں تو بالکل ہی دوسرے رنگ کی ہیں۔

انسان کے ظرف کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو یہی دیکھنے پر قناعت نہ کیجئے کہ اس کا برتاؤ دوستوں اور معتقدوں کے ساتھ کیسا ہے، بلکہ دیکھئے کہ معترضوں، نکتہ چینوں اور مخالفوں کے ساتھ کیسا ہے۔ یہ امتحان ایک کڑا امتحان ہے۔ اچھے اچھے عابد و زاہد بزرگ بھی اس امتحان میں ہمیشہ پورے نہیں اتر پاتے۔ مولانا کو اللہ نے اس نعمت خصوصی سے نوازا تھا کہ وہ اپنے مخالفین کے لئے بھی دل میں جگہ رکھتے تھے اور ان سے معاملہ رکھنے میں اپنے حلم، رواداری اور عالی ظرفی کا پورا ثبوت دیتے رہتے۔

ان حالات میں یہ کچھ ضروری سا معلوم ہوا کہ مولانا کے یہ نجی کے خطوط جو تعداد میں بہت تھوڑے ہیں دنیا کے سامنے پیش ہو جائیں۔ گو ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن سے خود مکتوب الیہ کی خودستائی کا پہلو نکل رہا ہے۔

اُن خطوط کی جو مجھے وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) مکتوب مورخہ ۱۲ر اگست ۱۹۱۲ء
(۲) مکتوب مورخہ ۷ر دسمبر ۱۹۱۲ء
(۳) مکتوب مورخہ ۲۶ر مئی ۱۹۱۳ء
(۴) مکتوب مورخہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۳ء
(۵) مکتوب مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

(۶) مکتوب مورخہ ۱۵ر مارچ ۱۹۱۸ء
(۷) مکتوب مورخہ ۱۶ر مارچ ۱۹۱۸ء
(۸) مکتوب مورخہ ۱۸ر جنوری ۱۹۱۹ء
(۹) مکتوب مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۱۹ء
(۱۰) مکتوب مورخہ ۲ جنوری ۱۹۲۰ء
(۱۱) مکتوب مورخہ ۲۷ر جنوری ۱۹۲۰ء
(۱۲) مکتوب مورخہ ۲۹ر جون ۱۹۲۳ء
(۱۳) مکتوب مورخہ ۳۶ر اکتوبر ۱۹۲۶ء
(۱۴) مکتوب مورخہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۶ء
(۱۵) مکتوب مورخہ ۱۳ر نومبر ۱۹۲۹ء
(۱۶) مکتوب مورخہ ۱۹ر جولائی ۱۹۴۵ء
(۱۷) مکتوب مورخہ ۱۱ر فروری ۱۹۴۶ء
(۱۸) مکتوب مورخہ یکم اپریل ۱۹۴۸ء
(۱۹) مکتوب مورخہ ۲۲ر مئی ۱۹۴۸ء

(۱)

الہلال

۱۰۸ میکلاوڈ اسٹریٹ کلکتہ

۸-۱۲

صدیقی العزیز

والا نامہ پہنچا۔ آج بسہ مہلت ملی تو میں صبح کے وقت کہ ذہن و دماغ کے سکون اور جمعیت کا وقت ہوتا ہے اول سے آخر تک پڑھا۔ یقین فرمایئے کہ اس مخلصانہ اظہار رائے و مشورہ کیلئے کمال متشکر اور ممنون ہوں میں آج ہی تفصیلی طور پر اپنی معروضات بھی عرض کرتا لیکن خود بیمار ہوں۔ گھر میں شب سے سخت علالت دو چار دن کی مہلت دیجئے۔ انشاء جمعرات یا جمعہ کے دن خط لکھوں گا۔

آپ کا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ مولانا شبلی یہیں مقیم تھے ان سے پوچھا تھا اور خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

مولانا شبلی کی بھی الہلال کے لب و لہجہ کی نسبت وہی رائے ہے جو آپ کی ہے۔

فقیر ابوالکلام

مولانا کے محفوظ خطوں میں یہی سب سے پہلا خط ہے۔ مکتوب الیہ اس وقت بی اے پاس کر کے ایم۔ اے میں (فلسفہ لیکر) داخل ہونے کی فکر میں تھا اور اُس وقت مسلمان طالب علم کے لئے یہ ایک حد تک نئی سی بات تھی۔ الہلال کو نکلے ہوئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا۔ علی گڑھ کے خلاف اس کی شدید اور تند پالیسی سے مکتوب الیہ متفق نہ تھا اور یہی مولانا کو مفصل خط میں لکھ بھیجا تھا۔

مولانا شبلی تو علی گڑھ کی سیاسیات کے خود ہی بہت مخالف تھے، تاہم الہلال کی حد تک جانے کو تیار نہ تھے۔

صاحب الہلال کا مرتبہ اس وقت بھی بلند تھا۔ یہ ان کا نہایت کرم تھا کہ ایک طالب علم سے دوستانہ لہجہ اختیار کئے ہوئے تھے۔

لفظ "صدیقی" جس سے یہ مکتوب شروع ہوا ہے اور آئندہ بھی عموماً اسی سے سارے مکتوب شروع ہوتے رہیں گے، عربی کا لفظ صَدِیق بر وزن فعیل کریم ہے۔ نہ کہ اردو میں چلا ہوا لفظ صدّیق (دال مشدد کے ساتھ) اور اس کے معنی دوست کے ہیں۔

(۲)

الہلال

۷-۱ میکلاوڈ اسٹریٹ کلکتہ

۱۲-۰

صدیقی العزیز

سخت نادم ہوں کہ خط کا جواب وقت پر نہ دے سکا و خواستگار معافی۔

امید ہے کہ آپ بہ صحت و عافیت ہوں گے۔ یہ سنکر نہایت خوشی ہوئی کہ آپنے ایم۔اے میں فلسفہ لیا ہے نیز تحصیل زبان جرمن۔

مولوی عبدالقادر صاحب خط کا جواب نہیں دیتے۔

امرتسر میں نے خطوط لکھے اور عرصے تک انتظار کیا۔
میرا سلام پہنچا دیجئے۔

ابوالکلام

مکتوب الیہ لکھنؤ چھوڑ کر اب علی گڑھ پہنچا ہو (لکھنؤ میں ایم اے میں فلسفہ کی تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا)۔ علی گڑھ میں پروفیسر ہوروئز (جرمن یہودی مستشرق) سے جرمن زبان میں کچھ شُد بُد شروع کر دی گئی اور وہ شُد بُد سے آگے بڑھی ہی نہیں۔

مولوی عبدالقادر بھاگلپوری بھی ایم اے ہی کے طالب علم تھے فلسفہ میں کوئی اور مضمون لئے ہوئے مسلک قادیانی (احمدی) رکھتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اُن کے علم و نظر کے مداحوں میں تھے۔

(۳)

الہلال

دیر آمدی اے نگار سرمست
زودت ندہیم دامن از دست

صدیقی الاعز

عطیۂ گرامی کا شکریہ۔ حسب الارشاد دو نمبروں میں شائع ہو جائے گا۔

کیا آپ اس کو پسند فرمائینگے کہ البصائر کے لئے جو ایک ماہوار غیر سیاسی خالص علمی و دینی پرچہ ہوگا جو جولائی سے شایع ہو جائے گا کوئی مضمون مخصوص ارقام فرمائیں؟ کسی اہم علمی موضوع پر ہو اور ترجمہ ہو یا بطور خود۔

ایک مستقل کتاب کے زیر ترتیب ہونے کی خبر پڑھکر خوشی ہوئی۔

البصائر کے لئے مضمون ۱۵۔ جون تک ضرور مل جانا چاہیئے۔ پہلا نمبر مدت سے مرتب ہے۔ صرف بعض ابواب باقی ہیں۔

مخلصکم الوفی
ابوالکلام

جناب عبدالماجد بی۔ اے۔ اسکوئر
گھیاری منڈی لکھنؤ

"مستقل کتاب" سے اشارہ مکتوب الیہ کی "فلسفۂ جذبات" کی جانب ہے۔ اس کتاب کا ایک باب دو نمبروں میں چھپنے کے لئے الہلال کو پیش کیا گیا تھا۔ الہلال نے اُسے چھاپا تو لیکن بعض مصطلحات پر ایک تنقیدی نوٹ دیکر، جس کا لہجہ مولانا کے مکتوب کے محبت آمیز لہجہ سے بالکل مختلف تھا۔ البصائر کا نکلنا اس وقت یاد نہیں پڑ رہا ہے۔

(۴)

الہلال

صدیقی العزیز

آپ کا مضمون پہنچا لیکن آپ نے کسی قدر جلدی کی۔ میری تحریر ناتمام ہو۔ میں اُسے بجنسہٖ الہلال میں شائع کر دوں گا مگر اپنی بقیہ تحریر کے ساتھ یا بعد۔

آپ کے غصہ نے بڑا لطف دیا۔

لکھنؤ میں مولوی ظفر حسن صاحب کے متعلق آپ سے گفتگو ہوئی تھی اور یہ بات قرار پاگئی تھی کہ وہ کچھ دنوں کے لئے آکر یہاں ٹھہریں۔ لیکن پچھلے دنوں ان کا ایک خط مرادآباد سے آیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اس قرار داد کی کچھ خبر نہیں۔ اب غالباً وہ لکھنؤ میں ہوں گے۔ جو گفتگو آپ سے ہوئی تھی وہ ان سے فرما دیجئے۔ اب تک اس کا پورا موقع باقی ہو کہ وہ تشریف لائیں۔

ہاں یہ آپ کو معلوم ہو کہ آج کل مسلم گزٹ کا اڈیٹر کون ہو؟

ابوالکلام

الہلال کے تنقیدی نوٹ کے جواب میں ادھر سے بھی ایک مضمون ترکی بہ ترکی لکھا گیا تھا۔ مکتوب میں مکتوب الیہ کے غصہ کا حوالہ اسی جوابی مضمون کے سلسلہ میں ہے۔

ظفر حسن خاں سے مراد ہیں آج کے خان بہادر ظفر حسین خاں؛

ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز، اور ریٹائرڈ پرنسپل، شیعہ کالج لکھنؤ۔ لکھنؤ کینگ کالج میں مکتوب الیہ کے خصوصی دوستوں میں تھے، اور اُسی کے توسط سے مولانا سے ملے تھے، جب وہ سول اینڈ ملٹری ہوٹل (آج کے برلنگٹن ہوٹل) لکھنؤ میں مقیم تھے۔ مولانا انھیں الہلال کے اسٹاف میں لینے کو آمادہ تھے۔

مسلم گزٹ اس وقت لکھنؤ کا ایک مشہور ہفتہ وار تھا جو مولوی محمد وحیدالدین سلیم پانی پتی کی ادارت میں نکلتا تھا۔

(۵)

الہلال

صدیقی العزیز

آپ کا خط پہنچا۔ یہ تو میں نے پیشتر ہی آپ کو لکھ دیا تھا اور اجازت طلب کی تھی کہ مضمون کی اشاعت میں تاخیر ہوگی اور یہ لکھا تھا کہ میں اپنی تحریر کے اختتام کے بعد جو نمبروار چھپ رہی ہے اسے درج کروں گا۔ چنانچہ اس کی نسبت آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ادھر میں اور معاملات میں اس طرح مصروف رہا کہ بقیہ مضمون کے لکھنے کا موقع ہی نہیں۔ بانکی پور چلا گیا تھا وہاں سے واپس ہوا اور بیمار ہوں۔ پس آپکی تحریر آیندہ اشاعت میں بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد کی اشاعت میں شایع ہوگی مع میرے مضمون کے تیسرے آخری نمبر کے۔

رہا یہ کہ آپ کو دیگر اخبارات میں شایع فرمائیں گے، تو شاید میں نے ابتک کوئی کوشش اس طرح کی نہیں کی ہے کہ لوگ اپنے مضامین الہلال کے سوا دیگر رسائل میں شایع نہ کریں۔ یہ آپ کے لئے جس طرح اس وقت ممکن تھا جب آپ نے وہ تحریر

بھیجی تھی اب بھی ممکن ہے اور آیندہ بھی ممکن رہیگا۔ آپ جس اخبار میں شایع کرنا چاہیں شایع فرمادیں مجھے تو کوئی عذر نہیں البتہ بصورت عدم اشاعت سامنے بدھ کے بعد والے بدھ کو الہلال میں درج ہوسکے گی اور بصورت اشاعت اس کا تذکرہ بحوالہ اخبار شایع کنندہ۔

آپ کو معلوم نہیں مراسلات وغیرہ الہلال میں ہمیشہ تاخیر سے شایع ہوتے ہیں۔ کئی مضمون ایک ایک ماہ کے بعد نکلے ہیں۔ یہ بدنظمی ہو یاسوءقصد لیکن ایک عام بات ہے۔

مسلم گزٹ تو بالآخر بند ہی ہوگیا لیکن افسوس ہے کہ بے موقع اور بہت بری طرح۔ مولوی ظفرحسن صاحب کا خط آیا انھوں نے اپنی موجودہ حالت جو بیان کی ہے مجھے ہمدردی ہے۔ خدا انھیں کامیاب فرمائے۔ ایسی صورت میں تو واقعی ان کا تشریف لانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ابوالکلام

مکتوب کے بیشتر حصہ میں تذکرہ اس ناخوشگوار مناظرانہ رنگ کے سلسلۂ مضامین کا ہے۔ اب بات کتنی ہلکی بلکہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت مرکز اہمیت بنی ہوئی تھی۔

مسلم گزٹ سرکاری عتاب کی زد میں آکر بند ہوگیا تھا۔ سلیم صاحب کے ہٹ جانے کے بعد اس کے ایڈیٹر بریلی کے ایک پرجوش اور دردمند مسلمان، مولوی ابوالکمال عبدالودود مقرر ہوگئے تھے۔ مولانا شبلی اس کے قبل ہی اس کی سرپرستی سے دست کش ہوچکے تھے۔

ظفرحسین خاں صاحب کے والد کا دفعۃً انتقال ہوگیا تھا۔ اور وہ اپنی ذاتی وخانگی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔

(۶)

صدیقی العزیز۔ السلام علیکم

یاد فرمائی کے لئے ممنون و شکرگزار اور

تاخیر کے لئے خواستگار معافی ہوں۔ امید کہ معذرت مقبول ہوگی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی اگر وجود میں آگئی تو بلاشبہ موجودہ زمانہ میں ہندوستان کا سب سے بڑا علمی کام ہوگا البتہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہو اشخاص کی کمی ہو اور ضرور ہو کہ کچھ عرصہ تک مطلوبہ نتائج پیدا نہ ہوں۔ لیکن ابتدا میں تو کوئی کام بھی بلا انتظار و تدریج متوقع نتائج پیدا نہیں کرتا کام صحیح اور مفید ہونا چاہیئے نقائص رفتہ رفتہ دور ہو جائیں عدم سے وجود مع النقائص بہرحال بہتر ہے اور اشخاص کے فقدان کا بھی علاج یہی ہو کہ کام ہو۔ آپ نے لکھا ہو کہ سردست صرف معمولی درجہ کی فلسفہ و منطق کی کتابوں کو لکھنا پڑتا ہو اور اس لئے طبیعت لگتی نہیں۔ لیکن یہ تو ناگزیر ہے اور ترتیب مبادیات و اوائل کا کام بھی منتھیوں ہی کو کرنا پڑے گا مبتدیوں کے لئے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ اگر آپ کے قیام و تعلق سے عثمانیہ یونیورسٹی نے اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ ہر فن میں مبادیات کا سلسلہ مکمل ہوگیا تو کیا یہ کوئی چھوٹا کام ہے۔

آپ نے فلسفہ کے ساتھ منطق کا بھی ذکر کیا ہو۔ منطق میں مولوی نذیر احمد مرحوم کا رسالہ مبادی الحکمت ہر لحاظ سے بہت عمدہ ہے اور بیان مسائل میں اس درجہ کا ہو کہ ہمارے قدیم عربی نصاب کے ابتدائی رسائل ایسا غوجی وغیرہ سے لیکر قطبی تک کا قائم مقام ہو سکتا ہے اور حسن بیان و تعبیر و ترتیب واشلہ کے لحاظ سے بدرجہا ان پر فائق۔ انگریزی کا حال مجھے معلوم نہیں ضرورت اس کی ہو کہ اس کے بعد کا صرف ایک رسالہ سردست اور مرتب کیا جائے۔ مجوزہ یونی ورسٹی میں ہمارے عربی مدارس کی طرح منطق ابتدا ہی میں نہیں رکھی جایئے گی۔ بلکہ جدید نظام تعلیم کے مطابق ابتدائی سنین تعلیم کے گزر جانے کے بعد، اور اس وقت کے لئے مبادی الحکمت بہت اچھی پہلی کتاب ہو۔

لیکن یہ صرف مقدمات و مسائل تک ہو۔ مباحث کے لئے اس کے بعد کی دوسری کتاب طیار کرنی چاہیئے۔ متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل مفید ہوں گے۔

آپ نے لکھا ہو کہ تین چار سال ادھر شاید بعض غلط فہمیوں کی بنا پر دلوں کی صفائی میں رنگ آگیا تھا۔ آپ نے دل کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہو حالانکہ ہونا چاہیئے مفرد۔ میں آپ کو پوری سچائی کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ میرے حافظہ میں کوئی گزشتہ زمانہ ایسا موجود نہیں ہو جس میں آپکی جانب سے میرا قلب زنگ آلود رہا ہو۔ دنیا میں باہمی علائق کے تکدر کے مختلف اسباب ہوا کرتے ہیں میں بالکل نہیں جانتا کہ اس قسم کا کون سبب پیدا ہوگیا تھا۔ کیا اس پورے زمانہ میں آپ نے کوئی بات میری جانب سے دیکھی یا سنی؟

میں نے تو جب کبھی کوئی بات مولینا شبلی مرحوم یا بعض دیگر حضرات سے نقلاً سنی تو خدا شاہد ہے کہ اس کا کوئی اثر اپنے قلب میں حسب عادۃ محسوس نہ کیا بلکہ اس کو کسی ایسے سبب پر مبنی خیال کیا جو مجھے معلوم نہیں۔ اس طرف سے جناب بالکل مطمئن رہیں۔ میں آپ کے جن اوصاف کا علماً یقین کرتا ہوں اور جو باعث نیاز مندی ہو سکتے ہیں جب تک ان میں تغیر نہ آئے میری نیاز مندی متغیر نہیں ہو سکتی ایسے تو الحمد للہ مجکو کوئی وجہ

شکایت نہیں لیکن اگر ہوتی بھی تو انشاءاللہ آپ مجکو کبھی شاکی نہ پاتے۔

بہ یُمنِ عشق ز کونین صلح کل کر دیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

آپ کی توجہ فرمائی بالکل مخلصانہ اور بے لاگ ہے موجودہ حالات میں کہ نظر بند و معتوب حکومت ہوں آپ کے لئے کوئی وجہ مراسلت نہیں ہو سکتی تھی، الا یہ کہ مخلصانہ و بے غرضانہ لطف و نوازش، و مقتضاء خلق طبع، اس بات کو محسوس کرتا ہوں اور ممنون متشکر ہوں۔

آپنے جناب مولینا حمیدالدین کا ذکر خیر فرمایا ملاقات ہو تو اس دور افتادہ کا سلام شوق عرض کر دیں۔

معارف آتا ہو نہایت شوق و دلچسپی سے مکالمات برکلے کا سلسلہ پڑھ رہا ہوں اور آپ کے حسنِ بیان و قوۃ نقل علوم و تسہیل مطالب کی تعریف نہیں کر سکتا۔ آپ انشاء اردو کے لئے وہ کام کریں گے جو ابتک کسی سے نہیں ہوا یعنی نقل علوم، سر سید مرحوم کے مجمع نے اردو کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں لیکن اس مد میں اب تک کچھ نہیں ہوا۔ حکیم عباری صاحب تصورات کلیہ بھی اس بارے میں اتنی ہی مدح کے مستحق ہیں جس قدر کہ آپ

فقیر ابوالکلام

۱۵ مارچ ۱۹۱۶ء رانچی بہار

الہلال مدت ہوئی بند ہو چکا ہو۔ اور مولانا اب عرصہ سے رانچی (صوبۂ بہار) میں نظر بند ہیں۔ پہلی جنگ عظیم ابھی جاری ہو۔ مکتوب الیہ یکم ستمبر ۱۹۱۶ء سے حیدر آباد آگیا ہو۔ عثمانیہ یونی ورسٹی ابھی باقاعدہ نہیں کھلی ہو۔ لیکن اس کا مقدمۃ الجیش سر رشتہ تالیف و ترجمہ مولوی عبدالحق صاحب (جو اب بابائے اردو کے نام سے مشہور ہیں) کی نظامت میں قائم ہو چکا ہے۔ اور مکتوب الیہ کے سپرد شعبۂ فلسفہ و منطق ہے۔

۱۹۱۳ء میں جو تلخ و تند مباحثہ الہلال کے صفحات میں، بعض بعض اصطلاحات کے پیچھے ہو پڑا تھا اب مکتوب الیہ کو اس پر ندامت و تاسف تھا۔ اور اپنے خط میں مولانا سے معذرت کی تھی ـــــ مولانا نے جواب میں جو شریفانہ انداز اختیار کیا، اور لطف و نوازش کی جو بارش کی، اس سے مکتوب الیہ پانی پانی ہو گیا۔

ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) میں مکتوب الیہ کے قلم سے، انگلستان کے فلسفی بشپ بارکلے کے مکالمات (DIALOGUES) کا ترجمہ نکل رہا تھا۔ مولانا نے حوصلہ افزائی اس کی فرمائی ہو۔

مولانا حمیدالدین صاحب فراہی اعظم گڑھی (صاحب تفسیر القرآن عربی) اس وقت تک حیدر آباد میں دارالعلوم کالج کے صدر تھے۔

عباری سے مراد ہیں مولانا عبدالباری ندوی۔ وہ اسی میں فلسفی بارکلے کے مکالمات کو اردو میں معارف کے صفحات میں لا رہے تھے "تصورات کلیہ" کے عنوان سے۔

(۷)

صدیقی العزیز السلام علیکم

کل خط بھیج چکا ہوں لیکن ایک غلطی ہو گئی جو آپ کو حیران کر دے گی۔ کل ایک خط بمبئی کے ایک تاجر کتب کے نام بھی لکھا تھا اور اس کو فہرست کی قیمت ۵ ر بھیجنی تھی۔ غلطی سے ۵ ر کے ٹکٹ آپ کے خط میں رکھ دیے گئے اور اس کا خط یہیں پڑا رہا آپ حیران ہوں گے کہ یہ ٹکٹ کیوں بھیجے گئے۔

فقیر ابوالکلام۔ رانچی بہار ۱۶ مارچ ۱۹۱۶ء

ظاہر ہو کہ یہ مکتوب نمبر (۶) کا محض ضمیمہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے چند خطوط کا عکس

نیا دور کے اِن صفحات پر مولانا ابوالکلام آزاد کے
اُن نجی خطوط میں سے چند کا عکس شائع کیا جا رہا ہے جو
انھوں نے مولانا عبدالماجد کو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۸ء تک
وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔

نمبر ۷۔۱ مکلاؤڈ اسٹریٹ
کلکتہ
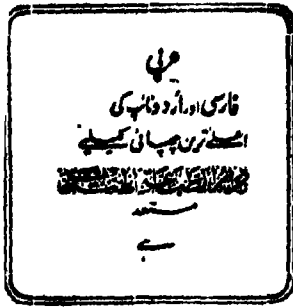
AL-HILAL,
Electrical Printing and Publishing House
7, 1, McLeod Street,
CALCUTTA, ۱۰/۷

صدیقی العزیز

سخت نادم ہوں کہ خط کا جواب وقت پر نہ دے سکا۔ دو ہفتہ سے بخار میں

امید ہے کہ آپ بصحت و عافیت ہوں گے۔ یہ سنکر نہایت خوشی ہوئی

کہ اپنے ایم اے میں فلسفہ لیا ہے نیز تحصیل زبان جرمن

مولوی عبدالقادر صاحب خطوں کا جواب نہیں دیتے۔ ان کو متعدد خطوط لکھے

والدہ محترمہ و عزیزہ کو میرا سلام پہنچا دیجئے

ابوالکلام

OFFICE-BEARERS FOR 1940.

President:
ABUL KALAM AZAD

Treasurer:
VALLABHBHAI PATEL

General Secretary.
J. B. KRIPALANI

अखिल भारतीय कांग्रेस कमेटी
स्वराज भवन, इलाहाबाद
آل انڈیا کانگریس کمیٹی
سوراج بھون۔ الہ آباد
ALL INDIA CONGRESS COMMITTEE
SWARAJ PHAWAN, ALLAHABAD

President's Address:
19-A, BALLYGUNGE CIRCULAR ROAD
CALCUTTA
Phone: PARK
Ref.

۱۹ جولائی ۴۰ء

صدیقی! شملہ سے واپس آکر بیان کی ڈاک دیکھی تو آپ کا کارڈ ملا۔ ایک مدت کے بعد ایک عزیز کی صورت دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے وہ آپ کا کارڈ دیکھ کر ہوئی۔ شکر گزار ہوں اور دعا گو ہوں

والسلام علیکم

ابوالکلام

۲۳-۵-۴۹ء

صدیقی! خط مورخہ ۱۷ مئی ملا

جس معاملہ کی نسبت آپ نے لکھا ہے

وہ پیش نظر ہے۔ ارباب اختیار

مناسب وقت ہی پر انجام پا سکتی ہے

اور انشاء اللہ سر انجام پا جائیگی۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

مولانا عبدالماجد صاحب

ایڈیٹر صدق

پوسٹ دریا باد (بارابنکی)

(۸)

صدیقی العزیز سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یاد فرمائی کا شکریہ۔ یہ آپ نے خوب کیا کہ حیدر آباد سے کنارہ کش ہوگئے۔ اوّل تو علمی زندگی ملازمت کے ساتھ نبھ نہیں سکتی پھر ملازمت بھی دیسی ریاستوں کی، اور ریاست بھی حیدر آباد جیسی سازش کدہ، عثمانیہ یونیورسٹی کا ابھی نیا نیا غلغلہ ہے۔ چند دنوں کے بعد دیکھئے گا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ آپ نے اپنی ایک تصنیف کا ذکر کیا تھا۔ غالباً اس سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔

یہ تکفیر کا معاملہ بہت ہی دلچسپ رہا۔ مجھ کو امید نہ تھی کہ آپ اس قدر جلد مسلمان ثابت ہوجائیں گے اگرچہ کفر کا مقام اس سے ارفع ہے۔ "کافر نتوانی شد لاچار مسلمان شو" امید ہے کہ آیندہ آپ اس طرح کے علائق سے آزاد و کنارہ کش رہیں گے، اور آزادانہ و خود مختارانہ اپنے اشغال میں منہمک و مستغرق۔ اگر ایسی زندگی میسر آئے تو اس سے بہتر و کامیاب زندگی کوئی نہیں۔

ابوالکلام

مولانا ابھی تک بدستور رانچی میں نظر بند ہیں۔

مکتوب الیہ تقریباً ایک سال کی مدت پوری کرکے حیدر آباد سے لکھنؤ واپس چلا آیا ہے، اور ملازمت سے استعفا دے آیا ہے۔ مکتوب الیہ کا دل حیدر آباد کے شاہی ماحول میں بالکل نہ لگ سکا تھا۔ وہاں کے بہت سے بزرگوں، دوستوں، عزیزوں کی انتہائی خاطرداریوں کے باوجود۔

مکتوب الیہ کی ایک کتاب نفسیات اجتماعی کے موضوع پر دو تین سال قبل کی چھپی ہوئی تھی۔ اس میں مذہب پر جابجا حملے تھے، (اور خود

الہلال پر بھی جابجا چوٹیں تھیں)۔ حیدر آباد میں اس پر ایک ہنگامۂ تکفیر برپا ہوگیا تھا۔ مکتوب الیہ انگریزیت کے اثر سے واقعۃً اس وقت "عقلیت" اور الحاد میں مبتلا تھا۔ از سرِ نو مسلمان اس کے ایک عرصہ کے بعد ہوا۔

(۹)

صدیقی العزیز السلام علیکم۔

مدت کے بعد آپ کا خط آیا خوش وقت فرمایا "تذکرہ" کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیت کے ساتھ شایع کی جاتی۔ ایک صاحب نے بطور خود شایع کر دیا۔ بوجوہ اس کی اشاعت میرے لئے خوش آیند نہ ہوئی۔

حقیقت کے کئی نمبر آچکے ہیں۔ آپ کے خط کے بعد خصوصیت سے میں نے دیکھا، بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت یہ سب سے اچھا ویکلی اردو اخبار ہے۔ اگر استقلال کے ساتھ جاری رہا اور مذاق عوام کی پیروی نہ کی گئی تو یہ ایک بڑی ضرورت پوری کریگا۔

آپ نے لکھا ہے کہ تعطل کا زمانہ کیوں نہ تمدنی اصلاحات کی سعی میں بسر کیا جائے؟ لیکن زمانۂ تعطل کی قید کیوں؟ یہ کام تو ایسا ہو کہ بڑی بڑی طاقتور کارکن زندگیوں کو وقف ہوجانا چاہیئے۔ جس چیز کو لوگ سیاسی اصلاح و ترقی کہتے ہیں وہ بھی دراصل تمدنی اصلاحات و ترقیات کی ایک خاص مجتمعہ حالت ہی سے عبارت ہے۔ سیاست مصطلحہ کا اس سے باہر کوئی وجود ہی نہیں۔ اور جس قدر بھی جماعتی مطلوبات ہیں بغیر درستگی علم و عمل افراد و حصول حقوق معاشرہ و مدنیتہ ممکن نہیں۔ بہرحال ایسا ضرور ہونا چاہئے لیکن آپ نے جس مسئلہ کی نسبت لکھا ہے وہ صرف پنجاب و بمبئی کی بعض اقوام سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی مسئلہ توریث میں رواج اور ہندو لا پر عمل کرتے ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل پیش نظر ہوں تو تحریر فرمایئے۔ میں حقیقت کے لئے ضرور لکھوں گا۔

مولانا سید سلیمان ندوی بارہا ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ انجمن کے جلسہ کے موقع پر بھی تشریف لائے تھے آپ کی ملاقات کی یاد آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیاں گزر گئیں۔

ابوالکلام

رانچی ۲۶ نومبر ۱۹ء

"تذکرہ" سے مراد خود مولانا کی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب تذکرہ ہے۔ نئی نئی شایع ہوئی تھی، اور اس کا بڑا غلغلہ تھا۔ مکتوب الیہ نے اسے کہیں پڑھکر اس پر اپنی رائے لکھ بھیجی تھی۔

مکتوب الیہ اب لکھنؤ میں ہے اور آزاد ہو۔ مولوی ظفر الملک علوی کاکوروی مرحوم کی شرکت سے اور اپنی نگرانی میں اس نے ایک ہفتہ وار پرچہ حقیقت نامی شروع کرایا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد ظفر الملک مرحوم اور مکتوب الیہ دونوں اس سے الگ ہوگئے اور پرچہ تمام تر انیس احمد صاحب عباسی کے ہاتھ میں آگیا۔ جس زمانہ میں مولانا نے یہ والا نامہ لکھ کر بھیجی ہو، مکتوب الیہ ہی کی نگرانی میں نکلتا تھا۔

مکتوب الیہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ سیاسی کام سے تو آپ کی معذوری ظاہر ہی ہے لیکن مسلمانوں کے اور اصلاحی کام تو اس وقت بھی آپ کر سکتے ہیں۔

مکتوب الیہ کی شدت الحاد اب باقی نہیں رہی تھی، اور اب وہ اسلام سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔

(۱۰)

صدیقی العزیز

مسئلہ توریث میں یوپی کے مسلمانوں کا حال معلوم نہ تھا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا۔ جن مفاسد کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہو، وہ، اور اسی طرح کے بے شمار مفاسد ہیں جن کی اصلاح مقدم ترین امور میں سے ہو۔ لیکن اس کے بارے میں سب سے پہلا سوال طریق اصلاح کا ہو۔ کسی جماعت کے رسوم و عوائد اور صدیوں کی مالوفات میں تبدیلی پیدا کرنا ایک ایسا کام ہے جو صرف بحث و نظر سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یعنی محض دلائل و معلومات کی اشاعت اس کے لئے سود مند نہیں ہوسکتی۔ جہاں تک تعلق احساس و اعتراف مفاسد اور معلومات نافعہ کا ہے، بہت کم تعلیم یافتہ آدمی ایسے نکلیں گے جو ان سے بے خبر ہوں، یا ضرورت اصلاح سے اختلاف رکھتے ہوں۔ تاہم یہ طاقت کسی میں نہیں ہے کہ عملاً اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے اور داعیات و بواعث مفاسد کا عزم و ہمت سے مقابلہ کرے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام فضائل عملیہ کا یہی حال ہے۔ مجرد بحث و نظر سے یہ مرحلہ نہ کبھی طے ہوا ہے نہ ہوگا۔ مفاسد معاشرت میں بڑا حصہ ایسے رسوم و اعمال کا ہو جو شرعاً بھی داخل اشد معاصی و فسق، اس لئے کم سے کم ان کے لئے تو علماء و مشائخ کو ضرور سعی کرنی چاہیے۔ مگر جو حال علماء کا ہو آپ کو معلوم ہے۔ علماء، غیر علماء سے نفس معلومات میں ممتاز ہیں۔ عمل میں نہیں۔ مفاسد کے دواعی و ترغیبات جس طرح عوام کے لئے قہر و تسلط رکھتی ہیں، ان کے لئے بھی، اسی لئے باوجود علم وہ خود بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔

ضرورت اس کے لئے دو باتوں کی ہے۔ ایک تو سعی اصلاح کے ساتھ ساتھ دفع و انسداد دواعی و ترغیبات کی بھی کوشش کرنی چاہیئے جب تک ان محرکات کا دفعیہ نہ ہوگا جو مفاسد کے لئے باعث ہیں، مجرد ترک و منع کی دعوت سودمند نہیں ہوسکتی۔ آپ لوگوں سے کہتے ہیں۔ گرد و غبار سے بچو اور سڑک پر چھڑکاؤ کا انتظام نہیں کرتے۔ ثانیاً ایک ایسی جماعت کا وجود، اور منظر عام پر آجانا جو عملاً اصلاح کا نمونہ ہو اور اصلاح کا وجود خارج

میں مجسم و ممثل دکھلا دے۔ چند عازم انسانوں کا فعل نفوذ اخبارات کے سیکڑوں آرٹیکلوں سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اگر ایک چھوٹی سی جماعت بھی اصلاح و تغیر کی چند ممتاز خصائص کے ساتھ قائم ہوجائے تو چند سالوں کے اندر تمام قوم کی حالت بدل جائے۔ علی الخصوص انگریزی تعلیم یافتہ جماعت جس میں احساس حال اور طلب اصلاح کی استعداد سب سے زیادہ موجود ہے۔

آپ تصنیف و تالیف میں علم، اور سعی و عمل میں اصلاحِ معاشرت، ان دو چیزوں کو اپنا مطمح نظر بنایئے۔ پہلی بات تو موجود ہے دوسری کے لئے بھی آمادہ ہوجایئے۔ اپنے تعلیم یافتہ احباب میں سے چند عزم صادق رکھنے والے اشخاص منتخب کیجئے اور ایک انجمن قائم کیجئے۔ ابتدا میں صرف دو چار نہایت ضروری اور بنیادی باتیں لے لی جائیں اور صرف ان لوگوں کو شریک کیا جائے جو ان پر پوری طرح عمل کرنے کے لئے طیار ہوں اور تمام موانع کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ کوئی ایسی جماعت وجود میں آجائے تو پھر اخبارات کے مباحث مفید ہوسکتے ہیں ورنہ مجرد مضامین نویسی سے اردو میں معاشرتی مباحث کا ایک نیا لٹریچر فراہم ہوجائے گا۔ عملاً اصلاح نہیں ہوسکتی۔ لوگوں کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی دعوت دینا جس کے خصائص و اعمال کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں، معاشرت کا فلسفہ ہے، اصلاح معاشرت نہیں ہے۔

تاہم مقصود یہ نہیں کہ مضامین نہ لکھے جائیں۔ ان کی ضرورت سے انکار نہیں۔ بہر حال بہتر ہے، میں حقیقت کے لئے ضرور لکھوں گا۔

لیکن براہ عنایت حاجی بغلول اور تجاہل عامیانہ وغیرہ کو تو رکوایئے۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ اگر یہی حال رہا تو وہی ہمدرد وغیرہ کا حال ہوکر رہ جائیگا۔
والسلام علیکم۔ دیکھئے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔

ابوالکلام

رانچی ۳۰ر جنوری سنہ ۲۰ء

اس طرح کے مکتوبات سے مولانا کے اصول زندگی کے بہت سے گوشوں پر خوب روشنی پڑجاتی ہے۔
حقیقت سے مکتوب الیہ کا تعلق ختم ہوتا جارہا تھا۔ اس میں عام پسند ظرافت و مزاح کے خاصے عنوانات اب ہونے لگے تھے۔

(۱۱)

البلاغ کلکتہ

صدیقی العزیز

آپ کا خط رانچی میں ملا تھا۔ معافی خواہ ہوں کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔ کلکتہ میں ایک ہی دن قیام کرسکا پھر دہلی چلا گیا اب واپس آیا ہوں۔ خط میں آپ نے اپنی علمی خدمات کے ساتھ عملی اقدام کے لئے بھی جو مستعدی ظاہر فرمائی ہے اس سے طبیعت نہایت درجہ مسرور ہوئی۔ کاش اس کا جلد ظہور ہو۔ ہمراہیوں کا انتظار بے سود ہوگا۔ سب سے پہلا اور سب سے بہتر رفیق خود اپنا ارادہ اور یقین ہے۔ آپ نے مسٹر محمد علی کی شعلہ بیانی کی نسبت جو کچھ لکھا ہے بالکل متفق ہوں اور اتنا اس پر اضافہ کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص اپنی ہتھیلی کے لئے انگاروں ہی کو منتخب کرتا ہے تو خیر یہ بھی ایک راہ ہے، بشرطیکہ جلد پھینک نہ دے۔ بہر حال وہ ایک بڑی آزمائش سے کامیاب نکلے ہیں اور ان کی بڑی سے بڑی اور زیادہ سے زیادہ عزت کے لئے یہ بس کرتا ہے۔
دیکھئے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔ رانچی

میں نہیں تو کلکتہ میں تو آپ آ سکتے ہیں ؟

ابوالکلام

۲۴ جنوری ۲۰ء

مولانا اب رہائی پاکر کلکتہ پہنچ چکے ہیں۔
مولانا محمد علی و شوکت علی کو بھی ۱۹۱۹ء کے آخر میں قید و بند سے رہائی مل گئی تھی اور مولانا محمد علی نے جیل سے باہر آتے ہی اس وقت کے معیار سے تیز و تند تقریریں شروع کر دی تھیں۔

(۱۲)

Retreat
Shahi Bagh
Ahmadabad
۲۹ جون ۲۲ء

صدیقی العزیز السلام علیکم

سفر سے واپس کلکتہ پہنچا تو آپ کا خط ملا لیکن ہجوم کار نے مہلت جواب نہ دی۔ پھر دہلی اور احمد آباد کا سفر پیش آیا۔ ڈاک رکھ لی تھی کہ یہاں کہیں مہلت ملے گی جواب لکھوں گا۔ امید ہے اس تاخیر کو معاف فرمائیں گے۔

آپ نے مولوی طفیل احمد صاحب کی نسبت دریافت کیا ہے کہ میں نے ان سے جواز سود کے باب میں کوئی گفتگو کی ہو؟ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے مجھے یاد نہیں، مولوی صاحب موصوف سے کبھی اس باب میں کوئی گفتگو ہوئی ہو، بلکہ شاید ان سے ملاقات بھی کبھی نہیں ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں انھیں ایسا خیال ہوا۔ غالباً اس بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ نے ان کے نام کے ساتھ "صاحب جواز سود" لکھا ہے۔ کیا اس سے مقصود کوئی ان کی مصنفہ کتاب ہے؟

باقی رہا اصل مسئلہ تو جہاں تک قرآن اور اسلام کا تعلق ہے نفس ربا کی حرمت میں تو گنجائش قیل و قال نہیں۔ فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ البتہ ربا کے تعین و تشریح میں متعدد فقہی مباحث اور مذاہب و آرار ہیں جنھیں فقہ و حدیث کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اوائل حکومت انگریزی سے ایک بحث یہ بھی شروع ہو گئی ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام۔ اگر دارالحرب ہے تو فقہاء کا قاعدہ ہے "لا ربا بین الحربی و المسلم" یعنی دارالحرب میں مسلمان اور حربیوں کی معاملت ربا نہیں ہے بعض کے نزدیک حربی کی قید بھی زائد ہے۔ پس اس بنا پر متعدد علماء کی رائے یہ رہی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ پولٹیکل حالت میں مسلمان غیر مسلم سے سود لے سکتے ہیں۔ مولوی عبداللہ مرحوم ٹونکی اور مولینا شبلی مرحوم کی یہی رائے تھی۔ مولینا شبلی مرحوم نے اس پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا اور ندوۃ العلماء کے کونسل کے علماء کے سامنے پیش کیا تھا غالباً ان کے مسودات میں ہوگا۔

پھر دارالحرب کے شروط میں بھی اختلاف ہے۔ حضرۃ امام ابوحنیفہ کی رائے دوسری ہے صاحبین کی دوسری ہے۔ پھر بعض کے نزدیک ایک ملک دارالاسلام ہو کر دارالحرب ہو جا سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک نہیں۔

حقیقت ان اختلافات سے بالا تر ہے اور دارالحرب میں جواز اخذ سود کی جو تعلیل کی گئی ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ صحیح تعلیل دوسری ہے۔ اگر ضرورت ہوئی اور مہلت ملی تو اس باب میں غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔

ابوالکلام

ملک میں ترک موالات و خلافت وغیرہ تحریکات کا غلغلہ برپا ہے بلکہ ابتدائی جوش و خروش اب دھیما پڑ چکا ہے۔ مولانا کا شمار اب آل انڈیا سیاسی لیڈروں میں ہے، اور مسلسل سفر اور دورہ اس کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اس افراط مشغولی کے باوجود علمی بحثوں کے لئے بھی مولانا وقت و فرصت نکال لیتے ہیں۔

"جواز سود" مولوی سید طفیل احمد مرحوم کے ایک رسالہ کا نام تھا۔

اللہ ان مرحوم کی لغزشیں معاف فرمائے، بیچارے کو دھن ہوگئی تھی مسلمانوں میں ترویج سود کی۔

(۱۳)

حبی فی اللہ۔ السلام علیکم۔ خط پہنچا، دہلی سے واپس آکر دو ہفتہ تک مبتلا بخار و پیچش رہا۔ اس وقت تک طبیعت بکلی صاف نہیں ہے، جہاں تک مسئلہ حجاز کا تعلق ہے جو کچھ ہو رہا ہے تمام تر افراط و تفریط ہے۔ بڑی مصیبت یہ پیش آگئی ہے کہ مسئلہ دینی احکام و مصالح سے ممزوج ہوگیا ہے اور جو لوگ اس جھگڑے میں ہیں انھیں ان کوچوں کی خبر نہیں۔ ذاتی کاوشیں اور جماعت بندی کا جذبہ ایک مزید آفت ہے۔ مسئلہ پر آرا کی تقسیم حقیقت کی بنا پر نہیں بلکہ محض پارٹی کی بنا پر ہوتی ہے۔ مختلف حالات و اسباب ایسے ہیں کہ اصلاح حال کی امید بہت ہی کمزور ہے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے۔

لکھنؤ میں جلسے کے موقعہ پر آنا ہی پڑے گا اگرچہ سرے سے یہ جلسہ ہی بیکار ہے۔ ممکن ہے جلسہ کی تاریخیں بدل دی جائیں۔ لوگوں کو اعتراض ہے کہ دہلی میں یہ جلسہ صرف اس لئے قرار دیا گیا تھا کہ رپورٹ وفد چھپ کر شایع ہو جائے اور ممبروں کو مطالعہ و نظر کا کافی وقت ملے۔ لیکن رپورٹ اس وقت تک تقسیم نہ ہو سکی۔ غالباً آج بمبئی سے روانہ ہوئی ہوگی۔ میں نے شوکت صاحب کو لکھا ہے کہ جلسہ ۱۵ر نومبر یا دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہو۔ غالباً ۱۵ر نومبر قرار پائے۔ بہرحال امید ہے آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔ قیام غالباً نواب علی حسن صاحب ہی کے یہاں ہو لیکن میں تو آپ کے یہاں ٹھہروں اگر آپ ٹھہرائیں۔

مولوی عبدالرزاق صاحب کا ادھر کئی ہفتہ سے کوئی خط نہیں آیا۔ مجھے ان کی صحت کی طرف سے برابر تشویش رہتی ہے۔ اگر ممکن ہو تو ملئے اور خط لکھنے کے لئے کہیے۔ مولوی ظفر الملک صاحب ملیں تو سلام شوق۔

۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کلکتہ　　　　ابوالکلام

مولانا اس وقت تک آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ اور کمیٹی کے اندر مسئلہ حجاز کے باب میں ایک عجب خلفشار برپا ہو گیا تھا۔ علی برادران اور حضراتِ فرنگی محل و بدایوں وغیرہ سلطان عبدالعزیز بن سعود کے شدید مخالفوں میں ہو گئے تھے۔ اور ظفر علی خاں صاحب اور اہل حدیث جماعت کے حضرات ان کے اسی شدید درجے میں حامی اور حمایتی تھے۔ مکتوب الیہ اودھ خلافت کمیٹی کا صدر تھا۔

جس جلسہ کا ذکر ہے وہ مرکزی خلافت کمیٹی کا ہو رہا تھا جسمیں شدید جنگ اور زور آزمائی کا خطرہ تھا۔ رپورٹ سے مراد اس وفد خلافت کی رپورٹ ہے جو ۱۹۲۶ء میں حج کے موقعہ پر جا کر سلطان سے ملا تھا۔ اس کے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے۔

نواب علی حسن خاں (صفی الدولہ حسام الملک) مرحوم، مشہور اہل حدیث فاضل نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی کے صاحبزادے، خود بھی صاحب علم رئیس تھے۔ ندوہ اور مولانا شبلی کے شیدائی۔ کوٹھی بھوپال ہاؤس واقع لال باغ میں رہتے تھے۔

مولوی ظفر الملک اس وقت خلافت کے کارکنِ خصوصی تھے۔

مولانا نے از خود جو مکتوب الیہ کے ہاں قیام فرمانے کا ذکر فرمایا، یہ دلیل ان کے کمال شفقت و عنایت کی ہے۔

(۱۴)

حبی فی اللہ۔ السلام علیکم۔ ایک خط بھیج چکا ہوں۔ میں نے لکھا تھا شاید مجوزہ تاریخوں میں جلسہ کا انعقاد ملتوی ہو جائے، چنانچہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوگا۔ التوا کا

باعث یہ ہوا کہ تقریباً انہی تاریخوں میں ہر جگہ
کونسل کے انتخابات کی کش مکش درپیش ہے۔ مرکزی
کے ممبروں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے
جو انتخابات میں مشغول ہیں خصوصاً بنگال اور پنجاب
کے ممبر انہوں نے اعتراض کیا کہ ہماری شرکت ممکن
نہیں۔ علاوہ بریں رپورٹ وفد حجاز کی اشاعت
میں بھی تاخیر ہوگئی۔ یہ تاخیر قصداً نہیں ہوئی۔
ناگزیر تھی۔ رپورٹ ضخیم ہے۔ باوجود سعی ۲۶ ر سے
پہلے مکمل نہ ہو سکی۔ ایسی حالت میں یہی مناسب تھا
کہ تاریخیں بدل دی جائیں۔ پیشتر ہی سے کافی نزاعات
موجود ہیں۔ اب محض تاریخ انعقاد کا معاملہ مابہ النزاع
کیوں بنا دیا جائے۔ نومبر میں انتخابات کی کش مکش
ختم ہو جائے گی۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں بہ اطمینان
جلسہ ہو سکے گا۔ آپ لوگوں نے لکھنؤ میں جلسہ کا اہتمام
کیا تھا۔ ممکن ہو اس تاخیر کی وجہ سے کارکنوں
کو بے لطفی ہوئی ہو۔ لیکن امید ہو دسمبر کا اہتمام
اس کی تلافی کر دے۔

افسوس ہو کہ زمیندار اور ہمدرد کی نزاع کسی طرح
ختم ہونے پر نہیں آتی۔ پچھلی دفعہ جب شروع ہوئی
تھی تو میں نے بہت کوشش کی کہ سلسلہ آگے نہ بڑھے۔
مولوی ظفر علی خاں صاحب سے تو دہلی میں قول و
قرار کرا لیا تھا کہ وہ مولانا محمد علی کے خلاف کچھ نہ
لکھیں چنانچہ سلسلہ رک گیا تھا مگر اب پھر شروع
ہو گیا ہے اور بڑھتا ہی جاتا ہو۔ نتیجہ اس کا یہ ہے
کہ تحریک کا جو کچھ بھی رہا سہا اثر عوام میں باقی
تھا وہ بھی امید نہیں کہ قائم رہ سکے۔ حقیقت یہ ہو
کہ ۲۰ء سے پہلے مسلمانان ہند میں جس قدر جماعتی
قوئی کا نظم اور دماغی انضمام تھا اتنا بھی اب
نہیں ہے اور یہ نتیجہ ہے اس ردعمل کا جو ۲۰ء
کی حرکت کے بعد ظہور میں آیا۔ اب مسلمانوں کی
دماغی و اجتماعی تالیف و نظم کے لئے از سر نو دعوت
و تحریک کی ضرورت ہو۔

مولوی عبدالرزاق اور مولوی ظفرالملک صاحب
ملیں تو سلام پہنچا دیں۔ آپ کے اخبار سچ کا اب کیا
حال ہے؟ کتنی اشاعت ہے؟ ممکن ہو تو تفصیلات
سے مطلع کریں۔

ابوالکلام
کلکتہ ۲۹ راکتوبر ۲۶ء

ہمدرد (دہلی) سے مراد مولانا محمد علی کا روزنامہ ہے' اور زمیندار (لاہور) سے مراد مولانا ظفر علیخاں کا۔ وہی سودی نزاعات دونوں میں زور شور سے جاری تھے۔

سچ 'صدق' کا نقش اول تھا' اور اس وقت تک مولوی ظفرالملک کے اہتمام میں نکل رہا تھا۔

مولوی عبدالرزاق ندوی ملیح آبادی تو مولانا کے سلسلے میں ایک معروف شخصیت رکھنے والے تھے۔

(۱۵)

صدیقی۔

آپ کا رجسٹرڈ خط دہلی سے واپس ہو کر یہاں
ملا۔ سچ میں آپ نے جس کتاب کا ذکر کیا ہو میری
نظر سے نہیں گزری۔ آپ نے جو اقتباسات پیش کیے
ہیں ان سے معلوم ہوتا ہو کہ مصنف کو تاریخ اسلام
کے مبادیات تک معلوم نہیں۔ مجھے نہیں معلوم اس کے
مترجم کون صاحب ہیں اور کیوں انہوں نے یہ کتاب
ترجمہ کے لئے منتخب کی۔ اگر مقصود یہ تھا کہ ایک مخالف
کا نقطۂ نظر واضح کیا جائے تو ضروری تھا کہ مقدمہ
میں اس کی تصریح کی جاتی اور جابجا فٹ نوٹس
بڑھائے جاتے۔ مصیبت یہ ہو کہ یا تو لوگوں کو کام
کا شوق نہیں ہوتا، ہوتا ہو تو نظر و امتیاز میسر

نہیں۔ یورپ کی زبانوں خصوصاً جرمن میں اسلامی تاریخ و علوم کے متعلق مفید چیزیں موجود ہیں لیکن ہمارے نئے مترجموں کو صرف ایسی ہی کتابیں مل سکتی ہیں۔

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا آپ نے اسے جامعہ کے کارنامے سے کیوں تعبیر کیا۔ اس قسم کے اخبار نویسانہ مبالغوں سے بحث و نقد کی وقعت اور سنجیدگی کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اگر جامعہ کے کسی پروفیسر نے ایک غلط کتاب ترجمہ کے لئے منتخب کی، یا اس کی نقد و تعبیر میں کوتاہی کی، تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ بہ حیثیت ایک مترجم کے اسے مخاطب کرنا چاہیئے۔ جامعہ کے کارناموں کا یہاں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ،

ابوالکلام

کلکتہ ۱۲ نومبر ۲۹ء

جس کتاب کا ذکر ہے وہ ہل (Hell) کی کتاب کا ترجمہ تھا، جو "عربوں کا تمدن" کے عنوان سے جامعہ ملیہ (دہلی) کے ایک استاد کے قلم سے اردو میں شایع ہوا تھا۔ اور میں نے اس پر شدید گرفت کی تھی۔

(۱۶)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون۔ الہ آباد

۱۹ جولائی ۳۸ء

صدیقی

شملہ سے واپس آکر یہاں کی ڈاک دیکھی تو آپ کا کارڈ ملا۔ ایک مدت کے بعد ایک عزیز کی صورت دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے وہ آپ کا کارڈ دیکھ کر ہوئی۔ شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

اب بالکل ذہن میں نہیں کہ اس کارڈ کا مضمون کیا تھا۔

(۱۷)

۲۴ مئی ۳۸ء

صدیقی۔ خط مورخہ ۱۷ مئی پہنچا۔ جس معاملہ کی نسبت آپ نے لکھا ہے وہ پیش نظر ہے۔ ہر بات اپنے مناسب وقت ہی پر انجام پا سکتی ہے اور انشاء اللہ انجام پائے گی۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

اب مولانا وزیر تعلیمات سرکار ہند ہیں۔ غالباً ندوہ یا دارالمصنفین ایسے ہی کسی اور ادارے کی سرکاری امداد کی تحریک کی گئی تھی۔

مولانا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کل یہی ۱۷ خط محفوظ نکلے؛ اس کے بعد کے کوئی ۲۰ خط اور بھی ہیں۔ لیکن وہ سب مولانا کی طرف سے ان کے نجی کے پرائیویٹ سکریٹری یا سرکاری پرسنل اسسٹنٹ کے ہاتھ کے یا اردو میں لکھے ہوئے یا انگریزی میں ٹائپ کئے ہوئے ہیں۔ اور وہ پبلک کے کام کے نہیں۔ صرف دو چھوٹے سے خط اس رنگ کے بھی محض نمونے کے طور پر خلاف ترتیب درج کئے جاتے ہیں۔

(۱۸)

۲۲ پرتھوی راج روڈ۔ نئی دہلی

۱۱ فروری ۱۹۴۷ء

جناب محترم۔ تسلیم

آپ کا تحفہ حضرت مولانا کو پہنچ گیا۔ اس کے لئے وہ شکر گزار ہیں۔ مکتوب گرامی بھی موصول ہوا۔ ترجمان القرآن۔ جلد اول۔ زم زم کمپنی لمیٹڈ لاہور میں چھپ رہی ہے، وہ غالباً ہفتہ عشرہ میں پریس سے نکل جائے گی۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز مند

محمد اجمل خاں سکریٹری مولانا آزاد

یقیناً میں نے اپنی کوئی کتاب تحفۃً پیش کی ہوگی اسی کا یہ جواب ہے۔
اور مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن کے بارے میں بھی ضرور دریافت کیا ہوگا۔

(۱۹)

۱۹، اکبر روڈ۔ نئی دہلی۔
یکم اپریل ۱۹۴۸ء

جناب محترم۔ تسلیم

آپ کا خط حضرت مولانا کو ملا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۵ اپریل کو آپ مندرجہ بالا پتے پر ۱/۲ ۱۲ بجے تشریف لائیں، اور لنچ بھی نوش فرمائیں۔

راقم۔ محمد اجمل خاں

آل انڈیا ریڈیو کی مرکزی اردو کمیٹی کا میں ممبر تھا۔ اور اس کے جلسہ میں شرکت کے لئے ۵ اپریل ۱۹۴۸ء کو جانا ہو رہا تھا ـــ اجمل خاں صاحب کا دوسرا دستی احتیاطی خط ۵ اپریل کو کمیٹی کے عین دفتر میں بھی اسی مضمون کا موصول ہوا تھا۔

میں تو اپنی کتابیں مولانا ہی کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا۔ اُدھر سے بھی ایک بار "غبارِ خاطر" کی جلد عنایت ہوئی۔ اس کے ساتھ کوئی عنایت نامہ بھی ضرور ہوگا۔ لیکن وہ مجموعہ میں ملا نہیں۔

سب سے آخری مکتوب فروری ۱۹۵۸ء کا لکھا ہوا ہے۔

واللہ عاقبۃ الامور

سیاسی اخلاق

عہدِ استبداد سے جمہوریت و اشتراکیت تک

نیاز فتحپوری

اس وقت قومی حکومت یا جمہوری نظام سلطنت، آئینی سیاست کا بڑا ترقی یافتہ اور بلند تصور سمجھا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ صدیوں کے تلخ تجربات کے بعد دنیا اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ انسانی حکومت انسانی فلاح ہی کی تکمیل کا دوسرا نام ہے اور اس میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب حکومت قومی ہو اور قوم کی ترقی کے ذرائع امن وسکون کی راہوں سے گزر کر تلاش کئے جائیں۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت تک اس میں کبھی قوم کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ممکن ہے جب تک تمام جامعۂ بشری ایک ہی قوم نہ بن جائے اور تمام دنیا ایک ہی آئین حکومت کی پابند نہ ہو۔ پھر ہو سکتا ہے کہ مستقبل بعید میں انسان کسی وقت اس درجہ شائستہ و مہذب ہو جائے کہ ایک ہی ماحول تمام دنیا میں نظر آئے، یا یہ کہ دنیا تباہ ہو کر آبادی اتنی مختصر ہو جائے کہ امیال وعواطف کا اختلاف ہی باقی نہ رہے، لیکن بہ حالت موجودہ اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کیونکہ نہ اس سے قبل حکومتوں کا سیاسی اخلاق یکساں رہا ہے اور نہ آئندہ اس کی امید کی جا سکتی ہے:

حکومت نام ہے کسی اجتماعی قرارداد کا، اجتماعی اخلاق کا جس کو دوسرے الفاظ میں ہم سیاسی اخلاق بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن چونکہ ہر اجتماع کی تشکیل افراد سے ہوتی ہے اور تمام افراد کی ذہنیت ایک ہونا ممکن نہیں اس لئے ہم کوئی سیاسی اخلاق ایسا وضع کر ہی نہیں سکتے جو قوم کے ہر ہر فرد کے لئے قابل قبول ہو اور باہمی تصادم کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

اس میں شک نہیں زمانۂ قدیم سے اکابر قوم قواعد اخلاق وضع کرتے چلے آئے ہیں اور حیات اجتماعی کی رہبری کے لئے انھوں نے بڑے اہم اصول منضبط کئے ہیں لیکن خاطر خواہ نتیجہ کبھی نہیں نکلا کیونکہ یہ قواعد انسان کو یکساں سمجھ کر وضع کئے گئے اور اس حقیقت کو پس پشت ڈالدیا گیا کہ انسان کی کوئی خصلت فطری نہیں ہے اور اس کے تمام اخلاقی رجحانات اکتسابی ہیں اور ماحول کی پیداوار، جس میں مذہبی عقائد، ملکی آب وہوا، جغرافی اقتضاء، جذبۂ حفظ وبقا اور مسابقت سب شامل ہیں۔ الغرض انسان کے تمام اخلاق اکتسابی ہیں جو زمان ومکان کے تنوع اور عوامل زندگی کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں۔

اہل اسپارٹا کے نزدیک چوری کرنا جائز تھا۔ بوڑھے باپ کو جو کسی کام کے قابل نہ ہو قتل کر دینا وحشی قبائل میں بڑا کار ثواب سمجھا جاتا تھا جزیرہ اقیانیا میں اس کو بہت ذلیل وحقیر تصور کیا جاتا تھا جو اپنے باپ کا گوشت نہ کھائے۔ افریقہ کا مشہور وحشی قبیلہ نیام نیام انسانی گوشت کو بڑے شوق سے کھاتا ہے حالانکہ ہم اس کا تصور بھی کبھی نہیں کر سکتے ہم موجودہ عہد میں اپنی عورت کے متعلق نہایت غیرت سے کام لیتے ہیں اور کبھی یہ گوارا نہیں کرتے کہ کوئی اجنبی اسے بری نظر سے دیکھے لیکن قدیم یونان میں دستور تھا کہ جب کسی مرد کی تناسلی قوت ضعیف ہو جاتی تھی تو اپنی بیوی کو نہایت خوشی سے اپنے بھائی یا کسی دوست کے پاس

دیا جاتا تاکہ سلسلۂ نسل منقطع نہ ہو۔ اپنی اولاد سے محبت فطری مجبوری ہے لیکن قدیم اہلِ فنیشیا اپنے معبود مولوخ کے آہنی بت کو آگ میں سُرخ کرکے اس پر اپنے بچے ڈال دیتے تھے۔

اگر اخلاق انسانی فطری ہوتے تو ان میں اس قدر عظیم اختلاف نہ پایا جاتا اور مذاہب یا حکومتوں کو اصلاحِ اخلاق میں سر کھپانے کی ضرورت نہ ہوتی۔

جب سے انسان نے دنیا میں اجتماعی زندگی شروع کی ہے اُسی وقت سے اخلاقی قواعد کا بھی آغاز ہوا ہے۔ سنجیدہ و مفکر افراد قوم نے وقت و مقام کے لحاظ سے اصول و قواعد وضع کئے اور کوشش کی کہ لوگ اس پر عمل کریں لیکن ابتدا میں ان قوانین کی حیثیت محض اخلاقی تھی یعنی کوئی سزا یا پاداش کسی پر عائد نہ ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں انسداد جرائم ناممکن تھا اس لئے قوانین سخت کر دیے گئے اور سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور افراد کی اصلاح کسی نہ کسی حد تک ہو سکی۔ لیکن جماعتی اصلاح کی صورت اس نے اختیار نہیں کی اور آئے دن ان کے درمیان جنگ و قتال کا سلسلہ بند نہ ہوا بلکہ انسان نے جتنی ترقی علوم و فنون میں کی لڑائیاں اتنی ہی زیادہ خطرناک ہوتی گئیں اور اخلاقی قواعد نزاعِ بشری دور کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔

علماءِ اخلاق کا یہ خیال صحیح نہیں کہ فرد و جماعت کے اخلاق یکساں ہوتے ہیں اور جو قانون افراد پر استعمال کیا جاتا ہے وہ جماعتوں کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جماعت اور فرد میں بڑا فرق ہے۔ بعض جماعتی خصوصیات افراد میں نہیں پائے جاتے اور بعض افرادی خصوصیات جماعت میں نظر نہیں آتے۔ اگر ہم جماعت کو افراد کے اخلاق کا پابند بنائیں تو یہ بات ناموسِ فطرت کے خلاف ہوگی۔ تجربات شاہد ہیں کہ بعض انفرادی کمزوریاں جماعت کے لئے مفید ہوتی ہیں اور بعض خوبیاں نقصان رساں۔ مثلاً نفاق و ریاکاری فرد کے لئے بدترین خصلت ہے لیکن بہت سی جماعتی کامیابیاں اسی سے حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح عفو و درگزر فرد کی بہترین صفت ہے لیکن اگر جماعت اسے اختیار کرے تو اس کا قومی وجود ختم ہو جائے۔

اسی حقیقت کی بناء پر ماکیاویلی نے (جو فلورنس کا مشہور مقنن تھا) نہایت جرأت سے کام لے کر صاف صاف کہہ دیا کہ "بادشاہ کو ان اجتماعی جرائم کے ارتکاب میں ذرا بھی تامل نہ کرنا چاہیئے کیونکہ بغیر ان کے کوئی ملک محفوظ نہیں رہ سکتا۔" اور بعد کو قوموں اور سلطنتوں میں یہ بات اصول موضوعہ کے طور پر مان لی گئی کہ "لڑائی کا دوسرا نام مکر و فریب ہے۔"

ماکیاویلی اپنی کتاب (THE BOOK OF KINGS) "الامیر" میں اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے: "میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ایک سیاسی اصول پیش کروں اور وہ یہ ہے کہ جب تم کسی دشمن کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو تمہیں ان دو طریقوں میں سے ایک طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ یا تو خوشامد و احسان سے اسے اپنا موافق بنا لو یا اسے ہلاک کر دو اور فطرتِ انسانی دوسرے طریقہ کو زیادہ پسند کرتی ہے۔" اسی اصول کی بناء پر اس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ "جو قوی کسی ضعیف کو تقویت پہنچاتا ہے وہ گویا اپنی موت کو دعوت دیتا ہے۔" آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "جنگ کے دو طریقے ہیں۔ ایک قانون کے ذریعہ سے، دوسرا قوت کی مدد سے۔ پہلا طریقہ انسانی ہے اور دوسرا حیوانی۔ لیکن چونکہ پہلا طریقہ ہر موقع پر کام نہیں دیتا اس لئے انسان کو مجبوراً دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے انسانی و حیوانی دونوں طریقوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔ حاکم یا بادشاہ میں شیر اور لومڑی دونوں کی خصوصیات کا اجتماع ضروری ہے۔ کیونکہ تنہا شیر اپنے آپ کو جال اور پھندوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا اور نہ تنہا لومڑی اپنے آپ کو بھیڑیوں سے بچا سکتی ہے۔ حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ دشمن کے مکر و کید سے بھی باخبر رہے اور اپنی طرف سے اسے خائف بھی رکھے۔ تنہا شیر کی خصلت سے کام نہیں چل سکتا۔ حاکم کو لومڑی کی عیاری و مکاری بھی جاننا چاہیئے۔"

یہ تھا وہ سیاسی اخلاق جس کو ماکیاویلی نے اپنے وطن (اطالیہ) کی حکومت کے سامنے پیش کیا تھا لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بعد کو تمام اربابِ سیاست نے اسی پر عمل کیا اور زمانۂ حال میں بھی اگر آپ پہلی جنگِ عظیم سے لے کر اس وقت تک عالمی سیاست کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی تمام حکومتوں نے اس پر عمل کیا، یہاں تک کہ آج بھی جبکہ انسان بہت ترقی کر گیا ہے اور دنیا میں صرف امن و سکون

چاہتا ہے جمہوریت و اشتراکیت دونوں اسی پر عامل ہیں۔

تاریخ عالم کے واقعات اور ان کے اسباب و علل پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ارباب سیاست ابتدا ہی سے صرف ایک مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہیں جسے ہم مصلحت عامہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پروفیسر بلونشلی نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ حکومت بے معنی و مہمل لفظ نہیں ہے اور بہت سی برائیوں کا انسداد حکومت کے بدولت ہوا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ ہمیشہ عام قواعد اخلاق کی پابند نہیں رہی اور خیر و شر کا معیار اس کے یہاں انفرادی معیار سے مختلف رہا ہے۔ سزا مجرم کی نظر میں شر ہے لیکن ہیئت اجتماعی اسے خیر سمجھتی ہے کیونکہ اگر سزائیں نہ ہوتیں تو جرائم بہت عام ہو جاتے، جانیں ضائع ہوتیں، مال لوٹا جاتا اور سوشل نظام درہم برہم ہو جاتا۔ سزا بیشک شر ہے لیکن وہ حصول خیر کا ذریعہ بھی ہے اس لئے سیاسی اخلاق میں اس کی اہمیت اس خیر سے زیادہ ہے جو محض انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔

سیاست کا اصل مقصد یہ ہے کہ حکومت داخلی و خارجی فتنوں سے محفوظ رہے اس لئے ایک بیدار سیاست وہی کہلائے گی جو ہر ممکن طریقہ سے اس مقصد کے حصول میں معاون ہو خواہ وہ افراد کے لئے کتنے ہی تلخ و ناگوار کیوں نہ ہوں۔ اجتماعی مسائل کبھی اجازت نہیں دیتے کہ حکومت انفرادی محاسن اخلاق کو سامنے رکھے، کیونکہ انسان ابھی تک اس حد تک ترقی نہیں کر سکا ہے کہ جو اخلاق ایک فرد کے محاسن میں شمار کئے جاتے ہیں وہی پوری جماعت کے لئے بھی موزوں سمجھے جائیں۔ فریڈرک، ماکیاویلی کے اس نظریہ کے خلاف تھا اور اس نے ماکیاویلی کی تردید میں صاف صاف لکھا ہے کہ جماعتیں افراد سے بنتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اخلاق کو بھی انفرادی نقطۂ نظر سے جانچا جائے۔ لیکن یہ بات فریڈرک نے اس وقت لکھی تھی جب وہ شاہزادہ تھا اور حکومت اس کے ہاتھ میں نہ آئی تھی لیکن جب وہ بادشاہ ہو گیا تو خود اس پر عمل نہ کر سکا اور سیاسی اخلاق کو بمقابلہ انفرادی اخلاق کے اسے زیادہ اہمیت دینا پڑی۔

ایک سیاسی مبصر کہتا ہے کہ رائے عامہ کی نظر معاملہ کی صرف ظاہری سطح پر پڑتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے دو افعال پر مختلف حکم لگاتی ہے۔ مثلاً اگر ایک فاتح سپہ سالار کسی مفتوح شہر کے لوگوں سے کوئی معاہدہ کرے اور اسے توڑ دے تو رائے عامہ اس کے خلاف ہوگی، لیکن اگر کوئی مغلوب سپہ سالار عہد نامہ توڑ کر برسرپیکار ہو جائے تو اس کی تعریفیں ہونے لگیں گی، حالانکہ عہد شکن دونوں ہیں۔

سیاست صرف غرض اور انجام کو دیکھتی ہے اور حصول مقصد کے لئے وہ ہر ذریعہ و وسیلہ سے کام لیتی ہے خواہ انفرادی نقطۂ نظر سے وہ کتنا ہی انسانیت و اخلاق و تہذیب کے منافی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح انفرادی حیثیت سے نیکی و بدی کا معیار قائم کیا جاتا ہے کیا حکومتوں کا نہیں کیا جا سکتا؟ اگر افراد کوئی جرم کرتے ہیں تو حکومت ان کو سزا دیتی ہے، لیکن اگر حکومت ایسا کرے تو اس کو کیونکر سزا دی جا سکتی ہے؟ اس کا جواب ماکیاویلی کے زمانہ میں تو نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ اس وقت سیاست و حکومت کا تصور کچھ اور تھا لیکن اب کہ حکومتوں کی بنیاد آزاد رائے عامہ پر قائم ہے، حکومتوں کے جرائم نظر انداز نہیں ہو سکتے اور جمہور کے متفقہ فیصلہ کے سامنے ان کو سر جھکانا پڑتا ہے، یہاں تک وہ معزول کر دی جاتی ہیں اور ان کی جگہ دوسری جماعتیں لے لیتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں عہد ماکیاویلی کے سیاسی اخلاق سے موجودہ عہد کے سیاسی اخلاق مختلف ہوں گے انفرادی اخلاق سے خواہ وہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔

لیکن گفتگو تشنہ رہے گی اگر اس سلسلہ میں عہد حاضر کے تمام دبستان سیاست کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ نہ کیا جائے کہ جمہور عامہ کی حکومتوں کے جو مختلف تصورات قائم کئے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ قرین فطرت کون سا تصور ہے۔

اس وقت مفکرین سیاست دو جماعتوں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جو آزاد رائے عامہ کی طرفدار ہے اور دوسری وہ جو رائے عامہ سے زیادہ مفاد عامہ کو سامنے رکھنے کی مدعی ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ان میں سے ایک جمہوریت کی طرفدار ہے اور دوسری سوشلزم (اشتراکیت) کی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ سیاست کے یہ دونوں تصور رجحان کے تصورات ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت و اشتراکیت دونوں بہت

قدیم العصر تصورات ہیں۔ جس وقت سے دنیا میں ملکیت یا تسلط کی تاریخ شروع ہوئی ہے اسی وقت سے اشتراکیت کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں زمانۂ قدیم میں جب کبھی اصحاب دولت نے غریبوں پر ظلم شروع کیا، اشتراکی خیالات دنیا میں رونما ہونے لگے۔

یونان قدیم میں جب امیر و غریب کا تفاوت بہت بڑھ گیا تو فایاتی نے ایک قانون مرتب کیا جس میں اس نے لڑکیوں کا مہر صرف دولتمند طبقہ پر عاید کیا اور غریبوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا۔ افلاطون نے جب یونانی جمہوریت کو مرتب کیا تو اس نے لوگوں کے تین طبقے مقرر کئے۔ پہلا طبقہ معلمین کا تھا جس میں تمام اعضاء حکومت شامل تھے، دوسرا طبقہ عامۃ الناس کا تھا جس میں مزارعین اور مزدوری پیشہ لوگ شامل تھے۔ تیسرا طبقہ فوج کا تھا۔ لیکن زمین، عورت اور غلام کو اس نے مشترکہ ملکیت قرار دیا تھا۔ گویا اس نے جمہوریت و اشتراکیت دونوں کو ایک کر دیا تھا۔

دوسری صدی قبل مسیح میں اسرائیلیوں کی ایک جماعت جو فرقۂ اسینیہ (ESSENES) کے نام سے موسوم تھی۔ بحر مُردہ (DEAD SEA) کے کنارے آباد ہوئی۔ ہرچند اس کی تعلیمات اور رسوم و عادات پر پردہ پڑا ہوا ہے، تاہم یہ ضرور ثابت ہے کہ مال میں سب برابر کے شریک تھے اور اس لئے ان میں نکاح کا رواج بھی نہ تھا۔ یہی حال ایک مسیحی فرقہ کروکراٹیانا کا تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں معدوم ہوگیا ـــ ہالینڈ میں بھی متعدد جماعتیں اشتراکی اصول پر قائم ہوئیں جن میں سے سب سے زیادہ مشہور وہ جماعت تھی جسے جرار گروٹ نے ۱۳۷۸ء میں قائم کیا تھا ـــ دوسری صدی عیسوی میں ایک گروہ آدمٹیا کا نمودار ہوا جو راستوں پر برہنہ پھرتا تھا اور عورت کو مشترک ملکیت سمجھتا تھا۔

جرمنی کے عہد اصلاح میں وہاں کی کاشتکار جماعت نے زمینداروں کو مجبور کیا کہ وہ انھیں بھی برابر کا شریک قرار دیں۔ اس پر باہم سخت خونریزی ہوئی جو "جنگ مزارعین" کے نام سے مشہور ہے۔

تاریخ میں بعض ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ مسیحی جماعتوں نے دولتمند افراد پر زور ڈالا کہ وہ اپنی دولت فقراء پر تقسیم کر دیں۔ الغرض ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اشتراکی خیالات پیدا ہوئے، دولت و حکومت نے ان کا مقابلہ کیا اور تسلط و مساوات کی اس جنگ نے دنیا میں کافی اضطراب پھیلایا ـــ اشتراکی اصول پر عہد وسطیٰ میں متعدد کتابیں بھی تصنیف کی گئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب سار تو ماس مور کی ہے جو ۱۵۱۶ء میں طبع ہوئی تھی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ متمدن دنیا میں اشتراکی انجمنوں کی تعداد ہمیشہ بڑھتی ہی گئی اور حکومت ان کے مطالبوں کو ختم نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ان کی تعداد ستر تک پہونچ گئی۔

فرانس بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا اور ایک بار وہاں اصول اشتراکیت نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ بابوف اور اس کے متبعین نے نظام حکومت کو اُلٹ دینے ہی کا ارادہ کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ ملکیت اشیاء میں سب کے حقوق برابر ہیں اور اگر کوئی شخص کسی خاص شے کو اپنی ملکیت قرار دیتا ہے تو وہ جمہور کا مجرم ہے۔

بابوف کے بعد اس کے متبعین میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ بعض نے رسم نکاح کو بھی اصول اشتراکیت کے منافی قرار دیا اور دنیا کے تمام شہروں کو تباہ کر دینے کا مطالبہ کیا کیونکہ ان کے نزدیک مظالم کے مرکز یہی تھے۔

سان سیموں فرانسیسی (۱۷۶۰-۱۸۲۵ء) نے ایک نیا مذہب نکالا جسے وہ "نصرانیت جدیدہ" کہتا تھا۔ اس نے کچھ اصول وضع کئے تھے اور انھیں کے مطابق وہ مذہبی و سیاسی عقاید کی اصلاح کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی۔ اس کے بعد اس کے شاگردوں نے اخبارات خطابت کے ذریعہ سے اس مذہب کی اشاعت شروع کی، لیکن چونکہ سان سیموں کے اصول خود اس کے تلامذہ بھی اچھی طرح نہ سمجھے تھے، اسلئے بعد کو ان میں اختلافات پیدا ہوگئے اور حکومت نے اس انتشار سے فایدہ اٹھاکر ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا اور ان کی مرکزی قوت کو بالکل فنا کر دیا۔

سان سیموں کے بعد شارل فوریار (۱۷۷۲-۱۸۹۳ء) سامنے آیا۔ اس کے اصول کچھ بدلے ہوئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ بحیثیت اجتماعی

کی بنیاد دائمی ارتقاء پر قائم ہے۔ اسی زمانہ میں جب کہ فوریا اور اس کے مقلدین اجتماعی اصلاحات میں مصروف تھے ایک اور شخص لوئی ویاں پیدا ہوا۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ تعین عمل اور تقسیم اجرت حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء میں اس کا تجربہ کیا گیا، حکومت کی طرف سے کارخانے قائم کئے گئے، مزدوروں کی اجرت مقرر کی گئی، لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور ملک میں اشتراکی بغاوت شروع ہو گئی اور اشتراکیت کے حامیوں کو ناکامی نصیب ہوئی۔

برودن (۱۸۰۹-۱۸۶۵ء) کا دستور العمل، لوئی کے خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکومت کو قوانین وضع کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ کام جمہور کا ہے، لیکن چونکہ اس کے اصول بہت مبہم تھے اس لئے ان میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

انگلستان میں رابرٹ اوین (۱۷۷۱-۱۸۵۸ء) نے اشتراکی خیالات کی اشاعت شروع کی لیکن ناکام رہا۔ اس کے بعد ملک میں بہت سی اشتراکی انجمنیں قائم ہوئیں جن کی تعداد ۱۲۰۸ تک پہونچ گئی لیکن ان میں سے سب سے زیادہ کامیاب انجمن روشڈایل کی تھی جس نے مشترک اصول پر تجارتی انجمن قائم کی اور بہت ترقی حاصل کی لیکن حکومت نے اسے بھی فنا کر کے چھوڑا۔

اسی زمانہ میں ایک اور بڑی شخصیت کروپٹکن کی پیدا ہوئی۔ یہ ماسکو میں پیدا ہوا اور زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد ۱۸۸۶ء میں انگلستان آ گیا۔ یہ اپنے زمانہ کا بڑا زبردست مصلح تھا۔ اس نے مذہب، حکومت اور ملکیت کے متعلق ایک خاص نظریہ پیش کیا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ روس کی موجودہ طرز حکومت کی بنیاد اس نے ڈالی۔ اس نے اپنے مذہب کی بنیاد نظریۂ نشو و ارتقا پر قائم کی اور چونکہ وہ اپنے عہد کے اقتصادی، اجتماعی و سیاسی نظام کو ارتقاء بشری کے منافی سمجھتا تھا اس لئے وہ کہتا تھا کہ وہ وقت قریب ہے جب دنیا کو ناگہاں انقلابات سے دوچار ہونا پڑے اور بشریت دورِ جمود سے نکل کر ایک روشن مستقبل کی شاہراہ تک پہونچ جائے۔ وہ ملک کے تمام مروجہ قوانین کے مخالف تھا کیونکہ ان سب کی غایت تھی کہ سرمایہ داروں کا تسلط جمہور پر قائم رہے۔ وہ چاہتا تھا کہ قانونی حکومت بالکل مٹا دی جائے۔ اس کا خیال تھا کہ جب قانون دنیا سے اُٹھ جائے گا تو انسان صرف اپنی فطری عادات پر قائم ہو جائے گا جو ارادۂ عامہ کے تحت ظہور میں آئیں گی اور اس ضابطہ کے ضامن وہ روابط و باہمی تعلقات ہوں گے جو اشتراکِ عمل سے پیدا ہوئے ہیں اور مخالفین کی سزا صرف یہ ہوگی کہ انھیں انسانی برادری سے خارج کر دیا جائے۔ چونکہ کروپٹکن کے یہ خیالات "لاقانونیت" کے حامی تھے اس لئے انھیں انارکزم (عدمیت) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

الغرض شخصی حکومت یا استبداد کے خلاف زمانۂ دراز سے جنگ جاری تھی اور گو اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ دورِ ملوکیت رفتہ رفتہ بالکل ختم ہو گیا، لیکن اس نے ایک اور نئی صورت آمرانہ حکومت کی اختیار کر لی۔ جس کی کھلی ہوئی مثالیں ہم کو ہٹلر اور مسولینی کی حکومتوں میں ملتی ہیں۔

ان کی تباہی کے بعد جمہوریت و اشتراکیت کا نیا دور شروع ہوا لیکن بدقسمتی سے خود ان میں بھی اختلافات پیدا ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ آج ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا ہے (حالانکہ غایت و اصول کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں) اور ان دونوں کی مخالفت کا ردِ عمل یہ ہوا کہ بعض حکومتوں میں پھر "عسکرانہ آمریت" کے آثار شروع ہو گئے۔

بہر حال دنیا، باوجود اس کے کہ اس وقت تک سیکڑوں مصلحین نے اس کی اصلاح کی کوششیں کیں، اب تک صحیح معنی میں امن و سکون سے محروم ہے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی قوم سیاسی اخلاق کا ایسا نظریہ پیش نہیں کر سکی جو تمام افراد کے لئے قابلِ قبول ہو اور نہ آیندہ اس کا کوئی امکان نظر آتا ہے۔ جماعتیں اُٹھتی رہیں گی، اپنے اپنے مفاد کے پیشِ نظر قانون بناتی رہیں گی اور پست و بلند کی نزاع کا یہ سلسلہ بدستور اسی طرح جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دن دنیا ختم ہو جائیگی اور غالباً یہی وہ تصور تھا جس کے زیرِ اثر آتش نے یہ شعر کہا ؎

پتلوں سے خاک کے یہ گڑھے بھر چکیں کہیں
دھبّا مٹے زمیں کے نشیب و فراز کا

تیز تر گام زن

عرش ملسیانی

قافلے کی کوئی ایک منزل نہیں

رُخ مخالف ہوا کا بدلتے رہو
کوئی اُفتاد ہو تو سنبھلتے رہو
مرحلہ سخت ہو پھر بھی چلتے رہو
عزم ہو تو کوئی راہ مشکل نہیں
قافلے کی کوئی ایک منزل نہیں

یہ تو سچ ہے کہ صبح مسرت ملی
پنجۂ غیر سے بھی فراغت ملی
بستیوں کے مکینوں کو رفعت ملی
بس یہی کچھ تو ہمت کا حاصل نہیں
قافلے کی کوئی ایک منزل نہیں

تم زمانے میں ہو محترم معتنم
عزم کا لے کے جھنڈا بڑھو دمبدم
منزلیں ہیں بہت، تیز رکھو قدم
سست گامی کا یہ دَور قائل نہیں
قافلے کی کوئی ایک منزل نہیں

سازِ حق حریت کی نواؤں میں ہے
نکہتِ گل وطن کی ہواؤں میں ہے
روحِ آزاد جولاں فضاؤں میں ہے
جو فقط اس پہ خوش ہیں وہ عاقل نہیں
قافلے کی کوئی ایک منزل نہیں

کیفِ جہد و عمل دل پہ طاری رہے
شوقِ تعمیر کا فیض جاری رہے
جوشِ تدبیر ہر رگ میں ساری رہے
بیٹھ رہنا تو ہمت میں داخل نہیں
قافلے کی کوئی ایک منزل نہیں

موج زن شوق ہو قلبِ بیتاب میں
شک کسی کو نہ ہو جہد کے باب میں
لے کے کشتی نکل جاؤ گرداب میں
زندگی ہے بھنور ریگِ ساحل نہیں
قافلے کی کوئی ایک منزل نہیں

✡

"سنسکرت ادب میں شاعری کا تصوّر"

آثر لکھنوی

"رسانُ بھو"[1] (रसानुभव) اور رساسوادن"[2] (रसास्वादन) ہندوستانی (سنسکرت) ادب کے وہ جاذب توجہ زاویے ہیں جو شاعر، شاعری اور پڑھنے والے کو مسرت و سرشاری و خود فراموشی کے ایک ہی سنگم پر لے آتے ہیں۔ رس (ذوق) وہ جوہر ہے جس سے ہم صناعت کے کسی نمونے کو جانچتے، پرکھتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ اس کی لذت ذہنی ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو جذبات اور تناسبات کی ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں وہ اپنے آپ اور گرد و پیش کے مادی مظاہر سے بے خبر ہو کر وہ روحانی تلذذ حاصل کرتا ہے جو "موکش" یا نفسِ مطلق سے مشابہ ہوتا ہے۔ تعینات سے گزر کر اس کی ہستی فرد کی حیثیت سے ختم ہو جاتی ہے۔ وہ محسوسات کے مطالعہ میں ایسا کھو جاتا ہے کہ ان کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے اُن آفاقی حقائق کا احاطہ کر لیتا ہے جو خود اس کی ہستی کے بنیادی عناصر ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ خود بھی جملہ حیات اور کل کائنات کا ایک جز بن جاتا ہے۔ صرف اسی کو "سہردیہ" (صاحبدل) کہہ سکتے ہیں یعنی ایسا شخص جس نے ذوق کی رہنمائی میں تربیت، فطرت اور عادت میں ایسی ہم آہنگی پیدا کی ہے کہ زندگی ایک حساس ساز کی طرح صناعت کا زخمہ کھاتے ہی نغمے بکھرانے لگتی ہے۔ یہ ذوق اور اس کی تحریک و اشاریت ہندوستان کے جمالیاتی شعور کی بلند ترین تشریح ہے۔

تحقیق نے بظاہر اس سے آگے قدم نہیں بڑھایا اور وہ خصوصیات پیدا نہیں کیے جو تفسیر اور ترجمانی کا کام دیں، وہ اقدار قائم کریں جو مغربی انتقاد کا طرۂ امتیاز ہیں، نہ مغرب کی طرح عمل تخلیق کی وضاحت میں شغف رہا نہ خلاقانہ ذہنیتوں کا جائزہ لے کر انھیں اُن کی ادبی پیداوار سے مطابق کیا گیا تاکہ وہ خطے منور ہوتے جو اب تک تاریک اور غیر متعین تھے۔ ارباب ادب نے عمل شاعری کا گہرا تجزیہ کر کے شاعر کی تخئیلی فطانت کو اجاگر کیا، لیکن ان کی توجہ خاص کر مصنفوں اور ناقدوں کو سہارا دینے کی طرف مبذول رہی کہ لسانی خوبیاں اور اسلوب کی دل آویزی نیز تصنیف کی امتیازی شان اور مدارج تک ذہن کی رسائی ہو اور اجزائے ترکیبی میں نسبتی اہمیت کا لحاظ رہے۔

"پرتبھا" (Genius) یعنی فطانت یا غیر معمولی ذہانت کو شاعرانہ تخلیق کا سبب اولیں قرار دیا گیا ہے۔ یہ تخئیل کی قوت ہے بصیرت کا وہ لمعۂ نور ہے جو نو بہ نو ذہنی اشکال، روابط اور معنویت کو ایک مجسمۂ حقیقت بنا دیتا ہے، خیال کو واقعہ میں بدل دیتا ہے، افسانہ حقیقت ہو جاتا ہے، مختلف واقعات باہم منسلک ہو جاتے ہیں اور سب میں ایک انفرادیت، ایک انوکھا پن پایا جاتا ہے۔ "پرتبھا" کو آزاد، بیباک، متلون، ہنگامہ آرا

۱۔ رس کا احساس ۲۔ رس کا ذائقہ لینا

اور خود مختار کہا گیا ہے۔ شاعروں کو اس سے پھریریاں آتی ہیں اور اس کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں۔ بعض اس کو دیوتاؤں کا عطیہ تو بعض الہام کہتے ہیں۔ گویا شاعری کی ملکہ براہ راست ان کے کان میں کچھ کہہ رہی ہے۔ کبھی کبھی پورا فرمان بالاعلان بھی نافذ ہوتا ہے، شاعر محض اس کا قلمبند کرنے والا اور نشر کا وسیلہ یا آلہ ہوتا ہے۔

لیکن کیا یہ سب درحقیقت مافوق الفطرت کرشمہ یا شاعر کی ذات سے باہر کی آمد ہے؟ شدتِ احساس (جس کو کبھی "حلول" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا) اور اس سے وابستہ جسمانی اور اعصابی ارتعاش اور اس کے بعد ایک حسین صناعت کا ظہور، کیا یہ تمام مشاہدات دراصل پُراز اسرار اور جولانی میں ایسے عناں تاب ہیں کہ ان کو انسانی طاقت سے ماوراء تصور کیا جائے؟ ہمارا خیال ہے کہ اس عقیدہ کا ایک معقول حصہ محض استعارہ ہے تاکہ اس عمل پر روشنی پڑے جو ہمیں مرعوب کرتا اور ہم پر چھا جاتا ہے، حیرت میں ڈال دیتا اور تن بدن میں اہتزاز کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے۔ دارالعمل (Laboratory) میں احتیاط سے کئے ہوئے تجربات نے ثابت کر دیا ہے، خود صناعوں کے بیانات سے بھی تصدیق ہوتی ہے، نیز ان لوگوں کی تحقیق نے جو تخصیص سے تعمیم کی طرف مائل ہوتے ہیں، یہ بات آئینہ کر دی ہے کہ زندگی کا یہ مظاہرہ علم اور مقصد کی وہ ثانوی شاخ ہے جس میں انسان کے تعمیری سماجی حقیقت کی مزعومہ ذہنی ساخت کو نمایاں کرنے میں صرف ہوتے ہیں۔

شاعرانہ تخلیق ایک مرکب عمل ہے جس میں جذبات کے اکثر عناصر نیز متخیلہ اور ادراک مختلف مقدار میں مل جل کر ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں اور انداز بیان وضع کرتے ہیں۔ شاعر کے دماغ کا کیا رنگ ہوتا ہے جس وقت یہ کیفیت مسلط ہونے والی ہوتی ہے یا مسلط ہو جاتی ہے؟ اس کا جوش و خروش جواب تک سیال تھا کیا صورت اختیار کرتا ہے؟ ان امور کی طرف ایک اُچٹتا سا اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں نبض کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، حاسّہ ذکی ہو جاتا ہے، مشاہدے کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے، تخیئل کی گیرائی اور دستگاہ بڑھ جاتی ہے، اندرونی ہستی کی تہ اور سطح سے مختلف قوتیں جوش زن ہوتی ہیں، چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، حافظہ اور متجانس خیالات ہر موڑ پر نقوش، آہنگ، معنویت، موسیقیت، جوش و حرکت، تمثیل و اشاریت، سلاست، روانی، صفائی، گہرائی، جذبات رغبت و برأت، نزاکت و شوخی غرضکہ ہر وہ چیز شامل کرتے جاتے ہیں جس سے کلام کی تزئین ہوتی ہے حتیٰ کہ ایک تصویر رونما ہوتی ہے جو خود شاعر کو بھی نئی معلوم ہوتی ہے[1]۔ اس طرح حُسن کی آفرینش ہوتی ہے یا ظہور میں آتا ہے یا دریافت کیا جاتا ہے اور اس کی ہستی خود وجود میں لانے والے کی اپنی ہستی سے الگ، قائم بالذات اور آزاد ہوتی ہے۔

یہ عمل بیک وقت جمالیاتی، تخلیقی اور فنکارانہ ہوتا ہے۔ اس کا آغاز بھی ہوتا ہے، وسط بھی اور اختتام بھی۔ اس میں اکساؤ یعنی وہ قوت ارادی ہوتی ہے جو ایک موثر اسلوب سے تخلیق و تفسیر کی مازم حق اور اظہار و تشکیل کے لئے ابداع و صناعت سے کام لیتی ہے۔ یہ آرٹ کے عمل کا ایک پہلو ہے اور چونکہ آرٹسٹ یا فنکار انسان ہے (البتہ ایک خاص میلان طبع رکھنے والا انسان) اور آلۂ اظہار الفاظ ہیں جو بے شمار انسانوں کا بھی آلۂ اظہار ہیں لہٰذا وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو معنویت سے لبریز ہیں، جن کا پس منظر جذبات سے ہم آہنگی، تیکھا، بلند پایگی، تاثر، حوالہ، انداز یا ڈھنگ ہوتا ہے اس لئے جو کچھ کہتا ہے دوسرے سمجھتے ہیں یعنی شاعر ترسیل یا ابلاغ (Communication) کا مرحلہ طے کرتا ہے۔

جب اس مسرت کے باعث جو شاعر کو اپنے طریق کار اور اس کے امکانات سے حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے تخیلات کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو پھر کوئی کسر نہیں رہتی نہ تو شاعر کے لئے نہ سامع کے لئے۔ صناعت کا ایسا نمونہ گویا ایک پُل ہے جس کی ایک کوٹھی تو پیچھے کی طرف گاڑی جاتی ہے جو تخلیقی حالات و واقعات کو پیش نظر کرنے اور سرچشمے تک رسائی میں معین ہو اور ایک کوٹھی آگے کی طرف گاڑی جاتی ہے تاکہ لوگ اس جانب قدم بڑھا سکیں، اقدار قائم کریں اور محاسن پا سکیں۔

---

[1] میں نے کبھی کہا تھا — صد عشرت نظارہ بے منت نظارہ — اک نقش نازنیں کا تخیئل میں ابھرنا۔ (اثر)

کو پرکھیں۔ اب لوگ اس نمونۂ صناعت سے یا تو لطف اندوز ہونے لگتے ہیں یا مخالفت پر اتر آتے ہیں، بعد ازاں وہ نمونہ یا تو روایات میں جذب ہو جاتا ہے یا نکال باہر کر دیا جاتا ہے یا خود روایات میں تغیر و تبدل یا ترمیم کی دعوت دیتا ہے۔

فطانت اس تجزیۂ شاعری کا سفر و منہ نقطۂ آغاز ہے۔ فطانت کسی خاص وقت میں کیوں ایک راہ اختیار کر لیتی ہے، دوسری راہ اختیار نہیں کرتی؟ اس میں تسلسل کیوں نہیں ہوتا؟ کیوں طویل عرصے تک معطل بھی رہتی ہے؟ کیوں شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت آزاد و سبک پرواز رہے؟ اس کی رفتار سست کیوں ہو جاتی ہے یا کیوں جمود پذیر ہو کر اپنی امتیازی شان کھو بیٹھتی ہے؟ یا کیوں مضمحل ہو کر انداز بیان کا بانکپن تج دیتی ہے؟ یہ جملہ امور اب تک مطالعہ اور تفتیش کے محتاج ہیں۔ ہندوستانی ادیبوں نے "پرتبھا" کو "سمسکار" یعنی تہذیب و تربیت کا حاصل ٹھہرایا ہے یا "واسنا" یعنی تجربوں کے مخفی اثرات سے منسوب کیا ہے جو پچھلے جنموں سے منتقل ہوتے آئے ہیں کیونکہ وہ لوگ تناسخ اور آواگون کے معتقد تھے جس میں ذہنی صفات کی توریث اور تفویض بھی شامل ہے۔ تاہم یہ نہیں بتایا گیا کہ "سمسکار" یا "واسنا" کہیں صناعانہ تخیل کی صورت گری کیوں کرتی ہے اور کہیں سپہ گری، سیاست، تفلسف یا طبابت وغیرہ کا سلیقہ کیوں بن جاتی ہے جب تک ہم یہ نہ فرض کریں کہ اس شخص کے پچھلے جنموں میں بھی تو یہی قوتیں عمل پیرا تھیں اور ان کا اکتساب کیا گیا یا ان کو برتا گیا تھا۔ مگر کیا ہم اس کی توجیہہ اپنے سطح علم پر ہندوستانی جمالیاتی اصطلاحات کو برقرار رکھتے ہوئے جدید نفسیاتی تحلیل کی روشنی میں نہیں کر سکتے؟ کیا وہی چیز جسے عام طور پر "رس" کہتے ہیں (یعنی صناعت کے نمونوں سے لطف اندوزی) دراصل وہی قوت نہیں جس کا عمل خلاقی ہے؟

ہم فرائڈ کے اس حد تک ہمنوا نہ ہوں کہ "ہمارا مادی شعور معطل ہے اور ہم عامل نہیں بلکہ نامعلوم اور قابو میں نہ آنے والی قوتوں کے معمول ہیں"۔ تاہم جسے فرائڈ "آئڈ" یعنی نفس کا غیر اتیاتی رخ کہتا ہے ایک حیرت میں ڈالنے والی زبردست حقیقت ہے جو تحت الشعور میں سرگرم عمل رہتی ہے اور ہمیں اسی موثر طریقے سے ابھارا کرتی ہے جیسے اور کوئی محرک جو بالائے سطح ہیجان پیدا کرے۔ ایک ذکی شخص خاص ذہنی تحائف کا حامل

ہوتا ہے، ایسے ماحول کا پرداختہ جس میں ضروریات، فرائض، پابندیاں، رسم و رواج، مواقع وغیرہ موجود ہیں اور ایسے خاندان سے ہوتا ہے جس میں مقامی طبقاتی، یا نسلی خصوصیات ممیز ہیں۔ اس میں قوتیں ودیعت ہوتی ہیں، عمل اور ردعمل کا ایک خاص رخ ہوتا ہے، متاثر ہونے اور کسی بات کو کسی بات پر ترجیح دینے کا خاص ڈھنگ یا پیرایہ ہوتا ہے اور انھیں امور کا بیشتر حصہ اس کی انفرادی اور سماجی تاریخ کی پیداوار نیز اس کا جز ہوتا ہے۔ مزید برآں اس کی شخصیت نے یا تو دماغی اور جسمانی ماحول میں پھیلنے کی جگہ پائی ہے یا وہ حصہ دب کر یا گھٹ کر رہ گیا ہے۔ تعلیم کے ذریعہ یا اپنی مرضی کے تابع آزادانہ عمل کا انتخاب کیا ہے یا غیر شعوری رکاوٹ کے باعث عہد طفولیت سے مختلف انواع کی استعداد اور صلاحیت بہم پہنچائی ہے جس پر اس کی انفرادی خصوصیات نے مہر ثبت کی ہے یعنی اس کے رجحان اور مزاج کی امتیازی شان نمایاں کی ہے۔ باقی جو کچھ ہے موروثی ہے یا اس میں اور اس کے سماج کے دیگر افراد میں مشترک ہے۔ اس سے قطع نظر کہ رشتہ قریب کا ہے یا دور کا ہے، سماج کی روح تک رسائی اور اس کا سمجھنا عام ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس شخص کی یہ تمام قوتیں شعوری، قبل الشعوری اور غیر شعوری طبقوں میں جبلت، حافظہ، ربط، افتاد طبیعت اور رجحان کی شکل میں مختلف محرکات عمل مہیا کرتی ہیں۔ یہی قوتیں اس کے جذبات نیز شخص کی عقبی سرزمین میں بھی خوابیدہ ہوتی ہیں، یہی اس کی سیرابی کے سرچشمے اور محفوظ عملی قوتیں ہیں، یہ نسلی اور قریب قریب آفاقی اثرات منصۂ شہود پر آئے بغیر موجود ہوتے ہیں، وہ اساسی، نامکمل، کھردرے، بمشکل سے ابھرنے والے، بسا اوقات سرکش، نافرمان اور اشتعال کے بعد ناقابل ضبط ہوتے ہیں اور ان میں ایسے عناصر کے اچھالنے کی قدرت ہوتی ہے جو بالعموم نامعلوم اور ناقابل فہم ہیں۔

مستندی اور دماغ کے اس بھنور میں غوطہ لگا کر اپنی سوئی ہوئی لیکن پائدار قوتوں کی تہ میں غواصی اور شناوری کے بعد شاعر گویا سمندر کی گہرائیوں یا زمین کے سینے سے پھر اوپر آتا ہے اور اپنے دامن [illegible] وہ جذبات و حرکت و جوش و ولولہ کا ایک طرز اور لاتا ہے جو اس [illegible] کی سوچ کی تشکیل کرتا اور اس میں تھرتھری بھر دیتا ہے۔ دماغ کے ان چشمے

نیا ہمیشہ اس سے زیادہ سامان موجود ہوتا ہے جو شاعر کو کسی خاص وقت پر درکار ہے یا جس سے انتخاب منظور ہے لیکن وقت معینہ کے لئے اس کی توجہ اور معروضیت (سمادھی) اس خاص مقصد پر اس کی خود اختیاری جس کی مقتضی ہے مرکوز رہتی ہے۔ اس کے وقار کی یہ شان ہوتی ہے کہ جس قدر مطلوب ہے اس سے زائد کا خواہش مند یا اس سے کم پر قانع نہیں ہوتا۔ اس طرح انسانیت کی بیخ و بُن سے (اور اس وقت وہ خود پوری انسانیت کا خلاصہ ہوتا ہے) کرید کرید کے رس نچوڑتا ہے تاکہ اس کے مقصد کی تکمیل ہو۔ نتیجہ بیک وقت انوکھا، دور رس، قابل قبول اور اثر خیز ہوتا ہے (ان سب کے لئے جو انسان ہیں) کیونکہ اس کا عمل دونوں سطحوں پر یکساں ہوتا ہے گویا ایک غیر منقسم وحدانیت ہے۔

ہر شخص اس کیفیت کی شدت یا صلاحیت کے بموجب مکمل یا نامکمل طور پر ملہم یا منہمک ہوتا ہے۔ ایک ہی موضوع کا مختلف اوقات میں مختلف اثر ہو سکتا ہے۔ کچھ ذکاوتیں ایسی ہیں جو ایک ہی وقت میں مختلف اثرات قبول کرتی ہیں۔ اس بنا پر تخئیل اور اسلوب ادا کے مدارج میں فرق اور خوبی یا گہرائی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بسا اوقات کوئی خلل ڈالنے والا یا دھیان بٹانے والا سبب یا گرفت کی ڈھیل عمل کو نقصان پہنچاتی ہے جس کا نتیجہ اپنا ہوش ہونا اور ناکامی، ناتمامی یا غلط روی ہوتا ہے، یا اثر اندازی میں کاوش ہونے لگتی ہے اور قابلیت اور لمحات الہام صناعی مقصود کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یا تو صناعت کو ضرر پہنچتا ہے یا عامیانہ ہو جاتی ہے۔ اس کے باوصف یہ امر یقینی ہے کہ تخلیق کے عمل اور تشکل پذیر ہونے کے ہنگام شاعر "لوکوتر" یعنی سب سے کنارہ کش ہو کر محسوسات اور تکوین کی دنیا میں ہوتا ہے۔ انسانیت اور زندگی کے دوسرے تقاضے ناگوار اور غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں بلکہ ایسے مضرت رساں سمجھے جاتے ہیں گویا روح کی ہلاکت کا موجب ہوں گے۔ صناعت کا جو نمونہ اس طرح معرض وجود میں آتا ہے شاعر کی ذکاوت کا آفریدہ ہوتا ہے جس کا وہ بیک وقت "مائی باپ" ہوتا ہے اور گوشت پوست کی صلبی اولاد سے جس کی ولادت میں ایک دوسری زندگی بھی شامل اور شریک کار ہوتی ہے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

فنی تخلیق کے بعد اس کی خوبی کا اندازہ لگانا، مقصد کی ترجمانی، اقدار اور کامیابی کی حدیں قائم کرنا تنقید کی قلمرو ہے۔ اس کے لئے تربیت، تجربہ، ہمدردی، حساسی، زندگی اور ادب کی نزاکتوں سے آگاہی، نئے جوہر کی شناخت اور خیر مقدم اور سنبھلے پن کی ضرورت ہے۔ اس کا انحصار ناقد کی بلندیٔ فکر، وسعت مذاق اور اس معیار پر ہے جسے وہ فن کے پرکھنے میں استعمال کرتا ہے۔ ایسا ناقد جب کسی نمونۂ ادب کا تجزیہ یا ترجمانی کرتا ہے تو اس کے لئے نئے ابعاد ڈھونڈ نکالتا ہے اور اس طرح اس نمونے میں بسیط سماجی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ناقد کی حیثیت سے وہ خوب چھان بین کے بعد مقدمات پر رائے زنی کرتا ہے اور بھانپنا چاہتا ہے کہ شاعر کو تخئیل کی مصوری میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ یہ بھی کھوج لگاتا ہے کہ تکنیک کی تبلیغ کے لئے کیا کیا وسائل استعمال کئے گئے، ان میں کہاں تک ہم آہنگی اور موزونیت ہے۔ وہ اس نمونے کا دوسرے اسی قسم کے نمونوں سے موازنہ کرتا، قدر و قیمت مقرر کرتا، درجہ قائم کرتا اور وقت و روایت سے مربوط کرتا ہے۔ یہ ویسا ہی صحیح طریق کار ایجاب و قبول کا ہے جیسا کہ خود نمونۂ فن سے متکیف ہونا۔ جہاں تک وہ "ادھیکاری" (اہلیت رکھنے والا) ہے اور بغیر زد و رعایت مطالب تک رسائی کی کوشش کرتا ہے اس کی تنقید مفید ہے اور وہ خود اقدار کا خلاق ہے۔

انتقاد کے بھی مدارج ہیں۔ ہر زمانے میں اپنی میراث کی قدر و قیمت دوبارہ قائم کی جاتی ہے۔ مطالعہ کرنے اور زور و اہمیت دینے کے مختلف زاویے ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر نمونۂ صناعت کے گرد ترجمانی اور آگاہی کی ایک عمارت کھڑی ہو جاتی ہے، ساتھ ہی ساتھ فن کے آغاز، اس کی ہیئت، اس میں جو پیام مضمر ہے، تکنیک وغیرہ کے متعلق نئے نئے نظریوں اور قیاسات کی نشوونما ہوتی ہے۔ لیکن آرٹ کے کسی نمونے کا مفہوم جامد نہیں بلکہ قوت آفریں ہوتا ہے۔ اس کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور ہر منزل پر اس کے سمجھنے اور اس سے بہرہ ور ہونے کی نہ ختم ہونے والی نئی نئی راہیں نکلتی رہتی ہیں، مزید انکشافات ہوتے ہیں، تازہ خوبیوں سے آراستہ کیا جاتا ہے اور بشرطیکہ اس میں حیاتیاتی اور نامیاتی اہمیت ہو اس کا حلقہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ فنکار کی پہلی زود گزر جھلک سے لے کر

تکمیل تک اور اس سے آخری نقاد کے آخری فیصلے تک اس کا سلسلہ ناختتم ہی ہے۔ تخلیق کے وقت ذہنی موجود کی حیثیت سے یا ترجمانی کے دوران میں قدر و قیمت کے ضمن میں جو کچھ کہا جائے اس پر صادق آتا ہے اور قابل قبول ہو سکتا ہے۔ اس طرح جمالیاتی، تکنیکی، فنی اور ناقدانہ نقطہ ہائے نگاہ معنویت، قیمت اور جاذبیت پر روشنی ڈالنے میں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ان سب کے مجموعہ کا نام اقلیم صناعت ہے۔

فنکار کے لئے اس کا نمونۂ فن ایک ذہنی، ذاتی بلکہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے ماہرین نفسیات کو اس کے مطالعہ میں دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ شعور کے ایک منظم عمل کا مظہر ہے۔ ادیب، نقاد، اور ہم مشرب شاعر کے لئے خضر راہ ہے۔ کیونکہ اس سے طرز کے جائز یا ناجائز استعمال پر عبور ہوتا ہے تکنیکی تجربے کی کامیابی یا ناکامی کا علم ہوتا ہے۔ دنیائے صناعت کے لئے اس کا وجود اس کی گوناگوں دولت کے ذخیرے میں اضافہ ہے جس سے مزید تخلیق کے امکانات پیدا ہوتے اور مقاصد کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ وقت اور ابدیت میں ایک جدید شاہکار کا شمول ہوتا ہے۔ ماہر عمرانیات کے لئے ایک سماجی منشا ریا طریق حیات کا نشان ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر کہ صناع اور اس کا پیش کردہ نمونہ اور اس کا مافی الضمیر ایسے ماحول کی پیداوار ہیں جس کی تاریخ ماضی کے عظیم وقفوں میں پھیلی ہوئی ہے، ناقد کے لئے نظریات اور مسلمات پر نظر ثانی کا موقع فراہم کرتا ہے تاکہ ذوق اور فیصلہ جات ماسبق کو جانچ کر دوبارہ اقدار متعین کرے اور خود اپنی جگہ یہ نمونہ ایک روح، ایک نادر ہستی، ایک حسین کارنامہ ہوتا ہے۔

تعمیم کی صورت میں جس کی بنیاد انفرادی مطالعہ کے بعد اقدار قائم کرنے پر ہو سائنس ہے، فلسفہ ہے اور تکنیکی یا کوئی دوسری تاریخ فن ہے جانچنے یا قدر و قیمت متعین کرنے کا یہ مجموعہ جو فن، تاریخ فن اور نقد فن پر محتوی ہے اتنا ہی وسیع اور قابل احترام ہے جتنا کہ علوم کا خالص فلسفیانہ یا حکیمانہ یا عمرانی مطالعہ۔ یہ علم کو اس کی مختلف منزلوں میں دیسی ہستی محض میں، جذبات و محسوسات میں، فکر و نظر میں، عمل میں راسخ ہیں) مالا مال کرتا ہے۔ اگر زندگی کی ترجمانی صناعت کی زبان میں کی جائے (اور ہر آرٹ از ابتدا تا انتہا یہی کرتا ہے) تو علم کا یہ شعبہ کیفیات و متعلقات حیات پر حکم لگانے میں زندگی کی میزان کل پر جسے حقیقت کہتے ہیں دیگر علوم سے کمتر ثابت نہ ہوگا۔

آرٹ ان تمام شاخہائے علوم سے جو انسان کی روح سے بحث کرتے ہیں یقیناً زیادہ حساس اور انسانیت سے قریب تر ہے کیونکہ اس کا اسلوب بیان انوکھا اور شخصی ہے۔ اس کے بغیر فلسفہ نامکمل ہے کیونکہ اس کی تشکیل کے ایک خاص عنصر کا فقدان رہے گا۔ بالفاظ دیگر علم مابعد الطبیعیات جس میں علت سے معلول کی طرف رجعت ہوتی ہے اگر آرٹ کے نظریے اور آرٹ کے نمونوں سے ہٹ کر یا ان کے علی الرغم بحث کرے تو قابل رحم ہے کیونکہ اس حالت میں نہ تو اس میں خون ہے، نہ جان ہے اور نہ جوہر لہذا بلاشبہ غلط نتائج اخذ کرے گا اور اُتھلا نیز بانجھ ہوگا۔

یہ ادعا غلط نہیں کہ اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے آرٹ مکمل اور آزاد ہے اور حقیقت کے باب میں اس کے فرمودات ٹالے نہیں جا سکتے۔

(پروفیسر دی سیتا رمیا کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ)

✡

واجد علی شاہ کی ایک مُناجات

سید مسعود حسن رضوی ادیب

اودھ کے آخری تاجدار سلطان عالم واجد علی شاہ ایک مذہبی آدمی تھے اسلامی احکام کی پیروی واجب سمجھتے تھے اور بہت بڑی حد تک ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ جن لوگوں نے واجد علی شاہ کی سیرت کے بارے میں کچھ لکھا ہے انھوں نے ان کی مذہبیت کا ذکر ضرور کیا ہے۔ چند لوگوں کے بیانات مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

مرزا محمد تقی لکھنوی اپنی کتاب آفتاب اودھ میں لکھتے ہیں : -

" اس بادشاہ عالی جاہ کو خدائے تعالیٰ نے بہت صفات جمیلہ عطا فرمائے ہیں۔ اوّل حلم اور انکسار.... دوسرے عدالت.... تیسرے صلاح اور تقویٰ کہ اگرچہ عین شباب میں سلطنت ملی مگر خیال مے نوشی بلکہ جملہ مسکرات وغیرہ امور منہیہ شرعیہ کا پیرامون خاطر عاطر نہ ہوا پابندی صوم وصلوٰۃ میں کبھی فرق نہ آیا۔"

عظمت علی نامی کاکوروی مرقع خسروی میں لکھتے ہیں : -

" واللہ حضرت کو صوم وصلوٰۃ کی سرِ دست پابندی اس قدر کہ اللہ اکبر .. رات دن میں پہر پہر سکہ کرتے اس پر بھی نور کے تڑکے بلاناغہ نماز پڑھنے کو اٹھتے۔ نہیں تو بہ جبر اٹھائے جاتے۔ ماہ رمضان میں ہر روزہ عبادت اور خیر کا شغل جاری رہتا۔ منہیات سے قطعاً پرہیز تھا۔ شام کو روزہ کھولتے اور کھلواتے۔ غرض تیس دن صوم سے خالی نہ جاتے۔"

صفیر بلگرامی برج خنداں میں لکھتے ہیں : -

" ہمارا بادشاہ گیتی پناہ مقید صوم وصلوٰۃ، دہندۂ خمس وزکوٰۃ اس دولت اس ثروت پر خدا کی یاد ہر وقت یاد، خدام کو ہر دم یہ ارشاد کہ جب وقت نماز آئے جو کوئی موجود ہو بے خوف و خطر جگائے تا طاعت خدا میں خلل نہ پڑے، کہیں مہر منیر خلوت کدۂ مشرق سے نکل نہ پڑے۔ مناہی سے شب و روز دور، مسکرات سے بتریہ نفور۔"

مولوی عبد الحلیم شررؔ واجد علی شاہ کی مثنوی حزن اختر کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

واجد علی شاہ کی ذات میں اگلی اسلامی معاشرت کی اصلی تصویر نظر آتی تھی.... تہذیب تھی، دین داری تھی، قدردانی تھی، اور انتہا درجے کی قناعت و خود فراموشی.... عہد شاہی کے واجد علی شاہ کو میں نہیں جانتا۔ مٹیا برج کے واجد علی شاہ، جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ تو اتقا و پرہیز گاری، خدا ترسی اور خدا پرستی کی مجسم تصویر تھے۔

مذہب کی پابندی اور مذہبی تعصب میں کوئی علاقہ نہیں ہے، مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ مذہبی احکام کی سختی سے پابندی کرتے ہیں ان میں تھوڑا بہت تعصب بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن واجد علی شاہ اس عیب سے پاک تھے۔ اس سلسلے میں مولوی شررؔ کا چشم دید بیان خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی کتاب گزشتہ لکھنؤ میں تحریر فرماتے ہیں : -

" بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ ان کا پرانا مقولہ تھا کہ میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سُنّی ہے"..... بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا

کہ سارا انتظامی کاروبار شیعوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم منفر م الدولہ بہادر شیعی تھے۔ منشی السلطان جو ایک زمانے میں سب سے زیادہ مقرب اور سارے جانور خانے، کل اہل قلم اور کئی اور محکموں کے افسر اعلیٰ تھے شیعی تھے۔ بخشی امانت الدولہ بہادر جن کے ہاتھ سے کل ملازموں حتیٰ کہ محلوں اور شاہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی شیعی تھے۔ عطارد الدولہ اور داروغہ معتبر علی خاں جو آخر میں سب سے بڑے عہدہ دار اور کل کاروبار کے مالک تھے دونوں شیعی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ امام باڑۂ سبطین آباد اور محل کے خاص امام باڑے بیت البکا کا انتظام اور مجلسوں اور مذہبی تقریبوں کے بجالانے کا انصرام بھی شیعوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ یہاں کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہیں کیا کہ کون شیعی ہے اور کون سنی ہے۔"

واجد علی شاہ پکے مذہبی آدمی تھے، مگر اس کے باوجود وہ موسیقی کے ایسے دلدادہ تھے کہ اس کے شوق میں شرعی احکام سے تجاوز کر جاتے تھے۔ پھر بھی یہ احساس ان کے دل میں موجود تھا کہ اسلامی شریعت کی رو سے گانا بجانا ممنوع ہے۔ اپنی سلطنت کے تیسرے سال سخت بیماری کی حالت میں انھوں نے ناچ گانے سے توبہ کر لی۔ خود لکھتے ہیں:[1]

"اس مرض میں جملہ منہیات و غنا وغیرہ سے بوجہ شدت مرض انکار کیا.... اُس وقت سے اِس وقت تک کبھی گانے کی آواز میرے کان تک نہیں گئی۔"

مگر بیماری سے نجات پانے کے بعد ان کی یہ توبہ آخر کار ٹوٹ گئی۔ موسیقی کے معاملے میں تو واجد علی شاہ گویا مجبور تھے، لیکن بعض دوسرے منہیات شرعیہ جو موسیقی کے ساتھ اکثر شامل ہو جاتے ہیں ان سے حتی الامکان دامن بچاتے تھے جیسا کہ مولانا شرر کے حسب ذیل بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

"حضرت جانِ عالم[2] کو اگر واقعی الزام دیا جا سکتا ہو تو موسیقی کا الزام ہو..... اچھا گانا، چاہے کیسے ہی اتقا و پرہیزگاری پر آمادہ ہوں، تو یہ توڑ دیا کرتا تھا۔ مگر اس میں بھی اس قدر احتیاط تھی کہ میرے علم میں قیام کلکتہ کے زمانے میں کبھی انھوں نے سوا موضعاتِ یوں یا اپنی محتوعہ گانے والیوں کے کسی بازاری عورت کا گانا نہیں سنا۔ لہٰذا جب ہم بہت سے بزرگان دین کو صحبت غنا کا لطف اٹھاتے دیکھتے ہیں اور تعرض نہیں کرتے ہیں تو واجد علی شاہ کے معاملے کو بھی خدا پر چھوڑ دینا چاہیے، خدا معاف کرنے والا ہے اور امید ہے کہ برگشتہ بخت تاجدار اودھ کے اس جرم کو وہ ان کی اور نیکیوں کے صلے میں معاف کر دے گا۔

اوپر جن مصنفوں کے بیانات نقل کئے گئے ہیں وہ سب واجد علی شاہ کے عہد میں موجود تھے اور ان کی جن کتابوں سے یہ اقتباسات لئے گئے ہیں وہ سب واجد علی شاہ کی معزولی کے کئی سال بعد لکھی گئی تھیں۔

اس کسی قدر طولانی تمہید کے بعد واجد علی شاہ کی ایک مناجات کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں، جن میں انکی مذہبیت کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ مناجات انتزاع سلطنت کے بعد نہیں، بلکہ اس زمانے میں کہی گئی تھی جب اودھ کا ملک زیر نگیں تھا اور ایک لاکھ پیادے اور سوار، ستو سو اہل قلم، پانچ سو طبیب اور پندرہ سو چوب دار وغیرہ تابع فرمان تھے۔ یہ مناجات واجد علی شاہ کی مثنوی بحر الفت سے لی گئی ہے۔

---

[1] محل خانۂ شاہی صفحہ ۱۴۳۔

[2] 'جان عالم' واجد علی شاہ کا عرف تھا۔ ان کا شاہی خطاب "سلطان عالم" تھا۔

[3] مثنوی حزن اختر، مطبع نولکشور لکھنؤ، سنہ ۱۸۷۲ء صفحہ ۱۱-۱۲۔

[4] مثنوی حزن اختر۔

[5] واجد علی شاہ نے تین طولانی رومانی مثنویاں اپنی شاہ زادگی کے زمانے میں کہی تھیں۔ دریائے تعشق، مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں، افسانۂ عشق، مثنوی سحر البیان کی بحر میں اور بحر الفت مثنوی زہر عشق کی بحر میں اور بادشاہ ہونے کے بعد بہ نظر ثانی کر کے شاہی مطبع میں چھپوائی تھیں۔ یہ تینوں مثنویاں راقم کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

مناجات بہ درگاہ قاضی الحاجات

واجد علی شاہ اختر

اے خطا پوش اے محیطِ عطا
اے غفور اے سحابِ لطف و سخا

روسیہ ہوں گناہ گار ہوں میں
جرمِ بے حد سے شرمسار ہوں میں

نام آمرزگار ہے تیرا
عفو کرنا شعار ہے تیرا

شرمِ عصیاں سے آب آب ہوں میں
غرقِ دریائے اضطراب ہوں میں

میں ہوں بے چارہ، چارہ ساز ہے تو
میں گدا ہوں، گدا نواز ہے تو

تجھ سے کس منہ سے آبرو مانگوں
شرمِ عصیاں سے پانی پانی ہوں

تو ہی منصف ذرا ہو بار الٰہ
تیری رحمت بڑی کہ میرے گناہ

گو کہ اے منشیٔ خطِ تقدیر
رازقِ رزق و کار سازِ تقدیر

یہ عقیدت مری سرشت میں ہے
وہی ہوگا جو سرنوشت میں ہے

مگر اے چارہ سازِ مجبوراں
اے امیدِ وصالِ مہجوراں

جب سے لاتقنطو نے دی ہے نوید
ہے تیرے فضل سے بڑی امید

گو سراپا گناہ گار ہوں میں
پر یہ تجھ سے امیدوار ہوں میں

جب تلک قطع ہو نہ تارِ نفس
تاکہ باقی رہے شمارِ نفس

تیری الفت کا دل میں داغ رہے
روشن اس گھر میں یہ چراغ رہے

دل رہے تجھ میں تو رہے دل میں
ہو تری یاد آب اور گل میں

مۓ الفت سے تیری مست رہوں
بلبلِ گلشنِ الست رہوں

خلوتِ دل میں یادِ غیر نہ ہو
بے ترے کچھ مرادِ غیر نہ ہو

بحرِ وحدت سے آشنائی دے
اس دوئی سے مجھے رہائی دے

دل کو لبریزِ معرفت کر دے
نورِ عرفاں سے جسم و جاں بھر دے

رنج و غم سے مجھے فراغ رہے
دلِ افسردہ باغ باغ رہے

بے ترے کچھ بھی غم نہ ہوں
چھوڑ کر کعبہ محو دیر نہ ہوں

اس محیطِ جہاں میں اے داور
آبرو سے رہوں برنگ گہر

روح قالب سے جب رواں ہوجائے
نام تیرا مری زباں ہوجائے

پندرہ اگست

اعجاز صدیقی

یہ دن ہے وہی دن، جب ہم نے زنجیر غلامی توڑی تھی
اس دن ہم نے محکومی کی مضبوط کلائی موڑی تھی

یہ دن ہے وہی جب مغرب کا افسون سیاست ٹوٹا تھا
مشرق کے افق سے ایک نیا مدہوش اجالا پھوٹا تھا

یہ دن ہے وہی، جب ٹوٹی تھیں نیندیں صدیوں کی آئی ہوئی
یہ دن ہے وہی، بھارت ماتا، جب اُٹھی تھی گھبرائی ہوئی

یہ دن ہے وہی، جب چٹکے تھے بندوقوں کی گولی کے نشاں
یہ دن ہے وہی، جب بدلا تھا اسلوب ستم، انداز فغاں

یہ دن ہے وہی، جس دن اپنے خوابوں کو ملی تھیں تعبیریں
یہ دن ہے وہی، جس دن پائی جاگی تھیں خفتہ تقدیریں

یہ دن ہے وہی، جب سورج کی کرنوں کو ملی تھی جوت نئی
یہ دن ہے وہی، جب چٹکے تھے ظلمت کے گگن پر چاند کئی

یہ دن ہے وہی، جب گندم کے خوشوں پہ جوانی آئی تھی
یہ دن ہے وہی، جب کھیتوں میں ہریالی اِک لہرائی تھی

یہ دن ہے وہی، جب جھرنوں سے نغمات مسرت اُبلے تھے
یہ دن ہے وہی، جب ندیوں سے پرکیف ترانے اُچھلے تھے

یہ دن ہے وہی، جب گنگا کی موجوں میں روانی آئی تھی
یہ دن ہے وہی، جب جمنا کی دھارا پہ جوانی آئی تھی

یہ دن ہے وہی، وندھیاچل کا سر فخر و ناز سے جب اُٹھا
یہ دن ہے وہی، اِک نُور نیا جب رُخ سے ہمالہ کے پھوٹا

یہ دن ہے وہی، جب پہلے پہل نکھرا تھا رُوپ اجنتا کا
یہ دن ہے وہی، جب اُبھرا تھا ہر نقش کہن ایلورا کا

یہ دن ہے وہی، ہر مینارہ جب تاج محل کا جھوما تھا
یہ دن ہے وہی، جب پئے در پئے چکرا اشوک کا گھوما تھا

یہ دن ہے وہی، قومی پرچم جب لال قلعہ پر گاڑا تھا
یہ دن ہے وہی، جب نعروں نے دامانِ غلامی پھاڑا تھا

یہ دن ہے وہی، جب جیتی تھی بازی برسوں کی ہاری ہوئی
یہ دن ہے وہی، جب بپھری تھی حسِّ قومی، للکاری ہوئی

یہ دن ہے وہی، جب چہروں پر اک رنگِ جلالت آیا تھا
یہ دن ہے وہی، جب جذبوں نے اندازِ صلابت پایا تھا

یہ دن ہے وہی، جب ہونٹوں پر گویائی کے شعلے لپکے
یہ دن ہے وہی، جب نظروں سے اُمّید کے سہم کوندے لپکے

یہ دن ہے وہی، جب آزادی کی دیوی نے لی انگڑائی
یہ دن ہے وہی، جب شانوں پر زُلفِ حُرّیت لہرائی

یہ دن ہے وہی، منہ پھیر دئے جب توپوں کے بلوانوں نے یہ دن ہے وہی، مانگی تھی اماں جب ساحل سے طوفانوں نے
یہ دن ہے وہی، جب اِک لَے میں ناقوس شوالوں کے گونجے یہ دن ہے وہی، مسجد مسجد جب شکر کے ہم نے کئے سجدے
یہ دن ہے وہی، جب دُنیا کو پیغام اہنسا کا پہنچا یہ دن ہے وہی جب عالم میں احساس آزادی کا جاگا
یہ دن ہے وہی، ملکوں ملکوں جب نازِ شہی پر چوٹ پڑی
یہ دن ہے وہی، قوموں کو مِلا جب ہم سے شعورِ خود نگری

اِس دن کی قسم، اے ارضِ وطن افلاک سے تجھ کو ملا دیں گے اِس دن کی قسم، دُلہن کی طرح ہر گوشہ تیرا سجا دیں گے
اِس دن کی قسم، یہ دیش اپنا جنت کی طرح ہو جائے گا اِس دن کی قسم، یہ دیش اپنا سارے جگ کو شرمائے گا
اِس دن کی قسم، بجھنے دیں گے ہم امن کے دیپوں کو نہ کبھی اِس دن کی قسم، ہم روکیں گے دُنیا کا مذاقِ جنگ گری
اِس دن کی قسم، ننگل کتنے اپنی دھرتی پہ بنا دیں گے اِس دن کی قسم، گنگ بھدرا سے کتنے ہی باندھ اُٹھا دیں گے
اِس دن کی قسم، ہر ہند کی تزئینِ وطن ہو جائیں گے اِس دن کی قسم، اب صحرا بھی ہم رنگِ چمن ہو جائیں گے
اِس دن کی قسم، چترنجن کیا، یہ ٹاٹا اور بھلائی کیا! اِس دن کی قسم، وہ دن ہے قریں بھارت کا بدل دیں گے نقشا
اِس دن کی قسم، ہم بخشیں گے کھیتوں کو اور بھی شادابی اِس دن کی قسم، ہم سینچیں گے مِل جُل کے وطن کی ہریالی
اِس دن کی قسم، چمکائیں گے ہم تہذیبوں کے کاشانوں کو اِس دن کی قسم، رستہ دیں گے بھولے بھٹکے انسانوں کو
اِس دن کی قسم، ہم پہنچیں گے صنعت کی آخری منزل پر اِس دن کی قسم، دھن برسے گا اِک دن بستی بستی گھر گھر
اِس دن کی قسم، ہر ذرے سے اُگلا کے رہیں گے سیم و زر اِس دن کی قسم، موج ساحل لائے گی رول کے لعل و گہر
اِس دن کی قسم، ہر دن اپنا اِک صبحِ جواں بن جائے گا جو عظمت آج ہے، اُس سے سوا عظمت کا نشاں بن جائے گا

یہ دن، یہ ہمارا قومی دن ہنستا ہوا ہر سال آئے گا
نظروں کو، دلوں کو، روحوں کو سامانِ طرب دے جائے گا

✡

اردو ادب اور سیاست

سید محی الدین قادری زور

ادب اور سیاست میں چولی دامن کا سا تعلق ہے۔ اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی بڑی اور زندہ زبانوں کی طرح اردو نے ہر دور کی سیاست میں حصہ لیا۔ وہ نہ صرف خود سیاست سے متاثر ہوئی بلکہ اس نے اپنے اثر سے بعض اوقات سیاست کا رخ موڑنے کا بھی کام انجام دیا۔

اردو ادب کے ابتدائی کارنامے گولکنڈہ اور بیجاپور میں منظر عام پر آئے۔ ان دونوں شہروں کو وسیع اور خوشحال سلطنتوں کے پایہ تخت ہونے کا شرف حاصل تھا اور حسن اتفاق سے دونوں جگہ سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۶۵۰ء کے درمیانی زمانے ہی میں اعلیٰ پایہ کی اردو کتابیں لکھی گئیں۔ یہ زمانہ دراصل پوری دنیا میں ادب و شعر کے لئے بڑا سازگار زمانہ تھا۔ فرانس میں لوئی چہاردہم، انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ، ایران میں شاہ عباس صفوی، شمالی ہند میں اکبر اعظم، بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ جگت گرو اور گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ، ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور دانشوروں کے فیاض سرپرست اور شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ ان تمام حکمرانوں کو حسن اتفاق سے طویل عرصہ تک شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ جہاں بانی کے مواقع نصیب ہوئے اور ان ملکوں میں قتل و خوں ریزی اور جنگ و جدل اس دور کی سیاست پر قابو نہ پا سکے۔

اکبر اعظم نے آگرہ سے قریب فتحپور سیکری کی بنیاد رکھی۔ ابراہیم عادل شاہ نے بیجاپور سے قریب ایک نیا شہر نورس پور تعمیر کیا اور محمد قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ کے نزدیک بھاگ نگر حیدرآباد کی بنیاد ڈالی۔ تینوں مقامات کے شاعر اور ادیب نئے شہر اور نئی زندگی کے ولولوں سے متاثر تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ اپنے ملک کی تابناکیوں اور شہر کی رونق اور شادابیوں میں اپنے کلام سے اضافہ کریں۔ بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ نئے نئے نغمے اور گیت نظم کر رہا تھا اور گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ رنگا رنگ غزلیں لکھنے اور ان سے اپنی رقص و سرود کی محفلوں کو گرمانے میں منہمک تھا۔

دکھنی سلطنتوں کے دونوں بادشاہ ہندوستانی اور خاص کر اپنے علاقہ کی تہذیب کو اپنانے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی فکر میں تھے اور وضع قطع، لباس، نشست و برخواست اور تعمیر و تزئین میں ایرانی و ترکی عناصر کے ساتھ ہندوستانی اور دکنی عناصر کی آمیزش میں منہمک تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کے دماغوں پر بھی اسی امتزاج و انضمام کے بادل منڈلا رہے تھے۔ انھوں نے اردو زبان کے اصلی مخلوطی خمیر سے فائدہ اٹھا کر اس امر کی پوری کوشش کی کہ یہ زبان صحیح معنوں میں اپنے دور کے سیاسی رجحانات اور اپنے حکمرانوں کے ذوق رواداری کی کامل نمائندہ بن جائے۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنی اردو شاعری میں بہت سے تلگو لفظ اور فقرے بے تکلف استعمال کئے اور ابراہیم عادل شاہ نے کنڑی اور

سنسکرت زبانوں کی اصطلاحوں کو اپنے گیتوں میں نگینوں کی طرح جڑ دیا۔ اور یہی رنگ اس عہد کے دوسرے شاعروں نے بھی اختیار کیا چنانچہ عبدلؔ نے "ابراہیم نامہ میں" اور وجہی و غوّاصی نے اپنے کلام میں اسی کو نمایاں رکھا۔

وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" تو ایک ٹھیٹ سیاسی مصلحت کی آئینہ دار ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگ متی کا ذکر مغل مورخوں اور ادیبوں مثلاً ملا فیضی اور ابوالقاسم فرشتہ نے ایسی حقارت سے کیا تھا کہ محمد قلی اور اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کو مجبوراً اسکے نام اور واقعہ کو چھپانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے لئے جو کوششیں کی گئیں ان میں سے ایک کوشش یہ تھی کہ ملک الشعرا ملا وجہی سے ایک ایسی مثنوی لکھائی جائے جس کا قصہ اصل واقعہ کو مسخ کر دے اور لوگ بھاگ متی کے نام ہی کو بھول جائیں۔ مثنوی "قطب مشتری" اردو کی پہلی آپ بیتی (اور بجنس) داستان عشق ہے۔ اور اپنی اعلیٰ ادبی اور فنی خصوصیات کے لحاظ سے اردو کی بہترین عشقیہ مثنوی سمجھی جاسکتی ہے۔

اردو ادب کی تشکیل میں سیاسی عنصر کا ایک اور نمونہ وہ ہزاروں مرثیے اور سیکڑوں مرثیہ نگار شعرا ہیں جو عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زوال کے زمانہ میں اور بعد میں پچاس سال تک دکن کے چپہ چپہ پر پھیلے ہوئے تھے اور اپنے ملک کی بربادی کا غم امام حسین علیہ السلام کے ماتم کے بہانے ظاہر کر رہے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے ہاتھوں بیجاپور اور حیدرآباد کی تباہی کے وقت بیسیوں شاعر ان پایۂ تختوں سے نکل کر کس مپرسی کے عالم میں روپوش ہوگئے۔ بہت سے شاعر ایسے بھی تھے جو وطن چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے ان تباہ شدہ شہروں ہی میں اقامت اختیار کی اور اپنی بربادی پر آخر وقت تک آٹھ آٹھ آنسو روتے رہے۔ چوں کہ تاریخ بادشاہ اور ان کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے وہ اپنے جذبات و خیالات کو صاف صاف ظاہر نہیں کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا اور اپنے غم زدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا علیہم السلام کے مرثیے لکھ لکھ کر نکال لی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں طویل نظمیں، قصیدے اور مثنویاں نہ لکھی جاسکیں۔ ان کے لئے تو اطمینان قلب اور فارغ البالی کی ضرورت تھی۔ اس دور کے شعرا نے مرثیوں کو اپنے سیاسی جذبات کا جس طرح سے آلۂ کار بنایا اس کا ثبوت پیرزادہ روحیؔ کے ایک مرثیہ کے چند شعروں سے ہو سکتا ہے ؎

آج غم ناک ہیں چمن کے گل | بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ، سینہ داغ، حیراں ہیں | نرگس و لالہ، یاسمن کے گل
جب سنے شہ کی بات مجلس میں | جل بجھے شمع انجمن کے گل
خوش لگے تجھ طبع سے اے روحیؔ | دل کے تا غاں منے سخن کے گل

یہ پوری نظم صرف نام ہی کو ایک مرثیہ ہے اور اگر اس کے پہلے مصرعہ میں بجائے چمن کے دکن کا لفظ لکھ دیا جائے تو پورا مرثیہ بجائے امام حسین کے حیدرآباد کے آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ کا مرثیہ بن جاتا ہے۔

دکن کی شاعری کا یہ رنگ ولیؔ اورنگ آبادی کے زمانہ تک جاری رہا۔ ولیؔ دکن کا پہلا بڑا شاعر ہے جس نے شمالی ہند کا سفر کیا اور دلّی کے شاعروں کا دل موہ لیا۔ چنانچہ اس کے قیام دہلی کے بعد وہاں بھی اردو شعر و سخن کا چرچا شروع ہوگیا۔ لیکن اردو شاعری کے عروج کے ساتھ ساتھ دلّی کے مغل بادشاہوں کا ستارہ اقبال زوال پذیر ہونے لگا اور وہاں کے شاعروں کو وجہیؔ، غوّاصیؔ اور نصرتیؔ جیسی بے فکری اور امن و امان نصیب نہ ہو سکا۔ وہاں کے ابتدائی اردو شعرا میں شاہ حاتمؔ استاد الاساتذہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا پورا کلام دہلی کی سیاسی زندگی اور انتشار و افتراق کا ترجمان ہے۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے دور کی سیاسی زندگی کے بارے میں ایک مستقل نظم ہی لکھ دی جس کا پہلا شعر ہے ؎

کیا بیاں کیجئے نیرنگیٔ اوضاعِ جہاں | کہ بہ یک چشم زدن ہوگیا عالم ویراں

شاہ حاتمؔ کے علاوہ اس دور کے اکثر شعرا سوداؔ، میرؔ، مظہرؔ، یقینؔ، سوزؔ اور تاباںؔ وغیرہ کے کلام میں بھی اس دور کی سیاست جھلکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا سوز و غم، غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کا مرہون منت ہے۔ سوداؔ نے تو اپنے استاد شاہ حاتمؔ کی طرح زمانہ

اور اپنا ئے زمانہ کی شکایت اور ہجو طرح طرح سے قصیدوں اور مثنویوں میں کھی ہے۔ چنانچہ تضحیک روزگار ان کا خاص موضوع بن گیا تھا۔

اردو شاعروں کا یہ رنگ اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ لکھنؤ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ امن وامان اور عیش و فراغ بالی کا مرکز بن گیا۔ لکھنؤ میں پھر دکن کی طرح طویل نظمیں (مثنویاں اور قصیدے) لکھے گئے اور جب تک لکھنؤ سیاسی حیثیت سے مقتدر اور شاد کام رہا شاعری کی یہ خصوصیت بھی باقی رہی اور انشا، رنگین، مصحفی، ناسخ اور آتش اور انیس و دبیر جیسے بلند مرتبہ شاعر نمودار ہو سکے۔

اس اثنا میں دلی نے بھی آخری بار سنبھالا لیا تھا۔ شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے دور میں وہاں بھی اچھے اچھے شاعر اٹھے۔ شاہ نصیر، ذوق، غالب اور مومن اسی دور کی یادگار ہیں۔ چونکہ اس وقت بادشاہ انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا اور انھیں کی وجہ سے سیاسی لڑائی جھگڑوں سے اہل دہلی کو نجات ملی تھی اس لئے دلی والے شعر و سخن اور ادب و انشا کی طرف اطمینان سے متوجہ ہو سکے۔ مگر اس دور کا ادب بھی ایک سیاسی گھٹن کا آئینہ دار ہے۔ لال قلعہ سے لے کر دلی کے گلی کوچوں تک انگریزوں کے آگے مجبوری اور سیاسی بیچارگی کا احساس عام تھا۔ مومن نے جہاد کی مثنویاں، ظفر نے سوز و گداز سے بھری ہوئی غزلیں اور غالب نے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

جیسے شعر اسی سیاسی فضا میں لکھے تھے۔ یہی رنگ اس دور کے دکنی شعرا کے یہاں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ فیض نے لکھا تھا۔

ہے دشمن دکن وہ کلاہ پوش جس نے فیض
غارت کیا ہے کشور ہندوستان کو

سن ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی نے اردو کے شاعروں اور ادیبوں میں آزادئ خیال اور شدت احساس کی رَو دوڑا دی۔ الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی وغیرہ کی نظمیں اسی سیاسی بیداری کا نتیجہ ہیں۔ حالی کا مسدس نہ صرف اسی سیاست کا نتیجہ ہے بلکہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کا رخ موڑنے میں بھی بڑا حصہ لیا۔ اسی نظم نے اقبال کی مفکرانہ شاعری کو جنم دیا اور آخر کار اردو کے ادیب اور شاعر اسی ڈگر پر چل پڑے جو ابوالکلام آزاد کی نثر اور جوش ملیح آبادی کی نظم میں اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گئی۔

اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اہل ہند کی سیاسی بے چینی اور آزادئ خیال کی جس خوبی سے نمایندگی کی ہے اس کی نظیر کم زبانوں کی تاریخ میں ملے گی۔

آزادئ ہند میں اردو کا حصہ ایسا موضوع ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور ایک دو لکھی بھی گئیں ہیں اور چھپ بھی چکی ہیں اردو زبان نے ہندوستانیوں کے قلب و دماغ کے بنانے اور سنوارنے میں اس ملک کی کسی اور زبان سے زیادہ ہی حصہ لیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے بعد پریم چند نے اردو نثر اور خاص کر ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سے اس نئی ہندوستانی قوم کی تمناؤں اور چاہوں کی ترجمانی کی جو ملک کی خوش حالی اور آزادی کے لئے گذشتہ نصف صدی سے کوشش کرتی رہی ہے۔

اس سلسلہ میں اردو کی ترقی پسند تحریک کا تذکرہ خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔ یہ تحریک دراصل جدید سیاسی نظریوں اور زندگی کی نئی قدروں کے سہاروں اٹھی، اور تقریباً ۲۰ سال تک اردو ادب کے ہر شعبہ پر چھائی رہی۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، میرا جی، مجاز، فیض، جذبی اور مخدوم کی نظم و نثر کا چرچا پوری اردو دنیا میں گھر گھر پہونچ گیا اور ہر نوجوان ادیب و شاعر انھیں کے رنگ میں رنگا جانے لگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ سیاسی رجحانات سے اتنا زیادہ متاثر کبھی نہ ہونے پائی تھی اور نہ کسی دور کے ادیب و شاعر ملک کی زبان اور شاعری پر اتنی قوت سے کبھی چھا سکے تھے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اس دیس کی تمام خوابیدہ صلاحیتیں جاگ پڑیں اور وہ سیاسی گھٹن دور ہو گئی جس کے باعث ترقی پسند تحریک کو ابھرنے اور سنورنے کے مواقع ملے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک نے آزادئ خیال اور

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۹۰ پر)

"ہمارا گھر"

علی عباس حسینی

اپریل کی آخری تاریخیں تھیں، صبح کے نو بج چکے تھے، لیکن ہوا میں خاصی خنکی تھی کھلی چھت پر پھیلی ہوئی دھوپ میں چودھویں کی چاندنی جیسی ٹھنڈک تھی۔ اخباروں کی اطلاع کے مطابق "لکھنؤ" کے مضافات اور اس کے ہمسایہ حلقوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سیر کے اولے گرے تھے۔ پھلوں سے لدے آم کے باغوں کا اس پتھراؤ نے ستھراؤ کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا قدرت بعض وقت بچوں جیسی حرکتیں کیوں کرتی ہے۔ وہ بنی بنائی ہوئی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر مسمار کیوں کر دیتی ہے کیا اُسے بگاڑنے میں مزہ آتا ہے؟ کیا اسے مٹانے میں لطف آتا ہے؟ عقل نے کہا شاید یہ ہماری ہمتوں کو اکسانے اور ہمیں للکارنے کی تدبیریں ہیں۔ اشارہ ہے کہ "ہم بگاڑتے جائیں، تم بناتے جاؤ، ہم الجھاتے جائیں، تم سلجھاتے جاؤ۔ یہی تمھاری زندگی کا راز ہے۔ اسی طرح کد و کاوش میں لگے رہے، یونہی جنگ کرتے رہے، لڑتے رہے، تو ایک دن ہم پر فتح پا لوگے اور خدا جیسے بن جاؤگے!"

غرض، میں اسی طرح کے روکھے سوکھے خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ دفعتہً نو بجے کی ڈاک سے دعوت نامہ ملا۔ ہندوستان بھر کے کہانی لکھنے والوں کی کانفرنس تھی۔ اصرار تھا کہ شرکت بھی کرو، اور کہانی بھی پڑھو۔

ذہن نے فوراً سوچنا شروع کر دیا "کیا کہوں، کیا سناؤں کوئی بات کہنے کی بھی تو اپنے پاس ہو۔ ہندوستان کی چودہ، بانوں کے ادیب، نقاد، مفکر، فنکار، صاحبان قلم جمع ہوں گے۔ ان کے سامنے جھوٹی باتیں نہیں بنائی جا سکتی ہیں۔ انھیں عشق و محبت کے رومان نہیں سنائے جا سکتے" انکے روبرو قسمت پر آنسو نہیں بہائے جا سکتے۔ ان کی ذہانت کو قتل اور جاسوسی کے قصے سُنا کر مجروح نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے لئے تو کوئی ایسی بات ہو جس میں صداقت ہو، شرافت ہو، مروّت ہو، آدمیت ہو، کوئی ایسی بات جس سے قوم بنے، ملک سنورے، انسانیت کی تعمیر ہو، امن کا محل کھڑا ہو۔ جس کے کہنے میں وہ انداز ہو کہ دل سے نکلے اور دلوں میں تیر کی طرح ترازو ہو جائے۔

دل نے کہا "اپنی وہی کہانی سنا دو جو تم نے ملک کا دستور، کانسٹی ٹیوشن، مکمل ہونے کے بعد لکھی تھی۔ کہانی کا ہے کو ہے، تمثیل (allegory) ہے، مگر مادرِ وطن کے معماروں کے سننے کے قابل ضرور ہے"۔

اس لئے میں اپنے کمرے سے نکل کر نیچے دالان میں وہاں آیا جہاں کھلی الماریوں کے تختوں پر کچھ کتابیں رکھی ہیں اور میرے بے معنی نئے پرانے مسودوں کا ایک انبار ہے۔ میں نے سب کچھ الٹ پلٹ ڈالا دونوں ہاتھ اور کُرتے کے دامن و جیب نے گرد کی پوشش اوڑھ لی۔ مگر جس کے گھر میں خود اس کی مطبوعہ کتابیں نہ ہاتھ آتی ہوں، وہاں مسودے کا مل جانا بالکل ویسا ہی ہے جیسا ڈوبتے سورج کی بھاگتی کرن کو مٹھی میں بند کر لینا۔ میں اپنی تلاش میں ہار کر عیال کے جنجال کے جھنجھلاتا پلٹا، تو میں نے دیکھا کہ میری بیوی انگنائی میں بان کے کھرّے پلنگ پر بیٹھی پان بنا بنا کر ایک میلے سے کاغذ پر رکھ رہی ہیں اتفاقاً

ہوا کے ایک جھونکے نے اس کاغذ کے ایک کونے کو پلٹ دیا۔ اپنی ہی تحریر جھلکی۔ میں نے ایک باز کی سرعت سے جھپٹ کر اس کاغذ پر پنجہ مارا۔ گولیاں پہاڑی مرچوں کی طرح پلنگ پر بکھر گئیں۔ بیگم کے منہ سے " اوئی، یہ کیا؟" کی چیخ ہی نکلی۔ لیکن میری آنکھوں نے نہ تو پانوں کی بربادی دیکھی اور نہ ان کی برافروختگی۔ وہ تو اسی کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھ رہی تھیں جو اب میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ اسی مسودے کا ایک حصہ تھا جو میں اتنی دیر سے تلاش کر رہا تھا۔ میرا چہرہ پان کی پیک کی طرح لال ہوگیا۔ میں نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر پوچھا:

اس کا دوسرا صفحہ کیا ہوا؟"

میری بیوی کے لب تو نہیں کھلے، غصے نے انھیں سی دیا تھا، لیکن ماما مقبولن جو اپنے ٹکڑے کی آس میں پٹی سے لگی بیٹھی تھی ذرا گھبرا کر بولی " میاں، شاید۔ وہ کاغذ نہ ہو جس میں میں نے آلو کے چھلکے بٹور کر کوڑے والے ٹین میں ڈال دیا تھا!"

میں نے گندگی صفائی کا کوئی خیال نہیں کیا، جب اتنی پوری پونجی کی صفائی کا سوال ہوتا ہو تو اس وقت حفظان صحت کے اصول یاد نہیں رہتے۔ اکلوتا بیٹا سنڈاس میں گر پڑے تو نکالنا ہی پڑے گا میں نے کوڑے سے بھرے ٹین کو جلدی سے زمین پر انڈیل دیا۔ خس و خاشاک کے ڈھیر میں، آلو کے چھلکوں کے نیچے دبا ہوا اسی مسودے کا دوسرا صفحہ تھا معلوم ہوا میلے میں کھویا ہوا بچہ مل گیا۔ میں نے غصے کی نظر سے بیوی اور مقبولن کو دیکھا، اکبری نورتن فیضی کی طرح آسمان پر شکایت بھری نظر ڈالی اور ایک ماں کی ماتما سے اس گندے چیتھڑے کو کلیجے سے لگائے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

آپ سمجھتے ہوں گے یہ کمرا اسٹڈی روم یا دارالمطالعہ کی طرح سجا ہوگا۔ فرش پر نرم نرم قالین، دیواروں پر مائیکل اینجلو اور ایمبرانٹ کی بنائی ہوئی تصویریں، آتشدان پر مرمریں مجسمے، گلدانوں میں پھول، صوفے کرسیاں، بڑی سی میز، طرح طرح کے فاؤنٹین پن، رنگ رنگ کی پنسلیں، مختلف اوقات کی مناسبت سے عینکیں، اور نہ جانے کیا کیا۔ انھیں سب سامانوں سے آراستہ ہوگا جو یورپ و امریکہ کے مصنفوں اور فسانہ نگاروں کیلئے مہیا ہوتے ہیں۔ مگر میں تو خالص سودیشی ہندوستانی مصنف ہوں۔ میرے پاس سوائے پلنگ اور بستر کے کچھ بھی نہیں۔ اسی پر راتوں کو لیٹ کر نیند کی روٹھی رانی کو منانے کے لئے کروٹیں بدلتا ہوں اور دن میں اسی سنگھاسن پر براجمان ہو کر قلم کی غلامی کرتا ہوں۔ اور پلنگ دونوں حالتوں میں میرے گناہوں کے بوجھ سے دب کر فریاد کرتا رہتا ہے۔

اسی پلنگ پر بیٹھ کر میں نے مسودے پر نظر ڈالی۔ مگر میری نظر ہی کیا۔ پھر اپنے دہی کو کون کھٹا کہتا ہے۔ اور یہ تو ٹھہرا لخت دل، لخت جگر اس کے دیکھنے کو بصارت سے زیادہ بصیرت چاہئے۔ اس لئے آپ، جو آنکھ والے ہیں، اسے دیکھیں۔ یہ ہے " ہمارا گھر" اسی گھر کی داستان جو ہم نے آزادی کے بعد بنایا۔

" اور انھوں نے طے کیا کہ ہم اس پھولوں سے لدی وادی میں اپنے لئے گھر بنائیں گے۔ اور ان میں سے چند دانش وروں نے کاغذ پنسل لے لی اسکیل پٹری اٹھالی اور ایک نقشہ بنا ڈالا۔ ایسی عمارت کا نقشہ جسکی بنیادیں پاتال تک جاتی تھیں اور جس کے مینار زہرہ و مشتری سے آنکھ لڑاتے تھے، جو اتنی مستحکم تھی کہ اس پر موسمی تغیرات کا اثر نہ ہو سکتا تھا، اتنی مضبوط کہ زمانے کی کروٹیں اس کو جنبش نہ دے سکیں اور اتنی کشادہ اور وسیع کہ اس کے کمروں، ہالوں میں صبا سدا اٹھلا کر چلتی رہے اور اتنی روشن کہ اس کے کونے گوشے میں چاند سورج کی کرنیں رات دن جھانکتی پھریں۔

نقشہ دیکھتے ہی سب کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ ایک ساتھ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب نے اپنی اپنی کمریں کس لیں اور شہد کی مکھیوں کی طرح گنگناتے وہ اپنے گھر کی تیاری میں لگ گئے۔

اور کچھ نے پھوڑے کدالیں اٹھائیں، کچھ نے کرنیاں، بسولیاں۔ اور انھوں نے گہری نیو کھود ڈالی اور بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر دیں۔ ان پہ چھتیں ڈالیں، محرابیں بنائیں، برجیاں بنائیں، مینار بنائے، گنبد بنائے۔

اور کچھ مضبوط بازوؤں والے بڑے بڑے تبر لے کر جنگلوں میں گھس گئے۔ انھوں نے ایک سے ایک جنگلی درخت کاٹ کر ڈھیر کر دئے۔ انکے تنوں کو چیر کر ان سے شہتیریں بنائیں، ستون بنائے، دروازے بنائے کھڑکیاں بنائیں، میز کرسیاں بنائیں۔

اور کچھ ہنرمند و تیز دست جوان آئے انھوں نے بیکار ملبہ صاف کیا دیواروں پر چھتوں پر قلعی کی، موقع موقع سے ان پر بیل بوٹے بنائے اور جگہ جگہ طاقوں اور محرابوں کو منبت کار کیا۔

اور کچھ صاحب حوصلہ اٹھے اور ہل کاندھوں پر رکھے، بیلوں کو للکارتے کھیتوں میں نکل گئے۔ اور ان کے تیز نکیلے بیلوں نے زمین کا سینہ شق کر دیا اور اس میں سے سونے چاندی جیسے چمکتے دانے نکل آئے اور سارے کام کرنے والے جو بھوک سے بیتاب تھے، ان کی روٹیاں کھا کر پھر سے اپنے اپنے کاموں پر پل پڑے۔

اور جب ان کا گھر ہر طرح بن سنور گیا تو بڑے پیمانے پر ایک دعوت کی، اور اس میں دوست دشمن سب کو بلایا۔ اور اس ولیمہ میں سب ہی آئے ایسے بھی جو ان کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور ایسے بھی جو دل ہی دل میں جلتے تھے۔ وہ بھی آئے جن کا کام ہی ہر چیز میں مین میکھ نکالنا تھا اور وہ بھی جو سدا اسی تھالی میں چھید کرتے تھے جس میں کھاتے تھے۔

اور دوستوں کا دل گھر بنانے والوں کی محنت سوارت ہوتے دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ لیکن دل میں کھوٹ رکھنے والے پیچ و تاب کھانے لگے۔ کسی نے برجیوں پر اعتراض کیا۔ کسی نے مینار کو تام دھرا۔ کسی نے کہا "دیواریں ٹیڑھی ہیں"۔ کوئی بولا "یہ چھتیں ٹپکیں گی ضرور!"

دفعتہً کونے میں خاموش بیٹھا ہوا بھانٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے اکتارے پر انگلیاں دوڑائیں اور وہ گانے لگا۔

"یہ مکان نہیں، عمارت نہیں یہ ہمارا گھر ہے! اس کی چھتیں کمزور، اس کی دیواریں ٹیڑھی، اس کی برجیاں بیکار اور اس کے مینار بے سود سہی، لیکن یہ ہمارا اپنا گھر ہے! ہمارے خوابوں کی تعبیر، ہمارے حوصلوں کا مجسمہ، ہماری امنگوں کی مورتی۔ اس کے گارے میں ہم نے اپنا خون ملایا ہے، اس کی دیواروں میں ہماری ہڈیاں پیوست ہیں، اور اس کی چھتوں میں ہم نے اپنی کھوپڑیاں لگائی ہیں۔ گھبراؤ نہیں، گھبراؤ نہیں، جلدی نہ کرو، جلدی نہ کرو۔ وہ دن دور نہیں جب اس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہوں گی اور اس کے گھاٹوں پر شیر اور بکری ایک ساتھ سیراب ہوں گے۔

ہاں ہاں، یہی امن کا گھر ہے! یہی اخوت کا گھر ہے! یہی مساوات کا گھر ہے! یہی انسانیت کا گھر ہے! یہی ہمارا گھر! ہمارا اپنا گھر!"

اور مغنی کی انگلیاں صرف تار پر نہیں دوڑ رہی تھیں، بلکہ سامعین کے ہر بُن مو میں مسرت کا ایک تموج پیدا کر رہی تھیں، اور میں اس خیالی سرود و نغمہ میں کھویا سا جا رہا تھا کہ دفعتہً میرے گھر والوں کی کڑوی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرائیں۔ مقبولن اپنی صفائی میں میری بیوی سے کہہ رہی تھی:۔

"اے وچ بی بی! تو میں کیا جانتی تھی کہ اس موئے کاغذ کے چیتھڑے میں لعل ٹکے ہیں۔"

✡

اردو ادب اور سیاست

(بسلسلہ صفحہ ۳۹)

تازگیٔ بیان کے جو چشمے بہائے ہیں ان سے پوری اردو دنیا سیراب ہو چکی ہے۔ بڑے سے بڑے رجعت پسند اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور غیر ارادی طور پر وہ انداز فکر اور طرز بیان اختیار کر چکے ہیں جس کی طرف ترقی پسند تحریک ان کو لانا چاہتی تھی۔

اردو ادب اور شاعری دونوں اب افراط و تفریط کی ایک ایسی فضا میں سانس لے رہے ہیں جو دو نوزائیدہ آزاد مملکتوں میں انھیں نصیب ہو سکی ہے۔ یہ دونوں ممالک جن میں اردو کے ادیب اور شاعر بستے ہیں نظریات اور ضروریات کے ایک ایسے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں جس سے رہائی دلانے میں شاید اردو کے ادیبوں کو پھر اسی طرح جد و جہد کرنی پڑے گی جیسی کہ انہوں نے انگریزوں سے ہندستان کو آزاد کرانے کے لئے کی تھی۔

ادبی تاریخ

سید احتشام حسین

حیاتِ انسانی نے جن چیزوں کو بھی جنم دیا ہے، ان کا زمان و مکان کے ابعاد کا پابند ہونا ضروری ہے۔ یہی ابعاد تاریخ بناتے ہیں، انھیں سے وہ رشتے وجود میں آتے ہیں جن سے ارتقا کا پتہ چلتا ہے اور سمتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ انھیں کے کوکھ سے ہم آہنگی اور اختلاف، ماضی، حال اور مستقبل، سست روی اور تیز رفتاری، روایت اور بغاوت، تقلید اور جدت، سب کی پیدائش ہوتی ہے۔ مناسب اور صحیح مقام پر ان کا تذکرہ تاریخ بنتا ہے۔ ادب اور شعر اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، ان کی تاریخ بھی فلسفۂ تاریخ کے انھیں اصولوں کی پابند ہوگی جن کی ضرورت عام انسانی ارتقا کی داستان مرتب کرنے کے لئے ہوتی ہے کیونکہ ایک مسلسل تاریخِ ادب زندگی کے دوسرے رشتوں اور ادبی ارتقا کی اندرونی حرکت سے پیدا ہونے والے رابطوں میں اسباب و نتائج کی تلاش کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ جو تاریخ جس حد تک اس ضرورت کو پورا کرتی ہے اسی حد تک وہ ذہن کی فلسفیانہ کاوشوں کا جواب مہیا کرتی ہے۔

اردو ادب کے مورخوں نے تو اپنے ذہن کو کبھی اس میں الجھایا ہی نہیں کہ مورخ کی حیثیت سے ان پر کیا فرائض عاید ہوتے ہیں اس لئے انھوں نے یا تو قدیم تذکرہ نویسوں کی پیروی کی یا زیادہ سے زیادہ ادوار کا ایک میکانکی تصور قائم کرکے تاریخ کو مختلف دوروں میں بانٹ دیا لیکن تاریخ کے اس عام بہاؤ اور پیچیدہ عمل اور ردعمل کو نظرانداز کر دیا، ادب جس کے محض ایک پہلو یا مظہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ لکھنے والوں نے قدم اس سے آگے بڑھائے اور بعض ادبی تحریکات کو بھی جگہ دے دی لیکن اس کے تجزیہ سے بہت کم سروکار رکھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں اچھی ادبی تاریخوں کا فقدان ہے۔ جب تک ذہن میں یہ بات واضح نہیں ہوگی کہ تاریخ ادب کو قومی اور تہذیبی زندگی کے عروج و زوال کا ایک جز ہونا چاہیے یا صرف مختلف ادیبوں اور شاعروں کے متعلق معلومات کا مجموعہ، ادب کو ایک نامیاتی حقیقت مان کر اس کے تغیرات کے مادی اسباب پر بھی نظر رکھنا چاہیے یا ایک غیر مادی حقیقت قرار دے کر ہر دوسرے رشتے سے الگ اور بے تعلق دیکھنا چاہیے، اس وقت تک ایسی تاریخ ادب نہیں لکھی جا سکتی جس کے آئینے میں ادب، ادیب اور ادبی فضا کی علاحدہ علاحدہ اور مجموعی تصویر نظر آجائے۔ ادب کن حالات میں پیدا ہوتا ہے، ادیبوں اور شاعروں کے تخلیقی عمل میں کون سے عناصر کام کرتے ہیں، ادبی اصناف میں تغیر و تبدل کیسے ہوتا ہے، فن کے تصور میں تبدیلیاں کس طرح ہوتی ہیں، پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا معیار یکساں کیوں نہیں رہتا، سرپرستیوں کے بدل جانے سے ادب کیوں کر متاثر ہوتا ہے، اشاعت کے ذرایع اس کی رفتار ارتقا کو کس طرح بدلتے اور ذوق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ سب مسائل کسی نہ کسی شکل میں ادبی مورخ کے ذہن میں آنے چاہئیں ورنہ اس کی تحریری کاوش کو تاریخ کا نام دینا تاریخ کی روح سے ناواقفیت کے مترادف ہوگا۔ ترکیب اور تحلیل، موضوع اور فن،

ماضی کی گرفت اور مستقبل کی خیال آرائی، حقیقتِ واقعیہ اور حقیقتِ تخیلی سب سے مل کر ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ انھیں تاریخ کے زمانی اور مکانی دائروں میں قید کرنا تغیر اور ارتقا کے صحیح مفہوم کا ادراک کئے بغیر ممکن نہیں۔ تاریخ نویسی میں ان سب مطالبات کو پورا ہونا چاہیئے۔

یورپی ادب کے مورخوں نے یہ بحثیں اٹھائی ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی حدبندی کرکے تاریخیں لکھی ہیں اور کبھی کبھی اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ انھوں نے تبصرہ اور تنقید پر اکتفا کی ہے تاریخ لکھنے کا حق ان سے پوری طرح ادا نہیں ہوا ہے۔ سینٹس بری، اڈمنڈ گاس، ٹین، لیگوئی کزیمیاں کے ذہن میں ادب اور تاریخ کے واضح تصورات موجود ہیں اس لئے چاہے ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف ہو لیکن ان کے یہاں ادب ایک حرکتِ مسلسل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے مختلف اَدوار اور اصناف کے بیان میں ایک ذہنی ہم آہنگی، ایک منطقی ربط اور ایک فلسفیانہ تصور کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ ہم اردو ادب کی جزوی یا مکمل تاریخوں پر نظر ڈالیں تو بعض صورتوں میں غیر معمولی تحقیقی کاوش کے باوجود تاریخی تصور اور ارتقائے ادب کا احساس مفقود نظر آتا ہے۔

چوں کہ ارتقائے ادب کا ذکر بار بار آیا ہے اس لئے چند لفظ اسکے متعلق بھی کہنا ضروری ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ادب میں ارتقا پر زور دینا مناسب نہیں کیوں کہ ادب کا ایک مثالی معیار اچھے برے یا زیادہ سے زیادہ تغیر و تبدل کا تصور تو پیدا کر سکتا ہے، ارتقا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ادب میں ارتقا حیاتیاتی ارتقا سے مختلف ہوتا ہے، ادب کسی معین اور مقرر منزل کی طرف بڑھتا ہوا بھی نظر نہیں آتا لیکن پھر بھی وہ جامد اور ساکن نہیں ہے بلکہ عام ارتقائے انسانی سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ قومی تہذیب کی طرح اس کی بھی ایک سمت بن جاتی ہے اور گو سارے ادیب اور شاعر اُسی راہ پر گامزن نہیں ہوتے لیکن کسی نہ کسی شکل میں اس کا احساس رکھتے ہیں۔ اس طرح روایت کی بنیاد پڑتی ہے اور ادب و زندگی کے باہمی رشتے کا ابتدائی تصور قائم ہوتا ہے۔ اگر اس تعلق کا احساس بالکل میکانکی اور مصنوعی ہوگا تو تاریخی ادوار بھی مصنوعی اور غیر منطقی ہوں گے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشکل اس بات کا سمجھنا ہے کہ فنی روایات کا استحکام بعض وقت تاریخ کے مختلف ادوار سے بے نیاز معلوم ہوتا ہے اور ارتقا اس حیثیت سے بے معنی نظر آتا ہے کہ ایک ہی قسم کے ادبی تصورات مختلف زمانوں پر حاوی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ادب کے اندر اُس کشمکش کی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے جو اُسے کبھی ماضی کی طرف کھینچتی ہے، کبھی محض حال کے عارضی ماحول میں محدود رکھنا چاہتی ہے اور کبھی مستقبل کی طرف لے جاتی ہے۔ اگر ان باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے تو ادب کی تاریخ لکھی ہی نہ جا سکے گی اور جو کچھ لکھا جائے گا وہ محض شاعروں یا ادیبوں کا تذکرہ ہوگا۔

ادب کی تاریخ گو زبان کی تاریخ نہیں ہوتی لیکن زبان کا تسلسل اور استعمال ادبی ارتقا کی بنیادی کڑی بن جاتا ہے۔ ادب کا ہر دور اور اس کی ہر صنف اپنی امتیازی حیثیت کے باوجود زبان کے ارتقا سے متعلق ہے۔ زبان کا ارتقا بھی عام انسانی ارتقا کا تابع ہے، اس کی رفتار بھی کبھی بہت سست اور کبھی تیز ہوتی ہے، اس سستی اور تیزی کے تاریخی اور سماجی اسباب ہوتے ہیں۔ زبان کا اندرونی نظام صوتی تغیرات سے اور اوپری ڈھانچا دوسری زبانوں، تعلیمی اور تہذیبی تقاضوں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے اثر لے کر زبان کی شکل بدلتا رہتا ہے جیسے سرسری طور سے سبھی ادب اور زبان کا مطالعہ کرنے والے دیکھ لیتے ہیں لیکن تغیر کے عمل اور اس کے اسباب کی واقفیت کے لئے علم اللسان کے علاوہ بعض دوسرے علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر ادب ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہوتے ہوئے، ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جاتے ہوئے اس لسانی تغیر سے بھی اثر لیتا ہے تو ادبی تاریخ میں اس کا تذکرہ اور تجزیہ بھی ضروری ہوگا۔ ہماری ادبی تاریخوں نے لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے فرق کو ضرور ملحوظ رکھا ہے لیکن اس فرق کو غیر ضروری اہمیت دینے کے علاوہ لسانی ارتقا کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے اس لئے طرزِ اظہار اور زبان کے فرق کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔

بہر حال یہ ایک بات واضح ہے کہ ادبی تاریخ فن یا ادب کے کسی مثالی تصور کو پیش نظر رکھ کر نہیں لکھی جا سکتی۔ اُسے واقعات اور حالات ادبی تخلیق کے معیار اور ادیبوں کے فنی تصورات اور خیالوں کے تسلسل و انتشار کا آئینہ بھی بننا ہوگا۔ ادبی تخلیق کے لئے نہ محض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یونانی دیومالا کی دیوی منروا کی طرح ہے جو اپنے باپ جیوپٹر کے

سے پیدا ہوئی اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسے فرد وجود میں لاتا ہے لیکن فرد اپنے دل و دماغ، علم و عمل کے ساتھ سماج سے متعلق ہے۔ انفرادی آزادی اور قدرتِ اظہار کی غیر معمولی قوت کے باوجود وہ زبان، فن اور خیالات کے ایک مخصوص زنداں میں گرفتار ہے۔ اس وجہ سے ادبی تاریخ حقائق کے مختلف کڑوں کی گردش پر نگاہ رکھ کر ہی اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ تاریخ کے اس پیچیدہ عمل میں صداقتوں اور حقیقتوں کا تعین ہر منزل پر ضروری ہے۔ واقعاتی حقائق کی تحقیق کو اس حقیقت سے بے نیاز نہیں ہونا چاہئے کہ واقعات قائم بالذات نہیں، متحرک تاریخ کا ایک جز ہیں اور نہ کوئی تنقیدی جائزہ واقعاتی حقائق سے بے نیاز ہو سکتا ہے کیوں کہ غلط معلومات سے صحیح نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ تحقیق، تجزیہ، تنقید تینوں ادبی تاریخ نویسی کا جز ہیں لیکن ان سب سے زیادہ ضروری تاریخ کا احساس ہے جو زمان و مکان کے مختلف حصوں کو علاحدہ علاحدہ بھی دیکھتا ہے اور ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیوں کی شکل میں بھی۔ اس احساس کے بغیر نہ تحقیق اور اس کے نتائج مکمل ہوں گے نہ تجزیہ اور تنقید سے وہ باتیں حاصل ہو سکیں گی جن پر مکمل طور سے بھروسہ کیا جا سکے۔

ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جب ادبی تاریخ میں زمانی تسلسل کا اتنا خیال رکھنا ضروری ہے اور اسباب اور نتائج کے اتنے رشتوں کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے تو پھر اس کو مختلف ادوار، مختلف حصوں اور دبستانوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے کہ مطالعہ میں آسانی ہو۔ اس کا جواب بہت آسان نہیں ہے لیکن عملاً ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ تقسیم کبھی علاقہ یا مقام کی بنیاد پر ہوتی ہے، کبھی عہد اور زمانے کی بنیاد پر، کبھی افراد سے متعلق ہو جاتی ہے، کبھی تحریکات سے، کبھی اصناف کے نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے، کبھی خیالات اور تصورات کے لحاظ سے ان سب کی مثالیں نہ صرف ادبیات میں بلکہ دوسرے فنونِ لطیفہ یعنی مصوری، رقص اور موسیقی میں بھی مل جاتی ہیں۔ ادبیات میں ہر ملک اور قوم کی تاریخ الگ الگ ہونے کے باوجود انھیں صورتوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ انگریزی اور فارسی ادب کی تاریخیں شاہی خاندانوں کے نام سے ملتی ہیں جیسے الزبتھ کا عہد، وکٹوریہ کا عہد، ساسانی، منگول یا صفوی عہد۔ تو ہندی میں موضوعات کے لحاظ سے جیسے ویرگاتھا کال، بھگتی کال، ریتی کال وغیرہ۔ اردو میں ہر طرح کی تقسیمیں نظر آتی ہیں۔ دکن میں اردو، پنجاب میں اردو، مدراس میں اردو، بنگال میں اردو، بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا وغیرہ خطوں اور علاقوں کے لحاظ سے ہیں تو اردو کے قدیم، جدید اردو شاعری وغیرہ زمانے کے نقطۂ نظر لکھی گئی ہیں۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید، اردو میں افسانہ نگاری، نیا افسانہ، اردو غزل کا نشو و نما، تاریخ مثنویات اردو، اردو میں ڈرامہ نگاری وغیرہ اصناف کے اعتبار سے ہیں تو ترقی پسند ادب تحریک اعتبار سے۔ دلی کا دبستانِ شاعری اور لکھنؤ کا دبستانِ شاعری دبستانوں کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہیں اور بعض دوسری تصانیف دوسری بنیادوں پر۔ بعض ایسی تصانیف بھی ملتی ہیں جو باقاعدہ تاریخ ادب کی کتابیں تو نہیں کہی جا سکتیں لیکن جن میں کسی مخصوص موضوع کے ارتقا سے بحث کرتے ہوئے تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھا جاتا ہے جیسے اردو میں طنز و مزاح، اردو شاعری میں منظر نگاری، اردو شاعری میں قنوطیت وغیرہ۔ یہ ان کتابوں کے علاوہ ہیں جو باقاعدہ تاریخ ادب کے نام سے لکھی گئی ہیں اور ان میں کم و بیش تمام اصناف اور ادوار مختصراً شامل کر لئے گئے ہیں۔ ادبی تاریخ کا مواد بہت سے اُن تحقیقی اور تنقیدی مقالوں میں بھی پھیلا ہوا ملتا ہے جو مختصر اور ادھورے ہونے کے باوجود خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

اب اگر ان تمام تصانیف اور تالیفات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان میں بہت کم ایسی ہیں جنھیں تاریخی شعور کے نقطۂ نظر سے سائنٹفک کہا جا سکے کیوں کہ وہ یا تو تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہیں یا چند حقیقتوں کی بے ربط یکجائی۔ سب سے بڑی کمی ان میں یہ ہے کہ یہ زمانے کی ان بنیادی حقیقتوں کو نظرانداز کرتی ہیں جن سے ادبی اقدار کی تشکیل ہوتی ہے اور ارتقا کو غذا ملتی ہے۔ مثلاً تذکرہ نگاروں نے خاص طور سے ادبی دبستانوں ذکر نہیں کیا تھا، بعد کے مورخوں نے دہلی اور لکھنؤ کے ادبی اور لسانی اختلاف کا ایک میکانکی تصور قائم کر کے انھیں دو دبستانوں میں تقسیم کیا، پھر ان اختلافات کی بنیاد پر انھیں ایسے الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا جن میں بہت معمولی اشتراک پایا جاتا ہے۔ علاحدگی کی یہ بحث منطقی نہیں اذعانی ہوتی ہے، تاریخی

نہیں یکسانی ہوتی ہے۔ ان دونوں دبستانوں کے متعلق کوئی بحث اس وقت تک نتیجہ خیز اور تسکین بخش نہیں ہو سکتی جب تک حسب ذیل حقائق پر غور نہ کیا جائے۔ اردو زبان لکھنؤ کے علاقہ میں کب اور کن ذرائع سے پہونچی، کیا اودھ کی حکومت قائم ہونے سے پہلے وہاں کوئی ادبی روایت موجود تھی، اگر تھی تو اس کی خصوصیات کیا تھیں، اگر نہیں تھی تو غالباً اس کی ابتدا اس وقت سے ہوئی ہوگی جب دہلی کے علماء، شعراء اور ادیب لکھنؤ یا فیض آباد میں وارد ہوئے ہوں گے۔ اب اگر ایسا ہے تو ان خاص اسباب کی تلاش ضروری ہے جن کی وجہ سے زبان، لب و لہجہ، محاورات، تذکیر و تانیث، خیالات اور معیار میں فرق پیدا ہوئے کیوں کہ دونوں جگہ معاشی نظام یکساں تھا، علوم و افکار وہی تھے جو صدیوں سے رائج تھے، تہذیبی سرمایہ وہی تھا جو اسلامی ممالک اور ہندوستان سے ورثے میں ملا تھا، شاہی انداز وہی تھا جو مغل حکومت کی کمزور روایت کی شکل میں زندہ تھا۔ اب اگر ان بنیادوں کے بعد بھی فرق ہوا ہے تو وہ فرق بنیادی نہیں ہو سکتا۔ تاہم جو فرق ہے اس کی توجیہہ اور تشریح اسباب کی روشنی میں کرنا ضروری ہوگا۔ اودھ کے کے علاقہ میں کھڑی بولی کی ایسی شاندار روایت کا وجود میں آنا کچھ ایسے تہذیبی عناصر کا نتیجہ ہوگا جو اودھ کی روایات سے آمیز ہونے کے بعد ہی کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں صورت پذیر ہو سکتی تھی۔ مذہب، لسانی اثرات، تہذیبی تعلقات کے نئے انداز، بدلے ہوئے سیاسی تعلقات، مقامی تیوہار اور رسم و رواج نے کس حد تک اس فرق کو امتیازی رنگ دیا، ان سب پر غور کرنے کی ضرورت ہوگی ورنہ جو نتائج نکلیں گے وہ محض سطحی ہوں گے۔

اردو ادب کی ہر تاریخ میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کا ذکر ملتا ہے لیکن وہ تشفی بخش نہیں ہوتا۔ اب اگر کوئی مورخ قدیم دکن اسکول (اور اس میں بھی بہمنی دور، قطب شاہی اور عادل شاہی دور)، دہلی اور لکھنؤ اسکول، رامپور اسکول، بہار اسکول، آگرہ اسکول، لاہور اسکول اور بعض دوسرے اسکولوں کو بنیاد بنا کر اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنا چاہے تو اسے ان دبستانوں کے امتیازی نقوش کو واضح کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسباب و علل تک رسائی حاصل کرنا بھی ضروری قرار دینا چاہئے۔ اس طرح جو تاریخ ادب وجود میں آئے گی وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دلکش ہو سکتی ہے لیکن ادب کی مجموعی رفتار ارتقا کا احساس مشکل سے پیدا کرا سکے گی۔

اردو زبان ہندوستان میں لسانی ارتقا کی ایک مخصوص منزل پر پیدا ہوئی۔ خاص قسم کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات نے اس کی تعمیر اور تشکیل میں مدد دی۔ یہ زبان یکایک وجود پذیر نہیں ہوئی، نہ تنہا تھی بلکہ اس وقت اور متعدد زبانیں موجود تھیں جو نئے سانچوں میں ڈھل رہی تھیں اور مختلف تاریخی وجوہ سے ان میں سے بعض ادبی ارتقا کی منزلوں میں تیزی سے گامزن ہو گئیں اور بعض کو یہ موقع بعد میں دستیاب ہوا یا نہ ہو سکا۔ اردو ادب کے مورخ کی نگاہ اگر ان مسائل پر ہو تو وہ بعد کے ارتقا اور تغیر کو بھی اچھی طرح سمجھ سکے گا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آسکے گی کہ دکن میں اردو کی ابتدائی ترقی کیسے ہوئی، پھر شمالی ہند کس طرح ادبی مرکز بنا، پھر اس کا دائرہ کیوں کر وسیع ہو کر ہندوستان گیر ہو گیا اور بعد کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی اثرات نے کس طرح کی تبدیلیوں کے لئے راہ ہموار کی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کے پیش نگاہ رکھنے سے ادب کی تاریخ محض ایک سماجی اور تہذیبی تاریخ بن کر رہ جائے گی لیکن اس کا دار و مدار خود مورخ پر ہے کہ وہ زندگی کے اس متحرک آئینے میں ادب کی تصویر کس رخ سے دیکھتا ہے، ادب اور زندگی کے تعلق کا تجزیہ کس طرح کرتا ہے اور اصل تصویر اور پس منظر کے تعلق اور تناسب کو جانتا ہے یا نہیں۔ مختصر اور مفصل تاریخ ادب دونوں میں یہی چیزیں ہوں گی صرف ان کا تناسب بدلے گا۔

کسی سماج میں ادوار کیسے بنتے اور ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اس کے بہت سے جواب دیئے جا سکتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اصل تغیر انسانی شعور کے ایک منزل سے دوسری منزل میں داخل ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے اور انسانی شعور کے بدلنے کا سبب وہ مادی تبدیلیاں ہوتی ہیں جن سے انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ کائنات اور سماج کے ساتھ اپنے رشتوں کو نئی طرح استوار کرتا ہے۔ اس لئے تاریخ میں حقیقی ادوار تو وہی ہوں گے جو کسی بڑے سماجی تغیر سے وجود میں لیکن مطالعہ کی آسانی کے لئے تبدیلی کے مختصر ادوار بھی بنائے جا سکتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۵۹ پر)

غزل

حبیب احمد صدیقی

نظر فسوں طراز ہے، ادا جنوں نواز ہے — یہ اہتمام ناز کیوں، جو حسن بے نیاز ہے

دلِ حزیں تجھے عبث غمِ شکست ساز ہے — اسی شکست ساز میں، فروغِ دل کا راز ہے

اِدھر حجاب آرزو اُدھر حجابِ ناز ہے — حکایتِ دل و نظر فسانۂ دراز ہے

جسے بزعم آگہی سمجھ رہے ہیں زندگی — کسی کرشمہ ساز کی وہ اک ادائے ناز ہے

یہ حسن کی فسوں گری اور اپنی خوئے بندگی — جہاں ہے دعوتِ نظر وہیں سرِ نیاز ہے

بہ فیضِ عشقِ بے نوا، بہ ہر نظر بہ ہر ادا — نیا فریبِ آرزو، نیا پیامِ ناز ہے

خرد چلی ہے کھولنے گرہ رموزِ زیست کی — اُلجھ نہ جائے اور بھی کہ رشتۂ دراز ہے

بایں فروغِ زندگی بایں غرورِ آگہی — نہاں تو خیر ہے نہاں، عیاں ہنوز راز ہے

لہو سے خار سینچنا اگر ہے پیشۂ جنوں — توائے اسیرِ رنگ و بو، مجھے جنوں پہ ناز ہے

نہ دل میں شمعِ آرزو نہ لب پہ نغمۂ طرب
نہ جانے جی رہے ہیں کیوں، نہ سوز ہے نہ ساز ہے

ہندوستانی موسیقی

ہندوستان کے فارسی لٹریچر کی روشنی میں۔۱

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

مسلمانوں کے مفتیوں اور فقیہوں کے نزدیک اسلام میں مزامیر کے ساتھ موسیقی جائز نہیں، لیکن مذہبی پابندیوں کے باوجود ہر زمانہ میں مسلمانوں کے شاہی درباروں، صوفیوں کی محفلوں اور خواص و عوام کی معاشرتی تقریبوں میں مزامیر کے ساتھ موسیقی مقبول رہی۔ مسلمان ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ بہت سے باجے مثلاً قانون، عود، قنبور، اور رباب جاہ وغیرہ ساتھ لائے۔ یہ سب تار والے ساز تھے۔ منہ سے بجانے والے باجوں میں بق، نے اور سرنا انہی کے لائے ہوئے ہیں۔ نقارہ، سنج، دف، طبل اور نوبت بھی انہی کی وجہ سے ہندوستان میں رائج ہوئے۔ ایران اور عرب کی موسیقی میں عشاق، نوروز، مبارک کرشمہ، بیت، عراق، نیشاپوری، زنگلہ، چہارگاہ، پیدازل، اشیران، رہوائے، زنگلہ حجاز اور گوشہ ازل جیسے راگ اور راگنیاں بہت مقبول رہیں۔ ایرانی راگ کی بارہ قسمیں ایک رباعی میں اس طرح نظم کی گئی ہیں۔

راست[1]، عشاق[2]، بوسلیک[3] بساز ‌ ‌ ‌ ‌ با نوا[4]، اصفہان[5]، بزرگ[6] نواز

کوچک[7] استاد، عراق[8] زنگولہ[9] ‌ ‌ ‌ ‌ پس حسینی[10] و رہوائے[11] و حجاز[12]

ایران و عرب کے بعض راگ اور راگنیاں ہندوستانی راگ راگنیوں سے ایسی مماثلت رکھتی ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ایرانی اور عربی راگنیاں ہندوستانی راگوں سے مستعار ہیں یا ہندوستانی راگ ایرانی اور عربی راگنیوں سے متاثر ہوئے۔ مثلاً نغمۃ الاسرار کے مصنف کا بیان ہے کہ نوروز ہندی للت پنچم اور قندھاری سے ملی جلی چیز ہے۔ اسی طرح عراق ہندی مالکوس اور پوروا، مبارک کرشمہ اور بھاگرا، بیت اور کانہڑا، نیشاپوری اور بلاول، زنگولہ اور چہارگاہ اور اساوری، پیدازل اور کھٹ، چہارگاہ اور گجری، اشیران اور جیت سری، رہوائے اور دھنا سری، زنگولہ حجاز اور جیتی گوری، صغیر اور کلیان، گوشۂ ازل اور شدھ ٹوری میں بڑی مماثلت ہے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کے راگوں اور نغموں میں امتزاج پیدا ہونے کی دو جگہیں تھیں، صوفیوں کی مجالس اور بادشاہوں کے دربار۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات اور تصانیف میں سماع کے جائز ہونے اور نہ ہونے پر بڑی لمبی لمبی بحثیں ملیں گی۔ لیکن عملی طور پر بہت کم ایسی خانقاہیں ہوں گی جہاں سماع کی مجلسیں مزامیر کے ساتھ منعقد نہ ہوتی ہوں۔ چشتیہ سلسلہ کے صوفیائے کرام کے یہاں رفتہ رفتہ سماع کا ذوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ مجلس سماع ان کے یہاں راہِ طریقت کا ایک اہم جزو بن گئی تھی۔ "دلیل العارفین" میں ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی پر محفل سماع میں غیر معمولی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک بار حضرت خواجہ ابو یوسف چشتی کی خانقاہ میں مقیم تھے۔ وہاں کی مجلس سماع میں قوالوں نے ان دو شعروں کو گایا۔

عاشق بہ ہوائے دوست بیہوش بود ‌ ‌ ‌ ‌ وز یاد محبت خویش مدہوش بود

فردا کہ بہ حشر خلق حیران ماند ‌ ‌ ‌ ‌ نامِ تو درونِ سینہ و گوش بود

تو حضرت خواجہ کئی روز تک بیہوش رہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات سماع ہی کی بدولت ہوئی۔ "فوائد السالکین" میں ہے کہ ایک بار شیخ علی سجستانی کی خانقاہ میں محفل سماع تھی۔ قوالوں نے شیخ احمد جام کا قصیدہ گانا شروع کیا، اور جب یہ شعر پڑھا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　　ہر زماں از غیب جان دیگر است

تو حضرت قطب صاحب پر وجد طاری ہوگیا اور مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے اور اسی حالت میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ "فوائد الفواد" میں ہے کہ حضرت قاضی حمید الدین ناگوری سماع سے والہانہ ذوق رکھتے تھے اور اس ذوق کی وجہ سے علمائے ظاہر نے ان کے خلاف فتوے بھی دیے، مگر انہوں نے کسی کی پروا نہیں کی اور اس کو بدستور قائم رکھا۔ غنا یعنی موسیقی کے متعلق ان کا خیال تھا کہ

حرام است بر سامع اہل قال　　　　مباح است بر سامع اہل حال

"سیر العارفین" میں ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ایک بار بارش نہیں ہوئی تو خشک سالی کی وجہ سے غلہ گراں ہوگیا۔ سلطان نے اپنے ایک معتمد خاص کو دہلی کے تمام مشائخ کے پاس بھیجا کہ بارش کے لئے دعائیں کریں۔ قاضی حمید الدین ناگوری نے یہ پیام سنا تو سلطان کو کہلا بھیجا کہ وہ محفل سماع منعقد کرائے، اسی میں تمام درویش جمع ہوکر بارش کے لئے دعا کریں گے۔ سلطان نے ان کے کہنے کے بموجب ایک محفل منعقد کی جس میں تمام ممتاز مشائخ مثلاً شیخ علی سنجری، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ احمد نہروالی، شیخ بدر الدین سمرقندی، سید قطب الدین، حضرت نظام الدین، ابو المؤید غزنوی، اور شیخ محمد مؤتینہ وغیرہ شریک ہوئے۔ سلطان نے اس محفل کے لئے فرش فروش کے عمدہ اور پاکیزہ سامان کئے طرح طرح کے کھانے پکوائے اور خوش گلو قوالوں کو جمع کیا۔ جیسے ہی محفل سماع شروع ہوئی ویسے ہی قدرت الٰہی سے زور شور کی بارش ہونے لگی۔

"راحت القلوب" میں ہے کہ ایک بار حضرت فریدالدین گنج شکر کی ایک مجلس سماع میں یہ غزل شروع کی گئی۔

ملامت کردن اندر عاشقی رسمست　　　　ملامت کے کند آں کس کہ بینا است
نہ ہر تر دامنے را عشق زیبد　　　　نشان عاشقی از دور پیدا است
نظامی نا توانی پارسا باش　　　　کہ نور پارسائی شمع دلہا است

تو حضرت گنج شکر پر بیقراری کی عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور یہ کیفیت اتنی بڑھی کہ سات دن اور سات رات سُکر کا عالم رہا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور ان کے بعد کے بزرگوں کے یہاں بھی سماع کی مجلسیں برابر ہوتی رہتیں اور ان پر وجد کی ایسی کیفیات طاری رہتیں کہ راہ طریقت کی اکثر کٹھن منزلیں اسی کے ذریعہ طے ہوجاتیں۔ مگر سماع ایک بڑی مقدس چیز تھی اور ان ہی لوگوں کے لئے جائز تھی۔ جو اس میں ایسے مستغرق ہوں کہ ایک لاکھ تلواریں بھی ان کے سر پر ماری جائیں تو ان کو خبر نہ ہو۔ "فوائد الفواد" میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا فرمایا کرتے تھے کہ سماع سے تین سعادتیں حاصل ہوتی ہیں (۱) انوار (۲) احوال (۳) آثار اور یہ تین عالموں سے نازل ہوتی ہیں (۱) ملک (۲) جبروت (۳) ملکوت اور تین چیزوں پر نازل ہوتی ہیں (۱) ارواح (۲) قلوب (۳) جوارح۔ انوار عالم ملکوت سے ارواح پر، احوال عالم جبروت سے قلوب پر اور آثار عالم ملک سے جوارح پر نازل ہوتے ہیں۔ انوار پھر احوال اور آخر میں آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ آثار کے نزول سے جسم میں حرکت اور جنبش پیدا ہوتی ہے۔

مجلس سماع کے خاص خاص آداب تھے، مثلاً حضرت خواجہ گیسو دراز اپنی تصنیف "خاتمہ" میں لکھتے ہیں کہ مجلس سماع کے لئے ایک علیحدہ مکان ہو۔ ارباب دنیا، امرا کے لڑکے، بچے اور عورتیں اس میں شریک نہ ہوں، اس میں لوگ غسل کرکے باوضو شریک ہوں، گانے والوں پر نظر نہ رکھیں، نہ ان کی موسیقی پر دھیان دیں، اشعار کی ترکیب کو بھی خیال میں نہ لائیں، زبان سے کچھ کہنا چاہیں تو بھی اس سے پرہیز کریں، اضطراب میں پیاس معلوم ہو تو پانی نہ پئیں، مزامیر بھی نہ ہوں۔ لیکن عملی طور سے ان آداب کی پابندی کم کی جاتی۔ مزامیر تو مجلسوں میں ضرور ہوتے۔ "فوائد الفواد" (ص ۲۲۷) کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عام طور سے دَف، چغانہ، چنگ اور رباب استعمال کئے جاتے۔

صوفیائے کرام کا میل جول ہندوستان کے باشندوں سے زیادہ بڑھا تو ان کی مجلسوں میں ہندی دوہے بھی گائے جانے لگے، جو رفتہ رفتہ اس قدر مقبول ہوئے کہ خود صوفیائے کرام نے دوہے کہنے شروع کئے۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت عبدالحق ردولوی اور

حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے دوہے مشہور ہیں۔ حضرت عبدالقدوس کا ایک دوہا یہ ہے۔ (وہ دوہے میں الکھ داس تخلص کرتے تھے)

دھن کارن پی آپ سنوارا — بن دھن سکھی کنت کنھارا
نہ کھیلے دھن ماتھیں ایوان — باس پھول میں اچھے جیوان
کیوں نہ کھیلوں تج سنگ میتا — مجھ کان تین ایتار کیتا
الکھ داس اکھے سن سوئی — سوئی پاک ارتھ پہن سوئی

یہ ہندی دوہے ہندی راگ میں گائے جاتے اور وہ خود صوفیہ کو اتنے پسند تھے کہ ان کی مجلسوں میں نہ صرف عام ہو گئے تھے بلکہ انھوں نے خود بھی کچھ راگ اختراع کئے تھے۔ "راگ درپن" میں ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے دھناسری، ٹوری اور مالسری کو مخلوط کرکے ملتانی دھناسری ایجاد کیا جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اپنی محفلوں میں بہت پسند کرتے تھے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کے راگوں میں امتزاج پیدا کرنے والوں میں سب سے ممتاز نام امیر خسرو کا ہے۔ وہ بہت بڑے صوفی بھی تھے، بہت بڑے شاعر بھی، نائک بھی، اور بہت بڑے محب وطن بھی۔ ان گوناگون اوصاف کی وجہ سے ان کی طریقت، شاعری اور موسیقی میں جلوۂ صد رنگ نہیں بلکہ ہزار رنگ پیدا ہوئے۔ ان میں درد دل، سوز دل اور گداز دل انتہا درجہ کا تھا، جو ان کی طریقت، شاعری اور موسیقی میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق شاہی دربار سے تھا، اس لئے موسیقی کی ایرانی طرز سے اچھی طرح واقف تھے لیکن طبعاً ہندوستانی موسیقی سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی ایک آگ ہے جو قلب اور روح دونوں کو جلاتی ہے اور دوسرے تمام ممالک سے بہتر ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی صرف آدمیوں کو نہیں بلکہ جانوروں کو بھی مسحور کر دیتی ہے، ہرن کو اس کے ذریعہ مسحور کرکے شکار کر لیا جاتا ہے! انھوں نے "اعجاز خسروی" میں ایک باب موسیقی کے اصول و فروع پر بھی لکھا ہے۔ (جلد اول۔ ص ۲۹۰ـ۲۷۵) لیکن اس کی مشکل عبارت آرائی میں معانی و مطالب کچھ ایسے گم ہو گئے ہیں کہ ان کا سمجھنا آسان نہیں۔ انھوں نے اس زمانہ کے خاص خاص سازوں کے یہ نام لکھے ہیں:۔ رباب، قانون، چنگ، نائی، طنبور، بابلک شہنائی، تبیرہ ہندی، دہل، ہُنگ۔ اس دور کے خاص خاص ماہرین فن کے عجیب و غریب نام لکھے ہیں:۔ امیر کنجشک، محمد شاہ مرغک، محمود چوزہ وغیرہ۔

امیر خسرو نے ہندی اور ایرانی راگ راگنیوں کو کس طرح ملایا، اس کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ ان قصوں میں ایک یہ بھی ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں جنوبی ہند سے بہت سے ہندو ماہرین موسیقی شمالی ہند میں آکر سلطان اور اس کے امراء کی زرپاشی سے سیراب ہوئے۔ ان ہی میں نائک گوپال بھی تھا جس کے سنگھاسن کو اس کے دو ہزار شاگرد اپنے اپنے کندھوں پر اٹھایا کرتے تھے، اور وہ کبھی زمین پر پاؤں نہیں رکھتا تھا۔ اس کا مقابلہ امیر خسرو سے ہوا۔ اس طرح کہ جب نائک گوپال علاء الدین خلجی کے دربار میں اپنا فن دکھاتا تو امیر خسرو تخت کی آڑ میں چھپ کر سنا کرتے تھے۔ گوپال جب کوئی ہندی راگ شروع کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس راگنی میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں۔ خسرو نے گوپال کی طرز کو اچھی طرح سمجھ لیا تو دربار میں آکر ایرانی راگ "قول" کو اپنے جنوبی ہند کے حریف کے اسٹائل میں اس طرح گایا کہ گوپال سن کر مبہوت ہو گیا اور یہ کہہ کر اس نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا کہ جانتا ہوں کہ یہ چوری ہے لیکن یہ چوری اس طرح کی گئی ہے کہ میرا بھی اس پر اختیار نہیں۔ یہ واقعہ "مراۃ الخیال" (ص ۲۴۳ـ۲۴۲) اور "راگ درپن" میں تھوڑی سی کمی و بیشی کے ساتھ درج ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں ہندوستانی موسیقی کا ایرانی موسیقی سے امتزاج شروع ہو گیا تھا۔ امیر خسرو نے اس امتزاج کے ساتھ کئی راگ مثلاً مجیر، منم، زیلف، سازگری، ایمن، عشاق، موافق، غنم، فرغنہ، سرپردہ، باخرزا اور فردوست اور محرم ایجاد کئے۔ "راگ درپن" کے مصنف کا خیال ہے کہ مجیر غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے، منم میں گلیان کے ساتھ ایک ایرانی راگ شامل ہے، سازگری میں پوربی، گوری کنگلی، اور ایک فارسی راگ کا امتزاج ہے، زیلف میں کھٹ راگ کو شہناز سے ملایا ہے، ایمن میں ہنڈول اور نیریز ملے ہوئے ہیں، عشاق میں سارنگ، بسنت اور نوا کے راگ ہیں، موافق میں ٹوڑی، مالوی، دوگاہ اور حسینی ملے ہوئے ہیں، غنم میں پوربی کو ذرا تغیر کر دیا گیا ہے، فرغنہ میں کنگلی اور

گوری کو ملایا ہے، باخرز میں وسیکال کے ساتھ ایک ایرانی راگ ہے' سر پردہ میں سارنگ، بلاول اور راست کو مرکب کیا ہے، فردوست میں کانہڑا، پوربی اور ایک ایرانی راگ کا امتزاج ہے اور ٹوڑی اور عراق کو ملا کر محرم بنایا گیا ہے۔

خسرو کی طرف اور دوسرے اختراعات بھی منسوب ہیں، مثلاً بادشاہ نامہ کا مصنف عبد الحمید لاہوری لکھتا ہے کہ ہندوستان میں خسرو سے پہلے گیت، چند، دھرپد اور استت گائے جاتے تھے لیکن خسرو نے خاص خاص چیزیں ایجاد کیں۔ ان میں چار کے نام اس نے خاص طور پر لئے ہیں (۱) قول جس میں فارسی اور عربی کے اشعار ہوتے، جو ایک سے چار تال پر گایا جاتا (۲) دوسری چیز کا نام لئے بغیر وہ لکھتا ہے کہ اس میں فارسی اشعار ترانہ کے ساتھ ایک تال پر گائے جاتے تھے، شاید یہ قلبانہ ہو (۳) ترانہ۔ اس میں اشعار نہیں ہوتے تھے، لیکن ایک تال پر گایا جاتا تھا (۴) خیال (بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۶-۵)

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خیال حسین شاہ شرقی کی ایجاد ہے، لیکن کچھ ارباب فن ایسے بھی ہیں جو خسرو کو خیالیوں کا نائک کہتے ہیں اور خیال کی ایجاد ان ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ امیر خسرو کے زمانے میں سنسکرت میں دھرپد زیادہ گایا جاتا جو زیادہ تر ہندوؤں کی مذہبی روایتوں پر مبنی ہوتا مسلمان دھرپد کے تقدس اور اس کی کلاسیکی اہمیت سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے قرین قیاس بھی ہے کہ امیر خسرو کے اختراع پسند ذہن نے دھرپد کی جگہ خیال ایجاد کیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر آف میوزک، ڈاکٹر سمتی ٹھاکر کا بیان ہے کہ قوالی کے چلنت بولوں اور جزئیات سے خیال وجود میں آیا۔ اس لحاظ سے بھی خیال امیر خسرو ہی کی ایجاد سمجھی جا سکتی ہے کیونکہ قوالی بھی امیر خسرو ہی کی اختراع ہے۔ ممکن ہے کہ حسین شاہ شرقی نے خیال کو زیادہ ترقی دی ہو، لیکن اس کو سب سے زیادہ ترقی دینے والا محمد شاہ رنگیلے کے دربار کا ماہر فن نعمت خاں سدارنگ تھا جس کے بعد دھرپد کے مقابلہ میں خیال زیادہ مقبول ہوتا گیا۔ دھرپد کے تال میں جو کرختگی ہوتی ہے وہ خیال میں نہیں پائی جاتی۔ اسکے دو اجزاء ہوتے ہیں، استھائی اور انترا۔ استھائی دھیمے اور انترا

اونچے سُروں میں گایا جاتا ہے۔ اس کے بول بہت محدود ہوتے ہیں، اسی وجہ سے وہ شاعری کی ہر صنف کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ پھر بھی خیال میں ہجر، وصال، عشق کی لپپائی، پائل کی غمازی اور سکھیوں کی چھیڑ چھاڑ وغیرہ کو کچھ اس انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے سننے والوں پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ خسرو کا خیال تو کہیں نظر سے نہیں گزرا، البتہ نمونے کے طور پر محمد شاہ رنگیلے کے عہد کا ایک خیال ذیل میں درج کیا جاتا ہے، جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر سے چپ چاپ جا کر رات کی خاموشی میں ملنا چاہتی ہے، لیکن اس کے پائل کی جھنکار سے اس کی ساس نند اور جیٹھانی اٹھ جاتی ہیں اور وہ اپنا کلیجہ مل کر رہ جاتی ہے۔

چھن چھن پائل باجے — کیسے جاؤں پی کو ملن
جاگے موری ساس نندیا — اور دیورنیا اور جیٹھنیا
اگر سُنے میرو باگر دونیگو — اور سن پاوے محمد شاہ رنگیلے

عورتوں کے اس قسم کے جذبات کا اظہار خسرو کے ہندی گیتوں میں بہت ہوا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر جو گیت اور بابل گائے جاتے ہیں، وہ خسرو ہی کی طرف منسوب ہیں۔ محمد حسین آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں کہ دلی بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہار میں کھم گڑواتی ہیں، درخت ہو تو اس میں جھولا ڈلواتی ہیں، مل مل کر جھولتی ہیں، اور گیت گا کر جی خوش کرتی ہیں۔ ان میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو یہ گیت نہ گاتی ہو۔

آجھوں نہ آئے سوامی ہو
اے ہو جو پیا آون کہہ گئے
آون آون کہہ گئے
آئے نہ بارہ ماس
اے ہو جو پیا اون کہہ گئے

یہ گیت امیر خسرو کا ہے، اور بردا راگ میں نے بھی ان ہی کی رکھی ہوئی ہے (آب حیات ص ۶۷) محمد حسین آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ موسیقی میں امیر خسرو کی طبیعت ایک بین تھی کہ بن بجائے بڑی بجتی تھی اسلئے دھرپد کی جگہ قول وقلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کئے کہ ان کے

اکثر گیت آج تک ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کی زبان پر ہیں۔ بہار راگ اور بسنت کے میلے نے ان ہی کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انھیں نے نکالا ہے۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ خسرو نے ہندوؤں کے وینا اور ایرانی طنبورہ کو ملا کر ستار کی ایجاد کی۔ گو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دسویں صدی سے پہلے کسی نہ کسی شکل میں ایشیائے کوچک، ایران، آرمینیا اور ترکستان میں ستار موجود تھا، اور یہ بیرونی ملکوں سے ہندوستان پہونچا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلے ستار میں چار تار ہوا کرتے تھے، مگر خسرو نے اس میں تین تار اور بڑھا دیے اور اس کا نام ستار پڑ کر خسرو کی طرف منسوب ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ طبلہ بھی امیر خسرو ہی کی ایجاد ہے (اسلامک کلچر حیدر آباد جنوری ۱۹۵۵ء) گو اس کی ایجاد اکبری عہد کے سدھارک خاں کی طرف سے بھی منسوب ہے۔ قوال تو امیر خسرو ہی کو اپنا ابوالآبا سمجھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قوالی میں غزل کا حسن، موسیقی کا روپ' اور ارباب دل کا کیف شامل ہوتا ہے۔ امیر خسرو غزل گو تھے، موسیقی کے ماہر بھی تھے، اور صاحب دل بھی تھے۔ اس لئے قوالی کی ایجاد کے لئے وہی موزوں ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی مجلس سماع میں مست اور بے خود ہو کر گاتے۔ "سیر الاولیا" (ص ۱۶ - ۵۱۵) میں ہے کہ ایک بار امیر خسرو خواجہ نظام الدین اولیا کے سامنے اپنی ایک غزل گانے لگے اور جب اس شعر پر پہونچے۔

رخ جملہ را نمودہ مرا گفت تو میں   زیں ذوق مست بے خبر کیں سخن چہ بود

تو سلطان المشائخ نے نگاہ محبت سے امیر خسرو کو دیکھا اور بے خود ہو گئے۔ کبھی کبھی وجد و کیف میں اپنی دستار بھی امیر خسرو کے سر پر رکھ دیتے تھے۔

امیر خسرو کو موسیقی میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے نائک کا خطاب دیا گیا تھا جو اس زمانہ میں اس فن کا بہت بڑا خطاب سمجھا جاتا تھا، پہلا خطاب پنڈت'، دوسرا گنی، تیسرا گندھرپ'، چوتھا گائک پانچواں اور آخری نائک ہوتا تھا۔ نائک موسیقی کے علم اور عمل دونوں میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن امیر خسرو خود اپنے ان اوصاف کے قدر دان نہ تھے۔ اپنے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ وہ چاہتے تو اپنی شاعری کی طرح موسیقی پر بھی تین دفتر لکھ سکتے تھے، لیکن انھوں نے لکھنا پسند نہیں کیا اور جس عشق مجازی کا راگ انھوں نے اپنی موسیقی اور شاعری میں الاپنا شروع کیا' وہ عشق الہی سے بدل گیا اور ان میں عشق الہی کی ایسی سوزش پیدا ہو گئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے روز اللہ تعالے پوچھے گا کہ کیا لائے تو میں کہوں گا کہ خسرو کا سوز سینہ۔ اور خسرو اسی سوز سینہ میں ماہر موسیقی کی حیثیت سے اپنی زندگی ہی میں جل کر رہ گئے، لیکن بعد میں اس حیثیت سے بہت یاد کئے جانے لگے۔

سلاطین دہلی کے دور میں علماء، غناء اور آلات غناء دونوں کو حرام قرار دیتے رہے۔ سلطان شمس الدین التتمش اور سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار میں تو اس کی مخالفت میں محضر بھی منعقد ہوا لیکن انکی مخالفت کے باوجود موسیقی دربار اور عام معاشرت میں مقبول ہوتی گئی۔ التتمش کا جانشین رکن الدین فیروز شاہ اپنے دربار کے ارباب طرب و عشرت کے ساتھ کچھ ایسا مشغول رہنے لگا کہ پھر اس کو اپنی سلطنت کے امور معاملات سے کوئی سروکار نہ رہا۔ (تاریخ مبارک شاہی ص ۲۱) غیاث الدین بلبن ایک سخت بیماری کے بعد اچھا ہوا تو خوشی میں گانے بجانے کی مجلسیں بھی منعقد کی گئیں، حالانکہ بلبن کا مزاج مذہبی واقع ہوا تھا۔ (مبارک شاہی ص ۴۱) اس کے دربار سے ارباب طرب کو وظائف بھی ملتے تھے۔ جشن نوروز میں مطرب دربار میں آکر اپنے نغموں کی داد ضرور لیتے۔ (تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۸۷) معز الدین کیقباد کے دربار میں گویوں کی اتنی قدر ہوتی کہ وہ اور لوگوں کو مشکل سے دستیاب ہوتے تھے (تاریخ فرشتہ ص ۸۴) اسی سلسلہ میں ضیاء الدین برنی مولف تاریخ فیروز شاہی کا بیان ہے کہ سلطان کی مجلس میں ماہر مطرب اور ترپ کا استاد شریک ہوتے اور ہندی و پارسی راگ ملا کر سلطان کی مدح میں قول، غزل، حبت(؟) اور کیلانی (؟) گاتے (ص ۱۵۷) سلطان کیقباد نے موسیقی کی مجلسوں میں کچھ ایسی بے اعتدالی اور بے راہ روی دکھائی کہ لوگ موسیقی کو رندی، بوالہوسی اور سرمستی کا ذریعہ سمجھنے لگے۔ اس دور کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی موسیقی کے خلاف اپنی کراہت کا اظہار برابر کرتے رہے' لیکن اپنے شباب کے زمانے کی مجلسوں کو یاد کر کے ان کا قلم بے قابو ہو جاتا ہے۔

چنانچہ جلال الدین خلجی کے عہد کی مجلس نشاط کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

"سلطان کی مجلسوں میں محمد چنگ بجاتا، فتوحا دختر نغامی اور نصرت خاتون گاتیں، اس طرح کہ ان کی آواز سن کر ہوا سے پرندے گر جاتے، اور سننے والوں کے ہوش جاتے رہتے۔ دل تڑپنے لگتے، روح بے قابو ہو جاتی۔ نصرت بی بی اور مہر افروز غضب کا حسن رکھتی تھیں۔ جہاں یہ اپنے کرشموں اور غمزوں کا اظہار کرتیں، سلطان کی مجلس میں جب رقص کرتیں تو جو ان کے کرشمے اور ناز کو دیکھتا، اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ..... سلطان کی مجلس ایسی تھی کہ خواب میں بھی نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔"

(تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۹)

علماء سے متاثر ہو کر سلطان غیاث الدین تغلق نے موسیقی کو اپنے دربار حتی کہ اپنی سلطنت میں ممنوع قرار دیدیا تھا اور صوفیہ کی مجلس سماع کے خلاف بھی ایک عام شاہی حکم کر دیا تھا۔ لیکن صوفیہ کرام جن میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا بھی تھے، سماع کے جائز ہونے کے قائل رہے۔ اسی زمانہ میں مولانا فخر الدین زرادی نے تو سماع کی موافقت میں ایک رسالہ بھی تالیف کیا۔ سلطان محمد بن تغلق کے زمانہ میں موسیقی پر قدغن نہیں رہا۔ اس کے دربار میں گویوں اور سازندوں کا ایک طائفہ رہا کرتا تھا۔ یہ لوگ ارباب نشاط کہلاتے تھے۔ ان کے لئے ایک نگراں داروغہ ارباب نشاط کے نام سے مقرر تھا۔ محمد بن تغلق کے شاہی محل کے پہلے دروازہ پر نفیری، نقارے اور سرنا والے بیٹھے رہتے۔ جس وقت کوئی امیر یا بڑا آدمی آتا تو وہ نقارہ اور نفیری بجانا شروع کر دیتے۔ وہ اپنے فن میں اس قدر ماہر ہوتے کہ بجانے میں یہ آواز نکالتے کہ فلاں شخص آیا ہے (سفر نامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۹۹)۔ شادی بیاہ کی تقریب کے موقع پر مطربوں اور طوائفوں کا ناچ گانا بھی ہوتا اور محل کے اندر دلہن کے پاس عورتیں ناچتیں اور گاتیں (سفر نامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۱۴۳)۔ سکندر لودی میں بڑی مذہبی راسخ العقیدگی تھی۔ لیکن موسیقی کے سلسلہ میں وہ اپنے راسخ عقیدہ پر قائم نہیں رہ سکا۔ وہ نغمہ، ساز کے ساتھ سنا کرتا تھا۔ تاریخ داؤدی میں ہے کہ اس کے یہاں چار غلام تھے، ایک چنگ، دوسرا قانون، تیسرا دینا، اور چوتھا طنبورہ بجانے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اسی طرح اس کے یہاں سرنائی اور نوبت بجانے کے بھی ماہرین تھے۔ اس کو ذاتی طور پر حسینی کانہڑا، کیدار، مالی گورہ اور کلیان کی راگنیاں پسند تھیں۔

لیکن اس دور میں موسیقی کو فن کی حیثیت سے ترقی دینے والوں میں جونپور کے حکمراں حسین شاہ شرقی (۱۴۸۳-۱۴۵۷) کا نام بہت ہی نمایاں ہے۔ "راگ درپن" میں ہے کہ اس نے ایک درجن سیام ایجاد کیں (۱) ملہار سیام (۲) گورا سیام (۳) بھوپال سیام (۴) کنھیر سیام (۵) سوہو سیام (۶) رام سیام (۷) میگھ سیام (۸) بسنت سیام (۹) بیراری سیام (۱۰) سیام گووانی (۱۱) گوند سیام (۱۲) پوربی سیام۔ "راگ درپن" ہی میں ہے کہ حسین شاہ شرقی نے چار ٹوڑی بھی ایجاد کئے۔ (۱) جونپوری ٹوڑی (۲) راما ٹوڈی (۳) رسوتی ٹوڑی (۴) بہلے ٹوڑی۔ ٹوڑیوں میں اس نے کچھ راگ بھی ملائے، مثلاً جونپوری ٹوڑی میں مالسری اور موافق کو ملایا، راما ٹوڑی میں رام کلی اور مالسری کو مخلوط کیا اور رسوتی ٹوڑی میں تلنانی اور دہناسری کو ضم کیا۔

حسین شاہ شرقی کی وفات کے بعد ہندوستانی موسیقی کی قیادت گوالیار کے حکمراں راجہ مان سنگھ ٹونوار کے ہاتھ آگئی۔ فرشتہ نے اسکے قلب کی پاکیزگی کی تعریف کی ہے۔ ہندو اس کو ہندو، اور مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے۔ شاہجہانی عہد کے مورخ عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" جلد دوم (ص ۶) میں اس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کو ہندوستانی موسیقی کے تمام "دقائق" سے پوری آگاہی تھی۔ "عمل صالح" کے مصنف محمد صالح کنبوہ لاہوری نے بھی راجہ مان سنگھ کی مہارت موسیقی کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے اختراعات کا ذکر کیا ہے (عمل صالح۔ جلد دوم۔ ص ۵۸)۔ وہ گاتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ دو آدمی مل کر گا رہے ہیں۔ بشن پد اسی کی ایجاد ہے جو دھرپد کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ دھرپد میں مذہبی اور فلسفیانہ قسم کی چیزیں گائی جاتی ہیں۔ اس میں تصور کی پرواز اور خیالات کی گہرائی ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ روحانی روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ پہلے یہ سنسکرت میں گایا جاتا تھا لیکن راجہ مان سنگھ نے اس کو عام فہم بنانے کی خاطر گوالیاری یعنی ہندی میں گانا شروع کیا

اور اس کو ساز کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ اسی لئے دھرپد کی ایجاد اس کی طرف منسوب ہے، حالانکہ سنسکرت میں دھرپد اس سے پہلے بھی گایا جاتا تھا۔ "مراۃ الخیال" میں ہے کہ راجہ مان سنگھ نے دھرپد کو بھیرون راگ سے ملا کر اپنے دربار کے ایک ماہرِ فن نائک بخشو کے سامنے پیش کیا اور اس سے رائے پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ آپ نے ایک گناہ کیا۔ اس میں عشق و عاشقی کا رنگ بھر کر اس کو عام فہم تو ضرور بنا دیا، لیکن جو چیز عبادت کی تھی، وہ عشق و عاشقی کی حکایت بن گئی۔ اس طرح تن پرست اس مجاز سے لطف اندوز ہو کر حقیقت سے غافل ہو جائیں گے اور یہ فساد کا سرمایہ بن جائے گا۔ راجہ یہ سن کر شرمندہ ہوا اور بخشو نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی۔ چند نائکوں کو چھوڑ کر دھرپد ارباب نشاط ہی میں زیادہ مقبول رہا (مراۃ الخیال ص ۲۴۲)

راجہ مان سنگھ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے ہندوستانی راگ اور راگنیوں کو علٰحدہ علٰحدہ تقسیم کر کے ان کی وضاحت اور تشریح کی۔ مسلمانوں کے آنے سے موسیقی میں نئے نئے نغمے اور ٹیکنیک پیدا ہو گئے تھے۔ بہت سے راگوں کی ہیئت ہی بدل گئی تھی اور ان کی شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ اس لئے اس نے ماہرین کا ایک "کمیشن" مقرر کیا جس نے پوری تحقیقات کے بعد ایک کتاب ترتیب دی۔ اس کتاب میں نئے اور پرانے راگوں کے لئے قواعد بنائے گئے۔ اس کا نام "مان کوتوہل" ہے۔ اس میں تمام راگ اور راگنیوں کا ذکر ہے جن میں وہ راگ بھی شامل ہیں جو مسلمانوں کے اثر سے پیدا ہوئے۔ راگ راگنیوں کی یہ تقسیم شمالی ہند کی موسیقی کے ارتقا کا ایک اہم باب ہے، اس کی تفصیل آگے چل کر "راگ درپن" کے سلسلہ میں آئے گی۔

راجہ نے اپنے دربار میں ہندو مسلمان ماہروں کو جمع کر کے موسیقی کو بالکل سیکولر بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دربار میں نائک بھنو، نائک پانڈے، نائک لوہنگ اور نائک کرن کے ساتھ نائک محمود اور نائک بخشو بھی تھے۔ یہاں پر یہ واقعہ ذکر کرنے کے لائق ہے کہ نائک بخشو مسلمان تھا، لیکن راجہ مان سنگھ کا ایسا فریفتہ رہا کہ بہت سے راجاؤں نے اس کو اپنے دربار میں بلانا چاہا لیکن اس نے راجہ کی جدائی گوارا نہیں کی، یہاں تک کہ جب ابراہیم بن سکندر لودی نے گوالیار پر قبضہ کر لیا تو اسی وفاداری کی بنا پر نائک بخشو نے راجہ کے دشمن کی ہمراہی اختیار نہیں کی، بلکہ کالنجر کے راجہ کیرت سنگھ کے دربار میں چلا گیا، جہاں اس کی بڑی قدر ہوئی۔ لیکن جب سلطان بہادر گجراتی کو معلوم ہوا کہ کالنجر کے راجہ کے دربار میں فن موسیقی کا ایک بہت بڑا ماہر پہنچ گیا ہے تو اس نے نہایت نرم لہجہ میں ایک خط لکھ کر راجہ سے خواہش ظاہر کی کہ اس نادرۂ روزگار کو اس کے دربار میں بھیج دیا جائے۔ راجہ نے اس کے عوض میں بہت سامال و زر پیش کیا، لیکن یہ تمام چیزیں بے اثر ثابت ہوئیں اور نائک کو سلطان کے دربار میں جانا پڑا (بادشاہ نامہ جلد دوم۔ ص ۶) نائک بخشو نے تین راگ بھی اختراع کئے، ٹوڑی اور دیسکار کو ملا کر بہادری ایجاد کی۔ جو سلطان بہادر کے نام پر ہے، پھر کلیان اور کانہڑا میں ترمیم کر کے جو راگ ایجاد کئے، ان کے نام نائکی کلیان اور نائکی کانہڑا رکھے (راگ درپن)۔

"عمل صالح" کے مصنف محمد صالح کنبوہ نے بخشو کو "یگانۂ عصر" اور "وحید قرن" لکھا ہے (جلد دوم ص ۵۸)۔ کہا جاتا ہے کہ بخشو گاتا تو جنگلی ہرن سر جھکا کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے، اور بخشو ان کے گلے میں مالا ڈال دیتا تھا۔ تان سین کو افسوس رہا کہ بخشو سے وہ تربیت حاصل نہ کر سکا، کیونکہ وہ مر چکا تھا۔ "عمل صالح" کے مصنف نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ گوالیار کی سرزمین سے جتنے ماہرینِ موسیقی پیدا ہوئے، کہیں اور نہیں ہو سکے، اور یہ راجہ مان سنگھ ہی کا فیض تھا۔ اس کے یہاں اتنے ماہرین جمع ہو گئے تھے کہ اس نے موسیقی کا ایک اسکول کھول دیا تھا اور اس کا نام گان ودیالیہ رکھا تھا جہاں سے بڑے بڑے اربابِ کمال پیدا ہوئے۔ مغلیہ دربار میں زیادہ تر گوالیار ہی کے اصحابِ فن رہتے تھے۔

اکبر کے دربار میں جتنے گوّیے اور سازندے تھے، ان میں اکثریت گوالیار والوں ہی کی تھی۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری (ص ۱۸۳) میں اکبر کے درباری ماہرینِ فن کے حسبِ ذیل نام لکھے ہیں۔

گانے والوں کے نام:- (۱) تان سین گوالیاری (۲) باز بہادر مالوی (۳) رام داس گوالیاری (۴) سبحان خاں (۵) سرگیان خاں گوالیاری (۶) میاں چند گوالیاری (۷) بچتر خاں گوالیاری (۸) محمد خاں ڈھاڑی (۹) سلطان حافظ حسین مشہدی (۱۰) داؤد ڈھاڑی (۱۱) سرود خاں گوالیاری (۱۲) میاں لال گوالیاری (۱۳) تان ترنگ خاں (۱۴) ملا اسحٰق ڈھاڑی

(۱۵) سور داس گوالیاری (۱۶) چاند خاں (۱۷) رنگ سین آگرئی۔
(۱۸) رحمت اللہ (۱۹) حافظ خواجہ علی مشہدی (۲۰) پیرزادہ خراسانی
(۲۱) نانک چرچو گوالیاری۔

طنبورہ بجانے والوں کے نام (۱) استاد یوسف ہروی
(۲) سلطان ہاشم مشہدی (۳) استاد محمد امین (۴) استاد محمد حسین۔

دوسرے سازندوں کے نام (۱) بیر منڈل خاں گوالیاری
سرمنڈل نواز (۲) قاسم (۳) تاش بیگ قبچاقی قیبزنواز (۴) برہن خاں
بین نواز (۵) شہاب خاں گوالیاری بین نواز (۶) استاد دولت مشہدی
نے نواز (۷) بہرام قلی ہروی غیچک نواز (۸) استاد شاہ محمد سرنا نواز
(۹) شیخ داؤد ڈھاری کرنا نواز (۱۰) میر سید علی غیچک نواز (۱۱) میر
عبداللہ قانون نواز۔

ان میں انمول ہیرا تان سین تھا۔ اس نے حضرت غوثؒ گوالیاری
کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ "خزینۃ الاصفیاء" کے مصنف کا بیان
ہے کہ حضرت غوث نے اس کو اپنا خلیفہ بھی بنایا تھا۔ موسیقی کی تعلیم راجہ
مان سنگھ کے قائم کردہ گان ودیالیہ میں پائی، جہاں بڑے بڑے ارباب
کمال جمع ہو گئے تھے۔ نائک بخشو کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے
تان سین کو بخشو سے ذہنی حاصل نہ کرنے کا قلق رہا، لیکن کہا جاتا ہے کہ بخشو
نے اپنے سینہ کی ساری دولت اپنی لڑکی کو دے دی تھی، اس لئے
تان سین نے اسی سے کسب فیض کیا۔ پھر بندرابن پہونچ کر باباہری داس
سے بھی تربیت حاصل کی اور جب کمال حاصل کر لیا تو راجہ چندر بھتہ
(ریواں) کے یہاں آکر ملازمت کی۔ اکبر نے اُن کی شہرت زین خاں کو
کی زبانی سنی تو اس کو اپنے یہاں مدعو کیا، اور جس روز وہ دربار میں
آیا اسی روز اس کو دو کرور دام یعنی دو لاکھ روپے کے انعام سے
نوازا۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۳۵، مآثر الامراء جلد دوم
ص ۱۳۴) اکبر خود موسیقی کا ماہر تھا، اس لئے تان سین کی بڑی قدر کرتا
رہا۔ وہ تان سین کے ساتھ اس کے استاد باباہری داس کے پاس جاتا
جو اپنے عہد کے سب سے بڑے استاد اور بھگت سمجھے جاتے تھے۔
تان سین جب کوئی چیز ہری داس کے سامنے گاتا تو اکبر اسکو غلط طریقہ پر گانے کے لئے اشارہ
کرتا تو اسوقت تان سین کو ہری داس ٹوکتے اور خود گا کر بتانے لگتے جسکو
سن کر اکبر محظوظ ہوتا۔ تان سین نے دھرپد کے مشکل راگ کو آسان بنا کر
سوہاراسیا دکیا۔ "راگ درپن" میں ہے کہ اس نے ملہار اور کانہڑا، کانہڑا
اور کلیان، اساوری اور دیوگندھار، اور پھر کانہڑا کو دربادی کانہڑا
کلیان سے ملا کر راگنیاں پیدا کیں۔ میاں کی سارنگ اور میاں کی ٹوڑی
اسی کی طرف منسوب ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کی موسیقی کو جو
عروج حاصل ہوا، وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک زریں باب ہے۔
مشہور ہے کہ وہ جنگل میں گاتا تو چرندے اور درندے مست ہو جاتے،
یا دریا کے کنارے راگ چھیڑ دیتا تو پانی سے شعلے نکلنے لگتے۔ ابوالفضل
نے "آئین اکبری" (ص ۱۸۳) میں لکھا ہے کہ تان سین جیسا گانے والا
ہزار برس میں بھی پیدا نہ ہو سکا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اسکی وجہ سے نغمہ اور مضامین نغمہ
میں بڑی ترقی ہوئی "مآثر الامراء" (جلد دوم ص ۱۳۴) میں ہے کہ تان سین
نغمہ کے فن میں "سرآمد وقت" تھا۔ اپنی آواز کے حسن اور گانے کی نازکی،
خیال میں اس کی طرح کوئی اور نہیں گزرا "اقبال نامہ جہانگیری" اور "مآثر الامراء"
دونوں کے مصنفوں نے لکھا ہے کہ تان سین کے ہزاروں گیت ابھی
تک رائج ہیں جن میں بہت سے اکبر کے نام پر ہیں۔ حسب ذیل درباری
کانہڑا بھی غالباً تان سین ہی کی تصنیف ہے۔

شبھ دن شبھ گھڑی لگن مہورت	بیٹھے تخت آج دلی نرپت رہے
نو کھنڈ بارہ منڈ گاوت گنیں	اندر جیون برکھا موتی دان کرے رہے
اٹل کرسی بی: بیٹھے چھتر دھاری	ہیرا مونگا، چنی، پنا موتی لعل زرد رہے
چاروں جگ جیو ہمایوں کے نندن	شاہوں کے پت شاہ اکبر رہے

(بہت ہی مبارک دن، مبارک گھڑی، اور مناسب وقت ہے،
جب کہ دلی کا بادشاہ تخت پر بیٹھا ہے۔ نو گانے اور بارہ جوہر اس کے
اوصاف کی تعریف کرتے ہیں، اور بارش اس کی زندگی کے اندر موتی نچھاور
کر رہی ہے۔ راجہ چتر لگائے تخت پر بیٹھے ہیں، اور ان کے گرد ہیرا،
مونگا، چنی، پنا، موتی، لعل، زرد وغیرہ ہیں۔ جگ جگ ہمایوں کا بیٹا جیتا
رہے۔ شاہ اکبر بادشاہوں کا مالک ہے)

تان سین نے ۹۹۷ھ (مطابق ۱۵۸۹ء) میں وفات پائی۔ گوالیار
میں اس کا مزار حضرت غوث گوالیاری کے مقبرہ میں ہے۔ اس کے مزار پر
نیم کا ایک درخت ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ گانے والے

اس کی پتیاں کھالیتے ہیں تو ان کی آواز پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے۔ تان سین کے تین بیٹے بلاس خاں، صورت سین، اور تان ترنگ خاں تھے۔ ان تینوں نے موسیقی وراثت میں پائی۔ اکبری دربار کے مذکورہ بالا گویوں کی فہرست میں تان ترنگ خاں کا بھی نام ہے۔ بلاس خاں نے ایک ٹوڑی بھی ایجاد کی، جس کا نام بلاس خانی ٹوڑی ہوا۔

اکبری دربار کا دوسرا ماہر فن سلطان باز بہادر تھا۔ وہ مالوہ کا حکمراں تھا، لیکن مالوہ پر اکبر کی لشکر کشی کے بعد شاہی دربار سے وابستہ ہو گیا۔ ابوالفضل نے "آئین اکبری" (ص ۱۸۳) میں لکھا ہے کہ گانے میں اس کی مثال نہ تھی۔ اس کے گانے کی طرز باز خانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ روپ متی سے اس کا عشق مشہور رہا ہے۔ اس عشق نے اس کے نغموں میں کیف، سوز اور درد عطا کیا۔ آئین اکبری میں تو صرف اس کے گانے کی تعریف ہے، لیکن وہ ساز و آہنگ دونوں کا ماہر تھا۔ مالوہ میں اس کے دوہے اب تک گائے جاتے ہیں۔

رام داس بھی اکبر کے دربار کے ممتاز ترین گویّوں میں تھا۔ وہ ملہار گانے میں کمال رکھتا تھا، اس لئے اس کی طرز کے گائے ہوئے ملہار کا نام رام داسی ملہار ہو گیا۔ اس کا لڑکا سور داس بھی اکبر کے دربار میں تھا، اور اس کی ملہار کا نام سور داسی ملہار پڑ گیا۔ وہ اپنے گرو ولبھ اچاری کے سامنے بھگوت گیتا شروع سے آخر تک گا کر سناتا۔

اکبری دربار کے مذکورہ بالا موسیقاروں میں سبحان خاں کے متعلق روایت کی جاتی ہے کہ وہ جب گاتا تو لوگ آبدیدہ ہو جاتے۔ اکبر کے سامنے ایک بار اس نے دیپک راگ گایا، تو اس کے تمام بدن پر آبلے پڑ گئے تھے۔ پھر وہ حج کے لئے چلا گیا جہاں اس کے نعتیہ گانوں کی بڑی دھوم مچی۔

اکبر خود موسیقی کا بڑا ماہر فن تھا۔ ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں لکھا ہے کہ وہ اکثر استادوں سے بہتر تھا۔ اس کو راگنیوں میں جلال شاہی، نوروز اور کرگت بہت پسند تھے۔ اسی کی وجہ سے بہت سے ایرانی راگ ہندوستانی اسٹائل میں گائے جاتے تھے۔ اس کے دربار میں ہرات، مشہد اور خراسان کے ماہرین فن تھے۔

لیکن مذکورہ بالا فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ دربار میں ہندوستان ہی کے موسیقار چھا گئے تھے۔ ان کی سات ٹولیاں تھیں۔ ہر ٹولی ہر روز اپنا فن دکھایا کرتی تھی (آئین اکبری، ص ۱۸۳)۔

اکبری دور میں ابوالفضل نے ہندوستانی موسیقی کا گہرا نظری اور فنی مطالعہ بھی کیا۔ ہندوستانی موسیقی میں تین اہم چیزیں ہوتی ہیں: سُر، دُھن اور راگ۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں سنگیت کے عنوان سے جو تفصیل لکھی ہے، اس میں ان کی اقسام بتائی ہیں۔ جو آوازیں موسیقی میں کام آتی ہیں، ان کو سُر کہتے ہیں۔ ابوالفضل نے سُر کی کئی قسمیں بتائی ہیں مثلاً۔

کھرج :- اس کو مور کی آواز سے لیا گیا ہے۔
رکھب :- " " پپیہا " " " " "
گندھار :- " " بکری " " " " "
مدھم :- " " کلنگ " " " " "
پنچم :- " " کوئل " " " " "
دھیوت :- " " مینڈک " " " " "
نکھاد :- " " ہاتھی " " " " "

اسی طرح دُھن کی کئی قسموں کا ذکر ہے، مثلاً سری راگ، بسنت (یا مالکوس)، بھیرو، پنچم (یا ہنڈول)، میگھ (یا دیپک) نٹ نرائن۔ ان میں سے ہر ایک کو راگ کہا جاتا ہے۔ راگ سُروں کی اس خاص ترتیب کو کہا جاتا ہے جو کانوں کو اچھے معلوم ہوں اور جن میں کم سے کم پانچ سُر ضرور استعمال کئے جاتے ہوں۔ راگ کی بھی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں اور ہر راگ کی علیحدہ علیحدہ شاخوں کا بھی ذکر ہے، مثلاً

(۱) سری راگ :- مالوی، ترونی، گوری، کیداری، مدھ مادوی، بہاری۔

(۲) بسنت (یا مالکوس) :- دیسی، دیوگری، بیراٹی، ٹوری، للتا، ہندولی۔

(۳) بھیرو :- مدھما، بھیروی، بنگالی، براٹکا، سندوی، خیر گیا۔

(۴) پنچم (یا ہنڈول) :- ببھاس، بھوپالی، بدہنسکا، مالسری، پٹ منجری۔

(۵) ہنگھہ (یا دیپک) :۔ ملہار، سورٹھی، اساوری، کیسکی، گندھاری، سرسنگاری۔

(۶) نٹ نرائن :۔ کامودی، کلیان، اہیری، سدہ ناٹ، سالک، نٹ، ہمیر۔

ابو الفضل کا بیان ہے کہ ہر راگ دو طرح سے گایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک مارگ اور دوسرا دیسی کہلاتا ہے۔ مارگ دیوتاؤں کے لئے گایا جاتا ہے اور اس مقدس راگ میں ہر جگہ یکسانیت ہے لیکن دیسی میں مقامی اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً دھرپد دیسی راگ ہے۔ یہ چار مسجع فقروں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ الفاظ اور حروف میں یکسانیت یعنی قافیہ بندی لازمی نہیں ہوتی۔ اس میں عشق کی نیرنگیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ دکن میں گایا جاتا ہے تو اس کو چند کہتے ہیں۔ یہاں یہ تین یا چار فقروں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ تر تعریف کی جاتی ہے۔ تلنگی اور کرناٹک میں اس کو دھرو کہتے ہیں۔ اس میں نازونیاز ہوتا ہے۔ بنگالہ میں جو گایا جاتا ہے اس کو بنگلا کہتے ہیں اور جونپور میں جو گایا جاتا ہے اس کو چٹکلا کہتے ہیں اور دہلی میں جو گایا جاتا ہے اس کو قول یا ترانہ کہتے ہیں۔ اس کو امیر خسرو نے سامت اور ستار کے ساتھ ہندی فارسی طرز اور راگ کو مخلوط کر کے ایجاد کیا ہے۔ اور متھرا میں جو گایا جاتا ہے اُسے بشن پد کہتے ہیں۔ اس کے چار چھ اور آٹھ فقرے ہندی کے ہوتے ہیں۔ اس میں سری کشن کی تعریف کی جاتی ہے اور جو سندھ میں گائے ہیں اس کا نام کافی ہے۔ اس میں مہر و محبت کی باتیں ہوتی ہیں۔ اور جو زبان ترہت میں گاتے ہیں اسے لہچاری کہتے ہیں۔ یہ بندیا کی ایجاد ہے جس میں وفور عشق کا اظہار ہوتا ہے۔ اور جو لاہور اور اس کے نواح میں گایا جاتا ہے، اسے چھند کہتے ہیں۔ اور جو گجرات میں گاتے ہیں، اس کا نام جکری ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی طرزیں جن کے نام یہ ہیں :۔ سارنگ، پوربی، دھناسری، سام کلی، کراتی، سوہو، دیسکال، دیساک۔ ابو الفضل نے الاپ کی دو قسمیں بتائی ہیں (۱) راگ الاپ (۲) روپ الاپ۔ راگ الاپ میں ان سروں میں تان لی جاتی ہے جو اس وقت گایا جا رہا ہو۔ روپ الاپ میں جس گیت کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ اسی تان میں گایا جاتا ہے۔

ابو الفضل نے تان کی بھی قسمیں بتائی ہیں (۱) میدنی (۲) سندنی (۳) دیسنی (۴) بھادنی (۵) تارادلی وغیرہ۔ ان میں سے بعض راگ اور راگنیوں کے خاص خاص وقت مقرر ہوتے، مثلاً کلیان اور پوربی شام کو، اساوری دوپہر کو، ٹوڑی دن کے دوسرے پہر کو، کیدارا رات کو، مالکوس دن کے تیسرے پہر کو گایا جاتا۔ اکبر کے عہد میں گوالیار کے رہنے والے دو بھائی تھے، چاند خاں اور سورج خاں۔ کہا جاتا ہے کہ چاند خاں صرف رات کے اور سورج خاں صرف دن کے راگ راگنیاں گاتا۔

ابو الفضل نے ان باجوں کی بھی تفصیل لکھی ہے جو گانوں کے ساتھ بجائے جاتے تھے مثلاً (۱) جنتر ۔ اسے ایک گز کھوکھلی لکڑی سے بناتے اس کے دونوں سروں پر دو کدو لگاتے، اس کے سر پر لکڑی کی سولہ کھونٹیاں لگا کر اس میں پانچ لوہے کے تار لگا دیتے، اور ان تاروں کو دوسرے سرے تک لے جا کر مضبوط باندھ دیتے، اور آواز کی پستی اور بلندی اور مختلف سُروں کے لئے اس کے اطراف میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لکڑی باندھ دیتے۔ (۲) بین۔ یہ جنتر کے مانند ہوتی لیکن اس میں تین تار ہوتے۔ (۳) کنر، یہ بین کے مانند تھا لیکن اس کی لکڑی اس سے زیادہ کچھ لمبی ہوتی اور اس میں تین کدو اور دو تار ہوتے۔ (۴) سربین یہ بھی بین کی طرح ہوتا، مگر اس میں لکڑی کے ٹکڑے نہ ہوتے (۵) انبرتی، اس کی لکڑی سربین سے بہت چھوٹی ہوتی اور نیچے کی طرف کا کدو اوپر ہوتا اور ایک لوہے کا تار ہوتا اور تمام پردے ویسے ہی ہوتے۔ (۶) رباب۔ اس میں تانت کے چھ کبھی بارہ اور کبھی سولہ تار باندھے جاتے۔ (۷) سرمنڈل۔ یہ قانون کی طرح ہوتا، اس میں اکیس تار ہوتے جن میں بعض لوہے، بعض پیتل اور بعض تانت کے ہوتے۔ (۸) سارنگی ۔ یہ رباب سے چھوٹی ہوتی اور غیچک کی طرح بجائی جاتی۔ (۹) پناک۔ یہ کمان کے برابر لمبی ہوتی۔ اسمیں ایک لکڑی کو تھوڑا سا خم دے کر تانت سے باندھ دیتے اور دو لکڑی کے پیالے دونوں طرف الٹ کر رکھتے اور غیچک کی طرح بجاتے۔ (۱۰) ادہٹی۔ اس میں دو کدو اور دو تار ہوتے۔ (۱۱) کنگرہ۔ بین کی طرح ہوتا لیکن اس کے دو تار تانت کے ہوتے اور اس کے کدو اس سے چھوٹے ہوتے۔ (۱۲) پکھاوج۔ اس پر کھال منڈھی ہوتی اور اس کے چاروں

طرف تسمہ ڈال کر نقارہ کی طرح کھینچتے' اور لکڑی کے چھوٹے بڑے چار ٹکڑوں سے دونوں ہاتھوں سے بجاتے۔ اس کی آوازیں کمی زیادتی تسموں کو پیچ دینے سے پیدا ہوتی۔ آوج' دہل' ڈھڈہ' اردہاوج' خنجری' یہ سب ڈھول اور مجیرے کی قسمیں ہیں۔

ابوالفضل نے اس عہد کے گانے والوں کی بھی قسمیں بتائی ہیں مثلاً (۱) کلاونت یا کلاونت جو زیادہ تر دھرپد گایا کرتے تھے (۲) دھاڑی (ڈھاڑی) پنجابی گانے والوں کو کہتے یہ ڈھڈہ اور کنگرہ بجا کر گاتے۔ قوال بھی اسی طبقہ سے تھے' جو دہلی اور جونپور کی طرز پر گاتے تھے' اور فارسی اشعار بھی پڑھتے تھے (۳) ہڑوکیہ۔ مرد ہرک باجہ جس کو اوج کہتے ہیں بجاتے تھے اور عورتیں تال دیتی تھیں اور گاتی بھی جاتی تھیں۔ پہلے یہ طبقہ کرک گاتا تھا اور اب دھرپد گانے لگا۔ (۴) دف زن۔ عورتوں کی ایک جماعت تھی جو شادی اور ولادت کے موقع پر آکر دھرپد اور سوہلہ گاتی تھی۔ ۵) سیزدہ تالی۔ اس جماعت میں مرد بڑے اور چھوٹے دف ساتھ رکھتے تھے اور عورتیں تیرہ تال یعنی پیتل کی کٹوریوں کو ایک ساتھ بجا کر آواز پیدا کرتی تھیں۔ دو کٹوریاں ہاتھ کے بند' دو کہنیوں کے بند' دو شانوں کے بند' دو مونڈھوں کے بند' تین سینے اور دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں پر باندھتی تھیں۔ یہ جماعت زیادہ تر گجرات اور مالوہ میں پائی جاتی۔ (۶) نٹوہ' یہ قسم قسم کے ناچ ناچتے اور گاتے بھی جاتے تھے'۔ نغمہ کے ساتھ پکھاوج' رباب اور مجیرہ بجاتے تھے۔ (۷) کیرتنیہ۔ ہندوؤں کی پوجا کے وقت یہ جماعت گاتی۔ لڑکوں کو عورتوں کا لباس پہنایا جاتا اور کرشن کی تعریف میں تماشہ دکھایا جاتا۔ اس میں پکھاوج' رباب اور مجیرہ استعمال ہوتا (۸) بھگتیہ طرح طرح کے بہروپ بھرتے اور رات کو گا بجا کر کھیل دکھاتے (۹) بہنویہ۔ یہ گروہ پیتل کی تھالی میں ناچتا اور گاتا (۱۰) خنجری کے ساتھ مرد پکھاوج' رباب' اور مجیرہ بجاتے اور عورتیں گاتیں اور ناچتیں۔ (باقی آیندہ)

✡

ادبی تاریخ

(بسلسلہ صفحہ ۴۳)

لیکن ان کا مقصد یہ نہیں ہوگا کہ کو دوسرے سے بالکل قطع کر دیا جائے کیوں کہ اس طرح فرضی تقسیم کے پردے میں فرضی خصوصیات بھی تلاش کرنی پڑیں گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو ممتاز کرنے والی خصوصیات دکھائی دیں انھیں نظر انداز کر دیا جائے بلکہ ان کو گہری نظر سے دیکھا جائے کہ کہیں وہ محض جدت برائے جدت کی حیثیت تو نہیں رکھتیں اور پہلی ہی خصوصیات کی بدلی ہوئی شکلیں تو نہیں ہیں۔ بہر حال ادبی تاریخ لکھنے والے حقائق کے بہت بڑے ذخیرے کی بنیاد پر ہی ادبی ارتقا کی ایک ایسی داستان پیش کر سکتے ہیں جو بیک وقت ادب کے ظاہر و باطن تک پہونچا سکے اس طرح قومی تہذیب کا ارتقا ادب کے آئینے میں منعکس ہوگا اور ادب قومی تہذیب کے آئینے میں اپنا جلوہ دکھائے گی۔

غزل

ذوالنورین

اِک نیا گلشنِ ہستی میں نظام آتا ہے
مژدہ باد اہلِ جہاں دورِ عوام آتا ہے

عقل اور ہوش سے کچھ کارِ جہاں بن نہ سکا
راہِ ہستی میں دل زار ہی کام آتا ہے

گونجنے لگتی ہے جب دار و رسن کی آواز
منظرِ عام پہ اِک حق کا اِمام آتا ہے

فرصتِ چند نفس اور ابھی دست اجل
آج پُرسش کو وہ آہستہ خرام آتا ہے

مُدتوں صورتِ پروانہ جگر جلتا ہے
تب کہیں آہ میں یہ سوزِ دوام آتا ہے

راہِ منزل میں کسے عذرِ شکستہ پائی
مژدہ اے عزم کہ دشوار مقام آتا ہے

ظلمتِ وہم سے اس طرح گذرتا ہے یقیں
ابر میں جیسے نظر ماہِ تمام آتا ہے

راستے کے تھکے ہاروں کو سناؤ مژدہ
آخرش فصلِ بہاراں کا پیام آتا ہے

آزادی اور منصوبہ بندی

عشرت علی صدیقی

ہندستان کی سیاسی آزادی کی لڑائی کو ختم ہوئے بارہ برس بیت چکے ہیں۔ تقریباً اتنی ہی مدت معاشی آزادی کی جد و جہد کے آغاز کو ہوئی ہے اور ان دونوں کے حالات اور اتار چڑھاؤ ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ سیاسی آزادی کی لڑائی میں ایک منزل ایسی آگئی تھی جب 'بزرگوں' کا طبقہ جد و جہد کے روایتی طریقوں سے جو درخواستیں دینے تک محدود تھا آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا۔ مگر نوجوانوں کے طبقے میں، جسے بعض 'بزرگوں' کی تائید بھی حاصل تھی، جوش نسبتاً زیادہ تھا۔ یہ لوگ نسبتاً زیادہ دور تک دیکھ سکتے تھے اور نسبتاً زیادہ بڑا خطرہ مول لے سکتے تھے۔ وہ کوتاہ دستی والی محرومی پسند نہیں کرتے تھے اور انھوں نے آگے بڑھ کر آزادی کی لڑائی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ کچھ 'بزرگ' اپنے چھوٹوں کی اس ہمت اور حوصلے پر خوش ہوئے اور ان کے ساتھ ہو لئے۔ کچھ بددل ہو کر الگ بیٹھ گئے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو مخالف صف میں چلے گئے یا اپنے طور پر مخالفت کرنے اور رکاوٹ ڈالنے لگے۔ ان کو کامیابی نہ ہونا تھی نہ ہوئی اور ان کی مخالفت نیز نوجوان طبقہ کی بعض غلطیوں کے باوجود آزادی کی لڑائی چلتی رہی اور آخرکار ملک آزاد ہو گیا۔

کم و بیش یہی کیفیت سیاسی آزادی کے بعد شروع ہونے والی معاشی آزادی کی جد و جہد میں نظر آتی ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء کی طرح اس سے پہلے اور بعد میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو پرانے ڈھرّے پر چلنا چاہتا تھا۔ کچھ کو اس میں اپنا فائدہ نظر آتا تھا، کچھ کو کوئی دوسرا راستہ نہیں دکھائی دیتا تھا، اور کچھ ہر نئی بات سے ڈرتے یا بھڑکتے تھے۔ لیکن سیاسی آزادی کی جنگ کے آخری دور میں ہندستانی رہنما سوچنے لگے تھے کہ آزادی کے بعد کیا کرنا ہے۔ اس کے لئے جواہر لال جی کی رہنمائی میں ایک قومی منصوبہ بندی کمیٹی بنا دی گئی تھی۔ ویسے گاندھی جی کھادی اور دیہی صنعتوں کی ترقی کے لئے بھی کوشش کر رہے تھے، جس کی بنیاد جسمانی محنت کی اولیت اور لامرکزیت پر تھی۔ اس طرح آزادی سے پہلے منصوبہ بندی کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ آزادی کے بعد اسی کام کو آگے بڑھایا گیا۔ اس کی وسعت اور اس کی رفتار برابر بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی نوعیت میں سوشلسٹ رنگت نکھرتی آ رہی ہے۔ معاشی آزادی کی جد و جہد کو نہ صرف یہ کہ عوام کی زبردست اکثریت کی تائید حاصل ہے بلکہ عوام اس جد و جہد میں حصہ بھی لے رہے ہیں۔ مادی ترقیات لوگوں کو متاثر کر رہی ہیں اور ایک نفسیاتی انقلاب کے آثار صاف دکھائی دے رہے ہیں۔

کچھ لوگوں میں اس ترقی سے دہشت اور مستقبل پر شک بھی پایا جاتا ہے۔ مگر سیاسی آزادی سے بھی تو کچھ لوگ ڈرتے تھے اور آزادی کی جد و جہد کی کامیابی کی طرف سے مشکوک تھے۔ ایسے شکوک اور ان کے اظہار کے باوجود منصوبہ بند ترقی کا کام جاری ہے اور اگرچہ تفصیلات پر اختلاف کوئی ناقابل برداشت بات نہیں ہے پھر بھی منصوبے کی

[illegible] سے نہیں کی گئی ہے اور یہ بات بہت ہی [illegible]

[illegible] منصوبہ ۔ سیاسی آزادی اپنے ساتھ بہت سے مسئلے [illegible] کی وجہ سے معاشی منصوبہ بندی پر فوراً ہی توجہ نہیں دی [illegible] تقسیم کے عمل سے ملک کا معاشی ڈھانچہ بگڑ گیا تھا۔ داخلی امن [illegible] قیام اور استحکام ایک فوری مسئلہ بنا ہوا تھا اس کے علاوہ ہندستان اور پاکستان میں لاکھوں انسان ایک طرف سے دوسری طرف آجا رہے تھے۔ ہندستان میں آنے والوں کی امداد و بحالی ایک بہت بڑا مسئلہ تھا اور پھر سو سے اوپر ہندستانی ریاستیں اُن چھوٹی بڑی بے لگام بہنے والی ندیوں کی مانند تھیں جو کسی وقت بھی ترقی کا راستہ روک سکتی تھیں۔ ان کو قومی دھارے میں ملانا اور ملکی مفاد سے ہم آہنگ بنانا تھا۔

معاشی حالات بھی خاصے ابتر تھے۔ آزادی سے پہلے جنگ کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو روزگار کے مواقع تو مل گئے تھے مگر یہ خوش حالی عارضی تھی۔ صنعت و حرفت میں کوئی بنیادی ترقی نہیں ہو سکی تھی۔ زراعت ملک کا سب سے بڑا پیشہ تھا مگر غلہ کے لئے ہندستان باہر کا محتاج تھا۔ صنعتوں کے لئے نہ صرف مشینوں بلکہ کچے مال کی بھی کمی تھی۔ جون ۱۹۵۰ء میں کوریا کی جنگ نے درآمد برآمد کو دشوار کر دیا تھا اور ۱۹۵۰-۵۱ء میں ملک کے مختلف حصوں میں اناج کی فصل خراب ہو جانے سے حالات اور بدتر ہو گئے تھے۔ مگر اس اثنا میں اندرونی امن کی طرف سے کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا۔ ریاستوں کے مسئلے کو حل کرنے کی کوششیں بار آور ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس طرح معاشی معاملات پر کسی قدر یکسوئی کے ساتھ توجہ دی جا سکی اور تعمیر و ترقی کے جو کام شروع ہو چکے تھے یا مستقبل قریب میں شروع ہونے والے تھے ان کو ایک مربوط سلسلے میں اور ایک خاص نقطۂ نظر سے جوڑ کر پہلا پنج سالہ منصوبہ مرتب کیا گیا۔

منصوبہ کے دو خاص مقصد تھے۔ ایک یہ کہ ملک کی دیرینہ معاشی پسماندگی، جنگ اور ملک کی تقسیم کے اثرات کی وجہ سے معاشی نظام میں جو عدم توازن پایا جاتا تھا اسے دور کیا جائے اور اس کے لئے غذا کی قلت کو جلد سے جلد دور کر دینا بہت ضروری تھا۔ دوسرے یہ کہ متوازن ترقی کے لئے میدان ہموار کیا جائے۔ اس طرح حکومت کی ذمہ داری اب یہیں تک محدود نہیں رہ گئی کہ ملک کی گاڑی جس ڈگر پہ چل رہی ہے اسی ڈگر پر اسی رفتار سے چلتی رہے۔ اس ذمہ داری میں معاشی اور سماجی ڈھانچے کو ترقی پذیر اور عوام دوست انداز میں اور دستور کی روح کے مطابق جمہوری طریقے پر بدلنے کی بات بھی شامل ہو گئی۔ منصوبہ صرف اس لئے نہیں بنایا گیا تھا کہ دولت کی پیداوار بڑھ جائے۔ اس کی غرض یہ بھی تھی کہ دولت کی تقسیم آہستہ آہستہ درست ہو جائے۔ مقصد صرف ترقی کا سامان فراہم کرنا نہیں بلکہ ترقی کی اُمنگ پیدا کرنا بھی تھا۔

ترقی کا سفر۔ ترقی کے جو نشانے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک کے لئے رکھے گئے تھے وہ سب تو پورے نہیں ہو سکے مگر قومی آمدنی میں کوئی ساڑھے سترہ فی صدی کا اور فی کس آمدنی کے اوسط میں تقریباً ساڑھے دس فی صدی کا اضافہ ہو گیا۔ زرعی ترقی کا جسے پہلے منصوبے میں پہلی جگہ دی گئی تھی اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ زرعی پیداوار میں ساڑھے چودہ فی صدی سے زائد کا خالص اضافہ ہو گیا۔ اسی طرح کان کنی، مصنوعات اور چھوٹے کاروبار کی پیداوار اٹھارہ فی صدی سے اوپر بڑھ گئی۔ تجارت، ذرائع نقل و حمل اور رسل و رسائل میں بھی قریب قریب اتنی ہی ترقی ہوئی اور دوسری خدمات میں ساڑھے ۲۳ فی صدی سے زیادہ اضافہ ہوا۔ عوام کی زندگی پر منصوبے کا جو اثر پڑا اس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ غذائی اجناس کے فی کس خرچ کا اوسط جو ۱۹۵۰-۵۱ء میں ساڑھے بارہ آونس کے قریب تھا ۱۹۵۵-۵۶ء میں ساڑھے چودہ آونس کے قریب ہو گیا۔ شکر کے معاملے میں یہ اوسط کچھ کم آدھے آونس سے بڑھ کر کچھ اوپر ساڑھے چھ آونس ہو گیا۔ کپڑے کا خرچ منصوبے سے فوراً پہلے اوسطاً ساڑھے نو گز فی کس تھا اور منصوبے کے آخر تک یہ ساڑھے سولہ گز کے قریب ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ لالٹینوں، سائیکلوں، سلائی کی مشینوں، بجلی کے سامان اور ریڈیو وغیرہ کی کھپت بھی پہلے سے بڑھ گئی۔

یہ حقائق اس بات کا ثبوت ہیں کہ منصوبے سے قوم کو فائدہ ہوا اور ملک نے ترقی کی۔ بلاشبہ ملک کی وسعت آبادی کی کثرت اور پسماندگی کی شدت کو دیکھتے ہوئے ترقی کی رفتار سست رہی لیکن رفتار کے سست یا تیز ہونے کا اندازہ محض ضرورتوں کو سامنے رکھ کر کرنا درست نہیں ہوگا۔ ترقی کے ذرائع کو بھی جو بہت ہی محدود تھے

[illegible] تک [illegible] ترقی کے [illegible] یا [illegible] کسی ایک بات سے نہیں ہو سکتا [illegible] کسی ایک منصوبے کی مدت کو دیکھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک آگے بڑھ رہا ہے یا نہیں۔ اس طرح اگرچہ بے روزگاری اور کم روزگاری کے مسئلے پہلے منصوبے میں خاطر خواہ حد تک حل نہیں ہو سکے تاہم ایسے کئی کام شروع ہو گئے جن سے روزگار کے مواقع آگے چل کر بڑھ سکتے تھے۔ دوسرے منصوبے میں ایسے کام اور زیادہ تعداد میں شروع کئے گئے ہیں جن کے اثرات آگے چل کر ظاہر ہوں گے۔ اور روزگار کے سلسلے میں ایک خاص بات ۱۹۵۶ء میں یہ دیکھی گئی کہ تربیت یافتہ کاریگروں کی مانگ ان کی قابل حصول تعداد سے زیادہ تھی۔ اس سے ترقی کے ایک نئے رخ کی نشان دہی ہوتی تھی جو دوسرے منصوبے میں اور زیادہ نمایاں ہو گیا۔

سوشلسٹ نمونے کا سماج ۔ ایسی ہی ایک اور بات منصوبہ سازوں کا یہ احساس تھا کہ پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ پیداواری اہمیت میں اضافہ اور سماجی انصاف کے تقاضے نیز عوام کی جمہوری تمنائیں پوری کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سماجی نابرابری دور کرنے اور عوام کو ترقیاتی سرگرمیوں کے تماشائی کے بجائے حصہ دار بنانے کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ اسی احساس کے تحت کمیونٹی پروجیکٹ یا اجتماعی ترقی کی اسکیم شروع کی گئی، قبضۂ آراضی کے نظام میں اصلاحات کی گئیں، مختلف شعبوں میں امداد باہمی یا کوآپریٹیو ادارے بنائے گئے اور دسمبر ۱۹۵۴ء میں پارلیمنٹ نے ایک رزولیوشن کے ذریعے طے کر دیا کہ ہندستان کی معاشی اور سماجی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ ایک سوشلسٹ نمونے کا سماج قائم کیا جائے۔

ایسے سماج کی تعمیر کا مطلب یہ ہے کہ آبادی کے بڑے سے بڑے حصے کے زیادہ سے زیادہ فائدے کا بندوبست کیا جائے۔ اور اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ معاشی نظام میں عوام کے مفاد کے امین اور محافظ کی حیثیت سے حکومت کا دخل بڑھ جائے۔ حالانکہ پہلے منصوبے کے دوران غذائی پیداوار بڑھ جانے کی وجہ سے کنٹرول اٹھا لئے گئے اور سرمایہ کاری کی رفتار نسبتاً سست ہونے کی وجہ سے حکومت کی کسی بڑی مداخلت کے بغیر ہی کام چلتا رہا مگر حکومت کے لئے بے تعلق

بنیا [illegible] ہو گیا تھا۔ البتہ چونکہ ہندستان کا سوشلزم جمہوری [illegible] کا ہے اس لئے معاشی نظام سے حکومت کا تعلق کلی طور پر [illegible] نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔

اس تعلق کے تعددی [illegible] پہلے منصوبے کے آخر اور دوسرے منصوبے کے شروع میں ابھرنے لگے۔ ان کی ایک جھلک حکومت ہند کے صنعتی پالیسی سے متعلق اس رزولیوشن میں ملتی ہے جو ۳۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو شائع ہوا تھا اور جسے دوسرے منصوبے کا ایک بنیادی جزو کہا [illegible] اس رزولیوشن کا محرک سوشلسٹ نمونے والے سماج کی تعمیر کا فیصلہ تھا۔ فیصلے کی پابندی کے لئے یہ ضروری تھا کہ زراعت کے ساتھ صنعت و حرفت اور اندرونی و بیرونی تجارت کی بھی تیز ترقی ہو۔ عام [illegible] والی اشیاء اور کسانوں کے کام میں آنے والے آلات کے علاوہ بڑی بڑی مشینیں بھی جو ابھی باہر سے آتی ہیں ملک کے اندر ہی تیار کی جانے لگیں، آمدنیوں کا فرق کم کیا جائے اور روزگار کے مواقع بڑھائے جائیں۔ یہ مقاصد محض رزولیوشن یا قانون پاس کر دینے یا دا [illegible] ترغیب یا دفتر سے نہیں حاصل ہو سکتے تھے۔ ان کے حصول کے لئے حکومت کے لئے عملی اقدامات کرنا ضروری تھا۔ اور اس سلسلے کے بعض اقدامات کا خاکہ صنعتی پالیسی والے رزولیوشن میں پیش کیا گیا تھا۔

قومی ملکیت اور نجی ملکیت ۔ اس رزولیوشن میں بعض صنعتیں تمام تر سرکاری یا قومی ملکیت کے حلقے میں رکھی گئی تھیں۔ بعض میں حکومت [illegible] مالکوں دونوں کا دخل رکھا گیا اور ان کی ترقی کے لئے [illegible] امداد بھی حاصل کر سکتے تھے، اور باقی کے لئے کہا گیا تھا کہ وہ عام طور پر نجی ملکیت کے حلقے میں رہیں گی۔ البتہ انھیں مملکت کی سماجی اور معاشی پالیسی سے مطابقت رکھنا پڑے گی اور وہ حکومت کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط کی پابند ہوں گی۔ یہ تقسیم آہنی نہیں تھی مگر اس کی پشت پر جو پالیسی تھی وہ مستحکم اور واضح تھی۔ کلیدی اور بنیادی صنعتیں نجی سرمایہ اور پونجی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑی جا سکتی تھیں اور منافع کے ایک محرک تسلیم کرنے جانے کے باوجود اسے معاشی نظام کا ایسا محور نہیں بنایا جا سکتا تھا جس پر کوئی روک نہ لگائی جا سکے، چاہے اس کا رخ یا رفتار ملک و قوم کے حق میں کتنی ہی مضر ہو۔ ملک کے مالی اور فنی ذرائع محدود ہونے کی وجہ سے

ان کے استعمال میں احتیاط اور کفایت بہت ضروری تھی۔ اور اگر نجی ملکیت والے طبقے کو اپنے حدود میں بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تو صنعتوں کے قیام کا معیار عوام کی فلاح سے زیادہ کارخانہ دار کا منافع ہوتا۔ کم شرح پر منافع دینے والی صنعتیں عوام کے لئے چاہے جتنی ضروری ہوتیں مگر ان کا قیام دشوار بلکہ شاید ناممکن ہوتا اور جن کاموں کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ان میں کے بعض ترکے پڑے رہتے۔

بھاری صنعتوں کے معاملے میں حکومت کی مداخلت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ دوسرے منصوبے کے ختم ہونے سے پہلے فولاد کے تین قومی ملکیت والے کارخانے اپنا مال بازار میں بھیجنے لگیں گے جبکہ ملکیت میں آزادی کے پہلے سے لے کر اب تک کل دو کارخانے قائم ہو سکے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ان دونوں کی توسیع میں بھی امداد دی جا رہی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی پالیسی میں نجی ملکیت کے خلاف کوئی خواہ مخواہ کا تعصب نہیں ہے۔ فولاد کے فلک بوس کارخانوں کے علاوہ بھاکڑہ ننگل، ہیراکڈ، تنگ بھدرا اور دوسرے دیو قامت باندھ اور ہا ٹڑا اور دوسرے مقامات پر غلہ کے موسم بند اور بہت بلند گوداموں کی تعمیر، صنعت و حرفت اور سائنس و صحت سے متعلق لکھنؤ، رڑکی اور دوسرے شہروں میں (۲ تو ؟) لیبارٹریوں کے قیام، اور اسی طرح کے دوسرے کاموں مثلاً کیمیاوی کھاد کے بندوبست اور تیل کی تلاش وغیرہ کے لئے جس بھاری رقم اور وسیع تنظیم کی ضرورت تھی اس کا ہندوستان جیسے پسماندہ ملک میں نجی طور پر بندوبست ہونا ناممکن تھا ــــ خاص کر ایسی حالت میں کہ جب ان چیزوں سے سردست کسی منافع کی توقع نہیں تھی۔

اس طرح موجودہ منصوبہ بندی اور صنعتی پالیسی کسی تعصب، کٹرپن یا بے جان نظریے کی نہیں بلکہ ترقی کے تقاضوں کی پیداوار ہے۔ کسی ملک کی ترقی محض ایک ہی پہلو تک محدود نہیں رہ سکتی اور جب بعض مخصوص صنعتوں کی اہمیت کے پیش نظر ماہرین اور سرمایہ کو ان پر مرکوز کرنا ضروری ہے تو یہ بھی ضروری ہوگا کہ دوسری صنعتوں کو من مانے طور پر پھیلنے سے روکا جائے ورنہ سرمایہ اور مہارت جن کے ذرائع بہت ہی محدود ہیں ضائع ہوں گے اور جس چمن کی آبیاری کی جا رہی ہے وہ جنگل بن جائے گا۔

محرکات اور مقاصد۔ چمن اچھا تبھی ہوگا جب اس میں رنگ رنگ کے پودے اور طرح طرح کے پھول ہوں اور ان سب کی دیکھ ریکھ یکساں طریقے سے کی جائے۔ آزادی سے پہلے حکومت کی سرپرستی صرف اوپری طبقے تک محدود تھی اور ملک کی بیشتر آبادی کی طرف سے حکومت بے پروا تھی لیکن آزادی کے بعد بننے والی قومی اور عوامی حکومت ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ترقی کو ہمہ گیر بنانا اور ترقی کے پھل عوام تک پہنچانا اس کا فرض تھا۔ اور اس فرض کو پورا کرنے کے لئے اسے معاشی اور سماجی میدانوں میں جو اصلاحی اور انقلابی اقدامات کرنا تھے ان کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی بسرمایہ کے بعض سوتے ایسے تھے جو عوام کی کوشش سے بنے تھے مگر ان کا پانی تمام تر نجی باغیچوں میں جا رہا تھا جن کے دروازے عوام پر بند تھے اور اس پانی کا پوری طرح سے صحیح استعمال بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے زندگی کے بیمہ کے کاروبار کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور امپیریل بنک اسٹیٹ بنک بن گیا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے اقدامات جن میں ٹیکس کی پالیسی بھی شامل ہے، شاید بعض لوگوں کو کھلے ہوں یا آگے چل کر کھلیں مگر ان کے متعلق کوئی متوازن رائے قائم کرنے کے لئے ان کے محرکات اور مقاصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

منصوبہ بندی کمیشن نے دوسرے منصوبے کے چار خاص مقصد بتائے ہیں:۔ (۱) قومی آمدنی میں اضافہ تاکہ ملک کا معیار زندگی اونچا کیا جا سکے (۲) تیز رفتار صنعت بندی جس میں بنیادی اور بھاری صنعتوں پر خاص زور دیا جائے (۳) روزگار کے مواقع میں بڑے پیمانے پر اضافہ اور (۴) آمدنیوں اور دولت کی نابرابری کم کی جائے اور معاشی طاقت کی تقسیم کو منصفانہ بنایا جائے۔ یہ چاروں مقصد ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں قومی آمدنی میں اضافے کے لئے صنعت بندی ضروری ہے بھاری صنعتوں مثلاً لوہا، فولاد اور معدنیات کی ترقی سے چھوٹے اور بڑے پیمانے والی صنعتوں کی ترقی کا سامان ہو جائے گا جس سے روزگار کے مواقع بڑھیں گے اور چونکہ یہ ترقی سوشلسٹ اصولوں پر ہوگی اس لئے معاشی طاقت کی تقسیم کے موجودہ نقائص بتدریج دور ہوتے جائیں گے اور نابرابری کم ہوتی جائے گی۔

منصوبے کے اخراجات کی مدیں اور پالیسی کے اصول انھیں مقاصد کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ دوسرے منصوبے کا حجم شروع

میں پہلے منصوبے کے دوگنے سے زیادہ یعنی ۴۸ ارب روپیہ رکھا گیا تھا اور جبکہ پہلے منصوبے میں صنعت و حرفت اور معدنیات کے لئے کل خرچ کی ساڑھے سات فی صدی کے قریب رقم (۱۹۰ کروڑ روپیہ) رکھی گئی تھی، دوسرے منصوبے میں یہ تناسب ساڑھے اٹھارہ فیصدی تھا جو ۸۹۰ کروڑ روپیہ ہوتا تھا۔ یہ اعداد و شمار جس پالیسی کا پتہ دیتے ہیں اسے بعد میں سامنے آنے والی دشواریوں اور منصوبے کے حجم میں لگ بھگ تین ارب روپیہ کی تخفیف کے باوجود برقرار رکھا گیا ہے۔ اس پالیسی میں بھاری صنعتوں کے ساتھ چھوٹے پیمانے والی اور دیہی صنعتوں کی ترقی بھی شامل ہے اور اس مد کے لئے پہلے منصوبے سے چھ گنی زیادہ رقم رکھی گئی تھی جس کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ روزمرہ ضرورت والی اشیاء جن کے بھاری صنعتوں میں تیار نہ ہونے کی وجہ سے قلت اور گرانی کا اندیشہ تھا، فراہم کی جاسکیں اور روزگار کے موقعے نکالے جاسکیں۔

نابرابری کی درستی ۔ نابرابری کم کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اونچی آمدنیوں میں سے قوم کی ترقی کے لئے ایک مناسب حصہ لے لیا جائے اور اس طرح ان کو کم کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ کم آمدنیوں کو بڑھایا جائے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ بے روزگاری اور کم روزگاری دور کرنے کی تدبیریں کی جائیں۔ دوسرا یہ کہ گرانی کی روک تھام کی جائے اور تیسرا یہ کہ سماجی خدمات مثلاً تعلیم اور دوا علاج وغیرہ کی سہولتیں متوسط اور نچلے طبقے کے لئے بڑھا دی جائیں۔ منصوبے کے دوران ان دونوں صورتوں اور تینوں طریقوں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ وراثت ٹیکس، دولت ٹیکس، تحفہ ٹیکس اور خرچہ ٹیکس اسی مقصد کے لئے لگائے گئے ہیں بلکہ غلہ کی تھوک تجارت کے حکومت کے زیر انتظام لے لئے جانے اور کھیتی باڑی میں امداد باہمی طریقوں کی ضرورت جتائے جانے کا بھی یہی مقصد ہے اور اسکولوں اور اسپتالوں میں اضافہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ نابرابری ابھی ختم نہیں ہو سکی ہے اور بے روزگاری اور کم روزگاری کا مسئلہ بھی ابھی تک پوری طرح سے حل نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن یہ مسئلے بہت سے [illegible] کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں اور ان کو جلد ہی حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں یاد رکھنے والی ایک اور بات یہ ہے کہ جمہوری نظام کے اندر ان مسئلوں کو حل کرنے کی کوشش ابھی تک کسی دوسرے ملک میں نہیں کی گئی ہے۔ جمہوری طریقوں پر کاربند رہتے ہوئے اور جمہوری قدروں کو برقرار رکھتے ہوئے سوشلسٹ سماج بنانے کی کوشش جو ہندوستان میں کی جا رہی ہے ویسی ہی انوکھی ہے جیسی کہ عدم تشدد کے اصول پر آزادی کی لڑائی لڑنے اور جیتنے کی کوشش جس میں کامیابی حاصل کر کے ہندوستان نے پوری دنیا کی رہنمائی کی ہے۔

نت نئی منزلیں ۔ جس طرح سیاسی آزادی ایک ہی ہلے میں نہیں ملی بلکہ اس کے لئے طول طویل جد و جہد کرنا پڑی اور نہ جانے کتنے ہفت خواں طے کرنا پڑے، اسی طرح معاشی آزادی کوئی ایسی منزل نہیں ہے جسے ایک ہی جست میں حاصل کر لیا جائے۔ منصوبہ بندی ایک مسلسل عمل ہے۔ ہر منصوبہ ایک منزل ہے مگر ایسی ہر منزل کے آگے ایک نئی اور پہلے سے زیادہ پرکیف منزل دکھائی دیتی ہے جو مسافر کو اپنی طرف بلاتی ہے۔ دو ایک ابتدائی منزلوں کے بعد سفر کا تجربہ ہو جاتا ہے، مسافر کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور اسے آگے جانے کے لئے توانائی بخش زادِ راہ مل جاتا ہے جس کی وجہ سے اگلی منزلیں آسانی سے سر کر لی جاتی ہیں۔

ہندوستان اب اسی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ پہلا منصوبہ کسی قدر ہنگامی نوعیت کا تھا مگر دوسرے منصوبے کی بنیاد نسبتاً زیادہ مستحکم تھی اور اس کے نتائج بھی زیادہ ٹھوس نکلے ہیں۔ کچھ نقائص بھی سامنے آئے ہیں مگر نقائص سے ڈر کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے جتنا نقصان ہوتا اتنا خود ان نقائص سے نہیں ہوا ہے اور آگے کے لئے سبق بھی مل گیا ہے۔ آزادی کے بارہ برسوں اور منصوبہ بندی کے آٹھ برسوں میں ملک یقیناً آگے بڑھا ہے۔ اور جن ترقیاتی کاموں کا فائدہ ابھی عام لوگوں کو محسوس نہیں ہوتا وہ دو سال بعد شروع ہونے والے تیسرے منصوبے کے بنیادی ستون اور عوام کی خوش حالی کے ذریعے بن جائیں گے۔ فولاد کی صنعت، ملک کے اندر ریل انجنوں اور بڑی فوجی موٹروں کی تیاری، کھاد اور دواؤں کے کارخانے اور آبپاشی اور بجلی کی اسکیمیں چند اسی طرح کے کام ہیں، اور منصوبے کا جائزہ مکمل تبھی ہو سکتا ہے جب ان کاموں کے نہ صرف فوری بلکہ طویل میعاد کے پہلو کو بھی حساب میں شامل کر لیا جائے۔

عوام کا حصہ ۔ ہندوستان کے منصوبوں میں صرف یہی نہیں ہے کہ ایک

مقررہ مدت میں کتنی ترقی کی جائے گی۔ ان کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ترقی کیسے کی جائے۔ ان منصوبہ بند ترقی میں عوام کی شرکت کو جس سے ان میں خود اعتمادی اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے لئے اجتماعی ترقی یا کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور قومی توسیعی سروس یا نیشنل ایکس ٹن شن سروس کی اسکیمیں چلائی گئی ہیں۔ متعلقہ وزارت کی اس سال کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جنوری ۱۹۵۹ء تک یہ اسکیمیں یا پروجکٹ ۲۴۰۰ بلاکوں میں چل رہی تھیں جن کے تحت ۳ لاکھ ۲ ہزار ۹۷۴ گاؤں آتے ہیں۔ ان گاؤں کے ترقیاتی کاموں میں گاؤں والوں نے نقد جنس یا محنت کی شکل میں ۸۰ کروڑ ۹ لاکھ روپیہ کے بقدر حصہ لیا جبکہ حکومت کا حصہ ۱۰۳ کروڑ ۳۸ لاکھ روپیہ تھا۔ عوام کا ان کاموں میں اتنا حصہ لینا ترقی کے لئے ان کی امنگ کا پتہ دیتا ہے اور یہ چیز مادی ترقی سے کہیں زیادہ دوررس اور دیرپا اہمیت رکھتی ہے۔ اس اسکیم کی افادیت کا اندازہ اس جماعت کی رپورٹ سے ہو سکتا ہے جسے منصوبہ بندی کمیشن نے ۱۹۵۵ء میں اسکیم پر عملدرآمد اور اس کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے شری بلونت رے جی مہتا کی زیر قیادت مقرر کیا تھا۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس جماعت نے چھ ریاستوں کے کوئی پونے چھ سو آدمیوں سے جو ترقیاتی بلاکوں میں رہتے تھے ان کے گاؤں پر اسکیم کے اثرات کے متعلق سوالات کئے جن کے جواب میں ۸۰ فی صدی آدمیوں نے بتایا کہ یہ اسکیم ان کے گاؤں کے لئے مجموعی طور پر مفید رہی ہے۔ اتر پردیش کے دو بلاکوں کے سو آدمیوں سے ایسے سوالات کئے گئے اور ان سب نے اسکیم کے مفید ہونے کا اعتراف کیا۔ یہ جائزہ اگرچہ محدود پیمانے پر لیا گیا تھا پھر بھی اسے ایک نمونے کی حیثیت دی جا سکتی ہے اور اسے سامنے رکھ کر موجودہ فضا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اُمید افزا حالات۔ یہ فضا یقیناً اُمید افزا ہے۔ ملک کو ترقی کی ضرورت ہے لوگ ترقی کرنا چاہتے ہیں اور اسی لئے تیسرے منصوبے کو دوسرے کے دونے سے زیادہ بڑا بنانے کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ موٹے طور پر تیسرے منصوبے کی مدت میں ایک کھرب روپیہ کے ترقیاتی خرچ کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ابھی تیسرے منصوبے کا ابتدائی مسودہ بھی تیار نہیں ہوا ہے مگر اس کے متعلق ابتدائی غور و بحث شروع ہو چکی ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن کی مختلف کمیٹیاں الگ الگ شعبوں پر غور کر رہی ہیں اور حال ہی میں [illegible] کی آل انڈیا کمیٹی کے زیر اہتمام حال ہی میں منصوبے پر ایک مجلس مباحثہ (سیمینار) منعقد ہوئی ہے۔ ان مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیسرے منصوبے میں زرعی پیداوار بڑھانے پر خاص زور دیا جائے گا۔ اس کا سوال حل کرنے کے لئے مروجہ طریقوں کے علاوہ شاید کچھ ایسے طریقے بھی اختیار کئے جائیں گے جو ملکوں سے ہٹے ہوئے ہوں۔ سماجی خدمات بڑھائی جائیں گی اور دیہی آبادی کے لئے ایسی خدمات کا خاص طور پر بندوبست کیا جائے گا۔ صنعتی پروگرام میں دھات، بجلی اور کیمیاوی اشیاء کے علاوہ مشین ساز کارخانوں کے قیام کو اوّلیت حاصل ہوگی۔ سرکاری حلقہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ نجی ملکیت والے کاروبار کی بھی ہمت افزائی کی جائے گی اور اس دوسرے حلقہ پر پابندیاں یا حد بندیاں لگانے کے بجائے اسے ضابطے کے اندر رکھنے کی پالیسی اختیار کی جائے گی۔ پالیسی کی اس وضاحت سے اس اندیشے کا ازالہ ہو جانا چاہیئے کہ تیسرے منصوبے میں جبر کا عنصر بڑھا دیا جائے گا۔ ایسے ہی بعض اندیشے کچھ لوگ کھیتی باڑی میں امداد باہمی طریقہ رائج کئے جانے کے متعلق ظاہر کر رہے ہیں، اگرچہ وزیر اعظم نے بار بار کہا ہے کہ یہ طریقہ تمام تر رضامندی اور تلقین و ترغیب کے ذریعے رائج کیا جائے گا۔

جہاں ایک طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ ترقی کی رفتار تیز کی جائے تاکہ پسماندگی جلد ہی دور ہو جائے وہاں دوسری طرف کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ترقی کا سفر روک دیا جائے تاکہ سستانے کا موقع مل جائے لیکن سستانے میں سستی آ جانے کا ڈر ہے۔ اس سے زیادہ نقصان کی بات یہ ہے کہ جو کام پہلے اور دوسرے منصوبے میں شروع کئے گئے ہیں اگر ان کو بیچ میں چھوڑ دیا گیا تو ان پر جو محنت اور رقم صرف ہوئی ہے وہ اکارت جائے گی۔ اور اگر ان کے سلسلے کے دوسرے کام نہ چلائے گئے تو اس محنت اور رقم سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکے گا [illegible] کے بقول اگر ہم آگے نہ بڑھتے رہے تو ڈر ہے کہ بیچ دھارے میں ڈوب جائیں۔

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(اگست ۴۲ء کی تحریک آزادی سے متعلق ایک طویل منظومئے کے چند حصّے۔)

(نازش پرتاپگڈھی)

اگست ۴۲ء

راوی:۔

ہر طرف بکھرا چلا جاتا ہے کہرے کا غبار
دوش پر لادے ہوئے مُردہ امنگوں کے مزار
ذوقِ نغمہ بھی نہیں حُسنِ سماعت کی قسم
زندگی سوگ میں ہے جبرِ امارت کی قسم
گردِ آلام سے انسان اٹا جاتا ہے
خونِ جمہور پیالوں میں بٹا جاتا ہے
صرف خاکے ہیں مکمل کوئی تصویر نہیں
خواب ہی خواب ہیں جن کے لئے تعبیر نہیں
خون کے جلنے کی بدبو کے سوا کچھ بھی نہیں
زیست ڈھلکے ہوئے آنسو کے سوا کچھ بھی نہیں

شہیدوں کی آواز:۔

افقِ دار سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ابھی
جو کرن اُٹھتی ہے تاریکی میں کھو جاتی ہے
آدمی کوڑے کے ڈھیروں پہ ابھی پلتا ہے
زندگی ہانپ کے فٹ پاتھ پہ سو جاتی ہے
نغمۂ عیش ابھی تک ہے وہ آوارہ نگاہ
چند لمحوں کو سرِ راہ جو ٹک جاتی ہے
"محنت" اب بھی ہے کسی سستی طوائف کی طرح
اونچے محلوں میں جو بے دام بھی بک جاتی ہے
ماں کی تقدیس بہک جاتی ہے بچے کے لئے
ممتا بھوک کی بھٹی میں پگھل جاتی ہے
وہ جو اس دَورِ تشدد میں ہوئے نذرِ ہوس
لوری اُن ہونٹوں پر آتی ہے تو جل جاتی ہے
کب وہ دن آئے گا جس دن کی تمنا میں مرے
کب یہاں سلسلۂ دار و رسن ٹوٹے گا
کب تک اس خاک سے اپنا وہ لہو پھوٹے گا
سُرخیٔ صبح کی حسرت میں بہایا جس کو

اگست ۴۲ء

راوی:۔

کوئی قانون، کوئی ظلم، کوئی پابندی
کس نے روکی کسی بے باک علم کی رفتار
کوئی ظلمات، کوئی رات، کوئی ابرِ سیاہ
کس کے بس میں رہی سورج کے قدم کی رفتار
جرأتیں مائلِ پرواز ہوئی جاتی ہیں
حسرتیں وقت کی آواز ہوئی جاتی ہیں

وقت نے کہا:۔

آج تک دور تھے میدانِ سیاست سے عوام
اب مگر تم کو بدلنا ہے زمانے کا نظام
ہر کرن تم کو اُبھرنے کا سبق دیتی ہے
ہر نئی صبح سُناتی ہے بغاوت کا پیام

ایک ہاتھ اور بھی! اک ہاتھ کی حاجت ہے اور
عالمِ نزع میں ہے جبر و تشدد کا نظام
اب نئی صبح، نئے دور کا آغاز کرو
رات کے پاس کہاں بادۂ جاں بخش کا جام

عوامی للکار:-

زخمِ سر کچھ بھی نہیں زخمِ جگر کچھ بھی نہیں
رسن و دار بجز گردِ سفر کچھ بھی نہیں
ساتھیو اک نئے طوفان میں ڈھلنا ہوگا
اپنی قسمت کو ہمیں خود ہی بدلنا ہوگا
ساتھیو اٹھو کہ منھ دورِ خزاں کا موڑیں
ساتھیو اٹھو کہ زنجیرِ غلامی توڑیں

ظلمت و نور کے دھاروں سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

راوی:-

شمعِ آزادی کے پروانے بڑھے جاتے ہیں
اپنا پرچم لئے دیوانے بڑھے جاتے ہیں
ان کے ہونٹوں پہ مہکتا ہے محبت کا غرور
ان کے چہروں پہ دمکتا ہے صداقت کا غرور
ان کے ذہنوں میں نئے دور کی تعمیریں ہیں
ان کے سینوں میں نئی صبح کی تنویریں ہیں
تیوریاں جہدِ مسلسل کا پتہ دیتی ہیں
نظریں مستقبلِ زریں کو صدا دیتی ہیں
لاکھ مجبور ہیں، لاچار ہیں، پر بستہ ہیں
موت سے آنکھ ملائے یہ کمر بستہ ہیں

جگمگاتا ہی گیا ذہن و نظر کا فانوس
اور چلتا گیا، بڑھتا گیا سڑکوں پہ جلوس
ظلمت و نور کے دھاروں سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم

وقت کی آواز:-

ختم یہ سلسلۂ ظلم و ستم کر ڈالو
اٹھو گلچینوں کے ہاتھوں کو قلم کر ڈالو
بڑھ چلو روند کے کانٹے جو ملیں راہوں میں
لوٹ لو ان کو جو بیٹھے ہیں کمیں گاہوں میں

ایک اندیشہ:-

یہ اہنسا کی جنم بھوم، یہ گوتم کی زمیں
اس کو بدنام کرے داغِ تشدد نہ کہیں

تاریخ نے کہا:-

سچ کی آواز اٹھانے کو تشدد نہ کہو
ظلم کا دور مٹانے کو تشدد نہ کہو
موت کے مار گرانے کو تشدد نہ کہو
زیست سے پیار جتانے کو تشدد نہ کہو
اپنی عظمت کے بچانے کو تشدد نہ کہو
ماں کی عزت کے بچانے کو تشدد نہ کہو
ورنہ پھولوں کا مہکنا بھی تشدد ہوگا
دل کا سینے میں دھڑکنا بھی تشدد ہوگا
صبح ہونے کا قرینہ بھی تشدد ہوگا
سانس کا لینا بھی، جینا بھی تشدد ہوگا

دوسرا اندیشہ:-

لیکن انسان کو انسان سے نفرت کیسی
اپنے ہم جنسوں سے اس درجہ عداوت کیسی

شعور نے بتایا :-

ذہن کے پردے پہ ابھرا نہیں کوئی چہرا
دوستو ہم جو کریں گے بھی تو نفرت کس سے
ظلم ہوتا تو نہیں ہے کسی انسان کا نام
ساتھیو سوچو کہ ہے ہم کو عداوت کس سے
ہم کو اٹھنا تو نہیں ہے کسی انساں کے خلاف
جنگ کرنی ہے ہمیں قوتِ شیطاں کے خلاف

حالات نے کہا :-

تیرگی ظلم کی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
سانس انسانوں کی آہوں میں ڈھلی جاتی ہے
ہاتھ جو بڑھتے ہیں بھالوں سے رگڑ جاتے ہیں
ہونٹ جو کھلتے ہیں تالوں میں جکڑ جاتے ہیں
بوئے گل اب کسی گوشے سے کہاں آتی ہے
کھیتوں کے سینوں سے آواز فغاں آتی ہے
نہ کسی قوم نہ انسان کا چہرہ دیکھو
تم فقط ظلم کا چڑھتا ہوا دریا دیکھو
جادۂ حق سے نہ یوں ہٹ کے کھڑے ہو جاؤ
وقت آیا ہے کہ اب ڈٹ کے کھڑے ہو جاؤ

تیسرا اندیشہ :-

کل کوئی یہ نہ کہے ہم نے حماقت کی تھی
کہیں تاریخ نہ لکھے کہ بغاوت کی تھی

وقت کا تقاضا :-

جنگ ۔ ظلمات کو انوار بنانے کے لئے
جنگ ۔ ویرانے کو گلزار بنانے کے لئے
جنگ ۔ رخساروں کو شاداب بنانے کے لئے
جنگ ۔ پیشانی کو مہتاب بنانے کے لئے
جنگ ۔ دھرتی کی اور انساں کی حفاظت کے لئے
گر بغاوت ہے تو اٹھ جاؤ بغاوت کے لئے

ارتقار کی آواز :-

جس کو تخریب کہا کرتے ہیں دنیا والے
اپنے ہر نقص کے باوصف مری اپنی ہے
اور تخریب ہی تعمیر کی بنیاد بھی ہے

چوتھا اندیشہ :-

تم نے سوچا بھی ہے انجام بغاوت لیکن
موت ۔ جس سے نہیں انسان کا لڑنا ممکن

صدائے قوت وحیات :-

کوئی بھی زیست کو پابند نہیں کر سکتا
موت مر سکتی ہے انسان نہیں مر سکتا

راوی :-

اور پھر موج سی اٹھنے لگی بیداری کی
یعنی انسان نے جاگ اٹھنے کی تیاری کی
جمع ہوتے گئے لوگ اور علم بڑھتے گئے
بازو لہراتے گئے اور قدم بڑھتے گئے
"ظلمتو! نور کے دھاروں سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم"

سامراج چلایا :-

غیر قانونی ہے یہ بھیڑ، یہ مجمع، یہ جلوس
حکم دیتا ہوں میں تم سب کو یہاں سے ہٹ جاؤ
خیریت چاہو تو کائی کی طرح سے پھٹ جاؤ

راوی :-

کون انسان کے قدموں کو مگر روک سکا
کون چڑھتے ہوئے طوفاں کو کبھی ٹوک سکا

نالیں بندوقوں کی ہتھیار تھیں لیکن وہ جلوس
آگے بڑھتا گیا، بڑھتا گیا۔ بڑھتا ہی گیا
جگمگاتا ہی گیا ذہن و نظر کا فانوس
اور طوفان جو چڑھا۔ اور بھی چڑھتا ہی گیا
"ظلمتو! نور کے دھاروں سے نہ ٹکراؤ تم
غاصبو! صحنِ گلستاں سے نکل جاؤ تم"

- - - - - - - - - - - - -

اپنی تذلیل پہ بَل کھا گیا کالا قانون
کھول اٹھا زعمِ حکومت کی رگِ ظلم کا خون
گولیاں چلنے لگیں تاک، تڑاک اور تڑاک
جسم انسانوں کے گرنے لگے دھم، دھاک، دھڑا
جسم گرتے بھی گئے۔ جسم سسکتے بھی گئے
اور انساں تھے کہ آگے ہی سرکتے بھی گئے
بازو لہراتے گئے اور علم بڑھتے گئے
سخت راہوں پہ بھی جرأت کے قدم بڑھتے گئے
ایک طوفان جو اُمنڈا وہ اُمنڈتا ہی گیا
گولیاں تھک گئیں انسان مگر تھک نہ سکا
اگست ۵۹ء

راوی:۔

تیرگی ختم ہوئی۔ نورِ سحر جاگ اٹھا
کلیاں بیدار ہوئیں، ہر گلِ تر جاگ اٹھا
بندشیں دور ہوئیں، ذوقِ سفر جاگ اٹھا
زخمِ سر ختم ہوا، زخمِ جگر جاگ اٹھا
جذبِ دل جاگ اٹھا، حسنِ نظر جاگ اٹھا
صبحِ نو آئی تو خوابیدہ بشر جاگ اٹھا
وادیٔ خشک بنی صحنِ چمن زندہ باد
سرخیٔ خونِ شہیدانِ وطن زندہ باد!

نویدِ فردا:۔

عشق میں آہِ سحرگاہی کے دن بیت گئے
ایشیا والوں کی گمراہی کے دن بیت گئے
وہ جو پیروں میں تھی زنجیرِ سیہ ٹوٹی ہے
آج انسان کے ماتھے سے کرن پھوٹی ہے
قطرے اس واسطے اٹھیں گے کہ دھارے بن جائیں
عزم ذرے یہ کریں گے کہ ستارے بن جائیں

تاریخ کہتی ہے:۔

ہوتا آیا ہے یونہیں، ہوتا رہے گا یوں ہی
کفر بڑھتا ہے تو ہو جاتا ہے ایماں پیدا
آگ سے ہوتا ہے اندازِ گلستاں پیدا
ناگنیں اپنے ہی بچوں کو چبا لیتی ہیں
ظلمتیں چاند ستاروں کو جگا دیتی ہیں
ٹھوکریں کھاتا ہے انسان سنبھلنے کے لئے
آدمی مرتا ہے دُنیا کو بدلنے کے لئے
بیج مٹتا ہے کہ ہو ایک گلِ تر پیدا
تارے بجھتے ہیں کہ ہو مہرِ منور پیدا

✡

دربارِ واجدی کے کچھ نامور شاعر

شیخ تصدق حسین

تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے دور میں لکھنؤ میں نازک خیال سخنور آسمان کے تاروں کی طرح ہر سمت بکھرے ہوئے تھے۔ سارا شہر موزونیِ طبع کے جوہر دکھاتا تھا اور ہر طرف مشاعروں کی صحبتیں گرم رہا کرتی تھیں۔ بادشاہ خود بھی شاعر تھے اور شاعروں کے بڑے سرپرست بھی۔ لکھنؤ کے متعدد شعرا ان کے دربار سے وابستہ تھے جن میں برق، قلق، قبول اور اسیر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں[1]۔ اس مضمون میں انھیں شعرا کے حالات پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

فتح الدولہ برق

محمد رضا نام، برق تخلص، فتح الدولہ خطاب۔ کاظم علی صلح کے بیٹے تھے۔ حضرت امجد علی شاہ کے دورِ شہریاری میں تمام فوج کے بخشی تھے۔ سلطان عالم واجد علی شاہ کے عہد دولت میں رسالۂ میمنۂ شاہی کے رسالدار اور شاعری میں بادشاہ کے استاد تھے۔ (مثنوی حزن اختر)

۱۸۵۶ء میں جب شاہ اودھ تاج و تخت سے محروم ہو کر کلکتہ تشریف لے گئے تو حالانکہ برق زندگی کی آخری منزل طے کر رہے تھے مگر شوق جاں نثاری میں وہ بھی شاہ معزول کے ہم رکاب کلکتہ چلے گئے۔ پھر جب جون ۱۸۵۷ء میں بادشاہ فورٹ ولیم میں زیر حراست کر دیئے گئے تو وہ بادشاہ کے ہمراہ قلعہ چلے گئے۔ مگر یہ بوجہ ضعف پیری چراغ سحری کی طرح نڈھال ہو رہے تھے۔ بادشاہ نے ہر چند کہا تم ضعیف ہو، بار گراں تم سے نہ اٹھ سکے گا مگر انہوں نے جواب دیا:-

مرے تن میں جبتک ہے جاں بادشاہ
نہ چھوڑوں گا تم کو خدا ہے گواہ

بالآخر ۲۸ صفر ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء کو قلعہ ہی میں مرض تپ سے عالم بقا کو روانہ ہو گئے اور بقول سلطان عالم ؒ جو کہتے تھے منھ سے وہی کر گئے۔ میر احمد سوداگر کے باغ میں سپرد خاک کئے گئے۔ ان کی دائمی جدائی سے بادشاہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر صبر کر کے خاموش ہو رہے اور ان کا درماہہ ان کے عیال کے لئے مقرر کر دیا۔

برق کے بعد ان کی بیوہ اور بڑے بھائی مرزا آغا جان اور دوسرے بھائی مرزا جعفر نے بھی وہیں سفر آخرت اختیار کیا۔ لکھنؤ کی املاک اور امام باڑہ جسے دعا مانگ مانگ کر بنوایا تھا وہ بھی گیا گزرا ہوا۔ بقول واجد علی شاہ ("بنی") بر وقت دم واپسیں ایک مطلع اور بیت پڑھ کر روانہ فردوس ہوئے۔

برق جو کرنا تھا آخر وہی کر کر اٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پر مر کر اٹھے

---

[1] پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب فرماتے ہیں کہ واجد علی شاہ کے دربار کے ممتاز شعرا کو "سبع سیارہ" کہا جاتا تھا لیکن سب کے نام نہیں معلوم ہیں۔ (ایڈیٹر)

سانس لینے میں ہر اک جانے سکا جلتا ہوا تن

برقؔ پہلو جامۂ ہستی پر اتنا ہو گیا

شاہ نصیر الدین حیدر کے عہد شہریاری میں برقؔ ہر مہینے صحبت مشاعرہ بھی بڑی دھوم دھام سے منعقد کرتے تھے جس میں حسب رواج زمانہ حاضرین کی تواضع افیم سے بھی کی جاتی تھی۔ کوئی چسکی گھول کر استعمال کرتا تھا کوئی گولی بنا کر نگل لیتا تھا۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ مصنف فسانۂ عجائب بھی اس بزم مشاعرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بندہ کا ایک شفیق جگت آشنا مرزا محمد رضا مجمع خوبی از پا تا فرق تخلص برقؔ۔ فی الحقیقت کلام بلاغت نظام ان کا صاعقۂ خرمن ہستی حاسد ہے۔ بھائی بند شاعروں کا بازار ان کے روبرو کاسد ہے۔ جوان خوش رو، جامہ آشنائی بامزہ، نیکخو، شب ماہ صحبت مشاعرہ بدولت خانہ مرزا معین ہے۔ رئیس، امیر، صغیر و کبیر تشریف لاتے ہیں۔ اس مکان وسیع میں آدمیوں کی کثرت سے جگہ کی قلت ہوتی ہے۔ ہوا کشمکش سے بار پاتی ہے، عجب پنکھے کی سعی اٹھاتی ہے۔ سخن سنج، بیر بنج، خوش گو، نازک فہم، باریک بین، نیکخو جمع ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے وہ لوگوں سے حظ اٹھاتے ہیں تلامذہ مرزائے ممدوح خدمت کو حاضر۔ کورے کورے خارسیئے۔ دمبدم گلوریاں ورق لگی، کتھا بسا، چونا سنگ مرمر کا متواتر قبل از غزل خوانی افیون کا چرچا ہو جاتا ہے۔ کوئی چاندی کی کھاتا ہے۔ اگرچہ کسی کو چاہ کی ہوئی، دو دو پیسے پیچے تک کو شیرچا، موجود کر دی۔ ہمیشہ صبح اس شام کے جلسہ کی ہو جاتی ہے طبیعت نہیں گھبراتی ہے۔ گھر جانے والوں کو صدائے مرغ سحر، ندائے اللہ اکبر آتی ہے۔"

مرزا بہت پرگو شاعر تھے۔ اپنے استاد ناسخؔ کے رنگ میں کہتے تھے۔ ان کا شہر آشوب بہت مشہور ہے جو درد اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کے شاگردوں میں میر ضامن علی جلالؔ اور میر علی اوسط رشکؔ بہت نامور ہوئے۔

استادشہ کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو ۔۔۔ غم میں پھنسا ہوں دام محبت پھوڑ کر

نکلا غبار دل سے صفائی تو ہو گئی ۔۔۔ اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا ۔۔۔ کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو ۔۔۔ دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

شب فراق کا صدمہ سہا نہیں جاتا ۔۔۔ حرام موت نہ ہوتی تو زہر کھا جاتا[1]

---

[1] قلقؔ کے کچھ اور اشعار:

زلف و رخ کے عاشقوں کو فکر صبح و شام کیا ۔۔۔ رند مشرب ہیں ہمارا کفر کیا اسلام کیا

پیری جگر سے داغ محبت مٹائے گی ۔۔۔ آیا قریب وقت غروب آفتاب کا

دل اپنا کوئے زلف صنم میں ٹھٹک گیا ۔۔۔ لو اور سنئے خضر بھی رستہ بھٹک گیا

قلقؔ شمع سحر کا ساتھ دیتا کون رونے میں ۔۔۔ کفن سے اپنے ماتم میں خود اپنا میں نے منہ ڈھانکا

نہ وہ خوشبو ہے گلوں میں نہ خلش خاروں میں ۔۔۔ اک ترے آتے ہی خاک اڑ گئی پر والوں میں

قفس میں درد دل سے نالہ و فریاد کیا کیجے ۔۔۔ پراگندہ دماغ نازک صیاد کیا کیجے

دم عرض رہائی ہنس کے وہ صیاد کہتا ہے ۔۔۔ گرفتار آ کے جو خود ہو اُسے آزاد کیا کیجے

ہمیں بھاتی نہیں یہ حجتیں شیخ و برہمن کی ۔۔۔ پسند طبع اپنے مذہب رندانہ آتا ہے

یہ اشعار قلقؔ کے دیوان "مظہر عشق" سے لئے گئے ہیں جس کا ایک مطبوعہ نسخہ (نول کشور پریس ۱۸۸۱ء) جناب سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔۔۔۔۔۔۔ ایڈیٹر

آفتاب الدولہ اسد جنگ قلق

خواجہ اسد نام، قلق تخلص، خواجہ حسین کے بیٹے اور لکھنؤ کے نامور اور ممتاز شاعر خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے خاص مصاحبوں میں ان کا شمار تھا۔ بادشاہ کی ان پر بے حد نظرِ الطاف و کرم تھی۔ مرزا ولی عہد کی شادی میں شہریار نے قلق پر انعام و اکرام کی بارش کر دی اور خلعت گراں بہا بھی عطا کیا۔ مگر اس وقت تک موصوف خطاب سے سرفراز نہ ہوئے تھے چنانچہ موقع محل دیکھ کر اور سلطان عالم کو اپنے حال پر مہربان پاکر یہ شعر فی البدیہہ پڑھا :-

خلعت و زر سے تو سب کچھ میں سنوارا جاؤں
ایسی شادی میں قلق کہہ کے پکارا جاؤں

بادشاہ بات کی تہہ کو پہنچ گئے اور اسی وقت "آفتاب الدولہ اسد جنگ" خطاب دیکر ممتاز و سربلند فرمایا۔

بعد زوال سلطنت قلق بادشاہ کے ہمرکاب کلکتہ بھی گئے اور انھیں کلکتہ پہنچا کر لکھنؤ واپس چلے آئے۔ یہاں نواب آصف الدولہ کے تعمیر کردہ عیش باغ کے شمالی پھاٹک سے چند قدم پر ان کا ایک باغ تھا جو قلق کا باغ کہلاتا تھا اور بہت وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اُسی میں ان کا رہائشی مکان بھی تھا۔ قلق کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کی ایک نظم سے صرف اتنا سراغ ملتا ہے کہ ۱۸۸۴ء تک گلزار عالم کی سیر کر رہے تھے۔ اس کے بعد کسی سن میں اس دار بے مدار سے کوچ کر گئے۔ انھیں کا باغ ان کی دائمی آرام گاہ قرار پایا مگر دستبرد زمانہ سے نہ اب وہ حویلی قائم ہے نہ قبر کا نشان ملتا ہے۔ باغ کے وسط سے سڑک نکل گئی ہے جس سے باغ دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے اور اس کی آراضی پر لوگوں کے متعدد مکان بھی تعمیر ہو گئے ہیں۔ مگر وہ قطعہ تا حال قلق کے باغ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایک مثنوی موسومہ "طلسم الفت" قلق سے یادگار ہے جو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں کہی گئی ہے۔ سلطان عالم کے سفر کلکتہ کے حالات اور واقعات کو بھی انہوں نے نہایت دلچسپ انداز میں نظم کیا تھا۔ ایک واسوخت اور شہر آشوب بھی ان کے افکار عالیہ کا نتیجہ تھا۔ ان کے علاوہ اور کلام کا بھی بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا تھا جو اب کمیاب بلکہ نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

مقبول الدولہ قبول

مہدی علی خاں نام، خطاب مقبول الدولہ اور تخلص قبول تھا۔ موصوف کنز الدولہ احمد علی خاں کے بیٹے، مجد الدولہ رمضان علی خاں کے پوتے اور ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں کے پرپوتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد دولت سے اسی خاندان کے افراد افسر خزانہ کے منصب پر مامور ہوا کرتے تھے۔ یہ اسامی دراصل اس خاندان کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ چنانچہ سلطان عالم کے دور تاجداری

لہ برق کا دیوان مطبع شاہی میں چھپا تھا۔ مطبوعہ دیوان کی ایک نقل سید مسعود حسن رضوی صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس میں سے کچھ اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔

ہر سرزمیں میں شور ہے آہِ بلند کا ۔۔۔ افلاک پر سرا ہے ہماری کمند کا
ہولی میں کھیل ہے یہ مرے گلعذار کا ۔۔۔ رنگ اڑ رہا ہے باغ میں روئے بہار کا
دور بھاگے فرشتگانِ عمل ۔۔۔ میکشِ جرموں سے اجتناب کیا
برق ہم آج نہ دیکھیں گے سحر کی صورت ۔۔۔ دن تو مر مر کے کٹا پھر شبِ فرقت آئی
جورِ ساقی یہ اُٹھا سکتے نہیں ۔۔۔ چپکے ہم بیٹھے رہیں ساغر چلے
سامنے پھر رہی ہے آمدِ یار ۔۔۔ شورِ محشر مری نظر میں ہے

—— ایڈیٹر

میں بھی اس جگہ پر مفتاح الدولہ محمود علی خاں فائز تھے جو قبول کے بڑے چچا تھے۔ قبول کا شجرۂ خاندان حسب ذیل ہے:۔

ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں
I
مجد الدولہ عنان علی خاں
I

مفتاح الدولہ محمود علی خاں — کنز الدولہ احمد علی خاں
I — I
مخزن الدولہ محمود علی خاں — مقبول الدولہ مہدی علی خاں قبول

واجد علی شاہ بھی قبول کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی تصنیف "بنی" میں لکھتے ہیں:۔ "کپتان مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی قبول ہم مشورہ راقم۔ اٹھارہ انیس برس کا میرا سن تھا جو میرا ان کا ساتھ ہوا۔ میرے ملازم رہے۔ میرے والد (حضرت امجد علی شاہ) کے بھی ملازم رہے۔ میرے عہد میں خدمت چوکی۔ پلنگ خاص و مصاحبت اور چھاپہ خانہ اور کتبخانہ اور کرنیل راٹن (Roton) کا توپخانہ یہ سب ان کے بائنام تھے۔ بعد انتزاع سلطنت اودھ جب راقم قلعہ فورٹ (فورٹ) ولیم کلکتہ میں مقید تھا یہ حاضر کلکتہ ہوئے اور جب راقم نے رہائی پائی یہ میرے پاس موجود تھے۔ حسرت زیارت عتبات عالیات میں انتقال کیا۔ یہ مطلع انھیں کا ہے۔

پھلنے کو ترے آگ سے جلوا نہیں سکتا
اے گلبدن اس واسطے گل کھا نہیں سکتا"

موصوف ناسخ کے شاگرد اور صاحب دیوان تھے جو زیور طباعت سے بھی آراستہ ہوا تھا مگر اب عنقا ہو رہا ہے۔ لکھنؤ کی بہت سی شاہی اور امراء کی تعمیرات کی تاریخیں بھی موصوف نے نظم کی تھیں۔

طرز کلام یہ ہے:۔

حُسن سے عشق کا ظہور ہوا — نور سے نار کیوں نہ پیدا ہو
قبولؔ ناسخِ مرحوم کا جانشیں تھا — خدا ہی جانے کہ مرزا دبیر کیسے تھے

تدبیر الدولہ اسیر

مظفر علی خاں نام اسیرؔ تخلص اور خطاب تدبیر الدولہ مدبر الملک تھا۔ اپنی اوائل عمری کے حالاتِ اسیر نے خود قلمبند کئے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"قصبہ امیٹھی جو آباد ہے وہی میرا وطن، وہی میرا مولد ہے۔ جب نو برس کا ہوا بخت رسا لکھنؤ میں لایا۔ میرے جنت مقام باپ میر مدد علی تھے۔ مائل تخلص تھا۔ میں جب قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا شفقت سے پڑھانے لگے۔ فارسی میں روشن ذہن ہو گیا۔ استاد بن گیا۔ بہت سے طالب علم آنے لگے۔ آخر فکر روزی سے مکدر ہوا تو پہلے کتب خانہ میں نوکر ہوا۔ وہاں خوش نویسوں کا مجمع تھا۔ مجھ کو بھی شوق پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ جب شاعروں سے ملاقات ہوئی شعر کہنے کا ڈھب ہو گیا، رنگین شاعری کی ہوس ہوئی۔ مضامین تلاش کرنے لگا۔ دیوان جمع کر کے دیکھے۔ پچھلوں کے رنگین کلام یاد کئے۔ بعض بعض موقع پر عربی زبان کی ضرورت پڑی۔ فکر ہوئی اس کا بھی کچھ علاج کیجئے۔ میر سید علی نے جو علم نحو و علمی میں بہت فائق تھے، صرف نحو میں منتخب روزگار تھے، میرے پڑھانے میں کمال محنت کی۔ چار برس تک ان کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ زمانے نے کچھ ایسا انقلاب کیا کہ قوت میں اضطراب ہوا۔ پڑھنے پڑھانے کی صحبت جاتی رہی۔ روزی کی فکر نے پریشان کیا۔ القصہ کچہری میں نوکری کی۔ کچھ انشا گری جانتا تھا۔ عمر کے آٹھ برس اسی شغل میں صرف ہوئے۔"

"خدا کی شان رزاقی وہاں ایک عالم مرزا کاظم علی تھے۔ ان کی خدمت میں مشرف رہا۔ حدیقہ حکیم ثنائی پڑھا۔ علم حاصل کیا۔ وہ کامل تھے مجھے بھی کامل کر دیا۔ ترک عادت تو بہت مشکل ہے، شاعری کا بھی کچھ کچھ خیال رہا۔ جابجا شاعروں میں گیا۔ شاعروں سے صحبتیں رہیں۔ میں نے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں کیا کہ مجھ کو شاعری میں کمال ہے مگر لوگ تو تعریف کرتے ہیں، یہ پرچے مجھ کو بھی گزرتے ہیں۔ تاریخ کی صبح و شام سیر کی۔ لغت کی کتابیں پیش نظر رہیں۔ جب حضرت ثریا جاہ خاقانِ زماں محمد امجد علی شاہ زیب تخت و کلاہ ہوئے تو مدار المہام وزیر الممالک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خاں بہادر ذو الفقار جنگ وزیر ہوئے۔ میں بھی ان کے بندوں میں ایک صاحب نیاز بندہ تھا۔ کچھ ایسا حق نہ تھا جس پر ناز کرتا، مجھ کو محض عنایت سے میر منشی کا محکمہ دیا۔ بہت مسرت سے تین برس کٹے۔ کچھ حسب حال مقدرت حاصل ہوئی۔ بعد ازاں گردش روزگار ہوئی۔ فلک نے ہمیں خانہ نشین کر دیا۔ تمام اقارب عدم کو روانہ ہوئے۔ میری زوجہ نے بھی انتقال کیا۔ دل کو نہایت ملال ہوا ایسا

سر پر اس قدر بلا پر بلا پڑی کہ دنیا سے دل اٹھ گیا۔ سخن مختصر دنیا سے دل بہت برخاستہ تھا کسی بزم آراستہ سے کچھ کام نہ تھا۔ ناگاہ ایک شاہی خواص آیا اور مجھے دیوان خاص میں لے گیا۔ وہاں حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ اختر رونق افروز تھے۔ مجھ جیسے ناچیز شخص سے خلق کیا۔ امتیازی درجہ سے پاس بٹھایا۔ ایک ایسی کتاب[1] عنایت فرمائی جو درحقیقت گل انتخاب تھی حسب الحکم اسے نظم کیا، سن کے بہت خوش ہوئے۔ مجھے بھی ان کی خوشی سے مطلب تھا۔"

جب واجد علی شاہ معزول ہونے کے بعد کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے تو اسیر نے لکھنؤ کی اقامت کو ترجیح دی اور نوابین رام پور کے دربار سے متوسل ہوگئے، جس زمانہ میں نواب محمد سعید خاں والی رام پور لکھنؤ میں رونق افروز تھے، اسیر صاحب زادوں کی تعلیم پر مامور ہوئے۔ مابعد نواب یوسف علی خاں کے عہد دولت میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ پھر نواب کلب علی خاں نے اسیر کو گرانقدر تنخواہ پر رام پور طلب کیا اور اسیر وہاں چلے گئے۔ واجد علی شاہ کو اُن کا یہ رویہ ناگوار گزرا چنانچہ وہ اپنی کتاب "بنی" میں اسیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہ شخص پندرہ برس کے سن میں راقم کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہا اور صحبت مشاعرہ کوئی ایسی نہ ہوتی تھی جس میں اس کی اور میری ہمراہی نہ ہو۔ خطاب فقیر ہی کا عنایت کیا ہوا ہے۔ ہر دم محبت کا دم بھرتا تھا اور خود کو عاشقوں میں گنتا تھا۔ جد ان کے نمک خوار میرے باپ دادا کے رہے۔ میری ولی عہدی میں عاشق اور میرے زبان سلطنت میں مصاحب اور داروغہ کل زندان خانہ سرکار اودھ کا اور خلاصہ نویس تمام کچہریات سلطانی کا رہا اور یہاں تک میرے مزاج میں دخل تھا کہ شبانہ روز حاضر خدمت رہتا تھا۔ پینسٹھ برس کے سن میں عقد کیا[2]۔ زوجہ سے نہایت مانوس رہا کرتا تھا۔ جب انتزاع سلطنت اودھ واقع ہوا میں مایوس جانب کلکتہ چلا۔ یہ از بس زوجہ کا مبتلا بہت تعلق نمک یک قلم فراموش کرکے گھر میں جا چھپا۔ میں کلکتہ میں داخل ہوا۔ میں برس سے مجھ سے اس سے فراق ہے۔ طرفہ تر یہ کہ اب والی رامپور کو اپنا بادشاہ بنا کر یہ سید بنی فاطمہ اس کا نمک کھاتا ہے۔"

اسیر کی تصانیف میں ایک دیوان "گلشن تعشق" فارسی میں اور چھ دیوان "گلستان سخن"، "ریاض مصنف"، دیوان اسیر وغیرہ اردو میں طبع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان غیر مطبوعہ رہا۔ ایک اور دیوان منقبت میں موسومہ "گلدستہ امامت" ہے۔ ایک مثنوی مراۃ التاج بادشاہ کی فرمائش سے نظم کی تھی۔ ایک مثنوی میں نواب امین الدولہ مولوی امداد حسین خاں وزیر اعظم کے زخمی ہونے[3] کی کیفیت لکھی ہے۔ ایک مثنوی معراج الفضائل معجزات ائمہ میں ہے۔ زر کامل عیار، شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسائل علم عروض و قوافی کے فارسی اور اردو میں ہیں۔ رسالہ بیان اضافت

---

[1] اسیر نے گو کتاب کا نام نہیں ظاہر کیا ہو مگر گمان غالب یہ ہے کہ یہ "تاریخ پریخانہ" تھی جس میں سلطان عالم نے فارسی میں اپنے محلات کے واقعات "پری خانہ کے حالات" اور اپنے معاشقہ کے قصوں کو خود نہایت مشرح طور سے قلمبند کیا تھا۔ بعد میں ان کی فرمائش سے اسے اردو میں نظم کیا گیا اور اس کا نام "پری خانہ منظوم" رکھا گیا۔ یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے کس نے نظم کیا مگر اس میں رنگ اسیر کا جھلکتا ہے واجد علی شاہ کی طرز سخنوری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ مابعد ۱۹۱۴ء میں مرزا فدا علی خنجر کے فارسی تاریخ پری خانہ کا اردو نثر میں ترجمہ کرکے اس کو "محل خانہ شاہی" کے نام سے موسوم کیا تھا جو مطبع نامی لکھنؤ میں شایع ہوا تھا۔

[2] یہ دوسرا عقد تھا۔

[3] وزیر اعظم کے زخمی ہونے کے واقعات مختصراً یہ ہیں کہ امام باڑہ ملکہ زمانی واقع گولا گنج کے مغربی جانب چند شورہ پشتوں نے روپیہ وصول کرنے کی غرض سے نواب موصوف کی گاڑی روک کر انھیں سنگین جراحتیں پہنچائیں اور قریب کی ایک دوکان میں اٹھا لے گئے۔ جب یہ خبر ریزیڈنٹ کے کانوں تک پہنچی تو وہ فوراً موقع واردات پر آموجود ہوئے اور حالات پر قابو پالیا۔ اس واقعہ کے بعد واجد علی شاہ نے نواب علی نقی خاں کو قلمدان وزارت سپرد کر دیا۔

اور رسالۂ آتشیں کا الصوت دونوں فارسی میں ہیں۔ فوائد مظفر علم نحو عربی میں ہے۔ مستند انہوں نے مرثیے اور سلام کہا کئے مگر ان کا دفتر غدر میں تلف ہوگیا۔

اسیر نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی اور بہت پرگو بھی تھے۔ ساٹھ ساٹھ ستر ستر شعر کی غزل کہا کرتے تھے۔ مصحفی اکثر کہتے تھے کہ ایک روز یہ آخری شاگرد استادوں کی صف اوّل میں جگہ لے گا۔ اُن کی یہ پیشین گوئی آگے چل کر آخر پوری ہوگئی۔ اسیر دریائے گومتی کے اس پار "مفتی گنج" میں رہتے تھے جہاں ان کی کئی عالیشان عمارتیں اور دوکانات وغیرہ تھیں۔ ان کے علاوہ متعدد مواضعات کے بھی مالک تھے۔ گورے چٹے، کشیدہ قامت، متوسط الجثہ تھے اور چہرہ کتابی تھا۔ اکثر ٹخنوں تک کا لمبا کرتا پہنا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ان کے قدرداں اور شاگرد بہت تھے۔ صاحب کمال ہونے کے باوصف ان میں خود نمائی نہ تھی۔ مزاج میں انکسار بہت تھا۔ ہر اعلیٰ و ادنیٰ سے بہ تواضع پیش آتے تھے۔

زندگی کی اکیاسی بہاریں دیکھ کر ۱۲۹۹ھ میں اسیر رحلت کر گئے۔ خواجہ محمد یوسف متخلص بہ یوسف نے تاریخ وفات کہی جس کا مصرع تاریخی یہ ہے ؎ یاں مصحفی کی باقی تھی ایک یہ نشانی (۱۲۹۹ھ)۔ اولاد ذکور میں مرحوم نے دو بیٹے غضنفر علی خاں عرت بڑے بھیا اور افضل علی خاں عرت چھوٹے بھیا اپنی یادگار چھوڑے۔ انھیں دونوں کی زندگی میں کل جائداد ختم ہوگئی۔ ابتک میں صرف کربلا باقی رہ گئی ہے۔ شاعری کا رنگ یہ ہے۔

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

کس سے کہوں تلون ابنائے روزگار
دشمن یہ لاکھ بار ہوئے گھر کے یار دوست

زنجیر تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے
ہے فاصلہ دوگام کا ہستی سے عدم تک

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضمون چراغ سے
روشن اسی کا نام ہے جو جلائے دل

دل گنہ کرنے میں خیرہ ہوگیا
جو صغیرہ تھا کبیرہ ہوگیا

کھا گیا بے فائدہ مجھ کو فلک!
اونٹ کے منہ کا میں زیرہ ہوگیا[1]

ان کے شاگرد بہت تھے جن میں امیر، کلیم، افضل، شوق اور واسطی بہت نام آور ہوئے۔

✡

---

[1] اسیر کے کچھ اور اشعار:

دوڑتا آتا ہے مجنوں دور سے ناقے کے ساتھ
شرم اے لیلیٰ کہاں تک! پردہ محمل اٹھا

صبح پیری ہوچکی بالیں پہ آیا آفتاب
کھول آنکھیں خواب غفلت سے سرِ غافل اٹھا

سرائے ہستی سے اے مسافر ضرور کر قصد اب عدم کا
سحر ہے نزدیک، رات ہے کم سحر کا تارا فلک پہ چمکا

گئے کچھ ایسے نہیں پتا بھی جو کوئی ڈھونڈھے کبھی نہ پائے
غبار و بانگ جرس تو کیسا نشاں نہیں ایک قدم کا

ترک دنیا ہو جسے کہتے ہیں آزادی اسیر
جو گرفتار علائق ہے یہاں دیوانہ ہے

—— ایڈیٹر

افسانہ

بھوکی نظریں

صالحہ عابد حسین

آج کئی دن ہوچکے تھے مگر وہ اب تک اس کا پیچھا کئے جا رہی تھیں۔ سوتے جاگتے، ہنستے بولتے، کھاتے پیتے ہر سمے جیسے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چنوتی دے رہی تھیں۔ یہی ہے تمہارے خالق کا رحم و کرم، یہی ہے تمہاری انسانیت؟ یہی ہے تمہاری مہذب دنیا؟ تمہارا خوشحال سماج؟ وہ لاکھ کوشش کرتی مگر اس دن کے واقعہ کو اپنے ذہن سے کھرچ نہیں پاتی تھی۔ توبہ! کاہے کو وہ اس دن پڑوسن کے ساتھ پکنک پر چلی گئی تھی!!

بڑی سی شاندار موٹر میں وہ اور سارے میزبان اور مہمان مزے سے ہنستے بولتے جھیل کے کنارے سیر کرنے چلے جا رہے تھے۔ کبھی لڑکے لڑکیاں گراموفون رکارڈ بجانے لگتیں، کبھی سب کے سب کورس میں فلمی گیت گانا شروع کر دیتے۔ باہر کی سیٹوں پر معزز مہمان اور میزبان کسی سیاسی مسئلے پر زور و شور سے گفتگو کرتے رہے۔ عورتیں پان کھاتی اور بدگوئی کرتی رہیں اور وہ چپ چاپ ایک کونے میں دبی ہوئی بیٹھی، اس ماحول سے بے نیاز ہو کر ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے مناظر کو اپنی آنکھوں سے پیتی رہی تھی۔ جھیل کا موتی جیسا شفاف پانی، اس پر کانپتا ہوا درختوں کا عکس اور ناچتی ہوئی سورج کی کرنیں، اونچی نیچی پہاڑیوں کی گود میں بادلوں کی اٹھکیلیاں اور پودوں کی ٹہنیوں پر پھولوں کے ہلکورے، ان سب کی کشش ہی تو اسے وہاں کھینچ لے گئی تھی ورنہ اُسے نہ فلمی گیتوں کا شوق تھا اور نہ لڑکے لڑکیوں کے بھونڈے مذاق پسند تھے۔ نہ ٹھوس علمی مسائل حل کر سکتی اور نہ سیاسی گتھیاں سلجھانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ پڑوسن کی دعوت کو اس نے قبول صرف اس لئے کیا تھا کہ مناظرِ فطرت کا حسن دیکھنے اور جھیل کے کنارے بیٹھ کر شعر سوچنے کے لالچ کو وہ نہ روک سکی تھی۔ وہ شعر جو کبھی قلم و کاغذ کے مرہونِ منت نہ ہوئے، رسالوں میں نہ چھپ سکے، مشاعروں میں داد و تحسین نہ پا سکے۔ جو کبھی اس کی زبان تک نہ آسکے۔ اس کے دماغ اور ذہن میں چھن کر کھاتے کھاتے اس کے دل میں تو وہ اتر آتے تھے مگر وہ انہیں آج تک موزوں نہ کر سکی تھی۔ اس کا دل بعض وقت بے قرار ہو جاتا۔ ایک عجیب بے چینی اور کسک وہ محسوس کرتی مگر شعر اس کی گرفت سے جانے کیسے پھسل جاتے کہ وہ ہاتھ پھیلائے ان کو پکڑنے کی کوشش کرتی رہ جاتی۔ پھر بھی اُسے امید تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہی حسین مناظرِ فطرت یہی دلکش اور رنگین خیالات اس کے روٹھے ہوئے شعروں کو منانے کا کام انجام دیں گے۔ یہ حسین و رنگین دنیائیں جو ابھی صرف تصور میں بستی ہیں ایک دن شعر کے سانچہ میں ڈھل کر نکلیں گی اور دنیا سے داد و تحسین پائیں گی۔

مگر اُف! اس کے سارے سُہانے خواب، سارے حسین تصورات خوبصورت اور دلکش دنیائیں چکنا چور ہوچکی تھیں۔ اب اس کے نازک دل اور حساس دماغ پر صرف ایک چیز کا راج تھا۔ ان گرسنہ نگاہوں کا جن کا اس دن مقابلہ ہوا تھا۔

جھیل کے کنارے ایک اونچے گھنے درخت کے سائے میں قالین بچھا کر اسی پر دسترخوان آراستہ کیا گیا۔ اس پر انواع و اقسام کی نعمتیں چن دی گئیں۔ پکنک کا موڈ ہر ایک پر طاری تھا۔ میزبان اور مہمان ہنس رہے تھے۔ بچے شوخیاں کر رہے تھے۔ عورتیں کھانے پینے کے

اہتمام سے خوش دلی سے مصروف تھیں اور میں میل کے سفر نے سب کی بھوک چمکا دی تھی۔

لیکن ابھی کھانا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ ہر طرف سے بھکاریوں کی یورش شروع ہو گئی۔ بوڑھے اپاہج مرد جو کولھوں یا ہاتھوں کے بل چل رہے تھے، اندھے جو لاٹھی یا کسی بچے کے سہارے آرہے تھے، کم سن ننگ دھڑنگ بچے اور بچیاں گندی جھولیاں لٹکائے ادھر اُدھر جھوٹن جمع کر رہی تھیں، نیم برہنہ عورتیں چیتھڑوں سے چو رہے جیسے بچوں کو چمٹائے پُر امید نظروں سے ان دھن وان، دیالو، رحم دل لوگوں کے شانِ کرم کی امید میں آس لگائے کھڑی تھیں جو ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنے دسترخوانوں کے گرد براجمان اور چیں بر جبیں تھے کہ اس پر لطف و پر مسرت وقت میں یہ بلائیں کہاں سے ٹپک پڑیں!

اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ان بھکاریوں کی تو گنتی ہی نہ تھی۔ صرف انھیں کے پاس نہیں ہر طرف پکنک اور سیر کرنے والوں کے ارد گرد اس گروہ کے افراد موجود تھے۔ اور اس نے اندازہ لگایا کہ تقریب قریب ہر جگہ سے انھیں ایک ہی جواب مل رہا تھا۔ لیکن بھکاریوں کی امید جواب نہیں دیتی تھی۔ وہ بار بار ادھر اُدھر گھوم کر پھر وہیں آجاتے تھے۔ شاید ان کے دل میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ انسان اتنا بے رحم، اتنا بے حس، اتنا بے درد نہیں ہو سکتا کہ خود ٹھوس ٹھوس کر شکم پُری کرے اور اور بھوکوں کو دو ٹکڑے بھی نہ دے!!

اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ سارا کھانا اٹھا کر ان بھکاریوں میں بانٹ دے! لیکن کسی دوسرے کے مال پر اس کا کیا حق ہے؟ تہذیب و تمدن کے اصول اس کو جکڑے ہوئے تھے۔ ایک گندی، مدقوق عورت اس کے سامنے ہاتھ پسار کر کھڑی ہو گئی۔ وہ رحم و کرم کی التجائیں کر رہی تھی اور خوشحالی اور پر مسرت زندگی کی دعائیں دے رہی تھی جو اس کے منہ سے بدترین گالیاں معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کا بھگناہ اور نہ برداشت کر سکی اور اس نے بٹوے میں سے کچھ پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے......

"ارے ارے آپا یہ نہ کیجئے! نہیں تو دس اور آجائیں گے ستانے" ایک نوجوان لڑکی نے اپنی قیمتی ساری کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"اسے ہے بیوی ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ یہ کمبخت مارے تو بھڑوں کے چھتے کی طرح چمٹ جائیں گے اگر کچھ دیا ان کو" گھر والی نے تنبیہ کی۔

"جی ہاں ابھی کچھ نہ دیجئے۔ چلتے وقت کچھ دے دیجئے گا" معزز مہمان نے فرمایا۔ ابھی ابھی انھوں نے ملک کے معاشی حالات پر بحث ختم کی تھی جس میں وہ حکومت پر کڑی تنقید فرما رہے تھے کہ وہ دیس کے بیکار بھوکے لوگوں کی طرف سے بالکل لاپروائی برت رہی ہے اور ان کی حالت درست کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔

چاروں طرف کی یورش سے گھبرا کر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ جیسے کوئی بڑا جرم کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ اصولاً تو وہ خود بھی بھکاریوں کی ہمت افزائی کو بہت برا سمجھتی تھی نا۔ پھر بھی کبھی اس سے یہ نہ ہو سکا کہ وہ زد میں آئے محتاج کو کچھ نہ کچھ دینے سے باز رہ سکے۔ بھکارن کے آنکھوں میں ایک پل کے لئے پیسوں کو دیکھ کر ہیرے کی کنی کی سی جو چمک پیدا ہوئی تھی وہ مرگئی، چہرے پر بے قراری اور مایوسی کے ملے جلے رنگ ابھر آئے اور دعاؤں میں اور تیزی پیدا ہو گئی۔

"جا جا بھاگ پرے! آجاتی ہیں منحوسیں لطف کرکرا کرنے"۔

"اس شہر میں تو بھکاریوں کی اس قدر کثرت ہے کہ معاذ اللہ"۔

"ان کمبختوں کو بھیک مانگنے میں مزا آوے ہے۔ نہیں تو ان کے پاس بہتیرے پیسے ہوں ہیں"۔ مجمع میں سے سب سے دولت مند کی بیوی نے اظہار خیال فرمایا۔

"ان لوگوں کو کوئی کام سکھانا چاہو، یا محتاج خانے میں رہنے کی رائے دو تو مانتے نہیں۔ بھیک میں مزا زیادہ ہے" ایک سوشل ورکر بولے۔

"دراصل یہ سارا قصور ہماری حکومت کا ہے" سیاسی بحث کے شوقین نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بحث چھیڑ دی۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ بحث بھی جاری تھی۔ بیچ بیچ میں ایک دوسرے کی خاطر تواضع بھی ہوتی جا رہی تھی......

ایک دم دونوں بچے چلائے "ممی ــــ ممی ــــ وہ دیکھو، وہ ــــ وہ" وہ دونوں خاصے سہمے ہوئے تھے۔

سب کی نظریں اٹھیں۔ اور ایک حقیر، ذلیل، عجیب الخلقت آدمی کو دیکھ کر بے پروائی سے دوسری طرف متوجہ ہو گئیں۔ اونہہ ــــ

بھلا ایسے عجیب، نامکمل آدمی بھی اس قابل ہیں کہ کوئی ان پر اپنی توجہ ضائع کرے !!

مگر وہ تو اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی جیسے سحر زدہ ہو گئی ہو۔ خوف، اذیت اور ہیجان کا ایک عجیب سا احساس اس کے وجود پر چھا گیا۔ اس نے آج تک ہزاروں بھکاری دیکھے تھے۔ بیمار بھی، اپاہج بھی، مصیبت زدہ بھی، بھوکے ننگے بھی۔ اس کے پیارے دیس میں بھکاریوں کی کوئی کمی تو نہ تھی لیکن یہ حال تو اس کا کبھی نہ ہوا تھا۔ ایسا گہرا اثر تو کسی نے نہ چھوڑا تھا۔

ایک انتہائی دبلے، بل کھائے، سیاہ جسم پر خوفناک حد تک پتلی لمبی گردن ایک طرف کو عجیب انداز سے جھکی ہوئی! اتنے لمبے قد پر ایک چھوٹا سا بے بالوں کا سر!! اتنے مختصر چہرے پر اتنی بڑی بڑی آنکھیں!!! بدن پر کپڑوں کے نام چند انتہائی گندی دھجیاں جو اس کے جسم کے کسی حصے کو بھی چھپانے میں کامیاب نہ تھیں..... لیکن اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو وہ شاید اسے بھول سکتی۔ ایسے مناظر تو آخر اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن اس کی بے رونق، بڑی بڑی بھیانک آنکھوں سے جو بھوک، بے پایاں ــــ اتھاہ بھوک ٹپک رہی تھی وہ اسے کیسے بھول جائے۔ اُف! ان دو مختصر آنکھوں میں جیسے ساری کائنات کی بھوک نے اپنا ڈیرا جما لیا تھا۔ جیسے زندگی کی ساری تمنائیں، آرزوئیں، خواہشیں، امنگیں سمٹ کر ایک نقطہ پر مجتمع ہو گئی ہوں۔ بھوک ــــ بھوک ــــ بھوک۔ آفرینش سے لے کر آج تک کے ان کروڑوں بھوکوں کی روح ان آنکھوں میں سے جھانکتی نظر آ رہی تھی جنہیں کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں ملا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ساری عمر میں — اور کتنی طویل ہوگی یہ عمر۔ شاید زالِ دنیا کے برابر — کبھی اس کی بھوک سیر نہیں ہوئی۔ وہ کوئی سحر زدہ روح ہے یا بھوت؟ ہر طرف لوگ کھا پی رہے تھے اور یہ بھوکی روح جس کے بھیانک وجود کو ہر طرف سے دھتکارا جا رہا تھا کھانوں کے آس پاس منڈلاتی پھر رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے والا بچہ جب ڈانٹ کھا کر اسے کھینچ کر پرے لے جاتا تو وہ اس کے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگتا مگر اس کی ربڑ کے ٹیوب جیسی گردن بالکل کھانوں کی طرف اس طرح مڑتی جاتی جیسے وہ مقناطیس کی طرف رخ کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی ٹپکتی ہوئی گرسنہ نگاہیں دور سے بھی ایک تار کی طرح دسترخوان سے بندھی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

وہ کھانا بھول گئی۔ دسترخوان پر چُنی ہوئی انواع و اقسام کی نعمتیں اسے مردار چیزیں معلوم ہو رہی تھیں۔ بھوک ــــ بھوک ــــ بھوک ــــ موجوں کا شور ــــ پرندوں کی چہکار، کھنکتے قہقہے ــــ بادلوں کی گھن گرج میں صرف ایک صدا سنائی دے رہی تھی، بھوک ــــ بھوک ــــ بھوک ــــ ساری کائنات بھوکی تھی۔

کب کھانا ختم ہوا؟ کب جھوٹے دال چاول، نچڑی ہوئی بوٹیاں، پھلوں کے چھلکے گدوں کی طرح ارد گرد منڈلانے والے بھکاریوں کو نک ٹکوڑ کر دے دیئے گئے؟ ــــ کب وہ سب کے ساتھ وہاں سے اٹھی؟ کب کشتی میں سب کے ساتھ سیر کی؟ کب پک نک ختم کر کے لوگ موٹروں میں جا کر بیٹھے؟ کب اس نے اپنے زد میں آئے کسی بھکاری کو اپنی ساری پونجی ــــ جو چند روپوں سے زیادہ نہ تھی ــــ دے دی؟ اُسے اب کچھ بھی اچھی طرح یاد نہ تھا۔ بس دو گرسنہ نگاہیں تھیں جو اس کے دماغ میں جم گئی تھیں۔ دو پھانسیں تھیں جو دل میں چبھی ہوئی کھٹک رہی تھیں۔ کیا کرے؟ کیسے اُسے سکون ملے؟ اس کے شعر اس سے روٹھ گئے تھے۔ حسین مناظرِ فطرت آنکھیں چرانے لگے تھے، رومانی تصورات اور رنگین و حسین خیالات کھو گئے تھے؟ کیا وہ اپنی ہر متاع کھو چکی؟ دنیا کو بدلنا اس کے بس کی بات نہیں۔ ان لاکھوں بھوکوں کو جو زندگی کی ہر بھوک سہتے رہتے ہیں ــــ وہ سیر نہیں کر سکتی تو پھر وہ کیا کرے؟ کیسے اس سب کو جھیلے؟ اگر وہ اس دنیا کے دکھ درد کو دور نہیں کر سکتی تو اس کی زندگی کا حاصل؟ آہ ــــ کیا وہ عمر بھر اب ان گرسنہ نگاہوں کے جال میں پھنسی رہے گی؟ اس کے دل میں مسلسل یہ کھٹک ــــ یہ کسک موجود تھی۔ اور پھر ایک دن۔ جانے کیسے۔ اس کے دماغ میں کون سی کھڑکی کھلی؟ آمد کا یہ سیلاب، یہ طوفان کہاں سے آ گیا؟ اس عالم میں اس نے کیا کیا؟ وہ یہ سب نہیں جانتی۔ اُسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ پچیس تیس بند کی ایک نظم کاغذ پر لکھی اس کے سامنے پڑی ہے جس میں اس کی روح کی کسک، دل کا درد، دماغ کی تپک سموئی ہوئی ہے۔ اس کے احساسات و جذبات شعر کے سانچے میں ڈھلے اس کے سامنے پڑے تھے۔

(بقیہ صفحہ ۸۶ پر)

حضرت محل

روش صدیقی

۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں جن شجاعانِ وطن نے کارہائے نمایاں انجام دیے، ان میں اودھ کی بہادر بیگم حضرت محل بھی شامل ہے۔ حریم شاہی کی یہ ناز آفریں خاتون، بہ کمال ہمت و فراست فرنگی اقتدار کے خلاف، عمر کے آخری لمحات تک لڑتی رہی۔ اس کی غیرت و حمیت نے نیپال کے جنگلوں میں مرگِ غربت کو قبول کیا، لیکن غاصب انگریزوں سے پیمانِ صلح گوارا نہ کیا۔

ع۔ خدا رحمت کند، آں کشتۂ تیغِ حمیت را

بہ سوزِ سرمدی حضرت محل کی داستاں کہیے
نہ کہیے شمع اک پروانۂ آتش بجاں کہیے

اُٹھے خاکِ اودھ سے جنگ آزادی کے دیوانے
وہ دیوانے کہ رشکِ ہوشمندانِ جہاں کہیے

وہی حجلہ نشیں تھی رہ نما ان سرفروشوں کی
اُسے ان سرفروشوں میں امیرِ کارواں کہیے

وہ اُس کا جذبۂ غیرت، وہ اُس کی ہمت عالی
جسے شایانِ شانِ دخترِ ہندوستاں کہیے

فرنگی کو کیا محصور اُس کی سعیِ پیہم نے
مگر کیا قصۂ تزویرِ دَورِ آسماں کہیے

بچھائے سازشوں کے جال ہر سو خود فروشوں نے
وہی پیماں شکن نکلے کہ جن کو پاسباں کہیے

شکستوں پر بھی وہ اک اک قدم پر رزم آرا تھی
دلِ نازک کو اُس کے برتر از سود و زیاں کہیے

فرنگی سرنگوں تھا اُس کی خودداری کی عظمت سے
وہ خودداری کہ جس کو بے پناہ و بے اماں کہیے

اودھ چھوٹا، بنا غربت میں گھر صحرا ہوا مسکن
کہاں تک کاروانِ بیکسی کی داستاں کہیے

بظاہر اُس کی جاں بازی کو یوں ناکام ہونا تھا
مشیت کا اشارا ہے کہ اس کو کامراں کہیے

نچھاور جان بھی کر دی، وطن کے عشق میں اُس نے
روشؔ! اس کو شہیدِ اُلفتِ ہندوستاں کہیے

غزل

جگن ناتھ آزاد

دیکھے کوئی جو دیدۂ بینا لئے ہوئے
ذرے ہیں آفتاب کی دنیا لئے ہوئے

تیرا خیال ہے یہ مرے دل میں یا کوئی
قطرہ ہے اپنے ظرف میں دریا لئے ہوئے

مخصوصِ طور ہی تو نہیں جلوہ اے کلیم!
ہر ذرہ ہے تجلیٔ سینا لئے ہوئے

دل ہر غمِ جہاں سے گزرتا چلا گیا
تیرے ہی ایک غم کا سہارا لئے ہوئے

پھر اُن کی بزمِ ناز کی جانب رواں ہے عشق
ترکِ تعلقات کا دعوےٰ لئے ہوئے

میرے ہر ایک دوست پہ قرباں ہے دل مرا
میرے ہر ایک دوست کا شکوا لئے ہوئے

دل ہر قدم پہ تیرے سہارے کا منتظر
دُنیا تمام دل کا سہارا لئے ہوئے

اپنا بھی دل ہے پردہ کشائے ازل، جو وہ
حُسنِ ازل کا رُخ پہ ہیں پردا لئے ہوئے

تنہا انھیں نہ دیکھ سکا میں کہ آئے وہ
پردا لئے ہوئے کبھی جلوا لئے ہوئے

منجدھار سے کہو کہ اب آئے سنبھل کے وہ
کشتی چلی ہے عزم کے دریا لئے ہوئے

سنسکرت کا عظیم ڈرامہ نگار — بھوبھوتی

بشیشر پرشاد منور لکھنوی

مہاویر چرت۔ مالتی مادھو اور اتر رام چرت کے مشہور مصنف بھوبھوتی کا شمار سنسکرت زبان کے اہم اور بلند پایہ تمثیل نگاروں میں ہوتا ہے۔ عام طور پر سنسکرت زبان کے دوسرے تمثیل نگاروں حتیٰ کہ کالی داس ایسے شہرہ آفاق تمثیل نگار کے مصدقہ حالات زندگی بھی دستیاب نہیں ہوتے لیکن بھوبھوتی کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ اُن کے بیشتر حالات ان کی اولین تخلیق مہاویر چرت سے اور کچھ اتر رام چرت میں ملتے ہیں۔

مہاویر چرت کے مطابق بھوبھوتی کا سلسلۂ نسب کرشن یجر وید کی شاخ تیتریہ [illegible] کے کیشپ گوتر والے بڑے عالم اور تقدس مآب پروہتوں کے خاندان سے ملتا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ مہاکوی کہلاتے تھے۔ مہاکوی سے مراد ہے شاعر اعظم۔ مہاکوی کی دو نسلوں کے بعد بھٹ گوپال ہوئے۔ بھوبھوتی انھیں بھٹ گوپال کے پوتے اور پنڈت نیل کنٹھ کے بیٹے تھے۔

یہ خاندان جنوبی ہند کے مقام پدم پور میں آباد تھا۔ پدم پور، موجودہ [illegible] جسے ودربھ دیش کہتے ہیں، واقع تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ پدم پور نام کا ایک گاؤں مدھیہ پردیش کے ضلع بھنڈارا میں اب بھی موجود ہے۔ بھوبھوتی کا پورا نام اومیرا بھوبھوتی نیل کنٹھ تھا۔ سری کنٹھ ان کا لقب تھا۔

اب تک جو تحقیقات ہوئی ہے اس کے مطابق بھوبھوتی آٹھویں صدی بعد مسیح کے پہلے چوتھائی حصے یعنی ۷۲۵ء میں ہوئے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر نے اس تحقیقات کی اس لئے تائید کی ہے کہ مشہور سنسکرت مصنف وامن نے تقریباً ۸۰۰ء میں بھوبھوتی کا ذکر اپنی تصنیف کاویہ النکار سوتر ورتی میں کیا ہے اور بان نے اپنے ناٹک میں جو ۶۲۵ء کی پیداوار ہے بھوبھوتی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے اگرچہ اس میں کالی داس۔ پرورسین اور سنسکرت زبان کے دوسرے شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ "انسائیکلوپیڈیا برٹانکا" میں بھی بھوبھوتی کا زمانۂ وجود ۷۰۰ سال بعد مسیح تحریر کیا گیا ہے۔ بھوبھوتی کالی داس کے بعد ہوئے اس میں کوئی شک ہی نہیں کیونکہ انھوں نے اپنے ناٹک مالتی مادھو میں کالی داس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ بھوبھوتی کو قنوج کے راجا یشو ورمن کی سرپرستی حاصل تھی۔ کشمیر کے حکمراں للتادتیہ نے یشو ورمن پر حملہ کرکے قنوج کو فتح کرلیا تھا۔ یہ واقعہ ۷۲۱ یا ۷۴۴ سال بعد مسیح کا ہے۔ للتادتیہ نے ۶۹۳ء یا ۷۰۰ء سے لے کر ۷۳۶ء تک حکومت کی لیکن کتاب گنڈواہو کے مصنف واک پتی اور ڈاکٹر جیکبی کے مطابق یشو ورمن کو شکست ۷۳۳ء میں ہوئی۔ اس بیان کی تائید چینی مورخوں کی یادداشتوں سے بھی ہوتی ہے۔ جینیوں کے مذہبی گرنتھوں سے پتہ چلتا ہے کہ یشو ورمن کا انتقال ۷۵۰ء اور ۷۵۵ء کے درمیان ہوا۔ واک پتی بھی راجہ یشو ورمن کا ملازم تھا۔ اُس نے اپنی تصنیف گنڈواہو میں بھوبھوتی کے لئے شکرگزاری کا اظہار کیا ہے۔ گنڈواہو کی تصنیف کا زمانہ غالباً ۷۳۴ء ہے۔ اسی لئے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ بھوبھوتی ساتویں صدی کے اواخر اور آٹھویں صدی کے اوّلین چوتھائی دور میں ہوئے یعنی آٹھویں صدی سے لے کر گیارھویں صدی کے درمیان جو اور سنسکرت

جنت ہوئے ہیں مثلاً ٹیسے میندر، اوز کیم تیھٹ، داسن اور ونٹرنج۔ انھوں نے بھی اپنی تصنیفوں میں بھو بھوتی کو دعائے خیر سے یاد کیا ہے اور بھو بھوتی کے کلام کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر مغربی ماہرین ادب مثلاً البیرٹ ویبر لیوپولڈ۔ اسکروڈر، میکڈانلڈ اور ونسنٹ سمتھ نے اپنی اپنی تصنیفات میں بھو بھوتی کا زمانہ آٹھویں صدی بعد مسیح کا اولین حصہ قرار دیا ہے۔ صرف آنند بوروا نے لکھا ہے کہ بھو بھوتی کسی صورت میں بھی پانچویں صدی بعد مسیح نہیں ہوئے۔ مگر ڈاکٹر ٹوڈرمل نے اپنی تحقیقات سے مدلل طور پر بوروا کے دعوے کو باطل ثابت کر دیا ہے۔

بعض پنڈتوں کے خیال میں بھو بھوتی کالی داس کے ہم عصر تھے۔ وہ دونوں باکمالوں کو راجہ بھوج کے دربار سے وابستہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ بہت سی روایات بھی دونوں کے متعلق گڑھ لی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر بھوج پربندھ کے مطابق روایت ہے کہ ایک مرتبہ راجہ بھوج نے دونوں باکمالوں سے ایک اشلوک بنانے کے لئے خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ دونوں نے طبع آزمائی کی اور اپنا اپنا اشلوک بھوج کے سامنے پیش کیا۔ بھوج نے دونوں کے اشلوکوں کو ایک ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر بھونیشوری دیوی کے مندر میں تولا۔ بھو بھوتی کے اشلوک والا پلڑا اونچا ہو گیا تو دیوی جی ظہور پذیر ہو گئیں اور انھوں نے بھو بھوتی والے پلڑے میں اپنے کانوں سے کچھ شہد ٹپکا دیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ بھو بھوتی نے جب اتر رام چرت لکھا تو کالی داس کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے۔ کالی داس اس وقت کسی کھیل میں مصروف تھے۔ انھوں نے بھو بھوتی سے بہ آواز بلند پڑھنے کے لئے کہا اور خود کھیل کی طرف متوجہ رہے۔ اس سے بھو بھوتی کی بڑی دل شکنی ہوئی مگر انھوں نے کسی نہ کسی طرح پورا ناٹک پڑھ ہی دیا۔ ناٹک ختم ہوتے ہی کالی داس نے اس کی بہت تعریف کی مگر قواعد کی رو سے اس میں ایک مقام پر ایک غلطی کی طرف بھی اشارہ کیا۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ بھو بھوتی، ڈنڈی اور کالی داس کو پورتی (تکمیل) کے لئے ایک سمسیا دی گئی۔ تینوں نے علاحدہ علاحدہ تین مصرعوں سے سمسیا پوری کر دی۔ چوتھا مصرع خود راجہ بھوج نے تصنیف کیا۔ ایک اور دلچسپ روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ علم کی دیوی سرسوتی نے ڈنڈی، کالی داس اور بھو بھوتی کو ملاکر یہ گیند کھیلتی ہوئی ایک نوجوان حسینہ کی شکل میں درشن بھی دیئے۔ لیکن یہ سب روایات محض منگھڑت معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی کوئی تاریخی اور قابل وثوق بنیاد نہیں کیونکہ کالی داس بھو بھوتی سے کئی صدی پہلے ہوئے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے راجہ بھوج کا بھی کہیں وجود نہیں پایا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ امر مسلّم ہے کہ بھو بھوتی کا وطن ودربھ دیش ہے لیکن قطعی طور سے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ مہاراشٹری تھے یا دراوڑ نسل سے ان کا تعلق تھا کیونکہ پدم پور میں دونوں نسلوں کے برہمن آباد تھے۔ بعض نقادوں اور خاص طور پر اتر رام چرت کے مترجم گنشام کو، بھو بھوتی کے انداز نگارش میں دراوڑی اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے لیکن بھو بھوتی کے ناٹکوں سے معلوم ہوگا کہ ان میں دراوڑی طرز تحریر کہیں بھی خاص طور پر نمایاں نہیں ہے۔ یہی خیال پروفیسر شودر اور دیوادھار کا بھی ہے۔

کچھ مختلف اشلوکوں کے علاوہ جو بھو بھوتی سے منسوب کئے جاتے ہیں، ان کی خاص تصانیف تین ہیں اور یہ تینوں تصانیف ناٹک ہیں۔
(۱) مہاویر چرت (۲) مالتی مادھو (۳) اتر رام چرت۔

مختلف محققوں کے درمیان ان تینوں ناٹکوں کے زمانہ تصنیف کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ ڈاکٹر کیتھ، کالے اور کچھ دوسرے مصنف کہتے ہیں کہ بھو بھوتی نے پہلے مالتی مادھو لکھا اور اس کے بعد مہاویر چرت اور اتر رام چرت مگر ڈاکٹر بھنڈارکر، ڈاکٹر بیلوالکر، ڈاکٹر ٹوڈرمل، پرنسپل کرمارکر اور بعض دوسرے اصحاب کے خیال میں مہاویر چرت کی تخلیق پہلے ہوئی اور اس کے بعد مالتی مادھو اور اتر رام چرت کا علی الترتیب ظہور ہوا۔ پرنسپل ایس رائے کی رائے میں مہاویر چرت اور اتر رام چرت یکے بعد دیگرے معرض وجود میں آئے اور اس کے بعد مالتی مادھو کی تخلیق ہوئی۔

تینوں گروہوں کے محققوں نے اپنے اپنے دعاوی کی تائید میں دلیلیں پیش کی ہیں اور یہ دلیلیں یقیناً بہت دلچسپ ہیں مگر مجھے تو پروفیسر کرشت کا خیال زیادہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ مہاویر چرت کی تخلیق تو بہرحال سب سے پہلے ہوئی، اس کے بعد اتر رام چرت وجود میں آیا لیکن مہاویر چرت کی ناکامی سے بد دل ہو کر بھو بھوتی نے اتر رام چرت کو دبا رکھا۔ چونکہ مہاویر چرت سے عوام کے مذاق کی تسکین نہیں ہوئی تھی اس لئے انھوں نے مالتی مادھو نام کا رومانی ناٹک لکھ کر پیش کیا۔ مالتی مادھو عوام کے معیار پر پورا اترا۔ اس کے بعد بھو بھوتی کو اتر رام چرت پیش کرنے کی

ہوئی۔ اس خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ چونکہ مہاویر چرت اور اُتر رام چرت دونوں کا موضوع ایک ہی ہے یعنی بھگوان رام چندر کے حالات زندگی کی عکاسی اور ترجمانی۔ (مہاویر چرت رام چندر جی کی زندگی کے پہلے دور سے متعلق ہے اور اُتر رام چرت دوسرے دور سے) یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ ایک مسلسل ناٹک کا پہلا حصہ بھو بھوتی نے پہلے لکھا اس کے بعد مالتی مادھو ناٹک شروع کر دیا اور پھر اُتر رام چرت کی تخلیق ہوئی۔ درست خیال یہی معلوم ہوتا ہے کہ بھو بھوتی نے پہلے مہاویر چرت، اس کے بعد اُتر رام چرت اور سب سے آخر میں مالتی مادھو کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہوگا۔

بھو بھوتی ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی سمجھے جاتے ہیں اور ایک کامیاب تمثیل نگار بھی۔ خاندانی روایات کے مطابق تمام دینی و دنیوی علوم انھوں نے حاصل کر لئے تھے۔ وید، پُران، شاستر، اپنشد، گیتا اور رامائن میں تو ان کو کامل دسترس حاصل تھی ہی، انھوں نے علم طب اور علم ہیئت و نجوم بھی حاصل کیا۔ وہ تنتر شاستر کے بھی ماہر تھے۔ نیتی شاستر اور راج نیتی کا مطالعہ بھی انھوں نے کیا تھا۔ کچھ دخل بودھی ادب میں بھی تھا۔

بھو بھوتی کے مذہبی عقائد کے متعلق بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ٹوڈرمل کی رائے میں بھو بھوتی کا تعلق شیوی مت سے تھا مگر پروفیسر کاردار تھن کے خیال میں بھو بھوتی وشنو اور بڑے رام بھگت تھے۔ مگر چونکہ بھو بھوتی نے اپنے ناٹکوں میں بھگوان شو کی بھی حمد لکھی ہے، گنیش جی کی بھی اور رام چندر جی کی بھی، اس لئے انھیں بجا طور پر ویدانتی کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہمہ اوست و ہمہ از وست کے قائل معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی خاص اور مرکزی توجہ رام بھگتی کی طرف تھی۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ ان کے تین ناٹکوں میں دو ناٹک صرف رام چرتر ہی کے لئے وقف ہیں۔

بھو بھوتی کے ایک عالم جید اور فاضل اجل ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ وہ پہلو میں شاعر کا دل لے کر بھی پیدا ہوئے تھے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بھرپور تھا ان کے معلومات اور مشاہدے بھی وسیع تھے۔ زندگی کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا

یہ ایک اتفاق ہے کہ جو ڈراما انھوں نے سب سے پہلے بڑے ذوق و شوق سے تیار کیا اسی کو مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی ناکامی کے متعدد اسباب تھے۔ اس ناکامی سے بھو بھوتی کے حساس دل کو چوٹ لگی کیونکہ ان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں میں پورا اعتماد تھا۔ یہ اسی اعتماد کو دھکا پہونچنے کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے مالتی مادھو میں نقادوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ غالب کی طرح ان کو بھی ایک مرتبہ یہ کہنا پڑا کہ

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اگرچہ ان کو اپنی زندگی میں بھی اپنی مقبولیت کی قطعی امید تھی۔ اتر رام چرت میں بھی انھوں نے نقادوں کو بُرا بھلا کہا ہے مگر اس ناٹک میں بھو بھوتی کا فن پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ جو خامیاں پہلے مہاویر چرت اور اُس کے بعد مالتی مادھو میں رہ گئی تھیں اتر رام چرت اُن سے بہت بڑی حد تک پاک ہے۔ مہاویر چرت میں زبان و بیان کی غرابت تھی۔ شوکت الفاظ سے بہت کام لیا گیا تھا۔ روزمرّہ کی گفتگو میں بھی دقیق، مشکل اور مقفیٰ مسجع طرز عبارت اختیار کی گئی تھی۔ اس سے جب ڈراما پبلک کے سامنے آیا تو لوگوں کے کچھ پلّے نہ پڑا۔ مالتی مادھو میں شاعر نے زبان بھی بدلی اسلوب بیان بھی بدلا اور اُسے روزمرّہ کی زندگی سے قریب رکھا لیکن اتر رام چرت میں تو بھو بھوتی نے زبان و بیان کے ایسے دل کش، دل دوز اور پُر اثر نمونے پیش کئے ہیں کہ پڑھنے والا فنکار کی داد دینے پر بے ساختہ مجبور ہو جاتا ہے

غرض اگر کالی داس کو سنسکرت زبان کا شیکسپیر کہا جاتا ہے تو بھو بھوتی کو اس کا ملٹن کہنا بھی کچھ بے جا نہ ہوگا۔ کالی داس کی طبیعت میں بلا کی روانی ہے۔ انسانی عادات و خصائل نیز جذبات کے ہر پہلو میں وہ آب و آتش سے جس طرح رنگ آمیزی کرتے ہیں اسی طرح بھو بھوتی تمام ہیئتوں اور چیزوں کو اپنی طرف کھینچ کر خود اپنے نصب العین یا آدرش کی وحدت میں سمیٹ لیتے ہیں۔ بھو بھوتی کا رنگ بھی انفرادی رنگ ہے۔ ان کے ناٹکوں میں ان کی زندگی کے گوناگون تجربات کی عکاسی ہے۔ یہ تجربات ہی ان کا سرمایۂ حیات ہیں جنھیں انھوں نے حافظے میں محفوظ رکھ کر دنیا کے سامنے ایسی زبان اور ایسے انداز بیان میں پیش کیا ہے جو اپنی جگہ لاجواب ہے۔

بھو بھوتی کے ناٹکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسرار عجائبات کے بھی قائل ہیں۔ دوستی اور دوست نوازی کا احساس انھیں بہت زیادہ ہے۔ بچپن کی اداؤں پر وہ دل و جان سے فریفتہ ہیں اور وہ اولاد کو ماں باپ

کے رشتۂ اُلفت کی گرہ سمجھتے ہیں۔ وہ فرض اور محبت کے شاعر ہیں۔ اُنکے ڈراموں کے تحت مقصدیت کام کرتی نظر آتی ہے۔ وہ دنیا کو ایک پیغام دیتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بھوبھوتی کے ذہن میں مکمل جمہوریت یا مارکسیت کی طرح کا کوئی اشتراکی خاکہ نہیں کھینچا ہوا تھا۔ پھر بھی انھیں انسانی قدروں کا احساس بدرجۂ اتم ہے۔ ان کی فکر، ان کا احساس اور ان کا ارادہ بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے ہوتا ہے۔ بسا اوقات فرض کا احساس انھیں زندگی اور محبت سے زیادہ بلند و برتر نظر آنے لگتا ہے۔ ان کے دل میں غم دوراں بھی ہے اور غم جاناں بھی۔ غم جاناں کو ان کی نظر میں مذہب کی سی اہمیت حاصل ہے۔ محبت کو وہ خدا سمجھتے ہیں اور خدا کو محبت۔ سچائی ان کے لئے محبت ہے اور محبت سچائی۔ رام اور سیتا کی محبت کو وہ جنسی محبت کی معراج سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں سچی محبت ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے۔ اس راستے میں انھیں کہیں بھی شکست و ہزیمت کا امکان نہیں نظر آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اتر رام چرت میں رام اور سیتا کو دوبارہ یکجا کر دیا ہے گویا والمیک جی کے پلاٹ میں رام اور سیتا کی جدائی سے جو حزنیہ پہلو پیدا ہو گیا تھا ایک طرح سے بھوبھوتی نے اس کی تلافی کر دی اور ناٹک کو طربیہ بنا دیا جسمانی اور روحانی محبت میں بھوبھوتی کو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ محبت خواہ جسمانی ہو خواہ روحانی بہرحال محبت ہی رہتی ہے۔ ورنہ اس کو محبت کے نام سے موسوم ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ بھوبھوتی کا نظریہ مختصراً میرے اس شعر سے ملتا جلتا ہے ؎

پتہ لگا ہے جہاں تک نگاہ پہونچی ہے
خدائے پاک کے در تک یہ راہ پہونچی ہے

بھوبھوتی کے ناٹکوں میں جسمانی اور روحانی محبت کے تمام مدارج کا اظہار پایا جاتا ہے۔ جنسی محبت میں وہ دو نگاہوں کا چار ہونا، دلوں کا دھڑکنا، دزدیدہ نگاہی سے کام لینا، دزدیدہ تبسم بکھیرنا، شدت جذبات، وصل اور ہجر کی کیفیات، ازدواجی تقدس اور اس کی معنویت، زن و شوہر کے درمیان محبت کے ابتدائی درجے میں جھجک، اس کے بعد دونوں میں بے تکلفی پھر ایک دوسرے کے غم و مسرت میں دونوں کی شرکت، محبت کے بناؤ بگاڑ وغیرہ، اس قسم کے تمام تجربات بھوبھوتی کے ناٹکوں میں منقوش و مرتسم

نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھوبھوتی عاشقانہ ازدواج کے قائل ہیں اور اس کا ثبوت ان کے مالتی مادھو ناٹک میں ملتا ہے۔ مختصر بھوبھوتی کی نظر میں محبت خواہ جسمانی ہو خواہ روحانی، اپنی جبلّی یزدانیت کی قوت سے موت پر بھی فتح یاب ہو جاتی ہے۔ محبت کو شکست تو کبھی ہوتی ہی نہیں بھوبھوتی چونکہ تناسخ کے قائل ہیں اس لئے ان کا عقیدہ ہے کہ اگر محبت ایک زندگی میں کامیاب نہیں تو دوسری زندگیوں میں کامیاب ثابت ہو سکتی ہے۔

در اصل، سنسکرت زبان کا اگر کوئی شاعر کالی داس کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ بھوبھوتی ہیں، کالی داس کے یہاں متانت اور سنجیدگی ہے اور بھوبھوتی کے یہاں جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب اتر رام چرت کی تخلیق سے متاثر ہو کر سنسکرت زبان کے کچھ علماء بھوبھوتی کو کالی داس پر ترجیح دینے لگے تھے۔ دونوں فنکاروں میں اوریجنلٹی یعنی اختراعی صلاحیت موجود ہے۔ دونوں شعر گوئی کو فطری اسلوب پر قادر ہیں اور دونوں کا مذاق عبارت انفرادی شان رکھتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ بھوبھوتی نے کالی داس کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اتباع بھی، پروفیسر ولسن کا ارشاد ہے کہ کالی داس تخئیل کے بادشاہ ہیں اور بھوبھوتی کے مقابلہ میں ان کا فنی رتبہ بہت بلند ہے۔ کالی داس وہی بات اشارات سے ظاہر کر دیتے ہیں جس کے لئے بھوبھوتی کو پرزور عبارت آرائی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک ایجاز کا مالک ہے تو دوسرا اطناب پر حاوی۔ کالی داس کو ڈرامے میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے بدوشک (مسخرے) کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر بھوبھوتی کے کسی ڈرامے میں بدوشک کو رکھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ اکثر مغربی علماء کا خیال ہے کہ کالی داس کے ناٹکوں میں جو طرز پائی جاتی ہے، بھوبھوتی کے ناٹک اس وصف سے محروم ہیں۔ کالی داس کے یہاں رکاکت نام کو نہیں۔ بھوبھوتی سے بعض مقامات پر ایسی لغزشیں ہوئی ہیں۔ کالی داس کا طرز تحریر سادہ شیریں اور فطری ہے اور اس میں ویدربھی (वैदर्भी) اسلوب پایا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے بھوبھوتی کے یہاں غرابت، پیچیدگی اور شوکت الفاظ کی کثرت ہے۔ ان کا اسلوب کسی حد تک مصنوعی ہوتا ہے اور گوڑی (गौडी) سانچے میں ڈھلتا ہے۔ بھوبھوتی کا کلام غیر روایاتی ہے کالی داس کا روایاتی۔ بھوبھوتی کے یہاں عام انسانوں کے جذبات کی تصویر کشی ہے۔ وہ انسانوں کے دلوں کی پراسرار

کچھ اشیوں میں آ جاتے ہیں۔ کالی داس کے یہاں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ بہرحال بھوبھوتی شدت پرست ہیں۔ ان کے کلام میں قوت بدرجۂ اتم ہے بخلاف اس کے سادگی اور سلاست کالی داس کا طرۂ امتیاز ہے۔

بھوبھوتی کے دونا ٹکوں یعنی مہاویر چرت اور اُتر رام چرت کا پلاٹ رامائن سے لیا گیا ہے اگرچہ دونوں میں کچھ تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں فنی تقاضوں کے لحاظ سے کتنی ہی ضروری اور حسین کیوں نہ ہوں مگر والمیک اسکول میں عقیدت رکھنے والوں کو اکھرتی ہیں اس لئے کہ والمیک کی تصنیف کردہ رامائن میں جو بنیادی چیز ہے کوئی بات ایسی نہیں ملتی جن سے ان تبدیلیوں کا جواز ثابت ہو سکے۔ واقعات کی ترتیب، کرداروں کی واقعاتی حیثیت میں اُلٹ پھیر۔ فرضی عناصر کا داخلہ، ان سب باتوں سے تو ایک مرتبہ اُس طبقے کو ضرور ہی ٹھیس پہونچتی ہے جو بھوبھوتی کے رام کی داستان کو والمیک کے رام کی داستان سے مختلف پاتے ہیں اگرچہ بھوبھوتی کا بھی شمار رام بھگتوں میں ہوتا ہے۔ مالتی مادھو کا ماخذ ہے ایک پرانی کتھا۔ اس میں کئی مقاموں پر کالی داس کے میگھ دوت اور وکرم اروشی کے کچھ حصوں کی نقالی پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود تینوں ناٹکوں میں بھوبھوتی کی فنکاری کا کمال بہرحال قابل توجہ ہے اور واقعاتی تبدیلیوں نیز دوسری خامیوں کے باوجود انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم کم از کم بھوبھوتی کے ان طلسم کدوں کی سیر تو کریں اور اپنے مذاق و نظر کے مطابق انکے متعلق فیصلہ صادر کریں۔

مہاویر چرت اور اتر رام چرت میں سات سات ایکٹ ہیں اور مالتی مادھو میں دس ایکٹ ہیں۔ مہاویر چرت میں رامچندر جی کی زندگی کا وہ حصہ پیش کیا گیا ہے جس میں رام اور لکشمن وشوامتر کے یگیہ کی حفاظت کے لئے جاتے ہیں پھر شیو دھنش توڑ کر سیتا جی کے ساتھ رامچندر جی کی شادی ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں دھنش کے ٹوٹنے پر پرسرام جی کا غیظ و غضب اور راجا جنک، ان کے وزیر شتانند، وشوامتر اور وششٹ پر ان کا عتاب اور بالآخر رامچندر جی کی مداخلت سے پرسرام کے زعم کی شکست، پھر رام بن باس۔ سیتا ہرن۔ سیتا جی کی تلاش۔ سگریو اور ہنومان جی سے دوستی، راون کے حامی بالی کا قتل، ہنومان جی کے لنکا میں داخلے، پھر سکتِ بندھو کے ذریعہ رامچندر کی طرف سے لنکا کے محاصرہ، انگد کی ناکام سفارت اور اس کے بعد رام راون کی لڑائی کا انجام کار رام کی جیت اور سیتا جی کے ساتھ ایودھیا میں واپسی، یہ تمام واقعات ناٹک میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اتر رام چرت میں عامۃ الناس کی رائے کے احترام میں فرض و محبت کی کشمکش میں مبتلا ہو رامچندر جی کا سیتا جی کو ترک کر کے بن باس کیلئے بھیجنا، وہاں والمیک جی کے آشرم میں رہ کر لَو اور کُش کا پیدا ہونا، رامائن کی تصنیف، لَو کُش کے ذریعہ رامائن کی اشاعت اور رامچندر جی کے دربار تک رسائی، رامچندر جی کی طرف سے اشومیدھ یگیہ کی تیاری، ان کے شیام کرن گھوڑے کی لَو کُش کے ہاتھوں گرفتاری، پھر ایک طرف لَو کُش اور دوسری طرف رامچندر جی کی فوج اور بالآخر خود رامچندر جی کے درمیان جنگ پھر سیتا جی کی مداخلت سے جنگ کا خاتمہ، سیتا جی کی دوبارہ آزمائش اور پھر رامچندر جی کے ساتھ ایودھیا میں واپسی، یہ سب واقعات دکھائے جاتے ہیں۔

مالتی مادھو میں دکھایا گیا ہے کہ مالتی، پدماوتی کے وزیر بھوری واسو کی لڑکی ہے اور مادھو، ودربھ دیش کے وزیر دیودت کا ایک بیٹا ہے۔ دونوں وزیروں میں طے ہو جاتا ہے کہ وہ مالتی مادھو کو ازدواجی رشتے میں منسلک کر دیں گے لیکن پدماوتی کا حکمراں یہ نہیں چاہتا۔ وہ مالتی کی شادی ایک شخص نندن کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ بھوری واسو حکمراں کی مرضی کے خلاف جانا نہیں چاہتا مگر لڑکی کی شادی مادھو ہی کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ ایک راہبہ کنڈ کی مالتی اور مادھو کی شادی کے لئے دوسری تدابیر اختیار کرتی ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ مادھو کے دوست مکرند کی شادی نندن کی بہن مدنیکا کے ساتھ ہو جائے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ سازش کرتی ہے۔ مگر مالتی کا اغوا ہو جاتا ہے۔ تنتریوں کا ایک گرو، اگھور گھنٹ، اسے قتل کر کے دیوی جی کو چڑھانا چاہتا ہے۔ مادھو کو اس کا پتہ لگ جاتا ہے اور وہ مالتی کو چھڑا لاتا ہے۔ مادھو خود بھی دل شکستہ تھا کیونکہ مالتی کی شادی اس کے بجائے نندن کے ساتھ ہونے والی تھی۔ اس لئے وہ بھی جان دینے پر آمادہ تھا مگر مالتی کو اگھور گھنٹوں کے پنجۂ ظلم میں گرفتار دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ اسے چھڑا کر کنڈ کی کے گھر پہونچ جاتا ہے۔ دوسری طرف نندن کے ساتھ مکرند شرارت کر کے خود مالتی کے بھیس میں اس کے ساتھ شادی رچاتا ہے مگر یہ شرارت کھل جاتی ہے۔ مدنیکا اپنی شادی مکرند کے ساتھ کرنا چاہتی

ہے۔ وہ اس پر جان و دل سے عاشق ہے اور کرند بھی اس کے تیر نظر کا شکار ہے۔ ایک مرتبہ پھر تنتر ک کپال کنڈ ھ کے ہاتھوں مالتی کا اغوا ہوتا ہے۔ مادھو اس کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے اور سودامنی کے ذریعہ مالتی کا پتہ چل جاتا ہے۔ سودامنی مادھو کو بھی خودکشی سے بچاتی ہے اور بھوری واسو کو بھی جو مالتی کی جدائی میں جان دینے پر آمادہ تھا۔ دونوں کے سلامت یکجا ہوجانے پر پدماوتی کا حکمراں بھی مالتی مادھو کی شادی کے لئے رضامند ہوجاتا ہے اور مکرند اور مدنتیکا کی شادی کے لئے بھی اجازت دے دیتا ہے اور اس طرح ناٹک کا انجام طربیہ رُخ اختیار کرلیتا ہے۔

بھوبھوتی کے ناٹکوں کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ان کا حقیقی آرٹ تفصیلات میں ہے۔ ابھی تک ان کے کسی ناٹک کا ترجمہ اُردو میں نہیں ہوا۔ کالی داس کے ناٹکوں اور دوسرے کارناموں کے تراجم تو اردو نظم ونثر میں ہوچکے ہیں۔ ان کے کمار سمبھو کے سات سرگوں کا منظوم ترجمہ میں پیش کرچکا ہوں جسے اُردو دنیا نے پسند کرکے کلاسیکل لٹریچر میں شمار کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی ادیب اور شاعر بھوبھوتی کی طرف بھی توجہ کرے اور انھیں اُردو دنیا میں تفصیل سے روشناس کرائے۔ میں ان دنوں گوئٹے کے فاؤسٹ کالی داس کے سگھودنش اور گیت گوند کے تراجم میں مصروف ہوں ورنہ بھوبھوتی کا کوئی کارنامہ اُردو میں پیش کرنے کی جسارت کرتا۔

✡

جھوٹی نظریں

(بہ سلسلہ صفحہ ۵۲)

اور اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے دل کی کسک اور دماغ کی ٹیسیں کم ہوگئیں۔ وہ بے بس نہیں۔ مجبور نہیں۔ معذور اور اپاہج نہیں۔ وہ بھی دنیا کو بدلنے کی کوشش کرسکتی ہے۔ ایک اچھی، خوبصورت، خوشحال دُنیا بنانے میں حصہ لے سکتی ہے۔ ایسی دنیا جہاں کوئی محتاج و بے بس نہ ہو۔ جہاں ظالم اور مظلوم نہ ہوں، جہاں ناانصافی اور نابرابری نہ ہو۔ جہاں بے حسی اور بے دردی نہ ہو۔ جہاں انسان، انسان کی تذلیل نہ کرے۔ غرور و تکبر نہ کرے۔ جہاں بھوک نہ ہو۔ بھوکی نظریں نہ ہوں۔

اس نے اپنی پہلی نظم "بھوکی نظریں" اٹھا کر سینے سے لگالی اور آنکھوں نے چند موتی اس کی پہلی تخلیق کو نذرانے میں پیش کردیئے۔

حُسنِ جاوداں

جلال ملیح آبادی

میں نے مانا، بہت حسین ہو تم
پھول، یہ رنگ رُوپ پا نہ سکے

لاکھ شبنم سے جگمگائے چمن
تم سا غنچہ مگر کِھلا نہ سکے

یُوں تو، چھلکے ہزار پیمانے
لبِ لعلیں کی مے اُڑا نہ سکے

چاندنی میں نہائے سرو و سمَن
دلبری کا جواب لا نہ سکے

پھر بھی، اُس حُسن سے گِلہ ہے مجھے
زندگی جو حسیں بنا نہ سکے

جو کبھی حرفِ آرزو نہ بنے
جو کبھی دِل کو گدگدا نہ سکے

جو تصوّر میں رنگ بھر نہ سکے
جو تخیُّل میں مسکرا نہ سکے

دل میں جو گُل فشانیاں نہ کرے
رُوح میں کہکشاں کِھلا نہ سکے

ایک انگڑائی، اک تبسّم سے
جو فضا میں دھنک بنا نہ سکے

جو نہ ہو مُطربِ شبِ مہتاب
سازِ باراں پہ گنگنا نہ سکے

دل میں جو باریاب ہو نہ سکے
جو محبت کے گیت گا نہ سکے

جو زباں عشق کی سمجھ نہ سکے
جو نگاہوں کا راز پا نہ سکے

لعلِ لب ہائے شعلہ آگیں سے
بادۂ آتشیں پلا نہ سکے

تم، کہ شہکارِ دلرُبائی ہو — تم کو جانِ بہار ہونا تھا
تم، کہ ہو پیکرِ فسوں، تم کو — شاہدِ عشوہ کار ہونا تھا
تم، زلیخائے دلبری ہو تمہیں — دلبرِ دل شکار ہونا تھا
تم، کہ ہو رُوحِ نغمگی، تم کو — مُطربِ جوئے بار ہونا تھا
چھاؤں میں جگمگاتے تاروں کی — ساغرِ زر نگار ہونا تھا
تم، شمیمِ بہار ہو، تم کو — جنّتِ مشکبار ہونا تھا
تم، سراپا جمالِ فطرت ہو — تم کو موجِ بہار ہونا تھا

محفلِ ناز سے نکل کے تمہیں
لیلیٰ بے قرار ہونا تھا

تابشِ حُسن ہے، شرارۂ عشق — حُسن کو اور شعلہ کار بناؤ
رشکِ انجم ہے، زلفِ پُر افشاں — زلفِ مشکیں سے کہکشاں برساؤ
لب و رُخسار کو کرو گلنار — پرتوِ رنگ میں شفق کے نہاؤ
ہے فلک، شامیانۂ پروین — گُلستاں میں گلابیاں کھنکاؤ
حُسن، جامِ گلاب رنگ سہی — بادۂ عاشقی سے جام رچاؤ
دل نشینی سے، گُل جبینی سے — دل کو گرماؤ، رُوح کو مہکاؤ

رُوح و جانِ بلاکشاں ہو جاؤ
مہ جبینوں میں جاوداں ہو جاؤ

✡

پہلی جنگ آزادی کے مشہور رہنما — خان بہادر خاں

پرتاپ چندر آزاد

خان بہادر خاں مشہور روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے۔ روہیلکھنڈ میں مدت دراز تک روہیلہ حکومت رہی مگر فتح گنج مغربی میں نجف خاں کی شکست کے بعد ۱۷۹۴ء میں یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت میں آ گیا۔ انگریزوں نے روہیلہ سرداروں کی بہادری سے متاثر ہو کر اُن کے بہت سے سرداروں کو اپنے یہاں متعدد باعزت عہدوں پر تعینات کر لیا۔ خان بہادر خاں کو بھی انگریزوں نے مجسٹریٹ کے عہدے پر سرفراز کیا۔ باوجود اس کے روہیلہ سرداروں میں انگریزوں اور کمپنی کی حکومت کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات موجزن رہے مگر اپنی بے کسی اور ناداری کے پیش نظر وہ ظاہرا طور پر انگریزوں کی مخالفت سے قاصر رہے۔ ۱۸۵۷ء میں بریلی میں انگریزوں کی آٹھویں پلٹن کو تعینات کیا گیا تھا۔ اس پلٹن کا صوبیدار تھا بخت خاں۔ وہ خان بہادر خاں کا دوست تھا۔ ۱۸۵۷ء میں بخت خاں کی مدد سے ہی ہندوستانی فوجوں نے روہیلکھنڈ میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اس انقلاب کے روح رواں تھے مشہور روہیلہ سردار خان بہادر خاں جو اس وقت مجسٹریٹ کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے لئے ۳۱ مئی کا دن مقرر کیا گیا تھا اور انقلاب پسندوں کی اس میٹنگ میں جس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا ہندوستان کے متعدد علاقوں کے انقلاب پسند رہنما شامل ہوئے تھے۔ روہیلکھنڈ سے خان بہادر خاں کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور وہ بھی اس میٹنگ میں شامل تھے۔ دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں یہ انقلاب ۳۱ مئی سے پہلے ہی ہو چکا تھا مگر روہیلکھنڈ میں خان بہادر خاں نے اس انقلاب کو ۳۱ مئی سے پہلے نہیں ہونے دیا اور نہ اس کی خبر کسی کو کانوں کان ہونے دی۔ یہاں تک کہ ۲۹ مئی کو تمام ہندوستانی افواج بریلی میں نکٹیا ندی کے کنارے جمع کی گئیں اور وہاں انگریز کمانڈر نے فوج کے سپاہیوں سے انگریزوں کی وفاداری کی قسم لی۔ جملہ ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کو مکمل اطمینان دلایا کہ وہ ان کے وفادار اور خیر خواہ رہیں گے۔

خان بہادر خاں اور بخت خاں کے اشارہ پر ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو طلوعِ آفتاب سے پیشتر ہی کیپٹن براؤن کے بنگلہ کو نذرِ آتش کر دیا گیا یہ ایک طرح کا سگنل تھا جو روہیلکھنڈ کے انقلاب پسندوں کو دیا گیا تھا اور گیارہ بجے تک توپوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ تمام شہر پر انقلاب پسندوں کا قبضہ ہو گیا۔ شام کو ٹھیک چار بجے بریلی کے تمام انقلابی فوجی افسر نیز دیگر رہنما خان بہادر خاں کے مکان پر جمع ہوئے۔ ان میں ہندو اور مسلمان سبھی کے رہنما تھے۔ ہندوؤں کے لیڈر تھے دیوان شوبھا رام سکسینہ اور مسلمانوں کے مفتی سید احمد۔ ساتھ ہی فوج کی طرف سے صوبیدار بخت خاں موجود تھے۔ ان تینوں رہنماؤں نے حاضرین کی اتفاق رائے سے یہ طے کیا کہ خان بہادر خاں کو روہیلکھنڈ کا نواب بنایا جائے نیز اس کا اعلان کرنے کے لئے خان بہادر خاں کا جلوس تمام شہر میں شاہی رعب و داب کے ساتھ نکالا جائے۔ چنانچہ شام کے چار بجے خان بہادر خاں کے مکان سے

اُن کا ایک عظیم الشان جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس کے آگے صوبیدار بخت خاں کپتان سپہ سالار کی گاڑی میں سوار خان بہادر خاں کے نواب ہونے کا اعلان کرتے جا رہے تھے۔ ان کے پاس دیوان شوبھا رام بھی بیٹھے تھے۔ جلوس خان بہادر خاں زندہ باد کے فلک شگاف نعروں کے درمیان سارے شہر کے بازاروں میں گشت کرتا ہوا کوتوالی پر ختم ہوا جہاں نواب خان بہادر خاں کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی شوبھا رام سکسینہ کو انکا وزیر اعظم یعنی دیوان بنایا گیا۔

خان بہادر خاں کے نواب بننے اور روہیلکھنڈ کے آزاد ہونے کی خبر جب دہلی پہونچی تو ہندوستان کے شہنشاہ بہادر شاہ نے نواب کو مبارکباد کا پیغام ارسال کیا، انھیں دہلی کی حکومت کے تحت روہیلکھنڈ کا نواب تسلیم کیا اور اپنے فرمان کے ذریعہ نواب کو اہتمام الملک کا خطاب عطا فرمایا۔ نواب کو خطاب دینے کی رسم ایک عالی شان دربار میں ادا کی گئی جس کا تذکرہ مشہور انگریز مصنف چارلس بال نے اپنی تصنیف "انڈین میوٹنی" میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:-

"یونین جیک کو نیچے اُتار کر آزادی کا جھنڈا لہرایا گیا۔ جھنڈا لہرانے کی رسم کی ادائیگی کے وقت صوبیدار بخت خاں نے توپوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ جھنڈے کو سلامی دی۔ اس جشن میں بہادر شاہ کا فرمان پڑھ کر سنایا گیا۔ اس جشن میں ہی بخت خاں کو بھی روہیلکھنڈ کی فوجوں کا کمانڈر بنایا گیا جسکا اعلان خود نواب نے اپنی زبان سے کیا۔"

خان بہادر خاں نے نواب کا عہدہ سنبھالنے کے بعد روہیلکھنڈ میں امن وامان قائم رکھنے اور انتظام وانصرام کرنے کے لئے آٹھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی جس کے ناظم تھے دیوان شوبھا رام اور صدر خود نواب خان بہادر خاں تھے۔ اس کمیٹی کے علاوہ ایک دوسری کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس میں زیادہ تر قانون داں حضرات تھے۔ یہ کمیٹی غداروں کو سزا دینے اور انصاف کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ خان بہادر خاں نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی روہیلکھنڈ کے تمام اضلاع، رامپور۔ بدایوں۔ شاہجہانپور۔ مرادآباد اور آنولہ وپیلی بھیت میں اپنی فوجیں بھیج کر ان پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ رامپور میں اسوقت نواب یوسف علیخاں نواب تھے۔ وہ انگریزوں کے انتہائی خیرخواہ تھے مگر جب خان بہادر خاں نے کپتان بخت خاں کی کمان میں روہیلکھنڈ کی فوج نواب کے خلاف بھیجی تو نواب نے گھبرا کر بخت خاں کے پاس صلح کا پیغام بھیجا اور نواب خان بہادر خاں کے تحت میں رہنا قبول کر لیا۔ بخت خاں نواب یوسف علی خاں سے مبلغ تیس ہزار روپیہ اور ایک ہزار فوجی سپاہیوں کو لیکر بریلی واپس ہو گئے۔ مگر نواب یوسف علی خاں اپنی انگریز دوستی سے باز نہیں آئے اور خفیہ طور پر انگریزوں کی روپیہ سے برابر امداد کرتے رہے اور خود موقع کی تلاش میں رہے۔ نواب خان بہادر خاں نے روہیلکھنڈ کے تمام اضلاع میں کلکٹروں (ناظم) کو تعینات کیا۔ اسی دوران میں شہنشاہ بہادر شاہ کا ایک فرمان نواب خان بہادر خاں کو موصول ہوا جس میں شہنشاہ کی طرف سے کپتان بخت خاں اور روہیلکھنڈ کی بہادر فوجوں کے جوان طلب کئے گئے تھے۔ خان بہادر خاں نے فوراً بخت خاں کی کمان میں روہیلکھنڈ کی فوج کے تیس ہزار جوان اور ایک لاکھ روپیہ شہنشاہ بہادر شاہ کے پاس دہلی بھیجا۔ شہنشاہ بخت خاں کی بہادری اور حسن انتظام سے اتنا خوش اور متاثر ہوئے کہ بخت خاں کو دہلی کی فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا۔

خان بہادر خاں ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء سے فروری ۱۸۵۸ء تک روہیلکھنڈ کی حکومت کو بڑے ہی حسن انتظام کے ساتھ چلاتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے کمایوں کو آزاد کرانے کے لئے کئی مرتبہ نینی تال پر بھی فوج کشی کی مگر پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے نواب کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اب صورتِ حال بدل رہی تھی۔ فروری ۱۸۵۸ء کے آخر تک دہلی۔ اودھ اور کانپور انقلابی فوجوں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے قبضہ میں آ چکے تھے۔ اس لئے ان جگہوں کے تمام انقلابی لیڈر، نانا صاحب (کانپور) شہزادہ فیروز شاہ (دھلی) بیگم حضرت محل (اودھ) بریلی میں آکر جمع ہو گئے تھے۔ خان بہادر خاں نے ان تمام رہنماؤں کی جائے رہائش کا انتظام نومحلا مسجد کے پاس کیا تھا۔ اسی مقام پر آج کل بریلی گورنمنٹ ہائی اسکول موجود ہے۔ ان تمام انقلاب پسندوں کے مشورہ سے خان بہادر خاں نے انگریزوں کے خلاف آخری جنگ لڑنے کا تہیہ کیا۔ مئی ۱۸۵۸ء میں خان بہادر خاں نے روہیلکھنڈ کی فوجوں کو نکٹیا ندی کے اس پار جمع کیا۔ اُدھر سے انگریزی

فوجیں بھی ندی کے دوسرے کنارے پر آکر جمع ہو گئیں۔ اُس وقت اودھ کانپور اور دہلی کی تمام انگریزی فوجیں بریلی میں جمع ہو گئی تھیں۔ علاوہ ازیں پنجاب سے ایک بڑی فوج بھی ۳ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوجوں میں آکر شامل ہو گئی۔ نواب اور انگریزی فوجوں کے درمیان ۵ مئی ۱۸۵۸ء کو گھمسان کی جنگ ہوئی۔ نواب نے اپنی فوجوں کی کمان خود سنبھال رکھی تھی۔ شام تک دوبار نواب کی فوجوں نے انگریزی فوجوں کو پسپا کیا بلکہ انگریزی فوجوں کو برابر باہر سے کمک مل رہی تھی۔ اُدھر نواب کی فوجیں لگاتار ۱۲ گھنٹے سے جنگ کر رہی تھیں اور اُنھیں کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخری اور تیسرے حملہ میں نواب کی فوجوں کو پسپا ہونا پڑا۔ شام کے چھ بجے انگریزی فوجیں بریلی شہر میں داخل ہوئیں۔ مگر اس سے پیشتر نواب اپنے ۲۵۰ ساتھیوں سمیت نیپال کی طرف کوچ کر گئے۔ بدقسمتی سے نیپال سرکار نے ان حضرات کو پناہ دینے سے انکار کر دیا اور نواب اور اُن کے ساتھی بہت دنوں تک نیپال کے جنگلات میں بے سر و سامانی کی حالت میں سرگرداں اور پریشان رہے۔ آخر نیپال سرکار نے ۱۸۵۹ء میں ان سب کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ فروری ۱۸۶۰ء میں خان بہادر خاں اور اُن کے ۲۵۰ ساتھیوں پر کمشنر روہیلکھنڈ کی عدالت میں مقدمہ چلا جس میں نواب کو اپنے ۲۵۰ ساتھیوں سمیت سزائے موت دی گئی۔ نواب کے ۲۵۰ ساتھیوں کو کمشنر کے اجلاس میں ایک برگد کے پیڑ پر ہی لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ یہ برگد کا پیڑ اب بھی موجود ہے اور اگست ۱۹۵۷ء میں اس پر شہیدوں کی یادگار کا ایک پتھر نصب کرا دیا گیا ہے۔ خان بہادر خاں کو پرانی کوتوالی کے چوراہے پر ایک بڑے مجمع کے سامنے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ پھانسی کے تختہ کی طرف جاتے وقت انھوں نے مندرجہ ذیل شعر پڑھا۔

بجرم کلمۂ حق می کشند دغوغا نیست
ز مرگ زندگیم می شود تماشا نیست

خان بہادر خاں کی لاش کو بریلی ضلع جیل کے پھاٹک کے پاس اس طرح دفن کیا گیا کہ قبر کا کوئی نشان نہ معلوم ہو۔ ان کے اعزا و اقربا نے ان کی لاش مانگی تو انگریز افسر نے یہ کہہ کر لاش دینے سے انکار کر دیا کہ وہ لاش کو لے جا کر قبر میں دفن کریں گے اور شہید بنا کر قبر پہ چراغاں کریں گے اور وہاں میلے لگائینگے۔ تدفین کے وقت نواب کے بدن پر کفن نہیں تھا تو ان کے ایک عزیز نے اپنا رومال اُن کے جسم پر ڈال دیا۔ اس پاداش میں اس کو پکڑ کر جیل بھیج دیا گیا۔ پہلی جنگ آزادی کی صد سالہ یادگار منانے کے سلسلے میں خان بہادر خاں کے دفن ہونے کا مقام تلاش کیا گیا اور ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء کو اس جگہ پر ان کی یادگار میں ایک پتھر نصب کیا گیا ہے۔ خان بہادر خاں کی جائے رہائش شاہ آباد میں تھی۔ اسکو انگریزوں نے توپوں سے ڈھا دیا تھا۔ یہ جگہ آج بھی خان بہادر خاں کا ٹھیغڑ کے نام سے مشہور ہے اور ایک کھنڈر کی شکل میں ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء کو اس مقام پر بھی خان بہادر خاں کی یادگار میں ایک پتھر نصب کیا گیا ہے۔

خریف اور ربیع مہم میں انعامات دینے کی اسکیم ●●● چارہ کی پیداوار بڑھانے کی اسکیم ●●● اصلاحات آراضی کے قوانین میں توسیع ●●● بلاک کے علاقوں میں ترقیاتی کام ●●● دیہی اور چھوٹی صنعتوں کے لئے ماسٹر پلان ●●● چھوٹی صنعتوں کے لئے قرضے ●●● صنعتوں پر بجلی ٹیکس ختم ●●● صنعتوں پر آٹھ کرور روپیہ کے اخراجات ●●● فہرست مندرجہ اور پسماندہ فرقوں کے طالب علموں کو مالی امداد ●●● روڈ ویز کی کارکردگی کا نیا ریکارڈ ●●● تین ہزار بے گھر کنبوں کے لئے مکانات ●●● مزدوروں کے مکانات کیلئے آجروں کو رعائتیں ●●● امداد باہمی مارکیٹنگ سوسائٹیوں کی کارگذاری

گاؤں سبھاؤں۔ بلاکوں اور اضلاع ویلیج لیول ورکروں اور پنچایت سکریٹریوں میں اناج زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کے سلسلہ میں مقابلہ کا صحت مند جذبہ پیدا کرنے کے پیش نظر ریاست میں انعامات دینے کی تین اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ ان تین اسکیموں میں سے ایک اسکیم ریاستی حکومت، دوسری اسکیم وزارت اجتماعی ترقی اور تیسری مرکزی حکومت کی وزارت زراعت کی جانب سے وضع کی گئی ہے۔

ریاستی حکومت کی اسکیم کے تحت ہر سرگرم بلاک کی بہترین گاؤں سبھا کو ہر فصل میں ۵۰۰ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ ہر ضلع کے بہترین سرگرم بلاک کو ایک رننگ شیلڈ دی جائے گی۔ متعلقہ بلاک ڈویلپمنٹ افسر اور پوری ٹیم کو انعام کے طور پر مخصوص تعریفی خط بھی دیے جائیں گے۔ ہر ضلع کے بہترین چھایا بلاک کو رننگ شیلڈ اور ڈویژن کے بہترین سرگرم بلاک کو مستقل شیلڈ دی جائے گی۔

ڈویژن کا بہترین چھایا بلاک ایک رننگ شیلڈ کا حقدار ہوگا۔ ہر ضلع میں سرگرم بلاک کے باہر کے بہترین فیلڈ افسر کو مجموعی طور پر ۱۵۰ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ ویلیج لیول ورکر اور پنچایت سکریٹری کے علاوہ ہر ضلع میں سرگرم بلاک کے بہترین فیلڈ افسر امداد باہمی سپروائزر، زراعت کا مدار، گرام سیوکا مدار اور سپروائزر کو ۱۵۰ روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔

وزارت اجتماعی ترقی کی اسکیم کے تحت ہر ضلع کی بہترین گاؤں

سبھا کو صرف خریف فصل کے لئے ۲۵۰ روپیہ اور ریاست کی بہترین گاؤں سبھا کو (جو سرگرم بلاک کے باہر ہوں) صرف خریف فصل کے لئے ۱۰۰۰ روپیہ انعام دیا جائے گا۔

صرف خریف فصل کے دوران میں ہر ضلع میں (سرگرم بلاک کے باہر) بہترین ویلج لیول ورکر یا پنچایت سکریٹری کو ایک سائکل یا ۱۵۰ روپیہ کی مالیت کا کوئی دوسرا انعام دیا جائے گا۔

صرف خریف فصل کے لئے ریاست کے بہترین ویلج لیول ورکر یا پنچایت سکریٹری کو (سرگرم بلاک کے باہر) ایک موٹر لگی ہوئی سائیکل اور ملک کے بہترین ویلج لیول ورکر کو ایک اسکوٹر دیا جائے گا۔

مرکزی وزارت غذا اور زراعت کی اسکیم کے تحت ملک کی بہترین ریاست کو ایک راشٹر کلش اور ۵۰ ہزار روپیہ نقد انعام دینے کی تجویز ہے کسی ریاست کو انعام کے قابل اس وقت سمجھا جائے گا جب کہ اس کی پیداوار گزشتہ تین برسوں کی اوسط پیداوار سے ۱۵ فی صدی زیادہ ہوگی۔ ہر ایسے بہترین ضلع کو جس کی پیداوار گذشتہ تین برسوں کی اوسط پیداوار سے ۱۵ فی صدی زیادہ ہوگی ۱۰ ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔

ریاست کے بہترین ضلع کو مذکورہ ۱۰ ہزار روپیہ انعام کے علاوہ زراعیہ کلش بھی دیا جائے گا۔

● ● ●

کاشتکاروں کو اصلاحات آراضی کے مختلف قوانین سے جو فوائد حاصل تھے حکومت اتر پردیش نے حال میں ان میں مزید توسیع کر دی ہے۔ نتیجہ کے طور پر سرکاری اسٹیٹوں میں جہاں ٹھیکہ داری طریقہ رائج تھا ادھیواسیوں کو سیردار قرار دے دیا گیا ہے۔

اب ان مخصوص علاقوں میں بھی جہاں یو۔پی اصلاح آراضی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۸ء نافذ نہیں تھا اس کا نفاذ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اتر پردیش بھر میں سوائے پہاڑی علاقوں جانسر باور پرگنہ اور شہری علاقوں کے اس قانون کا نفاذ ہو گیا ہے۔

یو۔پی گورنمنٹ اسٹیٹ ٹھیکہ داری خاتمہ ایکٹ ۱۹۵۸ء کے نو اضلاع میں ۳۰ رجون ۱۹۵۹ء سے نافذ ہو جانے کے بعد ٹھیکہ داری کے تمام پٹے اب سے ختم کر دیئے گئے ہیں۔ ان نو اضلاع کے نام ہیں۔ بلیا۔ وارانسی بجنور۔ فرخ آباد۔ گونڈہ۔ جھانسی۔ کھیری۔ پیلی بھیت اور اناؤ۔

ان گورنمنٹ اسٹیٹوں میں بھی ریاستی حکومت نے اتر پردیش خاتمۂ زمینداری و اصلاح آراضی ایکٹ ۱۹۵۱ء اور یو۔پی۔ اصلاح آراضی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۴ء ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء کا نفاذ کر دیا ہے۔

جن مخصوص علاقوں میں یو۔پی اصلاح آراضی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۸ء کو نافذ کیا گیا ہے ان کے نام ہیں۔ پرگنہ کسوار راجہ ضلع وارانسی سابق ریاست بنارس۔ سابق ریاست رام پور۔ اتر پردیش میں ضم شدہ علاقہ۔ قائم پور رینج کے جنوب میں ضلع مرزاپور کے کچھ علاقے ۴۸ اضلاع میں پھیلے ہوئے گورنمنٹ اسٹیٹ اور ٹھیکہ داری کے سابق نو اضلاع۔

مذکورہ بالا اقدامات کے بارے میں ضروری اعلانیہ حکومت اتر پردیش کے غیر معمولی گزٹ مورخہ ۳۰ رجون ۱۹۵۹ء میں شایع کر دیا گیا ہے۔

● ● ●

اتر پردیش کے محکمہ اعداد و شمار کی ماہ اپریل ۱۹۵۹ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق بلاک کے علاقوں میں ترقیاتی سرگرمیوں میں عوام نے روپیہ اور جسمانی محنت کی صورت میں جو تعاون کیا ہے وہ گزشتہ سال کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ ان ترقیاتی سرگرمیوں میں عوام نے جو حصہ لیا ہے اس کا تخمینہ ۱۶۶۲۹۸۶ روپیہ لگایا گیا ہے جس میں ۴۴۲۰۳ روپیہ محنت کی مالیت کے طور پر شامل ہے۔ اس طرح سے فی بلاک اوسط ۸۰۴۱ روپیہ ہے جبکہ گزشتہ سال اس مدت میں یہ اوسط ۳۶۶۲ روپیہ تھا۔

علاوہ ازیں زیر آبپاشی آراضی کے رقبہ میں بھی ۱۷۰۴۸ ایکڑ کا اضافہ ہوا اس سلسلہ میں اس ماہ میں اوسطاً ۱۴۵ ایکڑ آراضی فی بلاک کا اضافہ ہوا جبکہ گزشتہ سال اس مدت میں اضافہ ۱۵ ایکڑ فی بلاک کا تھا۔

زیر نظر مدت میں بلاک کے علاقوں میں ۲۹ ٹیوب ویل۔ ۴۰۴ پختہ اور ۱۲۰۵ کچے کنویں۔ ۵۰۳ بندھیاں تعمیر کی گئیں اور ۵۶۵ کنووں اور ۷۸ تالابوں کی مرمت کی گئی۔ اس کے علاوہ ۷۰۴ رہٹ اور ۲۷۰ پمپنگ سیٹ لگائے گئے نیز ۴ میل لمبی نہریں اور ۲۱۸ میل لمبی گولیں تعمیر کی گئیں۔ اس کے علاوہ ۲۳۵ کنوؤں کو گہرا کیا گیا۔

زیر نظر ماہ میں بلاکوں میں ۳۲۶ نئی امداد باہمی انجمنیں قائم کی

گئیں اور سرمایہ حصص میں ۴۰.۴۰ لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا۔ ان انجمنوں کے ذریعہ ممبروں کو ۱۰۱۹۵ لاکھ روپیہ کے قرضے دیئے گئے اور ۷۷.۲۷ لاکھ روپیہ کی وصولی کی گئی۔ اوسطاً فی بلاک ۷۴ ممبر بنائے گئے اور ۰ لاکھ روپیہ کے قرضے دیے گئے۔

زیر نظر مدت میں چھوٹی بچت اسکیم کے تحت کل ۹۸۹۴۶۰۰ روپیہ جمع کیا گیا جبکہ گزشتہ سال اسی مدت میں ۱۵۱۹۰۰ روپیہ جمع ہوا تھا۔

مویشیوں کو پوکنی وغیرہ بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں تقریباً ایک لاکھ مویشیوں کو ٹیکہ دیا گیا۔

سڑکوں کی تعمیر کے پروگرام کے تحت زیر نظر ماہ میں بلاکوں میں ۶۵ میل کچی سڑکیں تعمیر کی گئیں اور ۲۷۱ میل سڑکوں کی مرمت کی گئی۔

●●●

ریاستی حکومت کے محکمۂ نگہداشت مویشیان کی جانب سے چارہ کی پیداوار بڑھانے کے لئے ایک نئی اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کا اصل مقصد کم از کم اعلیٰ نسل کے مویشیوں کو کافی مقدار میں بہتر چارہ مہیا کرنا ہے۔

اس اسکیم کے تحت آئندہ دو برسوں میں ایک لاکھ روپیہ سے زائد رقم صرف کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں بہتر چارہ سے متعلق صدر مقام پر ایک ادارہ قائم کیا جائے گا جو کام کی دیکھ بھال اور رہنمائی بھی کرے گا۔

مذکورہ اسکیم کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ابتدا میں کلیدی گاؤں منتخب بلاکوں میں چارہ کی کاشت کو مقبول بنانے کی پوری پوری کوشش کی جائے اور ریاست کی موجودہ چراگاہوں کے رقبہ میں توسیع کی جائے اور ان کو بہتر بنایا جائے۔

یہاں اس امر کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ اتر پردیش میں خود گھاس کی کوالٹی بہت خراب ہے خاص طور پر پروٹین کے سلسلہ میں اس کے ذریعہ مویشیوں کی نشوونما کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قابل کاشت علاقوں میں پھلی دار فصلوں کی کاشت کی جائے اور تمام بنجر زمین کو چراگاہوں میں تبدیل کیا جائے۔

اسکیم کے تحت ریاستی فارموں میں چارہ کے آدرش پلاٹ قائم کرنے کی تجویز ہے جہاں سے بیج اور جڑیں وغیرہ کاشتکاروں کو سستے داموں پر فروخت کی جائیں گی۔

علاوہ ازیں ریاست کے تقریباً ۴۰ منتخب کلیدی گاؤں بلاکوں میں پانچ سے دس ایکڑ تک آراضی چراگاہوں کے لئے مخصوص کرنے کی تجویز ہے۔ یہ آراضی گاؤں پنچایتوں کے ذریعہ عام چراگاہوں سے مہیا کی جائے گی جو جہاں تک ممکن ہوا اسٹاک مین سنٹر کے قریب ہوگی تاکہ اس کی نگرانی کے لئے مزید عملہ کا انتظام نہ کرنا پڑے۔ ان آدرش پلاٹوں کے قیام کے بعد امید ہے کہ اور دوسری گاؤں پنچایتیں بھی اپنی چراگاہوں کو بہتر بنانے کے لیے قدم اٹھائیں گی ان پنچایتوں کو اس سلسلہ میں ضروری امداد مہیا کی جائے گی۔ ایک ایکڑ چراگاہ کو بہتر بنانے پر ۲۶۰ روپیہ صرف ہوگا۔

اس اسکیم کے تحت کل اخراجات مرکزی اور ریاستی حکومتیں ۲۵ اور ۷۵ کے تناسب میں برداشت کریں گی۔

●●●

حکومت اتر پردیش نے ریاست میں چھوٹی اور دیہی صنعتوں کی بھرپور ترقی کے لئے طویل مدتی ماسٹر پلان وضع کرنے کی غرض سے ۱۸ ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی ہے۔ اس کمیٹی کے چیرمین محکمہ صنعت کے سکریٹری شری ایس۔ ایس ایل ککڑ ہوں گے۔

دیہی اور چھوٹی صنعتوں کے خاص ورکنگ گروپ کے لئے اس کمیٹی کے ممبروں میں محکمہ صنعت کے ڈائرکٹر، جوائنٹ سکریٹری ڈپٹی سکریٹری محکمہ منصوبہ بندی کے جوائنٹ سکریٹری محکمہ بجلی کے سکریٹری، چیف انجینیر (ہائیڈل) امداد باہمی انجمنوں کے رجسٹرار ڈاکٹر ایچ ترویدی (پرنسپل ایچ۔ بی۔ ٹی انسٹی ٹیوٹ کانپور) چھوٹی صنعت سے متعلق سروس انسٹی ٹیوٹ کانپور کے ڈپٹی ڈائرکٹر انچارج، کل ہند ہتھ کرگھا کانپور کے ڈپٹی ڈائرکٹر، نواب اعزاز رسول، شری کرن بھائی شری شمشیر سنگھ تلوجا، شری ٹی۔ بی بھلا، شری سی، ایم سکھا اور شری سریندر کار شامل ہیں۔ محکمہ صنعت کے ایڈیشنل ڈائرکٹر (دیہی اور چھوٹی صنعت) کانپور اس کے ممبر سکریٹری ہوں گے۔

ابتدائی پراجکٹ رپورٹوں کا مسودہ تیار کرنے کے لئے مختلف

انجمنوں مثلاً ہتھ کرگھا چھوٹی صنعتیں جن میں صنعتی ریاستیں دستکاری ریشم کے کیڑے پالنا شامل ہیں دیہی صنعتوں اور صنعتی امداد باہمی انجمنوں کے ذیلی ورکنگ گروپوں کی تشکیل کی جا رہی ہے۔

مذکورہ ذیلی گروپوں میں سے ہتھ کرگھا صنعت اور ریشم کے کیڑے پالنے سے متعلق صنعت کے ذیلی ورکنگ گروپ قائم کئے جا چکے ہیں۔

ان ذیلی ورکنگ گروپوں کے ممبروں میں محکمہ صنعت کے سینیر افسران اور ریاستی ہتھ کرگھا بورڈ کے کئی غیر سرکاری ممبران کے علاوہ متعدد فنی ماہرین اور کل ہند ہتھ کرگھا بورڈ اور مرکزی سلک بورڈ کے نمائندے شامل ہیں۔

ہتھ کرگھا اور ریشم کے کیڑے پالنے سے متعلق ذیلی گروپوں کے کنوینر بالترتیب محکمہ صنعت کے ڈائرکٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر (ٹی - بی) ہوتے ہیں۔

خاص ورکنگ گروپ ان ذیلی گروپوں کے لئے ہدایت جاری کرنے کے علاوہ عام پالیسی بھی وضع کرے گا۔

علاوہ ازیں خاص ورکنگ گروپ ان ذیلی گروپوں کی تیار کردہ ابتدائی پراجکٹ رپورٹوں کا معائنہ کرکے ریاستی حکومت کو قطعی سفارشات پیش کرے گا اور تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے مسودہ میں شامل کرنے کے لئے مکمل اعداد وشمار کے ساتھ مفصل پراجکٹ تجویز کرے گا

ریاستی حکومت نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے لئے صنعتوں سے متعلق پبلک اور مختلف اداروں کے ممبران سے تجاویز طلب کی ہیں۔ یہ تجاویز خاص ورکنگ گروپ کے ممبر سکریٹری یا ذیلی ورکنگ گروپوں کے کنوینروں کے پاس بھیجنا چاہیئے۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ ریاست کی بڑی اور درمیانہ پیمانہ کی صنعتوں کے لئے ایک ماسٹر پلان وضع کرنے کے لئے ایک بھاری صنعت پلان کمیٹی بھی قائم کی گئی ہے۔ محکمہ صنعت کے سکریٹری اس کمیٹی کے بھی چیرمین ہیں۔

اس کمیٹی نے مختلف بڑی اور درمیانہ پیمانہ کی صنعتوں سے متعلق ۱۴ ورکنگ گروپ قائم کئے ہیں۔ اس کمیٹی نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے مسودہ میں شامل کرنے کے لئے اب تک ۵۰ پراجکٹوں کو مکمل کیا ہے جن میں سے ایک پراجکٹ ہائی ٹینشن الکٹرک انسولیٹر تیار کرنے اور دوسرا ریفریجیریٹری انڈسٹری سے متعلق ہے۔

●●●

حکومت اترپردیش نے قرضہ اور مالی امداد سے متعلق اسکیم کے تحت چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لئے مالی سال رواں میں ۳۱ء۴۲ لاکھ روپیہ کی مالی امداد منظور کی ہے۔

اس اسکیم کا مقصد ضرورت مند اور مستحق اشخاص کو مناسب فنڈ مہیا کرکے ریاست میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو فروغ دینا ہے۔

اس اسکیم کے تحت کسی شخص کو انفرادی طور پر زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپیہ بطور قرض اور دو ہزار روپیہ بطور مالی امداد دیا جائے گا. لیکن امداد باہمی انجمن یا رجسٹرڈ ادارے کو زیادہ سے زیادہ ۱۵ ہزار روپیہ کا قرضہ اور ۶ ہزار روپیہ کی مالی امداد دی جائے گی۔ نجی بانڈ پر ایک ہزار روپیہ تک کا قرضہ دیا جائے گا۔

مختلف پیشوں اور دستکاریوں کے تربیت یافتہ افراد کو بھی قرضہ کی یہ سہولتیں دی جائیں گی۔

یہ قرضے ریاستی سطح پر تشکیل کی گئی ایک کمیٹی کی جانب سے منظور کئے جاتے ہیں جس کے چیرمین اترپردیش کے وزیر اعلیٰ ہیں۔

یہ قرضے مشینوں اور خام مال کی خرید اور تنخواہوں وغیرہ کی ادائگی کے لئے دیئے جاتے ہیں اور مالی امداد اوزار اور آلات وغیرہ خریدنے اور ابتدائی نقصانات کو پورا کرنے کے لئے کاروباری سرمایہ کے لئے دی جاتی ہے۔ ان قرضوں کی ادائگی آسان قسطوں میں اور ۳ فی صدی سالانہ سود کے ساتھ ہوگی۔ اس اسکیم کے افتتاح سے اب تک مجموعی طور پر ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ رقم کے قرضہ اور مالی امداد دی جا چکی ہے۔

قرضوں کے لئے درخواستیں ڈائرکٹر آف انڈسٹریز لونس اینڈ گرانٹس سیکشن کانپور کے پاس بھیجنا چاہئیں۔

●●●

حکومت اترپردیش نے ایک آرڈی ننس کے ذریعہ صنعتوں میں بجلی کے استعمال پر موجودہ ۲۰ فی صدی ٹیکس ختم کر دیا ہے۔

اترپردیش میں ترقیاتی سرگرمیوں کی ایک جھلک
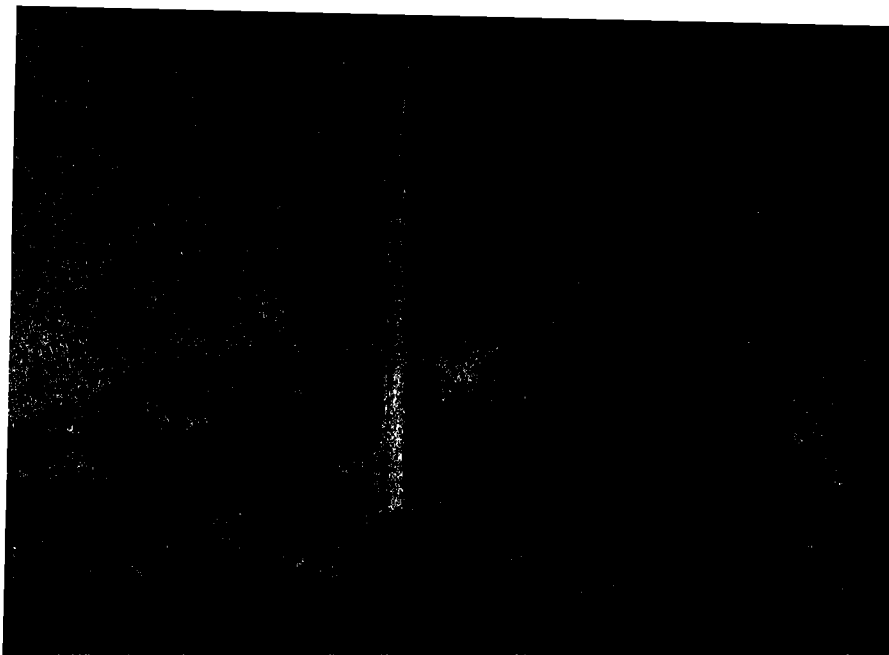
بازپور کی زیر تعمیر امداد باہمی شکرمل کا ایک منظر

اترپردیش کی چند گھریلو مصنوعات ایک نمائش میں
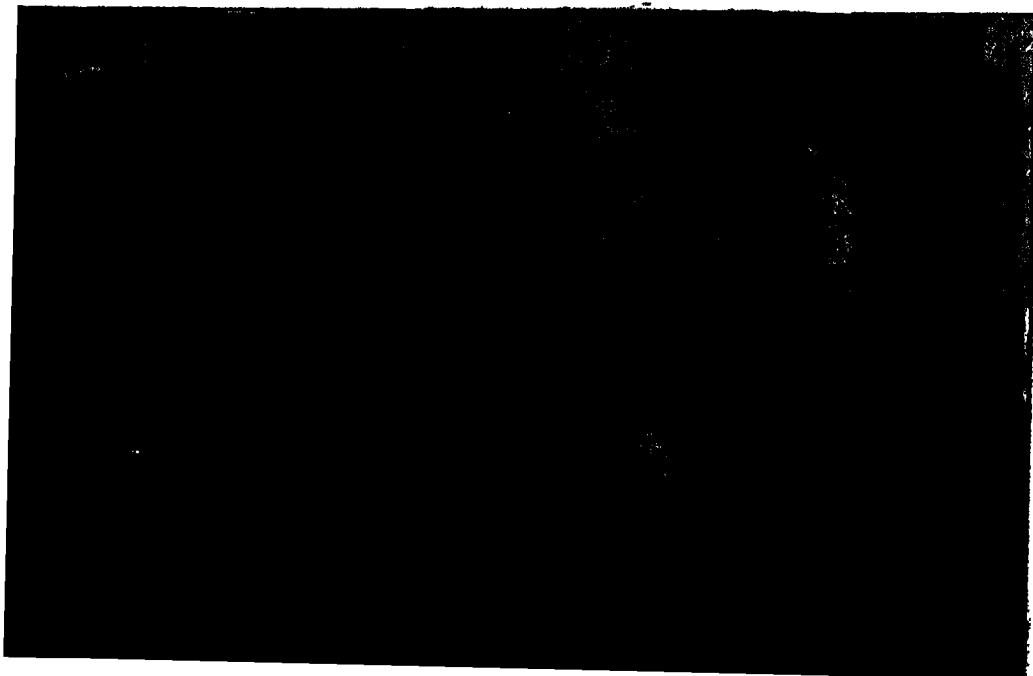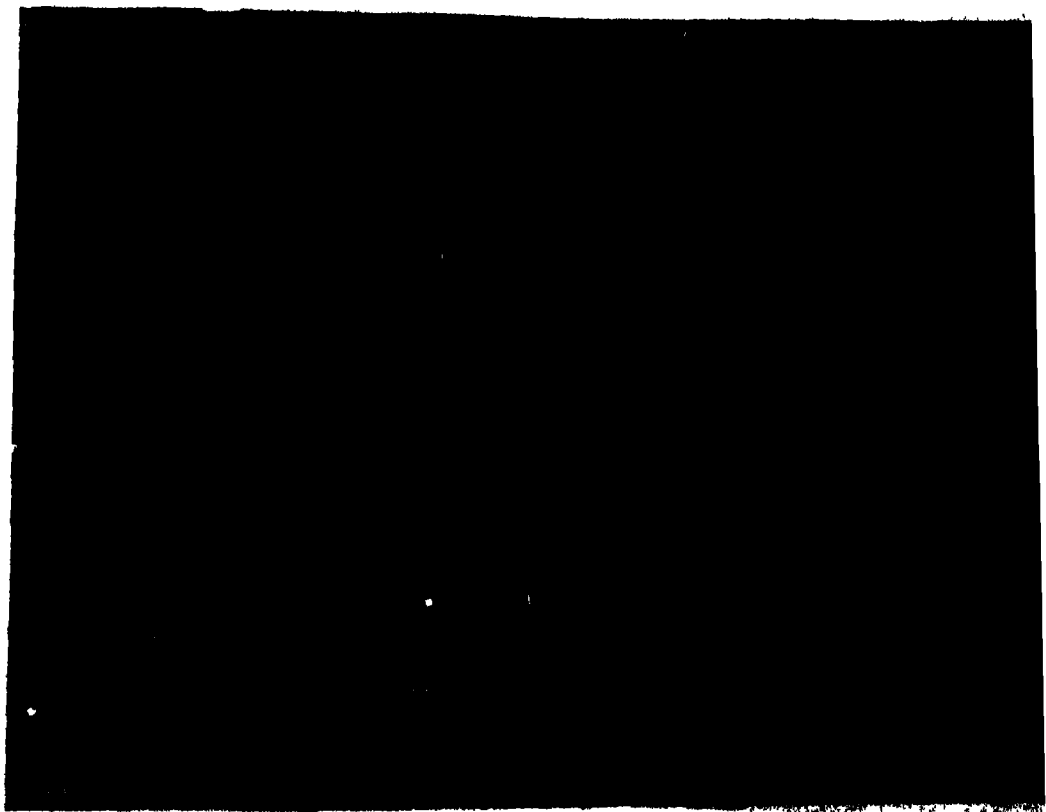
ریہانڈ باندھ (ضلع مرزاپور)

گورکھپور تھرمل پاور اسٹیشن
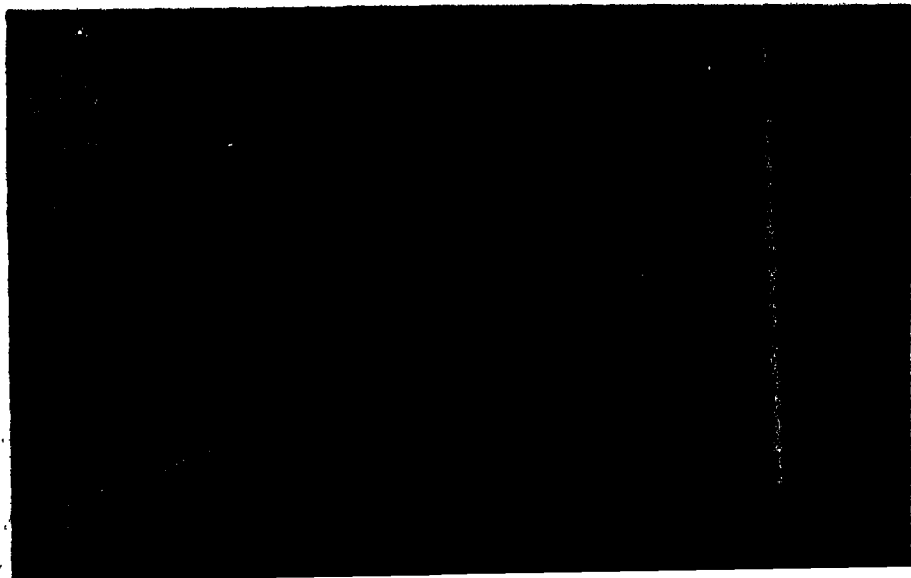
گورکھپور کی زیر تعمیر یونیورسٹی

ایک گاؤں میں واٹر ورکس سے پائپ کے
پانی کی بہم رسانی

کان پور میڈیکل کالج
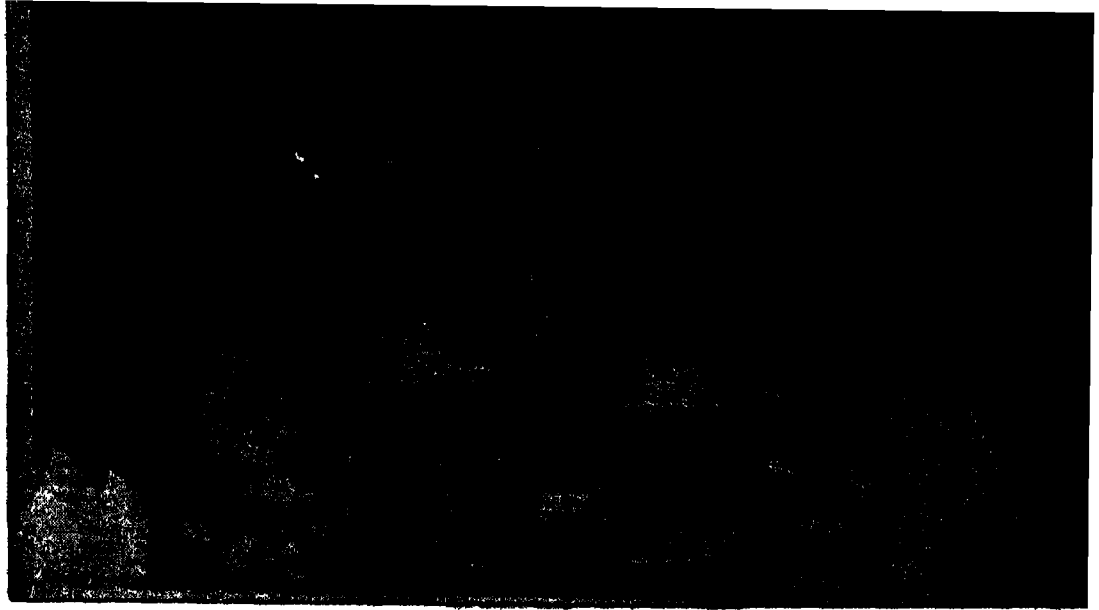
بے گھر عورتوں کا ایک تربیتی مرکز

بغیر دیوار کے جیل خانے کے قیدی تعمیری کام میں مصروف
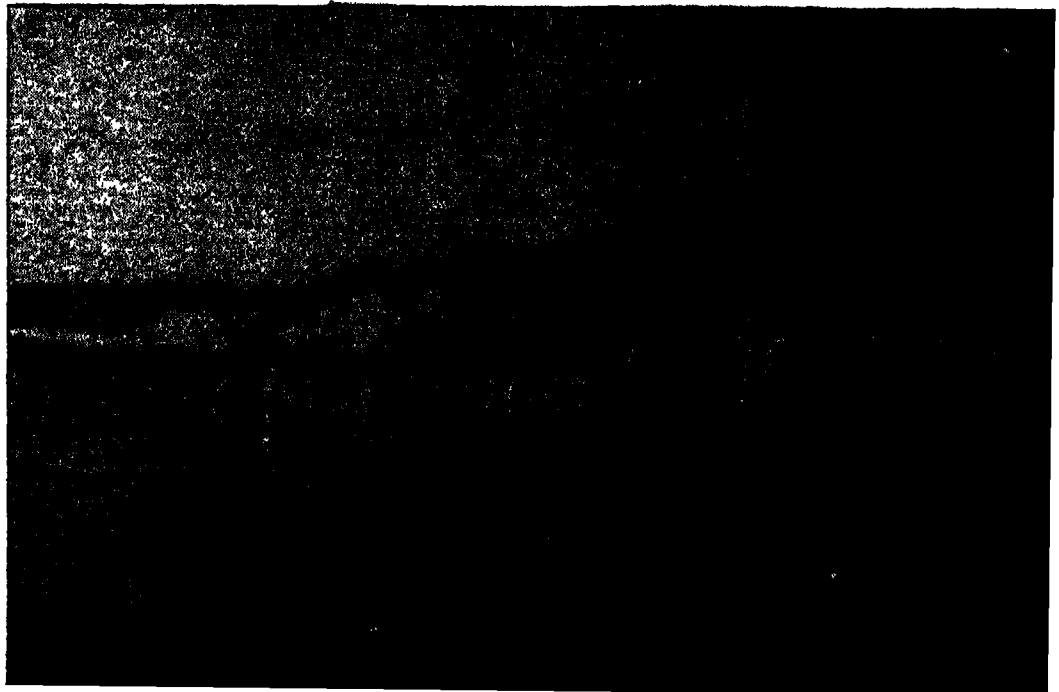
اس آرڈیننس کا نفاذ گذشتہ یکم اپریل سے سمجھا جائے گا۔

یہ آرڈیننس صنعتی صارفین کو ضروری سہولت دینے کے پیش نظر جاری کیا گیا ہے۔ اس رعایت سے حکومت کو سالانہ تقریباً ۵۰ لاکھ کا خسارہ ہوگا۔

اتر پردیش میں دو سال پہلے بھی صنعتوں کی امداد کے لئے بجلی کے نرخ ۲۵ فی صدی سے کم کر کے ۲۰ فی صدی کر دیے گئے تھے۔ بجلی ٹیکس کے خاتمہ سے صنعتی اشیاء کی لاگت میں کمی ہو جائے گی۔

اس رعایت کا اطلاق حسب ذیل ۳۸ زمروں کی صنعتوں پر ہوگا۔

(۱) خام دھات کو صاف کرنے کی صنعتیں (۲) ایندھن (۳) بوائلر اور بھاپ سے چلنے والے پلانٹ (۴) پرائم موور (۵) بجلی کے سامان (۶) ٹیلیفون (۷) نقل و حمل (۸) انڈسٹریل مشینری (۹) مشین کے اوزار (۱۰) زراعتی مشینری (۱۱) مٹی ہٹانے کی مشینری (۱۲) متفرق میکنکل اور انجینیرنگ صنعتیں (۱۳) تجارتی دفاتر اور گھریلو ضروریات کے سامان (۱۴) ڈاکٹری اور سرجری کے سامان (۱۵) صنعتی اوزار (۱۶) سائنس کے آلات (۱۷) ڈرائنگ اور سروے وغیرہ کے آلات (۱۸) کیمیاوی کھاد (۱۹) کیمیاوی کھاد کے علاوہ دیگر کیمیاوی سامان (۲۰) فوٹو کی خام فلم اور کاغذ (۲۱) رنگائی کے سامان (۲۲) دوائیں (۲۳) ٹیکسٹائل (۲۴) کاغذ اور گودا اور کاغذ کی مصنوعات (۲۵) شکر (۲۶) خمیر اٹھانے کی صنعتیں (۲۷) غذا کی پروسیسنگ (۲۸) وناسپتی (۲۹) صابن۔ اور آرائش کے سامان (۳۰) ربر کے سامان (۳۱) چمڑہ اور چمڑہ کی اشیاء (۳۲) سرامک (۳۳) کانچ (۳۴) مٹی کے برتن (۳۵) سیمنٹ اور کھریا مٹی کی مصنوعات (۳۶) لکڑی کی مصنوعات (۳۷) دھاتی صنعتیں (۳۸) متفرق صنعتیں (برقی قلمی پیتل کے برتن۔ تالا اور سگریٹ)

● ● ●

اتر پردیش میں مالی دشواریوں کے باوجود صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے مالی سال رواں کے دوران میں ۳٫۷۰ کروڑ روپیہ صرف کیا جائے گا۔ اس رقم میں پلان اور غیر پلان اخراجات شامل ہیں جو بالترتیب ۲٫۹۶ کروڑ روپیہ اور ۰٫۷۴ کروڑ روپیہ ہیں۔

مرکزی حکومت مذکورہ پروگرام کے لئے ۲٫۳۲ کروڑ روپیہ دینے کے علاوہ غیر پلان اسکیموں کے لئے بھی کافی روپیہ منظور کرے گی۔

صنعتوں سے متعلق پلان اسکیموں پر دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے چوتھے سال کے آخر تک ۱۰٫۴۰ کروڑ روپیہ صرف ہونے کی امید ہے جو پلان کی نظر ثانی شدہ زیادہ سے زیادہ مقررہ حد یعنی ۱۲٫۹۴ کروڑ روپیہ کا ۸۰ فی صدی ہے۔

بڑے پیمانہ کی صنعتوں سے متعلق پروگرام کے تحت جس کے لئے مجموعی طور پر ۳٫۱۰ کروڑ روپیہ الاٹ کیا گیا ہے گورنمنٹ سیمنٹ فیکٹری کی توسیع کے لئے ۶۷ لاکھ روپیہ اور گورنمنٹ پریسیزن انسٹرومنٹس فیکٹری کی توسیع کے لئے ۲٫۴۴ لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا اور ضلع میرٹھ میں باغپت امداد باہمی شکر مل کے پانچ لاکھ روپیہ کی مالیت کے حصے خریدے جائیں گے۔

ریاست میں معدنیات کی ترقی کے سلسلہ میں سال رواں میں ایک لاکھ روپیہ کی رقم صرف کی جائے گی۔

۳٫۲۸ کروڑ روپیہ کے مجوزہ اخراجات کا کثیر حصہ دیہی اور چھوٹی صنعتوں پر صرف کیا جائے گا جو ریاست کی صنعتی معاشیات کا اہم جزو ہیں۔ اس پروگرام کے تحت تقریباً ۱۰۵۰۰ اشخاص کو چھوٹی اور گھریلو صنعتوں میں تربیت دی جائے گی۔ امید ہے کہ سال رواں میں گھریلو صنعتوں کے سیکٹر میں ۸٫۵۱ کروڑ روپیہ کی مالیت کا سامان تیار کیا جائے گا۔

گھریلو صنعتوں کی ترقی سے متعلق ۴۹ موجودہ اسکیموں کو بروئے کار لانے کے علاوہ اس سال ۲٫۶۳ لاکھ روپیہ کے چھ نئے منصوبوں پر عملدرآمد شروع کیا جائے گا۔ یہ منصوبے وارانسی میں زری کی صنعت اور نگینہ میں آبنوسی لکڑی کی صنعت کو فروغ دینے، دستکاری سے متعلق امداد باہمی انجمنوں کو قرضے دینے۔ الموڑہ، سارناتھ اور مسوری میں دستکاری کے شوروم قائم کرنے، کوالٹی مارکٹنگ اسکیم کی توسیع اور کلا کیندر دہرہ دون کو مالی امداد دینے سے متعلق ہیں۔

علاوہ ازیں ۱٫۷۸ لاکھ روپیہ کا غیر ملکی مبادلہ زر خورجہ میں ہائی ٹینشن انسولیٹروں کی جانچ سے متعلق تجربہ گاہ قائم کرنے پر صرف کیا جائے گا۔

کل ہند کھادی اور دیہی صنعت کمیشن کی مدد سے اتر پردیش میں صنعتی امداد باہمی انجمنوں کی توسیع اور ۱۴ قسم کی دیہی صنعتوں کو مزید ترقی دینے کی تجویز ہے۔

پھلوں کے تحفظ سے متعلق اسکولوں کے لئے بھی ۱۲٫۵۰ لاکھ روپیہ

کی رقم مخصوص کی گئی ہے جس کے تحت فروٹ پروسیسنگ فیکٹری رام گڈھ میں ایک کولڈ اسٹوریج پلانٹ لگایا جائے گا اور پھل فروٹ ریسرچ اسٹیشن چوبٹیا میں فاضل مشینیں لگائی جائیں گی۔

ریاست میں مالی سال رواں میں ٹیکنیکل تعلیم کی توسیع اور تنظیم پر ۳۰ء ۹۹ لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا۔ اس پروگرام کے تحت الہ آباد میں منطقائی انجینیرنگ کالج اور کانپور، فیض آباد اور مرزا پور میں تین نئے ڈپلوما اداسے قائم کرنے کے علاوہ پانچ پالی ٹکنیک اداروں کو جونیر ٹکنیکل اسکولوں میں تبدیل کیا جائے گا۔ مرکزی حکومت ان اداروں کے لئے کافی فنڈ مہیا کرے گی۔

مرکزی حکومت ریاستی حکومت کو ۳۷ء ۷ کروڑ روپیہ کے کل اخراجات میں سے ۵۴ء ۱ کروڑ روپیہ بطور قرضہ اور ۸۰ء ۷ لاکھ روپیہ بطور مالی امداد دے گی۔

• • •

حکومت اُتر پردیش نے اپنے تعلیمی اداروں کے اس خسارہ کو پورا کرنے کے لئے جو انہوں نے فہرست مندرجہ اقوام کے طلبا کی تعلیمی اور دیگر فیسیں معاف کرکے برداشت کیا ہے ریاست کے تمام اضلاع کو ۱۳ء ۲۵ لاکھ روپیہ سے زیادہ رقم دی ہے۔

علاوہ ازیں ریاستی حکومت نے فہرست مندرجہ اقوام کے طلبا کو وظائف اور غیر متواتر مالی امداد دینے کے لئے ۸۹۲۱۹۶ روپیہ الاٹ کیا ہے۔ جو ۸۲ لاکھ روپیہ کی اس رقم میں سے ہے جو فہرست مندرجہ اقوام کے طلبا کو وظائف اور مالی امداد دینے کے لئے مالی سال رواں کے واسطے منظور کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ تقریباً ۵۰ء ۱۱ لاکھ روپیہ پسماندہ اقوام کے طلبا کی فلاح پر صرف کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ ریاستی حکومت نے ۲۸ ہزار روپیہ کی رقم خارج از فہرست قبائل کے طلبا کی جو پہلے سابق جرائم پیشہ قبائل کہلاتے تھے مالی امداد کے لئے الاٹ کی ہے۔ گزشتہ سال ان قبائل کے ۸۰۰ طلبا کو ۲۸ ہزار روپیہ کی رقم دی گئی تھی۔ دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں ان طلبا کے لئے کل ڈیڑھ لاکھ روپیہ منظور کیا گیا ہے۔

گزشتہ سال ہریجن اور دوسرے پسماندہ اقوام کے تقریباً ۴۳ ہزار طلبا مستفید ہوئے تھے۔ جن پر ۵۰ء ۹۳ لاکھ روپیہ کی رقم صرف کی گئی تھی۔

• • •

گزشتہ مالی سال رواں میں تقریباً ۶۰ء ۸ کروڑ اشخاص لمبے راستوں پر چلنے والی سرکاری روڈویز بسوں کے ذریعہ سستے اور آرام دہ سفر کی سہولتوں سے مستفید ہوئے۔ اس کے علاوہ اسی مدت میں ۹۰ء ۱ کروڑ اشخاص نے الٰہ آباد۔ بریلی۔ لکھنؤ اور وارانسی کی سٹی بس سروس سے فائدہ اٹھایا۔

زیر نظر سال میں ریاست کے ۵۵۰ لمبے اور چھوٹے راستوں پر ۲۴۳۹ بسیں چلائی گئیں جنھوں نے مجموعی طور پر ۶۰ء ۲۱۶،۴۱ میل کی مسافت طے کی۔

یو۔ پی گورنمنٹ روڈویز نے اُتر پردیش کے اندر بسیں چلانے کے علاوہ پنجاب اور اُتر پردیش کے درمیان پیہوا۔ کروکشیتر۔ ہردوار اور انبالہ۔ دہرہ دون راستوں پر بسیں چلائیں۔

بس سروس کی بہتر کارکردگی کو برقرار رکھنے کے لئے سنٹرل ورک شاپ کانپور۔ سات منطقائی ورکشاپوں اور ۴۷ ڈپو ورکشاپوں میں بڑی اور چھوٹی مرمت اور بسوں کے انجنوں کی ری کنڈیشنگ وغیرہ کا کام بھی کیا گیا۔ ان ورکشاپوں میں پرانے اور گھسے ہوئے پرزوں کی مرمت کرکے دوبارہ استعمال کے قابل بنایا گیا۔ جس کے نتیجہ میں روڈویز کو تقریباً ۴ لاکھ روپیہ کی بچت ہوئی۔

اس کے علاوہ ٹائروں۔ بیٹریوں اور انجن وغیرہ کے بہتر استعمال کے ذریعہ بسوں کو ایک گیلن میں زیادہ میل چلاکر فی میل خرچ کو ۸۴ نئے پیسے سے ۷۹ نئے پیسے لایا گیا اور اس طرح سے پانچ نیا پیسہ فی میل کی بچت ہوئی۔

گزشتہ مالی سال میں یو۔ پی روڈویز کے کل ۶۶۹۹۵۲۸۵ روپیہ کی آمدنی ہوئی جس میں سے تقریباً ۶۰ء ۱ کروڑ روپیہ منافع ہوا۔

یو۔ پی روڈویز نے نینی تال میں مختلف ریاستوں کے محکمۂ ٹرانسپورٹ کے وزرا کی کانفرنس مسوری میں چھوٹی صنعتوں سے متعلق کل ہند شو۔ دہلی میں عالمی بینک کانفرنس اور مسوری میں محکمۂ جنگلات کے افسران کے جلسہ وغیرہ ایسے مخصوص موقعوں پر مخصوص انتظامات بھی کئے۔ اس کے علاوہ زیر نظر سال میں مختلف ریاستوں کے ۴۰۰ نوجوانوں کے لئے آگرہ اور مسوری کی سیاحت کے سلسلہ میں اور آندھرا پردیش کے ۴۰۰ کسانوں کے واسطے آگرہ۔ الٰہ آباد اور دہرہ دون

جانے کے لئے بسوں کا انتظام کیا گیا

● ● ●

ریاست کے بجنور، نینی تال، پیلی بھیت، رامپور اور بہرائچ اضلاع میں مشرقی پاکستان کے تقریباً ۳۰۰۰ بے گھر کنبوں کو ۱٫۵۰ کروڑ روپیہ کے صرفہ پر بسایا جائے گا۔

ہر کنبہ کو پانچ چھ ایکڑ آراضی کے علاوہ ایک پکا مکان بھی الاٹ کیا جائے گا۔ ان مکانوں کی تعمیر جدید طریقہ پر کی گئی ہے جس میں دو رہائشی کمرے ایک برآمدہ اور بیلوں کے چھپر کے لئے کافی جگہ موجود ہے۔ ہر مکان کا کل رقبہ تقریباً ۲۰۰۰ مربع فٹ ہے جہاں ترکاری وغیرہ کیواسطے ایک چھوٹے باغیچہ کے لئے بھی کافی جگہ موجود ہے۔

دیہی علاقوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جبکہ یہاں پختہ مکانات پختہ اور ڈھکے ہوئے کنویں اسکول اسپتال اور امداد باہمی انجمنوں کی سہولتیں فراہم ہیں۔ یہ امداد باہمی انجمنیں اپنے ممبران کو قرضے دینے کے علاوہ بہتر بیج کھاد اور زرعی آلات بھی تقسیم کریں گی۔

بجنور سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ایک نالے کے دونوں کناروں پر ۲۶۰ بے گھر کنبوں کے لئے ایک کالونی تعمیر کی گئی ہے۔ کالونی کے دونوں حصوں کو پُل کے ذریعہ ملایا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ جولائی تک اس نوآبادیاتی علاقہ میں بے گھر کنبے بس جائیں گے۔

تقریباً ۷۰۰ ایسے بے گھر کنبوں کو رودرپور سے ۲۲ میل کے فاصلہ پر ضلع نینی تال میں شکتی فارم میں بسایا جائے گا۔ اس فارم کو ۱۲ میل لمبی پکی سڑک کے ذریعہ کچھا سے ملا دیا جائے گا۔ ان ۷۰۰ بے گھر کنبوں میں سے ۵۰۰ کنبے آئندہ ماہ تک بس جائیں گے جن میں سے تقریباً ۳۰۰ کنبے فارم پر پہنچ چکے ہیں اور بقیہ ۲۰۰ کنبے برسات کے بعد پہنچ جائیں گے۔ یہاں بچوں کے لئے ایک اسکول اور مریضوں کے لئے ایک اسپتال کی تعمیر ۲ لاکھ روپیہ کے صرفہ پر مکمل ہو چکی ہے

مزید ۹۶۰ بے گھر کنبوں کے لئے ایک دوسری کالونی ضلع پیلی بھیت میں مالا ریلوے اسٹیشن اور موضع نیوریا کے قریب قائم کی گئی ہے اس علاقہ میں ایسے تقریباً ۲۰۰ کنبے بس چکے ہیں اور ۴۰۰ کنبے آئندہ ماہ تک پہنچ جائیں گے۔ بقیہ ۳۰۰ کنبے برسات کے بعد پہنچ جائیں گے یہاں تقریباً ایک لاکھ روپیہ کی لاگت سے ایک اسپتال تعمیر کیا گیا ہے اور جلد ہی ایک جونیر ہائی اسکول قائم کرنے کی تجویز ہے۔

اس کے علاوہ ضلع رامپور میں رودرپور سے تقریباً ۶ میل اور رامپور نینی تال سڑک سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر مزید ۱۶۰ ایسے بے گھر کنبوں کو بسایا جائے گا۔

ضلع بہرائچ میں جھیل تال کے قریب ۳۲۰ ایسے بے گھر کنبوں کو بسانے کی ایک اسکیم ریاستی حکومت کے زیر غور ہے۔

● ● ●

ریاستی حکومت نے آجروں کو مزدوروں کے لئے مکانات تعمیر کرنے سے متعلق مزید رعائتوں کا اعلان کیا ہے۔ یہ رعائتیں اس امر کے پیش نظر دی گئیں ہیں کہ صنعتی مزدوروں کے لئے زیادہ سے زیادہ مکانات تعمیر کرنے کے سلسلہ میں آجروں کا پورا تعاون حاصل ہو سکے۔ ان رعائتوں کے تحت آجروں کو مکانات تعمیر کرنے کی مدت میں قرضہ اور مالی امداد کی شکل میں زیادہ رقم دی جائے گی۔ اس کے علاوہ قرضوں کی ادائیگی کے شرائط بھی آسان کر دئے گئے ہیں۔

قرضہ کی رقم منظور شدہ کل لاگت کی ۲۷½ فیصدی سے بڑھا کر پچاس فیصدی کر دی گئی ہے۔ یہ رعائت منظور شدہ لاگت کی ۲۵ فیصدی بدستور دی جانے والی براہ راست مالی امداد کے علاوہ دی جائے گی۔

آجروں کو اب کرسی کی سطح تک تعمیر مکمل ہو جانے پر منظور شدہ قرضہ کی پچاس فیصدی رقم مل جائیگی۔ اس سے پہلے اس سطح تک تعمیر مکمل ہو جانے پر صرف پچیس فیصدی قرضہ دیا جاتا تھا۔ بقیہ ۵۰ فیصدی قرضہ چھت کی سطح تک تعمیر مکمل ہو جانے پر دیا جائے گا۔ مکان کی تعمیر مکمل ہو جانے پر آجروں کو قرضہ کے کسی بقیہ حصہ کے لئے مالی امداد جو منظور شدہ لاگت کا پچاس فیصدی ہے مساوی قسطوں میں ادا کی جائیگی۔ پہلی قسط مکان تعمیر ہو جانے اور دوسری اخراجات کے آڈٹ ہو جانے کے بعد حکومت کی منظوری پر ادا کی جائیگی۔

قرضوں کی ادائیگی کی مدت پندرہ برس سے بڑھا کر پچیس برس کی جا سکتی ہے۔

آجروں کی جانب سے تیار کردہ پلان اب ریاستی حکومت

[...] حکومت کو بھیجنے کے بجائے خود اس کی منظوری دیدے گی۔

حال ہی میں یہ سہولتیں مکانوں کی تعمیر سے متعلق مزدوروں کی امداد باہمی انجمنوں کو بھی دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔

صنعتی مکانات تعمیر کرنے سے متعلق اسکیم کے تحت اب تک چار مرحلوں میں ۲۰۶۲۴ مکانات تعمیر کئے جاچکے ہیں جب کہ اس سلسلہ میں مقررہ نشانہ ۲۰۶۹۰ ہے۔ پانچویں اور چھٹے مرحلوں میں مزید ۴۸۰۰۵ مکانات تعمیر کرنے کے لئے ایک دوسری اسکیم وضع کی گئی ہے۔ دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے آخر تک اتر پردیش میں سات کرور روپیہ سے زیادہ کی لاگت سے ۲۵۵۰۰ مکانات تعمیر ہو جائینگے۔

●●●

اتر پردیش کی ۹۸ امداد باہمی مارکیٹنگ سوسائٹیوں نے اس امر کے باوجود کہ گیہوں کے لیوی اور نرخ پر کنٹرول کے احکام کی وجہ سے منڈیوں میں گیہوں بالکل نہیں آیا۔ موجودہ سیزن میں ایک کرور روپیہ سے زیادہ مالیت کی ۱۰ لاکھ من ربیع کی پیداوار کا لین دین کیا۔

ان سوسائٹیوں نے جو سنہ ۱۹۵۵ء کی ربیع فصل سے کام کرنے لگی تھیں اب تک پانچ کرور روپیہ سے زیادہ مالیت کی زراعتی پیداوار کا لین دین کیا ہے۔

ان سوسائٹیوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اکثر اوقات اپنے ۲۱۲۰۰۰ ممبروں کو نقد بونس تقسیم کرتی ہیں۔

موجودہ امداد باہمی خرید اور فروخت کی اسکیم کا مقصد ایک ایسا نظام وضع کرنا ہے۔ جس کے تحت خرید و فروخت کی خدمات کے مصارف کم سے کم کر دیئے جائیں تاکہ اناج پیدا کرنے والوں کو اپنی پیداوار کی زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل ہوسکے۔ یہ اسکیم دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت دیہی قرضہ جائزہ رپورٹ کی سفارش کے مطابق عمل میں لائی جارہی ہے۔

اتر پردیش میں اس مدت کے دوران میں ۱۵۰ مارکیٹنگ سوسائٹیوں کی تنظیم کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

امداد باہمی مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے سلسلہ میں اب تک جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ حد درجہ حوصلہ افزا ہے۔ ان سوسائٹیوں کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ اس کی روز افزوں مقبولیت۔ اور اس کے سرمایہ حصص اور منافع میں اضافہ اس کی اقتصادی ترقی اور استحکام کا مظہر ہے۔

سن ۱۹۵۶-۵۷ء میں قائم کی گئی ۴۰ سوسائٹیوں کا ادا شدہ سرمایہ حصص جو ۳۰ جون سن ۱۹۵۷ء کو ۱۴۰۰۰۰ روپیہ تھا بڑھ کر ۱۵۰۴۹۰۰ روپیہ ہوگیا۔ ۱۹۵۷-۵۸ء میں قائم کی گئی ۴۹ سوسائٹیوں کا ادا شدہ سرمایہ حصص ۲۰ لاکھ روپیہ ہے۔ اس طرح ۸۹ سوسائٹیوں کا ادا شدہ مجموعی سرمایہ حصص تقریباً ۳۶ لاکھ روپیہ ہوتا ہے۔

سن ۱۹۵۶-۵۷ء میں قائم کی گئی ۴۰ امداد باہمی مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۸۰،۹۲۶ سے بڑھ کر ۳۰ جون کو ۱۲۹۰۰۰ ہوگئی۔ سن ۱۹۵۷-۵۸ء میں قائم کی گئی ۴۹ سوسائٹیوں کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۸۳۰۰۰ ہے۔ ان سوسائٹیوں کے ممبروں کی مجموعی تعداد اس وقت ۲۱۲۰۰۰ ہے۔

گذشتہ پانچ سیزنوں میں ان سوسائٹیوں نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ حسب ذیل سہولتوں کی وجہ سے ہے جو ان سوسائٹیوں کے ذریعہ ان کے ممبروں کو بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

اناج کی صحیح تول کا انتظام۔ غیر قانونی کٹوتی کا خاتمہ۔ اناج کو گروی رکھنے کی سہولت اناج کو گودام میں رکھنے کی سہولت۔ خرید اور فروخت کی بہتر سہولتیں۔ ممبروں کو کیمیادی کھاد اور مویشیوں کے چارہ وغیرہ کی فراہمی۔

✡

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۶

بھادوں ۱۸۸۱
ستمبر ۱۹۵۹ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

"نیا دور" کا اسپیشل نمبر ہر حلقہ میں پسند کیا گیا اور متعدد حضرات نے اس کی تعریف کرتے ہوئے ہمارے پاس خطوط بھیجے۔ اس قدردانی پر ہم ان کے شکرگزار ہیں لیکن درحقیقت یہ سب نتیجہ ہے ہمارے لکھنے والوں کی معاونت کا، اور ہمیں امید ہو کہ ہمیں ان کا یہ تعاون برابر حاصل ہوتا رہے گا۔ البتہ اس سلسلہ میں ہم یہ ضرور عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس غزلیں اس کثرت سے موصول ہو رہی ہیں کہ ان کا انتخاب کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ نظمیں مقابلتہً کم آ رہی ہیں اس لئے ہم شعرائے کرام سے مستدعی ہیں کہ وہ اپنی نظموں سے بھی ہمیں سرفراز فرماتے رہیں۔ اسی کے ساتھ یہ درخواست بھی ہو کہ نیا دور کے لئے جو چیز بھی بھیجی جائے وہ غیر مطبوعہ اور نیا دور کے لئے مخصوص ہو۔ ہمیں یہ بار بار اس لئے کہنا پڑتا ہے کہ کئی مرتبہ یہ گزارش کرنے کے بعد بھی کچھ لوگ پرانی (حتیٰ کہ مطبوعہ) غزلیں، نظمیں اور مضامین تک ہمیں بھیج دیتے ہیں یا ایک ہی نظم اور مضمون بیک وقت دو رسالوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔ ہم اس سے قبل کہہ چکے ہیں کہ کسی رسالہ کے ایڈیٹر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہر مطبوعہ نظم یا غزل یا مضمون اس کی نظروں سے گذر چکا ہو۔ یہ فرض شاعر یا مضمون نگار کا ہے کہ وہ اس قسم کی غیر ذمہ داری سے احتراز کریں۔ ہم نے ابھی تک ایسے حضرات کا نام نہیں لکھا ہے جو اس قسم کی غیر ذمہ داری دکھا چکے ہیں لیکن اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو شاید ہمیں مجبور ہو کر یہ بھی کرنا پڑے۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے، ہمیں سائنس اور دوسرے موضوعات پر بدستور کم تعداد میں مضامین موصول ہو رہے ہیں۔ ہمارے قلمی معاونین کو اس طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

"نیا دور" کی ایجنسی کے شرائط وغیرہ کے بارے میں دفتر کو برابر خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ خط لکھنے والوں کو دفتر سے فرداً فرداً جواب دے دیا جاتا ہے۔ اس خیال سے کہ یہ شرائط سب کو معلوم ہو جائیں ہم انھیں ذیل میں بھی درج کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اتنا اور کہہ دینا مناسب ہوگا کہ نیا دور منگوانا ہو یا محکمۂ اطلاعات اتر پردیش کا کوئی اور جریدہ یا کتاب، بہتر یہ ہوگا کہ وی۔ پی سے منگوانے کے بجائے منی آرڈر سے روپیہ بھیج دیا جائے۔ اس طرح "نیا دور" طلب کرنے والے کو زیادہ رقم نہ صرف کرنا پڑے گی اور دفتر کو بھی اس کا احتمال نہ رہے گا کہ کہیں وی۔ پی واپس کر دیا جائے۔ شرائط ایجنسی یہ ہیں:-

(۱) ایجنٹ کو جتنی کاپیاں منگوانا ہوں اُن کی دُگنی قیمت محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش کے پاس بطور پیشگی بھیج دی جائے۔ یہ رقم محکمہ کے پاس اس وقت تک جمع رہے گی جب تک ایجنسی باقی ہے۔ ایجنٹ جب ایجنسی ختم کرنا چاہے گا، حساب صاف کر دیا جائے گا۔

(۲) ایک مہینہ میں بھیجی ہوئی کاپیوں کا حساب آئندہ مہینے کی پندرہ تاریخ تک صاف ہو جانا چاہیئے۔ اگر تاریخ مقررہ تک حساب صاف نہ ہوا تو محکمہ کے لئے تیسرے مہینہ کا پرچہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

(۳) ایجنٹوں کو فروخت شدہ پرچوں کی قیمت پر ۲۰ فی صدی کمیشن دیا جائے گا۔ حساب بھیجتے وقت وہ کمیشن کی رقم مجرا کر کے باقی روپیہ محکمۂ اطلاعات کو بھیج دیں۔

(۴) کاپیاں معمولی بک پوسٹ اور پسنجر ٹرین سے محکمہ اپنے خرچ سے بھیجے گا۔ لیکن اگر کوئی دوکاندار انھیں رجسٹرڈ ڈاک سے منگوانا چاہے تو رجسٹری کا خرچ اسے خود برداشت کرنا پڑے گا۔

(۵) محکمہ کی طرف سے کاپیاں اچھی طرح گن کر بھیجی جاتی ہیں۔ اگر ڈاک یا پارسل میں وہ کسی طرح کم ہو جائیں یا کاپیاں ضائع ہو جائیں تو اس کی ذمہ داری محکمہ پر ہوگی۔

(۶) بغیر بکی ہوئی کاپیاں دس فی صدی تک واپس لے لی جائیں گی۔ لیکن جو کاپیاں واپس کی جائیں اُن کے بھیجنے کا خرچ ایجنٹ کو برداشت کرنا ہوگا۔ یہ کاپیاں حساب کے ساتھ ہی محکمہ کو مل جانا چاہیئے۔

(ایڈیٹر) ———

ہندوستانی موسیقی
ہندوستان کے فارسی لٹریچر کی روشنی میں۔ (۲)

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت کچھ ایسی بڑھتی گئی کہ رفتہ رفتہ یہ مغل بادشاہوں کے دربار، امراء کی مجلس اور عام معاشرت کا ایک ضروری جزو بن گئی اور اکبر نے اُس کی جو فیاضانہ سرپرستی کی، وہ دربار کی ایک روایت بن گئی۔ جہانگیر فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ اُس نے موسیقی کی سرپرستی میں باپ سے کم زرپاشی نہیں کی۔ اپنے گیارھویں سن جلوس میں دربار کے طنبورہ نواز شوقی کو آنند خاں کا خطاب دیا (تزک جہانگیری رص۔ ۱۸۷) میں لکھتا ہے ؛۔

"شوقی طنبورہ نواز زمانہ کے نوادر میں سے ہے۔ وہ ہندی اور فارسی نغموں کو اس طریقہ سے گاتا ہے کہ سُن کر دلوں کی ساری کدورت جاتی رہتی ہے۔ اُس کو آنند خاں کا خطاب دے کر میں نے اپنے دل کو خوش اور مسرور کیا۔ آنند کے معنے ہندی میں خوشی اور راحت کے ہیں۔"

ایک اور استاد فن محمد قائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ اپنے فن میں بے نظیر ہے۔ ایک موقع پر اس نے ایسے کمالات دکھائے کہ میں نے اس کو روپے میں تلوایا اور ایک حوضہ دار ہاتھی بھی عطا کیا، اور حکم دیا کہ ہاتھی پر سوار ہو کر چاروں طرف روپے برساتا ہوا اپنے مکان تک جائے (تزک جہانگیری۔ ص۔ ۱۸۷)۔ جہانگیر نے اپنی ایک محفل سماع کا عجیب غریب حال لکھا ہے۔ ایک بار دہلی کے قوال اُس کے سامنے گا رہے تھے جب ایک مطرب نے یہ بیت پڑھی۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

جہانگیر نے حاضرین سے اس بیت کا مطلب پوچھا۔ اسوقت مولانا علی احمد نشانی بھی وہاں موجود تھے، جو صاحب سخن اور صاحب دل ہونے کے علاوہ جہانگیر کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ مولانا نشانی پر اس شعر سے وجد کی کیفیت طاری تھی، اسی عالم میں رقص کرتے اور تالیاں بجاتے ہوئے شاہی تخت کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ ایک روز جمنا کے کنارے ہندو عورتیں اور مرد غسل کر رہے تھے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اپنی خانقاہ سے امیر خسرو کے ساتھ نکلے۔ دریا کے کنارے نظر اٹھائی تو یہ مصرع زبان مبارک سے نکلا۔ ع

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

امیر خسرو نے یہ مصرع سنا تو اپنے مرشد سے فوراً یہ عرض کیا۔ ع

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے سر پر اُس وقت ایک ٹوپی تھی جو تھوڑی سی کج تھی مولانا نشانی نے اس بیت کی تشریح میں اپنی کلاہ کو کج کیا، اور وجد کی حالت میں بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ حاضرین کو خیال ہوا کہ مولانا بیہوش ہو گئے ہیں۔ جہانگیر اپنے استاد کی یہ کیفیت دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ غایت اضطراب میں تخت سے اُتر کر مولانا کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا اور اسی حالت میں

مولانا کی روح عالم بالا میں منتقل ہوگئی (تزک جہانگیری ۔ ص ۔ ۸۲)

"اقبال نامۂ جہانگیری" (ص ۔ ۳۰۸) میں جہانگیر کے دربار کے سازندوں اور گویوں کے حسب ذیل نام درج ہیں :۔ حافظ نادر علی ۔ حافظ کیب فتحا ۔ نصیرا ۔ باقیا ۔ حافظ عبداللہ ۔ استاد محمد فائی ۔ حافظ چیلہ ۔ جہانگیر داد ۔ چتر خاں ۔ پرویز داد ۔ خرم داد ۔ ماکو ۔ حمزہ ۔

مورخوں نے شاہجہانی دربار کے جن خاص خاص ماہرین فن کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک لال خاں کلاونت تھا ۔ یہ تان سین کے لڑکے بلاس خاں کا داماد تھا ۔ تان سین نے اس کے بچپن ہی میں اس کا گانا سنا تھا تو اس نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ آگے چل کر استاد فن ہوگا ۔ اسی لئے اس نے اس کو اپنے لڑکے بلاس خاں کے سپرد کیا اور اپنی پوتی سے شادی بھی کردی ۔ عبدالحمید لاہوری مصنف "بادشاہ نامہ" کا بیان ہے کہ دھرپد گانے میں لال خاں بے مثال تھا ۔ خود شاہجہاں دھرپد کا عاشق تھا، اس لئے اس نے لال خاں کو "گن سمندر" (فن کا سمندر) کا خطاب دیا تھا ۔ شاہ جہاں سالگرہ جشن کے موقع پر لال خاں کو انعام واکرام سے نوازتا رہا ۔ (بادشاہ نامہ ۔ جلد دوم ۔ ص ۔ ۵، ۹، ۲۱۱، ۳۵۱) لال خاں کے دو لڑکے خوش حال خاں اور بسرام خاں کلاونت تھے ۔ ان دونوں کے نغمے شاہجہاں کو بہت پسند تھے ۔ خوش حال خاں جب ٹوڑی گاتا تو شاہجہاں پر ربودگی کی کیفیت طاری ہوجاتی ۔ خوشحال خاں اور بسرام خاں کے لئے دربار میں وہی جگہ مقرر تھی، جو اکبر کے زمانے میں تان سین کے لئے تھی ۔ لیکن آخر میں یہ دونوں شاہ جہاں کے عتاب میں آگئے تھے ۔ ہندو ماہرین فن میں شاہ جہاں نے جگناتھ کو مہا کوی کا خطاب دیا تھا ۔ عبدالحمید لاہوری نے اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ ہندوستان بہشت نشان میں ہندوستانی موسیقی کے فن میں اس کے مثل کوئی اور نہیں تھا ۔ شاہجہاں نے اس کے فن کی قدر دانی کے سلسلہ میں اس کو روپے میں تلوایا، اس کا وزن ساڑھے چار ہزار روپے کے برابر ہوا، جو اس کو انعام میں دیدیے گئے ۔ عبدالحمید لاہوری کا یہ بھی بیان ہے کہ تان سین کے بعد موسیقی میں اسی کا درجہ ہے (بادشاہ نامہ ۔ جلد دوم ۔ ص ۔ ۶ ۔ ۵)

"راگ درپن" میں شاہجہانی عہد کے حسب ذیل ماہرین فن کا بھی ذکر ہے جنہوں نے اپنے فن میں بڑا کمال حاصل کیا (۱) گن سین ۔ اسے ناٹک فضل کا خطاب حاصل تھا (۲) محب خاں ۔ یہ دھرپد کا ماہر تھا (۳) بانید خاں (۴) تلسی رام کلاونت (۵) دھرم داس کلاونت ۔ موخرالذکر تینوں دھرپد گانے میں مشہور رہے، (۶) ولی ڈھاڑی (۷) رحیم داد ڈھاڑی (۸) گوپ چند ڈھاڑی (۹) روضہ (۱۰) اکبر ۔ یہ دونوں مشہور قوال تھے (۱۱) شیخ بہاءالدین ۔ یہ صوفی اور موسیقار دونوں تھے ۔ انھوں نے گیت دھرپد خیال اور ترانے میں نئی نئی چیزوں کا اضافہ کیا ۔

"راگ درپن" کا مؤلف بڑے فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ شاہجہانی عہد کی موسیقی اکبری دور کی موسیقی سے زیادہ ترقی یافتہ تھی، لیکن اس کی یہ رائے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اکبر کے زمانے کے گویے محض عطائی تھے کیونکہ ان کی ساری لیاقت "راگ ساگر" پر مبنی تھی اور مان کوتوہل کے ذریعہ جو انقلاب ہوا اس سے یہ سب ناواقف رہے، لیکن شاہجہانی عہد کے گویے مان کوتوہل کے راگ راگنیوں سے روشناس رہے، اور انہوں نے ان میں لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں ۔ "راگ درپن" کے مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ شاہجہاں کے ارد گرد موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین فن جمع ہوگئے تھے، جن میں زیادہ تر گوالیار ہی کے تھے ۔

شاہی دربار میں خوش گلو کنیزیں بھی ہوتیں، جو محلسرا میں بادشاہوں بیگموں، شہزادوں اور شہزادیوں کی تفریح کی خاطر گایا کرتیں ۔ یہ زیادہ تر اس دور کے فارسی شعراء کی غزلیں سناتیں ۔ تاجپوشی، نوروز، عید، بقرعید، سالگرہ، صحت یا فتح وکامرانی کا جو جشن منایا جاتا، اس میں رقص وسرود کی محفلیں بہت ہی شان وشوکت سے منعقد ہوتیں ۔ دربار پورے تزک واحتشام کے ساتھ سجایا جاتا، در و دیوار پر زربفت وکمخواب نظر آتے، ایران وترکستان کے رنگارنگ قالین زمین کو گلزار بنا دیتے، دروازوں پر چین وماچین کے خوش نگار پردے آویزاں ہوتے، جھاڑ فانوس، قمقمے، سفید اور رنگین کافوری شمعیں اور قندیلیں ایوانوں کی چھتوں کو منور کر دیتیں، مجمروں سے عود اور عنبر کے نکہت بیز بادل اٹھتے رہتے ۔ دربار کو اس طرح سج سجا کر دلہن بنا دیا جاتا تو اس وقت ارباب نشاط نغمی موسیقی کے ماہرین طلب کئے جاتے اور وہ شاہی تخت کے پاس پہنچ کر اپنے پرکیف نغموں اور پرجوش سبالاپوں سے پوری محفل کو مست کر دیتے اور پھر

انعام واکرام سے نوازے جاتے۔ "تزک جہانگیری" میں جہانگیر لکھتا ہے کہ جب وہ سولھویں سال جلوس میں بیمار پڑا اور اچھا ہوا تو اس کی خوشی میں نورجہاں نے دربار اور محل کو اس طرح سجایا کہ اس سے پہلے ایسی زینت و آرائش کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس موقع پر موسیقی کے ماہرین فن نے بھی اپنے کمالات دکھائے اور انعامات سے سرفراز کئے گئے (تزک جہانگیری۔ ص۔ ۳۴۱) شاہ جہاں کی لڑکی جہاں آرا جل گئی تھی۔ جب اچھی ہوئی تو شاہ جہاں نے خوشی میں بہت دھوم دھام سے جشن منایا، مخمل اور زربفت کے خیمے لگائے گئے، زرنگار شامیانے کھڑے کئے گئے، جن میں چاندی اور سونے کی ڈوریاں تھیں۔ طرح طرح کے فرش اور قالین بچھائے گئے۔ شاہی تخت کو موتیوں سے سجایا گیا اور اس کے دائیں بائیں جواہر آبدار کے چتر لگائے گئے۔ اس کے دونوں طرف چاندی کی خرگاہ کھڑی کی گئی، جس پر مخمل کا غلاف تھا اور سونے کی مینا کاری تھی مصور پردے آویزاں کئے گئے، جس میں فرنگیوں اور چینیوں کی بہترین صنعت نظر آتی تھی۔ جب شہزادے اور امرا اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو خوش آواز مغنی اور رامشگر اور باکمال سازندے طلب کئے گئے۔ جب انھوں نے گانا شروع کیا تو "بادشاہ نامہ" کے مؤلف کا بیان ہے کہ ان کے سازو آہنگ کی آواز نویں آسمان کو ہلا رہی تھی، اور طبل و نفیر کی صدا کرۂ اثیر تک پہنچ رہی تھی۔" (بادشاہ نامہ۔ جلد دوم۔ ص۔ ۳۹۴۔۹۵)

اورنگ زیب موسیقی کو شرعاً ناجائز سمجھتا رہا لیکن تقریبات کے موقع پر وہ اس پر پابندی عائد کرنے سے مجبور ہو جاتا۔ اس کے لڑکے محمد معظم کی شادی ہوئی تو "عالمگیر نامہ" کے مولف کا بیان ہے کہ مطربوں کے طائفہ نے اپنے ساز و نغمہ سے لوگوں کو محظوظ کیا۔ اس طائفہ میں عورتیں بھی تھیں۔ نقارہ، کرنا، صفیر، نفیر اور سرنا کی آوازیں آسمان تک جاتی تھیں، اور جب مبارکباد میں ترانہ گایا گیا تو خود اورنگ زیب نے بھی اس کو سنا۔ (عالمگیر نامہ۔ ص۔ ۶۴۲)

شاہی دربار کے امراء بھی موسیقی کی سرپرستی میں پیش پیش رہے اور ہر زمانہ میں ان کی مجلسوں میں ارباب نشاط کا دور دورہ رہا۔ راجہ بیربل اکبر کا مشہور درباری گذرا ہے۔ "ماثرالامراء" کے مولف نے لکھا ہے کہ اس کو فن موسیقی میں بڑی مہارت تھی (جلد دوم۔ ص۔ ۱۴۲) یہی مولف زین خاں کوکہ کے بارہ میں لکھتا ہے کہ اس کو ہندی راگوں سے بڑا شغف تھا اور ساز بڑی خوبی سے بجاتا تھا (جلد دوم۔ ص۔ ۳۶۹) عبدالرحیم خانخاناں نے اکبر کے دربار کے مشہور موسیقار رام داس کا گانا سنا تو آبدیدہ ہوگیا اور ایک لاکھ روپے انعام میں دیئے۔ اکبر کے دربار کے ملک الشعرا فیضی نے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی دونوں موسیقی میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ بین بجانے میں اس کو کافی مشق تھی۔ اس کے کتب خانہ میں علم موسیقی پر کافی کتابیں جمع تھیں۔ فیضی کے باپ شیخ مبارک موسیقی کے بھی عالم سمجھے جاتے تھے۔ نغمۂ و سرود اور ساز و آہنگ کے بغیر ان کو چین نہ آتا۔ (بدایونی۔ جلد سوم۔ ص۔ ۷۳) ملا عبدالقادر بدایونی اپنے مذہبی کٹرپن کے لئے مشہور رہے تھے لیکن بین بجایا کرتے تھے، اور ہندی اور غیر ہندی نغموں سے بھی واقف تھے (بدایونی۔ جلد سوم۔ ص۔ ۱۴۴) جہانگیر کے امراء میں اسلام خاں چشتی فاروقی حضرت شیخ سلیم چشتی کے پوتے تھے۔ جہانگیر نے ان کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا۔ عجیب و غریب صفات رکھتے تھے۔ مسلکاً صوفی تھے۔ زندگی بھر جوار کی روٹی، ساگ کا چاول اور ساگ کھاتے رہے لیکن کہتے ہیں کہ میدان جنگ میں ہاتھی سے لڑ جاتے تھے اور اس کو زمین پر دے مارتے تھے۔ مذہبی احکام کے بھی بڑے پابند رہے لیکن فنون لطیفہ کی سرپرستی کی خاطر بنگال کے رقص و سرود کے ارباب کمال مثلاً لولی، ہورکنی، کنچنی اور ڈومنی پر نو لاکھ ساٹھ ہزار سالانہ خرچ کیا کرتے تھے۔ (ماثرالامراء جلد اول۔ ص۔ ۱۱۹)۔ جہانگیر کا ایک اور درباری امیر میرزا علیسٰی ترخان نغمہ و ساز، راگ و رنگ دونوں کا ماہر سمجھا جاتا تھا (ماثرالامراء جلد سوم۔ ص۔ ۴۸۸) شاہ جہانی امراء میں مغل خاں اور حسام الدین خاں کو ہندوستانی موسیقی میں بڑی مہارت تھی۔ مغل خاں کے یہاں موسیقی دانوں کا بڑا مجمع رہتا تھا (ماثرالامراء جلد اول۔ ص۔ ۵۸۶۔ جلد سوم۔ ص۔ ۴۹۲) اس دور میں موسیقاروں کا سب سے بڑا مرکز شاہ نواز خاں صفوی کا دربار تھا جو خود بھی راگ اور نغمہ کا دلدادہ تھا۔ اس کے دربار میں جتنے گویّے اور سازندے تھے کسی اور امیر کے یہاں نہیں تھے۔ (ماثرالامراء۔ جلد دوم۔ ص۔ ۶۷۵) شاہجہانی دور میں ملا عبدالسلام لاہوری اپنے مذہبی اور فقہی علم کے لئے مشہور تھے اور بقول مولانا ابوالکلام آزاد جس طرح ہدایہ اور بزدوی کے مشکل مقامات حل

کو [illegible] طرح موسیقی کی مشکلات بھی حل کر دیا کرتے تھے۔ اسی دور میں شیر خاں لودی نے مرآۃ الخیال لکھی تو ہندی نغمات پر مستقل ایک باب لکھ کر ہندوستانی موسیقی کی بہت سی باریکیاں بتائیں۔ شاہجہاں کے درباری مورخ عبدالحمید لاہوری نے ہندوستانی موسیقی کی تعریف دل کھول کر کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "موسیقی لذیذ ترین مستلذات اور دقیق ترین معقولات میں سے ہے، خصوصاً ہندوستانی نغمہ تو ایسے مرتبہ کی چیز ہے کہ اس سے بلند تصور میں نہیں آسکتا ہے۔ اس کی آواز میں دلربائی ہے، کیفیت ہے، دل کشائی ہے۔ ہر قوم میں موسیقی ہوتی ہے لیکن جو وسعت، نازک خیالی، رنگینی، دل نشینی اور ناز و نیاز ہندوستانی نغمہ میں ہے، اس کا دسواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی کسی اور قوم کی موسیقی میں نہیں۔ اسی لئے ہندوستان کے نغمہ کا حسن یہاں کے حسن کی طرح عالمگیر ہے" (بادشاہ نامہ۔ جلد اول ص ۱۵۲)

عالمگیری امرا میں سب سے بڑا ماہر فن فقیر اللہ سیف خاں تھا۔ اس نے ہندوستانی موسیقی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسی سلسلہ میں اس نے راجہ مان سنگھ کی ترتیب دی ہوئی مان کوتوہل کا فارسی میں ترجمہ کیا، جس کا نام "راگ درپن" تھا۔ اس میں اپنی طرف سے اس نے بہت سے قواعد کا اضافہ بھی کیا۔ اس نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے کہ ہندوستانی سنگیت میں کون کون سے راگ، کن کن راگوں سے مل کر بنے۔ اسی کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر راگ کی راگنیاں (رسویاں) ہوتی ہیں اور پتر (لڑکے) بھی ہوتے ہیں۔ راگ کی چھ قسمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی راگنیاں ہیں جن کے علیحدہ علیحدہ پتر ہیں۔ فقیر اللہ نے اپنی کتاب میں ان سب کی تشریح کی ہے۔

ہندوستان کی مرکزی حکومت کے علاوہ صوبوں میں بھی موسیقی کی شاہانہ سرپرستی برابر ہوتی رہی۔ کشمیر کے مشہور سلطان زین العابدین کے بارے میں فرشتہ لکھتا ہے کہ:-

"جب اس کی سخاوت کی شہرت پھیلی تو ساز بجانے والے اور گانے والے جو کہ زمانے میں بے مثل تھے، اطراف و جوانب سے کشمیر آنے لگے۔ چنانچہ کشمیر ہندوستانی فن موسیقی کا ملک فرنگ بن گیا۔ خواجہ عبدالقادر کا ایک شاگرد ملا عودی خراسان سے سلطان کے پاس آیا اور عود ایسا بجایا کہ سلطان بہت خوش ہوا اور بڑے انعامات سے نوازا۔ ملا جمیل حافظ تھے۔ اشعار بھی بڑی خوبی سے پڑھتے تھے۔ انھوں نے سلطان کی مجلس کو خوب گرم رکھا۔ سلطان کا وقت ان کی وجہ سے خوب گذرتا اور وہ ان کو ہر سال اتنے روپے دیتا کہ اس کی تفصیل نہیں لکھی جا سکتی ہے ..... سلطان کی مجلس میں ایسے ایسے اہل نغمہ اور ارباب طرب تھے کہ ان کی صورت اور آواز دونوں کا حسن زمانہ میں بے مثل تھا۔ ان کے ناچ بھی بے نظیر ہوتے۔ اسی لئے سلطان کی مجلس رشک بہشت بن جاتی۔ بعض گانے والے ایک گانے کو بارہ طریقے سے ادا کرتے۔ بعض اہل طرب کے ساز مثلاً عود، رباب اور طنبور مطلا و مرصع ہوتے۔

(فرشتہ۔ جلد دوم۔ ص۔ ۳۴۴)

گجرات میں سلطان مظفر (المتوفی ۱۵۲۶ء) موسیقی کا بڑا صاحب فن سمجھا جاتا تھا۔ "مرات سکندری" (ص ۔ ۱۷۹) میں ہے کہ وہ بہت ہی خوش گلو تھا، اور گو اس کو مذہب سے بھی بڑا شغف تھا لیکن مختلف ساز و مثلاً رباب، چیتری اور سرمنڈل وغیرہ بجانے میں اتنا کمال رکھتا تھا کہ اس کے عہد کے استاد بھی اس کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ "مرات سکندری" کے مؤلف کا یہ بیان ہے کہ سلطان کو سورانیہ دہیا، مالدیہا، براکیت، سواریدہ، جھندو اور دوہیرہ میں بڑی مہارت تھی۔ یہ سب غالباً گجراتی راگ یا راگنیاں تھیں۔

سلطان مظفر کا بیٹا سلطان بہادر بھی موسیقی کا بڑا مربی تھا۔ نائک بخشو بھی آخر میں اُسی کے دربار میں چلا آیا تھا جیسا کہ ذکر آچکا ہے "مرات سکندری" میں سلطان بہادر کے ایک اور ماہر فن کا ذکر ہے جس کا نام منجھو درج ہے۔ لیکن بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ یہ منجھو دراصل بیجو ہے جو بیجو باورا کے نام سے مشہور رہا۔ ہمایوں نے جب گجرات فتح کیا تو منجھو یعنی بیجو اس کے ہاتھ آیا لیکن کچھ دنوں کے بعد بیجو پھر سلطان بہادر کے پاس بھاگ کر چلا آیا اور سلطان بہادر نے اس کو دیکھ کر کہا:

"جو میرے پاس سے گیا تھا، آج واپس آگیا۔ اس کو دیکھ کر میرا سارا غصہ اور غم جاتا رہا۔ اب میری اور کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔ جو کچھ میں نے خدا سے طلب کیا تھا وہ مل گیا۔"

(مرات سکندری۔ ص۔ ۲۵)۔

بیجو اپنے عہد کے ماہرین کا استاد سمجھا جاتا تھا۔ تان سین سے اس کی ٹکر کی بہت سی روایتیں بیان کی جاتی ہیں مگر ان میں کچھ افسانوی رنگ بھی آگیا ہے۔

گجرات کے حکمراں سلطان محمود ثانی کا وزیر دریا خاں بھی موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ "مرات سکندری" میں ہے:۔

"دریا خاں کے زمانے میں ہر گھر ہر منزل، ہر کوچہ اور بازار سے ساز و نغمہ کی آواز آتی تھی۔ اس کے دربار کے کلاونتوں میں نائک انجو تھا جس کے روح افزا نغمے سے نائک گوپال کی مردہ روح میں بھی جان آجاتی تھی۔ نائک حسینی بھی تھا جو نائک بخشو کا لڑکا تھا۔ نائک چتر کے دو بیٹے رنگ خاں اور ملہی بھی تھے، حکیم ماہرین بھی تھا۔ ان کے نغموں سے زہرہ بھی آسمان سے اتر آتی تھی اور یہ سب اپنے فن میں بینظیر تھے اور دریا خاں کی خدمت میں رہتے تھے (ص۔ ۲۶۸)"

دکن بھی موسیقی کا گہوارہ رہا بلکہ بعض حیثیتوں سے اس کو شمالی ہند پر فوقیت حاصل تھی۔ دکن کے مسلمان حکمرانوں میں اکبر کی طرح ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اس فن کو بڑا فروغ دیا۔ اس کو خود موسیقی کے فن میں بڑا کمال تھا اور اس فن کے جتنے ماہرین تھے دور دور سے اس کا گانا سننے کے لئے آتے تھے اور اس کے جود و کرم سے فیضیاب ہوتے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس کے دربار میں ماہرین فن کا بہت بڑا مجمع ہو گیا تھا۔ تقریباً تین ہزار گویّے ایسے تھے جو شاگرد کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کی تین قسمیں تھیں (۱) حضوری۔ یہ جماعت فن موسیقی میں غیر معمولی مہارت رکھتی تھی اور ہمیشہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حضور میں رہتی تھی (۲) درباری ان لوگوں کا درجہ حضوری سے کم تھا (۳) شہری۔ یہ وہ ماہرین فن تھے جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے بسائے ہوئے شہر نورس میں رہتے تھے۔ یہ گویا فن موسیقی کے طلباء کی تین جماعتیں تھیں، جن کا استاد ابراہیم عادل شاہ ثانی تھا۔ وہ جب کوئی راگ یا راگنی باندھتا تھا تو وہ پہلے حضوریوں کو سناتا تھا جو اس کو ازبر کر لیتے تھے۔ یہ درباریوں کو سناتے تھے اور جب وہ اس کو سن کر یاد کر لیتے تھے تو پھر وہ شہریوں کو سناتے تھے۔ اس طریقہ سے فن موسیقی کی تعلیم کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہو گیا تھا۔ ہر جماعت کے لئے وظائف اور جاگیریں مقرر تھیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فن موسیقی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام "نورس" ہے۔ اس کا دیباچہ ملا ظہوری نے قلمبند کیا تھا جو نثر نگاری کے لحاظ سے ایک بے عدیل چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس دیباچہ کے آگے "نورس" کی شہرت دب کر رہ گئی۔ نورس میں ۵۹ گیت اور ۱۷ دوہرے ہیں۔ گیتوں میں ۱۹ گیت کنہرا (یا کرناٹی) کے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو زیادہ پسند تھے۔ اسی طرح بھیروں، بھوپالی، رام کلی، جھنجھوٹی، مارو، آساوری، دیسی، پوریا، براری، ٹوڑی، ملہار، گوری، کلیان، دھناسری، کیدارا، اور نور دز پر گیت ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے صحیح معنوں میں ہندوستانی موسیقی کو "سیکولر" بنایا کیونکہ اس نے جہاں اپنے رسول اور خواجہ سید محمد گیسو دراز کی شان میں گیت لکھے ہیں وہاں بہت سے گیت ہندو دیومالا سے بھی بھرے ہیں۔ مثلاً ایک "بھوپالی" میں کہتا ہے۔

حضرت محمد جگت ترگر گسائیں تو در گہ چمک میرو من سار
ترلوک جیت تو نانو پادیں پران کی پڑان
آچرج مہا پیرا بلا بلی توں ہی سانچو اوتار
کوڈ چاہے ماتنگ تکھار کو ڈورتن مال
کوڈ بھوجن واسہ کوڈ دھامان دھولار
ابراہیم چاہے اتم بدیادان دھرم
سید محمد کی ڈہائی کریم کرتار

(اے حضرت محمد آپ تینوں جہان کے ہادی ہیں۔ آپ کی درگاہ مقناطیس ہے اور میرا دل لوہا ہے جو اس طرف کھنچا رہتا ہے۔ تینوں جہان والے آپ کے نام کا ورد کرتے ہیں اور اس سے ان کی دلی آرزو پوری ہوتی ہیں۔ آپ دلیوں میں سب سے بڑھ کر ہیں۔ آپ ضعیفوں کے دست گیر اور سچے نبی ہیں۔ کوئی گھوڑے اور ہاتھی چاہتا ہے تو کوئی ہیرے کی مالا۔ کوئی کھانے کپڑے کا آرزو مند ہے، تو کوئی بلند محل کا متمنی۔ ابراہیم خدا سے دست بدعا ہے کہ وہ سید محمد کے وسیلے سے اس کو علم اور سخاوت میں ممتاز کردے)

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۳)

غزل

اختر اورینوی

تیرے نصیب میں کہاں سوزِ یقیں گدازِ غم
جانے تو کیا کہ دل نشیں میرے لئے ہے نازِ غم

میں نے گلے لگائی تھیں دردِ اثر خموشیاں
بول اٹھا سکوت ہی، چھپ نہ سکا یہ رازِ غم

جس کے لئے تجلیاں حسنِ خیال و دردِ زیست
جادۂ زندگی اسے سلسلۂ درازِ غم

آرزوئے دل کی زندگی، زہر بھی ہو نشاط بھی
رقصِ حیات دم بہ دم شعلہ بہ جاں بہ سازِ غم

حسن کی بے قراریاں! یہ بھی ہے اک مقامِ عشق
میرے دلِ حزیں کو ہے تجربۂ نیا غم

اخترِ زار سے کہو شوق کے مرحلے ہیں اور
جلوۂ خاصِ حسنِ عام! طور نہیں فرازِ غم

غزل

ایس این سنہا

کہیں رنگِ رخ کے نکھار میں، کہیں خندۂ گل تر میں ہے
وہ چمن کہ محفلِ ناز ہو ترا جلوہ میری نظر میں ہے

وہ لطیف دعوتِ رنگ و بو وہ حسین فرصتِ آرزو
دلِ سادہ لوح کو کیا کہوں کہ جنونِ مادہ گر میں ہے

نہ قرار ہے، نہ ثبات ہے مگر ایک لمحۂ جاں فزا
وہی دلکشی ہے شباب میں، جو بہارِ رقصِ شرر میں ہے

یہ نگار خانۂ زندگی، یہ طلسمِ دانش و آگہی
پسِ پردۂ تنِ عنصری کوئی شے تو روحِ بشر میں ہے

لبِ ناز کا وہ پیامِ جاں، مگر اس کے آگے نہ پوچھئے
وہ خمارِ بادۂ آرزو کہ دل و دماغ و نظر میں ہے

دلِ غم نصیب کی داستاں میں کروں بیاں نہ کروں بیاں
کہیں کھل نہ جائے وہ راز بھی جو ہنوز دیدۂ تر میں ہے

یہ ادائے ناوکِ بے اماں، وہ تاثرات کہ الاماں
جسے عینِ جانِ سکوں کہیں وہ خلش بھی دردِ جگر میں ہے

عجب انقلاب ہے ہم نشیں کہ وہ آرزوئے دلِ حزیں
جو نگاہِ یاس میں تھی کبھی وہی اب کسی کی نظر میں ہے

جو رواں دواں ہے یہ کارواں، ہے کہاں وہ منزلِ جستجو
مرا عزمِ راسخ و نوجواں، وہ میرے مذاقِ سفر میں ہے

وہ خرامِ ناز وہ نکہتیں، وہ ادائے نرگسِ شرمگیں
جو روش روش ہے چمن چمن وہ بہار میری نظر میں ہے

رنگِ سیار

آدارہ

"اودھ کے آخری تاجدار حضرت سلطان عالم واجد علیشاہ کے دور حکومت میں علی رضا بیگ کی کوتوالی ان دنوں کے لکھنؤ میں ایک افسانوی حیثیت رکھتی تھی۔ جاگیرداری نظام اور اس کے اداروں کو مٹے سو برس سے اوپر ہو چکے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب خود لکھنؤ میں شاید گنتی کے لوگ ہی مرزا کے نام اور اُن کے کارناموں سے واقف نکلیں گے۔ وہ دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ جرائم پیشہ عناصر کی گرفت اور سرزنش کے لئے مرزا نے جو اصول قرار دیئے تھے، مروجہ قوانین انصاف سے ناروا ہوں تو ہوں مگر اس وقت کی سوسائٹی کے تانے بانے میں کھپ جاتے تھے۔

والد مرحوم کے ہم نشینوں میں ایک بزرگ وارث محمد عسکری نام صلحا، لکھنؤ سے تھے۔ کبھی شاہی عزا خانے کے مرثیہ خوانوں میں اسم تھا اور کوتوال سے رسم۔ میں نے لڑکپن میں اِن کی زبانی مرزا کے بہت سے واقعات سنے تھے۔ ایک آپکی نذر کرتا ہوں:

گھڑیال کی ٹن ٹن نے چونکا دیا۔ کلبلائیں۔ آنکھ کھلی دیکھا تو دن چمک رہا تھا۔ جماہی آئی۔ نیند کا رہا سہا خمار کافور ہو گیا۔ بکھرے بال سمیٹ کر جوڑا باندھا۔ سامنے آئینہ تھا۔ رات کا اجڑا اجڑا چہرہ یہی تھیں کہ یکایک کچھ یاد آیا۔

یہ تھیں نوروزی بیگم۔ خواص کو آواز دی: "سبزہ — سبزہ"

سبزہ (سانولی سلونی گدرائی جوانی، شوخ مزاج) "آئی سرکار"

بیگم کہاں تھی بے فضلی؟ میں پوچھتی ہوں یہ ابھی کیا بجا؟

سبزہ "اری لونڈی کیا جانے۔ یہ جوانی پیٹا گھڑیال یونہی اپنی جان کو پیٹا کرتا ہے"۔

بیگم "چل یہ ہر وقت کا خیلا پن ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتا باتیں نہ چکنا۔ ڈیوڑھی پہ جاکے پوچھ کیسی ہے۔ مردی! آنکھوں پہ چربی چھائی ہے، سوجھتا نہیں، مہتابی کی دھوپ دہلیز چوم رہی ہے۔ اور وہ بیکل مغلا ابھی تک نہیں اجڑا"۔

سبزہ "کچھ نہیں، سرور تیز ہو گیا۔ کہیں بیٹھے جھونکے لے رہے ہوں گے۔ ورنہ وہ! ادھر گھڑیالی نے دس کی موگری اٹھائی، ادھر وہ ڈیوڑھی میں ہنہنائے"۔

بیگم "یونہی تو کہا میں نے۔ باہر جاکے پوچھ کیسی ہے، یہ دس بجے یا کچھ اور؟ ہے ہے! جو کہیں دس بج گئے، اور مغل بیگ نہ آئے۔ ادھر غارت گئی کچہری کے پٹ بند ہو گئے تو لگی پینڈ آٹھویں دن"

سبزہ "مزہ یہ کہ سرکار نے آج رات کے کھانے میں پلاؤ انار دانہ کی فرمائش کی ہے اور آج ہی ڈیوڑھی میں برکت ہے۔ رزق کے نام کا دانہ اور چکھنے کو نمک کی کنکری نہیں"

بیگم "میں نہیں جانتی کیا! گئی بوٹی نپا شوربا تو ہوتا ہی

ہے۔ سونیپاں کی آبرو کھتی۔ اس ماسے کل ہی چھاپ انگلی میں ڈال لی تھی کہ دھوپ گرماتے گرماتے مغل کچہری سے لوٹ آئیں گے ڈیوڑھی کا چھتا چھنا چھن بانٹ دوں گی، سودا سلف آجائے گا اور بھئی رات کا خاصہ اک ذری تکلفی رہے گا۔ وہ پکّی پپّہاس نکے گوشت پر.....“

سبزہ (بات کاٹ کر) ”جان کی امان۔ لونڈی کی زبان میں تو سٹے رٹتے موچ آگئی کہ از برائے خدا اس پرانے پھوس کو اب فلیتہ دکھایئے اور کوئی اچھا چلتا پرزہ، ذری کلتے ٹھلتے کا کار زندہ رکھیے۔ وہ ہماری سرکار کو بھاتا نہیں“

بیگم ”کیوں نہیں، جس میں ایک دن سنوں، بیگم، مبارک! کارندے صاحب گئے اور اپنے ساتھ دادی حضور کی چھاپ اور مہینے بھر کا آذوقہ، وثیقے کے روپئے بھی لے گئے۔ تو کیا جانے نفری، اس میں کیا ثنی ہے ہماری، اری نادان ہاتھ کے سچے آج کل موتیوں کو بھی مہنگے ہیں“

سبزہ ”قربان جاؤں سرکار، پھر تو وہی مثل ہوئی کہ کانا اور کانے بغیر چین نہیں۔ گھڑیاں بجا ہو، آتے ہوں گے، شرک پر تسبیح کرتے ہوئے.....“

بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ ڈیوڑھی پر کوئی کھنکھارا: ”سبزہ! میں حاضر ہوں۔ حضور میں کورنش عرض کرو، آج گھڑی بھر کی دیر ہوگئی چھاپ اور رومال لاؤ، کچہری جاؤں“

سبزہ ”سن لیا سرکار؟ تشریف لایئے نہ امی جی سے“

بیگم ”پوچھو تو ان سے آج اتنی دیر کیوں ہوئی؟ یہاں اتنے ہی میں خفقان ہونے لگا“

سبزہ ”مرزا، سرکار پوچھتی ہیں تمہارا مردہ اتنی دیر سے کیوں نکلا؟“

مغل ”معاذ اللہ کتنی آتش فشاں چھوکری ہے (بلند آواز سے) سبزہ، عرض کرو سرکار کا فرمانا مرے سر آنکھوں پر۔ کیا کرتا گھر سے نکلا ہی تھا، جو بائیں پر تڑاق سے چھینک پڑی۔ وہیں ٹھٹھک گیا۔ اب رستہ کاٹ کے آیا ہوں“

بیگم ”سبزہ، کہنا، خدا نے خیر کی، آئی بلا ٹل گئی۔ اب کچہری سے جلد لوٹیے گا“

مغل ”سبزہ، عرض کرو، بہت مناسب۔ چھاپ اور رومال دے جاؤ، اور حضور سے کہو، بلا ایک نہ تھی دو دو کا ترغہ تھا۔ منہ اندھیرے سے بائیں آنکھ بھی پھڑک رہی تھی۔ تو کیا تب جاکے جی ٹھہرا“

سبزہ ”یہ لیجئے چھاپ اور رومال۔ کب تک آیئے گا؟“

مغل ”یہی ٹھنڈے ٹھنڈے کوئی پانچ بجے تک“

سبزہ ”کیا کہا، کوئی پانچ بجے تک! بس تو دم ہو چکا پلاؤ انار دانہ اور ملاحظہ کر لیا سرکار نے۔ اُنہہ! مجھے کیا، تمہیں کو بے سے کریں گی“

مغل ”ڈیوڑھی کے پچھواڑے تو ہے نہیں وثیقے کی کچہری۔ نہیں نہیں کرکے بھی اٹھنی سواری ہے“

سبزہ ”میں کہتی ہوں ٹلیئے گا بھی، یا یہیں کھڑے کھڑے لیاقت بگھارے جایئے گا“

مغل ”سبزہ، بہت منہ زور کلہ دراز ہوگئی ہو تم“

سبزہ ”پھر نہ ہوں گے۔ اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں، اور چین کرتے ہیں۔ اے وہ اب بھی نہ ٹلے جھجھڑ کہیں کے“

مغل ”لیجئے صاحب ٹل گئے۔ دیکھیں گے پلاؤ انار دانہ اکیلے اکیلے کیوں کر سے پچا لیتی ہو“

سبزہ ہنس کر ”یہ منہ اور مسور کی دال!!“

—:—

دن ڈھلا۔ دھوپ کا کندنی رنگ ماند پڑا۔ پانچ ساڑھے پانچ کا عمل ہے۔ اور چوک کی چہل پہل شباب پر۔ دوکان داروں نے دن بھر کا گرد و غبار جھاڑ کر اپنا اپنا مال قرینے سے سجا دیا ہے۔ خرید فروخت ہو رہی ہے۔ پان والوں کی دوکان پر سیلانیوں کے جمگھٹ ہیں۔ آئے ڈبل دیا گلوری کھائی۔ مڑے تھے کہ گگڑ والے نے عظیم اللہ خانی کی نے بڑھائی، دور سے خمیرے کے چار کش کھینچے اور آگے بڑھے۔ کسی یار آشنا سے آنکھ ملی تسلیمیں بجائیں، مزاج پرسی کی چلتے ہوئے۔ ایک بانکے گاڑھے کا گریبان کھلا زعفرانی کرتا، اسی کا گھٹنا، سر پہ قالب چڑھی چوگوشیہ ٹوپی، پاؤں میں زرد بانات کی ٹاٹ بافی، دوپایوں پر داڑھی چڑھائے، مونچھوں کو تاؤ دیئے، ہاتھ میں فولادی سانگ، تیر سے سیدھے چلے آرہے ہیں۔ بھیڑ کائی سی پھٹی، لوگ مجرا کورنش بجا لائے۔ بانکے منہ سے نہیں بولتے گوشہ ابرو سے چھپتا سا جواب دیتے ہوئے بڑھ جاتے

ہیں۔ جاڑا، گرمی، برسات، روز کی یہی وضع یہی معمول ہو مجال ہو کہ وقت ٹل جائے یا آن بان میں فرق آئے۔ ایک نواب زادے تفریح کو نکلے ہیں۔ بھاری کام کی نکتے دار ٹوپی گھنگریالے بالوں پر جمی ہوئی، تین کمر توڑیوں کا چست انگرکھا، گلبدن کا کھنچا ہوا گھٹنا، ہاتھوں میں مہندی، پانوں میں منڈی جوتی، چھل بل کرتے کمیت پر ران پٹری جمائے، خوش خرام چلے آرہے ہیں۔ جلو میں دو تین ہم سن خوش پوش مصاحب، آگے آگے چابک سوار۔ ادھر سے کسی رئیس کی سواری آرہی ہے۔ کمر کسے، ہٹو بچو کرتے دو پیادے ہیں، خود بدولت بوچے میں، چار کہار سرخ بانات کے ڈھیلے ڈھالے چغے پہنے، ہوں ہوں کرتے، کندھا بدلتے۔ ارباب نشاط کے بالاخانے جنت نگاہ فردوس گوش، سارنگی رِت رہی ہے، طبلہ ٹھنک رہا ہے۔ اہل بزم کیف وسرور کے عالم میں "واہ واسبحان اللہ" سے نغمہ فروش کو داد دے رہے ہیں۔ بیل چل رہی ہے، چاندی برس رہی ہے۔

مجمع کے اسی بہاؤ میں مرزا مغل بیگ ہلتے کانپتے پنجوں کے بل کبھی ایڑیوں پر سڑک پر زنجیرہ ڈالتے چلے آرہے ہیں "معاذ اللہ! کیا کھوے سے کھوا اچھل رہا ہے۔ سانس لینا دوبھر ہے... اس بھیڑ نے تو چول چول ہلا دی۔ سلامتی سے ڈیوڑھی پہنچ گئے تو سمجھئے گنگا نہائے۔ جینے پیچھے دو رُلی کے لئے یوں جان جوکھم میں ڈالنا کس حکیم نے بتایا ہے... اے حضور مار ڈالا۔ کس خوبصورتی سے پہلو میں کہنی دی ہے کہ آنکھوں تلے تارے چھٹک گئے۔ .. معاف کیجئے گا ذری دیکھ بھال کے۔ آپ کی پیک سے مار جوتیاں چت گئیں... تسلیمات عرض۔ ذری جلدی میں ہوں پھر ملوں گا... جی ہاں وثیقے کی کچہری سے..." کہنے پائے تھے کہ داہنی بغل میں دبا ہوا بایاں ہاتھ جھول کے لٹک پڑا۔ مغل بیگ کے حواس جاتے رہے، پیروں تلے سے زمین نکل گئی "اماں اماں۔ لوٹ لیا، لوٹ لیا۔ پکڑو پکڑو۔ وہ ہے۔ وہ جاتا ہے۔ وہ۔ وہ۔ وہ پھنک گیا فینس کے پیچھے۔ وہ نکلا، وہ گیا۔ پکڑو پکڑو" چند لمحے کے لئے چوک کے بیچ پہ سناٹا چھا گیا۔ مغل بیگ تھے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ منہ پر ہوائیاں رنگ فق۔ دیدے پھٹ گئے۔ دم بخود سکتے کا عالم۔ لوگوں نے گھیر لیا۔

ایک "کیا ہوا قبلہ؟ نصیب دشمناں خیر تو ہے؟"

دوسرا "اے حضرت کچھ تو کہیئے۔ الجھن ہو رہی ہے کون گیا، کیا لے گیا؟"

مغل "کیا عرض کروں، وثیقے کی کچہری سے آرہا ہوں سو روپئے پوٹلی میں بندھے بغل میں دبے تھے۔ وہ کسی شقی نے مار لئے۔"

ایک "ہے ہے! میں تو حضرت کے تیور دیکھ کے سہم گیا۔ دیکھئے نہ چہرے پہ سپیدہ پھوٹا ہوا ہے۔ چلئے ہٹائیے، سر صدقے گئے۔ یک در دنیا ستر در آخرت۔"

دوسرا "اور میں عرض کرتا ہوں، قصور معاف۔ یہ سو روپئے باندھ کر آپ کھلے خزانے وہ بھی ماشے اللہ سے چوک کے اس بھیڑ بھڑکے میں چلے ہی کیوں تھے۔ ہو نہ ہو کوئی اچکا تھا سائے سائے لگا آتا ہوگا۔ غافل پاتے ہی داغ دے گیا مردک۔ افسوس ہوا واللہ۔"

ایک "دیکھئے نہ ہونٹ بے جارہے ہیں۔ میری مانئے، تو سامنے تحسین کی مسجد ہے بیں پہ کلی کرکے گلوری نوش کیجئے۔ وہ گکڑ والا ٹہل رہا ہے، دو کش حقے کے ملاحظہ ہوں، تب حواس برجا ہوں۔ پھر دولت خانے کا رخ کیجئے۔ تسلیمات عرض۔"

مار ڈالا ظالم جیتے جی مار ڈالا... ہائے اب بیگم کو کیا منہ دکھاؤں گا... وہ ضیابانی سبزہ کیا کچھ زہر نہ اگلے گی... ہائے کیسے کہوں گا کہ پوٹلی کی پوٹلی اچک لے گیا کافر... رومال کے گوشہ میں چھاپ بندھی تھی وہ بھی گئی۔ خداوندا! وہ تو بیگم کا ایمان تھی۔ آج مارا گیا دس برس کی نوکری میں۔ اور... ہے ہے! ساتھ میں وہ دکھیا بیگم بھی۔ اس غریب کا تو اسی پر گزارہ تھا۔ اس کے منہ کا چھیا تم نے چھنوایا مغل بیگ تم نے گنوایا... بس کچھ نہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک چھلانگ میں قصہ پاک۔ جس میں رونے کو لاشہ بھی نہ ملے.. چل کے.." سورج ڈوبے، دونوں وقت ملے۔ زمین سے آسمان تک رات کی سیاہی میں مرزا مغل بیگ ایک ربودگی کے عالم میں لڑکھڑاتے ڈگمگاتے سڑک کے ایک موڑ پر کسی طرف جارہے ہیں۔ چہرہ شست کر لٹک گیا ہے، آنکھوں

میں گھستے ہیں۔ لگتا ہے مردہ کفن پھاڑ کے قبر سے اٹھا ہے، اور چلا نہیں چلا جا رہا ہے۔

اچانک دامن شب چاک ہوا اور سامنے سے ایک جلوس سا آتا دکھائی دیا۔ دستیاں لئے کئی مشعلچی قدم قدم پر روشنی دکھاتے ہوئے ان کے پیچھے "دور باش" کی صدا لگاتے چاندی کے عصا باندھے چار بانکے مرد ہے، پھر ننگی تلواریں کھینچے دو تلنگے، ان کے پیچھے ادھیڑ عمر کشیدہ قامت بھرے بھرے جسم کے ایک مرد نشین گیہواں رنگ، لمبی گھنی مونچھیں، کلوں پہ چوڑی چوڑی ٹھیکیں، مہین شربتی کا بنجات لگا انگرکھا، سر پہ شملہ، چوپڑ کے مشروع کا کلی دار پیجامہ پہنے خراماں خراماں قلیان بردار لمبی سٹک کا پیچوان لئے، دائیں بائیں دو کہار رتاڑ کے جھالر کے پنکھے جھلتے ہوئے، ایک خدمت گار کی بغل میں سفید غلاف چڑھی آب شورے کی صراحی، دوسرے کے ہاتھ میں پدری تھالی جوڑ۔ پھر کمر کسے لال پگڑیاں باندھے، کئی روتنے اور پیادے گوش بر آواز۔

مغل بیگ کا پاس سے گزرنا تھا کہ دفعتاً جلوس رکا اور کسی کی بھاری آواز سنائی دی "گومتی ڈوبنے جا رہے ہو مغل بیگ ؟

اماں ابھی تو میں جیتا ہوں۔ مرزا ندی اکھلی ہے۔ پیروں کے تلوے بھی نہ بھیگیں گے "

مغل بیگ بے خودی کے عالم میں کھوکھلی آواز سے "کون ہو، کون ہو تم مجھے ٹوکنے والے ؟" آواز پھر آئی "ہوش میں آؤ، نہیں پہچانا؟

مغل بیگ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور دیوانہ وار جھپٹ کے بولنے والے کا گریبان پکڑ لیا "علی رضا کوتوال! لاؤ میری پوٹلی! لاؤ میرے سو روپے!"

قریب تھا کہ تلنگوں کی تلواریں مغل کے سر پہ چمکیں جو کوتوال نے ہاتھ کے اشارے روک دیا "مغل بیگ گریبان چھوڑو اور چھری تلے دم لو۔ روپے گنوائے تم، اور پکڑا جائے علی رضا!! خیر یوں ہی سہی۔ بیٹے کہاں جاتے ہیں۔ سو ٹکی کے لئے جان دے کر گور کیوں اجالی کرتے ہو"

مغل بیگ کی گرفت چھوٹ گئی۔ کھڑے رہنے کی سکت نہ تھی۔ مدہوشی میں گرا چاہتے تھے جو علی رضا نے سنبھالا۔ "دیکھو انھیں آرام سے ہاتھوں ہاتھ کوتوالی لے چلو"

اس حکم کے ساتھ ہی جلوس روانہ ہو گیا۔

یہ مچھلی والی بارہ دری ہے۔ ایک کشادہ کمرے میں مرزا علی رضا بیگ آرام چوکی پر پیچوان کی سٹک سے کھیلتے ہوئے نیم دراز ہیں۔ دائیں بائیں پنکھا ہو رہا ہے۔ سامنے اپنے آپ سے بے خبر مغل بیگ سر نیوڑھائے تکئے دار مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ اور خاموشی ہے۔ دفعتاً کوتوال نے آواز دی "ادھر آؤ"

جواب میں کسی نے "حاضر" کہا۔ ساتھ ہی بغلی کمرے سے پیشی کے منشی کان میں قلم گھڑے برآمد ہوئے

کوتوال "چور کھاتہ اور شہر کا نقشہ

منشی جی "بہت خوب" کہہ کر الٹے پاؤں لوٹے اور لمحے بھر بعد کھاتہ اور نقشہ لئے واپس آئے۔

کوتوال "کھاتے میں چوک کا حلقہ نکال کر ہمیں دو۔ اور نقشہ کھولے سامنے کھڑے رہو"

علی رضا بیگ نے کھاتے کا معائنہ کرکے نقشے پر نظر دوڑائی، جسے دیکھتے دیکھتے کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی، کبھی تیوری پر بل پڑ جاتے۔ مغل بیگ گم سم بت بنے کھوئے ہوئے بیٹھے تھے کہ یکایک کوتوال کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، چہرہ بشاش ہو گیا۔

کوتوال "ہاں بھئی مغل بیگ۔ ہوا یہ کہ تم روپے لے کر وثیقے کی کچہری سے نکلے، اور (قلم سے نقشہ پر بتاتے ہوئے) یہ دیکھو چلتے چلتے شاہ مینا کی درگاہ کے سامنے سے گزرے نالے کا پل پار کیا۔ گول دروازے پہنچے۔ پوٹلی بغل میں تھی۔ کیسے تھی ؟"

پوٹلی کے نام پر مغل چونکے، اور گردن سے جواب دیا کہ تھی۔

کوتوال "چوک میں داخل ہوئے، گھومنے پھرنے والوں کی ریل پیل شروع ہوئی، کپتان کا کنواں آیا۔ خیریت رہی۔ آگے بڑھے، چلے اور چلے۔ (ہنس کر) چلے کیا چلائے گئے"

مغل بیگ "یہ آپ ٹھٹھول کرنے مجھے یہاں لائے ہیں۔ قسم ہے اب وجد کی اپنا گلا کاٹ کے دم لوں گا۔ مغل بچہ ہوں"

کوتوال (بات کاٹ کر) بجا ہے۔ گلے کی فکر نہ کیجئے۔ میں نہ کٹنے دوں گا "

مغل بیگ (تلملاکر) "پھر وہی مسخراپن، وہی بازاری باتیں "

کوتوال " بازاری کی تو بات ہے۔ ہاں تو سنئے یہ ہے آپ کی واپسی کا نقشہ ۔ ہے نہ ؟ چلئے اور دیکھئے۔ یہ آپ پہنچ گئے تحال کے پھاٹک پر۔ مغل طالع کے سکندر ہو۔ یہاں پکڑا گیا چور تھا را " (منشی سے) نقشہ اور کھاتہ لے جاؤ" (پکار کے) "کدرا "

مغل بیگ جھلاکر "کیا چور چور، کدرا کدرا کرکے آپ مجھے بچوں کی طرح تھپکیاں دے رہے ہیں۔ سنئے جناب ولائتی کا بیٹا ہوں ۔ حضرت حسین کی قسم . . . . "

کوتوال "جلدی نہ کرو مرزا۔ (پکار کے) کدرا!!"

ساتھ ہی آرام کرسی کے پیچھے سے ایک چھوکرا گویا زمین نے اگل دیا۔ چودہ پندرہ برس کا سیہ فام، آنکھوں میں بجّو جیسے دیدوں کی چمک۔ ننگے سر۔ لال تول کا جانگیہ پہنے۔ آداب بجالایا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

کوتوال "کدرا! یہ ہمارے مرزا مغل بیگ ہیں، نوروزی بیگم کے کارندے۔ انھیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کہنا یہ تیسری بار ہے، اب کے اور درگزر کرتا ہوں، ورنہ لال مرچوں کا توبڑہ منہ پر چڑھوا دیتا۔ شہر بانٹ دیا۔ حلقے الگ کر دیے، پھر بھی نہ مانے، غریب بوڑھے پر ہاتھ صاف کرایا۔ وہ بھی پرائے علاقے میں۔ جتا دیا کہ بوڑھے بالے اور بیوہ کو نہ موندو، کیا شہر کے رئیس نواب مرگئے ؟ مگر نہیں سنا۔ بس جاؤ اور بارہ کے گجر سے پہلے جواب سنوں گا ورنہ حلقہ چھین کر وہ سزا دوں گا کہ چلتی ہوا اور بہتا پانی روئے گا۔ جاؤ۔ مرزا صاحب تشریف لے جائیے"

مغل بیگ۔ کہاں ؟ کوتوال صاحب کان کھول کر سن لیجئے، دغا کی بو پاؤں گا تو تھارا اور اس چھوکرے کا سر تن سے جدا کر دوں گا "

کوتوال ہنس کر "مرزا، یہ سر ابھی سے حاضر ہے، مرد دغا نہیں کیا کرتے۔ جائیے جائیے، اس کی نوبت نہ آنے پائے گی" (کدرا سے) کدرا سمجھ گیا نہ ؟ اچھا مغل، شب بخیر، خدا حافظ"

شہر آبادی سے دور، ریتلی زمین، بالو کے تودے، سائیں سائیں کرتا کانس کا جنگل، اندھیاری رات، گیدڑوں کی ہونہو، مغل بیگ اور کدرا مونج اور پتاور کی گھنی دو دھاری گھاس کو چیرتے چلے جا رہے ہیں۔

مغل بیگ "ہانپتے ہوئے" ابے ملاعون کہاں چلوں، کب تک چلوں ؟ بولتا نہیں۔ یہ ظلمات کی رات، یہ بھیانک سناٹا۔ ابے یہاں تو بھیڑیئے ہوں گے۔ خداوندا میں کس جال میں پھنس گیا "

کدرا "چپ چاپ چلے آیئے۔ جال تو نہیں، ہاں بھیڑیئے بہت ہیں"

مغل بیگ "اچھا ہے پھاڑ کھائیں، پاپ کٹے۔ بچو، بچو گے تم بھی نہیں"

کدرا "جی نہیں، اس جنگل کے بھیڑیئے مجھے پہچانتے ہیں۔ البتہ آپ نے میں ہشیار رہیں "

مغل بیگ "وہ نہ سہی تو میں تیری بوٹیاں بو دوں گا اس جنگل میں "

کدرا "کیا ہوگا۔ ہر بوٹی سے اور ایک کدرا پیدا ہو جائے گا۔ (رک کر) اے چپ رہیئے ہم آگئے "

گھنی گھاس میں چھپی ہوئی گھپ اندھیارے میں ایک کچی دیوار دکھائی دی جس میں چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ کدرا نے تین بار کھڑکی کے پٹوں کو تھپ تھپایا۔ اندر سے کسی نے جیسے کھڑکی پر منہ رکھ کے پوچھا "کون ؟"

کدرا "بارہ دری! بے چے کھڑکی کھولو"

کھڑکی کھلی، پہلے کدرا اچک کر اس پار کودا، پھر جیسے تیسے مغل کو کھینچا اور پٹ بند ہوگئے۔ ٹوکنے والا بے چے کدرا کا ہم سن ایک چھوکرا تھا۔

بے چے "کسے لائے ؟"

کدرا "اپنے ہی ہیں، قدم بوسی کو بھیجے گئے ہیں "

بے چے "سمجھ گیا جاؤ۔ میں پہرے پہ ہوں "

کدرا "کیا کر رہے ہیں ؟"

بے چے "کرتے کیا وظیفے میں ہیں "

اس پوچھ گچھ کے بعد کدرا اور مغل بیگ آگے بڑھے۔ پتلی چھیٹ سی پگ ڈنڈی پر کوئی سو قدم بڑھے ہوں گے کہ دفعتاً کانس

کا جگہ جگہ سے اور ایک کھلی جگہ دکھائی دی جسکے اُس سرے پر کچی دیواروں کا گھر تھا دروازہ بند۔ کدرا نے دستک دی۔ اندر سے آواز آئی "تو کون ؟"

کدرا "بارہ دری"

دروازہ کھلا کسی نے سر نکال کر آنے والوں کا جائزہ لیا۔

مغل بیگ کدرا کے پیچھے اندر داخل ہوئے اور دروازہ بند ہو گیا آنگن چھوڑ کر دالان میں قبلہ رخ چوکی پر جانماز بچھی تھی۔ اور طاق میں رکھے کڑوے تیل کے چراغ کی دھیمی روشنی میں آنکھیں بند کئے دنیا و مافیہا سے غافل ایک بزرگوار موٹے موٹے دانوں کی تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اور لبوں کی حرکت سے جو شکلیں بن رہی تھیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ وظیفے کا ایک ایک حرف اپنے پورے مخرج سے ادا ہو رہا تھا۔ تسبیح کے دانے دھیرے دھیرے گر رہے تھے یہاں تک کہ سیکڑہ پورا ہوا۔ بزرگ نے تسبیح کو چوما اور دونوں ہاتھوں پر دم کر کے سینے اور پیٹھ پر پھیرا۔ پھر پورب پچھم اتر دکھن چھو چھو کر کے آنکھیں کھولیں اور کدرا کی طرف مخاطب ہوئے۔

کدرا نے جھک کر سلام کیا۔ اور آنکھ کا اشارہ پاکر بڑھا اور کان میں کچھ کہا۔ بزرگ نے سر سے پاؤں تک مغل بیگ کو دیکھا، اور دستک دی۔ ساتھ ہی آنکھیں ملتا ہوا تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا آیا اور مغل بیگ کو دیکھتے ہی مسکرانے لگا۔ مغل بہوت کھڑے تھے جو کدرا نے ہاتھ دبا کر چپکے سے کہا: "مرزا جی پہچانا ؟ یہی ہے اور بڑا شاطر ہے چاہے تو آنکھوں کا سرمہ اڑا لے اور آپ کو پتہ نہ چلے"۔ اتنے میں بزرگوار نے نو وارد چھوکرے کو انگلی سے اشارہ کیا۔ وہ گیا اور لوٹا تو مغل بیگ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے ہاتھ میں وہی پوٹلی تھی، اور کھونٹ میں نوروزی بیگم کی چھاپ بندھی تھی۔ چھوکرا چاہتا تھا کہ چوکی پر رکھ دے جو بزرگوار کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ حلق سے گرجتی ہوئی "ہوں ہوں" نکلی اور مرزا کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔ لڑکے نے پوٹلی مغل کو دے دی اور آہستہ سے کہا "دیکھ لیجئے گرہ تک نہیں کھلی ہے"۔ یہ کہا اور جدھر سے آیا تھا ادھر ہی غائب ہو گیا۔ اب بزرگوار نے کدرا کو پاس بلایا اور کان میں کچھ کہہ کر رخصتی کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی دونوں پلٹ پڑے۔ چلتے چلتے کدرا نے کہا "اب ہم دوسرے رستے سے چلیں گے۔ مجھے بارہ کے گجر سے پہلے کوتوالی پہنچنا ہے"۔

کدرا "مرزا صاحب! وہ دیکھئے شہر کی روشنی، ٹمٹما رہی ہے۔ کچھ یاد ہے آپ کہاں گئے تھے ؟"

مغل بیگ "لعنت بھیجتا ہوں یاد۔ رکھنے والے پر" مگر بتا یہ کیا تماشا تھا؟

کدرا "آپ نے دیکھ لیا۔ یہی بس ہے"

مغل بیگ "یہ کیا اسرار ہے ؟"

کدرا "اس کا جواب کوتوال صاحب دیں گے"

مغل بیگ "تو کون ہے ؟"

کدرا "کدرا ہوں، چلئے چلئے دیر ہوتی ہے" اور دونوں آگے بڑھ گئے۔

کدرا "مرزا جی کوتوالی آگئی۔ یہاں سے ہم آپ الگ الگ۔ یاد رکھیئے کہ جس نے آپ کی پوٹلی اچکی، وہ جہاں پناہ کی جیب پر بھی بند نہیں۔ آداب عرض کرتا ہوں۔ اور ہاں لیجئے۔ چاند کی پہلی کو آٹھ کا گجر بج رہا ہو تب یہیں ایسا لفافہ آپ کو مل جایا کرے گا"

یہ کہہ کر اور مغل بیگ کو ایک سر بند لفافہ دے کر کدرا چل دیا۔ مغل بیگ نے لفافہ چاک کیا تو اس میں شہر کے ایک ساہوکار کے نام دس روپئے کی درشنی تھی۔

ایک نامکمل سفر

سلطانہ حیات

میدانوں کے رہنے والوں کے لئے پہاڑ اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتے ہیں اور جو پہاڑی مقامات کچھ مشہور ہو جاتے ہیں ان کو دیکھنے کی تو اور بھی آرزو رہتی ہے۔ کیلاش یاترا کے سفرناموں میں پتھورا گڑھ۔ گنناک اور کربیانگ کے نام پڑھتے تھے تو ان مقامات کو دیکھنے کے لئے دل بے قرار ہو جاتا تھا۔ ریل کے وہاں تک پہنچنے کا کوئی سوال نہیں ایسی سڑک بھی نہ تھی جس پر کوئی سواری چل سکے۔ صرف پیدل سفر ممکن تھا۔ ایسے سفر میں کیا دقتیں پیش آئیں گی اس کا اندازہ تھا۔ اس وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی۔

ادھر چند سال ہوئے اخباروں میں پڑھا کہ حکومت دفاعی ضرورتوں کے پیش نظر تبت کی سرحد تک سڑک بنا رہی ہے۔ اور وہ گنناک کے آگے تک بن بھی گئی ہے۔ اسی وقت ارادہ کر لیا کہ ایک بار اس طرف ضرور جائیں گے۔ اور اب کی بار گرمیوں میں اس شوق کو پورا کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ پیلی بھیت سے ٹنک پور، وہاں سے چمپاوت۔ پتھورا گڑھ۔ گنناک سے کچھ آگے جا کر متصل ہوتے ہوئے کوسانی اور رانی کھیت، پھر نینی تال آجائیں گے۔ یہ سفر ریل۔ موٹر بس اور پیدل چل کر پورا کرنے کا ارادہ تھا۔

سفر سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ چمپاوت۔ پتھورا گڑھ اور گنناک کا کچھ ضروری حال معلوم ہو جائے، وہاں کے سفر اور قیام کے مسائل کیا ہیں، اور قابل دید چیزیں کون کون ہیں۔ لیکن باوجود کوشش کے کوئی کارآمد کتاب نہ مل سکی۔ اس لئے ہم لوگ ان مقامات پر قریب قریب اس طرح چل کھڑے ہوئے جیسے کوئی ایسے دور دراز کے سفر پر روانہ ہو جس کے بارے میں علم کم ہوتا ہے اور لاعلمی بہت زیادہ! اور وہی لاعلمی سفر میں روح ڈال دیتی ہے۔

پیلی بھیت سے ہم ٹنک پور روانہ ہوگئے۔ راستہ میں کھیٹما کا بس اسٹیشن پڑا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاردا کو ایک اونچے مقام سے گرا کر ایک کروڑ یونٹ سے زیادہ بجلی پیدا کی گئی ہے۔ کھیٹما بجلی گھر کو تیار کرنے میں اتر پردیش کی حکومت نے تقریباً ایک کروڑ ۱۴ لاکھ روپیہ خرچ کیا ہے۔

ٹنک پور قریب قریب میدان میں آباد ہے مگر تین طرف سے پہاڑ بھی اس کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک پہاڑی ندی ٹنک پور کو شاداب بناتی ہوئی گذرتی ہے۔ اسی ندی پر آگے چلکر کھیٹما کا مشہور بجلی گھر بنایا گیا ہے۔ ٹنک پور ایک چھوٹی سی بستی ہے لیکن اپنے پختہ مکانوں اور دکانوں اور کاروباری چہل پہل کی وجہ سے اوسط درجے کے شہر کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی ہے جہاں عام ضروریات کی چیزیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔

سردیوں کے زمانے میں ٹنک پور کی آبادی اور رونق بہت بڑھ جاتی ہے کیوں کہ یہاں نیپال، کمایوں اور ہمالیہ کے اور گوشوں سے پہاڑی باشندے اپنی مخصوص پیداوار مثلاً اون، کھالیں، جڑی بوٹیاں

کھیٹما بجلی گھر

وغیرہ لے کر آجاتے ہیں اور اس کے عوض نمک، چائے، مٹی کا تیل، لالٹین، چھتریاں، سوتی کپڑے اور دوسرا ضروری سامان لے جاتے ہیں۔ دس بارہ سال ادھر اپنی پیداوار کے ساتھ ساتھ اپنی معصوم بیٹیوں کو بھی روپیہ اور ضروریات زندگی کے عوض فروخت کر جاتے تھے مگر اب یہ خرید و فروخت سرکاری روک ٹوک اور کڑی نگرانی، نیز ان کے ذرائع آمدنی کے وسیع ہو جانے کی وجہ سے بند ہو گئی ہے۔ ٹنک پور سے پتھر بھی بڑی تعداد میں میدانوں کو بھیجا جاتا ہے یہاں پر اکثر مکان میدانی طرز کے ملتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کی آبادی زیادہ تر بریلی پیلی بھیت اور مراد آباد وغیرہ کی طرف کی ہے جو تجارت کے سلسلہ میں یہاں آکر آباد ہو گئی ہے۔

ٹنک پور میں ایک رات ڈاک بنگلہ میں قیام کیا اور وہاں کی خوبصورت شام دیکھی۔ شاید صبح بھی حسین ہوتی مگر کہرے کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا۔ سخت اُمس تھی۔ اس لئے طبیعت پریشان ہو گئی۔

صبح صبح ہم لوگ چمپاوت کے لئے روانہ ہو گئے۔ سڑک رفتہ رفتہ پہاڑوں پر چڑھنے لگی۔ یہ پہاڑ ایک کے بعد ایک تصویر کی طرح اپنے دامن میں گہری گہری وادیاں لئے سامنے آتے جاتے تھے۔ قسمت کی تحریر کی طرح سڑک بل کھاتی۔ لہراتی۔ انسان کی عظمت پر مہر ثبت کرتی چلی جاتی تھی۔ دور سے گذرنے والی بسیں، ٹرک، کاریں اور جیپ وغیرہ چیونٹیوں کی طرح رینگتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک طرف لاکھوں برس قائم اور دائم رہنے والے پہاڑ اور دوسری طرف یہ حقیر گاڑیاں!

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

ہوا لمحہ بہ لمحہ ٹھنڈی ہوتی جارہی تھی۔ جب سڑک مڑتی تو پہلے سے زیادہ شاندار پہاڑ سامنے آجاتے تھے۔ سڑک تقریباً ۴۰۰۰ ہزار فٹ اوپر چڑھنے کے بعد پھر نیچے اترنے لگی راستہ میں چھوٹے چھوٹے بس اسٹیشن پڑتے ہیں۔ دو تین اور بعض جگہ ۴۔۵ تک چائے کی دوکانیں ملتی ہیں جن میں چائے کے علاوہ بسکٹ کیلے اور پہاڑی مٹھائی بھی مل جاتی ہے۔ یہاں بیٹھ کر دو آنے میں چائے کا گلاس پیجئے" دھوئیں سے اَٹی ہوئی بانس یا لکڑی کی دیواروں پر مذہبی کیلنڈروں کے بیچ میں نرگس اور مینا کماری کی ہنستی ہوئی تصویریں دیکھئے اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہوجائیے۔

ٹنک پور سے کوئی ۴۲ میل چل کر ۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اتر کر "چلتی ندی" کا پل پڑتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اور ندیاں ٹھہری رہتی ہیں۔ اس کا نام ہی چلتی ندی ہے۔ یہ پل انجینیری کا ایک کارنامہ ہے اور چند ہی برس ہوئے بنایا گیا ہے۔ پہلے موٹریں "چلتی" کے ایک کنارے پر آکر رک جاتی تھیں مسافروں کو ایک جھولے کے پل کے ذریعہ جو اب بھی باقی ہے پیدل چل کر دوسرے کنارے جانا ہوتا تھا اسباب بھی ایک طرف سے دوسری طرف ڈھونا ہوتا تھا جس میں وقت اور روپیہ دونوں صرف ہوتے تھے۔ اب "چلتی" پر گاڑیوں کیلئے پل بن جانے کی وجہ سے سفر اور مال کی درآمد و برآمد آسان ہوگئی ہے۔ یہ پل بہت سادہ اور خوبصورت ہے۔ تقریباً ۴ گز کا فاصلہ دریا میں دے کر سیمنٹ کی دو کمانیں سی بنائی گئی ہیں جو ایک پہاڑ سے شروع ہوکر دوسرے پہاڑ پر ٹک جاتی ہیں۔ ان کمانوں سے لوہے اور سیمنٹ کی سلاخیں لٹکی ہوئی ہیں۔ یہی سلاخیں سڑک کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ "چلتی" کو عبور کرنے میں پہلے بڑی دیر لگتی تھی۔ اور اب اس طرح سے اس ندی کو پار کرلیا جاتا ہے کہ اونگھتے ہوئے مسافر کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب پل آیا اور کب گذر گیا۔

سنگ میل پتہ دیتے رہتے تھے کہ چمپاوت نزدیک آتا جارہا ہے۔ سڑک خطرناک ڈھلواں پہاڑوں پر سے گذر رہی ہے۔ کنارے ایک سفید کتبہ لگا ہے جو بتاتا ہے کہ ایک دفعہ ایک موٹر آٹھ سپاہیوں کو لے کر کھڈ میں گر پڑی تھی۔ بڑی مشکل سے لاشوں کو نکالا گیا تھا اور پھر ایک ہی چتا پر لٹانا پڑا کیوں کہ اعضا کی پہچان مشکل ہوگئی تھی۔

یہاں پہونچے ہی تھے کہ ڈرائیور نے مسافروں سے یا مسافروں نے ڈرائیور سے باتیں شروع کردیں۔ حد ہے لاپرواہی کی! یہ وہ جگہ

چلتی ندی کا پل

تھی۔ یہاں ایک سیکنڈ کی غفلت سواریوں کو اس گہرائی میں پہنچا سکتی تھی جو سڑک سے ٹھیک طرح پر نظر بھی نہیں آتی تھی۔

سڑک رفتہ رفتہ نیچے اترتی چلی جاتی ہے جنگل بھی گھنا ہوتا جاتا ہے۔ چپادت کا جنگل! دماغ چپادت کے جنگل اور اس کی کہانیوں میں کھو جاتا ہے۔ مگر جلدی ہی کھیت اور مکانات آنے شروع ہو گئے۔ دوپہر کے قریب ہم چپادت پہونچ گئے۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن میں بڑی سی وادی ہے۔ سرسبز کھیت ہیں۔ بل کھاتی پتلی اور چوڑی سڑکیں ہیں جن میں سے کچھ انسانوں نے بنائی ہیں کچھ جانوروں نے چل چل کر بنالی ہیں۔

بس اسٹیشن چپادت کا سب سے بڑا بازار بن گیا۔ بہت سی کھانے کی دوکانیں ہیں جن کی ڈھکی ہوئی چھتوں پر مسافروں کے قیام کا انتظام ہے۔ دوکاندار قیام کا کرایہ صرف یہ لیتے ہیں کہ مسافر کھانا اس دوکان پر کھائیں۔ باہر سے طرح طرح کا سامان یہاں آتا ہے مثلاً دوائیں۔ مٹی کا تیل۔ چھتریاں۔ کپڑے۔ نمک۔ یہاں تک کہ میدانوں کے پھل بھی ان وادیوں میں پہونچ جاتے ہیں۔ یہاں سے آلو۔ اون۔ کھالیں اور پتھر میدانوں کو بھیجے جاتے ہیں۔

ایک مسافر نے بس سے اتر کر ایک قلی سے کہا۔

"لادے بھائی!"

"میرے پاس کہاں ہے؟"

"مر دنگا تو میں مر دنگا۔ تجھے کیا؟۔ بس تو تو مجھے ذرا سا دیدے" لہجے میں بڑی خوشامد تھی۔

"میرے پاس نہیں ہے بابا!" اس کا یہ جملہ اس کے ہونٹوں پر آکر جم گیا۔ کیوں کہ اس کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی۔ دونوں بہت گھبرا گئے۔ ان کی گھبراہٹ میری توجہ اپنی طرف مبذول کرا چکی تھی۔

"کیا چیز؟" میں نے پوچھا۔

بھلا اس سوال کا جواب کوئی سمجھدار کیا دیتا۔ البتہ پاس سے لڑکپن بول اٹھا۔

"گانجا"

ہو سکتا ہے کہ میرے چلے آنے کے بعد اس لڑکے کو اس طرح بول اٹھنے کا انعام دو چار چیتھڑوں کی شکل میں ملا ہو

اس وادی میں برساتی ندی نالوں کے علاوہ دو ایک چھوٹی بڑی ندیاں بھی ہیں۔ اور الٹی ندی۔ جو جنوب سے شمال کو بہتی ہے ہمالیہ کے اندر اس قسم کی شاید ایک ہی ندی ہے۔ یہاں کے باشندے جب اس کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی اس خلاف قاعدہ بات پر معصومیت سے مسکرا ضرور دیتے ہیں۔ میٹھے اور ٹھنڈے سوتے اور چشمے بھی ہیں، اور "نیولا" بھی کہیں کہیں موجود ہے۔ وہ نیولا نہیں جو سانپ کو مارتا ہے۔ یہاں نیولا اس سوتے کو کہتے ہیں جو پہاڑ میں سے کسی جگہ کنوئیں کی طرح نکل آئے۔ لیکن اس میں پانی اوپر کی سطح تک آجاتا ہے۔ ان میٹھے پانی کے سوتوں پر نہ معلوم کب، کن فرض شناس لوگوں نے پختہ حوض بنوا دیئے ہیں۔ حوض پر چھت ہے تین طرف سے دیواروں نے پانی کو محفوظ کر رکھا ہے۔ نیولا کی چھت باہر سے پرانے زمانے کے مندروں کی یاد دلاتی ہے۔ یہ پانی پینے اور کھانا پکانے کے کام آتا ہے۔ آج بھی ہر شخص نیولوں کی صفائی کا خیال رکھتا ہے۔

چپادت کے باشندے عموماً غریب ہیں۔ دن میں عورتیں بہت کم نظر آئیں گی۔ وہ زیادہ تر کھیتوں میں جو یہاں کے پہاڑوں پر ہر ممکن جگہ واقع ہیں کام کرتی ہیں۔ مرد محنت مزدوری کرتے ہیں دن میں کبھی کبھی کسی بڑے گھرانے کی کوئی عورت چلتی پھرتی نظر آجاتی ہے مگر اس طرح کہ آگے آگے کوئی مرد چلتا ملے گا۔ مرد نہ ہوگا تو لڑکا ہی سہی۔ یہ سر جھکائے اس کے پیچھے رواں دواں ہوگی۔ لڑکا ٹھہر گیا۔ کھیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تو یہ بھی رک جائے گی۔ جب وہ چل پڑے گا تو عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے گی۔

یہ سب لوگ اجنبی لوگوں کو غور سے اور مسکرا کر دیکھیں گے۔ ان سے بات کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ بڑے خوش اخلاق ہیں۔ بناوٹ اور تصنع سے بالکل نا آشنا۔ ان لوگوں کے گھر ایک ہی طرح کے اور عموماً دو منزلہ ہوتے ہیں۔ پہلی منزل کے لکڑی کے ستون، دوسری منزل کا بوجھ اٹھائے ہوئے ملیں گے۔

دوسری منزل کا سامنے کا حصہ لکڑی کا بنا ہوگا۔ اس حصے میں چھوٹی چھوٹی تین کھڑکیاں ہوں گی۔ لکڑی پر مخصوص قسم کے نقش ونگا

چمپاوت کی ایک عورت

ہوں گے جالیاں مغلیہ آرٹ کو یاد دلاتی ہیں کہیں لکڑی کا ہاتھی بھی دروازے پر نصب ملے گا عموماً مکان کے سامنے کا حصہ عنابی رنگ کا ہوگا بیچ کی کھڑکی کبھی کبھی کھلی بھی نظر آجائے گی۔ بقیہ کھڑکیاں شاید بننے کے بعد کبھی کھولی نہیں جاتیں۔

گھر میں قدم رکھئے تو صاحب خانہ کے ساتھ دھواں اور گھٹی گھٹی ہوا آپ کا استقبال کرے گی۔ سونے کے کمرے میں چولہا بھی ہے۔ جس میں عموماً سیلی ہوئی لکڑیاں جل کر سارے مکان کو دھوئیں سے بھر دیتی ہیں۔ دھوئیں کی نکاسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ لوگ کھڑکیاں اور دروازے کھولتے کیوں نہیں۔ یہ ان سے دریافت کرنے کے بجائے خود ہی گھر کا جائزہ لے لیجئے۔ جواب مل جائے گا۔

ان مقامات کی گرمیاں بھی اتنی سرد ہوتی ہیں کہ ایک ہلکی رضائی کی ضرورت برابر رہتی ہے۔ اور جاڑے تو پھر جاڑے ہی ہوتے ہیں جن میں کبھی کبھی برف بھی پڑ جاتی ہے۔ ان موسموں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ان بیچاروں کے پاس بستر اور گرم کپڑے کہاں؟۔ گھر کو چاروں طرف سے بند کرکے اس کمی کو پورا کرلیتے ہیں۔ چاروں طرف سے بند ہونے کی وجہ سے مکان میں اتنا اندھیرا رہتا ہے کہ ٹارچ جلا کر میں نے گھر کا جائزہ لیا حالانکہ اس وقت باہر کافی روشنی تھی۔ صاحب خانہ کی بوڑھی ماں اندازے سے ترکاری کاٹ رہی تھی۔

"بی بی، تمھاری آنکھیں۔؟"

خالی دیدوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ دھوئیں کی وجہ سے میری آنکھوں سے بھی پانی جاری ہوگیا تھا۔ ماحول سے بے خبر کوئی چھ سات برس کی بچی پیے پیتے فرش پر ایک چھوٹی سی گدڑی پر لپٹی سو رہی تھی۔ گدڑی اتنی چھوٹی تھی کہ اس کی ٹانگیں اس سے باہر نکل گئی تھیں۔ ایسی گدڑیاں گھر میں دو تین اور بھی تھیں۔ ان گدڑیوں میں ٹاٹ کا پیوند بھی تھا اور کالی سرج کا بھی جو شاید کبھی گھر کے باپ یا دادا کا کوٹ بن کر ساری عمر کی ساتھی رہی ہوگی۔ اور لٹھے کے ٹکڑوں کا بھی۔ کچھ اور کپڑوں کے پیوند بھی تھے مگر زمانے نے ان کو اتنا تبدیل کر دیا تھا کہ میں ایک نظر میں نہ پہچان سکی کہ وہ کیا تھے بہرحال اب تو وہ اس گدڑی کا اہم جز تھے۔

دوسرے تیسرے کمرے میں کچھ پیتل کے برتن۔ کانچ کے گلاس بھیڑوں وغیرہ کی کھالیں تھیں اور کھیتی کے اوزار وغیرہ بھی طاق پر دیا دھرا تھا۔ کب جلتا ہوگا یہ چراغ پتہ نہیں۔ کیوں کہ اس وقت بھی اتنا اندھیرا تھا کہ کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔

میں نے پوچھا گھر کی مالکہ کہاں ہے۔ گھر کے مالک نے بتایا کہ وہ کھیت پر کام کر رہی ہے۔

"کب آئے گی وہ؟"

"آجائے گی تھوڑی دیر میں" اس وقت سورج ڈوب چکا تھا۔

"اور کون ہے کھیت پر؟"

"ایک بہن ہے جس کو اس کے خاوند نے چھوڑ دیا ہے۔ اس کا

[illegible] ہوں:

پہاں کے اعتبار سے یہ کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ ان کے دروازے پر ایک گھوڑا بھی بندھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر آس پاس کے رہنے والے بھی آگئے۔ گھروں کے چاروں طرف دھان، تمباکو اور آلو کے کھیت تھے۔

میں نے پوچھا۔ آلو کیا بھاؤ ہیں۔

"مجبور پچیس روپیہ من !"

"مجھے خریداری نہیں کرنی ہے۔ اصلی قیمت بتاؤ۔"

"یہی دام ہیں۔"

"واہ۔ آٹھ روپیہ فی من تو کھلے بازار میں دام ہیں۔

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر بتایا کہ بہت دن ہوئے یہاں پر آلو چھبیس روپیہ من بھی بکا تھا۔ وہ زمانہ یاد کر کے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔

ہمیں دیکھ کر عورتیں بھی آگئیں تھیں۔ ان سب نے ہمیں بڑی محبت سے رخصت کیا اتنی دیر میں وہ ہمیں اپنے دکھ درد اور آرزوؤں اور خوشی سے آگاہ کر چکے تھے۔

یہ چمپاوت کا ایک حصہ ہے۔ دور اوپر ایک پہاڑی کی چوٹی پر کمیونٹی پروجیکٹ کی سرکاری عمارتیں بن رہی ہیں۔ یہاں ایسی کوئی خاص دستکاری نہیں ہے جو لوگ گھر پر بیٹھ کر کر سکیں۔ یہاں کے باشندے زیادہ کھیتی کرتے ہیں اور فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ کمایوں رجمنٹ مشہور ہے۔ تعلیم بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر پڑھنے کے خلاف ایک محاذ بھی بن گیا ہے۔ مثلاً لڑکے پڑھنے کے بعد بوجھ وغیرہ اٹھانے کے قابل نہیں رہ جاتے جو کہ یہاں کا ایک ذریعہ معاش ہے۔ فوج میں بھرتی ہوتے ہیں مگر پورا کمایوں تو فوج میں لیا نہیں جا سکتا۔ تو یہ پڑھا لکھا لڑکا اپنے خاندان کے لئے ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ باپ سوال کرتا ہے۔ کہ اپنے لڑکے کو پڑھاؤں تو کیوں؟ کیا فائدہ ہوگا مجھے؟"

ایک پتلی سی گلی جو بڑے بازار سے چلتی ہوئی ڈاک بنگلہ کی طرف جاتی ہے اس پر برابر برابر ہر طرح کی دکانیں ہیں۔ حلوائی کی دکان پر ایک عجیب سی چیز رکھی تھی۔ اس پر سفید شکر دانوں کی شکل میں لپٹی ہوئی تھی معلوم ہوا کہ یہ پہاڑوں کی خاص مٹھائی ہے۔ بال نام ہے کھائی تو میٹھا ہی میٹھا تھا۔ دہلی کی قلاقند اور لکھنؤ کی برفی نے میدان والوں کے منہ کا مزہ خراب کر دیا ہے۔ ورنہ بال واقعی مٹھائی ہے۔

ایک کمایونی نوجوان

ہم اس بازار میں ایک رات کچھ خرید رہے تھے۔ میرے دس سالہ بچے نے جو چمپاوت کے شیروں کی کہانیاں بہت پہلے سن چکا تھا ایک دکاندار سے پوچھا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ جم کاربٹ نے یہاں شیر کا شکار کھیلا تھا۔؟"

"ہاں ہاں، کاربٹ صاحب نے یہاں شیروں کو مارا تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیں شکار کی کچھ باتیں بتلانے لگا۔"

جو لوگ سیاحوں کو باتیں کرتے دیکھ کر ہمارے اردگرد جمع ہو گئے تھے ان میں سے ایک بڑے میاں بولے۔

"یہ کیا جانے۔ یہ بات ہے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء تک کی۔ تب یہ بچے ہوں گے۔ مجھ سے پوچھو اس کا حال۔

بڈھے میاں کو ہم نے دکان پر بیٹھا لیا۔ اور دوسرے تماشائی چاروں طرف کھڑے ہوگئے۔ دکان کی دھیمی لالٹین کی روشنی میں بڈھے میاں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ انھوں نے کہا۔ اب تو لوگ آرام سے رہتے ہیں مگر جب بیس بیس میل اور پچیس پچیس میل دور دور تک کے رہنے والے اپنے گھروں سے نکلنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ چمپاوت کا شیر بہت لوگوں کو مار چکا تھا۔ تو جم کاربٹ صاحب آئے۔ جس دن وہ آئے اسی رات شیر رات کے وقت ایک دلھن کو کھا چکا تھا۔ کاربٹ صاحب نے شیر کے شکار کی جگہ دیکھی اور کہا کہ شیر نے پیٹ بھر کر کھایا ہے اسی لئے وہ یہیں چار میل کے اندر ہی اندر ہوگا اور سو رہا ہوگا۔ آس پاس کے دیہات والوں کو اکٹھا کرو، وہ ہکوا کریں۔

دیہات والے بہت جوش و خروش سے اکٹھا ہوگئے اور انھوں نے چھ سات میل کے اندر ہکوا کیا۔ شیر نکلا۔ اور ٹھیک اسی جگہ نکلا جہاں کاربٹ صاحب کا خیال تھا۔ کاربٹ صاحب نے تحصیل دار صاحب کی، جو پاس بیٹھے ہوئے تھے بندوق لے کر فیر کیا۔ لیکن وہ خالی گیا۔ اس پر انھوں نے بندوق پھینک دی اور اپنی رائفل سے فیر کیا۔ اتنی دیر میں شیر دور جا چکا تھا لیکن گولی لگ گئی تھی اور وہ کچھ دور جا کر گر گیا۔ اس کے پیٹ سے دلھن کی انگلی اور انگوٹھی نکلی جس سے معلوم ہو گیا کہ وہ یہی مردم خور شیر تھا۔

اس قسم کا دوسرا شکار کاربٹ صاحب نے اس وقت کیا جب وہ بڈھے ہو چکے تھے۔ شیر جب ان کو نہیں ملا اور شام ہونے کو آئی تو انھوں نے شیر کی بولی بولی۔ کاربٹ صاحب شیر کی ہر طرح کی بولی بول سکتے تھے۔ شیرنی کی۔ بچے کی۔ شیر کی۔ بھوکے شیر کی۔ غصے میں بھرے شیر کی۔ اس موقع پر انھوں نے ایسی بولی بولی کہ مردم خور شیرنی بھی دھوکے میں آگئی اور اس نے اپنی بولی میں جواب دیا۔ انھوں نے پھر بولی بولی۔ بولی سن کر وہ آگئی۔ کاربٹ صاحب ایک چکنی چٹان سے لگے کھڑے تھے اور خیال کر رہے تھے کہ شیرنی سامنے سے آئے گی۔ لیکن وہ اوپر نظر آئی کاربٹ صاحب نے گولی تو مار دی، لیکن خود بھی چٹان سے گر پڑے اور ان کے ساتھ ساتھ شیرنی بھی۔ جب ہم لوگ پہونچے تو کاربٹ صاحب کو اٹھایا۔ شیرنی مر چکی تھی۔

کاربٹ صاحب نے کہا کہ ہم بڈھے اور کمزور ہو چکے ہیں۔ اب اگر کوئی شیر لاگو ہو تو ہم کو خبر نہ کرنا۔ انھوں نے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ اس آدم خور شیرنی کے دو بچے ہیں۔ یہ بچے بڑے ہو کر یہاں کے باشندوں کا بہت نقصان کریں گے اس لئے ان کو مارنے کی فکر کرنا۔ بڈھے میاں سوچ کر بولے کاربٹ صاحب مردم خور شیر کے سوا اور کسی جانور کو نہیں مارتا تھا۔

پھر بڈھے میاں نے بتلایا کہ جس ڈاک بنگلے میں آپ لوگ ٹھہرے ہیں اسی جگہ کاربٹ صاحب ٹھہرے تھے

چمپاوت کی وادیوں میں آج پچاس سال کے بعد بھی کاربٹ صاحب کی رزمیہ داستانیں گونج رہی ہیں اور ابھی جانے کتنے زمانے تک گونجتی رہیں گی۔ خدمت خلق کی آواز بھی کیا آواز ہوتی ہے۔

چمپاوت سے پتھورا گڑھ کا راستہ بہت دلکش ہے۔ پہلے بس چمپاوت کی وادی کا چکر کاٹ کر ایک بلند پہاڑ تک جاتی ہے اور اترتی ہوئی لوہاگھاٹ تک آتی ہے۔ اس کے بعد سے اس کا راستہ ایک بہت گہری وادی کے کنارے کنارے جاتا ہے ہوٹر کے ایک طرف ہزار ڈیڑھ ہزار فٹ گہرا کھڈ ہوتا ہے تو دوسری طرف اتنے ہی بلند پہاڑ۔ یہ راستہ بہت شاداب بھی ہے اور پُر ہیبت و پُر وقار بھی۔ اسی راستے سے ہزاروں سال سے یاتری کیلاش کی یاترا کو جاتے رہے ہیں۔

پتھورا گڑھ پہنچ کر پہلا جو احساس ہوتا ہے اس بات کا ہوتا ہے کہ ہمالیہ کتنا بڑا خطہ ہے اور اس میں کیسی کیسی وادیاں ہیں۔ پتھورا گڑھ میں جنگل اور پہاڑ کے حسن کے ساتھ ساتھ انسانی آبادی کا حسن بھی شامل ہو جاتا ہے۔ منظر کی یہ تبدیلی قریب قریب اچانک ہوتی ہے۔

کشمیر کی وادی کی طرح یہ پتھورا گڑھ کی وادی بھی اپنی آغوش میں میدانی اور پہاڑی دونوں حسن سمیٹے ہوئے ہے۔ دور دور تک دھان کے کھیت ہیں۔ کھیتوں کے بیچ بیچ میں ندیاں نالے، کھڈ اور گہری وادیاں اور بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ ان وادیوں اور پہاڑوں پر آبادیاں ہیں جن کے مکانوں کی روشنیاں راتوں کو دلکش بنا دیتی ہیں۔

یہاں ناگا بابا کا ہوٹل ہے۔ لیکن یہ ہوٹل ہوٹل نہیں، ایک طرح کا دھرم شالا ہے جو ان لوگوں کے قیام کے لئے بنایا گیا ہے جو کیلاش کی

یاترا کو جاتے ہیں۔ ناگا بابا نے جو ایک سادھو ہیں پتھورا گڑھ سے کیلاش تک ہر منزل پر یاتریوں کے لئے قیام گاہیں بنا دی ہیں۔ یہ بابا جی بھی نرالے قسم کے سادھو ہیں۔ وہ دوسروں کی خیرات پر بسر نہیں کرتے ہیں، خود کاروبار کرتے ہیں اور اسی آمدنی کو خدمت خلق اور مذہبی کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ ابھی چند سال ہوئے انھوں نے اپنی بوڑھی ماں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر بدری ناتھ، کیدار ناتھ اور کیلاش کی یاترا کرائی تھی۔ یہ سفر اتنا سخت ہے کہ اپنا بدن لے جانا مشکل ہے نہ کہ اپنی پیٹھ پر ایک زندہ جان کو لے جانا۔

ہم لوگ ایک رات بابا جی کے ہوٹل میں ٹھہرے اور ان کے متعلق باتیں سنیں۔ وہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں لیکن ناگاؤں میں رہنے کی وجہ سے ناگا بابا کہلانے لگے ہیں۔ ان کے ہوٹل کے لوگوں نے ہم کو خلوص سے خوش آمدید کہا اور ہم کو آرام پہونچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ چھوت چھات یا مذہبی تفریق کا وہاں پتہ نہ تھا۔

ایک رات ناگا ہوٹل میں قیام کر کے ہم لوگ ڈاک بنگلہ سنولی آگئے۔ یہ بہت پر فضا مقام پر واقع ہے۔ اور یہاں بیٹھ کر چائے پینا یا کھانا کھانا پکنک کا لطف دیتا ہے۔

پتھورا گڑھ کی ایک چیز اور قابل تذکرہ ہے۔ وہ ہے چنڈاک جو ایک بلند پہاڑ پر واقع ہے۔ پتھورا گڑھ کی بلندی ۵۵۰۰ فٹ ہوگی۔ یہ وہاں سے ایک ہزار یا ڈیڑھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور یہاں سے جب فضا صاف ہوتی ہے ہمالیہ کی چوٹیوں کا چھ سات سو میل تک نظارہ ہوتا ہے۔ اس جگہ دو چیزیں اور بھی قابل تذکرہ ہیں۔ ایک کوڑھی ہسپتال جس کو ایک مشن چلاتا ہے اور دوسرا عورتوں اور بچوں کا اسپتال جسے ایک لیڈی ڈاکٹر مسز بیکر چلاتی ہیں۔ کوڑھیوں کے اسپتال تو ہم نہ جاسکے لیکن مسز بیکر کے اسپتال گئے۔ وہاں جانے کا خاص سبب یہ ہوا

کوسانی سے ہمالیہ کا نظارہ

کہ تفریح کی غرض سے ہم چنڈاک جا رہے تھے راستے میں ایک پہاڑی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتلایا کہ زنانہ اسپتال میں اس کی بیوی کا آپریشن ہوا ہے۔ اس نے اسپتال کی بہت تعریف کی اور کہا کہ وہاں برائے نام فیس پر بڑے سے بڑا علاج کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس اسپتال کو تیس چالیس میل کے حصے کے اندر نعمت بتلایا ہے۔

مسز بیکر کرالا کی رہنے والی ہیں جو یہاں، دور دراز مقام پر آکر بس گئی ہیں اور تنہا ایک اسپتال کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہی ڈاکٹر ہیں اور وہی نرس اور کمپاؤنڈر۔ اسٹاف اس لئے نہیں بڑھایا کہ خرچ بڑھے گا۔ اپنے طریقۂ علاج میں وہ مقامی راز و سامان سے بہت مدد لیتی ہیں۔ مسٹر بیکر انگریز ہیں، جن کے رگ و ریشے میں سوائے زبان کے ہر ہندوستانی چیز سرائیت کر چکی ہے۔ وہ بہت اچھے ماہر تعمیر ہیں۔ لیکن انھوں نے چنڈاک کی فضا اور اپنی بیوی کے اسپتال کے لئے اپنے کاروبار اور گاہکوں کے بیچ میں عظیم الشان پہاڑ شامل کر رکھے ہیں لیکن قدردان اب بھی وہاں پہونچ جاتے ہیں۔
مسٹر بیکر اور مسز بیکر نے ایک پرانے پہاڑ کو رفتہ رفتہ بہت بارونق بنا دیا ہے۔

چمپاوت کی طرح پتھورا گڑھ بھی کم خرچ کی جگہ ہے۔ لیکن اسکی طرح یہاں سیاحوں کے لئے کوئی سہولت نہیں۔ نہ اچھے ہوٹل ہی اور نہ اچھے کرائے کے مکان۔ اس مقام سے بھی وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو قیام کی دشواریوں کا سامنا کر سکتے ہوں اور اس کے باوجود مناظر سے لطف اٹھا سکتے ہوں۔ اور جو پہاڑوں پر اپنے قیام کے گھنٹوں کو قیام گاہ کے بجائے زیادہ تو پہاڑوں کی چوٹیوں اور وادیوں کی گہرائیوں میں صرف کرنے کے عادی ہوں۔

بارش قبل از وقت شروع ہو گئی اور ہمیں اپنا آگے کا سفر ملتوی کر دینا پڑا۔ پتھوڑا گڑھ کے ڈاک بنگلے سے ہم کربیانگ والی سڑک کو بڑی آرزو سے دیکھا کرتے تھے۔ کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم دنیا کے خوبصورت ترین پہاڑ کیلاش کو دیکھیں جو ایک ترشے ہوئے نگینے کی طرح کرۂ ارض پر جڑا ہوا ہے۔ اور مانسرور جھیل جس نے ہندوستانی ادب پر بھی بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس قدرتی حسن کی حفاظت اونچے اونچے پہاڑ کرتے ہیں۔ ان کو پار کر کے جانا بڑا مشکل ہے۔ مگر اب سڑک بن رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ سفر جس قدر مشکل تھا۔ اب اتنا مشکل نہ رہے گا۔

☆

ہندوستانی موسیقی —

بسلسلہ صفحہ ۷

لیکن کتاب کا آغاز اس دوہرہ سے کیا گیا ہے :-

نورس ہو رچگ جگ جوتی آنز سرو گنی۔
یوست سرستی ماتا ابراہیم پرساد بھئی دونی

(اے میری ماں سرستی، ابراہیم پر آپ کا بڑا فضل ہوا کہ نورس کے سر بہت دنوں تک رائج رہیں گے (اور دنیا کے عقلمندوں کے لئے روشنی بہم پہنچائیں گے) سرستی اور گنیش پر بھی بہت سے گیت ہیں جو "نورس" مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد (شائع کردہ دانش محل لکھنؤ) میں ملیں گے۔

انیسویں صدی میں اودھ کا دربار بھی موسیقی کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ہندوستان کے بڑے بڑے ماہرین اودھ میں جمع ہو گئے تھے۔ اسی زمانہ میں موسیقی پر ایک کتاب "اصول النغمات الآصفیہ" لکھی گئی۔ جب واجد علی شاہ کا دور آیا تو لکھنؤ کے در و دیوار سے نغمے سنائی دینے لگے۔ خود واجد علی شاہ نے موسیقی پر دو کتابیں صوت المبارک اور بنی لکھیں اور نئی راگنیاں مرتب کیں جن کے نام جوگی کنٹر، جوہی اور شاہ پسند وغیرہ رکھے۔ اس دور میں ٹھمری اور ٹپہ کی بڑی مقبولیت ہوئی۔ اودھ کے دربار میں موسیقی کو جو فروغ ہوا، وہ ایک مفصل مضمون کا محتاج ہے، جو کبھی اور موقع پر پیش کیا جائے گا۔ سلطنت اودھ کے انتزاع پر دربار رام پور وغیرہ نے بھی موسیقی کی بڑی سرپرستی کی اور شمالی ہند میں بڑے مشہور موسیقار پیدا ہوئے لیکن اس مضمون سے اس کا تعلق نہیں۔

منشی بال مکند رائے بے صبر

ہری کرشن داآز

منشی بال مکند نام تخلص بے صبر بمقام سکندر آباد ضلع بلند شہر (یو۔پی) سنہ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے ایک متمول بھٹنا گر کائستہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے بزرگ دگال کے رہنے والے تھے جو پنجاب میں واقع ہے۔ اسی رعایت سے آپ کی خاندانی الّ دگالیہ ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ بے صبر کے بزرگ اپنے وطن دگال کو کس سلسلہ میں خیرباد کہہ کر سکندر آباد میں آکر مقیم ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام رائے کانہہ سنگھ تھا۔ صحیح یوم و تاریخ پیدائش کا پتہ نہ چل سکا۔ جناب بے صبر نے اپنی تصنیف "بدیع البدائع" میں اپنا سنِ پیدائش ذیل کے چار مصرعوں میں تحریر فرمایا ہے؎

مرا سال ولادت ہندوی میں جو کوئی صورت معنی میں پاوے
تو کردے قافیئے کو دور تا ہوں ہزار و ہشت صد شصت و نہ آوے

(سمت ۱۸۶۹ بکرمی)

روز پیدائش سے سن شعور تک بے صبر سکندر آباد میں رہے۔ خداداد فہم و فراست و قابلیت و ذہانت کی وجہ سے آپ نے پندرہ سال کی عمر میں عربی۔ فارسی۔ نجوم منطق اور علم تصوف میں کمال حاصل کیا۔ فارسی کے مشہور شاعر اور مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے مشہور شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ آپ کے ماموں تھے۔ بے صبر نے حضرت تفتہ سے علم عروض پڑھا اور شروع شروع انھیں سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ تفتہ کے فیض صحبت اور اصلاح سے بے صبر نے شاعری میں دن دونی رات چوگنی ترقی کی اور بالآخر ان کے ہی ایما سے بے صبر نے مرزا غالب کی شاگردی اختیار کی جس سے بے صبر کے کلام کی وقعت اور بڑھ گئی۔ مرزا غالب اور بے صبر کے باہمی تعلقات کا اندازہ اردوئے معلیٰ کے خطوط ذیل سے ہو سکتا ہے:۔

خط بنام مرزا تفتہ اردوئے معلیٰ ص۱۰۱۔ "ہاں صاحب! منشی بال مکند بے صبر کے ایک خط کا جواب ہم پر فرض ہے۔ میں کیا کروں۔ اسی خط میں انھوں نے اپنا سیر و سفر میں مصروف ہونا لکھا تھا۔ پس میں ان کے خط کا جواب کہاں بھیجتا۔ اگر تم سے ملیں تو میرا سلام کہہ دینا۔"
(خط بنام مرزا تفتہ۔ اردوئے معلیٰ ص۱۰۱)

"لالہ گنگا پرشاد۔ شاد تخلص۔ اپنے کو تمہارا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر ریختہ کہتے ہیں۔ کئی دن ہوئے کہ یہاں آئے اور بال مکند بے صبر کی غزلیں لائے۔ بعد اصلاح ان کے حوالے کیں۔" (اردوئے معلیٰ۔ ص۹۲)

"دو مسودے تمہارے اور ایک مسودہ بے صبر کا تین کاغذ در پیش ہیں۔ بعد اصلاح بھیجوں گا۔" (اردوئے معلیٰ ص۵)

"منشی بال مکند بے صبر کا خط بلند شہر سے دلّی اور دلّی سے رام پور پہنچا۔ تلف نہیں ہوا۔ اگر میں یہاں رہ گیا تو یہاں سے اور اگر دلّی چلا گیا تو وہاں سے اصلاح دے کر اُن کے اشعار بھیجوں گا۔ بے صبر کو اب کی بار مہینہ بھر صبر چاہیئے۔ وہ لفافہ رکھا ہے۔ تم اسی رقعہ کو ان کے پاس بھیج دو۔" (اردوئے معلیٰ۔ ص۳)

منشی دیبی پرشاد بشاش مصنف تذکرہ آثار الشعرائے ہنود مطبوعہ ۱۸۸۵ء کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "ہندوؤں میں بہت سے ایسے

شعراء ہیں کہ جن کے کلام کو ہندو و مسلمان دونوں پسند کرتے ہیں۔ بھلا ایسا کون ہے جو بے صبر، جوہر، فرحت وغیرہ کے اشعار کی داد نہ دے۔"

بے صبر، ذوق، غالب، مومن وغیرہ کے ہمعصر و ہم مشاعرہ شاعر تھے۔ آپ کے دیوان اردو میں آتش، سودا، میر، درد، مصحفی، خواجہ وزیر وغیرہ کی غزلوں پر غزلیں اور فارسی میں نفقہ، حافظ، امیر خسرو کی غزلوں پر غزلیں اور مخمس و مسدس ہیں۔ تاریخ گوئی میں بے صبر کو کمال حاصل تھا۔ ولادت، شادی، وفات، تعمیر مکان وغیرہ کے موقعوں پر آپ نے تاریخیں کہی ہیں۔ مثنویاں بھی لکھی ہیں اور فن شاعری کی ہر صنف میں داد سخن دی ہے۔ فتح افغانستان اور دیگر موقعوں پر قصائد تصنیف فرما کر وائسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کئے تھے۔

سترہ سال کی عمر میں بے صبر سرکاری ملازمت میں محکمہ پرمٹ میں داخل ہوئے لیکن کچھ عرصہ بعد دل برداشتہ ہو کر مستعفی ہو گئے۔ پھر کلکٹری سہارنپور میں ملازم ہو گئے اور ۱۸۶۴ء میں پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے۔ ۱۸۶۱ء میں آپ کے فرزند منشی ہر سروپ کی وفات نے آپ کو نیم مردہ کر دیا مگر کاتب تقدیر کو اس پر بھی صبر نہ آیا اور ۱۸۷۳ء میں بے صبر کے سب سے چھوٹے بیٹے منشی بینی سروپ کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحہ عظیم نے آپ کو حواس باختہ کر دیا۔ منشی ہر سروپ کی تاریخ وفات بے صبر نے قطعہ ذیل سے نکالی ہے ؎

رخصت ہوا جہان سے جب ہائے ہر سروپ ماتم میں اُس کے سب کو ہوا رنج اور تعب
بے صبر مجھ کو فکر تھی سال وفات کی عیسیٰ نے دی ندا کہ ہوا ہائے کیا غضب
(۱۸۶۱ء)

منشی بینی سروپ کی تاریخ وفات کا یہ قطعہ لکھا ؎

مہر غروب اپنا ہوا صبح دم روز مرا ہو گیا شب کیا ہوا
سال وفات اُس کا جو بے صبر تو پوچھے ہے سمت میں۔ کہہ کب کیا ہوا
عالم فانی سے ہو بیدل وہ ماہ چھپ گیا ہے ہے یہ غضب کیا ہوا
(سمت ۱۹۳۰ ہجری)

از سر افسوس سن عیسوی ہے یہی۔ یہ شور و شغب کیا ہوا
(۱۸۷۳ء عیسوی)

سال وفات اُسکا جو ہجری میں ہے رہ گیا غم حیف سبب کیا ہوا
(۱۲۹۰ھ ہجری)

یہ سخت و جانکاہ صدمے اٹھانے کے بعد جناب بے صبر نے بھی پچھتر سال کی عمر میں ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء کو بروز شیو راتری اس دار ناپائیدار سے کوچ کیا۔ آخری عمر میں آپ شیو جی کی عبادت میں ہر وقت مصروف رہا کرتے تھے اور شیو منتر کا ہر وقت جاپ کیا کرتے تھے۔ شیو مت کے عقائد کے بموجب شیو راتری کے دن بے صبر کا انتقال فرمانا نہایت سعد تھا۔

بے صبر کے شاگردوں میں سے صرف تین کے نام معلوم ہو سکے۔

(۱) منشی بنواری لال بھٹناگر شعلہ حصاری۔
(۲) منشی شنکر لال بھٹناگر ساقی سہارنپوری۔
(۳) حضرت عباس سہارنپوری۔

حضرت بے صبر کے پس ماندگان میں دو صاحبزادے منشی کرشن سروپ متیر، بابو برہما سروپ اور رہبیر اور بابو رامچندر سروپ خلف منشی کرشن سروپ متیر تھے۔ مگر عرصہ ہوا کہ یہ تینوں صاحبان بھی قید حیات سے آزاد ہو چکے ہیں۔ آپ کے ورثاء میں سے اب بابو گردھر سروپ اور بابو جیوتی سروپ باقی ہیں۔ مضمون زیر قلم کا زیادہ تر مواد بابو گردھر سروپ سے حاصل ہوا۔ انھوں نے راقم الحروف کو اخبار بھٹناگر سماچار اور بے صبر کی غزلوں اور قصیدوں کے مسودوں کے علاوہ ان کی تصنیف ادیب لبنات کا قلمی نسخہ عنایت فرمایا۔ اسی سلسلہ میں ان کے بہت سے خاندانی حالات بھی بتائے۔ سکندر آباد ضلع بلند شہر میں بابو من موہن دیال دگالہ۔ بابو جگن دیال دگالہ۔ منشی نراین سروپ، منشی کلیان سروپ، منشی آتما سروپ۔ بابو بھگوان سروپ اور دھول پور میں بابو کرشن سروپ جناب بے صبر کی یادگار ہیں۔

حضرت بے صبر کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) دیوان عام اردو (غیر مطبوعہ) جس میں غزلیں، رباعیاں، قطعے، ترجیع وغیرہ ہیں۔

(۲) دیوان خاص اردو (غیر مطبوعہ) یہ صرف غزلیات کا مجموعہ ہے۔

(۳) دیوان فارسی (غیر مطبوعہ) منشی دیبی پرشاد بشاش نے اپنی تصنیف تذکرہ آثار الشعرائے ہنود میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۴) دیوان قصائد اردو (غیر مطبوعہ) اس میں چونتیس قصیدے ہیں۔ ترکیب بند ترجیع بند درج ہیں۔ اس کے اکثر صفحات ضائع ہو گئے ہیں۔ قصائد نمبر ۲۹، ۳۱، ۴۰ اور ۵۳ وائسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کئے گئے تھے دیگر

قصائد میں قصیدہ نمبر ۴ سدسہ توحید میں، نمبر ۵ تو بہار ہندوستان کی تعریف میں، نمبر ۹ قدامت مدح کے بارے میں، نمبر ۱۱ معطّل (جو بے نقط ہی) نمبر ۱۴ پرکالۂ آتش حضرت غالب کی مدح میں، نمبر ۱۸ جناب تفتہ کی تعریف میں، نمبر ۱۹ آرام جاں مہاراجہ بنارس کی تعریف میں، نمبر ۲۱ دلپذیر مہاراجہ کشمیر کی مدح میں، نمبر ۲۴ حالات ہجوم ہردوار، نمبر ۲۷ بہار کی تعریف میں، نمبر ۳۰ نورٌ علیٰ نور ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند کی مدح میں، نمبر ۳۳ تیغ برہنہ مبارکباد بر فتح افغانستان، نمبر ۴۴ مبارکباد حضور لارڈ رپن وائسرائے ہند بہ موقع دربار منعقدہ ۱۵ ر نومبر ۱۸۸۰ء اور نمبر ۵۳ دربارۂ تہنیت بر فتح مصر و مدح ملکہ وکٹوریہ ہے۔ قصائد مذکورہ بالا سے جناب بے صبر کی قادر الکلامی اور علمی تبحر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ (۵) مثنوی لخت جگر اردو (مطبوعہ ۱۸۶۱ء) اب یہ نایاب ہے۔

(۶) مثنوی اخگر عشق، اردو (مطبوعہ) اب یہ نایاب ہے۔

(۷) سراپا سخن، اردو (مطبوعہ فروری ۱۸۶۹ء) اس میں مصنف نے اپنے دو فرزندوں منشی ہر سروپ اور منشی بنی سروپ کا سراپا اور نوحہ لکھا ہے۔

(۸) رسالہ ادیب البنات، اردو نثر (غیر مطبوعہ) اس کے دیباچے میں بے صبر تحریر فرماتے ہیں :۔

"میں نے ساری عمر اپنی شعر و شاعری میں گزرانی اور خاک اس گلی کی خوب چھانی۔ تین دیوان اور تین مثنویاں اردو فارسی میں کہیں کہ وہ مجھ سے یادگار رہیں۔ لیکن کوئی ایسی کتاب جو واسطے تعلیم طلباء مدارس دیسی اور سرکاری کے مفید ہو بہ سبب کم فرصتی کام عہدہ نائب منشی یعنی نائب سرشتہ داری ثانی محکمہ کلکٹری ضلع بلند شہر و سہارنپور تصنیف نہ کر سکا ...... نام اس کا ادیب البنات رکھا ہے۔ اردو کے سیدھے سادے سلیس اور صاف محاورے میں بنائی۔ سال ۱۸۷۰ء میں مراد بر آئی۔ (یہ کتاب بتاریخ ۲۰ ر اگست ۱۸۷۰ء بحضور جناب سکریٹری صاحب گورنمنٹ بغرض منظوری روانہ ہوئی)

(۹) گلستان ہند، نثر اردو (غیر مطبوعہ) گلستان شیخ سعدی شیرازی کے ڈھنگ پر لکھی گئی ہے۔ عبارت سلیس اور بامحاورہ ہے۔ یہ پانچ بابوں میں منقسم ہے اور ان ابواب کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پہلا باب۔ بادشاہوں اور امیروں کے ذکر میں ۔۔۔ ۲۴ بیان۔
دوسرا باب۔ فقیروں کے بیان میں ۔۔۔۔۔ ۱۷ بیان
تیسرا باب حکیموں اور طبیبوں کے حال میں ۔۔۔۔ ۱۹ بیان
چوتھا باب۔ شاعروں کے احوال میں ۔۔۔۔۔ ۸ بیان
پانچواں باب۔ نکات، لطائف، پند و نصائح وغیرہ میں۔ ۴۵ بیان

بطور نمونہ چوتھے باب کی حکایت نمبر ۹ ذیل میں درج ہے :۔

"کہتے ہیں کہ عبدالرحیم خانخاناں کی مجلس میں کسی شاعر نے شعر پڑھا نواب کو پسند آیا۔ فرمایا ہیچو تو مول لیتے اور شصت دینار قیمت دیتے۔ شاعر نے کہا کہ شصت کم است۔ کم کے عدد بھی ساٹھ ہوتے ہیں گویا دو شصت ہو گئے۔ نواب اس لطیفہ حسن الطلب سے خوش ہوا اور ایکسو بیس دینار دے کر خرید لیا اور خلعت اضافہ کیا۔ شعر

جو قدرداں ہیں وہ کرتے ہیں قدر شاعر و شعر ستم ہو گر کوئی دنیا میں قدرداں نہ رہے

اس کتاب کا سن تصنیف ۱۸۶۱ء ہے۔

(۱۰) رسالہ بدیع البدائع، اردو (مطبوعہ) یہ کتاب فن شاعری پر ہے۔ علم عروض و صنائع بدائع کے شائقین کے لئے نہایت مفید چیز ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۰ء میں مطبع دبیر بلند شہر میں طبع ہوئی۔ اب اس کی صرف ایک جلد بے صبر کے وارث بابو گردھر سروپ صاحب کے پاس ہے اور بازار میں نہیں ملتی۔

ایسا کم ہوتا ہے کہ ایک شخص اچھا شاعر اور اچھا نثر نگار دونوں ہو۔ جناب بے صبر اپنے زمانے کے معیار کے مطابق اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے اور نثار بھی۔ اُن کی تصنیف رسالہ ادیب البنات جو اخلاقی تعلیم سے پُر ہے اُن کی اعلیٰ درجے کی نثر نویسی اور دلکش اندازِ تحریر کی شاہد ہے۔ اس رسالہ میں اول آپ ایک اخلاقی اصول کی تشریح کرتے ہیں اور بعد ازاں کسی قصے کی مدد سے اس اخلاقی اصول کو لوح دل پر نقش فرماتے ہیں۔ ذیل میں رسالہ ادیب البنات سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

رحم کی تعریف

"اصل کائنات کی خدا ہے اور خدا رسیدہ ہونا اپنی اصل کو پہنچنا ہے۔ خدا کی صفات میں سے ایک صفت رحم ہے اس کو وہی جانتا ہے جس کو فہم ہے۔ خدا کا رحم عام ہے۔ راحم، رحیم، رحمان اُسی کے نام ہیں۔ آدمی کا کمال یہی ہے کہ خدا اُس کو ملے۔ جب تک صفات الٰہی سے

تھوڑی بہت صفتیں بہم نہ پہنچاوے خدا کو نہ پاوے۔ پس لازم آیا کہ صفات حیوانی کو چھوڑ کر پہلے صفت انسانی کی طرف مائل ہوتا کہ صفت ربانی حاصل ہو۔ اس مقام سے رحم کے مرتبے کو خیال کرو اور رحم کرو تاکہ کمال حاصل ہو۔ بے رحمی کی سزا خدا دیتا ہے۔ کمزور کا بدلہ زور آور سے لیتا ہے۔ اس کا نمونہ بنئے اور نائی کے لڑکوں کی کہانی ہے۔

بنئے اور نائی کے لڑکوں کی کہانی

ایک بنئے اور نائی کے دو لڑکے پانچ پانچ چھ چھ برس کے جو سرراہ کھیلتے تھے، لڑ پڑے۔ بچے ہی تو تھے نہ جانے کس بات پر جھگڑ پڑے۔ لڑائی میں اوپر تلے ہونے لگے۔ دونوں رونے لگے۔ بنیا آیا، اپنے بچے کو گلے لگایا، پچکارا، پیار کیا، گھر کو بھیج دیا۔ پھر نائی کے لڑکے کو مارا اور یہ بھی کہا کہ کیوں بے کمینے کے۔ تو ہمارے ہی گھر سے کھاوے اور ہمارے ہی بچے پر ہاتھ اٹھاوے۔ اتنے ہی میں نائی بھی آیا اور اس نے شور مچایا۔ بنئے نے سوچا اب ایسا نہ ہو زیادہ فساد ہو، داد بیداد ہو۔ دوڑ کر گھر کو چلا۔ نائی اس کے پیچھے لگا۔ بنئے نے جانا کہ میں بے ڈھب گھرا۔ گھبراہٹ میں چوکھٹ پر ایسا گرا کہ کواڑ کی کیل اس کے گال میں گڑ گئی اور ایک ڈاڑھ صاف اکھڑ گئی۔ زخم کاری اور خون جاری ہو گیا۔ نائی نے کہا کہ تم کو میرے بچے پر رحم نہ آیا۔ پر میں نے اپنا انصاف خدا سے بھر پایا۔

جناب بے صبر کی نثر کے کچھ نمونے پیش کرنے کے بعد بطور مشتے نمونہ از خروارے کچھ اقتباسات، قصائد، غزلیات اور سلاموں کے پیش کئے جاتے ہیں۔ قصائد کے نمونے ملاحظہ ہوں جن سے جدت طرازی اور تخیل کی بلند پروازی عیاں ہے۔ قصیدہ نوبہار میں جو ہندوستان کی تعریف میں ہے فرماتے ہیں ؎

خطۂ دلنشیں ہے ہندوستاں   خالِ روئے زمیں ہے ہندوستاں
یہاں کے عارف جہاں میں ہیں معروف   مجمع العارفیں ہے ہندوستاں
قتلِ نفس کمینہ خو کے لئے   خوب جائے کمیں ہے ہندوستاں
پہلوان و حکیم و عارف سے   کبھی خالی نہیں ہے ہندوستاں
ہر زباں میں ملے ہیں یہاں کے لغت   مخرجِ رسم و دیں ہے ہندوستاں
کہتے ہیں کل زمیں کے سیاح   کہ عجب گل زمیں ہے ہندوستاں
ہے صباحت بہم ملاحت سے   نمکیں شکریں ہے ہندوستاں
ہے تواریخ ہند سے ظاہر   کہ بہت اولیں ہے ہندوستاں
یہیں پر جا تھا جتو ہر دو جہاں   دو جہاں آفریں ہے ہندوستاں
یہیں آدم کا بھی نزول ہوا   متبرک زمیں ہے ہندوستاں
باز گردد بہ اصل خود ہر چیز   مرجع عالمیں ہے ہندوستاں
گئے عالم میں یہاں سے فن و علم   جہاں دیکھو وہیں ہے ہندوستاں
مہروش زن مسیح دم ہیں مرد   فلک چارمیں ہے ہندوستاں
ہے جہاں خاتم سلیمانی   اور اس کا نگیں ہے ہندوستاں
لے جاؤں کہاں تلک بے صبر   کہ خیاں یا چنیں ہے ہندوستاں
حق اسے سنگِ تفرقہ سے بچائے   کہ سبک آبگیں ہے ہندوستاں

دوسرے، پانچویں اور تیرھویں شعر میں "یہاں" کو "یہاں" یا "یاں" پڑھا جائے۔ بے صبر کے زمانہ میں یہ لفظ اسی طرح مستعمل تھا۔ یہ قصیدہ، بے صبر کی قادر الکلامی کے علاوہ اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور ہندوستان کے متعلق ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ آخری شعر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ اتحاد کو کتنا ضروری سمجھتے تھے۔

بے صبر کا گیارھواں قصیدہ معطل بے نقط ہے۔ اس کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

مالکِ ملک کرم۔ سالکِ راہِ ولا   محرمِ اسرارِ کل۔ سرورِ اہلِ عطا
حاکمِ احکامِ عدل۔ دادِ دہِ رسم داد   عالمِ علمِ اصول۔ مالکِ حرص و ہوا
مصدرِ اطوارِ شور۔ موردِ الہام طور   رہبرِ راہِ رسول۔ ماہرِ سر سما
عاملِ کارِ محال۔ مردِ دلاورِ کمال   آگہ احوالِ دہر۔ ہر سحر و ہر مسا

اب قصیدہ در بیان توحید کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بے صبر جہاں پر وہ ہوا اس جانِ جہاں کا   ہر شے میں جو پنہاں ہو بیاں کیا ہو عیاں کا
ہر دل ہے زندستر نہفتہ کا خزینہ   ہر سینہ ہے گنجینہ دُرِ رازِ نہاں کا
سب اس میں ہیں اور سب میں ہے پیرو و دروں وہ   حاوی ہے زمین و فلک و عرش و زماں کا
ہر ساز میں آواز ہے اسرار کا پردہ   ہر پردے میں ہے زمزمہ رازِ سخنداں کا
ہاں ناطقہ بھی مار نہیں سکتا ہے دم واں   نہ بہار جہاں دخل نہیں کا ہے نہ ہاں کا
تو کا ہے نہ من کا نہ چناں کا نہ چنیں کا   نے این کا نہ آں کا نہ ہمیں کا نہ ہماں کا

قصیدہ نمبر ۲ عید کی تہنیت میں ہے شکوہ الفاظ اور تشبیہات ملاحظہ کیجئے۔

[illegible] بعد [illegible] منہ ہے ۔ آئینے میں ہے عکس ابروئے زال
[illegible] آبحیات ۔ ظلمات میں ہے بطرف جبال
[illegible] سپہر اخضر کے ۔ یا کہ جام زمردیں میں بال
بستہ کاروں کی کھولنے کو گرہ ۔ ناخن دست غیب کیجئے خیال
ساتھ مینا مے چرخ کے ہے جام ۔ یا لب ساقی پر ہی تمثال
یا کسوٹی پہ زر کا ہے یہ خط ۔ امتحاناً جو کھینچے ہے دلال

آخر میں بےصبر کی غزلوں سے کچھ متفرق اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار کا رنگ بالعموم وہی ہے جو اس زمانہ میں عام غزل گو شعرا کا ہوا کرتا تھا۔ لیکن ایسے اشعار بھی کافی ملتے ہیں جن میں تصوف بھی پایا جاتا ہے اور فلسفہ بھی۔

شاق ہو قطرے کو دریا سے جدا ہو جانا ۔ کہ یگانے سے ہو بیگانہ نما ہو جانا
چاہیئے فانی کو باقی میں فنا ہو جانا ۔ کہ فنا ہونا ہو وہ عین بقا ہو جانا
ساقیا ساغر شراب پلا ۔ مجھ کو آتش بجائے آب پلا
خون بلبل نہیں ہے مجھ کو حلال ۔ نہ مجھے چارہ گر گلاب پلا
کہا یہ دیکھ کے صوفی نے سوئے زاہد خشک ۔ یہ کس نے خار طریق خدا میں ڈال دیا
بنایا یوسف جاں کو عزیز مصر بدن ۔ بقا کے نقد کو جیب فنا میں ڈال دیا
کہاں تلک تجھے روؤں میں دیدۂ خونبار ۔ بدن کا میرے لہو تو نے سب نکال دیا
جب نقاب اس نے اٹھایا ہو گئی حیرت حجاب ۔ ایک پردہ گر اٹھا تو ایک پردہ پڑ گیا
آنکھ بھی روتے روتے کھو بیٹھا ۔ جان کو میں بڑوں کی رو بیٹھا
پاؤں پھیلایا نہ پاؤں اب تو میں ۔ تخم غم کشت دل میں بو بیٹھا
ملتا تو میں نہ تجھ سے دل آزار سے بھلے ۔ مجبور مجھ کو لذت آزار نے کیا
جہاں کوئی نہیں ہو میں وہاں ہوں ۔ جدا عالم سے اک عالم ہے میرا
میں ہوں اک جزو نفس و عقل کل کا ۔ وہی حوا وہی آدم ہے میرا
برسائے گر ذرا مری چشم تر آب آب ۔ بہہ جائے انفعال سے ہو کر سحاب آب
چشم عیاں کو پردۂ غفلت نہیں ہوتے ۔ مچھلی کی آنکھ کو نہیں ہوتا حجاب آب

حافظ کے رنگ میں بےصبر کی غزل دیکھئے۔

بیاد خسرو و جمشید کھینچ جام شراب ۔ کہ فتح مملکت عیش ہے بنام شراب
سعادت ازلی ان کو ہے جو کرتے ہیں ۔ شراب خانے کا اعزاز و احترام شراب
بنا کے سر کو قدم رکھنا ہو تو اس میں قدم ۔ ادب سے رکھ کہ خرابات ہے مقام شراب
خوشا وہ صبح کہ ہم اور حافظ اے بےصبر ۔ بصوت قمری و بلبل کشیم جام شراب

ذیل میں حضرت بےصبر کے کچھ ایسے اشعار دیے جاتے ہیں جن میں رعایت لفظی اور مبالغے کی رنگ آمیزی ہے مگر پھر بھی شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی کا نمونہ ملتا ہے۔

صبا نے کیا یہ خطا کی کہ زلف اسکی ہلا ۔ ختن میں زلزلہ۔ لرزہ خطا میں ڈالدیا
ابر تر کے اتر گیا سر سے ۔ دجلۂ اشک بے شمار چڑھا
آسماں نیلا ہو گیا ہے آسے ۔ کس کی زلفوں کا زہر مار چڑھا
زلف پڑتے ہی نظر رنگ اپنا کالا پڑ گیا ۔ کس بلا سے یا الٰہی مجھ کو پالا پڑ گیا
عالم تمام ہو گیا عالم بہ فیض شاہ ۔ مفتوح تھا جو حرف وہ مکسور ہو گیا

بےصبر نے غزلیں ہی نہیں کہی ہیں بلکہ سلام بھی لکھے ہیں۔ ایک سلام بطور نمونہ ذیل میں درج ہے۔

آہ مجرائی جو ہے تیر فگن آج کی رات
سینۂ چرخ بریں جائیگا چھن آج کی رات
کر چکے عزم سفر شاہ زمن آج کی رات
نہ دکھائے گی انھیں صبح وطن آج کی رات
دسویں شب کو حرم شاہ میں تھا شور کہ آہ
لٹ گیا فاطمۂ زہرا کا چمن آج کی رات
کہا بانو نے کلیجہ سے لگا اصغرؑ کو
تجھ پہ بھاری ہے مرے تشنہ دہن آج کی رات
نعش سرورؑ پہ ردا ڈال کے زینبؑ نے کہا
ہے مہ چرخ نبوت پہ گہن آج کی رات
پہنا قاسمؑ نے شہانہ تو کہا دلہن نے
یہی اس دولہا کا ہوویگا کفن آج کی رات
شب تاریخ نہم کہتے تھے زینبؑ سے حسینؑ
اور مہماں ہیں ترے ہم تو بہن آج کی رات

کمایوں کے چند مشہور مندر

اتر پردیش میں کمایوں کا علاقہ اپنے حسین مناظر، پُرشکوہ پہاڑیوں، خوبصورت وادیوں ہی کے لئے مشہور نہیں ہے بلکہ اپنے مندروں کے لئے بھی مشہور ہے۔ ان میں سے بعض مندر تو بہت ہی قدیم ہیں اور عہد عتیق سے وابستہ ہیں۔ بعض مندر فن تعمیر کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان صفحات پر کمایوں کے بعض مندروں کی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔

نندا دیوی کا مندر جو الموڑہ کے مندروں میں سب سے اہم مندر تصور کیا جاتا ہے

دوارہاٹ کا دھوج، مندر۔ دوارہاٹ قصبہ کے چاروں طرف مندروں کا جو سلسلہ ہے ان میں یہ سب سے بڑا اور مشہور مندر ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ مندروں کا یہ سلسلہ ایک اور "دوارکا" تعمیر کرنے کی کوشش کی کڑی ہے۔

بگیشور میں باگ ناتھ کا مندر۔ یہ مندر راجہ لکشمی چند نے ۱۳۵۰ء قبل مسیح میں تعمیر کرایا تھا

کٹارمل کا سورج مندر جو دریائے کوسی کے کنارے بنا ہو
نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ یہ دروازے اب قومی
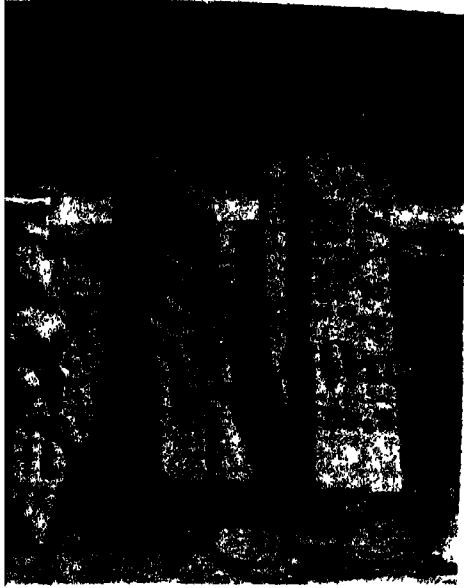
دوارہاٹ میں شری مرتیجئے کا مندر

گور اُڈیار یا گوبر غار۔ یہ خوبصورت غار گجی شیورجی سے وابستہ ہے اسی لئے اسے گوریا شیو غار بھی کہتے ہیں

ہے۔ مندر کے دروازے لکڑی کے تھے جن پر خوبصورت
...ب خانے دہلی میں محفوظ ہیں۔

جگیشور مہادیو کے مندر الموڑہ سے ۲۵ میل
دور الموڑہ۔ پتھورا گڑھ سڑک پر دیودار کے
جنگلوں میں واقع ہیں۔ یہ مندر ہند آریائی
فن تعمیر کا نمونہ ہیں۔

کُبیر کی مورتی۔ بیج ناتھ میں بے شمار مندر اور دیوی دیوتاؤں کی خوبصورت مورتیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ مندر اور مورتیاں اوائل قرون وسطیٰ کی بنائی جاتی ہیں۔

دوارہاٹ میں مہادیو جی کا مندر

غزل

نذیر بنارسی

مری خاطر نمایاں کون ہوگا — فسانہ میں ہوں عنواں کون ہوگا
سرِ محفل زباں کھلوانے والو — ذرا سوچو پشیماں کون ہوگا
شکستِ عہد و پیماں جب ہو شیوہ — گواہِ عہد و پیماں کون ہوگا
محبت کے تو دعویدار ہم ہیں — شریکِ دردِ انساں کون ہوگا
ہمارے پاس دنیا ہے نہ عقبیٰ — ہمارا دشمنِ جاں کون ہوگا
اگر کانٹا نکل جائے چمن سے — نگہدارِ گلستاں کون ہوگا
مرے بعد اے بتانِ شہرِ کاشی — مجھ ایسا اہلِ ایماں کون ہوگا

کرے ہے عین بتخانے میں سجدہ
نذیر ایسا مسلماں کون ہوگا

غزل

عارف عباسی

سراپا جستجو ہے راز بھی ہے — نگاہِ شوق ہی غماز بھی ہے
چلو ناصح وہیں پھر گفتگو ہو — درِ میخانہ شاید باز بھی ہے
نہ ہو مایوس اتنا قلبِ مضطر — نگہہ اُن کی غلط انداز بھی ہے
محبت شش جہت ہے کارفرما — یہی انجام بھی آغاز بھی ہے
نشیمن کے سکوں پر مرنے والو — سکوں یہ دشمنِ پرواز بھی ہے
ہے وجہِ زندگی جورِ محبت — جو دشمن ہے وہی دمساز بھی ہے
تمہارے نقشِ پا پہچانتا ہوں — جنوں میں ہوش کا انداز بھی ہے

زمانہ جانتا ہے جس کو عارف
وہی نا آشنائے راز بھی ہے

کھلونا

حسن عباس فطرت

نصرت کو رات کاٹنی مشکل ہوگئی۔ بار بار گھر کی یاد میں کھو جاتا۔ جب میں پہونچوں گا۔ امینہ پکارے گی: "منا۔ منا: دیکھ ترے ابا آگئے۔" منا دوڑے گا۔ پھر جھجک کر، ڈر کر کنارے کونے میں کھڑا ہو جائے گا۔ دانتوں میں کرتے کا دامن دبالے گا۔ ٹکٹکی باندھ کر دور سے دیکھے گا۔ امینہ میرے قریب آکر کھڑی ہو جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت اور خوشی ناچتی ہوگی۔ میرا دل بھی اسے دیکھ کر مسکرا اٹھے گا۔ افوہ کتنے دن ہوگئے اس سے چھوٹے ہوئے۔ اور پھر آج سے دو سال پہلے کی آواز نصرت کے کانوں میں گونج اٹھی" ابھاگے اپنے جنم کو نہیں روتا۔ تیرا منھ ہے کھلونا لینے کا!" کیسی تیکھی ہو کے، چتون چڑھا کے اور منھ بنا کے کہا تھا اس نے اب پوچھوں گا اس سے۔ تو نے کبھی خواب میں بھی یہ چیز دیکھی تھی؟

ساری رات وہ انھیں خیالات میں گم رہا اور ایک منٹ کے لئے سو نہ سکا۔ حالانکہ وہ دن بھر کا تھکا ہارا تھا۔ پہلی شفٹ میں صبح سے دوپہر تک اس نے ڈیوٹی دی۔ پھر فوراً ہی وہ اپنے سیٹھ کے کمرے میں گیا تھا" سیٹھ! میرا پگار جلدی سے دلوا دو۔ مجھے چھٹی تو مل گئی ہے پر منیجر پیسہ کے لئے بہانے کر رہا ہے۔ میں کل صبح ہی جانا چاہتا ہوں۔ میں رک نہیں سکتا۔ اب کی بار تو گھر والی نے ایسی چٹھی بھیجی ہے کہ میرے دل میں ہول سا ہونے لگا ہے۔"

سیٹھ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ موٹے موٹے ہونٹوں پر سے مونچھوں کے جال کو ہٹایا اور اونچی آواز میں بولا۔" اوہ۔ اوہ! اچھا نصرت تم جا رہے ہو۔ ابھی پچھلے ہفتہ تو تم مکادم ہوئے ہو۔ اچھا جانا ہی چاہتے ہو تو جاؤ میں منع نہیں کرتا مگر پھر کب آؤگے؟" کہتے کہتے سیٹھ کا چوڑا دہانہ پھیل گیا اور بڑے بڑے دانت دکھائی دینے لگے۔

"چھٹی پوری ہوتے ہی آؤں گا سیٹھ۔"

"ہاں آنا ضرور۔"

سیٹھ نے فوراً منیجر کو بلوایا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس کا حساب چکا دیا گیا۔ ابھی دوپہر اچھی طرح ڈھلی نہیں تھی۔ مگر وہ وہاں سے چل پڑا۔ تیز قدموں سے وہ اسٹیشن آیا۔ لائن لمبی تھی۔ اسے کافی انتظار کے بعد ٹکٹ ملا۔ ٹکٹ کو بڑی احتیاط سے اس نے اپنی صدری کے اندر کی جیب میں رکھا۔ اب شام قریب تھی اس لئے وہ وہاں سے سیدھا بازار کی طرف ہو لیا۔ راستہ بھر اسے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا رہا۔

بازار پہونچکر اسے عجیب کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔ کیا لے کیا نہ لے۔ اسی سوچ میں اس نے دو چکر بازار کے لگا ڈالے اور کچھ فیصلہ نہ کر پایا۔" پہلے امینہ کے لئے سوٹ کا کپڑا" نہیں نہیں پہلے منا کے واسطے۔" اونہہ۔" کپڑے وغیرہ تو بعد میں دیکھے جائینگے۔ وہاں بھی مل جائینگے۔ پہلے تو منا کیلئے کھلونے ...." اور کھلونوں کا خیال آتے ہی امینہ کے الفاظ اس کے کانوں میں بجنے لگے۔" ابھاگے اپنے جنم کو نہیں روتا...." پھر تو اس کی اس تمنا نے ہی فیصلہ کا درجہ اختیار کر لیا۔

سامنے ہی کھلونوں کی دوکان تھی کتنے بوں۔ ایک، دو، تین بچانہ

یہ یا وہ۔ ہاں یہ بندوق کتنے کی ؟ اور یہ ہوائی جہاز۔ یہ ریل۔ اچھا چرخی۔ وہ بڑا ہوا نہیں یہ سب کہاں تک سمیٹوں گا۔ پھر بھی بہت کچھ تو رہ ہی جائے گا۔ اچھا یہ ہے کہ کھلونا لوں۔ مگر ایسا کہ قصبہ بھر میں کسی نے دیکھا نہ ہو۔ امینہ کی آنکھیں کھل جائیں۔ ہمیشہ کے لئے منھ بند کر دوں اس کا یہی تو جواب ہے اس کے اس کڑوے بول کا نا ؟

پاس ہی فٹ پاتھ سے لگ کر ایک خوبصورت سا بچہ گز بھر لمبی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی موٹر چلاتا نظر آیا۔ اوہ بہت خوب۔ یہی کیوں نہ لوں یہ تو سب سے اچھا رہے گا۔ "ہاں بھائی جی" اس نے دوکاندار کو اپنی طرف مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے یہاں ایسی موٹر ہوگی ؟" اس کی انگلی اس بچہ اور موٹر کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"ہاں ! ہاں ! ساب برابر"

"ذرا دکھانا مجھے !"

موٹر آگئی۔ اسے کوک بھر کے اسٹارٹ بھی کر دیا گیا۔ ایک زنّاٹے کے ساتھ وہ دور نکل گئی۔ نصرت کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

اب اس نے موٹر ہاتھ میں لی۔ جھوٹ موٹ، بلا مطلب اسے ٹٹولنے لگا۔ اس کے کل پرزوں کو چھوتا رہا۔ انجانے پن پر بھی اسے گھماتا اور الٹ پلٹ کرتا رہا۔ دراصل اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ یہ ہوگی کتنے کی۔ کہیں چالیس پچاس کی نہ ہو۔ کچھ ہو۔ دام ہوں گے زیادہ۔ وہ بچہ بھی تو کسی بڑے آدمی کا معلوم ہوتا تھا۔ پھر کیا کروں۔ کیا کہوں دوکاندار سے وہ بھی کیا سوچے گا اپنے دل میں۔ میرے پاس تو کُل سوا سو روپئے ہیں جیب میں۔ پھر اور سامان کا کیا ہوگا ؟ گھر پیسے بھی تو کچھ نقد بچا کے لے جانا چاہئے۔ اس نے خیالات کو جھٹکا دیا۔ ہوگا۔ دام تو پوچھنا ہی چاہئے۔ ڈرتے ڈرتے اسکی زبان سے اتنا نکلا۔ سیٹھ..... یہ..... ہے..... کتنے..... کی۔

"پچھتر روپئے کا ہے پہلوان"

جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ تھوڑی دیر وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ٹھنڈی سانس کھینچی اور اُلٹے پاؤں دھیرے دھیرے کھسکنے لگا۔ وہ اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ اسے رکھ لیجئے۔ جیسے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہوں۔ اسے اس طرح چپ چاپ سرکتے ہوئے دیکھ کر دوکاندار نے اپنی لفاظی شروع کر دی۔

ساب کیا سوچ رہے ہو۔ لے لونا۔ برسوں رہنے والی چیز ہے۔ دو تین پشت تک کام دے گی، اور سچ مانو تو دراصل یہی ہے بھی واقعی کھلونا۔ جب بچہ پہلی بار اس پر بیٹھ کر چلے گا تو اس کے چہرے سے جو خوشی پھوٹے گی۔ اسے دیکھتے ہی تمھارے دام وصول ہو جائیں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ پھر سوچ میں پڑ گیا نہیں نہیں پچھتر تو بہت ہوئے۔ پچاس ہی کُل بچیں گے۔ پھر کپڑے لتے۔ میوہ، پھل، بسکٹ پھر تین دن کا سفر ہے۔ دس بارہ تو گھر پہونچتے پہونچتے خرچ ہو ہی جائیں گے۔ پھر نقد کیا بچے گا۔ امینہ کے ہاتھ پر رکھنے کے لئے۔ وہ بھی نہ سہی تو اُدھر سے لوٹنے کا خرچ کہاں سے آئے گا ؟ وہ انھیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اتنے میں دوکاندار کی آواز پھر اس کے کانوں میں آئی۔ وہ مشکل سے دو تین قدم آگے بڑھا ہوگا۔

"ارے ساب ! سنئے تو۔ کچھ کم کر دیجئے۔ ویسے تو ہمارے یہاں دام ایک ہی ہوتے ہیں۔ مگر آپ نے اسے ایسے چاؤ سے مانگا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ آپ کو پسند آگیا ہے۔ تو لے لیجئے نا۔ میں کچھ کمی کر دوں گا۔ بھاؤ تاؤ میں فرق نہ ہوگا۔" وہ اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ مگر نصرت کے قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہی گئے۔

سامنے ہی ایک نوجوان جوڑہ دکھائی پڑا۔ وہی بچہ موٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ موٹر دوڑ رہی تھی اور وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کتنے خوش تھے دونوں ؟ جیسے چہک رہے ہوں اور بچہ تو جیسے گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا ہو۔ دیکھتے ہی اسے اپنا امینہ اور مُنا کا خیال آگیا۔ ساتھ ہی امینہ کے الفاظ نے پھر اس کے کانوں پر ہتھوڑا چلانا شروع کر دیا "ابھاگے..... تیرا منھ ہے۔"

اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس کے ارادوں نے بے ساختہ ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ جلدی جلدی دوکان پر پہنچا۔ بغیر مول تول کئے جیسے آنکھ بند کر کے اور جی کڑا کر کے اس نے موٹر خرید لی۔ اسے کاغذ میں لپیٹنے بھی نہ دیا دوکاندار کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی کھولی کا رخ کر دیا۔ وہ چلتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ مگر جلد ہی اسکے

اس گھر کو تاریکی کا سہارا مل گیا۔ اب وہ کچھ اور نہ خریدے گا مزدور ہی کیا ہے۔ کیا کوئی شان دکھانا ہے؟ کپڑے لتے کی کمی ہی کیا ہے گھر میں۔ امینہ ہے تو کیا۔ ہر مہینے تو پچاس کا منی آرڈر لگا ہی دیتا ہوں۔ کمی ہی کیا ہوگی اس کا وہ جو چاہے خرید سکتی ہے شہر سے منگا سکتی ہے۔ رہی یہ چیز یہ تو ہمیشہ کے لئے یادگار رہے گی۔ کبھی دن تو سب اسے دیکھنے آئیں گے۔ اور بس اسے سکون ہوگیا۔ اسے قرار مل گیا۔

اب وہ اڑ کر گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر صبح سے پہلے کوئی گاڑی ہی نہ جاتی تھی۔ پھر رات کٹے تو کیسے کٹے بار بار وہ آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرتا مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تکان کے باعث اگر کہیں آنکھ لگ بھی جاتی تو کبھی منا اچھل کر اس کے سامنے آجاتا۔ کبھی امینہ کا گول اور گلابی چہرہ۔ اس کی آواز چوڑیوں کی کھنک، بیچ بیچ میں کبھی کبھی میٹھی سی مسکراہٹ، مونچھوں کا جال "نصرت پھر کب آؤگے؟" موٹر کی گڑگڑاہٹ۔ بازار کا شور اس کی نیند کو درہم و برہم کر دیتے۔ کبھی ایسا لگتا کہ ریل گاڑی پر کسی نے اس کی جیب صاف کردی۔ کبھی لگتا کہ الٹا خود ہی وہ تھانہ میں بند ہے۔ ساری رات یہ آنکھ مچولی ہوتی رہی۔

نصرت جس نے اپنی زندگی کے لگاتار بائیس سال گاؤں میں گذارے تھے۔ میلہ۔ عرس۔ بازار۔ ناچ۔ تماشہ اور بارات میں جانے کے علاوہ کبھی گھر سے سر نہیں نکالا تھا۔ یوں بھی اس کی دنیا شیر گنج کے ادھر ادھر دس میل کے دائرہ میں محدود تھی۔ اس نے شاید کوئی دن اور رات گھر سے باہر گزاری ہو مگر آج وہی نصرت اپنے گھر سے اپنے گاؤں سے بارہ سو میل دور بمبئی میں چلا ہاؤس کی تنگ تاریک کوٹھری میں مسلسل دو سال سے اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔

نصرت اپنے ماں باپ کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا اس لئے بڑے ہی لاڈ و پیار سے پلا۔ بڑا ہوا۔ گھر پر اچھی خاصی کھیتی باڑی تھی جانور تھے۔ چار چار بھینسیں تھیں۔ سواری کے لئے گھوڑا تھا۔ اس کے باپ حسرت چودھری قصبہ کے اچھے خوشحال اور کھاتے پیتے لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ نصرت جب بڑا ہوا تو اسے قاعدہ کے مطابق اسکول بھیجا گیا مڈل تک کسی طرح اس نے اپنی پڑھائی جاری رکھی مگر مڈل فیل ہونے پر پھر کسی طرح پڑھنے پر راضی نہ ہوا۔ دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا۔ دوسروں کے چرتے ہوئے گھوڑوں کو پکڑ کر سواری کرتا۔ کبوتر۔ فاختہ۔ بٹیر کے شکار میں پورا پورا دن گذار دیتا۔ برسات میں آموں کے باغوں میں گاؤں گاؤں گھومتا۔ مچھلیاں پھنساتا۔ اوکھ اور مٹر کی فصل میں اپنے غول کے ساتھ دوسروں کے کھیتوں کو ویران کرتا۔ رات میں کبھی ایک بجے کبھی دو بجے گھر لوٹتا۔ گانے بجانے کا رسیا۔ ناچ رنگ کے پیچھے دیوانہ۔ سب کچھ تھا مگر گھر کا لاڈلا۔ ماں باپ کا دلارا اس لئے اول تو کوئی کچھ کہتا ہی نہ تھا۔ اور کہتا بھی تو وہ سُنی اَن سُنی کر دیتا۔ جب سے ماں مر گئی تھی باپ کی شفقت اور بڑھ گئی تھی۔ بھائی کہنا تو بہت کچھ چاہتے مگر باپ کی وجہ سے دانت پیس پیس کر رہ جاتے۔ خون کا گھونٹ پی پی کر خاموش ہو رہتے۔ البتہ بھابھیاں کبھی کبھی اس کے پیچھے پڑ جاتیں اور اسے بھاگتے ہی بنتی۔

جیسے جیسے وہ بڑھتا گیا۔ وعظ و نصیحت کا سلسلہ سنجیدگی اختیار کرتا گیا۔ بھائیوں نے باتوں باتوں میں مٹھاس اور نرمی کے ساتھ دنیا کی اونچ نیچ دکھا کر بہتیرا سمجھایا۔ باپ کی نصیحتوں نے تو آخر کار لعنت و ملامت کی حیثیت اختیار کرلی۔ مگر اس کی روش میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ یہی ہوتا اگر کسی دن بات زیادہ بڑھ جاتی۔ کوئی کچھ زیادہ کہہ سن دیتا تو وہ منھ اٹھائے ہوئے اپنے کسی دوست کے گھر پہنچ جاتا۔ دوسرے دن حسرت چودھری جھکے جھکے کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے جاتے اور ادھر ادھر کی الٹی سیدھی سمجھا کر گھر لے آتے۔

نصرت کو نہ سنبھلنا تھا نہ سنبھلا۔ طے ہوا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ جب گلے میں جوا پڑ جائے گا تو خود بخود عقل آجائے گی۔ مگر ہوا الٹا۔ شادی کے بعد وہ اور بھی مست گیا۔ بگڑ گیا۔ نو، دس بجے تک سو کے اٹھتا۔ جوٹ موٹ کلی وغیرہ کرکے پیٹ پوجا کی اور گھومنے نکل گیا۔ دوپہر کو لوٹتا اور کھانا کھا کے جو تیزی کی کوٹھری میں گھستا تو اذان ہونے کو آجاتی تب کہیں [illegible] نکلنے کا نام لیتا۔ بارہ ایک بجے رات تک دوستوں میں چہلیں کرتا۔ بیوی کھانا لئے

راہ تکتی رہتی دو چار نقمے زہر مار کرتا اور پھر وہی دس بجے دن تک سوتا۔

شادی کے دو برس بعد وہ ایک لڑکے کا باپ بن گیا۔ مگر نصرت کے معمول میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا۔ ہاں دھیرے دھیرے وہ بچے کو پیار کرنے لگا اور پھر یہ پیار بڑھتا ہی گیا۔ جہاں جاتا اسے اٹھائے پھرتا۔ ساتھ ساتھ کندھے پر لئے رہتا۔ نہلانے دھلانے بازار۔ باغ۔ کھیت۔ کھلیان ہر جگہ منا اس کے کندھے پر دکھائی دیتا یا بغل میں یا پیٹھ پر۔ اس کے دوست اس پر ہنستے۔ جملے کستے۔ مذاق اڑاتے وہ کسی کی بات کا کوئی جواب نہ دیتا۔ اب اسکا زیادہ وقت منا کو گھمانے پھرانے میں صرف ہونے لگا۔

لیکن امینہ کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہ بھاتا اور امینہ کا دکھ بیجا نہ تھا۔ خالی خولی پیار سے بھی تو کام نہیں چلتا۔ وہ روزانہ اپنی جیٹھانیوں کے طعنے سنتی۔ نصرت کے نکمے پن سے اس کی کور دبی رہتی زیادہ سے زیادہ اور جی توڑ کے کام کرتی۔ سب سے پہلے جاگتی سب کے بعد سونے جاتی۔ مگر اسے کوئی نہ دیکھتا۔ اس کی یہ سخت مشقت بھی ان لوگوں کی نظروں میں نصرت کی بے راہ روی کا بدل نہیں ہو پائی۔ سب اچھے اچھے کپڑے پہنتیں۔ ان کی جیبیں پیسوں سے بھری رہتیں ان کے لڑکے دن بھر میں کئی کئی بار مٹھائیاں پھل اور دوسری چیزیں کھاتے اور اس بیچاری کو منا کے سر کے تیل کے لئے بھی حسرت چودھری کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اس کا اپنا تو ذکر ہی نہیں۔ دوسرے بچوں کے لئے مٹی، چینی، پلاسٹک وغیرہ کے کھلونوں کی کمی نہ تھی۔ اور امینہ کپڑے کے گڈے گڑیا۔ طوطا مینا بنا بنا کر منا کو دلاسہ دیتی۔ پھر کیسے نہ اس کا جی کڑھتا۔

اسی رنج اور کڑھن میں اس کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اس کا کسا ہوا بدن اپنی چستی چھوڑ رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبا سا رہتا تھا۔ مگر کہے تو کس سے کہے؟ نصرت سے؟ لیکن یہ تو اسے اپنے میکے میں بار بار سمجھایا گیا تھا کہ شوہر سے کسی چیز کے لئے کہنا اور وہ بھی سسر کے ہوتے ہوئے، حیادار اور اچھی سیرت لڑکیوں کا کام نہیں بلکہ ان کے لئے عیب کی بات ہے۔

اور انھیں حالات میں منا بڑا ہوتا گیا۔ اسے کون روک سکتا تھا۔ تتلا کے بولنے لگا۔ تھوڑا بہت چلنے لگا۔ دروازے پر کبھی خوانچے والے کبھی گڑکی مٹھائی والے۔ کبھی سوہن حلوے والے آتے۔ اور بچے تو جیسے اس کے منتظر ہی ہوتے۔ آواز سنتے ہی دوڑ پڑتے۔ ایک پر ایک ٹوٹ کر چیزیں خریدتے۔ پھر تعریف یہ کہ اسی گھر میں منا کو دکھا دکھا کر کھاتے۔ منا بھی تو بچہ ہی تھا آخر۔ وہ مچل جاتا تو امینہ کبھی اسے یہ کہہ کر بہلا لیتی کہ "اس میں کیڑے ہوتے ہیں" کبھی اسے بیماری کا باعث بتاتی۔ کبھی کہتی یہ گندی اور بری ہیں تمہارے ابو اچھی مٹھائی لانے گئے ہیں وغیرہ وغیرہ مگر کب تک؟

ایک دن جب قصبہ میں پیر کمال الدین کا عرس تھا۔ ہر طرح کے دوکاندار آس پاس سے آئے ہوئے تھے۔ دو چار دوکاندار گاؤں میں بھی نکل آئے تھے اور گلی گلی، مکان مکان گھوم رہے تھے۔ ایک شہر سے آیا ہوا کھلونے والا۔ جس کے یہاں رنگ برنگ کے عمدہ اور نئے قسم کے کھلونے تھے۔ غبارے۔ پلاسٹک کی گڑیا۔ بانسری۔ بین پشیر چھیتا۔ پستول۔ چڑیا۔ پھل اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ چودھری حسرت کے دروازے پر بھی آدھمکا۔ دیکھتے ہی سبھی بچے دوڑ پڑے۔ دم کے دم میں۔ ہاتھوں ہاتھ اس کی چوتھائی دوکان تو خالی ہی ہوگئی۔ جس کا آدھا تو چودھری حسرت کے پوتوں ہی نے لیا سب لڑکے باری باری گھر میں آنے لگے کھلونوں غباروں سے لدے ہوئے۔ چمکدار۔ انوکھے اور لبھا لینے والے کھلونے۔ جنھیں دیکھ کر بچے تو بچے بڑے بھی حیرت سے دیکھنے لگتے۔ منا تو خیر بچہ ہی تھا۔ ہر بچے کے ہاتھ میں جو کئی طرح کے انوکھے، بھڑکیلے، نازک، بولتے ہوئے کھلونے دیکھے تو مچل گیا۔ بیتاب ہو گیا۔ منمنانے لگا۔ ام۔ می۔ ام می لیں دیبے۔ ام۔ می۔ دہ۔ ایس۔ بی۔

امینہ نے حسب دستور اسے طرح طرح سے بہلانا۔ پھسلانا شروع کیا۔ لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ جتنا وہ اسے سمجھاتی وہ اور زیادہ ضد کرتا۔ ہار کر اس نے اسے گود میں اٹھا لیا منھ پر ہاتھ رکھکر اسے چپ کرانا چاہا۔ پر جیسے ہی وہ اسے لیکر دروازے سے اندر کی طرف چلی تو اس نے تڑپ کر دھڑام سے اپنے آپ کو نیچے گرا دیا اور

لگا پھر چیخنے اور چلانے۔ جتنا وہ اس کو منانا اور چپ کرانا چاہتی وہ اور زور زور سے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ وہ تنگ آ گئی، جھلا گئی۔ اوپر سے جیٹھانیوں کی مسلسل ہنسی اور طعنے بھرے زہریلے جملوں نے اور بھی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اس سے اپنے کو روکا نہ گیا وہ بڑھی اور کافی زور سے ایک دو ہتڑ منے کی پیٹھ پر جما دیا اور یہ کہتے ہوئے "ابھاگے اپنے جنم کو نہیں روتا۔ تیرا منھ ہے کھلونے لینے کا"

اور پھر خود جا کر پلنگ پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میاں نصرت بڑی دیر سے دور دالان میں بیٹھے ہوئے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اور چپ تھے۔ کر ہی کیا سکتے تھے مگر امینہ کے اس جملے کا اثر ان پر ایسا ہوا۔ جیسے یک بارگی کسی نے ان کے کانوں میں گرم گرم سیسہ پگھلا کر انڈیل دیا ہوا۔ وہ اٹھ پڑے۔ فوراً ہی حسرت چودھری کی بیٹھک کا رخ کیا۔ "ابا جی آپ مجھے کچھ روپئے دید یجئے میں شہر جاؤں گا کمانے۔ اب بیٹھے بیٹھے کام نہیں چلے گا۔"

جس نے بھی سُنا۔ اسے حیرت ہوئی کہ دوسرے ہی دن صبح کو نصرت امینہ سے ملے بغیر منا کو بنا پیار کئے شہر چلا گیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد شہر کو بھی خیر باد کہہ کر بمبئی پہونچ گیا۔

پورے دو سال سے تو وہ خاندیش مل ہی میں کام کر رہا تھا۔ یہاں پہونچ کر قریب قریب سال بھر وہ گھر والوں سے امینہ سے روٹھا رہا۔ کوئی خط تک نہ بھیجا تو روپئے پیسے کا کیا سوال۔ گھر سے بہت سے خطوط آئے۔ باپ نے زبانی بھی کئی بار کہلوا بھیجا کہ بیٹا چلے آؤ۔ تم جیسے رہتے تھے ویسے ہی رہنا۔ تمھیں اب کوئی کچھ نہ کہے گا۔ نہ ہی تمھیں کوئی تکلیف ہوگی۔ مگر اس نے کسی کا کوئی جواب نہیں دیا۔

سال بھر کے بعد اسے امینہ اور منا کی یاد آئی۔ اس نے ہر دوسرے مہینے کبھی ہر مہینے۔ پچاس۔ ساٹھ اور چالیس بھیجنا شروع کر دئے اس طرح خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ باپ کا خط۔ بھائی کا خط پھر امینہ کے خطوط آنے لگے۔ منا بہت یاد کرتا رہتا ہے۔ بہت دبلا ہو گیا ہے۔ اس کی خوراک آدھی ہو گئی ہے۔ بس ابا ابا کرتا رہتا ہے اور کچھ بولتا ہی نہیں۔ اور ادھر دو مہینے سے تو اس کے ایسے درد بھرے خطوط آنا شروع ہو گئے نہ وہ پگھل گیا۔ سب کچھ بھول گیا اور دھیرے دھیرے گھر کی یاد کی چونٹیاں اس کے بدن میں رینگنے لگیں۔ کچھ دن اور بیتے تو اس نے مستقل جگہ بنا لی۔ اب ہر وقت اس کے دل میں ایک نامعلوم سی کھڑ کھڑ بھی ہونے لگی۔ جیوں جیوں یہ خلش بڑھتی گئی اسے وطن کی ہر چیز کی یاد ایک ایک کر کے ستانے لگی۔ آج سے دو ڈھائی برس پہلے کا شیر گنج ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ آخر میں اس کا دل کام سے اچاٹ ہو گیا۔ ہاتھ پیر میں سنسنی ہونے لگی۔ جوڑ جوڑ میں درد۔ سارا بدن ٹوٹنے لگا۔ اب بمبئی اور خاندیش مل کی نوکری اس کے لئے وبال بن گئی تھی۔

رات، دن، سوتے، جاگتے اسے شیر گنج ہی کی دھن سوار رہتی۔

اور جب ایک ہفتہ پہلے اسے امینہ کی چھٹی ملی، جو بڑی ہی دکھ بھری، التجا آمیز اور ڈراونی بھی تھی تو وہ تڑپ گیا اور اس نے گھر جانے کی ٹھان لی۔ خط میں لکھا تھا۔ "اب تو منا تمھیں یاد کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ تھک کر چور ہو گیا ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے بیچارہ۔ ہر دم پلنگ پر بے سدھ پڑا رہتا ہے۔ ہنسنا بولنا تو عرصہ سے خواب ہو چکا ہے اس کا۔ اب بھی رحم کھاؤ اس ننھی سی جان پر اس نے کیا قصور کیا ہے تمھارا۔"

جب وہ شیر گنج کے اسٹیشن پر اترا تو پو پھٹ چکی تھی اور اتنا اجالا پھیل چکا تھا کہ اسٹیشن سے وہ اپنے گھر کے قریب لگے ہوئے ناریل کو پہچان سکے۔ وہ چل پڑا۔ بکس اور بستر تنبولی کی دکان پر چھوڑا۔ ایک گٹھر اور تھیلا اپنے ساتھ لیا لیکن کچھ عجیب سی بات تھی جیسے جیسے روشنی بڑھتی جاتی اسے فضا اور بھی دھوئیں کا مرغولہ لگتی۔ سورج نکل آیا اور گاؤں کی چودھری نے اس کے پیر چھو لئے مگر اسے ہر چیز نئی اور عجیب سی لگی۔ جیسے اس کا وہ دو برس پہلے والا گاؤں نہ ہو کوئی اجنبی دیس ہو۔ گاؤں اسے کچھ چھوٹا بھی معلوم ہوا۔ ایسا لگا جیسے گاؤں کی زمین اور سطح کچھ نیچی ہو گئی ہو۔ جیسے چمکتی ہوئی دھوپ کے سنہری پن میں کچھ کمی آ گئی ہو۔ پگڈنڈی پر قدم رکھتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ راستہ تو بہت لمبا ہو گیا ہے یا اس کے پیر ہی وزنی ہوتے جا رہے ہیں وہ ہر چیز کو اجنبی کی طرح حیرت اور تعجب سے دیکھتا چلا جا رہا تھا سر جھکائے یہ سوچتا ہوا کہ دو ڈھائی سال میں اتنی تبدیلی ؟

آگے بڑھنے پر دائیں طرف گاؤں کا بڑا تالاب۔ وہ بھی جیسے دبک کر نکلنے ہوئے کچھ ابھر آیا ہو۔ حالانکہ یہ نومبر کے آخری ایام تھے رلچھیا کی پھلواری جہاں وہ اکثر سرِشام قدم کے پیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر بانسری بجایا کرتا تھا۔ کچھ اجاڑ اجاڑ سی لگی۔ کانپتی ہوئی سی۔ اس کے بعد قبرستان کا سلسلہ تھا۔ چاروں طرف اسی طرح خاردار جھاڑیوں ببول اور کیکر کے درختوں سے گھرا ہوا۔ نئی، پرانی، چھوٹی، بڑی قبروں سے دبا ہوا۔ کراہتا ہوا۔ اتنے میں کافور اور لوبان کی بو اس کی ناک میں گھس گئی اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ حالانکہ اس وقت وہاں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔

وہ بڑھتا گیا۔ دل میں عجیب عجیب خیالات لئے۔ دھڑکن اور بے چینی لئے۔ اب مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا نیچے، اونچے کھپریل، پھوس کے مکانات، چماروں کا محلہ، دھوبیوں کے مکانات، بنیوں کا ٹولہ، ایک ایک چیز کو بڑے غور سے۔ پیار سے، حسرت سے تکتا رہا۔ دیکھتا رہا اور چلتا رہا۔

گاؤں میں سبھی جاگ اٹھے تھے۔ آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ دعا سلام کے درمیان اس کے خیالات کا تانا بانا تھوڑی دیر کے لئے ٹوٹ جاتا اور پھر شروع ہو جاتا یہاں تک کہ وہ گھر کے قریب آ گیا اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ ایک بات اس نے ضرور محسوس کی کہ ہر شخص اسے دیکھ کر پہلے ٹھٹھک جاتا اور رسمی سلام و دعا سے آگے نہ بڑھتا تھا۔

گھر پہنچ کر تو اسے اور بھی بڑا دھچکا لگا۔ گھر اور گھر پہونچنے کے بارے میں جتنے منصوبے اس نے بنائے تھے اور جس کے خیال نے اس سے بمبئی کی آخری رات کو نیند تک چھین لی تھی۔ ایک بھی تو پورے نہ ہوئے نہ شور نہ ہنگامہ۔ نہ آؤ بھگت۔ نہ امینہ کی آواز۔ نہ منا کی جھجک۔ کچھ بھی تو نہ تھا وہاں۔

اس کے دل میں عجیب غصہ و نفرت کا احساس پیدا ہوا۔ اس نے سامان کا گٹھر اور تھیلا باہر دالان کے تخت پر رکھ دیا اور بیٹھ کر جوتے کی ڈوری کھولنے لگا۔ اتنی دیر میں ایک ایک کر کے پورا گھر اس کے گرد جمع ہو گیا سوائے امینہ اور منا کے سبھی آ گئے۔ باپ۔ بھائی۔ بھابھیاں سب آئے۔ لیکن ان کے قدموں میں بھی نصرت نے کچھ جھجک سی محسوس کی۔ اس نے سوچا اس کے دماغ ہی میں کچھ فتور آ گیا ہے اور کچھ نہیں۔

باہر بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔ وہ منا اور امینہ سے ملنے کیلئے بے تاب تھا۔ سب سے پیچھا چھڑا کر گھر میں گھسنا چاہتا تھا۔ ایکبارگی اسے خیال آیا۔ امینہ گھر میں ہوتی تو آتی ضرور۔ کیا امینہ گھر میں نہیں ہے؟ اپنے میکے تو نہیں چلی گئی۔ اگر گئی تو کیوں۔ ضرور گھر میں کسی نے ایسی ویسی بات کہی ہو گی اسے۔ ورنہ وہ تو بہت ہی سیدھی ہے۔ ایسا ہی ہوا ہو گا نہیں تو وہ جانے والی نہ تھی۔ اور جاتی بھی کیسے؟ من جو آ رہا تھا وہ کسی سے پوچھ نہ سکا مگر اسے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ امینہ گھر میں نہیں ہے ورنہ منا تو ضرور ہی باہر آ جاتا۔

اس کے دماغ میں اسی طرح کے خیالات آتے رہے۔ اور بلا سوچے سمجھے۔ سنے یا غور کئے سب کے سوالات کو ہوں ہاں میں ٹالتا رہا آخر اس سے رہا نہ گیا۔ اور جی کڑا کر کے اپنے باپ سے پوچھ ہی بیٹھا۔

"بابا! منا کہاں ہے؟"

اس سوال کے ساتھ ہی اسے اندر سے امینہ کی آہٹ محسوس ہوئی وہ ضبط و شرم کو بالائے طاق رکھ کر جھٹ اپنا گٹھر اٹھا گھر کے اندر گھس گیا۔ مارے خوشی کے وہ نیم پاگل سا ہو گیا۔ اسے کچھ بھی نہ یاد رہا جاتے ہی اس نے امینہ کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا! اور گٹھر کھولتے ہوئے بولا۔ امینہ یہ دیکھ کیا شاندار چیز لایا ہوں اپنے منا کیلئے اور گٹھر کی گرہ پر اس کی انگلیاں اور تیز ہو گئیں۔ منا ہے کدھر، ذرا پکارو تو اسے اب تو وہ خوب اچھی طرح بھاگ دوڑ مچاتا ہو گا۔

امینہ چپ رہی وہ کہتا گیا۔ تمھیں کیا پتہ ہے۔ پورے بمبئی بھر میں ڈھونڈھ کے خریدا ہے میں نے اسے۔ یہاں تو خیر کیا؟ دور دور یہ چیز دیکھنے کو نہیں مل سکتی۔

"مگر ہاں تم خاموش کیوں ہو۔ کیا تمھیں کچھ بُرا لگا؟" اس نے گٹھر کھول کر موٹر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ کیا اس لئے کہ میں تمھارے لئے کچھ نہیں لا سکا صرف اس موٹر کے کارن؟

امینہ اب بھی چپ رہی۔ تو نصرت اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

حالی کی سیاسی شاعری

شجاعت علی سندیلوی

ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اردو زبان نے اپنے دور کے سیاسی حالات و رجحانات کی ترجمانی بدرجہ اتم کی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں یہ رجحانات اور زیادہ ہوگئے اور قریب قریب ہر شاعر یا ادیب نے سیاسی حالات پر تبصرہ ضرور کیا یا اشاروں اور کنایوں میں سیاسی ابتری کو بیان کیا۔ چنانچہ ہر دور کی غزلوں کے اندر ہزاروں اشعار ایسے موجود ہیں جن میں گل و بلبل، آشیانہ و قفس کے پردے میں آزادی و محکومی کا ذکر کیا گیا ہے۔ انگریزوں نے جب اپنی پرفریب سیاست سے ہندوستان کو غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑنا شروع کیا اور تجارت کے ذریعہ حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے لگے تو اردو کے شعرا نے باوجود اپنی سرمستیوں اور مدہوشیوں کے آنے والی غلامی اور ملک کی تباہی کو محسوس کیا اور اپنے جذبات و خیالات کا اظہار شعر میں کیا۔ مصحفی نے تو نہایت بے باکی سے اتنا کہہ دیا ؎

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

عام طور سے لوگ اس ظلم و ستم اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں کرتے تھے پھر بھی ایسے باہمت اور جری انسان تھے جو ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

مولانا الطاف حسین حالی کا شمار انھیں لوگوں میں ہے۔ عام طور پر انھیں انگریزوں کی حکومت کا بہی خواہ اور مدح خواں کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے انگریزی راج کی برکتیں ایک ایک کرکے بیان کی ہیں اور حکومت انگلشیہ کو انعام الٰہی بتایا ہے لیکن وہ انگریزوں کی سیاست سے ناواقف نہ تھے۔ انھوں نے غالباً سب سے پہلے اردو نظم میں انگریزوں کی سیاست کا پردہ چاک کیا اور اُن کی نظمیں اس امر کی شاہد ہیں کہ ان کا سیاسی شعور کافی بیدار تھا۔ فرنگی سیاست کے اثرات کا علم انھیں مختلف تعلیمی، سماجی، ادبی اور مذہبی تحریکوں میں حصہ لینے کی وجہ سے ہوا اور انھوں نے اپنے ان تاثرات کو مختلف مضامین، غزلوں قطعات، رباعیات اور نظموں میں ظاہر کیا۔ وہ انگریز کی تجارت کو اقتصادی لوٹ کھسوٹ سمجھتے تھے چنانچہ "زمزمہ قیصری" کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں: ۔

"جس قدر مال و دولت پہلے قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیا جاتا تھا، اس سے اضعافاً مضاعفہ اب صنعت اور تجارت کے ذریعہ خود بخود کھچا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب دو ایسی گورنمنٹوں کے درمیان جن میں سے ایک شائستہ اور دوسری ناشائستہ ہو، تجارتی عہدنامہ تحریر ہو جاتا ہے تو یہ یقیناً سمجھ لیا جاتا ہے کہ شائستہ گورنمنٹ بغیر اس کے کہ ہلدی لگے یا پھٹکری، دوسری گورنمنٹ کے تمام ملک و دولت و منافع و محاصل کی بالکل مالک ہوگئی

کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

نیں خالی ضرر سے تجشیوں کی لوٹ بھی لیکن ... عذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی اخلاقی
پھل چھوڑے نہ برگ یا جھوڑ تونے گلشن میں ... یہ چھنی ہے یا لش ہو گہیں؟ یا ہو قزاقی[1]

آگے لکھتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ اگلے زمانہ کی غارتگرانہ لوٹ کھسوٹ سے جو نتیجہ مترتب ہوتا تھا، اسی نتیجہ کے قریب قریب یہ شائستہ لوٹ بھی پہنچا دیتی ہے . . . جن حکمتوں اور تدبیروں سے آج کل دنیا کی دولت کھسیٹی جاتی ہے ان پر بخلاف اگلے زمانے کی جابرانہ لوٹ کھسوٹ کے کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا" [2]

مصحفی کے بعد انگریزوں کی تجارت کے متعلق اس قسم کے خیالات سب سے پہلے مولانا حالی نے ہی ظاہر کئے۔ یہ ۱۸۶۹ء کی بات ہے۔ اس کے بعد مولانا نے متعدد نظموں میں انگریز کی سیاست کا پردہ چاک کیا ہے "کالے اور گورے کی صحت کا مڈیکل امتحان"، "انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی"، "آزادی کی قدر" "پنشن کی تعریف" "قانون" "تدبیر قیام سلطنت" "قوم کی پاسداری" "پولیٹیکل اسپیچیں" "ٹیکس" "ہنگامہ مسجد کانپور" "قوموں کی زندگی اور موت میں فرق" وغیرہ قطعات اور رباعیات میں حالی نے فرنگی سیاست کے اثرات بیان کئے ہیں۔ ان کی دوسری طویل نظموں میں بھی سیاست افرنگ کے لطف وکرم کا ذکر ہے۔ انگریز کس طرح ہندوستانیوں کو مجبور محض بنا کر محکوم رکھنا چاہتے تھے، کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان" کا قطعہ اسی کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ اس قطعہ میں ایک کالا اور ایک گورا اپنی اپنی بیماری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے سرکاری ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ راستہ میں دونوں کسی بات پر جھگڑا کر بیٹھتے ہیں۔ گورا حاکم قوم کا ایک فرد تھا، کالے کی بات کی تاب کیوں لاتا، اس نے کالے کے ایک مکا رسید کیا۔ کالا آدمی بیچارہ بیہوش ہو جاتا ہے۔ جوں توں دونوں ڈاکٹر کے پاس پہنچتے ہیں۔ اور اپنا اپنا حال بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ان کے حالات سن کر

دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیق مرض ... اور لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا جس گورے کے مکّے سے مرے ... کر نہیں سکتا حکومت ہند پہ وہ زینہار
اور لکھا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند ... کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پیٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے ... آئے با با اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

کتنے صاف اور واضح الفاظ میں انگریز کی جابرانہ پالیسی اور ہندوستانیوں کی مظلومیت بیان کی ہے۔

حکومت کو اپنی قوت وطاقت کا نشہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہر فعل کو جائز سمجھتی ہے۔ مظلوموں کی فریاد وفغاں کرنا بھی اس کی جابرانہ طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتی۔ پھر انگریز صاحب تدبر وسیاست تھے، ان کی حکومت بظاہر عدل ومساوات رحم وانصاف پر مبنی تھی لیکن حقیقت میں لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر اس کی ترقی اور بقا کا انحصار تھا۔ وہ اسی پالیسی پر عمل کرتے تھے لیکن نہایت دانشمندی کے ساتھ۔ حالی نے اس پالیسی کا اظہار "تدبیر قیام سلطنت" میں کیا ہے ؎

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح ... واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی ... یہ حرف بد یک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر ... مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن ... جو بات بک ہواسے منہ سے نہ نکالو

ملوکیت پسند سیاست کا دارومدار زیادہ تر انھیں باتوں پر ہے بظاہر میں دوستی ہے اور باطن میں دشمنی۔ یہ سیاست ممکن ہے کچھ عرصہ تک کامیاب ہو جائے لیکن یہ حق وصداقت اور ستیہ اور اہنسا کی سیاست نہیں ہو سکتی۔ حالی نے بتایا ہے کہ اس قسم کی سیاست سے پرہیز کرو۔

اس قسم کی سیاست قانون کو بھی اپنے حسب منشا استعمال کرتی ہے۔ دنیا کو دکھانے کے لئے اچھے سے اچھا اور عدل ومساوات پر مبنی قانون بنایا جاتا ہے۔ لیکن یہ قانون صرف کمزوروں کے لئے ہوتا ہے، زور آوروں کے لئے نہیں۔

کہتے ہیں ہر فرد انساں پہ ہے فرض ... ماننا قانون کا بعد از خدا
پر جو سچ پوچھو نہیں قانون میں ... جان کچھ مکڑی کے جالے کے سوا

---

[1] یہ شعر خود مولانا حالی کی غزل کے ہیں
[2] کلیات نظم حالی حاشیہ صفحہ ۱۳-۱۴

اس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں　　اور بچ جاتے نہیں کچھ دست و پا
چھاڑ دیتے ہیں توڑ اک آن میں　　جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
حق میں کمزوروں کے ہے قانون وہ　　اور نظر میں زورمندوں کی ہو لا

"نیشن" کا لفظ اب قریب قریب عام فہم ہو چکا ہے اگرچہ اس کے معنی اور مفہوم میں اب بھی اختلاف ہو۔ حالی کے زمانہ میں یہ لفظ نیا نیا اردو میں داخل ہوا تھا۔ اس کے مختلف معنی لئے جاتے تھے۔ حالی کی نظر میں "نیشن" اس جماعت کو کہتے ہیں جس کی زبان، نسل اور مذہب ایک ہو، لیکن سب اس کو تسلیم نہیں کرتے ؎

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے　　اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب
کہ نیشن وہ جماعت ہے کم از کم　　زبان جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب
مگر وست اسے بعضوں نے دی ہے　　نہیں جو رائے میں اپنی مذبذب
وہ نیشن کہتے ہیں اس بھیڑ کو بھی　　کہ جس میں وحدتیں مفقود ہوں سب

اس دور میں انگریزوں نے ہندوستان کو تھوڑی بہت جو آزادی دی اس پر بہت سے ہندوستانی خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم کو اس آزادی کی قدر کرنا چاہیئے کیونکہ یہ ہم کو بہت مدت کے بعد ملی ہے۔ مولانا حالی نے نے اس پر طنز آمیز خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنھیں　　قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا　　بے نوا کو ہے زیادہ قدر دینار و درم
سن کے اک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا　　ہے سقر موری کے کیڑے کے لئے باغ ارم

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حالی کس قسم کی آزادی چاہتے تھے؟ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آزادی جیسی گراں بہا چیز، صرف اتفاق و اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے چلی گئی۔

ملک ہیں اتفاق سے آزاد　　شہر ہیں اتفاق سے آباد

اس لئے ان کو اس امر کا یقین کامل تھا کہ اگر اتحاد و اتفاق ہو جائے تو آزادی خود بخود مل جائے اور نحبت و افلاس دور ہو جائے، دولت و بخت قدم چومنے لگیں ؎

کہہ رہا تھا یہ اک آزاد کہ ہو جنہیں ملاپ　　دولت و بخت ہے ہر حال میں ان کے ہمراہ
پر نہیں اختلاط جس قوم میں اور یک جہتی　　اس کی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ

مثنوی حب وطن میں انھوں نے اسی خیال کو یوں ظاہر کیا ہے۔

ہند میں اتفاق ہوتا گر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی　　اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

یہ پونجی آزادی کی پونجی تھی۔ آزادی ختم ہو جانے کے بعد عزت و آبرو بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس پونجی کو بچانا ہر آزاد پسند ہندوستانی کا فرض ہے ؎

گر رہا چاہتے ہو عزت سے　　بھائیوں کو نکالو ذلت سے
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز　　ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز

انھوں نے حصول عزت کا طریقہ بھی بتا دیا ؎

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے　　علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے

اس لئے ؎

عزت قوم چاہتے ہو اگر　　جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر

یہ اب سے ۸۵، ۸۶ برس پہلے کی آواز تھی جس نے ملک کی غلامی کا خاص سبب جہالت بتائی تھی کون کہہ سکتا ہے کہ ملک کو اس نسخہ کی ضرورت اب نہیں رہ گئی۔

حالی کی قوم پرور طبیعت نے سودیشی یا اپنے دیس کی بنی ہوئی چیزوں کے استعمال پر بھی زور دیا تھا۔ ان کے ایک قطعہ قوم کی پاسداری میں ایک مسلمان انگریزوں پر اعتراض کرتا ہے کہ انگریز اپنے دیس کی بنی ہوئی خراب سے خراب چیز بھی دوسرے ملک کی عمدہ سے عمدہ چیز کے مقابلے میں خریدتے ہیں۔ اس فعل پر مسلمان کو حیرت بھی ہے اور اعتراض بھی ؎

اک مسلمان خاص انگریزوں پر تھا یوں نکتہ چیں　　پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہو کس قدر
چاہتے ہیں نفع تا پہنچے اپنے اہل ملک کو　　گو کہ ان کے نفع میں ہیچ ایک عالم کا ضرر
کارخانہ کا یہ رائج کے کبھی چاقو نہ لیں　　اس کا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
تورنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انھیں　　ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر
الغرض اہل وطن کی پاسداری کو یہ لوگ　　جانتے ہیں دین و ایماں اپنا قصہ مختصر

حالی یہ سن کر کہتے ہیں کہ انگریز ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم (مسلمانوں کے علاوہ) اس عیب میں مبتلا ہے ؎

مکھیاں بھی نکل جاتے ہیں پاس قوم میں　　پیچھے اچھے رانستبازا درحق پسند اور داد گر

انگریزی حکومت کی آمدنی کا دوسرا بڑا ذریعہ ٹیکس تھا حکومت اپنی فضول خرچیوں کی کمی ٹیکس لگا کر وصول کرتی تھی اور اس رقم کو جس طرح چاہتی خرچ کرتی۔ ٹیکس کی وصولیابی کتنی بے رحمی کے ساتھ کی

جاتی تھی، اور کس طرح اس کو وقت کے اندر وصول کرنے میں سختیاں کی جاتی تھیں، حالی نے اس کو موثر انداز میں بیان کیا ہے ؎

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل   اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اٹھ کر کہ حضور   ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل

ٹیکس کی وصولیابی میں گورنمنٹ کی جو جابرانہ پالیسی رہتی تھی اس کو اجل کے ایک لفظ نے واضح کر دیا ہے۔

غلامی میں زندگی، پستی و انحطاط کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور دل مردہ ہو جاتے ہیں، بقولِ اقبال ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

یہی حال ہندوستانیوں کا ہو گیا تھا۔ حالی اس نکتہ کو سمجھتے تھے۔ انھیں ہندوستانیوں کی بے حسی و بے عملی، مردہ دلی اور افسردگی کا احساس تھا اور یہ احساس انھیں بے چین کئے رہتا تھا اس سلسلہ میں وہ اپنے جذبات و خیالات کو برابر ظاہر کرتے رہتے تھے۔ ان کی زندہ اور مردہ قوموں میں کیا فرق ہوتا ہے، انھیں کے الفاظ میں سنئے ؎

اقوام میں زندگی کی ہے روح جہاں   چونک اٹھتے ہیں اک اک وہاں پیر و جواں
کرتی نہیں وحی مردہ قوموں میں کام   جو کام اک کارٹون، کرتا ہے وہاں

سیاست پر مولانا حالی کے یہ خیالات انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول کے عام رجحانات کو دیکھتے ہوئے قابل قدر ہیں۔ ان سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے انھوں نے نظم میں ہی نہیں بلکہ نثر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ سودیشی تحریک کے حامی تھے اور اس سلسلہ میں انھوں نے منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کانپور کو صاف صاف لکھدیا تھا، وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے تھے، ان کے خطوط میں یہ رائے محفوظ ہے۔ وہ سیاست میں سچائی کو ضروری عنصر سمجھتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ (Honesty is the best policy) سچائی ہی سب سے بہتر سیاست ہے۔ اسی لئے وہ سیاسی حضرات کی دروغ آمیز مصلحت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے "پولیٹکل اسپیچیں" کا قطعہ انھیں خیالات کی غمازی کر رہا ہے۔ سیاسی مقرر کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن   کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہے
ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار   اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے
جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں   اور جنگ میں کچھ لطف سخن اس سے سوا ہے
دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات   گو نگا نہیں گویا نہیں کیا جانئے کیا ہے
گر سوچئے تو سیکڑوں پہلو ہیں مضر کے   اور سنئے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہے
تھے لب پئے اظہار پہ اب آ کے کھلا یہ   انسان کو اخفا کے لئے نطق ملا ہے

کون انکار کر سکتا ہے؟ یہ حالی کی سیاسی بصیرت تھی کہ انھوں نے ہندوستان کی سیاسی حالت پر رمز و حکایت کے انداز میں، اپنے خیالات کا اظہار زیادہ تر نظم میں کیا، وہ سیاسی آدمی نہ تھے اور نہ سیاست ان کا میدان تھا لیکن ان کی بہت سی باتیں سچی ثابت ہوئیں۔ اسی لئے امین زبیری نے لکھا ہے کہ

"حالی ہمارے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سیاسی وضع کی نئی شاعری اختیار کی ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان کی نئی شاعری میں، کہیں کہیں خود بخود "سیاسی رنگ" پیدا ہو گیا جس میں تجربہ و مشاہدہ دونوں شامل ہیں۔

✡

غزل

فدا ابن فیضی

نشاطِ حوصلۂ زندگی سے دور رہے
جنھیں ملا نہ ترا غم، خوشی سے دور رہے

اُس اک تبسمِ غم آفریں کی بات نہ پوچھ
جو گریہ بن نہ سکے اور ہنسی سے دور رہے

اسی کو کہتے ہیں معراجِ بے خودی شاید
ترے قریب رہے اور تجھی سے دور رہے

بنامِ عشوہ و ناز و ادا ملے ہیں تجھے
وہ حادثے جو مری زندگی سے دور رہے

شعورِ غم سے ہے عرفانِ زندگی کو فروغ
خدا کرے تری دنیا خوشی سے دور رہے

مرے جنوں کی طرح صاحبِ نظر ٹھہرے
خرد، اگر ہوسِ آگہی سے دور رہے

یہ اپنا اپنا مقدر ہے اپنا اپنا نصیب
کہ غم کسی سے مسرت کسی سے دور رہے

غزل

شاہ مہدی

یہ اک بہانہ مری زندگی کو کیا کم ہے
تری وفا پہ مجھے اعتبار پیہم ہے

چمن چمن ہے اسی گلبدن کی شادابی
ختن ختن وہی خوشبوئے زلفِ پُرخم ہے

کبھی جو ہجر میں سرخوش، تو وصل میں بھی اداس
نشاط و درد کی سرحد عجیب مبہم ہے

یہ تاب و صبر اگر ہے گریز پا تو کیا
کہ درد و ہجر کی مدت بھی مائلِ رم ہے

وہ چاند آج ہے خلوت میں میری جلوہ فگن
سوادِ شہرِ نگاراں میں روشنی کم ہے

رخصتی کے پنجابی لوک گیت

شاکر پُرشار تقی

لوک گیتوں کا ذکر آتے ہی ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گیت کس نے لکھے۔ کیا ان گیتوں کا خالق کوئی ایک فرد تھا یا خود عوام ان کے خلاق ہیں اور بعد میں تربیت دینے والوں نے انہیں اپنے نام سے منسوب کرلیا۔ واقعات کچھ بھی ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاعر سے پہلے شاعری کے محرکات وجود میں آئے۔ اسی طرح جس طرح موسیقار سے پہلے موسیقی کی صلاحیتیں اور گیت کے تقاضے کائنات میں موجود تھے۔ لوک گیتوں کے متعلق زیادہ اہم بات یہ نہیں کہ ان کے لکھنے والوں کی تلاش کی جائے بلکہ ان گیتوں کے مرکزی محرکات اور اثر آفرینیوں کی تحقیق لازم ہے۔ آخر ان گیتوں کی خصوصیات کیا ہیں جن کی بدولت وہ زندہ رہنے اور آج بھی ان میں پروان چڑھنے کی تمام صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

لوک گیت کی اہم ترین خصوصیت اس کا طرز بیان ہے۔ جو کچھ بھی کہا جاتا ہے اس میں سادگی اور سچائی ہوتی ہے اور ماحول کی صحیح عکاسی! بیان کی سادگی اور ترنم کی حلاوت میں جذبات و احساسات کی رونمائی ہوتی ہے۔ نہایت سادہ اور دلکش جذبات کے حسین دھارے میں، اپنی متعین راہ پر، ترنم کے مدوجزر میں یہ کشتی رواں ہوتی ہے۔

لوک گیتوں کی دوسری اہم خصوصیت آہنگ اور ترنم ہے۔ اس کی وجہ سے ان میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔ اگر ان میں ترنم اور موسیقی کا یہ جذب و اثر نہ ہوتا تو بیش بہا سرمایہ، جسے ہم لوک گیت کہتے ہیں، آج ہم تک نہ پہنچتا۔ ان گیتوں کی بقا اور ان کے تحفظ کی ذمہ دار زیادہ تر عورتیں ہیں، جنہوں نے ان گیتوں کو اپنے دل میں جگہ دی۔ گیتوں میں چونکہ موسیقی تھی، جذب و اثر تھا، اس لئے یہ بآسانی یاد ہوتے گئے۔ روکھے۔ پھیکے، بے ربط الفاظ بھی جب موسیقی کا رنگین لباس پہن لیتے ہیں تو قلب و دماغ میں ایک مدت تک محفوظ رہتے ہیں۔ نثر میں یہ بات نہیں اس لئے نثر سے زیادہ نظم میں اثر آفرینی ہے۔

پنجاب کے لوک گیتوں میں بھی پنجاب کا ماحول، اس کی معاشرت اور یہاں کی زندگی پوری طرح جھلکتی ہے۔ امیروں کے محلوں کے ساتھ ساتھ یہ گیت غریبوں کے جھونپڑوں میں بھی گائے جاتے ہیں، جہاں چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں۔ یہ گیت ہر موقع پر اور ہر ماحول میں گائے جاتے ہیں۔ شہر شہر گاؤں گاؤں ادھر سرسوں پھولی، کھیت لہلہائے، ندی نالوں کا زور بڑھا، جوانی گنگنائی، دل مچلا اور نغموں کے سوتے پھوٹ پڑے۔

ذیل کی سطور میں دلہن کی رخصتی کے وقت گائے جانے والے کچھ پنجابی لوک گیتوں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

شادی بیاہ کے موقع پر دلہن اور اس کے خاندان والے بچے جوان، بوڑھے عورت اور مرد بھی خوش ہوتے ہیں۔ مگر یہ مسرت اپنے پہلو میں غم کو بھی چھپائے ہوتی ہے۔ آنے والے کل کی تمام

"حتیٰ کہ رنگینیاں اور گلفتیں اس طرح سامنے آجاتی ہیں کہ جی ہول کھانے لگتا ہے۔ اپنا دولھا۔ اپنا گھر۔ ارمانوں بھری زندگی۔ من بھایا سنسار۔ دور دیس۔ پرایا گھر۔ اجنبی لوگ۔ کیا تیتے گی کیوں کر کٹے گی ۔۔ چاہ اور نباہ کے ان گنت پہلو یکے بعد دیگرے مسلسل اور متواتر آنکھوں میں ناچتے ہیں۔ اُس وقت دلھن اپنے منھ سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی لیکن اس کی سہیلیاں ڈھولک پر اس کے جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔

نی ماں میری پڑی اے پرڈٹ
نی وچہ گڈیاں دا جوٹ۔
نی ماں میرا کون لیاوے۔
میرا ویر انجانا۔
تیری پڑی اے پرڈٹ
نی وچہ گڈیاں دا جوٹ
تیرا ویر انجانا
نال نائی رے سیانا
تیرا ویر لیاوے
تیریاں گڈیاں دا جوٹ

(اری ماں! میری پٹاری میں ایک چھوٹی پٹاری ہے جس میں میری گڑیوں کا جوڑا ہے۔ میرا بھیّا! تو ابھی ننھا۔ نادان ہے۔ تو مجھے سسرال بھیج رہی ہے۔ میری گڑیاں کون لائے گا۔ مطلب یہ کہ میں تو ابھی گڑیوں سے کھیلنے کے لائق ہوں، تو مجھے ابھی سے کیوں بیاہ رہی ہے؟ ماں کہتی ہے۔ تیرا بھیّا انجان ہے تو کیا ہوا؟ اس کے ساتھ سیانا اور تجربہ کار نائی بھی تو ہوگا۔ بھیّا! تیری گڑیاں لے آئے گا۔ تو تسلی رکھ۔ اپنے گھر جا۔)

ماں کی تسلی کارگر ہوتی ہے۔ اس لئے مائیوں۔ مہندی ہی سے ایسے گیت گائے جانے لگتے ہیں جو دلہن کو رخصتی کے لئے اس طرح تیار کرتے ہیں کہ جس کے لئے ایک دم میکہ چھوڑنے کا غم ہلکا ہو جائے:

نیٹے، گھول پیار دے گھول نی۔
میری سفنیاں دی مہندی۔
میننوں لاؤ اڈول اڈول نی۔
میرے سفنیاں دی مہندی
نی ساہوریاں گھر جاؤنا۔
مڑ کدی کدی پھیرا پاؤنا
دھیاں رہن نہ باپیاں کول نی

یہ گیت کسی سکھی سہیلی کی زبان سے لڑکی کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ وہ نائن سے التجا کر رہی ہے کہ پیار اور چاؤ سے مہندی گھول اس مہندی سے میرے (مستقبل کے سنہری خواب) وابستہ ہیں۔ مجھے سسرال جانا ہے۔ اس کے بعد تو کبھی کبھار ہی میکے میں آنا ہوگا۔ بیٹیاں ہمیشہ کے لئے اپنے ماں باپ کے یہاں نہیں رہ سکتیں۔

گیتوں کی ایک صنف سہاگ گیت کہلاتی ہے۔ اسی ذیل میں ڈولی کے گیت بابل کہلاتے ہیں۔ سہاگ گیتوں میں کئی کئی بند ہوتے ہیں اور ان میں رشتے ناتے کی رعایت سے ماں۔ باپ۔ بھائی بہنوں چچا اور ماموں سبھی کا ذکر ہوتا ہے۔ ان کی الفت اور پیار کا تذکرہ ہوتا ہے۔ سکھی سہیلیوں کا ذکر ہوتا ہے جو بچپن کی یاد بن کر ہمیشہ کے لئے ساتھ رہیں گی۔

یوں تو اسی دن سے رخصتی کے گیت سامنے آنے لگتے ہیں جب بیاہ شروع ہوتا ہے۔ اور ڈھولک کی گمک روڑے کی سنگت کو اپناتی ہے۔ مگر ان میں ایک سوچی سمجھی تدریج کار فرما ہے۔ پہلے مہندی کے تذکرے تھے، اب مہندی رچنے کی ساعت ہے:۔

مہندی لاڈو دے ہتھ دھرا مبڑیئے
لاڈو ہو گئی پرائی
ہو گئی پرائی وے بابلا۔ لاڈو ہو گئی پرائی
بھاتوں دیئے جوڑے گھوڑیاں۔ بھاتوں دیئے کنگناں
دھیاں اپنے گھر دی آس نی۔ لاڈو ہو گئی پرائی
بھاتویں چاڑھ پنگوڑے رکھئے۔ بھاویں رلج کھلیئے
دھیاں انتک نوں گھر جانا۔ لاڈو ہو گئی پرائی
ہو گئی پرائی وے بابلا۔ لاڈو ہو گئی پرائی
رل آئیاں بھیھیاں تے مامیاں۔ تائے چاچیاں تائیاں

نالے آئیاں سنگ سہیلیاں ۔ نالے ماں پیو جائیاں
مہندی لاڈو دے ہتھ دھرا مٹرپئے
لاڈو ہوگئی پرائی

پہلے مہندی کے ارمان تھے ۔ کہا جا رہا تھا ۔ اے نائن مہندی کو پیار کے رنگوں کی طرح گھول' یہ میرے شگنوں کی مہندی ہے ۔ اور اب ماں سے یہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ" اری ماں ! اپنی بیٹی لاڈو کی ہتھیلی پر مہندی رکھ دو ۔ یہ تو پرائی ہوگئی ہے ۔ (اور یہ اس لئے کہ رسم کے مطابق سب سے پہلے ماں اپنی بیٹی کی ہتھیلی پر مہندی کی ٹکلی رکھتی ہے تو وہ عملاً اقرار کر لیتی ہے کہ اب بیٹی پر اس کا کوئی حق نہیں رہا) بول چل رہے ہیں ۔" ہم نے تو ارمانوں سے کاج رچایا ہے ۔ لاڈو پرائی ہوگئی ہے ۔ ماں باپ چاہے گھوڑے اور جوڑے دیں ۔ لاکھوں کا سازوسامان دے دیں' پھر بھی بیٹی کو اپنے گھر ہی کی آس ہوتی ہے ۔ ماں باپ کے وان بہنر کی حیثیت وقتی ہے ۔ عمر کے نباہ کے لئے تو خاوند کی ہی کمائی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔ پھوپھیاں اور موسیاں مل کر آ گئی ہیں ۔ چچیاں اور تائیاں بھی ۔ ان کے ساتھ سہیلیاں اور بہنیں بھی ہیں ۔" اری ماں لاڈو کی ہتھیلی پر مہندی رکھ دے ۔ یہ تو پرائی ہوگئی ہے' اے بابل ! لاڈو پرائی ہوگئی ہے ۔"

جس گھر میں اس نے آنکھ کھولی ۔ ماں کی آغوش میں بچپن گزارا باپ کی شفقت نے جسے پالا پوسا ۔ اور بھائیوں کے پیار نے جسے مسرتوں کے خزانے بخشے ۔۔ اب واقعی اسے ان سب کو چھوڑنا ہوگا ۔ اسے بھائیوں پر رشک آتا ہے ۔ آخر ایشور نے اسے لڑکی بنایا ہی کیوں ؟

منڈے اپنی تھائیں رہندے
دھیاں کیوں بنائیاں رب نے ۔

بیٹی بن کر بھی اسے کون سا سکھ ملا ۔ کون سی نعمت میسر ہوئی ۔ وہ اپنے باپ سے اپنی بے بسی کا شکوہ کرتی ہے :

ویراں نوں دتڑے محل دو محلے ۔
دھیاں نوں دتا پردیس ۔ وے سن بابل مورے ۔

(میرے بابل ! تو نے بیٹوں کے رہنے کو تو محل بنا دیئے اور میرے حصہ میں آیا بھی تو پردیس)

جس گھر کو وہ آج تک بناتی سنوارتی چلی آئی ہے ، جس کے طاقوں پر ابھی اس کی گڑیاں رکھی ہیں' اب وہ اس کا نہیں ! اس کا مستقل گھر تو سسرال ہے ؟ یہاں تو وہ محض ان چڑیوں کی مانند ہے جو دم بھر کے لئے اکٹھی ہوتی ہیں اور پھر جدا ہو کر اپنے اپنے گھونسلوں میں چلی جاتی ہیں ۔ یہ مغموم احساسات ذیل کے گیت میں عیاں ہوتے ہیں :-

ساڈا چڑیاں دا چنبہ وے ۔۔۔ بابل اسیں اڈ جانا
ساڈی لمی اڈاری وے ۔۔۔ بابل کیہڑے دیس جانا
میریاں آلے گڈیاں وے ۔۔۔ بابل کون کھیڈو ؟
"میریاں کھیڈن پوتریاں ۔۔۔ دھیئے گھر جا آپنے"
میرا چھٹیا کیدا وے ۔۔۔ بابل کون کڈھے ؟
"میریاں کڈھن پوتریاں ۔۔۔ دھیئے گھر جا آپنے"
"تیرے محلاں وِچے دروچ نے ۔۔۔ بابل میرا ڈولا اڑیا"
"دو اِٹاں پٹا دیاں گا ۔۔۔ دھیئے گھر جا آپنے"

میرے بابل' ہماری حیثیت تو چڑیوں کے جھنڈ کی سی ہے ۔ ہم تو اڑ جائیں گے ۔
ہماری اڑان بہت لمبی ہے : نہ جانے ہمیں کون سے دیس جانا ہوگا ۔
میرے بابل ! تیرے محلوں کے طاق پر میری گڑیاں رکھی ہیں ان سے کون کھیلے گا ؟
میری پوتیاں ان سے کھیلیں گی ۔ بیٹی ! تم اپنے گھر جاؤ ؛
میرے بابل ! میرا کشیدہ ادھورا رہ گیا ہے ۔ اسے کون پورا کرے گا ؟
میری پوتیاں کشیدہ کاڑھیں گی ۔ بیٹی ! تم اپنے گھر جاؤ ۔
بابل ! ترے محلوں سے نکلتے وقت میری ڈولی اٹک جائیگی ۔
میں محل کی دو اینٹیں نکلوا دوں گا ۔ بیٹی ! تم اپنے گھر جاؤ ۔۔

بیسیوں بہانوں اور جذباتی دلائل سے بھرا یہ گیت الہڑ دوشیزاؤں کے ہونٹوں پر بکھر کر سارے ماحول کو مغموم بنا دیتا ہے ! کاش وہ سبھی سہیلیاں ہمیشہ اکٹھی رہ سکتیں ۔ مگر زمانہ کا دستور ہے ۔

جیویں جت پانی وچ لگھ جاندا۔ پھیر نہ لگھدا بھلکے
بیڑی دا پور ترنجن دیاں کڑیاں۔ فیر نہ بیٹھن رل کے۔
(جس گھاٹ سے پانی آج گزر گیا۔ کل وہ اس گھاٹ سے نہیں
گزرتا۔ کشتی کے سوار اور ترنجن کی سہیلیاں دوبارہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں)

انھیں مغموم و مسرور گیتوں کے ماحول میں۔ کنیا دان کا وقت
آتا ہے۔ بیٹی کا باپ ــــ اپنی عزت اور غیرت کو، جسے وہ آج تک چشم
فلک سے بھی چھپاتا رہا، آج نہایت انکساری کے ساتھ غیروں
کے سپرد کر رہا ہے۔ کنیا دان کرتے وقت وہ ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔
اور مقدس آگ کے گرد جو عورتیں جمع ہیں یہ گیت گاتی ہیں :۔

بیٹی دا ماں پیو جھک گیا — ہور نیاں نہ کوئی
نیوں گیا پربت پہاڑاں دا — ہور نماں نہ کوئی
بی بی دا بابل ایوں روے — جیوں گھٹ ساون دی آئی
توں کیوں روویں بابلا — جگ ہنوڑی آئی
تسیں کیوں روؤ ماپیو — جگ ہنوڑی آئی۔

(بیٹی کے ماں باپ جھک گئے ہیں، اور کسی نے سر تسلیم خم نہیں کیا۔
پہاڑوں میں اونچا پربت (اونچی شان والا) جھک گیا۔ بیٹی کا باپ
اس طرح رو رہا ہے گویا ساون کی گھٹا امنڈ آئی ہے۔ میرے بابل
تم کیوں رو رہے ہو؟ ہمیشہ سے ہی ایسا ہوتا آیا ہے! میرے ماں
باپ آخر کیوں رو رہے ہیں؟ یہ تو زمانہ کا دستور ہے!")

آخر رخصت کی ساعت آتی ہے۔ اور دولہن کے ساتھ ساتھ
سب کے نین بھر آتے ہیں۔ اجتماع ضدین کے جو لوگ قائل نہیں
وہ اس وقت دلہن کے عزیزوں اور والدین کو دیکھیں کہ انھیں ایک
ساتھ کتنی خوشی اور کتنا غم ہے۔ ہنسی کے ساتھ آنسو بھی نکل رہے
ہیں۔ خوشی اور غم کے آنسو۔ اور ہر طرف مبارکباد کا غوغا بھی ہے!
جسے اتنی امنگوں سے پالا پوسا۔ جوان کیا۔ وہ آج ان
سے رخصت ہو کر ایک اجنبی کے حکم و اختیار میں جا رہی ہے۔ اب
بیٹی پر ان کا کوئی حق نہیں رہا۔

ہن کی دھوئی بابل تیرا
دھوئی کر وامنڈے واجائیا

پچرا کھلوتا ڈولی دئیاں باہیاں

ہن کی دھوئی دے ویرا تیرا
دھوئی کر وامنڈے دا ویرا
پچرا کھلوتا ڈولی دئیاں باہیاں

میرے بابل، اب مجھ پر تمہارا کوئی اختیار نہیں۔ دولھا کا باپ
اپنا اختیار جما چکا ہے۔ دیکھو! وہ میری پالکی تھامے کھڑا ہے۔ میرے
اچھے بھیا! اب مجھ پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ دولھا کا بھائی اپنا اختیار
جما چکا ہے۔ اور وہ میری پالکی تھامے کھڑا ہے۔

ڈولی اٹھنے کا وقت آتا ہے تو گیتوں کے بول اور بھی دردناک
ہو اٹھتے ہیں :۔

گلیاں تاں ہوئیاں بابل بھیڑیاں۔ میںوں آنگن ہویا پردیس
سانبھ۔ سانبھ گھر اپنا بابل — میں چلی پردیس!
وے سن بابل مورے
ماں روندی دی کرتی بھج گئی — باپ رووے دریاؤ
ویر رووے سارا جگ رووے ۔ میری بھابیاں دے من چاؤ
دے سن بابل مورے
باپ دیاں دا راجہ چھڈیا۔ — ماں محلاں دی رانی!
پٹیاں لکھے ویر چھڈے — چھڈ دتا گھر بار!
دے سن بابل مورے

تیرے شہر کے گلی کوچے میرے لئے تنگ ہو چکے ہیں بابل!
تیرا آنگن میرے لئے پردیس ہو گیا ہے! بابل! اپنا گھر بار سنبھال رکھو!
میں پردیس جا رہی ہوں۔ روتے روتے ماں کی کرتی بھیگ گئی ہے،
باپ آنسوؤں کے دریا بہا رہا ہے۔ میرے بھائی کے ساتھ سارا جہان
رو رہا ہے۔ مگر میری بھابیاں دل میں خوش ہیں۔ گاؤں کے راجہ
باپ کو چھوڑ چلی، اور محلوں کی رانی اپنی ماں کو بھی چھوڑے جا رہی ہوں۔
امیر کبیر بھائیوں سے ناتا توڑے جا رہی ہوں، ـــ میرے بابل
میں نے سب گھر بار چھوڑ دیا ہے۔

درد بھری لے میں یہ گیت، روتی ہوئی دلہن، عزیزوں سے اس

(بقیہ صفحہ ۸۴ پر)

رُباعیات

اختر رضوانی

اشکوں کو فروزاں بھی کیا ہے ہم نے   ہر درد کا درماں بھی کیا ہے ہم نے
ذرّوں کو ستاروں کی ضیا بخشی ہے   طوفاں میں چراغاں بھی کیا ہے ہم نے

منہ پھیر دیا کرتے ہیں تقدیروں کا   خوف ان کو نہ تیغوں کا نہ شمشیروں کا
سر ہے سوئے افلاک قدم کانٹوں پر   اک یہ بھی ہے انداز جہانگیروں کا

احوالِ غمِ واقعی کہہ جائیں گے   ہر حسرت رہِ شوق میں بہہ جائیں گے
پانی ہو کہ ہوں چند لہو کی بوندیں   آنسو ہیں کسی رنگ میں بہہ جائیں گے

کیا لے گا کوئی سوختہ سامانوں سے   حاصل نہیں کچھ چاک گریبانوں سے
جب عشق کی غیرت پہ کبھی حرف آیا   ہم کھیل گئے آگ کے طوفانوں سے

گر جائے تو ہستی کا سہارا ہوگا   اشک دل و جان سے پیارا ہوگا
بے رنگ رہے گا جو رہا پلکوں پر   جب آنکھ سے ٹپکے گا ستارا ہوگا

ہونٹوں پہ پجارن کے نہ سرگم ہے نہ راگ   کٹیا میں بھکارن کی نہ دیپک ہے نہ آگ
برہن کا تو سنسار رہے سُونا سُونا   جس طرح کہ لٹ جائے اُبھاگن کا سہاگ

اتر پردیش میں آزادی کا بارھواں سال

ہمہ جہت ترقی اور تعمیراتی سرگرمیاں

اتر پردیش میں آزادی کے بعد سے جو تعمیری سرگرمیاں شروع ہوئی ہیں ان کی رفتار ہر آنے والے سال میں تیز تر ہی ہوتی رہی ہے چنانچہ آزادی کا بارھواں سال اس اعتبار سے ایک نمایاں سال رہا ہے۔ غذا اور رسد کا مسئلہ ہو یا صنعتی ترقی کا کام، پلوں، سڑکوں، نہروں اور باندھوں کی تعمیر ہو یا سماجی تبدیلیوں کی مہم غرض ہر اعتبار سے یہ کامیاب کوششوں اور سرگرمیوں کا سال کہا جا سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صنعتی ترقی کی جو جدوجہد اس سال ہوئی ہے اتنی آزادی کے بعد سے اب تک کسی سال نہیں ہوئی۔ ذیل میں ان تعمیراتی اور ترقیاتی سرگرمیوں کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے جو آزادی کے بارھویں سال میں کی گئی ہیں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ اتر پردیش کتنی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

کسانوں کا سال

اتر پردیش میں آزادی کا بارھواں سال دراصل کسانوں کا سال تھا۔ زیر نظر سال کی نمایاں کارگزاریوں میں جوت کی حد کا تعین۔ ربیع اور خریف کی مہموں کے ذریعہ زراعتی پیداوار میں اضافہ۔ ترقیاتی مشینری کی لامرکزیت۔ زمین کی بازیابی۔ پرانے قرضوں کی ادائیگی اور بہتر قسم کے آلات کی خریداری کے واسطے طویل مدت کے قرضوں کی فراہمی کے لئے ریاستی آراضی رہن بینک کا قیام۔ ترائی اسٹیٹ فارم میں زراعتی یونیورسٹی کی اسکیموں کو قطعی بنانا۔ متھرا ویٹرنری کالج کا درجہ بلند کرنا اور بازپور ضلع نینی تال میں شکر کے پہلے امداد باہمی کارخانہ کا قیام شامل ہیں۔

ریاستی حکومت سیلاب اور ناوقت بارش کے قدرتی آفات اور مغربی اضلاع میں پانی جمع ہو جانے کے باوجود ریاست بھر میں غذائی صورت حال پر قابو رکھنے میں کامیاب ہوئی۔ اناج کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کی روک تھام کے لئے شہری اور دیہی علاقوں میں سستے اناج کی دکانوں کا جال بچھا دیا گیا اور غلہ کی سرکاری تجارت کی اسکیم شروع کی گئی جس کے تحت اب تک ۶۰۸۲۹ ٹن چاول اور ۲۲۷۷۱۱ ٹن گیہوں خریدا جا چکا ہے۔ آئندہ دو برسوں میں مزید ۲۴ لاکھ ٹن اناج پیدا کرنے کے مقررہ نشانہ کی تکمیل کے لئے پوری پوری کوشش کی گئی۔

ریاست میں آبپاشی کی مختلف اسکیموں کے ذریعہ مزید ۶،۴۱ لاکھ ایکڑ زمین کو آبپاشی کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ زیر نظر سال میں ۴۰ لاکھ من سے زیادہ بہتر بیج تقسیم کئے گئے۔ بہتر بیجوں کی پیداوار میں اضافہ اور اس کی تقسیم کے لئے بیجوں کے فارم کے ۴۰۶ واحدے اور ۵۹۷ بیج گودام کھولے گئے۔ زیر نظر سال میں ۳۴۳،۱ لاکھ ٹن کیمیاوی کھاد تقسیم کی گئی۔ ہری کھاد کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے قومی توسیعی بلاکوں میں کھاد کے مقامی وسائل کو بہتر طور پر بروئے کار لانے کے لئے ایک اسکیم شروع کی گئی۔ اس اسکیم کے تحت ویلیج لیڈروں کو کھاد کے مقامی وسائل کو پورے طور پر بروئے کار لانے کی تربیت دی گئی۔

ریاست میں بہت بڑے پیمانہ پر خریف مہم شروع کی گئی۔ یہ مہم حد درجہ کامیاب ہوئی اور اس کے نتیجہ میں ۶،۵۰ لاکھ ایکڑ زمین میں جاپانی

طریقہ سے دھان کی کاشت ہوئی اور ۴۵ء۹ لاکھ ایکڑ میں قطاروں میں بوائی ہوئی اور ۴۳۳۳۹ ایکڑ کے رقبہ میں مینڈھ بندی ہوئی۔ نضا کارانہ صنعت کے ذریعہ ۴،۷۹ میل لمبی گولوں کی تعمیر ہوئی۔ اسکے علاوہ ۵۲۰۵۰ ایکڑ سے زیادہ رقبہ کی دھان کی فصل کو گندھی سے محفوظ کرنے کے اقدامات کئے گئے۔

خریف مہم کی حوصلہ افزا کامیابی کے پیش نظر ربیع مہم شروع کی گئی جس کے تحت اتر پردیش کے طریقہ سے گیہوں کی کاشت، جو اور دوسری فصلوں کی ٹاپ ڈریسنگ۔ ربیع کے بیجوں کے سلسلہ میں ریاست کو خودکفیل بنانے۔ کھاد کے موجودہ وسائل کو پورے طور پر بروئے کار لانے اور آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں کی ہمت افزائی پر زور دیا گیا۔

اتر پردیش میں اب تک ۴۶۰۲۲ ایکڑ سے زیادہ رقبہ میں نئے باغات لگائے جا چکے ہیں اور ۲۱۹۲۹ ایکڑ کے رقبہ میں پرانے باغات کی تجدید کی گئی۔ ترکاریوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے ابتک ۹۱۸۹ پونڈ ترکاری کے بہتر بیج تقسیم کئے جا چکے ہیں۔

شکر کی پیداوار۔ ریاست کے موجودہ ۲۲ شکر کے کارخانوں کی پیرائی کی صلاحیت بڑھانے کے لئے لائسنس جاری کئے گئے۔ باغپت ضلع میرٹھ میں شکر کے دوسرے امداد باہمی کارخانہ کی تعمیر قریب بہ تکمیل ہے۔ زیر نظر سال میں ۳۵ء۳۰ کرور من گنے کی پیرائی ہوئی جس سے ۱۰ء۱۸ لاکھ ٹن شکر تیار ہوئی۔ دوسرے منصوبہ کے تحت گنے کی ترقی کی اسکیموں کے لئے نظرثانی کے بعد ۵۸ء۴ ۳۶۴ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی۔

اس سال مئی کے شروع میں شکر کی قیمتیں بڑھنے لگیں۔ ریاستی حکومت نے صارفین کو فوری امداد بہم پہنچانے کے لئے مرکزی حکومت سے رجوع کیا اور ۵۰۰ء۳ ٹن شکر کا عارضی کوٹہ حاصل کیا گیا اور ریاست کے ۸ اہم شہروں یعنی لکھنؤ۔ الہ آباد۔ کانپور۔ آگرہ۔ وارانسی۔ میرٹھ بریلی اور سہارنپور میں کم آمدنی والے اشخاص کو فروخت کی گئی۔

ریاستی حکومت نے موجودہ جوت کی حد متعین کرکے ایک انقلابی اقدام کیا۔ اس سلسلہ میں حکومت ریاستی مجالس قانون ساز کے مانسون سیشن میں ایک بل پیش کرے گی۔

زیر نظر سال میں چک بندی اسکیم مزید ۵ تحصیلوں میں شروع کی گئی جس سے مزید ۸۶۶ مواضعات اس کے دائرہ اثر میں آگئے۔ اب تک ۷۶۶۶ مواضعات میں چک بندی ہو چکی ہے۔

ناگپور کانگریس کی قرارداد کی روشنی میں چک بندی کو جاری رکھنے کے متعلق از سر نو غور و خوض کیا گیا۔ ریاستی حکومت نے بالآخر اس اسکیم کو بدستور جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور مالی سال رواں میں یہ اسکیم مزید نو اضلاع میں شروع کی گئی۔

اجتماعی ترقیاتی بلاک۔ اتر پردیش میں گذشتہ سال ۳۰۷ اجتماعی ترقیاتی بلاکوں کا افتتاح ہوا جو مرکزی حکومت نے ریاستی حکومت کو الاٹ کئے تھے۔ اس سلسلہ میں زیر نظر سال میں کل ۵۸ء۱۱۲ لاکھ روپیہ صرف ہونے کی امید ہے۔ دوسرے منصوبہ کے بقیہ دو برسوں کی مدت میں مرکزی حکومت نے ریاست میں ۱۳۰ بلاکوں کے قیام کے لئے منظوری دی ہے۔

گوند سہائے کمیٹی نے زیر نظر سال میں اجتماعی ترقیاتی پروگرام میں عوام کی شرکت کے تخمینہ کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کمیٹی کی خاص سفارشات یہ کہ عوام اور عملہ کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کی جائے۔ اور دیہی ترقیاتی اسکیموں پر عملدرآمد کے سلسلہ میں گاؤں سبھاؤں کو زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔

امداد باہمی۔ زیادہ سے زیادہ قلیل المدتی، درمیانہ اور طویل المدتی زرعی قرضوں کی فراہمی کے پیش نظر امداد باہمی قرضوں کے ڈھانچہ میں توسیع کی گئی۔ چنانچہ دیہی امداد باہمی انجمنوں کے ممبروں کو دیئے گئے قرضہ کی رقم جو دوسرے منصوبہ کے شروع میں ۴ کرور روپیہ تھی اس سال مارچ کے اخیر تک بڑھ کر تقریباً ۱۳ کرور روپیہ ہو گئی۔ دیہی امداد باہمی انجمنوں کے ممبروں کی تعداد بھی بڑھ کر تقریباً ۲۸ لاکھ ہو گئی۔ ابتدائی امداد باہمی انجمنوں کا سرمایہ حصص اور زر امانت میں بالترتیب ۲۶۳ لاکھ روپیہ اور ۵۷۰۶۸ لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا۔ دوسرے منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں مرکزی بینکوں کے سرمایہ حصص میں ۱۹۳۲۹ روپیہ کا اضافہ ہوا۔

ریاستی حکومت نے ابتدائی قرضہ انجمنوں۔ مرکزی بینکوں اور مرکزی آراضی رہن بینک کے ۱۹۲ لاکھ روپیہ کے حصے خریدے۔

کل ہند دیہی قرضہ جائزہ رپورٹ کی سفارشوں کے مطابق ایک

امداد باہمی امدادی اور ضمانت فنڈ قائم کیا گیا جس سے قرضوں کی وصولی میں ہونے والے ناگہانی خسارہ کو پورا کیا جاتا ہے۔ ریاستی حکومت نے اس فنڈ میں ۵۷ء۹ لاکھ روپیہ جمع کیا۔

کسانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لئے پروسینگ سوسائٹیوں میں امداد باہمی طریقہ کو اپنایا گیا۔ ریاست میں اس وقت ۱۶ پروسینگ واحدے قائم ہیں۔

اترپردیش میں منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں ۱۱۰ امداد باہمی کاشت سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔

امداد باہمی انجمنوں کو سرمایہ کی فراہمی اور عام ترقی کے لئے یکساں پالیسی بنانے کے پیش نظر یہ طے کیا گیا کہ اترپردیش میں تمام امداد باہمی انجمنوں کے لئے ایک رجسٹرار ہوگا۔

ریاستی حکومت نے مرکزی حکومت کی اس سفارش کو منظور کیا کہ ہر دیہی انجمن کو ۵ سال تک ۹۰۰ روپیہ فی انجمن کے حساب سے امداد دی جائے۔ اس سلسلہ میں جو رقم خرچ ہوگی اس کا نصف مرکزی حکومت ادا کرے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ ۵ سال کے بعد ہر خدمتی انجمن اپنے اخراجات خود برداشت کرسکے گی اور سرکاری امداد کی ضرورت نہ رہیگی۔

پنچایتیں۔ پنچایتوں کے ڈھانچہ میں دور رس تبدیلیاں کی گئیں۔ گاؤں سبھاؤں کو اب یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسے اشخاص کے جو قدرتی آفات کا شکار ہوئے ہیں نیز دوسرے غریب اشخاص کے ذمہ باقی ٹیکس کو حاکم مجاز کی منظوری سے کم یا معاف کرسکیں۔ گاؤں سبھاؤں نے زیر نظر سال میں ۱۹۰ء۸ لاکھ روپیہ کی بقایا رقم معاف کی۔ نیائے پنچایتوں کو ۵۰۰ روپیہ کی مالیت کے دیوانی مقدمات کی سماعت کا اختیار دیا گیا۔ پنچایتوں نے اناج کی پیداوار بڑھانے کے سلسلہ میں مفید خدمات انجام دیں۔

دیہی علاقوں میں خریف اور ربیع مہم کو مقبول بنانے کے لئے گاؤں سبھاؤں نے ۲۰۶۲۴ جلسے کئے۔ اور ہر ایک گاؤں سبھا میں زراعتی پلان مرتب کرنے کے لئے ایک کرشی کمیتی (زراعتی کمیٹی) قائم کی گئی۔

دیہی عوام کو زیادہ سے زیادہ شہری آسائشیں مہیا کرنے کے لئے پنچایتوں نے زیر نظر سال میں ۸۶۶ پکے اور ۴۲۰ پکے کنوئیں تعمیر کرائے

لکھاؤ ۱۰۱

اس کے علاوہ دیہی عوام کو علاج معالجہ اور صفائی کی زیادہ اور بہتر سہولتیں مہیا کی گئیں۔

صنعتی ترقی

ریاستی حکومت صنعتی ترقی کے میدان میں تیزی سے گامزن ہے۔ آزادی کے بارھویں سال میں جتنی جدوجہد اس سلسلہ میں کی گئی اتنی شاید کسی اور سال نہیں کی گئی تھی۔

ریاست میں صنعتی ترقی کے امکانات کا جائزہ لینے کے لئے اترپردیش کے لوک سبھا کے ممبروں کا ایک کنونشن وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند کی صدارت میں منعقد کیا گیا جس میں اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ اترپردیش کی قدرتی دولت کو مناسب طور پر کام میں لانے کے لئے یہاں انسانی اور خام مال نیز بجلی کے کافی وسائل دستیاب ہیں۔

ریاست کے مختلف صنعتی پروگراموں کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنانے کے لئے نظامت صنعت کی تنظیم نو پہلی بار کی گئی۔ نجی صنعت کاروں کو سوڈا ایش، دفتی کاغذ، شیشہ کے رنگین برتن، چھوٹے بلب، ٹرانسفارمر وغیرہ بنانے کے لئے لائسنس جاری کئے گئے۔

صنعت کاری کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے ایک اہم اقدام یہ کیا گیا کہ صنعتوں میں استعمال ہونے والی بجلی پر سے ڈیوٹی بالکل ختم کردی گئی تاکہ صنعتی سامان کی قیمت کم ہوجائے۔ اس رعایت سے تقریباً ۲۸ زمروں کی صنعتیں مستفید ہوئیں۔

مرکزی حکومت نے ایک امریکن فرم کے اشتراک سے پبلک سیکٹر میں ۴۰ کروڑ روپیہ کی لاگت سے کیمیاوی ربر کی ایک فیکٹری بریلی میں قائم کرنے کا قطعی فیصلہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ریہاند بند کے قریب پیپری میں الومنیم کی ایک بہت بڑی فیکٹری کے قیام کے بارے میں ریاستی حکومت اور برلا کے مابین معاہدہ ہوگیا ہے۔ مزید براں ۳ ½ کروڑ کی لاگت کی بجلی گھر۔ ریہاند میں حال ہی میں کام شروع ہوگیا ہے۔

ساہو جین کیمیکلز نے وارانسی میں جو سوڈا ایش فیکٹری قائم کی ہے اس میں چالیس ہزار ٹن سوڈا ایش اور اتنی ہی مقدار میں امونیم کلورائڈ سالانہ تیار ہوسکے گی۔ بازپور میں پہلی امداد باہمی شکر مل کے قیام سے جس کا افتتاح اسی سال کے شروع میں کیا گیا ہے امداد باہمی بنیاد پر

بڑی صنعتوں کے قیام کی راہ کھل گئی ہے۔ لکھنؤ میں ہندوستان اور امریکہ کی مشترکہ کوششوں سے ۸۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے جو ٹارچ فیکٹری قائم کی گئی ہے اس میں سالانہ ۶۰ لاکھ ٹارچیں تیار کی جائیں گی۔

گورنمنٹ پریسیزن انسٹرومنٹس فیکٹری لکھنؤ میں صنعتی ہیرے بھی تیار ہونے لگے ہیں۔ ناپنے کے بجلی کے آلات، واٹر میٹر اور گھڑیوں کے لئے ان ہیروں کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ گورنمنٹ چرک سیمنٹ فیکٹری کی پیداواری صلاحیت کو دوگنا کرنے کے لئے چیکوسلواکیہ کی ایک فرم سے ایک کروڑ روپیہ کی مالیت کی مشینیں خریدی گئیں۔ الہ آباد کے قریب شنکر گڑھ میں ریت صاف کرنے کے پلانٹ کے چالو ہو جانے سے شیشہ کے کارخانوں کو ایسی سلیکا ریت مہیا ہو سکے گی جس میں لوہے کا جز نہیں ہو گا۔

یو۔ پی مالیاتی کارپوریشن نے بڑی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو معمولی شرح سود پر ۱۲۶,۷۰ لاکھ روپیہ کے قرضے تقسیم کئے۔ اس کے علاوہ کانپور میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے کارپوریشن کا قیام بھی ان صنعتوں کے لئے بہت سود مند ثابت ہوا۔ یہ کارپوریشن ان کی مصنوعات کی کوالٹی بہتر بنانے، خام مال کی فراہمی اور فنی رہنمائی کرنے کے علاوہ گھریلو صنعتوں کی مصنوعات کی خرید و فروخت کا بھی انتظام کرتا ہے۔

ریاست کے پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لئے پہاڑی ضلعوں میں مزید تین صنعتی ریاستوں کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ صنعتوں کی ترقی کے لئے ۲۹ لاکھ روپیہ سے زیادہ کی رقم صنعتی امداد باہمی انجمنوں میں تقسیم کی گئی۔

کانپور میں چوتھے ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے متعلق حکومت ہند اور حکومت امریکہ کے درمیان معاہدہ بھی اس سال کا اہم واقعہ ہے۔

ریاست کے کل فنی اور تعلیمی اداروں کے امتحانات کے لئے ریاستی فنی تعلیم بورڈ بھی بنایا گیا۔ ایچ۔ بی۔ ٹی انسٹی ٹیوٹ کانپور نے ملک میں پہلی بار مخصوص تیل جیسے پیپرمنٹ کا تیل، کافور کا تیل، اور کیوڑا، بیلا، چمیلی، چمپا، جوہی، مولسری کا عطر وغیرہ تیار کرنا شروع کیا۔

حکومت نے الکٹرک وسپلائی کانپور کو جو ہند بڑی کمپنی تھی اپنے انتظام میں لے لیا اور اس میں جلد ہی کام شروع کر دیا جائے گا۔

حکومت نے مزدوروں کے اہم اداروں کو دوسری بندشوں کو چلانے اور اس سلسلہ میں ہر ممکن امداد دینے کی پیش کش کی ہے۔ اس کے علاوہ صنعتی ترقی کا پندرہ سالہ پروگرام بنانے کے لئے بڑی صنعتوں کی ایک منصوبہ کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ بجلی کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہونے کی وجہ سے بھی صنعت کاری کے فروغ میں کافی مدد ملی۔

بجلی۔ ریہاند بند کا ۶۰ فی صدی سے زیادہ کام زیر نظر سال کے آخر تک مکمل ہو گیا۔ یہ بند ۴۶,۰۵ کروڑ روپیہ کے صرف سے تعمیر کیا جا رہا ہے۔ بجلی کی پیداوار اس کی فراہمی اور تقسیم کو بہتر بنانے کے لئے ریاستی حکومت نے یکم اپریل ۱۹۵۹ء سے ایک ریاستی بجلی بورڈ کی تشکیل کی ہے۔ گنگا اور شاردا گرڈ کی پیداواری صلاحیت کو پورے طور سے استعمال میں لایا گیا۔ سوہول۔ گورکھپور اور مئو کے اسٹیم اسٹیشنوں نے جن میں حال ہی میں کام شروع کیا گیا ہے بغیر کسی پابندی کے اپنے علاقہ کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔

زیر نظر سال میں ۳۶۰ ریاستی ٹیوب ویلوں اور ۲۱ قصبوں کو بھی بجلی فراہم کی گئی۔ تقریباً ۱۲۰۵ میل کی لمبائی میں بجلی کی ٹرانسمیشن لائن ڈالی گئی اور ۳۱۸ چھوٹے بجلی گھروں کی تعمیر کی گئی۔ رڑکی اور مراد آباد کے دو اہم تقسیمی مرکزوں میں کام شروع کر دیا گیا۔ بجلی کے استعمال کرنے والے لاتعداد لوگوں کو سہولتیں بہم پہنچانے کے پیش نظر ریاستی محکمہ بجلی کی نو تنظیم بھی کی گئی۔

صنعتی ترقی کے پیش نظر مزدوروں کی فلاح کے لئے بھی اقدامات کئے گئے۔ ٹریڈ یونینوں کے ورکروں کے لئے دو ریفریشر کورسوں کا انتظام کیا گیا۔ اس کے علاوہ ٹریڈ یونین مزدوروں اور صنعت سے متعلق مختلف موضوعات پر لیکچروں کا انتظام کیا گیا۔ ٹریڈ یونین ورکروں کی ایک جماعت پہلی بار بمبئی۔ احمد آباد اور اندور بھیجی گئی جس نے وہاں کی فیکٹریوں ٹریڈ یونینوں وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ حکومت نے رجسٹرڈ یونینوں کو اپنے ممبروں کی فلاح اور تعلیم پر خرچ کرنے کے لئے دس ہزار روپیہ کی مالی امداد بھی دی۔ زیر نظر سال میں کانپور اور نینی میں صنعتی مزدوروں کے لئے ۲۸۰ مکانات تعمیر کئے گئے۔ مزدوروں کے فلاحی مرکزوں کو زیادہ سود مند اور موثر بنانے کے لئے مزدوروں کی فلاح کے کام کو لامرکزی بنانے کا فیصلہ کیا گیا جس کے تحت ریاست کو پانچ منطقوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

مفت ٹرانسپورٹ اور کانپور روڈ ویلیمنٹ بورڈ کے ملازموں کے لئے کم سے کم شرح مزدوری مقرر کر دی گئی۔ سہ جماعتی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق نظرثانی شدہ مستقل احکام گذشتہ ۳ اکتوبر سے تمام شکر کے ملوں میں نافذ کر دیئے گئے۔

زیر نظر سال میں صنعتی مزدوروں کے کنبوں کو مفت علاج کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ مزدوروں کی ریاستی بیمہ اسکیم سے ۵۹۵ کارخانوں میں ۱۳۱۰۰۰ مزدور سالانہ طور پر مستفید ہوئے اور ۳۶ روزگار دفتروں کے ذریعہ بیروزگار اشخاص کو روزگار مہیا کیا گیا۔ پیرانہ سالی پنشن اسکیم کے تحت زیر نظر سال میں ۱۶۰۰۰ سے زیادہ اشخاص کو پنشن دی گئی۔

عظیم تعمیرات

اتر پردیش میں آزادی کے بارھویں سال میں پلوں۔ سڑکوں مزدوروں کے لئے مکانات۔ خزانۂ آب۔ اور تفریحی باغات کی تعمیرات کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا گیا۔

پلوں کی تعمیر۔ زیر نظر سال میں ۲۰ بڑے پلوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اور ۱۲ پل قریب بہ تکمیل اور ۲۰ پل زیر تعمیر تھے۔ جن پلوں کی تعمیر مکمل ہوئی ان میں سے اہم پل یہ ہیں :-

بریلی متھرا روڈ پر کچلا گھاٹ ریلوے پل (لاگت ۷۵ء۹ لاکھ روپیہ)۔ بانسی میں دریائے راپتی کا پل (لاگت ۷۰ء۱۴ لاکھ روپیہ)۔ دری والا میں سونگ ندی پر پل (لاگت ۶۵ء۱۲ لاکھ روپیہ) دریائے الکنندا کا پل (لاگت ۶۳ء۸ لاکھ روپیہ)۔ بریلی۔ تھورا گڑھ روڈ پر دریائے جگبور کا پل (لاگت ۹۰ء۶ لاکھ روپیہ) الہ آباد۔ باندہ روڈ پر براشیل ندی کا پل (لاگت ۲۷ء۳ لاکھ روپیہ)۔

سڑکیں اور عمارتیں۔ زیر نظر سال میں سڑکوں اور عمارتوں کی مرمت وغیرہ پر ۴۳ء۳۲۲ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

ریاست کے سرحدی علاقوں میں سڑکوں کی ترقی کی ۴۵ لاکھ روپیہ کی لاگت کی ایک اسکیم منظور کی گئی جس کے تحت ۲۳ میل لمبی کچی پگڈنڈی اور ۹۰ میل لمبی موٹر سڑک کو ازسر نو تعمیر کرنے اور ایک بڑا پل اور ایک جھولا پل تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔

اتر پردیش میں قومی شاہراہوں کی ترقی کے لئے مرکزی حکومت نے ۸۲ء۸۳ لاکھ روپیہ کی لاگت کی تعمیرات کے لئے منظوری دی ہے۔ اسکے علاوہ قومی شاہراہوں کی دیکھ بھال اور مرمت کے لئے ۲۸۰ء۱۵ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا۔ تعمیراتی کاموں کے لئے ۵ء۵۱ کروڑ روپیہ کی رقم منظور کی گئی۔

وارانسی کے گھاٹوں کی تعمیر اور مرمت کے سلسلہ میں ۱۲ء۵۵ لاکھ روپیہ کی لاگت کا کام مکمل ہوا۔ آنند مئی گھاٹ کے تحفظ کا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا جس پر ۴ء۷۷ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ وارانسی میں دریائے گنگا کے کنارے کے تمام گھاٹوں اور عمارتوں کے تحفظ کے لئے ایک ماسٹر پلان مرتب کیا گیا۔

گورکھپور میں طولی بند پر کام مکمل ہوا۔ اور ضلع بلند شہر میں کالی ندی بند کو چوڑا اور مستحکم کرنے کا کام بھی پورا کیا گیا۔ اور مرزا پور شہر کے تحفظ کے لئے تجربات کئے گئے۔

آب پاشی۔ آب پاشی کی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلہ میں زیر نظر سال میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ ضلع باندہ میں بالمیکی خزانۂ آب۔ ضلع بستی میں کمانو پمپڈ نہر۔ ضلع فیض آباد میں ٹانڈہ پمپڈ نہر اور ضلع اعظم گڑھ میں دھری گھاٹ پمپڈ نہر چالو ہوگئیں اور لوور کھجوری نہروں سے پانی کی سپلائی میں اضافہ کیا گیا۔

امداد باہمی ٹیوب ویلوں کو حکومت کے انتظام میں لئے جانے۔ اور پانی کی نکاسی کی نئی اسکیمیں ۷۰ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے مکمل کی گئیں۔ دوسرے منصوبہ کے تحت ۱۵۰۰ ٹیوب ویل تعمیر کرنے کی اسکیم کے تحت ۶۲۹ ٹیوب ویل تعمیر کئے گئے۔

زیر نظر سال میں آبپاشی کے دستیاب وسائل سے جن سے ۹۲ء۲۳ لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہو سکتی ہے۔ تقریباً ۸۶ء۲۲ لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوئی۔

ریاست کے پس ماندہ علاقوں میں آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی اور پانی کی نکاسی کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے ریاستی حکومت کو مزید ایک کروڑ روپیہ کی رقم الاٹ کی گئی۔

اتر پردیش میں ۱۰ کروڑ روپیہ کی سیلاب سے تحفظ کی اسکیمیں مکمل ہوئیں۔ ان اسکیموں کے تحت ۲۶۰ میل لمبے پشتے اور ۷۰۰ میل لمبی پانی

کی نکاسی کی نالیاں تعمیر کی گئیں اور تقریباً ۳ ہزار مواضعات کی سطح اونچی کی گئی۔

ریاستی حکومت نے زیر نظر سال کے دوران میں سیلاب سے تحفظ کی اسکیموں کے لئے ۱۸ لاکھ روپیہ کی منظوری دی۔

پانی کی بہم رسانی۔ ریاست کے شہری علاقوں میں پانی کی بہم رسانی اور پانی کی نکاسی کی اسکیموں کے لئے مرکزی حکومت نے ۶۵ لاکھ روپیہ کے قرضہ کی منظوری دی۔ اس رقم سے ۱۴ اسکیمیں شروع کی گئیں۔ جن پر کام جاری ہے۔ امید کی جاتی ہے یہ اسکیمیں آئندہ دو برسوں میں مکمل ہو جائیں گی۔ مرکزی حکومت نے ان اسکیموں کے لئے ایک کروڑ ۱۵ لاکھ روپیہ کا قرضہ دینے کا وعدہ کیا ہے جس میں سے ۸۲ء۷۹ لاکھ روپیہ کا قرضہ مل چکا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس اسکیم کے تحت ریاست کے ۸۷ قصبوں میں نلوں کے ذریعہ پانی سپلائی کیا جا سکے گا۔ اور ۷۷ قصبوں میں پانی کی نکاسی کا بندوبست ہو سکے گا۔

دیہی علاقوں میں پانی کی سپلائی اور صفائی کے لئے ۴۰ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی۔ یہ پوری رقم چند منتخب دیہی علاقوں خاص طور پر مشرقی اور پہاڑی اضلاع میں جہاں پینے کے پانی کی سخت قلت ہے پینے کے پانی کی فراہمی پر صرف کی جائے گی۔

مکانات۔ ریاست میں مکانات کی کمی کو پورا کرنے اور کم آمدنی والوں کو مکان تعمیر کرنے میں مدد دینے کے لئے ۵ اسکیمیں وضع کی گئیں۔ ریاستی حکومت نے اس سلسلہ میں صنعتی مزدوروں کے لئے کانپور، لکھنؤ، بریلی، رامپور، گورکھپور، نینی اور ہاتھرس میں ۱۳۴۲۶ مکانات تعمیر کرائے۔ گووند پوری (میرٹھ) نینی (الہ آباد) اور کانپور میں ۷۵۲۰۰ روپیہ کی لاگت سے ۱۹۹۴ مکانات کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ اس کے علاوہ ۳۲۰۰۰۷۹ روپیہ کی لاگت سے مزید ۱۹۰۴ کوارٹر تعمیر کرنے کی اسکیم بھی شروع کی گئی۔ کم آمدنی والوں کے لئے تعمیر مکانات کے پروگرام کے تحت ۱۲۶ء۷ مکانات تعمیر کئے گئے اور ۶۵ء۲۲۳۴ ایکڑ زمین ہموار کی گئی۔

دیہی علاقوں میں مکانات کی تعمیر کے سلسلہ میں ٹاؤن اور ویلیج پلاننگ کے تحت لکھنؤ میں ایک دیہی تعمیر مکانات مرکز قائم کیا گیا۔ دیہی علاقوں میں تعمیر مکانات اسکیم پر عملدرآمد کے لئے اب تک ۳۶۷ مواضعات منتخب کئے گئے ہیں۔ اور ۲۰۳ مواضعات میں سماجی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لیا گیا اور ۱۵۹ مواضعات کے لئے ماسٹر پلان مرتب کئے گئے۔ مالی سال رواں کے دوران میں اس سلسلہ میں ڈولپمنٹ کمشنر کو ۵۰ لاکھ روپیہ کی رقم دی گئی ہے۔

اتر پردیش میں گندی بستیوں کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ریاستی حکومت نے ایک اسکیم وضع کی ہے۔ جس کے بیشتر اخراجات مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔ اس اسکیم کے تحت ریاست کے کاوال شہروں میں گندی بستیوں کے بے گھر اشخاص کے لئے ۵۳۶۹ مکانات تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ اب تک ۳۳۲ مکانات تعمیر کئے جا چکے ہیں اور ۳۰۷۸ مکانات زیر تعمیر ہیں۔ اس اسکیم کے لئے کاوال شہروں کی لوکل باڈیز کو ۷۵ء۱۵ لاکھ روپیہ دیا گیا ہے۔

چائے کے باغوں کے مزدوروں کے واسطے مکانات کی فراہمی کے لئے ریاستی حکومت نے ۱۹۵۸-۵۹ء میں ایک لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی لیکن چائے کے باغوں کے مالکوں نے اس اسکیم کے لئے گرمجوشی نہیں دکھائی جس کی وجہ سے اس اسکیم کے تحت زیادہ کام نہ ہو سکا۔

اتر پردیش کے شہری اور دیہی علاقوں میں بغیر کسی پلان کے بے ڈھنگی عمارتوں کی تعمیر کی روک تھام کے لئے قانون وضع کیا گیا۔ اور نینی تال میرٹھ اور غازی آباد کے اضلاع اور ریاست کے کاوال شہروں کے کچھ علاقوں میں یہ قانون نافذ کیا گیا۔ ان علاقوں میں حکومت کی جانب سے مقررہ مجاز حاکم سے نقشے منظور کرائے بغیر نئی تعمیرات نہیں ہو سکیں گی۔

اتر پردیش میں سرکاری بسوں کے ذریعہ سفر سستا اور آرام دہ بنانے کے اقدامات کئے گئے۔ ریاست میں گذشتہ مئی کے اخیر میں ۵۶۹ راستوں پر ۷۵۵ء۱ بسیں چل رہی تھیں۔ تقریباً ۶۰ء۸ کروڑ اشخاص نے سرکاری بسوں سے سفر کیا۔ اس کے علاوہ سٹی بس سروس سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد ۱۹۰ء۱ کروڑ رہی۔

گورنمنٹ روڈویز نے حکومت پنجاب و اتر پردیش کے درمیان معاہدہ کے تحت پیہوا۔ کورکشیتر۔ ہردوار اور امبالہ۔ دہرہ دون کے راستوں پر بین ریاستی بس سروسیں شروع کیں۔

روڈویز نے بسوں کے چلانے کے اخراجات کو کم کرنے کے لئے جدید سائنسی طریقوں کو اپنایا جس کے نتیجہ میں ۵۹-۱۹۵۸ء میں یہ خرچ ۴۸ نئے پیسے فی میل سے کم ہو کر ۷۹ پیسے فی میل ہو گیا۔ اس طرح تقریباً ۴۰ لاکھ روپیہ کی بچت ہوئی۔ گذشتہ مالی سال کے دوران میں روڈویز کو کل ۶۶۹۹۵۲۸۰ روپیہ کی آمدنی اور تقریباً ۱۰۶ کروڑ روپیہ کا منافع ہوا۔

اہم سماجی تبدیلیاں۔ اتر پردیش نے آزادی کے بارھویں سال میں کچھ نئی سماجی تبدیلیاں ہوئیں۔ کاوال کارپوریشن بل کے لئے صدر نے منظوری دے دی اور اس سال ۲۴ جنوری سے بل کے پہلے باب پر عملدرآمد بھی شروع ہو گیا ہے۔

لوکل باڈیز۔ لوکل باڈیز کے کم تنخواہ پانے والے ملازموں کی حالت بہتر بنانے کے مسئلہ پر حکومت نے ہمیشہ سب سے زیادہ توجہ دی ہے۔ ریاستی حکومت نے لوکل باڈیز کے ملازموں کے مہنگائی بھتہ میں اضافہ کی سہولتوں کے علاوہ ان کی ملازمتوں کی شرائط کو سرکاری ملازمین کی سطح پر لانے کے لئے قواعد بھی وضع کئے۔

ریاست کے تمام میونسپل بورڈوں کے لئے ایسے ذیلی قوانین بنائے گئے جن کا مقصد رکشا چلانے کے کام کو دس سال کے اندر بتدریج ختم کرنا ہے۔

ریاست کے ۳۵۰۰۰ پرائمری اسکولوں میں دستکاری اور متعلقہ صنعتوں میں تربیت دینے کے سلسلہ میں انقلابی قدم اٹھایا گیا۔ ان اسکولوں میں بچوں کی تعداد میں پانچ لاکھ کا اضافہ ہو گیا۔ اب ان میں بچوں کی کل تعداد ۳۲ لاکھ اور ٹیچروں کی تعداد ۸۶۰۰۰ ہے۔ چھٹے کلاس میں فیس کی معافی کا بھی اعلان کیا گیا۔

ضلع نینی تال میں زراعتی یونیورسٹی کے قیام کی اسکیم کو قطعی کیا گیا۔ یہ ریاست کی نویں یونیورسٹی ہوگی۔

طبی تعلیم۔ کنبہ منصوبہ بندی۔ انسداد ملیریا اور دیہی صحتی خدمات کو زیادہ ترجیح دی گئی۔ لکھنؤ۔ آگرہ اور کانپور کے میڈیکل کالجوں میں توسیع کی گئی۔

مندرجہ فہرست اقوام پسماندہ اقوام اور سابق جرائم پیشہ قبائل کے مستحق اور غریب طلباء کی ابتدا سے ثانوی مرحلہ تک مفت تعلیم کی سہولت دی گئی۔ مندرجہ فہرست اقوام کے طلباء کو ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں ٹیوشن اور داخلہ کی فیس کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

ریاست کے میونسپل بورڈوں۔ عارضی ضلع پریشدوں۔ امپروومنٹ ٹرسٹوں اور ٹاؤن ایریا اور نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹیوں کو سڑکوں کی تعمیر اور مرمت کے لئے ۹۳۵۰۰۰ روپیہ کی رقم دی گئی۔ میونسپل بورڈ ہردوار کو دو مستقل پلوں کی تعمیر کے لئے ۲ لاکھ روپیہ کی رقم دی گئی۔ سیاحوں کو آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے ایک نئے میونسپل بورڈ چترا گندھام کے لئے پچاس ہزار روپیہ کی رقم منظور کی گئی۔

مہتروں کو دستی گاڑیاں مہیا کرنے کے لئے ایک لاکھ ۶۲ ہزار روپیہ کی رقم لوکل باڈیز اور خاص طور سے میونسپل بورڈوں میں تقسیم کی گئی۔

زیر نظر سال میں چترا گندھا کی جو نئی میونسپلٹی بنائی گئی اس سے اب ریاست میں میونسپلٹیوں کی تعداد ۱۳۵ ہو گئی ہے۔

سرایلا۔ اکبر پور۔ رام کولا۔ بھرواری اور کھرکھودا میں پانچ نئی ٹاؤن ایریا کمیٹیاں بن جانے کے بعد اب ریاست میں ان کمیٹیوں کی تعداد بڑھ کر ۲۷۶ ہو گئی ہے۔ ٹاؤن ایریا کمیٹیوں نے تعمیرات عامہ کے پروگراموں پر عمل درآمد کے سلسلہ میں کافی دلچسپی لی ہے۔ ریاستی حکومت نے بھی ان کو سڑکوں کی تعمیر و مرمت کے لئے ۵ لاکھ ۴۸ ہزار روپیہ کی مالی امداد منظور کی ہے۔

ریاست کی ۲۸ نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹیوں اور اتر کاشی کی نئی نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹیوں کے انتخابات ہو گئے اور وہ کام بھی کرنے لگیں۔ ریاستی حکومت نے ان میں سے ہر ایک کو سڑکیں گوبیل و نالیاں تعمیر کرنے اور ان کو بہتر بنانے کے لئے پانچ ہزار روپیہ کی مالی امداد منظور کی۔

تعلیم۔ ریاست میں زیر نظر سال کے دوران میں مزید ۱۲۰۰ پرائمری اسکول قائم کئے گئے۔ دوسرے منصوبہ کے آخیر تک ۵ ہزار نئے پرائمری اسکول کھل جائیں گے۔ نرسری اور کنڈر گارٹین اسکولوں کی تعداد ۲۶ سے بڑھ کر ۴۱ ہو گئی۔ ہائر سیکنڈری اسکولوں کے نصاب میں مجوزہ ۴۲ نئے مضامین میں سے ۱۶ مضامین کی تعلیم کا انتظام کیا گیا

ہائر سیکنڈری اسکولوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ کے پیش نظر نگرانی کے عملہ میں اضافہ ضروری ہوگیا جس کے مطابق سب ڈپٹی انسپکٹروں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور لڑکوں کے لئے، سب ڈپٹی ڈائریکٹوریٹ اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے، ریجنل انسپکٹوریٹ قائم کئے گئے۔

طبی سہولتیں۔ طبی تعلیم کی توسیع کے لئے میڈیکل کالج کانپور میں ایک سرجری واحدہ اور سماجی اور انسدادی دوا کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ آگرہ میڈیکل کالج میں نشستوں کی تعداد ۵، سے بڑھا کر ۱۰۰ کر دی گئی۔

آیورویدک کالج لکھنؤ میں ضروری عملہ۔ تجربہ گاہ اور ضروری سازوسامان مہیا کیا گیا۔ نیشنل ہومیوپیتھک کالج لکھنؤ کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے ضروری مالی امداد منظور کی گئی۔

طبی عملہ کی تربیت کے لئے، ۱۰ ڈاکٹروں کو بچوں کے امراض اور تپ دق وغیرہ کے مضامین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملک کے باہر بھیجا گیا۔ گذشتہ یکم جنوری سے دایہ گری کے موجودہ ۱۰ مرکزوں کو آگزیلری مڈوائفری تربیتی مرکزوں میں تبدیل کر دیا گیا۔

ملیریا کی بیخ کنی کے پروگرام کے تحت ایسے علاقوں میں جہاں ملیریا کا زیادہ زور ہے مزید ۲۷ واحدے قائم کئے گئے جس سے ریاست میں ایسے واحدوں کی کل تعداد ۷۶ ہو گئی۔

تپ دق کی روک تھام کے لئے ۵ کلینک قائم کئے گئے اور ہردوار میں ۵۰ پلنگوں کا ایک مرکز قائم ہوا۔ فائلیریا کی روک تھام کیلئے زیر نظر سال میں جونپور اور بہرائچ کے اضلاع میں ایک مرکز قائم کرنے کی منظوری دی گئی۔

دیہی علاقوں میں مزید ۵۰ ابتدائی صحتی مرکز قائم کئے گئے جس سے دیہی علاقوں میں ایسے مرکزوں کی کل تعداد ۱۰۰ ہو گئی۔

ریاست میں کنبہ منصوبہ بندی کو مقبول بنانے کے لئے موجودہ ۳۵ دیہی اور ۵ شہری مرکزوں کے علاوہ ۲۰ دیہی اور ۳ شہری مرکز قائم کئے گئے۔ اس کے علاوہ مالی سال رواں میں مزید پانچ شہری اور ۳۵ دیہی مرکز قائم کرنے کی منظوری دی گئی۔

جیل سدھار۔ جیل کے نظم و نسق میں بھی کافی سدھار ہوا۔ لمبی سزا کے ۴۹ قیدیوں کو نومبر سن ۱۹۵۰ء میں پیرول پر ترائی اسٹیٹ فارم پر کام کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ان قیدیوں کو ان کی عمدہ کارگذاری اور تسلی بخش طرز عمل کی بناء پر رہا کر دیا گیا۔ اس سال مزید ۳۲ قیدیوں کو مذکورہ فارم پر کام کرنے کے لئے بھیجا گیا۔

سمپورنانند کیمپوں کی اسکیموں کے تحت، جس کا مقصد قیدیوں کو آزاد ماحول میں مفاد عامہ کی اسکیموں پر کام کرنے کے مواقع بہم پہنچانا ہے، نانک ساگر ضلع نینی تال اور گھرما کنڈی ضلع مرزاپور میں کام جاری رہا۔ گھرما کیمپ کے ۶ قیدیوں کو فنی تربیت کے لئے چرک سیمنٹ فیکٹری بھیجا گیا۔

جیل کی صنعتوں سے متعلق تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کی رفتار کی نگرانی کے لئے جیل کی صنعتوں سے متعلق مشاورتی بورڈ قائم کیا گیا۔ بریلی اور آگرہ کے سنٹرل جیلوں اور لکھنؤ اور سیتاپور کے ضلع جیلوں میں امبر چرخہ اسکیم شروع کی گئی۔ مذکورہ کمیٹی کی سفارشات کے مطابق جیلوں میں مزید، صنعتیں شروع کی گئیں۔

امداد و بحالی۔ مندرجہ فہرست اقوام اور پسماندہ طبقوں وغیرہ کو تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے پر ایک کرور روپیہ صرف کیا گیا۔

بخشی کا تالاب لکھنؤ، گورکھپور اور نینی تال میں فنی تربیت کے ۳ مرکز قائم کئے گئے۔ ان مرکزوں میں مفت رہائش کا انتظام کیا گیا۔

اتر پردیش کے ۸ پہاڑی اضلاع یعنی نینی تال۔ المورہ۔ گڑھوال ٹہری گڑھوال۔ دہرہ دون۔ باندہ۔ جھانسی اور مرزاپور کے اضلاع کے پسماندہ طبقوں کی فلاح اور بہبود پر تقریباً ۱۱.۵۲ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا۔

مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے بے گھر طلبا کو مالی امداد دینے کے لئے ۶۵ ہزار روپیہ کی رقم منظور کی گئی۔ اس کے علاوہ ایسے ۲ تعلیمی اداروں کو جو بے گھر طلبا کو تعلیمی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں ۲۳۱۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد منظور کی گئی۔

زیر نظر سال میں گوبند نگر (کانپور)۔ ہستناپور (میرٹھ) اور گوند پوری (میرٹھ) میں واقع تربیتی اور پیداواری مرکزوں کا انتظام ریاستی محکمہ محنت کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ مرکز مغربی پاکستان سے آئے ہوئے

بے گھر طلبا کے لئے قائم ہیں۔
مغربی پاکستان کے بے گھر اشخاص کو چھوٹے شہری قرضے دینے کی اسکیم ختم کر دی گئی لیکن مشرقی پاکستان کے بے گھر اشخاص کو قرضے دینے کی اسکیم جاری رہی جس کے تحت ایسے اشخاص کو کاروبار شروع کرنے کے لئے ۔۔۔۲۲۱ روپیہ دیا گیا۔

لوکل باڈیز اور بے گھر اشخاص کی تعمیر مکانات کی امداد باہمی انجمنوں کو بالترتیب ۔۔۔۲۵۵ روپیہ اور ۶۵ ہزار روپیہ کے قرضے دکانوں اور مکانوں کی تعمیر کے لئے دیئے گئے۔
زیر نظر سال میں مرکزی حکومت کی جانب سے ۲۸۴ نئے کلیم تصدیق کے لئے موصول ہوئے جن میں سے ۱۰۰ کلیموں کی تصدیق کی گئی۔

کھلونا

(بہ سلسلۂ صفحہ ۳۰)

ہوئے بولا۔ اچھا ہماری تمھاری تو چلتی ہی رہے گی۔ پہلے منا کو تو بلاؤ یہاں۔ جب وہ اس پر بیٹھ کر جھکتا ہوا دوڑے گا تو تم آپ ہی آپ من جاؤ گی۔ اس نے دوکاندار کے لفظوں کو اپنے انداز میں دہرایا۔
مگر۔ مُن ۔ نا ۔ ہے ک ۔ ہاں ۔ امینہ نے جیسے ہزار کوشش کے بعد یہ بات کہی نہیں بلکہ اُگلی ہو۔ اور اس کے بعد وہ سسکیوں اور آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اس نے اپنا سر نصرت کے سینے پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اسکے ساتھ ہی جیسے گھر بھر کے غم وضبط کا جوالا مکھی پھٹ پڑا۔
جب سارا گھر رونے دھونے اور اڑوس پڑوس کے لوگ دلاسہ دینے سے فرصت پا چکے تو نصرت اٹھا اور وہی کھلونا لئے۔ آہستہ آہستہ۔ خاموش بے حس وحرکت۔ سکتہ کے مریض کی طرح قبرستان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں وہ ایک تازی لپی پتی ہوئی ننھی سی قبر کے پاس رک گیا اور کھلونے کو اس نے قبر پر رکھ دیا۔ کھلونا اتنا بڑا تھا کہ اس نے ساری کی ساری قبر کو چھپا لیا۔ قبر ڈھک گئی۔ غائب ہو گئی۔ نظروں سے اوجھل۔

رخصتی کے پنجابی لوک گیت

(بہ سلسلۂ صفحہ ۴۴)

بچھڑنے کا نظارہ، یہ سب ایسا سماں اور ایسا ماحول پیش کر دیتے ہیں کہ بعض اوقات خود دولھا پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔
پنجاب کے صوفی شعراء نے اسی دردانگیز جدائی کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ اور اللہ سے راز و نیاز کی ایسی طرح ڈالی کہ اسے روحانی دنیا کی معراج کے لئے عرفان وحقیقت کی بنیاد بنا دیا۔ انھوں نے دنیا کو میکہ اور آخرت کو سسرال مقرر کر کے ع

سوہو سوا ئی
جو شوہ من بھاتی

کا نعرہ لگایا۔ یعنی عورت (گھروالی) وہی ہے جو خاوند کے من بھائے۔ یہ گویا خالق ومخلوق کے باہمی رشتہ کو واضح کرتا ہے۔ پنجاب کے صوفی شعراء نے شادی بیاہ کے دوسرے تلازمات بھی اسی طرح نظم کئے ہیں اور ان کے کلام کو پنجاب میں جو قبول عام حاصل ہے اس کی بنیاد بھی یہی تلازمات ہیں۔ لڑکی سب کچھ تیاگ کر اور راضی بہ رضا رہنے کا عزم کر کے سسرال جاتی ہے اور یہی پہلو ہے جس پر صوفیانہ شاعری زور دیتی ہے۔

دو خط

ذیل میں رشید حسن خاں صاحب اور ڈاکٹر گیان چند کے خطوں کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب کے ایک مضمون "چند عروضی غلطیاں" مطبوعہ "نیا دور" جون ۱۹۵۹ء کے سلسلہ میں ایڈیٹر کی طرف سے کچھ فٹ نوٹ دیئے گئے تھے۔ رشید حسن خاں صاحب کا خط اسی سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کا خط "نیا دور" جولائی ۱۹۵۹ء کے دو مضامین کے بارے میں ہے ——— ایڈیٹر

..... آپ نے محوؔ رام پوری کی ایک غزل کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ غزل صاحبزادہ واجد علی آشک کی ہے"۔ اس سلسلے میں یہ عرض کروں کہ میں نے دیوان محوؔ رامپوری موسوم بہ "جذبات محوؔ" مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی کو پیش نظر رکھ کر اس کے ایک مرتب کا قول نقل کیا تھا۔ چونکہ یہ مضمون عروض سے متعلق تھا اس لیے اس تحقیق کا کوئی محل ہی نہ تھا کہ یہ غزل کس کی ہے پھر مجھے شبہ کیسے ہوتا جب کہ میرے سامنے مطبوعہ دیوان موجود تھا۔ اس سلسلے میں یہ عرض کروں کہ آشک صاحب محوؔ صاحب کے شاگرد تھے۔ اور یہ بات بہت مستبعد ہے کہ شاگرد کا کلام استاد اڑا لے، بالعکس تو ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی عرض کروں کہ مرتب دیوان مہرؔ رامپوری صاحب نے صفحہ ۳ پر اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ بعض لوگوں نے استاد کے کلام کو دوسروں کی طرف منسوب کیا ہے اور کنایتاً آشک صاحب کا بھی ذکر کیا ہے اور آخر میں تصریحاً لکھا ہے کہ یہ قول سراسر غلط ہے کہ محوؔ صاحب کے کلام میں دوسروں کا کلام شامل ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ دیوان خود محوؔ صاحب کے مسودات کی بنا پر ترتیب دیا گیا ہے۔ آپنے جن دو اشعار کا حوالہ دیا ہے ان میں سے ایک شعر بجنسہٖ دیوان محوؔ میں موجود ہے البتہ مقطع تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ہے۔ آپکا درج کردہ مقطع یہ ہے۔

ہوا حشر میں مرا سامنا تو یہ بولے واجد بے وفا
تو کرے ہمارا یہاں گلہ تو یہ بات تجھ سے بعید ہے

دیوان میں یہ شعر یوں ہے:

ہوا مجھ سے حشر میں سامنا تو وہ بولے عاشق باوفا!
کرے تو ہمارا یہاں گلہ تو یہ بات تجھ سے بعید ہے

میں نے دیوان محوؔ کے ایک مرتب رشید رام پوری صاحب کو خط لکھا تھا موصوف نے جواب میں انھیں خیالات کا اظہار کیا جن کا اظہار دیوان کے دیباچے میں کیا جا چکا تھا اور اس روایت کو قطعاً غلط بتایا کہ محوؔ صاحب کے دیوان میں کسی شاگرد کا کلام شامل ہے بلکہ ان کے لکھنے کے مطابق (اور جس کی شہادت میں انھوں نے مائل ہاشمی صاحب کا نام لکھا ہے) آشک صاحب بعض دفعہ اپنے استاد محوؔ صاحب کی غزلیں اپنے نام سے پڑھ دیا کرتے تھے (کیونکہ اسوقت تک دیوان محوؔ طبع نہیں ہوا تھا)۔

بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو یہ مسئلہ تحقیق طلب ضرور ہے۔ کبھی رام پور جانے کا اتفاق ہوا تو تحقیق کروں گا۔ آپ کے نوٹ سے اس کا احتمال ہو سکتا ہے کہ لوگ یہ خیال کریں کہ میں نے سہواً یا قصداً آشک کی ایک غزل جسکا مقطع موجود ہے محض حسن داستان کی خاطر محوؔ صاحب کے دامن میں ڈال دی۔[1]

---

[1] فٹ نوٹ میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ یہ غزل قطعی طور سے واجد علی خاں آشک رامپوری کی ہے۔ ہم نے لکھا تھا "جہاں تک ہمارے علم میں ہے ......" یہ بالکل ممکن ہے کہ رشید حسن خاں صاحب کا خیال صحیح ہو۔ بہرحال موصوف کا خط پانے کے بعد ایک صاحب کے ذریعہ ہم نے اس غزل کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ابھی تک کوئی جواب نہیں ملا ہے۔ ——— ایڈیٹر

ایک جگہ آپ نے لکھا ہے :-

" تقطیع میں رکن کے لحاظ سے شعر کے جو ٹکڑے کیے جاتے ہیں ان میں ہر ٹکڑے کا حرف اول متحرک ہو جاتا ہے خواہ وہ اپنی اصلی شکل میں ساکن ہی کیوں نہ ہو مثلاً۔ نپائی اسے۔ مفاعیلن۔ کہ دن پی آ۔ مفاعیلن۔ ردِ گندم۔ مفاعیلن۔ کہ ارزانی۔ مفاعیلن "

آپ کے اس نوٹ کا منشا میں نہیں سمجھ سکا کیونکہ میرے لکھنے کا بھی مفہوم بالکل یہی ہے[۵۲]۔ میں نے بھی یہی لکھا ہے کہ تقطیع میں حرف ساکن متحرک ہو سکتا ہے۔ میر نے آرد کی را متحرک نہیں ساکن استعمال کی ہے۔ تقطیع میں رکن مفاعیلن کے مقابل آنے کی وجہ سے (ردِ گندم) متحرک معلوم ہوتی ہے اسی وجہ کا لکھا کہ صاحب نور اللغات نے آرد کو متحرک ثانی سمجھے۔ میرے الفاظ یہ ہیں :-

"میر نے بھی یہ را شے ساکن ہی استعمال کیا ہے۔ را کا فتحہ محض کرشمۂ تقطیع ہے اور بس۔"

اس کے بعد میں نہیں سمجھ سکا کہ کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہو مصرع ثانی کی تقطیع میں جو ارکان آپ نے قائم کئے ہیں جو اوپر منقول ہوئے وہی میں نے قائم کئے ہیں۔ بہر حال آپ کے اس فٹ نوٹ کا مقصد میں نہیں سمجھ سکا۔

اسی صفحے پر آپ نے حروف ساکن کو متحرک کرنے کے متعلق ایک ضروری تصریح کی ہے۔ میں یہ عرض کر دوں کہ میں اس سے بے خبر نہیں تھا۔ البتہ یہاں کوئی ایسی بحث نہیں تھی جس میں مکمل تصریح کی ضرورت محسوس ہوتی اس لئے میں نے اصل مضمون میں بہ طور اختصار صرف اصول بیان کرنا کافی سمجھا تھا[۵۳]۔

اس مضمون کا جو آخری حصہ آپ نے صفحہ ۳۳ کے آخر میں دیا ہے وہ عجیب بے ربط ہو گیا ہے۔ ادھر کی سطریں ادھر ہو گئیں جن سے مفہوم بالکل خبط ہو گیا ہے[۵۴]۔ اس کے علاوہ متعدد الفاظ کی کتابت میں صورت اس طرح مسخ ہوئی ہے کہ بات کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ مثلاً صفحہ ۹ پر پہلے کالم کی آخری سطر سے پہلی سطر میں مسامحت کے بجائے مصالحت چھپ گیا ہے۔ اس سطر سے اوپر والی سطر میں "دراز دستی کاتب" کے بجائے "دراز دستی کاتب" موجود ہے[۵۵]۔

رشید حسن خاں

(۲)

نیا دور بابت جولائی ۵۹ء میں مخدومی قاضی عبدالودود صاحب نے بینی نرائن جہاں کے نو بہار یعنی قصۂ گل و صنوبر کا تعارف کرایا ہے۔ یہ کتاب میری نظر سے تو نہیں گزری لیکن میں اسکے وجود سے ضرور واقف ہوں۔ میں نے "اردو کی نثری داستانیں" میں ص ۱۷۲ اور ص ۲۰۰ پر اسکا ذکر کیا ہے۔

ایم حبیب خاں صاحب اپنے مضمون "طلسم نارنج" میں فرماتے ہیں کہ "نثری داستانیں میں "طلسم نارنج" کا کوئی ذکر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر گیان چند کی نظر سے نہیں گزری۔"

اطلاعاً عرض ہے کہ "نثری داستانیں" ص ۵۶۹ پر "طلسم نارنج" کا تذکرہ ہے۔ میں نے یہ کتاب اسٹیٹ لائبریری رام پور میں دیکھی تھی اور اس کے قصے کا خلاصہ اپنی یادداشت میں درج کر لیا۔ یہ ۱۲۱۹ھ کی تصنیف ہے[۵۶]۔

گیان چند

۵۲۔ یہ فٹ نوٹ تردیدی نہ تھا بلکہ محض مزید تشریح کے طور پر تقطیع کر دی گئی تھی۔ ۵۳۔ رشید حسن خاں صاحب نے لکھا تھا کہ علم عروض کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ حرف ساکن کو تقطیع میں متحرک کر سکتے ہیں"۔ اس بارے میں بھی فٹ نوٹ کا مقصد یہ بتانا تھا کہ "ہر حرف ساکن کو متحرک نہیں کیا جا سکتا بلکہ کچھ ضوابط ہیں جن کے ماتحت حرف ساکن متحرک ہو سکتا ہے۔ رشید حسن خاں صاحب کے جملہ سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ "ہر حرف ساکن متحرک ہو جاتا ہے"۔ ۵۴۔ صفحہ ۳۳ پر کاپی جوڑنے میں غلطی ہو گئی تھی جس کی تصحیح جولائی کی اشاعت میں کر دی گئی تھی۔ ۵۵۔ کتابت کی غلطی کا افسوس ہے۔ "دراز دستی کاتب" کے متعلق تو کاتب صاحب کہتے ہیں کہ ہم اپنی قوم کی "دراز دستی" کا اعتراف اپنے قلم سے کیسے کر سکتے تھے۔ ۵۶۔ ڈاکٹر گیان چند کی کتاب اس وقت تلاش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکی ورنہ "نیا دور" کی طرف سے اس چیز کی وضاحت اسی اشاعت میں کر دی جاتی ـــ ایڈیٹر

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۷

آشون ۱۸۸۱

اکتوبر ۱۹۵۹ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

اکتوبر کی دوسری تاریخ کو ہم ہندوستان کی ان جلیل القدر ہستی کی سال گرہ منا رہے ہیں جس نے نہ صرف اپنے ملک کو بیرونی اقتدار سے نجات دلائی بلکہ دنیا کے تمام محکوم ممالک کو آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے ایک نئے حربہ سے روشناس کرایا اور سیاسیات میں ایک نیا نظریہ پیدا کیا۔ یہ نیا حربہ تھا "عدم تشدد" اور یہ نیا رُخ تھا سیاسیات میں حق و صداقت کی آمیزش!

مہاتما گاندھی نے جب برطانوی حکومت سے جنگ کرنے کے لئے عدم تشدد کو شرط اولیں قرار دیا تو بہتوں نے تبسم زیر لب کیا اور بہتوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ بظاہر یہ چیز قرین قیاس بھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ دنیا کی طاقت ور ترین حکومت کا بغیر کسی اسلحہ کے مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن عدم تشدد پر مبنی تحریک آزادی میں جب شدت پیدا ہونے لگی اور ستیہ گرہ نے جب قصر استعماریت میں زلزلہ پیدا کر دیا تو مسکراہٹیں سنجیدگی میں بدل گئیں اور استہزا ندامت میں۔ آخر وہ دن بھی آیا جب عدم تشدد اور ستیہ گرہ کو مکمل فتح حاصل ہوئی اور طاقت و جبروت نے ایک نہتے ملک کے سامنے سپر ڈال دی۔ دنیا نے بھی یہ دیکھ لیا کہ ظاہر میں جو چیز بزدلی معلوم ہوتی تھی اس میں درحقیقت وہ جوہر پوشیدہ تھے جو کسی کے تصور میں بھی نہ آ سکتے تھے۔

گاندھی جی کے طریق جنگ میں جہاں عدم تشدد ایک انوکھا حربہ تھا وہاں ان کے مسلکِ سیاست میں حق و صداقت کی آمیزش بھی دنیا کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ سیاست میں مصلحت کو ہمیشہ اولیت دی جاتی رہی اور یہاں تک کہا گیا کہ "جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے" لیکن مہاتما گاندھی نے سیاست کو عام سطح سے بلند کر کے اس میں ایک روحانی عظمت پیدا کر دی اور اپنی ساری سیاسی زندگی میں صداقت کو وہ اپنا شعار بنائے رہے۔ وہ جب کوئی نئی تحریک شروع کرنے والے ہوتے تو حکومت کو پہلے باخبر کر دیتے اور اگر کسی چیز کے متعلق انھیں یہ احساس ہوتا کہ یہ اُن کی غلطی ہے تو علی الاعلان اُس کا اعتراف کر لیتے۔ گاندھی جی کی یہ صداقت شعاری ہی تھی جس نے انھیں دنیا کے دوسرے سیاست دانوں سے ممتاز کر دیا ہے۔

لیکن گاندھی جی کی عظمت کا راز صرف یہی نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے رہنما اور ایک نئے طریق جنگ "ستیہ گرہ" کے موجد تھے۔ وہ ایک سیاست داں ہونے کے علاوہ ایک زبردست مصلح، ایک زبردست معلم اخلاق، ایک زبردست سماجی کارکن، ایک ماہر تعلیم، ایک اعلیٰ پایہ کے صحافی، فرقہ وارانہ اتحاد کے سب سے بڑے علمبردار، دیہات کے رہنے والوں کے سب سے بڑے ہمدرد اور امن اور شانتی کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔ دنیا نے ایسی متعدد ہستیاں پیدا کی ہیں جن کا شمار ممتاز سیاست دانوں یا اپنے ملک کی جنگ آزادی کے رہنماؤں میں کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسی ہستی شاید ہی پیدا ہوئی ہو جو جنگ آزادی کی رہنما ہونے کے ساتھ ان صفات کی بھی حامل ہو جو مہاتما گاندھی میں مجتمع تھیں۔ سچ ہے ؂

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق ‏ ‏ ‏ ‏ ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

ہندوستان کے طول و عرض میں ۲ اکتوبر کو ہر سال اس عظیم المرتبت ہستی کی جینتی (یوم پیدائش) منائی جاتی ہے لیکن صرف جینتی منا نا اور رسمی طور پر اس تقریب میں شرکت کر لینا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ اگر اپنے اس مہاتما اور موجودہ دنیا کی اس بزرگ ترین ہستی کا ہمارے دل میں احترام ہے اور ہمیں اس کے ساتھ کوئی عقیدت ہے تو اس کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اس کی زندگی اور اُس کی تعلیمات کو پیش نظر رکھیں اور یہ عہد کریں کہ ہم گاندھی جی کے نقش قدم پر چل کر اپنے ملک کو خوشحال بنانے میں حصہ لیں گے اور اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کر دینگے کہ ہم گاندھی جی کے سچے پیرو ہیں۔

ایڈیٹر

پیرِ مشرق

شمیم کرہانی
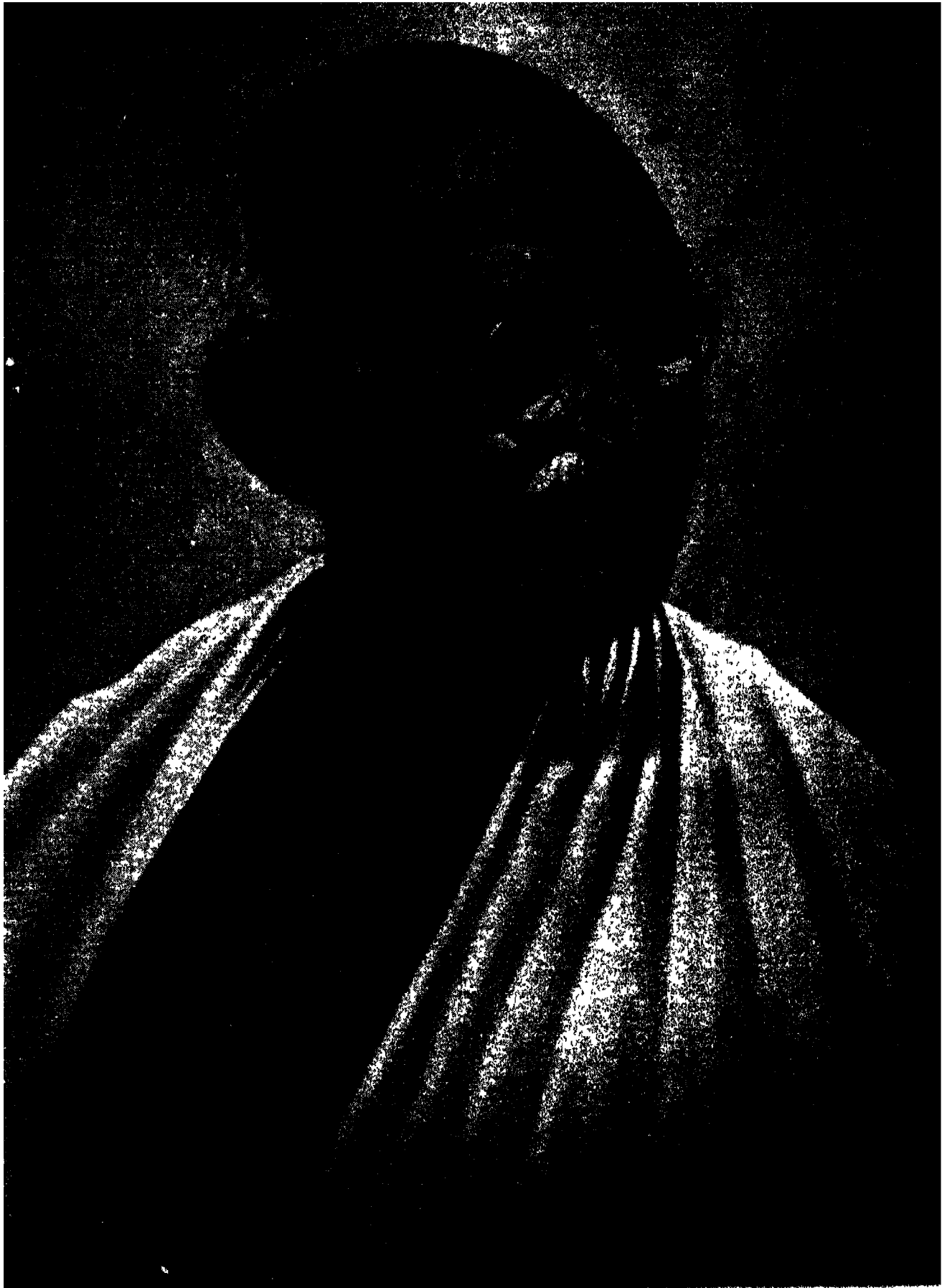
دیدۂ حق نگر دیا تو نے
دلِ شوریدہ سر دیا تو نے
نغمۂ رہ گزر دیا تو نے
جذبۂ بال و پر دیا تو نے
ہم کو ذوقِ سفر دیا تو نے

بہارانِ نشاط گستر کو
ظالمانِ نگار در بر کو
صاحبانِ فنون و لشکر کو
دلِ بیدرد و ظلم پرور کو
دردِ نوعِ بشر دیا تو نے

عام تھا نظمِ جورِ سلطانی
درِ ظالم تھا اور پیشانی
ذہن قیدی تھا، فکر زندانی
مہر بر لب تھی روحِ انسانی
نالۂ کارگر دیا تو نے

رشتۂ کائنات کی خاطر
تفرقوں سے نجات کی خاطر
کعبۂ و سومنات کی خاطر
اتحادِ حیات کی خاطر
خود کو قربان کر دیا تو نے

لی حیاتِ خودی نے انگڑائی
جاگ اٹھے وطن کے سودائی
زیست کو زیست کی ادا بھائی
دل نے دیکھی جنوں کی رعنائی
وہ شعورِ نظر دیا تو نے

گلشنِ سوگوارِ مشرق کو
چہرۂ پُر غبارِ مشرق کو
حجرۂ تنگ و تارِ مشرق کو
شامِ ماتم گسارِ مشرق کو
آفتابِ سحر دیا تو نے

ہیں لبوں پر عمل کے افسانے
سر ہیں اونچے، تنے ہوئے شانے
رشکِ گلشن بنیں گے ویرانے
اب تھمیں گے نہ تیرے دیوانے
ایسا سودائے سر دیا تو نے

حیدرآباد کے چند قدیم علمی و ادبی رسالے

نصیر الدین ہاشمی

حیدرآباد میں علمی رسالوں کا آغاز ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ اس سن میں ایک علمی رسالہ حیدرآباد سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک یعنی گذشتہ سو سال کے عرصہ میں تقریباً دو سو رسالوں کا پتہ چلتا ہے جو مختلف سنین میں حیدرآباد سے جاری ہوئے۔ ان تمام اخباروں اور رسالوں کے متعلق ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیا جا رہا ہے جو پھر کبھی پیش ہوگا۔ یہاں چند ایسے رسالوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو ۱۹۱۰ء کے قبل شائع ہوئے اور اپنے مضامین کے لحاظ سے اردو کے معیاری رسالے سمجھے جاتے تھے۔ ۱۸۸۳ء سے ۱۹۱۰ء تک حیدرآباد کا وہ درخشاں زمانہ تھا جب کہ شمالی ہند کے ممتاز اصحاب حیدرآباد میں جمع تھے اور ان کے ادبی کارنامے اردو کے لئے باعث افتخار تھے۔ جن رسالوں کا تعارف کرایا جا رہا ہے وہ اسی دور میں شائع ہوتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ (۱) مخزن الفوائد (۲) ادیب (۳) فنون (۴) مذاق سخن (۵) حسن اور (۶) افسر۔

(۱) مخزن الفوائد۔ یہ ایک علمی اور اخلاقی رسالہ تھا جو ۱۸۸۳ء میں جاری ہوا۔ چند سال تک نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی سید حسین بلگرامی المخاطب بہ نواب عماد الملک تھے جو اس زمانہ میں نظامت تعلیمات کے عہدہ پر مامور تھے۔ رسالہ کا حجم چار جزو یعنی ۶۴ صفحے ہوتا تھا مگر نشان صفحوں کا سلسلہ ہر ایک پرچہ میں علیحدہ نہ ہوتا تھا بلکہ آغاز سال سے شروع ہو کر ختم سال پر ختم ہوتا تھا۔ سرکار آصفیہ کے دارالطبع میں اس کی طباعت ہوتی تھی۔ ہمارے پیش نظر اس رسالہ کے چند نمبر ہیں۔ رسالہ میں شائع شدہ مضامین کے عنوان درج ذیل ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کس قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

(۱) ہوا اور پانی کا بیان۔ از ایڈیٹر۔ (۲) اردو اور ہندی کا جھگڑا از سید ابوالحسن۔ (۳) افسانہ نیرنگ زمانہ۔ از آغا مرزا (سرور) (۴) تار برقی از آغا مرزا (سرور) (۵) زمین کو کیونکر درست کرنا چاہیئے۔ از ایڈیٹر۔ (۶) [illegible] از قربان علی بیگ سالک۔ (۷) امام مہدی جعلی۔ از مشتاق حسین (وقار الملک)۔ (۸) سلطنت اسلامیہ۔ از سید مہدی علی (محسن الملک)۔ (۹) اردو اور ہندی کا مناظرہ۔ از حسن بن عبداللہ (عماد نواز جنگ)۔

اس فہرست سے واضح ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کے جو قابل اشخاص حیدرآباد میں جمع ہو گئے تھے ان سب کا تعاون رسالہ کو حاصل تھا اور سب کے سب اردو کے بہی خواہ تھے۔ اس موقع پر شائع شدہ مضامین سے صرف دو مضمونوں کا اقتباس درج کیا جاتا ہے تا کہ رسالہ کے مضامین کا بھی اندازہ ہو سکے۔

سلطنت اسلامیہ

شرطہ یا کوتوال

افریقہ میں اس عہدے کا نام حاکم ہے اور اندلس

میں صاحب المدینہ اور ترکی سلطنت میں اس کو والی کہتے ہیں مگر یہ عہدہ سپہ سالار سے اکثر کم رتبہ سمجھا جاتا تھا۔ شریعت حقہ محمدیہ میں بلا تحقیق وقوع جرم کوئی شخص سزایاب نہیں ہو سکتا تھا لیکن بادشاہوں کے ہاں بعض اوقات بلا ثبوت جرم بھی محض قیاس کی بنا پر عبرتاً کسی کسی کو سزا دی جاتی تھی اس لئے بنی عباس کی سلطنت میں ایسے لوگوں کی سزا اس عہدہ دار سے متعلق تھی جس کو وہ صاحب الشرطہ کہتے تھے۔ اور کبھی اس کو شرع کے بموجب بھی قصاص کا اختیار رکھ دیا جاتا تھا جو حقیقت میں قاضی کا کام ہوتا تھا۔" (ص ۶۲۷۔ جلد اول۔ نمبر ۹۔ ذالحجہ ۱۲۹۱ھ)

ہوا اور پانی کا بیان

ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

یوں تو خدا کی خدائی میں نعمتیں ایک سے ایک بھلی ہیں مگر غور کرکے دیکھو تو ہوا اور پانی کو سب پر فضیلت ہے۔ ہوا نہ ہو تو ایک دم جینا محال ہو جائے۔ اور پانی وہ چیز ہے کہ کوئی پیاسے سے اس کی قدر پوچھے۔ عرب اور افریقہ کے ریگستانوں میں پانی کا مارا مسافر تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ غرض کوئی اگر ان دونوں نعمتوں کے فائدے لکھے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جاویں۔"

"۔۔۔ہوا اور پانی کے قوام میں بڑا فرق ہے۔ رقیق اور سیال دونوں ہیں مگر ہوا میں یہ صفتیں پانی سے زیادہ ہیں۔ ہوا کے اجزا میں باہم اتصال کم اور پانی کے اجزا میں زیادہ ہے۔ ہوا کے اجزا میں ایک قوت واقعہ ایسی ہے کہ وہ اس جسم لطیف کو بہت ذی مروت یعنی لچک دار کر دیتی ہے مثلاً اگر پھکنے میں ہوا بھر کر ہاتھ سے دباؤ تو دب کر چھوٹا ہو جاتا ہے اور ہاتھ کھینچ لو تو پھر پھول کر اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے۔" (صفحہ ۲۳۔ جلد اول نمبر ۱)

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یہ رسالہ سرکار آصفیہ کے سرکاری مطبع میں طبع ہوتا تھا۔ چنانچہ پرچہ پر اس کی صراحت ہے۔

"دار الطبع سرکار عالی باہتمام محمد مسیح الزماں طبع شد۔"

(۲) فنون۔ یہ رسالہ حیدرآباد سے منشی محمد مشتاق احمد صاحب ۱۸۸۳ء سے شائع کرنے لگے۔ تین چار سال تک جاری رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں علم فلاحت۔ تجارت صنعت و حرفت سے متعلق مضامین ہوتے تھے۔ چند عنوانات درج کئے جاتے ہیں۔ (۱) وکھنی باغبانوں کے لئے دستور العمل۔ (۲) سیلون (لنکا) کے زراعتی کالج کا نتیجہ۔ (۳) ہندوستان کے مختلف مقامات کی زمین اور ان کی خاصیتیں۔ (۴) نیشکر کی زراعت۔ (۵) امریکہ کی کپاس۔ (۶) کافی کی کاشت۔ (۷) تجارت کے لئے ریلوں کی ضرورت۔ (۸) خوش نما اور خوش وضع باغ کا نقشہ (۹) کھاد اور مرکبات کھاد۔ (۱۰) ریشم کے کپڑے۔

ان عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب سے تقریباً پچھتر سال پہلے حیدرآباد میں صنعت و حرفت اور فلاحت کے لئے اردو میں مضامین لکھنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک مضمون کا اقتباس بغرض نمونہ پیش ہے۔

"۔۔۔زمین کا کارآمد کر لینا اور اس سے نفع حاصل کرنا ہمارا کام ہے۔ اگر ہم چاہیں تو بڑی سے بڑی افتادہ زمین کو درست کرکے منفعت اٹھا سکتے ہیں۔ ریاست بیکانیر اور علاقہ توررا وانی۔ ریاست بےپور ضلع سرسہ اور ملتان وغیرہ کے درمیان میں جو زمین واقع ہے اس میں سیکڑوں میل تک ریت کے ٹیلے اور ریتیلی زمین کے میدان ہیں جن میں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ بعض بعض قطعے جو کسی قدر نیچے ہیں ان میں بارش کی امید پر موٹھ باجرا بویا جاتا ہے۔ جس سال مینہ نہیں برستا تو یہ قطعات محض بیکار اور زراعت سے خالی پڑے رہتے ہیں۔" (فنون نمبر ۲۔ جلد ۲۔ فروری ۱۸۸۴ء)

(۳) مذاق سخن۔ اس رسالہ کے ایڈیٹر بھی مشتاق احمد صاحب

[illegible] ہوتی تھیں۔ یہ غزلیں ہندوستان کے مختلف مقامات کے شعرا کی ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ بھی سنہ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوتا تھا۔ چند سال تک جاری رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ رسالے کے دو جز یعنی ۳۲ صفحے ہوتے تھے۔ ٹائیٹل پر یہ شعر لکھا جاتا تھا۔

بیرے گلزار کا ہر پھول گل جنت ہے چشم انصاف سے دیکھیں جو طبیعت والے

اس کی طباعت مطبع علوم و فنون میں ہوتی تھی جو منشی محمد احسان احمد صاحب کا ذاتی مطبع تھا۔

اس رسالہ کے نمبر ۲۔ جلد ۳۔ کے پرچہ میں طرح کے دو مصرعے دیئے گئے ہیں۔ ایک تو غالب کا مصرع ہے :-

"روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں"

اور دوسری طرح ہے۔ "مل گئے ہم خاک میں محشر تری تاخیر سے"۔

بعض شعراء کے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ شعر طرح نمبر ۲ پر کہے گئے ہیں اور کچھ دوسری طرحوں پر۔ اولاً دکھنی شعرا کا کلام پیش کیا گیا ہے۔

فہیم

بعد مردن قبر پر آتا ہے وہ جلاد دنگا خاک میری کم نہیں ہے سرمہ تسخیر سے

وصل ہو جانا بھی آسان نہیں ہے، نہیں اے دل محال
ہاں بدل دے غیر اگر قسمت میری تقدیر سے

صفدر

ہیں نظر آتی ہیں آنکھیں سرمگیں تحریر سے وہ ہرن گویا بندھے ہیں آہنی زنجیر سے

راغب

اٹھانے کو میرے ہرگز نہ اٹھو فتنہ اٹھے گا
اٹھایا گر ہمیں مجلس سے اٹھ جائیں گے ہم جاں سے
میری آنکھوں نے فرقت میں بہائے اس قدر دریا
خجل ہے نوح کا طوفاں ہمارے جوش طوفاں سے

معجز

دکھا دے جلوہ میرا یار ہر گوشے جاناں سے کہیں بلبل کو رونا نے بھی ہیں یا ہر گلستاں سے

یقیں ہو جائے گا ہر ایک کو خورشید محشر کا
الٹ دیں گے اگر گھونگھٹ وہ اپنے روئے تاباں سے

حسام

ہم منزل میں ترقی اور ترقی میں زوال دیکھ تو نقشہ مہ نو کا مہ کامل کے ساتھ

منزل الفت میں تنہا کون کہتا ہے مجھے
دل ہو میرا ساتھ میرے اور میں ہوں دل کے ساتھ

شکیب

مر کے بھی باقی تھا لیلیٰ کی محبت کا اثر
تھا غبار گور مجنوں راہ میں محمل کے ساتھ

فہیم

رہ عاشقی میں نہ پوچھ یہ کہ تمہاری جان پہ کیا بنی
جو جھکے تو نقش قدم بنے جو چلے تو عرش علا ہوئے

شمالی ہند کے بعض شعراء کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

اکرم

جلوہ نمائے عرش جہاں تھا خدائے پاک جز مصطفےٰ ہی کون گیا اس مقام پر

یاور

خجل ہے برق تاباں، ابر باراں پانی پانی ہے
تمہاری تابش دنداں سے، میری چشم گریاں سے
فلک کو ایک ہی پر ناز ہے یہ ظرف تو دیکھو
میرے سینے میں لاکھوں داغ ہیں خورشید تاباں سے

فیض

جرس کی طرح گھر بیٹھے ہوئے فریاد کرتے ہیں
بہت اے قافلہ والو تمہیں ہم یاد کرتے ہیں

محو لکھنوی

یہاں تک ہے کدورت شیشۂ دل میں پری رو کے
پس مردن بھی میری خاک کو برباد کرتے ہیں

شیفتہ

شوق نظارہ نہ ہو کیوں حسن عالم سوز کا
عشق ہے روز ازل سے میرے آب و گل کے ساتھ
وہ جو اٹھا بزم سے وقت سحر یہ جل بجھی
تھی جو الفت شمع کو اس رونق محفل کے ساتھ

قتل ہوگا ایک دن کیا شیفتہ واقف نہ تھا
کیوں ہوئی دل بستگی کمبخت کو قاتل کے ساتھ

اسی پرچہ "مذاقِ سخن" میں مولانا عبدالحلیم شررؔ کی ایک نظم شامل ہے جو شبِ وصل کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ اس کے چند بند پیش ہیں۔

دردِ جگر کچھ آج گھٹا ہے　　زخمی دل کو چین پڑا ہے
شوقِ بیاباں بھولا ہوا ہے　　برسوں بعد زمانہ پھرا ہے
خوب ہوا آرام تو پایا
بے چینی سے چین تو آیا

لو شبِ وصل کی شام آ پہنچی　　نکلے گی خوب سی حسرت دل کی
غم جاتا ہے عشرت آئی　　چمکا ستارہ قسمت جاگی
آج وہ اپنے قابو میں ہونگے
ہم بھی ان کے پہلو میں ہونگے

جس پر قرباں وہ گھڑی اب ہے　　جس کے صدقے آج وہ شب ہے
نیچی ان کی تیغِ غضب ہے　　وصل نصیب اب اپنا لقب ہے
واہ رے وہ اور ان کی شفقت
واہ رے میں اور میری قسمت

چرخ پہ کچھ کچھ چھایا اندھیرا　　کوئی کوئی ستارہ چمکا
چڑیاں ڈھونڈھ رہی ہیں بسیرا　　کوّوں نے اب شور مچایا
دیکھتے ہی دو وقتوں کو ملتے
موت کے خواہاں اللہ اٹھ بیٹھے

شور ہوا ہر سمت اذاں کا　　برہمنوں نے سنکھ بجایا
بجنے لگا ہر دیر میں گھنٹا　　نیچر شام کا ہر جا چمکا
دوسری جانب دنیا پلٹی
پیرِ فلک نے کروٹ بدلی

یہ ایک طویل مسدس ہے۔ تیس بند ہیں۔ آخری بند یہ ہے

چین پڑے گا دل کو کیونکر　　دیکھ رہے ہیں صبحِ محشر
بیٹھے ہیں حیراں، مضطر، ششدر　　جاں آئی ہے اب تو لبوں پر
بیٹھے شررؔ ہو کیوں پُر حسرت　　جل بجھی بیٹھے شمع کی صورت

(۴) رسالۂ ادیب۔ یہ رسالہ انجمن اخوان الصفا حیدرآباد کی جانب سے سنہ ۱۹۰۰ء سے شائع ہونے لگا۔ ملا عبدالقیوم صاحب مرحوم اس رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ ہمارے پیش نظر اس کا صرف ایک نمبر ہے یہ پہلے سال کا دسواں نمبر ہے۔ رسالہ صرف ۲۲ صفحوں کا ہے اور اس میں صرف ایک مضمون "وقت" پر لکھا گیا ہے۔ آخر میں ایک فارسی غزل بھی شائع ہوئی ہے۔

انجمن اخوان الصفا چند حیدرآبادی اصحابِ علم کی انجمن تھی جس کے روح رواں ملا عبدالقیوم تھے۔ انجمن کے مقاصد میں ایک رسالہ کا شائع کرنا بھی شامل تھا۔ گویا یہ رسالہ انجمن کا آرگن تھا چونکہ کوئی اور پرچہ ہم کو ابھی تک نہیں ملا ہے اس لئے اس کے متعلق مزید صراحت نہیں کی جا سکتی۔ مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ معیاری تھا اور اس وقت کے حیدرآبادی اصحابِ علم کے خیالات کا مخزن ہوتا تھا۔ اس رسالہ کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

"عالمگیر کی پابندیٔ وقت کا یہ حال تھا کہ باوجود ہر وقت کے کارزار و سفرہائے سخت و دشوار کے وہ کبھی اپنے تئیں وقت کی نگہبانی سے غافل نہ رکھتا تھا۔ کوئی منزل ایسی نہیں ہوتی تھی جو تبت و آسام کا شغر سے دکن تک اس کے دستخطی فرمانوں اور پروانوں سے خالی پائی جاتی ہو اور جو صوبہ داران و افسرانِ فوجی کو نہ ملتے ہوں یہاں تک کہ مرتے دم تک اس نے وقت کی نگہبانی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔"

رسالہ کی اس اشاعت میں مضمون کا دوسرا حصہ شائع ہوا ہے۔ مضمون دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔

(۵) رسالہ حسن۔ یہ رسالہ اگست ۱۸۸۸ء میں جاری ہوا۔ اس وقت ہمارے پیش نظر اس کی سات جلدوں کے چند مختلف نمبر ہیں۔ اس کے ایڈیٹر حسن بن عبداللہ تھے جنکو عماد نواز جنگ کا خطاب ملا تھا۔ حیدرآباد میں وہ مختلف عہدوں پر متمکن رہے۔ جس زمانہ میں یہ رسالہ جاری کیا تھا اس وقت انسپکٹر جنرل رجسٹریشن و اسٹامپ تھے۔ سلطنت آصفیہ کے یہ روایات تھے کہ حکومت کے

[illegible] بھی علمی کام کرتے تھے۔ علمی انجمنیں قائم کرتے، رسالے شائع کرتے [illegible] اور ادبی موضوع پر لیکچر دیا کرتے۔ حسن بن عبداللہ صاحب کو بھی چونکہ علم و ادب سے دلچسپی تھی اس لئے انھوں نے یہ رسالہ نکالنا شروع کیا تھا۔

رسالہ "حسن" اپنے زمانہ کا ایک معیاری رسالہ تھا۔ اس کی جانب سے ہر اچھے مضمون پر ایک اشرفی انعام دی جاتی تھی۔ عموماً ہر پرچہ میں ایک انعامی مضمون شائع ہوتا تھا۔ یہاں ہم چند ایسے مضامین کے عنوانات درج کرتے ہیں جن کو انعام دیا گیا تھا۔

(۱) حالات حکیم ارسطاطالیس۔ از سید جلال صاحب۔ (۲) حقیقت الماس۔ از مجیب احمد تمنائی۔ (۳) الناس بالناس۔ از سید اقبال علی خاں۔ جج ہائیکورٹ۔ (۴) النظری فی التاریخ۔ خواجہ غلام الثقلین صاحب۔ (۵) عربوں کے سویلزیشن کی تاریخ۔ از محمد یوسف علی۔ (۶) اورنگ زیب کی پالیسی۔ از محمد رشید اعلی۔ (۷) دعوت افلاطون۔ از محمد اصغر حسین۔ (۸) تذکرہ تیمور۔ از احمد شفیع (۹) سلطان بایزید یلدرم اور تیمور اور مسلمانوں کی موجودہ پولیٹیکل حالت کی نسبت ایک خیال۔ از سراج الدین احمد ایڈیٹر سرمور گزٹ۔ (۱۰) سکندر اعظم کے حالات زندگی پر ایک محققانہ نظر۔ از مجیب احمد تمنائی۔ (۱۱) سلطان محمد خاں ثانی اور قسطنطنیہ کی فتح۔ از عبدالحلیم شرر۔ (۱۲) کتب خانہ ہائے اسلامی۔ از محمد شبلی نعمانی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس رسالہ میں تاریخی مضامین زیادہ لکھے جاتے تھے اور انعام بھی اکثر ان کو ملا کرتا تھا مگر یہ خیال رہے کہ یہ رسالہ صرف تاریخی مضامین کا مجموعہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ چند مزید عنوان قلمبند کئے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسالہ "حسن" میں مختلف النوع موضوعات پر خامہ فرسائی ہوتی تھی۔

(۱) علم اللسان۔ از سید علی بلگرامی۔ (۲) زندہ آدمیوں کی سوانح عمری۔ عربی پادشاہ۔ ایڈیٹر۔ (۳) ہندوستان کے حیوانات کی تاریخ۔ از ایڈیٹر۔ (۴) آواز اور اس کی کیفیت۔ از محی الدین حسین خاں۔ (۵) حافظہ کے عجیب و غریب افعال۔ از احمد عبدالکریم۔ (۶) سفرنامہ نیل گری۔ از منیر الملک۔ (۷) حنوط کی ہوئی لاشیں۔ از خیرالدین خاں محمود جنگ۔ (۸) قسطنطنیہ۔ از میر لیاقت علی (۹) انسانی طرز معاشرت پر قدرت کا اثر۔ از محمد رشید اعلی۔ (۱۰) آب و آتش۔ از شمس العلماء ذکاء اللہ (۱۱) صنعت و حرفت۔ از ایڈیٹر۔ (۱۲) غبارہ کا فلاسفرانہ بیان از مجیب احمد تمنائی۔ (۱۳) فوٹوگرافی۔ از راجہ مرلی منوہر (۱۴) وسط یورپ۔ از ایڈیٹر۔ (۱۵) حقیقت القرطاس۔ از مجیب احمد تمنائی۔ (۱۶) سویلزیشن۔ از رفیع الدین سعدی کاکوری۔ (۱۷) شاعری از سید محمد حسین رضوی۔ (۱۸) شکاری پرند۔ از ایڈیٹر (۱۹) عقل اور اس کا استعمال۔ از سید احمد حسین (۲۰) اجرام فلکی کے تاثرات۔ از شریف الدین۔ (۲۱) تعلیم جبری۔ مترجم عبدالواحد۔ (۲۲) اخلاق و تمدن ترقی۔ از ایڈیٹر۔ (۲۳) غدر ۱۸۵۷ء کے اسباب۔ از شریف الدین۔

اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ مضامین میں تنوع ہوتا تھا۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے کسی مضمون کا اقتباس پیش نہیں کیا جا رہا ہے۔

(۶) افسر۔ یہ رسالہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہونے لگا اور چند سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر پہلے مولوی محب حسین اور پھر مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب (حال معتمد انجمن ترقی اردو کراچی) تھے۔ اولاً یہ رسالہ صرف فوج سے متعلق تھا اور فوج ہی سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ مگر اس کے بعد جنوری ۱۹۰۰ء سے اس میں علمی اور ادبی مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ اس رسالہ کی جانب سے بھی اچھے مضمون پر ایک اشرفی دینے کا اعلان ہوا تھا۔

اس وقت اس رسالہ کے صرف دو نمبر ہمارے پیش نظر ہیں یعنی اکتوبر ۱۸۹۹ء اور جنوری ۱۹۰۰ء۔ پہلے پرچے میں صرف دو مضمون ہیں ایک آلات کار ہائے ڈفنس وغیرہ پر اور دوسرا مضمون مردانگی کے عنوان پر ہے۔

جنوری ۱۹۰۰ء کے پرچے میں فوجی مضامین کے ساتھ جو علمی و ادبی مضامین ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں:۔

(۱) حکمت ظاہری و باطنی (منظوم)۔ از سید بے نظیر شاہ۔ (۲) دارالعلوم اسلامی۔ از حسین بلگرامی عماد الملک (۳) سگنیلنگ کا استعمال۔ از محب حسین۔

اس پرچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے بلند پایہ ادیبوں کا تعاون اس رسالہ کو حاصل ہو گیا تھا۔ بے نظیر شاہ کی اہمیت زمانہ مابعد میں بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ حال میں ان کا مجموعہ کلام بھی شائع ہوا ہے۔ بے نظیر شاہ کی اس نظم کے متعلق اڈیٹر صاحب نے جو نوٹ لکھا ہے اس کا مختصر اقتباس اور نظم کا کچھ حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"اس بے مثل نظم کے مصنف، حقایق آگاہ فضیلت دستگاہ۔ جناب سید شاہ بے نظیر شاہ ہیں جنھوں نے اردو نظم میں ایک خاص رنگ پیدا کیا ہے۔ اُن کی ایک مثنوی کی ایک جلد بھی طبع ہو چکی ہے۔ بے شمار اشعار ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اُن کے دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اردو نظم کو کس کمال و مرتبہ تک پہنچایا ہے۔ چنانچہ یہ نظم جو ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے خود اس امر کی شاہد ہے کہ اس میں فلسفہ، تصوف، سائنس اور شریعت کے مسایل پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور کس خوبی اور لطافت سے ان پر بحث کی ہے۔ اس قسم کے سائنٹیفک مسائل کو اردو میں اب تک کسی نے نظم نہیں کیا اور باوجود اس کے شاعری کے پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ شاہ صاحب نے اردو لٹریچر پر بڑا احسان کیا ہے۔"

پلا ساقیا جام عین الصفات — کہ ادراک سے ہو میری کُنہ ذات
کسی کو نہیں اسکی مطلق خبر — کہ ہم کون ہیں، جا رہے ہیں کدھر
پڑے کس لئے کوئی خلجان میں — توقف نہیں اپنے امکان میں
یہی داخلی خارجی مدرکات — بناتے ہیں مقصود منشاء ذات
جو مفہوم سے قلب آگاہ ہے — یہ ادراک وہبی من اللہ ہے
اگر معرفت اس کا مصقل بنی — تو یہ چھوٹی چنگاری مشعل بنی
اگر کاہلی اس کی مانع ہوئی — تو بے شک یہ تقدیر ضائع ہوئی
یہ ادراک کیا شے ہے فی نفسہ — رہا اس میں حیران ہر فلسفی
نہ سمجھا کوئی جز خواص خدا — قل الروح من امر ربی ہے کیا
ہو علم اولیں تجربہ یا نظر — ہیں سب تحت فطرت میں لے یا جبر
یہ ابطال باطل یہ احقاق حق — تصنع کے قانون کا ہے سبق
ریاضی فلاحت یہ کیمسٹری — اسی سے ہوئے مایل برتری
جیالوجی، سائنس، علم کلام — یہ طب، علم الاصوات و علم نظام
یہ علم الصنایع، یہ علم الاصول — یہ علم المناظر یہ شرح نقول
غرض علم و فن جسقدر آج ہیں — ہمیشہ تصنع کے محتاج ہیں

نظم خاصی طویل ہے۔ کل ۱۵۵ اشعار ہیں۔ خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

وہ سمجھ دے کہ صوفی تجھے مان لوں — کل اسباب مخفی کو پہچان لوں
ترا فیض ہر وقت شامل رہے — حضوری تری مجھ کو حاصل رہے
وہ دے دے کہ حاصل ہو تمیز تام — علیک الصلوٰۃ و علیک السّلام

ان کے علاوہ حیدرآباد کے کئی اور پرچے بھی قابل تذکرہ ہیں جو سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد جاری ہوئے ہیں مثلاً "دکن ریویو"۔ اس کے اڈیٹر مولانا ظفر علی خاں صاحب تھے۔ دوسرا ذخیرہ "جو ناظر الحسن ہوش المخاطب ہوش یار جنگ اپنی ملازمت کے پہلے شائع کرتے تھے۔ "معلم نسواں" مولوی محب حسین کا رسالہ تھا جس نے تمام ہندوستان میں پہلی مرتبہ پردہ کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ موقع ہوا تو سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد کے رسالوں کا بھی تعارف کیا جائے گا۔ بہرحال اردو کی ترقی میں حیدرآباد کے ان رسالوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ تاریخی حیثیت سے بھی ان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام رسالے نواب سالار جنگ کے کتب خانہ کی زینت ہیں۔

اہنسا — زینہ بھی اور منزل بھی

عبدالمجیب سہالوی

گاندھی جی کی تعلیمات پر دہلی میں ۱۹۵۳ء والے سیمینار میں امریکی نمائندے ڈاکٹر رلیٹ گینشے نے اپنی تقریر میں کہا کہ گاندھی جی کی قیادت میں عدم تشدد کے ذریعہ ہندوستان کے عوام نے جس طرح آزادی کی جنگ میں کامیابی حاصل کی اس نے دنیا کی آنکھیں کھول دیں اور ایک نیا راستہ دکھایا جو جنگ کے ذریعہ بیرونی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے والے پرانے راستہ سے بالکل مختلف تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اہنسا کے ذریعہ ہندوستان کا آزادی حاصل کرنا نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے ایک زبردست خدمت تھی تو غلط نہ ہوگا۔" انھوں نے کہا کہ گاندھی جی انسانیت کے سچے خادم تھے۔ انھوں نے جنگ اور تشدد کی اس وقت مخالفت کی جبکہ اسی کا سکہ چل رہا تھا اور انسانیت اس کی آگ سے جھلس جاری تھی انھوں نے بڑی بہادری اور عزم کے ساتھ یہ بتایا کہ دنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو پُرامن طریقہ پر اہنسا کا راستہ اختیار کر کے حل نہیں ہو سکتا۔

عدم تشدد پر گاندھی جی کے اس پختہ عقیدہ سے ہندوستان کے عوام میں ایک بھروسا اور اعتماد پیدا کر دیا۔ ان کے دل سے خوف دور ہو گیا اور ان کے اندر ایک ایسی اخلاقی قوت پیدا ہو گئی جس نے انھیں اپنی جنگ آزادی میں بالآخر کامیاب بنا دیا۔ گاندھی جی کے اس انوکھے طریقہ جنگ نے ساری دنیا کو حیرت زدہ کر دیا اور ملک جو بیرونی اقتدار سے دبے ہوئے تھے اور آزادی کی جدوجہد کیلئے انھیں کوئی راستہ نہیں نظر آرہا تھا ان کے لئے ستیہ گرہ اور عدم تشدد کی تحریک آزادی کے خوابوں کی تعبیر بن کر آئی۔ بے بسی اور مایوسی کی تاریکی میں انھیں ایک ایسی کرن نظر آئی جس کی روشنی میں وہ اپنی آزادی کی منزل، دور سہی لیکن دیکھ ضرور سکتے تھے۔

اہنسا اور سچائی: گاندھی جی کے نزدیک اہنسا اور سچائی ایک جان دو قالب ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ انکے نزدیک سچائی کا مطلب اس روحانی اتحاد کو حاصل کرنا ہے جو بنیادی طور پر تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے اور یہ روحانی اتحاد بے لوث محبت بے غرض محبت اور بلا امتیاز ہر شخص کے لئے خوشی سے تکلیف اٹھانے کے واسطے تیار رہنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن روزمرہ کا تجربہ کہتا ہے کہ تشدد اس روحانی اتحاد میں قدم قدم پر رخنے ڈالتا ہے الجھنیں پیدا کرتا اور وہ جذبہ محبت جو انسانی فطرت کا تقاضا ہے اسے نفرت میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے گاندھی جی کی تعلیمات میں اہنسا کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور انھوں نے سچائی کی منزل پر پہنچنے کے لئے اہنسا کو ضروری زینہ قرار دیا ہے۔

گاندھی جی کے الفاظ میں "اہنسا تمام مذہبوں کی جان ہے یہ زینہ بھی ہے اور منزل بھی۔ اس طرح اہنسا سچائی حاصل کرنے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ خود سچائی ہے۔ یہ اس کی روح اور اس کا پہلا پہلی

ان کا کہنا ہے کہ سچائی ہمارے اندر رہے باہر نہیں۔ جتنا بھی ہم تشدد کی طرف جائیں گے اتنی ہی ہم سچائی کی منزل سے دور ہوتے جائیں گے اور کبھی بھی اسے حاصل نہ کر سکیں گے۔ اس طرح اہنسا سب سے بڑی حقیقت اور سچائی کا عملی مظاہرہ ہے جسے انسانی اتحاد کہا جا سکتا ہے۔ اسی لئے گاندھی جی کے نزدیک گناہ کرنے والے کو بری نظر سے دیکھنا، نفرت کرنا یا اسے ذلیل کرنا بھی ایک قسم کا تشدد ہے جسے وہ کسی طرح بھی جائز نہیں قرار دیتے۔ ان کے خیال کے مطابق گناہ سے نفرت کرنا چاہئے گناہ گار سے نہیں۔ کیوں کہ انسان بنیادی طور پر پاک و صاف ہے حالات اسے برا بنا دیتے ہیں اور وہ اپنی راہ سے بھٹک کر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم راستہ بھولے ہوئے بھائی کے ساتھ ہمدردی کریں اور اس محبت سے جو کسی ایک کے لئے نہیں بلکہ تمام ہی نوع انسان کے لئے یکساں اور مساوی ہو گریز نہ کریں۔ گاندھی جی کے نزدیک محبت کی گرمی میں وہ زبردست طاقت جو بجلی میں نہیں ہوتی۔ یہ گرمی گناہ کو جلا کر خاک کر سکتی ہے اس لئے ہمیں اپنے گناہ گار بھائیوں کو محبت سے محروم نہیں کرنا چاہئے اصلاح کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے کہ سزا کے بجائے ترغیب سے کام لیا جائے۔ سزا کے ذریعے آدمی وقتی طور پر گناہ سے رک سکتا ہے لیکن اس کا دل نہیں بدل سکتا۔ دل بدلنے کے لئے دل کی راہ تلاش کرنی ہوگی اور اس راہ سے محبت کی گرمی پہنچا کر اصلاح کرنی ہوگی۔

مکمل عدم تشدد۔ مکمل عدم تشدد یا اہنسا مطلق معصومیت ہے جس کے لئے ہر جاندار کی طرف سے دلی نفرت، بدگمانی اور بدنیتی سے بالکل پاک ہونا چاہئے انسان قدرتی طور پر اسی مطلق معصومیت اور اہنسا کی طرف بڑھنا چاہتا ہے لیکن دنیا کے حالات اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور اسے اہنسا کی مقدس اور اعلیٰ منزل تک پہنچنے نہیں دیتے ہیں۔ گاندھی جی کا کہنا ہے کہ "موجودہ حالات میں انسان کامل ہونا مشکل ہے اس وقت سماج کی جو حالت ہے اس میں آدمی آدھا انسان اور آدھا درندہ ہے۔"

گاندھی جی اہنسا کی منزل تک پہنچنے میں جو دشواریاں اور جو رکاوٹیں ہیں ان سے اچھی طرح واقف تھے اسی لئے وہ کہتے تھے کہ مکمل اہنسا کے حصول کی کوشش بجائے خود ایک مقصد ہے مجھے اس کی کوشش میں جب کبھی ناکامی کا سامنا ہوتا ہے تو میں اس سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اس کے حصول کی کوشش شروع کر دیتا ہوں کیونکہ اس سعی ناکام میں کامیابی کی بھرپور مسرت پائی جاتی ہے۔"

گاندھی جی کی اہنسا اندھی اہنسا نہیں ہے جس میں حالات اور اخلاقی اور نیت کا لحاظ کئے بغیر تشدد سے ہر حال میں پرہیز کیا جائے گاندھی جی کی اہنسا انسان کو بزدلی کے لئے کوئی بہانہ نہیں فراہم کرتی اسی لئے اگر کوئی شخص عورتوں کی عزت لینا چاہتا ہو اور اسے اس فعل سے باز رکھنے کا کوئی ذریعہ اس وقت موجود نہ ہو تو گاندھی جی کی اہنسا ہمیں یہ نہیں سکھاتی کہ ہم ایک بزدل آدمی کی طرح اس بے عزتی اور بے حرمتی کو برداشت کر لیں بلکہ ہمیں عزت کی حفاظت کے لئے اپنی جان بہادری کے ساتھ قربان کر دینی چاہئے اور اس کے لئے اگر تشدد کی ضرورت ہو تو اس سے بھی باز نہیں رہنا چاہئے۔ اسی طرح اگر کسی جاندار کو کوئی ایسی تکلیف ہو کہ وہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو اور اس کے علاج کی بھی کوئی صورت باقی نہ رہ گئی ہو تو اگر اسے اس تکلیف سے نجات دلانے کے لئے اسے ختم کر دیا جائے تو یہ فعل اہنسا کے مفہوم کے خلاف نہ ہوگا بلکہ اہنسا کی روح کے عین مطابق ہوگا۔

اگر ایک ڈاکٹر کسی مریض کا آپریشن کر کے اس کا خراب ہاتھ یا پاؤں کاٹ ڈالتا ہے یا آنکھ نکال لیتا ہے تو اس پر مریض یا مریض کے متعلقین ناخوش ہونے کے بجائے خوش ہوتے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ ڈاکٹر نے یہ جارحانہ کام خود مریض کے فائدہ کے لئے کیا ہے اس میں اس کا اپنا ذاتی فائدہ ہوتا ہے اور نہ اس کے پیچھے نفرت کا جذبہ۔ اس لئے اگر کوئی تشدد انسانی ہمدردی اور عام مفاد کے لئے بغیر اپنی کسی ذاتی غرض اور مفاد کے لئے کیا جائے تو وہ اہنسا کے خلاف نہیں بلکہ عین اس کے مفہوم کے مطابق ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تشدد جس کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے خلاف دل میں نفرت، غصہ یا انتقام کا جذبہ بھی نہ ہونا چاہئے۔

عقیدہ اور پالیسی۔ گاندھی جی کی اہنسا اپنے جانی دشمن کے خلاف بھی دل میں ایک منٹ کے لئے بھی دشمنی، نفرت اور انتقام کا

جذبہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ان اصولوں کو برت کر دکھانے کی کوشش کی ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ سچا یعنی تمام انسانوں کا روحانی اتحاد اہنسا پر عمل کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے انھوں نے اس عقیدہ کو صرف عقیدہ ہی نہیں رہنے دیا بلکہ زندگی بھر اس کے تجربات کرتے اور اس عقیدہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے سیاسی آزادی کے حصول کے لئے بھی اہنسا کا راستہ اختیار کیا اور کانگرس نے اگرچہ اہنسا کو بطور عقیدہ کے نہیں بلکہ بطور پالیسی کے اختیار کیا تھا مگر اسی پر چل کر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایسی وہ کامیابی حاصل ہوئی کہ دنیا کی نظریں اس کی طرف مبذول ہو گئیں۔

کانگرس نے اہنسا کو صرف پالیسی کے بطور اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ ایک سیاسی جماعت تھی جس کے لئے حالات کے لحاظ سے اپنے طریقۂ کار میں رد و بدل کرنا ضروری تھا۔ پالیسی اور عقیدہ میں یہی فرق ہے کہ پالیسی حالات کے لحاظ سے بدل سکتی ہے لیکن عقیدہ میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی پالیسی مخصوص حالات میں مخصوص مقصد کے لئے اختیار کی جاتی ہے اور حالات بدلنے پر پالیسی تبدیل اور مقصد حاصل ہونے کے بعد پالیسی ختم ہو جاتی ہے۔ پالیسی کی بنیاد عقلی دلائل پر ہوتی ہے اور عقیدہ کی بنیاد وجدان اور مشاہدات پر۔ اہنسا گاندھی جی کے لئے عقیدے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور کانگرس کے لئے پالیسی کی۔ گاندھی جی نے اپنی پوری زندگی اس کے تجربے اور مشاہدے میں صرف کر دی۔ وہ آخر دم تک اپنے اس عقیدہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہے اور ناسازگار حالات کے باوجود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اہنسا پر گاندھی جی کے پختہ عقیدے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گاندھی جی اور ان کا ساتھ سنہ ۱۹۲۰ء سے لے کر آخر وقت تک رہا اور اس لمبے عرصہ میں انھیں گاندھی جی کے بہت قریب رہنے کا فخر حاصل رہا۔ اس درمیان سب سے زیادہ جس چیز نے انھیں متاثر کیا وہ اہنسا پر گاندھی جی کا غیر متزلزل اور اٹل عقیدہ تھا۔ ان کے لئے اہنسا ایک قدر مطلق کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ

وہ خود سچائی تھی۔ وہ اہنسا کے معاملہ میں کسی صورت میں بھی مجھوتہ کیلئے تیار نہ ہوتے تھے۔

جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ان کا دل جنگ کے ہاتھوں تباہ ہونے والے ملکوں کے دکھ درد سے بھاری رہنے لگا۔ وہ اس لئے اور بھی پریشان نظر آتے تھے کہ وہ نہ تو ان کا غم بٹا سکتے تھے اور نہ جنگ روکنے کے لئے کچھ کر سکتے تھے۔ ان کی یہ ذہنی تکلیف اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب برطانیہ پر جرمنی نے زبردست بم باری کی۔ وہ اس مسئلہ پر بہت سوچتے رہے اور آخر کار انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ بھی وہ جنگ روکنے کے لئے کر سکتے ہیں انھیں نتیجہ کی پروا کئے بغیر کرنا چاہئے اس لئے انھوں نے برطانی عوام کو ایک پیغام روانہ کرنے کا ارادہ کیا جس میں وہ ان کو مشورہ دیں گے کہ وہ ہٹلر کے حملہ کا جواب فوج کے ذریعہ نہ دیں بلکہ اس کا مقابلہ عدم تشدد اور ترک موالات کے ذریعہ کریں چاہے اس کی وجہ سے ان کو فوجی لحاظ سے جرمنی کے زیر قبضہ رہنا پڑے۔ مولانا آزاد نے اس پیغام کے سلسلہ میں گاندھی جی سے کہا کہ اس وقت جبکہ برطانیہ پر سخت بم باری ہو رہی ہے اس کے عوام کو یہ پیغام بھیجنا مناسب نہ ہوگا اور اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اس کے بعد وہ دو دن تک پھر اس پر غور کرتے رہے لیکن اس کے بعد پھر وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ انھیں اس کے بارے میں نتیجہ کی پروا کئے بغیر اپنے خیال کا اظہار بغیر جھجک کے کرنا چاہئے چنانچہ انھوں نے پیغام کا مسودہ تیار کیا اور اسے وائسرائے اور گورنر جنرل کے ذریعہ برطانی عوام کو روانہ کر دیا۔

جنگ ہی کے زمانہ میں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ گاندھی جی کی یہ پختہ رائے تھی کہ اگر حکومت برطانیہ اس شرط سے ہندوستان کو آزادی دینے پر تیار ہو کہ وہ جنگ میں اس کے ساتھ شریک ہو جائے تو اسے اس پر رضامند نہیں ہونا چاہئے۔ ان کا خیال تھا کہ عدم تشدد انکے لئے ایک عقیدے اور قدر مطلق کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے وہ اس معاملہ میں ہندوستان کی آزادی کی خاطر بھی کسی مجھوتہ پر تیار نہیں ہو سکتے۔

مولانا آزاد اس وقت کانگرس کے صدر تھے اور ان کی رائے

اس سے مختلف تھی ان کا خیال تھا کہ اتحادی طاقتیں ایک اچھے مقصد کے لئے جنگ کر رہی ہیں۔ ہندوستان جنگ میں صرف اسلئے شریک نہیں ہو رہا ہے کہ اس کو خود آزادی سے محروم رکھا جا رہا ہے اگر اسے آزاد کر دیا جائے تو جنگ میں شرکت کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں رہتی اور ہندوستان اتحادی طاقتوں کے ساتھ مل کر جنگ کو کامیاب بنانے میں مدد کر سکتا ہے۔

ان دو مثالوں سے اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہنسا گاندھی جی کے لئے کیا حیثیت رکھتی تھی اور وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے بھی اہنسا پر اپنے عقیدہ سے ایک انچ ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

گاندھی جی کے لئے اہنسا محض ایک نظریہ ہی نہ تھا بلکہ عملی پروگرام تھا اور ان کی زندگی اس کی جیتی جاگتی مثال تھی گاندھی جی سے قبل جن مفکروں نے جنگ کی مخالفت کی انھوں نے اس کی جگہ پر کوئی ایسا پروگرام نہیں رکھا جس کے ذریعہ ناانصافی کی مخالفت، اسلحہ کو استعمال میں لائے بغیر اخلاقی طاقت سے عدم تشدد اور ترک موالات کے ذریعہ کی جا سکتی۔

گاندھی جی کی زندگی جس طرح سچائی اور اہنسا کا ایک نمونہ تھی اسی طرح ان کی موت بھی اپنے اصولوں پر پختہ عقیدے کا مظہر تھی۔ سینے پر گولی کھانے کے بعد بھی ان کے دل میں اپنے قاتل کے خلاف نہ تو غصہ تھا اور نہ نفرت بلکہ لبوں پر وہ پاک مسکراہٹ تھی جو بڑے سے بڑے گناہ کو معاف کرنے کے لئے بے چین نظر آتی تھی۔

★

اک نیا پیغمبرِ امن و اماں پیدا ہوا کارواں میں اک امیرِ کارواں پیدا ہوا
ایک خضرِ عصرِ حاضر، اک کلیمِ عہدِ نو ایک صدرِ محفلِ روحانیاں پیدا ہوا
خوں سے اس کے آج بھی گلرنگ ہے خاکِ وطن فخرِ عالم، نازشِ ہندوستاں پیدا ہوا

مجاز

پہرہ دار

راہی معصوم رضا

دن کے ہنگاموں سے تھک کر
سناٹے کی چادر تانے
دنیا گہری نیند میں گم ہے
بس اک پہرہ دار کا نعرہ
اس دنیا میں جاگ رہا ہے
جاگتے رہنا سو مت جانا
جاگتے رہنا سو مت جانا

پہرہ دار کا نعرہ سُن کر
جاگ بھی گر پڑتا ہے کوئی
کروٹ لے کر سو جاتا ہے

شاعر بھی پہرہ والا ہے
جو احساس کی ٹیڑھی میڑھی
اونچی اور نیچی گلیوں میں!
آوازیں دیتا رہتا ہے
جاگتے رہنا، سو مت جانا
جاگتے رہنا، سو مت جانا

شاعر کی آوازیں سُن کر
جاگ بھی گر پڑتا ہے کوئی
کروٹ لے کر سو جاتا ہے

لیکن صبح کے ہنگاموں میں
دنیا ان پہرے والوں کو
بھولے گی، یا یاد رکھے گی؟

اکتوبر ۱۹۵۹ء

[illegible]

بحر لکھنوی

حسنین کاظمی

شیخ امداد علی بحر لکھنؤ کے شرفا سے تھے۔ ان کے والد شیخ امام بخش بھی لکھنؤ ہی کے تھے۔ اتفاق سے ان کو استاد بھی والد کا ہم نام ملا یعنی شیخ امام بخش ناسخ۔ بحر کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ ابتدائی زندگی اور خاندان کے متعلق معلومات فراہم نہ ہو سکے البتہ صرف اس قدر معلوم ہوا کہ ابتداً لکھنؤ ہی میں اِدھر اُدھر نوکری کی۔ پھر واجد علی شاہ کی سرکار میں زمرۂ شعرا میں ملازم ہو گئے اور انتزاع سلطنت اودھ تک وہیں رہے۔ جب دربار اودھ درہم برہم ہوا تو بحر کے ساتھی واجد علی شاہ کے پاس کلکتہ جانے لگے مگر بحر نے لکھنؤ چھوڑنا پسند نہیں کیا وہیں رہے البتہ جب بالکل مفلس ہو گئے تو نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور کو متوجہ کیا انہوں نے رامپور بلا لیا اور کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔ چھتر برس افلاس و تنگ دستی میں گزار کر سنہ ۱۳۰۱ھ (مطابق ۱۸۸۴ء) انتقال کیا۔ دیوان زندگی ہی میں مرتب ہو گیا تھا جسے نواب سید محمد خاں رند شاگرد آتش نے ۱۲۸۵ھ میں شائع کیا۔

دیوان ۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ رائل سائز اور سطر ۲۹ سطری ہے ۶۲۸ غزلیں درج ہیں۔ یہ مطبع مصطفائی شہر لکھنؤ (محلہ محمود نگر) میں ۲۹ شعبان ۱۲۸۵ھ کو طبع ہوا تھا۔ تاریخ طبع خود بحر نے کہی ہے ؎

جامع اس دیواں کے ہیں سید محمد خان رند
اس جلیل القدر کا یہ بحر پر احسان ہے
نام تاریخی "ریاض البحر" ہے دیوان کا
نام پر اس کے گلستان بوستاں قربان ہے
اب جو بارہ سو پچاسی سن میں یہ چھاپا گیا
اس کی بھی تاریخ کچھ مشکل نہیں آسان ہے
بحر کی طبع رواں سے ہے یہ سال انطباع
شعر ہیں نایاب در کان گہر دیوان ہے

بحر نے ناسخ کے دوسرے شاگردوں کے برخلاف پیچیدہ تشبیہوں اور دقیق استعارات سے بہت پرہیز کیا ہے۔ ابتدائی کلام البتہ اسی رنگ کا ہے مگر بعد میں انہوں نے اس رنگ کو بڑی حد تک ترک کر دیا اور ناسخ کے دوسرے شاگردوں کی طرح شعر کو بھول بھلیاں نہیں بنایا بلکہ صاف شعر کہتے رہے۔ صحت الفاظ اور تحقیق لغت کے تو استاد تھے۔ محاورات کا استعمال بڑی عمدگی سے کرتے تھے اور الفاظ کے استعمال میں بڑے محتاط تھے۔ اگر بحر کے استعمال کردہ محاورات کو ایک جگہ اکٹھا کر کے شائع کر دیا جائے تو وہ محاورات کا ایک بہت عمدہ مجموعہ ثابت ہوگا۔ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول اور فضا کے باعث مسّی، دھڑی، چولی، چوٹی کے مضامین ضرور باندھتے تھے مگر اس میں بھی ایک رکھ رکھاؤ ہوتا تھا۔

مذہباً وہ اثنا عشری تھے مگر فقرا کی صحبت میں بھی زیادہ بیٹھتے تھے۔ وسیع القلب تھے اور بعض بعض وقت تصوف کے مضامین باندھنے کی کوشش بھی کرتے تھے گرچہ عملاً صوفی نہ تھے یا تصوف کا مطالعہ

اکتوبر ۱۹۵۹ء

نہ کرسکتے تھے اس لئے سامنے سامنے کے مضامین یا اصطلاحاتِ تصوف سے آگے نہ بڑھ پاتے تھے۔ البتہ علومِ متعارفہ، نجوم، رمل، ریاضی، تعمیرکات، وغیرہ پر خاصی اچھی نظر تھی۔ ان فنون کے مصطلحات بڑی بے تکلفی سے باندھے ہیں اور ان مضامین کو بڑے سلیقے سے ادا کیا ہے۔ بحر کے مطلعے غضب کے ہوتے تھے۔ غزل میں چاہے جان نہ ہو مگر مطلع اس دھوم دھام کا کہتے کہ طبیعت پھڑک جاتی تھی۔ لیجیے چند مطلعے دیکھیے:

اللہ نے جمال دکھایا حبیب کا
منہ دیکھ کر اٹھے تھے کسی خوش نصیب کا

کبھی لبوں پہ رُکا سینے میں کبھی اٹکا
تمہارے واسطے کیا کیا نہ شب کو جی بھٹکا

بتو! خدا پہ نہ رکھو معاملہ دل کا
بُرا بھلا یہیں ہو جائے فیصلہ دل کا

نہ پوچھو احوال مجھ حزیں کا فریفتہ ہوں کسی حسیں کا
اسیر ہوں زلفِ عنبریں کا قتیل ہوں چشمِ سرمگیں کا

خالی کا چاند آپ کی فرقت میں بھر گیا
اب تک نہ آئے یہ بھی مہینہ گزر گیا

کیا سلام جو ساقی سے ہم نے جام لیا
پڑھا درود جو پیرِ مغاں کا نام لیا

کیا کہہ کے پکاریں تجھے اے جانِ محبت
غارت گرِ اسلام کہ ایمانِ محبت
میرا مہمان ہے اک رشکِ قمر آج کی رات
منزلِ ماہ نظر آتا ہے گھر آج کی رات

حوریں سننے کے لئے آئیں گی افسانۂ عشق
آ گیا بڑھیں کسی روز جو دیوانۂ عشق

غنچے چٹکیں گے پھر اے خالقِ گلشن کب تک
خشک پتّوں کے سنوں نالہ و شیون کب تک

جنوں کے جوش میں نکلے جو گھر سے!
ادھر سے ہم چلے پتھر ادھر سے

خدا کو یاد کر کیوں بنتی ہے کیمیا گر سے
کہ سونا خاک سے ہوتا ہے پیدا لعل پتھر سے

شکوہ نہ کر ازل سے یہی کارخانہ ہے
آج اس کا دور ہے تو کل اس کا زمانہ ہے

آنکھیں نہ جینے دیں گی تری بے وفا مجھے
ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

نہ پوچھو کس لئے آنسو ہیں ڈبڈبائے ہوئے
کسی کی بزم سے ہم آتے ہیں چوٹ کھائے ہوئے

فقرا کی صحبت میں بیٹھنے کا اثر بھی متعدد اشعار میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً:

ہم فقیر اللہ کے جھوٹی صدا دیتے نہیں
جو ہمارا جام بھر دے گا وہ جم ہو جائے گا

فقر کا پوچھو مزا سلطان ابراہیم سے
چھوڑ کر شاہی کو درویشی کا خواہاں ہو گیا
یادِ معبود ہے ہر وقت ہم آزادوں میں
منہ سے ہر دم ہے یہاں نعرۂ یا ہو پیدا

ہم غریبوں سے نہ پوچھو دولت دنیا کا حال
شکر کر کے کھا لیا جو کچھ ملا اچھا برا

رنج پر رنج سہے شکر کرے فقر یہ ہے
آج فاقہ ہو تو کل روزے کی نیت رکھے

لیکن بحر کی صحبت جاہل فقرا سے رہی اس لئے ہو حق تو آگیا مگر تصوف نہ آسکا۔ انھیں فقرا کے اثر سے تصوف کی طرف قدم بڑھایا بھی تو اسے سمجھ نہ سکے خلط ملط کرتے رہے۔ سامنے سامنے کے مضامین تصوف باندھ کر اپنے کلام کو عارفانہ خیال کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ انھیں تصوف کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ بہرحال اسی قبیل کے کچھ شعر پیش ہیں ؎

کعبہ کا قصد ہو تو سوئے دل کرو رجوع
وہ راہ دور کی ہے یہ رستہ قریب کا

وہ عالم ہے کہ غم سے غم نہ شادی سے مجھے شادی
برابر میرے میزان میں ہے پلہ رنج و راحت کا

اہل دنیا خوش ہوں یا ناخوش ہوں کچھ پروا نہیں
آسرا رکھتا ہے یہ بندہ خدا کی ذات کا

دید کے طالب کو چشم معرفت ہیں چاہیئے
آتش ہر رنگ میں جلوہ ہے برق طور کا

ہر خاک نقش مظہر انوار خدا ہے
ہر دانۂ ذرات میں خرمن نظر آیا

بصارت ہو تو پھر دیدار اس کا بالشافہ ہو
کہ انکار ملاقات انکو تو ہو نہیں سکتا

خود اپنے بھید سے محرم کیا جسے چاہا
کسی کو ہو گیا ابقا کسی کو خواب ہوا

نہ دیکھا اس کے سوا کوئی جب کھلی آنکھیں
خدا صنم کو میں سمجھا جو ہوشیار ہوا

پاؤں پردے سے نکالو بھی کوئی راہ چلو
جوتی پیزار لڑیں شیخ و برہمن کب تک

حضور قلب بھی مشروط ہے دعا کے لئے
جو ہے قریب شجر اس سے ہے ثمر نزدیک
جو اس کو دور سمجھتے ہیں عقل سے ہیں دور
کہ یار ہے رگ جاں سے زیادہ تر نزدیک

صاحب کہیں ظہور کرو کائنات میں
دولھا کو آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں برات میں

مشاہدہ رہا ہر دم تکلم و جہہ اللہ
صدا سنی ارنی کی نہ لن ترانی کی

چار دیوار عناصر جلوہ گاہ یار ہے
قد آدم آئینے کو چشم عرفاں چاہیئے

تصوف سے اسی ناواقفیت اور روحانیت سے بعد کا نتیجہ ہے کہ شاہ دریا کے حال کو اپنی عارفانہ غزل کا نتیجہ سمجھتے تھے ؎
بحر کی سن کے عارفانہ غزل شاہ دریا کو حال آتا تھا
بحر کے متعدد اشعار ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں مذہب کے معاملے میں خاصے شکوک تھے ؎
حشر پہ زعم بیان تو ہمارے دن گئے
مر کے اٹھائیں گے اب دیکھئے وبال کیا کیا

[illegible] اسلام میں
[illegible] دل میرا [illegible] بھی دنیا دیکھ کر

بندوں کا تو یہ حال ہے لیتے نہیں سلام
کیونکر کیوں قبول کرے گا خدا نماز

خدا کی دید کا اے سحرؔ کیا میں ہوں قائل
کہ بندے کا بھی میسر نہیں جمال مجھے

عقبیٰ میں کسی شے کی مجھے کیا ہے توقع
دنیا میں مری کون سی امید بر آئی

گر با وجود تشکک فی المذہب کے اس کے قائل تھے کہ

کیا قباحت ہے جھکے پائے صنم پر عاشق
سجدہ اللہ کو کرتے ہیں یہ نیت رکھے

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ہے، سحرؔ فن اعمال یعنی نیرنجات اور فن یعنی تعویذ نویسی کے معلومات بھی خاصے رکھتے تھے ۔

یار کی چین جبیں سے خوف کرنا چاہیئے
مستتر اس نقش میں قہار کے اعداد ہیں

تسخیر وہ پری ہو یہی آرزو رہی
اس نقش حب نے جان لی میری زکات میں

قل ہو اللہ احد کا کیا عمل پڑھتا ہوں میں
غیر تنہائی نہیں کوئی مرے تسخیر میں

معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح نجوم اور رمل سے بھی خاصی واقفیت تھی ۔

جانتا ہوں میں ترے راس و ذنب کو لے فلک
میرے ڈسنے کے لئے پالا ہے جوڑا سانپ کا

جس وقت تک کہ بال نہ رکھے تھے یار نے
داخل ہمارے زائچے میں ذو ذنب نہ تھا

سبعہ سیارہ نہ تحویل کریں جوزا میں
تیرے محرم سے ستارے ہوں جو دو چار جدا

سحرؔ تیرے گھر میں کیا آئے بھلا وہ مہروش
خانۂ آبی میں ہوتا ہے وبال آفتاب

ہرن کو شیر سمجھ کر پناہ میں رہیئے
زحل کا دور ہے چشم سیاہ کی گردش

نہ وہ رخسار کا تل ہے نہ وہ سرمے کا دُنبالہ
محاذی ہیں دو اختر ایک رامح ایک اعزل ہے

کیمیا سے بھی نہ صرف واقفیت تھی بلکہ شاید اس کا شوق بھی کر چکے تھے ۔

وہ ہوس ہوں جو نکلے روح بھی پھونس یہی
میرے سمپٹ سے کوئی پارے کا جوہر اڑ گیا

صاحب اکسیر کو دیکھا فقیر
کیمیا کی آرزو اچھی نہیں

سحرؔ کو لکھنؤ سے بڑی محبت تھی اور اس کے گن گاتے ہی رہتے تھے ۔

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش جمالوں کو
ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا

انتزاع سلطنت کے ساتھ لکھنؤ کی جو بربادی ہوئی اس پر اس طرح آنسو بہائے ہیں ۔

لکھنؤ پر آگئی کیسی بلائے انتشار ۔۔۔ دفتر گلزار اوراق پریشاں ہو گیا
کل فرشتوں کا گزر مشکل تھا جن قصروں میں ۔۔۔ اس محل میں آج غولوں کا گزارا ہو گیا

انگریزوں کے متعلق ان کے خیالات اس شعر سے ظاہر ہوتے ہیں ؎

دل میرا چرا لیا ہے نہیں پوچھتا کوئی
ہے دزد حنا چور نصاریٰ کے عمل کا

مگر باوجود اجڑنے کے وطن آخر وطن ہی تھا۔ اس لئے اس سے محبت تھی ؎

پیچھے پڑتا ہے جو آگے کو قدم رکھتا ہوں
کس طرح کوئی نکلتا ہے وطن سے باہر

وطن سے جانے کے بعد پھر وطن کی یاد روح کو کھینچتی رہتی ہے ؎

پس مرگ آٹھویں دن روح بھی گھر دیکھ جاتی ہے
خدا وہ دن نہ دکھلائے نہ دیکھوں لکھنؤ برسوں

وطن سے جانے کے بعد بھی وطن کی بربادی کی خبریں سننے میں آتی رہیں تو رنج ہوتا ؎

لٹ گئے باشندگان لکھنؤ گھر ڈھد گئے
خاک اڑاتے ہیں بگولے خانۂ برباد کے

بھیک مانگیں جو ملازم تو عجب کیا ہے سحر
آج کل باب عطا بند ہے دربار وں میں

حسین آباد میں جو جھاڑ فانوس لگے ہوئے تھے لکھنؤ پر تسلط کے بعد انگریزوں نے غالباً انھیں لے جا کر اپنے گرجا میں لگا لیا تھا۔ اس پر سحر نعل در آتش تھے ؎

نور ایمانی کو کفرستان میں بھی ہے فروغ
جھاڑ گرجا گھر میں روشن ہیں حسین آباد کے

یہ وہی جھاڑ تھے جن کے متعلق انھوں نے پہلے کہا تھا ؎

جلوہ کیا کیا ہے حسینوں کے قد پر نور کا
کیسے کیسے جھاڑ روشن ہیں حسین آباد میں

معلوم ہوتا ہے کہ سحر رستم نگر میں رہتے تھے ؎

بر لاؤ اپنے بندۂ درگاہ کی امید
صاحب گزر کرو کبھی رستم نگر کی راہ

سحر نے سراپا نگاری اور منظر کشی خوب کی ہے۔ ان کی تمام غزلیں اس وصف سے پُر ہیں ایک مسلسل غزل کے دو شعر ہیں۔

جڑاؤ چوڑیوں کی ہاتھوں میں پہین کیا خوب
بھرے بھرے ترے بازو پہ نورتن کیا خوب
کچوری چوٹی کے قربان واہ کیا کہنا
نثار بیریوں کے موبو شکن کیا خوب

سحر کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان کی غزل ادا بندی کا مرقع ہو اور ہر شعر میں معشوق کی تصویر کھینچ کہتے ہیں ؎

غزل ایسی ہو مرقع جو ادا بندی ہو
سحر ہر بیت میں معشوق کی تصویر کھینچے

ان کی متفرق غزلیں جن میں اس قسم کی ادا بندی ہوئی ہے دیکھئے تو اس طرح کے شعر نظر آئیں گے ؎

نہا کے یار نے بالوں کو جب نچوڑا ہے
دکھا دیا ہے سماں ناگنوں کے جھالوں کا

ہے موج نسیم سحری ہونٹوں کی جنبش
ہنستے ہو تو بن جاتا ہے غنچہ سا دہن پھول

آج ہنسنے میں جو سب دانت تمھارے دیکھے
ہم نے اک برج میں بتیس ستارے دیکھے

تعریف کیا تناسب اعضا کی کیجئے
ہے بین بین اس کی کمر قد میانہ ہے

بدن کے رنگ کے کپڑے پہنے تھے ایسے نہا فشاں
کہ چادر پچھوڑی کی تھی دوپٹا جامدانی کا

سارے کپڑے بن گئے پُر زر فروغ حسن سے
موتیے کا ہار پہنا سلک گوہر ہو گیا

[illegible] عشق کا جو بن ہو گیا
یار کے [illegible] روشن ہو گیا

جسم ایسا گھلا ہے کہ کپڑے چمک اٹھے
تنزیب کو ترے حُسن نے کمخواب بنایا

اس گل بدن کی بو ہے بدن کچھ نہ پوچھئے
بندِ قبا جو کھول دیئے گھر مہک گیا

آکے بیٹھے جو کبھی تیر کی صورت بیٹھے
چلے اٹھ کر تو وہ تلوار کی رفتار چلے

بادہ خواری کی یہ تعزیر ہے خمیازہ نہیں
مار ڈالے گا شکنجہ مجھے انگڑائی کا

بحر زبان اور محاورے کے بادشاہ تھے لیکن اپنی زباں دانی اور محاورہ بندی کی ترنگ میں ایسی ایسی تلمیحات استعمال کر جاتے جو عوام کی سمجھ سے باہر ہوتی تھیں مثلاً ؎

قامتِ جاناں ہے میں منزلِ اوّل مجھے
کاکلِ شبگوں ہے جادہ وادیٔ آفات کا

وادیٔ آفات کی تلمیح طلسم ہوش ربا سے لی گئی ہے۔ آفات چہار دست ایک جادوگرنی ہے جو اس وادیٔ آفات میں رہتی تھی اسی کو تلمیحاً استعمال کیا ہے۔ اسی طرح ؎

قطمیر سے کروں گا سگِ یار کا گلا
مرقد کے غار میں جو ہوئیں ہڈیاں خراب

قطمیر سگِ اصحاب کہف کا نام تھا۔ اسی سے یہ تلمیح رواج پائی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مقامی تشبیہات، استعارات اور نام بھی بحر نے بڑی خوبی سے استعمال کئے ہیں۔ جگہ جگہ ہندوستانی ناموں میلوں ٹھیلوں، تماشوں کا ذکر کیا ہے ؎

ایک دن ٹوکا تھا اس کے شوخ رخسار کو
بھر دیا لوگوں نے انگاروں سے منہ تنور کا

سن کے میری سرگزشت احباب یہ کہنے لگے
بحر کا قصہ بھی افسانہ ہے رانجھا ہیر کا

گلے کا ہار تعشق ہے گورے گالوں کا
گلی میں یار کی میلہ ہے پھول والوں کا

میرا رونا اہلِ دنیا کو تماشا ہو گیا
میں جہاں رویا وہاں گنگا کا میلہ ہو گیا

نہ رہا نل نہ پرسرام نہ فرہاد نہ قیس
رہ گیا چار ہی دن عشق کا چرچا ہو کر

محاورات اور ٹھیٹھ الفاظ تو بحر پانی کی طرح استعمال کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کے بحر مواج کے قطرے ہیں ؎

زندگی ہے جو کھلی رہتی ہے کھڑکی لب بام
میں گلا کاٹتا اپنا جو وہ تیغا کرتے

زخم کانٹوں کے جگر میں ہیں گلوں کے داغ ہیں
شکوۂ اعدا کروں میں یا گلہ احباب کا

دوپٹا وہ گلنار دکھلا گئے
نئے سر سے پھر آگ بھڑکا گئے

بادہ خواروں کا ہے دماغ قوی
دُردِ مے بھی انھیں حریرہ ہے

ایک دن ہو جائے گا وحشی سیہ کاری کا حال
دونوں بغلوں میں بھرے ہیں کہ جوڑا سانپ کا

نہ ہوگا فرق نقطے کا ملا کر دیکھ لے کوئی
مرے اعمال نامے سے نوشتہ میری قسمت کا

اڑیں جو دوست تو جھک کر اڑیں یہ لازم ہے
وہ ٹھاٹھ باندھیے جیسا کہ ہو ہاتھ پاکٹ کا

خانہ برباد ہوں ققنس کی طرح عالم میں
آگ قسمت نے لگا دی ہیں جسے گھر سمجھا

دوست کے دل میں عداوت اسے کیا کہتے ہیں
جامِ غوری میں بھرا زہر ہلاہل دیکھا

خوش لباسی کی ہوس نے کیا پیری میں ظہور
خط کشی جھریوں نے کی ہوا اتو پیدا

حسنِ نمکیں کو لے کے چاٹیں ؟
جب اپنی ہی زیست بے مزا ہو!

کیا غضب آتے ہیں آنکھوں کو تری چھل بٹے
اے پری جان مستی بھی یہ ہنر کیا جانے

داغ، امیر، جلال وغیرہ بحر کے ہم عصر تھے۔ مگر ان لوگوں نے انگریزی الفاظ استعمال نہیں کئے اور اگر ضرورتاً کبھی کیا بھی تو توڑ مروڑ کر مثلاً استاد داغ کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ وہسکی کیا ہے۔ حضور نظام نے ایک شعر میں وسکی کا لفظ استعمال فرمایا تھا غزل داغ کے پاس اصلاح کے لئے آئی تو داغ نے وسکی کو ہسکی بنا ڈالا حضور نے پوچھا تو کہا ہسکی میں نے اس لئے بنا دیا ہے کہ اب ہسکی بولتے ہیں وسکی اور وسکی نہیں بولتے۔ حضور نظام بے اختیار ہنس پڑے اور فرمانے لگے استاد یہ نہ پینے کی خوبی ہے۔ اسی طرح داغ ٹونڈ کو

ہیٹ ٹوپ کئے تھے بخلاف ان کے بحر نے بڑی بے تکلفی سے انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ بے تکلفی سے استعمال کئے ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

مختار ہیں وہ لکھیں نہ لکھیں جوابِ خط
صاحب کو روز اپنا عریضہ رپورٹ ہے

توڑا آفتِ دردوں نے رگِ جاں کا ہیرا ہو
نالہ کروں تو برجِ فلک پے رفل چلے

سر پر سفیدی آگئی ساقی معاف رکھ
اس برج کی ہوا نہ رکھو شمپین سے

پرانے لوگ علم نفسیات سے کما حقہ واقف تھے۔ دنیا میں جینا اور لوگوں کو اپنا بنانا جانتے تھے۔ بحر بھی اسی طرح اس فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے جگہ جگہ اس کی تلقین کی ہے ۔

آدمی کیا دیو ہوتا ہے اطاعت سے مطیع
یہ ہمارے تجربے میں ہے عمل تسخیر کا
اے بحر قلب و روح کی تسخیر سیکھ لے
الطاف کی نگاہ سے شفقت کی آنکھ سے

خلق کی باتوں سے بیگانے کو اپنا کیجئے
چال وہ چلئے کہ دل میں راہ پیدا کیجئے

اسی فن زندگی سے واقفیت اور اسے برتنے کی وجہ سے بحر کی زندگی بھی اصولی تھی اور ان کا اخلاق بھی بہت بلند تھا ۔

پیار کی آنکھ سے دشمن کو بھی جو دیکھتے ہیں
ہم نے ایسے بھی ہیں اللہ کے پیارے دیکھے

کہے مجھ کو جو جس کا جی چاہے لیکن
کبھی مجھ سے ہوگی نہ غیبت کسی کی

[illegible]
[illegible] کیا کرتے ہیں

بعض [illegible] سے جو رنج دیتے ہیں
بعض اللہ [illegible] ایسے ہیں جو ہم کو شاد کرتے ہیں

یہ ہو غلط نہ بولیں گے جو یہ دعا ہے
یہ کان سنیں کوئی نہ الزام کسی کا

آخر میں بحر کے کچھ اور اشعار پیش ہیں۔

رسائی در یار تک مدعا ہے
گدائی بھی ہے اک بہانا ہمارا

یہ حالِ ناتوانی ہے کہ آنکھیں
کھلیں جو ایک دم تو دو پہر بند

یہ کیا کہا کہ وہ خط کا جواب لکھیں گے
مجھے اڑاتا ہے فقرے یہ نامہ بر کے ہیں

مجھ کو بھی آپ سے گلہ ہے!
پوچھا نہ کبھی کہ حال کیا ہے!

میں دوڑ رہا ہوں اس کے پیچھے
جو سایہ سے اپنے بھاگتا ہے

جنت کی آرزو ہے جہنم کا خوف ہے
اعراف میں ہے جان ہماری ادھر میں ہے

کہا کسی نے نہ اتنا ہمارے دفن کے وقت
کہ خاک ڈالو نہ ان پر یہ ہیں نہائے ہوئے

عہ۔ بحر لکھنوی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ عروض کے بڑے ماہر تھے۔ انھوں نے زحافات کو اشعار میں نظم کیا تھا۔ جناب قدر بلگرامی نے اپنی مشہور کتاب "قواعد العروض" مطبوعہ شام اودھ ہلالِ نمائے عید (۱۲۸۵ھ) میں اس کے متعلق لکھا ہے: "جناب شیخ امداد علی صاحب بحر لکھنوی سلمہ اللہ نے زحافات کو نہایت حسن اختصار سے چند اشعار میں قلم بند کیا ہے" (ص۹۵) اس کے بعد بحر کے اشعار دیئے گئے ہیں۔ (ایڈیٹر)

✱

"میں ایک ایسا ہندوستان تعمیر کرنے کی کوشش کروں گا جس میں غریب سے غریب بھی یہ محسوس کر سکے کہ یہ اس کا اپنا ملک ہے جس کی تعمیر میں اس کی آواز کو ایک خاص وزن حاصل ہے ایک ایسا ہندوستان جس کے باشندوں میں نہ اعلیٰ طبقہ ہوگا نہ ادنیٰ۔ ایک ایسا ہندوستان جس میں تمام فرقے مکمل یگانگت اور اتحاد کی زندگی بسر کریں گے۔ اس ہندوستان میں چھوت چھات یا منشیات کی لعنت نہ پائی جائے گی۔ عورتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مردوں کو ہیں۔"

——— مہاتما گاندھی

راشٹر پتا

(امید قرباشیوی)

تاریخ کے سینے میں پنہاں ابلیس کی کتنی گھاتیں ہیں
جب عقل بدیسی حاکم کی سو ظلم اُگلتی رہتی تھی
جب جھوٹے سچے سکّوں سے ایمان خریدے جاتے تھے
ظلمت کا بسیرا تھا ہر سو گھنگھور گھٹائیں چھائی تھیں
اک مہرِ درخشاں بن کر پھر اس دنیا میں موہن آیا
خود اُس نے جو کچھ بھی سمجھا بے کھٹکے سب کو سمجھایا
وہ بنسی چھیڑی موہن نے بھارت کا انساں جاگ اٹھا
آزاد کے جوہر جاگ اٹھے اجمل کی وفا بیدار ہوئی
سونے والے جاگ اٹھے اور نیند کا دامن چھوڑ دیا
اک شمع جلائی گاندھی جی نے لاج رکھی پروانوں نے
جب مہر و محبت عام ہوئی جب دل میں وفا کے دیپ جلے
جو راشٹر پتا نے سپنا دیکھا اس کی ہمیں تعبیر ملی
پردے میں اجل کے باپو نے جینے کا ہمیں پیغام دیا
امید اسی آزادی کے متوالے کو پرنام کر دو!
دیوار تعصب کی ڈھا کر نفرت کو مٹا دو دنیا سے
جس سمت بڑھو مل جل کے بڑھو جو کام کرو اک ساتھ کرو
جب ہاتھ اٹھاؤ مہر و وفا یاد آئے دعا خود باپو کی

لیکن انھیں ظالم گھاتوں میں کچھ ہمت کی بھی باتیں ہیں
سینے پہ نہتے انساں کے جب گولی چلتی رہتی تھی
جب دولت کے بل بوتے پر انسان خریدے جاتے تھے
نفرت کا اندھیرا پھیلا تھا ہر سمت جفائیں چھائی تھیں
ظلمت کی گھٹائیں چھٹنے لگیں اور نور کا پرچم لہرایا
اور لے کے کسانوں مزدوروں کو اس نے ترنگا لہرایا
خود جوت جواہر کی جاگی موتی کا ارماں جاگ اٹھا
لڑنے کو اہنسا کی چھاؤں میں فوج نئی تیار ہوئی
پھر جال غلامی کے سپنوں کا سب نے مل کر توڑ دیا
اور ماتا کے سنگھار کی خاطر خون دیا دیوانوں نے
جب ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کے سب اک ساتھ چلے
اور بھارت کے انسانوں کو آزادی کی تقدیر ملی
خود گھائل ہو کر بے امنی کو امن و اماں کا جام دیا
جو درس دیا باپو جی نے اس درسِ وفا کو عام کرو
انوارِ محبت پھیلاؤ ظلمت کو مٹا دو دنیا سے
اک ساتھ اٹھو اک ساتھ چلو اک ساتھ جیو اک ساتھ مرو
دل اس طرح اپنا دھڑکا دو بن جائے صدا خود باپو کی

ماسٹر جی

رفعت نواز

"سنو، سارا سر"

"یس سر" میں رضائی کے اندر سے ہی جواب دیتا ہوں۔ اور سوچتا ہوں کہ اس شدت کی سردی میں نرم و گرم بستر چھوڑ کر، دروازہ کھول کر اپنی اخلاقی قدر کا ثبوت دینا چاہیئے یا رضائی کو اپنے چاروں طرف لپیٹ کر مزے سے سوجانا چاہیئے، لیکن ہر دن خیال اول بازی لے جاتا ہے۔ اور میں حسب معمول دو تین بار رضائی میں ہی کروٹیں بدل کر اٹھ جاتا ہوں اور انگڑائیاں لیتے ہوئے آنکھیں مچماتے ہوئے دروازہ کھولتا ہوں۔

"گڈ مارننگ" میں بالکل روکھے لہجہ میں کہتا ہوں۔

"گڈ مارننگ" بڑی بشاشت سے جواب ملتا ہے۔

میں کبھی کبھی دونوں لہجوں کے صوتی تاثر کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے میرا گڈ مارننگ بے انتہا تھکن، بیزاری اور لاپروائی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اور جوابی گڈ مارننگ بشاشت، تازگی اور شیرینی رکھتا ہے اور کانوں کو بہت بھلا لگتا ہے۔ اور یہیں سے میں ماسٹر جی کی عظمت تسلیم کر لیتا ہوں۔ "عطیہ! عطیہ" کہتے "یہ" کو کھینچتے ہوئے میں اپنے بستر کی جانب حسرت سے دیکھتا ہوں۔ اس اثنا میں میرا ذہن گھڑی کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ اور میرے کان گھنٹوں کی آواز کے منتظر ہوتے ہیں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ماسٹر جی کے آنے سے دو تین منٹ قبل چھ بج چکے ہوتے ہیں یا اس وقت تو ضرور ہی بج اٹھتے ہیں جب میں خمار آلود آواز میں عطیہ کے "یہ" کو کھینچتا رہتا ہوں۔ میری اس پکار میں ایک طرح کی جھلاہٹ اور کسی چیز کے چھن جانے کا غم ہوتا ہے۔

عطیہ یا تو ماسٹر جی کے آنے سے پہلے ہی جگ چکی ہوتی ہے۔ اور اگر سوتی ہوئی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ دو چار چھپکے منہ پر مارتی ہے اور موتیا کی بیل سے چار چھ پھول اپنے جوڑے میں اڑس کر دوپٹہ سے منہ پونچھتی ہوئی کمرہ میں آجاتی ہے۔

"آداب۔ ماسٹر صاحب!"

"آداب"۔ وہی لہجہ کی بشاشت اور زندگی کا پیغام۔

میں ایک بار پھر کمرہ کا جائزہ لیتا ہوں۔ ماسٹر جی اپنا موٹا گرم کوٹ پہنے کرسی پر بڑے اطمینان سے ڈٹے ہوتے ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ بدستور کپکپاتا رہتا ہے (جس کے متعلق ماسٹر جی نے کہا تھا کہ یہ الکٹرک شاک کا اثر ہے۔ وہ میز پر دونوں پیر پھیلائے ہوتے ہیں جو نہ جانے کتنے عرصے سے جوتوں کے لئے ترس گئے ہیں اچھا جا پیروں نے تڑخنا شروع کر دیا ہے۔ کتنے جاڑے کتنی برساتیں اور کتنی گرمیاں گزر گئیں۔ لیکن جوتا، چپل یا اس قبیل کی کوئی چیز میسر نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔

ماسٹر عطیہ کو مراٹھی پڑھانا شروع کر دیتے ہیں اور میں دالان

میں آرام کرسی پر اکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں اور ہمیشہ کی طرح یہی خیال کرتا ہوں کہ بہر حال آج تو اپنا پلنگ ضرور کسی دوسرے کمرے میں منتقل کر دوں گا۔ تاکہ روز روز کی جھلاہٹ سے نجات ملے۔ صبح ہی صبح جگ جاؤ۔ کپکپاتے بیٹھے رہو، یا باورچی خانہ کے چکر لگاتے رہو کہ کب چائے بنے۔ لیکن جوں جوں دھوپ آنگن میں اترنا شروع ہوتی ہے کمرہ بدلنے کا خیال کم ہوتا جاتا ہے۔ اور جب شام کی چائے پی کر میں باہر دوستوں سے ملنے نکل جاتا ہوں اور رات میں گیارہ بارہ بجے لوٹتا ہوں اور بلا کھٹکے باہر سے لگی کنڈی کھول کر اپنے کمرہ میں جاکر اطمینان کا سانس لیتا ہوں تو اس وقت اپنے کمرہ کی افادیت کا مجھے احساس ہوتا ہے۔ کتنا کار آمد ہے یہ کمرہ جو بیک وقت میرا کمرہ بھی ہے اور گھر کا دیوان خانہ بھی۔ بھائی میاں کی اور میری مشترکہ لائبریری بھی۔ اور چھوٹے بچوں کے لئے گھر سے چرائی گئی چیزوں کو رکھنے کا اڈہ بھی۔ سکنڈ شو دیکھ کر جب میں لوٹتا ہوں اور گھر میں کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی تو کمرہ کی عظمت کا احساس اور بڑھ جاتا ہے اور میں کمرہ تبدیل کرنے کا خیال یکسر اپنے دماغ سے نکال دیتا ہوں۔

صبح ہوتی ہے۔ پھر وہی مانوس آواز آتی ہے۔ ہمیشہ کی طرح گھڑی چھ بجاتی ہے۔ میں حسب عادت جھلاہٹ کے ساتھ دروازہ کھولتا ہوں۔ روز کی طرح سوچ اپنا کام کرتی ہے۔ چند گھنٹے وہی جھلاہٹ اور کمرہ تبدیل کرنے کا خیال رہتا ہے۔ اور پھر حسب معمول زندگی اپنی پچھلی رفتار پر آجاتی ہے۔ زندگی جس میں کوئی تبدیلی نہیں۔ جو مانوس طریقہ پر گھسٹ رہی ہے۔

"سر، سار، سر!"

آج میں اس آواز میں ایک طرح کا غصہ محسوس کر رہا تھا۔ میں پہلی آواز پر ہی بستر سے اٹھ بیٹھا۔ دروازہ کھول کر میں نے گوڈ مارننگ کہا۔ ماسٹر جی نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا "گوڈ مارننگ" میں نے ان کے چہرے کو دیکھ کر ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا چاہا۔ میں نے بہتوں سے سنا ہے اور کئی دفعہ پڑھا بھی ہے کہ انسان کا چہرہ اس کے جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے لیکن دھند اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ

ماسٹر جی کی دھندلی سی مانوس شبیہ نظر آئی اور وہ بھی شاید میرے زیادہ تصور کا نتیجہ تھی۔

میں نے ماسٹر جی کو کمرہ میں بٹھایا اور عطیہ کو آواز دینے لگا مگر آج میری آواز میں نامعلوم سا خوف پایا جاتا تھا۔ گھڑی نے سات کے گھنٹے بجائے۔ میں نے حیرت سے گھڑی کے قریب جاکر سوئیوں کو بغور دیکھا سات ہی بجے تھے۔ مجھے یقین نہیں آیا میں نے ڈیسک کو رکھ کر رسٹ واچ دیکھی "ہاں سات ہی تو بجے ہیں" میں نے مزید اطمینان کے لئے ماسٹر جی سے ہی پوچھا۔

ماسٹر جی نے میری بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے لاپرواہی کے ساتھ جیب سے گھڑی نکالی اور اسے ایک محدب عدسہ کو جیسے وہ عینک کی بجائے استعمال کرتے ہیں سیدھی آنکھ پر پہلی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے جاکر دیکھا۔ "سات بج کر دس منٹ ہو رہے ہیں میں سمجھتا ہوں میری گھڑی شاید سات منٹ تیز چل رہی ہے۔"

"ماسٹر جی آج آپ...." میں پوری بات بھی ختم نہیں کر پایا تھا کہ وہ عطیہ کے ہوم ورک کی کاپی پر املا کی غلطیاں درست کرتے ہوئے اور بغیر میری طرف متوجہ ہوئے بولے۔ "آج میں وقت پر ہی یہاں آرہا تھا لیکن زینہ کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا کہ ایک چھپکلی میرے کندھے پر آگری اور ہمارے یہاں اصول ہے کہ اگر چھپکلی جسم سے چھو جائے تو بغیر اشنان کئے کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔"

میں اپنے مطلب کی بات سن کر پھر دالان میں آگیا اور سوچنے لگا ماسٹر جی کٹر روایت پرست آدمی ہیں۔ سخت پرانے قسم کے ایسے آدمی مجھے کم ہی متاثر کرتے ہیں لیکن ماسٹر جی کا میں بہت ادب لحاظ کرتا تھا، بلکہ ایک حد تک میں ان سے مرعوب بھی تھا، حالانکہ کبھی ماسٹر جی نے مجھے ڈانٹ ڈپٹ تو درکنار بے اعتنائی سے گفتگو بھی نہیں کی۔ صورت شکل، چال ڈھال، بات چیت سے تو وہ مجسم "ماسٹر جناب" تھے۔

ماسٹر جی در اصل مراٹھی پڑھانے کے لئے رکھے گئے تھے لیکن وہ تقریباً ہر مضمون پڑھا لیتے تھے حتیٰ کہ بعض وقت تو [illegible]

[illegible] وقت میں نے
[illegible] ایک خاص قسم کا رجحان دیکھا ہے۔ ماسٹر
[illegible] پاس ہوتے لیکن میری بیاضت
[illegible] ادب، سیاست، مذہب غرض کہ
[illegible] ایک دفعہ غیر ملکی ادیبوں کے متعلق
[illegible] کا عظیم کہانی نگار گذرا ہے۔ اس کی
[illegible] بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جاسوسی ہوا کرتی
تھی۔ [illegible] اس کا عظیم کردار شرلاک ہومز ہے" میں نے دخل
دیتا معلومات [illegible] ہوئے اپنی علمی سوجھ بوجھ کا اظہار کرنا چاہا کہ
[illegible]..." اور کوئی بات نہیں یہ سب Over
Knowledge کا نتیجہ ہے۔ بعض دفعہ اس قسم کا Crises
[illegible] ہے۔ اسے ادبی اصطلاح میں Literary Crisis
کہتے ہیں۔ خود ڈاکٹر جانسن اس قسم کے Crisis میں مبتلا تھا
جسے باسول نے Johnsons Contradiction سے موسوم
کیا ہے۔ اور شکسپیر کے متعلق شاید بھی اسی قسم کے کرائسس کا شکار
ہوا تھا۔" میں مزید ادبی گفتگو سننے کی تاب نہ لاکر کمرہ سے باہر
چلا گیا۔ اور وہ عطیہ سے بڑی لاپرواہی سے کہنے لگے "ابھی بچہ
ہے احمق..."

ماسٹر جی کی ایک لڑکی بھی تھی شاید نیلما، نیلم، یا نلنی، یا اسی قسم
کا کچھ نام تھا۔ میں نے ہمیشہ ماسٹر جی کی زبانی نیلی ہی سنا تھا۔
اس کا تذکرہ ماسٹر جی بڑے چاؤ سے کرتے۔

ایک دن عطیہ کسی کام کی وجہ سے مکان میں چلی گئی اور کمرہ
میں [illegible] میں اور ماسٹر جی رہ گئے تو ماسٹر جی نے کہا "امجد میاں عطیہ
بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ میں نے ہیرت صاحب کی زبانی سنا
ہے۔ وہ لڑکا کیسا ہے، کچھ پتا کر تو ہو گا ہی؟"

میں نے بغیر دلچسپی لئے "ہاں" کہہ دیا۔

"نیلی بھی شادی کے قابل ہو گئی ہے۔ اس سال وہ بی۔ اے
[illegible] پاس کرے گی۔ اس کی شادی کی بڑی فکر ہے لیکن لڑکا
[illegible] ملتا۔ جو ملتے ہیں یا تو بیکار ہوتے ہیں یا معمولی درجہ کے

[illegible] کم تم جاننے ہو کہ تعلیم یافتہ ہے۔ کم از کم اوسط گھرانے کا کھاتا
کماتا لڑکا تو ملنا ہی چاہئے۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" میں نے بڑی بے دلی سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔
ماسٹر جی بولتے رہے "ہاں امجد! تو میں نیلی کے لئے بر اس کے انٹر
پاس کرنے کے بعد ہی سے تلاش کر رہا ہوں۔ مگر اب تک کوئی مناسب لڑکا
نہیں ملا۔ اگر کوئی ملتا بھی ہے تو بڑی بڑی رقمیں مانگتا ہے، ہزاروں
کی باتیں کرتا ہے، سودا کرنا چاہتا ہے۔ جہیز دینے کی رسم بڑی جان
لیوا بنتی جا رہی ہے۔"

میں نے دیکھا ماسٹر جی کے چہرے پر عجیب طرح کی بیچارگی چھا گئی تھی
اور ان کی آنکھوں کی مدھم سی چمک بھی بجھنے لگی۔ ان کی آواز بھرا گئی۔
بڑے مایوسانہ لہجے میں کہنے لگے "امجد میاں! شاید نیلی کے لئے کوئی
بر نہ مل سکے گا اور یہ بوجھ دل پر لئے ہی میں دنیا سے چلا جاؤں گا۔"

"ماسٹر صاحب! آپ کے لڑکے مدد نہیں کرتے۔ وہ تو لازم ہیں
نا؟" میں نے ماسٹر جی کے غم کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"امجد میاں تم تو پڑھے لکھے ہو۔ پھر بھی بچوں جیسی باتیں کرتے
ہو۔ بھلا اب وہ میری امداد کیوں کرنے لگے۔ سب گھر گرہستی سے لگ گئے
ہیں۔ وہ تو اب پوچھتے بھی نہیں مجھے۔ اگر امداد کرتے تو بڑھاپے میں دربدر
یوں مارا مارا پھرتا؟ نیلی کے بیاہ کی فکر اور غم مجھے اس طرح کھائے
ڈالتا ہے۔"

ماسٹر جی کی آواز اور گلوگیر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے
ضبط کا بندھن ٹوٹنے ہی والا ہے۔ میں نے ایسے موقع پر کھسک
جانا ہی بہتر سمجھا کیوں کہ میری موجودگی سے شاید ماسٹر جی کو اپنے
اوپر قابو رکھنا ناممکن ہوتا۔ پانچ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں
نے ماسٹر جی کو اس طرح غمگین اور دکھی دیکھا تھا۔

عطیہ کی شادی رفیع سے طے ہو گئی تھی۔ ماسٹر جی کو جواب دیدیا
گیا۔ شادی کا رقعہ خود میں نے ماسٹر جی کو دے جا کر دیا تھا انہوں نے
عقد میں شرکت کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن وہ عقد کے وقت نہیں آئے
اور ہم سب تمام دن ان کا انتظار کرتے رہے۔ میں سارے دن
ان کے نہ آنے کی وجہ پر غور کرتا رہا۔ ایک دو بار خیال آیا کہ ان کے

گھر تک پہنچا آؤں اور انھیں بلا لاؤں۔ عطیہ کو دلھن بنے انھیں دیکھنے کی آرزو جو تھی! لیکن مہمانوں کے ہنگامے میں میں کچھ بھی نہ کر سکا۔

آرسی مصحف سے قبل میں دالان میں بیٹھا جہیز میں دی جانے والی چیزوں کی فہرست مرتب کر رہا تھا کہ جاوید نے اطلاع دی کہ ماسٹر جی آ گئے۔ میں دوڑا دوڑا دروازے تک گیا اور جاتے ہی شکایتوں کا طومار باندھ دیا۔

ماسٹر صاحب نے بمشکل اتنا کہا "دراصل بات یہ تھی..." اور انکی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو رواں ہو گئے۔ انھوں نے کوٹ کی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "میں خواہ مخواہ جذباتی بن گیا تھا۔ ایسے موقعوں پر صبر و ضبط سے کام لینا چاہئے۔ کہاں ہے عطیہ بیٹی میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں اور "یہ کچھ" ہے۔

"ماسٹر صاحب نیلی نہیں آئی" عطیہ نے بہت آہستگی سے کہا "نہیں وہ نہ آسکی۔ یہ ایک ادنیٰ سا تحفہ قبول کرو بیٹی"۔ اور ماسٹر صاحب تیزی سے باہر نکل گئے۔ "میں یہاں ایک ضروری کام جا رہا ہوں۔ خدا جوڑا سلامت رکھے۔"

میں ماسٹر صاحب کا دیا ہوا تحفہ دیکھنے کی خاطر عطیہ کے کمرہ تک گیا۔ رقیہ کے ذریعہ میں نے بکس منگوایا جو تحفۃً ماسٹر صاحب نے دیا تھا۔ بکس بڑا خوبصورت تھا، اندر سے ایک نکلس نکلا۔ جس پر بڑی نزاکت سے مہر کھدا ہوا تھا۔

دوسرے دن عطیہ آ گئی۔ رحمت بی بھی چپلیں گھسیٹتی حیران پریشان گھر میں داخل ہوئیں۔ رحمت بی جب بھی آئیں سمجھ لیجئے کوئی زحمت ضرور ہوگی۔

"بیگم صاحب سنا آپ نے نیلی نے باؤلی میں کود کر جان دیدی۔ ہائے بیچاری!"

میں حیرت سے رحمت بی کا منھ دیکھنے لگا۔ بھاگا بھاگا ہوا ماسٹر کے گھر پہنچا لیکن وہ وہاں موجود نہ تھے۔ اور پھر آج تک پتہ نہ چلا کہ ماسٹر جی کہاں گئے کیا ہوئے۔

گلہائے عقیدت

سعید اختر نعمانی

اک امیر کارواں اک راہبر پیدا ہوا — دیدہ ور پیدا ہوا صاحب نظر پیدا ہوا
ایک درویش ہمہ اخلاص و صدق باصفا — اک جلیل القدر، اک فخر بشر پیدا ہوا
اک اہنسا کا علمبردار اک حامیٔ حق — آشتی کا "امن کا پیغامبر پیدا ہوا
اک معلم، اک مفکر، محرم راز حیات — ایک نکتہ سنج، اک بالغ نظر پیدا ہوا
مصلح اعظم، مسیح عہد نو، نباضِ وقت — رگ شناس و چارہ ساز و چارہ گر پیدا ہوا
آفتاب نو پئے تسخیر ظلمت ہائے دہر — قاصد انوار و تنویر سحر پیدا ہوا
غیرت خلد بریں، زینت دہ باغ ارم — گلشن ہستی میں گل افشاں شجر پیدا ہوا
کیوں نہ ہو اب عام رسم اختلاط باہمی — کارگاہ دہر میں اک شیشہ گر پیدا ہوا
مژدہ اے گم کردہ جادہ بہ عزم رہبری — سرزمین ہند میں آج اک خضر پیدا ہوا

ناز کر اے مادر بھارت کہ تیرے بطن میں
"گاندھی" فرخ قدم، فرخ سیر پیدا ہوا

بعض اشعار کا غلط انتساب — ۴

حنیف نقوی سمنؤانی

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

میر دیکھو سر ہر خار کو لے دشت جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

یہ دونوں شعر مختلف جگہ مختلف شعرا کے نام سے میری نظر سے گزرے ہیں۔ کچھ لوگ آصف اور خاں تخلص کے دو مجہول الاحوال شعرا سے منسوب کرتے ہیں، کچھ منور خاں غافل لکھنوی سے اور کچھ میر سے۔ (پہلا شعر یوسف حسین خاں نے "اردو غزل" میں صفحہ ۲۳۹ پر میر کے نام سے اور صفحہ ۲۹۵ پر انتخاب کلام غافل کے تحت نقل کیا ہے) در حقیقت پہلا شعر غافل لکھنوی کا ہے اور دوسرا میرزا محمد تقی ہوس کا۔ غافل کا دیوان نول کشور پریس سے شایع ہو چکا ہے۔ ہوس کا دیوان قلمی گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ مذکورہ دیوان میں اس زمین میں ایک مکمل غزل موجود ہے۔ اس کے علاوہ مصحفی نے "ریاض الفصحا" میں اس غزل کے کئی شعر ہوس کے ذکر میں نقل کئے ہیں؛ یہ شعر اس انتخاب میں بھی شامل ہے۔ میر سے انتساب کی بنیاد مندرجہ ذیل شعر ہے جو علامہ شبلی نے "شعر العجم" میں غالباً فردوسی کے تذکرے میں نقل کیا ہے —

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

یہ شعر قطعی طور پر الحاقی ہے۔ کلام میر سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن میر تخلص کے ساتھ شہرت عام کی بنا پر جس طرح علامہ شبلی کو غلط فہمی ہوئی اسی طرح دوسرے مصنفین نے بھی یہ مقطع اور اسی کے ساتھ اس زمین کے دوسرے مشہور شعر بھی میر سے منسوب کر دیئے۔

قاتل ہماری لاش کو تشہیر دے ضرور
آئندہ تا کسی سے نہ کوئی وفا کرے

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کے نقیب پندرہ روزہ "قومی زبان" کی اشاعت مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۵۸ء میں ایک مستقل عنوان "غزل نما" کے تحت اشرف علی خاں فغاں (متوفی ۱۱۸۶ھ) کی غزلیات کا ایک مختصر انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب شاعر موصوف کے دیوان، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن و شایع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان پر مبنی ہے۔ منتخب اشعار میں مندرجہ بالا دونوں شعر بھی شامل ہیں جو در اصل فغاں کے نہیں سودا کے ہیں۔ اس زمین میں سودا کی غزل "کلیات سودا" مرتبہ عبدالباری آسی و شایع کردہ نول کشور پریس لکھنؤ جلد اول صفحہ ۲۱۰ پر موجود ہے۔ سودا نے خود ہی اس غزل کی تخمیس بھی کی ہے جو مخمسات کے تحت مذکورہ کلیات میں صفحہ ۴۳۲، ۴۳۳ پر درج ہے۔

؎ اس عنوان سے تین قسطیں "نیا دور" کی تین اشاعتوں میں شایع ہو چکی ہیں اور آج چوتھی قسط شائع کی جا رہی ہے۔ اڈیٹر

سکتے اضداد پیدا، قدرتاً معلوم ہوتے کی
جسم کے مقابل ظلمہ جاودان کیا پیدا

کوئی بانی ہے بیشک محفل زیبائے عالم کا
نہ ہوں منظم مجلس نہ جب تک مجلس آرا ہو

ڈاکٹر نورالحسن نے اپنے تحقیقی مقالے "دلی کا دبستان شاعری" میں صفحہ ۳۲۳ پر یہ دونوں شعر میر حسن سے منسوب کئے ہیں لیکن درحقیقت ان کے نہیں، راسخ عظیم آبادی شاگرد میر کے ہیں اور ان کے مطبوعہ کلیات کے صفحات ۱۰۵، ۱ پر موجود ہیں۔

بلند و پست عالم کا بیاں تحریک کرتا ہے
قلم ہے شاعروں کا یا کوئی رہبر ہو بیہڑ کا

"دلی کا دبستان شاعری" میں صفحہ ۳۳۱ پر یہ شعر ناسخ سے منسوب ہے۔ دراصل ان کے ہمعصر خواجہ آتش کی تخلیق ہے اور ان کے کلیات مطبوعہ نول کشور پریس کے صفحہ ۳۲ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس غزل کا مقطع کسی حد تک مشہور بھی ہے اور اچھا بھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سمجھ لیتے ہیں مطلب اپنے اپنے طور پر سامع
غزل آتش کی رکھتی ہے اثر مجذوب کی بڑ کا

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں ایک خانہ خراب ہیں دونوں

عام طور پر یہ شعر میر کے نام سے مشہور ہے اور ان کے کلام کے کئی انتخابوں میں میری نظر سے گزرا ہے۔ یہاں تک کہ اردو کے مشہور اور بلند پایہ محقق ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مرتبہ "انتخاب کلام میر" شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ صفحہ ۱۲۰ پر بھی موجود ہے۔ مگر قدرت اللہ قاسم نے "مجموعۂ نغز" صفحہ ۲۱۳ پر اور مولوی کریم الدین نے "تذکرۂ شعرائے اردو" صفحہ ۲۴۰ پر لالہ بالمکند حضور شاگرد خواجہ میر درد کے کلام میں نقل کیا ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت "کلیات میر" کے دو نسخے ہیں ایک نول کشور پریس کا شائع کردہ ہے اور دوسرا ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مرتبہ۔ ان دونوں نسخوں میں اس مطلع کی عدم موجودگی سے قاسم اور کریم الدین کے خیال کی تصدیق اور دوسرے مصنفین کے انتساب کی تردید ہو جاتی ہے۔ میر نے اس زمین میں غزل ضرور کہی ہے لیکن اس کا مطلع یہ ہے ؎

لب ترے لعل ناب ہیں دونوں پر تمامی عتاب ہیں دونوں

یہ غزل کلیات میر دیوان اوّل میں شامل ہے۔ اس غزل کا ایک شعر مشہور ہے اور واقعی بہت اچھا کہا ہے ؎

ایک سب آگ ایک سب پانی دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان ہفتہ وار "ہماری زبان" مورخہ ۸ مارچ ۱۹۵۹ء میں محمد علی جوہر کے متعلق محمد علی خاں اثر رام پوری کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے جس میں یہ شعر بھی انتخاب کلام جوہر کے ذیل میں نقل کیا گیا ہے۔ مجھے اس انتساب کی صحت پر کسی قدر شک تھا۔ اس چیز کا احساس جناب تاثیر صدیقی کو بھی ہوا جس کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے ۱۵ اپریل کے "ہماری زبان" میں لکھا ہے کہ

"جہاں تک مجھے یاد ہے یہ شعر مولانا آسی غازی پوری کا ہے"

ممکن ہے تاثیر صاحب کا خیال صحیح ہو لیکن میں اس کی تصدیق کا حق نہیں رکھتا کیوں کہ میں نے مولانا آسی کا دیوان نہیں دیکھا ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ شعر مولانا محمد علی جوہر کا نہیں۔ میں نے ایک بار مولانا مرحوم کے مجموعۂ کلام سے کچھ شعر انتخاب کئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ یا اس زمین کا کوئی دوسرا شعر اس انتخاب میں شامل نہیں تھا۔ اگر یہ شعر اس مجموعۂ کلام میں ہوتا تو میں ضرور نقل کرتا۔

مجھے اسیر کرو یا مری زباں کاٹو مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

چکبست کا یہ شعر ان اشعار میں سے ہے جن پر کسی شاعر کی شہرت و مقبولیت اور بقائے نام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ لیکن اختر بلوی صاحب، چیرمین ریسرچ اکیڈمی کانپور نے اپنے ایک خط مطبوعہ ماہنامہ "جمہوریت" کراچی بابتہ ماہ فروری ۱۹۵۹ء میں اسے چکبست کے بجائے حسرت موہانی سے منسوب کر دیا ہے۔ یہ شعر "صبح وطن" مجموعۂ کلام چکبست شائع کردہ انڈین پریس الہ آباد کے صفحہ ۱۳۱ پر موجود ہے۔ مصرعِ اوّل صبح وطن میں اس طرح ہے ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
تمہارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہو

[illegible] [illegible] سے منسوب کیا جاتا رہا ہے
[illegible] [illegible] نے رقص و موسیقی سے متعلق
[illegible] میں انھیں کے نام سے نقل کیا ہے لیکن حقیقت
[illegible] [illegible] صفحہ "تذکرہ ریختہ گویاں" فتح علی خاں
گردیزی صفحہ ۱۰ "مخزن نکات" قائم چاند پوری صفحہ ۱۱ "گلشن ہند"
مرزا علی لطف صفحہ ۷۰ اور "نکات الشعرا" میر تقی میر صفحہ ۱۳ کے مطالعہ
[illegible] ہوتی ہے۔ ان تذکروں میں یہ شعر میاں نجم الدین عرف شاہ
مبارک آبرو کی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں آبرو
کی اس غزل کے دو شعر اور بھی نقل کئے ہیں جن میں مقطع بھی شامل
ہے۔ کثرت استعمال کی وجہ سے زیر بحث شعر کے مصرع اول میں بعض
لفظی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جو چنداں اہم نہیں۔

خدا کا نام گو اکثر زبانوں پر ہے آجاتا
مگر کام اس سے جب چلتا کہ وہ دل میں سما جاتا

شری راجیشور پرشاد نارائن سنگھ ایم۔ پی۔ نے اپنے ایک
ہندی مضمون "بہادر شاہ ظفر" میں ظفر کے ایک شعر سے موازنہ کرتے
ہوئے یہ شعر غالب سے منسوب کیا ہے لیکن یہ شعر نہ تو دیوان غالب
کے مروجہ نسخوں ہی میں ملتا ہے اور نہ اس کے طرز بیان اور بندش
الفاظ ہی کا تقاضا ہے کہ اسے غالب کی تخلیق کہا جا سکے۔ میں
نے جب مذکورہ مضمون کا ترجمہ کیا تو "نقل مطابق اصل" کے پیش نظر
یہ غلطی دانستہ برقرار رہنے دی (یہ ترجمہ ماہنامہ نگار لکھنؤ بابتہ ماہ ستمبر
۱۹۹۰ء میں شائع ہوا ہے) یہ شعر کسی اور شاعر کے دیوان میں بھی
میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس لئے یہ بتانا ناممکن ہے کہ کس کی ملکیت
ہے۔ بہر حال غالب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

خواجہ آتش کا مشہور عام شعر ہے لیکن "مطالعۂ حالی" مصنفہ
شجاعت علی سندیلوی و ناظر کاکوروی میں صفحہ ۲۳۱ پر سعید انصاری
کے کسی مضمون کے اقتباس میں مرزا غالب کے نام سے نقل ہوا ہے
علاوہ ازیں کہ یہ شعر غالب کا نہیں، غالب نے اس زمین میں کوئی
غزل بھی نہیں کہی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

شعر بہت مشہور ہے اور شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو یہ نہ جانتا
ہو کہ فکر غالب کا نتیجہ ہے مگر پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے "شرح بال
جبریل" صفحہ ۸۳ پر داغ سے منسوب کر دیا ہے۔

غم دنیا سے گر پائی بھی رخصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یہ شعر بھی غالب ہی کا ہے لیکن پروفیسر حامد حسن قادری نے
"تاریخ و تنقید" میں صفحہ ۹۶ پر داغ کے نام سے نقل کیا ہے۔ مجھے اس
غلطی میں قادری صاحب کے سہو سے زیادہ کاتب کی لغزش قلم کی
کار فرمائی نظر آتی ہے کیوں کہ اس شعر سے پہلے کچھ شعر غالب کے اور بعد
میں کچھ اشعار داغ کے درج کئے گئے ہیں۔ شاعر کا تخلص اشعار کے
سامنے لکھا گیا ہے۔ ایسی صورت میں کاتب کے سہو نظر یا سہو قلم
کے امکانات ظاہر ہیں۔

قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

روزنامہ ندیم بھوپال کے مدیر جناب محمود الحسینی نے ۲۲ اگست ۱۹۹۵ء
کی اشاعت کا اداریہ جس میں عہد حاضر کے لسانی تعصبات سے بحث
کی گئی ہے، اس شعر پر ختم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
"مولانا محمد علی مرحوم نے یہ شعر اسی موقع کے لئے کہا تھا۔"
محمود صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ شعر مولانا محمد علی جوہر کا نہیں
امیر مینائی کا ہے۔ اس کے علاوہ مصرع اول میں "کیوں کر" کے بجائے
"کب تک" شائع ہوا ہے جس سے شعر کی موسیقیت میں بھی بڑی حد تک
فرق آگیا ہے۔ اس شعر کی تخلیق کے اسباب و محرکات بیان کرتے ہوئے
پروفیسر آل احمد سرور نے ایک مضمون "اردو غزل میر سے اقبال تک" میں
لکھا ہے کہ

"ریاض، امیر کے بہت چہیتے شاگرد تھے۔ انھوں نے
ایک دفعہ (امیر سے) تاریخ کی مشہور غزل "ہے خنجر کا آستیں کا"

پر غزل کہنے کی فرمائش کی۔ استاد ادب کے خیال سے ٹال گئے۔ آخر جب اصرار بڑھا تو غزل کہی مگر آتش کا قافیہ چھوڑ دیا۔ ریاض نے فریاد کی کہ اس قافیے کی خاطر تو میں نے غزل کی فرمائش کی تھی۔ بالآخر امیر نے یہ شعر لکھوایا ......!"

(ادب اور نظریہ ـ مجموعۂ مضامین سرور ـ صفحہ ۲۶)

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

فصیح الملک داغ دہلوی کی وفات پر ڈاکٹر اقبال نے ایک مرثیہ لکھا تھا جو "بانگِ درا" حصہ اول میں شامل ہے۔ یہ اسکا دوسرا شعر ہے۔ مگر امیر تخلص کی وجہ سے ملک محمد علی خاں اسے امیر مینائی کا کلام سمجھ بیٹھے اور اپنے مضمون "سرزمینِ دکن کے غزل گو شعراء" مطبوعہ ماہنامہ "شعلہ و شبنم" دہلی بابتہ ماہ جنوری ۱۹۵۰ء میں موصوف کے کلام کے تحت پیش کر دیا۔ یہ انتساب بڑا حیرت انگیز ہے۔ شعر کے الفاظ اور تیور صاف بتا رہے ہیں کہ یہ شعر امیر کا طبع زاد نہیں بلکہ کسی دوسرے شاعر کے تاثرات کا ترجمان ہے۔ تعجب ہے کہ مضمون نگار موصوف نے اس طرف مطلق خیال نہیں کیا۔

ہوا ہے عشق سے آ کر مقابلہ دل کا
بھڑا پہاڑ سے جا، بل بے حوصلہ دل کا
سرشک و آہ ہے شورِ جنوں ہے، وحشت ہے
عجب جلوس سے جاتا ہے قافلہ دل کا
کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر
مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

قدرت اللہ قاسم نے "مجموعۂ نغز" میں یہ تینوں شعر پہلے تو صفحہ ۴۴ پر قدرت اللہ قدرت شاگرد میر شمس الدین فقیر و میرزا مظہر جانِ جاں کے کلام کی مثال میں پیش کیے ہیں، اس کے بعد صفحہ ۳۰۹ پر واقف شاہ واقف کے ذکر میں نقل کیے ہیں۔ مصحفی نے "ریاض الفصحا" میں دوسرا شعر میر علی حیرت مراد آبادی سے منسوب کیا ہے۔ تیسرا شعر میر حسن نے تذکرۂ شعرائے اردو" میں حیرت کے ذکر میں نقل کیا ہے۔ کریم الدین بھی ان کے ہم خیال

ـــــــــــــــ
۱ـ دیکھئے فٹ نوٹ صفحہ ۴۴

ہیں لیکن تذکرۂ گلزارِ ابراہیم" اور "مخانۂ جاوید" کے مؤلفین [illegible] قائم چاند پوری اور مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم ثانی کا کلام قرار دیا ہے۔ اس طرح پہلے شعر کے دو، دوسرے شعر کے تین اور تیسرے شعر کے پانچ خلاق منظرِ عام پر لائے گئے ہیں۔ جہاں تک تیسرے شعر کا تعلق ہے، لالہ سری رام صاحب "مخانۂ جاوید" کے خیال کی تائید کرنا پڑتی ہے مرزا سلیمان شکوہ کا قلمی دیوان لالہ صاحب کے کتب خانے میں موجود تھا۔ موصوف نے لکھا ہے کہ انتخابِ کلام مذکورہ قلمی دیوان سے کیا گیا ہے۔ باقی اشعار کے متعلق قاسم کے دو مختلف بیانات اور دوسرے شعر کے سلسلے میں قاسم اور مصحفی کا اختلاف ناقابلِ حل معمے ہیں کیونکہ نہ تو قدرت، واقف اور حیرت کے دیوان ہی مل سکتے ہیں کہ جن میں ان اشعار کی تلاش کی جا سکے اور نہ کوئی دوسرا مستند تذکرے ہی ہم خیال ہیں جن کی روشنی میں کسی صحیح فیصلے تک پہنچایا جا سکے مصحفی حیرت سے ذاتی طور پر واقف تھے اور قصبہ ٹانڈہ میں دونوں کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں دوسرے شعر کے حیرت سے انتساب کو کسی حد تک قرینِ صحت خیال کیا جا سکتا ہے۔

بھولا نہیں ہوں یاد ہیں صحبت کی گرمیاں
اب تک مزے زباں میں تمھاری زباں کے ہیں

نواب علی حسن خاں سلیم نے "بزمِ سخن" میں یہ شعر منشی فاخر حسین فاخر بھسوانی کے نمونۂ کلام میں پیش کیا ہے جو صحیح نہیں۔ دراصل یہ شعر فاخر صاحب کے چھوٹے بھائی منشی صابر حسین صبا بھسوانی کا ہے۔ "انتخابِ یادگار" میں امیر مینائی نے انھیں کے انتخابِ کلام میں نقل کیا ہے۔ استاذی پروفیسر سلیم حامد رضوی (استاد شعبۂ اردو گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال) نے اپنے تحقیقی مقالے (Thesis for Ph.D) "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" میں یہ شعر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صبا نے یہ غزل بھوپال کے ایک طرحی مشاعرے کیلئے کہی تھی۔ رضوی صاحب کا یہ بیان درست نہیں۔ صبا نے یہ غزل بھوپال آنے (اواخر ۱۲۹۵ھ) سے قبل رامپور کے دورانِ قیام میں کہی تھی۔ اس زمانے میں صبا، داغ اور امیر مینائی وغیرہ کی غزلیں ایک ہی زمانے کی

[illegible] کتاب [illegible] میں اس شعر کی موجودگی [illegible] کے قول کی تردید اور میرے خیال کی تائید ہو جاتی ہے۔

شکوہ آنکھوں کنے ہے میرے [illegible] کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

(حضرت علی جوان فغاں) کا یہ شعر سودا نے اپنی ایک غزل کے قطعہ بند اشعار میں بغیر کسی حوالے کے شامل کر لیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے چند اشعار کی طرح یہ شعر بھی سودا ہی کا طبع زاد ہے۔ میر اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں اس حقیقت کی وضاحت کر کے بڑی حد تک غلط فہمی کے امکانات ختم کر دیئے ہیں۔ میر صاحب فغاں کے ذکر میں زیر بحث شعر نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"این شعر مرزا رفیع در غزل خود قطعہ کردہ است و بچہ خوب کردہ" (نکات الشعرا)

میر حسن "تذکرۂ شعرائے اردو" میں رقمطراز ہیں کہ

"این شعر مرزا رفیع سودا سلمہ اللہ در قطعہ تضمین نمودہ است"

یہ قطعہ "کلیات سودا" مرتبہ عبدالباری آسی، شائع کردہ مطبع نولکشور جلد اول کے صفحات ۱۸۹، ۱۹۰ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلے سات شعر غزل کے ہیں۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل شعر سے قطعہ شروع ہوتا ہے جو اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہے۔

سودا فغاں کو خط یہ لکھا اسکے یار نے   جس وقت اسکے حال کی اسکو خبر گئی

۱؎ منشی فاخر حسین فاخر منیر شکوہ آبادی کے شاگرد اور سہسوان ضلع بدایوں کے مشاق اور پرگو شعرا میں سے تھے۔ آپ نے ناسخ کی مشہور غزل "اجرام کا" "گریباں کا" کی زمین میں ایک مکمل دیوان کہا تھا جس میں کئی سو غزلیں تھیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، ہندوستان کے کسی دوسرے غزل گو نے ان کے برابر (بہ اعتبار تعداد) شعر نہیں کہے۔ افسوس کہ یہ سرمایہ دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ آج فاخر کی متاع کل صرف ایسے چند اشعار تک محدود ہے جو زبان زد خاص و عام ہیں یا تذکروں میں محفوظ ہیں۔ ان کا انتقال ۱۳۳۵ھ میں ہوا تھا۔

۲؎ منشی صابر حسین صبا (متوفی ۱۳۰۶ھ) منشی انوار حسین تسلیم اور فاخر حسین فاخر کے برادر حقیقی اور امیر، داغ، جلال اور تسلیم کے ہم عصر تھے۔ پہلے دربار رامپور سے وابستہ رہے اور فارسی میں ایک مثنوی "شوکت خسروی" لکھ کر "نظامی ہند" کا خطاب پایا۔ ۱۲۹۰ھ میں بھوپال چلے گئے اور نیابت محکمۂ دیوانی و فوجداری نیز نظامت ضلع (کلکٹری) کے عہدوں پر فائز رہے اس کے علاوہ ان کا شمار نواب صدیق الحسن خاں کے مخصوص اور ممتاز درباری علما و شعرا میں ہوتا تھا۔ امیر، داغ، جلال اور امیر اللہ تسلیم وغیرہ آپ کی استعداد علمی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے قائل اور مداح تھے جیسا کہ ان حضرات کے خطوط مرسومہ صبا شائع کردہ ماہنامہ "صبح گل" دہلی بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۱۲ء سے ظاہر ہوتا ہے۔

غزل

مصوّر لکھنوی

دل جس کو زخم خوردۂ رنج و محن کہیں
چمکے تو مہر و ماہ، کھِلے تو چمن کہیں

تاریک دل میں ایسی تو کوئی ضیا نہیں
جس کو ہم آفتابِ سحر کی کرن کہیں

اپنے تصوّرات کی محفل بھی آج کل
اتنی حسیں ہے جس کو تری انجمن کہیں

اک جنبشِ نظر میں عطا کر دیا ہمیں
وہ غم کہ جس کو آتشِ گل پیرہن کہیں

ہے امتحانِ شوق بعنوانِ ترکِ شوق
ہم بھی کوئی فسانۂ دار و رسن کہیں

فرہاد تو بہت ہیں زمانے میں آج بھی
ایسا کوئی نہیں کہ جسے کوہ کن کہیں

اس میکشِ جمال کی سرشاریاں نہ پوچھ
رندانِ میکدہ جسے تشنہ دہن کہیں

آلام و زندگی کے مصوّر تعلقات
ایسے ہیں جن کو رشتۂ گنگ و جمن کہیں

غزل

(نذرِ غالب)

سعادت نظیر

بزمِ نشاط و عیش کے قابل نہیں رہا
جس دل سے زندگی تھی، وہی دل نہیں رہا

رنگِ جہاں بدل دیا عزمِ بلند نے
اب کوئی مرحلہ مجھے مشکل نہیں رہا

پایا ہے کیفِ زیست تلاطم میں وہ کہ اب
کوئی خیالِ عشرتِ ساحل نہیں رہا

چھالے پڑے آبلہ نے گلستاں بنا دیا
بے رنگ کوئی جادۂ منزل نہیں رہا

ہمت نے زندگی کے تقاضے بدل دیئے
مشکل، کوئی بھی عقدۂ مشکل نہیں رہا

افسانۂ الم کا اثر اٹھتے ہیں سب مذاق
کیا آشنائے درد کوئی دل نہیں رہا

ذوقِ سفر نے خود نئے جادے بنا لیے
کیا غم؟ جو کوئی جادۂ منزل نہیں رہا

دار و رسن کے قصے میں گزری ہے اے نظیر
جز حق مری نگاہ میں باطل نہیں رہا

شعر میں لفظ اور کنایہ

محمد اکرم الرضا خان

شعر اور اس کی حقیقت کے متعلق مفکرین نے مختلف نظریے پیش کئے ہیں۔ ارسطو سے لے کر اس وقت تک صدہا تعریفیں شعر کی بیان کی گئیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس کو جامع کہا جا سکے۔ جانسن (Johnson) کے بقول "شعر الفاظ کو ایسی ترکیب دینے کا نام ہے جس میں وزن ہو"۔ مل (Mill) کہتا ہے: "شعر اس کے سوا اور کیا ہے؟ خیالات اور الفاظ کا وہ طریقہ مناسب جس میں جذبات صورت پذیر ہوں"۔ میکالے (Macaulay) کے خیال میں شاعری ایک فن ہے جس میں الفاظ کو ایسی صورت میں پیش کیا جائے کہ سننے والے پر حیرت طاری ہو جائے اور وہ خیال کے تجزیہ اور تحلیل سے عاجز رہے۔ شاعر الفاظ سے وہ کام لیتا ہے جو مصور مختلف رنگوں کی باہمی ترکیب سے۔ رسکن (Ruskin) کے الفاظ ہیں "پاک اور بلند خیالات کے حصول کے لئے پاک اور بلند ذرائع کا مہیا کرنا" اور یہ قوت فکر کا کام ہے۔ میتھو آرنلڈ (Mathew Arnald) کے نزدیک شاعر کی صفت یہ ہے: "موجوداتِ عالم سے کسی چیز کو پیش کرتے ہوئے شاعر سننے والے کے دل میں ایک نیا اور مکمل احساس پیدا کر دے"۔ ان تمام نظریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے آگسٹائن (Augustine) کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے: وہ کہتا ہے کہ "اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ شعر کیا چیز ہے؟ تو میں کہوں گا کہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اگر مجھ سے یہ سوال نہ کیا جائے تو میں شعر کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔"

لینگ (Lang) نے شاعری کو آذری (بت تراشی) سے تشبیہ دی ہے اور نہایت فلسفیانہ انداز میں اشعار اور اصنام کا موازنہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اصنام، سکون کا اور اشعار، حرکت کا اظہار کرتے ہیں۔ جب حُسن سمٹ کر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے تو بُت یا مجسم کہلاتا ہے، لیکن جب متحرک اور رقص کناں نظر آتا ہے تو شعر بن جاتا ہے . . .!"

کارلائل (Carlyle) کے بقول کائنات کے مقدس راز تک شاعر کی آنکھ کی رسائی ہوتی ہے اور وہ نہ صرف راز تک بلکہ حُسن راز تک پہنچ جاتی ہے۔ قدیم یونانی فلسفہ میں شاعری منصبِ پیغمبری خیال کی جاتی تھی۔ اور شاعر اور پیغمبر دونوں کے لئے لفظ Vates استعمال ہوتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ کائنات کی ہر شے خواہ مادّی ہو یا غیر مادّی، مرئی ہو یا غیر مرئی، اپنے وجود میں ایک راز رکھتی ہے۔ جس کو کائنات کا مقدس راز کہا جاتا ہے اور اس مقدس راز تک شاعر کی رسائی بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ پیغمبر کی۔ المانیہ کا مایۂ ناز شاعر اور فلسفی گیٹے (Goethe) اس مقدس راز کو اپنی اصطلاح میں کائنات کا رازِ آشکارا کہتا ہے۔ آشکارا تو اس لئے کہ قدرت نے کسی سے اس کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اور راز اس

ہے مگر عام انسانی ذہن اس تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اس راز
تک پہنچانا فقط شاعر اور پیغمبر کا کام ہے۔ شاعر اس کے جمالیاتی
تصور تک پہنچاتا ہے اور پیغمبر اس کے اخلاقی تصور کو پیش کرتا ہے۔

شعر کے بارے میں چند مغربی مفکرین کے یہ خیالات تھے
اگر عام اصطلاح کی رو سے شعر کی تعریف کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے
کہ شعر فی الحقیقت انسان کے خیال یا جذبے کے اظہار کا نام ہے،
جو موزوں الفاظ میں ادا کیا گیا ہو۔ شعر کے دو جزو ہیں، ایک
تخیل دوسرا محاکات۔ شاعر کے دماغ میں پہلے خیال پیدا ہوتا
ہے اور اس کے اظہار کے لئے وہ الفاظ کی تلاش کرتا ہے۔ جو
کام مصور مختلف رنگوں کے باہم ربط و آمیزش سے لیتا ہے وہی
کام شاعر مختلف الفاظ کی باہمی ترکیب سے لیتا ہے۔ جس طرح
رنگ کا انتخاب اور ایک رنگ کا دوسرے رنگ سے ربط، رنگ
کی نسبتی قوت تصویر میں جان ڈال دیتی ہے، اسی طرح الفاظ کا
انتخاب، ایک لفظ سے دوسرے لفظ کا ربط، الفاظ کی باہم
ترکیبیں اور الفاظ کی موسیقیت شعر کی خوبی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔

بسا اوقات مصور کو مادی اشیاء سے گزر کر غیر مادی چیزوں کی
تصویر کھینچنا ہوتی ہے مثلاً طبیعتوں کی مختلف کیفیتیں، خوشی و رنج، رحم
و غضب۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کا یہ کام شاعر کے کام
سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اول تو رنگ خود اپنی قسم میں غیر محدود
ہے، پھر ایک رنگ کی دوسرے رنگ سے آمیزش ایک نیا رنگ
پیدا کر دیتی ہے۔ اگر رنگ کو اس کی قوت اور کمزوری کے لحاظ
سے دیکھا جائے تو رنگ جو بظاہر ایک معلوم ہوتا ہے اپنے اندر
صدہا اقسام پوشیدہ رکھتا ہے اور اس بنا پر یہ کہنا بالکل درست
ہوگا کہ رنگ خود اپنے میں ایک قسم کی حرکت رکھتا ہے۔ مگر الفاظ
بالکل قائم ہیں اور ہر لفظ کا جرس صوت ایک متعین چیز ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ ترکیب دینے
سے اس کی موسیقیت میں فرق ضرور پڑ جاتا ہے مگر لفظ بجائے خود
تغیرات سے بالاتر ہے۔ قائم اور متعین الفاظ سے متحرک اور متموج
جذبات اور خیالات کی تصویر کھینچنا خود ایک طلسم ہے۔ کارلائل
نے خوب لفظوں میں شاعری کو تعمیر سے تشبیہ دی ہے۔ الفاظ وہ
خشت و سنگ ہیں جن سے خیال کی عالیشان عمارت بنائی جاتی
ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سنگ و خشت میں بھی صورت
پذیری کا مادہ موجود ہے یعنی ایک معمار سنگ و خشت کو تراش کر عمارت
کے لئے موزوں بنا لیتا ہے مگر الفاظ میں یہ بات ممکن نہیں ہے بلکہ
اس کمی کو حسن انتخاب و باہمی ترکیب سے پورا کیا جاتا ہے اور اس
بنا پر ارسطو کا یہ دعویٰ کہ الفاظ لعل و جواہر سے بھی گراں بہا ہیں،
بالکل درست ہے۔

خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ کا انتخاب کرنے کے
سلسلہ میں کوئی قواعد متعین نہیں ہو سکتے۔ اس کا انحصار شاعر
کے اس مذاقِ سلیم پر ہے جو فطرت اس کو عطا کرتی ہے۔ شاعر
کے دماغ میں پہلے خیال پیدا ہوتا ہے پھر اس کے اظہار کے لئے
الفاظ کی تلاش ہوتی ہے۔ شاعر کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ خیال
سننے والے تک بعینہٖ اسی صورت میں پہنچ جائے جس صورت میں
وہ خود شاعر کے دماغ میں پیدا ہوا ہے۔ بالفاظ دیگر سننے والا
بھی اس خیال سے اتنا ہی متاثر ہو سکے جتنا کہ خود شاعر ہے۔
بزم کی تصویر کھینچنے کے لئے الفاظ میں سلاست، لطافت، روانی
اور نزاکت لازمی ہے مگر رزم کا صحیح نقشہ اس کے بغیر نہیں کھینچ
جا سکتا کہ الفاظ میں وزن، ضخامت اور ہیبت ہو۔ اگر معرکۂ رزم
کو پیش کرنے کے لئے وہ الفاظ استعمال کئے جائیں جو بزم کے لئے
موزوں ہیں تو وہ صحیح تصویر رزم کی نہ ہوگی۔

لفظ بجائے خود ثقیل ہے نہ لطیف۔ ثقل اور لطافت محل
استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ جذبات کے مصور اور واقعہ نگاری
کے امام انیس واقعۂ کربلا میں حضرت عباس کی شجاعت اور
غضب کی تصویر کھینچتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے
جھلا کے ڈکارتا ہو [illegible]

ہمہمہ اور ڈکار دونوں ثقیل ہیں۔ مگر اس شعر میں جس ترکیب
کے ساتھ استعمال کئے گئے، فصیح ترین معلوم ہوتے ہیں۔ رزمیہ مضامین
لکھتے ہوئے الفاظ میں وزن، ضخامت اور ہیبت ہونا چاہئے

[illegible] ہے دونوں لفظ
[illegible] کی تصویر آنکھوں کے سامنے
[illegible] کہتے ہیں
[illegible] گلی پر لاکھ یا تصدق ہما کے پر
[illegible] وہ قد بالا وہ تہور کہ الحذر
جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں گھر گیا ہو
پھر کس طرح وہ دل کی چھاتی پہاڑ ہو

کربلا میں دسویں محرم کو جنگ شروع ہونے سے قبل یزیدی فوج کی طرف سے ابتدا ہوتی ہے تیر پھینکے جاتے ہیں، تب مجبوراً حضرت [illegible] میں رخصت کے لئے جاتے ہیں۔ حضرت عباس ہتھیار [illegible] خیام کے سامنے پر حفاظت کے لئے ٹہلنے لگتے ہیں۔ اس [illegible] میں حضرت عباس کا نقشہ پیش کیا ہے۔ چھاتی کا پہاڑ ہونا کس قدر [illegible] ہے لیکن اس موقع پر جس صورت سے استعمال کیا گیا ہے کیا لطیف معلوم ہوتا ہے۔

انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کا اثر قلب پر پڑتا ہے جس کا اظہار حرکات و سکنات سے ہوتا ہے۔ اس اظہار کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک قوی القلب آدمی خاموش ہو جاتا ہے مگر ایک کمزور آدمی احتجاج و زاری شروع کر دیتا ہے۔ بعض وقت وہ عالم یاس میں بکنے بھی لگتا ہے۔ یہ کیفیتیں اختلاف طبائع کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ عرب کے مشہور پہلوان ارزق کے چاروں لڑکے میدان جنگ میں حضرت قاسم کے ہاتھ سے مارے جاتے ہیں۔ ایک طرف لڑکوں کا غم، دوسری طرف خاندانی شجاعت کا نام [illegible] کا خیال، انیس نے اس کی جذبات نگاری اس طرح کی ہے

چاروں کے سر جو بیٹے ہوا سکے چار ارزق کا دل ہوا صفت لالہ داغدار
[illegible] ہر شعر نا بکار عل الحذر منہ سے نکلنے لگا بخار
سیب قبا کو غش کفن پھاڑتا ہوا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

[illegible] کو بد ہے اور بیٹا کی ہیبت آواز کو چنگھاڑ سے تشبیہ دی

گئی ہے یعنی از اصطلاح ماہرین ہاتھی کی آواز کو کہتے ہیں [illegible] لفظ ہے لیکن یہاں اس لفظ کو جس صورت سے اور ترکیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس نے خیال کے حسن کو کتنا بڑھا دیا۔

الفاظ کی اس مختصر بحث کے بعد اب ہم اس چیز کی طرف آتے ہیں جسے شاعری کی اصطلاح میں کنایہ کہتے ہیں۔ کنایہ کی جو تعریف علم بیان میں کی گئی ہے اس سے اس لفظ کا مفہوم محدود و متعین ہو جاتا ہے انگریزی ادب میں اس مفہوم کو لفظ Suggestion سے ادا کیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں کوئی لفظ (Suggestion) کی قائم مقامی نہیں کر سکتا (suggestion) کنایہ سے کہیں زیادہ وسیع اور قوی ہے (suggestion) کنایہ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے بہر حال کنایہ حقیقتاً خیال کے بالواسطہ طریقۂ اظہار کا نام ہے۔ شاعر کہیں تو اپنے خیال کو صریح اور صاف طور پر بلا کسی واسطے کے ظاہر کر دیتا ہے اور کہیں اظہار خیال کے لئے کسی واسطے یا ذریعہ کی تلاش کرتا ہے۔ یہ واسطہ کہیں تشبیہ یا استعارہ کی صورت میں ہوتا ہے اور کہیں اس ذریعہ کے اظہار سے جو ایک خیال کو دوسرے خیال سے ہوتا ہے یعنی ایک خیال کے پیش کرتے ہی وہ خیال سامنے آ جاتا ہے جس کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

اگر شاعر کسی جذبہ یا خیال کی تصویر کھینچتے ہوئے اس کے حدود متعین کر دے اور اس کے ہر جذبہ کو ظاہر کرنے کی کوشش کرے تو شعر کے حسن میں کمی ہو جائے گی۔ اول تو کسی خیال کو اس کے تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ ادا کرنا دشوار ہے اور اگر کسی خیال کو ان قیود اور پابندیوں سے ادا بھی کیا جائے تو وہ علم النفس کا ایک باب منظوم ہوگا۔ شعر کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ شعر کا تعلق در اصل اس کے مجموعی اثر سے ہے نہ کہ تحلیل سے۔ اگر خیال کے ٹکڑے کئے جائیں اور ہر ٹکڑے کے ثبوت کا مطالعہ کیا جائے تو دماغ شعر کے منطقی پہلو کی طرف رجوع ہو جائے گا اور شعر کا اثر زائل ہو جائے گا۔

انسان فطرتاً آزادی پسند ہے اور اس کی آزادی خیال بھی

جتنی قیود اور پابندیاں عاید کی جاتی ہیں، اس کو ناگوار ہوتی ہیں اور اگر اس کی قوت تخیل کو آزادی سے کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے تو طبیعت لطف اندوز ہونے کے بجائے بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اوّل تو شاعر اور سامع کے خیال میں اس حد تک اتحاد ممکن ہی نہیں کہ اصول سے گزر کر جزئیات میں بھی اختلاف نہ ہو اور اگر ہو بھی تو ایسی حالت میں سامع کے لئے بجز اس کے اور کوئی موقع نہیں رہتا کہ وہ شاعر کے پیش کردہ خطوط میں اپنے دماغ کو محصور کر دے، اور وہ اسی تقلید کرتا چلا جائے۔ اور چونکہ شعر کا تعلق جذبات سے ہے یعنی ایک طرف تو یہ جذبہ شاعر کے دل میں پیدا ہو کر الفاظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور دوسری طرف سننے والے تک پہنچ کر اس کے جذبات کو متحرک کرتا ہے، اور اس کا تعلق تخیل کی آزادی سے ہے اس لئے خیال اپنے اثر کو بالکل زائل کر دے گا۔ خیال کے ایک پہلو کو دکھانا اور سننے والے کو اس کی وسعت نظر اور مذاق طبیعت کے مطابق لطف اٹھانے کا موقع دینا شاعر کا مقصد اصلی ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ہے ؎

کہیں نظر نہ لگے اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

دیکھئے اس شعر میں زخم کی شدت کو کتنے خوشنما پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی ہے کہ اگر لوگوں نے یہ شدید زخم دیکھا تو ان کا خیال معشوق کے دست و بازو کی طرف جائے گا جنھوں نے یہ زخم پہنچایا ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خیال اس دست و بازو کو نظر لگا دے۔ اب اگر اس خیال کے اظہار میں حدود متعین کئے جاتے اور خیال کو بلا کسی واسطہ کے ظاہر کیا جاتا تو اس میں کمزوری آجاتی۔

داغ کہتے ہیں ؎

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

خیال یہ ہے کہ معشوق غیر کے گھر سے آرہا ہے، اور اس کو چھپانا چاہتا ہے، مگر اس راز کے آشکارا ہو جانے کا خوف، ندامت کا ایک جذبہ پیدا کر رہا ہے اور اس جذبہ کے اثر سے چہرہ پر پسینہ بہ جاتی [illegible]

حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور وہ بند بند الفاظ میں یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ اسے سارا پتہ چل گیا ہے۔

داغ کا ایک اور شعر ہے ؎

میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ یہ بات ہے کیا
وعدہ وہ کرتے ہیں آتا ہے تبسم مجھ کو

یہ وہ وعدہ ہے کہ جو ایفائے وعدہ کا روشناس نہیں۔ ہزار مرتبہ کا تجربہ ہے کہ اصرار بالکل بے سود۔ اگر تردید کی جاتی ہے تو وہ خفیف سی امید بھی جاتی ہے جو زندگی کا سہارا ہے۔ اور وعدہ بھی اس کا جس کے سامنے سوائے تسلیم کے چارہ نہیں۔ پھر سوائے تبسم کے کیا ہو سکتا ہے۔ ان دونوں مصرعوں میں عاشق و حسن کا ہنگامہ پوشیدہ ہے: ان کا وعدہ اور میرا تبسم، یہ عجیب دلچسپ بات ہے۔ خیال تو فقط یہ تھا کہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوگا۔ لیکن طریقۂ اظہار نے خیال کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

یہاں تک تو کنایہ کے اس پہلو سے بحث تھی جو ایک حد تک متعین ہوتا ہے یعنی جس خیال کو ادا کیا گیا ہے اس میں مفہوم کا ایک بعید تعین ضرور ہوتا ہے یعنی اس تمام وسعت کے ساتھ جو اس طرز ادا میں پوشیدہ ہے کسی نہ کسی مقام پر خیال کے حدود ضرور آجاتے ہیں۔ مگر اب جس طرز ادا پر بحث کرنا ہے وہ اس سے بھی آگے ہے یعنی محاکات کی وہ صورت جس میں حدود کا تعین نہیں ہوتا۔ شاعر اپنے خیال کو اس صورت سے ظاہر کرتا ہے کہ مفہوم محدود ہو جانے کے بجائے ایک عجیب وسعت اختیار کر لیتا ہے۔ شاعر خیال کے ایک پہلو کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرے پہلوؤں کی طرف جن کا اظہار مقصود ہوتا ہے اشارہ کرتا ہوا گزر جاتا ہے اور وہ بھی اس صورت سے کہ نہ تو کوئی پہلو متعین ہونے پاتا ہے اور نہ کسی پہلو کی حد تک سننے والے کی نظر جاتی ہے، بلکہ خیال کی تصویر اس صورت سے پیش کی جاتی ہے کہ تعین کے بجائے اس میں وسعت آجاتی ہے۔ فن تنقید میں اس طریقۂ اظہار کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور مغربی نقادوں نے اس کو بڑی اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بعض کا خیال تو یہ ہے کہ شعر کی تمام قوت طرز ادا پر منحصر ہے۔ خیالات کی تفصیلات

[illegible] اس کے کسی خاص پہلو کو اس طرح پیش کیا [illegible] وسعت نظر اور مذاق طبیعت کے مطابق اپنی قوت تخیل سے کام لے اور شاعر کے پیش کردہ خاکے میں رنگ بھر سکے اسی کو انگریزی اصطلاح میں (suggestion) کہتے ہیں۔ یہ قوت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی سامع کو اپنے تخیل سے کام لینے کا موقع ملے گا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ (suggestion) کا مفہوم کنایہ سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ غالب کا شعر ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے   کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اس شعر میں حیرت و استعجاب کا ایک وسیع میدان ہے۔ عشق کی نیازمندی، حسن کی بے نیازی، عشق کی محویت، حسن کی بے اعتنائی ان میں سے کسی کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی تو خواہ کتنا ہی مبالغہ کیوں نہ ہوتا خیال کے حدود قائم ہو جاتے۔ اس میں ایک طرف تو نیازمندی ہے دوسری طرف بے نیازی۔ بے نیازی کی یہ حالت کہ سراپا نیاز کی خبر نہیں۔ دریافت حال ہوتا ہے تو اس مجبور محویت سے جو فنا کو بقائے دوام سمجھتا ہے۔ اب اس بے نیازی پر حیرت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر اس حیرت میں معذوری کی جھلک پائی جاتی ہے اور اس کی حد بھی نہیں یعنی ہر شخص سے مدد کا طالب ہے کہ وہ اس دشواری کو حل کر دے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ 'کوئی' نے خیال میں عجب وسعت دیدی۔

غالب ہی کا ایک اور شعر ہے۔

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھائے وہ سمجھائیں گے کیا؟

خیال تو یہ ہے کہ جو کچھ حضرت ناصح سمجھائیں گے وہ ہم کو معلوم ہے۔ وہی فرسودہ نصیحت، وہی ظاہری علت و معلول کا غیر تناہی جھگڑا، وہی معقول و منقول کا صبر شکن ایثار۔ مگر یہاں تو معاملہ ہے دل کا۔ جذبہ کا سامنا ہے ایک ایسی قوت سے جس کا مقابلہ ممکن نہیں

مگر پھر بھی اس کے لئے تیار ہے کہ جو کہا جائے، سن لیں۔ حضرت ناصح کی عزت کو جس صورت سے ظاہر کیا ہے اس میں ایک عجیب لطف خیال میں پیدا کر دیا ہے۔

اب، کنایہ کے متعلق چند شعر اور ملاحظہ کیجئے۔ سودا کا یہ شعر تو ایک مقولہ بن گیا ہے

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کیفیت چشم کو ساغر سے اور ساغر کو پینے والے کے ہاتھ سے کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ ایک طرف تو ساغر کی فکر دوسری طرف کسی کی مستانہ آنکھ کا خیال۔ لیکن نشیلی آنکھ کا نشہ مدہوش کر کے رہے گا وہ نشہ تو ساغر کے نشہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔

علامہ اقبال کا یہ شعر دنیا کی بے ثباتی لیکن انقلابات کائنات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ تہذیب و تمدن اور معاشرت بدلتی رہتی ہے۔

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

ملاحظہ کیجئے، تاریخ عالم کو دو مصرعوں میں کس خوبی سے پیش کر دیا ہے۔

بستر غم پہ الٰہی دل بیتاب کی خیر
کچھ مرے کان میں ہر روز کے صدا آتی ہے

یہ صدا کیا ہے؟ جہاں سننے والے کے خیال پہونچ جائیں وہیں یہ صدا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کنایہ عارض سخن پر ایک ایسی نقاب ہے جو مشتاقان جمال کے شوق دید کو بڑھاتی رہتی ہے۔ نظارے کے بعد شوق دید اور بڑھ جاتا ہے۔

نینی تال سے واپسی پر

سرخوش عسکری لکھنوی*

رقص گاہوں کا نگاہوں میں سماں لے کے چلے
دل میں تصویرِ جہانِ گزراں لے کے چلے

بہکے بہکے ہوئے اندازِ سحر گاہی میں
سر بسر کیفیتِ خوابِ گراں لے کے چلے

آنکھ میں مستیٔ سودائے شبِ گیسوئے حور
رُخ پہ موجِ نفسِ صبحِ جناں لے کے چلے

وہ جھمکتے ہوئے تارے وہ مہکتے ہوئے پھول
نکہت و نور کا اک تازہ جہاں لے کے چلے

وہ چھلکتے ہوئے شیشے وہ کھنکتے ہوئے جام
رونقِ کارگہِ شیشہ گران لے کے چلے

اُفقِ ذہن پہ ڈوبے ہوئے تاروں کا غبار
دل میں بجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں لے کے چلے

تہ میں یادوں کی لپیٹے ہوئے سامانِ بہار
دامنِ ہوش میں اک جنسِ گراں لے کے چلے

موجِ رنگِ شفقِ عارضِ شعلہ رویاں
آب و تابِ نظرِ زہرہ وشاں لے کے چلے

عشرتِ حلقۂ آغوشِ بہارانداماں
دولتِ گلشنِ فردوس وشاں لے کے چلے

غمزۂ چشمِ سیہ مستِ غزالانِ حرم
شوخیٔ لعلِ مے آلودِ بتاں لے کے چلے

تمکینِ ذائقۂ شکوۂ نازک بدناں
رازِ غنچہ دہناں، لالہ رُخاں لے کے چلے

لذتِ عربدۂ کافرِ حیلہ جویاں
نازِ پیماں شکناں، عشوہ گراں لے کے چلے

جنتِ شیوۂ دلداریٔ چشمِ خوباں!
بوئے انفاسِ مسیحا نفساں لے کے چلے

دل سے اٹھتی ہوئی مانندِ قیامت اک ہوک
پرتوِ قامتِ شمشاد قداں لے کے چلے

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں جنوں خیز اک شکل
عکسِ مہتاب، سرِ آب رواں لے کے چلے

جرسِ وقت کے بہتے ہوئے سناٹے میں
نوبنو قافلۂ عمرِ رواں لے کے چلے

گنگناتے ہوئے چشموں کی رسیلی غزلیں
آبشاروں کی دل افروز زباں لے کے چلے

جس میں سو طرح کے اندازِ گل افشاں وہ سکوت
جس میں سو رنگ کے معنی وہ بیاں لے کے چلے

جس کو سجدے کرے ایمان، سنبھالے وہ کفر
جس کا کلمہ پڑھے عرفاں وہ گماں لے کے چلے

ابرِ کہسار کے مانند، زہے فیضِ حبیب
روح میں ولولۂ عزمِ جواں لے کے چلے

لے کے آئے تھے دلِ سادہ و پُر امن سرخوش
شورشِ فتنۂ محشر رو شاں لے کے چلے

---

* میرے میزبان حبیب احمد صدیقی صاحب کمشنر کمایوں ڈویژن۔ — سرخوش

سودا اور ان کا ادبی ماحول

جمیلہ خاتون

سودا کے زمانہ کی دہلی جاگیردارانہ تہذیب کے زوال آمادہ دور کی دہلی تھی۔ اور چونکہ ہر زوال آمادہ دور ایک انتشاری کیفیت کا حامل ہوتا ہے اس لئے ہمیں اس دور میں بھی ایک انتشاری کیفیت ملتی ہے۔ یہ انتشاری کیفیت اس دور کے ادب پر بھی اثر انداز ہوئی چنانچہ ہمیں اس دور میں بھی خیالات کے لحاظ سے کوئی مجموعی رجحان ایسا نظر نہیں آتا جو اس دور کے تمام ادیبوں اور شاعروں کی مخصوص نفسیات سے ہم آہنگ ہو کر مختلف راستے اور مختلف منزلیں اختیار کرتا۔ ایسے موقع پر ماضی کا تہذیبی ورثہ کسی حد تک ادیبوں کا سہارا بنتا ہے لیکن سودا کا دور اس تہذیبی ورثہ سے بھی محروم تھا۔ اردو شاعری ابھی اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی، ابھی روایتیں بن رہی تھیں، ابھی ذہن اپنے لئے راستہ بنا رہا تھا، ابھی زبان کا کھردرا پن دور کیا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے ایسے وقت کسی بھی تہذیبی ورثہ کو سہارا بنانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ خود اس دور کے شعرا کو اپنے شعور، اپنے ذہن اور اپنی صلاحیتوں کو رہنما بنانا پڑا۔

تاریخی حالات نے اس دور کے شعرا کو شعوری اور ذہنی حیثیت سے تین خانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ عام حالات کی افراتفری سے ہر شاعر نے اپنے ذہن کی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے مختلف اثرات قبول کئے۔ ایک گروہ پر جو میر درد کی قیادت میں برسرِ عمل تھا تصوف کا غلبہ ہوا۔ چونکہ ان میں آفتوں سے بھری ہوئی اس زندگی سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہ تھی اس لئے یہ لوگ ایک منفی فلسفہ کے شکار ہو گئے۔ تصوف کی خاص تعلیمات 'نفی ہستی'، زہد اور ترک دنیا نے انھیں اپنی مستیوں میں الجھا لیا۔ میر درد جو اس گروہ کے قائد تھے اس رجحان کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا عمومی رنگ کچھ اس قسم کا ہے ؂

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

نے گل کو ہے ثبات، نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن، ہوس رنگ و بو کریں

نہ سمجھا درد ہم نے بھیدیاں کی شادیٔ غم کا
سحر خنداں ہے کیوں، روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

ان اشعار میں صرف یاس و حرماں کی مصوری نہیں ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمیں ان میں درپردہ ایک ربط نظر آئے گا۔ یہ ربط اسی ذہن کا عکس ہے جو ان اشعار کی

تخلیق کا گہوارہ ہے۔ یہ ذہن ایک ایسے فرد کا ذہن ہے جو دنیا سے، دنیا کے حالات سے اور اپنی زندگی سے شکست کھا کر ناامید ہو چکا ہو۔ زندگی سے ناامیدی ہمیں حالات کو بہتر بنانے پر بھی اکسا سکتی ہے اور خودکشی پر بھی۔ لیکن اس گروہ میں نہ تو یہ جرأت تھی کہ حالات کو بہتر بنانے کی جد و جہد کر سکتا اور نہ یہ ہمت تھی کہ طبعی طور پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا۔ ایسے موقع پر تصوّف کا وہ فلسفہ ان کے کام آیا جو باوجود اپنی دوسری خوبیوں کے میرے نزدیک ذہنی خودکشی کا فلسفہ ہے جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ نفی اور نفیِ ذات کے ذریعہ اپنی انفرادی ہستی کو ختم کر دیا جائے۔ انفرادی ہستی کو ختم کر دینے کا راستہ دنیا سے کنارہ کشی اور ترکِ لذات کا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو زندگی کا یہ نظریہ اس گروہ کے شعرا کی نفسیات سے سب سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ گروہ تیزی کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوا۔ اس نے خود کو اس فلسفہ میں الجھا کر اپنی بے چین زندگی سے فرار حاصل کیا۔

دوسرا رجحان ان لوگوں کا تھا جن کی طبیعت زیادہ حساس تھی جو اس زندگی سے بھاگنا نہیں جانتے تھے بلکہ ان کے دلوں میں وہ خلوص تھا جو انھیں اس زندگی کو برتنے پر مجبور کر رہا تھا۔ انھیں اپنی تہذیب کے مٹنے کا غم تھا، حالات کی ناسازگاری کا احساس تھا اور اپنی مجبوری و لاچاری سے وہ باخبر تھے۔ لیکن ان کے پاس عمل کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ صرف یہ کر سکتے تھے کہ اپنے احساسات کو قوتِ گویائی بخش دیں۔ ان کے اختیار میں صرف اتنا تھا کہ اپنے قلم کو اس المیہ کے لئے وقف کر دیں اور انھوں نے یہی راستہ اختیار کیا۔ اس طبقے کے سرگروہ میر تقی میر تھے۔ حقیقی زندگی کا المیہ ان کی شاعری کا المیہ بن گیا۔ ایسا کیوں ہوا اس کی وضاحت میر کے ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھوں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دلّی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسی کا سرِ پرغرور تھا

میر نے ان اشعار میں دہلی کا المیہ نظم کیا ہے۔ یہ المیہ کہیں واضح ہے، کہیں ان کے شعورِ غم میں رچا ہوا۔ بہر حال ان اشعار سے یہ بات تو واضح ہو ہی جاتی ہے کہ میر کو ایک طرف دہلی کے کوچوں کا "اوراقِ مصوّر" ہونا یاد تھا اور دوسری طرف کسی کے "سرِ پرغرور" کی عظمت کا احساس تھا۔ ان اشعار سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ میر نے زندگی کو صرف برتا ہی نہیں تھا بلکہ انھیں اپنی اس زندگی سے جو کبھی "سرِ پرغرور" کی حامل تھی ایک محبّت بھی تھی۔ ان کی نظر میں اس دہلی کا جو ایک زمانہ میں "اوراقِ مصوّر" تھی ایک احترام بھی تھا۔ وہ روتے ہوئے بھی یہ جانتے تھے کہ ؎

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اور غالباً یہ ہمسایہ کو خواب سے بیدار کرنے ہی کا احساس تھا کہ میر نے اپنے بین کی جھنکار تیز سے تیز تر کر دی۔ وہ پورے خلوص اور پوری شدت کے ساتھ اپنے دور کے اس المیہ کو اپنی شاعری میں سموتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم میر کی شاعری میں غم انگیزی کے باوجود انتہائی گرمی اور انتہائی جوش و خروش محسوس کرتے ہیں۔

درد اور میر دونوں کی فطرت غم پسند ہے۔ دونوں کے احساسات میں درد اور غم کے اجزا مشترک ہیں لیکن ان دونوں کے رجحانات میں فرق ہے۔ درد کا غم تصوّف سے ہم آہنگ ہو کر زندگی کی منفی قدروں کا ترجمان بن گیا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر میں قنوطیت ہے۔ زندگی سے فرار ہے لیکن میر کے غم میں نہ تو زندگی سے فرار ہے اور نہ قنوطیت درد سے

[illegible] کا مالک ہونے کے باوجود میر ایک صحت مند [illegible] زندگی کی علامت ہیں۔ ان کے یہاں ـــ

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جیسی فضا نہیں۔ وہ درد کی طرح زندگی کا مقصد فنا قرار نہیں دیتے بلکہ وہ زندگی کو عشق کی طرح جاری و ساری سمجھتے ہیں ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یہ رجائیت اور قنوطیت کے رجحانات تھے جو اس دور میں ایک بڑے گروہ پر چھائے نظر آتے ہیں لیکن ایک تیسرا رجحان بھی تھا۔ یہ بظاہر رجائی تھا لیکن حقیقتاً اس کی بنیادیں قنوطیت اور فراریت پر تھیں۔ یہ رجحان رکھنے والے درد وغیرہ کی طرح زندگی کے بھیانک خدوخال سے آنکھیں چار کرنے کی جرات نہ رکھتے تھے اور اسی کے ساتھ ان میں اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ ترک لذات کا راستہ اپنا لیں۔ انھوں نے اچھے دن دیکھے تھے عیش کی زندگی بسر کی تھی اور اب بھی ان کے دل میں اسی طرح زندگی بسر کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ زندگی سے بھاگ کر کسی ایسے فلسفہ کی آغوش میں پناہ حاصل نہیں کر سکتے تھے جو ذہنی خودکشی کا فلسفہ ہو۔ یہ اپنی دن بدن بگڑتی ہوئی زندگی سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں ان لوگوں پر اُن کے عہد اور اس کے حالات نے ایک دوسرا اثر ڈالا۔ ان لوگوں نے اپنی زندگی کی عمومی افراتفری کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اس لمحاتی سکون کو جو درباروں میں انھیں کچھ دیر کے لئے مل جاتا تھا انھوں نے بہت زیادہ اہمیت دی اور خود کو دربارداری اور عیش و عشرت کے جھوٹے نشہ میں ڈبو دیا۔ ان کی نفسیات کچھ اس طرح کی تھی کہ جتنا بھی رس وہ اس دم توڑتی ہوئی رنگین محفلوں سے نچوڑ سکیں نچوڑ لیں۔ انھیں اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ یہ رنگا رنگ محفلیں، یہ پرلطف زندگی اور یہ رنگین ماحول صرف چند دنوں کا مہمان ہے اور پھر اس کے بعد یہ صورتیں اور یہ محفلیں دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترس جائیں گی۔ انھیں یہ زندگی اور یہ محفل عزیز تھی۔ وہ اس کی موت اپنی موت سمجھتے تھے۔ لیکن انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ اب یہ زوال ان کے روکے نہیں رک سکتا۔ ہوا کے وہ جھونکے جو اس شمع کو بجھا رہے ہیں اتنے تیز ہیں کہ ان کا مقابلہ کرنا لاحاصل ہے۔ مٹتی ہوئی قدروں کا یہ احساس ان کے مزاج میں ایک طرح کی انبساطیت (Hindonism) کا محرک بنا۔ اور انہوں نے اپنے اردگرد کی سسکتی ہوئی زندگی سے آنکھیں چرا کر خود کو عرق مے ناب کر دیا۔ سوداؔ اسی گروہ کے نمائندہ تھے۔

جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے اس رجحان کے شعرا نے اپنی شکست کو درباروں کی وقتی رنگ رلیوں میں چھپانے کی کوشش کی۔ ان کے دل رو رہے تھے لیکن ان کی زبانوں پر مسرت کے نغمے تھے۔ زندگی سسک رہی تھی لیکن وہ بادشاہ کی سالگرہ، صحت اور دوسری تقریبات پر مبارکباد کے قصائد لکھنے میں مشغول تھے۔ ان کا دل بجھا جا رہا تھا لیکن ان کی زبانیں شکوہ الفاظ اور زور تخیل کی بھول بھلیاں میں الجھی ہوئی تھیں۔ سودا کے پورے سرمایۂ ادب کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہی ہیجان واں واں نظر آئے گا۔ سوداؔ کے اشعار کی یہی کیفیت ہے جو ان کے اس قسم کے اشعار کو

سودا کی جو بالیں پہ اٹھا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

میرؔ اور دردؔ کے طرز کلام سے الگ الگ کرتے ہیں۔ سوداؔ کے یہاں نہ وہ سوز اور درد ہے جسے میرؔ نے اپنایا اور نہ وہ سادگی اور بے ثباتی کا احساس ہے جو اس دور میں دردؔ کی شاعری پیش کر رہی تھی۔ اس کے برعکس اُن کے اشعار میں ایک آمد، ایک جوش، ایک پرشکوہ بلندی، ایک لذت اندوزی، ایک طنطنہ، ایک شوکت ملتی ہے جو اُن کے معاصرین میں ناپید ہے۔

اس تغیر پذیر زمانہ اور زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کا احساس بادشاہوں کو بھی تھا اور امرائے وقت کو بھی۔ وہ اپنے پیروں کے نیچے سے زمین نکلتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن اس کے باوجود بادشاہ اور امرا سبھی نے شاعروں کے اس تیسرے رجحان کی سرپرستی کی۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ اوّل تو یہ کہ جاگیردارانہ تہذیب نے عزت اور وقار کا جو معیار قائم کر دیا تھا وہ انھیں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ خواہ نام ہی کے سہی بہرحال بادشاہ تھے اور کسی بادشاہ کی عظمت کا اس دور میں بھی یہ معیار تھا کہ اس کے دربار سے کتنے شعراء وابستہ ہیں، کتنے اہل فن اس کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ایک کرتے ہیں، کتنے پڑھے لکھے انسان اس کے درِ دولت پر حاضری دیتے ہیں وغیرہ عظمت کا یہ وہ جھوٹا معیار تھا جو ان بادشاہوں کو اپنی محدود آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ اُن شعراء پر خرچ کر دینے کے لئے مجبور کرتا تھا؛ جو اس زوال پذیر سماج میں بھی ان سے وابستہ تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ہماری شان و شوکت رفتہ رفتہ موت کے بھیانک غار کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن جس طرح گیارھویں کا میلہ، محرم کی تقریبات، عید کا جشن اور رمضان کا اہتمام انھیں اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے کرنا پڑتا تھا اسی طرح شعراء کو بھی اپنے دربار سے متعلق رکھنا اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ ایک دوسری نفسیاتی وجہ بھی تھی۔ قیاس کیجئے کہ جب درباروں کی تباہی کا اثر عوام پر اس طرح پڑ رہا ہو کہ وہ زندگی سے فرار اختیار کر رہے ہوں اور گوشہ نشینی میں سکون تلاش کر رہے ہوں؛ تو پھر ان لوگوں کا کیا حال رہا ہوگا جو اس اتھل پتھل اور اس انتشار میں ایک مرکزی درجہ رکھتے ہوں۔ ان کے ذہن اپنی تباہ حالی کے احساس سے پراگندہ تھے۔ ایسے وقت میں تسکین کا اگر کوئی راستہ نہ ہو تو جینا دوبھر ہو جاتا ہے اس لئے شعرا کی قصیدہ خوانی ان کے لئے غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی۔ شعرا کی جھوٹی سچی تعریف سن کر ان کی انا اور خود پسندی کو بڑا سہارا ملتا۔ ان کی اہمیت حقیقتاً ختم ہو چکی تھی لیکن خود انھیں اپنی اہمیت کا اب بھی اتنا احساس تھا کہ یہ تعریف ان کے لئے ایک نشہ کا کام کرتی اور وہ اس طرح اپنی زندگی میں تھوڑی سی رونق، تھوڑی سی چاشنی تھوڑا تھوڑا سا رنگ اور تھوڑی سی دلچسپی محسوس کر لیتے۔

سوداؔ وغیرہ نے بادشاہ اور درباروں کی اس ذہنیت سے پورا فائدہ اٹھایا۔ جب تک دہلی کی سلطنت سے تھوڑی بہت امید رہی انھوں نے دہلی نہ چھوڑی لیکن جب امید کے تمام رشتے ٹوٹ گئے تو فرخ آباد گئے اور وہاں کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ وہاں سترہ سال تک دربار سے وابستہ رہے لیکن جب وہاں بھی زوال شروع ہوا تو احمد خاں کی زندگی ہی میں اودھ چلے آئے اور یہاں کے امرا کی تعریف میں قصائد لکھنے لگے۔

دہلی کو الوداع کہنے والوں میں میرؔ بھی تھے اور حقیقت یہ ہے کہ تقریباً سب ہی قابل ذکر شعراء دہلی کے انتشار سے اکتا کر دوسری جگہوں پر سکون کی تلاش میں جا بسے سوائے دردؔ کے جنھوں نے اپنا نصب العین یہ بنا لیا تھا کہ "ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را"۔ وہ اپنی زندگی بھر اسی کے سہارے دہلی میں جمے رہے۔ لیکن دہلی سے میرؔ کی ہجرت اور سوداؔ کی ہجرت میں فرق ہے۔ میرؔ جب دہلی کی تباہی اور بربادی نہ دیکھ سکے تو اکتا کر انھوں نے دہلی چھوڑ دی۔ معاشی مسئلہ ان کی ہجرت کا بھی ایک سبب تھا لیکن ان میں کسب زر کی وہ خواہش نظر نہیں آتی جو ہمیں سوداؔ کے یہاں ملتی ہے اور اگر "آب حیات" کے مؤلف محمد حسین آزادؔ کا بیان صحیح ہو تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ میرؔ نے کسب زر سے زیادہ ذہنی سکون کے لئے دہلی کو خیرباد کہا تھا۔ اس کے برعکس سوداؔ جس طرح دہلی سے فرخ آباد گئے اور پھر وہاں کافی دنوں قیام کرنے کے بعد اودھ پہونچے اور وہاں بھی دربار سے متعلق رہے اسے دیکھتے ہوئے ہمارا یہ خیال پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ سوداؔ کا مقصد صرف یہ تھا کہ زندگی آرام سے گذرے۔ چنانچہ اپنے اسی رجحان کے زیر اثر وہ ساری عمر درباروں کی خاک چھانتے رہے۔

لیکن سماج کی بدحالی اور اقتصادی حالات نے آخر سوداؔ کو بھی اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے اپنے دور اور اپنے معاشرے کی تباہی سے متعلق ایک اچھا خاصا ادب تخلیق کیا لیکن

سودا نے بدلتے ہوئے زمانہ پر عام طور سے ہجویں لکھی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اتنے سنجیدہ نہ تھے جتنے میرؔ ورنہ ان کے کلام میں بھی ان حقائق کا وہی سنجیدہ پر تو ملتا جو ہمیں میرؔ کے یہاں نظر آتا ہے۔ سوداؔ کی سماجی شاعری ایک اور حیثیت سے میرؔ کی سماجی شاعری سے مختلف ہے اور وہ ہے دونوں کے لب و لہجہ کا فرق۔ میرؔ نے جب حالات زمانہ کو اپنا موضوع بنایا ہے تو اس عالم حیات سے انھوں نے اپنی ذات کو الگ نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے ایسے اشعار آپ بیتی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں وہ گھلاوٹ، وہ درد، وہ احساس کی شدت اور وہ جاذبیت ہے جو اسے دل کی ترجمان بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس جب سوداؔ اس عہد اور اس کے حالات پر طبع آزمائی کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی اپنی ذات اس عام افراتفری سے الگ ہو۔ ان کے اشعار دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سوداؔ دوسروں کی بات کر رہے ہیں، اپنی نہیں۔ ان میں بیانیہ کا زور و شور ہے لیکن احساس کی کمی۔ ان کی اس قسم کی شاعری بالکل ایسی ہی ہے جیسے کنارے پر کھڑے ہوئے کسی شخص نے کسی ڈوبنے والے کو ڈوبتے دیکھا ہو اور پھر وہ دوسروں کے سامنے تفصیل سے اس کی منظر کشی کرے۔ میرؔ کو پڑھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ خود ڈوبنے والے کے تاثرات ہیں اور سوداؔ کو پڑھیے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک شاہد کی زبانی اس المناک حادثہ کی داستان سن رہے ہیں۔ یہ فرق دراصل ان کی اسی مختلف نفسیات کا فرق ہے جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے۔

سوداؔ کی یہی نفسیات تھی جس نے انھیں خاص طور پر قصیدہ کا شاعر بنا دیا۔ چونکہ غزل کے لیے اس لب و لہجہ اور اس انداز کلام کی ضرورت تھی جو آپ بیتی کے لئے ضروری ہے اور سوداؔ کی توجہ بہت جگ بیتی کی طرف تھی اس لئے وہ غزل گو شاعر کی حیثیت سے کوئی بڑا کارنامہ پیش کر سکے۔ ان کا اپنا ذہن اور ذہن کی نوعیت قصیدے سے ہم آہنگ تھی اور پھر ان کی اپنی نفسیات بھی انھیں قصیدہ نگاری پر مجبور کر رہی تھیں۔

اسی لئے ان کے یہاں قصیدہ نگاری کا وہ آرٹ ملتا ہے جس کی مثال اردو شعرا کی صف میں کہیں نہیں ملتی۔ ان کے ذہن، ان کی نفسیات اور ان کے فن نے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر وہ شکل تیار کی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کسی پہاڑ کی بلند ترین چوٹی کی طرح تنہا اور شاہکار کی طرح بے مثال ہے۔ سوداؔ کی عظمت میں ان کے اس نفسیاتی رجحان کا سب سے بڑا ہاتھ تھا اس لئے ان کی عظمت ان کی اہمیت اور ان کی قدر و قیمت کو صرف اسی نفسیاتی پس منظر کی روشنی ہی میں سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

✡

ہم سب کو خواہ ہم ہندو ہوں یا مسلمان۔ پارسی ہوں یا سکھ ہوں یا عیسائی۔ ہندوستانی کی حیثیت سے آپس میں بھائی چارہ کے ساتھ رہنا چاہیئے اور ہمارا یہ عزم ہونا چاہیئے کہ ہم ایک ہی ماں کے لڑکوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی ایک رہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ایک ہی درخت کی بے شمار پتیاں ہوتی ہیں۔

مہاتما گاندھی

چاند کی فضا

علی ارشاد نقوی

آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب ہم چاند کی سیاحت کر سکیں گے۔ راکٹ کی طاقت سے اڑنے والے جہاز ہم کو زمین کی قوت کشش سے باہر نے جانے کا کام انجام دے سکتے ہیں اور جب ہم زمین کی قوت کشش سے نکل کر چاند کے دائرۂ کشش میں داخل ہو گئے تو پھر آہستہ آہستہ گھومتے گھومتے ہم چاند کی سطح پر بھی اتر سکیں گے۔

چاند کے متعلق اس وقت تک جو معلومات حاصل ہو چکی ہیں ان سے ہمیں چاند کی سطح کا بہت کچھ اندازہ ہو گیا ہے اور وہاں کی بہت سی باتیں تخئیل کی گہرائیوں میں کچھ اس قدر اثر کر گئی ہیں کہ تصور بہ آسانی اُن کا خاکہ اتار سکتا ہو۔ یہ خاکہ، اگر چاند کا اصلی ماحول نہیں تو اس سے بہت کچھ مشابہ ضرور ہو گا۔

یہ امر مسلّم ہے کہ ہماری دنیا کرۂ باد سے گھری ہوئی ہے اور اس کرۂ باد کے بعد بہت سے کرّے ہیں۔ یہ کرّے جیسے جیسے کرۂ باد سے دور ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے ان میں ہوا کا دباؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ کرۂ باد کا وجود زمین سے صرف ۲۵ یا ۳۰ میل کے حلقے میں خیال کیا جاتا ہو اور اس کے بعد جو کرّے ہیں ان میں ہوا بتدریج اتنی ہلکی ہوتی جاتی ہے کہ تقریباً ڈھائی سو میل کے بعد یہ مفقود ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہوا جو ہماری سطح زمین پر برق کی موصل (Conductor) نہیں زمین سے جیسی جیسی دور ہوتی جاتی ہے موصل ہوتی جاتی ہے۔ ہوا مختلف گیسی عناصر سے مل کر بنی ہے اور ان گیسوں کے لاانتہا ہی چھوٹے چھوٹے اجزا (ایٹم) اس وقت تک برق سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے جب تک ان میں موجود متضاد برقی صلاحیت الکٹران (Electron) اور پروٹان (Proton) کا توازن قائم رہتا ہے۔ مگر یہ توازن کرۂ باد سے دور ہونے پر بگڑنے لگتا ہے کیوں کہ سورج سے ہم جتنا نزدیک ہوتے جائیں گے اسی قدر فضا میں بالائے بنفشی شعاعوں ([illegible] Violet Ray) کی تیزی بڑھتی جائے گی۔ یہ بالائے بنفشی شعاعیں فضائی گیسوں کے ایٹموں کی برقی طاقتوں کو اس طرح الگ الگ کر دیتی ہیں کہ ان میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ الکٹران نیز پروٹان تیزی سے گھومنے اور ٹکرانے لگتے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ چاند پر بھی ہوا کے ایٹموں کا یہی حشر ہوا اور وہ منتشر ہو کر تیزی سے گردش کرنے لگے۔ پھر گردش کی رفتار ان کے باہمی تصادم کے سبب سے برابر بڑھتی رہی۔

اب اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے آج کل کی جدید تحقیقات ایٹمک کی طرف رجوع ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ اگر کسی شے کو تقریباً سات میل فی سیکنڈ کی رفتار سے رہا کیا جائے تو وہ زمین کے گرد گردش کرتے کرتے اس کی قوت کشش کے باہر نکل جائے گی اور پھر واپس نہ آئے گی۔ یہی کچھ چاند کے گرد کی فضا کے ساتھ پیش آیا۔ اس فضا کی گیسوں کے ایٹم پہلے تو بالائے بنفشی شعاعوں کے سبب سے الکٹران اور پروٹان میں منتشر ہوئے اور پھر یہ الکٹران

اور یہ [illegible] قدرتی تو اس کا سبب ہے کہ ان میں پنہاں برقی قوت کشش [illegible] ہو گئی اور پھر یہ آپس میں ٹکرانے کے باعث چاند کے گرد تیزی سے چکر کاٹنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی رفتار چاند پر درکار فرار رفتار رہائی سے تجاوز کر گئی اور یہ الکٹران اور پروٹان اس کے حلقۂ اثر سے دور ہوتے گئے۔ اس طرح دھیرے دھیرے چاند پر پائی جانے والی گیسیں یہاں سے غائب ہو گئیں اور اب اگر وہاں کی فضا میں کسی گیس کی موجودگی کا شبہ کیا جا سکتا ہے تو وہ نائٹروجن جیسی بھاری گیسوں کا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ گیسیں بھی وہاں اتنی کم مقدار میں ہوں گی کہ ان کا شمار نہ ہونے میں کیا جائیگا۔

اس کا ماحصل یہ نکلتا ہے کہ چاند کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد ہم کو سب سے پہلے اپنے لئے ہوا اور آکسیجن کا انتظام کرنا پڑے گا جو ہماری بقائے حیات کے لئے اشد ضروری ہیں۔ پھر ہمارا لباس کچھ ایسا ہونا چاہئے جو ہمارے جسم کو خلا کے مضر اثرات سے محفوظ رکھے۔ یہی آخر الذکر دشواری کا حل تو ہم نے نکال لیا ہے مگر چونکہ یہ لباس بھاری ہوگا اس لئے وہ ہماری سبک روی میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ چاند کا وزن کم ہونے کے باعث وہاں ہمارا وزن زمین پر ہمارے وزن کا چھٹا حصہ ہوگا۔ مگر لباس بھاری ہونے کے سبب سے ہم اپنے ہلکے پن کا فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے جہاں تک پیداوار کا تعلق ہے چاند کی سطح پر نہ تو کوئی شے اگ سکتی ہے اور نہ ہم کسی چیز کو پکانے کے لئے آگ روشن کر سکتے ہیں کیوں کہ ان دونوں کاموں کے لئے ہوا کی ضرورت ہے جو وہاں نہ ملے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آگ کی جگہ ہم سورج کی گرمی سے کام چلالیں مگر پودوں کی نشوونما کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہو سکتا۔ پھر ہوا نہ ہونے کے باعث چاند پر پانی کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ وہ مقامات جن کو زمانۂ قدیم کے ماہر فلکیات پانی سے لبریز خیال کرتے تھے اور جن جگہوں کے نام انھوں نے "بحر گل" (Sea of Flowers) اور "خوابوں کی دنیا" (Lake of Dreams) وغیرہ رکھا تھا حقیقت میں کوئی سمندر یا جھیل نہیں اور نہ ان جگہوں پر پانی ملنے کا امکان ہے لیکن ایک طرف فضا کی عدم موجودگی ہمارے لئے تشویش اور دقتوں کا باعث ہوگی تو دوسری طرف یہی چیز ہم کو غیر متوقع مناظر قدرت سے روشناس کرانے کی حامی ثابت ہوگی۔ چاند پر سے بھی ہم کو لاتعداد ستارے نظر آئیں گے اور ان میں چمک بھی ہوگی مگر اُن میں ٹمٹماہٹ نہیں ہوگی۔ ان کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوگا گویا وہ ٹکٹکی باندھے آنکھیں دکھانے کے بدلے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہم کو گھور رہے ہیں۔

سطح زمین پر طلوع و غروب آفتاب کے وقت جو شفق نمایاں ہوتی ہے وہ فضا کی مختلف تہوں میں سے روشنی کے گذرنے اور اپنے اس دوران سفر میں ہوا میں موجود پانی کے قطرات اور گرد کے چھوٹے چھوٹے ذرّوں سے دوچار ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ چاند میں ہوا، گرد یا پھر فضائی نمی نہ ہونے کے باعث ہم وہاں کرشمۂ قدرت کی اس دلکشی سے محروم ہو جائیں گے۔ زمین پر سپیدۂ سحر اور شفق کا نمودار ہونا اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ طلوع یا غروب آفتاب میں زیادہ دیر نہیں لیکن چاند پر فضا مفقود ہونے کے باعث وہاں کے طلوع و غروب آفتاب سے ہم کو اسی وقت آگاہی ہوگی جب ہم سورج کو سطح کے اوپر نمودار ہوتے یا سطح زمین کے نیچے جاتے دیکھیں گے۔ سورج کی وہ روشنی جو ہم کو قبل طلوع یا بعد غروب اس کی کرنوں کے ہوا کی مختلف ثقل کی مختلف تہوں میں سے منعطف (Refraction) ہونے کے سبب سے ہم تک پہنچتی ہے چاند پر ہم کو نہیں ملے گی۔ اور اس طرح دن اور رات کے مابین اختلاط پیدا کرنے والی شام اور صبح کے سہانے مناظر سے ہم وہاں قطعاً محروم ہو جائیں گے۔ ہاں اگر ہم روز روز ایک ہی طرح کی شام و سحر دیکھتے دیکھتے اس سے اکتا گئے ہیں تو ہمیں چاند پر اکتانے والے ان لمحات سے چھٹکارہ مل جائے گا۔ وہاں تو سورج آگ کے ایک بہت بڑے دہکتے ہوئے گولے کی مانند ایک دم سے اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دے گا اور پھر اسی طرح اپنی ترچھی مگر تیز شعاعیں بکھراتا ہوا غروب ہو جائے گا۔

مگر چاند پر رات کا آنا بھی ایک مصیبت کا آنا ہوگا۔ یہ رات ہمارے یہاں کی رات کی طرح بارہ گھنٹے کی نہ ہوگی بلکہ ہمارے تقریباً پندرہ دن کے برابر ہوگی اور اسی طرح چاند کا دن بھی ہمارے پندرہ دن کے برابر ہوگا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ تقریباً ۳۶۰ گھنٹے

کی رات کیسے کٹے گی۔ عجب نہیں کہ طول شب ہجر بھی اس رات سے شرما جائے۔ اگر خدا خدا کرکے رات کٹ گئی تو پھر وہی ۳۰۰ گھنٹے کا دن ہوگا اور ہم ہوں گے اور جوں جوں دن چڑھتا جائے گا نئی نئی مصیبتیں سامنے آئیں گی۔ سورج کی گرم شعاعیں تمام دن چاند کی پتھریلی سطح کو گرم کرتی رہیں گی اور یہ گرمی ہوا نہ ہونے کے باعث ایصال (Convection) یا نقل (Conduction) کے ذریعے منتقل بھی نہ ہو سکے گی۔ رفتہ رفتہ چاند کا درجۂ حرارت کھولتے ہوئے پانی کے درجۂ حرارت سے بھی تجاوز کر جائے گا۔ یہ گرمی ہماری قوت برداشت پر گراں ہی نہیں گزرے گی بلکہ ہم کو بھون دیگی۔ ٹھیک اسی طرح جب رات ہوگی اور سردی پڑنا شروع ہوگی تو ایک وقت ایسا آئے گا جب چاند کا درجۂ حرارت برف کے درجۂ حرارت سے بھی سو ڈگری کم ہو جائیگا۔

معلوم نہیں چاند کی دنیا میں ہم ایک دوسرے کی آواز بھی سن سکیں گے یا پرانے زمانے کے خاموش فلموں کی طرح صرف لبوں کی جنبش دیکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہم سے کیا کہا جا رہا ہے اور کون کہہ رہا ہے۔ تجربات شاہد ہیں کہ خلا میں آواز بغیر ہوا کی استعانت کے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن ہماری اس دشواری کا حل غالباً ریڈیائی شعاعیں فراہم کر سکیں گی جو خلا میں بھی بلا کسی دشواری کے طویل مسافت طے کرتی ہیں۔

ہماری زمین پر ہم سائے میں اور کمرے یا بند جگہوں میں بھی آسانی سے ہر شے کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہوا میں شامل گرد اور پانی وغیرہ کے مختلف ذرات سورج کی روشنی کو بند جگہوں میں اس طرح پہنچاتے ہیں کہ وہاں کی ہر شے ایک ہلکی سی روشنی دینے لگتی ہے جس کے سبب سے ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن چاند پر ہم صرف ان چیزوں کو صاف دیکھ سکیں گے جو کھلی ہوئی جگہوں پر ہوں گی وہاں روشنی کا نفوذ (Diffusion) ممکن نہیں اس لئے سایہ دار جگہیں کافی تاریک ہوں گی۔

ان سب دشواریوں کے قطع نظر ہم چاند پر بہت سے ایسے دلکش اور غیر متوقع مناظر دیکھیں گے جو اپنی جاذبیت کے سبب سے ہم کو اپنی دشواریاں بھولنے پر مجبور کر دیں گے۔ مختلف ستاروں اور سیاروں سے قربت حاصل ہونے کی وجہ سے ان کی بابت مزید تحقیقات کے امکانات وسیع ہو جائیں گے۔ گرد و غبار کی غیر موجودگی ہماری حد نظر کو اور وسعت دے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ چاند پر پہنچ کر ہمارے حوصلے اور بلند ہو جائیں اور وہاں سے ہم دوسرے ستاروں پر جانے کا ارادہ کریں کیوں کہ ہر کامیابی انسان کی ہمت بڑھاتی ہے۔

غزل

مشیر احمد گمنام

نشۂ بادۂ گلرنگ میں مدہوش آیا — کون میخانہ میں اس درجہ بلا نوش آیا
پھر کوئی شیشہ بلب جام درآغوش آیا — انجمن میں تری پھر کوئی خطا کوش آیا
شاید انجام سے واقف نہ تھی ارباب جنوں — ہو چکا خونِ تمنا تو انھیں ہوش آیا
ہائے وہ حسن جو کاشانۂ دل میں اکثر — کبھی مصروف تکلم کبھی خاموش آیا
وائے تقدیر نشیمن کبھی گلشن کی طرف — ابر آیا بھی اگر صاعقہ بردوش آیا
حشر انداز تصور میں اگر آئے گمنام — وہ نہیں آئے تو کون عہد فراموش آیا

دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے آخری سال کے دوران میں انسانی طاقت کے وسائل کو بروئے کار لانے سے متعلق نظامت تربیت اور روزگار کی اسکیموں میں مزید توسیع کی جائے گی۔ ان اسکیموں پر منصوبہ کی پوری مدت میں تخمیناً ۱۶ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ جس کا ۶۰ فی صدی مرکزی حکومت ادا کرے گی۔

نظامت تربیت و روزگار سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں مزید ۱۴ ضلع روزگار دفتروں کے قیام۔ روزگار سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی اسکیم کے مزید ۱۰ ایجنسیوں میں نفاذ۔ اور پیشہ ورانہ رہنمائی کے مزید ۴ واحدوں کے قیام کی تجویز رکھتی ہے۔

مذکورہ بالا ۱۴ ضلع روزگار دفتروں کے قیام سے منصوبہ کے تحت ہر ضلع میں ایک روزگار دفتر قائم کرنے کا مقررہ نشان پورا ہو جائے گا۔

روزگار سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے واحدے اس وقت روزگار تلاش کرنے والوں کی خصوصیات۔ تربیت یافتہ عملہ اور مزدوروں کی مانگ اور سپلائی میں توازن قائم کرنے کے لئے اقدامات وغیرہ کے متعلق ضروری اعداد و شمار فراہم کر رہے ہیں۔ دوسرے منصوبہ کے پانچویں سال میں یہ اسکیم پرائیویٹ سیکٹر میں مزید ۱۰ مقامات پر شروع کی جائے گی۔

اس اسکیم کے تحت جو اعداد و شمار فراہم ہوں گے وہ قومی اور ریاستی سطح پر انسانی طاقت کی منصوبہ بندی کے لئے کام میں لائے جائیں گے تخمینہ لگایا گیا ہے کہ پوری مدت میں اس مد میں ۱۵ر۳۴ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

منصوبہ کے آخری سال میں پیشہ ورانہ رہنمائی کے چھ واحدے قائم کئے جائیں گے ان کے ذریعہ اسکول سے نکلنے والے لڑکوں کو پیشوں کے انتخاب کے سلسلہ میں رہنمائی کی جائے گی۔ ان واحدوں کے ذریعہ بالغوں کی بھی رہنمائی کی جائے گی۔ ان واحدوں پر جن کی تعداد منصوبہ بندی کی مدت میں بڑھ کر ۹ ہو جائے گی تقریباً ۱۰۵ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

پیشوں سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے واحدوں کی جانب سے ایک جامع ڈکشنری بھی شائع کی جائے گی جس میں مختلف کاروبار اور پیشوں کی تعریف و تشریح اور دیگر ضروری تفصیلات ہوں گی۔ اس اسکیم پر منصوبہ کی مدت میں تقریباً ۳۲ ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔

• • •

ریاستی محکمہ صحت کے ورکنگ گروپ نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے مسودہ میں شامل کرنے کے لئے اتر پردیش کے لئے ۳۵ کروڑ روپیہ کی لاگت کی طبی سہولتوں کی توسیع کا پروگرام مرتب کیا ہے۔ اس پروگرام کی اہم مدوں میں مزید دو میڈیکل کالجوں کا قیام۔ نرسنگ کالج اور لکھنؤ میں منطقائی کنبہ منصوبہ بندی تربیتی مرکز کا قیام شامل ہے۔

اس پروگرام کے تحت اتر پردیش کے پانچ اضلاع میں تپ دق کی روک تھام کی ہمہ گیر اسکیم شروع کرنے کے علاوہ پردیش بھر میں کوڑھ کی روک تھام کے اقدامات تیز تر کرنے کی تجویز ہے۔ پروگرام میں خاص طور پر دیہی علاقوں میں چیچک اور ہیضہ وغیرہ کی بیماریوں کی بیخ کنی کیلئے وسائل مہیا کرنے کی اسکیم بھی شامل کی گئی ہے۔ ملیریا کی بیخ کنی کا پروگرام جو پہلے سے زیر عمل ہے تیسرے منصوبہ کے دوران میں بھی جاری رہیگا۔

گاؤں کے ہر باشندے کو خواہ وہ کتنے ہی دور افتادہ گاؤں میں رہتا ہو طبی سہولتیں فراہم کرنے کے پیش نظر دیہی علاقوں میں مزید اسپتال اور ڈسپنسریاں قائم کرنے کی تجویز اس پروگرام میں شامل کی گئی ہے اور عورتوں کو علاج معالجہ کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے مزید ۴۰ ڈسپنسریاں قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔

پروگرام کے تحت ایسے مریضوں کے علاج کی سہولتوں میں بھی اضافہ کیا جائے گا جو علاج کے لئے اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے اخیر تک ریاست کے اسپتالوں میں پلنگوں کی مجموعی تعداد بڑھ کر ۱۷،۰۰۰ ہو جائے گی اور تیسرے منصوبہ کے دوران میں پلنگوں کی تعداد میں مزید ۶۰۰۰ ہزار کا اضافہ ہوگا۔

مجوزہ پروگرام میں مختلف زمروں کے عملہ کی طبی تعلیم اور تربیت اور موجودہ طبی اداروں اور میڈیکل کالجوں میں تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کو اولیت دی جائے گی۔ مجوزہ میڈیکل کالجوں میں ایک علی گڑھ اور دوسرا ریاست کے مشرقی اضلاع میں سے کسی ضلع میں قائم کیا جائے گا۔ علی گڑھ میں میڈیکل کالج کی عمارت علی گڑھ یونیورسٹی تعمیر کرے گی۔ ان دو میڈیکل کالجوں کے قیام کا فیصلہ ریاست میں ڈاکٹروں کی تعداد بڑھانے کے لئے کیا گیا ہے۔ دوسرے منصوبہ کے اخیر تک اتر پردیش میں ڈاکٹروں کی تعداد تقریباً ۸۰۰۰ ہو جائے گی اس طرح باعتبار آبادی ہر ۸۶۵۰ اشخاص کے لئے ایک ڈاکٹر ہوگا۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے دوران میں ریاست بھر میں ضرورت کے مطابق مزید ابتدائی صنعتی واحدے قائم کئے جائیں گے۔ امید کی جاتی ہے کہ دوسرے منصوبہ کے اخیر تک ریاست میں ۵۷۴ ابتدائی صنعتی واحدے قائم ہو جائیں گے۔ ریاست کو ۸۶۹ ترقیاتی بلاکوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اس طرح پورے اتر پردیش کو ان کے دائرہ اثر میں لانے کے لئے مزید ۲۹۵ ابتدائی صنعتی واحدے قائم کرنا ہوں گے۔ تیسرے منصوبہ کے تحت اتنی ہی تعداد میں واحدے قائم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

پروگرام میں دیہی طریقہ علاج کو فروغ دینے کے پیش نظر آیورویدک کالج کو مزید ساز و سامان مہیا کرنے اور اس کی توسیع کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نیشنل ہومیوپیتھک کالج لکھنؤ کے لئے عمارت کی تعمیر اور ہومیوپیتھک میڈیکل کالج الہ آباد کو صوبائی بنانے کی بھی تجویز ہے۔

• • •

نقل و حمل کے ورکنگ گروپ نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے مسودہ میں شامل کرنے کے لئے ۲۰،۹۲۵ کروڑ روپیہ کے منصوبہ کا خاکہ تیار کر لیا ہے جس میں اصل سرمایہ ۱۱،۸۰ کروڑ روپیہ اور بسوں کے چلانے کے اخراجات کے لئے ۹،۱۲۵ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے۔

ان اسکیموں میں ۱۶۰۰ ڈیزل جیپوں کی خریداری، باڈی کی تیاری، ایک نئے مرکزی کارخانے کا قیام، موجودہ روڈ ویز ورک شاپوں کے لئے مشینوں کی خریداری، بس اسٹیشنوں اور ورک شاپ کی تعمیر کے سلسلہ میں زمین کا حصول شامل ہے۔ بسوں کے چلانے سے متعلق اسکیموں میں ۱۶۰۰ بسوں کا چلانا، انفورسمنٹ اسکواڈ کی توسیع، سب ریجنل ٹرانسپورٹ افسروں کے دفتروں کا قیام اور ریجنل انسپکٹروں کی تعداد میں اضافہ کی اسکیمیں شامل ہیں۔

۱۶۰۰ نئی بسوں کی مجموعی لاگت ۷،۲۰ کروڑ روپیہ ہوگی۔ ان بسوں کے باڈی سنٹرل ورک شاپ کانپور میں تیار کئے جائینگے۔ ان ۱۶۰۰ نئی بسوں کے چلانے پر تیسرے منصوبہ کے دوران میں ۱۸،۶۸۸ کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ ایک نیا سنٹرل ورک شاپ ۵۰۰ ایکڑ زمین کے رقبہ میں ۲ کروڑ کی لاگت سے تعمیر کیا جائیگا۔ جس میں ۲۰۰۰ مزدوروں کے لئے کوارٹر، کینٹین اور ان کے لئے ایک فلاحی مرکز ہوگا۔ نئے سنٹرل ورک شاپ کی تجویز اس لئے بھی

نیا دور

... ورکشاپ روز افزوں کام کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہو رہا ہے اور اس میں مزید توسیع کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے علاوہ نئی ورکشاپوں، بس اسٹیشنوں، ڈپو اور پارکنگ اسٹیشنوں کی تعمیر پر بھی ۲۲ء۲ کروڑ روپیہ صرف کرنے کی تجویز ہے۔ ان ورکشاپوں کے لئے مشینوں اور اوزاروں کی خریداری پر ۲۵ لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا۔ پرائیویٹ سیکٹر میں مزید راستوں پر موٹر ٹرانسپورٹ کی توسیع کے لئے زیادہ سے زیادہ پرمٹ جاری کئے جائیں گے۔ موٹر گاڑیوں سے متعلق قانون اور قواعد کے تحت بڑھتے ہوئے کاموں کی دیکھ بھال کے لئے آگرہ، گورکھپور، کانپور، لکھنؤ اور روہیلکھنڈ کے منطقوں میں سب ریجنل ٹرانسپورٹ افسروں کے دفاتر کھولے جائیں گے اور ریجنل انسپکٹروں کی تعداد میں ۲۵ فی صدی اضافہ کیا جائے گا۔

ریاست میں ہوابازی کی ترقی کے لئے بھی ورکنگ گروپ نے رقم مقرر کی ہے۔ حکومت پہلے ہی سے اس سلسلہ میں ہندپرادنشیل فلائنگ کلب کو ۵ء۱۴ لاکھ روپیہ کی مالی امداد دے رہی ہے۔ تیسرے منصوبہ کی مدت میں اس کلب کو پانچ لاکھ روپیہ کی مزید امداد دی جائے گی۔

یو۔پی گورنمنٹ روڈویز سے حکومت کو منافع ہو رہا ہے چنانچہ ۵۹-۱۹۵۸ء میں روڈویز سے ۶۰ء۱ کروڑ روپیہ کا خالص منافع ہوا تھا۔ تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے دوران میں مجوزہ توسیع سے مجموعی طور پر ۰۰ء۵۶ء۳۰ء۹۲ء۲ روپیہ کی آمدنی ہوگی اور تقریباً ۲۵۱ء۲۲۴ لاکھ روپیہ سالانہ کا خالص منافع ہوگا۔

• • •

اتر پردیش کے ورکنگ گروپ نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے مسودہ میں شمولیت کے لئے سماجی فلاح کا بھی ایک پروگرام مرتب کیا ہے جس پر ۲۲۶ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ سماجی فلاح کی نئی اسکیموں میں معذور بچوں کے لئے علاج گھر۔ بعد کی دیکھ بھال کے مرکزوں کے مکینوں کے بچوں کے لئے آورش گھر۔ انسداد عصمت فروشی قانون کے تحت، اپناہ گاہوں۔ معذور بچوں کے لئے کارگاہوں و جسمانی طور پر معذور اشخاص کے لئے ایک ایک ریاستی روزگار دفتر کے قیام کی اسکیمیں شامل ہیں۔

معذور بچوں کے لئے علاج گھر۔ ۱ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے قائم کیا جائے گا۔ یہاں ۱۰۰ بچوں کا مخصوص ورزشوں۔ کام اور بجلی کے ذریعہ علاج کیا جائے گا۔ شفایاب ہو جانے کے بعد بچوں کو مناسب تربیت اور عام تعلیم دی جائے گی۔ اس ادارہ سے ملحق مصنوعی اعضا اور دیگر آلات تیار کرنے کا ایک کارخانہ قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔ اس اسکیم پر تیسرے منصوبہ کے دوران میں کل ۴۷ء۴۵ لاکھ روپیہ صرف کرنے کی تجویز ہے۔

آورش گھر میں جو ۹۶ ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر کیا جائے گا تقریباً ۱۰۰ بچوں کی نگہداشت کے علاوہ ان کی تعلیم کا بھی بندوبست رہے گا۔

انسداد عصمت فروشی قانون کے تحت۔ اپناہ گاہیں ۸ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تعمیر کی جائیں گی۔ ان پناہ گاہوں میں تقریباً ایک ہزار عورتوں کو جن کو گناہ کی زندگی سے نجات دلائی گئی ہے۔ طویل عرصہ کے لئے پناہ دی جائے گی اور ان کو ایسے کاموں کی تربیت دی جائے گی جو ان کی بحالی میں معاون ہو سکیں۔

معذور بچوں کے لئے آگرہ، لکھنؤ اور گورکھپور میں واقع معذور بچوں کے ریاستی اداروں میں ۳ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ۳ کارگاہیں قائم کی جائیں گی جہاں اندھے، بہرے اور گونگے بچوں کو دستکاری اور پیشوں کی تربیت دی جائے گی۔

معذور اشخاص کے لئے ریاستی روزگار دفتر ان کے لئے مناسب روزگار مہیا کرے گا۔ اس دفتر کے اخراجات کے لئے ۵۰ ہزار روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

تیسرے منصوبہ کے دوران میں ۳۶ء۲۸ لاکھ روپیہ کی لاگت سے مختلف ضلعوں میں خواتین کی فلاح کے ۵۰۰ مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔

گرام سیوکاؤں کی تربیت کی موجودہ سہولتوں میں توسیع کے لئے مزید ۶ تربیتی مرکز قائم کئے جائیں گے۔

سماجی فلاح کے ریاستی مشاورتی بورڈ کی جانب سے موجودہ ۱۸۹ زیر عمل پروجیکٹوں کے علاوہ ۱۰۰ مربوط پروجیکٹ شروع کرنے کی تجویز ہے۔ اس اسکیم پر تیسرے منصوبہ کی مدت میں مجموعی طور پر ۳٫۲۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

دیہی عورتوں کے لئے گشتی تربیتی واحدوں کے قیام کی اسکیم کے تحت ضلع ہیڈ کوارٹروں پر ایک ایک واحدہ قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔ اس اسکیم پر تخمیناً ۵٫۲۶ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

بالغ مزدوروں کو پیشہ ورانہ اور فنی تربیت کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے وظائف دینے کے واسطے سالانہ ۲۰ ہزار روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

• • •

حکومت اترپردیش کے ایک پریس نوٹ میں ایسے تمام اشخاص کو جو شکر کے کارخانوں کے محفوظ یا مقررہ علاقوں میں راب یا کھنڈساری تیار کرنے کے لئے بجلی سے چلنے والے کولھو لگانے کے خواہش مند ہوں، یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں حکومت کی پالیسی کا اعلان ہونے تک کوئی اقدام نہ کریں۔

یہاں یہ ذکر مناسب ہوگا کہ ریاستی حکومت نے گذشتہ فروری میں یو۔ پی کھنڈساری مینوفیکچرس لائسنسنگ آرڈر جاری کیا تھا اور بعد میں اس کا اطلاق ریاست کے ۳۰ اضلاع میں شکر کے کارخانوں کے لئے محفوظ اور مقررہ علاقوں پر بھی کر دیا گیا تھا۔ یہ آرڈر شکر کی پیداوار کے لئے گنے کی سپلائی میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے جاری کیا گیا تھا۔

پریس نوٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ گنے کی سپلائی پر کنٹرول کا مسئلہ حکومت کے زیر غور ہے اور اس سلسلہ میں حکومت کی آئندہ پالیسی کا اعلان جلد ہی کر دیا جائے گا۔

• • •

اترپردیش میں ترقیاتی سرگرمیوں سے متعلق ریاستی محکمہ شماریات کے ڈائرکٹر کی حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جولائی ۱۹۵۹ء میں بلاک کے علاقوں میں جو رقبہ جاپانی طریقہ سے دھان کے زیر کاشت لایا گیا وہ گذشتہ سال کے مقابلہ میں تقریباً دگنا تھا۔ زیر نظر مدت میں بلاک کے علاقوں میں کل ۲۵۸،۸۸ ایکڑ اور اضلاع میں ۲۹۸۲۴۵ ایکڑ کے رقبہ میں جاپانی طریقہ سے دھان کی کاشت ہوئی۔

بلاک کے علاقوں میں زیر نظر مہینہ میں مزید ۲۲۷۸۳ ایکڑ زمین سیراب کی گئی۔ اس کے لئے ۱۱ نجی ٹیوب ویل، ۵ سرکاری ٹیوب ویل لگائے گئے اور ۱۳۰۱ پکے کنوئیں تعمیر کئے گئے۔

تحریک امداد باہمی کی توسیع کے لئے زیر نظر مہینہ میں بلاک کے علاقوں میں ۲۶۰ نئی امداد باہمی انجمنیں قائم کی گئیں اور ۱۶۷۳۹ نئے ممبر بنائے گئے۔ اور امداد باہمی انجمنوں کے سرمایہ حصص میں ۱۳۱٫۷۷ لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا۔ اضلاع میں ۴۳۴ نئی امداد باہمی انجمنیں قائم کی گئیں۔ اور ۳۴۶۵۱ نئے ممبر بنائے گئے۔ اور سرمایہ حصص میں ۱۳٫۳۸ لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا۔

توسیع تعلیم کے سلسلہ میں زیر نظر مدت میں ۲۷ بلاکوں میں تعلیم بالغان کے ۴۴۳ مرکز قائم کئے گئے اور ۴۰۲۹۰ مردوں اور ۱۴۸۷۱ خواتین کو خواندہ بنایا گیا۔

بلاک کے علاقوں اور اضلاع میں زیر نظر مہینہ کے دوران میں چھوٹی بچت مہم میں بالترتیب ۱۷٫۵۸ لاکھ روپیہ اور ۲۴٫۸۵ لاکھ روپیہ جمع ہوا

• • •

ریاستی محکمہ ترقیات نے ربیع مہم کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے ایک ایسا مربوط پروگرام بنایا ہے جس کے تحت اس میں سبھی متعلقہ محکمے حصہ لے سکیں گے۔ مثال کے طور پر محکمہ زراعت اس سلسلہ میں نہ صرف فنی رہنمائی کرے گا بلکہ بلاکوں کا اچانک معائنہ کرنے کے علاوہ بیج گوداموں کو بیجوں کی فراہمی کا بندوبست کریگا۔ اسی طرح محکمہ نگہداشت مویشیان اپنے اسپتالوں اور کلیدی دیہی بلاکوں کے قرب و جوار کے دیہاتوں میں گھاس اور چارہ کی پیداوار بہتر بنائے گا اور پرانتیہ رکھشک دل ربیع مہم کے لئے نوجوانوں کی خدمات حاصل کرے گا۔

محکمہ امداد باہمی کے ذمہ کیمیاوی کھاد اور بیج وغیرہ کی فراہمی اور محکمہ مال کے ذمہ تقاوی کی تقسیم کے انتظام کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ محکمہ تعلیمات ٹیچروں کو اس مہم کے مختلف کاموں کی تربیت دے گا اور محکمہ منصوبہ بندی تمام ترقیاتی محکمہ جات کی سرگرمیوں میں رابطہ قائم کرے گا اور آبپاشی کے لئے بروقت پانی کی فراہمی محکمہ آبپاشی کے ذمہ ہوگی۔

• • •

ریاست کے ڈولپمنٹ کمشنر نے بلند شہر۔ علی گڈھ۔ فتح پور۔ آگرہ۔ کھیری۔ شاہجہاں پور۔ سیتاپور۔ بارہ بنکی۔ بستی۔ گورکھپور۔ دیوریا۔ جونپور۔ نینی تال اور غازی پور کے اضلاع میں نمونہ کے طور پر منتخب کئے گئے ایسے ٹیوب ویل کی کارکردگی کی جانچ کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کا حکم دیا ہے جس کی آب پاشی کی صلاحیت سے پورے طور پر فائدہ نہ اٹھایا جا رہا ہو۔ یہ کمیٹی اڈیشنل ضلع مجسٹریٹ (پلاننگ) ضلع منصوبہ بندی افسر۔ ضلع افسر زراعت اور محکمہ آبپاشی کے متعلقہ اسسٹنٹ انجینیر پر مشتمل ہوگی۔

منتخب ٹیوب ویل کے اعداد و شمار کے مطالعہ اور عوام سے مشورے کرنے کے بعد یہ کمیٹی یہ پتہ لگائے گی کہ ٹیوب ویل کی آبپاشی کی صلاحیت سے پورے طور پر فائدہ نہ اٹھانے کے کیا اسباب ہیں۔ کمیٹی اس سلسلہ میں اپنی تجاویز پیش کرے گی۔ کمیٹی خاص طور سے اس امر پر غور و خوض کرے گی کہ ٹیوب ویل کی کارکردگی اور اس کے پانی کی تقسیم کو بہتر بنانے سے ٹیوب ویل کی آبپاشی کی صلاحیت کو پورے طور پر بروئے کار لایا جا سکتا ہے یا نہیں۔

• • •

حکومت اتر پردیش کی جانب سے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے صنعتی پروگراموں پر عمل درآمد کے لئے فنی عملہ کی بہ آسانی فراہمی کے لئے ابتدائی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی اندازہ لگایا جائے گا کہ کارخانہ میں کام کرنے والے ہنرمند شخص کو دوسرے پیشہ میں تربیت حاصل کرنے اور نئے اشخاص کو تربیت دینے میں کم سے کم کتنا وقت درکار ہوگا۔

ریاستی نظامت تربیت اور روزگار کے ایک مخصوص تربیت یافتہ افسر کے ذریعہ ریاست کی بڑی صنعتوں کے مختلف دستکاروں کے کاموں میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے موقع پر جائزہ لیا جا رہا ہے۔ مذکورہ صنعتیں یہ ہیں۔ کپڑا۔ انجینیرنگ۔ کیمیکل۔ نقل و حمل۔ کانوں کی کھدائی۔ رسل و رسائل۔ چمڑا۔ فوڈ پراسیسنگ اور تعمیرات۔

اس کثیر مقصدی تربیت سے فاضل ہنرمند اشخاص کے لئے ترقی اور متبادل روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے۔

تحقیقاتی افسر مختلف پیشوں کے لئے کم سے کم علمی استعداد۔ تربیت اور معیار کے متعلق اپنی سفارشات پیش کرے گا۔

یہ جائزہ مرکزی حکومت کے اشتراک عمل سے لیا جا رہا ہے اس کے اخراجات فورڈ فاؤنڈیشن گرانٹ سے پورے کئے جائیں گے۔

• • •

اتر پردیش میں تعلیمی سال رواں میں مزید ۴۸ نارمل اسکول کھل جائیں گے جن میں ۶ اسکول لڑکیوں کے لئے ہوں گے اس طرح ریاست میں ایسے اسکولوں کی تعداد ۱۰۷ ہو جائے گی۔

ٹیچروں کو تربیت کی زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے مرکزی پروگرام کے تحت یہ اسکول زیادہ تر دیہی علاقوں میں قائم کئے جائیں گے۔ اس پروگرام پر دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں ۱۴ء۱ کروڑ روپیہ سے زیادہ رقم صرف کی جائے گی۔

اس پروگرام پر عمل درآمد اس لئے کیا جا رہا ہے تاکہ سنہ ۱۹۶۱ء تک شروع کی جانے والی لازمی اور مفت تعلیم کی اسکیم کی ضرورتوں کے پیش نظر کافی تعداد میں تربیت یافتہ ٹیچر مہیا کئے جا سکیں۔

اس پروگرام کا مقصد لڑکوں کے لئے موجودہ ۸۴ نارمل اسکولوں میں سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء میں مزید ۲۵۰۰ تربیت پانے والوں کے داخلہ کی گنجائش پیدا کرنا ہے۔

لڑکیوں کے موجودہ ۱۱ اسکولوں میں مزید ۱۰۰ تربیت پانے والوں کا داخلہ کیا جائے گا اس کے علاوہ ان نئے نارمل اسکولوں میں ۴۰۰ ٹیچروں کو تربیت دی جائے گی۔

مذکورہ بالا ہر اسکول کی عمارت۔ عملہ کے لئے کوارٹر اور ہوسٹل

کی تعمیر پر [illegible] کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔

• • •

اترپردیش حکومت نے نوجوانوں کے لئے روزگار کے سلسلے میں رہنمائی کرنے اور مشورہ دینے والی ریاستی اسکیم کو موثر طریقے سے چلانے کے پیش نظر بارہ ممبروں پر مشتمل ایک مشاورتی کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔

یہ کمیٹی پرائیویٹ اور پبلک سیکٹروں کو کارکردگی اور پیداوار بڑھانے کے عام اصولوں اور طریقوں پر باہمی مشورہ و تبادلۂ خیال کرنے کے مواقع فراہم کرے گی۔ اس کے علاوہ یہ نوجوانوں کی فلاح اور بہبود اور روزگار سے متعلق اسکیموں کے لئے عام لوگوں خصوصاً مالکوں اور مزدوروں کا تعاون حاصل کرے گی۔ مزید براں یہ کمیٹی نوجوانوں کی تعلیم، پیشہ ورانہ تربیت اور اپرنٹس شپ سے متعلق پروگرام مرتب کرنے پر بھی غور کرے گی۔

ڈائرکٹر تربیت اور روزگار اس کمیٹی کے چیرمین اور پیشہ ورانہ رہنمائی کے ریاستی افسر اس کے سکریٹری ہیں۔

کمیٹی کو مخصوص مسائل کو حل کرنے کے لئے عارضی یا مستقل کمیٹیاں مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔ اس کمیٹی کی میعاد تین سال ہوگی۔

• • •

ریاستی محکمہ تعمیرات عامہ کے ٹیکنیکل آڈٹ سل نے جو گذشتہ اپریل میں قائم ہوا تھا تقریباً دو کروڑ روپیہ سے زائد مالیت کے کاموں کی جانچ پڑتال کی ہے۔ اس نے اخراجات میں کمی کرنے اور کارکردگی کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں مفید مشورے دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ سل نے بڑے پلوں، سڑکوں اور عمارتوں سے متعلق منظور شدہ ٹھیکوں کی بھی جانچ کی۔

اس سل کی تشکیل مرکزی حکومت کے چیف ٹیکنیکل اکزامنر کے سل کے نمونے پر کی گئی ہے۔ اس میں ضروری عملہ کے علاوہ چیف ٹیکنیکل اکزامنر، ایک اسسٹنٹ ٹیکنیکل اکزامنر اور ایک سب ٹیکنیکل اکزامنر بھی ہیں۔ مرکزی محکمہ تعمیرات عامہ کے اکزیکیٹو انجینیر کی خدمات مستعار لے کر ان کو چیف ٹیکنیکل اکزامنر مقرر کیا گیا ہے۔

سل کے دوسرے فرائض حسب ذیل ہیں:۔

تعمیر سے قبل اور اس کے بعد ضروری کاموں کا معائنہ کرنا اور سامان ضائع ہونے سے بچانا، ٹھیکوں کے نرخوں کے نمونے کی جانچ کرنا اور بلوں وغیرہ کی چھان بین کرنے کے سلسلہ میں آڈیٹر جنرل کی مدد کرنا۔

• • •

وزیر ریاست برائے فلاح و بہبود شکشی رمن آچاریہ نے کل شام کو مراد آباد میں سابق جرائم پیشہ بھاتو قبیلہ کی سالانہ مکتی دوس کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت ان قبائل کی ترقی کے لئے پوری طرح کوشاں ہے۔ چنانچہ ضلع بہرائچ کے ... ایکڑ رقبہ کے فارم میں ان کے بہت سے کنبوں کو بسانے کے لئے ۴ لاکھ کی لاگت کی ایک اسکیم وضع کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ان قبائل کے افراد کے لئے ریاست کے مختلف حصوں میں بھی آراضی حاصل کی جا رہی ہے۔ شری آچاریہ نے یہ بھی بتایا کہ حکومت ان بستیوں کے قیام کے سلسلہ میں فیاضی سے روپیہ صرف کرے گی۔

وزیر ریاست نے قبیلہ کے تعلیم یافتہ اشخاص کو اپنے طبقہ کی اصلاح کرنے کی تلقین کی اور اس سلسلہ میں قبیلہ کے ایسے لوگوں کے خلاف سماجی بائیکاٹ کرنے کا مشورہ دیا جو اب بھی مجرمانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھوں نے ان سے جونسار باور کی اُن لڑکیوں کے نقش قدم پر چلنے کو کہا جنھوں نے اپنے اداروں کے ذریعہ ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی مذموم رسم کی خرابیوں کو دور کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

• • •

ضلع بستی میں بوڑھی راپتی پر ۱۲ء۵ لاکھ روپیہ کی لاگت سے جو پل تعمیر کیا گیا ہے وہ آمد و رفت کے لئے کھل گیا ہے۔ اس پل کی تعمیر سے ضلع بستی میں راپتی پار کے علاقہ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔

بوڑھی راپتی کے پل کی تعمیر سے نیپال میں واقع لمبنی تک جو بھگوان بدھ کی جنم بھومی ہے ہر موسم میں براہ راست آمد و رفت ہو سکے گی اور اس کے ذریعہ اس علاقہ کے نقل و حمل کے مسائل کو حل

[illegible] شرنگ ملازموں کے لئے ... قابل رہائش تعمیرات ... بہت نے بھی کو خطاب کرتے ہوئے ملک کے ... خوشحالی کے لئے پوری جانفشانی اور محنت سے کام ... ۔ انھوں نے کہا کہ ملک اس وقت جن مسائل سے دوچار ... کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے کہا کہ ... ملک کے دستیاب وسائل کو پورے طور پر بروئے کار ... سے وابستہ ہو جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے حکومت کی جانب سے ہر ممکن امداد دیئے جانے کا یقین دلایا۔ انھوں نے کہا کہ بانی ... اور بڈھی راپتی کے پل اس علاقہ کی اقتصادی ترقی میں جو ریاست میں چاول کی پیداوار کا اہم مرکز ہے نمایاں رول ادا کر سکے۔

بڈھی راپتی کا یہ پل ۲۴ واں بڑا پل ہے جو ریاست میں حصول آزادی کے بعد تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ پل جس کی لمبائی ۴۴۰ فٹ ہے جدید ترین طریقہ سے تعمیر کیا گیا ہے۔

• • •

بچت میں روپیہ جمع کرنے کی ہمت افزائی کے لئے حکومت ہند نے پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ ۱۰ سالہ ٹریزری سیونگز ڈپازٹ سرٹیفکیٹوں میں لگانے کی سہولت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان دس سالہ سرٹیفکیٹوں میں روپیہ لگانے کی کوئی حد بھی مقرر نہیں کی گئی ہے۔

اس سے قبل یہ سہولت صرف بارہ سالہ نیشنل پلان سرٹیفکیٹوں کی خریداری کے سلسلے میں حاصل تھی۔ ایسے آجران اور ادارے جو اپنے ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ پر سالانہ سود حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

نیشنل پلان سرٹیفکیٹوں کو مقبول بنانے کے لئے مرکزی حکومت نے ان شناخت ناموں کے اجراء کے موجودہ ضابطہ کو آسان بنانے کا بھی فیصلہ کیا ہے جو نیشنل پلان سرٹیفکیٹ رکھنے والوں کو دیئے جاتے ہیں۔ شناخت ناموں کے اجراء کے آسان ضابطے کی تفصیلات تمام ڈاک خانوں سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

اتر پردیش گورنمنٹ سیمنٹ فیکٹری کے چھ انجینیروں اور فنی ماہرین پر مشتمل ایک جماعت چیکوسلواکیہ کی فرم سٹروژ ایکسپورٹ میں تربیت حاصل کرنے کے لئے روانہ ہو گئی ہے۔ یہ فرم چرک سیمنٹ فیکٹری کی پیداوار کو دوگنا کرنے کے لئے مشینیں مہیا کر رہی ہے۔

معاہدہ کے شرائط کے مطابق چیکوسلواکیہ کی اس فرم نے فیکٹری کے چھ انجینیروں کو دو گروپوں میں اپنے یہاں چھ ماہ تک تربیت دینا اور ان کے سفر، قیام اور طعام کا خرچ برداشت کرنا منظور کیا تھا۔

اس جماعت کے لیڈر فیکٹری کے قائم مقام چیف انجینیر شری وی۔ کے۔ ڈانگ ہیں۔ فیکٹری کے ڈائرکٹر شری ٹی۔ این منڈ بھی اس جماعت کے ہمراہ وہاں کی مشینیں دیکھنے کے لئے گئے ہیں۔

• • •

حکومت ہند نے یہ احکام جاری کئے ہیں کہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ بغیر کسی فیس کی ادائیگی کے مکفول کئے جا سکتے ہیں۔

محکمہ ڈاک اور تار کے ڈائرکٹر جنرل کی ایک گشتی چٹھی کے مطابق اس سے قبل یہ سرٹیفکیٹ منظور شدہ فارم پر مقررہ فیس کی ادائیگی کے بعد ہی مکفول کئے جا سکتے تھے۔ لیکن اب وزارت قانون اور مالیات (محکمہ اقتصادی امور) کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ چونکہ مکفول کرنا انتقال ملکیت کے [illegible] نہیں ہے اس لئے سرٹیفکیٹوں کو مکفول کرتے وقت یا [illegible] ... واگذاشت کرنے کے وقت کوئی فیس وصول نہیں کی جائے گی۔

• • •

اتر پردیش میں گذشتہ جون کے دوران میں بیمہ شدہ صنعتی مزدوروں کو بیماری اور زخمی ہو جانے وغیرہ کی بنا پر ۱۲۰۰۰۰ سے زائد روپیہ ادا کیا گیا۔

زیر نظر مہینہ میں بیمہ شدہ مزدوروں کی کل تعداد ۱۰۸۶۲۴۶ تھی۔ بیمار مزدوروں کو زیر نظر مدت میں نصف تنخواہ پر مجموعی طور پر ۹۳۳۱۰ دنوں کی چھٹی دی گئی اور ۲۶ تپ دق کے مریضوں کو نقد روپیہ اور چھٹی کی صورت میں مزید سہولتیں دی گئیں۔

تقریباً دو لاکھ سے زیادہ مزدوروں کو زیر نظر مہینہ میں مفت علاج کی سہولتیں فراہم کی گئیں اور ۹۲ مزدور مجموعی طور پر ۴۰۰ دنوں تک اسپتال میں رکھے گئے۔ اس کے علاوہ دو ہزار سے زیادہ مزدوروں کو ایکسرے۔ گھروں پر طبی معائنہ اور ماہرین کے ذریعہ معائنہ اور دوسری مفت سہولتیں مہیا کی گئیں۔

● ● ●

یو۔ پی گورنمنٹ روڈویز کی جانب سے ۳ نئے بس اسٹیشن فیض آباد۔ گڑھ مکتیشر اور ٹپہ قاضی میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ جن پر ۴۴۸۰۰ روپیہ کی رقم صرف ہوئی ہے۔

فیض آباد اور گڑھ مکتیشر کے بس اسٹیشنوں میں ٹکٹ گھر، عورتوں کے لئے ویٹنگ روم۔ اور دیگر مسافروں کے لئے ویٹنگ شیڈ، کینٹین اور جدید طرز کے غسل خانہ ہیں۔

ٹپہ قاضی کے بس اسٹیشن میں دفتر کے علاوہ مسافروں کے لئے ویٹنگ شیڈ اور ٹکٹ گھر وغیرہ کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔

● ● ●

قومی توسیعی منصوبہ ریاست کے مزید ۴ ڈگری کالجوں یعنی میرٹھ کالج میرٹھ۔ بلونت راج پوت کالج آگرہ۔ آئی۔ ٹی۔ کالج لکھنؤ اور ٹریننگ کالج، بنارس ہندو یونیورسٹی۔ وارانسی میں نافذ کر دیا گیا ہے۔

ثانوی تعلیم کے نظامت توسیعی پروگرام کی جانب سے یہ منصوبہ پہلی بار ۵۶-۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ الٰہ آباد۔ گورنمنٹ کنسٹرکٹیو ٹریننگ کالج لکھنؤ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم میں شروع کیا گیا تھا۔

ریاستی حکومت نے اس منصوبہ کے تحت کام کرنے والے ٹیچروں کے سفر اور یومیہ الاؤنس کی ادائیگی کے لئے مذکورہ بالا مرکزوں کے لئے ۴۲۰۰۰ روپیہ کی منظوری دی ہے۔ منصوبہ کے تمام مکرر اور غیر مکرر اخراجات ثانوی تعلیم کی کل ہند کونسل ادا کرے گی۔

ان مرکزوں میں ۱۴۰۰۰ روپیہ کے صرف سے امتحانی ادارے قائم کرنے کے متعلق کونسل کی تجویز ریاستی حکومت کے زیر غور ہے۔

● ● ●

آیورویدک اور طبی اکیڈمی اتر پردیش نے انگریزی، ہندی، سنسکرت یا اردو میں آیورویدک اور طب یونانی کی معیاری کتابوں کے مصنفین کی ہمت افزائی کے پیش نظر جنوری ۱۹۵۸ء کے بعد شائع شدہ معیاری کتابوں کے مصنفین کو مالی سال رواں کے دوران میں ۲۳۰۰ روپیہ کے انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

آیورویدک کتابوں کے مصنفین کو اپنی کتاب کے بارہ نسخے اور طب کی کتابوں کے مصنفین کو اپنی کتاب کے ۳ نسخے۔ مدیر آیورویدک اور طبی اکیڈمی یو۔ پی۔ تلسی داس مارگ۔ لکھنؤ کو اس کا خیال رکھتے ہوئے روانہ کرنا چاہئے کہ وہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۹ء تک اکیڈمی کے دفتر میں موصول ہو جائیں۔

انعامات کے اعلان کے بعد آیورویدک اور طب کی کتابوں کا ایک ایک نسخہ اکیڈمی کی لائبریری میں رکھا جائے گا اور بقیہ نسخے متعلقہ مصنفین کو واپس کر دئے جائیں گے۔

● ● ●

حکومت اتر پردیش کی جانب سے یکم جنوری ۱۹۵۵ء کے بعد شائع شدہ ہندی کی طبع زاد تصانیف پر انعامات دئے جائیں گے۔ ملک کی تمام ریاستوں کے مصنفین انعام کے لئے اپنی کتابیں بھیج سکتے ہیں۔ انعام کے لئے ہر کتاب کے ۸ نسخے ہندی سمیتی، حکومت اتر پردیش، رائل ہوٹل لکھنؤ کو ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۹ء تک بھیجنا چاہئے۔ صرف طبع زاد تصانیف پر غور کیا جائے گا اور ترجمے اسی صورت میں قبول کئے جائیں گے جبکہ وہ مخصوص افادیت اور خوبی کے حامل ہوں گے۔

مصنفین کو اپنی ہر ایک کتاب کے اندر کے پہلے صفحہ پر اپنا نام، مستقل پتہ۔ اور کتاب کا موضوع تحریر کرنے کے علاوہ اس امر کی بھی صراحت کرنا چاہئے کہ کتاب طبع زاد ہے یا ترجمہ۔ بصورت ترجمہ اصل مصنف کا نام بھی درج کرنا چاہئے۔

● ● ●

[...] پردیش نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر کسی شخص [...] الاٹ ہے مکان خالی کرنے سے پہلے [...] اپنے رشتہ دار یا دوست کو اپنے ساتھ [...] اجازت نہ لی ہوگی تو اس کے ایسے رشتہ دار یا دوست [...] نہیں کیا جائیگا اور ایسی صورت میں [...] شخص کے نام اس کی درخواستوں کی اولیت کا اعتبار کیا جائیگا۔

حکومت نے اس سلسلہ میں مزید واضح کیا ہے کہ ایسے دوست اور رشتہ دار محض اس امر کی بنا پر کہ وہ ضلع حکام کی اجازت سے مکان میں رہتے ہیں اپنے حق میں مکان کے الاٹمنٹ کے حقدار نہیں ہو جائیں گے۔

حکومت کو معلوم ہوا ہے کہ بہت سے کرایہ داروں کے ساتھ ان کے دوست یا رشتہ دار ضلع حکام کی اجازت کے بغیر رہتے تھے اور بعد میں جب وہ شخص جس کے نام مکان الاٹ تھا اس کو خالی کرتا ہے تو اس کے نام نہاد دوست اور رشتہ دار مکان کو اسی دلیل کی بنا پر اپنے حق میں الاٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ مکان پر کافی عرصہ سے قابض ہیں۔

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

نیا دور

جلد ۱۴ نمبر ۸

کاتک ۱۸۸۱

نومبر ۱۹۵۹ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ
گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات اترپردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

[illegible] وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی ستّرویں سالگرہ ۱۴ نومبر ۱۹۵۹ء کو منائی جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ [illegible] ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ جواہر لال کی عظمت وزیراعظم ہونے میں نہیں ہے بلکہ وزارت عظمیٰ ان پر فخر کر سکتی ہے۔ یہ جواہر لال کے صفات قلب و دماغ [illegible] ان کی وسیع النظری، ان کی صلح پسندی، ان کی امن کوشی، ان کی دور اندیشی، اُن کا حسن تدبر، ان کا پیغام زندگی اور ان کی آفاقیت ہے جنھوں نے اُن کو ہندوستان ہی کی محبوب ترین ہستی نہیں بلکہ دنیا کی ایک عظیم المرتبت شخصیت بنا دیا ہے۔

جواہر لال ہمارے سامنے مختلف حیثیتوں سے آتے ہیں۔ جنگ آزادی کے ایک رہنما کی حیثیت سے، ہندوستان کے وزیراعظم کی حیثیت سے، ایک اعلیٰ پایے کے ادیب کی حیثیت سے اور بین الاقوامی اہمیت رکھنے والے ایک ممتاز فرد کی حیثیت سے ــــ اور ان تمام حیثیتوں میں ان کے اندر ایک ایسی انفرادیت اور ایک ایسی دلکشی پائی جاتی ہے جو ہر وزیراعظم اور ہر بین الاقوامی شخصیت میں نہیں ہوتی۔ وہ ہندوستان کے وزیراعظم ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے محبوب ترین رہنما بھی ہیں۔ ان سے اختلاف رائے تو ممکن ہے لیکن اُن سے محبت نہ کرنا اور اُن کا احترام نہ کرنا ممکن نہیں۔ ان کے سیاسی مخالفین بھی اُن کے خلوص، ان کی صدق دلی، اُن کے جذبۂ خدمت، اُن کی حب الوطنی اور اُن کے بے پناہ قوت عمل کے قائل ہیں۔ ستّر سال کی عمر میں ہندوستان ایسے بڑے ملک کے وزیراعظم کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں جس انہماک، مستعدی اور محنت سے وہ کام کرتے ہیں وہ ہمارے ملک کے نوجوانوں کے لئے ایک سبق ہونا چاہیئے۔

آزادی کے بعد جواہر لال نے ہندوستان کی سیاسی سماجی اور اقتصادی بنیادوں ہی کو مستحکم بنانے پر زور نہیں دیا بلکہ اپنے قول و عمل سے رواداری، بردباری اور وسیع القلبی کی ان روایات کو بھی زندہ کیا جن کے لئے ہندوستان ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ جواہر لال کا پیغام صرف اپنے ملک والوں تک محدود نہیں رہا۔ ان کا پیغام عالمگیر پیغام ہے۔ انھوں نے ساری دنیا کو بقائے باہم کی تلقین کی اور پنچ شیل کے اصول بتائے۔ بین الاقوامی مسائل میں انھوں نے ہمیشہ اپنی آزادیٔ رائے کا ثبوت دیا اور اعلائے حق سے کبھی گریز نہ کیا۔ اُن کی یہی امن پسندانہ اور انصاف پسندانہ پالیسی ہے جس نے اقوام عالم کی صف میں ایک طرف ہندوستان کو ایک ممتاز مقام عطا کیا اور دوسری طرف جواہر لال کو ایک بین القومی شخصیت بنا دیا۔

حسن اتفاق سے جس دن پنڈت جواہر لال نہرو کی سالگرہ ہوتی ہے اسی روز عالمی یوم اطفال منایا جاتا ہے۔ بچے معمار ملک ہوتے ہیں۔ ان کی صحیح تعلیم و تربیت، بچوں کی صحت مند ذہنی نشو و نما اور اُن کی تندرستی صرف انھیں کے لئے ضروری نہیں بلکہ ملک کے لئے بھی ضروری ہے کیونکہ یہی بچے آگے چل کر اپنے ملک و قوم کے رہنما بنتے ہیں۔ اگر اُن کے صحیح نشو و نما پر شروع سے دھیان نہ دیا گیا تو ملک کے مستقبل پر نہ صرف ناخوشگوار بلکہ مضرت رساں اثر پڑے گا۔ اسی لئے اب ہر ملک میں بچوں کی صحت اور پرورش و پرداخت پر کافی توجہ منعطف کی جانے لگی ہے اور ساری دنیا میں ہر سال ۱۴ نومبر کو یوم عالمی اطفال منایا جاتا ہے۔ اتر پردیش میں بھی جہاں کی آبادی یورپ کے اکثر ممالک سے زیادہ ہے، بچوں کی تربیت اور تندرستی کی طرف خصوصی توجہ برتی جا رہی ہے۔ چناں چہ ۱۴ نومبر کو ریاست بھر میں یوم اطفال منایا جا رہا ہے۔ چیف محکمۂ منصوبہ بندی کے تمام ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور ضلع منصوبہ بندی افسروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ۱۴ نومبر ۱۹۵۹ء کو نئے بال منڈل اور نئے میلا منڈلوں کی تشکیل کریں، اسکولوں کے طالب علموں کو ایک بلاک سے دوسرے بلاک لے جانے کا انتظام کریں اور چند ممتاز طلبا کو ضلع ہیڈ کوارٹر پر منائی جانے والی تقریب میں حصہ لینے کے لئے بھیجنے کا بندوبست کریں۔

چودھری محمد علی ردولوی اور [illegible] کی وفات دنیائے اردو کے لئے دو بڑے حادثات ہیں۔ دونوں حضرات اپنی شگفتہ مزاجی اور اپنی شگفتہ نگاری کے لئے ممتاز تھے۔ دونوں نے اردو ادب کے خزانہ میں اپنی تحریروں سے گراں بہا اضافے کئے اور یہ کہنا غالباً زیادتی نہ ہوگا کہ اپنا طرز تحریر وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور اپنے ہی ساتھ لے گئے۔

ــــ ایڈیٹر

دھرتی سنگیت

[illegible]

دھرتی وہ خلا کی رقاصہ دامن میں لئے ہر دشت و چمن
ان نغموں میں ہم دھرتی کا سورج سے بیاہ رچاتے ہیں
شاعر کے خیالوں کی لالی، دھرتی کی دستی بیندی ہو
بل کھاتے ہوئے دریاؤں میں دھرتی کی ہیں چمکی ہوئی
خط کہساریں دھرتی کے ابرو کی اپنی تلواریں ہیں!
دھرتی کا سہاگ دکھاتا ہے اشجار کی شعلہ نوائی میں
ست رنگ شعاعوں کی لرزش دھرتی کی آنکھوں کے ڈورے
بہتار کی مدھ بھری صبحوں میں دھرتی لیتی ہے انگڑائی
دھرتی کا تصور ہی ہے جنت کی حیات وجد آور
دھرتی کی چمک، دھرتی کی جھلک، دھرتی کی لہک دھرتی کی مہک
تاریخوں کی تہذیبوں کی وہ کوکھ بھی ہے گہوارہ بھی
دھرتی جس کا ہر افسانہ افسانہ در افسانہ ہے
دھرتی پہ پچھلی راتوں کو صحیفۂ غیب اترتے ہیں
گزرے ہیں دھرتی سے ہو کر قرنوں سے قافلۂ ماضی
گم پیچ زماں، گم پیچ مکاں، اس رقص سروری کے جادے
تیرا سورج سے بچھڑنا تھا یا تھی سیتا کی جلا وطنی
تیرے ارمان نکالیں گے ماتا ہم سورج کی سنتان
ہر جگ میں ہم تو دیتے رہے ہیں تیرے لئے ہر قربانی
ناتے پہیلیوں کا جھومر ساگر لہریں زنجیر کمر
ذرا کو مانگ ہے ٹھنڈی رہے تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے

ہے میرے کلام کی بندش میں دھرتی کا سکوں دھرتی کا چلن
اس عقد کا جشن مناتے ہیں یہ چنگ، رباب و رقص و سخن!
ہر کا دل پنہاں دھرتی کے ہے اٹھتے ہوئے ... کی دھڑکن
لہراتے ہوئے صحراؤں میں دھرتی کے سلگتے دل کی جلن
ہر لالۂ گل میں دھرتی کے لو دیتے ہوئے مکھڑے کی پھبن
جب روح نبات مچلتی ہے دھرتی کا اگتا ہے جوبن
ندی ساگر میں پڑتے بھنور دھرتی کے رخ کے چاہ ذقن
کرنوں کی مہوشی پھیلی ہوئی جس کا ہر گھونٹ خمار شکن
جنت کے گلستاں اور ایواں دھرتی کے فروا کے درشن
صحرا صحرا، دریا دریا، وادی وادی گلشن گلشن
گودی میں پلے ہیں کھیلے ہیں ہر علم و عمل ہر جادوئے فن
اڑ جاتی ہے نیند ستاروں کی لیتے ہیں جماہی دشت و دمن
ہر صبح بہار پیالہ کش، ہر لالۂ صحرا صاعقہ زن
محفوظ ہیں اس کے سینے میں ناموس ازل آئین کہن
ہے سینۂ وقت کا زیر و بم دھرتی ہی کے دل کی ہے دھڑکن
ان لوکش کا بڑ کہیں جس کو دنیا ہے وہ بابر امان
تیرے قدموں میں ڈالیں گے سورج کے کٹ کے لعل یمن
ہر دور میں ہم تو لٹاتے رہے ہیں تن من دھن
ست رنگ بہاریں گھونگھٹ میں لہرائی شفق تیرا دامن
سنتان کی لے گیتان جلی، ہم ہیں تیرے سنگار اندن

---

[1] لو اور کش سیتا کے دو بیٹے تھے رامائن میں لوکش کا نام وہ باب ہے جس میں سیتا کی جلا وطنی اور ان کے بیٹوں کی ... کا حال ... سیتا ... پیدا ہوئے ... نام ... تھے۔ استعارۃً سیتا اور رام کی کہانی زمین کے سورج سے جدا ہونے اور ... کی کہانی ہے۔

جواہرلال جی اور عوام

حیات اللہ انصاری

ایک مرتبہ ایک بیرونی جرنلسٹ سے میری ملاقات ہوئی ہو جاپان، چین، انڈونیشیا، برما اور لنکا کا دورہ کرکے آرہا تھا۔ وہاں کی خاص خاص شخصیتوں کا اس نے قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا تھا اور ان لوگوں کے بارے میں اس نے جو رائے ظاہر کی اس میں سنجیدہ تنقید کے ساتھ ساتھ زہر آگیں طنز بھی شامل تھا۔ ان ہی لوگوں کے بارے میں اس سے باتیں ہوتی رہیں۔ ہندستان کے کسی لیڈر کا نہ ہم نے تذکرہ چھیڑا اور نہ اس نے کچھ کہا۔ مجھ کو خیال ہوا کہ شاید وہ ہم لوگوں کے سامنے اپنی رائے نہ ظاہر کرے۔ جب جدائی کا وقت قریب ہوا تو وہ خود کہنے لگا کہ ایک پارٹی میں پنڈت نہرو سے ملاقات ہوئی اور دس منٹ بات چیت رہی — یہ کہہ کر وہ سوچنے لگا، اور پھر کہنے لگا کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی بہت چوکنے مصنف اور خوش مزاج انسان سے باتیں کر رہا ہوں۔ ان دس منٹوں میں ایک سکنڈ کے لئے بھی مجھے یہ نہیں یاد آیا کہ یہ شخص ہندستان جیسے بڑے ملک کا بارہ سال سے وزیر اعظم ہے اور اس کا شمار دنیا کے چوٹی کے سیاست دانوں میں کیا جاتا ہے۔ پھر اپنے خیال میں ڈوب کر وہ بولا "دنیا کی میں نے جو بہت حیرت انگیز چیزیں دیکھی ہیں ان میں سے ایک جواہر لال ہے۔"

۱۹۵۷ء کے الکشن کے طوفانی دورے میں جواہر لال موٹر پر سفر کر رہے تھے۔ ان کے موٹر کے پیچھے دو جیپیں تھیں۔ حالت یہ تھی کہ صبح سے رات تک اس طرح سفر کرتے رہتے تھے کہ ایک دیہات میں دس منٹ کی تقریر کی اور پھر آگے بڑھ گئے۔ ایک دن دوپہر کے قریب سڑک سے کچھ دور پر ایک درخت کے نیچے ایک کنواں نظر آیا جس پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے جن میں ایک کچھ کھا رہا تھا۔ جواہر لال جی نے موٹر رکوائی اور ٹہلتے ہوئے درخت کے نیچے پہنچ گئے۔ وہاں ایک کھٹیا پڑی تھی وہ بچھا کر بیٹھ گئے اور جو آدمی کھا رہا تھا اس سے پوچھا کیا کھا رہے ہو۔ چنے یا جوار کی روٹی تھی اس نے وہ دکھلائی۔ جواہر لال جی نے کہا اس کا آدھا ٹکڑا ہم کو دے دو۔ اس نے بہت ادب سے خدمت میں پیش کی۔ اس پر چٹنی بھی رکھ دی۔ جواہر لال جی نے روٹی کھائی، کنوئیں کا پانی مٹکے سے پیا، ذرا دیر کھٹیا پر لیٹے اور پھر چل کھڑے ہوئے۔

جواہر لال جی کے موٹر کے پیچھے جو دو جیپیں تھیں ان میں سے ایک پر کچھ اخباری نمائندے تھے۔ جواہر لال جی جب اترے تو انھوں نے منع کر دیا تھا کہ کوئی شخص ساتھ نہ آئے، اس لئے سب دور ہی کھڑے رہے — ایک جرنلسٹ کا بیان ہے کہ جواہر لال کو دیہاتی پہچان گئے اور پہچان کر گھبرا گئے لیکن جواہر لال کی مسکراہٹ نے بے تکلفی اور بات چیت کے انداز نے ایک منٹ کے اندر ان لوگوں کی گھبراہٹ اور خوف دور کر دیا۔ اور پھر سب ہنس ہنس کر اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے وہ ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہوں۔

۱۹۴۷ء کے فسادوں کا زمانہ تھا کہ جواہر لال کو کسی نے ٹیلی فون کیا کہ جامعہ ملیہ پر حملہ ہونے والا ہے۔ جواہر لال فوراً کار لے کر روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد مولانا آزاد اور دوسرے لوگوں کو یہ خبر معلوم ہوئی۔ وہ بھی فوراً فوج کا ایک دستہ لے کر جامعہ کو چل دیئے۔ جواہر لال جی ان سے زیادہ سے زیادہ دس منٹ پہلے چلے ہوں گے، لیکن جانے وہ کس طوفانی رفتار سے گئے کہ جامعہ پہنچ گئے پھر وہاں ایک چکر لگا کر دیکھا کہ سب خیریت ہے اور واپس ہو گئے۔ راستے میں ایک جگہ موٹر رکوا کر ایک کنوئیں پر کچھ راہگیروں سے لوٹا اور رسی لے کر خود پانی بھرنے لگے۔ جب فوجی دستہ اور لیڈر پہنچے تو اس وقت وہ اپنے بھرے ہوئے پانی سے منہ دھو رہے تھے۔

جواہر لال نے گاندھی جی کے لئے لکھا ہے کہ وہ ہندستانی عوام کا

شعور اور تحت الشعور میں اس لئے ہندستانی عوام کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کا رہن سہن اتنا سادہ تھا کہ وہ اس معاملہ میں بھی کسان تھے۔ بھوری سی کھجور پتڑی، ابلا ہوا سادہ کھانا جو صرف مقامی چیزوں سے تیار ہوتا تھا اور بدن پر صرف آدھی دھوتی۔ لیکن جواہرلال کا رہن سہن شاہانہ ہے۔ وہ محلوں کی آسائش کے عادی ہیں۔ کھانا سادہ اور صحت بخش لیکن بہت نفیس ہوتا ہے۔ لباس کھدر کا ہوتا ہے لیکن سلائی، دھلائی میں نفاست بہت ہوتی ہے۔ ان باتوں کے باوجود وہ بھی ہندستانی عوام کا دھڑکتا ہوا دل اپنے سینے میں رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنے کو کبھی عوام سے دور محسوس نہیں کرتے ہیں۔ جب وہ تقریر کرتے ہیں تو ان کے تبسم، ان کی آواز، ان کے انداز بیان میں کوئی خطابت، کوئی بناوٹ اور کوئی لگاوٹ نہیں ہوتی ہے۔ وہ اسی طرح گھریلو انداز میں باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی بزرگ خاندان اپنے بیٹوں بیٹیوں، پوتوں نواسوں سے بات چیت کرے۔ ان کے لہجے الفاظ اور حرکات و سکنات کے خلوص کو الفاظ میں لایا جا سکتا ہے اور نہ برش سے کینوس پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسی شاعری یا موسیقی ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور ہندستان کے عوام اسے محسوس کرتے ہیں۔

جواہرلال جی اپنے عوامی جلسوں میں زیادہ تر وہی باتیں کہتے ہیں جن کو ہم دوسرے لیڈروں کی زبان سے بھی سنتے رہتے ہیں۔ لیکن جواہرلال کی تقریر کے بعد آپ لوگوں کو بہت مطمئن پائیں گے۔ یہی محسوس ہوگا کہ اب جا کر ان کو اطمینان ہوا کہ دوسرے لوگ جو کہتے تھے وہ سچ کہتے تھے۔ گویا لیڈروں کی رائے پر جب تک جواہرلال کی مہر نہ ہو وہ وقیع نہیں ہوتی ہے۔

ایک علمی صحبت میں ایک بہت بڑے لیڈر جو اب زندہ نہیں ہیں تجزیہ کرکے ثابت کر رہے تھے کہ جواہرلال کی تقریروں میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی ہے۔ جملے اکھڑے اکھڑے، الفاظ بے ڈول اور باتیں جانی بوجھی لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ پھر لوگ اس طرح ان کے جلسوں میں کیوں ٹوٹ پڑتے ہیں تو وہ اس کی کوئی معقول تشریح نہ کر سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے جواہرلال جی کی تقریر کا جو تجزیہ کیا ہے وہ کسی حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن یہ تجزیہ صرف تقریر کے جسم کا ہے۔ تقریر کے اندر جو خود اعتمادی اور خلوص اور بے غرضی اور عوام پر بے پناہ بھروسا ہوتا ہے ان باتوں کو وہ محسوس نہیں کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی عوام دلیل سے اتنے قائل نہیں ہوتے ہیں جتنے اپنی باتوں سے۔

جواہرلال نے بہادری سے پولیس کی سنگینوں کا تو سامنا کیا ہی ہے لیکن انھوں نے گاندھی جی کی طرح اپنوں کی سنگینوں کا بھی سامنا کیا ہے اور اس سامنے میں جہاں ان کی بے پناہ بہادری نے اپنے جوہر دکھلائے ہیں وہاں ان کے بے پناہ عوامی شعور نے بھی۔

نپولین کا قصہ مشہور ہے کہ جب ایک مختصر سی فوج لے کر وہ فرانس میں دوبارہ داخل ہوا اور فرانسیسی فوج اس کا سامنا کرنے بھیجی گئی تو اس نے اپنی مختصر فوج سے آگے بڑھ کر مخالف فوج کا تنہا سامنا کیا۔ وہ یوں کہ سینہ کھول کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ "ہو کوئی جو اپنے باپ کے سینے پر گولی مار سکے" پوری فوج نے اس آواز کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

جواہرلال نے ایک مرتبہ نہیں درجنوں مرتبہ ایسی ہی بہادری اور عوامی خود اعتمادی دکھلائی ہے۔ صرف چند لاکھ فوج کے سامنے نہیں، کروڑوں عام ہندستانیوں کے سامنے۔

سنہ ۴۷ء سے پہلے بہار میں نواکھالی کے بعد ہی فسادوں کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ ایک موقع پر جواہرلال بھی پٹنہ پہنچ گئے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا کہ پٹنہ میں بدترین فساد ہو گیا اور سیلاب خوں ریزی ابل پڑا۔

ایک صاحب جن کے خسر سے جواہرلال جی اور وزیر اعلیٰ بہار سے کافی تعلقات تھے، اس زمانے میں پٹنہ میں تھے۔ ان کے گھر کی طرف بلوائی بڑھنے لگے۔ انھوں نے ایک ذمہ دار کو فون کیا۔ انھوں نے کہا گھبراؤ نہیں میں پولیس بھیجتا ہوں۔ انھوں نے پانچ چھ منٹ انتظار کیا۔ اب شور اور قریب آ گیا۔ انھوں نے ایک اور ذمہ دار کو فون کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ پولیس کا دستہ چل ہی رہا ہے۔ اتفاق سے ان کی بیوی کو یاد آیا کہ آج اخبار میں خبر تھی کہ جواہرلال جی شہر میں ہیں۔ انھوں نے کسی طرح ان کا فون نمبر معلوم کر لیا اور ان کو فون کر دیا۔ انھوں نے جواب دیا: "میں آتا ہوں" اور پانچ منٹ کے اندر اندر وہ موقع پر تنہا پہنچ گئے اور اپنی کار سے اتر کر کھڑے ہو گئے۔

بلوائی سڑک کے بیچ میں ان کو دیکھ کر رک گئے۔ مگر شور ہوتا رہا اور جوش بھرے نعرے لگاتے رہے۔ بلوائیوں کے لیڈر تو یہ چاہتے تھے کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر جواہرلال کو بھی ٹھکانے لگا دیں۔ اس لئے وہ بلوائیوں کو [illegible] اکسانے لگے۔

جواہر لال نے کہا اگر تم چاہتے ہو کہ یہاں کے باشندوں کو قتل کرو اور مسلمانوں کو مارو تو پہلے مجھے مار ڈالو اور میری لاش کو پامال کرکے آگے بڑھو۔ یہ نعرہ کچھ ویسا ہے کہ کون ہے جو اپنے باپ کے سینے پر گولی مارے۔ اگر فرق ہے تو یہ کہ نپولین کا نعرہ اپنی ذات کے بچاؤ کے لئے تھا اور جواہر لال کی صدا مظلوموں کے بچاؤ کے لئے تھی۔

جواہر لال اکیلے بلوائیوں کے سامنے کھڑے رہے۔ نپولین کے پیچھے فوج تھی۔ ان کے پاس سوائے اپنے کوئی اور نہیں تھا۔ مگر بلوائیوں میں سے ایک بھی تو ایسا نہ نکلا جو اپنے باپ کے سینے پر گولی مار سکتا۔ آخر ان کے لیڈروں کی ہمت ٹوٹ گئی اور بلوائی پسپا ہو گئے۔ جب وہ پسپا ہو چکے ہیں اس وقت بہار کا پولیس دستہ پہنچا۔

۱۹۴۷ء کے فسادوں میں دہلی میں جواہر لال نے ایسی ایسی بہادریاں بہت دکھلائی ہیں۔ مگر افسوس ان کا ریکارڈ نہیں۔ ان میں سے بعض بعض واقعات تو ایسے ہیں کہ ان کو زبردست بہادرانہ کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن جواہر لال خود ان کو چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھتے ہیں اس لئے ان کو یادداشت میں محفوظ کرنا کیسا، نہ یاد رکھتے ہیں اور نہ تذکرہ کرتے ہیں۔

اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے جو میں نے ایک بہت اہم شخص سے سنا ہے۔ جواہر لال جی فساد کے زمانے میں دہلی میں گھوم رہے تھے کہ انھوں نے ایک مکان کے سامنے بہت بھیڑ دیکھی۔ گاڑی رکوا کر ایک شخص سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ ان کو دیکھ کر گھبرا گیا اور بات نہ چھپا سکا۔ کہنے لگا کہ اس گھر کی دو لڑکیوں کو لوگ اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔

جواہر لال بپھرے ہوئے شیر کی طرح کود پڑے اور مجمع میں ہٹو ہٹو کہہ کر گھستے چلے گئے۔ ان کی آواز سن کر لوگ صورت دیکھتے اور صورت دیکھ کر ہٹ جاتے۔ یہ دیکھتے ہی دیکھتے بیچ میں گھس گئے، دونوں لڑکیوں کا ہاتھ پکڑا اور لوگوں کو ڈانٹتے ہوئے کار تک آ گئے اور چلے گئے۔ یہاں بھی یہی ہوا کہ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اپنے باپ کے سینے پر گولی مارتا۔

۱۹۴۸ء کے فسادوں کی جب گاندھی جی نے مخالفت کی ہے تو بہت سے قومیت پسند بھی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ گاندھی جی بہت زیادہ آشفتہ ہو گئے ہیں۔ وہ زمانے اور حالات کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اس زمانے میں کون فرقہ واریت کے طوفان کو روک سکتا ہے؟ لیکن گاندھی جی اپنی جگہ قائم رہے۔ انھوں نے فرقہ واریت کی مخالفت کا سامنا صرف ہمت سے کیا اور آخر اپنی جان دے دی۔

گاندھی جی کے بعد ۱۹۵۱ء میں جواہر لال جی کے بارے میں بھی لوگوں نے اسی انداز پر سوچنا شروع کر دیا تھا۔ کیوں کہ جواہر لال جی نے اخبار میں اعلان کیا تھا کہ کانگرس کو لوگ فرقہ وارانہ جماعت سمجھنے لگے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس کی ورکنگ کمیٹی کو توڑ کر دوبارہ بنایا جائے۔

لوگ کہنے لگے تھے کہ جواہر لال بوڑھے ہو گئے ہیں۔ نہ زمانہ کو سمجھتے ہیں اور نہ ملک کے مزاج کو۔ وہ ایسی بات چاہتے ہیں جو ناممکن ہے۔ بھلا اس زمانے میں اور فرقہ واریت کی مخالفت!! جو لوگ جواہر لال کو بے حد دوست رکھتے تھے وہ بھی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ جواہر لال ہوا کے خلاف جا رہے ہیں، ان کی چل نہیں سکتی۔ کچھ لوگ جواہر لال جی کی اس مانگ پر طنزیہ تبصرے کرنے لگے تھے۔ جواہر لال کے بہی خواہ ان کو سمجھانے لگے تھے کہ حالات کی رفتار دیکھئے اور حد سے زیادہ آگے نہ بڑھیے۔ زمانہ گزرتا گیا۔ مخالفتیں بڑھتی گئیں۔ لیکن جواہر لال چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔

"جواہر لال ضدی ہیں۔ جواہر لال کی سیاست اب پرانی ہو چکی ہے اور ناقابل عمل ہے۔ جواہر لال اگر کانگرس سے الگ ہو رہے ہیں تو ان کو حکومت سے بھی الگ ہو جانا چاہیئے۔" یہ تھے وہ فیصلے جو اوپر کے حلقوں میں کر دیئے گئے تھے۔ لیکن جواہر لال ملائم تبسم کے ساتھ اس آہنی مطالبے پر قائم رہے۔

آخر جواہر لال کی جیت ہوئی۔ کیونکہ کانگرس کے عام ممبروں اور نمائندوں کے سامنے جب مسئلہ پیش کیا گیا تو انھوں نے اس بات کو سوچنے کے لائق بھی نہیں سمجھا کہ جواہر لال کو چھوڑا جا سکتا ہے اور ان کا کوئی بدل ہو سکتا ہے۔ جواہر لال کی جیت اس طرح ہوئی گویا طے شدہ بات تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جواہر لال عوام کو خوب پہچانتے ہیں اور عوام بھی اپنے لیڈر کے خلوص اور قابلیت پر بھروسا رکھتے ہیں اور ان کو بہت چاہتے ہیں —— یہی سبب ہے کہ بارہ سال سے جواہر لال ہندستان کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں اور ابھی تک ان کو کسی بڑی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ نئی آزاد حکومتوں میں صرف ہندستان ایسا خوش قسمت ہے جسے ایسی مستقل حکومت ملی ہے۔

بچوں کے لئے ادب

شبیہ الحسن نونہروی

بچوں کیلئے ادب پیدا کرنے کا مسئلہ کوئی مستقل یا انفرادی مسئلہ نہیں ہے۔ بچوں میں مناسب شعور کی بیداری، انھیں اچھا متعلم بنانا اور بالآخر انھیں اچھا شہری بنانا، یہ تمام سب مسائل آپس میں ایک دوسرے سے مکمل طور پر مربوط ہیں۔ نہ ان مسائل کیلئے علحدہ علحدہ نقطۂ نظر کی ضرورت ہے اور نہ الگ الگ وسائل کی۔ ممکن ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے میں جو وسائل اختیار کئے جائیں وہ بظاہر مختلف معلوم ہوں لیکن اندرونی طور پر ان تمام سب وسائل پر ایک ہی نقطۂ نظر کی چھاپ ہونی چاہیے، ورنہ یہ وسائل بجائے مفید ہونے کے اور نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

بچوں کی ساخت و پرداخت کا ہر مسئلہ جس میں ان کے لئے ادب پیدا کرنے کا مسئلہ بھی شامل ہے "طفلی شخصیت" اور اس کے "مقصود نظر ارتقاع" کی ایک فرع ہے۔ اسی لئے بچوں کے مسائل کو حل کرنے کی ایک پیشگی شرط یہ ہے کہ ہمارے پاس طفلی شخصیت اور ارتقاعی انجام کے متعلق خوب اچھی طرح سمجھا بوجھا نقطۂ نظر موجود ہو۔ کسی منصوبہ کیلئے بھی بہترین خواہش کا محض وجود کافی نہیں ہوتا ہے۔ یوں تو دنیا کے ہر مسئلہ کے متعلق ہر انسان کی یہی خواہش ہوگی کہ وہ خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو جائے مگر عملاً اس قسم کی مبہم خواہشیں کچھ زیادہ سودمند نہیں ثابت ہوتی ہیں۔ ہماری خواہشوں کو اگر انھیں افادی بنانا ہے تو کوئی نہ کوئی متعین اور مخصوص شکل اختیار کرنی چاہیے۔ اس تعین کیلئے کسی نہ کسی نقطۂ نظر کا وجود ضروری ہے۔ پھر اپنی خواہشوں کو متعین شکل دینے کے باوجود اور ایک مخصوص نقطۂ نظر اختیار کر لینے کے بعد بھی ہمیں ان ذرائع اور وسائل اور اس خام مواد کی وسعت و حدود و اوصاف و لوازم کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جو ہمارے نقطۂ نظر اور خواہشوں کی جولانگاہ بننے والے ہیں۔ مثال کے طور پر ذرعی خود کفالت کے مسئلہ پر غور کیجیے۔ یہ مسئلہ محض ہماری نیک اور مبہم خواہشوں سے نہیں حل ہو سکتا ہے اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے ایک مخصوص اور کارآمد نقطۂ نظر ہونا چاہیے۔ مقصود کو ذہن میں اچھی طرح واضح ہونا چاہیے۔ فنی معلومات ہونی چاہیے۔ اور پھر اس زمین کے متعلق کہ جو ہماری اس خواہش کے پورا کرنے کا ذریعہ بنے گی ہماری معلومات مفصل ہونی چاہیے۔ اس کی کیا مخصوص صلاحیتیں ہیں، ان صلاحیتوں میں اضافہ ممکن ہے یا نہیں، مختلف ماحول میں یہ صلاحیتیں کس طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بچوں کے مسائل کے سلسلہ میں 'طفلی شخصیت' کی وہی اہمیت ہے جو غذائی خود کفالت کے مسئلہ میں زمین کی۔ غذائی خود کفالت کا کوئی مسئلہ اس وقت تک نہیں حل ہو سکتا جب تک کہ ہم اپنے ضروریات اور مقاصد سے اچھی طرح واقف نہ ہوں۔ اسی طرح بچوں کے مسائل کو حل کرنا بھی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ بہت وضاحت کے ساتھ ہمارے ذہن میں یہ بات نہ ہو کہ ہم ان بچوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں اور آئندہ ان سے کس قسم کی خدمت لینا چاہتے ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے بچوں کا مسئلہ کافی پیچیدہ جسے بہترین فنی تعاون کے بغیر حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے بھی یہ مسئلہ دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے مسئلہ کے مقابل میں دوسرے درجہ پر نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے قومی اور ملکی ذرائع و وسائل کا بیشتر حصہ محض اسی مسئلہ کیلئے وقف کر دیں جب بھی ادائے حق کی منزل سے ہم پیچھے رہیں گے۔

ملکی اور قومی ضروریات کے پیش نظر ہزارہا فنی اور غیر فنی سمتیں ایسی ہیں جن کی طرف بچوں کی صلاحیتوں کا موڑنا ناگزیر ہے۔ عہد جدید کی زندگی اور مسائل ہر قسم کے تخصص (Specialization) کے متقاضی ہیں ان کے ذرائع و وسائل کا قابل اعتماد حد تک مہیا کرنا ضروری ہے۔ جب کہ بچوں کی تعلیم کا انتظام

[illegible] ہمارے ذہنوں میں ہوتا ہے۔ اور بچوں کو [illegible] جس قسم کا [illegible] بنانا مقصود ہوتا ہے اسی کے مناسب انتظام پہلے [illegible] کر لیا جاتا ہے۔ ایک بچہ آئندہ چل کر اچھے فنی تعاون کی بنا پر اچھا [illegible] کار بن جاتا ہے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کامیاب شخصیت میں کوئی نہ کوئی ایسا نقص ہے جسے نہیں ہونا چاہئے تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ فنی کمال کے باوجود شخصیت کا کوئی نہ کوئی غیر فنی پہلو ایسا بھی رہ جاتا ہے جس کی ساخت اور پرداخت، قطع نظر اس کے کہ بچہ آئندہ چل کر کیا پیشہ اختیار کریگا اور کس طرح اپنی روزی کمائیگا، ضروری ہے۔ ٹیکنیکل تعلیم کی افادیت سے انکار مقصود نہیں ہے لیکن کسی بچے کیلئے حاصل زندگی اس کا محض اچھا [illegible] بن جانا ہی نہیں ہے۔ دراصل تخصص کے شور و غل میں ہم ان مشترک اقدار کے نشو و نما کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو افراد و اقوام کو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط رکھتے ہیں۔ تخصص کو سماجی بیگانگی پیدا کرنے کی اجازت کبھی نہ دینا چاہئے دو فرد یا اگر مختلف سمتوں میں تخصص پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ضروریات کے پیش نظر اسکا بھی انتظام ہونا چاہئے اور پھر وسیع قومی اور بین الاقوامی توازن و اشتراک قائم رکھنے کیلئے اس بات کا بھی انتظام ہونا چاہئے کہ یہ دونوں فرد ایک دوسرے سے اتنا مختلف نہ ہو جائیں کہ انہیں کسی مشترک سماجی رشتہ کا وجود ہی باقی نہ رہے۔

اس وقت وسیع پیمانہ پر عالمی ہیجان موجود ہے۔ مختلف ممالک اور قومیں ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہیں۔ اس ہیجان کے پس پردہ بہت سے اسباب و عوامل برسرِ عمل ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گذشتہ پچاس برسوں میں فنی اور تخصصی تعلیم کا معیار اونچا ہونے کے باوجود ان مشترک علاقوں کی حفاظت کا کوئی معقول بندوبست نہیں کیا گیا جو افراد اور مختلف قوموں کو جذباتی اور ذہنی طور پر ایک دوسرے سے قریب کر سکیں۔ اسی کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ سماجی بیگانگی کسی متعدی مرض کی طرح پوری دنیا میں پھیل رہی ہے اور عالمی ہیجان کو شدید سے شدید تر بنا رہی ہے۔

اس مشترک علاقہ کا نام چاہے جو بھی رکھ لیجئے خواہ اسے مشترک تہذیب کہئے، انسانی تمدن کہئے یا محض انسانیت کہئے، اس کی حفاظت اور پرداخت بہرحال ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس مشترک ورثہ کی حفاظت اور مناسب نشو و نما کا اہتمام بچپن ہی کی زندگی سے شروع کر دینا چاہئے کیونکہ کسی فرد کے

غیر سماجی بن چکنے کے بعد اسے سماجی بنانا مشکل ہے لیکن ایک ارتقاع آمادہ شخصیت کو جیسی کہ بچے کی شخصیت ہوتی ہے سماجی بنا لینا چنداں مشکل نہیں ہے۔

ہر بچہ غیر سماجی ہوتا ہے۔ وہ نہ سماجی قوانین کو پسند کرتا ہے اور نہ اس میں سماجی بننے کا بذات خود کوئی رجحان موجود ہوتا ہے۔ اسی لئے اگر کسی بچے کو بغیر تربیت کے چھوڑ دیا جائے تو وہ غیر سماجی ہی رہے گا صرف فرق یہ ہوگا کہ بچپن کی منفی لاسماجیت شباب اور عہد کہولت کی مثبت لاسماجیت میں تبدیل ہو جائیگی اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ منفی لاسماجیت کو سماجیت میں اس کی ارتقاع آمادگی کی وجہ سے تبدیل کرنا بہ نسبت ایک مثبت لاسماجیت کے جو غلط طور پر مرتفع ہو چکی ہے کہیں آسان ہے۔

ممکن ہے کہ بچوں کو غیر سماجی کہنے میں کچھ اچنبھا سا محسوس ہو لیکن اگر بچوں کے عادات و اطوار و کردار و افعال اور طرز فکر پر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو اس حال کو سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوگی۔ سماجیت کو پروان چڑھانے میں جس قوت کا سب سے زیادہ حصہ ہوتا ہے وہ قربانی کا جذبہ ہے۔ سوسائٹی کا وجود ہی اس پر ہے کہ دوسروں کے لئے اپنی کن کن چیزوں کو کس کس حد تک قربان کر سکتے ہیں۔ بچوں میں تربیت سے پہلے قربانی کا جذبہ موجود نہیں ہوتا ہے وہ اپنی ذات کے علاوہ اور کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتا ہے۔ وہ ملکیت میں اشتراک کو پسند نہیں کرتا۔ وہ کسی چیز کا بٹوارہ کرنے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے بھائی بہنوں کے متعلق اس کا رویہ عام طور سے معاندانہ ہوتا ہے اور وہ انہیں زندہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ رجحانات بچوں کی بنیادی غیر سماجیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

اس نسبتہً طویل تمہید کا مقصد صرف یہ ہے کہ بچوں کے مختلف مسائل قدرے واضح ہو کر سامنے آجائیں اور اس طرح ادب اطفال کی افادیت اور اس کے منصب کا دائرہ متعین شکل میں پیش کیا جا سکے۔ یہاں ادب کی بذات خود افادیت اور اس کے انسانی مسائل سے گہرے ربط پر کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے۔ بچوں کے سلسلہ میں جہاں تربیت و پرداخت کے اور بہت سے دوسرے "غیر ادبی" ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں وہاں ان کی "تادیب" کیلئے خود ادب کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان بچوں کیلئے جن میں سمجھنے بوجھنے کی تھوڑی سی بھی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے ادب کے ذریعے ان کی ارتفاعی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ انہیں غیر سماجی سے اچھا سماجی یا شہری بنایا جا سکتا ہے۔ ان میں غیر شعوری طور پر اس عام ورثہ یا مشترک قدر کے سمجھنے کی بہتر استعداد پیدا کی جا سکتی ہے جو آئندہ چل کر

[illegible] ادب گری محض کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اس صورت حال کے [illegible] نظر بہت پہلے ادب اطفال کی تنقید کا سلسلہ شروع ہوجانا چاہئے تھا میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بچوں کا ادب مقدار اور معیار کے اعتبار سے اس منزل پر آگیا ہے کہ جہاں صحیح اور تعمیری تنقید کا آغاز ایک اہم ضرورت کو پورا کرے گا۔ اگر بچوں کے لئے پیدا کئے جانے والے ادب کو بالکل ہی بے مہار چھوڑ دیا جائے، اس کے خوب و زشت پر کوئی محاکمہ نہ کیا جائے، اس کے مسائل و وسائل پر مکمل تبصرہ نہ کیا جائے اور اس کے شرائط و لوازم پر سیر حاصل بحث و تمحیص نہ کی جائے تو یہ بات اتنی ہی خطرناک ہوگی جتنا کسی بچے کو بغیر تربیت کے چھوڑ دینا۔ اس لئے ان ادیبوں کا بھی جو بچوں کے لئے ادب پیدا کرتے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ اپنی کارکردگی کا خود جائزہ لیں اور ان نقادوں کو بھی جو خود بچوں کا یا کسی دوسری قسم کا ادب نہیں پیدا کرتے ہیں ان مسائل کی اہمیت کے پیش نظر ادبی تنقید کے اس پہلو کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

اس وقت بچوں کے لئے ہمارے ملک میں جو ادب پیدا ہو رہا ہے اسمیں (جہاں تک میری واقفیت ہے) خاصی خامی کا احساس ہوتا ہے۔ اس خامی کا سبب کچھ تو ناتجربہ کاری ہے اس لئے کہ بچوں کے ادیب کے سامنے بچوں کے ملکی ادب کی کوئی قابل تقلید روایت موجود نہیں ہے اور دوسرا سبب "بچوں" سے ناواقفیت ہے۔ طفلی شخصیت کے متعلق بیشتر ادیبوں کی واقفیت گہری نہیں معلوم ہوتی ہے۔ غالباً وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ بچوں کی شخصیت، جیسا کہ عام طور سے کہا جاتا ہے، بڑی سادہ ہوتی ہے جس میں نہ کوئی تہ ہوتی ہے نہ گتھیاں اور نہ پیچ و خم۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ کسی بڑے اور بالغ العمر کی شخصیت نسبتہً سادہ ہوسکتی ہے اس لئے کہ وہ ایک مخصوص ڈھرے پر لگ چکی ہے، اسکے نظریات عام طور سے متعین ہوچکے ہیں اور اس کے امکانات محدود ہوچکے ہیں۔ بچوں کی شخصیت کے متعلق ایسا کہنا ممکن نہیں ہے وہاں امکانات کی کثرت ایک ایسے آئینہ خانہ کو پیدا کرتی ہے جو عکسوں کے استقبال اور جلووں کی کثرت میں اپنا نظیر نہیں رکھتا ہے۔ ہم بچوں کو عام طور سے معصوم، سادہ لوح بھولا اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان تمام بظاہر سادہ لوحی اور بھولے پن کے پیچھے لاشعوری جبلتوں کا وہ شور و شر پوشیدہ رہتا ہے جس کی ہیجان آفرینی کو نہ کوئی بڑے سے بڑا قانون روک سکتا ہے

اور نہ کوئی مستحکم سے مستحکم سماجی اور اخلاقی گرفت۔ اسی لئے بچوں کے ادب کا مطلب چڑیا چڑے کی لڑائی، طوطے مینا کی کہانی، پریوں اور پریزادوں کی کھینچ تان، یا مریخ و زہرہ تک کی خیالی اور بے مقصد جست میں ہرگز محدود نہیں ہے بچوں کیلئے حقیقتہً وہی ادب مفید ہوسکتا ہے جو ان کے گستہ مہار لاشعور کو شخصیت پر بغیر کسی قسم کا دباؤ ڈالے ہوئے اچھی راہ پر ڈال سکے اور اس قوت کو جو بچپن میں صرف ہیجان پیدا کرتی ہے کسی تعمیری اور پر امن منصوبے کی طرف موڑ سکے۔ یہ صحیح ہے کہ بچوں کے ابتدائی ادب کو مشاہدات کے محور پر گھومنا چاہئے اور اس ضمن میں ان کے تجسس کے مادہ کو بیدار رکھنے کے لئے مافوق الفطرت "مشاہدات" کا بھی تذکرہ ہونا چاہئے مگر ایک قصہ کو محض قصہ کی خاطر بیان کرنا یا اس سے بچے کے اندر محض تحیر کی کیفیت پیدا کرنا کچھ مفید مقصد نہیں ہے۔ دراصل ان تمام قصوں کے اندر اس جذباتی تسکین کا انتظام ہونا چاہئے جو طفلی نظام کی فوری ضرورت ہے اور اس جذباتی تسکین میں اس طویل منصوبہ بندی کے لئے راہیں درست ہونی چاہئے جو اس بچے کے انجام بلکہ خوش انجامی کا وسیلہ ہیں۔

اس وقت بچوں کے ادب کا جو ذخیرہ پیدا ہو رہا ہے اس کی سب سے بڑی کوتاہی یہی ہے کہ وہ ادب برائے ادب کی طرح کا ہوتا جا رہا ہے بچوں کی شخصیت اور ان کے ادب میں مناسب قسم کا توازن یا ہم آہنگی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اس بے ربطی اور ناہمواری کا دور کرنا اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے کہ جب ادیب بچوں کے مسائل اور ان کی شخصیت کے بنیادی ڈھانچے اور ان کے ارتقاء کے مناسب راستوں اور انھیں آئندہ چل کر کیا بننا ہے یا کیا بنانا ہے ان سب چیزوں سے باقاعدہ واقف ہو۔ دراصل مجھے بچوں کے ادیب کی نیت پر کوئی حملہ یا شبہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس فنی دانائی اور اور بصیرت کی طرف انھیں متوجہ کرنا ہے جس کے بغیر اچھی سے اچھی نیت اور نیک سے نیک خیال اور خواہش بھی کوئی عملی افادیت نہیں پیدا کرسکتی ہے یہاں پر یہ سوچا جاسکتا ہے کہ ماں باپ کے سلسلہ میں اس فنی واقفیت کی ضرورت کو جب نظر انداز کیا گیا ہے تو ادیب کے سلسلہ میں بھی اس واقفیت کو نظر انداز کرنا چاہئے۔ مگر ان دونوں باتوں میں کافی فرق ہے۔ ایک تو ہر ماں باپ کا بچوں کی شخصیت کے متعلق مکمل فنی واقفیت حاصل کرنا عملاً ناممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے طویل سابقہ اور تادیب و تفہیم کی تکرار کی

وجہ سے باوجود کم واقفیت کے بچوں کی شخصیت پر گہرا اثر ڈال سکتے ہیں۔ اسی لئے وہ اپنی کم نگاہی فنی نقطۂ نظر سے مع معلومات کی بنا پر تربیت کا کام چلا سکتے ہیں۔ بچوں کا ادیب ظاہر ہے کہ بچوں سے محض اپنی تحریروں کی مدد سے ربط پیدا کرتا ہے۔ نہ اس کا سابقہ طویل ہوتا ہے اور نہ اسے تکرار اور باتوں کے دہرانے کا اتنا موقع ملتا ہے۔ اس کم فرصت اور تھوڑے سے سلجھ میں جب تک اس کی فنی بصیرت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوگی وہ بچوں کے لئے کوئی مفید خدمت نہیں انجام دیتا ہے۔ پھر بچوں کے ادیب اور بڑوں کے ادیب میں کافی فرق بھی ہوتا ہے۔ ایک بڑا غزل گو یا افسانہ نگار حقیقتہً پیشہ ور ادیب نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنی اندرونی کشش اور جذبۂ بے اختیار کی بنا پر اس فن کو اختیار کرتا ہے۔ بچوں کے ادیب کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ کسی جذبۂ بے اختیار کی بنا پر بچوں کا ادب پیدا کر رہا ہے مشکل ہے۔ اسی لئے بچوں کے ادیب سے بہ نسبت دوسرے ادیبوں کے فنی بصیرت اور بچوں کی شخصیت کے متعلق وافر معلومات کا تقاضہ زیادہ ضروری ہے۔

بچوں میں ادب سے مستفید ہونے کی صلاحیت ان کی زندگی کے ایسے وقت میں پیدا ہوتی جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ بچوں کی نفسیاتی زندگی میں وہ وقت جبکہ ان کے ذہنی نہاں خانہ میں سپر ایگو (S.uper ego) کی تکوین ہوتی ہے کافی دیکھ بھال اور اچھی طرح مستعد رہنے کا وقت ہے۔ دراصل "سپر ایگو" کی تکوین پر بچے کی ساری اخلاقی زندگی اور اقدار کے تصور کا انحصار رہتا ہے۔ "سپر ایگو" کی غلط تکوین ایک ایسے انسان کی تخلیق کرتی ہے جس کے پاس خوب و زشت کے پرکھنے کا کوئی معیار ہی نہ ہو یا اگر ہو تو غلط ہو۔ اس صورت حال کے متعلق یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ وہ انسان کی مجموعی زندگی کے لئے کتنی خطرناک ہے۔ بچوں کا "سپر ایگو" صوتیات اور مشاہدات دونوں سے بنتا ہے۔ اسی لئے بچوں کے سلسلہ میں زبانی اور تحریری دونوں قسم کے ادب بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ نفسیاتی ارتقاء کی اس منزل پر ادب کی راہ نمائی بہت مفید ہو سکتی ہے اور بچوں کے لئے ایسا ادب پیش کر کے جو ان کے "سپر ایگو" کو بننے اور بڑھنے میں مدد دے کے در حقیقت شخصیت آفرینی کا کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ "سپر ایگو" محض ادب اور کہانیوں کے ذریعہ سے نہیں بن سکتا ہے۔ اس بنیادی قوت کی تراش خراش میں ماحول اور شخصیت کے نامعلوم کتنے محرکات بر سر عمل رہتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں جو وافر حصہ ادب کو مل سکتا ہے وہ بھی اہمیت کے اعتبار سے کم نہیں ہے۔

اس موقع پر بچوں کے ادب کے سلسلہ میں صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ممکن ہو سکا ہے۔ ابھی ہزارہا پہلو ایسے ہیں جو اس قسم کے مضامین سے نہیں بلکہ کافی غور و خوض کے بعد نمودار ہوں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے ادیب بھی ان مسائل پر سیر حاصل بحث کریں۔

اتر پردیش کے لوک ناچ

(بسلسلۂ صفحہ ۴۷)

نکلا کرتی تھیں۔ وہ رواج تو ختم ہو چکا ہے لیکن اس کی یادگار یہ تلوار رقص باقی ہے۔ دو اور کبھی کبھی چار آدمی رقص کے لباس میں ملبوس ہاتھوں میں ڈھال اور تلوار لئے ہوئے برات کے آگے آگے رقص کرتے چلتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ڈھولک اور ڈھپلی بجانے والے ہوتے ہیں جو تال دیتے جاتے ہیں۔ ان کے دونوں جانب دو جھنڈے رہتے ہیں ایک سرخ جو لڑائی کا اور دوسرا سفید جو صلح کا نشان ہوتا ہے۔ جب برات دولہن کے دروازے پہنچتی ہے تو دولہن کا باپ سفید جھنڈا لے کر برات کا استقبال کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بغیر کسی تصادم کے اپنی لڑکی کی شادی کر کے اسے رخصت کرنے کے لئے تیار ہے۔ تلوار رقص میں یہی چیز پیش کی جاتی ہے۔ برات چونکہ آہستہ چلتی ہے اس لئے تلوار رقص میں بھی اس کا لحاظ کرتے ہوئے پیر آہستہ اٹھتے گرتے اور چلتے ہیں لیکن انداز دلکش ہوتا ہے۔ اس رقص میں صرف برات سے متعلق جزئیات پیش کئے جاتے ہیں۔

غزل

شفیق جونپوری

کیا جانے کون اہلِ چمن کی نظر میں ہے
اے پھول آج تک تری خوشبو سفر میں ہے

محوِ خرامِ ناز کوئی رہ گذر میں ہے
چلتا ہوا بہشت ہماری نظر میں ہے

پستی نگاہ میں نہ بلندی نظر میں ہے
اب زندگی تلاشِ بنائے دِگر میں ہے

کتنی بہاریں آکے چمن سے گذر گئیں
تو باغباں ہنوز تلاشِ سحر میں ہے

میں بوئے گل نہیں جو گلستاں کو چھوڑ دوں
میری تو زندگی اسی برق و شرر میں ہے

آئینہ شکستہ کی تقدیر دیکھیے!
ٹوٹا تو اب جگہ دلِ آئینہ گر میں ہے

دیوانگی نے ہوش کو بھی مات کر دیا
منزل پہ ہو جنوں تو خرد رہ گذر میں ہے

وہ راہ ایک جست میں طے کر گیا بشر
روح الامیں جہاں خلشِ بال و پر میں ہے

چلنے سے پہلے قافلے والے یہ سوچ لیں
کیا امتیاز راہزن و راہبر میں ہے

دنیا سمجھ رہی ہے نئی روشنی جسے
اک پر فریب شام لباسِ سحر میں ہے

وہ صاحبانِ ہوش و خرد کو کہاں نصیب
جو آگہی کی شان ترے بے خبر میں ہے

مایوس ہو نہ میرے دلِ خانماں خراب
تیری جگہ ابھی نگہِ معتبر میں ہے

آجائے میرا ذکر تو کہنا پیامبر
ابتک وہی جنوں ترے شوریدہ سر میں ہے

قطرہ وہی جو روکشِ دریا ہوا ہے شفیق
اک کائنات میرے دلِ مختصر میں ہے

غالب کی شاعری میں آپ بیتی

م۔ حنیظ سیّد

غالب کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہو کہ ان کا کلام خود ان کی زندگی کا آئینہ ہے۔ تقریباً ہر شاعر صاف یا مبہم طور پر اپنی زندگی کے کچھ واقعات کو ضرور موضوعِ تحریر بناتا ہے۔ لیکن غالب کے ساتھ یہ خصوصیت وابستہ ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں کا تمام فلسفیانہ اور شاعرانہ مواد خود اپنی زندگی کے واقعات اور حالات سے فراہم کیا جن سے ان کے وسیع نظریۂ حیات اور صحیح ادبی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے دیوان سے ایسے بہت سے اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا ہے جن میں ایک حد تک شاعر کی داخلی زندگی کے نقوش نمایاں ہیں اور جن سے بعض اہم کوائف اور حالات کا بھی انکشاف ہو سکتا ہے۔

میں نے مرزا غالب کے دیوان سے اس قسم کے متعدد اشعار منتخب کر کے ان میں ایسا ربطِ باہمی اور تسلسل قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی زندگی کا ایک رخ سامنے آ جائے۔ یہ اشعار مرزا غالب کی زندگی کے ان اہم واقعات کا پتہ دیتے ہیں جنھیں روایتی اور بے کیف تفصیلات کی بڑی سے بڑی مقدار بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اور ان میں غالب کے سچے جذبات اور ان کی زندگی کے بحرانی واقعات کی یادیں محفوظ ہیں۔

پانچ سال کی عمر میں غالب کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا اور نو سال کی عمر میں چچا کا انتقال ہو گیا۔ تیرہ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ غالب کے نزدیک یہ شادی کیا تھی گویا حبسِ دوام کی سزا تھی۔ ہمیشہ کے لئے ان کے پاؤں میں بیڑیاں اور گردن میں طوقِ محکومیت ڈال دیا گیا۔ مندرجۂ ذیل شعر میں انھیں ان واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

مرزا عیش و عشرت کی محفل کے رند تھے۔ جوانی میں ایک نوبہارِ ناز پر فریفتہ بھی ہو گئے۔ انھیں عیش و عشرت کی محفلوں کی یاد میں کہتے ہیں :۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

محبوب دنیا سے چل بسا۔ مرزا نے اس صدمۂ عظیم سے متاثر ہو کر ایک غزل شاید اسی کی یاد میں کہی تھی۔ اس کا ایک شعر یہ ہے :۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

غزل کے کامیاب ہونے میں شک نہیں لیکن اس میں وہ بے پایاں غم اور وہ لا متناہی احساس نہیں جو دلوں کو ویران کر دیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب عشق کے زخموں سے اتنے چور نہیں تھے یا ان کی محبت دیوانگی کی اس حد تک حقیقتاً نہیں پہونچی تھی جسے خود انھوں نے ذیل کے اشعار میں پیش کیا ہے۔

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

بہر حال اس محبت کی یاد ان کے دل سے کبھی نہیں مٹی۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں اپنی منظورِ نظر چناجان کی موت پر یوں اظہارِ غم کرتے ہیں :۔

"شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیری کی یہ انتہا ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ

ان کے سامنے مری [illegible] تمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے۔ اور ہم تم دونوں کو کہ دوست کے مرنے کا زخم کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے اب وہ کوچہ چھٹ گیا اس فن میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

غالباً اسی زمانے میں مرزا نے شراب نوشی کی ابتدا کی اور اپنی شراب نوشی کی وجہ جواز یہ تلاش کی ہے کہ شراب سے ان کا مقصد نشہ و کیفیت نہیں بلکہ وہ بے خودی و سرشاری ہے جس میں دنیا کے آلام و افکار دب کر رہ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

لیکن "غم و آلام" کو "غرق مئے ناب" کرنے کی کوشش غالب کی صحت کے لیے رفتہ رفتہ بہت مضر ثابت ہوئی اور ان مصائب کا احساس تیز تر ہو گیا جن سے وہ فرار اختیار کرنا چاہتے تھے ؎

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: "میر مہدی صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر ہائے آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچایا۔" اور اسی خیال کو انھوں نے ایک شعر میں اس طرح پیش کیا ہے۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

مرزا کے طریق شعر گوئی کے بارے میں مولانا حالی فرماتے ہیں: "فکر شعر کا طریقہ یہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمربند میں ایک گرہ باندھ لیتے تھے۔ اس طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔" ایک دوسری جگہ مولانا حالی لکھتے ہیں: "مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی اکثر شام کو ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت بہت پرلطف باتیں کیا کرتے تھے۔" غالب نے اسی کیفیت کا اظہار اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

پھر دیکھیے انداز گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

ظاہر ہے کہ ان رنگ رلیوں کا نتیجہ سوائے تباہی اور کیا ہو سکتا تھا۔ چناں چہ جائداد بھی ہاتھ سے نکل گئی اور مختلف قسم کے جسمانی امراض نے بھی اپنا زور دکھانا شروع کیا۔ غالب کو خود شکایت ہے ؎

کر دیا ضعف نے عاجز غالب — ننگ پیری ہے جوانی میری

مرزا غالب کے لیے خانگی زندگی میں بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس بے تعلقی کے دو اسباب قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو غالب کی ذاتی مصروفیتیں جن کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے، اور دوسرے خود ان کا بلند فلسفیانہ دماغ جس کے نزدیک تمام انسانی تعلقات اور رشتے، انسانی امیدیں اور تفکرات وہم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ ایک شعر میں یوں ادا کرتے ہیں:-

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

یہاں پر حالی کو شبہ ہے کہ آیا یہ غالب کی محض ایک شاعرانہ ادا تھی یا انھوں نے اپنے سچے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

مرزا ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے۔ اگرچہ دہلی میں ان کا قیام پچاس سال تک رہا لیکن ذاتی مکان بنانے کی خواہش تشنۂ تکمیل ہی رہی غالباً اسی سلسلے میں وہ کہتے ہیں:-

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں!

قلت آمدنی کے سبب مرزا ہمیشہ مقروض رہے۔ مرزا قربان علی کے

نام ایک خط میں وہ اپنی مالی مشکلات کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں : "میری جان، کن اوہام میں گرفتار ہے۔ جہاں باپ کو بیٹھ چکا۔ اب چچا کو بھی رو بیٹھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات اور احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں۔ کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں، لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے، نجم الدولہ بہادر۔ ایک قرضدار کا گریبان ہاتھ میں، ایک قرضدار کو بھوک لگ رہی ہے۔ میں اس سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اور خاں صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو۔ کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا۔ بے عزت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔" اس طویل خط کا خلاصہ اس شعر میں پیش کیا ہے؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

وہ کمرہ جس میں مرزا اپنے روز و شب گزارتے تھے مکان کے صدر دروازہ کے ٹھیک اوپر ایک دو منزلہ پر واقع تھا۔ کمرے پر ایک اندھیری اور نیچی چھت والے بغلی کمرے کا چھوٹا سا تنگ دروازہ کھلتا تھا۔ مرزا کے کمرے کی تاریکی اور اندوہناکی نے مندرجہ ذیل شعر کی قنوطیت اور یاس انگیزی میں مکمل اظہار پایا ہے؎

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

مرزا کو چوسر سے بہت شوق تھا اور جوئے سے ہمیشہ شغف رہا۔ ایک مرتبہ اسی بنا پر کوتوال شہر نے جسے مرزا سے ذاتی بغض اور عناد بھی تھا انھیں حراست میں لے لیا۔ غالباً یہی واقعہ اس شعر کا محرک ہوا؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں ہی سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

مولوی محمد حسین آزاد رقم طراز ہیں کہ ایک غیر معمولی واقعے کی بنا پر مرزا کچھ دنوں تک زیر حراست رہے۔ ٹھیک جیسے یوسف علیہ السلام مصر کے قید خانہ میں بند رہے تھے۔ ان کے کپڑے گرد آلود تھے اور ان میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔ ایک روز مرزا کپڑوں سے جوئیں نکال رہے تھے کہ ایک رئیس ملاقات کو آئے۔ مزاج دریافت کیا تو برجستہ شعر میں جواب دیا؎

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن قید خانے سے باہر نکلے اور کپڑے بدلنے کا موقع آیا تو مرزا نے اپنی قمیص چاک کر دی اور برجستہ یہ شعر پڑھا؎

اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اپنی خود نوشتہ سوانح عمری اور خطوط میں مرزا نے لکھنؤ، مرادآباد، رام پور اور ہاپڑ کے واقعات سفر درج کیے ہیں۔ اور ان کے مصائب اور مشکلات اور دوستوں کی سرد مہری کو یوں نظم کیا ہے۔

تا چار بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواریٔ رہ و ستم ہم زباں نہ پوچھ

لکھنؤ سے جب گزرے تو اس کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

کلکتے سے جب واپس ہوئے تو اس کی یاد ان اشعار میں کرتے ہیں؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

چودھری عبد الغفور خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "بندہ پرور، میرا کلام کیا نظم کیا نثر، اردو کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم

تھیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان کے لاکھوں روپئے کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپیہ کے کتب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ مجموعۂ پریشاں بھی غائب ہو گئے ہیں۔ غالباً اسی نقصان کا احساس اس شعر کی تخلیق کا باعث ہوا ہے

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

مرزا کے ابتدائی کلام پر خوب اعتراض ہوئے۔ کچھ لوگوں نے تو مرزا کے منہ پر کلام کے بے معنی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس پر برجستہ کہتے ہیں ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بقول مولانا حالی مندرجہ ذیل شعر اسی واقعہ کے متعلق ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

مندرجہ ذیل رباعی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اُن کا ایک اور شعر ہے ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اسی کے ساتھ اپنے اشعار کے ہر لفظ کو پُر از معانی سمجھتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

ایک اور جگہ یوں گوہر افشاں ہیں ؎

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں اپنی طویل عمر کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کے شاکی ہیں کہ ان کی اتنی عمر ہوئی لیکن فنِ شاعری کا کوئی صلہ نہ ملا۔ بادشاہِ وقت ان کی شاعری کی قدر ضرور کرتا ہے لیکن اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ اب یہ اشعار دیکھئے ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

مرزا کی سوانح عمری میں ان کے ہم عصروں کی بے اعتنائیوں کا تذکرہ صرف ان کے کلام کے اعتراضات کے سلسلے میں آیا ہے۔ "قاطع برہان" پر نہایت سخت قسم کی بوچھار کی گئی اور معترضین نے مرزا کو گالیوں سے بھرے ہوئے خطوط بھی لکھے۔ اس قسم کی مخالفانہ تنقیدوں نے مرزا کے دل کو جتنی تکلیفیں پہونچائیں اتنی شاید کوتوال شہر نے یا ان کے چچا نے بھی نہ پہنچائی ہوں گی جنھوں نے مرزا کو حق وراثت سے محروم کر دیا تھا۔ مرزا نے مخالفین کے ایک گروہ کے خلاف جنھوں نے "قاطع برہان" کے جواب میں ایک گندہ اور بیہودہ رسالہ شائع کیا تھا مقدمہ دائر کیا۔ مولویوں نے جن کو وہ اپنا دوست سمجھتے تھے مخالفت میں گواہی دی۔ ان کے نقادوں کا یہی وہ غیر ہمدردانہ رویہ تھا جس نے مرزا کو مندرجہ ذیل اشعار کہنے پر مجبور کیا۔

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

اس دنیا اور یہاں کے رہنے والوں سے تنگ آکر انھوں نے یہ آرزو کی کہ

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

تمام زندگی مرزا نے نہ تو نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ ایک مرتبہ مولانا حالی نے مرزا کو ایک خط لکھا جس میں پنجگانہ نماز ادا کرنے کی ہدایت کی۔ مرزا نے اس دوستانہ خط کے غلط معنی لیے چنانچہ ان کا مندرجہ ذیل شعر اسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ایک اور شعر میں اپنے طرزِ حیات کو یوں سراہتے ہیں ؎

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

مرزا نے اپنی حالت درست کرنے کے لئے کئی ذرائع آزمائے۔ لیکن تقدیر نہ بننا تھی نہ بنی۔ کہتے ہیں ؎

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

مالی مشکلات کے علاوہ مرزا کو قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کی اچانک موت کے صدمے بھی برداشت کرنے پڑے۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بھائی جن کا نام مرزا یوسف تھا، تین سال تک پاگل رہے۔ ایک شعر میں ان کی صحت یابی کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

دی میرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بڑی محبت کرتے تھے۔ مرزا کی زندگی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس موقع پر مرزا نے جو اندوہناک اشعار کہے تھے ان میں سے ایک یہ ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

بہر حال یہ تمام غم و مصائب تھے جنھوں نے مرزا سے اس نوع کے دردناک اشعار کہلوائے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف   آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی!

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے   لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

انتہائی مایوسی کے عالم میں انھوں نے موت کی آرزو کی ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ایک مرتبہ انھوں نے عبدالغفور کو خط میں لکھا "حضرت پیچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے کہ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی"۔ اس کی تشریح اس شعر میں ہوتی ہے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

موت سے کئی سال پہلے سے مرزا مرنے کے لئے بے قرار تھے۔ ہر سال اپنی موت کی تاریخ کہتے اور ہر سال غلط ثابت ہوتی۔ آخرکار مرزا نے ۱۲۷۷ھ اپنے مرنے کا سال مقرر کیا۔ الفاظ یہ تھے "غالب مرد"۔ جو آہر سگھ جوہر مرزا کے ایک جگری دوست نے کہا "خدا کے فضل سے یہ بھی غلط ثابت ہوگی"۔ مرزا نے التجا کی اس قسم کی پیشین گوئی نہ کرو۔ اگر یہ تاریخ غلط نکلی تو سر ٹکرا کر زندگی کا خاتمہ کر لوں گا ؎

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے پر نہیں آتی

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

آخر مرزا کی آرزو بر آئی۔ اور وہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو بہتر (۷۲) سال کی عمر میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔

نئی زمین

کاملی باخوضیا

کرن افق سے زمیں پر اترنے والی ہے
فضا میں صبح کی افشاں بکھرنے والی ہے
ہر ایک دشت میں ہونے کو ہے چمن بندی
ہر ایک کوہ کی چوٹی سنورنے والی ہے

خزاں رسیدہ چمن کے ہر ایک خاکے میں
نئی بہار نیا رنگ بھرنے والی ہے
غبار خوردہ نگاہوں میں ہے خودی کی چمک
دبی پسی ہوئی دنیا ابھرنے والی ہے

غرورِ برق و تلاطم کا ٹوٹ جائے گا
کہ روح، عزمِ جواں کی بپھرنے والی ہے
اجل سے کھیل چکی ہے جو زندگی اکثر
وہ کب اجل کے ڈرانے سے ڈرنے والی ہے

نہ رہگزر کے تقاضے قیام پر راضی
نہ قافلے کی روانی ٹھہرنے والی ہے
کمند پھینک رہی ہے دیارِ انجم پر
زمیں فضا کو تہہ دام کرنے والی ہے

حیاتِ عصر کے اے کارواں مبارکباد
نئی زمین پہ دنیا اترنے والی ہے

قدیم ہندوستان میں صنعت وحرفت

سید یحییٰ حسن نقوی

قدیم ہندوستان کی تجارتی سرگرمیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس زمانہ میں صنعت وحرفت کے میدان میں بھی کافی ترقی ہوگئی تھی۔ اُس عہد کی تمام کتابوں میں جو ہمارے پاس موجود ہیں، اور تمام کتبوں میں جو ہمیں دستیاب ہوئے ہیں اس دور کے مختلف پیشوں کے جابجا حوالے ملتے ہیں جو ملک کے لوگ اس وقت اختیار کئے ہوئے تھے۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستانی سماج تجارتی سرگرمیوں کی طرح صنعتی سرگرمیوں کے لئے بھی ممتاز تھا، اور قدیم ہندوستان کی صنعت وحرفت اور اس کا نظام ایک اعلیٰ معیار حاصل کر چکا تھا۔

چودھویں اور دسویں صدی قبل مسیح کے مابین رہائشی مکانات میں زیادہ تر لکڑی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ چوکھٹوں، کواڑوں، ستونوں اور گھر کے دیگر سامان پر منبّت کاری کی جاتی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بڑھئی کا پیشہ پرانے زمانہ میں ہی بہت ترقی یافتہ تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگ ریشمی کپڑا استعمال کرتے تھے اور کپڑا بننے کی صنعت باقاعدہ طور پر جاری تھی۔ زراعت اُس زمانہ میں بھی ہندوستانیوں کا خاص پیشہ تھا اور مختلف قسم کے اناج ترکاریاں، جڑی بوٹیاں، پھل پیدا کئے جاتے تھے۔ لوگ تیل اور شکر بھی تیار کرنا جانتے تھے۔

زراعت کا طریقہ قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا کہ آج کل ہے۔ آبپاشی کا ڈھنگ بھی آج کل کے معمولی طریقوں جیسا ہی تھا اور آلات اور اوزار کا بھی یہی حال تھا۔ ہندوستان کی زراعت کے بارے میں یونانیوں نے بڑی دلچسپ تفصیلات اپنے تذکروں میں بیان کی ہیں۔ نیرکس نے جو سکندر اعظم کی فوج میں ایک افسر تھا اور جسے سکندر نے اس بیڑے کی کمان پر متعین کیا تھا جو دریائے سندھ کے بہاؤ پر ہوتا ہوا سمندر تک پہنچا تھا، بڑا دلچسپ آنکھوں دیکھا حال ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ اس بیان کے اقتباسات ایریانس[1] کی "انڈکا" میں محفوظ ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ زمین کو چند رشتہ دار مل جل کر جوتتے بوتے تھے۔ کل پیداوار کو آپس میں تقسیم کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ان میں سے ہر شخص کل پیداوار میں سے اتنا اناج اپنے لئے حاصل کر لیتا تھا جتنا اس کے سال بھر کے خرچ کے لئے ضروری ہوتا تھا۔ جو اناج باقی بچتا تھا اُس کو جلا دیا جاتا تھا تاکہ لوگ کاہل اور سُست نہ ہو جائیں۔

نیرکس نے ہندوستان کے کاریگروں کے بارے میں بڑی اچھی رائے قائم کی تھی۔ اُس نے بتایا ہے کہ اہل ہند نے یونانیوں کو اسپنج استعمال کرتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے فوراً اس کی نقل اُتارنے کی کوشش کی یعنی اُنھوں نے دھاگے اور اُون کی مدد سے اسپنج بنایا اور اسے اصلی اسپنج کا رنگ دے دیا۔ اُن کا بنایا ہوا نقلی اسپنج اصلی اسپنج سے مل گیا۔ یہ لوگ کانسی بھی استعمال کرتے تھے یعنی وہ دھات جس سے گھڑیاں بنتا ہے اور جس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے

---

[1] ایریانس: (سنہ [illegible] تا سنہ [illegible]) یہ ایک یونانی مورخ ہے۔ اس کا لکھا ہوا سکندر اعظم کی مہموں کا تذکرہ بہت دلچسپ، اہم اور مشہور ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تذکرہ میں جابجا اُن مورخین ماسبق کے حوالے دیتا ہے جن کی تحریریں آج مفقود ہو چکی ہیں۔

کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

ان پیشوں کے علاوہ فوجی لوگ عام طور پر دوہری خدمت انجام دیتے تھے، یعنی وہ فوج میں سوار، پیدل، رتھ بان، یا فیلبان کی حیثیت میں بھی کام کرتے تھے اور اپنے مخصوص پیشہ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑوں اور ہاتھیوں سے متعلق تمام تجارت اور صنعت فوج کے سپاہیوں کے ہاتھ میں تھی اور یہی لوگ فوج کے لئے رتھ، جہاز، اور آلات حرب مثلاً تیر، کمان، تلوار وغیرہ مہیا کرنے کے لئے لکڑی اور دھاتوں کا کام کرتے تھے۔

لکڑی اور دھات کی فراہمی کے لئے جنگلوں اور بنوں کو صاف کرنے اور کانوں میں کام کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ کوٹلیہ کی "ارتھ شاستر" میں ان دونوں شعبوں کے لئے بڑے واضح قواعد مندرج ہیں۔ کوٹلیہ نے اپنی کتاب میں ایک افسر کا ذکر کیا ہے جسے "آکر ادھیکش" یا کانوں کا نگراں کہتے تھے۔ یہ افسر اپنے مخصوص شعبہ کی تمام فنی معلومات رکھتا تھا۔ اس افسر کو اس کے کام میں ایسے ماتحت مدد دیتے تھے جو خود بھی کانوں کے کام میں ماہر ہوتے تھے۔ اس کے ماتحت بہت سے مزدور بھی کام کرنے والے ہوتے تھے جو اپنے پاس مختلف آلات اور اوزار رکھتے تھے۔ سلطنت میں جتنی بھی کانیں ہوتی تھیں ان کی نگرانی اسی افسر کے ذمہ تھی سوائے ان کانوں کے جو بہت بڑی ہوتی تھیں اور جن کا آمد و خرچ کثیر ہوتا تھا۔ ایسی کانیں غیر سرکاری لوگوں کے انتظام میں رہتی تھیں۔

ایک دوسرا سرکاری افسر سیسہ، پیتل، تانبا وغیرہ دھاتوں سے بنی ہوئی اشیاء کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ سمندری کانوں کا نگراں قیمتی پتھروں مثلاً ہیرے، موتی، اور نمک وغیرہ کی صنعت کی دیکھ بھال کرتا تھا اور ان اشیاء کی خرید و فروخت کے قواعد مقرر کرتا تھا۔ اسی طرح بنوں اور جنگلات کا نگراں جنگلات کی حفاظت اور دیکھ بھال کرتا تھا اور ہر قسم کی لکڑی کی مصنوعات جو زندگی کے لئے یا قلعوں کی حفاظت کے لئے ضروری تھیں اسی کی نگرانی میں بنتی تھیں۔ اسی افسر سے متعلق ایک اور اہم صنعت تھی یعنی جہاز اور کشتیاں بنانے کی صنعت جو اس وقت ایک وسیع پیمانہ پر ملک میں رائج تھی۔

اس طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست بعض صنعتوں پر مکمل اجارہ رکھتی تھی۔ گویا موجودہ اصطلاح میں کانوں، اسلحہ، جنگلات، نمک، اور چند دیگر صنعتوں کو مکمل طور پر قومیا لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ حکومت نہ صرف کپڑے، تیل، اور شکر وغیرہ کے کارخانوں کی مالک تھی، بلکہ نجی تجارت اور صنعت پر بھی کافی تصرف رکھتی تھی۔ تجارت کا نگراں تھوک کی قیمتوں کا بھی تعین کرتا تھا اور ریٹیکر کی قیمتوں کا بھی۔ وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ مال چوری سے بلا محصول ادا کئے تو نہیں بھیجا جاتا ہے، یا اصلی چیزوں مثلاً دودھ، گھی، اور تیل میں آمیزش تو نہیں کی جاتی ہے، یا نقلی اور جھوٹے باٹ تو استعمال نہیں کئے جا رہے ہیں، یا قیمتوں کے بڑھنے کے انتظار میں مال کو ذخیرہ تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ مزدوری بڑھانے کے سلسلہ میں کاریگروں یا مزدوروں کی ہڑتال جائز نہیں سمجھی جاتی تھی۔ تجارت اور صنعت و حرفت سے متعلق جن قواعد اور تفصیلات کا "ارتھ شاستر" میں ذکر کیا گیا ہے وہ حیرت انگیز طور پر جدید معلوم ہوتے ہیں۔

قدیم ہندوستان میں لوگ کافی عیش و عشرت کی زندگی گذارتے تھے اور اس طرز معاشرت نے بھی بہت سی صنعتوں کو جنم دیا تھا۔ سنگتراشی اور شیشہ گری کے فن تیسری صدی قبل مسیح سے بہت پہلے ہی کافی ترقی کر چکے تھے۔ کوٹلیہ کی "ارتھ شاستر" میں سونے چاندی کے زیورات، ہاتھی دانت کی اشیا اور طرح طرح کے ہیرے جواہرات کا ذکر ملتا ہے۔ آبادی کا ایک معتدبہ حصہ مختلف قسم کے عطریات، طرح طرح کے سوتی، اونی، اور ریشمی کپڑے، کمبل، اور ہر قسم کے مشروبات تیار کرنا جانتا تھا۔ بڑے بڑے تاجر، امرا، اور راجہ مہاراجہ عالیشان اور خوبصورت مکانات، مندر یا محل وغیرہ بنواتے تھے اور ان کی تزئین کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسی لئے اس عہد میں مصوری، نقاشی اور سنگتراشی جیسے فنون نے بھی کافی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ مویشی اور مرغیاں پالنا، اور مچھلی پکڑنا بھی خاص پیشے تھے جس سے نہ صرف دودھ مکھن ہی حاصل ہوتا تھا بلکہ مختلف قسم کے جانوروں اور پرندوں کا گوشت بھی بہم پہنچتا تھا۔

غرض عہد قدیم میں ہندوستان میں جو پیشے ورپائے جاتے تھے اُن میں سے کچھ کی فہرست حسب ذیل ہے:

منشی (لیکھک)، طبیب (وید)، کاشتکار (کیکھیہ)، سنار (ہیرانائک)، بڑھئی (بارودھکی)، مالی (مالاکار)، مچھیرا (دانک)، لوہار (لوہاکارک)

ناپنے والے (رنگ گرنک)، ناٹک کرنے والے (شیلالک)، کمہار، عطر فروش رنگریز، موچی، ٹوکری بننے والے، جولاہے، معمولی قسم کے سنگتراش وغیرہ۔

قدیم ہندوستان کی صنعت و حرفت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کی تنظیم بہت اعلیٰ پیمانہ کی تھی جس کی نظیر معاصر عہد میں دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔ قدیم ہندوستان میں ایک ادارہ پایا جاتا تھا جسے "شرینی" کہتے تھے۔ یہ ایک قسم کی پنچایت یا بیوپار منڈل ہوتا تھا جس میں ایک ہی پیشہ کرنے والے کاریگر یا فنکار ایک انجمن کی صورت میں منسلک ہو جاتے تھے۔ ہماری یہ شرینی عہد متوسط کے یورپ کی "گلڈ" سے مشابہت رکھتی تھی۔ تقریباً تمام صنعتیں اپنی ایک شرینی یا گلڈ بنا لیتی تھیں اور اپنے اراکین کے مفاد کے تحفظ کے لئے اپنے علیحدہ علیحدہ قواعد وضع کر لیتی تھیں جن کی پابندی منڈل کے تمام اراکین پر واجب اور لازم ہوتی تھی۔ یہ قواعد قانون کا حکم رکھتے تھے۔

"شرینی" یا بیوپار منڈل کا ایک سرپنچ یا پردھان ہوتا تھا جسے "سیٹھی" یا "سرشیٹھی" کہتے تھے۔ سیٹھی عام طور پر ایک اہم مقامی شخصیت ہوتا تھا اس کی امداد کے لئے ایک چھوٹی سی مجلس عاملہ یا کابینہ ہوتی تھی۔ سیٹھی شہر کی حکومت میں بھی دخل رکھتا تھا، اور کبھی کبھی خود بھی عدالت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ عدالت اور انصاف کے معاملہ میں اسے اہم ترین مقام حاصل ہوتا تھا۔

بعض اوقات یہ بیوپار منڈل علم و تمدن کے مرکز کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے۔ کاریگروں کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ یہ منڈل ان کے لئے کام کا تعین بھی کرتے تھے۔ بعض منڈل فوج بھی رکھتے تھے اور اس سبب سے کافی طاقت اور اہمیت حاصل کر لیتے تھے۔ ضرورت کے وقت وہ راجہ کو فوجی امداد بھی بہم پہنچاتے تھے۔ کبھی کبھی منڈل ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جاتے تھے جس سے ان کی طاقت کو بڑا نقصان پہنچ جاتا تھا۔

ان منڈلوں کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ یہ مقامی بنک کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ لوگ اپنی پس انداز رقمیں (اکشانوی) منڈل کے فنڈ میں جمع کر دیتے تھے۔ اس رقم کا سود یا منافع، جمع کرنے والے کی خواہش کے مطابق، ہر سال کسی خاص مقصد پر صرف کیا جاتا تھا۔

سن ۲۰۰ ق م۔ اور ۳۰۰ء کے درمیانی دور کے ایسے بے شمار کتبے دریافت ہوئے ہیں جن سے ان بیوپار منڈلوں کی تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔ آندھرا میں جو کتبے پائے گئے ہیں اُن سے ہمیں اس قسم کے سا تعد بیوپار منڈلوں کا حال معلوم ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیلی، پن چکیاں بنانے والے، کمہار، جولاہے، بانس کا کام کرنے والے، بنیئے اور ٹھٹھیرے، سب اپنی اپنی الگ پنچائتیں رکھتے تھے۔ راجا سودت ایک بڑا دانی راجہ تھا۔ اس نے انہیں پنچائتوں میں سے ایک پنچائت کے فنڈ میں روپیہ جمع کیا تھا۔ اس کا حال ہمیں ناسک میں پائے گئے ایک غار کے کتبے سے معلوم ہوا ہے۔ اس راجہ نے منڈل کے خزانہ میں ...۲۰۰ "کہاپن" جولاہوں کے بیوپار منڈل کے لئے جمع کیا جسے "شرینی کولی کنیا کائے" کہتے تھے۔ اس رقم کا سود یا منافع ایک "پدک"[1] سیکڑا ماہوار مقرر کیا گیا تھا۔ اسی راجہ نے ...۱۰۰ "کہاپن" جولاہوں کے ایک دوسرے منڈل میں جمع کیا۔ اس کا منافع پون "پدک" سیکڑا ماہوار طے ہوا۔ ان کہاپنوں کی واپسی ضروری نہیں تھی البتہ صرف ان کے منافع کو صرف میں لایا جا سکتا تھا، اصل رقم کو نہیں۔ ان عطیات کا اعلان "نگم سبھا" میں کیا جاتا تھا اور پبلک رکارڈ آفس میں ان کو درج کیا جاتا تھا۔

ناسک ہی میں دریافت ہوئے دوسرے کتبوں سے معلوم ہوا ہے کہ وشنودت نامی ایک شاکا عورت (شاکانی) نے ...۱۰۰ "کرشاپن" کمہاروں کے بیوپار منڈل (کلیرک) میں، ...۲۰۰ پن چکیاں بنانے والوں کے بیوپار منڈل (اودیانترک) میں، اور ...۵۰۰ تیلیوں کے بیوپار منڈل (تل پیشک شرینی) میں، سنگھ کے بیمار سادھوؤں کو دوائیں اور آرام و آسائش کا دوسرا سامان فراہم کرنے کے لئے جمع کئے تھے۔

ان بیوپار منڈلوں کو حکومت سے بھی زیادہ مضبوط و مستحکم سمجھا جاتا تھا۔ ان کی اعلیٰ تنظیم، اور ان کے حیرت انگیز کام سے لوگ اس قدر مطمئن تھے کہ بڑی بڑی رقمیں بڑی بے تکلفی کے ساتھ ان میں جمع کر دیتے تھے۔

اس قدر زبردست تجارتی اور صنعتی سرگرمی پتہ دیتی ہے کہ سکہ کا استعمال بھی قدیم ہندوستان کے ابتدائی دور میں شروع ہو چکا تھا۔ ویدک عہد میں لین دین تبادلہ کے ذریعہ ہوا کرتا تھا یعنی اگر ایک شخص کو ترکاری

---

[1] یہ ایک سکہ کا نام تھا جسے "کرشاپن" بھی کہتے تھے۔ [2] سکہ کی سب سے چھوٹی اکائی

[illegible] کے وزن سے پاؤ بھر گیہوں یا آدھ پاؤ جو دینے ہوتے تھے۔ [illegible] طریقہ رفتہ رفتہ متروک ہو گیا اور آہستہ آہستہ اس کی جگہ [illegible] کے ذریعہ ہونے لگا۔ پھر بڑھتی ہوئی تجارتی اور [illegible] سرگرمیوں نے اور سرکاری اور پنچایتی افسروں کو نقد تنخواہ دینے کی ضرورت نے سکے کے باقاعدہ وجود کی طرف رہنمائی کی۔ چنانچہ ہندوستان میں [illegible] قبل مسیح میں ہم ایک نئے سکہ کا ذکر سنتے ہیں جسے "ستان" کہتے تھے۔ اس کا وزن ۱۰۰ "کرشل"[1] کی برابر ہوتا تھا۔ ہیرو ڈوٹس کا بیان کہ ہندوستان میں ایرانی "شترابی" ۳۶۰ طلائی گرد بطور سالانہ خراج کے ادا کرتی تھی، پتہ دیتا ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سکہ کے رواج کی ابتدار ہو چکی تھی اور طلائی گرد یا سونے چاندی کے ٹکڑوں کا استعمال بطور سکہ کے شروع ہو چکا تھا۔

تقریباً اسی زمانہ میں یا اس کے فوراً بعد کے زمانہ میں ہم کو اصلی سکوں کے استعمال کا ثبوت ملتا ہے یعنی دھات کا گڑھا ہوا باقاعدہ سکہ جس کا وزن اور شکل و صورت مقررہ معیار کے مطابق ہوتی تھی۔ یہ سکے یا تو راجہ جاری کرتا تھا یا کوئی خاص سوداگر یا "شریتی"۔ سرکار کا کوئی خاص اجارہ سکہ پر نہیں تھا۔ ان سکوں پر جاری کرنے والے کا "پنچ" یا ٹھپہ ہوتا تھا، اس لئے انھیں "ٹھپہ دار" سکے کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس قسم کے ہزاروں سکے برآمد ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طویل عرصہ تک ان کا استعمال بحیثیت سکہ کے ہوتا رہا۔ ان سکوں پر کوئی نام یا تصویر نہیں ہوتی تھی۔ دراصل ہندوستان میں پہلی بار سکہ چلانے والے جس پر باقاعدہ نام اور تصویر ہوتی تھی، یونانی لوگ تھے۔ یونانیوں کے سکوں پر ایک طرف بادشاہ کا چہرہ ہوتا تھا اور دوسری طرف کسی دیوتا کا چہرہ یا کوئی اور نشان بنایا جاتا تھا۔ ہندوستانی حکمرانوں نے یونانیوں کی دیکھا دیکھی اپنے ملک میں اس قسم کا سکہ رائج کیا۔

ابتدائی سکوں کے وزن کی پہلی اکائی رتی ہوتی تھی جس کا وزن تقریباً ۱۰۸۳ گرین یا ۱۱۸ ملی گرام ہوتا تھا۔ اگرچہ ۸۰ رتی کے طلائی سکہ کا نمونہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے لیکن ۳۲ رتی کے چاندی کے سکے "پران" یا "دھرن" اور ۸۰ رتی کے تانبے کے سکے "کرشاپن" اور اس کی مختلف چھوٹی اکائیاں کثیر تعداد میں دستیاب ہوئی ہیں۔ "ارتھ شاستر" میں چاندی اور تانبے کے سکوں کا ذکر موجود ہے۔ کوٹلیہ نے ۳۲ رتی کے چاندی کے "کرشاپن" کا بھی ذکر کیا ہے۔

کشن راجاؤں نے چاندی کے سکہ کا استعمال بالکل ترک کر دیا اور انھوں نے صرف سونے کے سکے چلائے۔ اس کے برعکس گپت راجاؤں نے شروع شروع میں صرف سونے کے سکے چلائے اور بعد ازاں سونے اور چاندی دونوں کے سکے چلائے۔ گپت راجاؤں کے سکے یونانی سکوں کے معیار کے تو نہیں تھے لیکن صورت شکل کے لحاظ سے بدنما بھی نہیں تھے۔ اسی اثناء میں تانبے کا سکہ بھی چلتا رہا جو نقلی سکہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جنوبی ہند میں سونے اور تانبے کے سکے ایک ساتھ چلتے تھے، اور چاندی کے سکوں کے استعمال سے بھی جنوبی ہند کے لوگ ناواقف نہیں تھے۔ جنوبی ہند میں رومی سکے بھی اس قدر کثیر تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں کہ گمان غالب ہے کہ ہندوستان میں ان رومی مسکوکات کا استعمال دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں بہت مقبول تھا۔

گپت سلطنت کے زوال کے بعد چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آگئیں جنھوں نے اپنے اپنے الگ سکے رائج کئے۔ لیکن ان کے سکے صورت شکل کے اعتبار سے بہت پست درجہ رکھتے تھے۔ نہ ان کے وزن میں یکسانی پائی جاتی تھی نہ نمونہ میں۔

---

[1] کرشل :- یہ ایک بیج کا نام تھا جسے ہم لاکھری کہتے ہیں۔ اسے باٹوں کی سب سے چھوٹی اکائی کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔

تمثیل بردوش فضا — ریڈیو ڈرامہ

عمیق حنفی

ہمارے بعض ناقدوں نے ریڈیو ڈرامے کو ایک مجلسی تمثیل سے بھی کمتر درجے کا ڈرامہ قرار دیا ہے۔ لیکن ریڈیو ڈرامہ ایک زندہ فن ہے اور کم از کم اردو میں اسٹیج ڈرامے سے آگے ہے۔ اردو اسٹیج کی موت کے بعد یہی ایک ڈرامائی میڈیم ہے جس کے ذریعہ زندگی کے رنگا رنگ پہلو اور گوناگوں مسائل اور کش مکش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ویسے فلم اور شوقیہ اسٹیج بھی اس فریضے کو انجام دے رہے ہیں مگر فلم میں تاجرانہ اور تفریحی مقاصد کا غلبہ ہے اور شوقیہ اسٹیج کسی خاص موقع پر اپنے سیٹ سجاتا اور پردے اٹھاتا ہے۔ مستقل ڈرامائی عمل صرف انہیں مقناطیسی برقی لہروں پر قائم اندھے اسٹیج پر جاری رہتا ہے۔

ریڈیو ڈرامہ سب سے پہلے ڈراما ہے۔ تکنیکی اور فنی امتیازات اس کی انفرادیت ضرور قائم کرتے ہیں مگر بنیادی شرائط اور لوازم اس ڈرامے کے بھی وہی ہیں جو اسٹیج ڈرامے کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ کلیٹن ہیملٹن (CLAYTON HAMILTON) نے ڈرامے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "ڈرامہ ایک ایسی کہانی ہے جسے اسٹیج پر سامعین کے سامنے اداکار پیش کریں" اس تعریف میں کہانی، اسٹیج، سامعین اور اداکار ترکیبی عناصر مانے گئے ہیں۔ ریڈیو ڈرامے میں بھی کہانی ہوتی ہے، جسے اداکار پیش کرتے ہیں مگر اسٹیج مفروضہ ہوتا ہے ہر چند کہ اس کی وسعت آفاقی اور کائناتی ہوتی ہے اور سامعین سامنے نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ اداکاری صداکاری کی صورت میں ہوتی ہے۔

فنون لطیفہ کے ہفت ستونی نظریے کے مجوز جان ڈالمین (JOHN DOLMAN) کے مطابق کسی بھی تخلیق کو فن کا روپ اسی وقت دیا جا سکتا ہے جبکہ اس کی بنیاد ان سات صفات پر ہو۔ (۱) وحدت یعنی وحدت مقصد و تاثر (۲) زور یعنی اہم ترین عناصر کا امتیاز، اہم بات کی غیر اہم باتوں سے علاحدگی (۳) لے یعنی روانی کا دلچسپ آہنگ (۴) توازن یعنی آرائش و تزئین کا آہنگ (۵) تناسب یعنی مقصد اور اظہار، اجمال و تفصیل، کہانی اور پلاٹ کا فنی طور پر ہم وزن ہونا (۶) تطابق یعنی تخلیق کے مختلف مدارج کا ہم آہنگ ہونا اور (۷) فطری سادگی اور سہولت یعنی اظہار و ابلاغ اور تفہیم و پسندیدگی میں آسانی۔ ریڈیو ڈرامے میں یہ تمام عناصر ہوتے ہیں اور تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان عناصر کا ہونا ضروری ہے اس لئے اسے فنون لطیفہ کے دائرے سے کوئی خارج نہیں کر سکتا۔

ایک اور مغربی ماہر تمثیل جوزف مرسانڈ (JOSEPH MERSAND) نے لکھا ہے کہ ڈرامے میں ان خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:-

(۱) زمان و مکان کے لحاظ سے آفاقی کشش (Appeal)

(۲) اطمینان بخش حالات میں زندہ کرداروں کی تخلیق۔

(۳) چونکانے، دل دہلانے، معلومات میں اضافہ کرنے یا تبدیل (Transform) کرنے کی صلاحیت۔

(۴) حسین اور مناسب زبان میں اظہار خیال و مقصد۔

(۵) تفسیر حیات بیان کرنے اور زندگی کے مسائل سے الجھنے اور ان کا مقابلہ کرنے میں ہمارے ہاتھ مضبوط کرنے کی صلاحیت۔ ان شرائط کی نوعیت ہیئتی نہیں بلکہ موضوعی ہے۔ اس لئے ریڈیو ڈرامے پر ان کا اطلاق بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

مناکوی کا لیداس نے "ناٹک" کو کئی بہترین ڈرامے کو عوامی کردار پر تبصرہ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ناٹک میں زندگی کے رنگا رنگ پہلو، لوک بحیثیت ورتن، مختلف رشتوں کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔ ان اس

[illegible] اور کیفیت کا نام ہے جو کسی مستقل اور مرکزی جذبے اور متعلقہ ضمنی جذبات کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ ان جذبات کا اظہار قول و عمل، گفتار و حرکات جسم یا ان میں سے کسی ایک طریقے سے کیا جا سکتا ہو۔ بہرحال ریڈیو ڈرامے کو ایک صنف فن و ادب تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کیونکہ بصارت کے بغیر بھی اس میں اتنی بصیرت ہو کہ زندگی اور اس کی ہر قسمی کشمکش کا احاطہ کر سکے اور اس کی تفسیر، تشریح اور وضاحت کر سکے۔ محض جدید ہونے کی بنا پر اسے اپنے قدیم پیش رو یعنی اسٹیج ڈرامے سے کمتر درجے کی چیز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا اپنا رنگ روپ ہے، اپنا مزاج ہے، اپنی تیکنک ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسے سائنس اور ثقافت کی رفاقت باہمی کی ایک اچھی مثال کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسٹیج ڈرامے اداکاروں کو مجسم سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ پردوں اور سیٹس (sets) کی مدد سے تین سمتوں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ حرکات و اشارات بدن سے خاموشی کو زبان بخش دیتے ہیں۔ عمل و حرکت کے ذریعہ مختلف کرداروں کی تخلیق و تجسیم کرتے ہیں اور جنت نگاہ و فردوس گوش دونوں بن جاتے ہیں جب کہ ریڈیو ڈرامے زیادہ سے زیادہ آوازوں کی جنت پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن خواہ آپ ڈرامہ سن رہے ہوں، خواہ دیکھ رہے ہوں، قوت متخیلہ بہر صورت ضروری ہے۔

آپ مجھے دیوانہ قرار نہ دیں اگر میں کہوں کہ ہندوستان کا عظیم ترین رزمیہ مہابھارت بڑا ڈرامائی رزمیہ ہے اور اس کی نوعیت ریڈیائی ہے کیونکہ وہ سنایا جا رہا ہو اور یہ سنانے والے کی صلاحیت کی خوبی ہو کہ وہ اسے اس طرح سنا رہا ہے کہ نابینا سننے والے کو اس کی لطیف سے لطیف باریکی بھی نظر آ رہی ہے۔ ریڈیو ڈرامے میں ایسے ہی اشارات ہوتے ہیں اور ایسی ہی صوتی علامتیں ہوتی ہیں جو سماعت پر جادو کر کے پردۂ تخیل پر مختلف مناظر منعکس کر سکتی ہیں۔ بعض آوازوں کی نوعیت اور ساخت اور لب و لہجے سے مخصوص کرداروں کی تجسیم اور شناخت ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ہمدردی، محبت، نفرت، اور اسی قسم کے دوسرے رشتے قائم ہو سکتے ہیں۔ ریڈیو ڈرامے کے امکانات میں یہ بھی ہے کہ اس میں ایسے حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں جنھیں انتہائی لطیف، نازک، باریک مقامات کی سیر کی جا سکے۔ مائکروفون کے ذریعہ آپ انسان کے دل و ذہن اور روح کی گہرائیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ زمان و مکاں کی حدیں توڑ سکتے ہیں۔ بہ یک وقت مختلف مقامات اور مختلف زمانوں کی سیاحت کر سکتے ہیں۔ غیر فطری خطیبانہ اور مصنوعی زبان و لب و لہجہ کے بجائے سانسوں سے ہم آہنگ، دھڑکنوں سے ہم آواز سرگوشیاں اور دل سے ہم کلامی کی زبان سن کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ الفاظ، اصوات اور جذبات کا اتنا حسین امتزاج اور اتنی لطیف آمیزش اسٹیج پر بھی ریکارڈنگ اور مائکروفون کے ذریعے ہی پیش کی جا سکتی ہے اور یہ تیکنک ریڈیو کی اپنی تیکنک ہے۔

اسٹیج پر اور فلیش بیک تیکنک کا استعمال بیحد مشکل ہو۔ آپ کسی مقصد تک پہنچنے کے لئے بہ یک وقت کتنے ذرائع استعمال کر سکتے ہیں؟ ریڈیو ڈرامے میں ایک ہی بات کو اجاگر کرنے یا اس پر مختلف پہلوؤں اور سمتوں سے روشنی ڈالنے کے لئے کئی مختلف چھوٹے چھوٹے مکالمے یا صوتی اثرات کا استعمال کیا جا سکتا ہو۔ پھر کسی کردار یا راوی کے ذہن سے کسی پرانے واقعہ کو ماضی سے نکال کر حال بنا دینے کی فلیش بیک تیکنک اسٹیج پر کام نہیں آتی حالانکہ یہ بیحد دلچسپ پر کشش اور مفید تیکنک ہو۔ اسی طرح فنتاشیہ کی پیش کش ریڈیو پر تو اصلیت کا دلکش فریب پیدا کرتی ہو مگر اکثر اوقات اسٹیج پر مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔

اسٹیج ڈرامے کے لئے ضروری ہو کہ ڈرامہ وہیں سے شروع ہو جہاں سے کہانی شروع ہوتی ہے۔ یا جہاں سے ڈرامہ شروع ہو اس سے پہلے کی کہانی اشارات سے سمجھ لی جائے۔ یہ بیانیہ طرز ہے۔ ریڈیو ڈرامہ اگرچہ چابکدستی سے لکھا جائے اور پیش کیا جائے تو ڈرامے میں کہانی کے واقعات کی ترتیب کا خیال رکھنا ضروری نہیں۔ ڈرامہ کہانی کے اختتام سے بھی شروع کیا جا سکتا ہو اور درمیان کے کسی حصے سے بھی۔ اگر ضروری ہو تو کہانی کا پس منظر کسی موقعے پر ڈرامائی صورت میں ہی فلیش بیک کیا جا سکتا ہے۔

اسٹیج اور ریڈیو ڈرامے کا موازنہ اور پھیلایا جا سکتا ہے۔ اسٹیج ڈرامے کے اپنے فوائد اور اپنے اقدار ہیں۔ اس کی اپنی تاریخی اور ثقافتی اہمیت ہو اور اس کے اور ریڈیو ڈرامے کے راستے متوازی ہیں۔ اس لئے اس بحث کو یہیں ختم کرنے کے بعد ریڈیو ڈرامے کے تخلیقی عوامل اور مدارج پر غور کرنا چاہیئے۔ ریڈیو ڈرامے کی کئی قسمیں ہیں۔ خالص ڈرامہ، فنتاشیہ، منظوم ڈرامہ،

رُوپک، سنگیت رُوپک، دستاویزی روپک، اسکٹ، تمثیلچہ، رنگا رنگ ترنگ، وغیرہ۔ خالص ڈرامے سے مراد ایسا ریڈیو ڈرامہ ہے جس میں کوئی مفروضہ قصہ، کردار یا حالات ڈرامائی لوازمات کے ساتھ پیش ہوں یا کسی واقعے کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ موضوع کے اعتبار سے ان میں سماجی، نفسیاتی اور تاریخی ڈرامے آجاتے ہیں۔ ڈرامے کے لئے کم از کم آدھ گھنٹے کا عرصہ ضروری ہے۔ کش مکش، ارتقا، نقطۂ عروج وغیرہ کے اصول وہی ہیں جو اسٹیج ڈرامے کے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ریڈیو ڈرامے کے لئے وحدتِ زمان و مکاں کی قید لازمی نہیں، وحدتِ تاثر کافی ہے۔

فنتاشیہ میں غیر واقعی اور ماورائے فطرت و عادت حالات اور کردار ہوتے ہیں۔ قوتِ متخیلہ انھیں واقعی بنا دیتی ہے۔

منظوم ڈرامے اکثر رومانی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ عشق و محبت کے معاملات یا فکری، فلسفیانہ موضوعات پر منظوم ڈرامے اچھے لکھے جاسکتے ہیں۔ ڈوبے ہوئے لہجے کی لے جذبات کی گہرائی تک لے جاتی ہے اور موزونیت کی وجہ سے ایک شاعرانہ فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ منظوم ڈرامے مختلف بحروں میں ہوتے ہیں یا آزاد نظم کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

سنگیت روپک میں کہانی، شاعری اور موسیقی یکجا ہو جاتی ہیں۔ مختلف دھنوں اور تالوں کا استعمال ہوتا ہے۔ الگ الگ گیتوں اور کہانی کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑنے اور ان میں رابطہ پیدا کرنے کے لئے راویوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

اسکٹ بہت چھوٹے ڈرامے کو کہتے ہیں۔ اس کی نوعیت اکثر مزاحیہ ہوتی ہے۔ تمثیلچے کے لئے مزاحیہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ ترنگ میں ورائٹی ہوتی ہے۔ (Revue) کی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔ اکثر انمل اور بے جوڑ قصوں میں راویوں کے ذریعے مزاحیہ رابطہ پیدا کر دیا جاتا ہے یا پھر الفاظ کا کھیل ہوتا ہے یا بات سے بات پیدا کی جاتی ہے اس کے لئے مقصدیت کو ضمنی اور تفریح کو اولی شرط مانا جاتا ہے۔

روپک اور ڈرامے میں فرق ہے۔ ڈرامہ ادبی صنف ہے اور روپک صحافتی۔ روپک کسی واقعے یا کسی حقیقت کے آس پاس لکھا جاتا ہے اور ڈرامے کی بنیاد کسی افسانے یا داستان پر ہوتی ہے۔ روپک میں مواد اور ڈرامے میں صورت کی افضلیت ہے۔ روپک واقعیت کو مستحسن سمجھتا ہے اور ڈرامہ تخیل کو۔ روپک کے ذریعہ واقعاتی تفریح ہوتی ہے اور ڈرامے کے ذریعے جذباتی اور خیالی۔ دستاویزی روپک میں کسی ادارے یا تعمیری تحریک یا کسی اور عملی تعلیمی سرگرمی کو ڈرامائی انداز سے یعنی موثر زبان و بیان، مکالمے اور صوتی تصاویر کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عام روپک سے بھی زیادہ صحافتی قسم کی چیز ہوتی ہے۔

ریڈیو ڈرامے کے لوازمات اسٹیج ڈرامے سے مختلف ہیں۔ سب سے پہلے ریڈیو ڈرامے کے لئے اسٹوڈیو کا ہونا ضروری ہے جس میں جدید قسم کے مائکروفون، ریکارڈ بجانے کی مشینیں، بازگشت پیدا کرنے کے وسائل وغیرہ ہوں۔

ریڈیو ڈرامے کا میڈیم ہے آواز۔ یہ آواز انسانی بھی ہوتی ہے اور الفاظ پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری آوازیں بھی ہوتی ہیں مثلاً موسیقی، پس منظر پیدا کرنے والی مختلف جاندار اور بے جان آوازیں۔ کرداروں کی آوازیں، ان کے مزاج، ان کی عادتیں، ان کی عمر اور ان کی سماجی، نفسیاتی اور معاشرتی ساخت پیدا کرتی ہیں۔ انھیں آوازوں کی ترتیب، توازن، ہم آہنگی، زیر و بم، پیچ و خم اور سوز و ساز سے ریڈیو ڈرامے کا تاثر قائم ہوتا ہے۔

ریڈیو ڈرامے کا مسودہ خاص احتیاط سے تیار کیا جانا چاہیئے کیونکہ دراصل یہ مسودہ ہی وہ بنیاد اور وہ ڈھانچہ تیار کرتا ہے جس پر ریڈیو ڈرامے کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ موضوع کا انتخاب، ڈرامے کے متعلق مواد اور ان کی ترتیب، پلاٹ، ارتقاء (TREATMENT) اور دیگر فنی اور تکنیکی پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کے بعد ہی یہ مسودہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس مسودے کی کہانی اور مقصد کو اجاگر کرنا اور مسودے کی تعبیر و تفسیر پروڈیوسر اور صداکاروں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لئے مسودہ بہت واضح ہونا چاہیئے۔ ریڈیو ڈرامہ نگار جب اپنا مسودہ تیار کرتا ہے تو اسے اپنے آپ کو سامع تصور کرنا پڑتا ہے، ناظر نہیں۔ اسے ذہن میں رکھنا پڑتا ہے کہ جو کہانی وہ لکھ رہا ہے اسے سننا اور سنانا ہے دیکھنا اور دکھانا نہیں ہے۔ اس لئے ضروری ہے جن باتوں اور جن نکتوں کو دیکھ کر زیادہ اچھی طرح پسند کیا جا سکتا ہے انھیں ریڈیو ڈرامے سے حتی الامکان دور رکھا جائے۔ خاص طور پر نقطۂ عروج تک لے جانے والے اعمال کی صوتی اہمیت پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ بعض وقت مکالمے اور صوتی تاثرات (SOUND EFFECTS) اور موسیقی کے ذریعے ڈرامے کے منظریہ حصے متصور کئے جا سکتے ہیں مگر ایسے حصوں کی بنیادی یا مرکزی حیثیت اور اہمیت نہیں ہوتی۔ اردو کے ایک جلیل القدر فاضل نقاد

ریڈیو ڈرامے کو باقاعدہ اسپے عمل کرداروں کا ڈراما قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں ریڈیو ڈراما مثبت اور باعمل کردار پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا میرا خیال ہے کہ فاضل ناقد کی یہ رائے غلط ہے۔ اسٹیج ڈرامے کے کردار کا عمل ریڈیو ڈرامے کے کردار سے مختلف ہوتا ہے۔ ریڈیو ڈرامے کے کردار کی کشمکش اور عمل کا اظہار مکالموں سے مکالموں کی بین السطور فضا سے ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے۔ ریڈیو ڈرامے میں چابکدست پروڈیوسروں اور مصنفوں کے کمال فن نے بڑے کردار اور بے لفظ آوازوں سے بھی کامیاب تاثر پیدا کیا جا چکا ہے۔

ریڈیو ڈرامے کے مکالمے زندگی کی زبان میں ہوتے ہیں اور ہونا بھی یہی چاہیئے۔ چھوٹے چھوٹے غیر رسمی نیچرل سادہ مکالمے بامحاورہ زبان میں لکھے جائیں اور کرداروں کی طبقاتی سماجی اور شعوری سطح کو ملحوظِ خاطر رکھیں تو ریڈیو ڈرامے اپنے مقصد میں شاندار کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان مکالموں کے تیور تحریری اور تقریری نہیں بلکہ گفتگو کے ہوں۔ الفاظ کی نشست و برخاست کچھ اس طرح کی ہو کہ جذبات اور کیفیات کے اظہار کے لئے بین الالفاظ کافی گنجائش باقی رہے۔ فضول سے مکالموں سے وقت ضائع ہوتا ہے اور سامع کو بوریت ہوتی ہے۔ اسی طرح صوتی اثرات کی بہتات بھی بار گزرتی ہے۔ صوتی اثرات اور پس منظری موسیقی کا استعمال محض آرائشی نہیں ہونا چاہیئے۔ ان کا مقصد تشریحی، توضیحی اور معنویانہ ہونا چاہیئے۔ اچھا پروڈیوسر صوتی اثرات اور موسیقی سے بڑا کام لے سکتا ہے۔ بعض اوقات صوتی اثرات اور موسیقی ان بولنے مکالموں کا کام کرتی ہے۔ مسودہ نگار کو ان تمام باتوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ڈرامے میں مختلف النوع آوازوں سے کرداروں کی شناخت اور ان کے مزاج کے امتیاز میں سہولت ہوتی ہے۔ آواز کی نوعیت، لہجہ اور مکالمے ہی سے تو کردار قائم ہوتا ہے۔

ریڈیو ڈرامے کا پروڈکشن سب سے اہم عمل ہے۔ پروڈیوسر پر ہی مسودے کی تعبیر کا دارومدار رہتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے مسودے کی گہرائی تک پہنچنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی آوازوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ مشق شروع کرنے سے پہلے ساؤنڈ ایفکٹس میں اور انجینئروں سے ڈرامے کے تکنیکی پہلوؤں پر تبادلۂ خیالات کر لینا اور پروڈکشن کا پلان تیار کر لینا بہتر ہوتا ہے۔ صداکاروں کو اس بات کی تاکید کرنا ہوتی ہے کہ وہ اپنی آوازوں کے اعتبار سے مائکروفون سے فاصلے قایم کریں۔ ریڈیو ڈرامے میں مائکروفون بھی بڑا اہم حصہ دار ہوتا ہے اور کسی فنکار سے کم حساس نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کا پرخلوص تعاون انتہائی ضروری ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب کہ صداکار مائکروفون سے مناسب اور موزوں فاصلہ قائم رکھیں۔

غرض ریڈیو ڈرامہ کے امکانات کی حدیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور اس میں بہت کچھ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

"ہے سالگرہ آج ..."

جمال انصاری

(پنڈت جواہر لال نہرو کی سترویں سالگرہ کے موقع پر جو ۱۴ نومبر کو منائی جا رہی ہے)

تخئیل ہیں کب تک یونہی آوارہ پھریں گی
مستقبل نادیدہ کی بے نام ادائیں
ٹوٹے ہوئے سازوں سے ابھرتی ہیں ابھی تک
کتنے ہی نہ گائے ہوئے گیتوں کی صدائیں
جاتے ہوئے لمحو ابھی کچھ دیر ٹھہر جاؤ
جو دل میں ہے اپنے کہیں ہم بھول نہ جائیں
پیغام بہاروں کا صبا لائی ہے پھر آج
شاخوں کو خبر کر دو گل تازہ کھلائیں

تقدیر بدلنا ہے ہمیں سارے جہاں کی
ہے سالگرہ آج جواہر سے جواں کی

ماؤں سے کہو جا کے مبارک انھیں یہ دن
سنسار کو ممتا کے اجالوں سے بسائیں
بہنوں سے ذرا جا کے یہ سسرال میں کہہ دو
بھائی کے لئے ہار تو کچھ گوندھ کے لائیں
رہ جائے نہ دیکھو کہیں پنگھٹ کوئی سونا
سکھیوں سے کہو مل کے مدھر گیت سنائیں
بھارت کا کوئی ویر شکایت نہ کرے پھر
اس طرح خبر کر دو کہ سب جھومتے آئیں

تقدیر بدلنا ہو ہمیں سارے جہاں کی
ہے سالگرہ آج جواہر سے جواں کی

تخصیص نہ باقی رہے کچھ شاہ و گدا کی
سب تاج محل اپنی محبت کا بنائیں
موجیں ہیں کہاں سوئی ہوئی گنگ و جمن کی
ساحل پہ تمناؤں کے بہتی ہوئی آئیں
ان چوٹیوں سے جا کے ہمالہ کی یہ کہہ دو
سر فخر سے جتنا بھی اٹھانا ہو اٹھائیں
وسعت میں نہیں چرخ سے کچھ دامن دل کم
کہہ دو مہ و انجم سے زمیں پر اتر آئیں

تقدیر بدلنا ہے ہمیں سارے جہاں کی ہے سالگرہ آج جواہر سے جواں کی

کلکتہ ۹ نومبر ۱۹۵۹ء

کلکتہ

مرزا رحیم الدین حیاؔ دہلوی

از عزیز دارابی

پیدائش سنہ ١٢١٢ھ۔ رحلت سنہ ١٣٠۴ھ عمر تقریباً ٩٢ سال۔
مقام پیدائش لال قلعہ۔ دہلی۔ مقام رحلت۔ رام پور۔

حیاؔ کے والد کا نام مرزا کریم الدین اور تخلص رسا تھا۔ رسا شاہ عالم ثانی کے پڑپوتے تھے اور ان کا نکاح بہادر شاہ ظفر کی رشتہ کی بہن سے ہوا تھا۔ اس لحاظ سے مرزا رحیم الدین آخری مغل شہنشاہ کے بھانجے ہوتے تھے۔ "صاحب عالم" لقب تھا۔

لال قلعہ میں "صاحب عالم" قسم کے بچوں کی تعلیم کا نظام زیادہ شتر واد تھا۔ شہنشاہیت کو گھن لگ چکا تھا۔ ملک کے حالات بدل رہے تھے اور اب آخر میں بابر و ہمایوں کی جگہ پر بیٹھنے والے سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کا یہ عالم تھا کہ لال قلعہ میں بھی نظم و نسق، ریزیڈنٹ کے اشارۂ چشم و ابرو کا منتظر رہتا تھا اور لال قلعہ سے باہر تو بادشاہ کا نام تبرک کے طور پر پیا انگریز کے سر پہ آتی ہوئی تلوار کی سپر کے طور پر لیا جاتا تھا یعنی حکم بادشاہ کا اور ملک کے الفاظ انگریز کی ڈپلومیسی کی زبان سے نکلے ہوئے۔ بھلا انگریز کیوں چاہتا کہ لال قلعہ کی نسلیں سچے علم کے زیور سے مزین ہوں۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ ہر "صاحب عالم" قسم کا بچہ جوانی تک پہنچتے پہنچتے بٹیر باز ہو یا مرغ باز، افیون کھائے یا چرس پئے اور انگریز کو رب الارباب جان کر اس کی تقسیم کی ہوئی چاندی کی چند ٹکیوں کو من و سلویٰ جانے۔ مرزا رحیم الدین حیاؔ اسی فضا میں پروان چڑھے اور حق یہ ہے کہ وہ اس فضا کے ایک شہرت یافتہ نمائندے کی حیثیت سے اپنی موت کے بعد بھی ہماری نگاہوں کے سامنے پورے طمطراق کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی تعلیم کے متعلق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے تھے اور ان کے دیوان کو دیکھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم عروض اور علم قافیہ سے واقف تھے۔

اس میں شک نہیں کہ لال قلعہ کے بچوں کے اخلاق بُرے نہیں تھے۔ لہٰذا حیاؔ خلیق اور وضع کے پابند قسم کے لوگوں میں تھے۔ جس سے غشن گھٹی زندگی بھر گھٹنی رہی اور جس سے چھٹی آخری سانس تک چھٹی۔ لال قلعہ کی آخری نسل علی العموم سیاہ فام، اکہرے جسم اور چھوٹے قد کی تھی۔ کچھ داڑھیاں رکھنے والے، کچھ منڈانے والے۔ لباس ان لوگوں کا علی العموم سفید انگرکھا، سفید پاجامہ اور دہلی کی چوگوشیہ ٹوپی ہوا کرتا تھا۔ اچھا کھانا اور صاف کپڑے پہننا بھی اس خاندان کا شیوہ رہا ہے۔ یہ سب باتیں حیاؔ میں پائی جاتی تھیں۔ البتہ رام پور آکر وہ اچکن بھی پہننے لگے تھے۔ افیون کا شوق اپنے ساتھ دہلی سے رام پور لائے تھے اور اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گئے۔

حیاؔ کو شاعری سے زیادہ شطرنج کا شوق تھا۔ ابتدا دہلی میں حکیم شرافت علی خاں کی شاگردی سے کی اور انتہا حکیم مومن خاں کی شاگردی پر ہوئی۔ چناں چہ دہلی کے ایک یادگار مشاعرہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے حکیم مومن خاں کی محفل کا ذکر کرتے ہوئے یوں تخیل آرائی کی ہے:۔

> "جب ہم پہنچے تو وہ (حکیم مومن خاں) صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیاؔ سے کہہ رہے تھے کہ صاحب عالم تمہارے شطرنج کے نقشوں نے مرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہو دو ہوں آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے۔ صاحب عالم نے کہا۔ استاد کیا کروں ریزیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے حل کرنے کے لئے شطرنج کے نقشے آیا کرتے ہیں کچھ تو میں خود حل کر کے ان کے پاس بھیج دیتا ہوں، جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں۔"

لکھنؤ میں بچوں کی دلچسپیوں کا ایک مرکز

بنارسی باغ، لکھنؤ کا زُو (جانوروں کا عجائب خانہ) میں ہر طرح کے جانور پائے جاتے ہیں اور بڑے چھوٹے سبھی کو ایک مرتبہ وہاں جانے کا اشتیاق رہتا ہے۔ بچوں کے لئے تو یہ عجائب خانہ ایک طرح سے سب بڑا تفریحی ذریعہ ہے۔ ان کی اس تفریح میں اضافہ کرنے کے لئے ایک بچوں کا پارک بھی وہیں بنوا دیا گیا ہے۔ بچے عجائب خانہ آتے ہیں تو جانوروں سے بھی دل بہلاتے ہیں اور پارک میں بھی کھیلتے ہیں۔ ان تصویروں میں بچے لکھنؤ کے عجائب خانہ میں تفریح کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔

مرزا رحیم الدین حیا کی شطرنج کا دوسرا عبرت ناک واقعہ وہ ہے جو رام پور کی مصاحب منزل میں ان پر گزرا۔ مصاحب منزل قلعہ رام پور کی ایک مخصوص عمارت کا نام تھا۔ دستور یہ تھا کہ چار بجے سہ پہر کو تمام درباری اس میں جمع ہو جاتے اور رئیس وقت جسے یاد کرتا "ہرکارہ" اُسے نشست گاہ سرکاری میں لے جاتا۔ جو نہ یاد کئے جاتے وہ مصاحب منزل میں اپنے اپنے شغل کرتے رہتے — یہ نواب کلب علی خاں کے عہد کا واقعہ ہے ایک دن مرزا رحیم الدین حیا مصاحب منزل میں کسی سے شطرنج کھیل رہے تھے۔ اسی وقت مولوی عبد الحق خیرآبادی (مشہور منطقی) بھی تشریف لے آئے اور حیا کے حریف کو چال بتانے لگے۔ ایک دو چال تک تو حیا نے ادباً صبر کیا۔ پھر ان سے کہنے لگے کہ مولانا یہ منطق نہیں شطرنج ہے۔ مولوی صاحب کی نازک مزاجی تو مشہور رہی ہے۔ فوراً بساط اُلٹ دی اور دوبارہ مہرے جما کر کہا کہ آئیے صاحب عالم۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے تین بازیں مرزا رحیم الدین حیا کو دیں اور تیسری مات دے کر اٹھتے ہوئے بولے کہ صاحب عالم ہم شطرنج بھی کھیلتے ہیں تو وہ فلسفہ اور منطق ہو جاتی ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ مرزا رحیم الدین اپنے عہد میں شطرنج کے اُستاد اور اس کھیل کے خصوصی ماہر تھے۔

شاعری میں حیا شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور اس اسکول کے اعلیٰ نمائندے تھے۔ ان کا ایک دیوان باہتمام سید امیر علی مطبع الہدایت نور مشرقی دہلی سے شائع ہوا ہے جس کی تاریخ اشاعت ۲۲ شوال ۱۲۸۰ھ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دیوان ان کے ابتدائی کلام پر مشتمل ہے۔ سنا ہے کہ ان کا باقی کلام ان کے بیٹوں میں وراثتاً تقسیم ہو گیا اور جس کے ہاتھ آیا اس نے اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھا۔ یہ بات سنی گئی ہے کہ رام پور میں مرزا رحیم الدین حیا، استاد داغ کے مقابلے میں داد حاصل کرتے رہے لیکن اب وہ مجموعہ ہی نظر کے سامنے نہیں جو رام پور کے مشاعروں کی ہم طرح غزلوں کو سامنے رکھ کر کوئی موثق محاکمہ کیا جا سکے۔

موجودہ دیوان پر مرزا غالب نے فارسی میں تقریظ بھی لکھی ہے جو اسی دیوان کے آخر میں چھپ گئی ہے۔ صاحب خمخانۂ جاوید نے لکھا ہے کہ دو دیوان اور ایک واسوخت حیا نے اپنی یادگار چھوڑے مگر ہمارے سامنے وہی ایک ہی دیوان ہے جو طبع ہو چکا ہے۔ دوسرے دیوان کے متعلق صحیح روایت اوپر کی سطروں میں لکھی جا چکی ہے۔ واسوخت بھی یقیناً کسی بدنصیب کے ہاتھ پڑ کر پامال ہو چکا اور غاصبانہ قبضہ کرنے والا بدنصیب یوں رہا کہ وہ بھی اس کی ادبی حیثیت سے اپنے لئے کچھ نہ کما سکا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" میں حیا کی شاعری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں بھی پیش کر دیا جائے۔

"بڑے خوش مزاج، نیک فطرت، بدیہہ گو اور ظریف آدمی ہیں۔ ۳۵، ۳۶ برس کی عمر ہے۔ اکثر بنارس میں رہتے ہیں۔ کبھی دہلی چلے آتے ہیں۔ شکل تو بالکل شہزادوں کی ہے مگر داڑھی منڈی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا ہے۔ ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شاعر بھی اچھے ہیں مگر محنت نہیں کرتے۔ زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔" (ف۔)

"یادگار مشاعرہ" میں جو غزل دی گئی ہے اس کا مقطع انتخاب کے لائق ہے یعنی سے

تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ   آج اس کی کچھ اور حالت ہے

مطبوعہ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیا کو بھی اپنے استاد شاہ نصیر کے تتبع میں مشکل زمینوں میں شعر کہنے کی عادت تھی اور وہ بھی اسے استادی کی شان سمجھتے تھے مثلاً "پاپوش میں دریا" وغیرہ۔

مرزا رحیم الدین حیا ۱۸۵۶ء میں رام پور آ گئے۔ یہ عہد نواب یوسف علی خاں ناظم کا تھا جو ۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۵ء تک جاری رہا ہے۔ حیا کے رام پور آنے کا منظر اس سے ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ جو شیر خوار اولادیں تھیں ان میں ان کی بیٹی "محمدی بیگم" صرف گیارہ دن کی تھیں۔ حیا "شہر آفریں" قسم کے لوگوں میں تھے انھوں نے سات نکاح کیے بعد کو کئے اور بکثرت اولادیں اپنی یادگار چھوڑیں جو دہلی، رام پور، بھوپال اور حیدرآباد میں بسیں اور جن کا مفصل حال آج بہت کم معلوم ہے۔ رام پور میں حیا کو چونکہ خاندان صاحبزادہ سید حیدر علی خاں کے مکان کے متصل رہتے تھے ظاہر ہے کہ حیا جیسے کثیر العیال شاعر کا گزارہ [illegible] کا قلیل تنخواہ میں کیوں کر ہو سکتا تھا اس لئے نواب یوسف علی خاں نے ازراہ قدر دانی خاص ان کے لئے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ ان کی کم عمر اولادوں کو [illegible] اور رام پور

ان کی ہجوادا ۱۸۰۵ء کے بعد پیدا ہو، یوم پیدائش سے سن شعور تک ہر نئی ولادت پر یہ وظیفہ جاری ہو۔ اس طرح حیاؔ کی گزر بہ آسانی ہوتی رہی۔ یہ صورت خصوصی طور پر حیاؔ کے لئے اختیار کی گئی کہ ان کی ذاتی تنخواہ بڑھانے میں دوسرے معاصرین کی ناگواری کا اندیشہ تھا اور نواب یوسف علی خاں کسی کو شکایت کا موقع دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس طرح حیاؔ کی عیال داری بھی نبھ گئی اور کسی کو شکایت کی گنجائش بھی نہیں رہی۔

نواب یوسف علی خاں کے چھوٹے فرزند صاحبزادہ محمود علی خاں سے حیاؔ میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس قدر کہ ۵۔ رجب ۱۳۰۴ھ مطابق ۳۱ مارچ ۱۸۸۷ء کو جب حیاؔ کا انتقال ہوا تو صاحبزادہ محمود علی خاں نے انھیں اپنی کوٹھی واقع نواب دروازہ کے لان میں دفن کرایا۔ اس کوٹھی میں اب رام پور کا صدر اسپتال ہے۔ لیکن حیاؔ کی قبر کا نشان بتانے والا اب ان کے خاندان میں کوئی باقی نہیں۔ محمد رضا خاں، ریٹائرڈ سب انسپکٹر جنھوں نے مجھے یہ حالات بتائے وہ بھی حیاؔ کی قبر کا صحیح مقام نہ بتا سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا رحیم الدین حیاؔ مذہباً اہل سنت والجماعت تھے لیکن رواداری قسم کے آدمی تھے اور یہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

اصحاب چار یار کا مداح ہوں حیاؔ — ہے مجھ پہ سایہ پنجتن پاک ذات کا

مرزا رحیم الدین حیاؔ کی شاعری میں کئی رنگ پائے جاتے ہیں۔ ایک رنگ تو وہ ہے جسے آج کے دور میں حسرت موہانی کی ہلکی پھلکی شاعری کہتے ہیں۔ حیاؔ کے یہاں اس قسم کی شاعری کے زیادہ نادر نمونے نہ سہی مگر اچھے نمونے ضرور ملتے ہیں ؎

رفتہ رفتہ عدم کو پہنچیں گے — سب مسافر ہیں ایک منزل کے

نگاہِ وفا کا کسے اعتبار — جسے تم نے دیکھا اُدھر ہو گئی

ہمسایہ ور و دیوار کا دشمن ہے ہمارا — اس پر بھی گلی میں تری مسکن ہو ہمارا

طوافِ کعبہ کا ہم کو ثواب خاک ہوا — قدم قدم پہ خیالِ خمِ شراب آیا

عدو کے ہاتھ سے پینے لگے ہیں وہ اب تو — حرام موت بھی مرنا ہمیں حلال ہوا

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ حیاؔ کی ہلکی پھلکی شاعری میں ان کے شعر کے استاد حکیم مومن خاں کے فیوض لاانتہاہی کی جھلکیاں موجود ہیں اور اپنی ہلکی پھلکی شاعری میں بھی وہ بات پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ان کا دوسرا رنگ نفسیات کی ہلکی سی جھلک لئے ہوئے ہے ؎

سچ تو یوں ہے کہ نہیں ضعف سے چلنا اتنا — اک قدم آئے تو گویا کئی منزل آئے

اور کون نہیں جانتا کہ اس شعر میں ہر بیمار اور ناتوان شخص کے چلنے کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے ؎

انبساط کو لا کہ طرح کے ہوں عیش لئے حیاؔ — پھر دیکھئے تو شاکی تقدیر دیکھئے

حیاؔ کے اس رنگ کے بعد اُن کے یہاں کچھ تو ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جو شاہ نصیر کے اسکول اور اس زمانہ کی عام شاعرانہ فضا کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان میں حیاؔ کی کوئی انفرادیت محسوس نہیں ہوتی اور اس قسم کے اشعار اس زمانہ کے ہر شاعر کے کلام میں موجود ہیں۔ ان اشعار کو نظر انداز کر دینے کے بعد حیاؔ کی شاعری کا رنگ مندرجہ ذیل انتخاب سے واضح کیا جا سکتا ہے ؎

اُلٹی چھری سے ایک تو کاٹا مرا گلا — تڑپا جو میں تو اور وہ اُلٹے خفا ہوئے

لبوں پہ جان ہے۔ اس پہ یہ کہہ نہیں سکتے — کہ اب سہا نہیں جاتا ترا ستم ہم سے

جھیلتے ہیں جنبش ابروئے یار — رات دن ہیں ہم قضا کے سامنے

دانِ قتل کی اس شوخ نے ٹھہرائی ہے اور یاں
کاٹو تو لہو بھی دل گریاں میں نہیں ہے

کبھی تو جاں نہ دیتے جو یہ سمجھتے ہم — کہ یوں وہ روٹھ کے گا دو چار جا لئے

در پردہ ہم پہ حشر میں بھی ہو گیا ستم — فریاد سن کے بھی وہ نہ بولا حجاب سے

زندگانی بھی عجب جنس گراں ہے کہ حیاؔ — موت ساتھ خریدار لئے پھرتی ہے

میں جانتا تھا یہ کہ مرے ساتھ ہے یہ وضع — حالِ رقیب دیکھ کے صبر آ گیا مجھے

کون یہ ساتھ تمہارے ہے کہاں جاتے ہو — پھر نہ کہنا کہ ہمیں تم نے کمیں دیکھا ہے

تو نے سو پردے لگائے مری خاطر لیکن — میں نے سو بار تجھے پردہ نشیں دیکھا ہے

شکوۂ کاوش نہاں پہ نہیں کچھ موقوف — ہم نے اس بت کو سدا چیں بہ جبیں دیکھا ہے

تیرں کو چاہ کے ہم تو عتاب ہی میں رہے — شبِ فراق کٹی نہ روزِ انتظار آیا

اس قدر ہو نہ جگر داغِ بت کافر سے نکالا — دل جائے نہ ہنگامۂ محشر سے نکالا

یاں تک میں دل کے ہاتھ سے مجبور ہو گیا — جو جس نے کہہ دیا مجھے منظور ہو گیا

ان اشعار کو پڑھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ انتخاب جس مجموعہ سے پیش کیا جا رہا ہے وہ سنہ ۱۲۷۰ھ یعنی اب سے ایک سو نو برس قبل شائع ہو چکا تھا۔ اول تو یہ دیکھئے کہ ان اشعار کی زبان اور آج کی زبان میں سوائے ”یاں وان“ کے فرق واقعیاً نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں کہ ان ایک سو نو برس میں زبان نے ترقی نہ کی ہو۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ حیاؔ کا انداز بیان زبان کے مستقبل

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

ایک وقت — تین تہذیبیں

منموہن تلخ

رامو کچھ تکلیف کے عالم میں کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ دادا گھبراہٹ کے عالم میں بار بار کمرے کے دروازے تک جاتے، پھر کچھ بڑبڑاتے ہوئے واپس کمرے میں لوٹ آتے اور وہیں ادھر ادھر چکر لگانا شروع کر دیتے۔ رامو سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنی چارپائی تو باہر بارش سے اٹھا کر کمرے میں لے آیا تھا مگر چھوٹو کی چارپائی باہر ہی رہ گئی تھی۔ رامو کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ جسم بھی ٹوٹ رہا تھا، اس لئے اس نے بارش میں بھیگنا مناسب نہ سمجھا اور چھوٹو کی چارپائی باہر دالان ہی میں پڑی رہ گئی۔ دادا ایک تو ستر سے اوپر کے ہو چکے تھے۔ دوسرے ان کی بینائی بھی قریب قریب جاتی رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ شکی بھی تھے۔ چھوٹو کی چارپائی کو باہر بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھ کر نہ انھیں چین آ رہا تھا نہ اسے اٹھا لانے کی ان میں اب طاقت رہ گئی تھی۔ رامو نے گردن گھما کر کھڑکی کے باہر آسمان پر ایک نگاہ ڈالی۔

"دادا — ! چین سے بیٹھ جاؤ، بارش زیادہ دیر چلنے کی نہیں۔"

"ہوں۔"

اور دادا اپنے گھٹنوں کو کھجلاتے ہوئے لکڑی کے تختے پر بیٹھ گئے۔ ان کے گھٹنے پر کسی پھوڑے یا پھنسی کے چھل جانے سے زخم ہو گیا تھا۔ وہ اس کو ٹھیک نہ ہونے دیتے تھے۔ وہ شروع ہی سے ڈاکٹر کی دوا سے زیادہ اپنے ہاتھ استعمال کرنے کے حق میں تھے۔ اتنے میں باہر کا دروازہ کھلا اور چھوٹو سیٹی بجاتا ہوا داخل ہوا۔ وہ سر سے لیکر پاؤں تک بھیگ چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے باہر کے دالان کی کچی مٹی گیلی ہو گئی تھی۔ چھوٹو نے گھر کے اندر پہلا قدم رکھا تو گیلی مٹی میں اسکے گیلے پاؤں کا نشان بن گیا۔ چھوٹو بے پروائی سے سیٹی بجاتا رہا اور وہیں کھڑا مٹی میں اپنے پاؤں کے نشان کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنے میں دادا لپک کر کمرے کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے اور وہیں سے ڈرتی ہوئی آواز میں بولے: "چھوٹو بیٹے تمھاری چارپائی بھیگ رہی ہے۔"

چھوٹو نے کمرے کی طرف آتے ہوئے روکھے پن سے جواب دیا۔ "تو کیا میرا انتظار ہو رہا تھا کہ آؤں اور چارپائی اٹھاؤں؟" اور اتنا کہہ کر چھوٹو کمرے میں آ گیا۔ دادا سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے باہر گئے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں نے کسی نہ کسی طرح چارپائی اٹھا کر لے آئے۔ رامو یہ سب کچھ دکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر میں بہت شدید درد تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اس کے سر پر کس کر پٹی باندھ دے، اتنی کسی ہوئی پٹی کہ اسے روشنی نظر نہ آئے اور وہ سو جائے۔ جب دادا چارپائی اٹھائے کمرے میں آ گئے، تو چھوٹو نے ایک ہاتھ بڑھا کر چارپائی پکڑ لی اور پہلوانوں کی طرح اسے اٹھا کر دروازے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ ادھر جب دادا کی نظریں رامو کی نظروں سے ملیں تو ان میں غصہ اور حقارت جھلک رہی تھی۔ چھوٹو بھی غنڈوں کے سے انداز میں اپنی گیلی قمیص اتارتے ہوئے رامو کو گھور رہا تھا۔ اس نے کھاٹ کے پائے کے ساتھ قمیص لٹکاتے ہوئے دادا سے کہا: "تحقیق کیا۔ مزے سے لکڑی کے تختے پر سو جایا۔ گیلی چارپائی پر تو میں مر جاؤں گا نا رات کو؟"

دادا کانپتی ہوئی آواز میں بولے: "بھئی تم تو خوامخواہ بات پر بگڑ جاتے ہو۔ میں گیلی چارپائی پر سو جاؤں گا۔ تم رامو کی چارپائی لے لینا۔" پھر دادا کی آواز اتنی مدھم ہو گئی گویا اپنے آپ ہی کو سنا رہے ہوں: "رامو اس تختے پر سو جائیگا۔ نہیں تو زمین پر بستر لگا لے گا۔"

رامو کی آنکھ ابھر آئی تھی لیکن چھوٹو کب چپ رہنے والا تھا۔ اپنے بازو کی مچھلیوں کو دیکھتے ہوئے بولا: "زیادہ جھک جھک مت کرو۔ میں اپنی مصیبت خود کاٹ لوں گا۔" اتنا کہہ کر چھوٹو وہیں فرش پر لیٹ گیا۔

دادا نے چھوٹو کو کنکھیوں سے دیکھا اور اس کے قریب آکر بولے:
"منیا اٹھ تو وہاں بیچ پر لیٹ جا۔؟"

چھوٹو نے اس بات کے جواب میں اپنا دایاں ہاتھ یوں ہوا میں لہرایا جیسے کہہ رہا ہو: "تیرا سر مت کھاؤ" اور دادا چپ چاپ تخت پر بیٹھ گئے۔ شاید رامو کے کانوں نے دادا کے یہ الفاظ بھی سنے: "کیا زمانہ آگیا ہے۔ بھائی کو بھائی کا درد نہیں رہا۔ ہمارے زمانے میں بڑے بھائی....." اور دادا حسب عادت کچھ بڑبڑانے لگے۔

رامو بھی کھاٹ پر لیٹ گیا۔ بائیں ہاتھ کو سر کے نیچے دبا لیا اور دادا اور چھوٹو کی طرف سے پیٹھ کر لی۔ کمرے میں مکمل سناٹا چھا گیا۔ بس ان تینوں کے سانس لینے کی آواز بارش کے ترنم میں گھل رہی تھی۔ رامو کسی بہت گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

یوں تو چھوٹو کا یہ سلوک اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ نہ دادا کا چھوٹو سے اس قدر ڈرنا رامو کے لئے کوئی نئی بات تھی لیکن رامو کا دماغ اس معمے کو حل نہ کر سکا تھا کہ یہ دونوں اس کے ساتھ اتنا برا برتاؤ کیوں کرتے ہیں۔ چھوٹو اور دادا دونوں عموماً رامو کے سر روٹی کھاتے۔ چھوٹو نے آج تک کبھی کوئی کام کیا ہی نہیں تھا اور پھر چھوٹو رامو سے دس برس چھوٹا بھی تھا۔ پھر یہ سلوک کیوں؟ بڑے لڑکے کے مقابلہ میں چھوٹے لڑکے سے اتنی محبت کی وجہ؟ رامو نے لیٹے لیٹے اپنے ماتھے کو ہتھیلی سے یوں دبانا شروع کیا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہو یا اسے اس بات کا جواب نہ مل رہا ہو۔ جب رامو بیکار تھا ان دنوں ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ رامو کی آنکھوں کے سامنے دو برس پہلے کا ایک منظر گھوم گیا۔ مئی جون کی گرمیاں تھیں۔ رامو کا بدن بخار سے جل رہا تھا۔ وہ دوپہر تک اسی چارپائی پر بے سدھ پڑا رہا تھا۔ چھوٹو صبح سویرے اٹھ کر انگیٹھی سلگاتا۔ اپنے اور دادا کے لئے چائے بناتا اور پھر آگ بجھا دیتا تھا۔ اور دونوں باپ بیٹے رامو کے سامنے بیٹھ کر چسکیاں بھر بھر کر چائے پیتے اور دادا یہ کہتے جاتے آج چائے اچھی بنی ہے۔ کل چینی زیادہ پڑ گئی تھی۔ پرسوں چائے کی پتی کم رہ گئی تھی۔ فلاں دن پانی اچھی طرح نہیں ابلا تھا۔ لیکن اس بخار کے عالم میں چائے تو درکنار کسی نے رامو کو پانی کا گھونٹ تک نہ دیا تھا۔ رامو کو بھی یقین آ چکا تھا کہ اب خاتمہ ہے کیونکہ وہ ہمیشہ بخار کی شدت میں جلتے ہوئے خشک گلے کے مارے بے سدھ ہو کر رہ جاتا تھا اور جب اس کی آنکھ کھلتی تھی تو اس کے بدن میں ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ اس کے روئیں روئیں میں یوں درد اٹھتا تھا جیسے ایک ایک بال کھینچ کر نکالا جا رہا ہو۔ بالکل ایسے ہی جیسے گلا کٹ جانے کے بعد مرغی تڑپتی رہتی ہے اور اس کے بال گرتے رہتے ہیں یا نوچ نوچ کر پھینک دئے جاتے ہیں۔ رامو نے اس نیم بے ہوشی کے عالم میں لاکھ بار دعا کی تھی کہ اے بھگوان اب اٹھا لے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ رامو کو اپنے آپ پسینہ آتا اور سوکھ جاتا۔ اور جب اسے ذرا سا ہوش آتا تو وہ حلق تر کرنے کیلئے پانی کا گھونٹ پی لیتا اور پھر نڈھال ہو کر چارپائی پر لیٹ جاتا۔ آخر تین روز بعد اس کا بخار اتر گیا اور ادھ موئے رامو نے کبوتر کی طرح آنکھ کھول کر کمرے کا جائزہ لیا۔ دادا اپنے اور چھوٹو کے جھوٹے برتن مانجھ رہے تھے۔ رامو پانی پینے کے لئے اٹھا تو گٹھری کی طرح لڑھک کر فرش پر جا گرا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ دادا لپک کر اٹھے اور انھوں نے رامو کو سہارا دے کر بستر پر بٹھا دیا پھر بولے: "اس نے آج تمھارے لئے چائے بنا دی ہے۔ پی لو ٹھیک ہو جاؤ تو اپنے لئے کوئی کام ڈھونڈو۔"

اتنا کہہ کر دادا رسوئی میں گئے اور چائے کا ایک گلاس لے آئے۔ رامو کی زبان چائے اور پانی کے ذائقے سے بے نیاز ہو چکی تھی لیکن اس ایک پیالی نے اس پر جادو کا سا اثر کیا۔ رامو نے اپنے جسم میں کچھ جان سی محسوس کی۔ دادا برتن اٹھا کر نل پر جا چکے تھے۔ رامو کو اچانک یوں محسوس ہوا گویا اس کا کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اپنے اوپر قابو نہ پا سکا اور اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ بستر پر پڑا روتا رہا اور نہ جانے روتے روتے کب سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو کھاٹ کے نیچے دادا گیلے کپڑے سے فرش صاف کر رہے تھے۔ رامو نے انھی سے منہ پونچھنے کی کوشش کی تو دادا کی نظر رامو پر پڑی۔ بولے: "تمھارے لئے وید جی سے یہ تین پڑیاں لے آیا ہوں۔ ایک ابھی کھا لو۔ یہ پانی کا لوٹا رکھا ہے۔ منہ دھو لو۔ چھوٹو کو دوا کے بارے میں کچھ مت بتانا۔"

رامو ہمت کر کے اٹھا۔ منہ دھو کر دوا کی پڑیا کھائی اور پھر لیٹ رہا۔ اس کے دوسرے دن چھوٹو کو رامو پر دیا آگئی۔ اس نے مونگ کی پتلی دال اور دو پھلکے رامو کے لئے بھی پکا دئے تھے۔ یعنی پانچویں روز رامو کو بھی دو پھلکے مل گئے تھے۔

رامو یہ سوچتے سوچتے کچھ دیر بعد سو گیا۔ آج کل وہ بیکار تھا اس لئے اس کے یہ دن کیسے کٹ رہے تھے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آخر سردیاں آگئیں اور ایک بھیانک رات کو جبکہ باہر بلا کی بارش اور سردی پڑ رہی تھی چھوٹو نے دادا کے سامنے رامو کو گھر سے نکال دیا۔ رامو کوئی

مزاحمت نہیں کی۔ اس نے سوچا تھا اسے نمونیہ ہوگا اور اس جنجال سے چھٹی مل جائے گی۔ لیکن واہ رے انسانی جسم! گھر سے باہر نکلتے ہی رامو سے بارش اور سردی برداشت نہ ہو سکی اور وہ ایک دکان کے برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ بارش تھمنے پر رات کے کوئی ڈیڑھ دو بجے کے قریب رامو نے اپنے دوست کنھیا کے دروازے پر دستک دی۔ کنھیا رامو کے گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے رامو کو پناہ دی۔ اب کے بار رامو کی تقدیر نے بھی اس کا ساتھ دیا اور دو ہفتوں کی جھک جھک کے بعد رامو کو پچاس روپیہ ماہوار کی ایک نوکری مل گئی۔ یہی بہت تھا۔ رامو نے ایک کوٹھری کرایہ پر لے لی اور پھر دو مہینے اس نے گھر کا رُخ نہ کیا لیکن ایک دن نوکری سے واپس ہوتے ہوئے اس نے دادا کو سڑک پر دیکھ لیا۔ دادا کی پیٹھ پر کوئی بھاری سی گٹھری لدی ہوئی تھی اور چھوٹو پہلوانوں کی طرح ساتھ چل رہا تھا۔ رامو کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور اسی رات نو بجے کے قریب وہ دادا سے ملنے چلا گیا۔ جب اس نے گھر کی دہلیز کے اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ دادا فرش پر ایک چادر بچھائے ہوئے پڑے تھے۔ سانس لینے میں ان کے پوپلے منھ سے ہوا یوں نکل رہی تھی جیسے موت کی دعائیں مانگ رہے ہوں۔ رامو کچھ دیر کھڑا اپنے باپ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ نہ کھاٹ تھی نہ کوئی اور چیز۔ کمرہ اس طرح سونا تھا جس طرح اس گھر کے رہنے والوں کی زندگی۔ رامو نے دادا کے چرن چھو کر کہا: "دادا۔ کیا حال ہے؟" دادا چونک کر اٹھے۔ "رامو!" اور انھوں نے ایک گہری سانس کھینچی۔ پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولے: "تم اپنی کہو۔" چھوٹو گھر پر نہ تھا۔ رامو نے اپنی نوکری کی خبر دادا کو سنا دی۔ مگر دادا سے اس نے جو کچھ سنا اسے وہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے جی کھول کر چھوٹو کو گالیاں دیں۔ دادا بھی چھوٹو کو کوس رہے تھے۔ گھر کی ایک ایک چیز بک چکی تھی۔ عالم یہ تھا کہ صبح روٹی بنتی تھی اور بس! دادا نے بتایا کہ آج چار روز بعد انھیں چار ملی ہے۔ آج ہی صبح آخری کھاٹ بیچ کر وہ کچھ آٹا خرید کر لائے ہیں۔ باتوں باتوں میں رامو کو دادا نے یہ بھی بتایا کہ ایک بار چھوٹو نے ان پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔ اتنا کہہ کر دادا اپنی کہنی ٹٹولنے لگے، جیسے دیکھ رہے ہوں کہ اگر کسی زخم کا نشان نظر آجائے تو رامو کو دکھا دیں۔ رامو کا خون کھول اٹھا۔ وہ مرنے مارنے پر تل گیا۔ اور اس نے دادا سے صاف کہدیا کہ آج وہ چھوٹو کا مزاج ٹھکانے لگا ہی دے گا۔ لیکن دادا نے روک دیا۔ بولے: "بیٹا۔ وہ بہت طاقتور ہے۔ اور پھر غنڈوں کا سردار بنا پھرتا ہے۔

تم پر ہاتھ اٹھا بیٹھا تو چوٹ آجائے گی۔ چھٹی لے کر پڑے ہوگے پہلی نوکری سے بھی جاؤگے۔ جیسا وہ کر رہا ہے ویسا بھرے گا بھی۔ اپنے آپ کسی دن پولیس کے ہاتھوں آجائیگا۔ اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو یہ کرو کہ گھر واپس آجاؤ۔ میری زندگی کے آخری دن کچھ چین سے کٹ جائیں۔ دو وقت کا کھانا تو مل جائیگا اور پھر آنکھیں بند کرتے وقت کم از کم تم دونوں میرے پاس تو ہوگے!"

اتنے میں چھوٹو آگیا اور ان دونوں کے پاس بیٹھ گیا۔ دادا نے چھوٹو کو ایک نظر دیکھا پھر رامو سے بولے: "تمھیں پچاس روپئے ملتے ہیں۔ گھر میں تین ہی تو کھانے والے ہیں۔ کتنا خرچ آجائیگا۔ چالیس روپئے دیدینا، باقی تمھارے۔۔۔"

رامو نے دادا کو زیادہ کچھ نہ کہنے دیا۔ "دادا میں کل یہاں آجاؤں گا۔"

اور یہ کہہ کر رامو وہاں سے چلا آیا۔ راستے میں اس کی تمام پچھلی زندگی اسکی نظروں میں گھوم گئی۔ دادا اور چھوٹو نے اس کے ساتھ کیا کیا سلوک کئے تھے لیکن سب کچھ سوچنے کے بعد اس کے من میں بھول کر بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ اس عالم میں دادا کو چھوٹو کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے گھر واپس چلا آئیگا۔

اسی رات رامو گھر آگیا اور دو ایک مہینے چین سے بیتے۔ لیکن یہ چین طوفان سے پہلے کا چین تھا۔ ایک رات وہ طوفان آہی گیا۔ چھوٹو نے دادا سے کہا تھا کہ میرے ایک دوست کو علاج کے سلسلہ میں کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ رامو مجھے پچیس روپئے دیدے۔ مگر دادا نے رامو سے جب یہ کہا تو اس نے صاف انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ مجھے جو کچھ ملتا ہے اس سے گھر کا خرچ تو پورا نہیں ہوتا اور پھر میں نے دنیا بھر کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ رامو کا فیصلہ سنتے ہی چھوٹو اس پر اڑ گیا کہ یا وہ پچیس روپئے لے گا ورنہ اسی وقت وہ گھر چھوڑ کر چلا جائیگا۔ چھوٹو کی دھمکی سنتے ہی دادا پریشان ہوگئے۔ آخر چھوٹو نے بات بھی تو انتہائی ڈرامائی انداز میں کی تھی۔ اس نے کہا تھا "بس ٹھیک ہے۔ یہ دو وقت کی روٹی کھلاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی ہر خواہش کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اور اگر یہی بات ہے کہ ان کی روٹی کے بغیر زندگی مشکل ہے تو پھر اس زندگی سے موت اچھی۔" اتنا کہہ کر چھوٹو نے پہلی بار ایسا ڈرامہ رچایا کہ دادا تو ایک طرف رہے ایک پل کے لئے تو رامو کے پاؤں تلے سے بھی زمین نکل گئی یعنی اس نے بغیر کسی غم و غصے کے انتہائی اطمینان سے اپنا بستر لپیٹنا شروع کر دیا۔ ٹرنک میں اپنے کپڑے رکھے۔ دادا کے پاؤں چھوئے اور کہا: "دادا! سب کہا سنا معاف کر دینا۔ جب دل ہی نہ ملتے ہوں تو علاحدہ

... بستر ... اور اس نے پھر کر دادا کے کانپتے ہوئے ہونٹ کچھ کہتے اس نے ... بھائی صاحب پچھلی گستاخیوں کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں آپ ... رکھئے۔ میرا کیا ہے۔"

اور چھوٹو نے ایک لمبی گہری آہ بھری اور بستر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دادا ہچکیاں لے کر رو پڑے۔ "چھوٹو۔ میں تیرے بغیر مر جاؤں گا۔ چھوٹو میرے لال ... پر رحم کھا۔ میرے بچے۔ میں کل صبح کسی سے ادھار لاکر روپیہ دوں گا۔ اس سردی میں تو کہاں جا رہا ہے میرے لال۔" اس کے بعد دادا سے کچھ اور نہ کہا گیا۔ ان کی گھگھی بندھ گئی اور وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگے۔ چھوٹو نے ایک اور ہی وار کیا۔ اس کے لہجے میں جذبات کا کوئی دخل نہ تھا۔ انتہائی بے پروا لہجے میں بولا "جب مجھے اپنا ہی یقین نہیں کہ صبح تک جیوں گا یا مروں گا تو کسی اور کے بارے میں کیا سوچ سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر چھوٹو نے اپنا بستر اٹھایا اور باہر دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ دادا نے رامو کی طرف روتے ہوئے دیکھا۔ "ارے کمبخت اسے روک لے۔ وہ سردی میں اکڑ کے مر جائیگا۔ بھائی ہے یا دشمن۔ بھلے کہ پچیس روپئے بھائی کو خرچ کرنے کے لئے دیدئے ہیں۔"

رامو نے اپنا بکس کھول کر پچیس کے نوٹ دادا کے سامنے رکھ دئے اور سر نیوڑا کے یوں گھر سے باہر چلا گیا جیسے کہیں اپنی زندگی ہار آیا ہو۔ وہ بہت دیر تک اس سردی میں گھومتا رہا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ گھر چھوڑ دے۔ دونوں بھوکوں مرتے ہیں مر جائیں۔ پھر اسے خیال آیا لیکن دادا بھی تو اسی طرح ان دونوں کو بچپن ہی میں بھوکوں مرنے کے لئے چھوڑ کر کہیں جا سکتے تھے مگر وہ نہیں گئے۔ وہ سوچنے لگا تین تہذیبیں ایک ہی جگہ اکٹھی ہو گئی ہیں۔ ایک وہ پرانی تہذیب جس میں دادا نے جنم لیا تھا۔ اس تہذیب میں کتنا صبر تھا، کتنی عظمت تھی۔ کتنا صبر ہے اس تہذیب کے ماننے والوں میں۔ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور نئی تہذیب کے رحم و کرم پر جی رہے ہیں مگر اُف تک نہیں کرتے۔ اس کے بعد دوسری اس تہذیب نے جنم لیا جس میں رامو خود پروان چڑھا۔ یعنی کچھ پرانی قدریں ختم ہو گئی تھیں لیکن بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے پیار اور اپنے فرض کا احساس ابھی تک قائم تھا۔ تیسری تہذیب وہ تھی جس میں چھوٹو پل رہا تھا۔ رامو سوچنے لگا کہ اس تہذیب پر دو تہذیبوں کا ہاتھ ہے۔ اس کے باوجود اسے ماننے والے اپنے آپ کو لاوارث سمجھ رہے ہیں۔ انھیں یہ احساس دلانا کہ یہ لوگ لاوارث نہیں ہیں، ان کا بھی کوئی ہے، یہ رامو کی تہذیب کا کام ہے۔ رامو اتنا ہی سوچ سکا اور پھر اس کے قدم گھر کی طرف لوٹ رہے تھے!

بستر پر لیٹے لیٹے اس نے ہاتھ بڑھا کر سوتے ہوئے چھوٹو کے جسم کو چھوا۔ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے چھوٹو کو بخار سا آ گیا تھا۔ رامو کو اپنی تکلیف بھول گئی اور وہ چھوٹو اور دادا کے لئے چائے بنانے کی غرض سے اٹھ کر رسوئی میں چلا گیا۔

✱

مرزا رحیم الدین حیا دہلوی

بسلسلہ صفحہ ۳۰

سا آئینہ دار تھا اور یہ ایک ہی بات اُن کے فن کار ہونے کا مکمل ثبوت ہے۔ پھر ان اشعار کے تخیل اور مضمون کی طرف دیکھئے۔ اب سے سو برس قبل جو علی العموم کہا جاتا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے کیا یہ شعر منفرد اور ہماری شاعری کی اگلی منزل کی طرف رہنمائی کرتے نظر نہیں آتے۔ اس کے بعد جب ہم حیا کی اس بدنصیبی کو دیکھتے ہیں کہ سنہ ۱۲[illegible]ھ کے بعد سنہ ۱۳۰۷ھ تک آخری ۳۴ برس کا کلام، یعنی شاعر کی پختہ کاری کے زمانہ کی شاعری ہمارے سامنے موجود نہیں تو ہمیں شاعر سے اور زیادہ ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ فن کار کا فن اس کی پختہ کاری کے زمانہ میں نکھر کے سامنے آتا ہے اور فن کار کے آخری ایام اس کے فن کے شباب کا زمانہ ہوتے ہیں تو اب تو یہ اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے کہ حیا شاعر کے ذوق جستجو کی انتہا یہ ہے اس کی آخری منزل۔ منفرد، کامیاب اور وجد آفریں ہوگی ـــــ افسوس!

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

غزل

ذوالنورین

ملیں جس دم وہ نظریں عشرتِ دل کا پیام آیا
بہارِ بے خزاں کا گلشنِ دل کو سلام آیا

نہیں ساقی، نظر جس کی نہ ہو ہر اہلِ محفل پر
وہ میخانہ نہیں جس میں نہ ہر میکش کو جام آیا

دیا ہے یوں بھی ہم نے درس اکثر اہلِ عالم کو
کہ دل میں جذبۂ الفت بجائے انتقام آیا

بڑے نازک مقام آتے ہیں اکثر راہِ ہستی میں
مگر اک عزم محکم ہے جو ہر مشکل میں کام آیا

اب اس کوتاہ پر کو حسرتِ پرواز کیا ہوگی
کشش سے آب و دانہ کی جو طائر زیرِ دام آیا

خوشا جذبِ محبت، آفریں تمہیدِ رسوائی
وہ فردوسِ نظر دانستہ پھر بالائے بام آیا

حقیقت تک رسائی دیدۂ بینا کی ممکن ہے
ہمیں تو ذرے ذرے کی زباں سے یہ پیام آیا

مریخ

محمد اسحاق صدیقی

آپ ہر دوسرے سال آسمان پر انگارے کی طرح دہکتا ہوا ایک سُرخ ستارہ دیکھتے ہیں۔ اب سے بہت پہلے جب انسان مظاہر فطرت کی پرستش کیا کرتا تھا' اہل یونان و روما اِسے لڑائی کا خون ریز دیوتا سمجھتے اور اس کا بُت بنا کر پوجتے تھے۔ اس کا نام انھوں نے مارس (MARS) رکھا تھا۔ انگریزی کلنڈر کا تیسرا مہینہ مارچ اسی نام پر رکھا گیا ہے۔ ہماری زبان میں یہی ستارہ مریخ یا منگل کے نام سے مشہور ہے۔

مریخ دراصل ایک سیارہ ہے جو سورج کے چاروں طرف' زمین کے دائرۂ گردش کے باہر گھومتا ہے۔ نظام شمسی میں سورج کی طرف سے گنتے پر وہ چوتھا سیارہ ہے۔

سیارے' سورج کے گرد جن راستوں پر گھومتے ہیں انھیں مدار کہتے ہیں۔ یہ گول نہیں ہیں بلکہ انڈے کی شکل سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ شکل دائرے سے اس بات میں مختلف ہوتی ہے کہ دائرے کا مرکز ایک ہوتا ہے اور اس کے دو ہوتے ہیں۔ مدار کی بیضوی شکل ہونے کی وجہ سے یہ سیارہ کبھی زمین سے ......۱۵۹ (پندرہ کروڑ نوے لاکھ) میل دور نظر آتا ہے اور کبھی یہ فاصلہ گھٹ کر ......۱۳۲ (تیرہ کروڑ تیس لاکھ) میل رہ جاتا ہے۔

زمین سے بھی مریخ کا فاصلہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ نیچے کے ڈائگرام میں اندر کا دائرہ زمین کا مدار ظاہر کرتا ہے اور باہر والا مریخ کا۔ ان کو ملانے والی لکیریں ان سالوں کو ظاہر کرتی ہیں جب زمین اور مریخ آمنے سامنے ہوتے ہیں۔

اس ڈائیگرام میں سنہ ۱۹۴۸ء سے لیکر سنہ ۱۹۶۲ء تک کا زمانہ دکھایا گیا ہے۔ ان سالوں میں زمین اور مریخ کے فاصلے کا حساب یوں ہے:

سنہ ۱۹۴۸ء ...... ۶۳ میل
سنہ ۱۹۵۰ء ...... ۶۱ میل
سنہ ۱۹۵۲ء ...... ۵۳ میل
سنہ ۱۹۵۴ء ...... ۴۰ میل
سنہ ۱۹۵۶ء ...... ۳۵ میل
سنہ ۱۹۵۸ء ...... ۴۵ میل
سنہ ۱۹۶۰ء ...... ۵۷ میل
سنہ ۱۹۶۲ء ...... ۶۲ میل

ان اعداد و شمار کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ مریخ ہماری زمین سے زیادہ سے زیادہ ...... ۳۵ میل قریب آسکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ..... ۶۳۰ میل دور جاسکتا ہے۔ اسی لئے سنہ ۱۹۴۸ء اور سنہ ۱۹۶۰ء مشاہدے کیلئے نہایت ناموافق سال ہیں۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں مریخ ہم سے قریب ترین تھا۔ سنہ ۱۹۷۱ء میں وہ پھر اسی دوری پر آئے گا کیوں کہ وہ ہر پندرھویں یا سترھویں سال ہمارے نزدیک ترین ہوتا ہے۔

مریخ اپنے محور پر ۲۴ گھنٹے ۳۷ ½ منٹ میں ایک بار گھوم جاتا ہے۔ گویا اس کا دن ہمارے دن سے تقریباً آدھ گھنٹہ بڑا ہوتا ہے۔ سورج کے چاروں طرف اس کا ایک چکر ۱۵ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ۶۸۷ دنوں میں پورا ہوتا ہے۔ اس کا ایک سال ہمارے ایک سال ساڑھے دس مہینے کے برابر ہے۔ مریخ کا محور اپنے مدار پر محور سے ۲۴ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے جھکا ہے۔ یہ جھکاؤ تقریباً وہی ہے جو زمین کے محور کا ہے (۲۳ ½ درجہ) اسی لئے مریخ پر بھی زمین کے ایسے موسم ہوتے ہیں لیکن تقریباً دگنے لمبے۔

مریخ بھی زمین کی طرح ایک کرہ ہے جو اپنے قطبین پر کسی قدر چپٹا ہے۔ اس کا خط استوا پر قطر ۴۲۲۰ میل یعنی زمین کے قطر کا تقریباً نصف ہے۔

اس کا رقبہ زمین کے رقبے کا تقریباً ¼ یعنی چوتھائی سے کچھ زیادہ ہے اور قوت کشش زمین سے ۶۲ فیصدی کم ہے۔ چوں کہ وزن کا تعین کشش

زمین
۷۹۲۶

مریخ
۴۲۲۰

سے ہوتا ہے اس لئے جو چیز زمین پر ۲۰۰ پونڈ کی ہوگی وہ مریخ پر ۷۶ پونڈ کی ہوگی۔

ہماری زمین کا تو ایک ہی چاند ہے لیکن مریخ کے دو ہیں۔ انہیں سے ایک کو فوبس (PHOBOS.) کہتے ہیں اور دوسرے کو ڈیمس (DEIMOS)۔ فوبس کا قطر صرف دس میل ہے اور ڈیمس کا پانچ میل یہ ننھے ننھے چاند مریخ سے اتنے قریب ہیں کہ اس کے قطبین سے نظر نہیں آسکتے۔
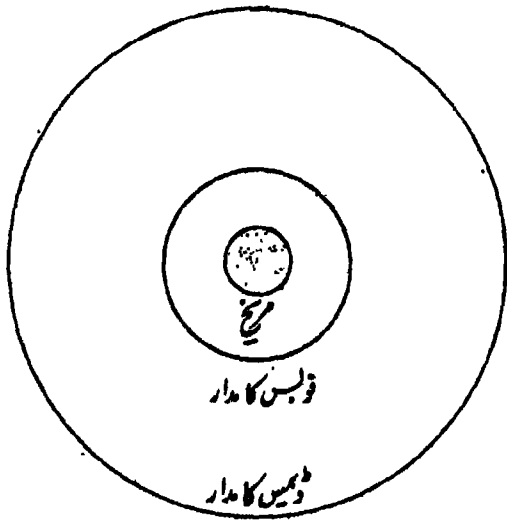
فوبس مریخ کی سطح سے ۳۷۰۰ (تین ہزار سات سو) میل دور ہے۔ مریخ کے خط استوا پر وہ اتنا بڑا دکھائی دیگا جتنا ہمارے چاند کا تہائی حصہ اور اس کی روشنی ہمارے پورے چاند کی ½ حصہ ہوگی۔ مریخ کا ایک چکر پورا کرنے میں فوبس کو ۷ گھنٹے ۳۹ منٹ لگتے ہیں۔ یہ اس وقت کے تہائی سے بھی کم ہے جو مریخ کو اپنے محور پر گھومنے میں لگتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ دوسرے چاندوں کے برخلاف مغرب سے طلوع ہوتا ہے اور مشرق میں غروب ہوتا ہے۔ اس پر لطف یہ کہ ہر مریخی دن میں تین بار

ایسا ہوتا ہے۔ ہمارے نظامِ شمسی میں یہ اپنے قسم کی واحد مثال ہے
ڈیمس مریخ کی سطح سے ۱۲۵۰۰ (بارہ ہزار پانچ سو) میل دور ہے۔
مریخ کے خطِ استواء سے دیکھنے پر یہ تارہ سا نظر آئیگا، جھلملاتا ہوا۔ اس کی
روشنی ہمارے پورے چاند کی ۱/۲۵ حصہ ہوگی۔ اس کا ایک چکر ایک دن
۶ گھنٹے اور ۱۸ منٹ میں پورا ہوتا ہے۔ مریخ کی محوری گردش کی وجہ سے
اس کی چال وہاں سے معلوم نہ ہوگی۔ اسے مشرق سے مغرب تک پہنچنے میں
تین دن لگتے ہیں اور اس اثنا میں وہ ہلال سے بدر کامل ہوجاتا ہے لیکن
اس تبدیلی کا پتہ بغیر دوربین کے نہیں چل سکتا۔

یہ دونوں چاند ۱۸۷۷ء میں دریافت ہوئے تھے لیکن اس سے
ڈیڑھ سو سال پہلے ڈین سوئفٹ (DEAN SWIFT) نے اپنی
کتاب "گلی ور کے سفر" (GULLIVERS TRAVELS) میں جو ۱۷۲۶ء
میں شائع ہوئی تھی ان کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس وقت تک نہ تو کسی نے
انھیں دیکھا تھا اور نہ ایسی دوربین ہی ایجاد ہوئی تھی جس سے انھیں دیکھا جا سکتا۔
بہرحال گذشتہ ہزار سالوں میں شاید یہ سب سے زیادہ حیرت انگیز انکشاف ہے۔

مریخ کا باقاعدہ مشاہدہ دوربین کی ایجاد کے بعد شروع ہوا۔ ۱۶۱۰ء میں
جب گلیلیو (GALILEO) نے مریخ کو اپنی دوربین سے دیکھا تو اُسے
معلوم ہوا کہ چاند کی طرح اس کی شکل گھٹتی بڑھتی ہے۔ لیکن اس میں ۱/۸
سے زیادہ وہی کمی ہوتی ہے جو بدر کامل میں تین چار دن بعد نظر آتی ہے۔

۱۶۳۶ء میں فونٹانا (FONTANA) نے سب سے پہلے مریخ کے
دھبوں کو محسوس کیا لیکن صاف نظر نہ آنے کی وجہ سے ان کی تصویر نہ بنا
سکا۔ ان کی پہلی تصویر ہیوجینس (HUYGHIENS) نے ۱۶۵۹ء میں
بنائی اور ان کے مشاہدے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نشانات مستقل
ہیں۔ وہ مغرب سے مشرق کو حرکت کرتے ہیں۔ اس طرح مریخ کی محوری
گردش کا پتہ چلا۔ ہیوجینس کا اندازہ تھا کہ مریخ ۲۴ گھنٹوں میں ایک بار
اپنے محور پر گھومتا ہے۔ ۱۶۶۶ء میں کاسینی (CASSINI) نے اس امر
کی ازسرِ نو تحقیق کی اور معلوم کیا کہ مریخ کا دن ۲۴ گھنٹے ۴۰ منٹ کا
ہوتا ہے۔ لیکن ۲۶۰ سال کے مشاہدے کے بعد ماہرینِ فلکیات اس نتیجے
پر پہنچے ہیں کہ مریخ کا دن ۲۴ گھنٹے، ۳۷ منٹ اور ۲۲ ۱/۲ سیکنڈ کا ہوتا ہے
یہ حساب اتنا صحیح ہے کہ اس میں سیکنڈ کے پچاسویں حصے سے زیادہ غلطی نہیں ہو سکتی۔

مرالڈی (MARALDI) نے ۱۷۱۹ء میں مریخ کے سرد قطب
سفید دھبے دیکھے جو سیارہ دھبوں کے مقابلے میں اپنی جگہ قائم نظر آتے تھے۔
اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ سیارے کے قطبین ہیں۔ اٹھارویں صدی
کے آخری سالوں میں سر ولیم ہرشل (SIR WILLIAM HERSHEL)
نے ثابت کیا کہ مریخ کے قطبین کی سفید ٹوپیاں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔
ان کے انداز عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برف کی چادریں ہیں جیسی کہ
ہماری زمین کے قطبین پر پائی جاتی ہیں۔

بیر (BEER) اور میڈلر (MADLER) نے ۱۸۳۰ء میں
مریخ کا نقشہ بنانا شروع کیا اور ۱۸۴۰ء میں انھوں نے یہ نقشہ تیار کر لیا۔ اس
نقشہ میں انھوں نے مریخ پر عرض البلاد اور طول البلاد کے خطوط مقرر کئے
جیسے کہ ہماری زمین کے نقشوں میں نظر آتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے مریخ
کے "جغرافیہ" کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد دوسرے نقشے پیش کئے گئے جن میں سے
ہر نقشہ اپنے پہلے سے بہتر تھا۔ اس وقت تک لوگوں کا خیال تھا کہ ہماری زمین
کی طرح مریخ پر بھی بحرِ اعظم اور برِ اعظم ہونگے۔ سیاہ دھبوں کو سمندر سمجھا گیا اور
نارنجی حصوں کو خشکی۔ ان کے نام بھی رکھے گئے جو ابتک چلے آتے ہیں۔

ایک امریکی ہیئت داں آسف حال (ASAPH HALL) نے
۱۸۷۷ء میں ایک ۲۶ انچ قطر والی دوربین کی مدد سے مریخ کے ننھے ننھے
چاندوں کا پتہ لگایا۔ اس نے ان کے نام فوبس (PHOBOS) اور
ڈیمس (DEIMOS) رکھے۔ ان کے معنی "خوف" اور "دہشت" کے ہیں۔
یہ یونانی رومی دیومالا میں جنگ کے دیوتا مارس کے ساتھی ہیں۔

اسی سال مریخ ہماری زمین سے بہت قریب ترین آ گیا تھا۔ اس لئے
میلان کی رصدگاہ کے مہتمم شیاپریلی (SCHIAPARELLI) نے مریخ کی
سطح کا باریک بینی سے مشاہدہ شروع کیا۔ وہ ابھی اس کی نقشہ کشی میں مصروف
تھے کہ انھیں مریخ کے نارنجی حصوں (ممالک) پر سیاہ خطوط نظر آئے۔ ان
لکیروں کا نام انھوں نے کینالی (CANALI) رکھا۔ اطالوی زبان
میں اس لفظ کے معنی "پانی بہنے کے قدرتی راستے" کے ہیں۔ انگریزی میں
اس کا ترجمہ چینل (CHANNEL) کرنا چاہئے تھا لیکن غلطی سے اس کا
ترجمہ کینال (CANAL) کیا گیا جس کے معنی "نہر" ہیں۔ اس طرح مشہور ہو گیا
کہ مریخ پر نہریں ہیں اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان نہروں کے بنانے

والی یعنی ذی عقل مخلوق بھی ہے۔

بہر حال، اس بات کو ماننے کیلئے کوئی تیار نہ تھا کہ مریخ میں "نہریں" بھی ہیں کیونکہ شیاپریلی کے سوا کسی کو یہ "نہریں" نظر نہ آتی تھیں۔ ۱۸۷۹ء میں شیاپریلی کو پھر یہی خطوط نظر آئے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ نمایاں، واضح اور باقاعدہ تھے۔ یں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے پٹڑی رکھ کر آڑی ترچھی لکیروں کا جال بنایا ہے۔
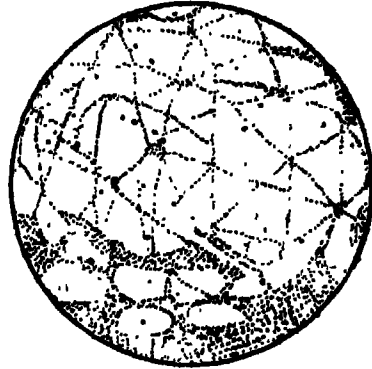
ان میں سے بعض لکیریں ۱۸۸۱ء میں دوہری ہو گئیں۔ یعنی جہاں پہلے ایک لکیر تھی وہاں اب ریل کی پٹریوں کی طرح دو لکیریں متوازی نظر آ رہی تھیں۔ اس مرتبہ بہت سے لوگوں نے انھیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن کسی کو دکھائی نہ دیں۔ اس لئے مشہور ہو گیا کہ یا تو شیاپریلی وہم کا شکار ہے یا اسکی نظر میں فتور پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن گیارہ سال کی مسلسل ناکامیوں کے بعد ۱۸۹۲ء میں بعض ہیئت داں ان "نہروں" کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۱۸۹۲ء میں پروفیسر پکرنگ (PROF. PICKERING) نے معلوم کیا کہ یہ خطوط خشکی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ایک بڑے "سمندر" کی سطح پر بھی نظر آتے ہیں۔

ایک امریکی ہیئت داں پرسی وِل لوویل (PERCIVAL LOWELL) کو مریخ سے ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ انھوں نے ۱۸۹۴ء میں اپنے ذاتی صرفے سے فلیگ اسٹاف، اریزونا (امریکہ) میں ایک رصدگاہ قائم کی۔ یہاں کی فضا بہ نسبت دوسری جگہوں کے نہایت صاف ہے اس لئے اجرام فلکی کے مشاہدے کے لئے بڑی موزوں ہے۔ اس رصدگاہ میں پہلے جو دوربین تھی اس کے شیشے کا قطر ۱۸ انچ تھا۔ ۱۸۹۶ء میں یہاں ایک ۲۴ انچ قطر والی اعلیٰ درجے کی دوربین نصب کی گئی۔ اس وقت سے اب تک یہ رصدگاہ مریخ کی تحقیقات میں مصروف ہے۔

لوویل نے ۱۸۹۴ء میں معلوم کیا کہ یہ "نہریں" صرف ایک "سمندر" تک محدود نہیں ہیں بلکہ دوسرے "سمندروں" کی سطح پر بھی نظر آتی ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ "سمندر" چاہے کچھ بھی ہوں لیکن "سمندر" نہیں ہو سکتے کیونکہ ظاہر ہے کہ پانی کی سطح پر اس طرح کے نقوش نہیں قائم رہ سکتے ہیں۔

بہر حال، لوویل نے مزید تحقیق کے بعد یہ بتایا کہ ان سیاہ دھبوں میں جنھیں سمندر سمجھا جاتا ہے، موسم کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصے نباتات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ لوویل نے ۲۵ سال تک مریخ کا گہرا مشاہدہ کیا اور انھیں رفتہ رفتہ اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ یہ نہریں وہاں کی آبادی نے آبپاشی کے لئے بنائی ہیں۔ اپنے اس نظریے کی تفصیل کیلئے انھوں نے بعض اہم کتابیں بھی لکھیں۔

یہ خیال کہ مریخ پر نہریں پائی جاتی ہیں اور وہاں انسان کی ایسی سمجھدار مخلوق آباد ہے، عوام میں بہت مقبول ہوا اور ۵۰ سال تک وہ یہی تصور کرتے رہے۔ برسوں یہ افواہ بھی رہی کہ مریخی باشندے انسانی بھیس بدل کر ہمارے درمیان گھوم پھر رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ مشہور ہوا کہ اڑن طشتریاں مریخ والوں کی ایجاد ہیں اور وہ زمین کا جائزہ لے رہی ہیں۔ چنانچہ اس وقت سے لیکر اب تک سائنسی ناول نویس نہ جانے کتنے افسانے اور ناول مریخی "باشندوں" کے بارے میں لکھ چکے ہیں۔

مریخ پر انسان جیسی مخلوق آباد ہے یا نہیں، اس کا جواب دینے کیلئے ضروری ہے کہ ہم خود مریخ کی آب و ہوا کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ وہاں زندگی کا وجود ممکن ہے بھی کہ نہیں۔

اعلیٰ قسم کی دوربین سے دیکھنے پر مریخ سرخی مائل نارنجی رنگ کا کرہ نظر آتا ہے۔ اس کی سطح پر کہیں کہیں نیلگوں مائل سبز دھبے نظر آتے ہیں۔ اسکے محور کا رخ زمین کی طرف بدلتا رہتا ہے کیونکہ دونوں سیاروں کی جگہ ایک دوسرے کی نسبت سے خلا میں بدلتی رہتی ہے۔ کبھی اس کا شمالی قطب ہماری طرف رہتا ہے اور کبھی جنوبی اور بسا اوقات دونوں ہوتے ہیں۔ اس کے قطبین جو برف سے ڈھکے ہوئے ہیں سفید نظر آتے ہیں۔ چونکہ فلکی مشاہدے والی دوربین میں ہر چیز الٹی دکھائی دیتی ہے اس لئے مریخ کے اوپر والے حصے کو قطب جنوبی کہتے ہیں اور نیچے والے حصے کو قطب شمالی۔ اس کے دائیں اور بائیں حصوں کو بالترتیب مغرب اور مشرق کہا جاتا ہے۔ دیگر اجرام سماوی

کی طرح مریخ کی تصویریں اور نقشے بھی الٹے چھاپے جاتے ہیں نیلگوں مائل سبز دھبے خط استوا کے جنوب میں مسلسل پھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں "بحر جنوبی" کہتے ہیں اس کے شمال میں جو نارنجی حصہ ہے اسے "شمالی براعظم" کہتے ہیں چاند کی طرح مریخ کے نقشے میں بھی آپ کو سمندر، خلیجیں اور جھیلیں ملیں گی لیکن یہ محض نام کا دھوکا ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نیلگوں مائل سبز دھبے جنھیں "سمندر" سمجھا جاتا تھا نباتات سے ڈھکے ہوئے ہیں اور نارنجی حصے جنھیں ممالک سمجھا جاتا تھا سرخ بالو کے ریگستان ہیں۔

قطبین پر ہزاروں فٹ موٹی برف کی چادریں بچھی ہیں۔ ان کی موٹائی ایک یا دو فٹ سے زاید نہیں بلکہ بعض ہیئت داں تو چند انچ ہی بتاتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ برف پگھلنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اس قطب کا جو رخ ہماری طرف ہوتا ہے وہاں محض ایک چھوٹا سا سفید نقطہ رہ جاتا ہے۔ (بسا اوقات جنوبی برفانی ٹوپی یکسر غائب ہو جاتی ہے) برخلاف اس کے جاڑوں میں یہ برف پھیل کر خط استوا کے قریب تک آ جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مریخ کے موسم ہمارے یہاں کے موسموں سے دگنے لمبے ہوتے ہیں اس لئے برف کو پھیلنے اور سکڑنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ جب شمالی قطب کی برف پھیلتی ہے تو جنوبی قطب کی برف سمٹنے لگتی ہے اور جب شمالی قطب کی برف سکڑتی ہے تو جنوبی قطب کی برف پھیلنے لگتی ہے۔ ہر مریخی سال میں باری باری ایسا ہوا کرتا ہے یعنی مریخ کے قطبین پر گیارہ مہینے کا دن اور گیارہ مہینے کی رات ہوتی ہے۔

مریخی نباتات کی زندگی کا دارومدار قطبین کی برف پر ہے۔ جب قطبین کی برف پگھلنے لگتی ہے تو وہ ہرے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مریخ کے نیلگوں مائل سبز حصوں کا رنگ بہار اور گرمی کے زمانے میں گہرا نظر آتا ہے۔ خزاں اور جاڑوں میں یہ دھبے ہلکے ہو جاتے ہیں۔ ان کا رنگ زرد اور پھر سرخی مائل کتھئی ہو جاتا ہے۔ موسم کے مطابق رنگوں کی اس تبدیلی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نباتات ہیں۔ غالباً وہ کائی (LICHEN) کی طرح کے پودے ہیں۔ یہ نباتات کی قدیم صورت ہے جو عرصے تک بغیر پانی کے زندہ رہ سکتی ہے اور انتہائی سردی برداشت کر سکتی ہے۔

بہار اور گرمی کے زمانے میں جب برف پگھلنے لگتی ہے نہریں بھی نمایاں ہونے لگتی ہیں اور جیسے جیسے برف پگھلتی ہے وہ بڑھتی جاتی ہیں۔ لوویل کے نزدیک ان نہروں میں پانی قطبین کی برف پگھلنے سے آتا ہے۔ ان نہروں کے کنارے مریخی باشندوں کے کھیت لہلہاتے ہیں۔ چونکہ مریخ پر پانی کی بہت کمی ہے اس لئے انھوں نے اپنے کھیتوں کی آبپاشی کے لئے نہروں کا یہ عظیم الشان سلسلہ قائم کیا ہے۔ دوربین کے دیکھنے پر یہ نہریں باریک لکیروں کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ عموماً تین یا چار لکیریں کسی ایک مقام پر جا کر ملتی ہیں جسے "نخلستان" کہتے ہیں۔ (لوویل کے نزدیک یہی مریخی باشندوں کے شہر ہیں) وہاں سے وہ پھر آگے بڑھتی ہیں اور سیکڑوں میل دور کسی دوسرے مرکز پر جا کر مل جاتی ہیں۔ نہروں کے اس جال کی صورت بالکل وہی ہوتی ہے جو نقشے میں ریل کی پٹڑیوں کی ہوتی ہے کہ وہ ہر خاص جنکشن پر جا کر مل جاتی ہیں۔ چونکہ ان کے راستے میں کوئی پہاڑ یا وادی حائل نہیں ہوتی، اس لئے خیال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں اس وقت بنایا گیا تھا جب مریخ کی سطح ہموار ہو گئی تھی اور سمندر خشک ہو گئے تھے۔

لوویل نے اپنے بنائے ہوئے مریخ کے نقشوں میں تقریباً ۔ ۔ نہریں ظاہر کی ہیں۔ یہ سب نہریں ایک ساتھ نظر نہیں آتیں بلکہ مختلف اوقات میں تھوڑی تھوڑی تعداد میں دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کی جگہوں میں تبدیلی نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ جو نہریں دوہری ہیں ان میں سے ایک تو اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور دوسری کبھی دائیں طرف نظر آتی ہے اور کبھی بائیں طرف۔ اعلیٰ سے اعلیٰ دوربینوں سے دیکھنے پر بھی یہ نہریں اتنی باریک نظر آتی ہیں جیسے دور سے دیکھنے پر مکڑی کے جالے کا تار۔ اسی لئے ان کا فوٹو نہیں کھینچا جا سکتا۔ مریخ کی چمک اتنی نہیں کہ فوٹوگرافی کی پلیٹ پر فوراً اس کا عکس آ جائے۔ اسے کچھ عرصے تک مریخ کے رخ پر کھلا رکھنا پڑتا ہے۔ جتنے باریک دانوں والی پلیٹ استعمال کی جاتی ہے اتنے ہی زیادہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور اتنا ہی زیادہ فضا کا اثر ہوتا ہے۔ ہوا کے تموج یا فضا کے ارتعاش کی وجہ سے باریک لکیریں غائب ہو جاتی ہیں۔ اگر موٹے دانوں والی پلیٹ استعمال کی جاتی ہے (جس پر عکس نسبتاً جلدی آتا ہے) تو یہ لکیریں آتی ہی نہیں اور اگر نیگیٹیو پر ان کا خفیف سا عکس بھی آ گیا تو وہ پرنٹ کرتے ہوئے غائب ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہمیں مریخی نہروں کا معمہ حل کرنے کے لئے ہاتھ سے کھینچے ہوئے نقشوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہاں ایک دوسری مشکل سامنے آتی ہے۔ عموماً وہ شخص جسے سیاروں کو دوربین سے دیکھنے میں مہارت

ہوتی ہے اچھا نقشہ نویس نہیں ہوتا اور جو اچھا نقشہ نویس ہوتا ہے اسے فلکی مشاہدے کی مشق نہیں ہوتی۔ جب تک یہ دونوں خوبیاں کسی ایک شخص میں نہ جمع ہو جائیں وہ مریخ کا اچھا نقشہ نہیں بنا سکتا۔ نقشوں میں نقشہ نویس کی "نظر" کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اگر کسی چیز کے بارے میں پہلے سے کوئی رائے قائم کر لی جائے تو ہمارا دماغ اس چیز کو اسی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اسی لئے مریخ کے جو نقشے موجود ہیں انہیں نہروں کی صحت پر شبہ کیا جاتا ہے۔

لوویل کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ یہ نہریں مریخی مخلوق کی بنائی ہوئی ہیں، ان کے دونوں کناروں پر نباتات اُگتے ہیں۔ یہ نباتات اور ان کے بیچ میں چھپی ہوئی نہر ملی جلی نظر آتی ہیں۔ اسی لئے ان کی چوڑائی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر دریائے نیل کو جس کے کنارے کنارے نباتات ہیں فاصلے سے دیکھا جائے تو وہ بھی ایسا ہی نظر آئیگا۔

لوویل کے نزدیک ان نہروں کی چوڑائی کم سے کم بیس میل ہوگی ان میں سے بعض سو یا دو سو میل تک چوڑی ہیں۔ جو نہریں دوہری ہیں، ان میں سے ایک نہر اور دوسری نہر کے درمیان تیس میل سے لے کر تین سو یا چار سو میل تک کا فاصلہ ہے۔ بعض نہریں ہزاروں میل لمبی ہیں اور ان کی مجموعی لمبائی ساٹھ یا اسّی لاکھ میل ہوگی۔

اب ذرا سوچئے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ "مریخی انسان" اتنی لمبی چوڑی نہریں بنا سکیں۔ مریخ کی کشش زمین کی تہائی ہے، اس لئے وہاں ہر چیز کا وزن زمین کے مقابلے میں بہت کم ہوگا۔ زمین کے مقابلے میں مریخ پر نہریں کھودنے اور ملبہ ڈھونے کے لئے بلاشبہ کم طاقت کی ضرورت ہوگی۔ لیکن تب بھی ان نہروں کا بنانا آسان کام نہیں۔ اب اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مریخ پر نہریں بنائی جا سکتی ہیں تو ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ مریخ کے قطبین پر جو برف جمی ہوئی ہے اس کی موٹائی چند انچ سے زیادہ نہیں۔ اگر یہ ساری برف پگھل جائے تو اس کا پانی مشکل سے اتنا ہوگا کہ ایک بڑی جھیل میں سما سکے۔ اور یہ پانی مریخ کی نہروں کو بھرنے کیلئے قطعاً ناکافی ثابت ہوگا۔

جب ہم اس زاویۂ نظر سے مریخی نہروں پر غور کرتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ وہ انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہو سکتیں اور جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ وہ انسان کی بنائی ہوئی ہیں اس وقت تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں ہماری جیسی مخلوق آباد ہے۔

ایسی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ نہریں انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہیں تو وہ قدرت کی تعمیر کردہ ہوں گی۔ یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ دریا ہوں؟ لیکن دریا نہ تو اتنے چوڑے ہوتے ہیں جتنی کہ یہ نہریں ہیں اور نہ وہ اس طرح ایک دوسرے کو جوڑتے اور کاٹتے ہیں جیسے کہ یہ نہریں جوڑتی اور کاٹتی ہیں۔ انہیں دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مریخ کی سطح جا بجا چٹخ گئی ہو۔ تو کیا اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ مریخ کی تہ میں چھپے ہوئے آتشی مادے کا نتیجہ ہیں؟ کیا جنہیں "نخلستان" سمجھا جاتا ہے وہ "آتش فشاں دہانے" ہیں جہاں سے اندر چھپا ہوا لاوا زور کر کے نکلتا ہے۔ یہ سب ایسے سوالات ہیں جن کا قطعی اور فیصلہ کن جواب نہیں دیا جا سکتا۔ جو کچھ بھی کہا جائیگا وہ محض قیاس آرائی ہوگی۔ یہ تک نہیں کہا جا سکتا کہ ان نہروں کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں۔ ہاں اتنا یقینی ہے کہ ان نہروں کا سیدھی لکیروں کی طرح نظر آنا محض نظر کا دھوکا ہے۔ اگر پاس جا کر دیکھا جائے تو ان کی صورت کچھ اور ہی ہوگی۔ اگر کسی لکیر کو جو جا بجا شکستہ ہو یا نقطوں کی قطار کو دور سے دیکھا جائے تو وہ لکیریں اور نقطے ملے ہوئے یا مسلسل نظر آئیں گے۔ اگر آپ چار کی خالی پیالی میں تہ نشین پتیوں کو دور سے دیکھیں تو ان میں خاص طرح کی شکلیں نظر آئینگی لیکن قریب سے دیکھنے پر وہ غائب ہو جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مریخ پر بڑے بڑے سمندر اور بڑی جھیلیں نہیں ہیں۔ اُس کا ⅔ حصہ ریگستان سے ڈھکا ہوا ہے جس کا رنگ سُرخ ہے۔ یہ سُرخی مریخ کی سطح پر پائے جانے والے فلزاتی ذروں کے ہوا سے آکسیجن جذب کرنے کی وجہ سے پائی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہوا اور پانی میں ملی ہوئی آکسیجن کے اثر سے لوہا زنگ میں بدل جاتا ہے۔

مریخ میں بالو کے طوفان آتے رہتے ہیں۔ ان کے تھپیڑوں نے پہاڑوں کو گھس گھسا کر چپٹا بنا دیا ہے اور ان کی اونچائی دو تین ہزار فٹ سے زیادہ نہیں۔

مریخ کو دیکھ کر ہم اپنی زمین کے انجام کو سوچنے لگتے ہیں۔ جو حالت آج مریخ کی ہے وہ کبھی ہماری زمین کی ہوگی۔ مریخ ایک اتنے بڑے ریگستان سے ڈھکا ہوا ہے کہ اس کے آگے دشت صحارا بھی ہیچ ہے۔ پانی کی اس قدر کمی ہے کہ اس کے بیشتر حصے میں نباتات اگتے ہی نہیں۔ جو نباتات ہیں بھی وہ جینے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ تھوڑی سی جو روئیدگی ہے وہ مٹنے والی ہے کیونکہ بالو اسے بھی اپنی لپیٹ میں لینا چاہتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے

جب مریخ کا موسم بدلے تو وہ نباتات پیدا ہو جاتے ہیں، غائب ہو جائیں اور پیداوار کی ساری سرگرمی ختم ہو جائے۔

چونکہ مریخ کی کشش بہت کم ہے اس لئے اس میں اتنی طاقت نہیں کہ ہوا اور پانی کو روک سکے۔ اس کا کافی پانی بھاپ بن کر اڑ چکا ہے اور آکسیجن بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ ہلکی گیسیں قریب قریب سب ہی اُڑ چکی ہیں۔ بھاری گیسیں کافی مقدار میں موجود ہیں۔ چونکہ نباتات آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اس لئے ہمیں مریخ کی فضا میں ان گیسوں کے وجود کو تسلیم کرنا پڑیگا۔ نباتات خود آکسیجن بناتے ہیں۔ لیکن مریخ کی ہوا میں آکسیجن کی اتنی کمی ہے کہ شاید ہم اس میں دم توڑ دیں کیونکہ ہماری ہوا میں جتنی آکسیجن ہے اس کے ہزارویں حصے سے زیادہ مریخ میں نہیں ہے۔ مریخی فضا کا بیشتر حصہ نائٹروجن پر مشتمل ہے۔ اس میں زمین کے تناسب سے دوگنی کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے۔ مریخ کی ہوا میں پانی کی بھاپ زمین کی بھاپ کا محض ۵ فیصدی حصہ ہے۔ خط استوا کے مقابلے میں مریخ کے قطبین پر اس بھاپ کی مقدار زیادہ ہے۔ اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔

مریخ پر ہوا کے دباؤ کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اندازاً سطح زمین پر جتنا ہوا کا دباؤ ہے اس کا دسواں حصہ مریخ پر ہے۔ یوں سمجھئے کہ جتنا ایورسٹ کی چوٹی پر ہوا کا دباؤ ہے وہاں اس سے بھی کم ہے۔ کوہ پیما اچھی طرح جانتے ہیں کہ جیسے جیسے وہ کسی اونچے پہاڑ پر چڑھتے ہیں ہوا لطیف ہوتی جاتی ہے اور سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ اسی لئے اونچی چوٹیوں پر چڑھتے وقت اپنے ساتھ آکسیجن لے جانا ضروری ہے۔ اگر آکسیجن کا ذخیرہ ساتھ نہ ہو تو انسان دم گھٹ کر مر جائے۔

مریخ زمین کے مقابلے میں سورج سے پانچ کروڑ میل زیادہ دور ہے اس لئے وہاں زمین کے مقابلے میں سردی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا مدار زمین کے مدار سے بہت بڑا ہے اس لئے موسم زمین کے مقابلے میں دوگنے لمبے ہوتے ہیں۔ دن اور رات کے درجہ حرارت میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ گرمیوں کی دوپہر میں مریخ کے خط استوا پر درجہ حرارت ۵۰ درجہ فارن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے برخلاف اس کے رات کو صفر سے بھی ۹۵ درجہ نیچے گر جاتا ہے۔ اس زبردست انقلاب کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ زمین کے مقابلے میں مریخ کی فضائی دبازت بہت کم ہے۔ اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ آفتاب کی اس حرارت کو روک سکے جو مریخ کی سطح دن میں جذب کرتی ہے۔

مختصراً ان باتوں کو سامنے رکھ کر اس پر یقین مشکل سے ہو سکتا ہے کہ مریخ پر انسان جیسی مخلوق آباد ہو سکتی ہے۔ مریخ پر انسان جیسی مخلوق تو کجا حیوانات کے متعلق بھی یقینی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ وہاں پائے جاتے ہیں۔ نباتات کا وجود البتہ عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے لیکن بعض ہیئت دانوں کو اسکے بارے میں بھی شبہ ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مریخ کے نیلگوں مائل سبز دھبوں کے بعض کیمیاوی اسباب ہوں۔ اُسی طرح جیسے تانبہ کسا کر سبز ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے مریخ کی سطح پر ایسے نمک پائے جاتے ہوں جو ہوا کے اثر سے رنگ بدلتے ہیں ایک خیال یہ بھی ہے کہ مریخ کے قطبین پر جو برف نظر آتی ہے وہ برف نہیں ہے بلکہ منجمد کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے۔ اصلیت کیا ہے اس کا پتہ تو اس وقت چل سکتا ہے جب ہم خود مریخ پر جا کر اُسے دیکھیں لیکن شاید اس سے پہلے ہم خلا میں یا چاند کی سطح پر اپنی فضائی ماوراء رصدگاہیں قائم کر سکیں اور اس طرح مریخ کا زیادہ صحیح مشاہدہ کر سکیں۔ فی الحال ہمیں ۱۰ اگست ۱۹۷۱ء کا انتظار رہے جب مریخ ایک بار پھر ہماری زمین سے قریب ترین آئیگا اور جدید ترین ریڈیائی دوربینوں سے اس کا مشاہدہ کیا جائیگا۔

✱

ندرتِ خیال

ندرت کاپوری

ہر رسم عشق تابع رسم زمانہ ہے
سجدے ابھی وہی ہیں، وہی آستانہ ہے

محسوس ہو رہا ہے یہ انفاس زیست سے
اک قافلہ کہ جانب منزل روانہ ہے

جو گل ہے اس چمن میں لئے ہے ہزار حسن
ہر آئینہ بجائے خود آئینہ خانہ ہے

سجدہ مری جبیں کیلئے بار تو نہیں
آخر مری نظر میں کوئی آستانہ ہے

صحرا میں خار و خس کے سوا کچھ نہیں مگر
آسائش جنوں کیلئے اک بہانہ ہے

اب یہ بتائیے کہ مری شرح زیست میں
کتنا مبالغہ ہے، کہاں تک فسانہ ہے

آئینہ سرشت ہے ہر لفظ شعر کا
ندرت مری غزل کی ادا عاشقانہ ہے

غزل

شبیر عالم شاد

انکار ہے اشارۂ مبہم کے ساتھ ساتھ
نشتر لگا رہے ہیں وہ مرہم کے ساتھ ساتھ

اک ذوق ہے گناہ کا خوگر نہیں ہوں میں
میری شکست توبہ ہے موسم کے ساتھ ساتھ

مجھ سے جناب شیخ کے بارے میں پوچھیے
میں رہ چکا ہوں قبلۂ عالم کے ساتھ ساتھ

محو خرام، دیکھ کے اس مست ناز کو
باد نسیم چلتی ہے تھم تھم کے ساتھ ساتھ

ضدین پر ہے رونق گیتی کا انحصار
بزم نشاط ہے صف ماتم کے ساتھ ساتھ

اک آفتاب حسن سے ہے شاد کی حیات
دامانِ گل پہ قطرۂ شبنم کے ساتھ ساتھ

جونسار باور کا لوک ناچ

اتر پردیش کے لوک ناچ

خورشید احمد

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے لوک ناچوں کا تعلق عوام الناس سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ مقام، ماحول اور طبقے کے ساتھ ساتھ ان کی شکل اور نوعیت بھی بدلتی جاتی ہے۔ البتہ ایک چیز جو ہر جگہ ہر علاقے اور ہر طبقے کے لوک ناچوں میں مشترک ہوتی ہے وہ اس کا جذبات سے بھرپور ہونا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوک ناچ کا وجود ہی دلی جذبات اور امنگ کا رہین منت ہوتا ہے اسی لئے وہ بڑے دلکش سادہ اور فطری ہوتے ہیں۔

سرزمین اتر پردیش اپنے لوک ناچوں کے لئے مشہور ہے۔ مختلف قسم کے لوک ناچ جو یہیں کی پیداوار ہیں اور اسی آب و گل سے انھوں نے جنم پایا ہے زمانہ قدیم سے رائج ہیں۔ البتہ آزادی سے قبل ان کی وہ قدر نہیں کی جاتی تھی جو ہونی چاہیئے۔ آزادی کے بعد جہاں اور بہت سی قدریں بدلی ہیں وہاں لوک ناچ کے بارے میں بھی ہمارا زاویہ نگاہ تبدیل ہوا ہے اور عوام اور حکومت دونوں کی طرف سے اس کی جو حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اس کے باعث اس میں ایک نئی روح، نیا بانکپن اور تازگی پیدا ہو رہی ہے۔ اتر پردیش میں ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال کی سالگرہ کے موقع پر محکمہ اطلاعات کی جانب سے ہر سال ۱۴ نومبر کو اتر پردیش کے لوک ناچوں کا بندوبست کیا جاتا ہے اور ریاست کی مختلف ناچ پارٹیاں لکھنؤ میں اپنے رقص کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

یوں تو اتر پردیش میں مختلف قسم کے لوک ناچ رائج ہیں لیکن یہاں ان میں سے چند کا تعارف کرایا جا رہا ہے:-

منگل ناچ یہ ناچ جذبۂ تشکر و احسانمندی کے اظہار کے لئے ہوتا ہے۔ مذہب سے وابستگی کے باعث ایک طرف عوام اپنے دکھوں اور مصیبتوں کو اپنے ہی اعمال و افعال کا نتیجہ سمجھ کر قناعت کر لیتے ہیں اور دوسری طرف زندگی میں خوشی و مسرت اور سکھ کے جو چند لمحے میسر آتے ہیں انھیں خدا اور دیوتاؤں کی مہربانی اور عنایت سمجھ لیتے ہیں۔ اس لطف و عنایت کے لئے دلوں میں تشکر و امتنان کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اس کا اظہار منگل ناچ کے روپ میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ہر علاقے میں خوشی کی تقریبوں اور موقعوں پر منگل ناچ دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ عام طور سے اجتماعی رقص ہوتا ہے جس میں عورتیں اور لڑکیاں حصہ لیتی ہیں اور ایک ساتھ ناچتی ہیں۔ گت پر ترتیب و تسلسل اور ہم آہنگی کے ساتھ اٹھتے ہوئے پاؤں، بہلتے ہوئے بھاؤ اور رقص کرنے والیوں

کے گیت مل جل کر بڑا ہی دلکش اور پُر اثر سماں پیدا کرتے ہیں اور حاضرین کو مسحور کر دیتے ہیں۔ گجرات کا "گربا" راجستھان کا "گھومر" اور مہاراشٹر کا جھمّر ناچ اسی قبیل کے مشکل ناچ ہیں۔

وجے ناچ ان کا رواج ہندوستان میں زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ دشمن پر فتح پانے کے بعد گیت ــــ ناچ کے ذریعہ فتحیابی کی تقریب منانے کا رواج بہت قدیم ہے۔ اس جشن میں جہاں فتح و ظفرمندی کی مسرت و خوشی کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس کا مقصد لڑائی میں حصہ لینے والوں کی ہمت افزائی اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کرنا بھی رہا ہے۔ ہندستان کی مذہبی کتابیں وجے ناچوں کے بیان سے بھری پڑی ہیں۔ کرشن جی کا کالیے کے پھن پر رقص ان کی ایک مثال ہے۔ اس رقص میں دشمن کی شکست پر جو خوشی اور مسرت ہوتی ہے اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ اس میں مردانگی اور بہادری کا اظہار ہوتا ہے اس لئے اس رقص میں مرد ہی حصہ لیتے ہیں

دیوالی ناچ یہ ناچ بھی فتح کی تقریب سے تعلق رکھتا ہے۔ دشمن پر فتح و غلبہ پانے میں خوشی اور مسرت کے جذبات کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ یہ ناچ انھیں جذبات کا مظہر ہوتا ہے۔ ہمارے پردیش میں بندیل کھنڈ کے علاقے میں اس ناچ کا خاص طور سے رواج ہے۔ بندیلوں کی سرزمین ہمیشہ سے بہادری

دیوالی ناچ - ہمیر پور

کے لئے مشہور رہی ہے اور زمانہ قدیم سے بہادری اور مردانگی کا مظاہرہ یہاں کے باشندوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ دیوالی ناچ بہادری کے اسی مظاہرہ کا ضمنی ...

ہے۔ اس ناچ سے زرعی زندگی کا بہت قریبی رشتہ ہے۔ زرعی ملک ہونے کے باعث ہندستان میں دیوالی کا تیوہار خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تیوہار ایسے زمانے میں پڑتا ہے جب کسان بونے جوتنے کے کام سے فارغ ہو چکا ہوتا ہے اور سخت محنت و مشقت کے بعد اسے جو اطمینان ہوتا ہے اور کچھ آرام کا موقع ملتا ہے اسے وہ خوشی و مسرت کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بندیل کھنڈ میں دیوالی ناچ ہوتا ہے جس میں بہادر بندیلے اپنے حوصلے اور امنگ کا مظاہرہ کرتے ہیں کمر میں گھنگھرو باندھ کر اور طرح طرح کے رنگین کپڑے پہن کر ہاتھ میں لکڑی لے کر یہ لوگ جب جوش و خروش سے ناچتے ہیں اس سے ان کی خوشی و مسرت اور امنگ و ولولے کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کرما ناچ ہمارے پردیش میں آدیواسی ہمیشہ سے عوامی آرٹ کے سچے پجاری رہے ہیں اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عوامی آرٹ کی سچی قدر و منزلت آدیواسی سماج ہی میں ملے گی۔ پس ماندگی کے زمانے میں آرٹ سے ان کی وابستگی ہی ان کے جذبات خوشی و مسرت کی حفاظت کرتا رہا ہے۔ اب بدلے ہوئے حالات میں ان کا آرٹ ترقی پذیر ہے۔ دودھی علاقے کے آدیواسیوں کا کرما ناچ اسی عوامی آرٹ کی ایک شکل ہے۔ کرما ایک درخت ہے جسے دودھی کے آدیواسی بہت ہی مقدس اور سرچشمۂ فیض و برکت مانتے ہیں۔ ان کے یہاں دیوالی کے موقع پر

کرما ناچ

اس درخت کی ٹہنیاں لے کر بہت سے لوگوں کا ایک ساتھ مل کر ناچنے کا رواج ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس ناچ سے ان کی مشکلات پریشانیاں اور مصیبتیں دور ہوں

کی اور کھاسیالیان کا پتہ چلتے گا۔ اس ناچ کا آغاز دیوالی سے ہوتا ہے اور بہار آنے تک چھا بسیوں کے علاوہ پورے سال چلتا رہتا ہے۔ ناچ کے ساتھ جو گیت گائے جاتے ہیں ان میں عام طور پر رام اور کرشن کی تعریف و توصیف ہوتی ہے۔ یہ ناچ ادیواسیوں کی زندگی اور ان کے تمدن میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اس سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

چھپیلی ناچ کمایوں کی سرسبز وادیوں میں رہنے والے مرد عورتوں میں جو معصومیت بھولا پن، سادگی، بے فکری اور امنگ پائی جاتی ہے اس کا اثر ان کے لوک ناچوں میں بڑی حد تک دکھائی دیتا ہے کمایوں کے علاقے میں سب سے زیادہ مقبول اور دل پسند ناچ چھپیلی ناچ ہے اس وجہ سے اس کا یہاں عام رواج ہے۔ عام طور پر تیوہاروں اور تقریبوں کے موقعوں پر یہ ناچ ہوتا ہے۔ اس ناچ میں دو ہی ناچنے والے ہوتے ہیں موقع کے لحاظ سے یہ محبوب اور محبوبہ بھائی بہن، باپ بیٹے غرض کوئی دو افراد ہو سکتے ہیں۔ ناچ میں حصہ لینے والے افراد کے اعتبار سے ناچ کا موضوع بھی بدلتا جاتا ہے۔ لیکن یہ موضوع بہرحال طربیہ اور ولولہ انگیز ہوتا ہے۔ ناچ کے ساتھ ساتھ ہم سروں میں ہُرکا، اور بانسری بجتی رہتی ہے اور ناچنے والے دل کش دھن میں گیت گاتے جاتے ہیں۔ یہ سب مل جل کر ایسا سماں پیدا کرتے ہیں کہ دیکھنے والے مسرور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چھپیلی ناچ پہاڑی مردوں اور عورتوں کے جذبات مسرت، رنگینی اور کیف و مستی کا پوری طرح آئینہ دار ہوتا ہے۔

گھیاری ناچ کمایوں کے گھیاری ناچ میں دیہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے۔

اتر پردیش کے کمایوں علاقے کے باشندوں کی روزانہ زندگی پر ہمالیہ کی وادیوں، پہاڑوں کی ناہموار زمینوں اور پہاڑی آب و ہوا کا نمایاں اثر ہے۔ پہاڑی عورتیں اپنے مویشیوں کے لئے چارے کی فراہمی اور دوسری ضرورتوں کے سلسلے میں پہاڑ کے گھنے جنگلوں میں گھاس وغیرہ کاٹنے جایا کرتی ہیں۔ جنگلوں میں تنہا جانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا اس لئے یہ عورتیں ٹکڑیاں بنا لیتی ہیں اور جنگل میں کام کرتے کرتے جب تھک جاتی ہیں تو دل بہلانے اور تھکان دور کرنے کا ذریعہ رقص و موسیقی کے ذریعہ فراہم کر لیتی۔ ان کا یہ رقص گھیاری ناچ کہلاتا ہے۔ موقع کے لحاظ سے اس رقص میں گھاس کاٹنے کے تمام عمل بھاؤ اور اشاروں کے ذریعہ ظاہر کئے جاتے ہیں۔ اس رقص کے ساتھ جو گیت گائے جاتے ہیں ان میں گاؤں کی دوشیزاؤں کو گھاس کاٹنے کے لئے ساتھ چلنے کی دعوت ہوتی ہے۔ اس رقص میں جسم کی حرکت، اشارے اور تحریک پیدا کرنے والے نغمے دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تفریح کے

چھپیلی ناچ۔ المواڑہ

ساتھ محنت کی عظمت کا مظاہرہ اس رقص کی خاص خصوصیت ہے۔

رقص مسرت انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ خوشی اور اطمینان کے ایک لمحے کو رائیگاں نہیں کرتا اور اس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ رقص مسرت اس کی اس خواہش کا آئینہ دار ہے۔ شادی بیاہ، پیدائش اور سالگرہ وغیرہ کے مواقع ایسے ہوتے ہیں جن میں نہ صرف گھر کے لوگ بلکہ دوست احباب، پڑوسی اور دور کے اعزہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر عورتوں کے جذبات مسرت وشادمانی تمام بندھن توڑ دیتے ہیں اور اسی کے نتیجہ میں رقص مسترت کا جنم ہوا۔ اس رقص میں صرف عورتیں حصہ لیتی ہیں اور عام طور پر یہ عورتوں ہی کے دیکھنے کے لئے ہوتا بھی ہے۔ یہ رقص تر نہ پر دیش ہی نہیں بلکہ ملک کے ہر حصہ میں رائج ہے۔ یہ رقص ایسے جوش وولولے اور سرشاری کے ساتھ ہوتا ہے کہ ساری فضا سے خوشی ومسرت برسنے لگتی ہے۔ یہ رقص کمایوں کے مختلف جاتیوں (ذاتوں) میں بھی رائج ہوا اور ایک گاؤں کے رہنے والے مشترکہ طور پر بھی اس میں حصّہ لیتے ہیں۔

جاپنچری ناچ اس میں مرد وعورتیں یکساں طور پر شریک ہوتے ہیں۔ یہ رقص ایک دائرہ بنا کر کیا جاتا ہے۔ دائرہ کی ایک جانب مرد اور دوسری جانب عورتیں ہوتی ہیں۔ دائرے کے بیچوں بیچ ہڑکا بجانے والا اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ہوتا ہے۔ اس کے یہ ساتھی مجیرا اور جھانجھ بجاتے ہیں۔ ہڑکا بجانے والا جو رقص کا ہدایت کار بھی ہوتا ہے گیت گاتا ہے اور ساتھ میں رقص سے متعلق ہدایت دیتا جاتا ہے۔ یہ گیت پہلے مرد گاتے ہیں اور پھر عورتیں اسے دہراتی ہیں۔ اس رقص کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حصّہ لینے کے لئے کسی مشق یا تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس رقص میں مقررہ انداز سے پیر اٹھتے اور گرتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ رقص کرنے والے گاتے بھی رہتے ہیں۔ رقص کرنے والوں کے انداز ان کے رنگ برنگے اور دلکش لباس اور وضع قطع کچھ ایسی ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں ان پر جمی رہتی ہیں۔ جاپنچری رقص کے لئے کسی مخصوص میلے، جشن یا تیوہار کی قید نہیں۔ ہر موقع پر اس رقص کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

تلوار رقص اسے چھولو جا رقص بھی کہتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں جو لوک ناچ رائج ہیں ان میں یہ رقص بھی بہت مقبول ہے۔ یہ تقریبات کا رقص ہے اور راجپوتوں کی شادی بیاہ کے موقع پر ہوا کرتا ہے۔ یہ رقص اس قدیم رواج کی یادگار ہے جس کے مطابق دولہا دلہن کو اٹھا لے جاتا تھا اور اس سے شادی کر لیتا تھا۔ اس زمانے میں براتیں ہمیشہ اسلحہ سے مسلح ہو کر

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۱ پر)

گڑھوال کا ایک لوک ناچ

اترپردیش شاہراہ ترقی پر

اترپردیش میں صنعت کاری کی ہمہ گیر ترقی • • • خدمتی امداد باہمی سوسائیٹیوں کے سلسلہ میں سرکاری پالیسی کی وضاحت • • • امداد باہمی کاشت کی روزافزوں مقبولیت • • • مالیاتی کارپوریشن کے ذریعے تقریباً دو کروڑ کے قرضے • • • گھریلو اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو مزید سہولتیں • • • تیسرے پنجسالہ منصوبہ میں غلہ کی پیداوار • • • ترقیاتی پروگراموں کی ترتیب تیسرے منصوبہ میں • • • نوجوانوں کے ۲۹ ہزار کلب قائم کرنے کی تجویز • • • پنچایتوں کے استحکام کی تدابیر • • • گیہوں اور گنے کی کاشت کا نیا تجربہ • • • ہریجنوں کی تعلیم کے لئے امداد • • • ریاستی شعبۂ خریداری • • • کیمیاوی اشیاء کی کھپت میں اضافہ

اترپردیش میں ۵۹-۱۹۵۸ء کے دوران میں صنعت کاری کی رفتار ترقی سے متعلق ریاستی نظامت صنعت کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس میدان میں ہمہ گیر ترقی ہوئی ہے۔

بھاری صنعتوں کی ترقی کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گذشتہ چار برسوں کے دوران میں ۲۰۵ فیکٹریوں کو نئی صنعتوں کے قیام یا موجودہ واحدوں میں توسیع کے لئے لائسنس دیے گئے۔ زیر نظر سال میں امداد باہمی شکر فیکٹری باز پور میں جس کی یومیہ پیداواری صلاحیت ۱۰۰۰ ٹن ہے کام شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم اقدام ہندوستان اور امریکہ کے اشتراک سے لکھنؤ میں تاریچ کی فیکٹری کا قیام ہے۔ یہ فیکٹری ۸۰ لاکھ روپیہ سے زائد لاگت سے قائم کی گئی ہے۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ امریکی ماہرین کی ایک جماعت کیمیاوی ربڑ کی فیکٹری کے محل وقوع کے سلسلہ میں بریلی گئی تھی۔

زیر نظر سال میں گورنمنٹ انسٹرومنٹ پریسیژن فیکٹری نے دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے دوران میں ماہانہ ۳ ہزار واٹر میٹر تیار کرنے کے مقررہ نشانہ کو پار کر لیا ہے۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ اس فیکٹری میں ہر سال ۳۰۰ خوردبینیں تیار ہو رہی ہیں اور اس فیکٹری میں اسٹیتھسکوپ۔ کان، ناک اور حلق کے امراض کی تشخیص کے آلات اور دباؤ کے ناپنے کے آلات وغیرہ بھی تیار ہونے لگے ہیں۔ علاوہ ازیں فیکٹری میں ٹائم پیس اور کلاک بھی تیار کرنے کی تجویز ہے۔

چرک سیمنٹ فیکٹری میں اپریل ۱۹۵۸ء سے ۱۵ جنوری ۱۹۵۹ء تک تقریباً ۱۵،۶۶۲ ٹن سیمنٹ تیار ہوئی اور زیر نظر سال میں فیکٹری کی پیداواری صلاحیت دُگنی کرنے کی اسکیم شروع کی گئی۔

الہ آباد کے قریب نینی کی صنعتی ریاست کے سلسلہ میں بھی کافی کام ہوا۔ اس صنعتی ریاست کی تمام ۴۲ فیکٹریاں صنعت کاروں کو الاٹ کر دی گئی ہیں اور کچھ فیکٹریوں میں مال تیار ہونے لگا ہے۔ ان فیکٹریوں میں زرعی آلات فولاد کے فرنیچر، فاؤنٹن پین اور چشمہ کے سامان وغیرہ تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہاں ایک کتائی مل میں کام شروع ہو گیا ہے جس میں ۲۵ ہزار تکلیاں ہیں۔ گھریلو اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کے لئے نظامت صنعت کی جانب سے ۸۰ سے زیادہ اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں جن کے تحت ان صنعتوں کو مالی امداد، فنی رہنمائی اور مال کی نکاسی وغیرہ کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ ۵۸-۱۹۵۷ء میں پاور الکحل تیار کرنے کی ۱۲ بھٹیوں میں ۱۵۱،۰۹۹ گیلن پاور الکحل تیار ہوا۔ پاور الکحل کو مختلف اغراض کے لئے استعمال کرنے کے علاوہ اس کو پٹرول میں بھی ملایا جاتا ہے۔ یہ پٹرول دوسری ریاستوں کو برآمد بھی کیا جاتا ہے۔ ۵۸-۱۹۵۷ء میں ۲۷،۸۲۴۲۹ گیلن پاور الکحل پٹرول میں ملایا گیا۔

• • •

حکومت اترپردیش نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ خدمتی امداد باہمی سوسائیٹیوں کے قیام اور ان کو تقویت پہنچانے کو ریاستی مہم کا ایک جز سمجھنا چاہیے۔ اس لئے سائٹیوں

کا قیام مقررہ تاریخ یعنی یکم نومبر ۱۹۵۹ء تک عمل میں آجانا چاہیئے۔

ڈولپمنٹ کمشنر نے اس سلسلہ میں تمام ضلع مجسٹریٹوں کے نام ایک گشتی چٹھی میں کہا ہے کہ عام طور پر خدمتی سوسائٹیوں کی تنظیم گاؤں سبھاؤں کی بنیاد پر کی جائے گی۔ حکومت ہند نے اس ریاست کے لئے ۱۰ ہزار خدمتی سوسائٹیاں الاٹ کی ہیں۔ مرکزی حکومت ہر سوسائٹی کو ۵ سال کے لئے ۸۰۰ روپیہ تک کی مالی امداد دے گی۔ پہلے سال ۳۰۰ روپیہ تک بطور رعایتی امداد دیا جائے گا چونکہ زراعتی پیداوار کی خرید و فروخت کرنا ان سوسائٹیوں کا ایک ضروری کام ہوگا اس لئے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کو مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے علاقہ میں قائم کیا جائے گا۔ سال رواں میں ۵۰ خدمتی امداد باہمی سوسائٹیاں قائم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا ۱۰ ہزار سوسائٹیوں میں سے تقریباً ۴۰۰۰ نئی سوسائٹیاں ہوں گی جن کا قیام عمل میں آئے گا اور تقریباً ۶۰۰۰ موجودہ سوسائٹیوں کو خدمتی سوسائٹیوں میں تبدیل کیا جائے گا۔ ان سوسائٹیوں سے متعلق ذیلی قوانین چھپ گئے ہیں جن کو اضلاع میں تقسیم کیا جائے گا۔

ڈولپمنٹ کمشنر نے اپنی چٹھی میں اس پروگرام کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے پوری پوری کوشش کرنا چاہیئے۔ چٹھی میں مزید کہا گیا ہے کہ موجودہ ربیع مہم کے دوران میں خدمتی امداد باہمی سوسائٹیوں کے قیام اور منتخب مواضعات کے لئے مکمل پیداواری پروگرام مرتب کرنے کو خاص اہمیت دینا چاہیئے۔

حکومت کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے گشتی چٹھی میں یہ بتایا گیا ہے کہ امداد باہمی پالیسی کی سب سے اہم خصوصیت ریاست کے تمام دیہاتوں میں ابتدائی امداد باہمی سوسائٹیوں یعنی خدمتی امداد باہمی سوسائٹیوں کی تنظیم کرنا اور اس کو فروغ دینا ہے۔ یہ سوسائٹیاں گاؤں کے لئے ایک زراعتی پیداواری پروگرام مرتب کریں گی اور کسانوں کے لئے قرضہ۔ کھاد۔ بیج۔ جدید زرعی آلات اور آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی کا بندوبست کریں گی۔

• • •

اتر پردیش میں امداد باہمی کاشت کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔ ریاست میں مزید دو امداد باہمی کاشت انجمنوں اور ایک مشترکہ کھیتی انجمن کا رجسٹریشن ہوا ہے۔

اتر پردیش میں سال رواں کے دوران میں ۱۷ امداد باہمی کاشت انجمنوں کا رجسٹریشن ہو چکا ہے جبکہ پورے سال میں ۲۰ انجمنوں کے قیام کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔

اتر پردیش میں اس وقت مشترکہ کاشت کی ۲۱۸، اجتماعی کاشت کی ۱۸ اور بہتر کاشت کی ۹۷ انجمنیں قائم ہیں۔

امداد باہمی فارموں کا زیر کاشت رقبہ بڑھ کر ۷۴،۶۹۰ ایکڑ اور ان کے ممبروں کی تعداد بڑھ کر ۱۹۶۱۷ ہوگئی ہے اور انجمنوں کا سرمایہ حصص بڑھ کر ۱۷،۳۴۳۳۹ روپیہ ہوگیا اور ان کے ذمہ ۵،۷۴۸۹ روپیہ کا قرضہ ہے۔ ان انجمنوں نے ۱۸۱۵۹۸۲ روپیہ جمع کیا۔

حکومت نے امداد باہمی کاشت انجمنوں کو ٹریکٹروں کی خریداری کے لئے ایک لاکھ ۴۴ ہزار روپیہ دیا ہے۔ ان ٹریکٹروں کے ذریعہ بنجر زمین کو قابل کاشت بنایا جا سکتا ہے

رامپور۔ بریلی اور ایسے دوسرے اضلاع میں جہاں بڑی تعداد میں ٹریکٹر موجود ہیں، ٹریکٹروں کی سروسنگ اور مرمت کے لئے ایک مرکزی ورکشاپ کے قیام کی تجویز ہے۔

کچھ مرکزوں میں بلاک یونٹوں سے کہا جائے گا کہ وہ زمین کی بازیابی کے لئے چند ٹریکٹر رکھیں۔

محکمہ صنعت کے تعاون سے ویربھدر ٹیننٹ فارمنگ سوسائٹی (دہرہ دون) میں ریشم کے کیڑے پالنے کا ایک مرکز قائم کیا گیا ہے اور سوسائٹی کے ممبروں کو ریشم تیار کرنے کی ضروری تربیت دی جا رہی ہے۔ تھانواری امداد باہمی کاشت انجمن جھانسی نے چمڑہ کمانے اور جوتا بنانے کا کاروبار شروع کیا ہے اور رام نگر ڈانڈا امداد باہمی کاشت انجمن دہرہ دون میں رسی بنانے کے علاوہ تیل کی پیرائی کا کام بھی شروع کیا گیا ہے۔

• • •

یو۔پی مالیاتی کارپوریشن نے اپنے قیام کے تین سال کے دوران میں ۲۵۴ صنعتی کاموں کے لئے مجموعی طور پر ایک کروڑ ۴۸ لاکھ روپئے کے قرضے منظور کئے ہیں۔ اس میں ۶۱ء۷۰ لاکھ روپے کے سرکاری

قرضے بھی شامل ہیں جو آسان شرطوں اور کم سود کے قرضوں کی اسکیم کے تحت منظور کئے گئے ہیں۔ کارپوریشن ان قرضوں کی منظوری اور ادائیگی کے لئے ریاستی حکومت کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا ہے۔

مذکورہ بالا منظور شدہ رقم میں سے تقریباً ایک کروڑ ۱۹ لاکھ روپئے اب تک مختلف پارٹیوں کو ادا کیا جا چکا ہے۔ ۴۶ لاکھ روپیہ کے منظور شدہ قرضے ضروری قواعد کی عدم تعمیل کی بنا پر منسوخ کر دیئے گئے۔

۱۱ موصولہ درخواستوں میں سے ۱۹۴ درخواستیں جو ۲،۳۸ کروڑ روپیہ کے قرضوں کے لئے تھیں خارج کر دی گئیں اور ۱،۱۹ کروڑ روپیہ کے قرضوں کی ۷۷ درخواستیں واپس لے لی گئیں۔

مالیاتی کارپوریشن نجی سیکٹروں کی صنعتوں کو سرمایہ بہم پہنچانے کے لئے کانپور میں نومبر ۱۹۵۴ء میں قائم کیا گیا ہے۔

اس کارپوریشن کے ذریعہ ۲۴۲ چھوٹے پیمانہ۔ ۹ درمیانی اور ۱۳ بڑے پیمانہ کی صنعتیں مستفید ہوئیں جن کو بالترتیب ۸۴ لاکھ روپیہ۔ ۲۵ لاکھ روپیہ۔ اور ۷۵ لاکھ روپیہ کے قرضے منظور کئے گئے۔

کارپوریشن نے اپنے مالی وسائل کو بڑھانے کے لئے گذشتہ مالی سال کے دوران میں ۵۰ لاکھ روپیہ کی ظاہری مالیت کے بانڈ جاری کئے۔ کارپوریشن کو اپنے قیام کے بعد سے ۱۰،۹۵ لاکھ روپیہ کا خالص منافع ہوا ہے۔

کارپوریشن نے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کے ساتھ جو انتظام کیا ہے اس کے مطابق چھوٹے اور درمیانی پیمانہ کی صنعتوں کے لئے قرضہ کی درخواست دینے والے بینک یا کارپوریشن یا دونوں سے قرضے حاصل کر سکتے ہیں۔

کارپوریشن سے ایک پارٹی کو زیادہ سے زیادہ ۱۰ لاکھ روپے کے قرضے مل سکتے ہیں۔ قرضہ پر ساڑھے چھ فی صدی سالانہ سود لیا جاتا ہے اور پابندی وقت کے ساتھ قسطوں کی ادائیگی پر نصف فی صدی کی چھوٹ دی جاتی ہے۔ سرکاری قرضے ۳ فی صدی سالانہ سود پر دیے جاتے ہیں۔ ایک پارٹی کو زیادہ سے زیادہ ۵۰ ہزار روپیہ تک سرکاری قرضہ دیا جا سکتا ہے۔

● ● ●

ریاستی قرضہ اور مالی امداد کمیٹی نے اپنے ایک حالیہ جلسہ میں ریاست میں گھریلو اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کے لئے ایک لاکھ ۷۰،۵ ہزار روپیہ کے قرضے اور ۹۰ ہزار روپیہ کی مالی امداد منظور کی۔ مذکورہ رقومات کی منظوری سے مالی سال رواں کے دوران میں منظور شدہ قرضوں اور مالی امداد کی مجموعی رقم بالترتیب ۶،۸۵ لاکھ روپیہ اور ایک لاکھ روپیہ ہو گئی ہے۔

ایک لاکھ ۷۰،۵ ہزار روپیہ کے اس قرضہ میں سے غذائی صنعتوں کو ایک لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ، انجینئرنگ صنعتوں کو ۵۳ ہزار روپیہ اور کیمیاوی صنعتوں کو ۱۲ ہزار روپیہ منظور کیا گیا۔ مالی امداد کے لئے منظور شدہ رقم میں سے ۷۰ ہزار روپیہ صنعتی اداروں اور ۲۰ ہزار روپیہ سابق تربیت پانے والوں اور بیواؤں وغیرہ کو دیا گیا۔

کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ بیواؤں کو ۲۵۰ روپیہ فی کس اور سابق تربیت پانے والے اور دوسرے مستحق اشخاص کو ۲۰۰ روپیہ کے حساب سے مالی امداد دی جائے۔

قسطوں پر مشین خریدنے کے خواہشمند درخواست دہندگان کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اس مقصد کے لئے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے قومی کارپوریشن سے رجوع کریں۔

یہ کمیٹی ایک پارٹی کو شخصی ضمانت پر ایک ہزار روپیہ تک قرضہ منظور کرتی ہے۔ اب صرف ایک صاحب حیثیت شخص کی ضمانت پر ۲ ہزار روپیہ تک قرضہ دیا جا سکتا ہے۔ کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ بینک کی ضمانت پر بھی قرضہ منظور کیا جائے۔

جلسہ میں یہ بھی بتایا گیا کہ کمیٹی نے ۵۳-۱۹۵۲ء سے اب تک مجموعی طور پر ۵۸ لاکھ روپیہ کے قرضے منظور کئے ہیں جس میں سے اصل رقم کے طور پر صرف ۵،۶۲ لاکھ روپیہ باقی ہے۔

ایک فرد کو قرضہ اور مالی امداد کے طور پر بالترتیب ۱۰ ہزار روپیہ اور ۲ ہزار روپیہ تک اور امداد باہمی انجمنوں کو ۱۵ ہزار روپیہ اور ۶ ہزار روپیہ تک منظور کیا جا سکتا ہے۔ ان قرضوں کو آسان قسطوں میں ۳ فی صدی سالانہ سود کے ساتھ ادا کرنا ہوتا ہے۔

● ● ●

ریاستی محکمہ منصوبہ بندی نے تیسرے پنجسالہ منصوبہ کا جو خاکہ بنایا ہے

اس میں تیسرے منصوبہ کے اخیر تک مجموعی طور پر ۱۹۵۰۵۳ لاکھ ٹن غلہ پیدا کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے۔ ریاست کے تیسرے منصوبہ کو قطعی شکل دینے سے متعلق غور و خوض ہو رہا ہے۔

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ تیسرے منصوبہ کے تحت مذکورہ مقدار میں غلہ پیدا کرنے پر ۱۶۹٫۷۸ کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ تیسرے منصوبہ کے تحت ۶۹٫۴۳٫۰۸۶ لاکھ روپیہ کی لاگت کی آبپاشی کی بڑی اور درمیانی اسکیموں کے ذریعہ ۵٫۷ لاکھ ٹن اور ۸۳۹۲۷۵۶۸ روپیہ کی لاگت کی آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں کے ذریعہ ۴۶٫۴۳ لاکھ ٹن غلہ پیدا ہونے کی امید ہے۔

آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں کے تحت دیگر کاموں کے علاوہ ۱۲۳۰ ٹیوب ویل لگائے جائیں گے اور متعدد چھوٹے تخزانۂ آب۔ تالاب۔ پہاڑی علاقوں میں نالیاں اور جنوبی اتر پردیش میں بندھیاں تعمیر کی جائیں گی۔

تیسرے منصوبہ کے تحت ۴۰ لاکھ ایکڑ آراضی میں جاپانی طریقہ سے دھان کی کاشت اور ۵۰ لاکھ ایکڑ آراضی میں اتر پردیش کے طریقہ سے گیہوں کی کاشت شروع کرنے اور ۱۲٫۷۵ ایکڑ کے رقبہ میں مٹی کے تحفظ کے اقدامات کرنے کی تجویز ہے۔

ریاست میں ۴۷٫۹۶ لاکھ ایکڑ قابل کاشت بنجر زمین ہے۔ دوسرے منصوبہ کی طرح تیسرے منصوبہ میں بھی ایسی ۱۵ ہزار ایکڑ زمین کی بازیابی کی تجویز ہے جس پر کل ۸۰٫۵۴ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ تجارتی فصلوں کی کاشت کے پروگرام کے تحت ایک لاکھ ۷ ہزار گانٹھیں جوٹ پیدا کرنے کی تجویز ہے۔

نگہداشت مویشیان سے متعلق تحقیق کی مجوزہ اسکیموں کے عملدرآمد پر ۲۷٫۳۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا اور نگہداشت مویشیان کی تربیت کے پروگرام کے لئے ۱۰۰٫۹۹ لاکھ روپیہ مخصوص کرنے کی تجویز ہے۔

بھیڑوں اور اون کی ترقی کی ۱۲ اسکیمیں وضع کی گئی ہیں۔ جن پر کل ۹۴٫۷ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

تیسرے منصوبہ میں شامل کرنے کے لئے جنگلات کی ترقی کی مجوزہ اسکیموں پر ۱۵٫۱۱ کروڑ روپیہ صرف ہوگا اور تقریباً ایک لاکھ ایکڑ کے رقبہ میں مٹی کے تحفظ کا پروگرام شروع کرنے کی تجویز ہے اور متھرا، آگرہ اور اٹاوہ کے اضلاع اور مرکزی اور مغربی منطقوں میں ۲۵ ہزار ایکڑ کے رقبہ میں درخت لگانے کی تجویز ہے۔ گنگا کھولا کے علاقہ میں ۲۰ ہزار ایکڑ کے رقبہ میں جنگل لگانے کا کام جاری رہے گا اور بندیلکھنڈ کے منطقہ مرزاپور اور وارانسی کے اضلاع کے سول ڈویژن کے ۲۵ ہزار ایکڑ کے رقبہ میں جنگل لگانے کی تجویز ہے۔

مٹی کے تحفظ کے مذکورہ پروگرام پر ۲ کروڑ روپیہ صرف ہونے کی امید ہے۔

مچھلیوں کی افزائش نسل کی اسکیموں پر ۴۳٫۰۵ لاکھ روپیہ صرف کرنے کی تجویز ہے۔

• • •

ریاست کے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کا جو خاکہ تیار کیا جا رہا ہے اس میں منصوبہ کی اسکیموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈیولپمنٹ کمشنر نے محکمہ منصوبہ بندی اور متعلقہ محکموں کے افسران کو ایک گشتی چٹھی بھیجی ہے۔

پہلے حصہ میں وہ پروگرام شامل ہیں جو گاؤں اور بلاک کی سطح پر مقامی وسائل اور محنت، شرمدان، پنچایت وغیرہ کے ذریعہ سے انجام پائیں گے جیسے تالابوں، نالیوں، چھوٹے باندھوں کی تعمیر اور ندامتی پروگرام وغیرہ۔ دوسرے حصہ کے پروگرام کے تحت وہ اسکیمیں آتی ہیں جن کو عوام ضلع اور بلاک کی مالی اور فنی امداد سے بلاک اور گاؤں کی سطح پر بروئے کار لائیں گے۔ ان میں کنوؤں، چھوٹے پلوں کی تعمیر اور پرائمری اسکولوں اور ڈسپنسریوں وغیرہ کا قیام شامل ہے۔ تیسرے حصہ میں محکمہ جات پیچیدہ اسکیموں کو عوام کے مقامی نمائندوں کے صلاح و مشورہ سے عملی جامہ پہنائیں گے۔ ایسی اسکیموں میں اسپتال۔ ہائر سکنڈری اسکول۔ ٹیوب ویل۔ ورکشاپ سڑک اور پل شامل ہیں۔ چوتھے حصہ میں صرف وہ بڑی اسکیمیں آتی ہیں جو صرف حکومت کے وسائل یا پرائیویٹ صنعت کاروں کی جانب سے بروئے کار لائی جائیں گی۔ ان اسکیموں میں آبپاشی۔ بجلی اور صنعت کے بڑے پراجکٹ شامل ہیں۔

گشتی چٹھی میں افسران سے کہا گیا ہے کہ وہ امداد باہمی سوسائٹیوں کی تنظیم کے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ نئے ممبر بنانے میں ہر کنبہ کی نمائندگی ہو جائے۔

بلاک ڈیولپمنٹ افسران سے کہا گیا ہے کہ وہ کمپوسٹ اور ہری

کھاد کی پیداوار بڑھانے، علاقہ میں دھان کی جاپانی طریقہ سے کاشت اور گیہوں کی یو۔پی طریقہ سے کاشت، قطاروں میں بوائی اور دو فصلوں کی بوائی کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ کام کریں۔

اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ اجتماعی ترقیاتی پروگراموں کو فروغ دینے کے لئے پودک منگل دَلوں اور مہیلا اور یودک منگل دَلوں کی تنظیم کافی اہمیت رکھتی ہے اس لئے مقامی پنچایتیں اور دَلوں کی تنظیم کا کام بلاک کے عملہ کی مدد سے اپنے ہاتھ میں لے لیں گی۔

• • •

حکومت اتر پردیش نے تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت دو سال کے کورس کی بنیاد پر گرام سیوکوں کی تربیت کا پروگرام مرتب کیا ہے جو کئی مرحلوں میں مکمل ہوگا اور جس پر تخمیناً ۲۷۰۹،۳۳ لاکھ روپیہ صرف ہوگا جس میں سے ۸۰۴ لاکھ روپیہ کی رقم غیر متواتر اور ۳۳،۲۲۸ لاکھ روپیہ کی رقم متواتر ہوگی۔

پروگرام کے تحت ہر بلاک میں گرام سیوکوں کی تعداد دگنی کی جائے گی اور تیسرے منصوبہ کے اخیر تک تمام ۲۴ تربیتی مرکزوں میں تربیت دینے کا کام جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ ۸ ہزار پنچایت سکریٹریوں کی تربیت کے لئے مزید تربیتی مرکز قائم کئے جائیں گے۔

امید کی جاتی ہے کہ مرکزی حکومت کل غیر متواتر اخراجات اور متواتر اخراجات کا نصف ادا کرے گی۔

پروگرام کے تحت توسیعی تربیتی مرکزوں کے قرب و جوار میں قائم کئے گئے نوجوانوں کے کلبوں کے لئے اقتصادی پروگراموں کی رفتار ترقی تیز تر کرنے کی بھی تجویز ہے اس اسکیم پر تیسرے منصوبہ کی مدت میں تخمیناً ۱۳۷،۵۰۰ روپیہ خرچ ہوگا۔

دیہی کاریگروں کے تربیتی پروگرام کو آگے بڑھانے کے لئے ہر توسیعی تربیتی مرکز سے ایک کارگاہ ملحق کرنے کی تجویز ہے۔ اس اسکیم پر تخمیناً ۶،۳۵،۰۰۰ روپیہ صرف ہوگا۔

پروگرام کے تحت گرام سہائکوں کی تربیت جاری رہے گی۔ اس سلسلہ میں تیسرے منصوبہ کے دوران میں تقریباً ۲۲۵۰۰۰ اشخاص کو تربیت دی جائے گی جس پر تخمیناً ۶۷۵۰۰۰۰ روپیہ خرچ ہوگا۔

دیہات کے اسکولوں کے ٹیچروں کو ایک ماہ کی مدت کے تربیتی کیمپوں میں تربیت دینے کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اتر پردیش میں ایسے ٹیچروں کی کل تعداد ۱۲۰۰۰۰ ہے جس میں سے ۳۰ ہزار ٹیچروں کو تربیتی کیمپوں میں تربیت دی جائے گی جس پر تخمیناً ۲۷۰۰۰۰۰ روپیہ خرچ ہوگا۔

• • •

تیسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں نوجوانوں کے ۲۹ ہزار کلب قائم کرنے کی تجویز ہے۔ دوسرے منصوبہ کے اختتام تک ریاست میں نوجوانوں کے کلبوں کی تعداد بڑھ کر ۱۱۰۰۰۰ ہو جانے کی امید ہے۔ نوجوانوں کے کلب اجتماعی ترقیاتی پروگرام کی تکمیل میں گاؤں والوں کی مدد کرتے ہیں۔ اس وقت یہ کلب لڑکوں کے لئے مخصوص ہیں لیکن تیسرے منصوبہ کے دوران میں لڑکیوں کے کلب بھی قائم کئے جائیں گے۔ محکمہ سماجی فلاح کے تحت خواتین کی بہبود و ترقی کے اداروں کی جانب سے عورتوں کے گروپوں کی تنظیم کی جا چکی ہے۔ ان گروپوں کو مجوزہ اسکیم کے تحت لایا جائے گا۔ میسور میں منعقدہ اجتماعی ترقی سے متعلق کانفرنس کی سفارشات کے مطابق تیسرے منصوبہ کے تحت نوجوانوں کے پروگرام کے لئے ہر بلاک کو ۱۰ ہزار روپیہ کی رقم الاٹ کی جائے گی۔

تربیت کی مقررہ مدت کے بعد نوجوانوں کا ہر کلب غلہ کی پیداوار بڑھانے اور چھوٹی بچت کی مہموں میں شرکت کرنے کے علاوہ زراعت، نگہداشت مویشیان اور دوسرے اقتصادی منصوبوں کی تکمیل میں ہاتھ بٹائے گا۔ اس کے علاوہ یہ کلب دیہاتوں میں صفائی کا خیال رکھیں گے اور دیہی علاقوں میں توسیع تعلیم کی اسکیم کو آگے بڑھائیں گے۔

• • •

ریاستی ترقیاتی رابطہ کمیٹی کے ایک حالیہ جلسہ میں اجتماعی ترقی کے پروگرام کے لئے عوام کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنے اور پنچایتوں کو مستحکم کرنے کی تدابیر پر غور و خوض کیا گیا۔

اس جلسہ میں اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ پنچایتوں کے عہدہ داروں کو ضروری تربیت دی جائے تاکہ پنچایتوں کو ذمہ داریاں سپرد کرنے میں آسانی ہو۔

جلسہ میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ گاؤں سبھاؤں کو ۵۰۰ روپیہ کی مجموعی

مالیت کے کاموں کی تکمیل کی ذمہ داری سپرد کی جائے۔ ایسی گاؤں سبھاؤں کو جن کے پاس ضروری وسائل نہیں ہیں ڈائرکٹر پنچایت راج اپنے ۵ لاکھ روپیے کے فنڈ سے قرضہ منظور کریں گے۔

دسمبر ۱۹۵۹ء کو ختم ہونے والی سہ ماہی کے ترقیاتی پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے جلسہ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شرمدان کو اولیت دی جائے اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ نومبر میں چیچک کے ٹیکے لگانے اور دیوالی کی تعطیل میں صفائی کی مہم شروع کی جائے گی اور اسکول کی عمارتوں کی تعمیر کا پروگرام نومبر اور دسمبر کے مہینوں میں شروع ہوگا۔

اجتماعی ترقی سے متعلق میسور کانفرنس کی روئداد کا ذکر کرتے ہوئے ڈیولپمنٹ کمشنر نے جو جلسے کی صدارت کر رہے تھے کہا کہ اجتماعی ترقیاتی پروگرام پر عملدرآمد کے لئے گاؤں سبھا، امدادباہمی انجمن اور دیہی اسکول کو تقویت پہنچائی جا رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میسور کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ سے اجتماعی ترقی کے بیشتر پروگراموں کی تکمیل کی ذمہ داری ایسے اداروں کو سپرد کی جائے گی اور حکومت محض فنی، انتظامی اور مالی امداد بہم پہنچائے گی۔ ڈیولپمنٹ کمشنر نے کہا کہ ریاستی حکومت گذشتہ خریف اور ربیع مہموں کے دوران میں دیہی اداروں کو غذائی پیداوار کے پروگرام کے عملدرآمد کی ذمہ داری سپرد کر کے اس سلسلہ میں پیش قدمی کر چکی ہے۔ سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے ترقیاتی پروگرام پر ۵۰ کروڑ روپیہ صرف کرنے کی تجویز ہے۔

● ● ●

بستی کے ایک کاشتکار شری بھانو پرتاپ سنگھ نے ایک سال میں ایک کھیت میں گیہوں اور برسیم اور گیہوں۔ برسیم اور گنے کی کاشت کا ایک کامیاب تجربہ کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس طریقہ سے زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہوتا ہے اور گیہوں اور گنے کی حسب معمول پیداوار کے علاوہ مویشیوں کے چارہ کے لئے برسیم بھی پیدا ہوتی ہے۔

اس طریقہ کو اپنا کر شری سنگھ نے ایک ایکڑ میں ۲۵ من گیہوں اور مویشیوں کے لئے چارہ بھی پیدا کیا ہے۔ گیہوں اور برسیم کی فصل کے بعد اس کھیت میں کھاد دیئے بغیر ایک ایکڑ میں ۲۵ من دھان بھی ہوا ہے۔ ڈیولپمنٹ کمشنر نے اس کامیاب تجربے کو سراہتے ہوئے محکمہ ترقیات کے افسروں سے کہا ہے کہ وہ اس سال مشرقی اضلاع کے ڈیلیولپل ورکر کے چند حلقوں میں اس کا تجربہ کریں۔

فروری میں برسیم کی کٹائی کے بعد اس کی جگہ گنے کی کاشت کا بھی تجربہ کیا گیا جس کے نتیجہ میں ایک ایکڑ میں ۹۰۰ من گنا پیدا ہوا۔ اور جیسے ہی گنا اگنا شروع ہوا گیہوں کی فصل تیار ہو گئی۔

● ● ●

حکومت اترپردیش نے ریاست کے ۵۰ عارضی ضلع پریشدوں اور ۸۶ میونسپل بورڈوں کو ۹۰۵۸۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ یہ رقم اس نقصان کی تلافی کے لئے منظور کی گئی ہے جو ضلع پریشدوں اور میونسپل بورڈوں کو فہرست مندرج اقوام کے طلبا کی تعلیمی، کھیل کود، علاج معالجہ اور لائبریری کی فیس معاف کرنے کے سلسلہ میں ہوا۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ فہرست مندرجہ اقوام کے طلبا کو وظائف اور کتابوں کی خریداری وغیرہ کے لئے ۱۵ء۱۴ لاکھ روپیہ سے زیادہ دیا گیا ہے جب کہ مالی سال رواں میں اس مقصد کے لئے ۸۲ لاکھ روپیہ کا نشان مقرر کیا گیا ہے۔

دوسرے پس ماندہ طبقوں اور مومن انصار کے طلبا کو گذشتہ سال جو وظائف منظور کئے گئے تھے وہ ان کو پابندی کے ساتھ دیئے جا رہے ہیں۔

سابق جرائم پیشہ قبائل کے طلبا کو وظائف اور غیر متواتر مالی امداد دینے کے لئے منظور شدہ ۲۸ ہزار روپیہ کی رقم مختلف اضلاع کو دیدی گئی ہے اور ایسے طلبا کو بھی اس سلسلہ میں پابندی کے ساتھ رقم ادا کی جا رہی ہے۔

● ● ●

محکمہ اترپردیش کا شعبہ خریداری ریاست میں نہ صرف گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی سرپرستی کر رہا ہے بلکہ نئی صنعتوں کے قیام میں بھی مددگار ثابت ہو رہا ہے۔

ریاستی حکومت کے مختلف محکموں کی مرکزی خریداری ایجنسی کی حیثیت سے اس شعبہ نے ۵۹-۱۹۵۸ء میں ۵ کروڑ روپیہ کے مال کی خریداری کی جس میں ۹۹ء۳ کروڑ روپیہ کی مالیت کا سامان مقامی کارخانوں وغیرہ سے خریدا گیا۔

اس شعبہ کے ذریعہ کل خریداری پر تقریباً ۵ لاکھ روپیہ اسے کر ۷۰ فی صدی تک بچت ہوئی۔ بڑے خریدار ہونے کی وجہ سے اس کو ادویات جیسی چیزوں پر ۱۰۰ فی صدی اور شارجوں پر ۴۰ فی صدی چھوٹ ملتی ہے۔ اس کے ذریعہ کنٹریکٹ سسٹم کے تحت ایک کروڑ روپیہ کی مالیت کی عام ضرورت کی چیزوں اور کوانٹٹی کنٹریکٹ کے تحت ۴ کروڑ کی مالیت کے ٹریکٹر موٹر اور کیمیاوی کھاد وغیرہ کی خریداری ہوئی۔

اس کے علاوہ ۵۹-۱۹۵۸ء میں ۲۷ لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کی گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی مصنوعات کی خریداری ہوئی۔ کیونکہ یہ شعبہ ایسے مال کو اولیت دیتا ہے جن پر عمدہ کوالٹی ہونے کی مہر ہوتی ہے اس لئے اس شعبہ نے چمڑہ کی مصنوعات، بکس کا سامان، تالے، قینچیاں اور ڈرائنگ کے آلات کا تمام سامان اسی قسم کے مال میں سے خریدا۔

یہ شعبہ ریاست میں نئی صنعتوں کی ترقی میں بھی اعانت کر رہا ہے چنانچہ بل فیننگ تیار کرنے کے لئے اس نے کانپور اور لکھنؤ کے صنعتکاروں کو ۱۲۵۰۰۰ روپیہ کی مالیت کے بل فیننگ بنانے کا آرڈر دیا۔ اس طرح وارانسی اور مغربی اضلاع کے کچھ کارخانوں کی بجلی کا سامان تیار کرنے کے لئے بھی ہمت افزائی کی گئی مزید براں اس نے ڈائریکٹر جنرل سپلائز اینڈ ڈسپوزل گورنمنٹ آف انڈیا کے ذریعہ بیرونی ممالک سے ۱۰۴۰ کروڑ کی مالیت کے مال کی سپلائی کا انتظام کیا۔

• • •

ریاستی نظامت صنعت کی جاری کردہ ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اترپردیش میں صنعت کاری کی ترقی کے ساتھ ادھر چند برسوں کے اندر مختلف صنعتوں میں کیمیائی اشیا کی کھپت میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

اترپردیش میں گندھک کی پیداوار کے بارے میں رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ریاست میں گندھک کے تیزاب کے تین کارخانے کانپور، غازی آباد اور وارانسی میں ہیں جہاں ۵۹-۱۹۵۸ء کے دوران میں بالترتیب ۵۲۸ ٹن، ۶۵۳۲ ٹن اور ۸۰۸۰ ٹن تیزاب تیار ہوا۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۶۱-۱۹۶۰ء کے دوران میں ریاست کی مختلف صنعتوں کو ۲۳۹۰۰۰ ٹن سوڈا ایش کی ضرورت پڑے گی۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سوڈا ایش کی دو فیکٹریاں زیر تعمیر ہیں۔ ان میں سے ایک فیکٹری مغل سرائے کے نزدیک تعمیر کی جا رہی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ سال رواں کے دوران میں اس فیکٹری میں کام شروع ہو جائے گا۔

اناج کی پیداوار بڑھانے کی مہم کے سلسلہ میں کیمیائی کھاد کی اہمیت کے پیش نظر مسرز ساہو کیمیکلس ساہو پوری (وارانسی) کو سالانہ ۴۰ ہزار ٹن المونیم کیلورائڈ تیار کرنے کے لئے لائسنس جاری کیا گیا ہے۔ اس فیکٹری کی عمارت کی تعمیر اور مشینیں لگانے وغیرہ کا کام قریب تکمیل ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس فیکٹری میں جلد ہی کام شروع ہو جائے گا۔

• • •

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش اُن سے بہرحال متفق ہو۔

توضیحات

نیا دور (جون ۱۹۵۹ء) میں رشید حسن خاں صاحب کا ایک مضمون "چند عروضی غلطیاں" کے عنوان سے چھپا تھا جس میں اُنھوں نے حسب ذیل شعر کو جناب محمود رام پوری سے منسوب کیا تھا ؎

جسے دید اُن کی نصیب ہے وہ نصیب قابل دید ہے
جو شب برات ہے رات اُسے تو دن اُس کے واسطے عید ہے

جس غزل کا یہ مطلع ہے وہ پوری غزل محمود رام پوری کے مجموعۂ کلام "جذبات محمود" مرتبہ مہر رام پوری میں درج ہے۔ اس غزل کے بارے میں ایڈیٹر نیا دور کی جانب سے یہ نوٹ دیا گیا تھا کہ جہاں تک ہمارے علم میں ہے یہ غزل صاحب زادہ واجد علی خاں آشک رام پوری کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں دو خط موصول ہوئے ہیں۔ ایک مرتب دیوان جناب مہر رامپوری کا اور ایک جناب داز یزدانی کا۔ یہ دونوں خطوط شائع کئے جا رہے ہیں۔ تیسرا خط جناب قاضی عبدالودود صاحب کا ہے جو انھوں نے اپنے ایک شائع شدہ مضمون "نوبہار یعنی قصۂ گل وصنوبر" از بینی نارائن جہاں" کے تتمہ کے طور پر بھیجا ہے۔

ایڈیٹر "نیا دور"

(۱)

... پرچے پہونچنے پر میری نظر رشید حسن صاحب کے مضمون خط اور آپ کے نوٹ پر پڑی جو حضرت محمود کی اک غزل کے متعلق ہے حضرت محمود کا دیوان میں نے مرتب کیا ہے۔ آپ صاحبان کے سامنے حضرت استاد مرحوم کا مطبوعہ دیوان ہے اور میرے سامنے وہ تمام مسودات ہیں جن سے دیوان مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ذاتی معلومات ہیں جو صغیر سنی سے قبلہ استاد مرحوم کی زندگی تک حاصل رہی ہیں۔ میں حضرت محمود کا بھتیجہ ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ ان کی خدمت میں رہا ہوں اور ابتدائی تعلیم میں بھی میں نے مرحوم کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہو اس قرب روحانی کے ساتھ مجھے قرب مکانی بھی حاصل رہا ہے۔ مرحوم کو شعر کہتے اور پڑھتے دیکھا۔ شاگردوں کی غزلوں پر اصلاحیں میرے سامنے ہوئیں۔ ان حالات میں میری شہادت اور اہمیت کو آپ بھی تسلیم فرمائیں گے۔ اس کے بعد عرض کروں گا کہ زیر بحث غزل استاد مرحوم کی ہے "جذبات محمود" حضرت محمود کے مسودات سے مرتب کیا گیا ہے اور یہ مسودات خود مرحوم کے قلم کے ہیں اور تخلص بھی ان ہی کے قلم کا ہے۔ . . . . . .

. . . . . . جذبات محمود کی طباعت واشاعت آشک مرحوم کی زندگی میں ہو چکی تھی اور دیوان ان کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا لیکن زندگی بھر انھیں اس غزل کو اپنانے کی جرات نہ ہوئی۔ میں نے دیباچہ میں صرف ایک غزل پر تبصرہ کیا ہے جس کا مطلع ہے ؎

محتسب نے جو نکالا ہمیں میخانہ سے
دور تک آنکھ ملائے گئے پیمانہ سے

یہ شعر بھی اسی غزل کا ہے۔

میں نے چکھی بھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ
آپ للہ چلے جایئے میخانہ سے

اُس وقت صرف اسی غزل کو آشک مرحوم کے دو ایک ہوا خواہوں نے آشک مرحوم سے منسوب کرنے کی ناکام کوشش کی تھی میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی تردید کر دی تھی اور حضرت محمود کے قلم کا عکس بھی دیوان میں دیا تھا۔ جب ایک جگہ یہ بات بدیہی طور پر ثابت ہو گئی کہ یہ غزل آشک مرحوم کی نہیں تو اب کسی شبہہ کی گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے۔ آپ کے مرسلہ پرچے اور بعض صاحبان کے کہنے پر اس غزل کے متعلق مجھے اطلاع ہوئی ۱۹۰۱ء سے مجھے استاد مرحوم کی خدمت میں شعر و سخن کے سلسلہ میں حاضری کا شرف حاصل رہا ہے۔ آشک مرحوم نے میرے بعد اور میرے سامنے شعر کہنا شروع کیا۔ تعجب ہے کہ آشک مرحوم نے خود تو کبھی لب کشائی کی جرأت نہ کی لیکن انھیں بدنام کرنے والوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ غزل آشک مرحوم کی ہے۔ کہیں شاعر کا رنگ بھی چھپتا ہے۔ کلام تو خود بولتا ہے کہ کس کا ہوں۔ اس موقع پر اختصار سے کام لے رہا ہوں اگر آپ یا رشید حسن صاحب کو مزید تحقیقات کی ضرورت ہوئی تو اس سلسلہ میں بہت کافی مواد پیش کر سکوں گا۔

ابراہیم علی خاں مہر رام پوری

انھوں نے رشید خاں ابن موتمن الدولہ نواب اسحاق خاں والیٔ گجرات کو رشید خاں ابن نواب جعفر خاں والیٔ بنگال سمجھا ہے۔ نآزیزدانی

(۳)

اُردو میں ایک مثنوی گل وصنوبر ہے جس میں کم و بیش ... ۵ شعر ہیں۔ اس کا آغاز اس مصرع سے ہوتا ہے :۔

"الٰہی مجھے کرتُو رنگیں رقم"

اس کا مصنف کون ہے اس کا پتا نہیں چل سکا لیکن، اس کا زمانۂ تصنیف ایک حد تک معین ہے۔ اس میں "سلطان زماں" (سلطان زمن" غازی الدین حیدر کا لقب بادشاہ تسلیم کئے جانے کے بعد) اور "صاحب عالم کیواں جاہ مرزا محمد حسن خاں بہادر" کی مدح ہے۔ اس مثنوی میں گل عاشق اور صنوبر معشوق ہے، اور نوبہار سے بالکل مختلف قصہ منظوم ہوا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ تحقیقات اُردو پٹنہ کی نمائش کے لئے آیا ہے اور دوسرا میر فیلین علی خانصاحب (باغ ناسخ، حیدرآباد دکن) کی ملک ہے۔ موخر الذکر کے ساتھ گل وصنوبر کے کاتب کی لکھی ہوئی مثنوی اعجاز عشق بھی ہے اور یہ ۴۔ رمضان ۱۲۷۱ھ کی مکتوبہ ہے۔ قرینہ ہے کہ گل وصنوبر بھی اسی سنہ میں لکھی گئی ہوگی۔ یہ مثنوی طبع بھی ہو چکی ہے، بہار دانش (از طپش) وغیرہ کے ساتھ ۱۲۷۷ھ میں بمبئی کے مطبع حیدری نے چھاپ کر شائع کی تھی۔

قاضی عبدالودود

تصحیح :۔ (۱) "نیا دور" (ستمبر ۱۹۵۹ء) میں سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کے مضمون "ہندوستان موسیقی ۔ ہندوستان کے فارسی لٹریچر کی روشنی میں" کی دوسری قسط شائع ہوئی تھی۔ اس مضمون کی آخری سطر (ص ۶۲) میں یہ چھپا ہے :"..... شمالی ہند میں بڑے موسیقار پیدا ہوئے ....؟ لفظ "موسیقار" غلط چھپ گیا ہے۔ اسے ماہر موسیقی پڑھا جائے ہمیں اس غلطی کا افسوس ہے۔

(۲) "نیا دور" (اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں شائع شدہ ایک مضمون "شعر میں لفظ اور کنایہ" میں حسب ذیل شعر کو داغ سے منسوب کیا گیا ہے :۔

نہ ہم سمجھے، نہ آپ آئے کہیں سے ‏ پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے (ص ۳۴)

یہ شعر داغ کا نہیں بلکہ انور دہلوی کا ہے اور اس کی وضاحت "نیا دور" (جون ۱۹۵۹ء) میں شائع شدہ ایک مضمون "بعض غلط اشعار کا انتساب" (از حنیف نقوی سسرانی) میں کردی گئی ہے (صفحہ ۲۱) ——— ایڈیٹر

(۴)

... "جذبات محمود" کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں سنا تھا کہ اس میں نہ صرف آشک مرحوم کے اشعار اس میں شامل کر دیئے بلکہ محمود کے ایک دوسرے شاگرد واثق کی ایک غزل بھی شائع کر دی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

لے شاہسوار اسپ تجھے ٹھہر لئے ہیں ‏ ہم بھی تری جولاں گہ توسن میں پڑے ہیں

یہ غزل مولوی صاحب نے استاد محمود خاں کی زندگی میں کئی بار مشاعروں میں واثق مرحوم سے سنی ہے اور اب "جذبات محمود" میں شامل ہے۔ اسی طرح آشک مرحوم کی کئی غزلیں "جذبات محمود" میں طبع ہو گئی ہیں۔ استاد محمود خاں (خدا ئے کریم ان کی غلطیوں کو معاف کرے) دائم الخمر تھے۔ ممکن ہے کہ نشہ کی ترنگ میں تلامذہ کے سودے اپنے پاس رکھ لیتے ہوں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اصلاح کرتے وقت انھیں اپنا کہا ہوا کوئی "ہم طرح" شعر یاد آجاتا ہو اور یہ سمجھ کر کہ شعر شاگرد کی غزل اصلاح کرتے میں ہوا ہے، شاگرد کی غزل میں بڑھا دیتے ہوں کیونکہ قدیم اساتذہ کا یہی طریقہ تھا کہ جو شعر کسی غزل کو اصلاح کرتے وقت ہو گیا وہ اسی شاگرد کو دے دیا۔ بہرحال "دیدہ ہے اور شنیدہ ہے" آشک کی یہ غزل جب آشک مرحوم جو بمبئی میں تھے تو رام پور کے کسی ماہنامہ میں وہاں سے آکر شائع ہوئی تھی۔ انھی زمانہ میں استاد محمود خاں بھی زندہ تھے۔ وہ رسالہ میرے ایک دوست کے پاس ہے۔ غزل پر مدیر کا کوئی نوٹ بھی غالباً ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ غزل آشک مرحوم مقیم بمبئی کی ہے۔

جہاں تک "جذبات محمود" کی ترتیب کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں زیادہ توجہ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اور رام پور میں جو غزلیں استاد محمود خاں کے شاگرد ان کی زندگی میں اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھ چکے تھے وہ غزلیں جذبات محمود میں شائع ہو گئی ہیں۔ حقیقت کیا ہے اسے خدا بہتر جانتا ہے

... ڈاکٹر گیان چند کی کتاب بھی نہ زیادہ صحیح ہے، نہ زیادہ واضح بلکہ بعض اغلاط تو حیران کن ہیں۔ مثلاً۔ بوستان خیال کے مصنف نے اپنے مربی نواب رشید خاں خلف الصدق موتمن الدولہ مرحوم کے متعلق یہ دعائیہ فقرہ لکھا رَفَعَ اللّٰهُ قَدْرَهٗ الشَّانُ الجَلِی۔ گیان چند اسے رفیع اللہ سمجھے اور نواب رشید خاں کا نام اپنی کتاب میں لکھا "مرزا محمد علی رفیع اللہ"۔ یہی نہیں بلکہ

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۹

اگرہاینٹر ۱۸۸۱

دسمبر ۱۹۵۹ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر

صباح الدین عمر

پبلشر

بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر

ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

حکومت اتر پردیش سنسکرت اور ہندی کے مصنفوں کے علاوہ اردو مصنفوں کو بھی ان کی کامیاب ترین تخلیقات پر انعام دیتی ہے۔ حکومت اس سلسلہ میں اردو کے ممتاز ادیبوں کی ایک کمیٹی منتخب کرتی ہے۔ انعامات کے لئے کتابیں بھیجنے کی ایک تاریخ مقرر کر دی جاتی ہے اور اس تاریخ تک جو کتابیں موصول ہوتی ہیں کمیٹی کے اراکین ان کا مطالعہ کرتے ہیں اور حکومت کے سامنے اپنی سفارشیں پیش کرتے ہیں۔ اس اسکیم کے ماتحت مالی سالی رواں ۶۰-۱۹۵۹ء کے لئے بھی حکومت نے اردو کے ۱۴ مصنفین کو ان کی بہترین تخلیقات پر ۶٫۷۵۰ روپیہ کے انعامات دیئے ہیں۔ ان مصنفوں کے اور ان کی کتابوں کے نام جن پر انعام ملا ہے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب (لکھنؤ) کو ان کی کتاب لکھنؤ کا عوامی اسٹیج اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن (رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ) کو ان کی کتاب ہندوستانی عہد وسطیٰ کی ایک جھلک پر ایک ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا گیا ہے۔ مولانا سید اختر علی تلہری (لکھنؤ) کو ان کی کتاب شعر و ادب، ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی (شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی) کو ان کی کتاب دلی کا دبستان شاعری اور سید شبیہ الحسن نونہروی (شعبۂ اردو۔ لکھنؤ یونیورسٹی) کو ان کی کتاب تنقید و تحلیل پر ساڑھے سات سات سو روپیہ کا انعام دیا گیا ہے۔ شری نشور واحدی (کانپور) کو ان کے مجموعۂ کلام فروغ جام پر پانچ سو کا انعام ملا ہے۔ ان کے علاوہ شری اظہر علی فاروقی (کرسچین کالج، الٰہ آباد) کو اردو مرثیہ، شری مصطفیٰ حسین رضوی (لکھنؤ) کو ایجادوں کی ساس، شری ممتاز حسین جونپوری (لکھنؤ) کو شرا بی مضمون نگار، شری نثار احمد فاروقی (دہلی) کو میر کی آپ بیتی، شری رضا حسین (لکھنؤ) کو چٹکیاں، شری رام لال (لکھنؤ) کو نئی دھرتی پر نئے گیت، شری بشیشر پردیپ (لکھنؤ) کو پیاس اور سید اثر عالم سوامی (ایٹہ) کو سوامی درشن پر ڈھائی ڈھائی سو روپیہ کے انعامات دیئے گئے ہیں۔

اردو کے سلسلہ میں حکومت اتر پردیش کے دیگر اقدامات کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت نے اردو کے کچھ ضرورت مند ممتاز ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد بھی دی ہے۔ اردو اخبارات کو اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔ محکمۂ اطلاعات کی پریس مشاورتی کمیٹی میں اردو اخبارات کے نمائندے بھی شامل کئے جاتے ہیں۔ اردو اخبارات کے لئے محکمہ کی شائع شدہ تمام خبریں اردو میں بھی بھیجی جاتی ہیں۔ مختلف موضوعات پر اردو میں کتابچے لکھے اور چھاپے جاتے ہیں اور کبھی ضخیم کتابیں بھی تیار کی جاتی ہیں مثلاً اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔ ہندی اور انگریزی ماہناموں کے علاوہ اردو کا ماہنامہ (نیا دور) بھی شایع کیا جاتا ہے۔

—— ایڈیٹر

شکستِ دل، شکستِ غم نہیں ہے — مجھے اتنا سہارا کم نہیں ہے

یہ مے خانہ ہے بزمِ جم نہیں ہے — یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

ذرا سا دل ہے لیکن کم نہیں ہے — اسی میں کون سا عالم نہیں ہے

تو پھر کیا ہے اگر یہ حسنِ فطرت — مآلِ لغزشِ آدم نہیں ہے

ارے او شکوہ سنجِ عمرِ فانی — یہ فانی زندگی بھی کم نہیں ہے

اگر ہو فی الحقیقت گوش مشتاق — کوئی آواز بھی مبہم نہیں ہے

جگر

۲ دسمبر ۱۹۵۹ء

حضرت جگر مراد آبادی کی یہ تازہ ترین غزل ہے جو انھوں نے نیا دور کو خصوصی طور سے عنایت فرمائی ہے۔

دنیا کے کلچر میں ہندوستان کا حصہ

(اثر لکھنوی)

اس بات پر غور کرنے سے پہلے کہ دنیا بھر کے کلچر میں ہندوستان کی کیا اہمیت اور قدر و قیمت ہو آیئے ذرا سوچیں کہ کلچر سے مراد کیا ہو اور اس کی تہہ میں کون سا خیال کارفرما ہو۔ میری دانست میں کلچر زندگی بسر کرنے کا طریقہ ہو۔ دل و دماغ کے وسیلے سے ماحول کی ترجمانی ہے۔ ہندستانی کلچر نے ساری دنیا پر گہرا اثر ڈالا ہے لیکن اکثر دیشتر یہی دیکھنے میں آیا کہ اس کے احسانات کو صدق دل سے بہت کم سراہا گیا۔ اس تمہید کے بعد پہلا سوال جو پیدا ہوتا ہو یہ ہے کہ ہم ہندستانیوں میں اس تہذیب اور کلچر کا ذہنی نما کیا ہو، اس کے علامات کیا ہیں۔ بالفاظ دیگر ہندستان کے دماغی اور روحانی مطمح سے کون سے ضروری خیالات ایسے بنیادی اصول قرار پاتے ہیں جن سے انگنت صدیوں میں اس ملک کو تقویت پہنچتی رہی ہو۔

پہلا خاص تحفہ جو ہندستان نے دنیا کو دیا اسے میں نڈرپن (آزادیٔ فکر و نظر) کہتا آیا ہوں اسی کو اپنشد کی زبان میں "ابھے" (Abhya) کہتے ہیں۔ تحقیق کا شاذ ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس کا تعلق ہستی سے یا الوہیت (Divinity) کے صفات و لوازم سے یا نفس انسانی سے ہو جس کی طرف ہندستانی مفکرین نے توجہ نہ کی ہو۔ کتنے ہی نظریئے جو ہندستانی انداز فکر سے بظاہر الگ معلوم ہوتے ہیں وید (Vedas) کے ماہرین نے ثابت کیا ہو کہ تین یا چار ہزار سال اور بعض صورتوں میں پانچ یا چھ ہزار سال پیشتر سے لے کر آج تک ان سب کا ماخذ ہندستان ہو۔

غیر ملکی لوگ جو ہمارے بشر ہیں نیز وہ جنھیں ہم بشر کا خطاب نہیں دے سکتے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہندستانی زندگی میں ہم آہنگی و یکجہتی مفقود ہو، پراگندگی ہو، انتشار ہو۔ یہ ایک حد تک درست ہو کیونکہ جب سے تاریخ وجود میں آئی ہماری دماغی و روحانی کاوش بظاہر بکثیر متباین تصورات سے وابستہ رہی ہو۔ ایک طرف تو یہ ملک بودھ کا مولد ہو جس کے فلسفے میں قادر مطلق کے ہونے کا ہمارے حسب منشا مطالبہ نہیں کیا جاتا، دوسری طرف یہ ملک ویدانتی فلسفے کا گہوارہ ہو جس میں شخصی خدا کے تصور سے استدلال کا آغاز نہیں ہوتا حالانکہ دوسرے مذاہب کا یہی وتیرہ ہو۔ پھر یہاں بھکتیوں کا گیان بھی رائج ہو جس کا لب لباب یہ ہو کہ اپنی ذات کو ایک ایسی بلند ترین ہستی کا تابع کر دو جو کسی خاص روپ میں جلوہ گر ہوئی ہو۔ فکر و نظر کے یہ مختلف اسالیب جو شاید ایک دوسرے کی ضد ہیں دراصل آخری سبب کی تلاش یا اصل حقیقت کا تجزیہ ہیں۔ اسی آزادیٔ خیال نے ہندستان کے افراد میں نڈرپن قائم رکھا ہو، وہ بے دھڑک ان مسائل پر غور کرتے ہیں جن کا تعلق حیات یا مابعد الحیات سے ہو۔

دوسرا تصور آہنگ یا توازن کا ہو جسے بعض کتابوں میں دھرم سے تعبیر کیا ہو اور جسے ویدوں میں "رت" (Rta) کہہ کے پکارا ہو۔ یہی "رت" انتہائی ترتیب و یکرنگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہو، اس علم و یقین کا اظہار ہو کہ جو امور وقوع پذیر ہوتے ہیں اتفاقیہ نہیں ہوتے نہ کسی انسان یا دیوتا (Semi-divine) یا خدا کی دست اندازی کا نتیجہ ہوتے ہیں بلکہ ان میں منتظم تواتر ہے، ایک ایسے قانون کے محکوم ہیں جو وقت کی تخلیق سے پہلے وضع ہو چکا تھا[1]۔ یہ رت یہ تصور کہ ہستی میں تسلسل ہے[2] دستور عالم کو ہندستان کا دوسرا عطیہ ہے۔ ہندستانی تخیل میں زندگی نباتاتی ہو کہ حیوانی یا انسانی وہ اس کے ساتھ جسے ہم موت کہتے ہیں ختم نہیں ہوتی نہ اس کے ساتھ شروع ہوتی ہے جسے ہم پیدائش کہتے ہیں، نہ

---

[1] ۔ دیوتا خلق ہوئے وقت کی تخلیق کے بعد

[2] ۔ قطرہ ہے موج بدل، موج ہے طوفاں بکنار

کون ہو پھر جو کرے منکشف اسرار شہود (اثر)
بحر ہستی کے نہیں جوش کا پایاں کوئی (اثر)

اس کی وسعت ہستی کے ہنگاموں، جھگڑوں یا دشواریوں تک محدود ہو بلکہ "سعت" کے عمل کا براہ راست نتیجہ ہو۔ ایسی زندگی کو ایک عظیم وحدت یا اکائی مانا جاتا ہے[1] ایسی یکتائیت جس میں یکرنگی کے باوصف مدوجزر ہے، بلندیاں ہیں گہرائیاں ہیں اور مجموعی حیثیت سے اس کا دھارا ہمیشہ بہتا رہتا ہو[2]۔ یہ خیال جس نے رفتہ رفتہ مسلۂ ارتقاء کی شکل اختیار کرلی ہندستانی تخیل کے مرکزی اصول میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔

خاص تحفے جو ہندستان نے باقی دنیا کی فہم وفراست کو دیئے وہ خیالات ہیں جن میں حیات کو مستقل دکھایا ہے[3] جن میں زندگی کے مدارج کو واضح کیا ہو اور توجہ دلائی ہو کہ ہر شے میں عظیم الشان تنظیم پائی جاتی ہے[4]۔ اس راستی کو سمجھنے کے لئے لازم ہو کہ ہر مسئلے کی چھان بین میں منطقی استدلال سے کام لیا جائے اور مطلق پروا نہ کی جائے کہ ایسی تشریح کا ذہنی یا روحانی مآل کیا ہوگا اور ہمارے خیال کی رَو پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

کیا اس دعوے کا کوئی ثبوت ہے کہ ہم نے دنیا کے ذخیرۂ خیالات میں اضافہ کیا؟ از منۂ قدیم میں ہندوستانی کلچر کی حالت ایسے دریا کی سی رہی ہے جو زیر زمیں بہتا ہے، جس سے مختلف ممالک کی آبیاری ہوتی رہی ہے اور ان کو زرخیز بناتا رہا ہے، گو اس کا کھلے بندوں اعتراف نہیں کیا گیا لیکن اس آنکھ اوجھل دریا کے اَن دیکھے مگر زندگی بخش سوتے نہ صرف ظاہری مناظر سے نمایاں ہیں بلکہ ذہنوں کی قلمرو میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اب مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کے بعض مخصوص اقسام لیجئے۔ اوتاروں کے متعلق برابر پڑھتے آئے ہیں کہ وشنو کے دس بَرن یا مظاہر ہیں۔ کچھ لوگ اس خیال کو ناقابل قبول سمجھتے ہیں لیکن غور وتامل کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ ان دس اوتاروں میں سے پہلا اوتار "متسے" (Matsya) کی دنیا کا ہے جو رینگنے والے کیڑوں کی آفرینش سے بھی پہلے موجود تھی۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ زندگی کی اولیں علامت مچھلیاں ہیں۔ اس کے بعد ایسی مخلوق کی دنیا ہے جو پانی میں اور خشکی پر یکساں سانس لے سکتی ہے، پھر انسان سے مشابہ جانوروں کی دنیا ہے پھر بَونوں یا بالشتیوں کی، پھر وحشی انسانوں کی پھر بے قابو اور بغیر سوچے سمجھے کام کرنے والوں کی، پھر ایسے انسانوں کی جو کم وبیش کامل تھے، پھر ایک زمانہ آتا ہو کہ انسان کامل قادر مطلق میں جذب ہوکر غائب ہو جاتا ہے یعنی مستقبل میں دنیا ستاروں کے ایک قسم کے اثر یا کلیش سے تباہ وبرباد ہو جائیگی۔

بعض لوگ اس کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ مسلۂ ارتقاء کی "پیش تشکیل" (Refiguration) ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ ہندوستانی ذہنیت اور دماغ کی خصوصیت ہے کہ ایسے مسئلے کا تشفی بخش جواب سوچے جو ناقابل حل ہے۔ لیکن ہمارے پورے فلسفے اور مذہب کی بنیاد وہی زندگی کے ایسے واقعات قبول کرنے پر ہے جن میں تدریجی ارتقا کی جھلک ہے۔ ہم ابتدائی حیاتیاتی نشوونما سے آغاز کرکے اس سے کم مبہم اور غیر واضح اشکال کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور یہ عمل ہمارے وجود اور ہماری زندگی تک محدود نہیں بلکہ ہماری اندرونی حیات میں بھی جاری وساری ہے اور ہم ادراک محض سے بڑھتے بڑھتے ذہنی عظمت اور روحانی علو تک پہنچ جاتے ہیں۔

یہی خیالات زرتشتی معتقدات کا سرمایہ ہیں، مصر قدیم کے مذہب میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ شہر تھیبس (Thebes) میں "را" (سورج کا دیوتا) کے مندر میں ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جو اپنشد کے مسئلے "نام رُوپ" (Nama rupa) کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اپنشد اعلان کرتے ہیں کہ دنیا کی تخلیق ایک اولیں مادے سے ہوئی اور انسانیت والوہیت میں صرف "نام رُوپ" یعنی نام اور ہیئت کا فرق ہے۔ جیسا رخ توانائی بخشنے والی آگاہی اختیار کرتی ہے اسی کے مطابق زندگی پیکر بنتی رہتی اور مدارج ارتقا طے کرتی ہے۔ مصری مندر کے کتبے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تمام دیوتا (Gods) اور انسان ایک ہیں۔

---

[1] دیدۂ حق بیں میں وحدت کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک ہی ہے لاکھ ہو کثرت اثر اعداد کی

[2] ایک طوفان اُمنڈتا ہی چلا آتا ہے
ایک طاقت ہے جسے شوق ہویدائی ہے
جس کے ہر قطرے میں ہو پورے سمندر کی نمود
اور اظہار کی قدرت نہیں مرہون قیود (اثر)

[3] اک مستقل حقیقت ناقابلِ تغیّر
ہستی جو یہ نہیں ہے ہستی ہی نیستی ہے (اثر)

[4] ساری ادائیں مختلف پھر بھی تناسب آفریں
جیسے کہ ایک گیت میں سُر ہوں کئی لے مُجلے (اثر)

کل، جز سے علیحدہ نہیں ہے صرف اسماء اور اشکال کا فرق ہے۔ بعض اشخاص کا تو ادعا ہے کہ مصریوں نے کتبہ کی عبارت ہندستان کی مقدس کتابوں میں سے کسی کتاب سے لے لی ہے۔ ایسا ہو کہ نہ ہو اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہندستان کا ایک مرکزی خیال مصر قدیم میں موجود تھا اور تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جہاں تک ہندستان کی تاریخ اور فکریت کا تعلق ہے ہڑپا (Harappa) اور موہنجو ڈرو (mohenjo-daro) انکشافات نے جو پنجاب کے مختلف حصوں میں نیز وسط ایشیا میں ہوئے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ مختلف کلچروں میں امتزاج ہوا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو ہزار برس ادھر بھی ہندستان کے لوگوں کا پیرو (Peru) اور میکسکو (Mexico) پہنچنا ممکن تھا۔ جا کر دیکھ لیجئے کہ ان ملکوں کے اور جنوبی ہندستان کے رہنے والوں کے چہرے مہرے بالکل ایک سے ہیں۔ ناک نقشے میں رتی بھر فرق نہیں۔ رنگ بھی ہمارا سا ہے (شاید قدرے زیادہ سیاہی مائل)۔ مجھے اس مشابہت سے اتنا اچنبھا نہیں ہوا جتنا اس واقعہ سے ہوا کہ ان کے مندر بھی ہمارے مندروں کی نقل ہیں کلچر بھی ہمارا جیسا ہے۔ میں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن پیرو کے ایک قدیم شاہی خاندان کا لقب آئیر (Aiyars) تھا۔ میں یہ مشورہ نہ دوں گا کہ ہمارے یہاں کے آئیر اس دور دراز ملک میں جا کر تاج شاہی طلب کریں لیکن مجھے یقین ہے کہ دونوں ملکوں میں جو ایک دوسرے سے کئی ہزار میل کے فاصلے پر ہیں اور جن کے درمیان کئی سمندر حائل ہیں کبھی بڑے چاؤ سے کلچر کا تبادلہ ہوا تھا۔

جاوا (Java) اور مشرق بعید کے دیگر ممالک۔ پورا ملوکہ فرانس ہند چین (French Indo-China) اور کمبوڈیا (Combodia) کی گزشتہ معاشرت اور ہندستانی معاشرت ایک ہی زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں ان کا فن عمارت سازی بھی وہی ہے جو ہمارا ہے۔ نام بھی ہندوانے ہیں گو مذہب اسلام ہے۔ ارجن نام برہما سے لے کر فلپائن تک بہت عام ہے ہندستانی خیالات اور کلچر کا اثر بہت گہرا اور پھیلا ہوا ہے گو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں بخل سے کام لیا گیا ہے۔ ہندستانی اور دوسرے کلچروں میں کیا زرتشتی، کیا ایرانی، مسیحی، مصری اور اسلامی اس سے بہت زیادہ خیالات اور نظریات میں تبادلہ ہوا ہے جتنا کہ عام طور پر قیاس کیا جاتا ہے بہ مثال کے طور پر آواگون یا تناسخ کا مسئلہ لے لیجئے۔ مغرب کا خیال ہے کہ عیسائی نصب العین اس سے اجنبی ہے، لیکن ایک نابینا شخص کو حضرت عیسیٰ کے سامنے پیش کر کے استفسار کیا گیا کہ گناہ کس کا ہے اس شخص کا یا اس کے والدین کا کہ یہ اندھا پیدا ہوا؟" تو اس کا کیا مطلب ہوا؟

یونان میں مسئلہ تناسخ فیثا غورس کے وقت سے چلا آتا ہے۔ اس حکیم پر ہندستانی فلسفیوں کا گہرا اثر تھا۔ عیسائی مذہب کی تعلیم بعض صورتوں میں بودھ کلچر سے مختلف نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خیالات کا مبادلہ ہوا ہے۔ اگر یہ بھی پیش نظر رہے کہ نہ صرف فلسفیانہ خیالات بلکہ فنون لطیفہ کے اکثر پہلوؤں پر ہندستان قدیم اثر انداز ہوا ہے تو کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں بھی آفاقی کلچر کی پرداخت میں بھی کوئی حصہ لے گا یا حصہ لینے کا مستحق ہے؟ جواب اثبات میں ہے۔ سماج آج کل ڈانواں ڈول ہے اور اس کا یہ سبب قرار دیا جاتا ہے کہ ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر زمانے کے لوگ اپنے دور کو عبوری کہتے ہیں۔ انقلاب فرانس سے کچھ پہلے ورڈز ورتھ مقولہ تھا کہ۔

"سنہری پو پھوٹ رہی تھی اور اس تڑکے میں زندگی بہت
سہانی تھی اور جوان ہونا تو گویا جنت کا مصداق تھا!"

ہم میں کچھ لوگ اپنے دیس کی سیاسی آزادی کے سپنے دیکھتے تھے۔ ان میں سب سے بڑے ہی نہیں بلکہ سب سے زبردست ماہر اور اسی کے ساتھ عملی نصب العین قائم کرنے والے مہاتما گاندھی تھے۔ وہ ایک نئی دنیا کے وجود میں لانے کا خواب دیکھتے تھے لیکن کیا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس وقت رد عمل ہو رہا ہے اور ہماری آنکھیں کھل رہی ہیں۔ ہم نے بڑی بڑی امیدیں باندھی تھیں اور فوری نتائج رونما ہونے کی آس تھی۔ حاصل ابتک تاریکی میں ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے جذبات پامال ہو گئے، ہم جھنجھلائے ہوئے اور اپنے ماحول سے بیزار ہیں۔ حکومتوں سے جن کی حالت قابل رحم ہے ایسے مسائل حل کرنے پر مصر ہیں جو قریب قریب گرفت سے باہر معلوم ہوتے ہیں اگرچہ گتھیاں سلجھانے کی انتھک کوشش جاری ہے۔

ہم فلسفیوں سے بھی دل برداشتہ ہیں کہ دنیا بھر کی مشکلات کا آخری اور مفید مطلب حل نہیں سوچ سکتے۔ لیکن اس غم و غصہ کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہم نے ان عظیم الشان بنیادی راستیوں کو فراموش کر دیا ہے جن سے اگلے زمانہ میں ذہنی اور روحانی کشت زاروں کی آبیاری ہوتی تھی۔ ہندستان کی کلچرل زندگی

نہیں بدلی ہے، اس کے حدود بدستور قائم ہیں اور ترقی کی قدیم شاہراہیں کھلی ہوئی ہیں بشرطیکہ ہم اپنی ذمہ داریوں کا احساس لئے ہوئے ان پر گامزن ہوں۔ دنیا بھر میں جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے اس کے تین سبب ہیں :-

اوّل ۔ انسان بھول گیا ہے کہ کُل دنیا ایک ہے۔

دوم ۔ ایک رہ سکتی ہے۔

سوم ۔ ہم سب نے وینڈل ولکی (Wendall Wilkie) کی کتاب "دنیائے واحد" (One world) پڑھی تو ہے مگر اس کا یہ سبق بخوبی ذہن نشین نہیں ہوا کہ ـــــ

"ابتک انسانیت کی وحدت ہماری اندرونی آگاہی یا بیرونی زندگی کا اٹل جزو نہیں بنی ہے"

شاید کوئی معترض ہو کہ آپ کُل دنیا کو متحد کرنے کا تو ڈھونگ رچاتے ہیں مگر خود ہم میں نام چار کو بھی میل ملاپ نہیں، فرقہ وارانہ آپا دھاپی نے ہندستان کی ایکتا کو تین تیرہ کر دیا ہے۔ جماعتوں کے درمیان شدید اختلاف و امتیاز رونما ہو گیا ہے۔ جماعت کا ایک خاص جتھا نوچ کھسوٹ کا شکار ہے اور اس کے ساتھ نامنصفانہ برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ یہ کچا چٹھا ہے اور آپ چلے ہیں سارے جہان کے اتحاد کا ڈھنڈورا پیٹنے! وہی مثل ہوئی کہ چراغ تلے اندھیرا!

میرا جواب ہے کہ انسانیت لہراتی چکر کھاتی اپنا سفر طے کر رہی ہے اور اکثر اپنے نصب العین کو عملی صورت دینے میں ناکام رہتی ہے۔ ہاں سچ ہے ایسے ممالک بھی ہیں جن کا رویہ قابل اعتراض ہے اور جو کھلم کھلا کہتے ہیں کہ ہمارا آئین مساوات رنگ اور قومیت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے ایسے ممالک کا بھی سفر کیا ہے جہاں میرے ساتھ "کالے آدمی" کا برتاؤ نہیں کیا گیا۔ ریل گاڑی میں، موٹر بس میں، عام جلسوں میں، ہر جگہ مجھ سے وہی سلوک روا رکھا گیا ہے جو "سفید چمڑے والوں" کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے نصب العین کا صرف اعلان ہی نہیں کرتے بلکہ برتنے میں بھی کوشاں رہتے ہیں۔ بے لاگ پہچان یہ ہونا چاہیئے کہ کیا اس نصب العین کا تصور آدمیوں کے ذہن میں موجود اور ان کے تن من میں رچا ہوا ہے۔ کیا ان کی سعی ہے (کیسی ہی ناکام کیوں نہ ہو) کہ اس نصب العین کو عمل میں منتقل کریں۔

میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ہر عہد میں نہ صرف نوعِ انسان کی مکمل وحدانیت بلکہ کُل ذی حیات و غیر ذی حیات مخلوق کی متحدہ حیثیت ہندستانی فکریت کا مطمحِ نظر رہا ہے اور میں عرض کروں گا کہ ہمیں یہی مقصد ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے اور دوسروں کو اس طرف توجہ دلانا چاہیئے گو اس وقت ہندستان یا کوئی دوسرا ملک اس اصول پر کاربند نہیں ہے۔ ہندستان میں اس پر عامل ہونے کا امکان ہے کیونکہ یہ ہمارے ملک کا اہم جزو ہے۔ ہندستان ہی اس خیال کو ایسے سکون اور تناسب سے مانوس کر سکتا ہے جو زندگی واحد ماننے سے ظہور پذیر ہوتا ہے[1]۔ یہی وہ خاص وِدیہ ہے جو ہندستان دنیا بھر کو اپنے اپنے مسائل حل کرنے کے لئے دے سکتا ہے۔

میں امریکہ کا سفر کر رہا تھا جو سب سے بڑھ چڑھ کر مشینوں کی طاقت سے چلنے والا ملک ہے۔ وہاں کے کل پرزوں اور رہنے سہنے کا معیار بہت بلند ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جہاں تک انسان کا مقدور ہے آسودگی و خوش حالی کی راہ میں جتنے کانٹے تھے ہٹا دیئے گئے۔ مہاتما گاندھی کے حادثۂ قتل کے ایک ہفتے بعد میں سین فرانسسکو (San Francisco) پہنچا اور ہر شخص کو مغموم پایا۔ ایک سے زیادہ افراد نے مجھ سے کہا (اور ان کا تعلق عام سیاسی طبقے سے نہ تھا بلکہ ادیب کیا مرد کیا عورت، بنک چلانے والے مزدور جماعت کے نمائندے اور دوسرے لوگ شامل تھے) کہ ہم خسارہ بھگت رہے ہیں کیونکہ ہم میں لیڈروں (رہنماؤں) کی کمی ہے۔ ہم مصیبت میں مبتلا ہیں کیونکہ ذہنی توازن وطمانیت کا قحط ہے۔ کام کرنے اور کام لینے میں وہ لپ جھپ ہے، مفاد حاصل کرنے میں ایسی بھول بھول ہے کہ سوچنے سمجھنے اور مآل کار پر نظر رکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ہم کسی چیز کو پا جانے کے خواہاں ہیں مگر معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے۔ ادھر آپکے درمیان گاندھی جی تھے جنھوں نے فرد کی حیثیت سے ذہنی سکون، اطمینان اور توازن حاصل کر لیا تھا اور اس طرح دنیا کو ایک پیغام دیا جو کتنا ہی دشوار اور ناقابل تقلید معلوم ہو وحیرج، شانتی اور آنند کا پیغام ہے۔ ایسا سندیسا ہے جو ساری خدائی کے کرب و اضطراب کا مداوا ثابت ہو سکتا ہے۔

---

[1] زندگی تقسیم ہو کر زندگی رہتی نہیں ۔ اس کی وحدت کو سمجھنا اور سمجھانا بھی ہے (منقو...)

کیا ہندستان اس طرف کوئی اقدام کر سکتا ہے؟ میری عرض ہے کہ ضرور کر سکتا ہے بشرطیکہ اپنی میراث دہ نہ بیچے اور اس میراث پر قبضہ جب ہی رکھ سکتا ہے کہ زندگی کو واحد مسلسل اور غیر منقسم مانے۔ اسی کو میں نے ارتقاء یعنی ایسی موزونیت و روانی سے تعبیر کیا ہے جس سے فرار محال ہے یا فطرت میں ترتیب سے موسوم کیا ہے یا پھر اس سے وابستہ کیا ہے جس کو آپ حیات اعظم یا قادر مطلق کہتے ہیں۔ اگر وہ خیالات جو کبھی ہمارے ادب، ہمارے فلسفے، ہماری صناعت میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کی روشنی میں ہم عالمگیر وحدت میں کثرت کا مطالعہ کر سکتے تھے اور ہر شے کو اسی وجود واحد کا مظہر سمجھتے تھے —— میں کہتا ہوں کہ اگر ہم اس یکتائیت اور سکون کو فقط محسوس ہی نہ کریں بلکہ دوسروں میں بھی ودیعت کر سکیں، انھیں بھی محسوس کرا سکیں تو یہ بیش بہا تحفہ ہوگا جو ہندستان باقی دنیا کے کلچر کو دے سکتا ہے۔

صرف ضروریات پوری ہونے سے تسکین نہیں ہو سکتی اس طرح تو ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے، کامیابی کا جنون اس سے بڑھ کر کامیابی کا تقاضا کرتا ہے، آج متحدہ اقوام کی انجمن کے سامنے ایجنڈے کا ایک ختم نہ ہونے والا طومار ہے کیونکہ کوئی شخص راضی نہیں کہ کسی مسئلے یا قضیہ کا تصفیہ ہو۔ حرکت لازم تک ناگزیر، چھین جھپٹ لابد! انگلستان کا حال اتنا پتلا نہیں جتنا امریکہ کا ہے۔ برِ اعظم یورپ کے بعض ممالک کی حالت انگلستان سے بھی کم خراب ہے لیکن بےچینی اور بے اطمینانی کا روگ ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے، بے روک ٹوک ہو جائے اور فی الفور یا کم سے کم وقت میں ہو جائے! ہوا تو کیا ہوا؟ ایک نئی مشین ایجاد ہو گئی، لیکن ساری محنت اکارت ہو گئی کیونکہ معاً دوسرے نے اس سے بہتر مشین گڑھ لی! ایک شخص نے ایک آلۂ ہلاکت ایجاد کیا، دوسرے نے اس کو اسی کے میدان میں شکست فاش دی! اس میں شک نہیں کہ مغربی دماغ نے سائنس میں حیرتناک انکشافات کئے ہیں؛ دارالعمل (Laboratory) میں بڑے بڑے تجربے کئے گئے ہیں اور نازک نازک اندازے لگائے گئے ہیں۔ اسی طرح ایجادات پر قیاس کر لیجئے۔ ہندستان نے بھی سائنس اور دوسرے شعبہ جات میں نتائج حاصل کئے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر تجربے کے بجائے وجدان (Intuition) کا ثمرہ ہیں۔ جہاں تک تجربہ و تحلیل کا تعلق ہے دنیا کبھی اس ڈھنگ سے نہیں چل سکتی کہ ایک پلہ بھاری ایک ہلکا نہ اس کے حصے بخرے لگائے جا سکتے ہیں۔ یہ میرا یہ تیرا۔ میٹھا میٹھا ہپ کڑوا کڑوا تھو۔

خلاصہ یہ کہ انسانیت کے چند بنیادی اصول ہیں جن کو ہندستانیوں نے اپنا لیا ہے۔ اس تہذیب یا کلچر کی تہ میں چند جذبات کارفرما ہیں جو انوائع مفید، اور قابل قدر ہیں۔ ان خصوصیتوں کو پس پشت نہ ڈالنا چاہیئے، یہ دنیا کے لئے کام کی باتیں ہیں۔ لیکن یاد رکھیے کہ ہم ان کے ذریعہ سے دنیا کی خدمت جب ہی کر سکتے ہیں جب خود ان پر عمل پیرا ہوں اور اسی حد تک خدمت کر سکتے ہیں جس حد تک خود ان پر کاربند ہیں۔ لہٰذا میں دوبارہ پوری قوت سے درخواست کروں گا کہ آپ ان بنیادی اصولوں کو سچے دل سے برتیں۔

(سر سی پی رام سوامی آئیر کے ایک انگریزی لیکچر کا اقتباس)

✡

انیسویں (۱۹) صدی میں لکھنؤ کی اردو صحافت

نادم سیتاپوری

لکھنؤ ہی پر کیا منحصر۔ اردو صحافت پر برسہا برس سے ریسرچ و تحقیق کرنے والے آج تک اس پر متفق الرائے نہیں ہو سکے کہ اردو زبان کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" (کلکتہ) کا مختصر سا ضمیمہ تھا یا مولوی اکرام علی (مترجم اخوان الصفا) کا وہ "اردو اخبار" جو انھوں نے ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے جاری کیا تھا ــــ اور اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہندوستان کی ڈیڑھ سو سالہ صحافت کی کوئی مستند، جامع اور مکمل تاریخ ہندوستان کی کسی زبان میں مرتب نہیں کی گئی۔ لے دے کر جو کچھ ملتا ہے وہ اردو زبان کی ایک مختصر سی کتاب "اختر شاہنشاہی" ہی ہے جسے اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف مرحوم نے ۱۸۸۸ء میں اختر ہند پریس لکھنؤ سے شایع کیا تھا یا پھر ڈاکٹر گارساں دتاسی کے مقالات و خطبات۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہمیں ابھی فیصلہ کرنے کے لئے برسوں بھٹکنا پڑے گا کہ لکھنؤ سے اردو زبان کا پہلا اخبار کب جاری کیا گیا تھا اور اس کا کیا نام تھا ــــ ؟

جناب محمد عتیق ردولوی نے قاضی عبدالغفار مرحوم اور امداد صابری صاحب کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ اختر الدولہ نے "اختر شاہنشاہی" میں "جلالی" اور "خیالی" جو نام درج کئے ہیں وہ دراصل پریس تھے اخبار یا رسالے نہیں تھے۔ عتیق صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں "اختر شاہنشاہی" سے ایسے ہی چودہ ناموں کی ایک فہرست پیش کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

> "مؤلف "اختر شاہنشاہی" نے اخباروں اور چھاپے خانوں کا ذکر ایک ساتھ حروف تہجی کے اعتبار سے کیا ہے اس لئے بعض جگہ اس کا اندازہ لگانا دشوار ہو جاتا ہے کہ جو نام لکھا گیا ہے وہ اخبار کا نام ہے یا چھاپے خانے کا ــــ !"

اس کے بعد "اختر شاہنشاہی" کے حوالے سے چودہ ایسے ہی ناموں کی ایک فہرست پیش کی گئی ہے جس کا ضروری اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

سنہ	نام	نام ایڈیٹر یا مالک	کیفیت
۱۸۴۰ء	جلالی	جلال الدین	یحییٰ گنج متصل مسجد مولانا حسن علی محدث
۱۸۴۶ء	خیالی	منشی خیالی رام	. . . .

آگے چل کر عتیق صاحب نے اپنی رائے ظاہر فرمائی ہے۔

"یہ چودہ ناموں کی فہرست ہے۔ ان ناموں کے سلسلہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ یہ اخبار تھے یا چھاپے خانے۔ بعض نام اس فہرست میں ایسے ہیں جن کے متعلق رسالے یا اخبار ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے مثلاً جلالی، علوی یا خیالی۔

قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم نے "جلالی" اور "خیالی" کے متعلق اخبار ہونے کا بالیقین اظہار کیا ہے اور "جلالی" کے ایڈیٹر کا نام "حسن علی محشر" بتلایا ہے ــــ امداد صابری صاحب نے فرمایا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں لکھنؤ سے ایک مذہبی پرچہ جس کا نام "جلالی" تھا۔ مولانا علی حسن محدث نے جاری کیا۔ یہ "حسن علی محشر" اور "مولانا حسن علی محدث" غالباً نہیں بلکہ یقیناً خرابی ہے "مسجد مولانا حسن علی محدث" کی ــــ جس کے متصل "جلالی" کا دفتر یا چھاپہ خانہ رہا ہوگا۔ ہندوستانی اخبار نویسی ــــ کمپنی کے عہد میں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ صفحہ ۲۰۱، ۲۰۲ "اختر شاہنشاہی" کے ان اندراجات سے یقیناً یہ ثابت نہیں کہ "جلالی" اور "خیالی" لکھنؤ کے قدیم اخبار یا رسالے تھے اور جب تک اس سلسلہ میں کوئی قابل وثوق شہادت نہ مل جائے ہمیں عتیق صاحب کے اس نظریے کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ یہ دونوں نہ تو رسالے تھے نہ اخبار۔

لکھنؤ کا پہلا اردو اخبار کون تھا ــــ ؟ یہ سوال اس کے بعد بھی باقی رہ جاتا ہے بعض محققین نے "طلسم لکھنؤ" کو اوّلیت کا درجہ دیا ہے جو محمد عتیق صاحب کی ریسرچ کے بعد صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لکھنؤ سے اردو کا سب سے پہلا اخبار "لکھنؤ اخبار" ہی نکلا تھا اور جو ۱۸۴۷ء سے قبل جاری ہو چکا

تھا عتیق صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

"لکھنؤ کا پہلا اخبار جس کے وجود کا ہم کو "لکھا پڑھا" اور باضابطہ ثبوت ملتا ہے وہ "لکھنؤ اخبار" ہے جس کے اجرا کی صحیح تاریخ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ ۱۸۴۷ء کے اوائل میں ایک بزرگ جن کا نام "لال جی" تھا "لکھنؤ اخبار" شایع کرتے تھے۔

نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں ایک قلمی "رجسٹر آف دی نیوز پیپرز" یعنی بہی رسید اخبارات ۱۸۴۷ء محفوظ ہے اس "بہی" میں پنڈت جیون رام کھن تیواری ان اخبار و رسائل اور دیگر متعلقہ کاغذات کا اندراج کیا کرتے تھے جو "دفتر فارسی خانہ گورنری" میں دہلی و آگرہ و بریلی و شملہ و کلکتہ و بنارس سے آتے تھے۔

اس رجسٹر میں ۲۴ر اپریل ۱۸۴۷ء کی تاریخ میں اور اخباروں کے ساتھ ہم کو "لکھنؤ اخبار" "لال جی" بھی نظر آتا ہے اور یہ اس کا قطعی ثبوت ہے کہ ۲۴ر اپریل ۱۸۴۷ء کو "لکھنؤ اخبار" موجود تھا۔ ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں ص۲۸۳

اس کے (۱۸۴۷ء) بعد تقریباً نو سال تک ہمیں لکھنؤ کے افق صحافت پر کسی اخبار یا رسالے کی اجرا کا پتہ نہیں ملتا۔ ایک طویل اور مسلسل سکوت کے بعد ۱۸۵۶ء میں مولوی محمد یعقوب فرنگی محلی نے ہفتہ وار "طلسم" جاری کیا جس کا ذکر "اختر شاہنشاہی" میں مختصر طور پر کیا گیا ہے۔

"طلسم لکھنؤ" لکھنؤ محلہ فرنگی محل۔ ہفتہ وار۔ چار ورق اوسط۔ یوم جمعہ سالانہ پندرہ روپیہ۔

مالک مولوی محمد یعقوب انصاری۔ از مطبع محمدی۔ اجرائے جنوری ۱۸۵۶ء (اختر شاہنشاہی ص۱۱۱) لیکن "طلسم" کے جو فائل ابتک سامنے آسکے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر شاہنشاہی "میں طلسم" کی تاریخ اجرا جو لکھی گئی صحیح نہیں ہے "طلسم" کا پہلا شمارہ جنوری ۱۸۵۶ء کو نہیں ۱۵ر جولائی ۱۸۵۶ء کو نکلا تھا چنانچہ جناب محمد رضا انصاری فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں:-

"طلسم کا پہلا پرچہ ۱۵ر جولائی ۱۸۵۶ء مطابق ۲۲ر ذیقعدہ ۱۲۷۲ھ کو نکلا یہ اخبار کب تک جاری رہا اس بارے میں کوئی آخری فیصلہ کر دینا آسان نہیں ہے۔ اخبار کے دستیاب شدہ شماروں کی مدد اور قیاس کی رہنمائی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں اردو صحافت کے اس پہلے نقیب کی گردن پر چھری چل گئی ہوگی۔ آخری شمارہ جو دستیاب ہوا ہے اس پر ۸ر مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ پڑی ہے جس کے تیسرے دن (۱۰۔ مئی کو) وسیع پیمانے پر وہ شورش پھوٹ پڑی تھی جس کو غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ غالباً اسی ہلچل میں کارپردازان اخبار کو "طلسم ہفتہ وار" کی اشاعت ملتوی کرنا پڑی ہوگی۔"

"طلسم" انقلاب سن ستاون کے بعد بند ہوا ہو یا کچھ دنوں تک اور جاری رہا ہو لیکن اسی سال لکھنؤ سے ایک اور اخبار بھی جاری ہوا تھا جس کا ذکر "اختر شاہنشاہی" میں نہیں ہے۔ اس کی دریافت کا سہرا جناب محمد عتیق صدیقی دولوی کے سر ہے۔ جنھوں نے پہلی بار اس کے متعلق کچھ تفصیلات اپنی نو تالیف کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" میں کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:-

"طلسم" لکھنؤ کا پہلا نمبر شایع ہونے کے تقریباً پانچ مہینے بعد ۱۷ر نومبر ۱۸۵۶ء کو لکھنؤ سے ایک اور ہفتہ وار اردو اخبار "سحر سامری" کے نام سے جاری ہوا اس کے اڈیٹر گھیر نرائن عیاش اور پنڈت بیج ناتھ تھے۔ مواد اور انداز بیان کے اعتبار سے "سحر سامری" اپنے ہم عصر "طلسم لکھنؤ" سے مختلف نہ تھا۔"
(ہندوستانی اخبار نویسی۔ کمپنی کے عہد میں)۔ ص۳۱۶

اختر الدولہ نے "اختر شاہنشاہی" میں منشی شنکر دیال فرحت کی ایڈیٹری میں شایع ہونے والے جس ہفتہ وار "سحر سامری" کا تذکرہ کیا ہے وہ یہی "سحر سامری" ہے جو ۱۷ر نومبر ۱۸۵۶ء کو گھیر نرائن عیاش کی ادارت میں نکلا تھا۔ اس اخبار کے مالک پنڈت بیج ناتھ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار ۱۸۵۶ء میں جاری ہو کر سن ستاون کی تہلکہ خیزیوں کی نذر ہو گیا تو دوسری بار یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء میں منشی شنکر دیال فرحت کی ایڈیٹری میں پھر جاری کیا گیا۔

"سحر سامری" کے حوالے سے عتیق صاحب نے ایک دوسرے اخبار کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام "مخزن الاخبار" تھا۔ عتیق صاحب کا اندازہ ہے کہ یہ اخبار نومبر یا دسمبر ۱۸۵۶ء میں جاری ہوگا۔ عتیق صاحب لکھتے ہیں۔

"سحر سامری" کے اوراق لکھنؤ کے ایک اور اخبار کی نشاندہی کرتے ہیں اس کا نام "مخزن الاخبار" تھا مولوی غلام رسول ضیا

نے اس اخبار کا قطعہ تاریخ کہا تھا جو سحر سامری میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

جلوہ آرائے لکھنؤ گردید مطبع تازہ و جواہر کار
عیسوی سال گفت فکر صفا طبع گردیدہ "مخزن الاخبار"

اس اخبار کے مزید حالات معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے مؤلف "اختر شاہنشاہی" نے بھی "مخزن الاخبار" کا ذکر نہیں کیا ہے گمان غالب ہے کہ نومبر یا دسمبر ۱۸۵۶ء میں اس اخبار کا اجرا ہوا ہوگا۔ (ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں) ص ۲۱۰

ان اخبارات کے علاوہ ۱۸۵۶ء میں ایک اور اخبار کا بھی پتہ چلتا ہے جس کا نام "اختر شاہنشاہی" نے "اعجاز" لکھا ہے لیکن "اعجاز" کا ذکر صرف ایک سطر میں کیا گیا ہے۔

"اعجاز ــــ یہ اخبار لکھنؤ سے شائع ہوا ــــ اجرائے جنوری ۱۸۵۶ء (اختر شاہنشاہی) ص ۵۵"

انقلاب ۱۸۵۷ء کی افراتفری سے تقریباً ڈیڑھ سال تک لکھنؤ پر ایک شدید قسم کا ادبی اور صحافتی جمود طاری رہا ــــ اور اس طویل خاموشی کے بعد لکھنؤ کے ادبی اور ثقافتی ماحول میں نئی زندگی کی لہر اس وقت اٹھی جب منشی نول کشور مرحوم "کوہ نور" لاہور سے علیحدہ ہو کر لکھنؤ پہنچے اور نومبر ۱۸۵۸ء میں "نولکشور پریس" کی داغ بیل ڈالی۔

منشی نول کشور مرحوم کا شمار ہندوستان کے ان گنے چنے چند صحافیوں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے اردو صحافت کے ابتدائی دور میں ہندوستانی اخبار نویسی کو پروان چڑھایا تھا۔ نول کشور پریس قائم کرنے کے بعد ہی انھوں نے "اودھ اخبار" جاری کیا جو پہلے تو ہفتہ وار رہا لیکن کچھ عرصے کے بعد روزانہ کر دیا گیا۔ اسی سال سے کچھ اوپر جاری رہ کر ۱۹۴۴ء میں بند ہوا۔

اودھ اخبار ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا تھا اس کے اجراء کے بعد سال ہی بھر کے اندر ۱۸۶۰ء میں مسٹر جیکب نے "اودھ گزٹ" جاری کیا جس کی عنان ادارت منشی گنگا پرشاد کے ہاتھ میں تھی اور دفتر جھاؤ لال کے پل پر۔ مسٹر جیکب کو ہندوستانی ادبیات سے خاص دلچسپی تھی۔ "اودھ گزٹ" کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک پندرہ روزہ گلدستہ شعر و سخن بھی "دیوان گلدستہ" کے نام سے ۱۸۶۰ء ہی میں جاری کیا تھا۔ اسے بھی منشی گنگا پرشاد ترتیب دیتے تھے۔ مسٹر جیکب کے یہ دونوں پرچے ان کے ذاتی مطبع اودھ گزٹ پریس میں چھپتے تھے۔ "دیوان گلدستہ" لکھنؤ کا سب سے پہلا گلدستہ شعر و سخن تھا۔

لکھنؤ کی صحافت کا یہ تاریخی پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے کہ یہاں کی اردو صحافت کی باگ ڈور تقریباً آٹھ دس سال تک ہندوؤں اور انگریزوں کے ہاتھ میں رہی۔ "اودھ اخبار" کے اجراء سے لیکر "کارنامہ" کے جاری ہونے تک جتنے اخبار یا رسالے لکھنؤ سے نکلے انھیں ہندوؤں یا انگریزوں کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا۔ ۱۸۶۱ء میں ایک بنگالی ہندو دکھنا رنجن مکرجی نے آٹھ ورق کا ہفتہ وار اخبار "ہندوستانی" جاری کیا جو ہر جمعرات کو اردو زبان میں گنگنی تنکل کے تالاب سے شائع ہوتا تھا۔ بارہ روپیہ سالانہ چندہ تھا اور یہ اخبار خود مکرجی کے ہندوستانی پریس میں چھپتا تھا۔

اودھ کے تعلقداروں کا تنظیمی ادارہ "انجمن ہند" کے نام سے سن ستاون کے بعد ہی قائم ہو چکا تھا۔ ۱۸۶۰ء میں انجمن کی طرف سے ایک پریس بھی قائم کر دیا گیا اور ۱۸۶۲ء میں جبکہ راجہ سر رانا بخش سنگھ تعلقدار کھجور گاؤں انجمن کے قائم مقام صدر تھے ایک ہفتہ وار اخبار "انجمن ہند" کے نام سے جاری کیا گیا جس کے ایڈیٹر کنور رہبر نام سنگھ اہلووالیہ سکریٹری انجمن ہند تھے۔ آٹھ ورق کا یہ اخبار ہفتے کے دن یحییٰ گنج سے شائع ہوا کرتا تھا۔ بارہ روپیہ سالانہ چندہ تھا۔

اس وقت تک اردو زبان کو بالعموم تمام ہندوستانی بلا تفریق مذہب و ملت اپنی ملکی و قومی زبان سمجھتے تھے۔ چنانچہ یو پی کی صوبائی حکومت نے ۱۸۶۳ء میں سرکاری گزٹ "اودھ گورنمنٹ گزٹ" کے نام سے جاری کیا وہ بھی اردو زبان اور فارسی رسم الخط ہی میں نکالا گیا تھا۔ یہ گزٹ ایف۔ کمنڈرو سکریٹری چیف کمشنر کے انتظام و انصرام میں ہفتہ وار سولہ صفحات پر شائع ہوتا تھا اور تقریباً ساٹھ ستر سال تک مسلسل اردو زبان میں جاری رہا۔ اس میں زیادہ تر سرکاری اطلاعات۔ قوانین کا خلاصہ۔ کیونکہ سرکلر اور حکام کے تقرر و تبادلوں کی خبریں ہوتی تھیں اس کے بیشمار فائل آج بھی یو۔ پی کی قانونی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

مولوی محمد یعقوب انصاری ایڈیٹر "طلسم" نہ صرف مرزا رجب علی بیگ سرور کے قریبی دوستوں میں تھے بلکہ اس دور کی مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کے بھی مرد میدان تھے۔ واجدی عہد میں سرور کی رنگینی بیان لکھنؤ کی روزمرہ بول چال میں بھی داخل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اگر انقلاب سن ستاون نہ ہو گیا ہوتا تو

کیا عجب تھا کہ یہ رنگ عرصے تک لکھنؤ کے مزاج پر غالب رہتا۔ اس مخصوص طرز انشاء کے لکھنے والوں میں مولوی محمد یعقوب کا تیسرا درجہ تھا۔ رجب علی بیگ سرورؔ کے بعد میر کلّو عرشؔ (تخلص میر تقی میرؔ) کے شاگرد رشید اچھے صاحب عیشؔ (فدا علی) صف اوّل کے لکھنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ "طلسم" بند ہونے کے بعد آٹھ نو سال تک مولوی محمد یعقوب نہ جانے کن مصائب کا شکار رہے کہ نہ مرحوم "طلسم" کو زندہ کر سکے اور نہ دوسرا کوئی اخبار نکال سکے۔ ان کا دوسرا اخبار "کارنامہ" یکم جنوری ۱۸۶۱ء کو لکھنؤ سے جاری ہوا۔ سولہ صفحات کا ہفتہ وار اخبار تھا۔ سالانہ چندہ میں بھی اس زمانے کے دستور کے مطابق ایک خاص امتیاز تھا یعنی گورنمنٹ اور والیان ملک سے پندرہ روپیہ سالانہ عوام سے بارہ روپیہ۔

اختر الدولہ نے "اختر شاہنشاہی" میں "کارنامہ" کا اشتہار بھی نقل کیا ہے۔

"شائقان سوانح روزگار کے لئے بشارت ہے۔ خواہشمندان کوائف امصار کے لئے اشارت ہے کہ یہ اخبار ہر بہار دوشنبہ کو چھاپا جاتا ہے۔ سہ شنبہ کو ملاحظہ ناظرین میں آتا ہے۔ سچی خبریں لکھی جاتی ہیں مفید باتیں نگارش پاتی ہیں۔ آغاز میں اخبار بلاد و امصار و قوانین و احکام سرکار تسطیر ہوتے ہیں آخر میں اشعار آبدار و اشتہار تحریر ہوتے ہیں۔" (اختر شاہنشاہی ص ۱۹۵)

"کارنامہ" اپنے ایک مخصوص رنگ میں ۴۲ سال تک جاری رہا۔ ۱۹۰۳ء میں مولوی محمد یعقوب کی وفات کے بعد بند ہوا۔

"کارنامہ" کے بعد ۱۸۶۱ء تک صرف چار اخبارات و رسائل کے اجراء کا پتہ چلتا ہے۔ مارچ ۱۸۶۱ء میں پنڈت دیبی پرشاد نے ایک ماہوار قانونی رسالہ "گلشن کشمیر" کے نام سے نکالا۔ مسیحی پادریوں نے ہندوستان کے پریس اور مطابع کی تاریخ میں جو نمایاں اور بنیادی کام کیا ہے وہ ہندوستان کی تاریخ صحافت کا ایک شاندار کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ مدراس، کلکتہ، آگرہ اور دوسرے مقامات کی طرح لکھنؤ میں بھی مسیحی مشن اپنا پورا کام انجام دے رہا تھا۔ ہندوستان کی عوامی زندگی سے قریب تر ہونے کے لئے جیکب کے علاوہ پادری بی کریون اور پادری سمور کی کوششوں سے ۱۸۶۹ء میں "شمس الاخبار" کا اجراء ہوا۔ یہ اخبار آٹھ ورق کی ضخامت پر امریکن مشن پریس حضرت گنج میں چھپتا تھا۔ آٹھ سال بعد اسی اخبار کا نام بدل کر "کوکب ہند" رکھ دیا گیا لیکن کرتا دھرتا پادری سمور اور بی کریون ہی رہے۔ "سحر سامری" کے دوسرے دور کا آغاز بھی اسی سال ۱۸۶۹ء میں ہوا جسے پنڈت بیج ناتھ نے سب سے پہلے ۲ نومبر ۱۸۵۶ء کو جاری کیا تھا اور ۱۸۵۸ء میں بند ہو گیا تھا۔

اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں صرف ایک ہی اخبار جاری ہوا۔ "مشیر قیصر" اس ہفتہ وار اخبار کو مرزا غالبؔ کے ایک شاگرد منشی غلام محمد خاں طپشؔ نے نکالا تھا۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی ایک ریڈیائی تقریر میں فرماتے ہیں۔

سب سے پرانے "منشی غلام محمد طپشؔ"۔ یہ تھے تو دہلوی مگر ہو گئے تھے لکھنوی۔ انھیں ان کی آخری عمر میں میں نے دیکھا ہے۔ بڑی عسرت سے بسر کرتے تھے۔ اپنے وقت کے منشی بے بدل تھے ... "کارنامہ" ہی کا ایک معاصر "مشیر قیصر" بھی گذرا ہے یہ انھیں منشی غلام محمد طپشؔ کی ادارت میں نکلا تھا جن کا نام "اودھ اخبار" کی ایڈیٹری کے سلسلے میں بھی آپ سن چکے ہیں۔

لکھنؤ کی صحافت کا ارتقائی دور ۱۸۶۲ء سے شروع ہو تا ہے۔ پچیس تیس سال کے اندر کوئی ستر اسّی اخبار و رسالے نکلے۔ کچھ تھوڑے دنوں زندہ رہ کر بند ہوئے اور کئی برسہا برس ہندوستان کے افق سیاست پر جگمگایا کئے۔ "اختر شاہنشاہی" نے ان کی کافی تفصیلات پیش کی ہیں جسے مختصر طور پر ایک فہرست میں درج ذیل کر رہا ہوں۔ یہ فہرست یقیناً نامکمل ہے بہت سے اخبارات و رسائل ایسے بھی ہوں گے جو مؤلف "اختر شاہنشاہی" کو دستیاب نہ ہو سکے ہوں گے۔ اسی لئے ان کا ذکر اس کتاب میں موجود نہیں ہے۔

سنہ اجرا	نام اخبار		نام ایڈیٹر یا مالک	کیفیت
۱۔ یکم اپریل ۱۸۶۲ء	"مخبر صادق"	(ہفتہ وار)	مرزا اثر صاحب	میر اصغر علی نے گولا گنج سے نکالا تھا۔
۲۔ یکم نومبر ۱۸۶۲ء	"انتباہ الاخبار"	(ہفتہ وار)	مولوی سید محمد علی	شیعوں کا مذہبی اخبار "فرنگی محل" سے شائع ہوتا تھا۔
۳۔ ۱۸۶۲ء	"جامع الاحکام"	(پندرہ روزہ)	منشی چندن لال	یہ قانونی اخبار تعلقداران اودھ کی "انجمن ہند" کی طرف سے نکالا گیا تھا۔ اس میں قانونی احکام و نظائر وغیرہ شائع ہوتی تھیں۔
۴۔ یکم جنوری ۱۸۶۳ء	"خیر خواہ اودھ"	(ہفتہ وار)	خیراتی لال طاہر	۱۸۶۳ء میں یہ ہفتہ اخبار پندرہ روزہ ہو چکا تھا۔

سن اجراء	نام اخبار	نام ایڈیٹر یا مالک	کیفیت
۵۔ یکم اپریل [illegible]	"خیرخواہ اطفال"	(ماہنامہ) پادری سموئیل پادری ٹی کریون	مسیحی مشن کی طرف سے سنڈے اسکولوں کے بچوں کے لئے جاری کیا گیا تھا
۶۔ یکم جنوری [illegible]	"تاج الاخبار"	(پندرہ روزہ) لالہ گوکل پرشاد	کایستھ دھرم سبھا کی طرف سے جاری ہوا تھا۔
۷۔ ۲ جنوری [illegible]	"آثار الامصار"	(ہفتہ وار) فدا علی عیش	شیعوں کا مذہبی اخبار ہر جمعرات کو امام باڑہ غفران مآب سے شائع ہوتا تھا۔
۸۔ یکم جولائی [illegible]	"اسح الاخبار"	(ہفتہ وار) سید محمد	یہ بھی شیعوں کا قومی اخبار تھا اس کا دفتر بھی امام باڑہ غفران مآب میں تھا۔
۹۔ [illegible]	"روزانہ"	منشی محمد علی خاں	پہلے یہ اخبار "انوار الاخبار" کے نام سے ہفتہ وار جاری ہوا پھر ۱۱ جون [illegible] سے روزانہ کر دیا گیا۔ مؤلف "اختر شاہنشاہی" نے اس کا نام "روزانہ" ہی لکھا ہے۔
۱۰۔ [illegible]	"گلدستۂ شعراء"	(ماہانہ) فتح محمد تائب	ماہانہ گلدستۂ شعر و سخن تھا۔ اس سے پہلے [illegible] میں اسی نام کا ایک گلدستہ منشی شنکر پرشاد سحا لکھنؤ سے بھی نکالتے تھے۔
۱۱۔ [illegible]	"مرقع تہذیب"	(پندرہ روزہ) مولوی چراغ علی (ہفتہ وار) اودھ بہاری لال	جلسہ تہذیب لکھنؤ کا یہ پندرہ روزہ اخبار تھا پہلے سرسید کے ساتھی اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی کی ادارت میں نکالا گیا تھا بعد میں لالہ اودھ بہاری لال کے زمانے میں ہفتہ وار ہوا۔
۱۲۔ [illegible]	"انجمن اسلام"	(ماہانہ) امتیاز علی علوی وکیل	انجمن اسلام لکھنؤ کا آرگن تھا۔
۱۳۔ ۲۲ جولائی [illegible]	"گلدستۂ سخن"	(ماہانہ) لالہ رام سہائے تمنا	۱۶ صفحہ کا گلدستۂ شعر و سخن تھا۔
۱۴۔ [illegible]	"منبع الاحکام"	(پندرہ روزہ) خیراتی لال طاہر	آٹھ صفحات کا قانونی پندرہ روزہ تھا۔
۱۵۔ یکم جنوری [illegible]	"اودھ پنچ"	(ہفتہ وار) منشی سجاد حسین	ہندوستان کا مشہور اور معیاری مزاحیہ اخبار۔
۱۶۔ یکم ستمبر [illegible]	"سرپنچ ہند"	بابو ابنکا پرشاد	لکھنؤ کا یہ دوسرا مزاحیہ اخبار تھا۔
۱۷۔ ،، دسمبر [illegible]	"بوستان العاشقین"	(ہفتہ وار) منشی بادھو لال	چار ورق کا یہ ہفتہ وار اخبار مولوی گنج سے شائع ہوتا تھا۔
۱۸۔ یکم مئی [illegible]	"انڈین پنچ"	(ہفتہ وار) منشی نوروز علی شیدا سری کرشن چند قیصر	پہلے نوروز علی شیدا کی ادارت میں نکلتا تھا۔ دسمبر [illegible] سے سری کرشن (قیصر) کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا رہا۔
۱۹۔ [illegible]	"اخبار ہند"	(ہفتہ وار) مرزا رفیع الدین	بابو گوری شنکر نے نکالا تھا۔
۲۰۔ [illegible]	"اشرف گزٹ"	(ہفتہ وار) سید بندہ حسن	"اختر شاہنشاہی" کے مؤلف اختر الدولہ محمد اشرف کے نام پر نکالا گیا تھا۔
۲۱۔ جنوری [illegible]	"ریاض الاشعار"	(ماہانہ) ڈاکٹر محمد یوسف	شعر و سخن کا ماہانہ گلدستہ۔
۲۲۔ یکم اپریل [illegible]	"ذخیرۂ آخرت"	(ماہانہ) اختر الدولہ محمد اشرف	ماہنامہ تہذیب الآثار سیتاپور کا ضمیمہ۔
۲۳۔ [illegible]	"تبیان الاخبار"	(ہفتہ وار) مرزا محمد علی	شیعوں کا قومی اخبار نخاس [illegible] سے شائع ہوتا تھا۔
۲۴۔ یکم جنوری [illegible]	"روزنامچہ لکھنؤ"	(روزنامہ) عبدالبصیر حضور بلگرامی	دو ورق کا روزانہ اخبار خدا بخش خاں بابی نے نکالا تھا۔
۲۵۔ ۲۹ جنوری [illegible]	"سیارہ اودھ"	(ہفتہ وار) محمد حسین اغلب موہانی	سولہ صفحے کا ہفتہ وار اخبار۔
۲۶۔ ۲۰ ستمبر [illegible]	"ہمزاد اودھ"	(ہفتہ وار) منشی رام سہائے تمنا	مزاحیہ اخبار "نوبستہ" سے شائع ہوتا تھا۔
۲۷۔ ۱۵ اکتوبر [illegible]	"امامیہ"	(دس روزہ) سید عابد علی رضوی	شیعوں کا مذہبی اخبار تھا۔
۲۸۔ [illegible]	"اخبار الاخبار"	(پندرہ روزہ) سید محمد علی	مدرسہ ایمانیہ اثنا عشری کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔
۲۹۔ [illegible]	"پیام یار"	(ماہانہ) منشی نثار حسین	ہندوستان کا مشہور گلدستہ شعر و سخن۔
۳۰۔ ۴ جنوری [illegible]	"سلطان الظرفا"	(ہفتہ وار) ڈاکٹر محمد حسن خاں	اس کا دوسرا نام "سرپنچ" تھا۔
۳۱۔ ۸ جنوری [illegible]	"لکھنؤ پنچ"	(ہفتہ وار) عاشق لکھنوی	اخبار ہند کا ضمیمہ تھا۔
۳۲۔ یکم فروری [illegible]	"ہندوستانی"	(ہفتہ وار) گنگا پرشاد ورما	یوپی کا مشہور وطن پرور اخبار ہندی اور اردو میں مشترک چھپتا تھا۔ لکھنؤ کے مشہور کانگریسی بابو گنگا پرشاد نے نکالا تھا۔
۳۳۔ ۲۳ مئی [illegible]	"پیام عشاق"	(ماہانہ) تصور حسین خاں	ماہانہ گلدستہ شعر و سخن۔
۳۴۔ ۲۳ مئی [illegible]	"فیض سخن"	(ماہانہ) مرزا عباس حسین ہوش	یہ بھی شعر و سخن کا ماہانہ گلدستہ تھا۔
۳۵۔ ۱۳ جولائی [illegible]	"اتالیق ہند"	(ہفتہ وار) محمد علی خاں عرشی	رکاب گنج سے ہر جمعرات کو شائع ہوتا تھا۔
۳۶۔ یکم اگست [illegible]	"جام جہاں نما"	(ہفتہ وار) سری کرشن چند قیصر	چار صفحہ کا اخبار دوشنبہ کو شائع ہوتا تھا۔
۳۷۔ یکم اکتوبر [illegible]	"رعنا"	(ماہانہ) عاشق حسین عاشق	گلدستہ شعر و سخن تھا مگر انگریزی ناولوں کے ترجمے بھی چھپتے تھے۔
۳۸۔ یکم جنوری [illegible]	"قومی"	(ماہانہ) لالہ دیبی پرشاد	کایستھوں کا قومی آرگن۔
۳۹۔ ۸ جنوری [illegible]	"جوبلی گزٹ"	(ہفتہ وار) سری کرشن چند قیصر	یوپی کے چیف سکریٹری ڈبلیو۔ بی۔ جونس کی یادگار میں نکلا تھا۔
۴۰۔ ۱۵ جنوری [illegible]	"نیر نظیر"	(ہفتہ وار) پنڈت شیو ناتھ سنگھ	
۴۱۔ ۲۲ فروری [illegible]	"مرقع نگار"	(ماہانہ) عاشق حسین عاشق	ماہانہ گلدستہ شعر و سخن۔
۴۲۔ ۵ مارچ [illegible]	"رفیق نسواں"	(پندرہ روزہ) مسٹر ہیڈلی	امریکن مشن کا یہ پرچہ لکھنؤ سے اردو ہندی کا کلکتہ سے بنگالی میں [illegible] عورتوں کے لئے جاری کیا گیا تھا۔

آگرہ ہنٹر ۱۸۸۱

سنہ اجراء	نام اخبار		نام ایڈیٹر یا مالک	کیفیت
۴۳۔ یکم اپریل سنہ [illegible]ء	"محشر"	(ہفتہ وار)	عبد الباسط محشر	
۴۴۔ ۱۰ مئی سنہ [illegible]ء	"تحفۂ عشاق"	ماہانہ	معصوم علی محشر جگوری	شعر و سخن کا گلدستہ۔
۴۵۔ ۱۵ مئی سنہ [illegible]ء	"اشراق"	(پندرہ روزہ)	مرزا محمد ہادی رسوا بی۔ اے	معیاری علمی اور ادبی پندرہ روزہ تھا جس میں افلاطون اور ارسطو کے فلسفے پر بہت کچھ مواد پیش کیا گیا ہے۔ رسوا نے ایک رسالہ "اقلم" بھی لکھنؤ سے نکالا تھا۔
۴۶۔ یکم جون سنہ [illegible]ء	نگار ادیان	(ماہانہ)	لالہ دیبی پرشاد	تحکم کائستھوں کا یہ دوسرا قومی آرگن تھا۔
۴۷۔ یکم نومبر سنہ [illegible]ء	"انتخاب"	(ماہانہ)	سخاوت علی سوختہ	شعر و سخن کا گلدستہ۔
۴۸۔ یکم جنوری سنہ [illegible]ء	"رہنما"	(ہفتہ وار)	محمد احمد قمر مینائی	یہ ہفتہ وار امیر مینائی کے صاحبزادے قمر مینائی نے نکالا تھا۔
۴۹۔ یکم جنوری سنہ [illegible]ء	"اختر اودھ"	(ہفتہ وار)	مالک علی الحق۔ منشی عبد الواحد	چار ورق کا ہفتہ وار، دوشنبہ کو گولہ گنج سے شائع ہوتا تھا۔
۵۰۔ یکم جنوری سنہ [illegible]ء	"قیامت"	(ہفتہ وار)	خواجہ محمد وزیر	سولہ صفحات کا ہفتہ وار اخبار تھا۔
۵۱۔ یکم فروری سنہ [illegible]ء	"دامن گلچیں"	(ماہانہ)	واجد علی بسمل	یہ ماہوار گلدستہ بھی امیر مینائی کے صاحبزادے قمر مینائی نے جاری کیا تھا۔
۵۲۔ ۲۰ مارچ سنہ [illegible]ء	"خمخانۂ عشق"	(ماہانہ)		شعر و سخن کا گلدستہ منشی درگا پرشاد نے اپنے پریس سے جاری کیا تھا۔
۵۳۔ ۲۵ مارچ سنہ [illegible]ء	"آزاد"	(ہفتہ وار)	منشی احمد علی شوق قدوائی	اپنے دور کا مقبول ہفتہ وار اخبار تھا۔
۵۴۔ ۲۰ اپریل سنہ [illegible]ء	"ہر دل عزیز"	(ماہانہ)	شری کرشن چند قیصر	دفن کلب کی طرف سے نکالا گیا تھا غالباً گلدستہ تھا۔
۵۵۔ ۱۵ مئی سنہ [illegible]ء	"درد دل"	(ہفتہ وار)	نواب محمد علی خاں	جلسہ محمدی کی طرف سے جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔
۵۶۔ ۱۵ ستمبر سنہ [illegible]ء	"مرأت الہند"	(ماہانہ)	پنڈت کشن نرائن	کشمیری برہمنوں کا معیاری ماہنامہ۔ "مراسلۂ کشمیر" کی پارٹی نے جاری کیا تھا۔
۵۷۔ ۱۵ ستمبر سنہ [illegible]ء	"نغمۂ بہار"	(ماہانہ)	یعقوب علی خاں نصرت	گلدستہ شعر و سخن۔
۵۸۔ ۲۵ جنوری سنہ [illegible]ء	"دلگداز"	(ماہانہ)	عبد الحلیم شرر	مشہور ادبی ماہنامہ تھا۔
۵۹۔ یکم اکتوبر سنہ [illegible]ء	"بہار ہند"	(ماہانہ)	چھجو بیگ عاشق	کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی کی طرف سے جاری کیا گیا تھا اس گلدستہ کو ہندوستان کے مشہور مزاح نویس مرزا محمد تقی دہرت چھجو بیگ عاشق ترتیب دیتے تھے۔
۶۰۔ ۱۵ اکتوبر سنہ [illegible]ء	"ادیب"	(ماہانہ)	ہدایت رسول محوی	انجمن تجارت کی جانب سے جاری ہوا تھا کافی معیاری رسالہ تھا۔
۶۱۔ ۱۲ جنوری سنہ [illegible]ء	"وکیل قومی"	(پندرہ روزہ)	مرزا عبد اللہ مسیحی عیسائی	عیسائی مشن کا تبلیغی پرچہ تھا۔
۶۲۔ جنوری سنہ [illegible]ء	"حامی اسلام"	(ماہانہ)	منشی تیغ بہادر	مذہبی رسالہ تھا۔
۶۳۔ یکم اپریل سنہ [illegible]ء	"کائستھ اخبار"	(ہفتہ وار)	لالہ سری رام وکیل	کائستھ سبھاؤں کا آرگن تھا تار کی خبریں اور اکابر قوم پر دلچسپ مضامین بھی ہوتے تھے۔
۶۴۔ سنہ [illegible]ء	"اختر ہند"	(ہفتہ وار)	اختر الدولہ محمد اشرف	انجمن علمی لکھنؤ کی طرف سے "اختر شاہنشاہی" کے مؤلف اختر الدولہ نے جاری کیا تھا۔ ہر جمعہ کو سولہ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔

اس زمانہ (۱۹۰۰ء) تک اتنے ہی رسائل و اخبارات کی تفصیلات ملتی ہیں حالانکہ بہت سے اہم اخبار و رسالے اور بھی تھے جن کا ذکر "اختر شاہنشاہی" میں تفصیل کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ "مراسلۂ کشمیر" (جسے بعد میں غالباً سر تیج بہادر سپرو مرحوم کی ادارت کا شرف حاصل ہوا تھا) اسی دور کے معیاری رسائل میں شمار ہوتا تھا۔ انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے جتنا رسالے اور اخبار لکھنؤ سے جاری ہوئے ان میں نولکشور پریس کا "اودھ ریویو" بھی کافی مقبول ہوا۔ اور مولوی عبد الحلیم شرر کے "ظریف" نے تو معرکۂ "چکبست و شرر" میں "اودھ پنچ" سے برابر کی ٹکر لی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستانی صحافت کے ابتدائی دور میں دیسی اخبارات کی کوئی خاص پالیسی نہیں ہوتی تھی بلکہ بقول جناب محمد رضا انصاری کے یہ کہنا چاہیے کہ ان کی کوئی پالیسی ہی نہیں تھی۔ لکھنؤ کی صحافت میں اس اوّلیت کا شرف "اودھ پنچ" کو حاصل ہے یہ ایک خاص قوم پروری کی پالیسی کے تحت جاری کیا گیا تھا اور آخر وقت تک مضبوطی کے ساتھ اپنی پالیسی پر قائم رہا۔ منشی سجاد حسین مرحوم پکے کانگریسی تھے۔ ان کے بعد شیخ ممتاز حسین نے جب عنان ادارت اپنے ہاتھ میں لی تو وہ بھی منشی صاحب کے بنائے ہوئے راستوں ہی پر چلتے رہے۔ "اودھ پنچ" کے بعد "ہندوستانی" دوسرا اخبار تھا جس کی پالیسی میں ہمیشہ ایک استقلال رہا۔ بابو گنگا پرشاد ورما اپنے زمانے کے مخلص محب وطن تھے۔ "ہندوستانی" کے ذریعہ انھوں نے ملک و قوم کی جو بے لوث خدمت کی ہے ہندوستان کی تاریخ آزادی میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہے۔

اب میں مختصر طور پر ان چند اخبارات و رسائل کے اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں جن کے بوسیدہ اوراق بھی چند دن میں معدوم ہو جائیں گے۔ اودھ کے الحاق اور نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد شاہی خاندان پر انگریزوں نے

جو مظالم کئے اس کا ذکر ۱۶، دسمبر ۱۸۵۶ء کے شمارے میں "طلسم" (لکھنؤ) نے چند جملوں میں کیا ہے۔

"شاہی خاندان کے لوگوں اور وظیفہ داروں کے ساتھ بے تمیزی کا برتاؤ کیا گیا وظائف روک دیئے جانے سے ان کا حال پتلا ہو گیا۔" جان عالم نواب واجد علی شاہ کے کلکتہ چلے جانے کے بعد لکھنؤ کے بہت سے معتقد حضرات کلکتہ کی طرف روانہ ہونے لگے۔ مدار الدولہ نواب علی نقی خاں انگریزوں سے ٹکا سا جواب پا کر سوچ میں پڑ گئے "سوچا تھا کیا کیا ہو گیا؟" مجبوراً کلکتہ کی طرف رخ کیا۔ ان کی روانگی کا منظر "طلسم" کے اوراق پر پیش کیا گیا ہے۔

"ذیقعد کی تیرھویں ۱۲۷۲ھ جولائی کی سولھویں ۱۸۵۶ء کو آدھی رات کے وقت نواب علی نقی خاں معہ مصاحبین و اہل و عیال ڈاک گھی پر کانپور کو روانہ ہوئے۔ بیس گاڑیاں ڈاک کی عزیزوں اور مصاحبوں کی سواری میں ہمراہ تھیں۔ گنگا کی طغیانی سے ایک رات دن گنگا کے کنارے قیام رہا۔ پندرھویں (ذیقعدہ) کو کانپور میں پہنچے وہاں سے سترھویں کو جانب کلکتہ مسافر ہوئے۔ جب حضور بادشاہ حضور بادشاہ جم جاہ میں حاضر ہوں گے تب جوہر رفاقت ظاہر ہوں گے۔ کیفیت حصول اجازت ابھی تحقیق نہیں ہوئی۔ انشاء اللہ تعالیٰ بعد دریافت ہفتہ آئندہ میں لکھی جائیگی۔ اتنا معلوم ہوا کہ روانگی سے پہلے چیف کمشنر "بمک سین صاحب بہادر" اور کپتان میجر ہیلس صاحب بہادر کی ملاقات کو گئے تھے۔ وہاں سے پھر کر اسباب لادنے کا حکم فرمایا نقد و جنس جو کچھ لائق ہمراہی کے تھا ساتھ لیا باقی جو بچا امانت رکھوایا۔

جب سواری سڑک پر گزری مردم بازاری نے سواری کا اہتمام کیا۔ دم رخصت مسافر کو خدا اور رسول کو سونپتے ہیں۔ ان لوگوں نے سب و دشنام کیا۔ جو جو منہ میں آیا بے تکلف سنایا۔ نواب صاحب نے باروقار سے دب کر سر نہ اٹھایا۔"

"کارنامہ" اسی "طلسم" کا نقش ثانی تھا جسے مولوی محمد یعقوب فرنگی محلی ترتیب دیتے تھے۔ "طلسم" کے اجرا کے آٹھ نو سال بعد جاری ہوا تھا اس کی عبارت آرائی "طلسم" سے کہیں زیادہ فنی تھی۔ مولوی حکیم نورالدین دریابادی کی ریاست "بڑودہ" روانگی پر ۲۰، فروری ۱۸۷۱ء کو "کارنامہ" میں ایک خبر دی گئی تھی۔ صرف تمہید ملاحظہ فرمایئے۔

"الحق" انقلاب پسند فلک عربدہ جو ہے۔ اس حربانگ کی قدیم یہ خو ہو۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہر علم کے فاضل جملہ فنون کے کامل اس شہر میں بکثرت نظر آتے تھے۔ طلبہ تلمذ سے نفع اٹھاتے تھے۔ قدردانی امراء و رؤسا سے ہر شخص کو تحصیل کا شوق تھا کسب کمال کا ذوق تھا۔ سرکار شاہی سے ایسی امداد کی جاتی تھی کہ اہل کمال کے احتیاج پاس نہ آتی۔ جب سے ستارہ "اختر نگر" زوال میں آیا۔ مخالفت تقدیر نے نقش سلطنت مٹایا۔ کاملین پریشان ہوئے۔ فکر معاش میں سرگردان ہوئے۔ تلاش الحتاج نے شرفاء کو ایسا گھیرا کہ ہوش و حواس پراں ہوئے۔ تعلیم اور تعلم کا شغل گھٹا۔ اس پر جو ذی علم و کمال ہزار طرح کی تکلیف سہہ کے خانہ عزلت گزیں ہوئے وہ بھی کاوش بہر ٹھہر سے اپنے ارادہ پر قائم نہ رہ سکے۔ چار و ناچار جلاوطن ہوئے۔ بہ تلاش قدر دان نکل گئے۔"

اس طویل "تمہید افشانی" کے بعد اس خبر میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حکیم صاحب عازم بڑودہ ہوئے۔

ہفتہ وار "سحر سامری" بھی "طلسم" ہی کا ہمعصر تھا۔ سلطنت اودھ کے خاتمہ کا جو ردعمل ہو رہا تھا اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"ان دنوں غلہ کی گرانی ہو۔ گرانی خاطر کی ارزانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہو (کہ) ایسا ئے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ فاقہ کشوں کی برق آہ شرربار سے خرمن ناد جل گیا۔ گردہ نان خورشید لشکر غم کے نیچے کچل گیا۔ جور فاقہ سے رفاقت نہیں بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا۔ جس نا: ان دوانلہ نے حال بربادی سنا رو دیا۔ ایک تو معاش نہیں بجائے تلاش نہیں۔ دوسرے وفور غم سے گندمی رنگ ہر بشر نیلا ہوا۔ گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا ... خون دل بجائے شراب ہے۔ لخت جگر کباب ہے۔ بد حواسی سے زوال اعتدال مزاج ہوا۔ ہر غریب و مسکین روٹی کے ٹکڑے کو محتاج ہوا ... لیکن چپڑی باتوں سے تدبیر نہیں چلتی۔ بت سب سکتے ہیں دال نہیں گلتی۔ حاکم اس طرف عنان توجہ پھیرتا نہیں پس کیا کریں

کہ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں "

ان دو ایک مثالوں سے اس دور کی صحافت کے ساتھ اس معاشی بحالی کا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے جو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ پر چھائی ہوئی تھی۔ بیس سال کے اندر لکھنؤ کے قدیم طرز نگارش میں کافی اصلاح ہو چکی تھی چنانچہ ۱۸۷۷ء میں جب لکھنؤ کی چیف کمشنری توڑی گئی تو یہ خطرہ سامنے تھا کہ یو۔ پی کی راجدھانی لکھنؤ کے بجائے "الہ آباد" میں بنے گی۔ جنوری ۱۸۷۷ء کے "مرات الہند" میں اسی مسئلہ پر ایک دلچسپ پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

"بعد جشن نوروزی اور دربار شہنشاہی واقع یکم ماہ حال چوتھی تاریخ کو کل تعلقداران اودھ کو یہ حکم سنایا گیا ہو کہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر۔ تعلقداران اودھ کے دوستدار اور محب صادق کا انتظام اب ترمیم ہوا اور صوبہ اودھ شامل ممالک مغربی و شمالی کے کر دیا گیا۔ اگر لکھنؤ اور الہ آباد کے ملنے سے صرف اتنی غرض ہے کہ محکمہ چیف کمشنری تخفیف میں آئے اور الہ آباد یا لکھنؤ دونوں میں ایک مقام صدر قرار دیا جائے تو سر دست یہ انتظام بھی نقصان سے خالی نہیں چونکہ سر جارج کوپر صاحب "کو لکھنؤ اور ارباب لکھنؤ سے ایک دلی انس اور محبت ہے اس سبب سے ہم کو یہ امید تھی کہ حضور محتشم الیہ یقیناً لکھنؤ ہی کو صدر قرار دیں گے اور الہ آباد اپنی اصلی حالت پر آجائے گا۔ اگر ایسا انتظام ہو تو چنداں مضائقہ نہیں۔ خدانخواستہ اگر معاملہ برعکس ہوا تو چوک کی سیر۔ حسین آباد کی روشنی۔ چھتر منزل کے جلسوں۔ امام باڑوں کی تعزیہ داریوں۔ آٹھوں کے میلوں عیش باغ کے جھمگھٹوں کو ابھی سے سلام ہے

سچ ہے کہ بہ نسبت سابق کے لکھنؤ ایک تو یوں ہی اجڑا معلوم ہوتا ہے مگر بوجہ حب وطن" از ملک سلیمان خوشتر"۔ تاہم یہاں کے باشندوں کی نظر میں اس اجڑے حال پر بھی لکھنؤ کا ہر ایک کوچہ و بازار اب تک اور شہروں کے مقابلے میں گلزار دکھائی دیتا ہے۔ اب بھی کپتان کے کنوئیں کی برفی کے مقابل میں ہندوستان بھر میں بھی کہیں ایسی برفی نصیب ہے؟ پارچہ والی گلی کا دوسیرا تنبا کو کسی نے اور کہیں پیا ہے۔؟ اگر یورپ کے شہزادے ایک دفعہ بھی ان کو پی لیں تو پھر "ہوانا سگار" اور "منیلا چروٹ" کا مزہ بالکل دل سے بھول جائیں۔ ہم کو زیادہ تر خیال اس کا ہے کہ جبکہ چوک میں بجائے سفید پوش وضعداروں کے دن کو تو ان کی روحیں پھرا کریں گی اور شب کو سریلے راگ اور گھنگروؤں کی جھنکار کے عوض میں سیار اور کتے سُر بھرتے ہوں گے۔ اس وقت یاں لوگوں کا زندہ رہنا معلوم۔ زندہ رہنا کیا۔؟ ارے صاحب ہم لوگوں کی تو ایک عرصے تک روحیں بھی مرقد میں چونک اٹھیں گی۔ افسوس کہ پھر لکھنؤ اور ملیح آباد کا سفیدہ کس کے کھانے میں آئے گا اور بعزض محال اگر کسی نے کھا یا بھی تو کیا مثل ہمارے قدر کریگا۔ استغفراللہ ہمارا سا منہ' ہماری سی طبیعت' ہمارا سا دل کہاں سے لائے گا۔ ہاں شاید عید بقرعید! بڑے دن کو دو چار یا دس بیس آم ڈالیوں میں لگ جائیں گے۔ آگے خیر صلاح۔ اللہ بس۔ باقی ہوس۔ ہائے لکھنؤ۔ ہائے لکھنؤ۔ ہائے لکھنؤ " مرات الہند لکھنؤ جنوری ۱۸۷۷ء

انیسویں صدی میں لکھنؤ کی صحافت علمی۔ ادبی۔ تاریخی۔ تمدنی۔ معاشرتی سماجی اور ثقافتی اعتبار سے زیادہ کامیاب رہی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے ادبی معرکے اسی دور کے لکھنؤ میں رزم آرا نظر آتے ہیں ـــ اور ان تمام ہنگامہ آرائیوں کے پس منظر میں صرف شرر۔ سرشار۔ چکبست۔ منشی سجاد حسین۔ ریاض خیرآبادی اور مرزا مچھو بیگ عاشق وغیرہ ہی نہیں تھے بلکہ "اودھ پنچ" "ظریف"۔ "دلگداز" اور "اودھ اخبار" کے علاوہ خدا جانے کتنے اخبارات و رسائل کے اوراق بھی مصروف کار تھے۔

✡

غزل

مانی جائسی

آپ کے سمجھے ہوئے ہوتے ہیں گوناگوں فریب
میں بھی لیکن دیدہ و دانستہ کھاتا ہوں فریب

ہو فلک سے بھی نرالی آپ کی شانِ ستم
کم سے کم اتنا تو ہو، دیتا نہیں گردوں فریب

کیا حقیقت ظرفِ رندانِ ازل کے سامنے
کچھ نہیں، یہ بحر اک دھوکا ہے، یہ جیحوں فریب

ہیں طمع کے حرف سب مہمل، ہوس کی راہ چھوڑ
ہر قدم پر ہے، اے ہوا و حرص کے مفتوں، فریب

لوحِ تقدیرِ جہاں پر لکھ دیا روزِ ازل
اس کا ہر عنواں طلسم، اور اس کا ہر مضموں فریب

دیکھ تو تیرے جلو میں کون ہے دیوانہ وار
روک لے ناقہ ذرا اے لیلیِ مجنوں فریب

بت نئے، گل ان سے کھلتے ہیں الٰہی زندہ باد
میری حد کی سادہ لوحی، ان کا روز افزوں فریب

عشق کی پیچیدہ راہوں سے گذر آساں نہیں
یہ وہ جادے ہیں جہاں کھاتا ہو افلاطوں فریب

ساغرِ لبریزِ صہبا کا مجھے دھوکا ہوا
دے گیا اس طرح ان کا دیدۂ مے گوں فریب

میری نظروں میں ہے ان کی ہر ادا کی مصلحت
تیری خاطر ہے کہ اتنے کھا رہا ہوں یوں فریب

میرے شعر اکثر وہ اے مانی سناتے ہیں مجھے
ہے تو دھوکا یہ بھی، لیکن کس قدر موزوں فریب

آگرہ اخبار ۱۸۸۱

دسمبر ۱۹۵۹ء

قائم چاند پوری

بہ نثار احمد فاروقی

قائم چاند پوری عہد میر و مرزا کے بڑے ریختہ گو، مشاق اور ماہر فن شاعر تھے۔ ان کی نغز گوئی اور شیوا بیانی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں کسی طرح میر و مرزا سے کم نہ تھے لیکن کچھ تو ان کی آواز اپنے عہد کے دوسرے بڑے شاعروں کی آواز میں دب گئی جن میں میرزا رفیع سودا اور میر تقی میر خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں اور کچھ ہمارے مورخوں اور ناقدوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

ان کا پورا نام محمد قائم اور قائم تخلص ہے۔ سال ولادت کا تعین دشوار ہے اس کے لئے کوئی صریح شہادت یا قوی قرینہ نہیں ملتا۔ لیکن مصحفی نے عقد ثریا میں لکھا ہے کہ "عمرش از شصت متجاوز است" اور تذکرہ عقد ثریا کی تالیف ۱۱۹۵۔۱۱۹۹ ہجری کے مابین ہوئی ہے۔ اس کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ بارہویں صدی ہجری کے دوسرے ثلث میں تقریباً ۱۱۳۵ ہجری و ۱۱۳۹ ہجری کے مابین پیدا ہوئے ہوں گے۔

مختلف تذکرہ نگاروں نے ان کے نام میں بہت اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ خود قائم نے مخزن نکات میں قیام الدین لکھا ہے۔ میر، میر حسن دہلوی، فتح علی حسینی، علی ابراہیم خلیل اور مرزا علی لطف نے محمد قائم لکھا ہے۔ مصحفی اور احمد علی خاں یکتا، قیام الدین علی لکھتے ہیں۔ شاہ محمد کمال، کمال مجمع الانتخاب میں اور گارساں دتاسی اپنے خطبات میں قائم الدین بتاتے ہیں۔

لیکن دستور الفصاحت کے مرتب مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا قول ہے کہ قائم کے والد کا نام محمد ہاشم اور ان کے دادا کا نام محمد اکرام تھا۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ قائم کا نام محمد قائم اور لقب قیام الدین ہے۔ جنھوں نے اسکا نام قیام الدین علی لکھا ہو وہ شاید اس کے خاندانی ناموں کی روش سے بے خبر رہے ہیں۔ مولوی عنبر شاہ خاں آشفتہ رامپوری جنھوں نے قائم چاند پوری سے ذاتی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے اپنے دیوان ریختہ (قلمی) کے دیباچہ میں نام قیام الدین محمد بتاتے ہیں۔ مگر شوق رامپوری نے تذکرہ تکملۃ الشعراء (تالیف ۱۱۹۷ ہجری۔ ۱۲۱۳ ہجری) میں محمد قائم ہی لکھا ہے۔

لیکن تمام شواہد کی روشنی میں یہ قول ہی زیادہ قرینِ صحت ہے کہ شاعر کا اصلی اور خاندانی نام محمد قائم ہی ہے اور قیام الدین ان کا لقب ہے۔ کسی تذکرے سے قائم کے والد یا دادا کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ بہت زمانہ ہوا جناب راز چاند پوری نے اپنے ایک مضمون (رسالہ زمانہ۔ کانپور جلد ۵۲ شمارہ ۱) میں لکھا تھا۔

"منشی محمد حسین صاحب جو قائم ..... کی نسل میں اس وقت چاند پور میں موجود ہیں راقم الحروف کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "آپ کا نام محمد قائم تھا۔ بعض تذکروں میں آپ کا نام جو قیام الدین لکھا ہوا ہے وہ غلط ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے والد کا نام محمد ہاشم اور دادا کا نام محمد اکرم تھا۔ نیز آپ کے صاحبزادے کا نام محمد منعم تھا۔ اس صورت میں آپ کا نام قیام الدین کسی طرح نہیں ہو سکتا۔"

ضلع بجنور میں چاند پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جسے قائم نے اپنا وطن بتایا ہے اور اسی کی نسبت مکانی کے ساتھ وہ مشہور بھی ہیں:

"فقیر ..... قائم ..... از باشندگانِ قصبۂ چاند پور است"

قدرت اللہ شوق، مصطفٰے خاں شیفتہ اور عبد الحی صفا بدایونی نے بھی انھیں چاند پور کا باشندہ لکھا ہے۔ لیکن میر حسن اپنے تذکرے میں اور میرزا علی لطف گلشن ہند میں "متوطن چاند پور ندینہ" لکھتے ہیں۔ یہ ندینہ اصل میں نگینہ ہے جو چاند پور کے قریب، ضلع بجنور میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔

بعض تذکرہ نگار انھیں دہلوی بھی سمجھتے ہیں مثلاً تذکرہ مسرت افزا مولفہ ابوالحسن امراللہ الہ آبادی میں انھیں "متوطن شاہ جہاں آباد" لکھا گیا ہے۔

مختلف تذکروں سے اور قائم کے ہم عصر مورخین کے بیانوں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی اور رسمی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی اور "بدو شعور" میں دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر بادشاہ کی نوکری کو اپنا ذریعہ معاش بنایا یعنی شاہ عالم کے عہد میں توپ خانے کے داروغہ ہو گئے اور مخزن نکات کی تالیف کے وقت (۱۱۶۷ ہجری کے لگ بھگ) وہ اسی ملازمت سے وابستہ تھے۔ "از بدو شعور تا ایں سال بتوسل نوکری بادشاہی بدارالخلافہ شاہجہان آباد گذراندہ" پھر اسی زمانے میں کچھ نظام سلطنت میں ایسی ابتری آئی کہ یہ سلسلۂ ملازمت چھوٹ گیا اور توکل پر گذارا ہو رہا تھا۔ اس انقلاب سے غالباً درانیوں کا دہلی پر تسلط مراد ہے جس سے سارا کارخانہ درہم برہم ہو گیا تھا اور اہل فن، صناع اور ملازمت پیشہ سبھی پراگندہ خاطر پھر رہے تھے۔ میر نے اس عہد کے انتشار کا مجمل تذکرہ ذکر میر میں کیا ہے۔ قائم بھی اسی کی لپیٹ میں آگئے۔

"دریں ایام کہ رشتہ سلک انتظام مردم بادشاہی بصدمۂ انقلاب
ازہم گسیخت وہریکے چوں لآلئ آبدار برخاک مذلت افتادہ رو بہر سو
نہاد بچار و ناچار بلکہ بے اختیار ارادۂ سفر برزائے اقامت غالب آمد"

یہی وہ زمانہ ہے جب دہلی کے نامور شعرا اور اہل کمال ایک ایک کرکے ہجرت کر رہے تھے۔ میرزا رفیع سودا، خان آرزو، میر سوز، میر حسن، وغیرہ نے لکھنؤ اور فیض آباد کا رخ کیا۔ اس زمانے میں قائم بیکار تھے اور تنہائی میں کسی انیس و رفیق کی ضرورت تھی۔ فکر شعر تو انسان ہر وقت نہیں کر سکتا اور "بیکاری جنون" کو پھر نہ کچھ شغل ضرور چاہیے: احباب و رفقا کی یہ جدائی اور افتراق دیکھ کر خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ایک ایسا تذکرہ ہی مرتب کر دیا جائے جس میں ان شعرا کے حالات اور کلام کا انتخاب شامل ہو۔

"فرصت را غنیمت انگاشتہ مصمم ساخت کہ نسخہ از روزنامچۂ احوال
بعضے از جریدۂ احوال ہر کدام بقید قلم درآوردہ درحالت جدائی
انیس تنہائی ساز دو بعد جذب یاد و کہ بے شمار ترقیم ابیات و تصحیح
حالات سخن وران متقدم و حال منسر گردید"

قائم جب اپنی جوانی کے زمانے میں دہلی پہنچے ہوں گے تو یہاں بڑے باکمال اساتذہ کا مجمع دیکھا ہوگا جس میں خان آرزو اور ان کے تربیت یافتہ ایک طرف اور میرزا مظہر اور ان کے تلامذہ دوسری طرف تھے۔ ان میں شاہ حاتم، مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد، عبدالحی تاباں، انعام اللہ خاں یقین، میر سوز وغیرہ نمایاں اور قابل ذکر ہیں۔ ایسے ماحول میں جہاں دن رات شعر و سخن کا چرچا ہو اور مضامین تازہ کے تارے آسمان سے توڑ کر لائے جا رہے ہوں کون ایسا ہوگا جو ذہن سلیم اور طبع مستقیم رکھتے ہوئے بھی شعر و شاعری کی طرف مائل نہ ہو۔ شعر کہنے کے لیے جس فکر، فطری اور جوہر خداداد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کی طبیعت میں پہلے سے موجود تھا۔ ان باکمالوں کی صحبت کیمیا خاصیت نے اسے بروئے کار لانے اور جلا دینے میں مدد کی اور رفتہ رفتہ یہ بھی اساتذہ کی صف میں شامل ہو گئے۔

قائم نے شاعری میں اصلاح کس سے لی؟ اس کا انھوں نے مخزن نکات میں تذکرہ نہیں کیا۔ البتہ سب سے پہلے میر تقی میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا (سال تالیف ۱۱۶۵ ہجری) میں لکھا ہے کہ پہلے خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے تھے۔ اب مرزا رفیع السودا سے مشورۂ سخن حاصل کرتے ہیں:

"مدتے داخل جرگۂ میاں خواجہ میر صاحب ماندا کنوں با مرزا رفیع مشورات"

اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ مخزن نکات کی تالیف کے زمانے میں وہ میرزا سودا کے شاگرد ہو گئے تھے۔ مگر سودا کے حال میں اپنے تعلق تلمذ کا تذکرہ تو کیا اشارہ بھی نہیں کیا آخر میں صرف اتنا لکھا ہے:

"الٰہی سایہ اش از سرِ سرو پایاں کم مباد"

اس سے کھینچ تان کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سودا سے اپنے تلمذ کا مبہم سا اعتراف کرتے ہیں لیکن دوسرے تذکرہ نگاروں نے صراحت کے ساتھ انھیں سودا کا شاگرد لکھا ہے اور خود قائم کے کلام کی داخلی شہادتوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے مثلاً:

قائم یہ فیض حضرت سودا ہے ورنہ میں
طرحی غزل سے میر کی آتا تھا بر کہیں

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ "یہ اول شاہ ہدایت کے شاگرد ہوئے۔ ان سے ایسی بگڑی کہ ہجو کہی۔ تعجب یہ ہوا کہ شاہ موصوف باوجودیکہ حد سے زیادہ خاکساری طبیعت میں رکھتے تھے مگر انھوں نے بھی

[illegible] ان کے حق میں کہا۔ پھر خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ ان کے حق میں بھی کوئی شعر کہا الگ ہوئے۔ پھر مرزا کی خدمت میں آئے اور ان سے پھرے۔ مرزا تو مرزا تھے انھوں نے سیدھا کیا۔"

ہدایت کا ترجمہ مخزن نکات میں شامل ہے لیکن قائم نے اپنی شاگردی کا اس میں اشارہ بھی نہیں کیا لیکن اس کا امکان ہے کیوں کہ ہدایت، دہلی میں قائم کے ہمسائے تھے۔ دوسرے یہ کہ آزاد نے ہدایت کے تلمذ کی روایت قدرت اللہ قاسم کے تذکرہ مجموعۂ نغز سے لی ہے، اگرچہ اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ہدایت کی ہجو میں قائم کے یہ اشعار ان کے دیوان میں ملتے ہیں:

حضرت دردؔ کی خدمت میں ادب سے میں نے
عرض کی یوں کہ اے استادِ زماں سنتے ہو
امر ہووے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسو سے بھی کبھی کج طینت
تیر بنتی ہے کہیں شاخِ کماں سنتے ہو

ویسے قائم نے اپنے تذکرے میں ہدایت کی تعریف جی کھول کر کی ہے۔

بہرحال دہلی میں یہ اہلِ کمال جب تک جمع رہے "عمِ الفت کا قحط" نہیں تھا۔ جب ایک ایک کرکے ساری محفل ہی اکھڑ گئی تو یہ سوال پیدا ہوا کہ "دہلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟" اب جس کے جدھر سینگ سمائے چلا گیا۔ قائم نے رامپور کا رخ کیا۔ یہ ریاست نئی نئی قائم ہوئی تھی اور اربابِ کمال کی قدردانی میں کسی سے پیچھے نہ تھی۔ مختلف وقفوں میں قائم آنولہ، پیلی بھیت، امروہہ، کندرکی، بسولی، سنبھل وغیرہ بھی گئے۔ مگر آخر میں بسولی سے ٹانڈہ چلے آئے اور وہاں سے رامپور آکر قیام کیا۔

نواب محمد علی خاں روہیلہ کی وفات کے بعد ان کی ریاست کا تصفیہ اس طرح ہوا کہ ۵۔ ۵ لاکھ سالانہ کی آمدنی کے علاقے ان کے تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ ٹانڈہ کا علاقہ نواب محمد یار خاں کو ملا جو شعر و سخن کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ امیر تخلص تھا۔ موسیقی کے بھی ماہر تھے اور مصوری سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ یہ مشہور شعر جو میر کے نام سے رائج ہو گیا ہے انھیں امیر کا ہے:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

قائم چاندپوری ٹانڈہ پہنچے تو سو روپے ماہوار پر نواب کے استاد مقرر ہوئے۔ نواب نے اصل میں مرزا سودا کو طلب کیا تھا مگر وہ ان دنوں مہربان خاں رند کی سرکار سے وابستہ تھے انھوں نے "آوارہ ازیں کوچہ بآں کوچہ" پھرنے سے "یک در گیر و محکم گیر" کو زیادہ پسند کیا اور معذرت کر لی۔ اب نواب کی نظرِ انتخاب قائم پر پڑی۔ یہ ان دنوں بے کار تھے ہی، فوراً منظور کر لیا۔ یہاں حکیم کبیر سنبھلی، پروانہ علی شاہ پروانہ، عشرت، ہزال وغیرہ بھی جمع تھے۔ قائم نے مصحفی کو بھی بلا بھیجا۔ تھوڑی ہی مدت میں "منتخبانِ روزگار" کا ایسا مجمع ہو گیا کہ بقول شخصے آسمان کو بھی زمین پر رشک آنے لگا ہوگا۔ مگر بقول مصحفی "ناگاہ سنگِ تفرقہ آکر پڑا" اور یہ محفل بھی بارہ باٹ اٹھارہ پینڈے ہو گئی۔ یعنی ۱۱۸۵ھ میں نواب ضابطہ خاں کی شکست کے بعد جب شاہ عالم نے روہیلوں پر چڑھائی کی تو محمد یار خاں امیر کی امارت بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔ اور تین مہینے سے زیادہ یہ 'یارانِ موافق' ایک جگہ نہ بیٹھ سکے۔ مصحفی اُن دنوں کی یاد بڑے دل دوز پیرائے میں کرتے ہیں۔

اس کے بعد مصحفی تو لکھنؤ چلے گئے اور ایک سال تک وہاں کوچہ گردی کرنے کے بعد پھر دہلی آگئے۔ قائم چاندپوری نے نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کے بیٹے نواب احمد یار خاں کا توسل اختیار کر لیا اور رامپور میں مقیم ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے یہاں ان کی تنخواہ قلیل تھی جو ضروریات کے لیے کفایت نہ کرتی تھی اس لئے کچھ زمانے کے بعد لکھنؤ پہنچے اور مہاراجا ٹکیت رائے سے ملے۔ ٹکیت رائے کا اس دور میں طوطی بول رہا تھا۔ یہ علم و ادب کا بڑا شیدائی تھا اور نہایت عالم فاضل، قدردانِ کمال رئیس تھا۔ قائم نے اپنی خاندانی املاک کی واگذاشت کے لئے اس سے سفارش چاہی اور اپنے وطن کے عامل کے نام اس سے خط حاصل کرکے واپس آئے تاکہ اپنی جائداد اور روپیہ دوبارہ بحال کرا کر وطن میں کچھ دن چین سے بسر کر لیں۔ لیکن رامپور آنے کے کچھ ہی دنوں بعد انتقال کر گئے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔

ان کے سالِ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے ۱۲۰۷ھ (۹۳-۱۷۹۲ء) لکھا ہے اور ان کے خاندان میں بھی یہی سال مشہور ہے لیکن انتخاب یادگار میں امیر مینائی نے اور قاموس المشاہیر میں نظامی بدایونی نے ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۴ء) اختیار کیا ہے۔ گارساں دتاسی نے بھی یہی لکھا ہے۔

مصحفی نے اپنا تذکرہ ۱۲۰۹-۱۲۱۰ ہجری کے لگ بھگ مرتب کیا ہے۔ وہ

صراحتہً ان کا سالِ وفات نہیں لکھتے صرف اتنا کہتے ہیں کہ رامپور سے ان کے انتقال کی خبر پہنچی۔ علی ابراہیم خلیل، میرزا علی لطف، اور شیفتہ سنہ ۱۲۱۰ھ بتاتے ہیں لیکن ان میں ارجح قول، مولانا عرشی اور مختار الدین احمد آرزو کے نزدیک سنہ ۱۲۰۸ھ ہی ہے۔ استدلال وہ جراُت کے اس قطعۂ تاریخ وفات سے کرتے ہیں جو جراُت کے کلیات میں شامل ہے:

جراُت نے کہی یہ رو کے تاریخ وفات — یکتائی کے ساتھ
قائم بنیادِ شعرِ ہندی نہ رہی — کیا کیجئے اب آہ

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "اس مصرع سے سنہ ۱۲۰۸ھ ہی نکلتے ہیں اور یہی صحیح ہے" لیکن ہمیں اس مصرع سے یہ تاریخ ہاتھ نہیں آئی۔ سنہ ۱۲۰۷ھ البتہ مستفاد ہوتے ہیں۔

قائم کا انتقال رامپور میں ہوا تھا اور وہیں دفن ہیں۔ "در رامپور فیض اللہ خاں والہ کہ از مدت مسکن او، ہماں بلدہ بود مدفون گشت"

مصحفی نے بھی یہی لکھا ہے: "اجلش در رامپور رسید و خبر وفاتش شہر بہ شہر انتشار یافت" (تذکرہ ہندی) شاہ محمد کمال شاگرد قائم نے تذکرہ مجمع الانتخاب (قلمی) میں لکھا ہے:

"بہ رامپور..... سکونت داشتند وہموں جا انتقال نمودہ . . . ."

(نسخہ قلمی سالار جنگ میوزیم ورق ۵۷۴۔ الف)

قائم کی شادی کہاں ہوئی اور کتنی اولادیں ہوئیں اس کا کوئی صریح اشارہ نہیں ملتا۔ ہمارا قیاس ہے کہ شادی انھوں نے اپنے وطن ہی میں کی ہوگی۔ رسالہ زمانہ کے ایک مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اعقاب ابھی تک چاندپور میں موجود ہیں اور انھیں میں کے ایک بزرگ منشی محمد حسین نے بتایا کہ قائم کے ایک فرزند کا نام محمد منعم تھا۔ دیوان قائم کی ایک رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرزند خورد سالگی میں بھی فوت ہوا تھا۔ قدرت اللہ شوق کے تذکرہ طبقات الشعرا (قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن) میں بھی یہ رباعی ملتی ہے:

"رباعی در مرثیۂ پسر خود گفتہ:

کیدھر ہے تو اے قرار دل کے میرے
تجھ بن ہے دلوں کو بے قراری گھیرے
کس کھیل میں لگ گیا ہے خدا جانے تو
بیکار پڑے ہیں سب کھلونے تیرے

قائم کی تصنیفات زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اصنافِ سخن میں سے ہر ایک صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور کسی میدان میں بند نہیں ہیں لیکن ان کا دیوان مختصر ہی ہے۔ سودا، میر اور مصحفی کے دواوین سے ضخامت میں بہرحال کمتر ہے۔ اس کے کبھی قلمی نسخے زیادہ نہیں ملتے۔ ایک نسخہ دیوان قائم کا رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے اور دوسرا انڈیا آفس کے کتب خانے میں ہے۔ رسالہ زمانہ کانپور (جولائی ۱۹۲۹ء) سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ منشی محمد حسین کے پاس دیوان قائم کا ایک مکمل نسخہ موجود تھا جو انھوں نے ظفر الملک علوی مرحوم کے حوالے کر دیا تھا اور الناظر پریس سے اسے چھاپنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اب وہ نسخہ ظفر الملک مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں ہوگا مگر خدا ہی جانے وہ ذخیرہ بھی کہاں ہے۔ لکھنؤ والے اس کا پتا لگا سکتے ہیں۔ دیوان قائم کا انتخاب مختلف تذکروں میں ملتا ہے لیکن بہت ہی مختصر۔ بعض جگہ تو چند اشعار ہی دئے گئے ہیں۔ طویل انتخاب مقدمہ مخزن نکات نوشتۂ عبدالحق، جواہر سخن مرتبہ کیفی چڑیا کوٹی اور اردوے معلیٰ مرتبہ حسرت موہانی میں چھپا تھا۔ مجمع الانتخاب کے قلمی نسخے میں بھی سب سے زیادہ طویل انتخاب ملتا ہے۔

ایک لطیفہ اور بھی ہوا ہے۔ یعنی قائم اور سودا کا کلام طرز و اسلوب کی مشابہت کے باعث اور کچھ کاتبوں کی بد توفیقی یا بے احتیاطی سے غلط ملط ہو گیا ہے۔ چنانچہ کلیات سودا کے مروجہ نسخوں میں بعض مثنویاں اور غزلیں، جن کے اشعار کی مجموعی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہی نکلے گی، قائم چاندپوری کے دیوان سے شامل ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قائم کے مسودات اصلاح کے لئے سودا کے پاس آتے تھے۔ کلیات مرتب کرنے والوں نے انھیں بھی سودا کی تصنیف سمجھ کر داخل دفتر کر دیا۔ خصوصاً ایک مثنوی "بردیہ" جسے مرزا علی لطف نے بھی قائم کے انتخاب میں درج کیا ہے کلیات سودا کے مطبوعہ نسخوں میں ملتی ہے۔ اس کا مطلع ہے:

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

مولوی عبدالحق اس کے لئے لکھتے ہیں کہ:-

"دونوں کے کلیات میں یہ کم و کاست درج ہے لیکن یہ غالباً سودا کی ہے کیونکہ اسی کے ساتھ کی دوسری مثنوی موسم گرما کی

ہجو میں موجود ہے لیکن میر حسن کے تذکرے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے قائم ہی کی مثنوی خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک طویل عشقیہ مثنوی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

الٰہی شعلہ زن کر آتشِ دل
تپِ دل دے بقدرِ خواہشِ دل

لطف یہ ہے کہ مثنویوں کے آخر میں سودا کے کلیات میں سودا کا اور قائم کے کلیات میں قائم کا تخلص موجود ہے اس سے صحیح فیصلہ کرنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارا قیاس یہ ہے کہ یہ مثنوی قائم ہی کی ہے جو غلطی سے سودا کے کلیات میں درج ہو گئی ہے اسی طرح اور کئی مثنویاں جن میں چھوٹے چھوٹے قصے اور حکایتیں منظوم کی ہیں دونوں کے کلام میں مشترک پائی جاتی ہیں۔" (مقدمہ مخزن نکات)

لیکن فی الواقع مثنوی بردیہ (در ہجو موسم سرما) بھی جسے مولوی عبدالحق سودا ہی کی تخلیق سمجھتے ہیں، قائم کی تصنیف ہے۔ اس پر دو شہادتیں آتی ہیں ایک تو یہ کہ سودا و قائم کے ہمعصر یا قریب العہد تذکرہ نگار مثلاً میر حسن، شاہ کمال، علی ابراہیم خلیل اور میرزا علی لطف اسے قائم ہی سے منسوب کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ کلیاتِ سودا کے جتنے خطی نسخے سودا کی زندگی میں لکھے ہوئے ملتے ہیں ان میں یہ الحاقی کلام نہیں ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مستند وہ نسخہ ہے جو خود سودا نے ایک انگریز مسٹر جانسن کو پیش کرنے کے لئے تیار کرایا تھا اور جو آج بھی انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کے شروع میں سودا کی ایک قلمی تصویر بھی شامل ہے جسے شیخ چاند مرحوم نے اپنی کتاب سودا کے شروع میں درج کر دیا ہے۔

قائم کے ایک شاگرد شاہ محمد کمال، کمال، کڑا مانک پور (الہ آباد) کے رہنے والے اور بڑے سیلانی آدمی تھے۔ وہ لکھنؤ جا کر قائم کے شاگرد ہوئے تھے اور بعد میں جرأت سے اصلاح لیتے رہے۔ انھوں نے بہت سے ہمعصر شعرا کے دواوین اور تصاویر جمع کی تھیں۔ بعض دیوان خود مصنفوں نے انھیں نقل کرا کے دئے۔ ان میں ایک قائم کا دیوان بھی تھا اسی سے انھوں نے قائم کے دیوان کا انتخاب اپنے مجمع الانتخاب میں درج کیا ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ کتب خانہ مشرقی سالار جنگ اسٹیٹ حیدر آباد میں محفوظ ہے اور راقم الحروف کی نظر سے

گذرا ہے۔ اس میں مثنوی در ہجو سرما اور مثنوی عشقیہ، قائم ہی کے انتخاب میں درج ہیں۔

مثنویات کے علاوہ قائم نے رباعیات، قطعات، مخمس وغیرہ بھی لکھے اور خوب خوب دادِ سخن دی ہے۔ مگر ان کے رنگ سخن کا ایک پہلو ہجویات کا دفتر بھی ہے۔ اس میں وہ اپنے استاد میرزا سودا سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ قائم جو ایک ثقہ آدمی تھے اور ان کے ہمعصروں نے انکی "درویش منشی" اور صوفیانہ طرزِ زندگی کی گواہی دی ہے (خود مصحفی نے لکھا ہے کہ میں ان سے جب ملا تو وہ "لباسِ فقیری" زیبِ تن کئے ہوئے تھے) مگر ہجو کے میدان میں ایسے سرپٹ دوڑتے ہیں کہ شرم کی آنکھیں جھک جاتی ہیں اور حیا کو پسینہ آنے لگتا ہے۔ ہجو میں یہی نہیں کہ انھوں نے اشخاص معروف کی خبر لی ہو۔ اکثر کوئی قصہ یا لطیفہ فرضی اور روایتی قسم کا محض ذہنی عیاشی اور "تفریح" کے لئے مبتذل، عامیانہ اور بازاری زبان میں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے ہیں۔ فحش کلمات کا بے تکلف استعمال ان کے ہاں بھی سودا سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

مزید حیرت میر حسن پر ہوتی ہے کہ وہ بھی بڑے سلیم الطبع اور مرنجاں مرنج قسم کے بزرگوار تھے لیکن "قصاب کا لطیفہ"، "ہجو مولوی ساجد" وغیرہ میں انھوں نے بھی جامۂ حیا و شرم اتار پھینکا ہے اور سب کے ساتھ اس حمام میں ننگے ہو گئے ہیں۔ یہ دراصل رواجِ زمانہ کی بات ہے۔ انسان کی فطرت میں اجتہاد نہیں تقلید شامل ہے۔ وہ عوام یا عامۃ الناس میں جو بات مقبول و مروج دیکھتا ہے اسی کو نبھانے میں اپنی خوبی یا خوش بختی سمجھتا ہے۔ ہجویات کی روایت عربی سے فارسی میں گئی اور فارسی سے اردو نے حاصل کی۔ مگر فارسی میں پھر بھی اس کی آبرو بنی رہی۔ وہاں فردوسی و انوری جیسے مشاق تھے جو بحرِ فکر میں غوطہ کھا کر لآلیٔ آبدار نکال لاتے تھے اور ہجو میں بھی فنی ندرت و نزاکت کا ایک پہلو پیدا کر دیتے تھے یا زبان و بیان کے اعتبار سے اسے آسمان پر پہنچا دیتے تھے۔ اردو میں سودا نے یہ مرض پھیلایا۔ ان کی وہ ہجویات جن کا ہدف مخصوص اعلام و اسماء نہیں بلکہ کوئی سماجی حقیقت یا معاشرے کی خرابی ہے، یقیناً طنز کا عمدہ نمونہ ہیں اور وہاں سودا کا ذہن بھی جولانی دکھاتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی شخص پر کیچڑ اچھالتے ہیں تو سوائے گالیوں کے ان کی زبان سے کچھ نہیں نکلتا۔ قائم بھی سودا کے شاگرد تھے اور اپنے بہت سے معاصروں

سے چھلیں کرکے زبانِ ہجو کو سان پر چڑھا چکے تھے۔ اس لئے انھوں نے ہجویات میں حیرت انگیز طور پر سوداؔ کی کامیاب تقلید کی ہے۔ مثنویوں میں بھی وہ سوداؔ کے رنگ سے اپنا رنگ ملا دیتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بیانیہ شاعری جو سوداؔ کا خاص میدان ہے اور اسی میں سوداؔ کے قصائد، مثنویات اور ہجویات کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے، تقلید میں اتنی آسان نہ تھی جتنا قائمؔ نے اسے اپنے لئے آسان بنا لیا۔

لیکن سماج کی بدعنوانیوں، معاشرے کی خرابیوں اور نظامِ حکومت کی زبونی کی طرف جتنے واضح اشارے سوداؔ کی ہجویات میں مل جاتے ہیں اور جس طرح سوداؔ ان موضوعات کو اپنے تیرِ مطاعن کا ہدف بناتے ہیں اتنا قائمؔ سے نہیں ہو سکا۔

اب غزلیات کا معاملہ رہ جاتا ہے۔ محمد حسین آزادؔ نے لکھا ہے کہ "ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے"۔ یہ بات صحیح اور منصفانہ ہے۔ محمد حسین آزادؔ ہی پہلے تذکرہ نگار نہیں جس نے ایسی رائے کا اظہار کیا ہو۔ ان کے پیش رَو لکھنے والوں میں مصحفیؔ، شاہ کمالؔ، علی ابراہیم لطفؔ، احمد علی خاں یکتاؔ وغیرہ بھی ایسا ہی خیال ظاہر کر چکے ہیں۔ ہمعصر اور ہم طرح شعرا کے بارے میں مصحفیؔ کی رائے علی العموم جچی تلی اور منصفانہ ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ان کا خیال ہی دیکھئے:۔

"در پختگیٔ کلام و چستیٔ مصراعِ غزل، و روئیہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ
موافق رواجِ زمانہ دوش بدوش استاد را می رود و بلکہ در بعضے
مقام غلبہ می جوید"

"روئیہ قصیدہ و مثنوی" سے مصحفیؔ کی مراد وہی بیانیہ شاعری کا اسلوب ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اس انداز کو سوداؔ کے بعد صرف قائمؔ نے صحیح طور سے قائم رکھا ہے۔ "موافق رواجِ زمانہ" میں موضوع اور معیار کی بات آجاتی ہے یعنی انھوں نے جس قسم کے موضوعات پر لکھا وہ رواجِ زمانہ کے مطابق تھے۔ اور زبان و بیان اور اسلوب و ادا میں جو روش اختیار کی وہ اس عہد کی عام اور پسندیدہ روش تھی۔

میر حسنؔ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

"ان کا اسلوب طالب آملی کے طرز سے ملتا جلتا ہے۔ جس انداز کی مثنویاں انھوں نے لکھی ہیں اردو میں کم ہی کسی نے لکھی ہونگی۔"

میرزا علی لطفؔ کہتے ہیں:۔

"سچ تو یہ ہے کہ بعد سوداؔ اور میرؔ کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو تو طرزِ گویائی کا اس سخن آفرین کے نہایت مرغوب ہے۔"

کریم الدین نے تذکرہ طبقاتِ شعرائے ہند میں لکھا ہے:۔

"بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سوداؔ سے بہتر کہتے ہیں، حق یہ ہے کہ سچے ہیں اور بعضے کم مایہ اور بے استعداد جو اس کو برابر سوداؔ کے گنتے ہیں، خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں۔"

اس میں تو خیر کریم الدین نے مبالغہ کیا ہے۔ یعنی وہ سوداؔ کو قائمؔ کے ہم رتبہ کہنا قائمؔ کی توہین سمجھتا ہے دراں حالیکہ خود قائمؔ کو سوداؔ کی استادی اور ہمہ گیری کا اعتراف ہے۔ اس کے برعکس شیفتہؔ نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ قائمؔ کی خوش گفتاری اور شیوا بیانی میں کلام نہیں لیکن اسے سوداؔ کے ہم پلہ سمجھنا کور ذوقی ہے۔

"شاعریست خوش گفتار، بلند پایہ، موزونیت عالی مقدار گراں مایہ۔ و آنچہ بعض ناشناسانِ سخن بہ مکانتِ سوداؔ می شمارند نشئ، حرف در دیوانگی شاں از جنون است۔ از بہرہ اندوزانِ دانش نباید پستی، زمین را با فرازِ فلک یکے دانستن۔"

لیکن سب سے زیادہ متوازن رائے احمد علی خاں یکتاؔ مولف دستور الفصاحت کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "اگر کلمات اور بندش پر نظر کیجئے تو قائمؔ، مرزا سوداؔ کے ہم پلہ ہیں اور دانغیت کے نکھار، برشتگی و شگفتگی کے اعتبار سے دیکھئے تو میرؔ سے پہلو مارتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کا پایۂ شعری ان اساتذہ سے کسی طرح کم نہیں بلکہ ان عناصر کی ایسی لطیف و دل نشین ترکیب ہوئی ہے کہ میرؔ و مرزا دونوں استادوں کی خوبیاں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں اور بعض جگہ تو قائمؔ کو ترجیح دینا پڑتی ہے۔ لیکن فرق اتنا ہی ہے کہ قائمؔ سوداؔ کا شاگرد ہے اور بس۔"

قائمؔ نے بھی اپنے استاد کی طرح جمیع اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اس کی اہمیت و حیثیت کے مطابق داد سخن گستری دی ہے۔ پھر یکتاؔ لکھتا ہے کہ "دوسرے استادانِ زمانہ کی طرح قائمؔ کا کلام بھی اہلِ زبان کے لئے سند ہے اور وہ خود بھی تمام سخن سنجوں کے نزدیک مسلم الثبوت اور مستند شاعر ہے۔ میر حسنؔ نے بھی قائمؔ کے محاورے کو درست مانا ہے۔ ایک بات یکتاؔ نے بڑے

پتے کی لکھی ہے جس سے خود اس کی بالغ نظری اور ملکۂ انتقاد کے جوہر کھلتے ہیں۔
وہ کہتا ہے کہ "اکثر استادوں کے ہاں یہ بھی ملے گی کہ وہ قصیدے کو غزل سے،
غزل کو رباعی سے اور رباعی کو دیگر اصنافِ سخن کی بندش سے متمائز نہیں کرتے
مگر قائم کے کلیات میں یہ بات دیکھی کہ اس نے کسی صنف میں بھی حد سے
تجاوز نہیں کیا اور ان کے "فرقِ بندش" کو ملحوظ رکھا ہے اور جس صنف کیلئے
جو انداز مناسب و متناسب ہے اس کی نگہداشت کی ہے حالانکہ دوسرے استادوں
کے ہاں یہ خامی مل جاتی ہے کہ ان کی غزل ترقی کرکے قصیدہ اور قصیدہ اپنے
پایۂ بندش سے فروتر ہو کر غزل سے جا ملتا ہے۔ یہی حال اور حلیہ دوسرے
اصنافِ سخن کا ہے۔"

آخر میں قائم کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کا نمائندہ اور مختصر انتخاب
دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

کیوں بچھڑتے ہو ذرے تہ جام سے کشو
ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا

اس دشتِ پُر سراب میں بھٹکے بہت پہ حیف
دیکھا تو دو قدم پہ ٹھکانا تھا آب کا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دُور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپی من گیا

بے دماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا
مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا

لے گئے خاک میں ہمراہ دل اپنا قائم
شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

چھوڑ تنہا مجھے یارب انھیں کیوں کر گذری
غم جنھیں آٹھ پہر تھا مری تنہائی کا

خاک کا سا ڈھیر سرِ رہ ہوں میں
قافلۂ عمر سفر کر گیا

جوں شررِ کاغذ آتش زدہ
شام غم اپنی میں سحر کر گیا

لے وعدہ اس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں
پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

موجِ گرداب کی طرح ہم نے
گھر سے باہر کبھو سفر نہ کیا

فلک جو دے تو خدائی تو لے نہ اب قائم
وہ دن گئے کہ ارادہ تھا پادشاہی کا

برنگِ طائرِ نو ہم اسیر اے صیاد
وہ ہیں کہ جن کا گلوں بیچ آشیانہ تھا

معاملہ یہ ہے دل کا اسے کہے گا وہ کیا
پیامبر کے ہمیں ساتھ آپ جانا تھا

قائم
سچ کہ جھوٹ ہے دعوائے دوستی لیکن
کبھی ہمیں بھی تو اک بار آزمانا تھا

تھا گلِ تازہ میں، پر حیف کہ بخت بد سے
زینتِ گوشۂ دستارِ عزیزاں نہ ہوا

ہم ہیں جنھوں نے نامِ چمن بو نہیں کیا
آئی صبا جدھر سے اُدھر رو نہیں کیا

ہم ہیں ہوائے وصل میں اس گل کی دربدر
جس کا صبا نے طوفِ سرِ کو، نہیں کیا

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

گرفتہ طبع جو مجھ سا چھٹا قفس سے تو کیا
رہائی جس کی اسیری کا ننگ ہے صیاد

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی
اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

قائمؔ، ہے جو شمعِ بزمِ معنی
میں رات گیا تھا اس جواں تک
پایا، تو ہے ڈھیر آنسوؤں کا
دیکھا تو گداز، استخواں تک

اب کی جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر تجھ کو نہ منھ دکھائیں گے ہم
جو آگے کہا کئے ہیں تجھ سے
سو اب کی وہ کر دکھائیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا
ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
اس پر بھی اگر ملیں گے تجھ سے
قائمؔ ہی نہ پھر کہائیں گے ہم

قائمؔ بجگہ ہے رونے کی یہ حالتِ تباہ
اس صحنِ گلستاں کے وہ ہیں دل فگار ہم
کھٹکا صبا کے پانوں کا شنکر برنگِ بو
آغوشِ گل میں ہوتے تھے نت بیقرار ہم
کیا جانتے تھے ہم کہ یہ اک دن چلے گی باؤ
اس مرتبے کو ہوئیں گے بے اقتدار ہم

موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن
وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں نہیں

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائمؔ لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

غیر اس کے کہ خوب روئیے اور
غمِ دل کا کوئی علاج نہیں
دو جہاں بھی ملے تو بس ہو ہمیں
یاں کچھ اتنی تو احتیاج نہیں

غربت میں مرا حال جو دیکھے ہو تو قاصد
زنہار نہ کہیو اسے یارانِ وطن میں

جوں شیشہ بھرا ہوں مے سے لیکن
مستی نے میں اپنی بے خبر ہوں

دل سے رخصت ہو بس اے خواہشِ گلگشت کہ اب
تابِ رفتار کدھر طاقتِ پرواز کہاں

یہ کاسہ سر تلے رکھے جو میخانوں میں سوتے ہیں
جسے چاہیں اسے اک جام میں جمشید کرتے ہیں
جنھیں کچھ سلسلے میں عشق کے تحقیق حاصل ہے
وہ کب مجنوں سے ہم گمراہ کی تقلید کرتے ہیں
نہ جانے کہئے کس قالب میں قائمؔ زدِ دل اس سے
نہیں بنتی زباں سے دل میں جو تمہید کرتے ہیں

کیوں نہ روؤں میں دیکھ خندۂ گل
کہ ہنستے تھا وہ بے وفا بھی یوں ہی

میں رہ گذر میں پڑا ہوں برنگِ نقشِ قدم
تیں چھوڑا کس کے بھروسے پہ کارواں مجھکو

دم قدم تک تھی ہمارے ہی جنوں کی رونق
اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سنتے ہو؟

گرچہ بلبل ہوں میں قائمؔ نے اس باغ کے بیچ
فرق کوئی نہ کرے گل کو جہاں خار کے ساتھ

دل ڈھونڈھتا سینے میں مرے ہوا بھی ہے
یاں راکھ کا اک ڈھیر ہے اور آگ دبی ہو

بھٹکا پھروں ہوں یاں میں اکیلا ہر ایک سمت
اے ہم رہانِ پیش قدم تم کدھر گئے

ہزار حیف کہ کچھ بھی ہے اس بجا گستاخ
میں جس چمن میں یہ چاہوں تھا یاں صبا نہ پھر

دو چیز ہیں یادگار دوراں
تیرا ستم اپنی جاں فشانی

عشق تو قائمؔ نہ ہوا آپ سے
اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہئے

دورِ تجلی

یحییٰ اعظمی

مدت کے شبستاں کو تجلی کا ہے پیغام فطرت نے دیا اک سحرِ تازہ کا انعام
رخصت ہوئی افسردگئِ شمعِ سرِ شام بجلی کے چراغوں سے منور ہیں در و بام

روشن ہے تری برق سے ہر گوشۂ تاریک
سو مرتبہ اے دورِ تجلی تجھے تبریک

صد شکر ہوئی خاکِ وطن کی نئی تعمیر ذروں میں فروزاں ہے مہ و مہر کی تنویر
ہے اوج پہ اس خاک کا اب کوکبِ تقدیر اُف ساحلِ مدراس سے تا وادئ کشمیر

دیکھو تو ہے آراستہ اک خلدِ بہاراں
ہر سو ہے فروغِ گل و لالہ سے چراغاں

خاکِ وطن اور لعل و جواہر کے مظاہر گنجینۂ فطرت کے نوادر کے مظاہر
کوہ و دمن اور چشمۂ طاہر کے مظاہر اللہ رے تسخیرِ عناصر کے مظاہر

انسان نے خود چیر کے کہسار کے سینے
کس شان سے فطرت کے بہائے ہیں خزینے

موڑے ہیں جو تدبیر سے دریاؤں کے دھارے دریاؤں کے دھاروں میں ہیں بجلی کے شرارے
وادی ہوں کہ بن خرم و شاداب ہیں سارے درپردہ ہیں یہ سنبل و ریحاں کے اشارے

رعنائی فطرت کا یہ نظارۂ رنگیں
دراصل ہے خود برق کا گہوارۂ رنگیں

دریاؤں کے دھارے ہوں کہ نہروں کی روانی وادی کا فسانہ ہو کہ جنگل کی کہانی
سبزوں کا ہو ریحان کہ پودوں کی جوانی ہر شے میں ہے سب برق کی یہ جلوہ فشانی

ہے برق کی لہروں کا یہ فیضانِ نمو عام
سب کے لئے اک زندگئ نو کا ہے پیغام

باقی نہ رہی بزم وہ اب دورِ کہن کی سب ختم ہوئیں گردشیں ایامِ محن کی
پوچھے نہ کوئی عظمتیں اب خاکِ وطن کی جاں بخش ہوائیں ہیں بہت تازہ چمن کی

دیکھو جسے اب نشاۃ تازہ سے ہے سرشار
دل میں ہے نیا شوق نیا ولولۂ کار

ہیں سامنے تعمیر و ترقی کی منازل — ہے عزم جواں اور چٹانیں ہیں مقابل
اس ذوق میں خونِ جگر و دل بھی ہے شامل — کچھ غم نہیں اس کا کہ ہے یہ زیست کا حاصل
اک جوش ہے اور راہِ طلب میں ہیں قدم تیز
بنے سنگِ گراں راہ میں حائل ہے نہ

اک ذوق تگ و تاز سے معمور ہے ہر دم — اک سعیٔ مسلسل ہے تو ہے گردشِ پیہم
یہ ولولہ، یہ حوصلہ، یہ عزم نہ ہو کم — اللہ کرے یونہی رہیں گرمِ سفر ہم
لیکن رہے یہ ہوش بھی اس ذوقِ طلب میں
اٹھے نہ کوئی گام غلط شوقِ طلب میں!

اس منزلِ تعمیر میں کوئی غلط اقدام — دراصل ہے بربادیٔ اقوام کا پیغام
ملت کی ہے تعمیر و ترقی کا یہ ہنگام — ہو جوش میں اک ہوش و تدبر بھی بہ ہر گام
ہر سینہ میں ہے اک دلِ بیدار بھی درکار
اخلاص بھی درکار ہے ایثار بھی درکار

وحشت

شہریار

یادوں کے آسیب زدہ پیڑوں پر اب تک
غم کی کوئل کوک رہی ہے
تنہائی کی ڈالی ڈالی ہنستی ہے
خوں تھوک رہی ہے
مجبوری کے زہریلے کانٹے
مستی میں جھوم رہے ہیں
محرومی کے زخمی پتے
آہوں کے لب چوم رہے ہیں
پتھریلے ایام کی نس نس
درد کے مارے ٹوٹ رہی ہے
ناکامی کے گہرے بادل داغ جنوں کے ڈھانپ رہے ہیں
خوف سے جنگل امیدوں کے کانپ رہے ہیں
نبض کسی کی چھوٹ رہی ہے
یادوں کے آسیب زدہ پیڑوں پر اب تک
غم کی کوئل کوک رہی ہے

عروضی مغالطے

اشفاق علی خاں

ماہنامۂ نیا دور لکھنؤ کے جون کے شمارہ میں ایک مضمون "چند عروضی غلطیاں" کے عنوان سے چھپا ہے۔ مضمون میں بعض اہلِ قلم کی عروضی غلطیاں گنانے کی کوشش کی گئی ہے، مگر اس کوشش میں مضمون نگار نے خود اپنی غلطیوں کی ایک طویل فہرست پیش کر دی ہے۔ چونکہ اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اس لئے متذکرہ مضمون کے چند مقامات پر ذیل میں بحث کی جا رہی ہے۔

مضمون نگار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن بحر ہزج مثمن اشتر ہے۔" اس وزن کو بحر ہزج مثمن اشتر کہنا عروض سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کرنا ہے۔ اس طرح کی عروض دانی، عروض سیفی، بیان عروض مشمولہ غیاث اللغات، بحر الفصاحت مصنفۂ مولوی نجم الغنی، حدائق البلاغت مصنفۂ شمس الدین فقیر جیسی مبتدیانہ اور غیر معتبر کتابوں اور رسائل سے مستعار معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ مضمون نگار موصوف نے انھیں کتابوں اور رسالوں میں سے اکثر کے حوالے دیئے ہیں۔

اس وزن کو ہزج مثمن اشتر کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں فاعلن اشتر ہیں اور دونوں مفاعیلن سالم ہیں، حالانکہ نہ دوسرا فاعلن اشتر ہے نہ پہلا مفاعیلن سالم ہے۔ زحافِ شتر، خرم اور قبض دو زحافوں کا مجموعہ ہے۔ خرم صدر و ابتدا کے لئے مخصوص ہے، حشو یا عروض و ضرب میں نہیں آتا۔ اس لیے شتر بھی صدر و ابتدا میں آتا ہے، حشو یا عروض و ضرب اس کی سرحد سے باہر ہیں۔ جو رکن حشو یا عروض یا ضرب میں ہوگا وہ کبھی اشتر نہیں ہو سکتا۔ یہاں دوسرا فاعلن حشو میں واقع ہے اس لئے اشتر نہیں ہے۔ صرف پہلا فاعلن جو صدر و ابتدا میں ہے اشتر ہے۔

دونوں کی شکل ایک ہے لیکن دونوں میں مختلف زحافات کا عمل ہوا ہے اسی طرح پہلا مفاعیلن دوسرے مفاعیلن کا ہم شکل ہے لیکن اصل کے لحاظ سے اُس سے بہت مختلف ہے۔ دوسرا سالم ہے اور پہلا مزاحف۔ عروضیوں کا قاعدہ ہے کہ کسی وزن میں جتنے زحاف آتے ہیں، اُس وزن کے نام میں اُن سب زحافات کے نام لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح وزن کے نام میں جتنے زحافات کے نام مذکور ہوتے ہیں، اتنے ہی اور وہی زحافات اس وزن کے ارکان میں متصرف سمجھے جاتے ہیں۔ اس وزن کو بحر ہزج مثمن اشتر دو صورتوں میں کہہ سکتے تھے۔ یا اس صورت میں کہ اس کے سب ارکان سالم ہوتے، صرف صدر و ابتدا میں آنے والا رکن اشتر ہوتا۔ یا اس صورت میں کہ جتنے ارکان مزاحف ہوتے سب میں شتر کا عمل ہوتا۔ پہلی صورت میں وزن کی شکل وہ نہ رہے گی جو مضمون نگار موصوف نے لکھی ہے بلکہ یہ ہو جائے گی۔ "فاعلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔" اس شکل کی کوئی فرع بحر ہزج کی فارسی میں نہیں ہے۔ عربی میں اس کا مربع آتا ہے یعنی یہ چاروں رکن دو دو کرکے دونوں مصرعوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اس طرح:۔ فاعلن مفاعیلن ، مفاعیلن مفاعیلن

فی الذین قد ماقوا وفیما قَدَّمُوا عِبَرَۃٌ

دوسری صورت میں یہ قباحت ہے کہ صدر و ابتدا کے سوا کہیں اور شتر کا عمل نہیں ہوتا۔ لہٰذا "فاعلن مفاعیلن۔ فاعلن مفاعیلن" بحر ہزج مثمن اشتر نہیں ہے، نہ بحر ہزج مثمن اشتر کوئی بحر ہے۔

"فاعلن۔ مفاعیلن۔ فاعلن۔ مفاعیلن" اصل میں بحر ہزج مثمن اشتر مکفوف مقبوض مجبّق ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شتر نے مفاعیلن اول پر دو عمل کئے، ایک خرم کا دوسرا قبض کا۔

جولا پیبی کے میلے میں آنے والے دیہی باشندے

جولا پیبی کے میلے میں بھوٹیوں کے خیموں کا منظر

وتد مجموع اول سباعی کے متحرک اول کے اسقاط کا نام خرم ہے بشرطیکہ اس رکن سباعی میں سبب ثقیل نہ ہو ورنہ اس خرم کا ایک خاص اور جداگانہ نام عضب ہوگا۔ رکن کے پانچویں حرف کو گرانا قبض کہلاتا ہے بشرطیکہ وہ پانچواں حرف سبب خفیف کا ساکن ہو۔ اس طرح خرم کا ہدف مفاعیلن کا میم اور قبض کا ہدف اس کی "ی" ہے۔ لہذا اشتر کے عمل سے مفاعیلن کا میم اور اس کی "ی" گر گئی اور اس کی شکل فاعلن رہ گئی جو اشتر کہلائے گی۔

دوسرے مفاعیلن پر کف نے عمل کیا جس کا کام یہ ہے کہ کسی رکن کے ساتویں حرف کو گرا دیتا ہے بشرطیکہ وہ حرف سبب خفیف کا ساکن ہو۔ مفاعیلن میں ایسا ساتواں حرف نون ہے۔ کف کے عمل سے مفاعیلن کا نون گر گیا اور اس کی شکل مفاعیلُ رہ گئی جو مکفوف کہلائے گی۔

تیسرے مفاعیلن پر قبض نے عمل کیا جس کی تعریف اوپر بتائی جا چکی ہے کہ اس کے اثر سے رکن کا پانچواں حرف جو سبب خفیف کا ساکن ہوتا ہے گر جاتا ہے لہذا قبض کے عمل سے مفاعیلن کی "ی" گر گئی اور اس کی شکل مفاعلن رہ گئی۔ اس تیسرے رکن پر ایک اور زحاف نے بھی عمل کیا جس کا نام تخنیق ہے تخنیق کی تعریف یہ ہے کہ اگر کسی وتد مجموع اول رکن سے پہلے حرفِ متحرک آنے سے تین حرکتیں پے در پے جمع ہو جائیں تو اس وتد مجموع کے حرفِ اول کو ساکن کر دیتے ہیں بشرطیکہ وہ رکن صدر و ابتدا میں نہ ہو۔ اس مفاعلن مقبوض کے وتد مجموع "مفا" کے قبل مفاعیلُ مکفوف کا لام متحرک آ جانے سے تین متحرک "لُ مُفَا" ایک ساتھ پے در پے جمع ہو گئے۔ لہذا تخنیق کے قاعدے سے تیسرے رکن مفاعلن مقبوض کا میم ساکن کر دیا گیا جو دوسرے رکن مفاعیلُ مکفوف کے لام متحرک سے مل گیا۔ اس طرح دوسرے رکن یعنی مفاعیلُ مکفوف اور تیسرے رکن مفاعلن مقبوض کی شکل تخنیق کے عمل سے مفاعیلم فاعلن ہو گئی یعنی مفاعلن کا میم کٹ کر مفاعیلُ کے لام سے مل گیا۔ مفاعیلم کو بدستور مکفوف کہیں گے۔ لیکن مفاعلن مقبوض کی جو شکل میم کے سکون اور ظاہری علیحدگی سے ہو گئی ہے یعنی فاعلن اس کو مقبوض مخنق کہیں گے کیونکہ یہ شکل اصلی رکن مفاعیلن میں قبض اور تخنیق دو زحافوں کے مشترکہ عمل سے حاصل ہوئی ہے۔ چوتھا رکن بدستور سالم ہے یعنی مفاعیلن۔ اس طرح ان زحافات کے عمل سے وزن کی شکل یہ ہوئی۔ فاعلن۔ مفاعیلم۔ فاعلن مفاعیلن۔ لیکن مفاعیلم مستعمل نہیں ہے اور عروض کا قاعدہ ہے کہ زحاف کے عمل سے رکن کی جو شکل حاصل ہو وہ اگر مستعمل نہیں ہے تو اس کی جگہ بغیر تغیر حرکات و سکنات کی یعنی اسی وزن کی مستعمل شکل استعمال کرتے ہیں لہذا مفاعیلم کی جگہ مفاعیلن کہیں گے۔ اب وزن کی شکل یہ ہوئی۔ "فاعلن۔ مفاعیلن۔ فاعلن۔ مفاعیلن" متذکرہ تفصیل کے مطابق اس میں پہلا رکن اشتر ہے، دوسرا مکفوف، تیسرا مقبوض مخنق اور چوتھا سالم ہے۔ یہی حال دوسرے مصرع کا ہے۔ لہذا یہ وزن بحر ہزج مثمن اشتر مکفوف مقبوض مخنق ہے۔ اس میں صدر و ابتدا اشتر، حشو اول مکفوف، حشو دوم مقبوض مخنق اور عروض و ضرب سالم ہیں۔

ایک جگہ مضمون نگار نے نشور واحدی کی غزل کے اس مصرع کا ذکر کرتے ہوئے ع "جب کوئی سنور گیا، زندگی سنور گئی" اس کے وزن "فاعلن۔ مفاعلن۔ فاعلن۔ مفاعلن" کو بحر ہزج مثمن اشتر مقبوض بتایا ہے۔ یہاں پھر وہی غلطی کی ہے کہ حشو کے فاعلن کو بھی اشتر کہہ دیا ہے حالانکہ اشتر صدر و ابتدا کا رکن ہو سکتا ہے حشو کا نہیں۔ اس وزن کی صحیح صورت یہ ہے کہ اس کو مثمن کی بجائے مربع کہا جائے یعنی فاعلن مفاعلن کا ایک مصرع۔ مثلاً اس صورت میں نشور کا یہ مصرع ایک شعر سمجھا جائے گا ؎

جب کوئی سنور گیا　　زندگی سنور گئی

اس طرح حشو کے اشتر ہونے کا عیب دور ہو جائے گا اور یہ بحر ہزج مشطور (مربع) اشتر مقبوض ہوگی۔ بحر ہزج کی اصل دائرہ میں فارسی اور اردو عروض کے لحاظ سے مثمن ہے یعنی مفاعیلن ۸ بار۔ مگر یہ مشطور بھی آتی ہے اور بحر ہزج کو وافی کی بجائے مشطور استعمال کرنا جائز ہے۔

اگر اس وزن کو مثمن ہی استعمال کرنا چاہیں یعنی "فاعلن۔ مفاعلن: فاعلن۔ مفاعلن" کا ایک مصرع کہنا چاہیں جیسا کہ

نشور کی غزل میں ہے تو اس صورت میں اس وزن کو مشطور، اشتر مقبوض کا مضاعف کہنا چاہیئے اور نشور کی غزل کے متذکرہ وزن کا نام عروض کے قاعدے سے بحر ہزج مضاعف المشطور اشتر مقبوض ہوگا نہ کہ مثمن اشتر مقبوض۔ مضاعف المشطور کہنے کی صورت میں دونوں فاعلن جو اشتر ہیں بدستور صدر و ابتدا کے برابر رہیں گے اور دونوں مفاعلن جو مقبوض میں عروض و ضرب کے برابر رہیں گے اور ارکان کی تعداد ایک مصرع میں وہی رہے گی جو نشور کے مصرع میں ہے۔ لیکن فنی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس وزن کو مضاعف المشطور کی بجائے صرف مشطور کی شکل میں استعمال کیا جائے۔ نشور صاحب کے مصرع کے وزن کو مثمن اشتر کہنا بالکل غلط ہے اور فنی لاعلمی کا ثبوت ہے۔

غیاث پر اعتراض کیا گیا ہے کہ "اس نے زحاف خرب کو صرف بحر ہزج اور بحر مضارع کے ساتھ مخصوص بتایا ہے حالانکہ یہ قریب میں بھی آتا ہے۔ غیاث عروض کے متعلق خود ناقابل اعتبار سہی، مگر یہ اعتراض اس لئے زیادہ غیر معتبر اور بے بنیاد ہے کیونکہ غیاث نے بحر قریب کی فروع میں دو فرعیں اخرب لکھی ہیں۔ ایک بحر قریب مسدس اخرب حشو اہتم، عروض سالم، ضرب مسبغ۔ پھر لطف یہ ہے کہ جس عروض دانی کے سلسلہ میں اس مضمون میں ادھر ادھر سے اعتراضات کو جمع کیا گیا ہے وہ غیاث ہی جیسی ناقابل اعتبار کتابوں پر مبنی ہے۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کتابوں سے بھی محض اقتباسات کہیں کہیں سے پڑھے گئے ہیں۔ استیعاب کے ساتھ انھیں کبھی نہیں پڑھا گیا ورنہ غیاث میں بحر قریب کی فروع میں خرب کا استعمال مل جاتا۔

ظہوری کا ایک شعر ہے ؎

بدستم دہ آں رشکِ یاقوت را   کہ سازم علاج عقل فرتوت را

بعض نسخوں میں دوسرے مصرع میں "علاج" ہے اور بعض میں "جواں"۔ اگر ظہوری نے "علاج" کہا ہے تو یقیناً علاج کے جیم یا عقل کی عین کے اسقاط کی غلطی کی ہے۔ اگر "جواں" استعمال کیا ہے تو اس کا دامن کمال اس غلطی سے پاک ہے۔ حدایق البلاغت کے مصنف کو یہ شعر علاج کے لفظ کے ساتھ پہنچا اس لیے انھوں نے اسے ظہوری کی غلطی بتایا۔ انھوں نے اس قاعدہ کی صراحت کرتے ہوئے کہ ساکن دوم کو جو وسط مصرع میں واقع ہو گرانا غلطی ہے، ظہوری کے اس شعر کو اس غلطی کی مثال میں پیش کیا کیونکہ ان کی صراحت کے مطابق علاج کا جیم جو وسط مصرع میں واقع ہو گرانا غلطی ہے، ظہوری کے اس شعر کو اس غلطی کی مثال میں پیش کیا کیونکہ ان کی صراحت کے مطابق علاج کا جیم جو وسط مصرع میں ساکن دوم کی حیثیت رکھتا ہے یہاں گرتا ہے۔ یہ قاعدہ بجائے خود صحیح ہے۔ اگر ظہوری نے علاج کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس نے اصول کی خلاف ورزی ہوئی ہے اور اگر جواں کا لفظ استعمال کیا ہے تو یہ خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ ظہوری کے اس شعر میں یا کاتب کی غلطی ہے یا ظہوری کی۔ لیکن متذکرہ اصول کی صحت پر اصرار کرنے میں مصنف حدایق البلاغت کی کوئی غلطی نہیں۔

مضمون نگار نے ظہوری کے شعر کے دوسرے نسخہ کا جس میں جواں کا لفظ استعمال ہوا ہے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ظہوری کے شعر پر کسی اعتراض کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اس طرح مصنفِ حدایق البلاغت کے اعتراض کو عروضی غلطیوں میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ مصنف حدایق البلاغت کی عروضی غلطی صرف اس صورت میں ہو سکتی تھی جبکہ وہ قاعدہ غلط ہوتا جس پر ان کا اعتراض مبنی ہے اور ظہوری کے شعر کا علاج والا نسخہ موجود نہ ہوتا۔ جب وہ قاعدہ غلط نہیں ہے اور ظہوری کا شعر علاج والے نسخہ کے ساتھ موجود ہے تو صاحب حدایق البلاغت نے کیا عروضی غلطی کی۔

نسخوں کے اختلافِ کتابت کی صورت میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع مصنف نے کون سا لفظ استعمال کیا تھا پھر بھی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ظہوری نے جواں کا لفظ کہا تھا اور علاج والا نسخہ ظہوری کے شعر کا اصلی نسخہ نہیں ہے بلکہ کاتب کا تصرف ہے، تو مصنف حدایق البلاغت کے ساتھ ساتھ ظہوری کو بھی صحیح مان لیا جائے گا۔ اس صورت میں نہ ظہوری کو غلط کہا جائے گا نہ صاحب حدایق البلاغت کو۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح رہیں گے۔ ظہوری کو اس لیے صحیح سمجھا جائے گا کہ اس مفروضہ کے مطابق اس نے جواں کا لفظ کہا تھا، علاج کا کہا ہی نہیں۔ مصنف حدایق البلاغت کو اس لئے صحیح سمجھا جائے گا کہ جو قاعدہ اس نے پیش کیا وہ صحیح ہے اور

ظہوری کے جس شعر کو اس نے قاعدے کی خلاف ورزی کی مثال میں پیش کیا اس کا وہ نسخہ اسے پہنچا جس میں کاتب کے تصرف سے جوان کا لفظ علاج سے بدلا ہوا تھا۔ بہرحال یہ مسئلہ اختلاف کتابت کا ہے نہ کہ عروض کا۔ مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اس اختلاف کتابت کے مسئلہ کو بھی عروضی غلطیوں میں شامل کر لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کو یہ علم نہیں کہ اس شعر کے دو نسخے ہیں۔ یہ خود مضمون نگار کی غلطی ہے مضمون نگار نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ صاحب حدایق البلاغت نے علاج کی عین کو ساقط بتایا ہے۔ انھوں نے عین کو نہیں بلکہ جیم کو ساقط کہا ہے۔ حدایق البلاغت کے اس اعتراض کے شروع میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:

"صاحب حدایق البلاغت نے لکھا ہے کہ اس کا
مصرع اول ساقط الوزن ہے"

یہ بھی مضمون نگار کی غلط بیانی ہے۔ صاحب حدایق البلاغت نے صرف دوسرے مصرع میں علاج کے جیم کو ساقط کہا ہے۔ پہلے مصرع کو نہ ساقط الوزن کہا ہے نہ اس پر کوئی اور اعتراض کیا ہے۔

حدایق البلاغت کے متعلق ایک جگہ غلط طور پر لکھ دیا ہے کہ "اس کے مصنف نے فارسی میں رجز مسدس کے استعمال کی نفی کی ہے حالانکہ مصنف نے خود ہی بحر رجز کے بیان میں رجز مسدس کے دو اوزان دیئے ہیں"۔

یہ بات بھی بے بنیاد ہے۔ صاحب حدایق البلاغت کی جس عبارت سے مضمون نگار یہ سمجھے ہیں کہ وہ فارسی میں رجز مسدس کے استعمال کے قابل نہیں اس عبارت کے شروع میں مصنف کے یہ الفاظ موجود ہیں کہ "ایں بحر را فصحائے عجم اکثر مثمن سالم استعمال کردہ اند۔" اس عبارت کا یہ مطلب ہوا کہ مثمن سالم کے علاوہ رجز کی دوسری فروع جن میں رجز مسدس بھی شامل ہے مصنف کے نزدیک فارسی میں کم استعمال ہوتی ہے۔ اس عبارت سے مصنف کا یہ مطلب سمجھنا کہ وہ رجز مسدس کو فارسی میں بالکل متروک الاستعمال بتاتے ہیں خود سمجھنے والے کی غلطی ہے۔ کسی اقتباس کو اسکے سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پڑھا جائے گا تو مفہوم کے سمجھنے میں اس طرح کی غلطیاں ضرور ہوں گی جنکے لئے ذمہ دار پڑھنے والا ہوگا نہ کہ مصنف۔

جن حدایق البلاغت پر مندرجہ بالا دو بے بنیاد اعتراض کئے گئے ہیں اس کے ایک اقتباس اور بحر الفصاحت کے اقتباس کی بنیاد پر زحاف اذالہ کو مضمون نگار نے حشو میں بھی مستعمل سمجھا ہے۔ حالانکہ اذالہ عروض و ضرب کے ساتھ خاص ہے اور حشو یا صدر و ابتدا میں استعمال نہیں ہوتا۔ غالب و ذوق اور بدر چاچی کے جن اشعار میں حشو کو مذال بتایا گیا ہے ان میں حشو کو مذال سمجھنا صریح غلطی اور عروض کے ضابطوں سے بے خبری ہے۔ وہ اشعار رواں نہیں بلکہ مشطور الاصل ہیں اور مضاعف کی شکل میں کہے گئے ہیں۔ مشطور الاصل ہونے کی وجہ سے ان کے ہر مصرع کے دو رکن ایک مصرع کے قائم مقام ہیں اور ان کے رکن مذال کا شمار حشو میں نہیں بلکہ عروض و ضرب میں ہے۔ مضاعف المشطور کر کے دو مصرعوں کا ایک مصرع چار رکنوں کا کر دیا گیا لیکن بحر اپنی اصل کے لحاظ سے مشطور ہی رہی اور بحر کو مشطور استعمال کرنا جائز ہے۔ جب ان اشعار کی بحر مضاعف المشطور ہے مثمن نہیں ہے تو حشو کو مذال کس طرح کہا جائے گا۔ مضمون نگار نے غالب و ذوق کے جن شعروں میں حشو کو مذال سمجھا ہے وہ مع اپنے وزن کے یہ ہیں غالب ؎

میں نے کہا کہ بزم ناز ، چاہیئے غیر سے تہی
مفتعلن مفاعلان ، مفتعلن مفاعلان
سن کے ستم ظریف نے ، مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
مفتعلن مفاعلان ، مفتعلن مفاعلان
جب وہ جمال دل فروز ، صورت مہر نیمروز
مفتعلن مفاعلان ، مفتعلن مفاعلان
آپ ہی ہو نظارہ سوز ، پردے میں منہ چھپائے کیوں
مفتعلن مفاعلان ، مفتعلن مفاعلان
ہاں وہ نہیں وفا پرست ، جاؤ وہ بے وفا سہی
مفتعلن مفاعلان ، مفتعلن مفاعلان
جس کو ہو جان و دل عزیز ، اس کی گلی میں جائے کیوں
مفتعلن مفاعلان ، مفتعلن مفاعلان

ذوق ؎

تاکہ یہ گبر اور ہنود طاق پرست چون باز
مفتعلن مفاعلان ، مفتعلن مفاعلان

کچھ ڈر دیں سے شرک پوچھنا آتش و آب و خاک و باد

مفتعلن مفاعلن، مفتعلن مفاعلان

یہ سب اشعار اپنی بحر کے لحاظ سے مشطور الاصل ہیں اس طرح۔

؎ میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی

مفتعلن مفاعلان مفتعلن مفاعلن

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلان

پہلے مصرع کا عروض مذال ہے، چوتھے مصرع کی ضرب مذال ہے۔ ان دو شعروں کو جو مشطور ہونے کے سبب سے مربع یعنی چار رکنی ہیں مضاعف کر دیا گیا تو وہ دو مصرعوں کا ایک ایک مصرع اور دونوں شعروں کا ایک شعر مضاعف المشطور کے وزن کا ہو گیا اس طرح ؎

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یہی حال باقی اشعار کا ہے۔ کون سا زحاف کس جگہ (صدر، ابتدا، حشو، عروض و ضرب) میں آیا یا آ سکتا ہے یہ بحر کی اصل کے لحاظ سے طے کیا جاتا ہے۔ ان اشعار کی بحر چونکہ اصل میں مشطور ہے اور موجودہ شکل اس کو مضاعف کر کے حاصل ہوئی ہے اس لیے ہر مصرع کا دوسرا اور چوتھا رکن جو بظاہر حشو کا رکن معلوم ہو رہا ہے اپنی اصل کے لحاظ سے حشو کا رکن نہیں بلکہ عروض اور ضرب کا رکن ہے اور چونکہ عروض اور ضرب میں اذالہ آتا ہے اس لیے یہ ارکان دوم و چہارم جگہ جگہ مذال ہیں۔ ان اشعار سے یہ سمجھنا کہ اذالہ حشو میں آتا ہے ان کی بحر کی اصل سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ان اشعار میں جہاں جہاں رکن دوم و چہارم مذال ہے ان کی بحر رجز مضاعف المشطور مطوی مجنون مذال ہے۔ اس کو بحر رجز مثمن مطوی مجنون مذال کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔ یہی حال بدر چاچی کے ان اشعار میں اذالہ کا ہے۔ اشعار مع اوزان کے درج ذیل ہیں بدر چاچی ؎

آں شاہد عودی نقاب، آورد در چین دو ناب

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلان

در سر در آمد از شتاب، دریائے شاں شد معجزش

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلن

زریں صدف تا در برہ، نقرہ بہ عنبر ہم سرشت

مستفعلن مستفعلن، مستفعلن مستفعلان

واز ابر دریا در پرست، لولو بسر جا ریختہ

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلن

آں شاہد لرزہ دار، سرطانش چوں سازو نزار

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلان

آتش شود ہر خاک و خار، از تف تحیٰ ریختہ

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلن

در چاہ زہرہ ز آفتاب، دلو ز رو آرد ماہ تاب۔

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلان

آ گردد آب التہاب، از روئے گرما ریختہ

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلن

بگرفتمش در بر چو چنگ، من در نوازش او بجنگ

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلان

صد عنبر زنجیر رنگ، از مشک دیبا ریختہ

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلن

خالت بچشم آں کافرست، کز جور او مردم نرست

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلان

یک زنگی آتش پرست، آب دو لالہ ریختہ

مستفعلن مستفعلان، مستفعلن مستفعلن

ان اشعار کی بحر بھی غالب و ذوق کے اشعار کی بحر کی طرح مشطور الاصل ہے فرق اتنا ہے کہ وہ بحر رجز مطوی مجنون مذال ہے اور یہ رجز مذال ہے اس میں رکن مذال کے علاوہ باقی ارکان سالم ہیں اور غالب و ذوق کی بحر میں چار رکن مطوی اور چار مجنون ہیں۔ ارکان مجنون مشطور کے عروض و ضرب میں ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں مذال بھی ہیں۔ دونوں بحریں مشطور الاصل ہیں دونوں کو مشطور سے مضاعف کیا گیا ہے۔ اس لیے دونوں مضاعف المشطور ہیں۔ غالب ذوق کی بحر بحر رجز مضاعف المشطور مطوی مجنون مذال ہے اور بدر چاچی کے ان اشعار کی بحر بحر رجز مضاعف المشطور مذال ہے۔ دونوں میں مشطور الاصل

ہونے کی وجہ سے رکن مذال عروض یا ضرب میں ہے حشو میں نہیں۔ دونوں بحروں میں سے ایک بھی مثمن نہیں ہے۔ اس لیے کسی میں حشو مذال نہیں ہے۔ یہ بات کہ بدر چاچی کے اشعار بھی مضاعف المشطور میں ہیں اور ان کا اذالہ بھی حشو میں نہیں بلکہ عروض و ضرب میں ہے، ان میں سے ایک شعر کی درج ذیل توضیح سے اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

؎ خالِ بچشمِ آں کافرست	کز جورِ او مردم نرست
مستفعلن مستفعلان	مستفعلن مستفعلان
؎ یک زنگیٔ آتش پرست	آب دو لالہ ریختہ
مستفعلن مستفعلان	مستفعلن مستفعلن

یہ چار مصرعے یعنی دو شعر بحر رجز مشطور مذال میں ہیں۔ پہلے مصرع کا رکن ثانی جو عروض میں ہے مذال ہے۔ دوسرے مصرع کا رکن ثانی جو ضرب میں ہے مذال ہے۔ تیسرے مصرع کا رکن دوم جو عروض میں ہے مذال ہے، چوتھے مصرع کے کسی رکن میں اذالہ نہیں ہے۔ ان چاروں مصرعوں یعنی دونوں شعروں کو ملا کر ایک شعر کر دیا گیا۔ اس کا ہر مصرع اصلی مشطور بحر کے دو مصرعوں سے مرکب ہے۔ اس طرح پورے شعر کی بحر مضاعف المشطور کر دی گئی۔ یہی حال بدر چاچی کے اور اشعار کا ہے۔ اس کے پہلے شعر کے مصرع اول کے پہلے رکن مذال کو سالم بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں آورد کے الف ممدود کے پہلے الف کو جو الف وصل کی حیثیت رکھتا ہے گرا دیا جائے گا اور نصاب کی ب کو الف ممدود کے دوسرے الف کے ساتھ ملا کر پڑھیں گے۔ چوتھے اور پانچویں شعر کے مصرع ثانی کو بھی سالم بغیر اذالہ کے پڑھ سکتے ہیں۔ چوتھے شعر میں التھاب کے بعد الف وصل کو ساقط کر کے اور پانچویں میں رنگ کے بعد الف وصل کو ساقط کر کے لیکن پانچویں شعر کو اس طرح پڑھنے میں تکلیف زیادہ ہے۔ چھٹے شعر کے مصرع ثانی کو بھی پرست کے بعد کا الف وصل گرا کر سالم پڑھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح غالب کے تیسرے شعر کے مصرع ثانی میں عزیمہ کے بعد کا الف وصل گرا کر رکن دوم کو بغیر اذالہ کے پڑھا جا سکتا ہے۔

فراق کا ایک شعر ہے ؎

پھر بھی سکونِ عشق میں آنکھ بھر آئی بارہا
گو غمِ عشق بھی فراق کچھ غمِ جاوداں نہ تھا

نیاز صاحب کا اس پر اعتراض ہے کہ فراق کا ق تقطیع سے گرتا ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ق اس لیے شاملِ تقطیع رہے گا کہ اس بحر کا حشو مذال ہے نیز بحر کو مثمن کہا ہے۔ فراق صاحب کا شعر صحیح ہے لیکن اس کے صحیح ہونے کی جو توضیح مضمون نگار نے کی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس شعر کی بحر بھی غالب و ذوق کے متذکرہ اشعار کی طرح بحر رجز مضاعف المشطور مطوی مخبون مذال ہے۔ مضاعف المشطور ہونے کی صورت میں فراق عروض میں واقع ہوگا اور چونکہ عروض میں اذالہ آسکتا ہے اس لیے دوسرے مصرع کے رکن دوم کو جو اپنی اصل کے لحاظ سے عروض میں واقع ہے مذال کر کے فراق کا ق تقطیع میں شامل کر لیں گے۔

لیکن اگر اس بحر کی اصل مثمن مان لی جائے اور جس رکن کے جز کے برابر فراق کا لفظ ہے اس کو حشو کا رکن سمجھ کر مذال کیا جائے جیسا کہ مضمون نگار کا خیال ہے تو نیاز صاحب کا اعتراض صحیح ہے کہ فراق کا ق تقطیع سے گرتا ہے کیونکہ اذالہ حشو میں نہیں آتا۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "اس غلط فہمی میں اردو کے بعض ارباب نظر بھی مبتلا ہیں کہ رجز میں حشو مذال نہیں آسکتا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اور بحروں میں اردو کے اہل فن متفقاً ارکان حشو میں اذالہ کا استعمال جائز سمجھتے ہیں، صرف رجز کا حشو مذال ہونے میں بعضوں کو اختلاف ہے۔ مضمون نگار کا یہ خیال بھی غلط ہے۔ حشو نہ بحر رجز میں مذال ہو سکتا ہے نہ کسی اور بحر میں۔ یہ قاعدہ صرف اردو ہی کا نہیں بلکہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے اہل کمال تین قاعدے پر متفق ہیں۔ اگر رجز یا کسی بھی بحر میں حشو کے مذال ہونے کو ناجائز کہا جائے تو یہ اردو کے ارباب نظر کی غلط فہمی نہیں بلکہ مضمون نگار کی غلط فہمی ہے۔

اس سلسلے میں مضمون نگار نے ایک اور نمایاں غلطی کی ہے۔ فراق کے شعر کا وزن "مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن" لکھا ہے اور لکھا ہے کہ "اگر اس کے حشو کے ایک رکن کو مذال قرار دیا جائے تو وزن کی یہ صورت ہوگی "مفتعلن۔ مفاعلان۔ مفتعلن۔ مفاعلان"۔" ایک رکن کے مذال ہوتے ہی دونوں مفاعلن کی شکل مفاعلان کیونکر ہو جائے گی؟

اکبا شیرازی کی مثنوی سحر حلال صنعت ذوبحرین میں ہے۔ اس کا ہر شعر بحر رمل مسدس محذوف فاعلاتن فاعلاتن فاعلن اور بحر سریع مسدس مطوی مکشوف مفتعلن مفتعلن فاعلن میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے ایک شعر کے متعلق مضمون نگار نے غلط طور پر لکھا ہے کہ مصرع اول صرف بحر رمل میں آتا ہے بحر سریع میں نہیں۔ اور شعروں کی طرح اس شعر کا مصرع اول بھی دونوں بحروں میں بہ سہولت پڑھا جا سکتا ہے شعر یہ ہے ؎

ہر کہ شد از طاعتِ حق بیشتر فیض دے از رحمتِ حق بیشتر

مصرع اول میں از کے الف کو نہ گرائیے اور طاعت کے کسرۂ اضافت اشباع سے پڑھیئے تو وزن بحر رمل مسدس محذوف کا ہوگا یعنی فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔ اگر از کے الف وصل کو گرا کر اور طاعت کے کسرۂ اضافت کو بغیر اشباع کے پڑھیئے تو وزن بحر سریع مسدس مطوی مکشوف کا ہوگا۔ یعنی مفتعلن مفتعلن فاعلن۔ اسی طرح دوسرا مصرع صنعت ذوبحرین میں ہے۔

مضمون کے زیادہ طویل ہو جانے کا خطرہ ہے اس لئے بہت سے مقامات قلم انداز کرتا ہوں۔ آخر میں ایک اور مثال پیش کرتا ہوں۔

موصوف نے تقطیع کا ایک خانہ ساز قاعدہ تراشا ہے جو مضحکہ خیز حد تک دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں کہ "علم عروض کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ حرف ساکن کو تقطیع میں متحرک کر سکتے ہیں لیکن اس سے نفس حرکت کے لحاظ سے اس لفظ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔" اس سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ لغت کے لحاظ سے لفظ کا وہ حرف ساکن ساکن ہی رہے گا لیکن تقطیع میں عارضی طور پر متحرک ہو جائے گا۔ یہ علم عروض کا مسلمہ قاعدہ نہیں بلکہ بے قاعدگی ہے۔ اگر ہر حرف ساکن جیسا کہ مضمون نگار کا خیال ہے تقطیع میں متحرک ہو سکتا ہو تو عروض اور لغت دونوں بیک وقت بہت سے قاعدوں سے آزاد ہو جائیں اور ایک ایسا عروض جنم لے جس کی کوتاہ آستینی میں بڑی سے بڑی دراز دستیاں سما جائیں۔ کم سے کم نظم کی دنیا میں لغت کی حرکت و سکون کی قسم کی غلطیوں کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے چک جائے۔ ایک بار مضمون نگار کے اس "مسلمہ قاعدے" کو ذہن میں پھر تازہ کر لیجئے اور نیچے کے شعر ایک ایک کر کے پڑھ جائیے۔

لاکھ کروں میں جستجو، لاکھ کروں میں آرزو
آپ کا راز پا سکے، اتنی مری عقل نہیں

بات اتنی سخت خدا سے ڈرو کچھ بھی تم کو شرم نہیں آتی

شعر میں موتی نظم کرتا ہوں میں شاعری لفظوں میں کم کرتا ہوں میں

تو ہی جان ہے میرے شعر و غزل کی ترا نام لیکر شعر کہہ رہا ہوں

تیری فرقت میں عجب حال ہوا ہے میرا اب شب و روز مرے دل میں درد ہوتا ہے

مضمون نگار کے اس قاعدے کے مطابق کہ "حرف ساکن کو تقطیع میں متحرک کر سکتے ہیں لیکن اس سے نفس حرکت کے لحاظ سے اس لفظ پہ کوئی اثر نہیں پڑتا" مندرجہ بالا جملہ اشعار موزوں ہیں اور ان میں ہر خط کشیدہ لفظ کے ساکن اول کو تقطیع میں متحرک کیا جا سکتا ہے جس سے نفس حرکت کے لحاظ سے ان لفظوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ عقل، سخت، شرم، نظم، شعر، درد، ہر ایک کا حرف دوم لغت کے لحاظ سے ساکن ہے۔ نثر میں لغت کی پابندی کی جائے گی اور ان لفظ کو حرفِ دوم کے سکون کے ساتھ زبان سے ادا کیا جائے گا لیکن شعر کی گرفت میں آنے کے بعد مضمون نگار کے متذکرہ قاعدے کے رو سے ان الفاظ کی حرکت قلب شاعر کے قبضہ و اختیار میں ہوگی۔ وہ چاہے انھیں حرف دوم کی حرکت کے ساتھ استعمال کرے جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار میں ہے، چاہے اس حرکت کے بغیر!

پہلے شعر کی بحر رجز مثمن مطوی مجنون ضرب مذال ہے۔ اسکے دوسرے مصرع کی تقطیع یہ ہوئی۔

آپ کا را (مفتعلن) ز پا سکے (مفاعلن) اتنی مری (مفتعلن) عقل نہیں (مفاعلان)۔

عقل کا لفظ لغت میں ساکن الاوسط ہے مگر متذکرہ قاعدے سے یہاں ق کو جو ساکن تھا تقطیع میں متحرک کر دیا گیا۔

دوسرے شعر کی بحر خفیف مسدس، صدر و ابتدا سالم، حشو مجنون، عروض مجنون محذوف، ضرب مشعث محذوف ہے۔ اس کی

تقطیع یہ ہوئی :-

بات اتنی (فاعلاتن) سخت خدا (مفاعلن)۔ سڑ رو (فعلن)۔
کچھ بھی تم کو (فاعلاتن)۔ شرم نہی (مفاعلن)۔ ا آتی (فعلن)

پہلے مصرع میں سخت کی خ لغت میں ساکن ہے مگر متذکرہ قاعدے سے تقطیع میں اس کو متحرک کر دیا گیا۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں شرم کا میم جو لغت کے اعتبار سے ساکن ہے۔ متذکرہ قاعدے سے تقطیع میں متحرک ہو گیا۔

تیسرے شعر کی بحر رمل مسدس مقصور ہے۔ اس کے پہلے مصرع کی تقطیع یہ ہوئی۔

شعر میرو (فاعلاتن)۔ قی نظم کر (فاعلاتن)۔ تا ہمیں (فاعلات)۔
نظم کی ظ لغت میں ساکن ہے مگر یہاں تقطیع میں متذکرہ قاعدہ سے متحرک ہو گئی۔

چوتھے شعر کی بحر متقارب مثمن عروض سالم ضرب مسبغ ہے۔ اس کے دوسرے مصرع کی تقطیع یہ ہوئی :-

ترانا (فعولن)۔ ملیکر (فعولن)۔ یشعر کہ (فعولن)۔ رہا ہوں۔ (فعولان)
شعر کی عین لغت میں ساکن ہے۔ پہلے مصرع میں اس کو لغت کے مطابق استعمال کیا گیا لیکن دوسرے میں تقطیع میں متذکرہ قاعدے کے مطابق اس کی عین کو متحرک کر دیا۔

پانچویں شعر کی بحر یہ ہے۔ بحر رمل مثمن صدر و ابتدا سالم، حشو مخبون، عروض و ضرب مشعث محذوف۔ اس کے دوسرے مصرع کی تقطیع یہ ہوئی۔

اب شب درد (فاعلاتن)۔ نہ مرے دل (فعلاتن)۔ مدد نہ دیگو (فعلاتن)۔ تا ہے۔ (فعلن)۔ درد کی ر لغت میں ساکن ہے مگر یہاں تقطیع میں متذکرہ قاعدے سے متحرک کر دی گئی۔

ان اشعار کی تقطیع سے مضمون نگار کے اس خود ساختہ "مسلمہ قاعدہ" کی غلطی اور مضحکہ انگیزی اچھی طرح واضح ہو گئی ہوگی۔ مختصر یہ کہ خدا نخواستہ اگر عروض کا یہ قاعدہ ہو تو لغت میں حرکت و سکون کا فرق بیکار ہو جائے اور حرکت و سکون کے لحاظ سے ناموزوں سے ناموزوں شعر موزوں ہو جائے۔

تحریک ساکن اور اسقاط ساکن کا قاعدہ اصل میں یہ ہے :-

ضابطہ نمبر ۱۔ لفظ میں پہلا ساکن یا تنہا ساکن بہرحال ساکن رہے گا۔ اسے کسی جگہ اور کسی طرح متحرک نہیں کر سکتے۔

البتہ اگر ایک سے زیادہ ساکن حرف متوالی (پے در پے) جمع ہو جائیں تو یہ دیکھئے کہ یہ اجتماع سواکن مصرع کے آخر میں ہے یا مصرع کے وسط میں۔ وسط سے مراد یہ ہے کہ آخر مصرع کے سوا کہیں اور ہو۔

ضابطہ نمبر ۲۔ اگر مصرع کے وسط میں اجتماع سواکن ہو اور وہ صرف دو ساکن ہوں تو پہلا ساکن ضابطہ نمبر ۱ کے مطابق بدستور بحالت سکون قائم التقطیع رہے گا، لیکن دوسرا ساکن متحرک کر دیا جائے گا۔

ضابطہ نمبر ۳۔ اگر وسط مصرع میں تین یا تین سے زیادہ ساکن پے در پے جمع ہوں تو پہلے دو ساکنوں کے متعلق ضابطہ نمبر ۲ کے مطابق عمل کیا جائے گا یعنی پہلا ساکن ساکن رہے گا اور دوسرا متحرک کر دیا جائے گا۔ لیکن باقی ساکن ساقط التقطیع کر دیئے جائیں گے اور تقطیع میں محسوب نہیں کئے جائیں گے۔

ضابطہ نمبر ۴۔ اگر اجتماع سواکن مصرع کے آخر میں ہو اور وہ صرف دو ساکن ہوں، تو دونوں ساکن قائم التقطیع رہیں گے اور دونوں کا سکون بحال رہے گا۔ نہ کسی کو ساقط کیا جائے گا نہ کسی کو متحرک کیا جائے گا۔

ضابطہ نمبر ۵۔ اگر اجتماع سواکن مصرع کے آخر میں ہو اور وہ ساکن دو سے زیادہ ہوں تو پہلے دو ساکنوں کے متعلق ضابطہ نمبر ۴ پر عمل کیا جائے گا یعنی دونوں قائم التقطیع اور بدستور ساکن رہیں گے لیکن باقی حروف ساکن ساقط التقطیع کر دیے جائیں گے۔

اس طرح تقطیع میں اسقاط اور قیام کے لحاظ سے وسط مصرع اور آخر مصرع دونوں جگہوں کے سواکن کا ایک ہی قاعدہ ہے کہ صرف دو ساکن تک قائم التقطیع رہیں گے۔ باقی ساکن اگر ہیں تو وہ سب کے سب گر جائیں گے۔ حرف ساکن کی تحریک کے متعلق وسط مصرع اور آخر مصرع کا قاعدہ پہلے ساکن تک ایک ہے یعنی پہلا ساکن یا تنہا ساکن بہرحال ساکن رہے گا متحرک نہیں کیا جائے گا۔

لیکن دوسرے ساکن کی تحریک کے لئے وسطِ مصرع اور آخرِ مصرع کے قاعدوں میں اختلاف ہے۔ وسطِ مصرع کا ساکن دوم متحرک کر دیا جائے گا لیکن آخرِ مصرع کا ساکنِ دوم بدستور ساکن رہے گا متحرک نہیں کیا جائے گا۔

ساکن کی تحریک، بحالی اور اسقاط کے متعلق تقطیع کے یہ قاعدے افاعیل (اسباب، اوتاد، فواصل) اور ارکان کی ساخت اور زحافات کے قاعدوں کے مطابق مقرر کئے گئے ہیں۔ وسطِ مصرع میں صرف پہلے ساکن کو ساکن رکھنے اور دوسرے کو متحرک کر دینے کا قاعدہ تقطیع کے لئے اس وجہ سے وضع کیا گیا کہ افاعیل اور ارکانِ سالم میں جو شعر کا معروض علیہ ہیں اجتماعِ ساکنین نہیں ہے اور زحافات جتنے ایسے ہیں جو اجتماعِ ساکنین کر سکتے ہیں مثلاً اذالہ، تسبیغ، قصر وغیرہ ان کا استعمال وسطِ مصرع یعنی صدر و ابتدا اور حشو میں ممنوع ہے۔ ایسی صورت میں وسطِ مصرع کی تقطیع کا قاعدہ حرفِ ساکن کے متعلق یہی ہو سکتا تھا کہ اجتماعِ ساکنین سے بچانے کے لئے دوسرے ساکن کو متحرک کیا جائے۔

آخرِ مصرع کے سواکن میں پہلے دو کو ساکن رکھنے کا قاعدۂ تقطیع اس لئے وضع کیا گیا کہ اگرچہ افاعیل اور ارکانِ سالم کی ساخت کے لحاظ سے تو اجتماعِ ساکنین آخرِ مصرع میں بھی نہیں ہوتا لیکن ایسے زحافات جو اجتماعِ ساکنین پیدا کر دیتے ہیں مثلاً اذالہ، تسبیغ، قصر وغیرہ اواخرِ مصاریع (صدر و عروض) میں آتے ہیں اور ان کے لئے مخصوص ہیں۔

دو سے زیادہ ساکنوں کو وسطِ مصرع اور آخرِ مصرع دونوں جگہوں (یعنی پورے شعر) سے گرا دینے کا قاعدہ اس لئے وضع کیا گیا کہ وسطِ مصرع میں تو مذکورالصدر اسباب کی بناء پر اجتماعِ ساکنین کی بھی گنجائش نہیں تین ساکن کہاں سماتے۔ اور آخرِ مصرع میں اجتماعِ سواکن کرنے والے زحافات دو سے زیادہ ساکن ایک جگہ جمع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

ضابطہ ۱ کی مثال میں وہ پانچوں شعر ہیں جن میں عقل، سخت، شرم، نظم، شعر، درد وغیرہ کی تقطیع ساکنِ اول کو متحرک کر کے کی گئی اور چونکہ ضابطہ ۱ کے رو سے ساکنِ اول کو متحرک کرنا ناجائز ہے اس لئے وہ سب شعر ساقط التقطیع ہیں۔ ان الفاظ میں سے کسی بھی لفظ کا ساکنِ اول متحرک نہیں کرنا چاہیئے۔ اس ضابطہ کے مطابق ان اشعار کے متعلقہ مصرعوں کی صحیح صورت یہ ہو سکتی ہے:

ع۔ عقل مری کہاں کہ میں آپ کا راز پا سکوں

ع۔ سخت بات اسقدر خدا سے ڈرو ۔۔۔ شرم کچھ بھی تمھیں نہیں آتی

ع۔ نظم کرتا ہوں میں موتی شعر میں

ع۔ ترے نام سے شعر میں کہہ رہا ہوں

ع۔ درد اب دل میں شب و روز ہوا کرتا ہے

ضابطہ ۲ کی مثالیں۔ اس مصرع کی تقطیع پر غور کیجئے۔

ع۔ سخت بات اس قدر خدا سے ڈرو

تقطیع۔ سخت بات اس (فاعلاتن) قدر خدا (مفاعلن) سے ڈرو (فعلن)۔ سخت کی ت جو ساکن دوم ہے وسطِ مصرع میں ہے اس لئے تقطیع میں متحرک کر دی گئی۔ اس قاعدے کا ارکانِ بحر کی ساخت کے عین مطابق ہونا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ت کا معروض علیہ یعنی فاعلاتن کی عین پہلے سے اپنی اصل کے لحاظ سے متحرک ہے۔ اسی طرح بات کی "ت" وسطِ مصرع میں ساکن دوم ہونے کی وجہ سے تقطیع میں متحرک کر دی گئی یعنی معروض علیہ فاعلاتن کی تائے متحرک کے مطابق ہو گئی۔

مصرع۔ نظم کرتا ہوں میں موتی شعر میں

تقطیع۔ نظم کرتا (فاعلاتن)۔ ہو موتی (فاعلاتن) شعر میں (فاعلات)۔ یہاں بھی نظم اور شعر کے حرفِ دوم ساکن ہیں اور وسطِ مصرع میں واقع ہیں اس لئے تقطیع میں متحرک کر دیئے گئے۔

ضابطہ ۳ کی مثال یہ ہے:

تیرے ظلم و ستم کی ہر ادا برداشت کی میں نے ۔۔۔ مگر اے دوست میری بات کا تو نے برا مانا

تقطیع۔ ترے ظلمو (مفاعیلن) ستم کی ہر (مفاعیلن) ادا برد (مفاعیلن) شکی مینے (مفاعیلن)۔

مگر اے دو (مفاعیلن) ست میری با (مفاعیلن) تکا تو نے (مفاعیلن) برا مانا (مفاعیلن)۔

یہاں ضابطہ ۳ کے مطابق برداشت کی "ت" کو جو تیسرا

ساکن وسطِ مصرع میں ہے تقطیع میں ساقط کر دیا گیا اور "ش" کو جو دوسرا ساکن وسطِ مصرع میں ہے ضابطہ نمبر ۲ کے مطابق متحرک کر دیا گیا۔ مگر الف جو پہلا ساکن ہے ضابطہ نمبر ۱ کے مطابق اس کا سکون واجب ہے اس لئے بدستور ساکن رہا۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں دوست جو وسطِ مصرع میں ہے اس کی "ت" کو تیسرا ساکن ہونے کی وجہ سے ضابطہ نمبر ۳ کے مطابق تقطیع سے گرا دیا گیا۔ "س" کو جو دوسرا ساکن ہے ضابطہ نمبر ۲ کے مطابق متحرک کر دیا گیا، اور واؤ کو جو پہلا ساکن ہے ضابطہ نمبر ۱ کے مطابق بدستور ساکن رکھا گیا۔

ضابطہ نمبر ۴ کی مثال۔ ع

شاعری لفظوں میں کم کرتا ہوں میں

تقطیع۔ شاعری لف (فاعلاتن)۔ ظوں کم کر (فاعلاتن)، تا ہمیں (فاعلات)

یہاں "میں" جو مصرع کے آخر میں ہے اس میں "ے" اور "ن" دو ساکن ہیں۔ چونکہ ان دونوں ساکنوں کا اجتماع آخر مصرع میں ہے اس لئے ضابطہ نمبر ۴ کے مطابق دونوں کو بحالت سکون قائم التقطیع رکھا گیا۔ "ے" اپنے معروض علیہ یعنی فاعلات کے الف دوم ساکن کے برابر ساکن ہے اور نون اپنے معروض علیہ یعنی اسی رکن تائے ساکن کے برابر ساکن ہے۔

آخر مصرع میں آنے والے ساکنوں میں سے دو کو تقطیع میں قائم رکھنے کا قاعدہ اس قدر سخت ہے کہ نون غنہ بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں اور اسے بھی قائم التقطیع رکھا جاتا ہے جیسا کہ اس مثال میں ہے۔ لیکن نون غنہ اگر وسط مصرع میں ہو تو ساقط کر دیا جائے گا حالانکہ حرف علت کے بعد آنے کی وجہ سے اس کی حیثیت ساکن دوم کی ہوتی ہے اور اس لیے ضابطہ نمبر ۲ کے مطابق وسطِ مصرع میں اسے متحرک التقطیع ہونا چاہیئے تھا لیکن اس پر ضابطہ نمبر ۲ کا زور اس لئے نہیں چلتا اور وہ وسط مصرع میں ساکن دوم ہونے کے باوجود اس لئے متحرک التقطیع نہیں کیا جاتا کہ اس کا شمار حروفِ مکتوبۂ غیر ملفوظہ میں ہے۔ آخر مصرع میں بھی نون غنہ کی حیثیت حروفِ مکتوبۂ غیر ملفوظہ کی ہوتی ہے کیونکہ وہاں بھی وہ تلفظ میں ادا نہیں کیا جاتا، تاہم ضابطہ نمبر ۴ کے مطابق آخر مصرع میں اس کو بھی اور سواکن دوم کی طرح قائم التقطیع رکھا جاتا ہے۔

مصرع۔ ہے دلِ ناکام کی یہ سرگذشت

تقطیع۔ ہے دلِ نا (فاعلاتن) کامکی یہ (فاعلاتن) سرگزشت (فاعلات)

یہاں بھی سرگزشت کی ت جو دوسرا ساکن ہے آخر مصرع میں ساکن ہونے کی وجہ سے ضابطہ نمبر ۴ کے مطابق بحالت سکون قائم التقطیع رہی۔

ضابطہ نمبر ۵ کی مثال۔

مصرع۔ وقت پہ جو کام آ جائے وہی ہوتا ہے دوست

تقطیع۔ وقت پہ جو (فاعلاتن)۔ کام آجا (فاعلاتن)۔ ئے وہی ہو (فاعلاتن) تا ہے دوس (فاعلات)

یہاں دوست میں و، س، ت، تین ساکن ہیں اور چونکہ یہ تینوں ساکن آخر مصرع میں جمع ہیں، اس لئے پہلے دو ساکنوں کو ضابطہ نمبر ۴ کے مطابق بحالت سکون قائم التقطیع رکھ کر، ضابطہ نمبر ۵ کے مطابق ساکن سوم "ت" کو ساقط التقطیع کر دیا گیا۔

کچھ نہ پوچھئے

افقر موہانی

اس سنگِ آستاں پہ ہے سر کچھ نہ پوچھئے
دونوں جہاں ہیں پیشِ نظر کچھ نہ پوچھئے

آئینہ پر ہے ان کی نظر، کچھ نہ پوچھئے
دنیا اِدھر کی اب ہے اُدھر کچھ نہ پوچھئے

یکتائیٔ جمال کی اللہ ری وسعتیں
سو جلوے ہیں بطرزِ دگر، کچھ نہ پوچھئے

اکثر ہوا ہے موت کا دھوکا حیات پر
میرے دلِ حزیں کی خبر کچھ نہ پوچھئے

نظارہ مست، مست فضا، کائنات مست
مستی بھری نظر کا اثر کچھ نہ پوچھئے

جلووں میں گم نظر ہے تو جلوے نظر میں گم
بیتابیٔ جمال و نظر کچھ نہ پوچھئے

معصوم ہیں ادائیں تو نیچی نظر بھی ہے
یہ سب بجا درست، مگر کچھ نہ پوچھئے

جلوہ وہی ہے، طور وہی، جلوہ گر وہی
دنیا کا اختلافِ نظر کچھ نہ پوچھئے

یوں تو تڑپ تڑپ کے گذاری تمام رات
گذری جو دل پہ وقتِ سحر کچھ نہ پوچھئے

گم تھی جمالِ یار میں افقر نگاہِ شوق
جلوہ تھا خود حجابِ نظر کچھ نہ پوچھئے

غزل

مہدی پرتاب گڈھی

جہاں خلوص کی عظمت، نہ آدمی کا مقام
اسی کا نام ہے دنیا، تو اس کو میرا سلام

مری گریز پسندی بھی کام آہی گئی
نہیں تو تمکنتِ حسن، اور میرا سلام

قدم قدم ہے مرا اک جہانِ رنگ و بو
نفس نفس ہے میرا اک حیاتِ نو کا پیام

یہیں سے ہوتا ہے آغاز عہدِ زریں کا
ہجومِ غم کو نہ سمجھو حیات کا انجام

نظر نظر سے بکھیری ہے چاندنی میں نے
قدم قدم پہ ابھارے ہیں میں نے ماہِ تمام

میرا جہاں نہیں بس آشیاں ہی تک محدود
مری نظر میں ہے اس سے بھی اک بلند مقام

فراز دار نہیں اختتام ہستی کا
کچھ اور اس سے بھی آگے ہے زندگی کا مقام

زمانہ چاہے جو سمجھے اسے مگر مہدی
میں دے رہا ہوں زمانے کو اک نیا پیغام

نیند

محمید عثمانی

زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے تازہ دم اور پرسکون دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ کی صحت متوازن ہو۔ اچھی اور متوازن صحت کے لئے نیند کی عام مقدار بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ نظام جسمانی میں اس کا کام یہ ہے کہ دن بھر کی تھکن سے چور اعصاب اور عضلات کے لئے یہ مرہم کا کام کرے اور سات آٹھ گھنٹے میں انھیں پھر پہلی سی تازگی اور جوش عمل بخش دے۔

کبھی نہ کبھی ہر شخص کے دماغ میں اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہوں گے کہ اسے کتنا سونا چاہیئے، نہ سو سکنے سے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں، نیند نہ آئے تو کیا کرے، وغیرہ۔

سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ ہم کو کتنی دیر سونا چاہیئے کیونکہ اس مسئلے پر بہت اختلافات ہیں۔ کچھ جدت پسندوں کا کہنا ہے کہ سونا تو قدیم زمانہ کے انسان کی عادت ہے جو بیچارہ درندوں کے خوف سے سرِشام ہی اپنے غار میں چھپ رہتا تھا، تاریکی میں باہر رہتا بھی تو کیا کرتا اس لئے سو ہی لیتا تھا اور اب جب کہ بجلی کی ایجاد سے ہمارے شہروں کا گوشہ گوشہ منور ہے ہم کو خطرات کا سامنا بھی نہیں تو کیوں سو کر ہم اپنا وقت ضائع کریں۔ ایک دوسرا حلقہ سوچتا ہے کہ اگر وہ روزانہ نو دس گھنٹے نہ سوئے تو دھیرے دھیرے اس کے قویٰ جواب دے جائیں گے اور وہ مجہول ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے گا۔ لیکن یہ دونوں انتہاپسندانہ نظریات ہیں اور غلط۔ پہلے نظریئے کے لوگ اگر نیند کے اوقات زبردستی گھٹاتے رہے تو ان کی دوسری ہی پشت میں دماغی نقائص پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے۔ یہ بات اس تجربہ کی بنا پر کہی جا سکتی ہے جو کچھ عرصہ پہلے جاپان میں کیا گیا تھا۔ اس تجربہ میں کتوں کو مسلسل آٹھ دن تک بیدار رکھا گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر ان کا دماغ انحطاط پذیر ہونا شروع ہو گیا تھا۔

کافی بڑے پیمانے پر تحقیق کرنے کے بعد اوسطاً سات گھنٹے نیند کے لئے تجویز کئے گئے ہیں۔ اس تحقیق میں آرکٹک کے وہ حصے بھی شامل ہیں جہاں سرما کی راتیں مسلسل ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے جو لوگ اپنی خواہش کے مطابق آٹھ نو گھنٹے نہ سو سکنے پر فکرمند ہو جاتے ہیں وہ بھی غلط راستے پر ہیں۔

بچوں کے متعلق ۶ ماہ تک تحقیق کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ وہ پندرہ گھنٹے سویا کرتے ہیں۔

بوڑھے، اگر ان کی عام صحت اچھی ہے تو، زیادہ سوتے ہیں کیوں کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں کافی حد تک یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یکسانیت سے نیند کے اوقات بڑھتے ہیں۔ انتشار اور ہیجان سے کم ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے شہر کے لوگ دیہات کے لوگوں کے مقابلہ میں کم سوتے ہیں۔

شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر کلیٹ مین نے لگاتار ۱۰۰ گھنٹے بیدار رہ کر خود اپنے اوپر تجربہ کیا ہے۔ اتنی مدت تک جاگتے رہنے کے بعد نہ تو ان کے وزن میں کمی واقع ہوئی نہ قلب کی رفتار میں فرق واقع ہوا۔ ان کے خون کا دباؤ بھی درست ہی رہا۔ اور خون کے کریات حمرا میں بھی کوئی بے اعتدالی واقع نہیں ہوئی۔ صرف دماغ کے اعلیٰ مرکزوں پر نمایاں اثر ہوا۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بے خوابی سے نہ تو قویٰ جواب دئے جاتے ہیں اور نہ جسم کے کسی اور نظام میں خلل واقع ہوتا ہے۔

کبھی کبھی لوگ یہ کہتے ہیں کہ مجھے رات نیند کم آئی۔ یہ خیال عام طور پر دو وجہوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اول یہ دیکھ کر کہ آٹھ گھنٹے سے کم نیند آئی۔ دوئم صبح اٹھنے پر وہ تازگی نہ محسوس ہونے پر جو نیند کا لازمی نتیجہ تصور کی جاتی ہے، نیند کی کمی کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن چند مشاہیر کی مثالیں ایسی

رکھی جائیں تو اس سے اندازہ کرلینا چاہئے کہ اگر کوئی شخص کم سونے کی وجہ سے دماغی طور پر کوئی اضمحلال نہیں محسوس کرتا تو اس کے لئے اتنی ہی دیر تک سونا کافی ہے جتنی دیر تک وہ سوتا ہے۔ مشہور سائنس داں ایڈیسن دن رات میں کل چار گھنٹے سوتا تھا۔ جان ہنٹر بھی تین گھنٹے سوتا تھا۔ خود ہمارے وزیر اعظم، پنڈت جواہرلال نہرو کم سوتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو تجربات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ذکی اور ذہین لوگ عام لوگوں سے اکثر کم ہی سوتے ہیں۔ کس کو کتنی نیند کی ضرورت ہو، یہ اس کے اپنے مشاغل، مصروفیات، ماحول اور جسمانی ساخت پر منحصر ہو۔

جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے صبح اٹھتے ہی اگر تازگی نہ محسوس ہو تو اکثر لوگوں کے دماغ میں فوراً ہی یہ خیال آتا ہے کہ رات شاید کروٹ ہی بدلتے گذری ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ سونے کے خوشگوار اثرات ہر شخص بیدار ہوتے ہی محسوس کرنے لگے۔ بعض لوگ تو کئی کئی گھنٹے بعد یہ اثر محسوس کرتے ہیں۔ اکثر اوقات تو سہ پہر تک کوئی واضح اثر نہیں معلوم ہوتا مگر یہ غیر طبعی نہیں ہو۔

ان تمام غلط فہمیوں کے ازالے کے بعد بھی اگر آپ محسوس کرتے کہ آپ پوری نیند نہیں سو پاتے تو اس کے لئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اکثر دو ایک راتوں کی نیند کی کمی، بعد کی راتوں میں پوری ہو جاتی ہے۔ اور اگر بے خوابی کی شکایت مستقل بھی ہے تو اسے خلش کی صورت نہ اختیار کرنے دینا چاہئے کیونکہ ایک تو دماغی خلش خود نیند کی دشمن ہے دوسرے اس کی وجہ سے تمام عضلات میں تناؤ سا پیدا ہو جاتا ہے جس کی موجودگی میں نیند کا آنا دشوار رہتا ہے۔

اگر روز مرہ کی زندگی کا کوئی مسئلہ نیند کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے تو اس کا حل تلاش کیجئے۔ اس بات کی عادت ڈالیئے کہ ہمیشہ سونے سے قبل ایک دو گھنٹے پہلے ہی سے تفکرات کے لئے ذہن کا دروازہ بند کر دیجئے۔ کسی دلچسپ مشغلہ میں حصہ لیجئے۔ کوئی کھیل ہو یا ہلکا پھلکا مطالعہ، غرض مسرت بخش کام شروع کیجئے تاکہ آپ کے ساتھ آپ کی الجھنیں اور مسائل آپ کی خواب گاہ تک نہ پہنچ سکیں۔

اگر باوجود تمام کوششوں کے پریشان کن خیالات آپ کا پیچھا نہ چھوڑتے ہوں تو کاغذ قلم لے کر بیٹھ جائیے اور جو کچھ آپ کے دماغ میں آئے لکھتے جائیے۔ اپنے تمام مسائل، ان کے اچھے یا برے تمام نتائج، ان پر قابو پانے کے تمام ذرائع، غرض جو کچھ آپ بستر پر پڑے پڑے سوچنے والے ہوں سب کاغذ پر اگل دیجئے۔ بظاہر یہ طریقہ فضول سا معلوم ہوتا ہے مگر آزما کر دیکھئے تو آپ کے دماغ کا بار کافی حد تک کم ہو جائیگا۔

ایک غلطی جو عام طور پر سرزد ہوتی ہے وہ یہ کہ لوگ اتنی شدت سے نیند کا انتظار کرنے لگتے ہیں کہ دماغ اور جسم دونوں بے چین ہو جاتے ہیں اسکے برخلاف آپ اگر سکون سے لیٹے رہیں اور نیند نہ بھی آئے تو بھی کافی حد تک نیند کی کمی پوری ہو جائے گی۔ نیند نہ آنے سے اگر آپ کو تشویش پیدا ہوتی ہے اور آپ مضطرب ہو جاتے ہیں تو اس سے نیند اول تو قطعی آتی ہی نہیں دوسرے جسم کو جو فائدہ آرام دہ حالت میں لیٹے رہنے سے ملتا ہے وہ بھی خاک میں مل جاتا ہے۔ نیند کا انتظار خوشگوار انداز میں کیجئے۔ جس قدر مسرت اور اطمینان آپ پیدا کر سکتے ہیں پیدا کیجئے۔ اپنے تصورات کی مدد لینے کی کوشش کیجئے۔ اس سے محظوظ ہوئیے۔ غرض خوشکن ہوائی قلعے بنانے کا اگر کوئی موزوں وقت ہے تو وہ سونے سے پہلے کا وقت ہے۔

نیند آنے کے سلسلہ میں بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ سوتے وقت کسی سیاہ مخملی پردے کا تصور کیجئے، "ذہن کو خالی کر دیجئے" وغیرہ۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یوں چاہے آپ جتنی دیر سیاہ مخملی پردے کا تصور کر سکتے ہوں مگر جب کبھی آپ اسے نیند لانے کے لئے استعمال کرنا چاہیں گے تو عموماً ناکامی ہوگی۔ کچھ نہ کچھ دماغ میں آ ہی جائے گا۔ اس لئے یہ مشورہ زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ آپ سیاہ پردے کا تصور کریں گے تو اکثر اس پر آپ کی الجھنوں کی پرچھائیاں چھا جائیں گی۔

بہر حال، باوجود تمام احتیاط اور تدابیر کے اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جسم میں وہ ہلکا پن نہیں پیدا ہوا جو نیند کے لئے ضروری ہے تو اپنی ناکامی پر برہم نہ ہوئیے۔ اس سے آپ کی دقتوں میں اضافہ ہوگا۔ آرام سے لیٹ جائیے اور جسم کے ہر عضو۔ ہاتھ، پیر، گردن۔ سب کو پوری طرح تانئے جیسا انگڑائی لیتے وقت کرتے ہیں۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے تمام اعضا سخت کر دیجئے۔ پھر یکبارگی ان کو ڈھیلا چھوڑ دیجئے۔ سر کو ادھر ادھر گھمائیے۔ ہاتھ کو اوپر اٹھائیے۔ پھر اس کو اس طرح ڈھیلا چھوڑ دیجئے جیسے کوئی بے جان سی چیز سہارا ہٹا لینے سے گر پڑتی ہے۔ دونوں ہاتھ اور پھر پیروں سے یہ عمل دہرائیے۔ اس مشق میں آپ کو کچھ وقت ضرور لگے گا لیکن

(بقیہ مضمون صفحہ [illegible])

قندیل

مسیح الحسن رضوی

اس دن دسمبر کی ایک سرد رات کو میرے دماغ میں اٹھارہ برس پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی میں کوئی حادثہ، کوئی خوشگوار واقعہ پیش آیا اور پھر آپ نے وقت گزرنے کے ساتھ اسے بھلا دیا۔ لیکن پھر اچانک کوئی دوسرا حادثہ، یا کوئی دوسرا خوشگوار واقعہ پیش آتا ہے اور آپ کو بھونچکا چھوڑ جاتا ہے اور آپ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ کب اور کن حالات میں آپ پر ایسا ہی واقعہ گزرا تھا۔ پھر دونوں واقعات کے درمیان کی کڑیاں جڑنے لگتی ہیں اور آپ زندگی کے ان جانے تسلسل کے قائل ہو جاتے ہیں۔

دسمبر کی اس سرد رات کو میرے تحت الشعور میں سوئے ہوئے واقعات جاگ اٹھے جنھوں نے میرے ذہن میں ایک زمانہ میں ہلچل مچا دی تھی۔ یہ جب کی بات ہے جب میں ایک صوبائی شہر میں زیر تعلیم تھا اور ملک میں انگریز بہادر کا سکہ چلتا تھا اور ضلع میں ڈپٹی کمشنر کا۔

میں نے دیکھا کہ میرے سامنے سے ایک بوڑھا جو بیس سینر رز ہوئے ہولے ہولے قدم دھرتا گزر گیا۔ میں اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ کیا یہ صاحب وہی ہو سکتے ہیں؟ بیشک یہ وہی صاحب تھے۔ لیکن زمانہ کے بروٹس نے ان کے سینہ میں اپنا سرد خنجر اتار دیا تھا۔ نہ وہ تیور، نہ وہ آن بان، نہ وہ طنطنہ۔ ایک زندہ لاش تھی جو حضرت گنج کی چمکیلی سڑک کے فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ چھوٹی موہری کی اونی پتلون، لانگ کوٹ اور پرانی قیمتی فلیٹ ہیٹ میں نے انھیں پہچان لیا تھا۔ میری یادداشت نے مجھے بالکل دھوکا نہیں دیا تھا۔ یہ مسٹر ن تھے جو اس صوبائی شہر میں جہاں میں اب سے اٹھارہ سال قبل زیر تعلیم تھا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے مجھے قطعی نہ پہچانا ہوگا۔ اگر میں اس بات کی کوشش بھی کرتا تو ناکام رہتا لیکن میں انھیں ذرا دیر میں، قطعی طور پر پہچان گیا تھا۔ مسٹر ن اپنے زمانہ کے بڑے ہر دلعزیز ضلع مجسٹریٹ تھے۔ جب وہ کبھی کبھار گھوڑے پر بیٹھ کر شہر کے گشت کو نکلتے تو شہر میں ایک طرف سے دوسری طرف تک ہٹو بچو کا شور مچ جاتا۔ جنگل کے راجا شیر کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جب شکار کی تلاش میں، یا تفریح کی نیت سے اپنے کچھارے برآمد ہوتا ہے تو درختوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں تک پھڑ پھڑانا اور چہکنا بھول جاتی ہیں۔ میں نے جنگل کی اس کیفیت کا تو مشاہدہ نہیں کیا ہے لیکن مسٹر ن کو شہر کے گشت پر نکلتے دیکھا ہے اور میں نے بچشم اس کیفیت کا مشاہدہ کیا ہے۔ مگر ان ہی مسٹر ن کو جب میں نے حضرت گنج کی سڑک پر ہوا خوری کرتے دیکھا تو ان کے اور ان کی ضلع مجسٹریٹی کے درمیان اٹھارہ برس کا طویل زمانہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنے پچھلے وجود کا محض سایہ رہ گئے تھے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس طویل مدت سے قبل پیش آنے والے واقعات کو وہ بھول گئے ہوں گے۔ لیکن وہ ان واقعات کو بھول جانے کی ضرور کوشش کرتے رہے ہوں گے جو انھیں دیکھ کر میرے دماغ میں جگمگا اٹھے ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ واقعات فرائض منصبی بن کر داخل ہوئے تھے لیکن میرے لئے وہ واقعات ایمان کی تجدید کے مرادف ہیں۔ وہ ان کو فراموش کرنے میں حق بجانب ہوں گے مگر میں ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ اس دور کے ہر نوجوان کی کہانی ہے۔

آج ۹ راگست ۱۹۴۲ء تاریخ کا ایک جزو بن گئی ہے۔ لیکن ابھی ملک میں کروڑوں انسان ایسے بھی زندہ ہیں جنھوں نے اس تاریخ کو برتا ہے اور اپنی آنکھوں کے سامنے افق مشرق پر سپیدہ سحر کا نور جھلکتے دیکھا ہے۔ یہ خبر آناً فاناً سارے ملک میں گشت کر گئی کہ بمبئی میں کانگریس کے نیتا گاندھی جی، نہرو، مولانا آزاد اور دوسرے گرفتار کر لئے گئے ہیں جب

ہمارے چھوٹے سے شہر میں یہ خبر تقریباً بارہ بجے دن کو پہنچی تو عوام سڑکوں پر نکل آئے۔ ایک بڑے جلوس پر تحصیل کی عمارت کے سامنے گولی چلی اور سہ پہر ہوتے ہوتے کرفیو لگا دیا گیا۔ شہر کے کانگریسی نیتا صبح ہی گرفتار کر لئے گئے تھے۔

اس دن میں نے اپنے شہر میں پہلی بار مسٹر ن کو دیکھا۔ وہ کمیت گھوڑے پر سوار غرور و نخوت میں چور سارے شہر کا گشت کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے ضلع افسر بھی تھے جن کے عہدوں اور اہمیت سے میں اس زمانہ میں پوری طرح واقف نہیں تھا۔ یہاں میں آپ کو یہ اور بتاتا چلوں کہ اپنی نوعمری ہی میں میں پکا قوم پرست تھا۔ لیکن بزدل تھا اتنی ہمت نہیں تھی کہ جدوجہد میں کود پڑوں۔ لہٰذا میں نے جدوجہد میں شریک ہونے کا ایک اور راستہ تلاش کر لیا۔ رات کو جب شاید بوندا باندی ہو رہی تھی اور میرے گھر کے باہر کے برآمدوں، چبوترہ اور اس سے ملی ہوئی کھپریل پوش عمارت میں پولیس ڈیرا ڈالے پڑی تھی تو میں نے سڑک سے ملے ہوئے ایک کمرہ میں اپنے کو بند کر دیا اور تہیہ کر لیا کہ روزانہ کے واقعات کی ڈائری لکھوں گا چنانچہ اس دن میں نے رات کو کئی گھنٹے بیٹھ کر جب سڑکوں پر پولیس گشت کر رہی تھی اور دور سے کتوں کے رونے کی آواز آ رہی تھی اپنی ڈائری کے چند اوراق لکھے۔ جن میں مسٹر ن مرکزی کردار تھے۔ انھوں نے دن بھر اور رات گئے تک شہر کا گشت کیا تھا۔ گولی چلوائی تھی۔ کرفیو لگوایا تھا۔ یہ سب ان کے فرائض میں داخل تھا۔ میں نے ان سب کا ضمنی طور پر اپنی ڈائری میں ذکر کیا لیکن بات نہیں بن رہی تھی ان کا کردار ابھر نہیں رہا تھا۔ اس کے لئے کسی بے حد سفاکانہ فعل کی ضرورت تھی۔ اتنے میں سڑک پر شور ہوا۔ پکڑو بدمعاش کو۔ یہ لے' یہ لے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی پر ہنٹر برسنے لگے۔ میں نے ڈائری کا لکھنا بند کر دیا۔ کمرہ میں ذرا دیر ٹہلتا رہا۔ جی چاہا کہ کمرہ کا دروازہ کھول کر دیکھوں کہ کیا ماجرا ہے۔ ابھی میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی کے زور سے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ مستان شاہ کے تکیہ کے پاس مسٹر ن اپنے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی کیے کھڑے تھے۔ چند کانسٹبل ان کو اپنے حلقہ میں لئے ہوئے تھے اور میرا یار غار غنی حیوانی آواز میں کراہ رہا تھا۔

"صاحب پر تھوکے گا' صاحب پر تھوکے گا' سالے.....؟"

ان گالیوں کے ساتھ خوفناک کالے بوٹوں کی ٹھوکریں سنائی دے رہی تھیں اور غنی بھیانک آوازیں نکال رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی آگے بڑھ کر مسٹر ن کے منھ پر تھوک دوں لیکن میرے پیر بوجھل ہو گئے۔ پیشانی بھیگ گئی اور میں نے بڑی آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔

"سالے تھوکے گا' صاحب پر تھوکے گا۔ ...!"

دیر تک غنی پر گالیوں کی بوچھار میرے کانوں سے ٹکراتی رہی اتنے میں جیپ آئی اور غنی کو اس میں سوار کر کے ڈسٹرکٹ جیل پہنچا دیا گیا۔ میں نے اس واقعہ کو ڈائری میں قلم بند کرنا چاہا۔ لیکن مجھے اس کے لئے الفاظ نہیں ملے۔ میں نے ڈائری کو بند کر دیا اور سڑکوں کے سناٹے کی کہانی سننے لگا۔ گاندھی جی کہاں ہوں گے؟ نہرو کہاں ہوں گے؟ مولانا آزاد کیا سوچ رہے ہوں گے! ان کے اولوالعزم دل میں کیا ولولے اٹھ رہے ہوں گے؟

میں یہ سب باتیں سوچ رہا تھا۔ دن میں طرح طرح کی ہولناک افواہیں پھیلی تھیں۔ جنھوں نے عوام کو مشتعل کر دیا تھا۔ حکومت کی طرف سے صحیح واقعات بتلانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشتعل عوام نے اپنی قیادت کے بار کو خود سنبھال لیا۔ شاید انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ حکومت نے ان کے محبوب لیڈروں کو ان کی راہ سے ہمیشہ کے لئے ہٹا دیا ہے۔" ہو گو زوی از" میرے مکان کے برآمدہ میں بیٹھا ہوا پہرہ کا سپاہی رات بھر چلاتا رہا اور کبھی کبھی دور یا آس پاس گولی کے چلنے کی آواز آتی رہی۔ مسٹر ن کئی مرتبہ گشت کے سلسلہ میں موٹر یا جیپ پر بیٹھ کر گزرے۔ ان کے ساتھ دار فتنہ والے ہند و مسلم نیتا بھی ہوتے۔ جو انھیں بار بار اس بات کا یقین دلاتے کہ صبح ہوتے ہوتے امن و سکون قائم ہو جائے گا۔ غنڈہ گردی ختم ہو جائیگی آپ فکر نہ کریں۔ بلکہ گھر پر جا کر آرام کریں۔ لیکن مسٹر ن کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے وہ کسی پر بھروسہ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ سوائے اپنے یا اپنی پولیس کے۔ رات یوں ہی گزر گئی۔ باہر مسٹر ن شہر کے اندیشے میں دبلے ہوتے رہے اور اندر میں اپنے بند کمرہ میں بیٹھ کر غنی کو یاد کرتا رہا۔ جس نے آج مسٹر ن کے منھ پر تھوک دیا تھا۔

جب صبح ہوئی تو غنی کی گرفتاری اور اس کے کارنامے نے اسے محلہ بھر میں ہیرو بنا دیا تھا۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو غنی کے اس کارنامے کو کمتر بلکہ حقیر سمجھتے تھے۔ لیکن دوپہر ہوتے ہوتے ان سب کو بھی اپنے خیالات بدل دینا پڑے۔ شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جلوس نکلے

تھے اور گولی چلی تھی۔ پھر بھی بعض بے فکرے گھروں پر شطرنج کی بساط بچھائے گپیں ٹھونک رہے تھے اور تازہ خبروں پر تبصرے کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک موٹر تیزی سے چلتی ہوئی آئی اور شن کی آواز کے ساتھ غنی کے مکان کے سامنے رک گئی۔ اس میں سے "مسٹرن" برآمد ہوئے۔ تیر کی طرح سیدھا قد، خاکی برجس، خاکی قمیص اور خاکی ہیٹ پہنے۔ ان کے منھ میں چرٹ دبا ہوا تھا۔ مسٹرن کے ساتھ کچھ پولیس افسر بھی کار سے نیچے اترے اور بڑی تیزی سے آنکھ جھپکتے سب کے سب غنی کے اونچی کرسی والے مکان کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔

"اس لفنگے کا باپ کہاں ہے....؟" ایک پولیس افسر نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ غنی کے بوڑھے باپ گھبرائے ہوئے گھر میں سے نکل آئے۔

"فرمائیے کیا حکم ہے؟" "تلاشی لی جائے گی۔" اسی پولیس افسر نے نہایت ہی تحکمانہ انداز میں کہا "پردہ کرائیے ـــــــ" غنی کے والد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "تلاشی؟" یہ لفظ منھ سے نکلنا تھا کہ پولیس افسر نے ان کے ٹھوکر ماری۔

"بدمعاش ایک طرف وار فنڈ دیتا ہے اور دوسری طرف یہ کرتوت"

مسٹرن نے جب یہ تماشا دیکھا تو وہ اپنی کار میں جا کر بیٹھ گئے۔

پولیس افسر نے نہایت ہی بے ڈھنگے طریقہ سے گھر کی تلاشی لی اور غنی کے والد کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر کانسٹبلوں کے حوالہ کر دیا اور مسٹرن کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گشت پر نکل گیا۔

مسٹرن کی یہ دوسری تصویر ہے جو میرے دماغ میں جم کر رہ گئی ہے۔

اس دن رات میں اپنے کمرہ میں بند ہو کر میں نے مسٹرن کے بجائے غنی کو مرکزی کردار بنا کر ڈائری لکھی اور مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ پہلے دن کے مقابلہ میں دوسرے دن کی ڈائری زیادہ بامعنی اور خیال انگیز تھی۔ اس دن بھی رات بھر پولیس گشت کرتی رہی۔ قریب کی کمشنری کے صدر مقام سے فوج بھی پہنچ گئی تھی اور نظام حکومت اور بھی زیادہ فولادی، ظالم اور سخت گیر بن گیا تھا۔ لیکن اس نظام میں مسٹرن کی تصویر دھندلا گئی تھی۔ کیونکہ شہر میں گورے رنگ کے فوجی افسر بھی آن موجود ہوئے تھے۔ جن کے متعلق بڑی دہشت ناک خبریں گشت کر رہی تھیں لیکن ہمارے شہر پر طوفان سے قبل کا سناٹا چھا چکا تھا اس لئے کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آیا۔

دسمبر کی اس سرد رات کو جب میں نے مسٹرن کو حضرت گنج کی سڑک پر دیکھا جہاں وہ موت کے سایہ سے بچتے ہوئے چہل قدمی کرتے چلے جا رہے تھے تو مجھے ان کی تیسری تصویر یاد آ گئی جو غنی کی گرفتاری کے ایک ہفتہ بعد کی تھی۔ شہر میں سکون قائم ہو چکا تھا۔ وہاں کی آگ دیہاتوں میں پھیل گئی تھی۔ ہم لوگ غنی اور اس کے والد کو ضرور نہیں بھولے تھے۔ کیونکہ ان کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔ مکان قرق کر لیا گیا تھا اور اس پر سرکاری تالا پڑا ہوا تھا۔ غنی کی والدہ اپنے عزیزوں کے پاس دیہات چلی گئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مسٹرن کا پیکر سینما کی تصویروں کی طرح اپنا چولا بدل رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نیم جان انداز میں چلنے والے "مسٹرن" سیماب صفت کیت گھوڑے پر سوار ہیں اور کوتوالی کی طرف سے مستان شاہ کے تکیہ کی طرف دُلکی چلے آ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک خوبصورت چمڑے کا چمکتا ہوا چھوٹا سا ہنٹر ہے۔ مستان شاہ کے تکیہ کی طرف مڑنے والی سڑک پر میں کھڑا ہوا ہوں۔ کرفیو کا زمانہ ختم ہوئے دو دن ہو گئے ہیں۔ مسٹرن کا گھوڑا مستانہ وار چلتا میرے پاس سے دو گز کے فاصلہ سے گزرتا ہے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورا، ان کے چہرہ پر تعجب کی کیفیت پیدا ہوئی۔ گھوڑا مجھ سے چار گز، پھر گز دس گز کے فاصلہ پر پہنچا۔ آخ تھو..... تھو..... میں اپنی اس جرات پر حیران دوسرا گھر بھاگا اور کمرہ میں بند ہو کر ڈائری کے آخری اوراق لکھنے لگا۔ یہ مسٹرن کی میرے خیال میں آخری تصویر تھی۔ لیکن دسمبر کی اس سرد رات کو جب میں نے انھیں دیکھا تو میرے دل میں ان کے خلاف کوئی جذبہ نہیں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے تھوڑی دور تک ان کا تعاقب کیا۔ شاید میرے دل کے کسی گوشہ میں یہ خوف چھپا ہوا تھا کہ اب میں ان کو کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

✡

بامیان کے بدھائی آثار

محمود نیازی

بامیان کابل کے قریب ایک قدیم شہر کا نام تھا۔ آج سے تقریباً دو ہزار برس قبل یہ شہر بدھائی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا اور وہاں مہاتما بدھ کے سینکڑوں مجسمے پائے جاتے تھے اسی وجہ سے اردو و فارسی شعراء نے "بت بامیان" کی تلمیح اکثر استعمال کی ہے۔ بامیان کے بدھائی آثار پر مغربی علماء اور مفکرین نے بھی کافی تحقیق کی ہے اور اس موضوع پر کئی کتابیں لندن اور پیرس سے شایع ہو چکی ہیں۔ جیسے "بامیان[1] کے قدیم بدھائی آثار" "بامیان[2] کے آثار قدیمہ پر جدید تحقیق" اور "دنیائے[3] مغرب میں آثار بدھائی" وغیرہ

قدیم بامیان کے کھنڈروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر کسی زمانہ میں بدھ مذہب کا مرکز تھا۔ یہاں پر اب بھی مہاتما بدھ کے مجسموں کے آثار ملتے ہیں۔ یہ دیو پیکر مجسمے بڑے بڑے پہاڑوں کے ٹیلوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ ان کی محرابوں میں جو تصاویر ملتی ہیں ان سے ہمیں قدیم ایشیائی آرٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض جزئیات میں ان کی نقاشی ساسانی عہد کی نقاشی سے ملتی جلتی ہے۔ بامیان میں بدھ مذہب والوں نے سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں متعدد بدھ خانقاہیں بنائی تھیں۔ آج بھی ان کے کھنڈرات کی برجستہ تصاویر میں گندھارا آرٹ کے نمونے ملتے ہیں۔ اس زمانہ میں یہی آرٹ اپنے معراج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ اس مختصر مضمون میں اسی قدیم شہر بامیان کی جائے وقوع تہذیب و تمدن اور اس کی سیاسی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے گی۔

شہر بامیان کوہ ہندوکش کی شمالی گھاٹیوں میں سطح سمندر سے ۸۰۰۰ فٹ بلندی پر آباد تھا۔ اس شہر کے درمیان سے وہ مشہور قدیم سڑک گزرتی تھی جو دریائے سندھ اور دریائے جیحوں کی وادیوں کو ملاتی تھی اسی وجہ سے بامیان کو اہم تجارتی مرکز اور مستحکم فوجی چھاؤنی کی حیثیت حاصل تھی۔ ہندوکش کا پہاڑی سلسلہ اس کو کابل سے علیحدہ کرتا تھا لیکن سیاسی اعتبار سے یہ کابل اور غزنی کے لیے کافی اہمیت رکھتا تھا۔ غزنی کا ایک دروازہ "در بامیان" کے نام سے مشہور تھا[4]۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کا شمالی دروازہ ہی ہوگا۔ بامیان کا ذکر سب سے پہلے مشہور چینی سیاح اور بدھ زائر ہیون سیانگ نے ساتویں صدی عیسوی میں کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ ایک پہاڑی پر "چھوٹا سا شہر تھا اور اس زمانہ میں شہر کا نام "بامیکان" تھا۔ شہر کے تمام باشندے بدھ مذہب کے پیرو تھے جو ہندوکش کے تمام شمالی اور جنوبی علاقوں کا مقبول ترین مذہب تھا ہیون سیانگ کے زمانہ میں اس شہر میں دس بدھ خانقاہیں تھیں جن میں ایک ہزار سے زائد راہب رہتے تھے"۔ اصطخری نے لکھا ہے کہ بامیان ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کا رقبہ بلخ سے آدھا ہوگا۔ اس میں ایک مستحکم گڑھی یا قلعہ بھی تھا لیکن شہر پناہ کی دیواریں نہ تھیں۔ مشہور مورخ عبدالکریم بخاری اور انگریز سیاح مورکرافٹ (Moorcroft) نے لکھا[5] ہے کہ اس شہر کو "بت بامیان" بھی کہا جاتا تھا کیونکہ وہاں بدھ کے سینکڑوں مجسمے پائے جاتے تھے۔ بامیان کی جائے وقوع کے متعلق اصطخری کا کہنا ہے کہ یہ شہر نہیں بلکہ پورا ضلع تھا۔ اس میں ہندوکش کے جنوب کا سارا علاقہ اور پروان۔ کابل اور غزنی کے شہر بھی شامل تھے۔ ایک عرب مورخ کا بیان ہے کہ بامیان سیاسی اہمیت تو ضرور رکھتا تھا لیکن تجارتی حیثیت سے پسماندہ تھا اور اس کی آمدنی اس زمانہ میں صرف ۵۰۰ درہم سالانہ تھی۔

---

[1] مصنفہ گوڈارڈ و ہیکن (Godard & Hackin)۔ پیرس ۱۹۲۸ء [2] مصنفہ ہیکن و کارل۔ پیرس ۱۹۳۳ء [3] مصنفہ بیل (Beal)۔ لندن ۱۹۰۶ء [4] مقدسی ص ۳۰۴ [5] ہمالیہ کے صوبوں کی سیاحت ص ۳۸۸

بامیان کے دو دیو ہیکل مجسمے تو بہت مشہور ہیں۔ عرب مورخین نے لکھا ہے کہ اپنی ساخت اور جسامت کے لحاظ سے یہ عجیب و غریب مجسمے تھے۔ یاقوت نے لکھا کہ یہ دونوں مجسمے ہیون سیانگ کے زمانہ میں بھی موجود تھے ان میں سے بڑا مجسمہ ۱۲۰ فٹ اور دوسری روایت کے مطابق ۱۸۰ فٹ اونچا مرد کی صورت کا تھا۔ دوسرا مجسمہ اس سے دو سو فٹ کے فاصلہ پر تقریباً اسی قد و قامت کا عورت کا تھا۔ قدیم زمانہ میں ان بتوں کو سنگ سال اور شاہ مما یا دوسری روایت کے مطابق "سرخ بت" اور "سفید بت" کہا جاتا تھا۔ ان دونوں مجسموں کو ۱۷ ویں صدی عیسوی کے کسی بادشاہ نے گولہ باری کر کے اڑوا دیا تھا[1]۔

بامیان میں بڑے بڑے غار گوشہ عبادت کے لئے پتھروں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ یاقوت نے ان غاروں کی نقاشی کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی دیواروں پر ان تمام پرندوں کی تصاویر بنی ہوئی تھیں جن کو خدا نے دنیا میں پیدا کیا ہے۔

برن اور دوسرے سیاحوں نے بامیان کے بتوں کی موجودہ حالت کی تفصیلات بھی دی ہیں اور ان کے کھنڈروں اور شکستہ مجسموں کی تعداد لکھی ہے۔ تیسری صدی ہجری تک بامیان میں دوسری خانقاہوں کے علاوہ ایک بہت بڑی خانقاہ مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اس میں بدھ کے سیکڑوں

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام I ص ۶۴۳

قدیم مجسمے تھے اس خانقاہ کو یعقوب صفاری نے مسمار کیا اور اپنے ساتھ ان مجسموں کو بھی بغداد لے گیا[1]

بامیان کے امیر "شیر" کے لقب سے مشہور تھے جس کا ترجمہ یعقوبی نے اسد (Lion) کیا ہے لیکن وہاں کی زبان میں اس کے معنی "بادشاہ" کے ہوتے تھے اور اس لفظ کا ماخذ فارسی قدیم کا لفظ "خشتریہ" (Khshathriya) تھا[2]۔ ان امیروں نے عباسیوں کے زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا یعقوبی کے قول کے مطابق وہ زمانہ منصور یا مہدی کا تھا۔ تاریخ سے تو نہیں معلوم ہوتا کہ "شیر بامیان" کے تعلقات ہندوکش کی شمالی مغربی مملکتوں سے کیسے تھے لیکن یعقوبی نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ شہر بامیان کا تعلق طخارستان کی حکومت سے تھا۔ طبری نے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بامیان پر ایک غیر ملکی خاندان ختل کا حکمران تھا۔ ختل جیحوں کے شمال کا ایک شہر تھا اور طخارستان کا ہی ایک صوبہ تھا۔ سنہ ۷۱۸ء کے چینی مخطوطات سے معلوم ہوتا ہے کہ "شیر بامیان" اور اس وادی کے تمام امیر طخارستان کے ترکی بادشاہ کے حلقہ بگوش تھے۔ بامیان کے امیر اور شاہی خاندان کے لوگ عباسیوں کے آخری عہد میں بغداد کے دربار میں کافی رسوخ رکھتے تھے۔ طبری کے ایک قول کے مطابق سنہ ۲۲۹ھ میں "شیر بامیان" کو تمین کا والی مقرر کیا گیا تھا[3]۔

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں بامیان غزنویوں اور غوریوں کے قبضہ میں آگیا۔ غوری خاندان کی ایک شاخ نے وہاں سنہ ۵۵۰ھ سے ۶۰۹ھ تک ۵۹ سال حکومت کی۔ ان کی حکومت کا دارالخلافہ بھی بامیان ہی تھا اور اس میں طخارستان کا پورا علاقہ اور دریائے جیحوں کی وادی کے شمالی اضلاع بھی شامل تھے شمال مشرق میں اس حکومت کی حدود کاشغر کی سرحدوں سے ملتی تھیں۔ ساتویں صدی ہجری میں غوریوں کی دوسری مملکتوں کے ساتھ بامیان کا علاقہ بھی خوارزم کے محمد شاہ کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ بعد کو غزنی اور دوسرے علاقوں کے ساتھ اسے محمد شاہ نے اپنے بیٹے جلال الدین کو بخش دیا تھا اور اس طرح بامیان طخارستان سے دوبارہ علیٰحدہ ہو کر دریائے جیحوں کی جنوبی سلطنت میں شامل ہو گیا تھا۔

بامیان پر منگولوں نے سنہ ۶۱۸ھ میں حملہ کیا اور اس جنگ میں موتوجن بن چنگیز خاں مارا گیا۔ اس کے انتقام میں چنگیز خاں نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور وہاں کی عمارتوں کی بنیادیں تک اکھاڑ پھینکیں۔ اتنا قتل عام کیا کہ شہریوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ اس تباہی کے بعد اس شہر کو "بدبخت شہر" یا رشید الدین کے قول کے مطابق "بدبخت قلعہ" کہا جانے لگا اور چالیس سال تک وہ اتنا ویران رہا کہ لوگ اس طرف سے گزرنا بھی منحوس سمجھتے تھے۔ اس شہر کے کھنڈرات کو اب "گلگلا" کہا جاتا ہے۔ یہ کھنڈر ہندوکش کے جنوب میں اب بھی موجود ہیں اور ان میں تباہ شدہ مجسمے بھی ہیں۔

اب بامیان جدید تباہ شدہ شہر سے چند میل کے فاصلہ پر مغرب کی طرف آباد ہے لیکن اس کی پہلی جیسی سیاسی اور مذہبی حیثیت نہیں ہے۔ نیا شہر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور صدیوں سے غزنی اور کابل میں شامل ہو کر افغان حکومت کے زیرنگیں آگیا ہے۔ عبدالکریم بخاری کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں بامیان جدید کا منافع ایک لاکھ روپیہ سال تھا۔ ہندوستان کے مشہور سیاح منشی موہن لال نے اس رقم کا اندازہ ستر ہزار روپیہ سال کیا ہے[4]۔ اسی سیاح کا بیان ہے کہ اب بامیان کے باشندے ہزارہ نسل کے مسلمان ہیں اور ان کی زبان پشتو اور فارسی ہے۔

---

[1] بخارا تک کا سفر سنہ ۱۸۳۵ء ۔ II ۔ ص ۱۵۹ [2] طبری III ۱۵۰۱ اور فہرست میں ۳۲۶ (اورینٹل اسٹڈیز۔ برتھ ہولڈ I ص ۱۰۰)

[3] "ایران شہر" مصنف Marquart [4] تاریخ طبری III ص ۱۲۲۵ [5] Journal of Tour through the Punjab سنہ ۱۸۴۶ء ص ۲۷

اتر پردیش کے قوانین سنہ ۱۹۵۸ء

اترپردیش کی مجلس قانون ساز نے سنہ ۱۹۵۸ء میں ۴۵ قانون بنائے۔ ان میں سے ۱۸ نئے اور بقیہ ترمیمی تھے۔ اسی سال گورنر نے پانچ آرڈی ننس بھی جاری کئے تھے جو بعد کو ایکٹ میں تبدیل کر دئیے گئے۔ ان میں سے چند اہم قوانین کا خلاصہ علیٰحدہ علیٰحدہ عنوانات کے ماتحت درج کیا جا رہا ہے۔

تعلیم۔ مدرسین کی اس مسلسل اور پرزور مانگ کو پورا کرنے کے خیال سے کہ ان کی تنخواہیں اور اُن کے حالات بہتر بنائے جائیں الٰہ آباد، لکھنؤ اور گورکھپور یونیورسٹیوں کے قوانین میں یو۔پی یونیورسٹیز (ترمیمی) آرڈی ننس، ۱۹۵۷ (یو۔پی آرڈی ننس سنہ ۱۹۵۷ء نمبر ۱۴) کی رو سے ترمیمیں کی گئیں۔ بعد کو آرڈی ننس کی جگہ مختلف ترمیمی ایکٹ بنا دئے گئے۔

الٰہ آباد یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۷ — (یو۔پی ایکٹ سنہ ۱۹۵۸ء نمبر ۵) اس ایکٹ کا اصل مقصد اولاً یہ ہے کہ ریڈرز اور لیکچررز کی تنخواہوں میں یکسانیت پیدا کی جائے۔ ثانیاً یہ ہے کہ وائس چانسلر کو مدرسین اور یونیورسٹی کے تنخواہ دار افسران کے خلاف تادیبی کارروائی شروع کرنے کا جو اختیار ہے وہ اصل قانون سے خارج کر دیا جائے۔

لکھنؤ یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۷ — (سنہ ۱۹۵۸ء کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۵) یہ ایکٹ بھی اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ تنخواہوں کی یکسانیت آرٹ، سائنس، کامرس اور لا کے شعبوں تک محدود ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے سلسلہ میں دوسری ترمیم یہ ہوئی کہ یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں اور اداروں کے انتخاب کے طریقوں میں واحد نقل پذیر ووٹ کی مدد سے متناسب نمائندگی کا طریقہ شامل کر لیا گیا۔

دونوں ترمیمی قوانین کے نتیجہ میں بعض اور بھی تبدیلیاں اصل ایکٹوں میں ہوئیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ میں لکھنؤ یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۸ (یو۔پی ایکٹ سنہ ۱۹۵۸ء نمبر ۳۱) کی رو سے مزید ترمیم ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں اس توضیح کا اضافہ کر دیا گیا کہ اصل ایکٹ کی ترمیم شدہ دفعہ (۱) ۱۹ کا اطلاق پچھلے زمانہ سے ہوگا۔

گورکھپور یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ — (۱۹۵۸ء کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۲۳) یہ ایکٹ بھی مذکورہ بالا مقاصد یعنی مدرسین کی تنخواہوں اور وائس چانسلر گورکھپور یونیورسٹی کے اختیارات کے سلسلہ میں پاس کیا گیا تھا۔ اس سے گورکھپور یونیورسٹی (ترمیمی) آرڈی ننس ۱۹۵۸ء کی، جو کہ پہلے نافذ کیا گیا تھا تنسیخ ہو گئی۔

چونکہ وارانسیہ وِشو ودیالیہ ایکٹ، ۱۹۵۶ (سنہ ۱۹۵۶ء کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۲۸) کے نفاذ کے سلسلہ میں جو دشواریاں تھیں وہ مذکورہ بالا ایکٹ کے نفاذ کے ۱۸ مہینوں کے اندر رفع نہ کی جا سکیں اس لئے ان دشواریوں کو دور کرنے کی میعاد کو ۳۶ مہینوں تک بڑھانے کے احکام جاری کرنا ناگزیر ہو گیا۔

اسی لئے وارانسیہ سنسکرت وِشو ودیالیہ (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ (سنہ ۱۹۵۸ء کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۲۴) وضع کیا گیا۔ اس ترمیمی ایکٹ میں دوسری ریاستی یونیورسٹیوں کے ایکٹوں سے یکسانیت رکھنے کے خیال سے کچھ اور باتوں کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۵۸ء کا یو۔پی آرڈی ننس نمبر ۳ جو کہ پہلے نافذ ہوا تھا منسوخ کر دیا گیا۔

آگرہ یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ء ۔ (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۲۶) یہ ایکٹ بعض ان عملی دشواریوں کے پیش نظر وضع کیا گیا تھا جو اصل ایکٹ، ترمیم شدہ سنہ ۱۹۵۳ کی موجودہ دفعات کے عملاً آنے میں پیش آئی تھیں۔

تعلیمی اداروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ اور معیار تعلیم میں افسوسناک کمی کے پیش نظر انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن ایکٹ سنہ ۱۹۲۱ میں ترمیم کرنا ضروری ہو گیا۔ اس لئے انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۸ء (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۳۵) مناسب حالات، مدرسین کی ملازمت کے استحکام اور تعلیمی اداروں کے بہتر نظم و نسق کے لئے اس خیال سے وضع کیا گیا کہ ہائر سکنڈری اسٹیج میں تعلیم کا معیار اونچے سے اونچا ہو۔

تعلیم کے سلسلہ میں جو قانون بنائے گئے ہیں ان میں یو۔ دیشیہ سکشا دَل ایکٹ ۱۹۵۸ء (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۳۹) ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ یہ اس مقصد سے وضع کیا گیا ہے کہ انٹرمیڈیٹ درجوں کے لڑکوں کو لازمی فوجی ٹریننگ دی جائے (اس میں اسلحہ کا استعمال بھی شامل ہے)۔ اس ایکٹ میں ضمنی معاملات بھی شامل ہیں مثلاً لازمی حاضری، ڈسپلن قائم رکھنا اور عہدے عطا کرنا۔

یو۔پی زرعی یونیورسٹی ایکٹ، ۱۹۵۸ء ۔ (سنہ ۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۴۵) اس ایکٹ کی رو سے ریاست کے ترائی علاقہ میں ایک جداگانہ زرعی یونیورسٹی قائم کی جائے گی جو زراعت، پشو پالن، زرعی اصطلاحات، گھریلو سائنس وغیرہ میں تعلیم دینے والے پانچ کالجوں پر مشتمل ہوگی۔

اصلاحات آراضی۔

یو۔پی خاتمۂ زمینداری اور اصلاحات آراضی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۸ء ۔ (سنہ ۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۳۷) اصل ایکٹ کی دفعہ ۳ کے لفظ "اسٹیٹ" کی ایک واضح تعریف بدل کے طور پر پیش کرتا ہے اس کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب کہ آنریبل ہائی کورٹ الہ آباد نے ایک "رٹ" کے کیس میں اس اصطلاح کی موجودہ تعریف کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کیا۔

یو۔پی اصلاحات آراضی (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ء ۔ (سنہ ۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۳۷) یو۔پی خاتمۂ زمینداری اور اصلاحات آراضی ایکٹ، ۱۹۵۰ء (سنہ ۱۹۵۱ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۱) یہ ایکٹ ترمیم شدہ سنہ ۱۹۵۶ کے راستہ سے ان دشواریوں کو دور کرتا ہے جو تجربہ میں آئی تھیں:۔ اس کی رو سے وہ پیچیدہ طریقہ بالکل ختم ہو گیا جو گاؤں سماجوں کو اصلاحات آراضی کے بعض اقدامات کے سلسلہ میں اختیار کرنا پڑتا تھا۔ درمیانی لوگوں کے عطیہ بحالی کی تشخیص میں جو تاخیر ہوتی تھی وہ دور ہو گئی اور داخل خارج کے مقدمات کی طویل کارروائی بھی ختم ہو گئی ہے۔ خاص ایکٹ کی دفعہ ۱۵۴ میں "فیملی" کی تعریف بدل دینے کے نتیجہ میں جوتوں کی ایک نئی حد مقرر کر دی گئی ہے۔

یو۔پی جوت چک بندی (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ء ۔ (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۳۸) یہ ایکٹ عوام کی بعض دشواریوں کو دور کرنے کی غرض سے پاس کیا گیا تھا۔ مانگ یہ تھی کہ کھاتے داروں نے جو رضامندی سے چک بندی کی ہے وہ مان لی جائے۔ بھومی دھری مقدمات کے سلسلہ میں ثالثی کی دفعات ہٹا دی گئیں اور عدالتہائے مالی کو وہی اختیار دے دیا گیا۔ چک بندی کے افسران کھاتے داروں کے حقوق کے تصفیہ کے سلسلہ میں جو احکام جاری کرتے ہیں ان کے خلاف نگرانی اور اپیل ثانی کا اختیار دے دیا گیا ہے۔ ایسی صورت کی گئی ہے کہ آراضی کی مالیت کا تخمینہ اس کی پیداواری صلاحیت آبپاشی کی سہولتوں اور رجائے وقوع کی بنیاد پر کیا جا سکے۔ ایسی آراضیات جن میں بعض متعینہ پودے لگائے جاتے ہیں چک بندی کے حلقہ سے خارج قرار دے دی گئی ہیں۔ اس زمین کے انتظام کی بھی صورت نکالی گئی ہے جو مفاد عامہ کے لئے عطیہ میں ملتی ہے۔

محاصل اور ٹیکس۔

ٹیکسٹائیلس (کپڑا) شکر اور تمباکو سیلس ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیئے گئے ہیں اور مرکزی حکومت نے ان پر سنٹرل اکسائز ڈیوٹی بڑھا دی ہے۔ لیکن جس اسٹاک پر مزید اکسائز ڈیوٹی نہیں ادا کی گئی ہے اس پر سیلس ٹیکس بدستور رہے گا۔ یو۔پی سیلس ٹیکس (تیسرا ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ء (سنہ ۱۹۵۸ء کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۷) ان بیوپاریوں کو سہولت دیتا ہے جن کے پاس ایسا اسٹاک ہے نیز ایسی صورت پیش کرتا ہے جس سے یہ

ٹیکس جلد وصول ہو سکے۔

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یو۔پی سیلس ٹیکس (جواز) ایکٹ ۱۹۵۸ (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۱۵) بعض اعلانات اور ان کے تحت کئے جانے والے اقدامات کو جائز قرار دینے کے لئے جاری کیا گیا

<u>یو۔پی سیلس ٹیکس (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۸</u> — (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۱۹) یہ ایکٹ پالیسی کی تبدیلی ظاہر کرتا ہے اور بعض چیزوں کی خرید پر ٹیکس لگانے اور غلہ پر (single stage) یک مقامی ٹیکس لگانے کی صورت پیش کرتا ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے ریاستی حکومت کو یہ مجاز بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ بعض متعینہ آسائشی چیزوں پر، فیصدی کی یکساں شرح سے جیسا کہ مرکزی حکومت نے طے کیا یکساں مقامی ٹیکس لگا سکے۔

اس ایکٹ پر عملدرآمد کرنے میں جو دشواریاں تجربہ میں آئی تھیں انکو دور کرنے کی غرض سے ضابطہ کارروائی میں بعض تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔

اعشاری سکوں کے رواج کے نتیجہ میں متعدد قانونوں میں بڑے پیمانہ پر تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہوئی۔ یو۔پی کورٹ فیس (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۲۰) اور یو۔پی اسٹیمپ (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۲۱) کی رو سے کورٹ فیس ایکٹ ۱۸۷۰ اور انڈین اسٹیمپ ایکٹ ۱۸۹۹ میں جیسا کہ وہ اتر پردیش میں رائج ہیں، ضروری تبدیلیاں کی گئیں۔ انڈین اسٹیمپ ایکٹ ۱۸۹۹ کی دفعہ ۶ اور شیڈول I - B میں بھی ترمیم کی گئی اور دونوں میں جو نامساعدت تھی وہ دور کردی گئی۔

<u>اتر پردیش کورٹ فیس (دوسرا ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۴۴) اور اتر پردیش اسٹامپ (دوسرا ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۴۳)</u>۔ اس ایکٹ کی رو سے دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے کورٹ فیس اور اسٹامپ ڈیوٹی بڑھا دی گئی۔

<u>اتر پردیش سرکاری بجلی کے تجارتی ادارہ جات (وصولی واجبات) ایکٹ سنہ ۱۹۵۸</u> — اس مقصد سے وضع کیا گیا ہے کہ صارفین کو ریاستی بجلی کے اداروں سے جو بجلی فراہم کی جاتی ہے اس کے واجبات بقایا مال گذاری کی طرح جلد وصول کئے جا سکیں۔ یو۔پی موٹر وہیکلس ٹیکزیشن (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ اس مقصد سے وضع کیا گیا ہے کہ ریاستی سڑکوں کی رکھوالی اور تعمیر پر جو مزید اخراجات ہوئے ہیں انکو پورا کرنے کے لئے موٹر وہیکلس (گاڑیاں) ٹیکس میں اضافہ کیا جا سکے۔ نیز موٹر وہیکلس ٹیکزیشن ایکٹ، ۱۹۳۵ کی خامیاں بھی دور کی جا سکیں۔

یو۔پی انٹرٹینمنٹ اینڈ بٹنگ ٹیکس (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ انٹرٹینمنٹ ٹیکس میں فی صد کا رواج قائم کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔

اصلاح آراضی

یو۔پی فرسٹ افنڈرس پروبیشن (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۷ (سنہ ۱۹۵۸ کا یو۔پی ایکٹ نمبر ۸) اس مقصد سے بنایا گیا ہے کہ جو اختیارات ریاستی حکومت کو حاصل ہیں وہ کسی اور افسر کو تفویض کئے جا سکیں۔ اس کے پس پشت اصل غایت یہ ہے کہ انسپکٹر جنرل جیل خانجات کو پروبیشن افسران کے تقرر کا اختیار دیا جا سکے۔

پریزنس (یو۔پی ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸ کی رو سے پریزنس ایکٹ ۱۸۹۴ میں جہاں تک یو۔پی کا تعلق ہے ترمیم کردی گئی ہے۔ ترمیم کا مقصد یہ ہے جیل میں قیدیوں کی اصلاح کی جا سکے نیز جیل کے جرائم کے لئے بعض ہلکی سزائیں دی جا سکیں مثلاً عارضی یا مستقل طور پر گریڈ گھٹانا، یا یا ضبط کر لینا اور جیل کے حقوق عارضی طور پر لے لینا۔

لوکل سلف گورنمنٹ

<u>یو۔پی ڈسٹرکٹ بورڈس (ترمیمی) ایکٹ، ۱۹۵۸</u> کی رو سے یو پی ڈسٹرکٹ بورڈس ایکٹ، ۱۹۲۲ میں اس غرض سے ترمیم کی گئی ہے کہ ایکٹ مذکور ان قوانین کے مطابق ہو جائے جو ریاستی مجلس قانون ساز کے الیکشنوں پر عائد ہیں۔ اس کے تحت اسمبلی کی فہرست ووٹران ڈسٹرکٹ بورڈوں کے الیکشنوں کے لئے اختیار کرلی گئی ہے، اقوام مندرجہ فہرست کے لئے نشستیں ریزرو کی گئی ہیں پریسیڈنٹ کا چناؤ بالواسطہ کردیا گیا ہے اور اس کی علیحدگی بھی نااہلیت (Disqualifications) پیدا ہو جانے کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔

<u>یو۔پی انترم ضلع پریشد آرڈی ننس، ۱۹۵۸</u> کی مدد سے دیہاتی حلقوں میں لوکل سلف گورنمنٹ کے عبوری دور میں انترم ضلع پریشد

اگرباینٹرز ۱۰۰۱

کا قیام ہو سکتا ہے تاکہ ضلعوں میں معاشی اور سماجی پلاننگ کے نظم و نسق اور لوکل سلف گورنمنٹ کیلئے "ضلع پریشد" بنانے میں سہولت ہو۔
اس آرڈی نینس کی جگہ بعد کو یو۔پی انترم ضلع پریشد ایکٹ ۱۹۵۸ بنا دیا گیا۔

جائے رہائش اور بحالی

یو۔پی ہاؤس سائیٹس (قحط زدہ علاقے) (عارضی اختیارات) ایکٹ ۱۹۵۷۔ اس ایکٹ کی رو سے یو پی ہاؤس سائیٹس (قحط زدہ علاقے) (عارضی اختیارات) آرڈی نینس ۱۹۵۷ء کی تنسیخ ہوتی ہے۔ یہ آرڈی نینس اس غرض سے جاری کیا تھا کہ سیلاب زدہ علاقوں میں موجودہ قابضین جو آراضی مکانات پر قابض رہے ہوں انھیں ان پر مستقل قابض رہنے کا موقعہ دیا جائے کیونکہ اس آرڈی نینس کی عدم موجودگی میں وہ اور اپنے مالکان وقابضین آراضی کے مابین معاہدے کی بناء پر قابض نہیں رہ سکتے تھے۔

یو پی (عارضی) کرایہ مکان وتخلیہ (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۸۔ یو۔پی (عارضی) یہ ایکٹ کرایہ مکان وتخلیہ ایکٹ ۱۹۴۷ کی پانچ مزید سال کے لئے توسیع کرتا ہے۔ اسی طرح یو پی (عارضی) حصول جائے رہائش (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۸ کی رو سے یو پی (عارضی حصول جائے رہائش ایکٹ ۱۹۴۷ کی توسیع ہوتی ہے۔

یو پی (ریگولیشن آف بلڈنگ آپریشنس) ایکٹ ۱۹۵۸۔ اس ایکٹ کی رو سے ریاستی حکومت کو یہ اختیار ملتا ہے کہ شہری اور دیہاتی علاقوں میں غیر صحت بخش اور بے ڈھنگے تعمیری اقدامات روکے جا سکیں۔

یو پی اسٹوریج ریکوزیشن (تسلسل اختیارات) (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۸ء کی رو سے یو پی اسٹوریج ریکوزیشن ایکٹ ۱۹۵۵ کی مزید تین سال کے لئے توسیع ہوتی ہے اور ریاستی حکومت کو غلہ اور غذائی سامان کے رکھنے کے لئے جگہیں حاصل کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

متفرق

یو پی کنٹرول آف سپلائیز (تسلسل اختیارات) (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۷۔ یہ ایکٹ اس مقصد سے بنایا گیا ہے کہ صارفین کی ایک بڑی اکثریت کی سہولت کے لئے اینٹوں اور جنگل کی پیداوار پر جو موجودہ کنٹرول ہے وہ مزید تین سال کے لئے جاری رہے۔

کریمنل لا (کمپوزیشن آف آفنسز) (یو پی امنڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۵۸۔ اس کی رو سے کریمنل لا (کمپوزیشن آف آفنسز) (یو۔پی امنڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۵۶ میں وہ ترمیمیں کی گئی ہیں جو موٹر وہیکلس (امنڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۵۶ کی تبدیلیوں کے بعد ضروری ہو گئی تھیں۔ اس کے تحت بعض جرائم کے سلسلہ میں ایک ملزم وکیل کے ذریعہ عدالت میں حاضر ہو سکتا ہے۔

یو پی ریکوزیشن آف موٹر وہیکلس (ایمرجنسی پاورس) (امنڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۵۸۔ یہ ایکٹ وہ اصول پیش کرتا ہے جن کی بنیاد پر ان گاڑیوں کا معاوضہ دیا جائے گا جو یو پی ریکوزیشن آف موٹر وہیکلس (ایمرجنسی پاورس) ایکٹ ۱۹۴۷ کے تحت حاصل کی گئی ہیں۔

سوسائٹیز رجسٹریشن (یو پی امنڈمنٹ) ایکٹ ۱۹۵۸۔ حکومت ہند کے ایما پر یہ ایکٹ اس غرض سے بنایا گیا ہے کہ رجسٹرار جوائنٹ اسٹاک کمپنیز کو سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ اور انڈین پارٹنرشپ ایکٹ کے کام سے سبکدوش کر دیا جائے اور یہ کام ریاستی حکومت کے کسی افسر کے سپرد کر دیا جائے۔ اس ایکٹ سے سوسائٹیز رجسٹریشن (یو پی امنڈمنٹ) آرڈی نینس ۱۹۵۸ کی جو پہلے نافذ کیا گیا تھا تنسیخ ہو گئی۔

جونسار۔باور پرگنہ (ضلع دہرہ دون) ریونیو آفیشلس (اسپیشل پاورس) ایکٹ ۱۹۵۸۔ کی رو سے جونسار باور پرگنہ ضلع دہرہ دون کے ریونیو افسران کو ایک پولیس افسر یا افسر انچارج کے بعض اختیارات عطا کر دیئے گئے ہیں۔

(یو پی الیکٹری سٹی (ٹمپوریری) پاورس آف کنٹرول (امنڈمنٹ) ایکٹ، ۱۹۵۸ء۔ یہ ایکٹ اس خیال سے وضع کیا گیا ہے کہ یو۔پی الیکٹری سٹی (ٹمپوریری) پاورس آف کنٹرول ایکٹ ۱۹۴۷ کی توسیع کر دی جائے کیونکہ بجلی کی مانگ سپلائی سے ابھی تک زیادہ ہے۔

یو پی انسداد ذبیحہ گاؤ (ترمیمی) آرڈی نینس ۱۹۵۸۔ یہ ایکٹ اس غرض سے نافذ کیا گیا تھا کہ یو پی انسداد ذبیحہ گاؤ ایکٹ ۱۹۵۵ میں ہائی کورٹ کے فیصلہ کے مطابق جو خامی تھی وہ دور ہو جائے۔ اب اس آرڈی نینس کی جگہ ایکٹ جاری کر دیا گیا ہے اور آرڈی ننس کی تنسیخ ہو گئی ہے یعنی اصلی ایکٹ کی دفعہ ۳ میں جو خامی تھی وہ دفعہ حذف کر دی گئی ہے۔

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

خدمتی امداد باہمی انجمنوں اور گرام پنچایتوں کا اشتراک • • • اتر پردیش میں کھادی اور دیہی صنعت بورڈ کا قیام • • • مغربی اضلاع میں آبپاشی کی چھوٹی اسکیمیں • • • چک بندی کے خوشگوار نتائج • • • گرام سہائک کا کارنامہ • • • اسکولوں کے لئے ماہرین نفسیات • • • مزید تقاوی کی منظوری • • • تیسرے منصوبہ کے تحت فنی تعلیم کی توسیع • • • ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کا جشن

خدمتی امداد باہمی انجمنوں کو گرام پنچایتوں کے اشتراک کے ساتھ دیہی علاقوں میں جملہ ترقیاتی سرگرمیوں کے سلسلہ میں نمایاں مقام حاصل ہوگا۔ یہ فیصلہ ترقیات اور متعلقہ محکموں کے افسروں کے ایک جلسہ میں کیا گیا جو لکھنؤ میں ۲۶ راکتوبر کو منعقد ہوا۔

ڈیولپمنٹ کمشنر جنھوں نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ امداد باہمی انجمنوں اور بلاک ڈیولپمنٹ عملہ کے درمیان مکمل رابطہ کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ مقصد ریاستوں کے وزراء امداد باہمی کی میسور میں منعقدہ کانفرنس کی سفارشات پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ میسور کانفرنس نے یہ سفارش کی تھی کہ بلاک ڈیولپمنٹ عملہ خاص طور پر بلاک ڈیولپمنٹ افسروں۔ زراعتی توسیعی افسروں اور ویلیج لیول ورکروں کو امداد باہمی کی مکمل تربیت دینے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ گاؤں کی سطح پر نئے بھرتی کئے گئے لوگوں کو مکمل تربیت دینے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں اور جو لوگ تربیت حاصل کر چکے ہیں ان کے لئے ریفریشر کورس کا انتظام کیا جائے گا۔

جلسہ میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ بلاک ترقیاتی کمیٹیوں میں امداد باہمی انجمنوں کے نمائندے شامل کئے جائیں۔

کانفرنس میں نئی امداد باہمی پالیسی زیر غور آئی جس کے مطابق ابتدائی سطح پر امداد باہمی انجمنیں گاؤں کی بنیاد پر قائم کی جائیں گی اور اس کا دائرۂ عمل وہی ہوگا جو گاؤں سبھا کا ہوگا۔ اتر پردیش میں ایسی دس ہزار انجمنیں قائم کی جا رہی ہیں جو خدمتی امداد باہمی انجمنوں کے نام سے موسوم ہوں گی۔ امید کی جاتی ہے کہ ان انجمنوں کی تنظیم اور رجسٹریشن یکم نومبر ۱۹۵۹ء تک مکمل ہو جائے گا۔

ڈیولپمنٹ کمشنر نے بتایا کہ خدمتی امداد باہمی انجمن کا خاص کام اپنے ہر ایک ممبر کے لئے پیداواری پروگرام مرتب کرنا ہوگا۔ امداد اس پروگرام کی بنیاد پر کسانوں کی ضروریات خدمتی امداد باہمی انجمن پوری کرے گی اور مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے ذریعہ ممبروں کی پیداوار کی فروخت کا انتظام کرے گی۔ ان سہولتوں کی فراہمی کے لئے پرانی مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے علاوہ ۴۴۳ گنج یونینیں کے علاوہ دوسری زراعتی پیداوار کی بھی خرید اور فروخت کریں گی۔

کافی غور و خوض کے بعد جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ اجتماعی ترقی سے متعلق میسور کانفرنس کی سفارش کے مطابق لامرکزیت پالیسی پر عملدرآمد کیا جائے۔ میسور کانفرنس نے یہ سفارش کی تھی کہ دیہی عوام کی ترقی کے لئے مقامی اداروں کو تقویت پہنچانا چاہیئے۔ تین بنیادی ادارے یعنی پنچایت۔ امداد باہمی انجمن اور اسکول دیہی ترقیاتی پروگرام کے محور ہوں گے۔ اس لئے جلسہ میں یہ طے کیا گیا کہ پنچایتوں کو بھی ترقیاتی پروگرام پر عملدرآمد میں شریک کیا جائے۔ آئندہ سے ۵۰۰ روپیہ تک کی مالیت کے آبپاشی کے چھوٹے کاموں کی تکمیل پنچایتوں کے سپرد کی جائے۔ اور پنچایتیں منتخب ٹیوب ویل کے ذریعہ پانی کی تقسیم کی بھی ذمہ دار ہوں گی۔ ہر ایک پنچایت کی دو کمیٹیاں

یعنی پیداواری ذیلی کمیٹی اور فلاحی ذیلی کمیٹی ہوگی۔ پیداواری کمیٹی صنعتی امداد باہمی انجمن اور فلاحی کمیٹی اسکول سے مربوط ہوگی۔

● ● ●

حکومت اترپردیش ریاست میں کھادی اور دیہی صنعت کے قانونی بورڈ کے قیام کے لئے مجالس قانون ساز کے آئندہ اجلاس میں ایک بل پیش کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔ اس بل کا مقصد دیہی صنعتوں کے پروگرام کی بلا تاخیر تکمیل کے علاوہ تعمیری کارکنوں کا سرگرم تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ بل کل ہند کھادی اور دیہی صنعت کمیشن کی سفارشات کے مطابق پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ بورڈ بشمول چیرمین ۱۵ ممبروں پر مشتمل ہوگا۔ ریاستی حکومت بورڈ کے ۹ غیر سرکاری ممبروں اور چیرمین کو نامزد کرے گی۔ چیرمین کے عہدہ کی میعاد ایک سال ہوگی۔ اور غیر سرکاری ممبران تین سال کے لئے ہوں گے۔

موجودہ تجویز کے مطابق ریاستی حکومت کو بورڈ کے لئے سکریٹری مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔

بورڈ کے فرائض میں کھادی اور دیہی صنعتوں کا قیام۔ ان کی ترقی اور ہمت افزائی شامل ہیں۔ ان فرائض کی بحسن وخوبی انجام دہی کے لئے بورڈ کو کسی مخصوص علاقہ میں ایک یا ایک سے زیادہ کمیٹیاں مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ بورڈ کے ذریعہ اداروں کو جن میں امداد باہمی انجمنیں شامل ہیں اور کھادی اور دیہی صنعتوں میں لگے ہوئے افراد کو قرضے دیئے جائیں گے اور اس کے زیر انتظام تربیتی مرکز بھی چلائے جائیں گے۔

بورڈ کے ذریعہ خام مال اور اوزاروں کی تیاری اور فراہمی کا بھی انتظام کیا جائے گا اور کھادی اور دیہی صنعتوں کے لئے امداد باہمی انجمنوں کے قیام کی ہمت افزائی کی جائے گی۔

کھادی اور دیہی صنعتوں کی مصنوعات کی فروخت کے بندوبست کے لئے بورڈ کو دکانیں کھولنے کا اختیار ہوگا۔ اور ان مصنوعات کے پروپگنڈہ کے لئے بورڈ نمائشوں کے انعقاد کے علاوہ دوسرے طریقوں کو بروئے کار لائے گا۔

ان امور کے علاوہ بورڈ ان صنعتوں کے متعلق تحقیق اور کھادی اور دیہی صنعتوں کے کام میں لگے ہوئے افراد اور اداروں کی سرگرمیوں میں رابطہ قائم کرنے کا بندوبست کرے گا۔

بورڈ ان صنعتوں کی مصنوعات کی نکاسی کے سلسلہ میں چھوٹی صنعتوں کے ریاستی کارپوریشن اور صنعتی امداد باہمی انجمنوں کی ریاستی انجمن جیسے اداروں کی اعانت حاصل کرے گا۔

بورڈ کا خود اپنا فنڈ ہوگا اور ریاستی حکومت یا کسی حاکم۔ فرد یا ادارہ کی جانب سے ملنے والی مالی امداد۔ عطیات۔ تمغے اور قرضے اس فنڈ میں جمع ہو جائیں گے۔ یہ بورڈ کل ہند کھادی اور دیہی صنعت کمیشن کے نمونہ پر ہوگا۔

● ● ●

ریاستی حکومت نے مشرقی اضلاع میں آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں پر عملدرآمد اور پہاڑی اضلاع میں نالیوں کی تعمیر کے لئے محکمہ منصوبہ بندی کو ۴ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ دیا ہے۔

اس رقم میں سے مشرقی اضلاع میں پختہ کنوؤں پہاڑی اضلاع میں آبپاشی کی چھوٹی نالیوں کی تعمیر کے لئے بالترتیب ۲ لاکھ روپیہ اور ڈھائی لاکھ روپیہ کے قرضے دیے جائیں گے۔

ایک پختہ کنواں کی تعمیر کے لئے ایک ہزار روپیہ تک۔ کنواں گلانے کے لئے ۵۰۰ روپیہ تک اور ایک رہٹ لگانے کے لئے ۴۰۰ روپیہ تک کے قرضے دیے جائیں گے۔ کمایوں ڈویژن اور دہرہ دون میں ایک ایکڑ زمین میں آبپاشی کی چھوٹی نالیوں اور تالابوں کی تعمیر کے لئے ۲۰۰ روپیہ تک بطور قرض دیا جائے گا۔

یہ رقم ۲ کروڑ روپیہ کی اس رقم میں سے دی گئی ہے جو مرکزی حکومت نے مالی سال رواں کے دوران میں پس ماندہ علاقوں کی ترقی کے منصوبوں پر عمل درآمد کے لئے دی ہے۔

ریاستی حکومت نے پختہ کنوؤں کی تعمیر کے لئے تقاوی دینے کی غرض سے جونپور اور اعظم گڑھ کے لئے ۱۹-۱۹ ہزار روپیہ گورکھپور اور غازیپور کے اضلاع کے لئے ۳۸-۳۸ ہزار روپیہ اور ضلع فیض آباد کے لئے ۵۷ ہزار روپیہ مخصوص کیا ہے۔

نالیوں اور گولوں کی تعمیر کے لئے ضلع الموڑہ کے لئے ۵ ہزار روپیہ ضلع ڈیرہ دون کے لئے ۲ ہزار روپیہ اور ضلع نینی تال کے لئے ۵۵ ہزار روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔

● ● ●

اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں جوتوں کی چک بندی سے خوشحالی کے دور کا آغاز ہوا ہے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ایسے مواضعات میں جہاں چک بندی ہو چکی ہے کھاتہ داروں نے بڑی تعداد میں نئے کنوئیں تعمیر کئے ہیں اور وہاں بہت زیادہ سڑکیں تعمیر ہو گئی ہیں۔

اتر پردیش کے ۹۲۹ء۸ مواضعات میں جہاں چک بندی اسکیم کے تحت چک منتقل ہو چکے ہیں کسانوں نے گذشتہ اگست کے آخر تک ...،۱ پکے اور ...۴ کچے کنوئیں تعمیر کئے ہیں اور ۳۰۰ ٹیوب ویل لگائے ہیں۔ مواضعات کے درمیان سڑکوں کی لمبائی ۲۵۰۰ میل سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اور کھاد کے گڈھوں کی تعداد بڑھ کر ۱۲۵۵۸۳ ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ کھاتہ داروں نے تقریباً ۱۵۰ نئے ٹریکٹر خریدے ہیں۔

چک بندی اسکیم جس کے دائرہ اثر میں اس وقت ۲۷ اضلاع کے ۵۵۹ء۲۰ء۵ ایکڑ زیر کاشت رقبہ پر مشتمل ۹۴۴۰ء۱ مواضعات ہیں اگست کے آخر تک ۹۲۹ء۸ مواضعات میں چکبندی مکمل ہو چکی ہے۔ اور ۹۷۲۴ء۴ مواضعات میں چکوں کی حد بندی ہو گئی ہے۔

مالی سال رواں کے دوران میں چک بندی اسکیم مزید ۹ اضلاع یعنی دیوریا۔ گونڈہ۔ بہرائچ۔ رائے بریلی۔ پرتاب گڈھ۔ سیتا پور شاہجہانپور۔ مین پوری اور کانپور کے اضلاع میں شروع کی گئی ہے ان میں سے ہر ضلع کی ایک تحصیل میں یہ اسکیم شروع کی گئی ہے۔

ضلع ٹہری گڑھوال کے جاکھلی قومی توسیعی سروس بلاک کے موضع جاکھلی کے گرام سہائک شری راگھوانند نے ایک ایکڑ میں ۶۰ من دھان پیدا کر کے پورے گاؤں کے لئے غذائی پیداوار کے سلسلہ میں ایک مثال قائم کی ہے۔ گزشتہ خریف مہم میں شری راگھوانند نے اپنی قابل فخر کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے ڈیولپمنٹ کمشنر سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے گاؤں آکر اسے خود ملاحظہ کریں۔

ڈیولپمنٹ کمشنر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس صورت میں اس کے گاؤں کا دورہ کریں گے جب کہ جاکھلی میں ۱۹۵۹ء کی خریف کے دوران میں دھان کی فی ایکڑ اوسط پیداوار ۵۰ من ہو جائے گی۔ شری راگھوانند کے گاؤں میں دھان کی فی ایکڑ اوسط پیداوار ۵۱ من ۲ سیر اور ۹ چھٹانک ہو گئی ہے۔

شری راگھوانند نے ڈیولپمنٹ کمشنر کو اپنے گاؤں کا دورہ کرنے کی دوبارہ دعوت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے گاؤں کے لوگوں نے اس کامیابی پر اکتفا نہیں کر لیا ہے بلکہ انھوں نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ ربیع مہم میں ایک ایکڑ میں اوسطاً ۳۰ من گیہوں پیدا کرنے کی کوشش کرینگے۔

● ● ●

حکومت اتر پردیش نے مزید پانچ گورنمنٹ ہائیر سکنڈری اسکولوں میں پانچ ماہرین نفسیات کو مقرر کیا ہے۔ جس سے ریاست میں پورے وقت کے اسکولوں کے ماہرین نفسیات کی کل تعداد ۲۰ ہو گئی ہے۔

ریاستی نفسیات بیورو کے نفسیاتی رہنمائی کے ڈپلوما کورس میں داخل شدہ ۲۶ تربیت پانے والوں نے گروپوں میں رہنمائی کا کام شروع کر دیا ہے۔

لڑکوں کے چار اور لڑکیوں کے تین تعلیمی اداروں میں نفسیاتی موضوعات پر باہمی بات چیت ہو چکی ہے اور ایک ادارہ میں نفسیاتی جانچ بھی مکمل ہو چکی ہے۔

تربیت پانے والوں کو مختلف انفرادی جانچوں سے واقف کرایا گیا ہے۔ مذکورہ بیورو اور اس کے پانچ مرکزوں میں ۶۵ درخواست دہندگان کو درج رجسٹر کیا گیا ہے۔ ان میں سے ۱۹ طلبا کو نفسیاتی جانچ کے لئے منتخب کیا گیا ہے اور متعلقہ اداروں کو ۲۶ رپورٹیں پیش کی جا چکی ہیں۔

طلباء کے تعلیم میں پیچھے رہنے کی وجوہات اور اس خامی کو دور کرنے کی تدابیر معلوم کرنے سے متعلق جو کام شروع کیا گیا تھا وہ جاری ہے اور اس سلسلہ میں ۵ طلبا کی نفسیاتی جانچ کی جا چکی ہے۔

● ● ●

ریاستی حکومت نے آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں کے لئے مجموعی طور پر مزید ۶۳،۲۷،۵۰۰ روپیہ کی تقاوی منظور کی ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کنوؤں کی تعمیر کے لئے سہارنپور ۲ کنوئیں ۱۰ ہزار روپیہ میرٹھ

۱۲ کنوئیں ۶۰ ہزار روپیہ۔ مظفر نگر ۱۰ کنوئیں ۵۰ ہزار روپیہ۔ آگرہ ۲۰ کنوئیں ایک لاکھ روپیہ۔ بلند شہر ۱۰ کنوئیں ۵۰ ہزار روپیہ۔ ایٹہ ۵ کنوئیں ۲۵ ہزار روپیہ۔ الہ آباد ۶ کنوئیں ۵۰۲۵۰ روپیہ۔ بارہ بنکی ۲۵ کنوئیں ۱۲۵۰۰۰ روپیہ

کنوؤں میں پائپ لگانے کے لئے ایٹہ ۱۲ کنوئیں ۶ ہزار روپیہ۔ مراد آباد ۵۰ کنوئیں ۲۵ ہزار روپیہ بارہ بنکی ۱۰ کنوئیں ۵ ہزار روپیہ۔

رہٹ سہارنپور ۲۰ رہٹ ۸ ہزار روپیہ۔ ایٹہ ۳۵ رہٹ ۱۴ ہزار روپیہ۔ مراد آباد ۴۰ رہٹ ۱۶ ہزار روپیہ۔ لکھنؤ ۲۵ رہٹ ۱۰ ہزار روپیہ بارہ بنکی ۲۰ رہٹ ۸ ہزار روپیہ۔

پمپنگ سیٹ سہارنپور ۹ سیٹ ۲۲۵۰۰ روپیہ۔ بلند شہر ۲ سیٹ ۵۰ ہزار روپیہ۔ علی گڑھ ۸ سیٹ ۲ ہزار روپیہ۔ مراد آباد ۱۰ سیٹ ۲۵ ہزار روپیہ۔ ایٹہ ۲ سیٹ ۵ ہزار روپیہ۔ لکھنؤ ۴ سیٹ ۱۰ ہزار روپیہ۔ اناؤ ۴ سیٹ ۱۰ ہزار روپیہ۔ بارہ بنکی ۱۰ سیٹ ۲۵ ہزار روپیہ۔

مظفر نگر میں ایک نجی ٹیوب ویل لگانے کے لئے ۱۰ ہزار روپیہ کی تقاوی منظور کی گئی ہے۔

● ● ●

فنی تعلیم سے متعلق ورکنگ گروپ نے تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے دوران میں فنی تربیت کی ترقی اور توسیع کی دور رس اسکیموں کی سفارش کی ہے۔ ورکنگ گروپ نے یہ سفارش کی ہے کہ رڑکی یونیورسٹی اور ہرکورٹ بٹلر ٹیکنالوجی کل انسٹی ٹیوٹ کانپور میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور سائنس اور فنی اہمیت کے تحقیق کے منصوبوں کو آگے بڑھایا جائے اور سنٹرل ٹیکسٹائل انسٹی ٹیوٹ کانپور میں پوسٹ گریجویٹ کورس شروع کیا جائے۔

ورکنگ گروپ نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ رڑکی میں انجینیرنگ اور متعلقہ مضامین اور ہرکورٹ بٹلر انسٹی ٹیوٹ کانپور میں فنی مضامین کی ایک لائبریری قائم کی جائے۔ اس اسکیم پر مجموعی طور پر ۱۰۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

اس گروپ نے یہ سفارش کی ہے کہ تعلیمی اداروں میں انجینیرنگ کے مضامین کی تعلیم کے لئے مزید ۵۰۰ نشستوں کا انتظام کیا جائے۔ اس کے علاوہ ورکنگ گروپ نے یہ سفارش کی ہے کہ لیدر انسٹی ٹیوٹ کانپور میں لیدر ٹیکنالوجی میں ڈگری کورس شروع کیا جائے جس میں ابتدا میں دس طلبا کے داخلہ کی گنجائش ہو۔ اور رڑکی یونیورسٹی میں کان اور خام دھات کو صاف کرنے کے علم کا کورس شروع کیا جائے۔

ریاست کے تعلیمی اداروں میں اس وقت ڈپلوما کورس میں ۳۳۹۶ طلبا کے داخلہ کی گنجائش ہے اور دوسرے منصوبہ کے آخیر تک ۶۹۵ طلبا کے داخلہ کی گنجائش پیدا کرنے کی توقع ہے۔

مرکزی حکومت نے ۳۰ ہزار طلبا کے داخلہ کی گنجائش پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ دوسرے منصوبہ کی مدت میں ۲۵ ہزار طلبا کے داخلہ کی گنجائش پیدا کرنے کی امید ہے۔ ورکنگ گروپ نے اترپردیش میں مزید ۹۰۰ طلبا کے داخلہ کی گنجائش پیدا کرنے کی سفارش کی ہے۔ گروپ نے آگرہ میں لیدر ٹیکنالوجی کے ایک ڈپلوما انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی بھی سفارش کی ہے۔

ورکنگ گروپ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ طلبا کو ہندوستان اور بیرونی ممالک میں حصول تعلیم کے لئے قرضے دینے کی اسکیم کو دوسرے منصوبوں سے جداگانہ سمجھا جائے۔ یہ اسکیم بہت زیادہ مقبول ہوئی ہے اور اترپردیش اس معاملہ میں پیش پیش ہے۔ جہاں طلبا کو ایک فیصدی شرح سود پر حصول تعلیم کے آٹھ سال بعد واجب الادا قرضے دئے جاتے ہیں۔ ورکنگ گروپ نے ڈگری اور ڈپلوما اداروں کی ترقی اور متفرق اسکیموں کی جو سفارش کی ہے ان پر ۲۴۰۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

ایڈوانی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق اترپردیش میں تیسرے منصوبہ کے دوران میں تقریباً ۸۲ ہزار دستکاروں اور کاریگروں کی ضرورت ہوگی۔ اترپردیش میں اس وقت ۲۴ ہزار دستکاروں کو تربیت دینے کی درسگاہیں موجود ہیں۔ ورکنگ گروپ نے اس سلسلہ میں یہ سفارش کی ہے کہ تیسرے منصوبہ کی مدت میں مزید ۴۱ ہزار دستکاروں کو تربیت دینے کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اسکے علاوہ ایک ہزار اپرنٹسوں اور ایک ہزار پارٹ ٹائم طلبا کو بھی تربیتی سہولتیں فراہم کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس نشانہ کی تکمیل کے لئے ۲۰۳۶۷ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

ثانوی فنی تعلیم کی توسیع کے سلسلہ میں ورکنگ گروپ نے یہ سفارش کی ہے کہ لکھنؤ اور گورکھپور کے پالی ٹیکنک اسکولوں کو جونیر ٹیکنکل اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اور موجودہ انجینیرنگ پالی ٹیکنک اسکولوں اور اداروں

کی تنظیم کی جائے۔ ورکنگ گروپ کے اندازہ کے مطابق اس اسکیم پر ۱۲۶، لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

ورکنگ کے تین خاص منصوبوں پر مجموعی طور پر ۱۶۰، ۲۰۲ ، ۵۰ ، لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ ورکنگ گروپ کی سفارشات ابھی حکومت کے زیر غور ہیں۔

● ● ●

ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کے جشن سے متعلق کمیٹی کا پہلا جلسہ آج یہاں محکمہ اطلاعات کے لاونج روم میں وزیر داخلہ تعلیم اور اطلاعات پنڈت کملا پتی ترپاٹھی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ ہندوستانی طلبا کو ۶ وظائف جو ٹیگور اسکالرشپ کے نام سے موسوم ہوں گے دیئے جائیں گے۔ ان وظائف کا مقصد طلبا کی اس سلسلہ میں ہمت افزائی کرنا ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب کا عمیق مطالعہ کریں۔ کمیٹی نے اس کے علاوہ ٹیگور چیئر کے قیام اور منتخب یونیورسٹیوں میں مختلف زبانوں کے ادب کے بارے میں لکچروں کا انتظام کرنے کی بھی سفارش کی ہے

کمیٹی نے ٹیگور کے ڈراموں اور سنگیت کی تقریبات منعقد کرنے کے سوال پر بھی غور و خوض کیا۔

ٹیگور کی یادگار تعمیر کرنے کے سلسلہ میں کمیٹی نے سفارش کی کہ چندہ کے لئے عوام سے اپیل کی جائے۔ اپیل کا مسودہ کمیٹی کے آئندہ جلسہ میں پیش کیا جائے گا۔

کمیٹی نے ٹیگور کے ڈراموں اور موسیقی کی تقریبات منعقد کرنے کے سلسلہ میں مالی دشواریوں اور دیگر مسائل کی جانچ کیلئے سات ممبران پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل کی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات شری بھگوتی شرن سنگھ اس کمیٹی کے کنوینر ہوں گے۔

✡

نیند

بسلسلہ صفحہ ۴۲

متواتر کوشش سے آپ کو یہ عمل بڑا آسان اور دلچسپ معلوم ہونے لگے گا۔ آپ حسب مرضی جب چاہیں گے اعضا میں پہلے تناؤ پھر سختی اور پھر ایکبارگی ڈھیلا پن پیدا کرسکیں گے۔ اس میں مہارت پیدا کرلینے کے بعد نیند آپکے قابو میں ہوگی۔

سونے سے کچھ ہی دیر قبل کوئی ٹھوس غذا نہ استعمال کرنا چاہیے کیونکہ نیند کی وجہ سے آنتوں کی حرکت دودیہ (آنتوں کی ایک حرکت جس سے غذا آگے کی جانب بڑھتی ہے) سست ہوجاتی ہے اور اس وجہ سے ہضم میں خلل واقع ہوا کرتا ہے۔ اگر آپ کا معدہ قبول کرسکے تو کسی مشروب کا استعمال کیجئے (لیکن اس بات کا خیال ضروری ہو کہ مشروب، محرک قطعی نہ ہو) یہ اچھی نیند آنے میں معاون ہوسکتا ہے۔

بستر بھی آپ اپنے جسم کی ساخت کے مطابق منتخب کریں تو بہتر ہو۔ یوں تو سخت بستر پر ہی سونا مناسب ہے مگر دبلے پتلے اور اعصابی قسم کے حضرات کو ملائم ہی بستر استعمال کرنا چاہئے۔ تکیے زیادہ اونچے نہ ہوں۔ اونچا تکیہ سر کو طبعی حالت میں نہیں رہنے دیتا جس سے دماغ اور نخاع کے دوران خون میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اگر آپ اونچے تکیے کے عادی ہیں تو بتدریج اس عادت کو چھوڑیئے۔ پہلے اس سے نیچا پھر اور نیچا تکیہ استعمال کیجئے۔ اگر آپ کئی کئی تکئے سر کے نیچے رکھ کر سونے کے عادی ہیں تو ان کی تعداد رفتہ رفتہ گھٹایئے، یہاں تک کہ صرف ایک تکیہ سر کے نیچے رکھئے۔

✡

تپ دق کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

ذیل کے سوالوں اور اُن کے جوابوں کو پڑھیئے

۱۔ تپ دق کیسے ہوتی ہے؟
۱۔ تپ دق ایک جرثومے سے ہوتی ہے۔

۲۔ کیا تپ دق 'چھوت' سے ہو سکتی ہے؟
۲۔ ہاں، تپ دق 'چھوت' کی بیماری ہے۔

۳۔ کیا آپکو تپ دق والدین سے ورثہ میں مل سکتی ہے؟
۳۔ نہیں، آپ کو تپ دق اپنے والدین سے ورثہ میں نہیں ملتی۔

۴۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپکو تپ دق ہو لیکن مریض ہونے کا احساس نہ ہو؟
۴۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو تپ دق ہو اور بیمار ہونے کا احساس نہ ہو۔

۵۔ ڈاکٹر کیونکر بتا سکتے ہیں کہ آپ کو تپ دق ہے یا نہیں ہے؟
۵۔ ڈاکٹر ایکسرے اور دیگر طریقہ سے جانچ کر کے بتا سکتے ہیں کہ آپکو دق ہے۔

۶۔ کیا تپ دق کا مریض اچھا ہو سکتا ہے؟
۶۔ ہاں، اگر ابتدا ہی میں اس بیماری کا پتہ چل جائے اور معقول علاج ہو تو تپ دق کا مریض بالعموم اچھا ہو سکتا ہے۔

۷۔ کیا مریضوں کا علاج خود ان کے گھروں پر بھی ہو سکتا ہے؟
۷۔ ہاں، یہ ممکن ہے اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔ اسے "گھریلو" علاج کہتے ہیں۔ گھر پر رہ کر علاج کسی ٹی۔بی کلینک کی مدد سے جاری رکھا جا سکتا ہے۔

مزید صلاح و مشورے کے لئے اپنے ڈاکٹر سے رجوع کیجئے

بہترین جگہ ٹی۔بی کلینک ہے جہاں آپ کو مناسب صلاح و مشورہ حاصل ہو سکتا ہے۔

ٹی۔بی سیل خرید کر تپ دق سے لڑنے میں مدد دیجئے

ایک ٹی۔بی سیل کی قیمت صرف ۱۰ نئے پیسے ہے

ٹی۔بی سیل حسب ذیل جگہوں پر مل سکتی ہیں:-

۱۔ دی آنریری سکریٹری، اتر پردیش ٹیوبر کلوسس اسوسی ایشن، ۱۲ اے۔پی سین روڈ، لکھنؤ۔
۲۔ اُتر پردیش کے ہر ضلع میں سیل فروخت کمیٹی سے۔
۳۔ اُتر پردیش کے ہر ضلع میں میونسپل اور / یا ضلع میڈیکل افسر ہلتھ سے۔

اشتہار ہذا کی یہ جگہ ہدیہ منجانب

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات حکومت اُتر پردیش لکھنؤ

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۱۰

پوش ۱۸۸۱

جنوری ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر

صباح الدین عمر

پبلشر

بھگوتی شرن سنگھ

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر

ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

اپنی بات

تقویم عیسوی کا ایک اور سال گذر گیا اور جنوری سے ہم ۱۹۶۰ء میں قدم رکھ رہے ہیں۔ سال ۱۹۵۹ء دنیا کے لئے اس لحاظ سے اہم تھا کہ دو بڑی طاقتوں، روس اور امریکہ میں جو سرد جنگ جاری تھی وہ ایک حد تک ختم ہو گئی اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ روسی اور امریکی گروہوں میں جو کشیدگی پائی جاتی ہے وہ شاید رفتہ رفتہ دور ہو جائے۔ سرد جنگ میں کمی کا باعث صدر امریکہ، آئزن ہوور اور وزیر اعظم روس، خروشچیف کی ملاقات ہے۔ اس ملاقات کا کوئی اور نتیجہ چاہے نہ نکلا ہو لیکن اتنا تو ضرور ہوا کہ اس نے مزید ملاقات اور مزید گفت و شنید کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ سال کے آخر میں صدر امریکہ، وزیر اعظم برطانیہ اور وزیر اعظم فرانس نے یہ طے کیا کہ روس کے وزیر اعظم کو باہمی گفت و شنید کے لئے پیرس مدعو کیا جائے۔ وزیر اعظم روس نے اس دعوت نامہ کو منظور کر لیا ہے اور وسط مئی ۱۹۶۰ء میں یہ "چار بڑے" دنیا میں قیام امن کی گفتگو کرنے کے لئے ایک جگہ جمع ہوں گے۔ توقع ہے کہ یہ ملاقات نتیجہ بخش ثابت ہوگی اور دنیا اس وقت جنگ کے جن خطرات سے دو چار ہے ان سے نجات پا جائے گی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، ۱۹۵۹ء اس کے لئے بھی خاص طور سے بڑی سیاسی اہمیت کا سال تھا۔ ایک اہم واقعہ تبت کا سیاسی خلفشار اور ہندوستان میں تبت کے روحانی پیشوا دلائی لاما کی آمد تھی۔ انھوں نے حکومت ہند سے یہاں قیام کرنے کے لئے پناہ مانگی اور ہندوستان کی حکومت نے بین الاقوامی قوانین کے ماتحت انھیں ہندوستان میں رہنے کی اجازت دے دی مگر یہ شرط بھی عائد کر دی کہ وہ یہاں رہ کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم وہ صورت حال ہے جو ہندوستان کے خلاف چین کی سرگرمیوں سے پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی ابتدا تو بہت پہلے سے ہو چکی تھی لیکن حالات نے سنگین صورت ۱۹۵۹ء ہی میں اختیار کی۔ ہوا یہ کہ چین نے لداخ (کشمیر) اور ہندوستان کے شمالی مشرقی حصہ میں کچھ ایسے علاقوں پر تصرف کر لیا جو اگرچہ برفانی اور غیر آباد تھے لیکن تھے بہر حال ہندوستان کی سرحد کے اندر۔ ہندوستان نے جب چین کی حکومت سے اس پر احتجاج کیا تو وزیر اعظم چین نے جواب دیا کہ دونوں ملکوں کے سپاہی اپنی اپنی جگہوں سے چند میل پیچھے ہٹ جائیں اور پھر ان علاقوں کے بارے میں باہمی گفت و شنید کے بعد یہ طے کر لیا جائے کہ وہ علاقے کس کی ملکیت ہیں۔ وزیر اعظم ہند نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ ساری تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان علاقوں پر کبھی چین کا بھی قبضہ رہا ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے خطے میک موہن لائن کے (جو برطانیہ اور چین کے ایک سمجھوتہ کے ماتحت ہندوستان کی طے شدہ سرحد ہے) کے جنوب میں واقع ہیں۔ اس لئے چین پہلے میک موہن لائن کو حد بندی تسلیم کر کے سارے علاقوں کا تخلیہ کر دے اور اس کے بعد گفت و شنید کی جائے تاکہ اس گفتگو سے کوئی کار آمد نتیجہ نکل سکے۔ تجویز معقول تھی اور خیال تھا کہ چین اسے منظور کر لے گا مگر وزیر اعظم چین نے اپنے جواب میں میک موہن لائن ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ میں وزیر اعظم نہرو سے اس مسئلہ پر ۲۶ دسمبر ۱۹۵۹ء کو چین یا برما میں گفتگو کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب چین اصولی باتیں ہی ماننے کے لئے تیار نہ تھا تو گفتگو کرنا بے سود تھی۔ اس موقع پر ہندوستان میں بعض حلقوں کی طرف سے کہا گیا کہ چین کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی کو ختم کر دے۔ ان حلقوں کا یہ مشورہ صحیح نہ تھا۔ اس مشورہ میں جذبات کی زیادہ کار فرمائی تھی اور حقیقت پسندی سے گریز تھا۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو نے جنگ کے ان حامیوں کو سمجھایا کہ چین کے غلط رویہ کے باوجود غیر جانبداری کی پالیسی بنیادی طور پر صحیح پالیسی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مسئلہ اہم ضرور ہے پھر بھی ہمیں ایسا کوئی کام نہ کرنا چاہیئے جس سے جنگ کی فضا پیدا ہو جائے کیونکہ ہندوستان اور چین کی یہ جنگ خطرناک حد تک بری ثابت ہوگی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ یہ مسئلہ ہمارے لئے سب سے بڑا چیلنج ہے اور ہندوستانی عوام کو یہ یقین دلایا کہ جب یہ چیلنج ہمارے سامنے آئے گا تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں گے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ کہہ کر ہندوستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کر دی ہے اور اب یہ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ وطن کی محافظت کے لئے بوقت ضرورت ہر قربانی پر آمادہ رہے اور یہ سمجھ لے کہ اگر دو عظیم ملکوں میں خدانخواستہ جنگ چھڑ گئی تو پھر وہ جنگ صرف سرحد پر نہ لڑی جائے گی بلکہ ہر کھیت، ہر کارخانہ اور ہر اسکول اور کالج اس سے متاثر ہوگا۔ نیا دور کے اگلے صفحات میں پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک تقریر شائع کی جا رہی ہے جس سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑے گی۔

پہلی جنوری ۱۹۶۰ء کو اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند کی سترویں سالگرہ ہے۔ ڈاکٹر سمپورنانند جنگ آزادی کے ایک مجاہد، ہندوستان کے ایک تجربہ کار سیاست داں اور اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ایک زبردست مفکر اور ایک بلند پایہ ادیب اور سائنس داں بھی ہیں اور علم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں تک ان کی دوربین نگاہیں نہ پہنچی ہوں۔ وہ انگریزی اور ہندی کی کتابوں کے مصنف اور سنسکرت کے ماہر ہونے کے علاوہ فارسی اور اردو سے بھی اچھی واقفیت رکھتے ہیں اور "نیا دور" ایک مرتبہ ان کی ایک غزل انھیں کی تحریر میں شائع کرنے کا شرف حاصل کر چکا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہم اس موقع پر زیر نظر شمارہ میں ان پر ایک مضمون شائع کر رہے ہیں۔

——— ایڈیٹر

ہندوستان اور چین کے تعلقات

جواہر لال نہرو

میں آپ کا اور ایوان کے معزز ممبران کا اس بحث کے لئے شکرگزار ہوں جو پچھلے دو دنوں سے جاری ہے:۔

اس بحث کے دوران میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں اور بہت سی نکتہ چینیاں کی گئی ہیں لیکن یہ بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ ہمارے سامنے جو بڑے مسائل ہیں اس سے اس ایوان میں عام طور سے سبھوں کو اتفاق ہے۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی جب اچاریہ کرپلانی نے ہم پر یہ الزام لگایا کہ ہم اس معاملے کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں اور اسے ایک معمولی واقعہ سمجھتے ہیں۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم نے چاہے دوسری غلطیاں کی ہوں لیکن اس واقعہ کو معمولی واقعہ کبھی نہیں سمجھا ہے۔ ہم نے غالباً اس واقعہ کو اچاریہ کرپلانی سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے کیونکہ ہمیں بڑی سنجیدگی سے اس کے نتائج پر غور کرنا ہے۔ جیسے یہ مسئلہ ہمیں کس طرف لئے جا رہا ہے اور یہ کہ صرف آج نہیں بلکہ آنے والے مہینوں اور برسوں میں کیا ہو سکتا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت میرے سامنے تاریخ کا وہ نازک ترین لمحہ آگیا ہے جب کسی سمت میں ایسا قدم اٹھانا ہی ہوگا جس کے شدید اور دور رس اثرات صرف ہمارے ملک پر ہی نہیں بلکہ ایشیا حتیٰ کہ دنیا پر بھی پڑیں گے۔

ہم نے جس معاملے پر غور کیا وہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ میں انھیں یقین دلا سکتا ہوں کہ ہم نے اس مسئلے پر کبھی سرسری طور پر غور نہیں کیا ہے۔ ہم نے ہندوستان میں ہونے والی ترقیوں پنج سالہ منصوبوں اور اس طرح کی دوسری تمام باتوں کے دور رس اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مسئلے پر سوچ بچار کیا ہے۔ اس مسئلے پر غور کرتے وقت یہ تمام باتیں ہمارے اور ہمارے ساتھیوں کے سامنے تھیں۔ اس لئے یہ بات بالکل صاف ہونی چاہیئے کہ آج ہمارے سامنے کوئی معمولی یا سرسری واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا معاملہ ہے جو ہندستان اور ایشیا کے حال اور مستقبل کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

غیر جانبداری۔ دوسری بات جو مجھے اچھی لگی وہ یہ کہ ہماری غیر جانبداری کی پالیسی سے تقریباً سب کو اتفاق ہے۔ کچھ ممبروں نے شاید اس پالیسی کی توثیق کچھ جھجک اور ہچکچاہٹ کے ساتھ کی ہو اور اپنے ذہن میں کوئی بات رکھ کر کی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک یا دو ممبروں کو چھوڑ کر اس ایوان کے ہر ممبر نے خواہ ان کا تعلق کسی پارٹی سے ہو اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہمارے لئے سوائے غیر جانبداری کی پالیسی کے اور کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔

وہ لوگ بھی جو اس پالیسی کے بارے میں کچھ شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں، کچھ غلط فہمیوں سے دوچار نظر آتے ہیں۔ جب وہ پنج شیل ’پانچ اصول‘ کے بارے میں باتیں کرتے ہیں تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان حالیہ واقعات کو بھول جائینگے یا ان سے چشم پوشی کریں گے اور چینی حکومت سے اب بھی بہت سے معاملوں میں تعاون کریں گے اور عام طور سے پرانے تعلقات کو باقی رکھیں گے۔ لیکن یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خواہ کچھ ہو غیر جانبداری اور دوستانہ تعلقات رکھنے کی پالیسی ہر حالت میں بنیادی طور پر ایک صحیح پالیسی ہے۔ لیکن اگر یہ دونوں ملک الجھ پڑیں یا حتیٰ کہ لڑائی کی نوبت آجائے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ پالیسی

لوک سبھا میں ہند و چین کے تعلقات پر دو روز تک بحث ہوئی۔ وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو نے ۲۰ نومبر ۱۹۵۹ء کو اس کا جواب دیا۔

ان پر لاگو نہیں ہوگی یہ کہنا کہ یہ پالیسی لاگو رہے گی بالکل مضحکہ خیز ہے ! اگر امن ختم ہو جاتا تو جس حد تک ہم کر سکتے ہیں اس صورت حال کا مقابلہ کریں گے لیکن اس کے باوجود اس پالیسی کی اچھائی ہر وقت باقی رہے گی اور دنیا کے بقیہ ملکوں کے ساتھ اسی کے مطابق تعلقات رکھے جائیں گے اور بعد میں اس ملک کے ساتھ بھی اسی پالیسی کے مطابق تعلقات رکھے جائینگے کیونکہ جنگ بری چیز ضرور ہے کوئی مستقل چیز نہیں ۔

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری سرحدوں پر اور دوسری جگہوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے کوئی بہت بڑا فرق نہیں پڑا ہے ۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس سے نہ صرف حکومت اور چین سے ہمارے موجودہ تعلقات میں بہت بڑا فرق پڑا ہے بلکہ یہ آئندہ واقعات پر بھی اثر انداز ہوں گے۔ ہمارے ملک میں وسیع طور پر اور شدید ردعمل پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات بالکل صاف ظاہر ہے۔ اس کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں پرائمری اسکول کے چھوٹے سے بچے سے لے کر ایک جوان آدمی تک سبھوں پر اس کا شدید ردعمل ہوا ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ میں نے لوگوں سے پرسکون رہنے کی اپیل کی ہے لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ اس ردعمل پر مجھے فخر ہے ۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ ردعمل غلط سمت میں لے جائے کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ آپ اس خیال میں کہ ہم کچھ کر رہے ہیں غیر ضروری اور نامناسب سرگرمیوں میں پھنس کر اپنی قوت اور توانائی نہ کھو بیٹھیں ۔ میرے خیال میں یہ مسئلہ بہت نازک ہے ہم اس وقت تاریخ کے موڑ پر ہیں ۔ کیا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ طلبا کے مظاہرے منظم کر کے یا پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے جلوس لاکر اور جھنڈے ہلا کر اس مسئلے کو حل کر رہے ہیں ؟ اس کا کوئی فائدہ نہیں ۔ اس سے اس مسئلے کی اہمیت کم ہوتی ہے ۔ اگر ہمارے سامنے یہ بات بالکل صاف ہے اور درحقیقت ہم یہی محسوس کرتے ہیں کہ لڑائی ضروری ہے تو ہمیں ملک کے کروڑوں انسانوں کو بدلنا ہوگا ۔ یہ سوال صرف فوج کی تعداد میں اضافے کا نہیں ہے ۔ یہ تو معمولی باتیں ہیں ۔ اگر یہ افسوسناک بات ہو جائے تو ہمیں اس کا مقابلہ کرنا ہوگا اور پوری قوم کو ہتھیار اٹھا لینا ہوگا ۔ اس سلسلے میں کوئی شک وشبہ نہ رہنا چاہیئے لیکن ہم یہ کام کسی معمولی طریقے سے نہیں کریں گے ۔ ہماری ہر سرگرمی، ہمارا ہر کام جیسے پلاننگ وغیرہ اس اہم مسئلے کا تابع ہوگا کیونکہ یہ زندگی اور موت کی کشمکش ہوگی ۔ ایک معزز ممبر نے کہا ہے اور مجھے وہ اس تذکرے کے لئے معاف فرمائیں کہ "ہم اس علاقے میں جائیں اور اس پر قبضہ کرلیں اور انھیں نکال باہر کریں ۔" یہ بات اتنی معمولی نہیں ہے ۔ مجھے تعجب ہے کہ لوگ ایسی باتوں کو کس طرح اتنے سرسری طریقے سے سوچتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں ۔

اس لئے آچاریہ کرپلانی کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نے اس مسئلے پر سرسری طرح سے غور نہیں کیا ہے اور چونکہ یہ مسئلہ ہم سب کے لئے اور مستقبل کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ہم نے اس پر اتنی زیادہ توجہ کی ہے۔ اگر دو دیو قامت ملکوں، ایشیا کے سب سے بڑے دو ملکوں میں تصادم ہو جائے تو اس سے پورا ایشیا اور پوری دنیا بدل جائے گی ۔ یہ ایک معمولی سرحدی مسئلہ نہیں ہے جس کے بارے میں ہم اس قدر پریشان ہیں ۔ یقیناً ہمیں سرحدی واقعات سے بھی تشویش ہے، لیکن ہمارے سامنے جو مسائل ہیں وہ اتنے بڑے مبہم، گہرے، دوررس اور خلط ملط ہیں کہ ان تمام باتوں کے بارے میں پوری دانائی اور ہوش مندی کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے ایسا نہ ہو کہ جذبات کی رو میں بہہ کر ہم وہ کام کر جائیں جس سے بجائے فائدے کے نقصان ہو ۔ یہ تمام باتیں قابل غور ہیں ۔ ہم نے اپنی محدود عقل کے مطابق خواہ وہ جس حد تک محدود نہ ہو، ان باتوں پر غور کرنے کی کوشش کی ہے ۔

یہ باتیں اتنی بڑی ہیں کہ کوئی وزیر اعظم یا کوئی حکومت اس سے اکیلے نہیں نپٹ سکتی ہم لوگ معمولی آدمی ہیں اور ہمارے سامنے بڑے بڑے مسائل ہیں اور ہمیں بڑے اہم فیصلے کرنے ہیں ۔ ہم لوگ پارلیمنٹ اور عوام کی مکمل حمایت کے بغیر تقریباً کچھ نہیں کر سکتے ۔ مجھے یقین ہے کہ یہ حمایت مجھے حاصل ہے اور حاصل رہے گی ۔

متحدہ کوشش دو دن پہلے جب میں نے اس ایوان سے متحدہ کوشش کی اپیل کی تھی تو میں نے اس کے بہت گہرے معنی لئے تھے ۔ جو تقریریں ادھر ادھر کی گئی ہیں اس کا کوئی خیال نہیں کرتا حالانکہ یہ رائے عامہ کو متاثر کرتی ہیں اور باہری دنیا پر یہ اثر ہوتا ہے کہ ہم متحد نہیں ہیں، ہم آپس میں جھگڑ رہے ہیں اور ہم کمزور ہیں ۔ اس سے ہمارے عوام اور باہری دنیا دونوں پر برا اثر پڑے گا ۔ اس سے مغالطہ ہو جاتا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس طرح کے

مسئلے پر ہندوستان متحد رہے گا اور خطرے کے وقت کوئی اس اتحاد کو نہیں توڑ سکتا۔ آپ لوگ میری اس صاف گوئی پر مجھے معاف فرمائیں لیکن اگر یہ ایوان یہ سوچتا ہے کہ ہماری حکومت اس خاص کام کو تسلی بخش طریقے سے نہیں کر رہی ہے تو بلاشبہ یہ ایوان زیادہ قابل لوگوں کا انتخاب کر سکتا ہے جن میں اس ایوان کو اعتماد ہو اور ملک کو اعتماد ہو۔ بحران کے وقت ذاتی لحاظ اور مروت سے کام نہیں لیا جا سکتا ہے لیکن اگر آپ کی سمجھ میں آئے یا اگر آپ اس نتیجے پہ پہنچیں کہ اس حکومت کو اس چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے یا اس وزیر اعظم کو ان باتوں کا سامنا کرنا ہے تو اس کا ساتھ دیجئے اور اس کی مدد کیجئے اور اُس کے راستے میں نہ آیئے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی نکتہ چینی نہ ہو، نکتہ چینی ہونی چاہیئے۔ لیکن یہاں صرف نکتہ چینیاں ہی کی جا رہی ہیں۔ بحران کے زمانہ میں کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیئے جس سے مخالف یا دشمن کی ہمت افزائی ہو۔ ہمیں مستعد رہنا چاہیئے۔ ہمارے عوام اور خصوصاً اس ایوان کو چوکنا اور مستعد رہنا چاہیئے تاکہ وہ غلطیوں پر ٹوکیں اور انھیں درست کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی حکومت کو اور خصوصاً اس حکومت کو جس کے سربراہ ہونے کا مجھے فخر حاصل ہے ہر لحاظ سے عقل مند سمجھ لیا جائے۔ ہم یقیناً ایسے نہیں ہیں کہ ہم سے کوئی غلطی ہی نہ ہو۔ ہم بالکل عام انسان ہیں جنھیں بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بعض اوقات بڑے مسائل کے تعلق سے ہی آدمی بڑا بن جاتا ہے۔ جیسے ہم میں سے بہت سے لوگ گذشتہ دنوں میں بڑے بن گئے کیونکہ ان کا تعلق ہندوستان کی آزادی کی لڑائی سے تھا۔ گو کہ ہم سب معمولی انسان تھے لیکن ہم اس وجہ سے بڑے ہو گئے کہ ہمارا تعلق ان عظیم معاملات سے رہا۔

اب اس وقت بھی وہ بڑے واقعات ہمیں للکار رہے ہیں اور اگر آپ لوگوں کی خوشی اور مرضی اس میں ہے کہ جس حیثیت سے میں کام کر رہا ہوں اس حیثیت سے کام کئے جاؤں تو میں اس ذمہ داری کو نبھانے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا بلکہ اپنی پوری طاقت اور قابلیت کے ساتھ اس حیثیت میں کام کرتا رہوں گا لیکن اس مقصد کے لئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی خواہش کا آلۂ کار بنوں تو اس آلے کو کند نہ کیجئے بلکہ اسے اس کام کے لئے تیز کیجئے جو آپ اس سے لینا چاہتے ہیں۔

میانہ روی۔ ہمیں اس مسئلے پر ان تمام پیچیدگیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے غور کرنا ہو گا جس کا حوالہ اس مباحثہ میں دیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی پیچیدگیاں ہیں آخری تجزیے کے طور پر آپ کو یہ غور کرنا ہو گا کہ یہ مسئلہ ہمارے لئے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ یہ ایک ایسا چیلنج ہے جو تاریخ کو بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔ ہمیں لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ایسے خطرناک مسئلے کی موجودگی میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کی جا سکتی اس لئے ہمیں ایسی باتیں نہ کہنی چاہئیں کہ کیسے وہاں جا کر انھیں دھکے دے کر نکال دیں گے۔ نہ چین چھوٹا ملک ہے اور نہ ہندوستان۔ دونوں بڑے اور قدیم ملک ہیں اور غالباً مختلف حیثیت سے مضبوط ملک بھی ہیں چین کی حکومت کے لئے یہ سوچنا بلکہ مضحکہ خیز ہو گا کہ وہ ہندوستان پر قبضہ کرلے گی یا کچل دے گی۔ اسی طرح یہ بات بالکل لغو ہو گی اگر ہندوستان میں کوئی آدمی سوچے کہ وہ چین پر قبضہ کرلے گا یا اس کو کچل ڈالے گا۔ اگر یہ بدترین سانحہ ونما ہی ہو جائے اور ان دو عظیم ملکوں میں جنگ چھڑ جائے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کہ ایک ملک کے پاس کچھ زیادہ بندوقیں ہیں یا بڑی فوج ہے۔ فوجی لحاظ سے اس کی اہمیت ہو سکتی ہے لیکن بنیادی طور پر جب یہ دو بڑے ملک زندگی اور موت کی جنگ میں مصروف ہو جائیں گے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام کیا ہو گا۔ یقیناً ہندوستان کی ہار نہیں ہو گی۔ سرحدوں پر ادھر اُدھر کچھ ہو سکتا ہے ہم مانتے ہیں۔ ہم اس مسئلے کا سامنا اس طرح کر رہے ہیں جس طرح سے ہم اچھا سمجھتے ہیں اور یہ بعید امکان ہمارے سامنے رہتا ہے کہ نہ جانے کیا ہو جائے اور پھر ہم کس طرح اس کا سامنا کریں گے۔ اس لئے یہ بہت ہی بڑا مسئلہ ہے۔ بہر حال میں کہتا ہوں کہ مسئلہ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ہمیں کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہیئے جس سے جنگ کی فضا پیدا ہو جائے یا اس کی ہمت افزائی ہو کیونکہ ہمیں اس کا پورا احساس ہونا چاہیئے کہ ہندوستان اور چین کا یہ ٹکراؤ، یہ جنگ بری ہو گی، خطرناک حد تک بری ہو گی، ہمارے لئے، چین کے لئے، ایشیا اور دنیا کے لئے بدترین ٹریجڈی ہو گی۔ اس لئے ہمیں اس مسئلے کو معمولی نہ سمجھنا چاہیئے۔ ہمیں ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا چاہیئے جو ہمیں خود بخود جنگ کی طرف ڈھکیل دے۔

یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ جب چیلنج ہمارے

سامنے آئے گا تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ ہمیں چوکس اور تیار رہنا ہوگا اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ہم کرسکتے ہیں۔ اس تصویر کے دو رُخ ہیں اور ہمیں انتہا پسندی سے بچ کر درمیانہ راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

سرحدی علاقوں کو ترقی دینے اور بہتر بنانے کے جو مشورے اور تجویزیں پیش کی گئی ہیں میں ان پر بحث نہیں کروں گا۔ بعض مشوروں پر مجھے تعجب ہوا۔ ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ نے کہا ہے کہ ہمیں نیفا، لداخ کے علاقے، آسام اور لاہول میں صنعتیں قائم کرنی چاہیئں۔

ڈاکٹر رام سبھاگ سنگھ کی یہ بات بڑی اچھی ہے لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہمیں ہندوستان کے محدود ذرائع کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ ہمیں یہاں صنعتیں قائم کرنی ہیں۔ ہمیں پہلے ہندوستان میں صنعتیں قائم کرنی ہیں قبل اس کے کہ ہم اس مقصد کے لئے ہمالیہ کے پار جائیں۔ اس سے ہمارے معزز ساتھیوں کے جوش و خروش کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے جوش میں زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یہ بات مدد پہونچانے والی نہیں ہے۔

بارا ہوتی۔ ہم پر یہ الزام لگایا گیا ہے "آپ نے بارا ہوتی کیوں خالی کیا۔ گذشتہ ستمبر میں آپ نے ایک بیان دیا اور نومبر میں آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے خالی کر دیا۔" میں اس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل تو یہ کہ ہم ہر سال جاڑوں میں بارا ہوتی خالی کر دیتے تھے، کیونکہ جاڑوں میں وہاں رہا نہیں جا سکتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں رہنا ناممکن ہے۔ رہنے کا امکان ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو کوئی بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی میں بھی جایا جا سکتا ہے لیکن ہم نے وہ جگہ خالی کر دی اور چین نے بھی کر دی۔ کیونکہ سال میں تقریباً ۵ مہینے وہاں نہیں ٹھہرا جا سکتا۔ دوسرے مہینوں میں بھی بارا ہوتی کو جانے والے راستے نہ صرف ہندوستان بلکہ چین کی طرف سے بھی بڑے دشوار گزار رہتے ہیں۔ جن اونچے اونچے دروں سے بارا ہوتی کو راستہ جاتا ہے وہ بند ہو جاتے ہیں۔ کوئی آدمی تکلیف اٹھا کر یقیناً وہاں رہ سکتا ہے لیکن وہ سال میں سات مہینے تک ہندوستان آ اور جا نہیں سکتا جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اگر کوئی خطرہ درپیش ہو اور ضرورت پڑے تو آدمی کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔ لیکن سات مہینوں تک ہندوستان سے کٹ کر وہاں رہنے یا اپنے آدمیوں کو وہاں رکھنے کا خیال مجھے بالکل ضروری نہیں معلوم ہوتا یا ایسی بات نظر نہیں آتی جو ہندوستان کے وقار، مفاد یا دفاع کے نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہو۔

اس کے علاوہ دو تین سال پہلے ہم نے خصوصاً اس معاملے کے بارے میں چینی حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا اور وہ اس بات پر رضامند ہو گئی تھی کہ وہ اپنی کوئی مسلح فوج وہاں نہیں رکھے گی اور ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔ آپ کہہ سکتے ہیں "آپ نے ایسا سمجھوتہ کیوں کیا؟" مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے متفق نہ ہوں گا۔ جب کوئی جھگڑا پیش آئے جیسا کہ دو ملکوں میں بہت سے جھگڑے رہتے ہیں تو ہمیشہ ان پر بات چیت کی جاتی ہے اور کچھ فیصلے کئے جاتے ہیں۔ میں وسیع پیمانے پر سرحدی جھگڑوں یا پہاڑی علاقوں پر حملے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس لئے ہم نے ان سے طے کر لیا کہ ہم میں سے کوئی وہاں مسلح فوج نہیں بھیجے گا۔ گذشتہ دو تین سال سے ہم دونوں اپنے اس عہد پر قائم رہے۔ گرمیوں میں ہمارے آدمی وہاں جاتے ہیں۔ ہم نے ایسی کوئی بات طے نہیں کی ہے کہ ہم وہ جگہ خالی کریں گے یا نہیں کریں گے۔ بلکہ حالات نے ہمیں اس کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ وہ چلے گئے اور ہم بھی چلے آئے۔ اس طرح ہم اپنے غیر فوجی کارکنوں کو وہاں بھیجتے رہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سول افسران وہاں کوئی انتظامی کام کرتے ہیں۔ لیکن یقیناً وہ وہاں موجود ہیں اور موجود رہیں گے۔

میرا خیال ہے کہ ان باتوں کو بہت زیادہ اہمیت دینے اور ان کے بارے میں جذباتی ہونے سے ہمارے ذہن میں جو تصویریں ہیں ان کے خد و خال بگڑ جاتے ہیں۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہم اس بڑے مسئلے کو اس طریقے سے حل کرنے جا رہے ہیں جیسا کہ پہلے ہوتا آیا ہے اگر دو آدمیوں میں کسی کی مونچھ کچھ لمبی یا چھوٹی ہو یا کسی کی کچھ اونچی یا نیچی ہو تو وہ لڑ جا سکتے ہیں۔ ایسے نازک قومی مسائل کے بارے میں ایسا رویہ نہیں اختیار کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کا رویہ۔ بعض معزز ممبروں نے پاکستان سے مشترکہ دفاع کا مشورہ دیا ہے۔ میں اس معاملے پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں اس ایوان کو صدر ایوب خان کا وہ بیان یاد دلاؤں گا جو ابھی دو دن پہلے انھوں نے دیا ہے جب ان سے اس خط کے بارے میں پوچھا گیا جو میں نے وزیراعظم چو این لائی کو لکھا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ پاکستان اس سے متفق نہیں ہے کیونکہ اس کا لداخ پر دعویٰ ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزیراعظم چو این لائی کو مشورے دینا

ان کا کام نہیں اور یہ کہ وہ میرے خط کو نہیں مانتے۔ میں اس بات کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میں صرف اس بات کا اشارہ کر رہا ہوں کہ مشترکہ دفاع کے سوال میں بہت سی مشکلات حائل ہیں لیکن لوگ ان مشکلوں کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے۔

محدود جنگ کے بارے میں بھی باتیں کہی گئی ہیں۔ گذشتہ برسوں میں ہم نے کم از کم دو محدود جنگیں ضرور دیکھی ہیں۔ ایک کوریا اور دوسری ہند چین میں ہوئی تھی۔ بڑے اور طاقتور ملک ان لڑائیوں میں شریک تھے۔ برسوں تک جاری رہنے کے بعد جزوی سمجھوتہ یا صلح ہو سکی۔ مکمل صلح نہ ہو سکی اور مشکلات جاری رہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسی جنگ ہوئی جس میں بڑی بڑی قومیں شریک تھیں۔ بالآخر حالات کی مجبوری سے انھیں کچھ سمجھوتے کرنے پڑے جو دونوں کے لئے تشفی بخش نہیں تھے کیونکہ وہ بڑی قومیں تھیں۔ میں اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ ہمیں اس واقعہ پر سرسری نگاہ نہیں ڈالنی چاہئے لیکن شیخی نہیں بگھارنی چاہئے اور لمبی چوڑی باتیں بھی نہیں کرنی چاہئیں لیکن اسکے باوجود ہمیں مضبوطی اور ثابت قدمی سے کام لینا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بڑے زور سے چلانا چاہئے تاکہ ہماری آواز سنی جا سکے۔ یہ عمل اور ثابت قدمی ہے جس کی اہمیت ہے۔ زور زور سے اور بار بار اس بات کے احساس دلانے کی ضرورت نہیں کہ ہم کیا محسوس کرتے ہیں حالانکہ ضرورت کے وقت ایسا بھی کرنا ہوتا ہے۔

چین کا دھوکہ۔ لوگوں میں ایک دوسری غلط فہمی بھی موجود ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم لداخ میں ایک ایسا علاقہ بنا رہے ہیں جو کسی کا نہیں ہے اور اس طرح چین نے جو وہاں کی سرحد پر دعویٰ کر رکھا ہے اس کا اقرار کر رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے کوئی بھی اقرار نہیں کیا ہے یہ بالکل ظاہر ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہم اُن سے وہی بات کہہ رہے ہیں جو اس ایوان کے ہر ممبر کی خواہش ہے یعنی یہ کہ وہ ہندوستانی علاقہ خالی کر دیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم یہ مطالبہ بڑی نرمی، بڑے اخلاق اور اس طریقے سے کر رہے ہیں جو دونوں ملکوں کے لئے باعزت ہو۔ اس کام کا صرف یہی طریقہ ہے نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا مقصد انھیں سوائے تعطل یا جنگ کے کوئی اور کام کرنے دینے کا نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ یہ سب کچھ فضول ہے اور جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں ہمیں کوئی گفت و شنید یا بات چیت نہیں کرنی چاہئے جب تک کہ وہ (چینی) یہ کام نہ کریں یا وہ کام نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں اور کچھ دوسرے معاملوں میں بھی چینی حکومت نے غلطی کی ہے اور اس کا رویہ بگڑ رہا ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا ہے اور ہمارے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے۔ یہ دھوکہ کسی خاص لفظ یا دستاویز کے بارے میں نہیں بلکہ عام طور پر۔

لیکن کیا آپ کسی حکومت سے اس طرح سلوک کریں گے یا آپ توقع کرتے ہیں کہ کوئی آپ کو حکم دے گا؟ اگر ایسا ہے تو آپ غلطی پر ہیں کوئی ملک پسند نہیں کرتا کہ اسے حکم دیا جائے۔ کسی بڑے ملک کو حکم دینا نہ تو حکمت عملی کا تقاضہ ہے اور نہ ہی دو ملکوں کے درمیان تعلقات رکھنے کا طریقہ ہے۔ اسلئے یہ کہنا کہ چین یہ کرے اور وہ کرے اور جھک جائے اور تب ہم مہربانی کر کے ان سے بات کرنے جائیں گے تو یہ ہونے والی بات نہیں۔ اس سے ہم خوش ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہمیں بڑی مسرت ہوگی لیکن اس قسم کی باتیں چھوٹے ملکوں کے ساتھ بھی نہیں کی جا سکتیں اور پھر ایک بڑے ملک کو جان بوجھ کر ایسی بات جسے وہ اپنی ہتک سمجھے کیسے کہی جا سکتی ہے۔ بہت کم، بہت ہی کم ملک ایسے ہیں جو اسے برداشت کریں گے قطع نظر اس کے کہ وہ صحیح راستے پر ہیں یا غلط راستے پر۔ اس لئے یا تو ہمارا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ بالکل تعطل پیدا ہو جائے اور سوائے جنگ کے اور کوئی چارہ نہ رہ جائے یا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ دروازے اور کھڑکیاں کھلی رکھیں جو ہمیں اس تعطل کو دور کرنے اور ایک ایسی فضا پیدا کرنے میں مدد دے سکیں جس سے ممکن ہے ہم اس سوال کو اپنے فائدے کے مطابق طے کر سکیں۔ یہ بہت مشکل معاملہ ہے۔ لیکن ایک بات میں بالکل قطعی اور واضح طور پر جانتا ہوں کہ تعطل کو ہمیشہ کے لئے منظور کر لینا یا کوئی ایسا مشورہ دینا جو اس تعطل کو تقویت پہنچائے اور سوائے جنگ کے اور کوئی راستہ نہ چھوڑے تو یہ ہر لحاظ سے ایک برا قدم ہوگا۔ خطرناک قدم ہوگا اور ایک بالکل ہی غلط قدم ہوگا۔

بلاشبہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کمزور بن جائیں یا منہ بھرائی کریں۔ یہ لفظ اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن میں پوری طرح سمجھ نہیں پاتا کہ لوگ اس کے کیا معنی لیتے ہیں۔ یہ ایک برا لفظ ہے جو برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جن ممبروں نے یہ لفظ استعمال کیا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گفت و شنید کی پالیسی یا ایسی کوشش کہ کوئی راستہ نکل آئے وہ منہ بھرائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں یقین ہے کہ جنگ کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ انھوں نے "جنگ" کا لفظ استعمال

کیا یہ ممکن نہیں ان کا احساس ہونا چاہیے کہ جن اقدامات کا انھوں نے مشورہ دیا ہے اگر ان پر عمل کیا گیا تو ہم لامحالہ جنگ کی طرف چلے جائینگے ہمیں دوسرے ابتدائی اقدام کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ صرف اس معاملے میں نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیں بات چیت اور ملاقات کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ جیسا کہ ہم نے پاکستان کے نمائندوں اور لیڈروں سے ملاقات کی جب کہ ہمارے تعلقات کافی کشیدہ تھے۔ میں ان سے دوبارہ ملاقات کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں ذاتی وقار کے کسی بھی احساس کو راہ میں حائل نہ ہونے دوں گا۔ اگر میں سمجھوں گا کہ کہیں بھی کسی شخص سے ملنے سے میرے ملک کو فائدہ پہنچے گا یا اس طرح امن قائم رہے گا۔

یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کی ملاقات کی خواہ کتنی ہی خواہش کیوں نہ ہو لیکن جب تک کہ یہ میٹنگ مناسب حالات اور فضا کے اندر نہ ہو اور اس کے لئے کچھ تیاری نہ کی گئی ہو اور مناسب پس منظر نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ بات چیت ناکام ہو سکتی ہے' اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہو کہ اگر کوئی میٹنگ ایسی ہو جس میں دوسرے فریق کے حکم پر چلنے کا ذرا سا بھی شائبہ ہو تو وہ بالکل غلط ہوگی۔

ایوان کو یاد ہوگا کہ مسٹر چو' این لائی نے مشورہ دیا ہے کہ جلد ہی ایک ملاقات کی جائے۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے ان سے مل کر مسرت ہوگی میرا خیال ہے کہ میٹنگ اس وقت ہو سکتی ہے جب اول یہ کہ جو تجویزیں ہم نے بھیجی ہیں انھیں منظور کر لیا جائے' جب اس ملاقات کے لئے ایک بنیاد تیار ہو جائے' جب کشیدگی ختم ہو جائے اور اس کے لئے کچھ اور دوسری تیاریاں کر لی جائیں۔ میں کوئی دیر نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس ملاقات سے بچنا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد ہو۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ کچھ زمین ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک اُلجھا ہوا مسئلہ ہے قطع نظر اس موٹی بات کے کہ معاملے میں چینیوں کا کیا رویہ رہا ہو اور میرا خیال ہے کہ اُن کا بہت بُرا رویہ رہا ہے۔ اگر آپ صرف اِدھر اُدھر کے محدود سرحدی واقعات پر ہی غور کریں تو بھی یہ بہت پیچیدہ مسئلہ نظر آئے گا کیونکہ اس کا تعلق تاریخ' روایات اور نقشے وغیرہ سے ہے۔

چین کے نقشے ۔ چینی حکومت نے حال میں ایک طرح کا اٹلس شائع کیا ہے۔ اٹلس غالباً صحیح لفظ نہیں ہوگا بلکہ اسے نقشوں کا مجموعہ کہنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دیا تین ان کے اپنے نقشے ہیں۔ دوسرے نقشے وہ ہیں جو دوسرے ملکوں سے لئے گئے ہیں جنھوں نے ان کے خیال میں کچھ حد تک ان کی مدد کی ہے۔ ان میں کچھ سیاحوں کے نقشے ہیں اور کچھ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (Encyclopaedia Britannica) کے نقشے ہیں۔ ان میں کچھ سے ان کو تھوڑا اور کچھ سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا دعویٰ بہت مضبوط ہے۔ اگر دو ملکوں میں کوئی جھگڑا ہو تو وہ بات چیت کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ دنیا کا یہ طریقہ نہ اس وقت ہے اور نہ کسی وقت رہا ہے۔ اگر آپ طاقت ور ہیں تو بلاشبہ آپ اپنے حریف کو دھکا دے کر گرا سکتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ بری بات ہوگی۔ موجودہ معاملے میں ایسی باتیں ہوئی ہیں جس سے ہمیں صدمہ پہنچا ہے۔ باراہوتی یا ایک دو دوسری جگہوں کے بارے میں بات چیت کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ سرحد کے محدود واقعات ہیں۔ اگر کوئی جھگڑا ہے تو ہمیں اس پر بات چیت کر لینی چاہیئے۔ ہمارے کئی معزز میمبروں نے باراہوتی خالی کر دینے پر بڑی گرما گرمی دکھائی ہے۔ لیکن ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو باراہوتی کے متعلق پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا غصہ بجا ہے کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ چینی یہاں وہاں جو گھس آئے ہیں اسے برداشت نہیں کرنا چاہیئے' میں اس قسم کے جذباتی ردعمل کو سمجھتا ہوں۔ مجھے باراہوتی یا ایک دو دوسری باتوں کے بارے میں بات چیت کرنے میں کوئی انکار نہیں۔ چینیوں کے آنے سے پہلے ہی ہم نے اس جھگڑے کو ورثے میں پایا تھا۔

لیکن آج جو سوال ہمارے سامنے ہے وہ بالکل مختلف ہے چاہے وہ نام نہاد میکموہن لائن ہو یا لداخ۔ کچھ باتیں وہاں ایسی ہوئی ہیں جنھیں معمولی سرحدی جھگڑا یا معمولی سرحدی خلاف ورزی نہیں کہا جا سکتا۔ چینی حکومت خواہ کچھ بھی محسوس کرے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہو چینی یک رُخے دماغ کے لوگ ہیں۔ جب ہمارے قومی مفاد کا سوال آتا ہے تو ہم بھی کچھ حد تک یک رُخے ہو جاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہو کہ دوسری قوموں کے مقابلے میں چینی زیادہ یک رُخے دماغ کے ہیں۔ انقلابی چین میں جو حالات پیدا ہوئے ہیں ان کی ہمت افزائی یا ترقی اس نیم علٰحدگی کی وجہ سے ہوئی ہو جس کا چین شکار رہا ہے۔ کیوں کہ گزشتہ دس برسوں سے اس کے تعلقات چند محدود قوموں سے رہے ہیں۔

لیکن یہ واقعات دوسری بنیاد رکھتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا سوال ہے گذشتہ دس سال سے ہم ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ اچھی طرح پیش آ رہے ہیں۔ تبت کے صلح نامے کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں۔ بار بار اور کھلم کھلا طور پر کہہ رہے ہیں کہ ہماری سرحدیں کیا ہیں۔ نقشہ موجود ہے۔ پارلیمنٹ اور دوسری جگہوں میں بھی بتا رہے ہیں کہ ہماری سرحدیں کیا ہیں تاکہ ہماری پوزیشن کو سمجھنے میں کوئی شک نہ رہ جائے۔

میں اس وقت مان لیتا ہوں کہ چینی اپنے دعوی میں یقین رکھتے ہیں اور اپنے سرحدی مطالبے کو صحیح سمجھتے ہیں لیکن وہ ہمارے نقطۂ نظر سے پوری طرح واقف تھے، اس کے باوجود انھوں نے صرف یہی کہا، ان نقشوں پر معمولی نظر ثانی یا دوبارہ غور کی ضرورت ہے۔ یا اس طرح کی کوئی بات کہی۔ اس سے یقیناً بات ختم نہیں ہو جاتی تھی لیکن اس سے موٹے طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ صرف معمولی رد و بدل کی تجویز پیش کرینگے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہ ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود یک بیک یا اگر چاہیں تو یہ کہہ لیں کہ بتدریج وہ ہمارے ان علاقوں میں گھس آئے اور ان پر قبضہ کر لیا۔ میں پوری کہانی بیان نہیں کرونگا کیوں کہ یہ ایوان اس سے واقف ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ اس ملک کے ساتھ بالکل دھوکہ دہی کی گئی ہے جس نے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کی کوشش کی۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کی جو کوشش کی ہے وہ صحیح ہی کی ہے اور یہ بات صرف ماضی کو مد نظر رکھ کر نہیں بلکہ زیادہ تر حالات مستقبل کے پیش نظر کی گئی ہے کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ مستقبل میں ایسا امکان پیدا ہو جائے کہ ایشیا کے یہ دو بڑے ملک ہمیشہ ایک دوسرے کی گردن دبانے کے درپے رہیں۔ یہ ہمارے لئے، ان کے لئے اور ایشیا کے لئے ایک بڑا مستقبل ہوگا۔

انقلاب کا بہاؤ۔ ان ساری باتوں کو ذہن میں رکھ کر ہم نے ایک خاص پالیسی پر عمل کیا۔ صف بھرائی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ ہماری پالیسی پر اعتراض کیا گیا اور اسے ناپسند کیا گیا اور ایسی باتیں کہی گئیں جو تمام پالیسیوں کے خلاف تھیں۔ ہم ایسی پالیسی میں یقین نہیں رکھتے کیوں کہ ان کی بنیاد لازمی طور سے نفرت پر ہے اور کسی مسئلے کے متعلق یہ رویہ سرد جنگ کا ہے۔ اگر آپ کو کسی دشمن سے لڑائی کرنی ہے تو جائیے اور اس دشمن سے لڑیئے اور اگر ہرا سکتے ہوں تو ہرا دیجئے لیکن براہ راست جنگ کے بجائے یہ سرد جنگ کا رویہ اور زیادہ خطرناک ہے جو فرد یا قوم اسے اپناتی ہے اسے یہ رویہ گمراہ کر دیتا ہے جیسا گاندھی جی نے کہا ہو کہ اگر آپ کے دل میں کوئی غم و غصہ ہو تو اس کا اظہار کریں اور کچھ کر ڈالیں یہ اس سے بہتر ہے کہ آپ اُسے اپنے دل میں پالتے رہیں۔

چین کیا تھا اس کے بارے میں ہم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔ شاید ہم نے یہاں موجود معزز ممبران سے زیادہ اس مسئلے پر غور کیا ہے۔ انقلاب سے پہلے بھی ہم نے چیانگ کائی شیک کے چین سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی تھی، اس لئے نہیں کہ ہم چیانگ کائی شیک کو پسند کرتے تھے۔ بہر حال یہ بات چین کے فیصلہ کرنے کی تھی کہ کون اس پر حکومت کرے گا۔ ہم نے اب بھی ان سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی کوشش کی اور ہمارے ان کے دوستانہ تعلقات تھے کیوں کہ ہم ایک بڑے ہمسایہ ملک اور ایشیا کے سب سے بڑے ملک کے لحاظ سے اسے اہمیت دیتے تھے۔ بلاشبہ سابق چین سے ہمارے تعلقات ہمیں آزادی ملنے کے بعد بہت دنوں تک نہیں رہے کیوں کہ دو تین سال بعد چین میں کامیاب انقلاب آگیا۔

جب چین میں انقلاب آیا تو ہم نے وہاں متعین سفیر اور دوسرے متعلقہ لوگوں سے بات چیت کی۔ یہ بات بالکل صاف ظاہر تھی کہ یہ انقلاب ایسا نہ تھا جو محلوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک بنیادی انقلاب تھا جس میں لاکھوں کروڑوں انسان شریک تھے۔ اس انقلاب کے بعد ایک پوری طرح مضبوط حکومت قائم ہوئی جس کی بنیادیں گہری تھیں اور جو مقبول عوام بھی تھی۔ ہماری پسند یا ناپسند کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ قدرتی طور پر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں اس حکومت کو مان لینا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے دو تین مہینے کے اندر ہی اس کو مان لیا۔

اس وقت مجھے ایک بات یاد آئی۔ چینی انقلاب کے فوراً بعد مغربی ملک کے ایک بہت بڑے سیاست داں نے جو اس انقلاب کو پسند نہ کرتے تھے کچھ لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔ "ہم نے اس وقت بڑی غلطی کی جب کہ روس میں انقلاب برپا ہو رہا تھا کیونکہ ہم سنے سالوں تک ان کو (روسیوں) دبانے اور انقلاب کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے۔ البتہ ہم ہر ایک کو ناراض کر کے اپنے (مراد ہے مغربی ممالک) اور روس کے مابین زبردست انتشار پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔" انھوں نے کہا۔ "اب چینی انقلاب کے بارے

میں دوبارہ غلطی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ایک ایسے شخص کا قول ہے جو چینی انقلاب کو پسند نہیں کرتے۔ وہ مغربی ممالک کے بڑے ممتاز مدبر ہیں لیکن وہ عقل مند آدمی تھے۔

مجلسِ اقوامِ متحدہ کی رکنیت۔ ظاہر ہے کہ آپ ان انقلابات کو بددعائیں دے کر کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ان انقلابات کو پسند نہیں کرتے تو یہ ختم تو نہیں ہو سکتے۔ کسی ملک کے انقلابات اس کے حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم شروع سے ہی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ چین کا اقوامِ متحدہ میں شریک نہ ہونا بالکل غلط ہے اور یہ دنیا کے لئے نقصان دہ اور خطرناک ہے اور یہ حالات کے اقتضاء کے مطابق نہیں ہے۔ ہم یہی بات گذشتہ دس سال سے کہتے آئے ہیں اور وہ لوگ جو مخالفت کرتے تھے رفتہ رفتہ اس کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ چین کی حکومت کو مان لینا ہی مناسب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر مارشل چیانگ کائی شیک سے متعلق بعض غلط فہمیاں نہ ہوتیں تو چین اب سے بہت پہلے اقوامِ متحدہ میں شامل ہو گیا ہوتا۔

جنرل اسمبلی کے گذشتہ اجلاس کی کارروائی پر ہی نظر ڈالیئے۔ جب کچھ ملکوں نے جن میں ہندوستان بھی شامل ہے چین کو اقوامِ متحدہ میں شامل کرنے کا سوال اٹھایا تو لوگوں کو تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا۔ "واہ، ہندوستان کی سرحدوں پر اور تبت میں جو کچھ ہوا ہے اس کے باوجود ہندوستان یہ سب کچھ کئے جا رہا ہے۔ یہ لوگ کیسے اندھے ہیں۔" یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں بتاؤں کہ کون اندھا ہے اور کون نہیں۔ لیکن ہم نے گذشتہ دس سال میں عام طور پر یہی دیکھا ہے کہ ہم نے جو کچھ کہا، جو اقدام تجویز کئے اسے دوسرے ملک رفتہ رفتہ ماننے لگے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے مشورہ کو نہ ماننے سے بہت نقصان ہوا اور اس نقصان کے بعد بالآخر لوگوں نے ہماری بات مانی۔ آپ دیکھیں گے کہ اقوامِ متحدہ میں چین کے مسئلے پر پچھلی بار جب رائے لی گئی تو بہت سے ملکوں نے اس کے حق میں رائے دی جو پہلے مخالفت کرتے تھے وہ غیر جانبدار رہ گئے یا انھوں نے کوئی رائے نہ دی۔ پہلے جنھوں نے رائے نہیں دی تھی اس بار انھوں نے موافقت کی۔ یہ اس لئے ہوا کہ ان باتوں کے باوجود جنھوں نے دوسرے ملکوں کو اور ہمیں غصہ دلایا اور زیادہ ملکوں نے بھی صورتِ حال کا صحیح اندازہ کیا اور گذشتہ اجلاس میں اس مسئلے کے حق میں رائے دی۔

وجہ یہ ہے کہ وہاں مدبرین ہیں اور ایسے لوگ ہیں جو حال مستقبل دونوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اس طرح کے بڑے انقلابات اور دوسری باتوں سے آپ کا سابقہ تو دنیا کے عجیب و غریب واقعات سے ہو گیا ہے۔ آپ کو ان باتوں کو سمجھنا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ان باتوں پر برسرِ پیکار بھی ہو سکتے ہیں لیکن انھیں سمجھنا ضروری ہے کیونکہ بغیر سمجھے ہوئے آپ لڑائی نہیں کر سکتے۔

چین کا پھیلاؤ۔ اب میں اس سوال کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالوں گا۔ جب سے چین میں انقلاب آیا ہے۔ ہم نے قدرتی طور پر یہ بات سوچی کہ یہ نیا چین کون سا پہلو اختیار کرے گا۔ ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ اس تبدیلی سے قطع نظر یہ انقلاب ایشیا، دنیا اور ہمارے لئے ایک بہت بڑی بات ہو گا۔ ہم تاریخ سے اس حد تک ضرور واقف تھے کہ اتنا اندازہ لگا لیتے کہ ایک طاقت ور چین کا عام طور سے یہ مطلب ہے کہ یہ پھیلنے کی کوشش کرے گا۔ چین کی پوری تاریخ میں اس کی مثال ملتی ہے اور ہم نے دیکھا یا محسوس کیا کہ اس ملک میں صنعتوں کے قیام پر بہت زور اور آبادی کے اضافے کی رفتار میں حیرت انگیز ترقی ہوتی ہے یہ دونوں باتیں مل کر خطرناک صورتِ حال پیدا کر دیں گی۔ یہ بات سمجھنے کے لئے بہت زیادہ عقل مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ذہین آدمی نے کم و بیش اسی طرح سوچا۔

اتنی بڑی آبادی اور اس میں اضافے کی رفتار جو دنیا کے ہر ملک سے زیادہ ہے بذاتِ خود بڑی نازک صورتِ حال پیدا کر دیتی ہے اور اسکے بندھن ٹوٹ سکتے ہیں اگر پورا ملک صنعتی طور پر ترقی یافتہ نہ ہو کیونکہ ایک بہت بڑی آبادی کمزور بھی ہو سکتی ہے۔ یہی صنعتیں ترقی کر کے آبادی کو بہت طاقت ور بنا دیتی ہیں اور اسے آگے ڈھکیل دیتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے ہم نے دیکھا کہ یہ دونوں باتیں مل کر، ممکن ہے، ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے لئے بڑی عجیب و غریب اور بڑی خطرناک صورتِ حال پیدا کر دیں۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ چین کا یہ رجحان رہا ہے کہ جب کبھی وہ طاقت ور ہوا ہے اس نے پھیلنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی بھی آدمی ان باتوں سے بے خبر نہیں۔ ہم نے ان باتوں کو محسوس کر لیا تھا۔ ہم نے یہاں اس پر بات چیت بھی کی بھی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا یہ بات زیادہ سے زیادہ صاف اور واضح ہوتی گئی۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہم نے چین کے متعلق اپنی جس پالیسی پر عمل کیا ہے

وہ ان ظاہر نتائج پر غور کئے بغیر کیا تھا تو غلطی پر ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ ہم نے یہ پالیسی چین کے ڈر سے اختیار کی تھی تو وہ اور زیادہ غلطی پر ہے۔ یہ بات میرے کہنے کی نہیں ہے کہ ہم کتنے کمزور یا مضبوط یا خوف زدہ ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ گذشتہ دس سال میں ہم نے کسی وقت بھی ڈر سے کوئی کام نہیں کیا ہے جب سے ہم نے حکومت بنائی ہے ہم نے خوف سے کوئی کام نہیں کیا ہے۔ چین سے ڈرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ہم نے حالات اور نتائج کا اندازہ لگایا اور یہ سوچا کہ اگلا قدم کیا ہو تاکہ خطرناک صورت حال نہ پیدا ہو۔ میں نے اس ایوان کو پورے پس منظر سے آگاہ کر دیا ہے کہ کس طرح ہم لوگوں نے ان مسائل پر غور کیا کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی دنیا میں مگن ہیں اور دوسری جگہوں میں کیا ہو رہا ہے اس سے بالکل بے خبر ہیں یا ہم خوف سے سکڑے جا رہے ہیں۔ دونوں لحاظ سے وہ غلطی پر ہیں۔

چین صلح کی خواہش نہیں رکھتا۔ دوسری بات جس کا میں ذکر کر دوں وہ یہ ہے کہ روس اور چین کے انقلاب یقیناً بہت بڑے انقلاب ہیں لیکن ایک معنوں میں اس سے بھی بڑا انقلاب رونما ہو رہا ہے وہ سائنس اور ٹیکنیکل معلومات کا انقلاب ہے۔ ہمارے ہی زمانے میں ان باتوں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ گذشتہ چند ہی برسوں سے ہم لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اچھی ترقی کر رہے ہیں قبل ہمیں کوئی موقع حاصل نہ تھا اور ہم نے اس میدان میں خاصی اچھی ترقی کر لی ہے اور ہمارے پاس جو وسائل ہیں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہم اس میدان میں کافی ترقی کر لیں گے۔

تمام انقلابات خواہ وہ فرانسیسی انقلاب ہو یا روسی یا کوئی اور ان کا انداز بڑا غیر معمولی ہوتا ہے۔ عام حالات اور عام راستے سے ہٹ جانے کا نام ہی انقلاب ہے۔ یہ انقلاب غیر معمولی ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی تبدیلیاں لے آتے ہیں۔ یہ تکلفات کا سوانگ نہیں رچاتے بلکہ درحقیقت یہ تکلفات کے خلاف جاتے ہیں اور چیزوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ انقلاب تخریبی ہوتے ہیں حالانکہ ان بڑے انقلابوں میں کچھ تعمیری باتیں بھی تھیں۔ کچھ ایسی چیز تھی جو لوگوں کو بھائی اور ان میں جوش و خروش پیدا کیا۔ اس لئے آپ ان ہنگاموں اور فسادوں میں بھونڈی اور بے ڈھنگی باتیں ہوتی دیکھتے ہیں۔ رفتہ رفتہ انقلاب دب جاتا ہے لیکن اپنے بہت سے خصائص باقی رکھتا ہے لیکن زیادہ سے زیادہ معمول کے مطابق آ جاتا ہے۔ کتنی جلدی یہ معمول آ جاتا ہے اس میں بلا شبہ دوسرے عوامل کو دخل ہوتا ہے۔ لیکن لڑائی اور ہنگامے جیسے بیرونی حالات رکاوٹ ڈالیں تو معمول پر آنے میں کافی دیر لگتی ہے۔ لیکن حالات اعتدال پر ضرور آئیں گے کیونکہ انقلاب کے وقت لوگوں میں جو جوش و خروش آ جاتا ہے وہ بہت دنوں تک نہیں رہ سکتا۔ اس وقت سوویت روس میں حالات کو اعتدال پر لانے کا کام بڑے زوروں پر ہو رہا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے معاشی نظریوں سے منحرف ہو رہے ہیں۔ حالاں کہ بغیر انحراف کئے بھی وہ انھیں بدل دیتے ہیں عقل مند اور عملی ہونے کی حیثیت سے وہ وقتاً فوقتاً انھیں بدلتے رہتے ہیں لیکن اس کی بنیاد کم و بیش وہی ہوتی ہے۔

اس وقت چین میں حالات اعتدال پر نہیں آئے ہیں اور یہ ہماری اور دنیا کی بدقسمتی ہے یہ کافی طاقت ور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک غیر معمولی ذہنی کیفیت بھی رکھتا ہے۔ یہ خطرناک بات ہے اس کا سامنا کرنا ہوگا اور اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے مسائل کے متعلق روس اور چین کے رویے میں بہت بڑا فرق ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے، حالاں کہ سبھی ملک امن کے لئے بے چین ہیں جو سوویت روس سے زیادہ امن کا خواہشمند ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمام لوگوں کا حتیٰ کہ ان کے مخالفوں کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن مجھے اس میں شک ہے کہ دنیا میں اس وقت چین کے علاوہ کوئی دوسرا ملک بھی ہے جو امن کا اتنا کم لحاظ رکھتا ہو۔ ان دونوں کے رویے کے اس بڑے فرق کو دیکھئے۔

بین قومی کمیونزم اور سرمایہ داری۔ دوسری باتیں بھی کی جا سکتی ہیں شری ایم۔ کے۔ مسانی اب تک بین قومی کمیونزم اور دوسرے لوگ بین قومی سرمایہ داری کی باتیں کرتے ہیں۔ جو وہ کہتے ہیں ان میں سچائی کا شائبہ ہو سکتا ہے لیکن اساسی اور بنیادی طور پر یہ باتیں بالکل پرانی ہو چکی ہیں اور آج کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال یہ میرا کام نہیں کہ اس پر بحث کروں جب میں کہتا ہوں کہ دنیا بدل رہی ہے تو میں صرف حقیقت حال کا اظہار کرتا ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کے دو دیو پیکر ملک روس

[illegible] ایک دوسرے کے بہت قریب آ رہے ہیں اور وہ کچھ حد تک ایک دوسرے کے قریب آ چکے ہیں اس لئے لازمی طور پر سرمایہ داری اور کمیونزم کے متعلق یہ خیالات فرسودہ ہو گئے ہیں۔ آپ مقدس کتابوں سے حوالے دے سکتے ہیں، میرا خیال ہے کہ شری ایم آر مسانی نے حوالہ دیا ہے کہ چیئرمین ماؤ نے کیا کہا تھا اور کسی دوسرے صاحب نے مارکس کا حوالہ دیا ہے۔ یہ واقعیت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ چیئرمین ماؤ نے وہ بات خانہ جنگی کے زمانے میں کہی تھی۔ ایسے زمانے میں بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چیئرمین ماؤ وہی باتیں آج بھی کہیں یہ میں نہیں جانتا لیکن حقیقت بہرحال باقی رہتی ہے کہ یہ تمام باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔ یہ باتیں آج فرسودہ ہو چکی ہیں جبکہ آپ چاند تک پہنچ گئے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ وہ دو ملک جو اس وقت سائنس اور ٹیکنیکل معلومات کی وجہ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں امریکہ اور سوویت یونین ہیں۔ دونوں ٹیکنالوجی اور مشین کی پوجا کرتے ہیں۔ دونوں سوچتے ہیں کہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ حاصل کریں گے اور غالباً دونوں یہ بھول گئے ہیں کہ انسانی زندگی کے کچھ دوسرے اور گہرے پہلو بھی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے بین قومی کمیونزم اور بین قومی سرمایہ داری کے متعلق باتیں کرنا اور ان پرانے نعروں کو دہرانا ہمیں سیدھے طریقے سے سوچنے اور اس بدلتی ہوئی دنیا کو سمجھنے سے روکتے ہیں۔

سفیروں کے ذریعے مراسلت۔ معزز ممبر شری باجپائی نے اس خط پر تعجب اور ناراضی کا اظہار کیا ہے جو میں نے وزیر اعظم چو این لائی کو لکھا ہے اور جو ۲۶ نومبر کو بھیجا گیا ہے۔ یعنی جس دن سے اس ایوان کا اجلاس شروع ہوا ہے۔ کیا میں اس خط کو دو دن تک روک نہیں سکتا تھا اور ایوان کی منظوری نہیں لے سکتا تھا؟ مجھے ان کی اس رائے پر تعجب ہوا گویا کہ سفیروں کے ذریعے کسی قسم کی خط و کتابت حتیٰ کہ معمولی قسم کی مراسلت یا اس سے بھی زیادہ اہم معاملوں کے متعلق تمام خطوط بھیجنے سے پہلے پارلیمنٹ غور کرے۔ اس طریقے سے کام کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسا بالکل نہیں کیا جا سکتا آپ کو کچھ حد تک ان لوگوں پر بھروسا کرنا ہوگا جنھیں آپ اس کام کے لئے مقرر کرتے ہیں۔ اگر وہ خراب طریقے سے کام کرتے ہیں تو انھیں ہٹا دیجئے، نکال دیجئے لیکن آپ کو ان پر بھروسا کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ اس لئے یہ تمام خط و کتابت، مراسلت اور پیغام ہمیشہ پارلیمنٹ کے سامنے نہیں پیش کی جا سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے کئی خط پہلے بھی پارلیمنٹ کے سامنے نہیں پیش کئے گئے۔ مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے تمام معاملات سے پارلیمنٹ کو باخبر نہیں رکھا۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہے، لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی خط مکمل ہونے سے پہلے میں اسے پیش کر دوں اور جواب پانے سے پہلے ہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دوں۔

یہ دلیل یا نکتہ چینی اقصائے چین سڑک سے متعلق خبر پر لاگو کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ہم اس کی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے اپنے آدمیوں کو وہاں بھیجا۔ تقریباً ایک سال گزرا گذشتہ اکتوبر میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہاں سڑک موجود ہے اور ہمارے آدمیوں نے اس سڑک کو دیکھا۔ یہ ہمارے علاقے میں تھی۔ ہم نے فوراً ہی وزیر اعظم چو، این، لائی کو لکھا۔ بلا شبہ ہم اسی وقت اس حقیقت کا اعلان کر سکتے تھے لیکن ایسی صورت میں نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ پھر بات چیت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ دونوں فریق سخت ہوتے جاتے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ اس وقت ان کے رویے میں نرمی ہے بلکہ میں عام قاعدے کی بات کر رہا ہوں۔ ہر فریق سخت ہوتا جاتا ہے کیونکہ اس واقعے کی تشہیر ہوتی ہے۔ قومی احساس کو ابھارا جاتا ہے اور پھر دوسرے ملک پر اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ اس وقت کوئی بات چیت یا کوئی نرم رویہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے میں نے غلطی کی ہو لیکن میں صرف یہ بات بتا رہا ہوں کہ کسی طرح ہم لوگ ان باتوں کے متعلق ہمیشہ پارلیمنٹ میں اعلان نہیں کر سکتے یا انھیں پریس میں شائع نہیں کرا سکتے یا اس طرح کا کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتے۔ موٹے طور پر یقیناً یہ صحیح ہے کہ پارلیمنٹ سے رابطہ رکھا جائے اور اسے تمام واقعات سے باخبر رکھا جائے اور اس سے کوئی رازداری نہیں برتی جائے۔ دیر البتہ ہو سکتی ہے تاکہ کوئی خاص مقصد حاصل ہو جائے۔

وزیر دفاع کا تذکرہ۔ کچھ تقریروں میں ہمارے وزیر دفاع کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسا کیا گیا ہے کیوں کہ اس طریقے سے پالیسی کے بڑے بڑے مسائل شخصیتوں سے الجھ جاتے ہیں میں کسی معزز ممبر کے اس حق کو چیلنج نہیں کرتا کہ وہ کسی وزیر یا حکومت کے بارے میں

جو کچھ محسوس کرتا ہوں دو منٹ کہیں۔ یہ کسی حق کو چیلنج کرنے کا سوال نہیں ہے۔ تاہم کوئی صحیح بات صحیح طریقے سے بھی کی جا سکتی ہے اور غلط طریقے سے بھی یا ایسے غلط وقت میں اور ایسے طریقے سے کی جا سکتی ہے جس سے غلط نتائج برآمد ہوں۔ اس کے کرنے کے طریقے ہیں۔ شخصیتوں کے متعلق کچھ کہنا ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن بات کچھ ایسی ہے کہ جہاں تک اس ایوان کا تعلق ہے کسی دوسرے شخص کے مقابلے میں وزیر دفاع کو زیادہ عرصے سے جانتا ہوں۔ شری ایم۔ او۔ مسانی اپنا سر ہلا رہے ہیں غالباً وہ انھیں مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں بہرحال میں انھیں بہت دنوں سے جانتا ہوں اور آزادی ملنے سے پہلے ان کے ساتھ مل کر بہت دنوں تک کام کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں انھیں اتنا تو جانتا ہوں جتنا کہ کسی دوسرے کو۔ میں ان کی کمزوریوں ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں سے واقف ہوں بہت سے موقعوں پر میری رائے ان سے مختلف رہی ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ مستقبل میں بھی ہر معاملے میں ان کی رائے سے متفق نہ ہو سکوں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے قطع نظر ایک سچے محب وطن ہیں اور ان میں قومی جذبہ موجود ہے۔ ان کی وہ ساری صلاحیتیں ناکافی ہوتیں اگر مجھے ان کی حب الوطنی اور وطن کی محبت کا یقین نہ ہوتا۔

پھر میں نے وزارت دفاع میں بھی ان کا کام دیکھا ہے۔ وزارت دفاع نے گذشتہ دو تین سال میں بعض لحاظ سے بہت ترقی کی ہے۔ اس وزارت کے سائنسی کام اور ریسرچ کے کام میں انقلاب آ گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں یعنی سائنسی کام اور پیداواری آلات و سامان اس نازک بحران کے وقت میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سے ہمارے ممتاز سپاہیو اور دوسروں کو بہت زیادہ تقویت پہنچے گی کیوں کہ پہلے یہ نسبتاً دوسرے محکموں سے دبے ہوئے تھے۔ میں یہ ساری باتیں کچھ تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ کچھ مہینے پہلے یہ نزاعی مسئلہ اس ایوان میں اس تعلق سے آیا تھا کہ ہماری فوج کے چیف آف اسٹاف نے استعفیٰ دینے کی پیش کش کی تھی۔ وزیر دفاع اور چیف آف اسٹاف کے متعلق جو میرے خیالات تھے اس کے پیش نظر مجھے افسوس ہوا تھا۔ میں ان کی صلاحیت اور تجربے کی وجہ سے ان کی کافی قدر کرتا تھا۔ جب باصلاحیت افراد کسی طرح کے جذباتی تصادم کا شکار ہو جائیں تو یہ افسوسناک بات ہے۔

یہ بات کسی ایک یا دوسرے شخص کو کسی کام پر مامور کرنے کی نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے معاملہ رفع دفع ہو گیا اور خوش اسلوبی سے کام چلنے لگا۔ ہم سب ساتھ مل کر تشفی بخش طریقے سے کام کر رہے ہیں اور میں کہوں گا کہ اس معاملے کو کسی بھی طرح نہ دوبارہ چھیڑا جائے کیوں کہ جو قدم اٹھایا جائے گا اور خاص طور پر ان حالات میں وہ یقیناً نقصان دہ ہوگا۔

میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ اپنے بارے میں باتیں کرنا یا اپنے آپ کو پرکھنا بہت ہی مشکل ہے۔ آچاریہ کرپلانی نے مجھ پر الزام لگایا ہے اور کہا ہے کہ میں غیر روادار ہوں اور دوسروں کی باتوں کو سننا گوارا نہیں کرتا۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے میرے لئے اپنے آپ کو پرکھنا مشکل ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ رواداری کا یہ بہترین وصف صرف مجھ میں ہی کیوں ہو۔

آچاریہ کرپلانی۔ کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟ اس لئے کہ آپ اس وقت بااقتدار ہیں، کیوں کہ حکومت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے، عوام کی محبت حاصل ہونے کے ناتے آپ کو دوسروں کے خیالات کے بارے میں روادار ہونا چاہیئے۔ میں نے یہ بات کئی بار بالکل واضح کر دی ہے۔

جواہر لال نہرو۔ میں اس بات کو مانتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم سب جو یہاں موجود ہیں کسی نہ کسی بات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم یہاں صرف کوئی آرام دہ کام کرنے نہیں آئے ہیں۔ یہاں موجود معزز ممبران اپنی پارٹی یا اپنے انفرادی خیالات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مجھے کوئی شخص دو باتوں کی بناء پر مورد الزام ٹھہرا سکتا ہے یا تو میرے خیالات کی غلطی کی بناء پر یا نا اہلیت یا بددیانتی کی بناء پر۔ اگر بددیانتی کا سوال ہے تو حقائق پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ کم و بیش اسی طرح نا اہلیت کا بھی سوال ہے یہاں خیالات کا ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ اگر بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا جائے جنھیں میں صریحاً غلط اور ملک کے لئے نقصان دہ سمجھتا ہوں تو کیا میں خاموش رہوں اور ایسی نقصان رساں باتوں کو برداشت کر لوں۔ اگر میرے کچھ اپنے خیالات ہیں تو یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں انھیں ملک کے سامنے پیش کر دوں اور دوسروں کے غلط اور گمراہ کن خیالات کا مقابلہ کروں۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے

[illegible] خیالات کر[illegible] بتاتا ہے کہ مجھ میں کتنی زبردست حد
تک برداشت اور تحمل کا مادہ ہے ...
[illegible] کرچکی۔ غیر ملکی کے لئے
[illegible] شاید ہی ایک ہفتہ گزرتا ہو بلکہ ہر دوسرے تیسرے
دن جنوبی ہند کے ایک اخبار میں ایک بہت بڑے آدمی کے مختلف
مضامین نکلتے رہتے ہیں جن میں خاص کر میری شخصیت اور میری
پالیسیوں پر حملے ہوتے ہیں۔ میں صبر و سکون کے ساتھ خاموش
رہتا ہوں اور برداشت کرتا ہوں۔ میں بحث نہیں کرتا پھر یہاں
مجھے ایک شعر یاد آتا ہے۔ یہ فرانسیسی زبان میں ہے۔ لافانتین
کی بچوں کی کہانیوں میں ہے جس کا مطلب ہے: ۔

"یہ جانور ہے اور یہ بڑا بدمعاش ہے جب کوئی اس پر حملہ کرتا ہے
تو یہ اپنی حفاظت کرتا ہے۔"

جب میرے خیالات پر حملہ کیا جائے تو کیا میں انکی حفاظت
بھی نہ کروں و یقیناً یہ بات نہ صرف میرے لئے بلکہ عوام کیلئے
بھی غیر منصفانہ ہوگی۔ جن کے نزدیک میں اپنے کچھ اصول رکھتا ہوں۔
بلاشبہ ہم میں برداشت کا مادہ ہونا چاہیئے لیکن ہمیشہ ہمیں اپنی پوری
صلاحیت اور قوت کے ساتھ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیئے
لیکن ہاں ہمیشہ ایک دوسرے کی قوت برداشت کی حدوں کا بھی
لحاظ رکھنا چاہیئے۔

بھوٹان اور نیپال کی حفاظت۔ یہاں میں یہ بھی کہوں گا بلکہ اس بات
کو دہراؤں گا جو ہم پچھلی بار کہہ چکے ہیں کہ بھوٹان اور نیپال کے خلاف کسی جارحانہ
اقدام کو ہم ہندوستان کے خلاف جارحانہ اقدام سمجھیں گے۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں
کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ یہ ایک بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ لیکن سب کچھ
سمجھ بوجھ کر ہم نے بہت پہلے ہی ایسا کہا تھا اور اب میں اس کو دہرانا چاہتا
ہوں کسی وسیع تر خیال سے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے تحفظ کے خیال سے بھی۔ اگر
آپ پوچھیں کہ ایسا ویسا ہوا تو کیا کیا جائے گا تو میں صاف طور پر نہیں بتا سکتا
قیدیوں کے ساتھ بُرا برتاؤ۔ ابھی حال میں میں نے چینیوں کے ہاتھوں
ہندوستانی قیدیوں کے ساتھ بُرے برتاؤ کے سلسلے میں جنیوا کنونشن کا ذکر کیا تھا
میرا خیال ہے کہ شری اشوک مہتا نے اس بارے میں کچھ کہا تھا اور پوچھا تھا کہ

چین نے اس کنونشن پر دستخط کئے تھے۔ میں نے اس کی چھان بین کی ہے ۱۲ اگست
۱۹۴۹ء کو جنیوا میں جو کنونشن ہوا تھی وہی جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کے
بارے میں ہے۔ یہ کنونشن اعلانیہ جنگ یا کسی مسلح تصادم کے بارے میں ہے
جو دو یا اس سے زیادہ ملکوں کے درمیان ہو جائے چاہے اس معاہدے کے
فریقین میں سے ایک بھی جنگ کی حالت نہ مانتا ہو۔ کنونشن ان حالات پر بھی
لاگو ہوگا جب معاہدہ کرنے والے فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے کے پورے
ملک پر یا اس کے کچھ حصے پر قبضہ کرلے اور اس کے لئے کوئی مسلح مزاحمت بھی
نہ ہوئی ہو۔ جنگی قیدیوں سے کسی طرح کی معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی طرح
کی جسمانی یا ذہنی اذیت یا کسی دوسری طرح کی زور زبردستی جائز نہیں۔
جو قیدی جواب دینے سے انکار کریں ان کو خوف زدہ کرنے' ان کی بے عزتی کرنے
یا ان کے ساتھ کسی دوسری طرح کا ناخوش گوار یا بُرا برتاؤ کرنے کی اجازت نہیں۔
چین کی موجودہ حکومت کے علاوہ خود وزیر اعظم چو این لائی نے پیکنگ میں جنیوا
کنونشن کو ماننے کا اعلان کیا تھا۔

میرے ساتھ جس خوش اخلاقی کا برتاؤ کیا گیا ہے اس کے لئے میں
اس ایوان کا شکر گذار ہوں۔

میں پھر عرض کروں گا کہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم صورت حال کی نزاکت
کو اچھی طرح سمجھیں کیونکہ یہ صرف دفاع (بچاؤ) کا معاملہ نہیں بلکہ اس سے
زیادہ ہے۔ یہ ہم سب پر اثر ڈالتا ہے۔ اس کا اثر ہماری پیداوار اور ہماری
ساری منصوبہ بندی پر ہوگا۔ کارخانوں کے مالک اور مزدور اس سے اثر انداز
ہوتے ہیں غرضیکہ یہ ہر جگہ ہر آدمی پر اثر ڈالتا ہے۔ یہ سارے مطالبات
اور آئندہ ہونے والے مطالبات اس نئی صورت حال کے تابع ہوں گے۔
اسٹرائیک' ہڑتال اور ایسی دوسری باتوں کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا ہوگا۔
مجھے خوشی ہے کہ طلباء نے اس مسئلے پر بڑی زندگی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن
بھی یہ سمجھنا ہوگا کہ وہ اپنی توانائی دوسرے ڈھنگ سے دکھائیں جس سے
ہمیں واقعی مدد ملے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے میں یا میری حکومت ان مشکلوں کے ہوتے
ہوئے بڑے طریقے پر کام نہیں کر سکتی اگر ہمیں پارلیمنٹ اور عوام کا پورا
پورا تعاون حاصل نہ ہو۔ اس لئے میں اس تعاون کی درخواست کرتا ہوں

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

ڈاکٹر سمپورنانند

ایم حفیظ سیّد

مجھے مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب میں بھی جہاں میں عرصہ تک رہا ہوں ممتاز مفکرین اور مدبّرین سے ملنے اور ان سے ربط و ضبط قائم رکھنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اعلیٰ درجہ کے مفکرین اور صاحبانِ نظر کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں تو مختلف سیاسی وجوہ کی بنا پر ابھی حال تک فکری اور ذہنی نشوونما کے پورے مواقع بہت کم حاصل تھے اس لئے یہاں صفِ اوّل کے قائدین، مفکّرین اور مسلّم الثبوت اہلِ علم کی تعداد قدرتی طور پر اور بھی کم ہے۔

ان چند ہستیوں میں ڈاکٹر سمپورنانند کی شخصیت امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ بلا کے ذہین اور طبّاع ہیں ان کو قدرت نے ایک غیر معمولی شعور اور غیر معمولی حافظہ عطا کیا ہے۔ ان کے ذہن رسا کو معاملہ فہمی اور اس کی روشنی میں صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ ان کا مطالعہ وسیع بھی ہے اور عمیق بھی۔ سائنس، فلسفہ، سیاسیات، علوم مذاہب، تصوف، اشتراکیت، تعلیم و تدریس غرض وہ ہر موضوع پر حاوی ہیں اور ایک ایسا زاویہ نگاہ رکھتے ہیں جو عام طور سے دوسروں کے حصہ میں نہیں آیا ہے۔ جب ہم ان کے ارشادات اور مکتوبات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کا موقع خوش نصیبی سے ہم کو اکثر ملتا ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام مسائل میں جن سے انسانیت، ہمارا سماج اور ہمارا ملک دوچار ہے، ان کی طرزِ فکر انہی کی طرزِ فکر ہے۔ نہایت اچھوتی اور صحت مند ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک نئی چیز معلوم ہوئی۔ ایسی چیز جو اس سے پہلے ذہن میں آتی ہی نہ تھی۔ ان کے خیالات جو ان کے اپنے مطالعہ اور اپنے غور و فکر کا نتیجہ ہیں ہمارے ذخیرۂ معلومات میں ہمیشہ اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے اس جائزہ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے اور اس کی ہر وہ شخص تائید کرے گا جو ان کی عالمانہ صلاحیتوں سے واقف ہے۔

ڈاکٹر سمپورنانند نے جن مسائل پر غور و فکر کیا ہے وہ گوناگوں ہیں اور ان کی فکر و نظر نے ان سب کو واضح اور روشن کر دیا ہے تعلیم اور جدید رجحانات کے مسئلہ پر انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔ اس بات پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے کہ آج انسانیت کو اپنے تحفظ بقا اور ترقی کے لئے سب سے زیادہ یہ ضرورت ہے کہ تحصیلِ علم کی جد و جہد جاری رہے اور علم کا صحیح استعمال کیا جائے تاکہ یہ انفرادی زندگی مفید تر اور پاکیزہ تر بن سکے اور انسانوں کی یہ دنیا میدانِ کارزار کے بجائے آزاد اور ایک دوسرے کی حامی و مددگار قوموں کا ایک خوش و خرم گھرانہ بن سکے۔ ڈاکٹر سمپورنانند نے اپنی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں اس اہم ترین ضرورت پر توجہ دلائی ہے اور نظر افروز خیالات پیش کئے ہیں۔ وہ اپنے ایک دلچسپ مضمون "سکشا" مورخہ جولائی ۱۹۵۹ء میں مذہبی تعلیم کے موضوع پر جسے وہ اخلاقی تربیت کا ایک گراں قدر وسیلہ سمجھتے ہیں، اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

> "کرم، یعنی قانونِ اعمال فطرت سے ناآشنا ہو، انسان کو اپنے فعل و عمل کی پوری ذمہ داری تسلیم کرنا ہوگی اور یاد رہے کہ عمل میں خیال بھی شامل ہے۔ انسان جیسا سوچتا ہے ویسا ہی بنتا ہے۔ خود غرضی، بے رحمی نیز بیہودہ خیالات، خواہ انھیں عملی جامہ پہنے کا موقع نہ مل سکے، انسان کے ذہن میں کثافت پیدا کر دیتے ہیں

اور ہمیں [illegible] اور ناخوشگوار فرد بنا دیتے ہیں جال
کے لئے بھی اور [illegible] کے لئے بھی"

وہ مزید لکھتے ہیں:

"نیکی اور بدی کی کتنی ہی تعریفیں پیش کی جائیں لیکن اس
کا ایک معیار ہمیشہ یہ رہے گا کہ ہر وہ بات جو وحدت پیدا
کرے اور دوئی کے احساس کو دور کرے نیکی ہے۔ ہم
آپ اور دوسرے تمام ذی روح ایک واحد حقیقت
کے مختلف مظاہر ہیں جو سب پر طاری اور ساری ہے
پھر آپ کسی کے لئے برے خیالات کیسے دل میں لا سکتے
ہیں اس لئے کہ صرف پاگل ہی اپنے کو دکھ پہنچانے کی بات
سوچ سکتا ہے۔ آپ مجبور ہیں کہ اپنے پڑوسی سے پریم
کریں اس لئے کہ آپ اور وہ ایک ہیں۔ اس اصولِ
حیات کی پابندی انفرادی سطح پر بھی کرنا ہے اور اجتماعی
سطح پر بھی"

ڈاکٹر سمپورنانند کو حق ہے کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات
قدرت کے ساتھ ظاہر کر سکیں۔ وہ جدید سائنس اور ویدک تعلیمات
دونوں سے پوری طرح واقف ہیں اور انہوں نے جدید و قدیم طرز تعلیم
کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ انھوں نے اپنی
زندگی کا بہترین زمانہ تعلیم کی خدمت میں صرف کیا ہے۔
تعلیم میں نئے رجحان کا ذکر کرتے ہوئے وہ بجا طور پر کہتے ہیں:-

"جو باتیں انسان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں ان
میں ایک اس کا اچھا اخلاق ہے لیکن ہمارے اسکولوں
میں اس پر بہت کم دھیان دیا جاتا ہے۔ ہمارا اپنا آئین
اخلاق بہت اچھا ہے اور اس کی طرف توجہ نہ کرنا یا
اس سے ناآشنا رہنا گنوارپن ہے" ان کا خیال ہے کہ
تعلیم کا اس وقت سب سے بڑا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی پشت
پر ایک مناسب فلسفہ ہونا چاہیئے۔

اترپردیش واقعی خوش نصیب ہے کہ اس کو ڈاکٹر سمپورنانند کے سے
مفکر اور معلم کی خدمات حاصل ہیں۔ انھوں نے ملک، تعلیم اور علم کے لئے
جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔ ان کی شخصیت کی
بہت ہی ممتاز رہی ہے، ان کے جوہر طالبعلمی ہی کے زمانے سے ظاہر
ہو گئے تھے۔ وہ کوئینس کالج میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہونے
سے پہلے ہی وسیع مطالعے کے مالک تھے اور گوناگوں مسائل پر گہری نظر ڈال
چکے تھے۔ جب کبھی وہ اپنے درجہ میں کوئی مضمون لکھتے، ان کے استاد
پروفیسر ایچ سی نارمن اس کی زبان کی صحت، خیالات کی منطقی ترتیب
اور طرز نگارش کی پاکیزگی سے اتنے مسرور اور متاثر ہوتے کہ وہ اسے
انٹرمیجیٹ کے درجہ میں لا کر ہم لوگوں کو سناتے اور بتاتے کہ اعلیٰ معیار
کا مثالی مضمون ایسا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ صحت زبان
کے لحاظ سے کوئی بھی ان کا سا مضمون لکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔
پڑھنے اور لکھنے کی وہ صحت مند عادت جو انھوں نے طالبعلمی کے زمانہ
میں ڈالی تھی ان کی اعلیٰ کارناموں سے بھری زندگی میں آج تک قائم ہے۔
جب وہ ٹریننگ کالج میں تھے اور مدرس کی ٹریننگ حاصل کر رہے تھے
اس وقت تعلیم کے موضوع پر شاید ہی کوئی معیاری کتاب ہو جو ان کی
نظر سے نہ گذری ہو اور جس کا وہ حوالہ نہ دے سکتے ہوں۔ ٹریننگ کالج
ہی کے زمانہ میں ان کو تعلیم اور اس کے مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی اور
وہ دلچسپی آج تک قائم ہے۔ وہ کارمائیکل لائبریری وارانسی کے ممبر
بھی تھے اور وہاں اکثر و بیشتر جاتے بھی رہتے تھے۔

اسی ذہنی اور ادبی آراستگی کے ساتھ وہ سیاست میں داخل
ہوئے۔ انھوں نے نیشنل کانگریس میں شرکت کی، بھارت کی آزادی کے
لئے سنگھرش کیا اور بار بار جیل کی سزائیں کاٹیں۔ انھوں نے سماج کے
ہر درجہ کے لوگوں کا تجربہ حاصل کیا جس میں ادنیٰ ترین درجہ کے لوگ بھی
شامل ہیں اور اس تجربہ نے ان کے دل میں ایک عام آدمی کے لئے محبت
اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اس کے بعد کانگریس کے اعلیٰ کمان نے
ان کی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو وزیر تعلیم کی خدمت سپرد
کی۔ اس فریضہ سے وہ جس امتیاز کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ سب
پر روشن ہے۔ محکمۂ تعلیم کو دوسرے ہر محکمے سے زیادہ نئی تنظیم نئی تعمیر
اور نئے جذبہ کی ضرورت تھی جو نئی تحقیقات کے مطابق ہو۔ اس سلسلے میں
وہ ہماری انتہائی توقعات پر پورے اترے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں جو

اصلاحات پیش کی گئیں۔ یہ اصلاحات جہاں تک ممکن ہوا آمرانہ انداز کے برعکس جمہوری انداز میں رائج کی گئیں۔

بیورو آف سائیکالوجی، سنٹرل پیڈاگاگیکل انسٹی ٹیوٹ، کنسٹرکٹیو کالج اور مہو بائیں ٹریننگ اسکیم ان کے عہد وزیر تعلیم کی مستقل یادگار ہیں اور میرا خیال ہے کہ شاید ہی ہندوستان میں کوئی دوسرا پردیش ہو جہاں اس قسم کے ادارے بنے ہوں۔

ان کی توجہ ابتدائی اور ثانوی ہی تعلیم کی حد تک نہیں رہی انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے مسائل پر بھی بڑا غور و خوض کیا ہے۔ ان کے سامنے یونیورسٹی تعلیم کے لئے ایک بہت ہی بلند معیار ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریات کے انتخاب میں حکمائے قدیم کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کسی حلقہ میں بھی محدود نہیں رکھتا تھا اور نکتۂ خیال سے اکتساب کر لیا کرتا تھا

ان کا یونیورسٹی تعلیم کا معیار خود ان کے الفاظ میں مختصراً یہ ہے:۔

”یونیورسٹی تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایسا ماحول پیدا کرے جس میں ماضی کی روایات سے قدم اٹھایا جا سکے اور قدیم زمانہ میں جو سب سے اچھا تھا اور جو زمانۂ حال میں سب سے اچھا ہو ان دونوں کو ایک بنا کر مربوط کر دیا جائے۔ یعنی ہم اپنے آج کے علم اور تجربہ کی وضاحت ان بنیادی حقیقتوں کی روشنی میں کریں جس کی جھلک سب سے پہلے ماضی نے دیکھی تھی۔ یہی وہ تصور ہے جو ملک کی قدیم یونیورسٹیوں کا تھی جیسے ٹکشِ شِلا اور نالندا نے اپنی تعلیم کے لئے قائم کر رکھا تھا۔ افسوس ہے کہ گو یونیورسٹی کا تخیل ان ہی اداروں سے نکل کر قرطبہ اور دوسرے عرب نیز موری مرکز علوم سے ہوتا ہوا مغرب پہنچا پھر بھی ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہم ان سے کچھ سیکھ بھی سکتے ہیں۔ وہ منحوس دن ہوگا جب ہم ذہنی دریافتوں کو اپنی منزل سمجھنا چھوڑ دیں گے۔ یونیورسٹیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آج کی ذہنی حدود کے پرے بھی دیکھیں اور سوچیں۔“

ڈاکٹر سمپورنانند نے یونیورسٹی تعلیم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ایسے ہیں جن پر ہر اس شخص کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئیے جسے تعلیم سے دلچسپی ہے۔

ڈاکٹر سمپورنانند نے روحانی زندگی کی حقیقت اور اخلاقی قدروں کی غیر متنازعہ اہمیت کے بارے میں اپنے مستحکم اور مدلل عقیدہ کو اپنی آج تک کی زندگی میں برابر قائم رکھا ہے اور اس میں ذرا بھی لغزش نہیں ہونے دی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان پر سنسکرت کے ادب اور فلسفہ کے مطالعہ کا کافی اثر ہے۔ انھوں نے صرف کتابوں کے مطالعہ پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ سادھنا کی بھی مشق کی ہے اور جو کچھ انھوں نے ہند قدیم کی مقدس کتابوں میں پڑھا ہے اسے اپنی زندگی میں حقیقت بنا کر دکھا دیا ہے۔ قدیم روحانی ثقافت کی وہ معلومات ہیں جنھوں نے ان کو ہند قدیم کا صحیح تصور اور صحیح مفہوم عطا کیا ہے۔ انھیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ وہ کیا خامیاں ہیں جو صحیح مفاہمت کی کمی کی وجہ سے بعد کو سماج میں آ گئیں لیکن انھیں اتنا ہی احساس یہ بھی ہے کہ اس کے باوجود ہند قدیم بہت کچھ دے سکتا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں:۔

”میں پوری سنجیدگی کے ساتھ یقین رکھتا ہوں کہ جو بنیادی حقیقتیں رشیوں نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کی تھیں ان میں تمام علوم کی کنجیاں پائی جاتی ہیں آج کی زندگی کا کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو ان کی روشنی میں حل نہ کیا جا سکے۔ ان کے فلسفیانہ پس منظر میں ہم نئی بہادر دنیا کو ایسا گھیر سکتے ہیں کہ امن، مساوات اور سماجی انصاف سب کے لئے ضمانت کی جا سکے۔ ہندومت کے بارے میں یہ کہنا کہ جو دنیا سے نفور رہتی یہ اس کے عجیب و غریب ضابطوں کا ایک مجموعہ ہے ایک گناہ ہے:
ہندومت کو ... ہے اور اس میں ماحول کے داخلی اور خارجی تغیرات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔“

ہم اس مبارک موقع پر جب کہ ڈاکٹر سمپورنانند یکم جنوری کو اپنی سترویں سالگرہ منا رہے ہیں، اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ قادر مطلق انھیں نئی قومی زندگی کی خدمت کیلئے اسی صحت و توانائی کے ساتھ زندہ رکھے جس صحت و توانائی کے ساتھ انھوں نے یہ خدمت شروع کی تھی۔

رباعیات

تلوک چند محروم

اس صانعِ بے چگوں کی صنعت دیکھو
حیرت کدۂ جہاں کی وسعت دیکھو
موجود ہیں دنیا میں کروڑوں انساں
ملتی نہیں اک سے ایک صورت دیکھو

ہے خوب وہ طبع جس میں رنگینی ہے
شایانِ ستائش خرد آئینی ہے
سب سے ہشیار ہے مگر وہ انساں
جس کو سودائے عاقبت بینی ہے

دل موسمِ برشگال میں برہم ہے
یادِ ایّام میں رہینِ غم ہے
ساون کے بادلو ذرا تھم جاؤ
آمادۂ گریہ، دیدۂ پرنم ہے

اے وائے، غمِ نہاں نے مارا ہم کو
ایذائے غمِ نہاں نے مارا ہم کو
دل ہو نہ سکا حریفِ ضبطِ فریاد
اخفائے غمِ نہاں نے مارا ہم کو

ہو وہم و خیال کا ٹھکانا کچھ بھی
دعویٰ کرے کوئی مردِ دانا کچھ بھی
محرومؔ بقولِ ذوقؔ، ہم نے تو یہاں
جانا، تو یہ جانا، کہ نہ جانا کچھ بھی

جو عیب مقدّر میں لکھا ہوتا ہے
پتھر کی لکیر سے سوا ہوتا ہے
بدبوئے تنِ ماہی سے نہیں جا سکتی
دریاؤں کی شست و شو سے کیا ہوتا ہے

غزل میں وحدتِ تاثر

شہاب جعفری

قبل اس کے یہ سوال اٹھایا جائے کہ غزل میں کوئی وحدتِ تاثر ممکن ہے یا نہیں، یہ سوال زیادہ ضروری ہے کہ دیکھا یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے بغیر تخلیق شعر یا تنقید شعر کا کوئی پہلو تشنہ رہا جاتا ہے؟ آخر یہ وحدتِ تاثر ہے کیا چیز، جس کی اہمیت موضوعِ بحث بننے کے لائق ہے؟ میرے نزدیک اصلاً یہ تخلیق شعر کا مسئلہ ہے جس سے ہر آرٹسٹ دوچار ہوتا رہتا ہے اور طلسم سازیٔ فن میں وحدتِ تاثر ایک ایسا ناگزیر اور ناقابلِ گرفت عنصر ہے جو فنونِ لطیفہ کے ہر دور میں تنقید سے انکشاف کا مطالبہ کرتا رہا ہے۔

اگر ذہنِ انسانی ترقی نہ کرتا اور تہذیبیں وجود میں نہ آتیں اور اُن کے نتیجہ میں اگر یہ انکشاف نہ ہوتا کہ خدا کی ذات یا نفسِ انسانی سارے نظامِ کائنات کا نقطۂ ارتکاز ہے، تو شاید سارے مظاہرِ کائنات بے ترتیبی، انتشار اور وحشت کی ہمہ وقت نامتعین، متصادم اور نامعتبر شکلیں ہوتے۔ اشیاء کے مختلف الاقسام ہونے کا بھی ہمارے ذہن میں کوئی مفہوم نہ ہوتا، دنیا اس ہیبت ناک تصور سے آگے نہ بڑھتی کہ ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

چاند سے سمندر کی کشش، پہاڑوں اور میدانوں کے درمیان نشیب و فراز کا معنوی ربط، ثوابت و سیارگان کے اپنے اپنے قرار و رفتار کے نقطے اور خطوط، خلا اور مادے یا کسی دو متضاد چیزوں سے ایک دوسرے کی تکمیل، غرض اَن گنت متنوع اشیاء کو جو ہم آج اقسام، انواع، مدارج، مبدا و ربط، تراتیب علت و معلول، نظاماتِ خلق اور اصولِ معنوی و صوری وغیرہ کے خانوں میں تقسیم کر کے آسانی سے ہر چیز کی کیفیت و کمیت کو سمجھ لیتے ہیں، سب بے معنی، وحشی اور حشر خیز کثرت کے سوا کچھ بھی نہ معلوم ہوتے۔ مگر وہ اعصاب کے انسانوں خصوصاً مجنون و مجذوب کو یہی کچھ معلوم ہوتا ہے۔ نارمل اعصاب و نفس رکھنے والوں کے نزدیک کثرت و تنوع کا نتیجہ ہی وحدت ہے۔ فنونِ لطیفہ کبھی تہذیبی متاع کے طور پر ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے، مجنون و مجذوب کے لئے نہیں۔ اکثر لوگ نیچر کی تاب نہیں لا سکتے خواہ وہ نیچر انسانی ہو یا کائناتی۔ ان میں کثرت کے جمال اور وحدت کے جلال کو برداشت کرنے کی قوت و صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جذبات میں ہم آہنگی و تہذیب کے بجائے یک سُرا پن یا بے سُرا پن ہوتا ہے۔ اور ذہن پراگندگی و انتشار کی آماجگاہ۔ ان کے دل و دماغ ہمہ وقت دو مخالف سمتوں میں یا تو رمیدہ ہوتے ہیں یا متصادم ان کے جذبات و خیالات ایک دوسرے کے لازمۂ ارتقاء ہو کر ایک دوسرے کی تکمیل کرنے کے بجائے منفرد اکائیاں ہوتے ہیں۔ لیکن انسان نیچر سے جس قدر قریب ہوتا جاتا ہے، گمشدگی اور لگن سے اس کو وحدت کا عرفان اور تاثرات کا شعور ہوتا جاتا ہے اور اسی نسبت سے اس کا تخیل تیز تر، جو نظامِ وحدت کو اس کے تاثرات قلب سے آمیز کر کے اس کی ذات کی بہیمیت کو حسن لطافت میں تبدیل کرتا ہے ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

یہ شعر ایک دیوانے کے ذہن کی صحیح تعریف ہے کہ خارجی ماحول اور مظاہرِ کائنات اس کے ذہن پر کس طرح منعکس ہوتے ہیں۔ میں یہیں سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ اس کا نفس، تصویرِ کائنات میں نقطۂ ارتکاز نہیں بن سکا جس کی وجہ سے وہ اصولِ تخلیق، توازن، وحدت اور ضبط و نظم کے جلال و جبروت کی تاب نہ لا سکا۔ ایک صحیح الذہن اور ایک نامعقول الاعصاب میں بڑا نازک فرق ہے کہ اول الذکر بے ترتیبی میں ترتیب کا متلاشی

اور اس کے لئے متفکر رہتا ہے اور مؤخر الذکر ترتیب میں بے ترتیبی کا معتوب اور اپنی اس حالت پر مسرور رہتا ہے۔ ایسے لوگ جب فن کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اس سے اکثر ان کے نفس میں ایک گونہ سکون اور اطمینان تو آجاتا ہے لیکن اس "نفس مطمئنہ" کی وجہ سے ان کا مایۂ فن کبھی کبھی عظیم و بے بہا ہونے کے ساتھ ساتھ بیشتر ان کی اپنی نفسیاتی الجھنوں کا اشارہ بھی ہوتا ہے جس سے مدتوں ماہرین نفسیات: "تا بہ فن اپنے اپنے علم کے" اصول و مسائل وضع کرتے رہتے ہیں۔ تخلیق کے کسی مظہر کی، ایک دیوانے کے ذہن میں سمائی ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اس کے پاس تنقید کرنے والا نفس نہیں۔ روز حشر اور قیامت کی کوئی حقیقت ہو کہ نہ ہو افراد کی ذہنی قوت جس حد تک ان کا ساتھ دے سکتی ہے، وہی حد ان کے تنقیدی شعور کی ہے اور وہیں تک وہ تخلیق کا اثر و تاثر برداشت کرسکتے ہیں۔ اس سے آگے ان کے لئے ہر چیز حشر خیز، اور قیامت ساماں ہے۔ جب بھی دنیا میں بے ترتیبی و قیامت کے آثار پیدا ہوئے ہیں علوم و فنون کے خلّاق ذہنوں نے نئے اصول اور نظام دے کر دنیا کو تہذیب کی نئی وحدت اور اکائی کے سہارے سنبھال لیا ہے۔ علوم کا تعلق تخلیق کائنات کی تفصیلات و جزویات سے ہے اور فنون کا تعلق تخلیق کائنات کی عمومیات و تاثرات سے۔ علوم جزو اور [illegible] سے بحث کرتے ہیں فنون کل اور اکائی سے۔ فنون مختلف النوع چیزوں کی تاثراتی تجرید و توحید کرتے ہیں اور علوم ان کی عقلی تحلیل و تکثیر۔

تخلیق کے سارے اصول فن شعر اور علم شعر پر بھی منطبق ہوتے ہیں۔ شعر ہی کیا کوئی فن ہو ــــ رقص، موسیقی، مصوری، سنگتراشی، ڈرامہ ــــ ہر فن کے ہر اعلیٰ فن پارے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ آرٹسٹ اپنے فن پارے کے سارے جزوی تاثرات کے ذریعہ کسی ایک مخصوص تاثر کی طرف توجہ مرکوز کراتا ہے۔ اسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے ایک نقطہ میں اس کا اظہار کر جاتا ہے۔ اس نقطہ کے گرد خواہ دائرہ ہو کہ مثلث، مربع ہو کہ مستطیل، اور وہ نقطہ خواہ وسط میں ہو خواہ اپنے گرد کے حلقے میں کسی مقام پہ ہو بہرحال اس کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے۔ وہ نقطہ اس ناق[illegible] تعین مرکزی مقام پر رہ کر، اپنے متناسب متوازن جزوی کیفیات اور فنی لوازمات کے ساتھ ابھرتا ہے اور اپنی خارجی ہیئت کے نظام کو سنبھالے ہوتا ہے۔ یہ توازن ہر آرٹ، ہر صنف اور ہر فن پارے کی جان یا روح رواں ہوتا ہے۔ اس کے بغیر تکمیل فن کا احساس ناممکن ہے اور اس پر تنقید عبث اور بے معنی۔ جزوی تاثرات اور اس ایک مخصوص تاثر کے درمیان آرٹسٹ کے خود اپنے ذہن کا پیدا کیا ہوا جو تناسب ہوتا ہے اس میں اگر کوئی کمی بیشی واقع ہوتی ہے تو اس فن پارے کے نقص کا سبب بنتی ہے اور تنقید کی زبان میں ابہام، اہمال، مبالغہ وغیرہ کا نام پاتی ہے۔ جس تناسب کا میں ذکر کرتا آیا ہوں یہ ریاضی کے مسلمات کے مطابق نہیں بلکہ تخلیق فن کے وقت یہ خود اپنے اصول اور معیار لے کر پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ شاہکار قدر اول کی چیز بن کے دوسرے فن کاروں کے لئے نمونے کی حیثیت اختیار کرلے تو کرلے لیکن وہ تناسب بڑی حد تک اس شاہکار کے لئے ہی مخصوص ہو جاتا ہے۔ اسی لئے آرٹ میں تک بندی، نقالی، صناعی، مرصع سازی، ہیئت پرستی، اکتساب وغیرہ اور سچی فن کاری کے درمیان وہی مدارج ہیں۔ ہر فن پارے کی وحدت تاثر کو سمجھنے کے لئے بنے بنائے مسلمات سے کام لینے کے بجائے، بیشتر خود اس کی مخصوص اثر آفرینی سے نتائج نکالنے پڑتے ہیں۔ انھیں تنقیدی نتائج سے جو کلیے بنتے ہیں ہم انھیں وسعت اور عمومیت دیتے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا اطلاق بڑھتے بڑھتے اس فن پارے کی صنف، پھر اس صنف کے فن، پھر اس فن کے دور، پھر اس دور کے رجحان اور معیار پسندیدگی وغیرہ پر کرتے جاتے ہیں۔ جلد ہی ایک وقت وہ آتا ہے کہ پھر کوئی اعلیٰ تخلیق اپنے معیار اور اصول لے کر وجود میں آجاتی ہے اور وہ تنقیدی مسلہ یا کلیہ اپنی وسعت و عمومیت کھو بیٹھتا ہے اور تاریخ ادب کے طالب علموں کی دلچسپی کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔

غزل جو بعض لوگوں کے نزدیک مختلف المضامین اور منتشر الخیال اجزا اور بے ترتیب تاثرات و کیفیات کا ناقص مجموعہ ہے اس میں وحدت تاثر تلاش کرنے کے لئے اور اصل بحث کی طرف آنے کے لئے میں نے بھی غزل ہی کے فن کی طرح بڑی دور سے مصرع لگایا ہے بالکل اس طرح جس طرح کہ بقولے امیر خسرو نے ڈول، چرخہ، کتا اور چولھا جیسے دور کے بے جوڑ اور انمل مضامین کے الفاظ میں ایک ربط پیدا کردیا تھا اور پورے شعر کی وحدت کو اس کے ایک مستزاد کے مصرع میں ظاہر کردیا تھا

"لا پانی پلا۔" یہی وہ نقطۂ ارتکاز ہے جس میں شاعر اپنے دل کی بات کہنا چاہتا ہے۔ یہی وہ وحدت تاثر ہے جس میں شاعر کا سارا مقصد بیان پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس نقطہ کی وضاحت کے لئے اور اسی نقطہ کی مرکزیت کی طرف توجہ مرکوز کرانے کے لئے بے ربط و غیر متعلق اشیاء مضامین میں شاعر نے اصلی نقطہ کے متناسب متوازن فضا تیار کی۔ اگر یہ وحدت تاثر نہ ہوتی تو یہ نقش ناتمام اور پُر از اہمال و ابہام رہ جاتا اور اس نقش کے بنانے میں جتنا بھی خون جگر صرف ہوا ہوا ایک دیوانے کے سودائے خام کا نتیجہ سمجھا جاتا کیونکہ دیوانہ مظاہر کائنات اور غیر متعلق اشیاء کے ربط و ترتیب' اور نظم و توازن کے جلال و جبروت کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس کی ساری جگر کاوی' بے ترتیبی و انتشار' حشر و خلل و فشار کی وحشت و دہشت کا ایک ردعمل ہوتی۔

شیکسپیر کو ایک قانونی نکتہ سوجھ جاتا ہے کہ "شرائط نامہ کی رو سے قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں مقروض کے جسم کے کسی حصہ سے ایک پونڈ گوشت کاٹ لیا جائے۔" اس میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ خون کا ایک قطرہ بھی ضائع ہو' صرف گوشت کا مطالبہ ہے۔ اس نکتہ سے متعلقہ نہ جانے کتنی جزوی تفصیلات کے ساتھ وہ مرچنٹ آف وینس جیسی عظیم تخلیق کرتا ہے۔ غور کیجئے کہ کیسے کیسے کردار' ان کی نفسیات' ان کی اخلاقی پستی و بلندی' عیسائی و یہودی قوموں کے باہمی تنازع' اس عہد کی سوسائٹی' مقروض اور مہاجن کے فرائض و حقوق' دوستی کا ایثار' دو حریف و متعصب قوموں سے ہیرو اور ہیروئن کے کرداروں کا انتخاب اور اس سے ڈرامائیت پیدا کرنا' ان کے عشق کے مسائل اور معیار' شائیلاک کا بہ حیثیت یہودی اور سرمایہ دار کے سماجی اقتدار' عیسائی زاویے سے اس کا انتقامی جذبہ اور ایسے ظالم شخص کی بیٹی کا بہ حیثیت ہیروئن کے ایک اعلیٰ انسانی کردار' خود شیکسپیر کی بہ حیثیت عیسائی' جانبداری اور یہودیوں کی طرف اس کا ردعمل' شائیلاک کے کردار میں شیکسپیر کی متعصبانہ اور فرقہ وارانہ جانبداری کا مظاہرہ' غرض ہزارہا نکات چھوٹے بڑے چاند ستاروں کی طرح ایک محور کے گرد گھوم رہے ہیں۔ سارے خطوط ایک ہی نقطہ سے نکل رہے ہیں اور وہیں آ کر مل رہے ہیں۔ ان سارے خطوط کا مجموعی تاثر اس مخصوص نقطہ کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے شائیلاک کا شرائط نامہ منسوخ ہو جاتا ہے اور یہ ڈرامہ فن کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔

یونان کے ایک مصور نے نمائش کے لئے اپنی ایک تصویر میں ایک شخص کے ہاتھ میں خوشۂ انگور دکھا کر اس کی طرف تصویر کی وحدت اور کمال فن مرکوز کیا تھا جس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ دیکھنے والے تو متاثر اور حیران تھے ہی اس خوشۂ تصویر کو سچے انگور سمجھ کر پرندے بھی ٹوٹ پڑے۔ لیکن یہاں بھی تصویر کے حقیقی ہونے اور اس کی فنی وحدت میں ایک نقص رہ گیا جس پر مصور نے اپنا سر پیٹ لیا کہ تصویر کا آدمی بے جان رہ گیا ورنہ پرندے کبھی نہ آتے۔

آگرہ کا قلعہ بھی اس جمالیاتی وحدت کے بغیر ایک عام حیثیت کا قلعہ ہوتا اگر اس میں اس چھوٹے سے شیشے کا مقام دریافت نہ کیا جاتا جس میں تاج محل پورے طور پر منعکس ہوتا ہے اور جس میں شاہ جہاں اسیری کے زمانے میں بینائی کمزور ہو جانے کے باعث تاج محل کا دیدار کیا کرتا تھا۔

راگوں کی تقسیم موسموں اور وقت کے اعتبار سے اس لئے ہے کہ ہر راگ اپنے مخصوص وقت پر پورے طور پر اپنا طلسم ظاہر کرتا ہے۔ رقص میں اگر پیر زمین سے بے تعلق ہوتے ہوئے بھی' پورے طور پر توازن اور آہنگ برقرار نہ رکھیں تو ان کی حیثیت ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے زیادہ نہ ہو۔

غرض اس طرح کی مثالیں ہر فن اور ہر فن کی تمام اصناف میں مل سکتی ہیں۔ کوئی فن اور اس کی کوئی صنف' وحدت تاثر کے بغیر وجود میں بھی نہیں آ سکتی۔ کسی صنف کا زوال خود اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ اس صنف کی وحدت تاثر کے یا تو معیار بدل گئے جن سے وہ صنف کچھ اور بن گئی یا اس کے پیدا ہونے کے امکانات ختم ہو گئے۔ اردو شاعری میں پہیلی' انمل' کہہ مکرنیاں' دوہے' برہا' ہولی' آلہا' بھجن' گیت' نوحہ' نعت' مرثیہ' سلام' قصیدہ' مثنوی' ہجو' غزل' ہزل' ریختی' سہرا' رباعی' قطعہ' دوبیتی' ترانہ' سانیٹ' نظم' بیانیہ نظم' آزاد نظم' سیاسی' انقلابی' اصلاحی' قومی نظمیں' نیچرل پوئٹری' منظوم ڈرامہ وغیرہ' مکالماتی نظم' ناولٹ' ایپک' غرض ہر صنف کے الگ الگ اپنے حدود ہیں اور وحدت تاثر کے مطالبات ہیں۔ ایک کے مطالبات دوسرے پر منطبق کرنا فن کی ابجد سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ہاں "مدعائے ضروری الاظہار" کی کوشش

میں اصناف کے سانچے بنتے ٹوٹتے بھی رہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص تجربے کے تحت شاعر نے ایک صنف میں کسی دوسری صنف کے اوصاف و محاسن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو لیکن ایسی صورت میں وہ نیا مرکب یا تو کوئی اور صنف بن چکا ہوگا — مثلاً غزل سے مستزاد، سہرا، سلام، قطعہ، ہزل، ریختی، غزل مسلسل، غزل مثلث کی اصناف وجود میں آئیں — یا پھر نامقبولیت کے سبب اسے ادبی تجربے کی صرف ایک منزل سمجھا جائے گا اور مستثنیات میں شمار کیا جائے گا، کلیوں میں نہیں۔ — مثلاً غزل، تشبیب بن کر قصیدہ سے نکلی لیکن غالب نے غزل میں وسعت بیان کی خواہش کا جواز ڈھونڈھ کر قصیدے کے اوصاف پیدا کئے تجمل حسین خاں کے لئے الگ سے قصیدہ لکھنے کی زحمت اور اس کی وسعت بیان کی کوفت سے بچنے کے لئے انھوں نے قصیدہ اور غزل کے معنوی ربط سے فائدہ اٹھالیا۔ بظاہر یہ ادبی تجربہ غالب کا ہی کارنامہ سمجھا جاتا رہا ہے کیونکہ خود انھوں نے تنگنائے غزل کا شکوہ بالاعلان کر دیا لیکن ان کے سامنے مصحفی کی ایک نظیر بھی تھی۔ غالب سے پہلے مصحفی یہی تجربہ بغیر کسی اعلان کے کر چکے تھے، غالباً اسی وجہ سے اس پر کسی کی نظر نہ گئی۔ ۵

خورشید اوج خوبی ماہ سپہر احساں
شمشیر جنگ یعنی مرزا محمدی خاں
ہو رش میں تیغ جس کی ہے جیسے برق خاطف
بخشش میں ہاتھ جس کا ہے جیسے ابر نیساں
کیونکر نہ ہر طرف سے تحسیں بلند ہووے
ہو مصحفی سا شاعر جس بزم میں غزل خواں

غزل میں وحدت تاثر تلاش کرنے میں انھیں لوگوں کو ناکامی ہوتی ہے جو عموماً نظم یا اسی طرح کی کسی اور توضیحی صنف کا مطالعہ غزل سے کرتے ہیں۔ ظاہر ہے نظم کی طرح کے تسلسل بیان، تنوع مضامین، تفصیل جزئیات، وحدت موضوع، کلائمکس، بند اور اشعار کی ساخت اور تعداد، انداز تخیل، جذبے کا پھیلاؤ، فکر کی ریزہ کاری اور دوسری خصوصیات غزل میں نہیں ملیں گی اور اگر ملیں گی بھی تو ان کی ترکیب مختلف ہوگی۔ غزل مسلسل کہنے والے عموماً وہی شعراء ہیں جو بنیادی طور پر نظم گو ہیں مثلاً جوش یا سردار جعفری کی مسلسل غزلیں۔ ان کی یہ مسلسل غزلیں بھی نظم کا سا روپ یا قطعہ بند کی صورت اختیار کر لیتی ہیں کیونکہ ان پر نظمیہ بیانیہ تخئیل کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے غزل مسلسل کی اچھی مثالیں حسرت اور جگر جیسے خالص غزل گویوں کے یہاں مل جاتی ہیں جن میں متغزلانہ تخئیل کی کارفرمائی ملتی ہے۔ حسرت نظم نہیں کہہ سکتے اور جوش غزل۔ حالی نے تو خیر مضامین غزل کے رکیک پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کے ایک خاص ڈھب کی غزلوں کی مخالفت کی تھی لیکن عظمت اللہ خاں، جوش، سردار جعفری اور ان کے ہم خیالوں کے اعتراضات کی نوعیت غزل کے معاملہ میں ان کے عجز کا پتہ دیتی ہے۔ صرف چند مثالیں اقبال، جمیل مظہری، اختر انصاری، فیض، مجاز، جذبی وغیرہ کی ایسی ملتی ہیں جن کو شعر کی کم و بیش ہر اہم صنف یا کم از کم، نظم اور غزل پر برابر کی قدرت حاصل ہے اور ہر ایک کے مطالبہ کے مطابق ان کی تخئیل کام کرتی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے نظم اور غزل کے تخلیقی عمل کے بنیادی فرق کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے اور غزل کی وحدت تاثر کو نظم کی وحدت تاثر سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

غزل کی وحدت تاثر کے معیار ہر دور میں بدلتے بھی رہے ہیں۔ جیسے جیسے زمانے کے رجحانات میں تبدیلی آتی گئی اور نئے مضامین شعر پیدا ہوتے گئے اس کی لفظیات میں تخصیص اور تغزل میں متنوع کیفیات کا انداز بھی آتا گیا۔ جو معیار عہد میر کی غزل کے لئے لازم آتا ہے وہ عہد غالب یا بیسویں صدی کی غزل پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ میر کے زمانے میں غزلیں مختصر ہوتی تھیں اور طویل غزلوں میں قطعہ بند ہوا کرتا تھا۔ چونکہ اس وقت غزل داخلی کیفیات کی ترجمان تھی، جذبے کا پھیلاؤ قطعہ بند کو نظم کا سا روپ دیتا تھا باقی ابیات غزل کی ہوتیں۔ یقین کے یہاں یہ صورت بھی نہیں۔ کوئی غزل ایسی نہیں جو پانچ شعر سے کم یا زیادہ کی ہو، قطعہ بند سرے سے ہی نہیں۔ برخلاف اس کے لکھنؤ اسکول، غالب کے زمانے اور خصوصاً بیسویں صدی کی ابتدا میں، لکھنؤ کے ہی اثر سے، غزلوں میں اشعار کی تعداد بڑھتے بڑھتے تیس تیس چالیس چالیس تک پہنچنے لگی، پھر دوغزلے اور سہ غزلے کا رواج عام ہوا (جس کی مثالیں میر و سودا کے یہاں بہت کم ہیں)۔ قطعہ بند نے الگ ہو کر قطعہ اور نظم کی صورت اختیار کر لی۔ قطعہ کو غزل سے الگ کرنے کی ایک شعوری کوشش غالب ہی کے یہاں ملنے لگتی ہے مثلاً ع ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے۔ اس کے بعد تو باقاعدگی سے قطعے لکھے جانے لگے۔ شاد عظیم آبادی، داغ، امیر، حسرت، اصغر

اس کی سبب سے اچھی مثالیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال نے شادؔ عظیم آبادی کی قطعہ نگاری سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ غزل کے ظاہری پیکر کی اس تبدیلی کے مطابق ہم کو ہر دور کی معیاری غزلوں میں وحدت تاثر تلاش کرنے کے لئے ویسے ہی معیار بنانے پڑیں گے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ہر غزل وحدت تاثر کی اعلیٰ مثال ہوتی ہے لیکن کم از کم ہر غزل میں وحدت تاثر کے آداب کا لحاظ ضروری ہوتا ہے خواہ اشعار مضامین کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر دور میں تقریباً ہر بڑے شاعر کے یہاں چند معیاری غزلیں جو اردو غزل کی آبرو ہیں ایسی ضرور مل جاتی ہیں جن میں وحدت تاثر، تغزل کے دیگر سارے مطالبات کے ساتھ ملتی ہے۔ ایسی غزلیں تلاش کر لینا زیادہ مشکل کام نہیں۔ ذوقِ صحیح و سلیم اور کلیات کا بالاستیعاب مطالعہ درکار ہے۔

اب میں اساتذہ سے لے کر شعرائے تا حال کے یہاں سے دو دو ایک ایک مثالیں دیتا ہوں۔ ہر غزل کا صرف ایک شعر یا ایک مصرعہ لکھنا کافی ہے۔ ارباب ذوق خود اندازہ لگا لیں گے کہ یہ غزلیں وحدت تاثر کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہیں یا نہیں اور شاعر کے خاص موڈ کی ترجمان ہیں یا نہیں۔

ولی۔ سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ

میر۔ یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
شیخ جی آؤ مصلےٰ گروِ جام کرو

سودا۔ گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
رحم اے آہِ شرر بار کہ جل جاؤں گا

مصحفی۔ آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

انشا۔ مجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

ناسخ۔ سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں

آتش۔ ہوائے دورِ مئے خوش گوار راہ میں ہے

غالب۔ دل جگر تشنۂ فریاد آیا
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
رہیئے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو
حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
کوئی امید بر نہیں آتی
دلِ ناتواں تجھے ہوا کیا ہے

مومن۔ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

داغ۔ ناز والے نیاز کیا جانیں

امیر۔ جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

حسرت۔ ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

فانی۔ دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اقبال۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں

شاد عظیم آبادی۔ ڈھونڈھو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

یگانہ چنگیزی۔ جب تک خلش درد خداداد رہے گی

جمیل مظہری۔ بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
تجھے حق نہیں کہ خفا ہو تو مری بے دلی نیاز پر
خدا مجھے آزما رہا ہے خدا کو میں آزما رہا ہوں

فراق۔ مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
مسافروں سے کہو اس کی رہگذر آئی

جگر۔ آئی جو ان کی یاد تو آئی چلی گئی
پرواز اسیر پہ پرواز نہیں ہے
چمن میں آ سکتی ہو پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی
شاعر نہیں ہو وہ جو غزل خواں ہے آج کل

اس دور میں فراقؔ کے بعد غزل گوئی میں بعد کی نسلوں کو متاثر کرنے والے اہم شعرا ایک طرف فیضؔ جذبیؔ ہیں تو دوسری طرف مجازؔ مرحوم جبکہ یہ تینوں ہی نظم پر بھی یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ فراقؔ و جگرؔ کے بعد غزل واضح طور پر بالکل ہی ایک دوسری نہج پر آجاتی ہے ۱۹۳۶ء کے بعد کی غزلوں کی سب سے

[illegible] ہے کہ تعداد اشعار کے لحاظ سے غزل مختصر ہوتی جاتی ہے
جو اس بات کا اشارہ ہے کہ شعرا نے غزل کے Lyricism یعنی
تغزلیت اور غنائیت پر زیادہ زور دیا ہے اور بڑی حد تک لکھنؤ اور
رامپور اسکول کے سلسلے کی شاعری سے غزل کو آزاد کرایا ہے۔ فیضؔ کے
یہاں غزل کے آداب تاثر اور نظام تاثر کی بڑی ابھرتی مثالیں ملتی ہیں اور
یہاں تک آنے کے لئے ان کو بھی غالبؔ ہی کی طرح بڑی کٹھن منزلوں سے
گذرنا پڑا ہے۔ غالبؔ اور فیضؔ کے ابتدائی کلام ناپختگی و نامقبولیت کی رو
سے ایک ہی درجہ کے ہیں۔ بعد کو فیضؔ کے یہاں بھی بڑا رچاؤ آجاتا ہے انکی
تقریباً پچھتر فی صد غزلیں بھرے پُرے انداز میں کہی گئی ہیں اور زبان زد
عام ہیں۔ فن کی جو اپنی ایک جمالیات ہوتی ہے جس پر غالبؔ نے بڑی مدت
بعد قدرت حاصل کی، فیضؔ کو بھی یہ ملکہ عرصہ کے بعد حاصل ہوا۔

موت اپنی عمل اپنا ہے نہ جینا اپنا
تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے
رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
گرمیٔ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو
روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں

یہی جمالیات فن مجازؔ کے یہاں دوسرے آہنگ سے ہے جو غالبؔ اور
فیضؔ کی طرح ایک عمر کی ریاضت کا نتیجہ نہیں بلکہ خود اس کی اپنی والہانہ اور
سرشار طبیعت کا بے اختیار اظہار ہے۔ عموماً مجازؔ کی کوئی غزل بھی اسکے
معیار سے نیچے نہیں آئی ہے ؎

کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے گردشِ دوراں بھول گئے
تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں
یہ میری دنیا یہ میری ہستی
رخصت اے ہمسفرو شہرِ نگار آ ہی گیا
جگر اور دل کو بچانا بھی ہے
کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا
دامنِ دل پہ نہیں بارشِ الہام ابھی

ع: ہم بھی خواہ سبھی کے ہیں بھلا ہو ساقی

غزل کی جمالیات کا یہ عمومی آہنگ ان شعرا کے دور کا خاصہ رہا ہے اور تغزل
پر تمرکز، اس دور کی غزل کی سب سے بڑی خصوصیت۔ جذبیؔ کے یہاں
بھی غزلوں میں تغزل اور تاثر کی وحدت کا پاس بے انتہا ہے۔ ان کی
غزلیں بھی مختصر ہوتی ہیں اور اشعار میں ایک قسم کا باطنی ربط و تسلسل ہوتا
ہے۔ یہ تسلسل مضامین شعر کا نہیں بلکہ جذبہ اور کیفیات کا، موڈ کا،
الفاظ کی نشست، ان کے صوتی آہنگ ترتیب کا، ہر شعر اپنی جگہ منفرد
کیفیت اور تجربہ کا حامل، لیکن مجموعی طور پر پوری غزل ایک اکائی بن کر
ابھرتی ہے۔ ان کے یہاں بھی غالبؔ کی طرح شعروں کے انتخاب پر بڑی
کڑی نظر ہوتی ہے۔ ذیل کی غزلیں ملاحظہ ہوں ؎

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارہ کرتے ہیں
مشعل تھے جو بحرِ ظلمت میں وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے
ملے مجکو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں

مجروحؔ سلطان پوری نے اس تغزل کو ایک سیاسی آہنگ سے
رچایا، لیکن تغزل و تاثر کی وحدت، آہنگ اور غنا کو برقرار رکھا۔
ان کی غزلوں میں ایک بانکپن ملتا ہے۔ ان کا اسٹائل اسی بانکپن سے بنا
ہے اور اسی لئے وہ اگرچہ چھوٹے پیمانہ پر مگر منفرد غزل گو ہیں۔ ان کی بھی تو
غزلیں وحدت تاثر سے خالی نہیں ؎

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ختم شورِ طوفاں تھا دور تھی سیاہی بھی
اہلِ طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں

اب ان پر فیضؔ کا اثر بھی خاصا نمایاں ہے اور یہ کسی حد تک اچھی بات
بھی ہے کیونکہ ان کے ڈکشن میں کہیں کہیں کھردرے پن کا جو احساس
ہوتا تھا وہ اب دور ہو چلا ہے۔ کاش وہ شاعری کی طرف زیادہ توجہ
کر سکیں اور اسے پیشے سے زیادہ عبادت سمجھیں۔

[illegible] سے پہلے تک کے باقی شعراء یا تو سودا و جعفری کے سلسلے میں آتے ہیں یا جوش، جذبی، مجاز، فراق وغیرہ کے حلقۂ اثر میں ہیں لیکن [illegible] کے بعد واضح طور پر غزل کا معیار تغزل پھر بدلتا ہے نوجوانوں کے ذوق مطالعہ اور کلاسکس کی چھان بین نے جدید غزل پر پھر اپنا اثر ڈالا پیروی میر و غالب و فراق نے جدید غزل کے حدود متعین کئے۔ اگرچہ شاعروں کی بڑی تعداد نقالی سے آگے نہ بڑھ سکی لیکن ان میں بھی خصوصیت سے چند شاعر اپنی آواز کو پہچانتے رہے اور تقلیدی رنگ کے باوجود کبھی کبھی اپنا رنگ بھی چمکا سکے۔ ان میں سے بعض خاصے پرانے ہیں لیکن ان کی شاعری کی مقبولیت ادھر کوئی دس بارہ برسوں میں ہوئی۔ مختار صدیقی، باقی صدیقی، ناصر کاظمی، مجید امجد، خلیل الرحمن اعظمی، ابن انشا، مصطفےٰ زیدی، جمیل حشمی، ظفر اقبال، مشفق خواجہ وغیرہ نے جن میں سے بعض شعراء نظم گو بھی ہیں غزل کو نئی سمتوں سے آشنا کرایا ہے اور اس کی "جاگیر داریت" (بقول ڈاکٹر عبدالعلیم) اور "کٹھ پن" (بقول مجنوں گورکھپوری) پر بہت کچھ قابو حاصل کیا ہے۔ ناصر کاظمی کی متعدد غزلیں اور یہ غزل ؎

گلریز میری نالہ کشی سے ہے شاخ شاخ
گلچیں کا بس چلے تو یہ فن مجھ سے چھین لے

بھرپور تاثر کی اچھی مثال ہے۔ حال ہی میں مشفق خواجہ کی ایک غزل دیکھنے میں آئی جس کا مطلع ہے ؎

دل کو پیغام سکوں تیری نظر نے نہ دیا
زندگی چھین لی اس طرح کہ مرنے نہ دیا

پوری غزل اسی آہنگ و آداب سے آگے بڑھتی ہے۔

غزل کے ارتقا کے اس خاکے پر ایک ہلکی نظر بھی ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں معیار تغزل بدلتا رہا ہے اور غزل تعداد اشعار کے لحاظ سے بھی مختصر ہوتی گئی ہے۔ اسی نسبت سے تغزل کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور پاکیزہ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ وحدت تاثر رکھنے والی بھرپور غزلیں (جن کا غزل مسلسل سے کوئی تعلق نہیں اور ان سے مختلف ہوتی ہیں) جن کی کچھ مثالیں پیش کی گئی ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شعر منفرد بھی ہے اور دوسرے اشعار سے منسلک بھی۔ باوجود اسکے کہ ہر شعر کا مضمون مختلف ہے، تجربہ مختلف ہے، کیفیت کا بیان مختلف ہے،

اور ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل تصویر ہے مگر تمام اشعار مل کر بھی ایک تصویر بناتے ہیں اور غزل کو ایک اکائی کی حیثیت بخشتے ہیں۔ وہ کون سا عنصر ہے جو اس باطنی تسلسل کا ضامن ہے بتانا مشکل ہے غزل ہم آہنگی، فضا، موڈ، کیفیت، جذبہ، فکر، دلکشی، بحر، ردیف و قافیہ غرض تخلیق شعر میں جتنے عوامل و عناصر کی کار فرمائی ہوتی ہے، وحدت تاثر کی تکمیل میں ان سب کا ہاتھ ہوتا ہے، وحدت تاثر ان تمام کا مرکب ہے۔ کسی ایک پر وحدت تاثر کا دارو مدار نہیں۔ جس شاعر کے یہاں جس قدر بلند تنقیدی شعور، قوت انتخاب، محسوسات اور جمالیاتی گرفت ہے اتنی ہی اس کی پوری پوری غزلیں مقبول عام رہی ہیں اور ہر محفل میں پڑھی اور گائی جاتی رہی ہیں (میں اسے معیار نہیں بنا رہا ہوں، یہ اس کی مقبولیت کا صرف ایک پہلو ہے)۔ ان خوش نصیبوں میں غالب، داغ، اقبال، حسرت، جگر، فیض، مجاز کے نام خصوصیت سے لئے جا سکتے ہیں۔

معیار تغزل اور اسی نسبت سے وحدت تاثر کے بدلتے رہنے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ قدیم زمانے میں لے دے کر سب سے زیادہ اہم صنف غزل ہی تھی جو ہر طرح کے خیالات اور مضامین کا ذریعۂ اظہار بنی ہوئی تھی۔ میر کے زمانے میں عشق کی وارداتوں کے ساتھ امرد پرستی کے چرچے شیخ سے چھیڑ چھاڑ، تصوف کے نکات، دلی کا مرثیہ غرض ہر طرح کے مضامین غزل ہی کے ذریعہ ادا ہوتے تھے یا مثلاً میر کا یہ شعر بھی غزل ہی کا ہے ؎

یاں لپیٹیں نکل گیا واں غیر
اپنی ٹکی لگائے جاتا ہے

غزلیں البتہ مختصر ہی ہوتی تھیں کیونکہ داخلی رنگ زیادہ غالب تھا۔ غالب کے انتخابی ذہن نے غزل کی مختلف سطحیں بنائیں۔ ان کو شعروں کے انتخاب کا بڑا شعور تھا اسی وجہ سے وہ بیشتر میر سے بازی مارلے جاتے ہیں۔ انکی تقریباً ہر غزل کا موڈ ایک دوسرے سے مختلف ہے اور اپنی جگہ مکمل ہے نیز ایک الگ تجربے کا ترجمان ہے۔ ایک طرف :-

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن

ہے تو دوسری طرف :-

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ایک طرف اگر یہ ہے کہ :-

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

[illegible]

مجھ کو دیا ہے غم دل [illegible] نہ بنے

[illegible] غالب' چودھویں بیگم کا نوحہ اور یہ قطعہ جن کا ذکر ہو چکا ہے'

ع ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

[illegible] ایک ہی قسم کی داخلی سطح رکھنے کے باوجود اپنے اپنے طور میں مختلف ہیں۔ غالب کو اصناف فن اور فن کے نکھ سکھ پر بڑی قدرت حاصل تھی اور انھیں اپنے جذبات اور محسوسات کی مختلف سطحیں بنانے کا شعور رکھتا ہی تو ہے کہ ان کی غزلیں ان کی رنگا رنگ شخصیت اور تہہ داری جذبات کی الگ الگ آئینہ دار ہیں۔ مہر کی یہ خوش سلیقگی میر کے حصہ میں نہیں آئی اور اگرچہ میر کے کلام میں عیب بھی ہنر سے ملتے ہیں مگر بہرحال عیب ہیں۔ غالب کے ہمعصر مومن اور ان کے بعد داغ، حالی، شاد، اقبال، یگانہ چنگیزی، آرزو، حسرت، فانی، جگر، فراق اور ترقی پسند دور کے غزل گو شعراء فیض، مجاز، جذبی، مجروح اور ان کے بعد کے غزل گو ناصر کاظمی، باقی صدیقی وغیرہ یہ وہ شعراء ہیں جن کے یہاں الگ الگ غزل کے بعض مخصوص رجحانات ملتے ہیں۔ تغزل کی خصوصیات، غزل کی لفظیات، تجربہ کی نوعیت، جذبہ اور تخئیل کو برتنے کا انداز، موضوع کا انتخاب، کیفیات کی تازگی اور بیان کی انفرادیت کا جہاں تک تعلق ہے، ہر شاعر کے الگ الگ اپنے دائرے ہیں۔ ان میں سے ہر جدید شاعر اپنے پیشروؤں کا خوشہ چیں بھی ہے لیکن اپنے معیار تغزل کا خالق بھی۔ اس لحاظ سے ہر ایک کے یہاں ہم وحدت تاثر کے الگ الگ انداز پاتے ہیں کیونکہ ہر ایک کا تغزل دوسرے سے مختلف، ہر ایک کا انسانی جذبات کو چھونے کا طریقہ جداگانہ ہے۔

حالی کی اصلاح سے اور نظم گوئی کے عمومی رجحان سے غزل کے سر کا بوجھ بہت کچھ کم ہو گیا۔ جیسے جیسے دوسری اصناف نظم مقبول ہوتی گئیں غزل کے بہت سے جزوی اور ذیلی مضامین ان میں جگہ پاتے گئے اور غزل زیادہ سے زیادہ تغزل کی وحدت اور باطنی تسلسل کی طرف آتی گئی۔ آج اگر کوئی یہ سوال اٹھاتا ہے کہ بیسویں صدی میں میر و غالب جیسا کوئی غزل گو کیوں نہیں پیدا ہوتا تو وہ غلطی پر ہے۔ بیسویں صدی کی غزل یقیناً میر و غالب کے عہد سے آگے بڑھی ہے کیونکہ اب اس نے تغزل کے وہ معیار پیدا کئے ہیں جو پہلے

نہ تھے۔ آخر حسرت نے غزل کے ناصحانہ، عاشقانہ، متصوفانہ وغیرہ دائرے کیوں قائم کئے تھے؟ صرف اس لئے کہ غزل کے متفرق اشعار تاثر اور فضا اور اثر پذیری میں مخالف سمتیں نہ رکھیں اور ان کے انتشار پر پورا پورا قابو حاصل کیا جا سکے۔ غزل میں زیادہ سے زیادہ وحدت تاثر قائم رکھی جا سکے۔

حسرت کی یہ تقسیم اگرچہ مضامین شعر اور موضوع شعر کے اعتبار سے تھی لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے جزوی عناصر ہیں جن کا مجموعی تمرکز وحدت تاثر کو متعین کرتا ہے۔ بحر، ردیف، قافیہ، تعداد اشعار، صنعتیں، تشبیہ و استعارہ، محاورہ و روزمرہ، مضامین شعر، مقصد و نظریۂ شعر، شعر کی موسیقی و آہنگ، تلمیح، واقعات و محاکات، جذبہ و فکر، وجدان و شعور، محسوسات و معلومات، نفسیاتی تاثرات، تجربے کی شدت، غرض تہہ در تہہ اور نو بہ نو پہلو ہیں جو غزل کی نہ صرف ظاہری ہیئت کو متاثر کرتے ہیں بلکہ اُس کے نفس پر بھی اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ آخر غزل پر ردیف و قافیہ کی قید کے قدیمی التزام کے باوجود شعراء کیوں نہیں غزل میں ردیف و قافیہ سے آزاد ہو جاتے، اس سے دست بردار ہونے کی بجائے بعض دوسرے تاثرات و خیالات کی ادائیگی کے لئے جو نظم کا پیکر چاہتے ہیں، کیوں آزاد اور معرّا نظم کا سہارا ڈھونڈھ لیا گیا اور غزل ردیف و قافیہ کے اپنی جگہ پر رہی۔ ردیف و قافیہ بجائے خود غزل میں وحدت تاثر کی تکمیل میں جس طرح ممد و معاون ہوتے ہیں مذکورہ مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے لیکن یہاں واضح کر دوں کہ "گھوڑا سانپ کا" "فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں" "مکس کی تیلیاں" "شراب میں سانپ" وغیرہ قسم کے ردیف و قافیہ نہیں۔

یار دمجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں

یا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

یہاں ردیف "میں نشے میں ہوں" اور "میرے بعد" ان غزلوں کا مرکزی نقطہ یا "عنوان" بن جاتی ہے جو غزل کی ساری فضا پر محیط ہے اسکے تاثرات کو منتشر نہیں ہونے دیتی، کیفیات کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔ اور ہر شعر کے اپنی جگہ مکمل اور منفرد ہونے کے باوجود اُن کے درمیان

(بقیہ مضمون صفحہ [illegible] پر)

سوداکے مرثیے

مسیح الزماں

سوداکے کلیات میں ان کے مرثیوں کی تعداد ۲ ۷[1] ہے جن میں چھ منفرد مسدس اور چھ مخمس ہیں، چھ متفرق شکلوں میں اور اڑتالیس مربع ان کے علاوہ بارہ سلام ہیں۔ یہ تعداد خود ہی بتاتی ہے کہ مرثیہ گوئی سوداکے لئے رسمی، تفریحی یا ضمنی حیثیت نہیں رکھتی تھی نہ انھوں نے محض اعتقاداً اس کی طرف توجہ کی۔ ان کے رسالہ سبیل ہدایت سے بھی فنِ مرثیہ گوئی پر ان کی توجہ اور سنجیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا ہوا ہے کہ گوہرِ سخن عاصی
زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے۔ اس مدت میں مشکل گوئی
وقیقہ سنجی کا نام رہا ہے اور سدا مرغِ معنی عرش آشیاں
گرفتار دام رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مشکل ترین دقائق طرق
مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی
سے دیا چنانچہ اس کام میں محتشم سا کسو نے عز قبول نہیں
پایا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کے
ذکر برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے "

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ گوئی اس عہد میں عام ہو جانے کے باوجود محتشم کاشی کا فارسی مرثیہ سب سے مقبول تھا اور اردو میں اس صنف کی ادبی اہمیت کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ سودا جیسے قادر الکلام شاعر کو چالیس برس کی مشق سخن کے بعد بھی مرثیہ اپنے مختلف تقاضوں اور خصوصیات کی بنا پر مشکل ترین فن نظر آیا جس سے عہدہ برآ ہونے کی انھوں نے پوری کوشش کی۔

مرثیہ اس عہد میں بھی تجرباتی دور سے گذر رہا تھا۔ سودا کے مراثی پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ہیئت اور مواد میں بہت سے تجربے کئے۔ سماج کے تانے بانے میں اس کی جڑیں تلاش کیں اور ایک ہوشیار صناع کی مانند اسے طرح طرح سے ڈھالا۔ موضوع کے اعتبار سے جناب قاسم کی شادی سب سے زیادہ ان کی توجہ کا مرکز بنی ہے۔ جابجا مرثیوں میں اس کی طرف اشاروں کے علاوہ مندرجہ ذیل مرثیے پورے کے پورے اسی کے متعلق ہیں:۔

(۱) یا رو ستم تو یہ سنو چرخ کہن کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (مربع)
(۲) نئی یہ شادی بیاہ کی کس کے تو نے فلک اٹھائی ہے ۔ ۔ (مربع)
(۳) کہا یہ دل کو میں راضی ہے کیوں تو چشم پرنم ہے ۔ ۔ ۔ (مخمس)
(۴) جا دو بھرے اے بنرے قاسم بنری گھر میں روے (مسدس)
(۵) کیا کروں شادی قاسم کا میں احوال رقم ۔ ۔ ۔ ۔ (مسدس)
(۶) ہے قاسم کو مہندی لگانے کی نہ دی فرصت ۔ ۔ ۔ ۔ (مربع)
(۷) کس دن اس شادی نے پایا تھا قرار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (مربع)
(۸) کہوں کس سے فلک کی بے وفائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (مربع)

ان مرثیوں میں شادی کی خالص ہندوستانی رسموں کی رعایت مدنظر رکھ کر شہادت قاسم کا بیان سودا نے اس طرح کیا ہے کہ ان میں بڑا درد پیدا ہو گیا ہے۔ لگن دھرنا، منڈپ چھانا، مہندی، ساچق، بری

---

[1] سودا کے مطبوعہ کلیات میں ان کے مرثیوں کے ساتھ ساتھ ان کے خاص شاگرد میر آلِ کے مراثی بھی شامل ہو گئے ہیں۔

جلتی جانے کس ساعت بیچ کھی نئے کے پنگ کی پاٹی   پاؤں کے گھٹا سیر تیری اب جو تھانے گون کانی

کیا کیجئے جو بیان کرے ہے منسے مل مل کے مانی   سُن سُن کر یہ باتیں اُسکی پھاتی ہے میری پھاتی

کیوں نہ طوں میں رانڈ ہو کہ ستے آج کھبھوت

جس کی بیاہی ساس جی موا تھا را پوت

شادی کے بعد دولھا یا دلھن کے گھرانے میں اگر کوئی حادثہ ہوجائے تو عورتیں خاندان میں شامل ہونے والی نئی فرد کو سبز قدم یعنی منحوس کہتی ہیں۔ سودا نے یہ نفسیاتی نکتہ بھی پیش کیا ہے۔

ماں کہتی تھی دلھن کی یہ رو رو کے بلک ہم   بیٹی کے رنڈاپے سے بھی ہے مجھ کو بڑا غم

اب لوگ کنم کے یہی کہتے ہوں گے باہم   اس دولھا کو پیرا نہ ہوا نیک دلھن کا

شادی کے تلازمے کے علاوہ سودا نے مرثیوں میں اور رعایتوں کا بھی خیال رکھا ہے۔ تلازمے میں شاعر کو سوچ سوچ کر مضامین پیدا کرنے کی بڑی گنجائش ہوتی ہے جس سے اس کی مضمون آفرینی کی داد ملتی ہے اور جدت ادا کے پہلو نکلتے ہیں۔ قصائد کی تشبیہوں میں سودا کی اس صلاحیت کی طرف لوگوں نے اشارے کئے ہیں مگر مرثیوں پر توجہ نہیں کی گئی۔ ان کے مرثیے بھی اس پہلو کے اچھے نمائندے ہیں۔

فلک نے کربلا میں ابر جس دم ظلم کا چھایا   کمان جور کو قوس قزح کی طرح چڑھوایا

سوا پیکاں کے اک قطرہ نہ اس ظالم نے برسایا   کہوں کیا تیر یا ماں سے بچی کے گھر کو ڈبوایا

پپیہا منہ میں لاکر واں کہیں بوند پانی کی   بلے ہے آگے ہر اک نقش پر کتا ہوا پی پی

پئے پانی تو وہ کوئی کہ جس کے تئیں ہو دے جی   ترحم لیکن اس کے دل میں انکے حال پر آیا

نین سے نرگس کے نیند ایسی گئی الم سے کہ پھر نہ آئی

کہانی کہہ کہہ کے طوطی ہاری تھکا ہے ہر چہ بھی دے ہنکارے

تمام سرو آج پا نوپکے کھڑے ہوئے آہ بھر رہے ہیں

پلک کے اور رنگ اپنی پگڑی برہنہ سر ہو گئے ہیں سارے

یہ رنگ نالے کا ہے الم سے ہر ایک بلبل کا شاخ اوپر

کسی کی جس طرح نعش اوپر کھڑا ہو نوحہ کرے پکارے

کوئی یہ سوچے تو یار و سوسن کی نیلی کسوت کا کیا ہو موجب

سبب اس آشفتگی سنبل کا دل میں اپنے کوئی بچارے

ملا کے مالی میں جیسے پانی لحد کے بھرنے کو سانتے ہیں

چمن میں رو رو کے رات شبنم اسی طرح سے کرے ہو کا ہے

بنی ہے نرگس کے نگی یوں طرف ہزار کے ہر چمن میں

کہ لوتھ جس طرح خون ناحق کی ہو کے حیران کوئی نہارے

ادھر جو دیکھو تو صحن گلشن میں ڈھاڑ مار آبشار رو دیں

اُدھر کناری سے موج جو کے حباب ہر ایک پیٹ مارے

ان اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سودا نے اس مرثیے میں حسن تعلیل کی مدد سے چمن کی ایک ایک چیز پر غم حسین کا اثر دکھا کر قدرت کلام اور طباعی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں میں بھی غم والم کی فضا برقرار رکھی ہے جس سے پوری نظم کا تاثر کامیاب ہے۔

واقعات کربلا میں یوں تو سب ہی واقعے دردناک ہیں لیکن چھ مہینے کے بچے علی اصغر کی شہادت اکثر دلوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ اس کی بے زبانی، معصومیت، بھولا پن، اور تین دن کی پیاس میں پانی کے لئے طرف ہونٹوں پر زبان نکال دینے کے تصور پر اسے سہ شعبہ تیر سے ہلاک کر دینا بڑی بے دردی ہے۔ سودا نے دو مرثیے خاص اس موضوع پر لکھے ہیں۔ ان میں ماں کا نفسیاتی نکتہ پیش نظر رکھ کر انھوں نے معصوم بچے کی ماں کی زبانی اس کی شہادت کا بیان کیا ہے اور گھریلو زندگی کے مخصوص اشاروں سے درد کے پہلو پیدا کئے ہیں۔

ہاتھ سر پہ لئے شام سے اس کے رکھتی تھی میں صبح تک

اس خطرے سے شاید گردن نیچے پڑے جائے ڈھلک

یوں نہ ہوا سونے میں اسکے میری پلک سے لاگے پلک

جو بچہ درد اوائے دریغا سو بچا یوں مر گئے لو

یاد آوے گا کرتا اس کا بیٹھ کے جب کچھ سیوں گی

خاطر میں لا پیاس میں اس کی گھونٹ لہو کے پیوں گی

جلتی رہوں گی غم سے تس دن اب جیتک میں جیوں گی

ہو بچہ درد اوائے دریغا داغ جگر پہ دھر گئے لو

دوسرے مرثیے میں لوری کی بحر نے ایک خاص بات پیدا کر دی ہے۔ ماں کی ممتا کی تصویر کشی کے لئے غالباً لوری سے بڑھ کر اور کوئی شکل نہیں

جب ماں اپنے بچے کو گود میں لے کر سلاتی ہے اس وقت اس کی ساری محبت، اس کی مرادیں، اس کے ارمان اس کے دل و دماغ پر حاوی ہوتے ہیں۔ اسی لئے لوری کے بول اور تے ہیں اس کا پیار، اس کی جاں سپاری اور اس کے ایثار کا وہ انمول خزانہ جھلکنے لگتا ہے جو دنیا میں سب کو ہمیشہ اور یکساں مدت کے لئے نہیں ملتا۔

رونا میں کس کو بہلاؤں دودھ تھپک کر کس کو پلاؤں
جھاتی آگے کس کو سلاؤں جھولے میں اب کس کو جھلاؤں
تجھ بن میرے نور العین!
کیونکر ہو اس دل کو چین!

بچے کو جو چھڑیا گنوائے جنگل جنگل ڈھونڈنے جائے
دانہ پانی اس کو نہ بھائے رین بسیرے نیند نہ آئے
تجھ بن میرے نور العین
کیونکر ہو اس دل کو چین

جاگ پیارے ہوئی اویر سوت لالا اتنی دیر
مجھ ماں سے مت آنکھیں پھیر زیست سے مجھ کو مت کر سیر
تجھ بن میرے نور العین
کیونکر ہو اس دل کو چین

جناب قاسم اور حضرت علی اصغر کے علاوہ اور شہدا کے حال میں بھی سودا نے پورے پورے مرثیے لکھے ہیں۔ کسی شہید کے حال میں پورا مرثیہ شمالی ہند میں سب سے پہلے لکھنے کا سہرا سودا ہی کے سر نظر آتا ہے۔ پسرانِ مسلم کے حال کا مرثیہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

بلا کر صبح کو میں مضطرب الحال نسیم پوچھا کیوں ڈھونڈتی ہو آج تو یہ ہفت اقلیم
تو نے مسلم کے سنے ہوویں گے دو تھے جو یتیم ایک کا نام محمد تھا دوم ابراہیم

اس کے علاوہ "فلک نے کربلا میں ابر جس دم ظلم کا چھایا" میں حضرت عباس کی شہادت کا بیان ہے۔ ان کا میدان جنگ میں جانے کی اجازت طلب کرنا، رخصت ہونا، جنگ کرکے دریا پر پہنچنا مشک بھر کر خود پانی پینے کے ارادے سے چلو میں بھرنا اور پھینک دینا، نرغۂ اعدا میں پڑ کر جنگ کرنا، باری باری ان کے ہاتھ کٹنا، مشکیزے پر تیر لگنا، زخموں کی کثرت سے زمین پر آنا، امام حسین کا بھائی کی آواز سن کر میدان میں پہنچنا، اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مرثیے کے وہ تمام اجزا آگئے ہیں جو لکھنؤ میں اس کے عناصر قرار پائے۔ فرق ہے تو اتنا کہ یہاں سودا نے مربع کی شکل اور اختصار مدنظر رکھا ہے۔ صحیح اندازہ تو طویل اقتباس سے ہی ہو سکتا ہے جو یہاں ممکن نہیں۔ جگہ جگہ سے کچھ بند لکھے جاتے ہیں :-

اجازت طلب کرنا

طلب کی رخصت آ بھائی سے کہ میداں کی تیاری کیا عرض اب جیے چا ہوا ہے سوتیو علم داری
یہی آئی ہو دل میں ہر سن عورات کی زاری دیا سر یا تو میں دریا پہ جایا مشک بھر لایا

میدان میں آنا

چلا عباس جب قربوس زیں پر مشک کو دھر کر تو لائے رو بہ میداں کا فراس کے قصد پر اکثر
رکھا جس نے قدم تک آ کے اپنا چھوڑ کر لشکر جہنم کو اسے وہیں اجل کے ہاتھ بھجوایا

جنگ

نہ مانا جب تو پیٹھا فوج میں وہ اشجع عالم لگی تب صف بہ صف لشکر کی ہونے درہم و برہم
جدھر کو رخ کیا کشتوں کے پشتے واں لگے اسدم اُدھر خوں کے بہے نالے جدھر اس کا پڑا سایا

کہوں کیا جس طرح چھایا تھا ابر آہن کا اس جا پر سناں پر تیغ برسے تھی پڑی اور تیغ پر خنجر
نہ جانے آہ واویلا کہ اس میں کن نے واں آ کر حوالے تیغ کی اس کے کہ دست چپ لٹک آیا

سودا کی طبیعت ہمہ گیر تھی۔ انھوں نے مرثیہ گوئی میں کسی مقرر راستے پر چلنا پسند نہیں کیا بلکہ اس صنف کو ادبی حیثیت دینے کے لئے مختلف راستوں میں اس کے بڑھنے اور پھیلنے کے امکانات پر غور کیا اور اپنی ذہانت و جودت فکر سے نئے نئے پہلو نکالے جن کو بعد کے شعرا نے ترقی دی۔ ان کی حالت کم و بیش ایسے آدمی کی ہے جو کسی غیر آباد جزیرے میں پہنچ کر ہر طرف دوڑتا، ہر زمین کو آزماتا، ہر درخت کو پھیلتا نظر آئے تا کہ مختلف تجربوں کے بعد آنے والوں کو اس سرزمین کی واضح صلاحیتوں کا علم ہو جائے اور وہ اپنی ضرورتوں کے پیش نظر ان کا صحیح مصرف کر سکیں۔ اس مختصر جائزے میں سودا کے مراثی پر تفصیل سے لکھنا ممکن نہیں حقیقت یہ ہے کہ ان کا تقریباً ہر مرثیہ ایک نہ ایک پہلو رکھتا ہے۔ کسی میں سوال و جواب ہیں، کسی میں نیچر کی زبان، کہیں کسی غیر متعلق آدمی کی طرف سے واقعہ کربلا کا بیان ہے۔ ایک مرثیے میں امام حسین شہادت کے لئے روانہ ہوتے ہوئے وصیت کرتے ہیں، دوسرے

میں امام حسین کو میدان جنگ میں جانے کے وقت ان کی بیوی انھیں روک کر بین کرتی ہیں۔ ایک اور جگہ ان حالات کا بیان ہے جب بعد شہادت اہل حرم مدینے واپس جائینگے تو وہاں کے لوگ کیا کیا کہیں گے، وغیرہ وغیرہ۔

سودا کو اس کا احساس تھا کہ مرثیہ کا تعلق عوامی زندگی سے ہے۔ اس کے سننے والے غیر تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سودا جو قصیدوں میں اتنی مشکل زبان استعمال کرتے ہیں مرثیوں میں مغلق اور مشکل الفاظ سے حتی الوسع اجتناب ہی نہیں کرتے بلکہ ان میں وہ برج بھاشا اور عوامی بول چال کے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو شاعری کے دوسرے اصناف میں نایاب ہیں۔ وہ مرثیے کی ادبی سطح اٹھانا ضرور چاہتے ہیں لیکن اس ترقی میں وہ اسے ان عوام سے الگ کرنا نہیں چاہتے جن پر اس صنف کی ترقی کا انحصار ہے۔ ایک مرثیہ تو انھوں نے پورا پنجابی میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد مرثیے برج بھاشا کے مصرعوں سے دوہرہ بند کئے ہیں۔ وہ یہ نفسیاتی حقیقت جانتے ہیں کہ عوام اسی چیز کو اپنائیں گے جس میں ان کی اپنی روزمرہ زندگی کی جھلک ملے اور جس کے واقعات و کردار ان کی اپنی فضا اور ماحول سے مطابقت رکھتے ہوں۔ یہ بات انھوں نے مرثیوں کی بحروں اور الفاظ کے انتخاب میں بھی مدنظر رکھی ہے کہ عوامی گیتوں کی لے برقرار رہے۔ مثالوں کا تو موقع نہیں، صرف چند مرثیوں کے مطلعوں ہی سے اس کا اندازہ کیجئے۔

۱۔ بانو کہتی تھیں کہ رن کا قصد مت کر سائیاں
۲۔ چمن میں آئی ہو کیسی یہ رت مرے نین سے کوئی نہارے
۳۔ جاؤ بچھڑے اے بنڑے قاسم بنڑی گھر میں رو دے
۴۔ کہتی ہو بانو پیٹ کے سر کو اصغر میرا ہر گئے لو
۵۔ سُن لو میاں جس دن جگ کے خون نین سے جا رہی ہے
۶۔ سیمت از اقربا بن میں بلا کے کس کا باسا ہے
۷۔ ماں اصغر کی دن اور رین
۸۔ کاسیں کہئے بات کون سن کے بوجھے

سودا کی شخصیت اردو مرثیے کی تاریخ میں اس پہلو سے سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے اپنے پیش روؤں سے کیا پایا اور اخلاف کے لئے اسے کتنا آگے لے جا کر چھوڑا۔ مرثیے کے ادبی پہلو پر زور دے، انھوں نے اسے شاعرانہ نزاکتوں سے مالا مال کیا، نئے تجربوں سے اس کے امکانات واضح کر کے زمین کو نئے گل بوٹوں کے لئے تیار کیا اور تخیل و احساس کے نئے سرچشمے ڈھونڈ نکالے۔ پھیکی نظموں کے باوجود آزاد اور حالی کو جدید شاعری میں جو درجہ دیا جاتا ہے وہ ان کے نئے تجربے، نئی تلاش اور نئے راستے پر جانے کی وجہ سے جس نے بعد کو اقبال اور جوش کی بلندیاں حاصل کیں۔ مرثیے میں ترقی کی داغ بیل ڈالنے میں سودا کی بھی وہی اہمیت ہے جس نے لکھنؤ میں انیس وغیرہ کے ہاتھوں معراج پائی۔

✡

غزل میں وحدت تاثر

(بہ سلسلہ صفحہ ۳۶)

تعقید نہیں پیدا ہونے دیتی۔ یہاں غور طلب بات یہ بھی ہے کہ ان غزلوں میں ردیف "عنوان" بننے کے باوجود یہ غزلیں نہ تو نظم ہیں نہ قطعہ اور نہ ہی غزل مسلسل بلکہ صرف غزل اور بھرپور غزل۔

غالب کی ذیل کی دونوں غزلوں کا موازنہ کیا جائے تو ایک کے غزل اور دوسری کے غزل مسلسل ہونے کے فرق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

ع حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

اور

ع عشق سے میرے ہے مجھکو بیقراری ہائے ہائے

غزل میں وحدت تاثر کی پرکھ کرنے کے لئے ہر دور کے معیار، ہر دور کی غزلوں کے مزاج، ظاہری ساخت، ردیف و قافیہ و مضامین، شاعر کی سطح اور شخصیت، ارتقائے غزل میں ذہنی و کیفیاتی تبدیلیاں غرض بہت سے اعتبارات کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔

زندگی کے لمحات

سید صدیق حسن

عہدِ ماضی کے وہ حسیں اوقات
جن میں طوفاں بدست تھے جذبات
ہر نظر جب پیام تھی دل کا
ہر نفس انبساط حاصل تھا
ایسے لمحے رواں دواں گذرے
یاد البتہ ان کی باقی ہے
اے مرے ماہرانِ نفسیات
کیا وہی زندگی کے تھے لمحات؟
کوئی بے ساختہ سی اٹھتی نظر
دل کی رگ رگ کا جائزہ لیکر
ہوتی ہے دلبری کا جوشہ کار
فاش کرتی ہے خلد کے اسرار
ایسی نظریں جو بار بار اٹھیں
لے کے فردوس کی بہار اٹھیں
ہاں بتا میرے رندِ خوش اوقات
ہوں گے کیا زندگی کے وہ لمحات؟

کبھی گلشن میں صبح کو جیسے
آئیں الھڑ نسیم کے جھونکے
لائیں خوشبوئیں زلفِ ماضی کی
میٹھی میٹھی سی بھینی بھینی سی
اور اس طرح ان کی یاد آئے
جیسے بادل میں چاند شرمائے
میرے مونس مرے رفیقِ حیات
ہوں گے کیا زندگی کے وہ لمحات؟
آ، بتائیں کہ ایک شب بیدار
ڈھونڈتا ہے سحر کے جب انوار
اسکے ماہِ یقین[1] کو لے کر
کھیت کرتی ہے چاندنی گھر گھر
اس کے ایمان کی شعاعوں سے
فرش کیا عرش جگمگاتا ہے
صاحبِ ہوش! اے خرد آیات
ہوتے ہیں زندگی کے وہ لمحات

---

[1] اگر "ماہِ یقین" میں اعلانِ "نون" مناسب نہ سمجھا جائے تو اس مصرعے کو اس طرح بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ "نور اس نئے یقین سے لے کر" ——— صدیق حسن

جسمانی ورزش کے مظاہرے

ہندستانی کھیل کود اور ورزشوں کی تاریخ ہزاروں برس پرانی ہے۔ یہ کھیل کود اور ورزشیں نہ صرف ہندستان میں مقبول تھیں بلکہ بیرونی ملکوں میں بھی انھیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہندستان میں غیر ملکی تسلط کے زمانے میں دیسی ورزشوں اور جسمانی کرتبوں کی جگہ بیرونی ورزشوں نے لے لی اور ہم اپنی ورزشوں کو بھول سے گئے۔ لیکن خوشی کی بات ہو کہ آزادی کے بعد سے ہم پھر اس طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور جہاں ہم اپنے بہت سے دوسرے قدیم ورثوں کو زندہ کر رہے ہیں وہاں ہمارے کھیل کود اور قدیم جسمانی ورزشوں کی عظمت بھی دوبارہ واپس آ رہی ہے۔

ان کھیلوں اور ورزشوں کے احیا کے لئے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں ان میں کھیل کود اور ورزشوں کے کل ہند مقابلے یقیناً ایک اہم اور ٹھوس قدم ہے۔ چنانچہ اس سال ۶ دسمبر کو لکھنؤ میں ہندستانی کھیل کود اور ورزش کا تیسرا ریاستی مقابلہ منعقد ہوا جس کا سلسلہ تین روز رہا۔

گھوڑے پر اہرام بنایا گیا ہے

تیر اندازی کا مظاہرہ

ایک آسن
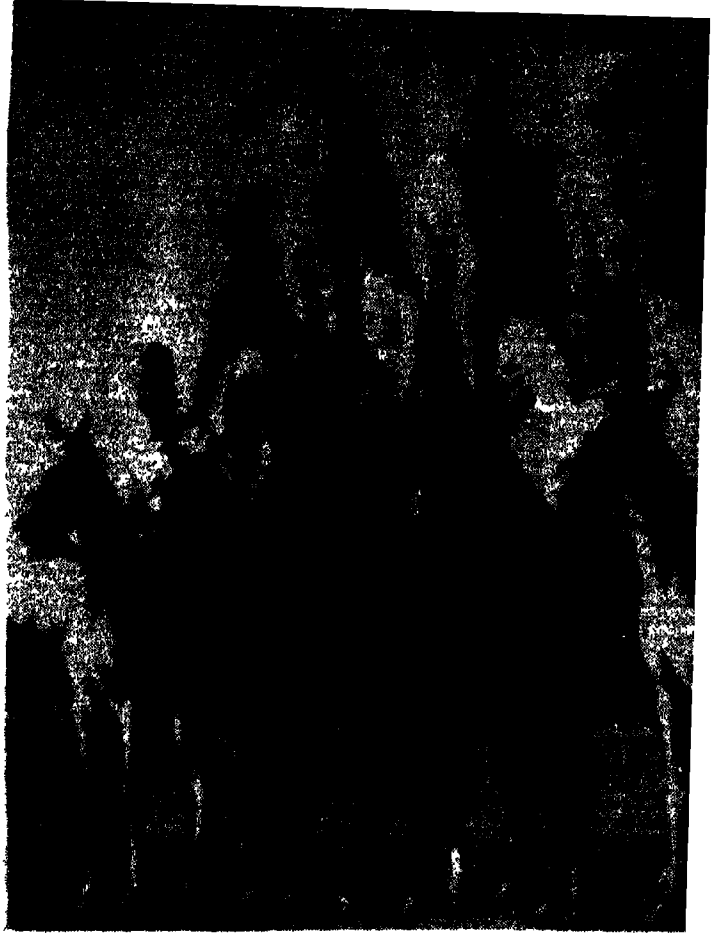
معمولی ملکھب (کھمبوں پر ورزش)

مقابلے میں کٹک، بڑودہ، حیدرآباد، اودے پور، اجین
علاوہ الہ آباد، گورکھپور، فیض آباد، میرٹھ، آگرہ، جھانسی، روہیل
میں منجملہ دیگر ہندستانی ورزشوں اور کرتبوں کے تیراندازی، کشتی، آ
سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم لکھنؤ میں کھیل کود اور ورزشوں کے اس م
بات پر اظہار مسرت کیا کہ قدیم ہندستان کے کھیل کود اور ورزشوں کو
کی افادیت بتاتے ہوئے کہا کہ یہ مقابلے ان کھیلوں اور ورزشوں کو مۃ
اور اس کے بعد سیکڑوں رنگ برنگے غبارے اس جشن کی یادگار میں ا

شمشیر زنی کا مظاہرہ
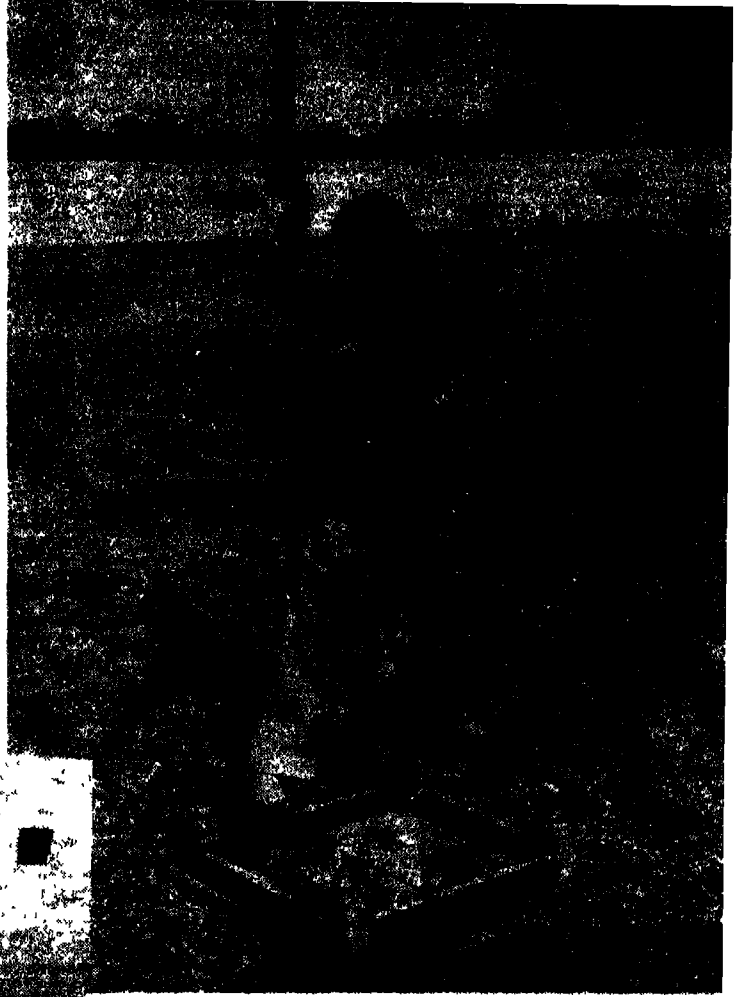
تلوار کے وار صرف ایک خنجر سے روکنا
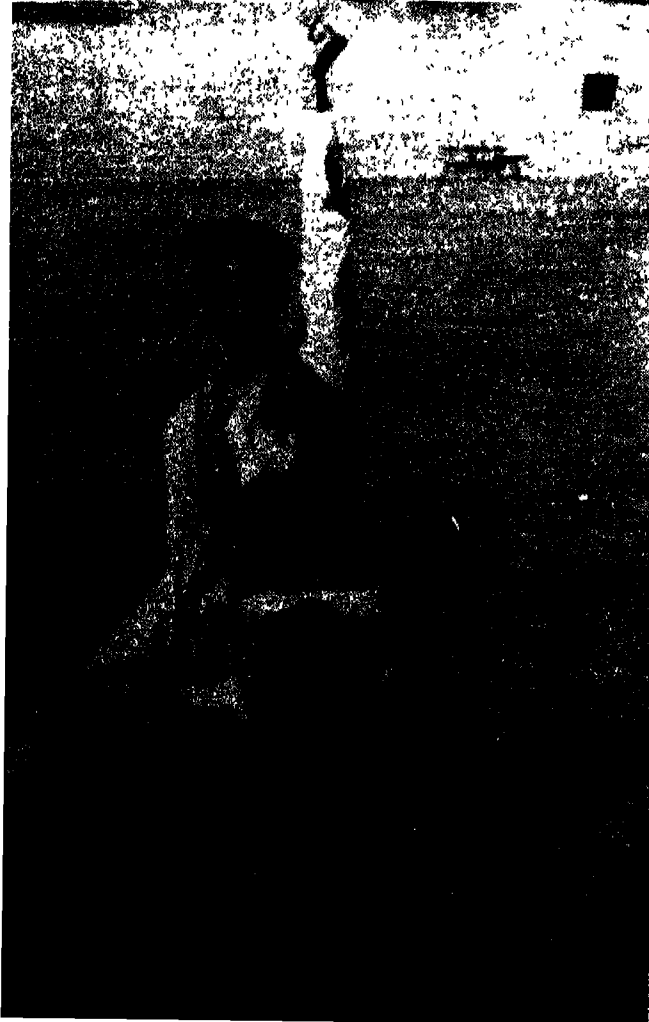
بمبئی) میرٹھ (بمبئی) بھاگلپور (بہار) کی ٹیموں کے
تی ریجنوں کی ٹیموں نے حصہ لیا۔ اس مقابلے کے پروگرام
ل کھمب (کھمبوں پر ورزش) اور کھوکھو کے مقابلے شامل تھے۔
کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ اترپردیش ڈاکٹر سمپورنانند نے اس
کے لئے مناسب توجہ کی جا رہی ہے اور اس طرح کے مقابلو
ٹھوس اقدام ہیں۔ تقریر کے بعد وزیر اعلیٰ نے پرچم کشائی کی
لاسفحات پر اس مقابلے کی کچھ تصویریں دی جا رہی ہیں۔

ناریل کو سر سے توڑا جارہا ہے

بتلوں پر گھومتا ہوا کھمب

تیری گلی میں

رام لعل

جس وقت وہ کچہری سے نکلا، اس کی جیب میں چھ آنے بچے ہوئے تھے۔ صرف چھ آنے۔ اس نے اپنے وکیل کا بھی انتظار نہ کیا اسے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ بھوک اور تکان دونوں اس کے چہرے سے عیاں تھیں۔ وہ کسی "ڈھابے" میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتا تو پھر اسے گھر تک پیدل چلنا پڑتا۔ گھر چار میل دور تھا۔ وہاں تک بسیں تانگے، رکشے، سبھی کچھ جاتے تھے لیکن اس کے پاس صرف چھ آنے تھے! وہ صبح سے بھوکا تھا!

صبح گھر سے چلتے سمے اس نے چائے کا ایک کپ پیا تھا۔ رات کی دو باسی روٹیاں کھائی تھیں۔ ماں نے روٹیوں پر تھوڑا اچار مسالہ تھی مل کر نمک اور لال مرچیں چھڑک دی تھیں۔ پچھلے دو سال سے اس نے کچہری کے اسی راستے پر متعدد بار جوتیاں چٹخائی تھیں۔ ہر بار ایک نئی تاریخ پڑی تھی۔ ہر تاریخ اس کے چہرے پر مایوسی اور بیزاری کی لگی ہوئی چھاپ کو اور گہرا کر گئی تھی۔ آج عدالت نے اس کا مقدمہ خارج کر دیا تھا۔ وہ اور اس کا وکیل یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے تھے کہ شیلا اور وہ علیٰحدہ ہونے سے پہلے آخری بار اکٹھے کہاں رہے تھے۔

اس نے سڑک پر چلتے چلتے ایک خوبصورت لڑکی کی طرف تاکا جو ہاتھوں میں کتابیں اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے روکھے بال کھجلانے لگا۔ اس کی قمیض کا کالر اندر گھسا ہوا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا لڑکی کو دیکھ کر اسے شیلا یاد آ گئی۔ شیلا کی یاد اسے مہکتی ہوئی خواب گاہوں میں لے گئی جن میں اس نے شیلا کے ساتھ چار سال قبل بہت تھوڑا سا عرصہ گزارا تھا۔ ایسے ہی خوبصورت بال تھے اس کے۔ ایسا ہی قد اور خوبصورت لمبی گردن۔ لڑکی لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی گئی۔ وہ سڑک کے پار دوسرے فٹ پاتھ پر اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ معاً اس کا ذہن لڑکی کا تعاقب چھوڑ کر بے شمار تاریک اندھیری گلیوں اور کوٹھوں کی گھسی پٹی...

کی پینک سے لتھڑی ہوئی، داغدار سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ پھر اس کا جی چاہا ایک سگریٹ پیئے۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر چھ آنے ٹٹولنے لگا۔ اور اسی وقت اچانک ایک رکشا اس کے پاس سے گزرتے گزرتے رک گیا۔ رکشا کے اندر سے اس کے وکیل نے جھانک کر پکارا۔

"ارے تم جا رہے ہو! سورج! میں تمہیں کچہری میں ڈھونڈتا رہا۔" وکیل کے لہجے میں مصنوعی حیرت کا اظہار تھا۔ لیکن اس نے وکیل کی طرف نہیں دیکھا۔

قمیص کے نیچے پہنے ہوئے پاجامے کو اوپر کھینچا۔ اور اپنے مقدمے کی فائلوں سے بھرے ہوئے تھیلے کو سینے سے لگا کر پوچھا۔ "کیا حکم ہے وکیل صاحب!"

"کچھ نہیں تمہیں دیکھ کر رکشا رکوا لی۔" پھر اس نے سر باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ یہاں کوئی پان کی دوکان قریب نہیں ہے؟ وہ ہے تو۔ ذرا لپک کر چار پان بنوا لاؤ سورج! تمباکو والے!"

سورج کی آنکھوں میں غصے کی جھلک گہری ہو گئی۔ لیکن وہ سڑک پار کر کے پان کی دکان پر چلا گیا۔ وکیل کو چار پان لا کر دے دیئے۔ وکیل نے دو اسے بھی پیش کئے۔ لیکن اس نے نہیں لئے۔ وکیل منہ میں پان بھرتے بھرتے کہتا ہوا "اچھا بھئی تم آنا پھر کسی وقت! ہائی کورٹ کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا جائے گا" رکشا آگے بڑھا لے گیا۔ چاہتا تو امین آباد کے چوراہے تک اسے اپنے ساتھ بٹھا کر لے جا سکتا تھا لیکن اس نے سورج سے چلنے کے لئے نہیں کہا۔ سورج نے دل ہی دل میں وکیل کو کچھ غلیظ ترین گالیاں دیں۔ جب ذرا غلیظ بات ایک انسان کے ذہن میں آ سکتی ہے۔ پھر وہ شیلا کے ماں باپ کو بھی اسی قسم کی گالیاں دینے لگا۔ تھیلے کو بار بار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بدلتا ہوا چلتا رہا۔ اس کا ہاتھ پھر جیب میں جا پہنچا۔ چار آنے جو بچ رہے تھے کسی عورت کے نرم گداز بدن کی طرح اس کی انگلیوں کی گرفت میں آ گئے۔

وہ کئی ہوٹلوں اور ڈھابوں کے سامنے سے گزرا۔ خاک اڑاتی ہوئی کئی بسیں پاس سے گزر گئیں۔ تانگے اور رکشے والے پیش کش کر کرکے ہار گئے۔ لیکن وہ پیدل چلتا رہا۔

گھر پہنچا تو بوڑھی ماں کو دروازے کی دہلیز پر انتظار کرتے پایا لیکن وہ اس کے ساتھ کوئی بات کئے بغیر اندر چلا گیا۔ اندر جاکر ایک چارپائی پر پڑ رہا ایک بازو سے منہ ڈھک لیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا سر گھوم رہا تھا کتنی دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ اس کی کبڑی ماں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی لیکن اس سے کچھ کہے بغیر اسے چھوئے بغیر اسے کچھ لمحوں تک گھور کر اسی طرح جھکی جھکی کمر کے ساتھ پرچھائیں کی طرح چلتی ہوئی کمرے کے کونے میں جا بیٹھی اور آگ پر رکھی ہوئی پیتل کی کیتلی میں چمچ ہلانے لگی۔ چمچ اور کیتلی کے ٹکرانے کی آواز سن کر سورج نے آنکھیں کھول دیں اور لیٹے لیٹے غصے سے پوچھا۔

"کھانے کے لئے کچھ زہر وہر بھی تیار ہے کہ نہیں"؟

یہ سن کر بوڑھی ماں کے چہرے کی جھریاں اور گہری ہوگئیں۔ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کیتلی کے نیچے دہکتے ہوئے کوئلوں کو سر جھکا کر گھورا پھر ایک تھالی میں آٹا گوندھنے لگی۔

"ابھی تم آٹا گوندھو گی؟ تب تک چاہے میری جان ہی نکل جائے؟"

اس کی ماں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک اور برتن میں سے صبح کا بچا ہوا خمیر آلود آٹا اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں سانے لگی۔

"تمہاری بلا سے میں مر جاؤں، مر جاؤں نا؟" وہ معمولی قسم کے سامان سے بھرے ہوئے کمرے میں چارپائی پر پڑا پڑا بولتا رہا۔ ماں سے اب نہیں رہا گیا تو دھیرے سے پوپلے منہ سے کہنے لگی۔

تو مر جائے گا تو میری چتا کو آگ کون دے گا بیٹا؟ بول!" یہ کہتے کہتے اس کے آنسو بھی چھلک پڑے جو نیچے گالوں پر پھیلے ہوئے جھریوں کے جال میں کھو گئے۔

لیکن اس نے ماں کے رونے کی پروا نہیں کی۔ چھت کو گھورتا ہوا بولا۔ "تو پھر تم ہی مر جاؤ! کیوں نہیں مرتیں تم؟"

"کیسے مر جاؤں؟" میرے اپنے اختیار میں تھوڑی ہے؟ بیمار ہو ہو کر بھی بچ جاتی ہوں۔ یہ میری بدنصیبی ہے۔ تو خود میرا گلا گھونٹ دے تو الگ بات ہے"

"تمہارا گلا میں گھونٹ دوں؟ میں!" اس نے حیران ہوکر پوچھا لیکن اس کی آواز میں وہی بیزاری تھی۔

"ہاں تو ہی گھونٹ دے نا" لیکن وہ بھی اس کے لئے تیار نظر نہیں آتی تھی۔ سر جھکائے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جلدی جلدی کھانا بنانے میں لگی ہوئی تھی۔

اوپر سے اسی مکان کے باقی حصے میں رہنے والی ایک خوش پوش ادھیڑ پڑوسن آگئی۔ یہ سارا مکان کچھ مہینے پہلے اس نے خریدا تھا۔ ان کے پاس صرف ایک کمرہ رہنے دیا تھا جس کا اب وہ بیس روپے کرایہ دیتے تھے۔

اونچی اور ہمدردی سے خالی آواز میں اس نے پوچھا — "کیا ہوا آج، کوئی دوسری تاریخ پڑی؟"

کسی نے اسے جواب نہیں دیا۔ کبڑی ماں نے کھانا تھالی میں پروس کر اس کے پاس چارپائی پر جاکر رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ دھوئے بغیر جلدی جلدی روٹی کے کئی ٹکڑے کرکے ترکاری میں ڈال دیئے۔ ترکاری میں انگلیاں ڈبوتے ہی اس نے جلدی سے باہر نکال لیں۔

"بتایا نہیں، ترکاری گرم ہے! ہاتھ جل گیا!"

ماں نے اس کی طرف بڑی بے بسی سے تاکا۔ بولی نہیں کچھ۔ پڑوسن نے کھڑے کھڑے پھر پوچھا۔

"لڑکی پیش ہوئی تھی؟"

"وہ کیوں پیش ہونے لگی!" اس کی ماں نے اس اعتماد کے ساتھ کہا جیسے جانتی ہو لڑکی پیش نہیں ہوئی تھی۔ "اس کی تو نانا، ماما، چاچا سبھی مدد کرتے ہیں۔ دو سو روپے خود بھی تنخواہ پا رہی ہے۔ اسے کیا غرض پڑی ہے پیش ہونے کی؟ فیس دے کر وکیل کو بھیج دیتی ہے۔ دو سال سے ہمیں مر رہے ہیں کچہریاں جا جاکر!"

"اپنی بکواس بند رکھو!" منہ میں لقمہ ڈالتے ڈالتے وہ چیخ پڑا۔ چبائے ہوئے لقمے کے کئی ذرّے ادھر ادھر اڑ اڑ کر نکل گئے۔ "آج میرا مقدمہ خارج ہوگیا ہے۔ دو سال کی محنت پر پانی پھر گیا ہے، سن لیا تم نے؟"

یہ سن کر ماں کے ہاتھ سے آٹے کا گولا نیچے گر پڑا۔ پڑوسن بھی ہکا بکا رہ گئی۔ سورج نے ترکاری لگی انگلی ماں کی طرف کرکے کہا — "یہ سب تباہی وجہ سے ہے! صرف تمہاری وجہ سے! تم ماں تھوڑی ہو! آج میں

اس مصیبت میں کیوں پھنسا ہوتا :"

اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لئے اور بلک بلک کر رو پڑا۔

کچھ لمحوں تک بالکل سناٹا رہا۔ پھر اس کی ماں پڑوسن سے آہستہ سے بولی "یہ تو مجھ ہی کو سارا الزام دیتا ہے۔ اسی کی خاطر میں زندہ ہوں۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کا گھر بسے تو میں اپنی راہ لوں جب اس کا باپ گذرا تو یہ دو سال کا تھا۔ صرف دو سال کا۔ ساری زندگی کا رنڈاپا کیا یہی سننے کے لئے میں نے کاٹا ہے کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں؟"

پڑوسن ایک کاٹھ کی چوکی گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ رو رو کر اسے بتانے لگی ۔۔ "شیلا کو میں نے گھر سے نہیں نکالا تھا۔ وہ جنم جلی آئی ہی اس لئے تھی کہ اس کا گھر اجاڑ کر چلی جائے۔ تم یقین کرو میں نے اس سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ اسے خود میرا گھر میں رہنا اچھا نہیں لگا۔ پہلے ہی دن میرے سامنے آتے ہی اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ میں نے اسے سولی میں لے جانا چاہا تو وہاں جانے سے اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اتنی شکایت ضرور کی، جھوٹ کیوں بولوں۔ آخر بھگوان بھی دیکھ رہا ہے۔ "کیا ماں باپ نے اتنا نہیں سکھایا کہ بڑوں کا ادب کرنا چاہیئے"؛ بس یہی کچھ کہا تھا میں نے۔ اتنی سی بات پر اس نے وہ ہنگامہ کیا، وہ ہنگامہ کہ اس کے ماں باپ آکر لڑکی کو گھر لے گئے۔ کتنے لوگوں نے انھیں سمجھایا سب نے ان کی لڑکی کو قصوروار ٹھہرایا لیکن وہ ماننے والے تھوڑی تھے! دو سال پورے کتنے لوگوں کو باری باری ان کے ہاں بھیجا۔ اب ضد چھوڑ دو۔ میرے لڑکے کا گھر بسنے دو۔ لیکن وہ ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں کہہ کر بات بڑھاتے رہے۔ تنگ آکر بیچارے کو کچہری تک جانا پڑا۔ جب کچہری تک بات گئی تو وہ لوگ اس بات پر اینٹھ گئے کہ بات وہاں تک کیوں لے گئے؟ اس سے ہمارے خاندان کی ناک کٹی ہے۔ ہم بھی اس کا بدلہ ضرور لیں گے۔ تو بس وہ ابھی تک بدلہ لے رہے ہیں۔ نہ لڑکی اس کے حوالہ کرتے ہیں نہ چھوڑ چھٹکارہ کرتے ہیں کہ یہ بیچارا کہیں اور شادی کر لے"۔

"نہیں بھئی اس میں تیری ماں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تو بلاوجہ بوڑھی ماں کو پریشان نہ کیا کر"۔ پڑوسن نے اسے سمجھایا۔ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا ــــــ "اس کی باتوں میں آدھے سے زیادہ جھوٹ ہے۔ اصل جھگڑا جہیز کا تھا۔ کم جہیز لانے پر اسے بہو پسند نہیں آئی۔ اس کے مزاج میں سو سو کیڑے نکال کر بیٹھ جاتی تھی ہر روز! کم جہیز لانے کا گلہ تو خود بھی اس سے کیا کرتا تھا۔ مجھے کیوں قصوروار ٹھہراتا ہے"؟

ماں زور زور سے رونے لگی۔

"جو کچھ تم مجھ سے کہتی تھیں وہی میں بھی دہرا دیتا تھا۔ کیا کرتا! عقل کا کچا تو تھا ہی!"

وہ ہاتھ دھونے کے لئے باہر نل پر چلا گیا اور وہیں سے گلی میں آ گیا۔

وہ اس وقت ایک دوکان پر روزانہ اکاؤنٹ بنانے کا کام کیا کرتا تھا۔ بیس روپے مہینے پر مل جاتے تھے۔ مکان بیچ کر مقدمے کی نذر کر چکا تھا۔ تنخواہ کا بہت سارا حصہ قرض کی قسطوں میں کٹ جاتا تھا۔ آج بھی تاریخوں میں وہ جو چھٹی لے کر کچہری جاتا رہا تھا وہ اسے بغیر تنخواہ کے ملتی تھی۔ وہ سرکاری ملازمت کی تمام مراعات ختم کر چکا تھا۔ آخری رعایت یہ رہ گئی تھی کہ اسے دفتر میں نہایت بے دلی اور لاپروائی سے کام کرنے کے باوجود ملازمت سے الگ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی پریشانی سے دفتر کے لوگ بھی واقف تھے۔ اسے وہ سخت بدحواس اور نیم پاگل سمجھتے تھے۔

دفتر میں اس کا سب سے بڑا بہی خواہ اس کا ہیڈ کلرک تھا۔ وہ اس کے لئے ایک ڈھال ثابت ہوتا آ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے آج تک اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوئی تھی۔ ہیڈ کلرک کی چار لڑکیاں تھیں۔ ایک کے اوپر ایک۔ شادی کے قابل۔ وہ چاہتا تھا ایک لڑکی کی شادی سورج کے ساتھ ہو جائے۔ سورج سے وہ اس بات کا وعدہ ایک سال پہلے لے چکا تھا۔ طلاق کا مقدمہ لڑنے کے لئے اس نے اپنے پروویڈنٹ فنڈ میں سے سورج کو کچھ روپیہ بھی نکلوا کر دیا تھا۔ اتفاق سے آج وہ سورج کو اسی دوکان پر مل گیا جہاں سورج پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔

سورج نے اسے عدالت کا فیصلہ سنایا تو وہ کہنے لگا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں تمہارے وکیل کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہ کہتا تھا اب بہت سا خرچہ اور ہوگا تب جا کر ہائیکورٹ میں اپیل ہوگی۔ لیکن میں نے ایک راہ اور نکالی ہے۔ میں ابھی ابھی ان لوگوں سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ لوگ تمہیں معاف کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ کہتے ہیں تم ایک بار ان کے سامنے جا کر معافی مانگ لو پھر وہ تمہیں سب کچھ لکھ کر دے

دیں گے اس کے بعد عدالت میں تمہارا مقابلہ بھی نہیں کریں گے۔

"میں نہیں جاؤں گا ان کے سامنے"

سورج نے بہت ہی دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ لوگ تمہیں کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ میں نے اس بات کا ان سے وعدہ لیا ہے"

"تم سے بابو! میں شیلا کے گھر والوں کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں وہ سب ایک نمبر کے شرارتی اور کمینے ہیں۔ انھیں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے میرا گھر برباد ہوا ہے"

"بھئی سنو! غرض تو تمہیں ہے۔ ہے نا؟ جو وہ کہیں سن لیں گے۔ وہ صرف تحریری طور پر اپنی لڑکی کا تم سے رشتہ توڑ دیں"

"وہ یہ بات کبھی نہیں مانیں گے"

"تم کیسی بات کرتے ہو سورج! کیا ان کو اپنی لڑکی کو ہمیشہ گھر بٹھائے رکھنا ہے؟ یہ سچ ہے کہ وہ تمہیں پریشان کرنا چاہتے تھے۔ سو کافی کر لیا۔ اب صرف تم سے معافی مانگنے کی توقع رکھتے تھے۔ وہ تم میری خاطر سہی، وہاں چل کر پوری کر دو اور یہ نہ بھولو کہ صرف اسی طریقے سے تمہاری نئی زندگی شروع ہو سکتی ہے۔ ورنہ کب تک اس طرح پریشان رہوگے؟"

جس جگہ بیٹھے وہ باتیں کر رہے تھے وہاں دو اور آدمیوں نے بھی جو اس قصے سے واقف تھے، سورج کو وہاں چلے جانے کا مشورہ دیا۔

ہیڈ کلرک سورج کو اپنی سائیکل کے پیچھے کیریئر پر بٹھا کر چھ میل دور شہر کے ایک دوسرے حصے میں لے گیا۔ وہاں شیلا کی ماں، نانا، چاچا، ماما اور چند دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ اسی گھر میں وہ کبھی بارات لے کر آیا تھا۔ بینڈ باجوں اور بہت سے لوگوں کے ساتھ۔ تب اس کا کتنا شاندار استقبال ہوا تھا۔ آج وہ ان لوگوں کے نزدیک ایک کوڑی کی بھی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے ہر رشتہ دار اور دوسرے معزز بزرگوں کی باتیں ٹھکرا دی تھیں جب وہ وہاں یہی درخواست لے گئے تھے۔ آج بھی سورج کو اپنے پاس اس مقصد کے لئے آیا ہوا دیکھ کر ان لوگوں نے قہقہے لگائے۔ ہیڈ کلرک صاحب کا خیال غلط نکلا اور اسے خود غرض، لالچی، پنچ اور کمینہ کے الفاظ سے یاد کیا گیا۔ سورج کے لئے اب وہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کا ہیڈ کلرک ابھی تک ان لوگوں کے سامنے جھولی پھیلا کر گڑگڑا رہا تھا۔ اسے معاف کر دینے کے لئے بھگوان کا واسطہ دے رہا تھا۔ مگر سورج نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب کہیں جا کر اپنی جان دے دے گا۔ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی ذلت سے دوچار ہو چکا تھا! وہ ہیڈ کلرک کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

نیم تاریک گلی کے سرے پر اس نے اپنے پیچھے کسی کے تیز تیز چلنے کی چاپ سنی پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی۔ دھوتی سے اپنا جسم ڈھانپے، سر کے اوپر ایک بہت خوبصورت جوڑا سجائے اور آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ چڑھائے! وہ اس کے قریب آئی تو اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ شیلا کس قدر بدل چکی تھی! اس نے اب "بی اے" کر کے ملازمت بھی کر لی تھی۔ آج اسے وہ چار سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔ جب سے وہ اس کا گھر چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کے سامنے سورج خود کو بہت ہی حقیر محسوس کرنے لگا مگر شیلا دھیرے سے بولی۔

"آپ سے کچھ کہنا ہے۔ ادھر آجائیے۔ یہاں کوئی دیکھ لے گا"

شیلا کے ہمدردی بھرے الفاظ نے اس پر جادو کا سا اثر کیا۔ اس کا دل مسرت محبت اور ندامت سے بھر گیا۔ اس نے شیلا کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور کہنے لگا۔

"کوئی دیکھ لے گا؟ تو کیا ہوا؟ کیا ہم میاں بیوی نہیں ہیں؟" اسے یہ کہنے کی نہ جانے کیسے ہمت پڑ گئی تھی۔

شیلا نے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیے۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ سے صرف یہ کہنا ہے۔ میں آپ کو سب کچھ لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں۔ جب اور جہاں کہیئے میں پہنچ جاؤں گی"

"شیلا!" اس کا جی چاہا وہ اس کے پاؤں پر گر پڑے "میں یہ سب نہیں چاہتا" اس کا ہاتھ سورج نے مضبوطی سے پکڑ لیا "تم میرے ساتھ چلو۔ ابھی اسی وقت۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں"

اچانک وہاں گھر کے سب لوگ باہر آگئے۔ ان کے چہروں پر سخت برہمی اور غصہ تھا۔ قریب تھا کہ ان میں سے کوئی آگے بڑھ کر سورج کو شیلا کا ہاتھ پکڑنے کے جرم میں دو تھپڑ لگا دیتا۔ لیکن شیلا نے سر کو دھوتی کے آنچل سے ڈھانپتے ہوئے کہا "غلطی صرف انھیں کی نہیں ہے۔ آپ لوگ بھی ذمہ دار ہیں۔ میں ان کے ساتھ جاؤں گی میں نے فیصلہ کر لیا ہے"

ایک مشرقی کتبخانہ۔ ہندوستانی مستشرقین کی نظر میں

سید نجم الدین نقوی

رضا لائبریری رام پور، جو ایک مدت سے تشنگانِ علم و ادب کی پیاس بجھا رہی ہے ریاست رام پور کے رؤساء کی مسلسل علم پروری کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ کتب خانہ کی بنیاد نواب فیض اللہ خاں مرحوم بانیٔ ریاست رام پور کے زمانہ میں پڑی اور اُس وقت سے اس میں ایسے اضافے برابر ہوتے گئے کہ آج رضا لائبریری رام پور کا شمار دنیا کے بہترین مشرقی کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ کتب خانے میں عربی۔ فارسی۔ اُردو کے جو بیش قیمت قلمی نسخے اور کم یاب کتابیں پائی جاتی ہیں ان کی تعداد درج ذیل ہے:۔

مخطوطات۔ عربی ۴۹۵۳۔ فارسی ۴۹۹۲۔ اردو ۹۳۰۔ ترکی ۴۵ پشتو ۴۳ — ہندی ۳۲ — تلیگو ۵ — گجراتی ۱۶ — تحفہ نواب صاحب لوہارو ۳۱۱ — لوہارو سے آئے ہوئے مخطوطات کی تفصیل فی الحال نہیں حاصل ہو سکی بہرحال یہ بھی ایک نادر اور جو اضافہ ہے اور اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس تحفہ میں جزو لانِ تاریخ کا وہ اصل نسخہ بھی شامل ہے جس کے حواشی پر مرزا غالب نے برہانِ قاطع کے نوٹس لکھے تھے۔

مطبوعات۔ عربی ۳۶۸۳۔ فارسی ۲۴۸۰۔ اردو ۷۵۹۰۔ انگریزی ۱۴۰۰ — ترکی ۱۱۱ — ہندی ۹۰ — عطیہ نواب لوہارو ۱۶۵۵۔ قلمی تصاویر ۹۰۰ — چھوٹی تصاویر ۳۷۵ — خوش نویسی کے نمونے ۱۲۷۵ — لیکن یہاں ان مخطوطات و مطبوعات کی تفصیلات بتانا مقصود نہیں بلکہ اصل مقصد کتب خانہ کی معائنہ بکوں کے اندراجات سے تعارف کرانا ہے جو بجائے خود ایک ادبی اور ایک طرح سے تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ معائنہ بکیں دو ہیں اور سب سے پہلے معائنہ کی تاریخ ۲۲ جون ۱۸۸۸ء ہے۔ لائبریری کے معائنہ کا سلسلہ اس کے بعد سے برابر جاری رہا، معائنہ کے تاثرات درج کرنے والوں میں ہندوستان کے مختلف گورنر جنرلوں اور دیگر صوبوں کے گورنروں سے لے کر ملک کی مایۂ ناز علمی و ادبی ہستیاں مثلاً مولانا حالی، علامہ شبلی، مولوی ذکاء اللہ، اکبر الٰہ آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ تک شامل ہیں۔ معائنے اُردو، فارسی، عربی، انگریزی اور ترکی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

سب سے پہلا معائنہ شیخ محمود بن شیخ محمد نصیر الدین جیلانی کا ہے۔ ان بزرگ کی حیثیت عرفی کے متعلق مجھے زیادہ نہیں معلوم ہو سکا مگر قرائن کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صاحب علمی حیثیت سے اُس عہد کے معروف لوگوں میں ہوں گے اس لئے کہ انتزاعِ ریاست رام پور سے قبل یہ کتب خانہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھا۔ جو شائقان و پیدا اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اُنھیں پہلے کتابیں دیکھنے کی اجازت حاصل کرنا ہوتی اور پھر بعد اجازت ریاست کے مہمان رہ کر اپنے موضوع سے متعلق استفادہ کرتے تھے۔ معائنہ بک میں مجھے کسی ایسے فرد کی رائے نہیں ملی جو محض طالب علم رہا ہو اور اسی حیثیت سے لائبریری سے استفادہ کیا ہو۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ صرف مخصوص لوگوں کو اس کی اجازت رہی ہوگی کہ وہ کتب خانہ کو دیکھ کر اپنی رائیں معائنہ بکوں میں درج کریں۔ ان اندراجات کے دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب خانہ کا انتظام شروع سے ہی نہایت معقول تھا اور یہاں کے کارکن ہمیشہ ذی علم لوگ ہوا کرتے تھے جو اپنے کام میں نہایت مہارت رکھتے تھے۔ تقریباً ہر اہم کتاب کا محل وقوع ان کی نظر میں ہوتا تھا۔ آنے والوں کو جس کتاب کی ضرورت ہوتی تھی اُس تک ان تک پہنچنے میں مطلق دیر نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک سے زیادہ رائیں اس قسم کی ملتی ہیں جن سے تحویلدار کتب خانہ کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے اور

[illegible] سال قبل اس کتب خانہ کی
[illegible] اس سلسلہ میں مولوی مہدی علی خاں
[illegible] کا اسم گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہے جن کی تعریف
میں [illegible] قابل ذکر مستشرق نے اپنی زبان تحریر کی ہے۔ انہیں
[illegible] ظاہر ہوتا ہے کہ آنے والوں نے ترتیب کتب کے سلسلہ
میں بعض مشورے بھی دیئے ہیں مثلاً کتابوں کا حروف تہجی کے بجائے انکے
فن کے لحاظ سے ترتیب دیا جانا اور اسی اعتبار سے فہرست کی تشکیل
کرنا۔ معائنہ بکوں میں رایوں کا پابندی سے اور سلسلہ وار درج کیا جانا اور
آنے والوں کا لائبریری کی ترتیب وغیرہ کے سلسلہ میں مشورہ دینا اور ان
مشوروں پر عمل کیا جانا، ظاہر کرتا ہے کہ یہ رائیں نوابین رام پور کی نظروں
سے ضرور گذرتی ہوں گی۔

یوں تو معائنہ بکوں میں اندراجات کی تعداد بہت زیادہ ہے
لیکن یہاں صرف چند اہم معائنوں کا ضروری اقتباس یا بشرط ضرورت
پوری عبارت نقل کی جا رہی ہے۔ پہلے معائنہ کے بعد (جس کا ذکر آچکا ہے)
دوسرا اہم معائنہ جو ہماری نظروں سے گذرتا ہے مولانا شبلی کا ہے۔ اس
معائنہ کی تاریخ ۹ ستمبر ۱۸۹۰ء ہے۔ اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت
مولانا شبلی سارے ملک میں پوری طرح مشہور نہ ہوئے تھے اور نہ اس وقت
تک انہوں نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب
وہ علی گڈھ سے وابستہ تھے اور اپنے تعارف کے لئے پروفیسر مدرسۃ العلوم
علی گڈھ لکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ معائنہ حسب ذیل ہے:

"میں نے کتب خانہ کو کسی قدر تفصیل سے دیکھا چونکہ
میں کتب خانہ کی ایک مفصل رپورٹ لکھنا چاہتا ہوں اسلئے
اس موقعہ پر اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ یہ ایک بے مثل کتبخانہ
ہے منتظمان کتب خانہ مستعد اور کارگذار ہیں خصوصاً
مہدی علی خانصاحب کو اس قدر واقفیت اور تجربہ ہے
کہ ایسے عظیم الشان دار الکتب کی ایک ایک کتاب کا
نمبر و نشان اور اس کی حالت گویا ان کی آنکھوں کے سامنے
ہے۔ فہرست کی اگر معقول ترتیب ہو جائے تو نہایت آسانی
ہو [illegible] اللہ صاحب نے بہت کچھ کام کیا ہے جو قابل مدح
ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔" محمد شبلی۔ پروفیسر مدرسۃ العلوم
علی گڈھ۔ ۹ ستمبر ۱۸۹۰ء

دوسرا قابل ذکر معائنہ مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی کا ہے جو ۲۲ اکتوبر ۱۸۹۰ء
کو لکھا گیا اس معائنہ کا ایک اقتباس دیکھئے:-

"میں نے کتب خانہ کو دیکھا۔ ایسا کتب خانہ کتب مشرقیہ کا
ہندوستان میں نہیں۔ میں نے دہلی میں بھی کبھی ایسا کتب خانہ
نہیں دیکھا....." ذکاء اللہ۔ ۲۲۔ اکتوبر ۱۸۹۰ء

اس کے بعد ۲۳۔ دسمبر ۱۸۹۲ء کا ایک مفصل معائنہ امیر احمد مینائی کا ملتا ہے
جس سے کتب خانہ کے قیام اور اس کی تدریجی ترقیوں پر کسی حد تک روشنی
پڑتی ہے اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ رام پور کے کن کن روساء نے
اس علمی خزینہ پر زیادہ توجہ صرف کی۔ معائنہ بہت طویل ہے اس لئے صرف
اس کے ضروری اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

"اس کتب خانہ کی بناء نواب فیض اللہ خان بہادر
(ستمبر ۱۷۷۴ء ـــــ جولائی ۱۷۹۴ء) عرش منزل کے
عہد سے پڑی...... اور عہد نواب یوسف علی خاں بہادر
فردوس مکاں میں کچھ کچھ ترقی ہونے لگی اور عہد نواب
کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں میں ترقیات نمایاں ہوئیں...
.... اور اس ترقی خواہ دولت سے ترتیب فہرست کے
واسطے ارشاد ہوا..... اب یہ کتب خانہ درحقیقت
ایک آئینہ خانہ ہے جس میں چار طرف شاہد جمال صوری و
معنوی جلوہ گر ہوئیں۔" ـــــ امیر احمد عفی عنہ۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۹۲ء

عبدالمجید خاں مرحوم برادر حکیم اجمل خاں مرحوم نے ۸ رجون ۱۸۹۶ء کو
اس کتب خانہ کے بے نظیر ہونے کے متعلق اپنی رائے لکھی۔ اس رائے
سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۸ رجون ۹۶ء کو اس کتب خانہ میں بارہ ہزار
کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ حکیم صاحب نے اپنے معائنہ میں یہ بھی شکوہ کیا تھا
کہ کتب خانہ میں طب سے متعلق کافی کتابیں موجود نہیں ہیں اور امید ظاہر
کی تھی کہ نواب ممدوح اس کمی کو ضرور پورا کریں گے۔ چنانچہ یہ کمی پوری
ہوئی۔ حکیم اجمل خانصاحب مرحوم اس کتب خانہ کے ناظم مقرر ہوئے اور
علم طب سے متعلق نہایت کافی ذخیرہ جمع ہو گیا۔

ایک مفصل معائنہ مولانا حالی کا ہے۔ ۲۵ر دسمبر ۱۹۰۵ء اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حکیم اجمل خاں مرحوم کتاب خانہ کے مہتمم مقرر ہو چکے تھے۔ دوسرے یہ کہ معائنہ کرنے سے کچھ قبل کتب خانہ سے کچھ کتابیں چرا لی گئی تھیں۔ چنانچہ مولانا نے کتابوں کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ رائے دی کہ "کسی شخص کو کتب خانہ سے باہر کتاب کے لے جانے کی اجازت نہ دی جائے۔" معائنہ لکھتے وقت مولانا علیل تھے۔ شاید اسی لئے عبارت میں ایک مقام پر شدید سہو واقع ہوا ہے۔ اجمل خاں صاحب مرحوم کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ "میں کتب خانہ کے حق میں اس کو ایک بڑی فال نیک سمجھتا ہوں کہ اس کا انتظام اور اس کی نگرانی جناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی سے متعلق کی گئی ہے جو باوجود علم و فضل کے نہایت علم دوست اور کتاب کے قدر شناس اور صاحب عقل سلیم ہیں۔" اس معائنہ کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔ اکبر الہ آبادی ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کو رام پور گئے اور معائنہ لکھا یہ معائنہ کسی قدر طویل ہے صرف ضروری اقتباسات دیئے جاتے ہیں:-

" میں آج اس کتب خانہ کو دیکھ کر بے انتہا محظوظ ہوا۔ رامپور میں میرا ورود اتفاقی تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا اس ریاست کو ترقی دے اور رئیسان ریاست کے مدارج کو بلندی اور مذاق کو علو عطا فرمائے جن کی توجہ اور قدر شناسی سے یہ کتب خانہ قائم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نو تصنیف انگریزی کتابوں کا اضافہ بلاشبہ توجہ کے لائق ہے لیکن ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کی طرف زیادہ ضرورت ہے جو ان کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ایسی جماعت کو موجود کرے ورنہ نور آفتاب سے بے بصر کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔۔"

۔ ۔ ۔ ۔ سید اکبر حسین جج عدالت خفیفہ الہ آباد۔ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۹ء

ملک کے مشہور عالم و ادیب محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے ۲۶ر جنوری ۱۹۱۴ء کو اس خزینۃ الکتب کی زیارت کی۔ حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری اس زمانہ میں ناظم کتب خانہ ہو چکے تھے۔ مولانا شیروانی نے اپنے معائنہ میں شوق رام پوری کو سہواً شوق قدوائی لکھ دیا ہے۔ شوق قدوائی نہیں شوق رامپوری ہی ہونا چاہیئے۔ مولانا کی عبارت حسب ذیل ہے:-

" حافظ احمد علی خاں صاحب شوق قدوائی کی مہربانی سے میں نے بھی یہ کتب خانہ جس کے دیکھنے کا مدت سے شائق تھا دیکھا۔ فرصت قلیل۔ ذخیرہ نایاب و کثیر کچھ نہ دیکھ سکا۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

تاہم جو کچھ دیکھا اس کے ذوق سے روح وجد و نشاط میں ہے۔ میں بھی تقریباً پچیس برس سے کتابوں کے جمع کرنے میں مصروف ہوں اس لئے اس درد سے واقف ہوں جو کتابوں کی ترتیب و نگہداشت سے تعلق رکھتا ہے اسی تجربہ کی رو سے کہہ سکتا ہوں کہ حافظ صاحب ممدوح بجد توجہ و محنت سے اور شوق دلی سے خدمت کتاب خانہ فرما رہے ہیں۔ اگر میں سرکار عالی حضور والی ریاست رامپور کا سپاس ادا نہ کروں تو موجب ناسپاسی ہوگا۔ اس لئے کہ حضور ممدوح کے مراحم خسروانہ سے اس بے نظیر خزینۃ الکتب کے دیکھنے کا موقع ملا۔" محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی ۱۶ر اپریل ۱۹۱۴ء کو دوبارہ کتب خانہ تشریف لائے اور اس وقت انہوں نے جو معائنہ لکھا ہے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت مولانا روم و مصر کے سفر سے واپس آ چکے تھے۔ اس کے بعد ان کا یہ کہنا کہ بحیثیت مجموعی ان ممالک میں بھی ایسا کتب خانہ نہیں دیکھنے میں آیا۔ گویا ایسا خراج تحسین ہے جو حقیقت پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کتب خانہ کی اہمیت پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے۔ اس معائنہ میں مولانا شبلی نے اپنے دستخط "شبلی نعمانی" کئے ہیں۔ معائنہ کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے:-

" میں اس کتب خانہ سے بارہا متمتع ہوا ہوں ہندوستان کے کتب خانوں میں اس سے بہتر کیا اس کے برابر بھی کوئی کتب خانہ نہیں میں نے روم اور مصر کے بھی کتب خانے دیکھے ہیں لیکن کسی کتب خانہ کو مجموعی حیثیت سے اس سے افضل نہیں دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔" شبلی نعمانی۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۱۴ء

حسن نظامی مرحوم نے ۲۹ر جولائی ۱۹۳۰ء کو اس کتب خانہ کو دیکھا اور اسے ایشیا کا ایک نایاب اور بے مثل کتب خانہ بتایا اور اسے نواب صاحب رام پور ہز ہائی نس نواب رضا علی خاں بہادر کے علم دوستی سے [illegible]

[illegible] بنادیں گے۔

[illegible] دلچسپ چیز ہے کہ فرماں روایان رام پور [illegible] ہی ہے۔ صرف ہر ہائنس بیگم رام پور کا ایک معائنہ [illegible] ہے جس کے اقتباسات درج ذیل ہیں :-

"آج [illegible] فرماں روائے رام پور کی ہمراہی میں میں نے بھی ان علمی موتیوں کی چمک دیکھی جن کی ضیا باری سے دنیا روشن ہے۔ یہ موتی پہلے در منثور تھے اور خدا جانے کہاں سے کہاں تک بکھرے ہوئے تھے جن کو سلیقہ شعار ہمارا کتب خانہ نے چن چن کر اور پہلو بہ پہلو جگہ دے کر نایاب سلک گوہر تیار کی ہے .... کتب خانہ کا سنگ بنیاد ریاست کی تعمیر کے ساتھ ساتھ رکھا گیا اور یہ دونوں ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے۔ الحمد للہ آج ان دونوں کی جوانی ہے اور پر بہار جوانی۔"

— حرۃ عسکری بیگم الملقب بہ رفعت زمانی بیگم مورخہ ۰ مئی [illegible]

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹ ستمبر ۱۹۴۰ء کو یہ کتب خانہ دوبارہ دیکھا اور اسے دنیا کے ان بڑے کتب خانوں میں بتایا جس پر دنیائے اسلام کو فخر ہے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کا پہلا معائنہ مجھے کتابوں میں نہیں ملا۔ پنڈت آنند نرائن ملا صاحب ۱۲ جنوری ۱۹۴۱ء کو تشریف فرما ہوئے اور بقول ان کے کتب خانہ کو دیکھ کر وہ اتنے مرعوب ہو گئے کہ کچھ کہنے کی قابلیت باقی نہ رہی۔ بشرط فرصت دوبارہ آنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "پھر آؤں گا تاکہ اس عجیب و غریب کتب خانہ سے کچھ استفادہ کر سکوں"۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی ۱۰ دسمبر ۱۹۴۱ء کو تشریف لائے۔ انھوں نے جن الفاظ میں کتب خانہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے وہ اپنی معنویت اور ادبیت کے ساتھ ساتھ زبردست خراج عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

"سچ کہا جس نے رامپور کو پہلی بار دار السرور لکھا۔ سرور ہستی کے نشان شہر کے چپہ چپہ پر۔ سرور معنوی کا مرکز یہ کتب خانہ۔ مدتوں کوئی یہاں رہے اور دل نہ اکتائے۔ طبیعت اس سدا بہار گلشن سے روز ایک نیا لطف اٹھائے۔ کتب خانے ہندوستان میں اور بھی اچھے اچھے ہیں لیکن یہ اپنے رنگ میں نرالا۔ اکثر سے افضل و اعلیٰ [illegible]۔ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔

آج پہلی بار نہیں ۱۹[illegible] سے لیکر اب تک متعدد بار اس سے استفادہ کیا اور ہر بار یہاں سے کچھ حاصل ہی کر کے گیا۔ مولانا روم کے ملفوظات فیہ ما فیہ کا قلمی نسخہ سب سے اول اسی کتب خانہ میں نظر سے گزرا اور اسی کی نقل لے کر ہندوستان اور استنبول کے بعض نسخوں سے مقابلہ کر کے اس بے علم نے شائع کیا۔ پہلے بھی یہاں کے کارکن مولوی حافظ احمد علی خاں مرحوم اور مہدی علی خاں مرحوم وغیرہ بڑے مخلص اور مستعد کارگزار تھے اور اب تو انتظام قریشیوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک "عرشی" کے ہاتھ میں آ گیا ہے اب پوچھنا ہی کیا ہے۔

"بہت بہتر ہو اور کتب خانہ کی حیثیت افادی بہت زائد بڑھ جائے اگر یہاں کے نوادر وقتاً فوقتاً ایڈٹ ہو کر شایع بھی ہوتی رہیں۔ نوادر سے مراد صرف مخطوطات ہی نہیں۔ عربی، فارسی، اردو کی پچاسوں قابل قدر کتابیں مطبوعہ ہونے کے باوجود بھی اب نوادر کے حکم میں داخل ہیں ان کی ترکیب تہذیب۔ تحشیہ طبع و اشاعت کا بہترین انتظام رام پور ہی جیسی علم دوست ریاست اور علم و ادب کی قدر دان سرکار کر سکتی ہے اس وقت اس عاجز کے فہم ناقص میں سہیلی اندلسی متوفی سنہ ۵۸۱ھ کی التعریف والاعلام فیما ابہم فی القرآن من الاسماء والاعلام تو ضرور اس قابل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابوں کا انتخاب ناظم صاحب کتب خانہ ملک کے دوسرے اہل علم و اہل ذوق کے مشورہ سے کر سکتے ہیں۔ نفع جاری کی یہ بہترین شکل ہو سکتی ہے۔ نفع عام بھی اور نفع تام بھی۔ ملک اور بیرون ملک کے ممتاز اور علمی رسائل بھی اگر کتب خانہ کے کسی حصہ میں میز پر لگے ہوئے ملیں تو بے محل نہ ہوں گے۔"

— عبد الماجد دریا آبادی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۱ء
۲۰ ذیقعدہ ۱۳۶۰ھ

جناب صفی لکھنوی مرحوم نے جناب عرشی ناظم کتب خانہ کی فرمائش پر ۵ اپریل ۱۹۴۳ء کو ایک دل آویز منظوم معائنہ لکھا۔ صفی مرحوم کی یہ نظم غالباً ابھی تک اردو والوں کی نظر سے پوشیدہ ہے اس لئے پوری نظم ذیل

میں درج کی جاتی ہے۔

مائل سیرِ کتب کیوں نہ ہو ہر صاحبِ ہوش — در حقیقت ہیں کتابیں رفقائے خاموش
ہے حکمت کا انھیں پتلوں میں ہو سرجوش — نظر آتی ہیں جو الماریوں میں دوش بدوش

کاغذی پتلیاں پیمانہ کشِ حسنِ ادب
آنکھوں آنکھوں ہی میں کہہ جاتی ہیں اپنا مطلب

نسخے مصروف ہیں خاموش گل افشانی میں — دیکھ لیں آپ جو ہو دخل زباں دانی میں
دن میں یا روشنیِ شمعِ شبستانی میں — حالِ دل مرتسم ان کے خطِ پیشانی میں

کھول کر جلد جہاں کوئی سفینہ دیکھا
بند سینے میں جواہر کا دفینہ دیکھا

ان مشاہیر سے منظور ہو ہو قال و مقال — جن کو گذرے ہوئے دنیا میں ہوں صدہا سال
اتنی دور اب ہیں کہ پہنچے نہ جہاں تک بھی خیال — جمع اس میں انھیں لوگوں کے ہیں زریں اقوال

جنکے پڑھنے سے کبھی دل کو نہ ہوگی سیری
منظرِ عالمِ ارواح ہے لائبریری

مفت لٹتی ہے یہاں دولتِ علم و حکمت — پھر بھی محروم رہے کوئی تو اسکی قسمت
طلبا کے لئے ہے عام یہ خوانِ نعمت — چاہئے تغذیہ روح بوقتِ فرصت

تذکرہ آبِ خضر کا اگر آفاق میں ہے
تو وہ موجود یہیں جدولِ اوراق میں ہے

آبِ حیواں ہے حقیقت میں اسی علم کا نام — زندہ ہیں آج بھی جو پی چکے ہیں اسکے جام
زیست کو اپنی بھی دیتا ہو جو تمنا دوام — جاکے خمخانہ میں سُن لیجئے شیشوں کا پیام

ایسی ہر رنگ کی ہیں کہنہ شرابیں محفوظ
جن کے نظارہ سے ہوتی ہے طبیعت محظوظ

قدر اس مے کی نہ کرنا بھی ہے بے انصافی — جس کا ہر جرعہ ہے اک تجربہ اسلافی
جلوہ گر ہے جو قرابوں میں شرابِ صافی — غالباً عمرِ خضر کے لئے ہوگی کافی

مے کشو ہاتھ میں جب ساغرِ صہبا لینا
ساقیِ میکدہ کو دل سے دعائیں دینا

کون ساقی شہ جم جاہ خدیوِ ذی شاں — جس نے رکھی ہے سبیل ایک پئے بادہ کشاں
کاغذی کوزوں میں لبریز شرابِ عرفاں — دیکھ ہی کر جسے تازہ ہو دماغِ انساں

شام کو صبح کو جس وقت بھی جی چاہے آئیں
تشنہ کامانِ علوم آکے یہاں پیاس بجھائیں

علم کی تھاہ نہیں کوئی یہ ہے وہ دریا — اس سمندر میں جو موتی ہے وہ دُرِ یکتا
اس سے آسائش و آرائشِ قدرِ زیبا — یہ جو پیروں کا عصا ہو تو جوانوں کی قبا

قوتِ علم سے بڑھ کر نہیں قوت کوئی
اس کے رتبہ کو پہنچتی نہیں دولت کوئی

عقل کو معرفتِ حق کا دیا ہے یہی علم — اور پھر کسبِ معیشت کا بھی حیلہ ہے یہی علم
باطناً مصلحِ عاداتِ رذیلہ ہے یہی علم — ظاہراً مظہرِ اوصافِ جمیلہ ہے یہی علم

نہ ہو انسان میں تو حیواں سے بھی وہ بدتر ہے
بلکہ اک پیکرِ بے جاں سے بھی وہ بدتر ہے

بہرِ انساں ہیں کتابیں رفقائے عاقل — ہم نشیں ایسے کہ اکتائے نہ جن سے کبھی دل
نہ تو غیبت میں یہ بدگو نہ حضوری میں مخل — کیوں نہ پھر ان کی طرف اہلِ نظر ہوں مائل

ان کے قبضہ میں تجارب کا جو گنجینہ ہے
نفع بخش و ادب آموز ہر آئینہ ہے

فتنہ و شر نہ حسد ان کی طبیعت میں کہیں — کوئی بھی ان کی زباں سے گلہ سنج ان کا نہیں
انھیں زندہ جو کہیں لیں تعیں آجائے یقیں — کہو مردہ تو نہ ہو جب بھی کوئی چیں بہ جبیں

گو کہ بے جان ہیں پر افعال ہیں جانداروں کے
چومتے رہتے ہیں ہاتھ اپنے خریداروں کے

خوش تمیز ایسے بھی دیکھے ہیں کتب بیں اکثر — واقعاً سیرِ کتب کا جنھیں ہے شوق مگر
احتیاطی روشیں رکھتے نہیں مدِ نظر — اوروں سے عاریۃً لیکے کتابیں اکثر

یا کسی صفحہ کو مسودہ بنا دیتے ہیں
یا ورق پھاڑ کے خود جیب میں رکھ لیتے ہیں

ایسوں کو سیرِ کتب کی جو اجازت دی جائے — تو کتابوں کی بخوبی نگرانی کی جائے
یہ بھی ملحوظ رہے جلد جہاں سے لی جائے — بعد پڑھنے کے اسی طرح وہیں رکھی جائے

اس طرح لائیں کتابوں کو اگر کام میں لائیں
ٹوٹنے پائیں نہ جلدیں نہ ورق مڑنے پائیں

ناظمِ قصرِ کتب، عرشیؔ فرخندہ سیر — نکتہ رس، فرش سے تا عرش ہے جن کی نظر
میں نے سرکار کو فرماتے سُنا ہے اکثر — ہے انھیں ذخرِ کتب میں یہ طولیٰ صد بہر

ایسے شاطر ہیں کہ سُن گن جو ذرا پائیں گے
عرش پر بھی ہو صحیفہ تو اڑا لائیں گے

بہرہم نام رضا قلعۂ شاہانہ علم — ہے جہاں مسندِ شکوہ جہل صلح خانۂ علم

رامپور آکے ذرا دیکھا کاشانۂ علم　　ہر طرف پلیٹے گا دور میں پیمانۂ علم

۔۔۔ دعائیہ صفی زمزمۂ مستانہ

عمر سے ساقی رہے آباد تیرا مے خانہ

"معائنۂ منظوم حسب فرمائش ناظم کتاب خانہ ریاست رامپور
جناب عرشی مورخہ ۵ر اپریل ۱۹۴۰ء

احقر العباد صفی عفی عنہ، بقلم"

جوش ملیح آبادی نے بھی معائنہ بک میں ۱۱ر مئی ۱۹۴۰ء کو منظوم معائنہ درج کیا ہے۔ نظم کا عنوان ہے "کتب خانۂ رام پور"۔ صفی لکھنوی کے معائنہ اور اس معائنہ کے درمیان اور کوئی دوسری رائے درج نہیں ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ صفی مرحوم خاص باغ میں کچھ دنوں سے ہز ہائی نس نواب صاحب[1] رام پور کے مہمان تھے۔ اسی زمانہ میں جوش صاحب بھی مہمان ہوئے۔ کتب خانہ کی سیر کرائی جانے کے بعد عرشی صاحب نے ان سے بھی منظوم رائے لکھنے کی فرمائش کی۔ یقین ہو کہ جب معائنہ بک ان کے پاس گئی ہوگی تو اس میں صفی کی نظم ضرور نظر سے گذری ہوگی۔ بہرحال جوش نے اپنی نظم کے آخر میں ایک نوٹ بھی دے دیا۔ جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"انتہائی گرمی اور بے نہایت عجلت میں یہ نظم کہی اور لکھی گئی"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مئی کا زمانہ گرمی کے شباب کا زمانہ ہے مگر جوش صاحب خاص باغ پیلس میں ہز ہائی نس کے مہمان تھے جہاں سے گرمی اپنا دامن بچا کر نکلتی ہے!!

کتب خانہ رامپور سے متاثر ہو کر اور اسی عنوان (کتب خانۂ رام پور) سے جو نظم رضا لائبریری کی معائنہ بک میں درج ہے وہ بعد میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ سموم و صبا مطبوعہ ۱۹۴۵ء میں صرف "کتب خانہ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ تعجب ہے کہ جوش صاحب نے جس کتب خانہ سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی اور اولاً اس کا جو عنوان مقرر کیا اسے سموم و صبا میں محذوف کیوں کر دیا۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ سموم و صبا میں شائع شدہ نظم شاعرانہ صنعت گری کا نہایت حسین نمونہ ہے۔ اس کا اندازہ دونوں نظموں کے تقابل ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ہر دو نظموں کا پہلا بند اسی غرض سے پیش کیا جاتا ہے:-

"کتب خانۂ رام پور" (درج معائنہ بک۔ رضا لائبریری۔ رام پور)

اے کہ پنہاں تیری ہر اک جلد میں گنج خطیر　　تیرے زم اوراق میں ہو فطرت ابر مطیر
تجھ میں مہر نیم روز و جلوۂ ماہ منیر　　تجھ میں پنہاں جنبش نبض حکیمانہ کبیر
بادۂ افشردۂ افکار تیرے خم میں ہے
موجزن ذہن انسانی ترے قلزم میں ہے

"کتب خانہ" (سموم و صبا ۱۹۴۵ء)

اے کتب خانے متاع علم کے گنج خطیر　　ہے کہ تیرا ہر ورق ایک ٹکڑا ابر مطیر
تجھ میں تاب مہر تاباں جلوۂ ماہ منیر　　تیری سطریں حامل نبض حکیمانہ کبیر
بادۂ افشردۂ افکار تیرے خم میں ہے
جزر و مد فکر انسانی ترے قلزم میں ہے

اب نظم کتب خانہ رام پور تمام و کمال درج کی جاتی ہے۔

"کتب خانہ رام پور"

اے کہ پنہاں تیری ہر اک جلد میں گنج خطیر　　تیرے زم اوراق میں ہو فطرت ابر مطیر
تجھ میں مہر نیم روز و جلوۂ ماہ منیر　　تجھ میں پنہاں جنبش نبض حکیمان کبیر
بادۂ افشردۂ افکار تیرے خم میں ہے
موجزن ذہن انسانی ترے قلزم میں ہے

نور عرفاں سے ترے شمس و قمر ہیں منفعل　　اے غرور اہل حق اے ناز بزم آب و گل
تجھ میں ہیں کتنے دماغ اے طاق زریں مشتعل　　کتنے رندوں کے دھڑکتے ہیں ترے سینے میں دل
تیرے نظارے سے بڑھ جاتی ہو جولانی مری
روح کے انفاس چھو لیتے ہیں پیشانی مری

تیرے ہر اک دائرے میں دولت نجم و قمر　　تیرے ہر مصحف کی زریں جلد میں لعل و گہر
لالہ و گل بن کے وہ غنچے ہیں تجھ میں جلوہ گر　　علم کی دیوی نے چٹکایا تھا جن کو چوم کر
خاتم پاک سلیماں تیرے دست ناز میں
لحن داؤدی کے شیشے ہیں تری آواز میں

تیرے شیشوں سے ابلتی ہو حقائق کی شراب　　تیرے ہر ذرہ میں گردش کر رہا ہو آفتاب
تو فسانہ در فسانہ ہے کتاب اندر کتاب　　شیب ہے تیرے نمایاں ہو تفکر کا شباب
پختہ عقلی، پختہ کاری، پختہ جانی تجھ میں ہو
اہل حکمت کے بڑھاپے کی جوانی تجھ میں ہو

---

[1] ہز ہائی نس نواب رضا علی خاں، نواب رام پور۔

تو حقائق کا سفینہ معرفت کی آب جو — بادۂ اندیشہ سے لبریز ہے تیرا سبو
جذب ہو سطروں میں تیری لے بہشتِ آرزو — کتنے ہاتھوں کا پسینہ کتنی پلکوں کا لہو

پھانکی جن سے ابھی تک خاک کے سینے میں ہے
عکس ان اہلِ نظر کا تیرے آئینے میں ہے

اے حریمِ اہلِ دل اے دیرِ اربابِ قلم — سومناتِ احتشام و کعبۂ طبل و علم
اے حق آگاہی کے معبد اے تفکر کے حرم — اے جنوں کے بوستاں اے عقل کے بیت الصنم

تیرے آبِ جاوداں کو ربط ہے صہبا کے ساتھ
خطبۂ سقراط بھی ہے ربطِ سلمیٰ کے ساتھ

ہر فشاں ہیں تجھ پہ بادل جو دو بذلِ عام کے — رنگ سب غلطاں ہیں تجھ میں چرخِ نیلی فام کے
تجھ میں یوں گونجے ہوئے ہیں زمزمے الہام کے — اہلِ دل سننے کو آتے ہیں کلیجہ تھام کے

تیرے ہر قطرہ میں جولانی ہے رودِ نیل کی
تیرے گوشہ میں ہوا ہے دامنِ جبریل کی

حرف کی صورت میں ڈھل کر اہلِ دانش کے خیال — تیرے فرشِ نرم پر خوابیدہ ہیں بے قیل و قال
جن کا دامن چھو نہیں سکتی ہوائے ماہ و سال — اے گلستانِ جمیل و اے خیابانِ جمال

ہر کتاب اس طرح تیری دلنشیں منزل میں ہے
لیلیٰ جاں بخش گویا پردۂ محمل میں ہے

جوشؔ

۱۱ مئی ۱۹۴۲ء

"انتہائی گرمی اور بے نہایت عجلت میں یہ نظم کہی اور لکھی گئی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۲ جنوری ۱۹۵۲ء کو کتب خانہ میں تشریف فرما ہوئے۔ موصوف اس زمانہ میں دو تین دن کے لئے اپنے پارلیمانی انتخاب کے سلسلہ میں رام پور تشریف لائے تھے۔ مولانا نے معائنہ بک میں جو عبارت لکھی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوسری بار کتب خانہ میں آئے تھے وہ فرماتے ہیں: "مجھے اس قیمتی کتب خانہ کے معائنہ کا پھر موقعہ ملا۔" دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ پہلی مرتبہ وہ مولانا شبلی کے ساتھ کتب خانہ آئے تھے اسی معائنہ میں مرحوم نے اس کی امید کی ہے کہ بدلے ہوئے حالات اس کتب خانہ کی مزید اصلاح و ترقی کا موجب ثابت ہوں گے۔ چنانچہ خوشی کی بات ہو کہ مولانا کی امیدیں بارآور ہو رہی ہیں اور اتر پردیش سرکار اس خزینۃ العلوم کی بقا و ترقی و تہذیب پر معقول رقم صرف کر رہی ہے۔ مولانا آزاد مرحوم کا متذکرہ بالا معائنہ درج ذیل ہے:-

"ایک عرصہ کے بعد مجھے اس قیمتی کتب خانہ کے معائنہ کا پھر موقعہ ملا۔ ہندوستان میں جو گنتی کے قیمتی علمی ذخائر ہیں ان میں ایک گراں مایہ ذخیرہ یہ ہے۔ امید ہے کہ حالات کی تبدیلیوں نے جو اب نئی صورت پیدا کر دی ہے وہ اس کتب خانہ کی مزید اصلاح و ترقی کا موجب ثابت ہوگی۔ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ایک صاحب علم فرد کی خدمت و نگرانی اسے حاصل ہے یعنی مولوی امتیاز علی صاحب عرشی کی۔"

ابوالکلام آزاد

۱۲ جنوری ۱۹۵۲ء

پدماوت

محبوب اللہ مجیب

قومی مزاج کی عکاسی اور خیالات و جذبات کی آئینہ داری ہر ادبی تاریخ کے فرائض میں سے ہے۔ چنانچہ فارسی ادب میں جن مشاہدات و احساسات کی نمائندگی جلال الدین رومی، سنائی، نظام گنجوی اور حافظ وغیرہ نے کی، ٹھیک اسی طرح کی نمائندگی ہندی ادب میں قطبین، جائسی اور عثمان کے ہاتھوں ہوئی۔

ہندوستان میں سب سے پہلے دراصل امیر خسرو نے رومی و حافظ کے اس میخانے کو شہرت دی اور وہ بھی اس طرح کہ

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانہ مستی کہ در شیراز بود

آہستہ آہستہ یہ اثر دور رس ہوتا گیا یہاں تک کہ ہندی ادب پر بھی اثر انداز ہوا۔ نہ محض اثر انداز ہی ہوا بلکہ ذہنی تعمیر میں ایک خاصا رول (کردار) بھی ادا کیا۔ ہندی ادب میں "بھگت کال" (دور تصوف) بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دور [illegible] سے شروع ہو کر [illegible] میں ختم ہو جاتا ہے۔ مزید برآں اس کو بھی چار دور میں منقسم کیا جاتا ہے:۔

۱۔ سنت کا ویہ دھارا:۔ اس دور کے شاعروں میں کبیر ایک مخصوص حیثیت کے مالک ہیں، جن کے نزدیک رام اور رحیم میں کوئی فرق نہیں۔

۲۔ کرشن کا ویہ دھارا:۔ سور داس کے دوہے اس رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

۳۔ رام کا ویہ دھارا:۔ اس تحریک کے بانی مبانی شری رام نج ہیں۔ تلسی داس جی اس دور کی رہنمائی کرتے ہیں۔

۴۔ اور صوفی کا ویہ دھارا:۔ اس دور کے شاعروں کا مزاج اور رجحان صوفیوں جیسا ہے۔ قطبین ان کے پیشرو ہیں۔ جائسی، عثمان، نور محمد، قاسم، فاضل شاہ اور شیخ نبی نے اس مخصوص رجحان کے ادب کو مالا مال کیا۔

ملک محمد جائسی۔ ملک محمد جائسی کے آبا و اجداد عرب تھے۔ لیکن انھوں نے خود جائس (ضلع رائے بریلی۔ اتر پردیش) کو اپنا وطن بتایا ہے جہاں وہ سکونت پذیر ہوئے۔

جائس نگر دھرم استھانو تہاں آئے کب کینہ بکھانو

जायस नगर धरम अस्थानू।
तहाँ आहि कब कीनहि बखानू॥

(جائس نگر جو ایک متبرک جگہ ہے۔ (شاعر ملک محمد) نے وہاں آکر شاعری کی)

جائسی کے والد کا نام شیخ ممریز تھا جو خود صوفی مزاج تھے۔ اختر دہلوی لکھتے ہیں:

"آپ خلیفہ شیخ اللہ داد کے اور وہ خلیفہ محمد مہدی کے اور وہ خلیفہ شیخ دانیال کے وہ خلیفہ سید راجی حامد شاہ کے، وہ مرید شیخ حسام الدین مانک پوری کے کہ خاندان نظامیہ (چشتیہ) میں مشہور مشائخ گزرے ہیں اور لقب ان کا محقق ہندی تھا۔ آخر عمر میں آپ کبڑے ہو گئے تھے۔ ایک بار بحضور اکبر اعظم (شیر شاہ سے مطلب ہے) آئے۔ شہنشاہ نے ان کی ہیئت کو دیکھ کر تبسم فرمایا۔ آپ نے کہا کہ اے بادشاہ! ظرف پر تبسم کیا یا کمہار پر؟ بادشاہ نے آپ کی فطانت پر آفریں کی۔ ہندی زبان میں آپ کی تالیفات بہت ہیں۔ پدماوت، ادھوتی نامہ و پوستی نامہ اور وفات حضرت کی سنہ ۹۴۹ھ ہے۔" (تذکرہ اولیاء ہند و پاکستان صفحہ ۲۴۰)

اور غلام سرور لاہوری کی رائے میں
"ملک محمد جائسی) مرید و خلیفہ شیخ الله داد است کہ
خلیفہ محمد مہدی است۔ او درکتب خود مدح بسیار کرد"
(خزینۃ الاصفیاء جلد اول صفحہ ۳۰۴)

ملک محمد کی عمر کا کافی حصہ جائس میں گذرا جہاں وہ تصوّف آمیز مزاج کی رہبری کرتے رہے۔ ان کی ذہنی تعمیر دو صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہوئی۔ اول سید اشرف جہانگیر اور دوئم سید محی الدین۔ یہ حضرات اپنے دور کی بزرگ ترین ہستیوں میں سے تھے۔ ملک محمد نے انھیں جان و دل سے خراج پیش کیا ہے۔

جہانگیر وے چستی نہ کلنک جس چاند   وے مخدوم جگت کے ہوں وہ گھر کے باند
(پدماوت استتی کھنڈ)

जहाँगीर वै चस्ती न कलंक जस चाँद ।
वे मख़दम जगत के हौं अप घर केबाँद ॥

(چشتیہ خاندان سے تعلق رکھنے والے شیخ اشرف جہانگیر چاند کے مانند سارے عیوب سے پاک ہیں۔ ان کی خدمت تمام دنیا نے کی اور میں انھیں کے گھر کا غلام ہوں۔)

سید اشرف پیر پیارا   جیہہ مونہہ پنتھ دینھ اجیارا
لیسائیں پیم کر دییا   اٹھی جوت بھا نرمل ہییا
(پدماوت استتی کھنڈ)

सैयद अशरफ़ पीर प्यारा ।
जीहि मुँह पंथ दीन्हि उजयारा ॥
लैसाईं पीम कर दैया ।
उठी ज्योति भा निर्मल हैया ॥

(پیر و مرشد سید اشرف جنھوں نے میرے دل کو روشن کیا، دل میں محبت کا چراغ جلایا، مجھے راہ راست دکھائی اور جن کی صاف و شفاف روشنی سے دل پاک و صاف ہو گیا۔)

ملک محمد جائسی سنہ ۹۴۹ھ (سنہ ۱۵۴۰ء) میں دہلی گئے اور انھوں نے پدماوت شیر شاہ سوری سلطان دہلی کے حضور میں پیش کی اور خراج عقیدت وصول کیا۔ پدماوت کے وہ حصے جو اس عادل شہنشاہ کی تعریف میں ہیں وہ بالکل فارابی کے قصیدے کے رنگ پر ہیں۔

سیر ساہ دلی سلطانو   چاریو کھنڈ تپے جس بھانو
اوہی چھاج چھات او پاٹا   سب راج بھیئیں دھرا للاٹا

सेर साह दिल्ली सुलतानू ।
चारिउ खंड तपे जस भानू ।
ओहि छाज छात ओ पाटा ।
सब राज भुईं धरा ललाटा ॥

(دہلی کا سلطان شیر شاہ جو چہار عالم میں مثل آفتاب روشن ہے۔ یہ تخت و تاج اسی کو زیب دیتا ہے جس کے در پر سارے راجہ آکر پیشانی ٹیکتے ہیں۔) صوفیا کے رواج کے مطابق ہر صوفی کو ایک ولایت سپرد کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ جائسی کے پیر و مرشد نے انھیں امیٹھی کی ولایت سپرد کی جہاں وہ راہ سلوک کی تبلیغ میں مشغول رہے۔ عوام و خواص ان کے در پر جمع ہوتے اور فیضیاب ہوتے۔ راجہ امیٹھی کو بھی ان سے عقیدت ہو گئی جس کے ثبوت میں خود ان کا مقبرہ ہے جو راجہ نے تعمیر کرایا۔

پدماوت کی کہانی ۔ پدماوت کی کہانی اور اس کے کردار جزیرہ سنگلدیپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جزیرے کی جس طرح تعریف جائسی نے کی ہے، اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک زرخیز علاقہ تھا، جہاں لوگوں کی مالی حالت بہت بہتر تھی۔

گندھرپ سین جزیرے کا راجہ تھا جو بہت ایماندار اور منصف تھا۔ اس کی ایک لڑکی تھی، جس کا نام پدماوتی تھا۔ پدماوتی کے پاس ہیرا نامی ایک طوطا تھا جس سے اس نے شوہر تلاش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر یہ خبر بادشاہ تک پہنچ گئی۔ اس نے اسے قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ خیر سے اس نے جان بچائی اور جنگل کو بھاگ گیا۔ وہاں سے پھر کسی شکاری کے ہاتھ لگا، جس نے چتوڑ لا کر اسے بیچ دیا۔ اس طوطے کو خریدنے والا راجہ رتن سین خود تھا۔ ایک دن رتن سین کی رانی ناگمتی سنگار کر رہی تھی۔ سنگار کے بعد اس نے اپنے حسن کی بابت طوطے سے پوچھا۔ اس نے کچھ توجہ نہ دی اور پدماوتی کے حسن کی تعریف کرنے لگا۔ یہ سن کر رانی ناگمتی طوطے پر غضبناک ہوئی۔ اتنے میں راجہ رتن سین آگیا اور اس نے پدماوتی کے حسن کی تعریف جو سنی تو وہ اس کا نادیدہ عاشق ہو گیا۔ آخر اس نے چتوڑ سے سنگلدیپ تک

کا سفر کیا اور مصیبتیں جھیلیں۔ مگر پدماوتی جیت کر ہی چتوڑ واپس ہوا۔ اس زمانہ میں علاءالدین خلجی جو دہلی کا حکمراں تھا۔ پدماوتی کے حسن کی تعریف سن کر وہ غائبانہ اسے دل دے بیٹھا اور اسے حاصل کرنے کی غرض سے راجہ رتن سین کو قید کر لیا۔ یہ سن کر پدماوتی کبیدہ خاطر ہو گئی۔ اور اس نے اپنے آپ کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے کی خواہش کی۔ بادشاہ نے اس کے استقبال کی تیاریاں شروع کیں۔ محافۂ شاہی محل کے سامنے آکر رکا مگر پدماوتی کی جگہ برہنہ تلوار لئے ہوئے راجپوت نکل آئے اور رتن سین کو آزاد کرا لیا۔ اب علاءالدین خلجی نے رتن سین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ خوب گھمسان لڑائی ہوئی۔ اور ایک ایک راجپوت رتن سین کے مرنے کے بعد لڑائی میں کام آگیا۔ رتن سین کے مرنے کی خبر سن کر دونوں رانیوں، ناگمتی اور پدماوتی نے راجپوتوں کی رسم کے مطابق "جوہر" کر لیا اور آگ میں جل کر خاک ہو گئیں۔ اس طرح علاءالدین خلجی کی خواہش تشنہ ہی رہی۔

پدماوت کے فارسی اور اردو نسخے۔ سنہ ۱۶۵۲ء میں فارسی نثر میں ایک کتاب لکھی گئی تھی جس کا نام تحفۃ القلوب ہے۔ اس کی داستان پدماوت کی داستان جیسی ہے۔ دوسرے یہی قصہ فارسی میں نظم بھی کیا گیا جو حسین غزنوی کے ہاتھوں ہوا۔ اردو میں اس قصے کو نظم کرنے والے ملّا ابوالقاسم، ضیاءالدین عبرت اور غلام علی عشرت ہیں۔ جن میں سے ابوالقاسم نے تو یہ کام تن تنہا کیا لیکن ضیاءالدین اور غلام علی نے مل کر کیا ہے۔ سنہ ۱۶۵۰ء میں پدماوت کا ترجمہ بنگلہ زبان میں بھی ہوا۔ اراکان ریاست کے وزیر مگن ٹھاکر نے اجالو نامی شخص کے ذمے اس کے ترجمے کا کام سپرد کیا تھا۔

جائسی نے پدماوت کب شروع کی، اس کا اشارہ خود انھوں نے ہی پدماوت میں کیا ہے۔

سن نو سو ستائیس اہی — کتھا ارمبھ بین کب کہی

सन नौ सौ सत्ताईस अही।
कथा आरम्भ बै कब कही।

(سن نو سو ستائیس تھا، جبکہ شاعر نے اپنی داستان شروع کی)

جائسی کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ پدماوت کا سن تصنیف سنہ ۹۲۷ھ (سنہ ۱۵۲۰ء) ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ ان تاریخوں میں ابراہیم لودی دہلی کا بادشاہ تھا شیر شاہ سوری نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دو اور چار کے عدد پڑھنے میں غلطی ہوئی اور یہ غلطی فارسی کے ہی نسخے سے ممکن ہو سکتی ہے۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ دو اور چار اپنی مماثلت کی وجہ سے غلط پڑھ لئے جاتے ہیں۔ سو اس کا بھی وہی حشر ہوا۔

اس طرح پر پدماوت کا سن تصنیف سنہ ۹۴۷ھ یا سنہ ۱۵۴۰ء ہے جب کہ ہندوستان کا حکمراں شیر شاہ سوری تھا جس کی پدماوت میں تعریف کی گئی ہے:

پدماوت کی تکنیک فارسی مثنویوں جیسی ہے۔ فارسی مثنویوں میں ہر داستان کے گرد مختلف کردار ہیں اور ان کرداروں کی باگ ڈور رمزیت (Symbolism) کے ہاتھوں میں ہے۔ "مجاز" اگرچہ کہ ان کا ذریعۂ اظہار ہے مگر دراصل "حقیقت" ہی ان کی منزل ہے۔ جیسے جلال الدین رومی کی "مثنوی مولوی معنوی" اور نظامی گنجوی کی خسرو و شیریں اور لیلیٰ و مجنوں وغیرہ۔ یہی صورت پدماوت کی ہے۔

پدماوت کے رسم خط کو سب ہی محقق فارسی قرار دیتے ہیں۔ ایف ای کی (F. E. Keay) نے بھی پدماوت کا فارسی رسم خط بتایا ہے۔
(ہسٹری آف ہندی لٹریچر صفحہ ۲۹)

پدماوت کا اوّل و آخر۔ پدماوت کا پہلا باب استُت کھنڈ ہے۔ فارسی مثنویوں کی طرح پدماوت میں بھی سب سے پہلے حمد کا حصہ ہے۔

سمروں آد ایک کرتارو — جیہہ جیو دینہ کینہ سنسارو
کینہس پرتھم جوت پرگاسو — کینہس تیہہ پریت کیلاسو
(استُت کھنڈ)

सुमिरन आदि एक करतारू।
जीह जिव दिनहि कीन्हि संसारू।
कीन्हस प्रथम ज्योति प्रगासू।
कीन्हस तो प्रीति कैलासू॥

(یاد کرتا ہوں اس کارساز کو، جس نے زندگی عطا کی اور مخلوق پیدا کی پہلے اس نے ایک نور پیدا کیا، پھر اس نور کی خاطر جنت بنائی)

خدا کی تعریف کے بعد رسول مقبول کی تعریف کی ہے:۔

کینہس پرکھ ایک نرمرا — نام محمد پونو کرا
پرتھم جوت بدھ تاکر ساجی — او تیہہ پریت سمشٹ اپراجی

कीन्हस पुरुख एक नर अरा ।
नाम मुहम्मद पुनू करा ।
प्रथम ज्योति बुद्ध ताकर साजी।
उईथि प्रीति सहट अपराजी॥

(اس خدا نے ایک پاک انسان پیدا کیا جس کا نام محمد اور چودھویں رات کے چاند جیسا روشن۔ خدا نے سب سے پہلے اپنے نور سے انھیں پیدا کیا اور ان کی خوشنودی کے لئے مخلوق پیدا کی)

اس کے بعد خلفائے راشدین کی تعریف ہے:-

چار میت جو محمد ٹھاؤں — جنہہ دینہو جگ نرمل پاؤں
ابابکر سدیق سیانے — پہلے صدق دین وئی آنے

चार मीत जौ मुहम्मद ठाउँ ।
जीहि दीनहिं जग निर्मल पाऊँ ।
अबाबकर सिद्दीक सयाने ।
पहले सिद्दक दीन वई आने ॥

(حضرت محمد کے چار یار تھے جن کو دنیا نے متبرک نام سے یاد کیا ہے اول خلیفہ ابو بکر تھے جو پارسا تھے اور سب سے پہلے ہی صدق دل سے ایمان لائے)

پن سو عمر خطاب سہائے — بھا جگ عدل دین جو آئے
پن عثمان پنڈت بڑ گنی — لکھا پران جو آیت سنی

पुन सौ उमर खताब सुहाये ।
भा जुग अदल दीन जो आये ।
पुन उसमान पंडित बड़ गुनी ।
लिखा पुरान जौ आयत सुनी ॥

(دوئم خلیفہ حضرت عمر تھے۔ جب وہ ایمان لائے تو انصاف کا بول بالا ہوا۔ سوئم خلیفہ عثمان غنی تھے جو بڑے عالم اور پرہیزگار تھے۔ انھوں نے آیتیں سن کر ان سب کو ایک کتابی شکل دی۔)

چوتھے علی سنگھ بریارو — سو نہہ نہ کوؤ رہا جھجھارو

चौथे अली सिंह बरयारू ।
सो नहन न कोऊ रहा जुझारू ॥

(خلیفۂ چہارم حضرت علی تھے جو شیر کے مانند تھے اور جن کے مقابل میں کوئی جنگ کرنے والا نہیں تھا۔)

ان سب کے بعد بادشاہ وقت شیر شاہ سوری کی تعریف ہے۔

سیر ساہ سر پوج نہ کوؤ — سمد سمیر بھنڈاری دوؤ
دان ڈنک باجے دربارا — کیرت گئی سمندر پارا

सेरसाह सिर पूज न कोऊ ।
समुद सुमीर भंडारी दोऊ ।
दान डाँक बाजे दरबारा ।
कीरत गई समुन्दर पारा ॥

(کوئی بھی شیر شاہ کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ پہاڑ اور سمندر اس کے نگہبان تھے۔ اس کے دربار میں بخشش کا ڈنکا بجتا تھا۔ اسی لئے اس کی شہرت سمندر پار تک گئی)

بادشاہ وقت کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد اپنے پیر و مرشد سید اشرف جہانگیر کی روشن ضمیری اور پاک دامنی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد اپنے مرشد کی اولاد حاجی شیخ اور حاجی شیخ کی دو اولادوں شیخ محمد و شیخ کمال کی نیک نفسی کی تعریف کی ہے۔

پدماوت کے آخر میں بھی عشق کا جلال اور جمال ہے۔ کہانی لکھنے اور کہانی لکھنے سب کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے:-

محمد کبیہ یہ جوڑ سناوا — سنا سو پیر پیم کر پاوا
جوری لائی رکت کے لیئی

मुहम्मद किब यह जोड सुनावा ।
सुना सो पीर पीम कर पावा ।
जोरी लाइ रक्त कै लेई ।

(شاعر ملک محمد نے الفاظ جمع کر کے یہ داستان بنائی۔ جس نے بھی سنا وہ درد محبت سے بیقرار ہوا۔ اس کہانی کو میں نے خون کی لیئی سے جوڑا ہے)

کہاں سو رتن سین اب راجا — کہاں سوا اس بدھ اپراجا

कहाँ सो रत्न सेन अब राजा ।
कहाँ सुवा अस बुद्ध अपराजा ॥

(کہاں اب وہ راجہ رتن سین ہے اور کہاں اب وہ عقلمند ہیرامن طوطا جس نے بادشاہ کو عقل دی)

کہاں علاالدین سلطا نو　　کہنہ راگھو جیہی کیہہ بکھا نو
کہنہ سروپ پدمات رانی　　کوئی نہ رہا جگ رہی کہانی

कहाँ अलादीन सुल्तानू।
कहँ राघ् जेई कीँघ वखानू।
कहँ सरूप पदमावत रानी।
कोइ न रहा जग रही कहानी॥

(کہاں وہ علاالدین سلطان اور کہاں وہ راگھو چیتن جس نے پدماوتی کے حُسن کی تعریف کی کہاں وہ خوبصورت رانی پدماوتی لیکن اگر باقی ہے تو صرف ان کی یہی ایک کہانی)

دھن سوئی جس کیرت جاسو　　پھول مرے پے مرے نہ باسو

धन सोई जस कीरत जासू।
फूल मरे पै मरे न बासू॥

(خوش نصیب وہی ہے جس کا نام دنیا میں جانا جائے پھول اگر مر بھی جائے تو اس کی خوشبو تو نہیں مرتی؟)

پدماوت کا اوّل و آخر پدماوت کا مزاج سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا کرتا ہے۔ اور جائسی کے سارے رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔

پدماوت اور "حدیثِ دوست"۔ اگر شاعری احساسات وجذبات کی ترجمانی کا نام ہے تو نشاط وغم اس کی کیفیات کا نام ہے جس میں وصل کی نمائندگی 'نشاط' سے ہوتی ہے اور 'غم' کی نمائندگی 'فراق' سے۔ اور پدماوت انھیں دو رُخ کی تصویر کشی رشک کی حد تک کرتی ہے۔

پدماوتی کے زلفوں کی تعریف میں:۔

بھنور کیس وہ مالت رانی　　بسہر لرے لینہ ارگھانی
بینی چھور جھار جوں بارا　　سرگ پتار ہوئے اندھیارا

(ستامانکھنڈ پدماوت)

भँवर केस वह मालति रानी।
बसहर लरे लीन्ह अरघानी।
बीनी छोर भार जूँ बारा।
सरग पतार हुये अँधियारा॥

(پدماوتی کے) بال مثل بھنورے کے ہیں اور وہ مالتی کے پھول کی طرح ہے جیسے سانپ ان پر جھکے ہوئے خوشبو لے رہے ہوں۔ جب وہ جوڑا کھولتی ہے تو آسمان سے زمین تک تاریکی ہو جاتی ہے)

پدماوتی کے نہانے کا سماں:

سرور تیر پدمنی آئی　　کھوپا چھور کیس مکلائی
سسی منکھ انگ ملیگر باسا　　ناگن جھانپ لینہ چہنہ پاسا

(مان سرودک کھنڈ)

सरवर तीर पदमनी आई।
खोंपा छोड़ केस मकलाई।
ससि मुख अंग मलेगिर बासा।
नागिनि झाँपलींह चिन्ह पासा॥

(پدماوتی تالاب کے کنارے نہانے آئی۔ جوڑا کھول کر بال منتشر کر دیے۔ ماہتاب جیسا چہرہ جسم صندل کی سی خوشبو لئے ہوئے اور منتشر گیسو ناگن کی طرح اس کے جسم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا)

پدماوتی جوان ہوتی ہے اور کلی سے پھول بن جاتی ہے اس کے احساس اس کو کریدتے ہیں اور وہ اپنے آپ سے کہتی ہے:۔

جوبن سنیوں کے نوں بسنتو　　تیہہ بن پریو ہست میمنتو

(پدماوتی بیوگ کھنڈ)

जोबन सुनियो के नूल बसंतू।
तीह बन परयो हस्त मेमन्तू॥

(میں نے تو ابھی ابھی جوانی میں قدم رکھا تھا، مثل موسم بہار کے، مگر یہ کیا ہوا کہ اسی دم مست ہاتھی کی طرح صحرا میں گھر گئی)

جب راجہ رتن سین دولہا بن کر پدماوتی کو لینے آتا ہے۔ تو وہ شاہی محل کے سب سے اونچے والے حصے پر چڑھ کر اسے دیکھتی ہے۔ اس کو دیکھنے سے بدن میں جو ردِّ عمل ہوتا ہے وہ جائسی کے الفاظ میں:۔

ہکسا بدن اوپ رب آئی　　ہلس ہیا کنچک نہ سمائی
بٹے پچ کسی بند ٹوٹی　　ہلسی جنج بلیاں کر پھوٹی

(بیاہ کھنڈ راجہ رتن سین وپدماوت)

हकसा बदन ऊप रब आई।
हलस हिया कंचक न समाई।

हलसे कुच कसने बंद टूटी।
हलसे भुज वलियाँ करे फूटी॥

(پدماوتی کے بدن کو اسے دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی کہ وہ شل آفتاب چمکنے لگا۔ دل خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ گلابیاں ایسی ابھریں کہ بند ٹوٹ گئے اور بازو اس قدر درد کرنے لگے کہ چوڑیاں ٹوٹ گئیں)

ناگمتی رتن سین کی پہلی رانی ہے۔ جب راجہ پدماوتی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کی غرض سے بیراگ لے بیٹھتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ناگمتی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو ناگمتی کہتی ہے:—

پی سے کہو سندیسڑا ہے بھونرا ہے کاگ
جو دھنی برہے جر مئی تیہی کا دھواں ہم لاگ

(ناگمتی بیوگ کھنڈ)

पी से कहो संदेसटरा है भौंरा है काग।
जो दैहनी कर है जरमई तेंही का धुवँ हम लाग॥

(اے میرے پیامبر بھونرے اور کوّے! میرے محبوب (رتن سین) سے یہ بات جا کر بتا دے کہ وہ (ناگمتی) تیرے انتظار میں زندگی کا آخری لمحہ بھی قربان کر چکی۔ اس نے اتنا آہ و نالہ کیا کہ ساری فضا سیاہ ہو گئی اور اس کا خود بھی رنگ سیاہ ہو گیا)

اس طرح جائسی نے "حدیث دوست" مکمل کی۔ اگر سراپا کھینچنے پر آئے تو تفصیلات گنا ڈالیں۔ ہجر اور وصال کے بیان کرنے پر آئے تو ہر پہلو کو اجاگر کر گئے۔ یہ بڑے کمال کی بات ہے۔

پدماوت کا تخلیقی پہلو۔ مثنوی کے سبھاؤ سے ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ جائسی کے سارے بیان میں ایک رمز چھپا ہوا ہے۔ مثنوی کے اندر علاالدین خلجی کا کردار نفس امارہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ عقل اور روح کا کردار پدماوتی ادا کرتی ہے۔ اور جسم خاکی اس کی اچھائیاں اور برائیاں رتن سین کے کردار میں پوشیدہ ہیں۔

تن چتور من راجا کینھا   ہیۓ سنگل بدھ پدمن چینھا
راجسی پنتھ دیکھاوا   بن گر جگت کو نرگن پاوا

(اُپ سنگھا)

तन चितौर मन राजा कीनहा।
हीय सिंघल बुधि पदमन चीन्हा।

गुरु सवा जेई पंथ देखावा।
बिन गुर जगत को निरगुन पावा॥

(جسم چتوڑ گڑھ ہے اور جان راجا۔ دل سنگلدیپ ہے اور عقل رانی پدمنی ہے۔ طوطا مرشد ہے جس نے راہ بتائی اور بغیر مرشد کے دنیا میں کس کو خدا ملا)

ناگمتی یہ دنیا دھندھا   بانچا سوی نہ یہ چت بندھا
راگھو دوت سوی سیطانو   مایا علاالدین سلطانو

(اُپ سنگھار)

नागमती यह दुनिया धंधा।
बाँचा सोय न यह चित बंधा।
राघो दुत सोये सैतानू।
माया अलादीन सुलतानू॥

(ناگمتی کاروبارِ جہاں کا نام ہے۔ نجات اسی نے حاصل کی جس نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی۔ راگھو گمراہ کرنے والا شیطان ہے اور علاالدین خلجی حرص و ہوا کا بندہ)

مرنے کے بعد انسان کی قیمت جائسی کی نظروں میں اس طرح ہے:—

ہاتھ جوڑ جس چلے جواری   تجا راج ہو چلا جواری
جب لگ جیو رتن سب ہاکا   بھابھی جیو نہ کوڑی لاہا

हाथ जोड़ जस चले जुआरी
तजा राज हो चला जुआरी
जबलग जिंव रत्न सब हाका।
भाभी जिव न कोड़ी लाहा॥

(راجہ اپنی سلطنت چھوڑ کر اس طرح خالی ہاتھ جا رہا ہے جیسے ہارا ہوا جواری۔ بالکل اسی طرح جب تک جسم میں روح باقی تھی، جسم مانند ہیرے کے تھا، لیکن اب کوڑی کے برابر بھی نہیں)

دیگر خصوصیات۔ پدماوت مندرجہ بالا خوبیوں سے ہٹ کر بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس سے ملک کے معاشی، تہذیبی، ثقافتی اور رسم و رواج کے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جائسی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ملک کی معاشی حالت کہیں زیادہ بہتر تھی۔ ان کا رہن سہن بڑے

(باقی [illegible])

متین قزلباش

مجھے تو آس قفس میں ہے آشیانے کی
کہیں بدل نہ گئی ہو ہوا زمانے کی
سہم رہا ہوں خبر ہے بہار آنے کی
الٰہی لاج رہے میرے آشیانے کی
مرے نیاز میں گنجائشِ مجاز نہیں
مری جبیں نہیں ممنون آستانے کی
کھنچے ہیں فیضِ تصور سے نقش آنکھوں میں
مری نگاہ فضا بن گئی زمانے کی
مٹائے مٹتا نہیں سوزِ خانماں برباد
بجھائے بجھتی نہیں آگ آشیانے کی
سوادِ شب کسی بیدار آنکھ سے پوچھو
مگر وہ کون سی شب ہجر کے زمانے کی
متین آج رگِ جاں کچھ اس طرح تڑپی
سنی ہو جیسے کہ آہٹ کسی کے آنے کی

واچند دیپا د موج

سکوں اس دہر میں حاصل نہیں ہے
برابر راہ ہے منزل نہیں ہے
ہے اک کاشانۂ صد یاس و حسرت
یہ دل اب آپ کے قابل نہیں ہے
انھیں چھپ چھپ کے پیہم دیکھتا ہوں
نظر کو اعتبارِ دل نہیں ہے
محبت لازوال و غیر فانی
وفا پابندِ آب و گل نہیں ہے
وہی کلیاں، وہی رودادِ گلشن
مگر اب وہ نگاہ و دل نہیں ہے
تمہیں پاکر بھلایا اک جہاں کو
کچھ اور اب آرزوئے دل نہیں ہے
چھٹا ہے جانے کتنی بار ساحل
مجھے موج اب غمِ ساحل نہیں ہے

بسنت کمار بسنت لکھنوی

وعدوں میں ترے رنگِ وفا ڈھونڈھ رہے ہیں
تاریک فضاؤں میں ضیا ڈھونڈھ رہے ہیں

سمجھیں گے تو اعلانِ رقابت بھی کریں گے
غنچوں میں ابھی بوئے وفا ڈھونڈھ رہے ہیں

چھیڑیں گے نئے راگ نئے دور کے مطرب
محفل کے لئے ساز نیا ڈھونڈھ رہے ہیں

گلشن کے نگہباں ہیں غنچوں سے نہیں کام
جینے کو فقط تھوڑی ہوا ڈھونڈھ رہے ہیں

وحشت کے سوا کچھ نہیں بازارِ ہوس میں
ہم ہیں کہ دلِ صدق و صفا ڈھونڈھ رہے ہیں

مے خانۂ عرفاں میں بسنت آئے جو پینے
ہم ساغرِ مے سب سے جدا ڈھونڈھ رہے ہیں

سکون و حرکت

جمیل الدین حیدر

جب ہم اپنے چاروں طرف نظر ڈالتے ہیں تو ہر چیز کسی نہ کسی صورت میں متحرک نظر آتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے حتیٰ کہ ہمارا کرۂ ارض سبھی اپنی اپنی جگہ متحرک ہیں۔ اور جب کرۂ ارض متحرک ہے تو اس کرہ پر بسنے والی ہر شے بھی حرکت میں ہوگی، یہ حرکت ذاتی نہ سہی کرۂ ارض کی وساطت ہی سے سہی۔ بہر حال ہے حرکت میں۔

یہ حرکت کیا ہے، اس کے کیا اسباب ہیں، سکون کسے کہتے ہیں، اس قسم کے سوالات پہ عام طور سے غور نہیں کیا جاتا لیکن بعض مفکروں اور سائنس دانوں نے اس سلسلہ میں کافی تحقیق و تفتیش سے کام لیا اور ان سوالات کے متعلق ہمیں بہت کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ آئزک نیوٹن، گلیلیو، آئن اسٹائن وغیرہ کے نام اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیوٹن نے حرکت کے جو تین اصول ظاہر کئے ہیں وہ اس قدر بنیادی ہیں کہ ان کی صداقت مسلّم ہوگئی ہے۔ وہ اصول یہ ہیں:۔

پہلا اصول:۔ ہر جسم اپنی حالت سکون یا رفتار یکساں کو اس وقت تک برقرار رکھتا ہے جب تک کہ اس پر کسی بیرونی قوت کا دباؤ نہ پڑے۔

دوسرا اصول:۔ "جھونک" کی تبدیلی کی شرح لگائی ہوئی "قوت" کے متناسب ہوتی ہے اور یہ تبدیلی "قوت" کے نفاذ کی سمت میں پیدا ہوتی ہے۔

تیسرا اصول:۔ ہر عمل کا مخالف سمت میں مساوی ردِ عمل ہوتا ہے۔

اس سے قبل کہ ان اصولوں پر تفصیلی طور پر غور کیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہم الفاظ کی جو اس سلسلہ میں آنے لازمی ہیں وضاحت کردی جائے۔

رفتار۔ اگر کوئی جسم اپنی جگہ کو بدل رہا ہے تو وقت کی اکائی میں وہ اپنی جگہ میں جس قدر تبدیلی کر لیتا ہے وہی اس کی رفتار ہے۔ رفتار دو قسم کی ہوتی ہے۔ یکساں رفتار اور بدلتی ہوئی رفتار۔ اگر وہ جسم ایک ہی شرح سے اپنی جگہ کو بدل رہا ہے تو وہ یکساں رفتار ہوگی۔ بصورت دیگر بدلتی ہوئی رفتار کہلائے گی۔ اگر ایک جسم کسی خاص وقت میں کسی خاص فاصلہ تک اپنی جگہ میں تبدیلی کرتا ہے تو

رفتار = طے شدہ فاصلہ / وقت

ترقیٔ رفتار۔ اگر کوئی جسم یکساں رفتار سے حرکت نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کی رفتار پہلے سکنڈ میں ۵ میٹر، دوسرے سکنڈ میں ۷ میٹر، تیسرے سکنڈ میں ۹ میٹر وغیرہ رہی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کی رفتار میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے اور یہ "رفتار ترقی" ۲ میٹر فی سکنڈ رہی ہے۔ اب یہ ترقیٔ رفتار یکساں بھی ہو سکتی ہے اور بدلتی ہوئی بھی۔ اگر ترقیٔ رفتار نفی میں ہو تو اسے تنزلِ رفتار کہا جائیگا۔

اگر یکساں ترقیٔ رفتار ہو تو جسم کی 'رفتار' 'ابتدائی رفتار' 'ترقیٔ رفتار' 'وقت' اور 'طے شدہ فاصلہ' میں ایک خاص قسم کا رابطہ رہتا ہے یعنی

(۱) 'رفتار' = 'ابتدائی رفتار' + 'ترقیٔ رفتار' × 'وقت'

(۲) 'طے شدہ فاصلہ' = 'ابتدائی رفتار' × 'وقت' + ½ × 'ترقیٔ رفتار' × 'وقت'۲

(۳) 'رفتار'۲ = 'ابتدائی رفتار'۲ + ۲ × 'ترقیٔ رفتار' × 'طے شدہ فاصلہ'

جھونک (Momentum) کسی بھی متحرک جسم میں اپنی رفتار اور مقدار مادہ کی وجہ سے 'جھونک' پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر وہ جسم کسی بیرونی قوت کا اثر قبول کرنے میں تھوڑا وقت پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ریل کے انجن کی اسٹیم بند کر لینے کے بعد بھی گاڑی میلوں تک چلی جاتی ہے یہ محض جھونک کی وجہ سے پیدا شدہ طاقت تحریک (Kinetic energy) کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ:۔

'جھونک' = 'مقدار مادہ' × 'رفتار'

قوت وہ ہے کہ جب کسی چیز پر لگائی جائے تو اس کی حالت کو

[illegible] کم از کم مقابلہ کی کوشش کرے۔ مثلاً ہاتھ کی قوت جب گیند پر
صرف کی جائے تو گیند اپنے سکون کی حالت کو چھوڑ کر حرکت کی حالت اختیار
کر لے گی۔ ہاتھ کی قوت سے دیوار کو دبایا جائے تو دیوار اپنی جگہ پر قائم رہے گی
اور اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی لیکن ہاتھ کی یہ قوت دیوار کی
حالت سکون میں تبدیلی کرنے کی کوشش ضرور کرے گی۔

اب حرکت کے تینوں اصولوں کو علی الترتیب دیکھئے۔ پہلا اصول حرکت
زیادہ واضح الفاظ میں یہ ہے کہ کوئی جسم اگر چل رہا ہے تو وہ چلتا ہی رہے گا
اور اگر ساکن ہے تو حالت سکون ہی میں رہے گا اور اُس کی حرکت یا سکون
میں اُسی حالت میں تغیر ہو سکتا ہے جب کہ کوئی بیرونی قوت اس پر اثر انداز
ہو جائے۔ ساکن چیزوں کے بارے میں تو یہ بات بالکل ہی واضح ہے اور روز ہی
اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے اور اگر میز پر پانی کا گلاس رکھا ہے تو وہ یقیناً اپنی
جگہ پر اُسی حالت میں رکھا رہے گا اور صرف اسی صورت میں حرکت کرے گا
جب ہاتھ کی قوت سے یا کسی دوسری قوت سے اُس کو وہ جگہ چھوڑنے پر مجبور
کیا جائے۔ بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے لیکن اس سلسلہ میں پہلے اصول
کے اطلاق پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ پانی کا گلاس جو میز پر رکھا ہے
وہ قوت کے اثرات سے قطعی طور پر مبرا نہیں ہے کیونکہ اُس پر کم از کم کشش
ارضی کی قوت ضرور اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس اعتراض کا جواب یہاں نہیں بلکہ
تیسرے اصول کی توضیح کے سلسلہ میں دیا گیا ہے۔ فی الحال اِس اُصول کا
صحیح اندازہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی دُنیا کا تصور کیا جائے
جس میں کشش مرکزی نہ ہو، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس جگہ کی کسی چیز
میں وزن بھی نہیں ہوگا، یعنی اگر پانی کے گلاس کو کسی خاص بلندی تک اُٹھا کر
چھوڑ دیا جائے گا تو وہ وزن نہ ہونے کی وجہ سے نہیں گرے گا۔ لیکن اس
صورت میں بھی یہ ممکن نہ ہوگا کہ گلاس بے راہ روی اختیار کرے اور خلا میں
کسی بھی جانب چلنا شروع کر دے۔ نیوٹن کا کہنا یہ ہے کہ وہ اپنے مقررہ
مقام پر ساکن رہے گا اور صرف ایک ہی صورت میں اُس کی اِس حالت
سکون میں تبدیلی ہو سکے گی اور وہ یہ کہ اس پر کسی بیرونی قوت کا استعمال
کیا جائے۔ اُس گلاس میں وزن نہ سہی لیکن مادّہ ضرور ہوگا اور مادّہ اپنی
حالت کو آسانی سے چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ مادّہ کی اس خاصیت کو ظرف
مادّہ (Inertia) کہتے ہیں۔

جہاں تک متحرک اجسام کا تعلق ہے دُنیا میں ایسی متحرک شے پانا
جس پر کوئی قوت نہ صرف ہو رہی ہو تقریباً ناممکن ہے۔ دُنیاوی اجسام کے
کے متعلق اِس اصول کی منفی مثالیں تو ضرور پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اثبات
میں کوئی ثبوت ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ لہٰذا منفی شکل میں حرکت کا اوّل اصول
یہ ہے کہ چونکہ دُنیاوی اشیاء پر کوئی نہ کوئی قوت ضرور اثر انداز رہتی ہے
لہٰذا سوائے چند مستثنیات کے وہ کبھی یکساں رفتار سے حرکت بھی نہیں
کر سکتیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک گیند کو ایک معیّنہ رفتار سے اوپر کی جانب
پھینکا جائے تو چونکہ زمین کی قوت کشش اُس کو نیچے کی جانب کھینچے گی اس لئے
اُس کی رفتار میں برابر کمی آتی جائے گی حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب کہ
اُس کی رفتار کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ نیچے کی
جانب آنا شروع کر دے گی۔

اِس سلسلہ میں بعض مستثنیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں
کہ دنیاوی چیزوں پر بیرونی قوتوں کا اطلاق ہوتے رہنے کے باوجود بعض
حالات میں اشیاء اپنی مقررہ رفتار سے چلتی رہتی ہیں مثلاً موٹر کار کو ایک مقررہ
رفتار سے چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسی صورت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ
اُس جسم پر کئی قوتیں ایک سمت لگ رہی ہوں اور کئی قوتیں مخالف سمت
نیز یہ قوتیں مساوی حیثیت رکھتی ہوں۔ ایسی صورت میں اول الذکر
ثانی الذکر کے اثر کو ختم کر دیں گی مثلاً کار کے سلسلہ میں ایک قوت تو انجن
کی ہے جو گاڑی کو آگے کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہے اور دوسری
جانب ہوا کی رُکاوٹ پہیوں اور پرزوں کی رگڑ وغیرہ اس کو پیچھے کی
جانب روکنے کی کوشش کرتی ہیں چنانچہ جب تک انجن کی قوت زیادہ
رہتی ہے کار کی رفتار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جب انجن کی قوت
بقیہ قوتوں کے برابر ہو جاتی ہے اور دونوں طرف کی قوتیں ایک دوسری کو
بے اثر کر دیتی ہیں تو موٹر کار یکساں رفتار سے چلنے لگتی ہے اور رفتار کی
یہ یکسانیت اُس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک کہ دونوں جانب
کی قوتیں مساوی رہتی ہیں۔

نیوٹن کے پہلے اُصول حرکت کی تصدیق میں خود اس زمین کو اور
اُن اجسام فلکیہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جو قرنوں سے اپنی متعینہ رفتار
کے ساتھ اپنے مقررہ ادوار میں حرکت کر کے یکساں وقفوں کے بعد دو[illegible]

شب اور ماہ و سال کا لامتناہی سلسلہ قائم کئے ہوئے ہیں ایکی رفتار میں تبدیلی کیوں نہیں ہوتی؟ وجہ یہ ہے کہ چونکہ فضائے بسیط میں سرگرم سفر رہنے والے اجسام فلکیہ پر اثر انداز ہونے والی قوتیں نہیں ہیں اس لئے ان کی یکسانیت رفتار میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا اور اگر کچھ قوتیں ہیں بھی تو وہ اجسام مذکورہ کی جسامت کے تناسب سے اس قدر کم ہیں کہ ان کا عدم وجود برابر ہے یا بالفاظ دیگر وہ اُن کواکب کی رفتار میں اس قدر قلیل تبدیلی کرتی ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہے یعنی ایک ہزار سال میں صرف چند سکنڈ کا فرق آتا ہے۔

حرکت کا دوسرا اصول۔ بظاہر تو یہ اصول نہایت سادہ ہے یعنی کسی شے کی "جھونک" کی شرح کی تبدیلی، لگائی ہوئی قوت کے تناسب میں ہوگی لیکن اس کے نتائج نہایت اہم ہیں۔ اول تو اس اصول کے ماتحت قوت کی ناپ کی اکائی کا تعین ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ مقدار مادہ اور وزن کا باہمی رشتہ واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی :-

'لگائی ہوئی قوت' = 'جھونک کی تبدیلی کی شرح'

یا " " " = ('مقدار مادہ' x 'رفتار') کی تبدیلی کی شرح
چونکہ (مقدار مادہ x رفتار) = جھونک

یا " " " = 'مقدار مادہ' x ('رفتار' کی تبدیلی کی شرح) چونکہ
مقدار مادہ میں کوئی تبدیلی ہی نہیں ہوتی

یا " " " 'مقدار مادہ' x 'ترقی/رفتار' چونکہ
رفتار کی تبدیلی کی شرح کو 'ترقی/رفتار' کہتے ہیں

علامت = سے مراد متناسب ہونے سے ہے۔

یعنی:- 'لگائی ہوئی قوت' = ک x 'مقدار مادہ' x 'ترقی/رفتار'

'ک' نسبت ظاہر کرنے والا کوئی بھی خود ساختہ متعینہ ہندسہ ہو سکتا ہے اس لئے قوت کی اکائی کا تعین کرتے وقت بغرض آسانی 'ک' ۱ مقرر کر دیا گیا۔ ایسی حالت میں اس مساوات کی مندرجہ ذیل صورت ہو جاتی ہے:-

'لگائی ہوئی قوت' = 'مقدار مادہ' x 'ترقی/رفتار'

اب اگر 'مقدار مادہ' اور 'ترقی/رفتار' کو ایک ایک اکائی مان لیا جائے تو 'لگائی ہوئی قوت' ایک ہی ہو جائے گی۔ چنانچہ قوت کی اکائی وہ قوت ہوئی جس کو اگر ایک اکائی 'مقدار مادہ' کی چیز پر نافذ کیا جائے تو وہ اس میں ایک اکائی 'ترقی/رفتار' پیدا کر دے۔ قوت کی اکائی کا نام ڈائن Dyne ہے اور یہ اس قدر قوت ہوتی ہے کہ اگر اس کو ایک گرام 'مقدار مادہ' کی چیز پر لگایا جائے تو یہ اُس میں ہر سکنڈ میں ایک سینٹی میٹر فی سکنڈ کی 'ترقی/رفتار' پیدا کر دے گا۔

تجربات شاہد ہیں کہ دنیاوی قوت کشش کے ماتحت اوپر سے گرنے والی ہر چیز کی رفتار میں ہر سکنڈ میں تقریباً ۳۲ فٹ یا ۹۸۰ سینٹی میٹر فی سکنڈ کے حساب سے 'ترقی/رفتار' ہوتی ہے۔ چنانچہ:-

کسی چیز کو نیچے کھینچنے والی قوت کشش = ۹۸۰ x اُس چیز کے مقدار مادہ کے

∴ کسی چیز کا وزن = ۹۸۰ x اُس چیز کے 'مقدار مادہ' کے

(چونکہ کسی چیز کو نیچے کھینچنے والی قوت کشش کو اُس چیز کا وزن کہتے ہیں)۔

حرکت کا تیسرا اصول۔ کائنات کی کل موجودات میں آہنگ قائم رکھنے اور حرکت و قیام کے توازن و اعتدال کے لئے یہ اصول بہت اہم ہے کہ ہر عمل کا مساوی ردّ عمل مخالف سمت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی گیند کو دیوار پہ مارا جائے تو وہ اُس پر گد اکھا کر تقریباً اُسی رفتار سے واپس لوٹتی ہے [illegible] وجہ ہے کہ جب گیند ایک مقررہ رفتار سے دیوار کی جانب جا رہی تھی تو دیوار سے ٹکرا کر اُس نے اپنی سمت بدل دی؟ اس سلسلہ میں ہم کو حرکت کے دونوں اصولوں کا اطلاق کرنا ہوگا۔ پہلے اصول کے بموجب گیند کو اپنی مقررہ سمت میں ہی اپنی رفتار جاری رکھنی چاہیئے البتہ یہ کہ اُس پر کوئی بیرونی قوت دباؤ ڈال دے۔ اس جگہ چونکہ گیند نے اپنی سمت اور رفتار تبدیل کر دی ہے اس لئے اس سے نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ گیند پر کسی بیرونی قوت کا دباؤ پڑا ہوگا یعنی دیوار نے بر وقت تصادم گیند پر کچھ نہ کچھ قوت لگائی ہوگی۔ اب حرکت کے دوسرے اصول سے مدد لیجئے، اس اصول کے بموجب رفتار اور جھونک کی تبدیلی لگائی ہوئی قوت کی سمت ہوتی ہے۔ یہاں پر دیوار کی جانب گیند کی رفتار میں کمی آئی اور مخالف سمت میں اضافہ ہوا اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب دیوار کی قوت دیوار سے مخالف سمت میں سرگرم کار رہا ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب گیند نے ایک خاص جھونک اور رفتار کے ساتھ دیوار کو دبایا تھا تو یہ کیونکر ممکن ہوا کہ دیوار نے مخالف سمت

میں اُس پر اُسی قدر قوت لگا دی ؟ ظاہر ہے کہ یہ اسی تیسرے اصول کے ماتحت عمل میں آیا۔ لہٰذا یہ بات طے رہی کہ کوئی چیز دوسری چیز کو جس قدر قوت سے کسی جانب دبائے گی تو اس کے جواب میں دوسری چیز بھی پہلی چیز کو اُسی قدر قوت سے سمت مخالف میں دبائے گی۔ پہلا کام عمل ہوگا اور اس کا جوابی کام ردِّ عمل کہلائے گا۔ چنانچہ اگر ایک شخص دوسرے کے رخسار پر طمانچہ مارتا ہے تو نہ صرف یہ کہ پٹنے والے کے ہی چوٹ لگتی ہے بلکہ مارنے والے کو بھی چوٹ کا احساس ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ ہاتھ ایک خاص قوت سے دوسرے شخص کے رخسار کو دباتا ہے لہٰذا ردِّ عمل کے طور پر رخسار بھی اُس کی ہتھیلی کو مساوی قوت سے مخالف سمت میں دباتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ رخسار نرم اور نازک ہوتا ہے اور ہتھیلی مقابلتاً سخت ہوتی ہے۔ اول الذکر جس قوت سے اذیت کا احساس کرتا ہے اُسی قدر قوت سے ثانی الذکر اثر نہیں لیتی۔ پھر بھی اکثر اوقات تھپڑ مارنے والے کے ہاتھوں میں (بالخصوص اگر ہاتھ ملائم ہوں) چوٹ کے نیلگوں نشانات پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔

پہلے اصول کی تشریح کے سلسلہ میں ایک ایسے گلاس کی مثال پیش کی گئی تھی جو میز پر رکھا ہو اور یہ بتایا گیا تھا کہ گلاس پر کم از کم قوت کشش کا نفاذ ضرور ہو رہا ہے۔ اوپر کی سطروں سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ چونکہ گلاس اپنے وزن کی قوت سے میز کی سطح کو نیچے کی جانب دبا رہا ہے لہٰذا میز ردِّ عمل کی قوت سے اس کو اتنی ہی قوت سے اوپر کی جانب دبا رہی یعنی اُٹھا رہی ہے۔ چونکہ ایسی حالت میں دونوں مخالف قوتیں مساوی ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو بے اثر بنا دیتی ہیں اس لئے گلاس اپنی جگہ پر ساکن رہتا ہے۔

رسّی کی مثال سے یہ اصول مزید واضح ہو جاتا ہے۔ رسّی کے دو سروں میں سے ایک کو دیوار کے ساتھ باندھ دیا جائے اور دوسرے کو کوئی شخص اپنی جانب کھینچے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اسے ایک حد سے زیادہ نہ کھینچ سکے گا لیکن اسی کے ساتھ رسّی کے تناؤ کی قوت جو اس کھنچاؤ کا ردِّ عمل ہوگی اس شخص کو مخالف سمت میں اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کرے گی اور ان دونوں قوتوں میں توازن برقرار رہے گا۔

اب تک جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ ساکن اشیا سے متعلق تھیں حالانکہ یہ اصول متحرک چیزوں کے سلسلہ میں بھی اسی قدر کارفرما ہے مثلاً جب بندوق سے فائر کیا جاتا ہے تو گولی نہایت تیزی کے ساتھ بندوق کی نال سے نکل کر باہر کو اُڑ جاتی ہے لیکن ٹھیک اسی وقت بندوق بھی مخالف سمت میں جھٹکا کھاتی ہے جس کو Recoil ہونا کہتے ہیں۔ چنانچہ بندوق کا کُندہ کافی طاقت سے فائر کرنے والے کے شانے کو پیچھے کی طرف ڈھکیلتا ہے۔ گولی کو باہر کی طرف اور بندوق کو پیچھے کی طرف ڈھکیلنے والی قوتیں بالکل مساوی ہوتی ہیں۔ گولی چھوٹی اور کم وزن ہونے کی وجہ سے بہت تیز رفتار سے چلتی ہے بندوق کا وزن نسبتاً بہت زیادہ ہوتا ہے اس لئے بندوق کی رفتار مقابلتاً بہت کم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بندوق چلاتے وقت بندوق کے کندہ کو شانہ سے بالکل بھڑا کر رکھا جاتا ہے تاکہ Recoil کی قوت کو بندوق اور چلانے والے دونوں کو ایک ہی وقت میں پیچھے ڈھکیلنا پڑے اس طرح وزن اور بڑھ جاتا ہے اور ڈھکیلنے سے جو رفتار پیدا ہوتی ہے وہ اور بھی کم ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی شکار کے موقع پر گھبراہٹ میں یا اپنی نادانی کی وجہ سے ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ بندوق چلانے والا بندوق کے کندہ کو شانہ سے بالکل ملا کر نہیں رکھتا۔ ایسی صورت میں بندوق میں پیچھے کی طرف کی کافی رفتار پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات بندوق کے کندے سے شکاری کو اتنی چوٹ لگتی ہے کہ شانہ کی ہڈی تک ٹوٹ جاتی ہے۔

اجسام فلکی میں جو کشش ایک دوسرے کے لئے موجود ہے حرکت کے تیسرے اصول کے ماتحت اس کی مساوی و مخالف کشش کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ہر سیارے پر بیک وقت دوسرے بے شمار ستیاروں کی کششیں اثر انداز رہتی ہیں۔ اس کے ردِّ عمل کے طور پر پہلا سیارہ دوسرے سیاروں میں سے ہر ایک پر کشش کی مساوی و مخالف قوت جُدا جُدا ڈالتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر سیارہ اپنے مقررہ راستہ پر لاتعداد قوتوں کی اس طرح جکڑا رہتا ہے جس طرح کوئی مکھی مکڑی کے جالے کے بے شمار تاروں میں گرفتار۔

ایک تاریخی لطیفہ حرکت کے تیسرے اصول کی اہمیت کا مظہر ہے۔ نپولین کے حملۂ روس کے دوران میں اُس کی فوج کا ایک دستہ تقریباً ۵۰ فٹ کے ایک ایسے برفیلے قطعۂ زمین پر پھنس گیا جس پر انتہائی چکنی برف پڑی ہوئی تھی۔ اس چکنی برف کی وجہ سے سپاہیوں کے لئے ایک قدم چلنا بھی ناممکن ہو گیا تھا لیکن انھیں اس قطعۂ زمین کو پار کرکے جنوب کی طرف بہرحال بڑھنا تھا۔ آخر دستہ کے کمانڈر نے سپاہیوں کو اپنے بھاری جوتے اتارنے کا حکم دیا۔ پھر انھیں اپنے دونوں جوتوں کو رومال سے باندھ کر پوری طاقت سے شمال کی طرف پھینکنے کی

ہدایت کی۔ جوتوں کو شمال کی جانب پھینکنے کا ردعمل یہ ہوا کہ سپاہیوں نے اپنے اپنے جوتوں پر جس قدر قوت شمال کی جانب لگائی جوتوں نے اُسی قدر قوت سے ان کو جنوب کی طرف ڈھکیل دیا۔ اس طرح سپاہی اپنے اپنے جوتے پھینکتے ہی برف کی انتہائی چکنی سطح پر مخالف سمت میں یعنی جنوب کی طرف پھسلنے لگے اور اس طرح اُس قطعۂ آراضی کو پار کرلیا۔

اس لطیفہ کی سچائی کے بارے میں تو یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جاسکتا ہاں اتنا ضرور ہے کہ آج کا "جیٹ" ہوائی جہاز اسی لطیفہ کی ارتقائی منزل ہے۔ جیٹ ہوائی جہاز کی پرواز کا اُصول یہ ہے کہ جلی ہوئی گیسوں کو ایک زبردست قوت کے ساتھ ہوائی جہاز کی مرکزی نالی سے پیچھے کی طرف باہر نکالا جاتا ہے۔ چنانچہ جس قوت سے سوختہ گیسیں پیچھے کی جانب ہوائی جہاز سے باہر پھینکی جاتی ہیں اُسی قدر قوت سے باہر نکلتی ہوئی گیسیں ہوائی جہاز کو آگے کی طرف دھکیلتی ہیں اور ہوائی جہاز نہایت تیز رفتاری کے ساتھ آگے کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ جیٹ ہوائی جہاز کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے کہ معمولی پنکھے دار ہوائی جہاز ہرگز اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

حرکت کے ان اُصولوں سے دانستہ یا نادانستہ تعداد لوگ مستفید ہوچکے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سائنس والوں نے اس مسئلہ کو ہر پہلو سے جانچ لیا ہے اور اب اس بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابھی اس مسئلہ کے متعدد گوشے تحقیق کے محتاج ہیں اور جب ان پر روشنی پڑے گی تو اس سے نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ یہ تحقیقات اپنی جگہ پر بڑی دلچسپ بھی ہوں گی۔

✡

ہندوستان اور چین کے تعلقات

(بسلسلۂ صفحہ ۱۵)

اور میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک ہوسکے گا ہم انھیں واقعات سے باخبر رکھیں گے۔ میں یہ وعدہ نہیں کرسکتا کہ میں جو بھی خط بھیجوں گا وہ فوراً ان کے سامنے رکھا جائے گا۔ لیکن درحقیقت کسی طرح کا راز رکھ کر ہمارے لئے کام کرنا مشکل و ناممکن ہوگا جبکہ ایسے نازک مسائل کا سامنا ہے۔ کئی ترمیمیں پیش کی گئی ہیں لیکن میں اس ایوان سے سفارش کروں گا کہ شری کسلیوال کی ترمیم منظور کرلی جائے جو میرے حق میں ہے۔ *

---

* ترمیم کے بعد جو قرارداد منظور کی گئی وہ یہ ہے :

"۱۶ رنومبر ۱۹۵۹ء کو ہند و چین کے تعلقات سے متعلق جو وہائٹ پیپر نمبر ۲ اس ایوان میں پیش کیا گیا اور سرحد پر جو حالیہ واقعات ہوئے اور چین اور ہندوستان کی حکومتوں میں جو سابقہ مراسلت ہوئی جسے ۱۷ر نومبر ۱۹۵۹ء کو اس ایوان میں پیش کیا گیا ، ان باتوں پر غور کرکے یہ ایوان اس سلسلے میں حکومت ہند کی پالیسی کو منظور کرتا ہے اور اس کی توثیق کرتا ہے "۔

اترپردیش شاہراہِ ترقی پر

ریاستی جیل مالی حیثیت سے خودکفیل • • • تعلیمی اداروں میں جسمانی ورزش کی سہولتیں • • • ڈکیتی کی وارداتوں میں کمی • ۱۹۵۸ء کی پولیس رپورٹ • • • سرکاری ٹیکنکل اداروں کی توسیع • • • دیہی علاقوں میں کنبہ منصوبہ بندی کا پرچار • • • رڑکی یونیورسٹی کے لئے ۸ کروڑ روپیہ کا پروگرام • • • خدمتی امداد باہمی انجمنوں کے کسان ممبروں کی رہنمائی • • • محکمۂ مال گزاری کے افسروں کو ہدایات • • • ترقیاتی پروگرام اور گاؤں پنچائتیں • • • غیرسرکاری ڈگری کالجوں کے ٹیچروں کی نئی تنخواہیں

ریاستی محکمۂ جیل کے زیرغور اسوقت دو اسکیمیں ہیں جن کی تکمیل سے حکومت یوپی کو سالانہ ۵۰ لاکھ روپیہ کی بچت ہوسکے گی۔

یہ اسکیمیں کھلے کیمپوں کے تجربہ کے دائرہ میں توسیع۔ قیدیوں کی بحالی اور ریاست کے جیلوں کو کھانے اور کپڑے کے معاملہ میں خودکفیل بنانے کے مقاصد کے پیش نظر وضع کی گئی ہیں۔

اترپردیش میں جو آبادی کے اعتبار سے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے اور جس کی موجودہ آبادی ۷ کروڑ ہے، اس کے ۵۰ جیلوں میں درج رجسٹر قیدیوں کی اوسط تعداد ۲۶ ہزار ہوتی ہے۔ ریاستی حکومت کو قیدیوں کے کھانے پر ۶۵ لاکھ روپیہ اور ان کے کپڑے پر ۹ لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

جیلوں کو کھانے کے معاملہ میں خودکفیل بنانے کی اسکیم کے تحت قیدیوں کو اناج کی پیداوار کے کام پر لگانے کی تجویز ہے۔ اسکیم کے تحت ابتدا میں ضلع نینی تال میں پھاکے قریب ۶ ہزار ایکڑ کا ایک پلاٹ حاصل کرنے کی تجویز ہے۔ پہلے سال کے دوران میں ۲ ہزار ایکڑ کے پلاٹ میں ۵۰۰ قیدیوں کو کام پر لگانے کی تجویز ہے۔ اسکیم کے تحت تین ٹریکٹر اور ۱۰۰ جوڑی بیل خریدنے کی تجویز ہے۔ شروع میں قیدیوں کی رہائش کے لئے ٹین کی چھت کے کمرے تعمیر کئے جائیں گے۔ بعد میں ان کے لئے پختہ کمرے تعمیر کئے جائیں گے۔ اسکیم کے تحت ایسے زمانہ میں جبکہ کھیتی باڑی کا کام نہ ہو قیدی کو گھریلو صنعتوں جیسے ڈیری۔ کتائی۔ مویشی پالنا اور پولٹری وغیرہ کے کام میں لگانے کی بھی تجویز ہے تاکہ انھیں گھریلو صنعتوں کی تربیت بھی مل جائے اور اس طرح وہ سال بھر اپنے کو مصروف بھی رکھ سکیں۔ چونکہ قیدیوں کی بڑی اکثریت دیہی علاقوں سے تعلق رکھتی ہے اس لئے امید کی جاتی ہے کہ یہ اسکیم رہائی کے بعد ان کی جلد از جلد بحالی میں حد درجہ معاون ہوگی۔

ابتدا میں اسکیم کے تحت ٹریکٹروں وغیرہ کی خریداری اور دوسری ضروریات پر تخمیناً ۲۰ لاکھ روپیہ اور سالانہ تقریباً ۱۰ لاکھ روپیہ صرف ہونے کا تخمینہ ہے اور اسکیم سے اسی مدت میں ۱۰ لاکھ روپیہ کی آمدنی ہوگی۔

اسکیم کے تحت قیدیوں کو کھلے کیمپوں میں کام پر لگایا جائے گا جن میں قیدی امداد باہمی اصول سے مزدوری پر کام کریں گے۔

اسکیم کے تحت مجموعی طور پر ۲۴ ہزار ایکڑ میں فارم قائم کرنے کی تجویز ہے تاکہ اناج سے متعلق ریاست کے جیلوں کی تمام ضروریات پوری ہوسکیں۔

جیلوں کی کپڑے سے متعلق ضروریات پوری کرنے کے لئے جیلوں میں ۵۰۰۰ امبر چرخے چلانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے جن میں سے ۱۳۰۰ امبر چرخے مہیا کئے جا چکے ہیں۔ کل ہند دیہی اور کھادی کمیشن نے ریاست کے جیلوں کو ۴۰۰۰ امبر چرخے ۱۲۱ انسٹرکٹر ۱۰۰ بہتر قسم کے کرگھے اور بناؤٹ کے چھ گائیڈ بہم پہونچانے کا وعدہ کیا ہے۔ کمیشن نے امبر چرخے تیار کرنے

اور ان کی مرمت کرنے کے لئے ایک کارگاہ کے قیام کا بھی وعدہ کیا ہے۔

• • •

اتر پردیش کے ثانوی تعلیمی اداروں کو جسمانی ورزش اور تفریح کی سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلہ میں خاصا کام ہو چکا ہے گزشتہ تین برسوں میں ریاست کے مختلف ہائیر سکنڈری اسکولوں میں تفریحی پروگراموں کے لئے ۲۹ بڑے کمرے ایک اسٹیڈیم ایک جمنازیم اور ایک پیراکی کا تالاب تعمیر ہوا ۱۹۵۶ء سے جب یہ اسکیم شروع کی گئی تھی، اب تک ۲۳ ثانوی تعلیمی اداروں کو جسمانی ورزش اور تفریح کی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے ۴۵ / ۵ لاکھ روپیہ کی رقم دی گئی ہے۔ مالی سال رواں میں اس اسکیم پر ساڑھے تین لاکھ روپیہ کی رقم صرف کی جائے گی۔

اسکیم کے تحت ڈگری کالجوں اور ثانوی تعلیمی اداروں کو مختلف کاموں کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم کی مندرجہ ذیل حد مقرر کی گئی ہے۔

بڑا کمرہ ۳۵ ہزار روپیہ۔ پیراکی کا تالاب ۳۰ ہزار روپیہ۔ جمنازیم ۲۵ ہزار روپیہ۔ اسٹیڈیم ۲۵ ہزار روپیہ۔ کھلا تھیٹر ۱۵ ہزار روپیہ پویلین ۱۰ ہزار روپیہ ۴۴۰ میٹر دوڑ کے لئے راستہ ۱۰ ہزار روپیہ۔ یہ رقوم تین یا چار قسطوں میں منظور کی جاتی ہیں۔

اس اسکیم کی اہم خصوصیت طلبا اور مدرسین کی جانب سے شرمدان مہم میں شرکت کرنا ہے جو تعلیمی ادارہ کے احاطہ تک ہی محدود رہے گی۔

اس اسکیم کو بروئے کار لانے میں مرکزی حکومت کا حصہ کل اخراجات کا ۷۵ فیصدی ہوگا اور باقی ۲۵ فی صدی تعلیمی ادارہ صرف کرے گا

اسکیم کے تحت تعلیمی اداروں کے انتخاب کے وقت طلبا کی تعداد، ادارہ کے محل وقوع اور درجہ اور مالی حیثیت کا خیال رکھا جائے گا۔ اس مالی امداد کے لئے صرف انھیں اداروں کی درخواستوں پر غور کیا جائے گا جن کے قیام کی مدت کم از کم تین برس ہو نیز ان کے پاس اپنی عمارت اور زمین موجود ہو

• • •

پولیس نظم و نسق کی رپورٹ بابتہ ۱۹۵۸ء میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اس سال طلباء کی جانب سے بہت سی تحریکیں چلائی گئیں جن میں نقض امن کے کئی واقعات ہوئے لیکن پولیس نے اپنے فرائض کو بہ حسن و خوبی انجام دیا۔ اس سال ڈکیتی کی بہت کم وارداتیں ہوئیں اور ڈاکوؤں کے بہت سے گروہوں کا خاتمہ کیا گیا۔

پولیس تھانوں میں ابتدائی رپورٹ اور واقعات کو صحیح صحیح درج کرنے کے سلسلے میں خاص توجہ کی گئی۔ ایسے معاملوں میں جن میں جرائم کو گھٹا کر دکھایا گیا تھا سخت کارروائی کی گئی۔ شکایات اسکیم کی کارکردگی بھی تسلی بخش رہی۔ اسکے تحت زیر نظر سال میں ۵۰۰ پولیس افسروں اور ملازموں کو سزائیں دی گئیں۔

۱۹۵۷ء کے عام انتخابات کے بعد مختلف پارٹیوں کی جانب سے ریاست بھر میں غذائی تحریکیں چلائی گئیں۔ اس سلسلہ میں ۰۰۰ سے زیادہ گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ طلباء کی بدنظمی کے نتیجہ میں مختلف مقامات خاص طور سے وارانسی اور لکھنؤ میں کچھ واقعات رونما ہوئے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی سے متعلق واقعات پر قابو پانے میں وارانسی پولیس کو بہت زیادہ دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن پولیس نے بڑی مستعدی اور خوش اسلوبی سے حالات پر قابو پالیا۔

ریاست میں وقتاً فوقتاً ہونے والے مختلف ضمنی انتخابات کے سلسلہ میں پولیس کو سخت جانفشانی سے کام کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ ایس۔ ایس۔ لائٹ ریلوے کی ہڑتال، مختلف مذہبی میلوں اور سیلابوں کے سلسلے میں پولیس کو متواتر مستعدی دکھانا پڑی۔

پولیس اور عوام کے باہمی تعلقات کو خوش گوار بنانے کی کوششوں کا تسلی بخش نتیجہ برآمد ہوا۔ ہر ضلع میں بندوق چلانے کی تربیت دینے کے کلبوں مجالس قانون ساز کے ممبروں اور اخباری نمائندوں سے وقتاً فوقتاً ملاقات کے ذریعہ پولیس اور عوام کے درمیان قریبی رابطہ کے قائم ہونے میں مدد ملی۔ اس کے علاوہ گم شدہ بچوں کی بازیابی کے دستہ اور گشتی خدمتی دستہ وغیرہ کی عمدہ کارگذاری اور دیہی علاقوں میں پولیس کے ذریعہ پہرا تحریک چلانے سے بھی پولیس اور عوام کے باہمی تعلقات بہتر ہوئے۔

جرائم زیر نظر سال میں گذشتہ سال کے مقابلہ میں جرائم کی صورت حال بہتر رہی قابل دست اندازی پولیس وارداتوں کی تعداد ۱۹۵۷ء کی ۶۴۸۰۵ سے کچھ بڑھ کر ۱۹۵۸ء میں ۶۶۱۵۴ ہو گئی۔ اس طرح جرائم کی وارداتوں کی صورت حال بہ ۰۰۰ الکی آبادی میں ۱۹۵۷ء کے ۰۰۰ سے بڑھ کر ۱۹۵۸ء میں ۱۱۱۰ ضرور ہو گئی اور مار پیٹ سے متعلق واقعات

میں کافی اضافہ ہوا لیکن ڈکیتی کے واقعات میں جو معتدبہ کمی ہوئی وہ خاص خصوصیت قابل ذکر ہے۔ ڈاکوؤں کے مسلح گروہوں سے مقابلہ کرنے میں پولیس نے نیابت بہادری، استقلال اور فرض شناسی کا ثبوت دیا۔

وہ ڈاکو جو گرفتار کئے گئے یا جان سے مارے گئے ان میں چند کے نام یہ ہیں۔ سانول سنگھ اور اس کا ساتھی۔ کیری کا پھول سنگھ۔ جھانسی کا جانکی اہیر اور امودھی گونڈ۔ گورکھپور کا بلرام پانڈے اور رمیش۔ فیض آباد کا چھنپال۔ اعظم گڑھ کا شنکر اہیر۔ الہ آباد کے کیسری پاسی کا گروہ۔ بریلی کا معشوق علی۔ سوبیدار اور تیج پال۔ روپا کے گروہ کا مہاراج سنگھ اور رام رت لاکھن سنگھ کے گروہ کا امر سنگھ وغیرہ۔

دیہی دفاعی انجمنیں بہت سودمند ثابت ہوئیں۔ گاؤں والوں نے ۱۵ موقعوں پر ڈاکوؤں کا مقابلہ کرکے ۲۹ ڈاکوؤں کو ہلاک کیا اور بہت سے ڈاکوؤں کو گرفتار کیا۔ بدقسمتی سے ان مقابلوں میں ۲۹ گاؤں والے بھی ہلاک ہوئے۔ ان دفاعی انجمنوں کے جن ممبروں نے مجرمین کا مقابلہ کرتے ہوئے قابل تعریف بہادری کا ثبوت دیا انھیں بندوقیں بندوق کا لائسنس۔ نقد انعام دیے گئے اور جو لوگ جان سے مارے گئے ان کے پسماندگان کو غیر معمولی پنشن منظور کی گئی۔

تفتیش جرائم شعبہ۔ محکمۂ تفتیش جرائم دو واحدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس میں سے ایک واحدہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس (تفتیش) اور دوسرا واحدہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس (جرائم) کے ماتحت ہے۔

یوپی فائر سروس۔ ریاست کے ۵ بڑے شہروں کی فائر سروس کی خدمات زیر نظر سال کے دوران میں آتشزدگی کے ۱۴۶۱ موقعوں پر حاصل کی گئیں جن میں سروس کے عملے نے نہ صرف آگ بجھانے کا کام کیا بلکہ تقریباً ۷ کروڑ روپیہ کی مالیت کی جائداد کا تحفظ کیا اور ۱۳۵ اشخاص اور ۱۹ مویشیوں کی جان بھی بچائی۔

اس امر کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ پولیس تھانوں میں معاملوں کی صحیح صحیح رپورٹ درج کرائی جائے اور جرائم کو گھٹا کر دکھانے اور ان کو چھپانے کی شکایتوں پر کارروائی کی گئی۔

اڑن دستے نے عمدہ کارگزاری دکھائی اور متعدد مواقع پر فساد وغیرہ پر حسن و خوبی قابو پالیا۔

شکایات اسکیم۔ زیر نظر سال کے دوران میں کی گئی تحقیقات کی بنا پر محکمۂ پولیس کے ۱۵۰۲ افسروں اور سپاہیوں اور دوسرے محکمے کے ۱۷۴ ملازمین کو سزائیں دی گئیں۔ یہ اسکیم دوسرے محکموں میں بھی نافذ کر دی گئی ہے جس سے یہ اسکیم اور زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

فرقہ وارانہ صورت حال، بعض اکا دکا واقعات کو چھوڑ کر جن پر پوری طرح اور بہ حسن و خوبی قابو پا لیا گیا، تسلی بخش رہی۔ کھیل کود کے میدان میں بھی ریاست کی پولیس نے عمدہ کارگزاری دکھائی۔

زیر نظر سال میں چھ پولیس افسروں کو قابل تعریف کارگزاری کے سلسلے میں تمغے دیئے گئے۔ سب انسپکٹر پولیس شری مہندر پرتاب سنگھ کانسٹبل شری امر سنگھ اور شری کندن سنگھ کو دوسروں کی جانیں بچانے پر وزیر اعظم تمغہ دیا گیا۔ زیر نظر سال میں اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے ہوئے چار کانسٹبل مارے گئے اور سات سب انسپکٹر، ۲۹ کانسٹبل اور گاؤں کے تین چوکیدار زخمی ہوئے۔

● ● ●

ریاستی ورکنگ گروپ کے مرتب کردہ پلان میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہر کورٹ بٹلر ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور کو ترقی دے کر اسے ریاست میں ریسرچ اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا اہم ترین ادارہ بنا دیا جائے۔

اس انسٹی ٹیوٹ میں اس وقت صرف انڈر گریجویٹ اور ڈپلوما کورسوں میں تعلیم دی جاتی ہے اور حال ہی میں یہاں تین پوسٹ گریجویٹ کورس شروع کئے گئے ہیں۔

اس ادارہ کی مجوزہ جدید تنظیم کی تکمیل سے ادارہ سے صرف چھوٹے چھوٹے انجینیروں کے بجائے اعلیٰ پایہ کے انجینیر نکلیں گے۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی مدت میں اس مجوزہ تنظیم پر تقریباً ۴۰۵ کرور روپیہ صرف کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

مذکورہ ادارہ کے ترقیاتی پروگرام میں نئے پوسٹ گریجویٹ کورس اور ریسرچ کی اسکیمیں شروع کرنے، سازوسامان میں سہ گونہ اضافہ، تنخواہ کے اسکیل کو بہتر بنانے اور ہوسٹلوں کی توسیع کرنے وغیرہ کی تجاویز شامل ہیں۔

ورکنگ گروپ نے نئے کورسوں کی سفارش کرتے ہوئے صنعتی ترقی کے لئے ریاست کے وسائل کو بروئے کار لانے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور شیرہ اور الکحل وغیرہ کو جو اس ریاست میں وافر مقدار میں دستیاب ہے کام میں لانے کے لئے ریسرچ کی مخصوص اسکیموں کی سفارش کی ہے۔

یہ بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ کے عملہ کو تربیت حاصل کرنے کے لئے ملک سے باہر بھیجا جائے۔ اس کے عملہ کی تنخواہ کا اسکیل رڑکی یونیورسٹی کے عملہ کے اسکیل کے برابر کرنے کی بھی تجویز ہے۔

اس انسٹی ٹیوٹ کی ایک علیحدہ شاخ مختلف کارخانوں میں طلباء کی عملی تربیت اور ان کو روزگار دلانے کا بندوبست کرے گی۔ انسٹی ٹیوٹ میں ۱۵ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے ایک ٹیکنیکل لائبریری قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔

ورکنگ گروپ نے سنٹرل ٹیکسٹائل انسٹی ٹیوٹ کانپور، گورنمنٹ لیدر انسٹی ٹیوٹ کانپور اور گورنمنٹ کالج آف آرٹ اور کرافٹ لکھنؤ کا درجہ بلند کرنے کی بھی تجاویز پیش کی ہیں۔ آخرالذکر دو اداروں میں ایسے مضامین میں جن میں اس وقت صرف ڈپلوما کورس کی تعلیم دی جاتی ہے، ڈگری کورس شروع کئے جائیں گے۔ گورنمنٹ سنٹرل ٹیکسٹائل انسٹی ٹیوٹ میں بُنائی، رنگائی، اور چھپائی وغیرہ میں پوسٹ گریجویٹ کورس شروع کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

آگرہ میں چمڑے کا کام اور چمڑے کی ٹیکنالوجی کا ایک ڈپلوما انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی بھی تجویز پیش کی گئی ہے۔

• • •

ریاستی کنبہ منصوبہ بندی بورڈ کے جلسہ میں جو حال ہی میں لکھنؤ میں ہوا، یہ فیصلہ کیا گیا کہ دیہی علاقوں میں کنبہ منصوبہ بندی کی ایک بھرپور مہم شروع کی جائے اور اس سلسلہ میں گرام پنچایتوں کا سرگرم تعاون حاصل کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ اشخاص خاص طور پر مردوں کو کنبہ منصوبہ بندی کی افادیت ذہن نشین کرائی جا سکے۔

جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ٹھاکر حکم سنگھ نے اس امر پر زور دیا کہ چونکہ کنبہ منصوبہ بندی کا تصور عوام کے لئے بالکل نیا ہے اس لئے اس کے پرچار میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ کنبہ منصوبہ بندی کی اصولی بحث چاہے کتنی ہی مدلل کیوں نہ ہو بالکل بے اثر ہوگی اگر یہ عوام کے مذہبی جذبات کے منافی ہوگی اور اس سلسلہ میں آپریشن کا پرچار کرنا بھی سودمند نہیں ہوگا کیونکہ اس سے لوگ خوف زدہ ہوں گے۔ اس لئے مناسب یہ ہوگا کہ کنبہ منصوبہ بندی کو مقبول بنانے میں لگے ہوئے سماجی کارکنوں کو مخصوص تربیت دی جائے اور کنبہ منصوبہ بندی کا اور زیادہ سہل طریقہ معلوم کیا جائے جس کو لوگ بہ آسانی اختیار کر سکیں۔

وزیر صحت نے کہا کہ کنبہ منصوبہ کلینکوں میں محض مانع حمل آلات کا اسٹاک کرنا اور عوام کو مفت تقسیم کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کنبہ منصوبہ بندی کی افادیت عوام کے ذہن نشین کرنے کے لئے پوری یکجہتی سے کوشش کی جائے کیونکہ اس تحریک کو آگے بڑھانے کا یہی واحد ذریعہ ہے۔

جلسہ میں جو رپورٹ پیش کی گئی ہے اس میں بتایا گیا کہ گذشتہ اپریل اور ستمبر کے درمیان ریاست میں ۲۰۵۰ عورتوں اور ۳۳۸ مردوں نے ضبط تولید کے لئے اپنا آپریشن کرایا۔ جلسہ میں متفقہ طور پر اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ ریاست میں اس مہم کے تحت کافی کام ہوا ہے اور یہ کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں یہ مہم زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ اس لئے بہ اتفاق رائے یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومت ہند سے ہر بلاک میں کم سے کم ایک مرد سماجی کارکن مقرر کرنے کے لئے کہا جائے۔ جلسہ میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ اس مہم کو پورے طور پر کامیاب بنانے کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ مردوں کا بھی تعاون حاصل کیا جائے۔

جلسہ میں کہا گیا کہ ایک سرسری تخمینہ کے مطابق اس ریاست کی موجودہ آبادی تقریباً ۸ کروڑ ۱۶ لاکھ ہے اور اگر آبادی میں اضافہ کی یہی رفتار رہی تو تیسرے منصوبہ کے آخر تک اتر پردیش کی آبادی ۸ کروڑ ۲۳ لاکھ ہو جائے گی۔

• • •

فنی تعلیم سے متعلق ریاستی ورکنگ گروپ نے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی مدت میں رڑکی یونیورسٹی کے لئے ۸ کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ کے ترقیاتی پروگرام کی سفارش کی ہے۔

ملک میں انجینئرنگ کے اس ممتاز ترین ادارہ کے لئے ورکنگ

گروپ کی اہم سفارشات یہ ہیں۔ یونیورسٹی میں ۲۴ پوسٹ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورس شروع کئے جائیں، ڈگری کلاسوں میں زیادہ طلبا کے داخلے کی گنجائش پیدا کی جائے اور ایک مرکزی لائبریری قائم کرنے کے علاوہ وظائف دئیے جائیں اور مدرسین کو بیرونی ممالک میں تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

سول انجینئرنگ سے متعلق تجاویز میں ریسرچ کی تقریباً ۵۰ اسکیمیں شامل کی گئی ہیں اور یونیورسٹی میں زیر دے متعلق انجینئرنگ اسکول کے علاوہ جس کے قیام کی حال میں منظوری دی گئی ہے فوٹوگرامیٹری، پبلک ہیلتھ، انجینئرنگ اور ماقوئیات میں ریسرچ کے لئے تین نئے اسکولوں کے قیام کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

موجودہ پنجسالہ منصوبہ کے شروع میں یونیورسٹی کے ڈگری کورس میں سالانہ داخلہ ۱۲۰ سے بڑھا کر ۲۹۰ اور ڈپلوما کورسوں میں ۲۰۰ سے بڑھا کر ۴۰۰ کر دیا گیا تھا۔ ڈگری کورسوں میں داخلے کی تعداد میں مزید ۸۰ کا اضافہ کرنے کی تجویز ہے۔

یونیورسٹی کی موجودہ تجربہ گاہوں میں توسیع کے علاوہ پوسٹ گریجویٹ کورسوں کے لئے مزید ۱۴ تجربہ گاہوں اور آلات تیار کرنے کی ایک کارگاہ کے قیام کی بھی سفارش کی گئی ہے۔

ورکنگ گروپ نے یہ سفارش کی ہے کہ یونیورسٹی کے اہل در لائق طلبا کو وظائف دینے کے لئے ۱۹ء۵۵ لاکھ روپیہ اور ہوسٹلوں اور رہائشی عمارتوں کی تعمیر کے لئے ۱۹ء۱ کروڑ روپیہ کی رقم مقرر کی جائے۔

ورکنگ گروپ نے ایک مرکزی انجینئرنگ لائبریری کے قیام کے علاوہ یونیورسٹی کے موجودہ نصاب تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے ایک محققانہ پروگرام کی بھی سفارش کی ہے۔

دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت رڑکی یونیورسٹی کے ترقیاتی منصوبوں پر تیزی سے عملدرآمد ہو رہا ہے۔ ان منصوبوں پر تقریباً ۲ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔

• • •

ریاستی محکمہ امداد باہمی نے خدمتی امداد باہمی انجمنوں کے کسان ممبروں کی رہنمائی کے لئے دیسی اور ترقی یافتہ طریقہ کاشت کے تحت مختلف فصلوں پر ہونے والے فی ایکڑ تخمینی اخراجات کا مسودہ تیار کیا ہے۔ ان فصلوں میں دھان۔ مکا۔ جوار۔ گیہوں۔ چنا۔ جو۔ مٹر اور گنا کی فصلیں شامل ہیں۔ فصلوں پر اخراجات کی مختلف مدوں کا صحیح صحیح تخمینہ لگانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے لیکن بازار بھاؤ میں اتار چڑھاؤ کے پیش نظر اس میں فرق ہو سکتا ہے۔

امداد باہمی انجمنوں کے رجسٹرار نے سرکاری افسروں اور غیر سرکاری افراد پر مشتمل ایک پارٹی کو خدمتی امداد باہمی انجمنوں کی کارکردگی کا مطالعہ کرنے کا کام سپرد کیا ہے۔ اس پارٹی کے ممبران اس وقت تخمینی اخراجات کے مسودہ کی روشنی میں ضلع بارہ بنکی کی خدمتی امداد باہمی انجمنوں کی کارکردگی کا معائنہ کر رہے ہیں۔ یہ پارٹی وزیر زراعت اور امداد باہمی سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد ۶-۶ ممبروں کے پانچ گروپوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ یہ گروپ کسانوں کے لئے پیداواری پروگرام مرتب کرنے کے لئے کھیتوں کا معائنہ کریں گے اور ہر ایک کسان سے ملیں گے اور ۱۹۶۰ء کی خریف کے لئے ان کو دئیے جانے والے نقد قرضہ کی حد مقرر کریں گے۔ اس کے علاوہ یہ پارٹی غیر کاشتکار افراد کے لئے قرضہ کی عام اور انتہائی حد مقرر کرے گی اور قرضہ کی ان حدوں کے لئے امداد باہمی بینکوں کی منظوری حاصل کرنے کے لئے کاغذات تیار کرے گی۔

یہ گروپ امداد باہمی بیج گوداموں سے سوائی پر بیجوں کی سپلائی اور بہتر بیج پیدا کرنے کے لئے ضروری سہولتوں کی فراہمی کی اسکیموں سے متعلق کسانوں کے ردعمل کا مطالعہ کرے گا۔ اس کے علاوہ یہ گروپ اس امر پر بھی غور و خوض کرے گا کہ بلاک یونینوں سے کیمیاوی کھاد اور زراعتی آلات کی سپلائی کے موجودہ طریقہ کو جاری رکھنا چاہیے یا نہیں۔ یہ گروپ خدمتی امداد باہمی انجمنوں کے ممبروں کی پیداوار کو اکٹھا کرنے اور مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے حوالے کرنے کے طریقوں اور ذرائع کا بھی پتہ لگائے گا۔

• • •

حکومت اتر پردیش نے محکمہ مالگزاری کے افسروں کے نام جو دورہ کر رہے ہیں یہ ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ اس امر کی جانچ کریں کہ بارش کی کمی وغیرہ سے فصلوں کو جو نقصانات ہوئے ہیں ان کا صحیح تخمینہ کیا گیا

ہے یا نہیں اور یہ خیال رکھیں کہ تمام مستحق اشخاص کو معقول امداد مل جائے۔ ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ مالگذاری میں جو چھوٹ دیدی گئی ہے یا جس کی وصولی ملتوی کردی گئی ہے وہ کسانوں سے غیر قانونی طور پر وصول نہ کی جائے۔

ضلع افسروں کے نام ریاستی حکومت کی ایک حالیہ گشتی چٹھی میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عام طور پر موجودہ جاڑے کے موسم میں کم سے کم تین ماہ تک دورہ پر رہیں۔ اس سلسلہ میں سب ڈویزنل افسران ۶ ہفتہ سے لے کر دو ماہ تک اور تحصیلدار و نائب تحصیلدار ۴۵ دن سے لے کر ۶۰ دن تک دورے پر رہیں گے۔

دورہ کرنے والے افسروں کو یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ فسٹ ورک کا بھی معائنہ کریں اور یہ دیکھیں کہ مزدوروں کو ان کی اجرت وقت سے مل رہی ہے کہ نہیں اور ایسے علاقوں کا پتہ لگائیں جہاں ضرورت ہونے کے باوجود امدادی اقدامات نہیں کئے جا رہے ہیں اور ان کے بارے میں اپنے افسر بالا کو اطلاع دیں۔ اس کے علاوہ اپنے دورہ کے دوران میں وہ اس امر کی بھی جانچ کریں کہ پختہ کنوؤں کی تعمیر کے لئے جو تقاوی دی گئی ہے وہ اس مقصد کے لئے استعمال ہو رہی ہے یا نہیں۔ ان افسروں کو یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ آراضی انتظامی کمیٹیوں کی کارکردگی کا معائنہ کریں۔

گشتی چٹھی میں محکمہ مالگذاری کے افسروں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ایسی بڑی جوتوں کی جانچ پڑتال کریں جو تین سال یا اس سے زیادہ مدت سے پرتی پڑی ہوئی ہے تاکہ خاتمہ زمینداری ایکٹ کے تحت کارروائی کی جاسکے۔ ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بھومی دھری کے حقوق کے حصول اور بانڈوں کی منتقلی کے ذریعہ مالگذاری کی پیشگی ادائیگی کی اسکیم کا پرچار کریں۔

سب ڈویزنل افسروں اور تحصیلداروں سے کہا گیا ہے کہ وہ تحصیل کے ہیڈکوارٹروں میں ہر پندرھواڑے میں کم سے کم دو دن امداد بحالی اور معائنہ کے کاموں کو نپٹائیں۔ آراضی کے کاغذات کے صحیح اور درست ہونے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے افسروں سے کہا گیا ہے کہ وہ پڑتال کے کام پر خصوصی توجہ دیں اور حصول آراضی کے معاملات میں عملدرآمد کے بارے میں جانچ کریں اور کاغذات کی صحت کے معاملات کو جلد از جلد نپٹانے کی کوشش کریں۔

محکمہ مالگذاری کے افسروں سے کہا گیا ہے کہ وہ تمام ترقیاتی اور منصوبہ بندی کے کاموں میں ذاتی دلچسپی لیں اور اپنے سب ڈویزنوں میں ہر بلاک ہیڈکوارٹر کا دورہ کریں اور یہ دیکھیں کہ وہاں کام ہو رہا ہے یا نہیں اس کے علاوہ بلاک ترقیاتی کمیٹیوں کے ممبروں اور گروپ لیول ورکروں سے ملیں اور ان کی دقتوں کا اندازہ لگائیں اور ان کی ضروری رہنمائی کریں اور اگر ممکن ہو تو ولیج لیول ورکروں کے کام کا بھی معائنہ کریں۔

جدید تنظیم کے تحت ریاست کی گاؤں پنچایتوں کو جو اختیارات اور ذمہ داریاں دی گئی ہیں ان کے پیش نظر گاؤں پنچایتیں ترقیاتی پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں گی۔

گاؤں پنچایت کی دو ذیلی کمیٹیوں میں سے زراعت اور پیداوار ذیلی کمیٹی کو گاؤں کے زراعتی پلان مرتب کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جہاں امداد باہمی انجمن موجود ہو وہاں زراعتی پیداوار کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے پنچایت اور امداد باہمی انجمن کے مشترکہ جلسے کئے جائیں تاکہ امداد باہمی انجمن ہر فصل میں بوائی کے لئے ضروری قرضہ وغیرہ کا بندوبست کرے۔ یہ ذیلی کمیٹی اس امر کا خاص خیال رکھے گی کہ زراعتی مہموں پر پورے طور پر عمل درآمد ہو۔ علاوہ ازیں اجتماعی جنگلات کی ترقی کے طریقے بھی معلوم کرے گی۔ یہ ذیلی کمیٹی مویشیوں کو بہتر بنانے۔ بیکار مویشیوں کو گوسدن بھیجنے اور پنچایت کی افتادہ زمین پر چارہ پیدا کرنے کے اقدامات کرے گی۔ اس کمیٹی کو ۵۰۰ روپیہ تک کی لاگت کے آبپاشی اور پانی کی نکاسی کے منصوبوں کی تکمیل کی ذمہ داری بھی سپرد کی گئی ہے۔ آبپاشی کے تمام اجتماعی کاموں جیسے تالاب اور بند وغیرہ کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ یہ کمیٹی پورے گاؤں کے لئے آبپاشی کے چھوٹے منصوبے تیار کریگی اور ان پر عملدرآمد کرے گی۔

گاؤں پنچایت کی دوسری ذیلی کمیٹی یعنی کلیان سمیتی تنہا یا دوسری پنچایتوں کے ساتھ مشترکہ طور پر پرائمری اسکول قائم کرے گی اور یووک منڈلوں اور مہیلا منڈلوں وغیرہ کے قیام کی ہمت افزائی کرے گی۔ اس کمیٹی کو پرائمری

اسکول کے انتظام اور اسکول کی عمارتوں اور دیگر جائداد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ پنچایت گھروں یا اجتماعی مرکزوں کے ذریعہ یہ کمیٹی سماجی تعلیم کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے اقدامات کرے گی۔

گاؤں کے ہر فرد کو پینے کے پانی کی فراہمی اس کمیٹی کا ایک اہم فرض ہوگا۔ چیچک اور ہیضہ کے ٹیکوں کو مقبول بنانے کے علاوہ یہ کمیٹی زچہ و بچہ کی بہبودی کے لئے اقدامات کرے گی اور دائیوں کو تربیت حاصل کرنے کی جانب راغب کرے گی۔ دیہی علاقوں میں تعمیر مکانات کی اسکیموں پر عملدرآمد میں بھی یہ کمیٹی شریک ہوگی۔

حکومت اترپردیش نے آگرہ اور گورکھپور یونیورسٹیوں سے الحاق شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کے امداد یافتہ غیر سرکاری ڈگری کالجوں اور لکھنؤ الہ آباد اور بنارس ہندو یونیورسٹیوں سے منسلک کالجوں کے ٹیچروں کی تنخواہ کے نظر ثانی شدہ اسکیل کی منظوری دے دی ہے۔

اس نئے اسکیل کا جو حسب ذیل ہے نفاذ یکم جولائی سنہ ۱۹۵۹ء سے سمجھا جائے گا۔

پوسٹ گریجویٹ کالج۔ پرنسپل ۔۔۔ ۸۰۰-۵۰-۱۰۰۰، ای بی-۵۰-۱۲۰۰

شعبوں کے صدر ۔۔۔ ۳۵۰-۲۰-۵۵۰، ای بی-۲۵-۶۵۰ ای بی-۳۰-۸۰۰

سینیر ٹیچر ۔۔۔ ۳۲۵-۲۰-۵۲۵ ای بی-۲۵-۶۲۵

جونیر ٹیچر ۔۔۔ ۲۵۰-۱۵-۴۰۰ ای بی-۲۰-۵۰۰

ڈگری کالج۔ پرنسپل ۔۔۔ ۴۵۰-۴۰-۸۵۰-ای بی-۵۰-۹۰۰

شعبوں کے صدر ۔۔۔ ۳۰۰-۲۰-۵۰۰-ای بی-۲۵-۶۰۰

سینیر ٹیچر ۔۔۔ ۲۷۵-۱۵-۴۱۰-ای بی-۲۰-۵۵۰

جونیر ٹیچر ۔۔۔ ۲۲۵-۱۵-۳۶۰-ای بی-۱۵-۴۵۰

ٹیچروں کو اختیار دیا گیا ہے کہ تنخواہ کے نظر ثانی شدہ اسکیل کو یا تو وہ یکم جولائی سنہ ۱۹۵۹ء سے یا اپنی آئندہ سالانہ ترقی کی تاریخ سے قبول کریں۔ لیکن ہر صورت میں اس اختیار کا ۳۰ جون سنہ ۱۹۶۰ء تک استعمال کرنا چاہئے جو اس اختیار کو استعمال کرنے کی آخری تاریخ ہوگی۔

وہ ٹیچر جو تنخواہ کے ان نظر ثانی شدہ اسکیل کو قبول نہیں کرتے، ان کو موجودہ لازمی اسکیل یا کسی دوسرے اسکیل کے تحت جو مالی امداد کے مقاصد کے لئے منظور شدہ ہو، بدستور تنخواہ ملے گی۔ نئے اسکیل کے سلسلہ میں ایک بار جو فیصلہ کیا جائے گا وہ قطعی ہوگا۔

تنخواہ کے نظر ثانی شدہ اسکیل کا نفاذ متعلقہ اداروں کو ہر قسم کی مالی امداد ملتے رہنے کے لئے لازمی شرط ہوگی۔ تنخواہ کے اس نئے اسکیل کے نفاذ سے ہر شعبہ کا صرف ایک صدر ہوگا جو شعبہ کے صدر کی تنخواہ کے اسکیل کا مستحق ہوگا۔

حکومت نے نظر ثانی شدہ اسکیل میں ابتدائی تنخواہ کے تعین کے لئے چند اصول مقرر کئے ہیں جن کے مطابق کسی عہدہ پر کام کرنے والے کو تنخواہ کے نظر ثانی شدہ اسکیل کی کم سے کم تنخواہ سے کم نہیں ملے گا۔

✡

پدماوت

(بسلسلۂ صفحہ ۴۹)

اعلیٰ معیار پر تھا۔ تلاش علم اور مطالعہ ان کے ذوق میں شامل تھا۔ راجہ رتن سین جب پدماوتی کو رخصت کرانے کے لئے آتا ہے تو اس کے ساتھ ہزاروں باراتی ہوتے ہیں جن کو دعوت میں مدعو کیا جاتا ہے۔ کھانے کے اقسام سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت شاہی محلوں میں ایسی تقاریب پر کتنے اقسام کے کھانے تیار کئے جاتے تھے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی چیز یہ کہ پدماوت زبان کے سلسلے میں سولھویں صدی کے لئے ایک شہادت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ فارسی داں طبقہ جب عوام میں گھسا تو اس نے زبان میں بھی ایک توازن پیدا کیا۔ شمالی ہندوستان میں آگے چل کر بولی جانے والی زبان کے خد و خال تیار ہوئے۔ جو آہستہ آہستہ فارسی کو ہٹا کر اردو کی شکل میں سامنے آگئے۔

نقد و تبصرہ

تلامذۂ غالب ۔ از مالک رام۔ ناشر: مرکز تصنیف و تالیف۔ نکو در (مشرقی پنجاب) قیمت۔ ساڑھے سات روپئے۔ صفحات ۳۱۴

جناب مالک رام صاحب عربی، فارسی کے مشہور فاضل اور غالب پر "اتھارٹی" کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ جس مسئلہ پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس میں انتہا تحقیق سے کام لیتے ہیں "تلامذۂ غالب" بھی ان کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور اس میں مرزا غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کے حالات زندگی مع نمونۂ کلام درج ہیں۔ دنیائے اردو ان میں سے بیشتر شعرا کے حالات زندگی سے کما حقہ واقف نہ تھی۔ مالک رام صاحب پہلی مرتبہ انھیں اس تفصیل سے منظرِ عام پر لائے کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ کتاب میں تقریباً ہر شاعر کی تصویر شائع کی گئی ہے اور بعضوں کی تصویر تو پہلی مرتبہ اس کتاب کے ذریعہ ہمارے سامنے آئی ہے۔

تلوک چند محروم ۔ مرتبہ جگن ناتھ آزاد۔ ناشر ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔ قیمت چار روپئے۔

یہ ان مقالوں اور تبصروں کا مجموعہ ہے جو تلوک چند محروم کی شخصیت، ان کے مجموعۂ کلام (گنجِ معانی) اور ان کی شاعری وغیرہ کے بارے میں لکھے گئے اور مختلف رسائل اور کتابوں میں چھپ چکے ہیں۔ آخر میں فاضل مولف کا جو خود بھی اردو کے مشاہیر شعرا میں ہیں، ایک مقالہ شامل ہے جس میں محروم کی زندگی کے ان گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے جو بقول مولف "اُن (محروم) کے تخلص کے ساتھ گہرا معنوی ربط رکھتے ہیں" تلوک چند محروم اردو کے مشہور اور کہنہ مشق شاعر ہیں اور یہ کتاب اس لحاظ سے یقیناً مفید اور کارآمد ہے کہ اس سے ان کے کلام، ان کے فن، ان کی شاعری کے وطنی اور قومی پہلو، ان کے فلسفۂ غم، ان کی شاعری کے وصف خاص، صلح و محبت کی تلقین اور ان کی شخصیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

سنگِ میل ۔ از میلا رام وفا۔ ناشر مکتبہ دربار ادب۔ این۔ ایم / ۵۲۲ محلہ قرار خاں۔ جالندھر (پنجاب) قیمت ساڑھے تین روپئے۔

یہ اردو کے کہنہ مشق شاعر اور صحافی جناب میلا رام وفا کی سیاسی اور ادبی نظموں کا مجموعہ ہے اس سے پہلے وفا صاحب کی سیاسی نظموں کا ایک اور مجموعہ "سوزِ وطن" شائع ہو چکا ہے۔ پنڈت میلا رام وفا کا نام اردو کے علمی اور ادبی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہے ملک کے اکثر اکابرینِ ادب انکی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کر چکے ہیں چنانچہ مولانا ظفر علی خاں کا یہ مصرع تو زبان زد ہو چکا ہے "شعر کہنے کا طریقہ سیکھ میلا رام سے" اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وفا کے کلام میں زبان، بندشِ الفاظ، روانی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ جذبات کی پاکیزگی بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں بھی ہر نظم اور ہر غزل ان کی قادر الکلامی کا ثبوت دیتی ہے اور مذکورہ خصوصیات کی حامل ہے۔

شعر و ادب ۔ از مولانا اختر علی تلہری قیمت تین روپئے۔ ملنے کا پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ مکتبہ فکر و ادب نمبر ۱۶۹ گولہ گنج لکھنؤ۔ طباعت کتابت گرد پوش عمدہ۔

شعر و ادب، مشہور نقاد، ادیب اور شاعر علامہ اختر علی تلہری کے آٹھ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے اس مجموعے میں جو تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں انھیں پڑھ کر مولانا کے عالمانہ ادبی شعور، حکیمانہ ادبی مذاق اور مفکرانہ اندازِ نظر کا اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مولانا کی "ادبی دیانت" کسی کی لغزش کو، خواہ وہ خود ان کا محبوب شاعر اور مصنف ہی کیوں نہ ہو، معاف نہیں کرتی لیکن اس پرکھ میں وہ ہمیشہ بے لوث منطقیانہ تحلیل و تجزیئے سے کام لیتے ہیں اور جنبہ داری کو قریب نہیں آنے دیتے۔

تنقید و تحلیل ۔ از سید شبیہ الحسن۔ ناشر: ادارۂ فروغ اردو۔ قیمت تین روپئے۔

یہ مجموعہ ہے سید شبیہ الحسن صاحب اسسٹنٹ پروفیسر اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے تنقیدی مقالات کا۔ زیرِ نظر مجموعہ میں سات مقالات شامل ہیں۔ خود سید شبیہ الحسن صاحب نے ان مضامین کے بارے میں لکھا ہے کہ انھیں "رسماً" تنقیدی کہنا ممکن ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں اصل تنقید کے بجائے ایک طرح کی تنقیدی فضا ملتی ہے۔" ان مضامین کو تنقید کہئے یا یہ کہ ان میں تنقیدی فضا" پائی جاتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شبیہ الحسن صاحب نے ان میں ایک انفرادیت سے کام لیا ہے اور ایسے پہلوؤں پر بحث کی ہے جو عام طور سے شاید نظر انداز ہو جاتے۔

گنگ و جمن ۔ از نذیر بنارسی۔ ناشر غالب اکادمی مدن پورہ بنارس قیمت ساڑھے چار روپئے

نذیر بنارسی، اتر پردیش کے خوش گو اور خوش فکر شعرا میں ہیں جو اچھی غزل بھی

کہتے ہیں اور اچھی نظم بھی کہہ لیتے ہیں۔ گنگ و جمن انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے جو معنوی حیثیت کے علاوہ صوری حیثیت سے بھی بڑا نظر نواز اور دل فریب ہے۔ مجموعہ کی نظموں میں زیادہ تر نظمیں سیاسی اور سماجی ہیں اور حب وطن کے جذبہ سے معمور۔ متعدد نظموں میں مناسب اور برمحل ہندی الفاظ کی آمیزش نے انھیں گنگ و جمن کا سنگم بنا دیا ہے اور ان نظموں کی دل آویزی دوچند کر دی ہے: غزلوں میں بھی ایک ایسی بے ساختگی ایک ایسا کیف اور ایک ایسی سرمستی پائی جاتی ہے جو ہر پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ ضرور کر لیتی ہے اور دل پر ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ جاتی ہے۔

نئی دھرتی پرانے گیت ۔ از رام لال۔ پبلشرز اینڈ پرنٹرز: میسرز نکئے صوان ایس چھابڑہ بلڈنگ، جدید چند نگر عالم باغ لکھنؤ، ۱۴۹ قطب روڈ نئی دہلی۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔

یہ رام لال کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ رام لال کا محبوب موضوع چھوٹے طبقوں کے دکھ درد اور خوشیاں ہیں اسی لئے وہ پڑھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کے زیر نظر افسانے اپنی سادگی اور پرکاری کے اعتبار سے بڑے کامیاب ہیں۔

میر کی آپ بیتی ۔ مرتبہ نثار احمد فاروقی: ناشر مکتبہ برہان۔ اردو بازار دہلی قیمت چھ روپے۔ حالی تذکرہ خدائے سخن میر تقی میر نے ذکر میر کے نام سے اپنے حالات فارسی میں قلمبند کئے تھے۔ یہ کتاب نہ صرف اسلئے اہم ہے کہ اس سے میر کے صحیح حالات زندگی معلوم ہوتے ہیں اور ان کے متعلق جو غلط روایتیں مشہور ہو گئی ہیں انکی حقیقت واضح ہو جاتی ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس سے میر کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اصل فارسی نسخہ اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ دوسرے، فارسی نسخہ کے پڑھنے والے بھی کم ہوتے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے نثار احمد فاروقی صاحب نے میر کی آپ بیتی کے عنوان سے ذکر میر کا سلیس اور محاورہ ترجمہ کر کے بڑا کام کیا ہے۔ نثار احمد فاروقی صاحب اردو کے اچھے محققین میں ہیں اور ان کے حواشی نے کتاب کی خوبی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

پیاس ۔ از بشیشر پردیپ۔ ناشر: میسرز ایس چھابڑہ کے دھون برائے "فکر جدید" چند نگر عالم باغ۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔

یہ بشیشر پردیپ کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پردیپ کے افسانے عام زندگی سے مستعار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور روزانہ کی بول چال کی ہوتی ہے جو انھیں حقیقت سے زیادہ قریب کر دیتی ہے۔ اس مجموعے کو دیکھ کر یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پردیپ کے افسانوں کا مستقبل روشن ہے۔

خد وخال ۔ از اختر رضوانی۔ قیمت اور ناشر کا پتہ درج نہیں۔

قابل رضوانی صاحب نے اپنے ماحول اور پرستاروں کی محبت اور خلوص کی نگاہ

لیلئے اپنی رباعیات کے اس مجموعے کی کوئی قیمت معین نہیں کی ہے۔ بہرحال یہ رباعیات عوام کے دھڑکتے دلوں کی عکاسی کا بہترین نمونہ ہیں اور ان پر رضوانی کے تجربات اور مشاہدات کا گہرا نقش ہے۔

فروغ اردو ۔ حالی نمبر۔ (دو حصے) ناشر: ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ حصۂ اول ۵ روپے حصۂ دوم ۳ روپے۔

لکھنؤ کے ادارۂ فروغ اردو نے اپنی چھوٹی سی زندگی ہی میں اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس ادارہ کی طرف سے ایک رسالہ فروغ اردو بھی نکلتا ہے جس کا سالانہ چندہ دو روپیہ ہے۔ اس رسالہ کے دو نمبر صرف حالی کے لئے مخصوص کر دئے گئے تھے۔ اور تقریباً پانچ اور چھ سو صفحات کے ان نمبروں میں وہ سب موجود ہے جو حالی کے متعلق لکھا جا سکتا تھا۔ ان نمبروں میں حالی کی زندگی، ان کے ماحول، ان کے عہد، ان کی شاعری اور ان کے ادب بھی چیزوں کے بارے میں مشاہیر اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں نئے بھی ہیں اور مطبوعہ بھی لیکن سب نے مل کر ان نمبروں کو دو مکمل تحقیقی کتابوں کی شکل دیدی ہے۔

ایک توضیح

نومبر ۵۹ء کے شمارہ نیا دور میں توضیحات کے تحت قاضی عبدالودود صاحب کا ایک خط مثنوی گل وصنوبر سے متعلق شائع کیا گیا ہے۔ یہ چند سطریں بھی اسی مثنوی سے متعلق ہیں۔ مثنوی گل وصنوبر میں کل ۷۰۰ شعر ہیں۔ اسکے مصنف کا نام اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے اسکا زمانہ تصنیف ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء کے بعد اور ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء سے پہلے کا ہے۔ قاضی صاحب نے اس مثنوی کی جس اشاعت (۱۲۸۷ھ مطبوعہ مطبع حیدری بمبئی) کا ذکر کیا ہے اس سے سو رسال پہلے یعنی ۱۲۶۱ھ کی ایک اشاعت اور بھی ہے۔ یہ اشاعت مصطفائی پریس لکھنؤ سے ہوئی تھی۔ اس اشاعت میں میر کی مثنوی اعجاز عشق بھی آخر میں ہے۔ صفحات دو مثنویوں کے مسلسل ہیں۔

غازی الدین حیدر کا لقب بادشاہ ہونے کے بعد شاہ زمن مقرر ہوا تھا نہ کہ سلطان زمن جیسا کہ قاضی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ میرے پیش نظر جو تصریحات ہیں وہ یہ کہ جب نوابی نے سلطنت کا روپ دھارا تو بادشاہ کا لقب ابوالمظفر معز الدین شاہ زمن قرار پایا۔ جو لوگ کیلئے ملاحظہ ہو قیصر التواریخ تصنیف سید محمد میرزا جلد اول صفحہ ۲۴۵ اور تاریخ اودھ مصنفہ نجم الغنی جلد چہارم صفحہ ۱۴۴

ناسخ نے جو تاریخ جلوس نظم کی ہے اس سے بھی شاہ زمن ہی کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

چوں شاہ زمن صاحب جود و انصاف ۔۔۔ شد بر سر اورنگ مرصع جالس

اسی کا مقطع ہے: ۔

تاریخ سعید کرد ناسخ تحریر ۔۔۔ شہ اسکندر وزیر ارسطا طالیس

اس سلسلہ میں ایک دوسرا شعر اور پیش ہے

سکہ زد برسیم و زر از [illegible] المن ۔۔۔ غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۱۱

جمہوریت نمبر

ماگھ ۱۸۸۱

۲۶ جنوری ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر

صباح الدین عمر

پبلشر

بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر

ایم۔ جی۔ شوم

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمہ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

اپنی بات —

جمہوریت

آج سے نو سال قبل، ہندوستان میں وہ نظام حکومت رائج ہوا جسے جمہوری طرز حکومت کہتے ہیں۔ ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء کو ہماری اس جمہوریت کے نو سال پورے ہو گئے اور اس تاریخ سے وہ دسویں سال میں قدم رکھ رہی ہے۔

جمہوریت عصر جدید کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی داغ بیل ہزاروں برس پہلے مشرق و مغرب دونوں جگہ پڑ چکی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جمہوریت کا جو نقشہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اور اس طرز حکومت کا جو منضبط نظام عہد حاضر میں پایا جاتا ہے وہ عہد قدیم میں رائج نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ جمہوریت، قدیم جمہوریتوں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

جمہوریت، ہندِ قدیم میں

مشرق میں جمہوریت کی بنیاد ہندوستان میں پڑی اور مغرب میں یونان کی سرزمین نے اسے جنم دیا۔ لارڈ زیٹ لینڈ کے بہ قول بہتوں کے لئے یہ امر باعث حیرت ہوگا کہ ہندوستان میں بدھ مذہب کے ماننے والوں کے اجتماعات میں جو دو ہزار برس قبل یا اس سے بھی پہلے ہوا کرتے تھے، موجودہ پارلیمانی طرز حکومت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لارڈ زیٹ لینڈ نے قدیم ہندوستان میں جمہوریت کی جھلکیاں صرف بودھوں کے اجتماعات میں دیکھی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جھلکیاں ہمیں بودھ اجتماعات سے پہلے ویدوں کے عہد میں بھی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ویدک لٹریچر سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں بھی راجہ یا بادشاہ کا اکثر انتخاب ہوا کرتا تھا۔ راجہ اپنے انتخاب کے بعد بسا اوقات اپنی پرجا کے گھر گھر جاتا اور ہر ایک سے اپنے انتخاب کی تائید کرنے کی درخواست کرتا۔ اور تو اور راجہ دسرتھ نے جب رام چندر جی کو اپنا ولی عہد بنانا چاہا تو اپنی تجویز ایک اجتماع کے سامنے پیش کی اور ان کی تائید حاصل کرنے کے بعد رام چندر جی کی ولی عہدی کا اعلان کیا۔ اس عہد میں راجہ کو بھوپت بھی کہا جاتا تھا جس کے معنی ہیں زمین کا رکھوالا۔ رعایا کو "پرجا" ضرور کہا جاتا تھا مگر "پرجا" کے معنی "رعایا" کے نہیں بلکہ نسل یا خاندان کے ہیں۔ اس لحاظ سے اس عہد میں راجہ اور پرجا کا تعلق بزرگ خاندان اور اولاد کا تھا اور راجہ کی حیثیت ہو لاہ ہوا کرتی تھی جو قرون وسطیٰ میں مطلق العنان حاکموں کی ہوتی تھی۔ خود لفظ راجہ ایک ایسے لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی پسندیدہ اور خوشگوار کے ہیں۔ اس زمانہ میں ہر راجہ کی ایک مجلس شوریٰ بھی ہوا کرتی تھی اور یہ مجلس جو فیصلہ کرتی تھی راجہ پر اس کی پابندی ناگزیر ہوتی تھی۔ چناں چہ اس سلسلہ میں چندر گپت موریہ کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ چندرگپت موریہ کو ایک مرتبہ کچھ جنگوں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے نئے ٹیکس لگانے کی سخت ضرورت لاحق ہوئی۔ معاملہ وزراء کی مجلس شوریٰ میں آیا۔ مجلس شوریٰ نے چندرگپت کی تجویز منظور کرنے سے انکار کر دیا اور چندرگپت کو خاموش ہونا پڑا۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایک زمانہ میں متعدد چھوٹی چھوٹی "جمہوریتیں" پائی جاتی تھیں اور ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب اس قسم کی پانچ جمہوریتوں کا ایک وفاق بھی قائم تھا۔ قدیم لٹریچر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں راجہ کو "گنتر داس" کہا جاتا تھا۔ "گنتر داس" کے معنی ہیں "عوام کا غلام" اور یہ لفظ بجائے خود اس امر کا ثبوت ہے کہ اس عہد کے راجاؤں کی وہی حیثیت تھی جو آجکل کے "آئینی بادشاہ" یا سربراہ کی ہوتی ہے۔ اس عہد میں کہیں کہیں خفیہ بلٹ دہندگی کا بھی طریقہ رائج تھا اور ووٹ دینے کے لئے رنگین لکڑیوں کے ٹکڑے استعمال کئے جاتے تھے۔

۲۶ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

مغربی جمہوریت کا ارتقاء

یہ حال تھا قدیم ہندوستان کا۔ مغرب کی طرف آئیے تو یونان قدیم میں بھی ایک طرح کی جمہوریتیں ملیں گی مگر ان میں ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ وہاں غلامی بھی رائج تھی اور ان غلاموں کو شہری حقوق حاصل نہیں تھے۔ یونانیوں کو البتہ شہری حقوق حاصل تھے لیکن چونکہ غلاموں کی وہاں اکثریت تھی اس لئے آبادی کی اقلیت ہی جمہوریت کے دیئے ہوئے حقوق سے فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ اب چونکہ ان جمہوریتوں میں ہر شخص کو بغیر تفریق رنگ و نسل یکساں حقوق حاصل نہ تھے، اس لئے ہم یونان کی ان "جمہوریتوں" کو موجودہ دور کی روشنی میں مکمل جمہوریت نہیں کہہ سکتے لیکن یہ بہر حال واقعہ ہے کہ آبادی کا کم سے کم ایک حصہ بعض جمہوری اصول و ضوابط کے ماتحت زندگی بسر کر رہا تھا۔ یونانی جمہوریت کے اصول و ضوابط مرتب کرنے میں سولن، فلاطون اور ارسطو کا بڑا ہاتھ تھا۔

یونان کے بعد، روما نے جمہوریت کے نئے اصول وضع کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا اور مغربی جمہوریتوں کے ڈھانچوں میں آج بھی جمہوریت روما کی جھلک پائی جاتی ہے۔ چنانچہ انگریزی لفظ "ری پبلک" (Republic) جس کے معنی جمہوریت کے ہیں، لاطینی لفظ "ریس پبلکا" (Respublica) ہی سے ماخوذ ہے۔ موجودہ دور کے کئی اصطلاحی الفاظ مثلاً "سینٹ" (Senate) وغیرہ لاطینی الفاظ ہی سے لئے گئے ہیں۔ لیکن روما کی یہ محدود قسم کی جمہوریت رفتہ رفتہ ملوکیت میں بدل گئی اور اس نے بعد میں سلطنت روما (Roman Empire) کی شکل اختیار کر لی۔ آخر سلطنت روما کا بھی زوال ہوا اور اس کے زوال کے ساتھ ساتھ حکومت کے اصول بھی بدل گئے اور یورپ کے مختلف ملکوں میں جاگیردارانہ نظام قائم ہو گئے۔ اسی کے ساتھ "پاپائیت" کو فروغ ہوا اور ایک عرصہ تک پاپائے روم کے فرامین کو وحی الٰہی کا درجہ حاصل رہا۔ اس میں شک نہیں کہ پاپائیت دین عیسوی کے ہر ماننے والے کو مذہبی معاملات میں ضرور یکساں درجہ دیتی تھی لیکن اس عہد کے سماج میں انسان کی درجہ بندی ہو گئی تھی اور ہر انسان کے حقوق و اختیارات اس کی امارت و وجاہت کے مطابق ہوتے تھے۔ پاپائے روم کے ارشادات اور کلیسا کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل انسان کا فرض اولیں سمجھا جاتا تھا اور آزادئ فکر و نظر کو نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ مذموم قرار دیا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد سماج میں پھر ایک انقلاب آیا۔ جاگیردار طبقہ کا انحطاط شروع ہوا اور اوسط درجہ کے طبقہ نے اس کی جگہ لینا شروع کی۔ اس طبقہ کے افراد کا زیادہ تر تعلق تجارت و حرفت وغیرہ سے تھا۔ اس طبقہ نے سماجی اونچ نیچ اور انسانی مساوات و حقوق پر غور کرنا شروع کیا اور اس غور و فکر کا نتیجہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ نیز پروٹسٹنٹ تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان تحریکوں میں قومیت کے عناصر بھی پائے جاتے تھے اس لئے عوام میں پاپائیت کا اثر و رسوخ ختم ہونے لگا مگر اسی کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے "بادشاہت" (Monarchy) کو اقتدار حاصل ہو گیا۔ گر یہ صورت حال زیادہ مدت تک نہیں قائم رہی اور یورپ کا تقریباً ہر ملک جدید انقلابات سے متاثر ہونے لگا۔ ان تمام ملکوں میں اس وقت سب سے زیادہ سیاسی شعور برطانیہ میں پایا جاتا تھا اس لئے سب سے پہلے برطانیہ ہی متاثر ہوا اور ۱۶۸۸ء کے "شاندار انقلاب" (Glorious Revolution) نے برطانیہ میں پارلیمانی طرز حکومت کی بنا ڈال دی۔ شروع شروع میں برطانوی عوام کو تشکیل حکومت اور انتظام و انصرام مملکت میں زیادہ اختیارات نہ مل سکے۔ سترھویں بلکہ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک آبادی کے بہت قلیل حصہ کو حق رائے دہندگی حاصل تھا لیکن ۱۸۳۲ء میں "ریفارم ایکٹ" پاس ہونے کے بعد برطانوی پارلیمنٹ اور اس کے اراکین کے اختیارات میں اضافہ ہونا شروع ہوا یہاں تک کہ پارلیمنٹ ہی کو اختیار کلی حاصل ہو گئے اور جمہوریت کے جدید ترین اصول وضع کئے گئے۔

دوسری طرف یورپ کے براعظم میں سب سے بڑا انقلاب (۱۷۸۹ء میں) فرانس میں آیا لیکن فرانس کے انقلاب سے چند سال قبل امریکہ میں، جو دراصل برطانیہ کی ایک نوآبادی تھا، ۱۷۷۶ء میں انقلاب آ چکا تھا۔ اہل امریکہ نے برطانیہ سے بغاوت کر کے اپنے لئے ایک نیا نظام تجویز کیا جس کے "منشور حقوق" میں فرد کو اہم ترین درجہ دیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ حکومت کا مقصد وحید ہی یہ ہونا چاہیئے کہ ہر انسان کو یکساں حقوق حاصل رہیں اور حکومت ان حقوق کے محافظ کا کردار ادا کرے۔ فرانس کے منشور حقوق میں بھی انسانی مساوات کو مقدم قرار دیا گیا تھا اور حکومت کو افراد کا تابع کر دیا گیا تھا یعنی اب ایسے نظام حکومت بننے لگے تھے جن میں اختیارات عوام کو حاصل تھے نہ کہ کسی ایک شخص یا گروہ کو اور عوام میں بھی کسی ایک کو دوسرے سے ممتاز نہیں کیا گیا تھا بلکہ ہر فرد کو یکساں درجہ دیا گیا تھا۔

رفتہ رفتہ سارے یورپ اور امریکہ میں "جمہوریتیں یا آئینی بادشاہتیں" تو قائم ہو گئیں لیکن بنیادی طور سے ایک ہوتے ہوئے بھی ان کے طریق کار میں اختلاف رہا مثلاً برطانیہ کی حکومت، پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے، وہاں پارلیمنٹ کے ممبران ہی اراکین حکومت کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان اراکین حکومت کو

جب تک پارلیمنٹ کا اعتماد حاصل رہتا ہے وہ برسر حکومت رہ سکتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں دوسرا طریق کار ہے، وہاں انتظامیہ، عدلیہ اور قانون سازی کی شاخیں علاحدہ علاحدہ ہیں اور صدر کو کافی اختیارات حاصل ہیں۔ سوئزرلینڈ میں ایک اور طرح کی جمہوریت پائی جاتی ہے۔

جمہوریت کی تعریف

یہ جمہوریت کے ارتقا کی مختصر تاریخ تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت کے معنی کیا ہیں اور اس کی تعریف کیا ہے۔ جمہوریت کی تشریح و تعریف مغرب کے متعدد سیاسی مفکرین نے کی ہے۔ ان تعریفوں میں سب سے مشہور تعریف امریکہ کے ایک صدر ابراہم لنکن (Abraham Lincoln) کی ہے یعنی "عوام کی حکومت، عوام کے ہاتھوں اور عوام کے لئے"۔ برائس (Bryce) نے لکھا ہے کہ "ہیروڈوٹس کے زمانے سے لفظ جمہوریت سے وہ طرز حکومت مراد ہے جس میں کسی ملک پر حکومت کرنے کے اختیارات قانونی طور سے کسی ایک طبقہ یا ایک سے زیادہ طبقوں کو نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے پورے معاشرہ کے افراد کو حاصل ہوں"۔ آرتھر بائرنڈ (Arthur Byrand) کا کہنا ہے کہ "میرے تصور میں جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں انسان کو ۔۔ ہر انسان کو ۔۔ اس کے جسم، دماغ اور روح کی معقول تسکین کے مواقع حاصل ہوں"۔ پروفیسر لاسکی (Laski) کے بقول "جمہوری حکومت، مساوات کے بغیر نہیں قائم ہو سکتی۔ اور جمہوری حکومت کے بغیر آزادی نہیں حاصل ہو سکتی کیونکہ جمہوری حکومت کے صحیح معنی یہ ہیں کہ سماجی اداروں کے ذریعے مسرت حاصل کرنے کے انفرادی دعاوی پر یکساں توجہ کی جائے"۔ جوڈ (Joad) نے جمہوریت کی یہ تشریح کی ہے: "جمہوریت کے یہ معنی ہیں کہ اختیارات عوام کو حاصل ہوں اور یہ کہ اسی وجہ سے عوام حکومت کریں"۔ اور وزیر اعظم نہرو نے جمہوریت کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے: "جمہوریت کے یہ معنی ہیں کہ ہم نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ رواداری برتیں جو ہم سے متفق ہیں بلکہ ان لوگوں سے بھی رواداری کے ساتھ پیش آئیں جو ہم سے متفق الرائے نہیں ہیں۔ حصول آزادی کے ساتھ ہمارے رویہ میں بھی تبدیلی ہو جانا چاہیئے تاکہ وہ اس آزادی سے ہم آہنگ ہو سکے"۔ جمہوریت کی ان تشریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت صرف ایک طرز حکومت نہیں بلکہ اس سے بلند چیز ہے یعنی وہ ایک نظام معیشت ہے۔ وہ ہمیں زندگی کا اصول بتاتی ہے۔ وہ ہمارے دلوں کو وسیع بنانا چاہتی ہے۔ وہ ہماری نظروں میں گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ہماری فکر کو ایک تنگ دائرہ میں محدود نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ہم کو فراخ حوصلگی سکھاتی ہے۔ وہ ہم کو رواداری کا درس دیتی ہے۔ وہ ہمارے قلب و دماغ کی کھڑکیاں کھول دینا چاہتی ہے۔ وہ ہمیں انسان کی عظمت سے آگاہ کرتی ہے اور مساوات و اخوت کی تلقین کرتی ہے۔

جمہوریت اور فرد

جمہوریت کی ایک اور بہت بڑی خوبی جو اسے حکومت کے دوسرے نظاموں سے ممتاز بناتی ہے، فرد کی اہمیت ہے۔ جمہوریتوں کے قیام سے قبل، دوسرے نظامہائے حکومت میں فرد کی عظمت کا کوئی تصور بھی نہ پیدا ہوا تھا۔ مطلق العنان بادشاہوں کے دور میں فرد کی زندگی اور موت دونوں بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اسے حاکم وقت سے سرتابی کی مجال نہ ہوتی تھی۔ اسے اظہار خیال کی آزادی نہ ہوتی تھی۔ اسے اپنے نظریات و محسوسات کی تبلیغ یا اعلان کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی ترقی اور بلندیٔ درجات منحصر ہوتی تھی بادشاہ کے رحم و کرم پر۔ اگر بادشاہ خوش ہو گیا تو اسے وزیر بنا دیا اور اگر بادشاہ ناراض ہو گیا تو بغیر کسی قصور اور بغیر کسی سبب کے اسے قتل بھی کر دیتا تھا۔ لیکن جب دور استبدادیت کے بعد سلطانیٔ جمہور کا زمانہ آیا تو فرد کو اس کا درجہ ملا۔ چنانچہ امریکہ اور فرانس دونوں ملکوں کے منشوروں میں فرد کی عظمت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا گیا اور افراد کو ہی ملک کا اصلی حاکم قرار دیا گیا۔ فرد کی اس عظمت میں برابر اضافہ ہوتا گیا تا آنکہ اٹلی اور جرمنی میں آمریت یعنی فسطائیت اور نازیت کو اقتدار حاصل ہو گیا۔ یہ دونوں نظام حکومت، جمہوریت کے برعکس تھے۔ ان نظاموں میں اختیارات اعلیٰ عوام کو نہیں بلکہ ایک شخص کو حاصل تھے۔ یہ آمریت یا شخصی حکومت دراصل قرون وسطیٰ کی بادشاہت تھی۔ چنانچہ اس دور میں بھی قانون ختم ہو گیا اور ڈکٹیٹر کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ نے قانون کی جگہ لے لی۔ نہ صرف یہ کہ اب فرد کوئی قانونی سہارا نہیں لے سکتا تھا بلکہ اس کی "شخصیت" بھی ختم ہو گئی اور وہ ایک بڑی مشین کا پرزہ بن کر رہ گیا۔ فسطائی نظریے کے مطابق فرد ایک سماجی جانور ہے اور اسے سماج میں اپنی آواز بلند کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ فسطائیت کے نزدیک ریاست ایک سمندر ہے اور فرد ایک قطرہ۔ اس لئے قطرہ کا فرض ہے کہ وہ سمندر میں مل کر اپنے وجود کو ختم کر دے اور اپنی انفرادیت کا تصور بھی نہ کرے۔ خود مسولینی کے الفاظ میں "ریاست ایک مطلق شے ہے اور اس کے مقابلہ میں افراد اور

جماعتیں ایک نسبتی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا تصوّر صرف ریاست کے پس منظر میں کیا جا سکتا ہے"۔ لیکن جمہوریت میں فرد کا درجہ ہی دوسرا ہوتا ہے۔ جمہوریت فرد ہی کو اصل مقصد قرار دیتی ہے اور ریاست کو حصولِ مقصد کا ذریعہ! فسطائی نظام میں ریاست خود مقصد تھی اور فرد حصولِ مقصد کا ذریعہ۔ دوسرے لفظوں میں فسطائیت کے نزدیک ریاست کو فرد پر ہر طرح سے ترجیح حاصل ہے اور فرد ریاست کے حصولِ مقاصد کا ایک آلۂ کار ہے! ظاہر ہے کہ جس نظام میں فرد کی یہ عزت ہو اس میں فرد کو اپنی ذہنی و روحانی بالیدگی کے کیا مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔ جمہوریت میں صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ فرد ہی جمہوریت کی بنیاد ہوتا ہے اور ریاست افراد کی تابع۔ اس لئے ہر جمہوریت میں فرد کو اپنی صلاحیتیں اُجاگر کرنے اور اپنی "شخصیت" کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے یکساں مواقع حاصل رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آمریت میں فرد کچھ عرصہ تک زیادہ کارکردگی دکھا سکیں لیکن یہ صورتِ حال دیر تک قائم نہیں رکھ سکتی اور کوئی فرد جس کی ذہنی بالیدگی رک جائے زیادہ عرصہ تک اپنی ریاست کے لئے فائدہ مند بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ مشہور مغربی مفکر مل نے اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ جس حکومت میں افراد ریاست کے آلۂ کار بنالئے جاتے ہیں اور ان کی شخصیت ختم کر دی جاتی ہے اسے بالآخر یہ محسوس کرنا پڑتا ہے کہ یہ افراد اپنی صلاحیتیں کھو بیٹھے ہیں اور ان کی حیثیت چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی سی ہو گئی ہے جو کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے شخصی آزادی، جمہوریت کی ایک بڑی دین ہے اس شخصی آزادی میں، آزادیٔ بیان، آزادیٔ اظہار، آزادیٔ تحریر، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ عقائد، آزادیٔ جماعت سازی وغیرہ بہت سی آزادیاں شامل ہیں اور ہر شخص جانتا ہے کہ جب تک وہ مروجہ قوانین کی خلاف ورزی نہ کرے گا اسے یہ تمام آزادیاں حاصل رہیں گی۔ مختصراً جمہوریت میں فرد ہی وہ محور ہے جس پر نظامِ جمہوریت گردش کرتا ہے اور اس کی شخصیت ہی "پہلی اور آخری حقیقت" ہے۔

جمہوریت اور آمریت کا ایک اور فرق

آمریت ہو یا اسی قسم کا کوئی اور نظام، اس میں اور جمہوریت میں ایک اور بڑا اور خاص فرق یہ ہے کہ آمریت یا شخصی حکومت کشت و خون کے بغیر بدلی نہیں جا سکتی خواہ عوام اس سے کتنے ہی متنفر ہوں۔ لیکن جمہوریت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ افراد یا عوام حکومتِ وقت کو ایک معینہ مدت کے بعد بغیر کسی کشت و خون کے بدل سکتے ہیں اور اپنے حسبِ منشا دوسری حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ حکومت کی تبدیلی کا یہ موقع انتخابات کے وقت ملتا ہے۔ آمریت یا فسطائی نظام میں ایک تو انتخابات عام طور پر ہوتے نہیں اور اگر ہوتے بھی ہیں تو ان میں ہر کوئی اپنی مرضی سے امیدوار نہیں بن سکتا۔ امیدواروں کی فہرست بھی شخصی حکومت کی مرتب کی ہوئی ہوتی ہے اور ان "سرکاری" امیدواروں کی مخالفت کرنے کے معنی موت کو دعوت دینے کے ہوتے ہیں کیونکہ شخصی حکومت یا آمریت میں حکومت کی مخالف جماعت بنانے یا حکومت کے خلاف لب کشائی کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔ یعنی اگر انتخابات بھی ہوتے ہیں تو شخصی حکومت کے معتمد علیہ آدمیوں کو منتخب کرنے کے لئے اور اسی لئے دوسری حکومت قائم کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن جمہوریت کا یہ امتیازی نشان ہے کہ اس میں ہر بالغ مرد اور عورت کو نہ صرف حقِ رائے دہندگی حاصل ہوتا ہے بلکہ ہر شخص کو جماعت سازی کا بھی حق ہے۔ وہ جس سیاسی جماعت میں چاہے شریک ہو کر اس کے نظریات کی تبلیغ کرے اور جس جماعت کو بھی چاہے ووٹ دے۔ اس طرح وہ مجالس قانون ساز میں انھیں نمائندوں کو منتخب کر سکتے ہیں جو ان کے ہم خیال ہوں اور پھر ان کے ہی ہم خیال (اگر مجالس قانون ساز میں ان کی کثرت ہو تو) ایک نئی حکومت کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ جمہوریت اور آمریت کے اس فرق کو بیورج (Beveridge) نے بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ بیورج کے یہ الفاظ محض ایک شخص کی رائے نہیں بلکہ وہ ایک تاریخی صداقت کے حامل ہیں۔ "جمہوریتوں اور مطلق العنان حکومتوں میں یہ فرق نہیں کہ ایک میں رہنماؤں کا فقدان ہوتا ہے بلکہ یہ فرق ہے کہ جمہوریتیں اپنے رہنماؤں کو بغیر گولی مارے ہوئے بدل سکتی ہیں۔ حکومت کو پُرامن طریقہ سے بدل دینے کا یہ اختیار، جمہوریت کی ضروری شرط ہے"۔ عوام کو تبدیلیٔ حکومت کا یہ حق حاصل ہونے کی وجہ سے حکومتِ وقت کو بھی اپنے اقدامات پر ہمیشہ نظر رکھنا پڑتی ہے۔ وہ جب بھی کوئی قانون بناتی ہے تو اسے اس کا خیال کرنا پڑتا ہے کہ قانون عوام کے فائدہ کے لئے ہے یا نہیں اور عوام کو اس سے اختلاف تو نہیں ہوگا۔ وہ جانتی اور سمجھتی ہے کہ ایک مقررہ مدت کے بعد اسے عوام سے پھر ووٹ حاصل کرنا ہیں اور اگر عوام اس کی کارکردگی سے خوش نہ ہوئے تو وہ اسے دوبارہ ووٹ نہ دیں گے۔ گویا ان انتخابات کی وجہ سے حکومتِ وقت کی

منادور

...دوسرے سے بہتر قانون وضع کرے تاکہ عوام برسر اقتدار جماعت کو ووٹ دیں۔ اسی کے ساتھ حکومت کی مخالف جماعتیں بھی کوشش کرتی ہیں کہ وہ ایسا لائحہ عمل تجویز کریں جو عوام کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ہو اور جسے عوام زیادہ پسند کریں۔ دوسرے لفظوں میں انتخابات عوام کے ہاتھوں میں وہ آلہ ہیں جن کے ذریعہ وہ ہر سیاسی جماعت یا حکومت کو اپنا تابع رکھ سکتے ہیں اور جس حکومت کو بھی وہ چاہیں وہ انتخابات کے موقع پر محض اپنے ووٹوں سے تبدیل کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کا جمہوری نظام

جمہوریت کی انھیں خوبیوں کے پیش نظر ہندوستان کے عوامی نمائندوں نے آج سے نو برس پہلے ملک کے لئے ایک جمہوری نظام وضع کیا جس میں دوسرے جمہوری ممالک کے نظاموں کی تمام اچھائیاں سمو دی گئی تھیں اور ساتھ ہی ہندوستان کے دیرینہ روایات کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ اوپر بتایا گیا ہے کہ جمہوریت میں فرد کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔ ہندوستان کے جمہوری نظام کا آئین مرتب کرتے وقت اس کا بھی لحاظ رکھا گیا۔ چنانچہ اس کی تمہید میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ ہم ہندوستان کے رہنے والوں نے یہ طے کیا ہے کہ اس کے شہریوں کو سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف ملے گا۔ انھیں خیال، اظہار، عقائد اور مذہب کی آزادی ملے گی، انھیں درجہ اور مواقع کی مساوات حاصل ہوگی اور ان سب میں ایسا بھائی چارہ پیدا کیا جائے گا جس میں افراد کی عظمت اور قوم کا اتحاد یقینی طور سے پایا جائے۔ ہندوستان میں چونکہ مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں اس لئے یہاں کی حکومت کو نامذہبی حکومت قرار دیا گیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ حکومت لامذہبیت کو پسند کرتی ہے بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں۔ یہ ہندوستان کی روایات کے عین مطابق تھا۔ رواداری اور وسیع النظری ہندوستان کی خصوصیات رہی ہیں۔ ہندوستان میں مختلف عقائد و نظریات کے لوگ آئے اور اس سرزمین نے سب کو اپنے آغوش میں لیا۔ چنانچہ صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے آئین ہند کے اسی نامذہبی تصور کے بارے میں کہا ہے کہ ہمارے آئین میں نامذہبیت (سیکولرزم) کا نصب العین کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ آئین مرتب کرنے والے ضابطۂ تحریر میں وہی چیزیں لائے جو ہمیں نسلاً بعد نسل ترکہ میں ملی ہیں۔ جہاں تک افراد کے حقوق کا تعلق ہے آئین ہند کے اندر "بنیادی حقوق" پورے ایک باب میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان حقوق کی تفصیل پیش کرتے ہوئے آئین میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ہر شہری کو آزادیٔ تحریر و تقریر، آزادیٔ بیان، آزادیٔ عقائد، آزادیٔ مذہب، آزادیٔ جماعت سازی حاصل ہوگی۔ وہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں کسی روک ٹوک کے بغیر نقل و حرکت کر سکے گا۔ وہ ہر مندر میں جا سکے گا اور چھوت چھات کا کوئی سوال نہ پیدا ہوگا۔ ہر شخص کو بغیر تفریق مذہب، ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔ اونچے سے اونچے منصب کے دروازے اس کے لئے کھلے ہوں گے۔ ہر تعلیمی ادارہ میں اس کا داخلہ ہو سکے گا۔ ہر سیاسی جماعت میں وہ شریک ہو سکے گا۔ ہر بالغ و عاقل کو ووٹ دینے کا حق ہوگا۔ مروجہ قوانین کے ماتحت ہر شخص کی داد رسی ہوگی۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی گئی ہے تو عدالت سے وہ انصاف کا طالب ہو سکے گا۔ آئین میں عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھا گیا ہے اور اس بات کا خیال کیا گیا ہے کہ انتظامیہ عدالتی معاملات میں دخل اندازی نہ کرے بلکہ فیصلوں کی پابندی کرے۔ آئین میں لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اقلیتوں کو ان کے کلچر اور زبان کے معاملہ میں تحفظات دیئے گئے ہیں۔ انھیں اپنے مذہبی اسکول کھولنے کی بھی اجازت ہے۔ ہندوستان میں جو زبانیں رائج ہیں ان سب کو ہندوستانی زبانیں قرار دیا گیا ہے۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں پارلیمانی طرز حکومت رکھی گئی ہے اور ایک مقررہ مدت کے بعد انتخابات کرانے کی ضمانت کی گئی ہے تاکہ عوام اس مدت مقررہ کے بعد اپنی مرضی سے اپنے نمائندے منتخب کریں اور اپنے حسب منشا حکومت کی تشکیل کر سکیں۔ غرض جمہوریۂ ہند کے دستور کو ہر معنی میں مکمل بنا دینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ آئین میں جمہوریت کی روح کے منافی کوئی دفعہ آنے نہ پائے اور ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے پورے مواقع حاصل رہیں۔

جمہوریت میں عوام کی ذمہ داریاں

جمہوریت نے عوام کو جو حقوق دیئے ہیں ان کا مختصر ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حقوق کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔

پیام دوم

چنانچہ جمہوریت میں اگر ایک شخص کو آزادئ تحریر و تقریر حاصل ہے تو اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اس حق کا ناجائز استعمال نہ کرے اور یہ نہ سمجھ لے کہ اس آزادی کے ماتحت وہ دوسروں کو مطعون کر سکتا ہے یا انھیں اپنے سب و شتم کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ جمہوری نظام کے ماتحت ہمیں آزادئ عقائد حاصل ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم دوسروں کے عقائد کا مضحکہ اڑائیں۔ جمہوری نظام میں رہ کر اگر ایک آدمی ایک جماعت میں شریک ہو سکتا ہے تو دوسرے کو دوسری جماعت میں شرکت کا بھی حق حاصل ہے اور پہلا اس پر معترض نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں جمہوریت میں کوئی شخص اپنے حقوق کو اس طرح استعمال نہیں کر سکتا کہ دوسرا اپنے حقوق کے استعمال سے محروم ہو جائے۔ یعنی ہمیں جمہوریت میں رہ کر ایک دوسرے کے ساتھ رواداری دکھانا ہے قانون کا احترام کرنا ہے اور اس مقولہ پر عمل کرنا ہے کہ "ہرچہ بر خود مپسندی بر دیگراں مپسند"۔ جمہوریت نے ہم کو حکومت وقت پر بھی نکتہ چینی کا حق دیا ہے اور جمہوری ملکوں میں لوگ حکومت پر نکتہ چینی بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ حکومتیں خندہ پیشانی سے نکتہ چینی سنتی ہیں اور اگر کوئی معقول بات کہی جاتی ہے تو اس پر عمل بھی کرتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہر جمہوری ملک کے عوام پر بھی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ اگر حکومت کسی تعمیری مہم میں مصروف ہو تو وہ اس کے ساتھ پورے طور سے اشتراک عمل کریں اور اگر کوئی قومی خطرہ درپیش ہو جائے تو سیاسی اختلافات کو نظرانداز کر کے تحفظ وطن کے لئے سینہ سپر ہو جائیں۔ اس وقت ہندوستان ایک ایسے ہی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف ہماری قومی حکومتیں ملک کی اقتصادی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے پنج سالہ منصوبوں کو کامیاب بنانے میں کوشاں ہیں، دوسری طرف انھیں اپنی شمالی سرحد کی محافظت کرنے کی فکر ہے۔ پنج سالہ منصوبوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستانی عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو جائے، جہالت کی تاریکی دور ہو، عوام کو علاج و معالجہ کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل ہوں، زرعی اور صنعتی حیثیت سے ملک خود کفیل ہو جائے اور ہندوستان کسی معاملہ میں کسی دوسرے ملک کا دست نگر نہ رہنے پائے۔ یہ ایک قومی کام ہے جس میں ہندوستان کے ہر باشندے کو اپنی قومی حکومت سے تعاون کرنا چاہیئے۔ اس وقت تک ان منصوبوں میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے اور اب تیسرا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔ پچھلے دو منصوبوں کی کامیابی میں عوام کے تعاون کو بڑا دخل ہے۔ ہندوستان توقع کرتا ہے کہ تیسرے منصوبہ کی اسکیموں کو بروئے کار لانے میں بھی اسے اپنے عوام کا اسی طرح اشتراک حاصل رہے گا۔ اسی طرح سرحدی مسئلہ بھی بڑا اہم قومی مسئلہ ہے۔ ہندوستان کسی سے جھگڑا نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ہر متنازعہ مسئلہ کو باہمی گفت و شنید سے حل کرنے کا خواہشمند رہتا ہے اور اس کی پالیسی کا بنیادی اصول ہی یہ ہے۔ اس نے دنیا کو "پنچ شیل" کا پیغام دے کر "جیو اور جینے دو" کے اصول کی تلقین کی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں گوارا کر سکتا کہ اس کی آزادی کو خطرہ پیدا ہو جائے اور وہ خاموش رہے یا اس کی سرزمین کے ایک چپہ پر بھی کسی غیر ملک کا قبضہ ہو جائے اور وہ اسے انگیز کرے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ وہ سرحدی مسئلہ پر چین سے حتی الامکان جنگ نہیں کرنا چاہتا پھر بھی وہ یہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا کہ چین اس کے علاقہ کی ایک ایک انچ زمین پر بھی قابض رہے۔ اسی لئے ایسے حالات میں ہر ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی کوئی بات نہ کرے جس سے ملک کی سالمیت و آزادی پر کوئی حرف آئے ہم نے حصول آزادی کے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں۔ بقائے آزادی کے لئے بھی ہم کو کسی طرح کی قربانی سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے آیئے اور یوم جمہوریت کے مبارک موقع پر یہ عہد کیجئے کہ ہم اپنے وطن کے تحفظ اور اقتصادی خوش حالی کے لئے صعوبتوں سے گھبرائیں گے نہیں اور گاندھی جی کے خوابوں کا نیا ہندوستان تعمیر کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دینگے۔

۲۶ جنوری ۱۹۶۳ء

جانِ افسانہ یہی کچھ بھی ہو افسانے کا نام
زندگی ہے دل کی دھڑکن تیز ہو جانے کا نام

رُت جوانی کی نگاہوں میں پیام آنے کا نام
لے کے انگڑائی کلی کے پھول بن جانے کا نام

قطرہ قطرہ زندگی کے زہر کا پینا ہے غم
اور خوشی ہے دو گھڑی پی کر بہک جانے کا نام

کچھ تو اس ساقی کی رکھ لو آبروئے چشم و لب
جس کی مے سے آج تک اونچا ہے میخانے کا نام

شمع سوزاں بجھ چکی رخصت ہوئے وہ جاں نثار
اب تو محفل میں فقط باقی ہے پروانے کا نام

زیست سے آنکھیں ملانے سے نہ روکیں وہ ہمیں
زندگی جن کی ہے خوابوں سے بہل جانے کا نام

اولاً سینے میں جس نے مے کو جا دی ہے کشو
گھونٹ پلا لے کے اس گم نام پیمانے کا نام

خوش نہ ہو خود چن کے اک اچھا سا نام اپنے لئے
اور جو دنیا کل بدل دے تیرے افسانے کا نام

طاقِ دیں ہو، بزمِ دانش ہو، حریمِ حسن ہو
گفتگوئے زیرِ لب کی جان ہے دیوانے کا نام

معبدِ انساں بنے کیسے، یہ ضد ہر دل میں ہے
اس کی پیشانی پہ ہو میسر ہی بت خانے کا نام

تابِ ناکامی نہیں تو آرزو کرنا ہے کیا
آرزو ہے موج کے ساحل سے ٹکرانے کا نام

آج تو، کل اور کوئی ہو گا صدرِ بزمِ مے
ساقیا تجھ سے نہیں ہم سے ہے میخانے کا نام

اک ہنسی تو وہ جو ہے اشکوں سے وقتی سا فرار
اک ہنسی ہے انتہائے غم پہ آ جانے کا نام

واقفِ مُلّاؔ نہ تھی بزمِ خرد یہ طے ہوا
ہو نہ ہو یہ ہے کسی مشہور دیوانے کا نام

شعرِ مُلّاؔ ہے اندھیروں میں اجالے کی تلاش
فکرِ مُلّاؔ ہے ستارے توڑ کر لانے کا نام

آنند نرائن ملا
۱۲ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

اُتر پردیش میں اُردو نظم ـــ آزادی کے بعد

محمد حسن

بعض لوگوں کے نزدیک اپنے دور کے ادبی رجحانات پر لکھنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک غیر ذمہ داری کا۔ ظاہر ہے ہر تنقیدی جائزے کی طرح اس قسم کا جائزہ بھی لکھنے والے کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی اس کے مذاق سلیم یا سوءِ ذوق کا غماز ہوتا ہے۔ ہمعصروں کے ادبی قد و قامت کا پوری طرح اندازہ نہیں ہو پاتا اور اس قسم کے مقالے ناموں کی نا تمام فہرست بن کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایسا خطرہ ہے جسے بہرحال مول لینا ضروری ہے کیونکہ جب تک انسان کو اپنے عہد اور اپنے گرد و پیش سے دلچسپی ہے وہ اپنی اور اپنے ہم عصروں کی قدر و قیمت ضرور لگائے گا اور اپنے دور کے رجحانات کے بارے میں بات کرنا پسند کرے گا۔

آیئے ہم بھی اپنے دور کے شعری رجحانات کے بارے میں باتیں کریں مگر یہ باتیں نہ سرکاری دستاویز کہی جا سکتی ہیں اور نہ ادبی محاکمہ۔

آزادی اتر پردیش کی زندگی میں خاص طور پر اہمیت رکھتی تھی کیونکہ آزادی کی رہبری کی زمام اسی صوبے کے چند ذمہ دار فرزندوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے علاوہ اس صوبے کے رہنے والوں نے دوسرے صوبوں کے رہنے والوں کی طرح اس مبارک دن کے انتظار میں بڑی بے چینی سے گھڑیاں گنی تھیں اور قربانیاں دی تھیں۔ اس صوبے کے شاعروں نے اور خاص طور پر اردو شعرا نے انقلاب کے زمزمے گائے تھے، قومی آزادی کے خواب دیکھے اور دکھائے تھے اور اس کی جد و جہد کے لئے لوگوں کے سینوں کو گرمایا اور روحوں کو تڑپایا تھا۔ انقلاب کے کئی زمزمہ خواں اور منادی اسی سرزمین سے اُٹھے تھے جن میں جوش ملیح آبادی۔ ساغر نظامی۔ روش صدیقی۔ آنند نرائن ملا۔ مجاز۔ سردار جعفری اور بعض دوسرے شعرا شامل تھے۔

آزادی کے بعد نظم نگاری میں دو واضح رجحانات پیدا ہوئے۔ ایک طرف تو شعرا کی توجہ اس قسم کی مردم بیزار، یاس پسند اور ابہام سے لگاؤ رکھنے والی شاعری سے ہٹنے لگی جو آزادی سے فوراً پہلے والے دور میں میراجی۔ راشد اور چند دوسرے شعرا کے زیر اثر عام ہو گئی تھی۔ اس قسم کی شاعری عام طور پر آزاد اور معریٰ نظم میں ہوتی تھی اور ابھی تک بہت سے لوگ آزاد اور معریٰ نظم کو صنف کی حیثیت سے اسی قسم کی یاس اور فراری شاعری کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد کے دور میں آزاد نظم میں بھی سنجیدہ فکر اور ذمہ دارانہ غور و خوض کے آثار ملنے لگے۔ دوسری طرف نظم نگاری میں سماجی شعور اور زیادہ واضح شکل میں رونما ہوا۔ آزادی سے پہلے بھی ہماری نظموں میں سماجی ذمہ داری کا لب و لہجہ آچلا تھا مگر پھر بھی اس میں جذباتیت زیادہ تھی۔ انقلابی نظموں میں یا تو آگ اور خون کے تذکرے تھے یا آنچلوں اور رخساروں کے بیچ انقلاب کے مطرب بھی تھے اور ڈھنڈورچی بھی مگر ان میں سے اکثر شعرا انقلابی بصیرت اور سماجی حقیقت کا ادراک کم رکھتے تھے۔ آزادی کے بعد اس قسم کی اعصابی شاعری کی گونج کم ہوئی اور دھیرے دھیرے ایک زیادہ سنجیدہ، زیادہ باوقار انداز جنم لینے لگا۔

آزادی کے بعد اسباب و علل کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے سنجیدہ اور ذمہ دارانہ غور و فکر کی دعوت دی۔ آزادی کے فوراً بعد ریاستوں کا الحاق، زمینداری کا خاتمہ، فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ، مہاتما گاندھی کا قتل، کشمیر کا معاملہ، دیسی راجاؤں کا خاتمہ، پہلے پنج سالہ منصوبے کی تکمیل، ہندوستان کی خارجی حکمت عملی کی کامیابی اور بعض دوسرے واقعات نے ذہنوں کو متاثر کیا۔ پرانی ذہنی تن آسانی ختم ہوئی اور جذباتیت کا سہارا لینے کے بجائے شعرا نے تھوڑا بہت حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنا اور اُن کے چیلنج کا جواب دینا سیکھا۔ اس لئے فکری اعتبار سے نظم میں زیادہ پختگی اور بلوغت کا احساس ہونے لگا۔

اس دور کی نظم گوئی میں غالباً سب سے اہم واقعہ جگر مرادآبادی کا نظم کی طرف متوجہ ہونا تھا۔ جگر صاحب ٹھیٹھ غزل گو شاعر ہیں اور غزل ہی کو علامت شاعری سمجھتے ہیں۔ انھیں معشوقِ غزل کے سارے ناز و انداز کا مکمل ادراک حاصل ہے اور

[illegible] آزادی سے پہلے بھی جب ایک [illegible] کے ذہن کو متاثر کیا انھوں نے نظم کی طرف [illegible] ان کی نظم [illegible] میں شائع ہوئی لیکن آزادی کے [illegible] جگر تغزل عشق کا سہارا لئے بغیر شعریت برقرار رکھنے کا گر پہچان گئے [illegible] ان کی شاعری — خواہ غزل ہو یا نظم — سچ مچ ان کے دل کی آواز ہے۔ ان کا [illegible] جوہر خلوص اور شدت احساس ہے جس میں جگر کی سرمستی، والہانہ پن اور [illegible] انفرادیت نے ایک انوکھی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ آزادی کے بعد کی نظموں میں یہ خلوص اور یہ شدتِ احساس پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ [illegible] کی سخت تنقید کرتے ہیں لیکن اس تنقید کے پیچھے کڑواہٹ اور تندی نہیں "گلزار گنگ و جمن" کا پیار اور اپنے چمن کے کانٹوں سے بھی نباہ کرنے کا ولولہ ملتا ہے۔ وہ انسانی ترقی کی رفتار سے مطمئن نہیں اور ان کی نگاہیں صرف آزادی ہی کو نہیں، اس کے نقائص اور ذمہ داریوں کو بھی دیکھ رہی ہیں:

ابھی ناقص ہے معیارِ جنوں، تنظیم مے خانہ
ابھی نامعتبر ہے تیرے مستوں کا چلن ساقی
وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

اور یہ نظم اس شعر پر ختم ہوتی ہے —

بدہ جامِ مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گل گشتِ جمن ساقی

جگر کے اس نئے رجحان کے علاوہ پرانے نظم نگاروں نے بھی اس زمانے میں کامیاب شہ پارے تصنیف کئے۔ ان میں فراق گورکھپوری، روش صدیقی و مجاز مرحوم، ساغر نظامی، آنند نرائن ملا، شاد عارفی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گویا ہمارے نظم نگاروں کی وہ صف تھی جس نے دورِ قدیم اور دورِ جدید کی شیرازہ بندی کر کے انھیں ایک سلسلہ میں پرو دیا۔ فراق مشاق اور کہنہ مشق غزل گو ہیں لیکن نظم نگاری میں بھی ان کا کس بل اور قوتِ تخیل بڑے جوہر دکھاتی ہے۔ انھوں نے نئے دور کے مسائل کو مختلف انداز سے اپنے نظموں میں سمویا اور ہنگامی موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہوئے بھی ان کے کلام میں شعریت، عمومیت اور لطافت اکثر باقی رہی۔ فراق [illegible] ان گنے چنے شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں جن کی وسعتِ نظر اور مطالعے کی ہمہ گیری [illegible] سے معمولی مضمون کو دلچسپ اور نہایت باوقار بنا دیتی ہے۔ ان کی نظموں میں خاص طور پر دو نظمیں قابلِ ذکر ہیں جن میں سے ایک غالباً "ہنڈولا" کے عنوان سے شاعل [illegible] میں اور دوسری شاعر کے منصب کے بارے میں "نقوش" لاہور میں شائع ہوئی تھی۔

روش صدیقی کا پہلا مجموعہ "شعراب" غزل کے عنوان سے اسی زمانے میں شائع [illegible] "مینائے غزل" کے عنوان سے چھپی۔ لیکن نظموں کے سلسلے میں روش نے "گاندھی جی کے قتل سے متاثر ہو کر جو شاندار نظم لکھی وہ اس سلسلے کی تمام نظموں میں ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ خلوص، جذبے کی شدت اور وسعتِ تخیل کے اعتبار سے بھی یہ نظم روش کی "عروسِ شب ابھی مہکو، ابھی تو رات بہت ہے" سے بھی زیادہ کامیاب ہے کیونکہ اس کا کینوس نسبتاً زیادہ بڑا ہے۔ اس کے علاوہ بھی روش نے کئی نظمیں کہیں جن میں ان کی مشرق سے وابستگی اور مناظرِ قدرت اور روحانیت سے والہانہ لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی نظم ان دو نظموں کے مرتبے تک نہیں پہنچی۔

مجاز نے ۱۹۴۷ء کے بعد بہت کم لکھا۔ آزادی کا دن انھوں نے بمبئی میں منایا اور اس زور شور سے منایا کہ ادیبوں، دانشوروں اور نوجوانوں کے ایک عظیم الشان جلوس میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوئے اور اس موقع کے لئے ایک مختصر سی نظم لکھی لیکن یہ زمانہ مجاز کی نجی زندگی کو راس نہ آیا اور وہ شدید نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہے۔ ان سب باتوں کے باوجود مجاز اس دور کے عظیم حادثوں سے متاثر ہوئے۔ گاندھی جی کے قتل پر ان کی نظم شائع ہوئی۔ فرقہ وارانہ فسادات اور آزادی کے فوراً بعد کے ہنگاموں اور بے رونقی سے گھبرا کر انھوں نے اپنی مشہور نظم "لالہ و گل کہاں گئے، سرو سمن کو کیا ہوا" لکھی جو گویا ان کی روح کی پکار ہے۔ اس میں ان کی شخصیت کا سارا سوز و گداز اپنی پوری تابناکی، شعریت اور ترنم کے ساتھ نظم کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ اس کے علاوہ "فکر" کے عنوان سے ایک اور نظم شائع ہوئی جس میں نئی زندگی کے مختلف مسائل کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ نظم کا بنیادی آہنگ اداسی کا ہے اور اس کی ابتدا اس یاس زدہ مصرع سے ہوتی ہے۔

ہیں ہر چند کسی گم شدہ جنت کی تلاش

لیکن اس کا خاتمہ پھر بھی مایوسی اور حزن و ملال پر نہیں ہوتا بلکہ میر نے جس طرح "تمام عمر ناکامیوں سے کام لینے" کا ہنر پیدا کیا تھا اسی طرح یہاں بھی مجاز نے مایوسیوں کے اندھیرے سے آبِ حیواں ڈھونڈھ نکالا ہے۔

[illegible] ملک شاہ "سیلاب چین" "خواب" اور [illegible] اسی دور کی تخلیقات ہیں۔ "جیل" "اے شام" [illegible] میں بھی تجربات کا تنوع اور اندازِ بیان کی تازگی نکھر کر سامنے آئی ہے لیکن اس دور کی سب سے کامیاب نظم "تین شرابی" ہے جس میں سردار [illegible] خطابت اور پروپیگنڈے سے آگے بڑھ کر ایک نئی منزل تک پہنچا ہے۔ سردار نے اس نظم میں پچھلے دس گیارہ برس کی بین الاقوامی زندگی کی ان حقیقتوں کی نقاب کشائی کی ہے جو ہر قوم اور ہر ملک کے لوگوں کے سامنے آتی رہی ہیں۔

اختر انصاری اپنے قطعات کے لئے مشہور ہیں۔ افسانہ نگار اور ناقد ہونے کے علاوہ وہ اچھے شاعر بھی ہیں۔ آزادی سے پہلے ان کے قطعات کی عام فضا نرم و نازک اداسی اور انفرادی محرومی کی رومانی فضا تھی لیکن آزادی کے بعد انھوں نے نیا لب و لہجہ اختیار کیا اور ان قطعات میں انسان کی بے بسی اور فطرت کی چیرہ دستی کا بڑا بے ساختہ اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے اس عرصے میں بعض نظمیں بھی کہیں۔

جذبی بنیادی طور پر غزل گو ہیں لیکن آزادی کے بعد والے عہد میں ان کی نظمیں "نیا سورج" "نقادسے" اور مجاز کی یاد میں ہمارے سامنے خاص طور پر آئیں۔ "نیا سورج" آزادی پر لکھی گئی لیکن اپنے علامتی اسلوب اور شعریت کے لحاظ سے انوکھی نظم کہی جا سکتی ہے۔ "نقادسے" ان کی اچھی نظموں میں شمار کی جائے گی جس میں مترنم بحر اور موسیقی سے معمور قافیوں کی جھنکار میں انھوں نے نجی دکھ درد کی کڑیاں اجتماعی درد و الم سے جا ملائی ہیں اور بڑی خوبی سے اس احساس کو ایک کامیاب فن پارے کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔

وامق نے اسی دور میں بڑی کامیاب نظمیں لکھیں انقلابی شاعری کی آب و تاب اور عوامی شاعری کی فضا دونوں سے انھوں نے کام لیا۔ پہلے دور کی یادگار "نیلا پرچم" اور بعض دوسری نظمیں ہیں۔ دوسرے صنف یعنی عوامی شاعری کی نشانی ان کے گیت، کجریاں اور بارہ ماسے ہیں لیکن اس دور میں ان کی کامیاب ترین نظم بلاشبہ "پیاری زمین" ہی ہے۔ "مینا بازار" پہلے چھپ چکی تھی لیکن "پیاری زمین" بڑے کینوس اور زیادہ دقیق مضامین کی وجہ سے مینا بازار کی علامتی اسلوب سے بھی گویا بازی لے گئی ہے۔ "پیاری زمین" زمین کی پیدائش کی کہانی ہے اور اس خالص سائنٹفک موضوع کو شعریت میں ڈھال کر ایک کامیاب نظم کی شکل دے دی گئی ہے۔

اختر الایمان اپنی صف میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ن۔م۔ راشد اور میراجی کے بعد آزاد نظم میں اختر الایمان ہی کو صاحب طرز شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اختر الایمان کی شاعری پر گہری داخلیت اور یاس پرستی کی مہر لگی ہوئی تھی حالانکہ اس محدود دائرے میں رہ کر بھی اختر الایمان نے بڑی کامیاب نظمیں کہیں لیکن آزادی کے بعد ان کی شاعری نئی کیفیت کی آماجگاہ بنی۔ اب اس میں ملکی اور کائناتی مسائل بھی جھلکنے لگے مگر ان کی جھلک چکاچوند پیدا کرنے والی نہ تھی، قوس قزح کی طرح دل فریب اور دل نواز تھی۔ اختر الایمان نے خودکلامی کے طرز کو اپنایا اور نظموں میں اسے رواج دیا۔ اسی اسلوب میں انھوں نے بڑے بڑے مسائل کو سمولیا۔ ان کی تازہ نظموں میں "میرا نام" اور کچھ سال پہلے کی نظموں میں "ایک لڑکا" "شکست خواب" اور "چلو چلیں" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ نظمیں تکنیک کے تنوع اور علامتی انداز کو انوکھے پن سے اختیار کرنے کی اچھی مثالیں ہیں اور ان کے اسلوب اور تکنیک نے نئی نسل کو خاموشی کے ساتھ متاثر کیا ہے۔

سلام مچھلی شہری کا شمار بھی تکنیک میں مختلف تجربے کرنے والے شعرا میں ہوتا ہے۔ سلام کی نظمیں، خواہ آزاد ہوں یا پابند، نئے انداز سے معمور ہیں۔ وہ کبھی مکالموں کا انداز اختیار کرتے ہیں، کبھی ڈرامائی اور واقعاتی اسلوب میں بات کرتے ہیں، کبھی گفتگو سے کام لیتے ہیں، اور کبھی اپنی نظموں میں بحر کے تنوع اور الفاظ کے دروبست سے رقص اور مصوری کی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ آزادی کے بعد سلام کی نظموں میں زیادہ پختگی آئی ہے۔ سلام نے فرقہ وارانہ فسادات پر جو نظم لکھی وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ منظوم ڈراموں میں بھی سلام نے کامیابی حاصل کی۔

ان کے علاوہ اسی دور میں غلام ربانی تاباں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ تاباں ہمارے مشہور اور کامیاب شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں مگر ان کی توجہ زیادہ تر غزلوں کی طرف رہی۔ آزادی سے لے کر ۱۹۵۱ء تک

جو نظمیں انھوں نے لکھیں ان میں سے اکثر سیاسی بلند آہنگی کی نذر ہو گئیں مگر پھر بھی بعد کی نظموں میں ایک سنبھلا ہوا انداز نظر آتا ہے۔ اس دور کے بعد وہ زیادہ تر غزلوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس لئے ان کی نظم نگاری ان کے بعد اس قدر نمایاں نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر زیب الرحمٰن کم گو شاعر ہیں۔ آزادی کے بعد کے دور میں انھوں نے بھی بعض کامیاب نظمیں لکھیں جن میں "شاعر کی موت" قابل ذکر ہے۔

نئی نسل میں جن شعراء نے اس زمانے میں اپنے فن کی نئی منزلیں طے کیں ان میں معصوم رضا راہی۔ باقر مہدی۔ منظر سلیم، شہاب جعفری، خلیل الرحمٰن اعظمی اور نازش پرتاپ گڈھی شامل ہیں۔ معصوم رضا راہی کی شاعری رومان اور انقلاب کی وادیوں سے گزر کر اس منزل تک پہنچی ہے ۱۹۴۷ء کے بعد ان کی نظموں میں خاص طور پر "جوہی کا پودا" اور "دیوانہ مر گیا" مقبول ہوئیں۔ باقر مہدی کا مجموعۂ کلام "شہر آرزو" اسی زمانے میں چھپا جس میں ان کا اس دور کا تمام نمائندہ کلام موجود ہے۔ باقر کی شاعری میں تلخی اور تیکھے لب و لہجہ زیادہ نمایاں ہے لیکن اس لب و لہجہ نے ان کی شاعری کو ذاتی ہونے سے بچا لیا ہے۔ ان کی شاعری میں خلوص اور واضح طور پر ان کی شخصیت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بعض نظموں میں انھوں نے عمرانی اور تہذیبی موضوعات کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور بڑی چابک دستی سے انھیں نظم کی داخلی فضا میں سمو لیا ہے۔

منظر سلیم نے آزادی کے بعد بہت کم نظمیں لکھیں لیکن گاندھی جی پر ان کی نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ منظر میں شاعری اور حسن ادا کی جو چنگاری ہے اب بھی خاموش نہیں ہوئی ہے۔ شہاب جعفری نے غزلوں کے علاوہ منظوم ڈرامے اور نظمیں بھی لکھیں جن میں "ذرہ کی موت" کامیاب نظم ہے اور اس میں علامتی اسلوب میں شہاب نے فرد اور اجتماعی زندگی کی کشمکش کو حسن کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظموں میں سبک رنگی اور کیفیت ملتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ان کی نظموں میں "پھر دیس" اور "اپنی تصویر پر لکھی ہوئی نظم" قابل ذکر ہے۔ نازش پرتاپ گڈھی نے اسی دور میں شاعروں اور فن کاروں کے نام ایک طویل نظم لکھی جس میں ان کی شاعری اپنی پوری روانی کے ساتھ رونما ہوئی ہے۔

بالکل نئے دور کے شاعروں کا تذکرہ ایک کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر کے ذکر پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے جعفر علی خاں اثر نے بھی اس دور میں اچھی اور کامیاب نظمیں لکھی ہوں لیکن میری نظر سے ان کی اس دور کی نظمیں نہیں گذری ہیں ہاں اعجاز صدیقی کی بعض نظمیں اس دور میں مقبول ہوئیں۔ اعجاز صدیقی کی نظم "بڑھے چلو" شعریت اور روانی کے اعتبار سے کامیاب ہے۔ اعجاز غزل زیادہ کہتے ہیں مگر ان کی نظموں میں غزل کا سا انتشار نہیں ہوتا وہ نظم کے آداب فن کو ملحوظ رکھ کر کہتے ہیں اور ان کی نظموں میں ترنم، موسیقی اور کیفیت ملتی ہے انھوں نے وقت کے بعض اہم مسائل پر اپنی نظموں میں اظہار خیال کیا اور نظم کی شعریت کو مجروح نہ ہونے دیا۔ اس کے علاوہ شمیم کرہانی کے گیت اور چند نظمیں بھی اسی دور کی تخلیقات میں شمار کی جانی چاہئیں۔ پھر مسعود اختر جمال نے بھی اس دور میں بعض بہت کامیاب نظمیں لکھیں اور ان کے فن نے نئی تابناکی حاصل کی۔

طنز و مزاح کی بھی شاعری میں گنجائش ہے اور گو مزاحیہ شاعروں کو بزم مشاعرہ میں تتمہ کے طور پر جگہ دی جاتی ہے مگر سچ بات یہ ہے کہ اگر شاعر مشاق اور ہنرمند ہو تو یقیناً طنز و مزاح سے شاعری میں بڑا کام لے سکتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو شاعری میں جس جس انداز سے طنز و مزاح کی لطافت کو برتا گیا ہے اتنا شاید ہی کسی دوسری زبان میں برتا گیا ہو۔ غالب کو حالی نے "حیوان ظریف" کا خطاب دیا تھا مگر اردو شاعروں میں سے اکثر اس خطاب کے کسی نہ کسی حد تک فرد سزاوار ہیں۔ طنز و مزاح کو کسی نے دو دھاری تلوار کہا ہے اگر ذرا سی چوک ہو جائے تو وار الٹا اپنے آپ ہی پر پڑتا ہے یہ صحیح ہے کہ ابھی تک ہماری شاعری میں ایسے مشاق اور ہنرمند شاعر کم پیدا ہوئے ہیں جو اس ہتھیار کو چابک دستی کے ساتھ استعمال کر سکیں اور اکبر کے سوا ایسا کوئی بھی پیدا نہیں ہوا جو صرف اسی صنف تک اپنے کو محدود رکھتا اور عظمت کی کرسی پر جا بیٹھتا مگر پھر بھی ہمارے یہاں طنز و مزاح کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔

آزادی کے بعد والے دور میں یوں تو لاتعداد طنز و مزاح نگار شعراء کی تخلیقات سامنے آئیں مگر ان میں سے زیادہ تر ادبی نوک پلک سے درست نہیں ہیں یا پھر ان میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکی ہے جو طنز و مزاح کو

[illegible] ہیں تاہم اس ضمن میں لئے جا سکتے ہیں۔
[illegible] نظم میں طنز و مزاح کے شاہکار کہیں
[illegible] کے بعد اچھی خاصی کامیاب طنزیہ اور مزاحیہ
نظمیں لکھی ہیں ان میں "مکین" اور "وی ایم ہال" دو نظموں کے
[illegible] اس وقت ذہن میں آتے ہیں اس کے علاوہ دلاور فگار
کا نام بھی اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے ان کی نظموں میں خاص طور پر
"شاعرِ اعظم" اور "انٹرویو" کامیاب ہیں اور طنز و مزاح کے
[illegible] ہیں۔ اس مضمون میں جن شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے
ان میں سے بیشتر شعرا پر "شاعرِ اعظم" میں دلاور فگار نے رائے زنی کی
ہے سوال یہ ہے کہ "شاعرِ اعظم" کس کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نظم
کے بعض اشعار ملاحظہ کیجئے۔

میں نے کہا جگر تو کہا "ڈیڈ" وہ ہو چکے
میں نے کہا کہ جوش کہا قدر کھو چکے
میں نے کہا فراق کی عظمت پہ تبصرا؟
بولے فراق، شاعرِ اعظم ارا را!...
میں نے کہا نیاز تو بولے کہ عیب بیں
میں نے کہا سرور تو بولے کہ نکتہ چیں
میں نے کہا ظریف تو بولے کہ گندگی
میں نے کہا سلام تو بولے کہ بندگی...
میں نے کہا کلامِ روش لاجواب ہے
کہنے لگے کہ ان کا ترنم خراب ہے...
[illegible] کا رختم ہوا جب یہ سلسلہ
میں نے کہا "حضور" تو بولے کہ "شکریہ"

بہرحال اٹھارہ برس میں آزادی کے بعد اردو نظم کا ارتقا
خاصی تیز رفتاری سے ہوا۔ اس مختصر سے خاکے میں بہت سے نام
چھوٹ گئے ہوں گے بعض نظم نگاروں کی تمام تخلیقات پیشِ نظر نہیں
تھیں اس لئے ممکن ہے ان کی بعض بہترین نظموں کا ذکر رہ گیا ہو
لیکن اس خاکہ کا مقصد بھی کوئی جامع و مانع فہرست تیار کرنا نہیں
تھا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اس مختصر سے جائزے سے اہم رجحانات
اور بعض قابلِ ذکر شعرا کی تخلیقات کا خاکہ سامنے آ جائے۔ اتر پردیش
اردو شاعری اور اردو ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اب بھی اردو کے
سلسلے میں مختلف قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ یہاں مشاعرے اور ادبی محفلیں
اب بھی کم و بیش دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہیں شاعری میں اور خاص طور پر
نظم نگاری میں مختلف قسم کے تجربے کئے جا رہے ہیں موضوعات کے
اعتبار سے بھی رنگا رنگی اور وسعت آ رہی ہے یہ احساس عام ہو رہا ہے
کہ نظم کا دائرہ محض نجی احساسات یا ارتعاشات تک محدود نہ رکھنا
چاہئے بلکہ حقیقی شاعری کا راز دراصل شخصیت کے پھیلاؤ اور نجی
احساس میں کائناتی آہنگ اور گرد و پیش کی پہنائی کو شامل کر لینے ہی میں
مضمر ہے۔ اور یہ احساس یقیناً مبارک ہے اسی لئے ابہام کی گریز پا
شاعری سے زیادہ سنجیدہ، زیادہ پختہ کار اور زیادہ ذمہ دارانہ شاعری
کی طرف توجہ مبذول ہوئی ہے ہاں اس راستے میں اگر کوئی رکاوٹ
اب بھی باقی ہے تو وہ ہے غزل سے بڑھی ہوئی وابستگی۔ غزل کو اردو
شاعری کی آبرو کہنے اور سمجھنے میں کوئی بدمذاقی نہیں ہے لیکن غزل کی
رمزیت اور اس کی گریز پائی، داخلیت اور ریزہ خیالی ہی پر قناعت
کر لینا اور اس پر اس درجہ فریفتہ ہو جانا کہ دوسرے اصناف کی طرف
توجہ نہ کی جا سکے۔ قابلِ اعتراض میلان ہے۔ بہرحال اس مختصر
خاکے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پچھلے گیارہ سال میں ہمارے نظم نگار
نئی منزلوں تک پہنچے ہیں اور ان کے سامنے نئے تصورات، آدرش اور
نئے افق آئے ہیں۔ یہ نئے افق بہ یک وقت زیادہ دل نشیں اور
دل افروز بھی ہیں اور کاوش طلب بھی۔ آئندہ زمانے میں اردو نظم کس
طرح اس مہم سے عہدہ بر آ ہوتی ہے، یہ نئی نظم کے لئے ایک عظیم الشان
چیلنج ہے۔

حریفِ دار و رسن

شبنم سحر کافی

ایسے کچھ لوگ حریفِ غمِ دوراں گزرے
منزلِ دار و رسن سے جو غزل خواں گزرے

خارزاروں میں چلے خاک اڑائی لیکن
سایۂ لالہ و نسریں سے گریزاں گزرے

پائی جمعیتِ خاطر تو بیابانوں میں
صحنِ گلشن سے جو گزرے تو پریشاں گزرے

لوگ پہنچ آئے سرِ بام نظارے کے لئے
تیرے کوچے سے اگر چاک گریباں گزرے

آندھیاں جن کے قدم چوم کے ہٹ جاتی تھیں
ایسے مضبوط ارادوں کے بھی انساں گزرے

جل رہی تھی عجب انداز سے ہر سینے میں
ایسی مشعل جو ہواؤں میں فروزاں گزرے

دل سے اس طرح گزرتی تھی تمنا جیسے
شور کرتا ہوا منجدھار سے طوفاں گزرے

جگمگاتے تھے اندھیرے میں کچھ اس طرح خیال
جیسے نظروں سے کوئی شامِ چراغاں گزرے

وہ بھی کیا دن تھے جب آوارگیٔ دشت کے بعد
سوچتے تھے کہ کہاں شامِ غریباں گزرے

ظلم پر اپنے جو مغرور نظر آتے ہیں
وہ بھی اک روز نگاہوں سے پشیماں گزرے

لوگ کہتے تھے شہِ مغرب و مشرق جن کو
ایک دن وہ بھی چراغِ تہِ داماں گزرے

کھل گئی راہِ چمن، عام اجازت ہے شبنم
شوق سے قافلۂ جشنِ بہاراں گزرے

شاد کا اندازِ نظر

آختر اورینوی

کائنات اور حیات بہت ہی وسیع، عمیق اور بیکراں حقیقتیں ہیں۔ آرٹ، حیات اور کائنات کو سمجھنے کی شعوری کوشش ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو سارے علوم انسانی کائنات اور حیات کے سمجھنے اور سمجھانے میں ہی مشغول رہتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ مخصوص انداز میں کائنات اور زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ فنکار کی یہ کاوش ہوتی ہے کہ وہ کائنات اور حیات کو کلی اور حقیقی حالت میں پیش کرے لیکن حقیقتیں اتنی لامحدود ہیں کہ کبھی بھی کوئی فنکار اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور یہی ناتمامی کی خلش اسے نت نئی تخلیقات پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔

تخلیقِ فن کا جذبہ ایک محور پر رقص کرتا ہے، اس محور کا پہلا قطب ادراکی اور شعوری ہے یعنی تفہیمِ کائنات کی ارادی کوشش۔ اس محور کا دوسرا قطب جذبی اور قلبی ہے۔ فنکار کے اندر ایک لگن ہوتی ہے۔ اس کے دل میں ایک اضطراب ہوتا ہے کہ عالمِ آفاق اور عالمِ انفس کو کلی طور پر سمجھ لے اور دوسروں کو سمجھائے۔ بلکہ اس کے حوصلے اس سے بھی بلند ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی نظارۂ حیات و کائنات کرنا چاہتا ہے، ان کی معنویت اور اقدار کو پانا چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی شریکِ نظارہ کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ وہ کائنات و حیات میں حُسن کی جلوہ گری دیکھتا ہے اور ان جلووں کی گریز پائی سے مضطرب ہوتا ہے۔ سائنس اور فلسفہ میں یہ جذبی کیفیت نہیں ہوتی، وہاں صرف شعور اور ادراک کی کارفرمائی ہے۔

تخلیقِ فن کا دوسرا اہم محرک یہ ہے کہ فنکار خود اپنے کو سمجھنا چاہتا ہے — اپنے واردات کو، احساسات و جذبات کو، تاثرات و تخیلات کو، اپنی روح اور اپنے ذہن کو، اپنی نفسی پیچیدگیوں کو اور یہ عالمِ انفس عالمِ آفاق سے کم حیرت افزا نہیں ہوتا۔ آرٹ میں حیات اور کائنات کی آئینہ سامانی حقیقتاً کلی طور پر معروضی نہیں ہوتی بلکہ اس میں داخلیت کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ بغرض یہ کہ تخلیقِ فن کے محرکات کی ان دونوں جہتوں میں حیات و کائنات کی ترجمانی سے زیادہ ان کی تعبیر ہوتی ہے اور اس تعبیر میں فنکار کی انفرادیت، اس کی شخصیت، اس کا زاویۂ نگاہ، اس کی افتادِ طبع، اور اس کا مزاج بروئے کار آتے ہیں۔ اگر غور کیجئے تو ہم انسان کبھی بھی محض معروضی طور پر زندگی اور عالم کا شعور حاصل نہیں کر سکتے۔ کیا عالم اور اشیائے عالم کی کوئی مطلق قدر بھی ہے؟ اس سوال کے جواب دینے کی کوشش انسان کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ آرٹ کی دُنیا میں عالم و آدم کی تاثراتی تعبیریں ہوتی رہی ہیں۔ اور یہی وہ اندازِ تعبیر ہے جو فنونِ لطیفہ کو تخلیقی اور جاندار بناتی ہے۔ آرٹ میں معروضیت اور اجتماعیت کی حیثیت محض ثانوی ہے۔

بڑے فنکاروں کے فن میں تازگی، جدت اور زندگی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ان کے تاثرات انفرادی ہوتے ہیں۔ خارجی دُنیا کے متعلق ان کا ردِ عمل اپنا خاص ہوتا ہے اور وہ دوسروں کے ردِ عمل سے مختلف ہوتا ہے۔ ان کی داخلی دُنیا کے واردات اِن کے اپنے واردات ہوتے ہیں جو دوسروں کے واردات سے امتیاز رکھتے ہیں۔ اسی چیز کو اخلاصِ تجربہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فنکار جتنا بڑا اور جتنا مخلص ہوگا، اتنی ہی وہ تعبیرِ حیات میں منفرد بھی ہوگا۔ سچے فنکار کا خاص زاویۂ نظر ہوتا ہے۔ اور وہ اِسی مخصوص زاوئے سے حیات اور کائنات کو دیکھتا ہے اور بڑے مخلصانہ طور پر ان کی تعبیر تاثراتی رنگ میں کرتا ہے۔ فن کی تعبیرات میں منطق کا دخل نہیں ہوتا بلکہ محسوسات کا دخل ہوتا ہے۔ فن کی تعبیریں ہوتی ہیں، جیتی جاگتی دھڑکتی ہوئی۔

شاعر یا دوسرے فنکاروں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے سارے فنکارانہ تجربوں میں ربط اور ہم آہنگی پیش کرے۔ اس کے تاثرات مستقل بھی ہو سکتے ہیں اور نت نئے بھی۔ اِس تبدیلی کی دو وجہیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ خارجی دنیا بھی جامد اور ساکت نہیں ہے، بلکہ متحرک ہے۔ وقت اور زمانے کو ہر آن انقلاب ہے۔ اسی طرح فنکار کے داخلی واردات بھی ساکن نہیں ہیں بلکہ ہر آن حرکت میں رہتی ہیں

[illegible] ہے۔ جذبات بہت [illegible] ہے۔ اس [illegible] شاعر زلف
[illegible] کرتا ہے۔ پہلے مصرعے کے پہلے ٹکڑے سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ [illegible] راستے ذہن کو شاں ہے مگر وہ الجھ کر
رہ گئے ہیں [illegible] کو کوئی سلجھا نہ سکا۔ دوسرا ٹکڑا یہ ظاہر کرتا
ہے کہ [illegible] طور پر بھی ہم حسن کے جلووں کی تھاہ نہ پاسکے۔ آئینے
کی حیرانی دل انسان کی حیرانی ہے۔ آئینے کی حیرانی سے مراد خود فطرت اور
مظاہر فطرت کی حیرانی بھی ہے کیونکہ اصل تجلی ماورائے فطرت ہے۔ غور فرمایئے
کہ تغزل کے لوازم کے ساتھ شاعر نے کس طرح ایک مخصوص تجربے کو پیش کیا
ہے اور چشم و گیسو کا مرکزی خیال کس طرح پوری غزل پر چھایا ہوا ہے۔

اب ایک اور غزل لیجئے ؎

موج فنا نہ دے مٹا نام و نشاں وجود کا   دیکھ حباب کی طرح شوق نہ کر نمود کا

اس غزل میں بھی ایک مرکزی محرک ہے — بے ثباتیٔ عالم اور استغنا۔ اسی
غزل کے ایک شعر کا ایک مصرعہ ملاحظہ ہو۔

دل نے خیال اٹھا دیا اپنے زیان و سود کا

پھر ایک دوسرے شعر کا ایک مصرعہ یہ ہے ؏

مدرسۂ وجود میں صفحۂ سادہ بن کے آ

اور حاصلِ کلام ملاحظہ ہو ؎

ناز کرے جبینِ شوق طالعِ ارجمند پر   سنگِ درِ نیاز پر نقش رہا سجود کا

یعنی یہ کہ پیامِ زندگی کی عیش سامانیوں سے بے نیاز رہ کر ایک اعلیٰ نصب العین
کے حضور اپنے کو مٹا دینا ہی بے ثباتیٔ عالم میں رنگِ ثبات پیدا کرتا ہے۔
میں غزلیں منتخب نہیں کر رہا ہوں۔ یوں ہی بیچ بیچ سے غزلیں پیش کر رہا ہوں۔

ایک اور غزل ؎

کچھ کہے جاتا تھا، غرق اپنے ہی افسانے میں تھا
مرتے مرتے ہوش باقی ترے دیوانے میں تھا

اس غزل میں بھی خیال کی ایک وسطی رو چلتی ہے۔ ربودگی اور وارفتگی کی لہر
دیوانے، خود رفتگی، وحشی، بوریا، شیشہ ئے، ٹوٹے سبو، درد، داغ، اس طرز
کے الفاظ سے اس غزل کی فضا بنتی ہے۔ اس کا مرکزی تاثر یہ ہے ؎

بوریا تھا کچھ شیشہ ئے تھی یا ٹوٹے سبو   اور کیا اس کے سوا مستوں کے ویرانے میں تھا

شاعرانہ احتیاط سے بھی اس شعر میں کتنی تاثیری تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ تصویر کشی

(Picturesque imagery) پہلے مصرعے میں ابھر کر پیکر تراشی
(Concrete imagery) کی سطح پر آجاتی ہے۔ دیکھئے
"ٹوٹے سبو" کی ترکیب۔ دوسرا مصرعہ کتنا تاثراتی ہے! وہ اس سے کتنی مکمل
فضا بندی ہوتی ہے "اور کیا اس کے سوا مستوں کے ویرانے میں تھا" —
اس کے بعد جو شعر آتا ہے اس کی ہم آہنگی ملاحظہ ہو۔ تاثرات گہرے ہو کر درد و
گداز بن جاتے ہیں۔ ارسطو نے "المیہ" کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ٹریجڈی
کے ذریعے انسانی جذبات کا تزکیہ ہوتا ہے (Pergation of humane
emotion) یونانی زبان میں ایک لفظ ہے کتھارسیس (Katharsis)
غم اور اندوہ کی شدت سے جب سامعین کے دل ابھر آتے ہیں تو آنکھیں ڈبڈبا
اٹھتی ہیں اور آنسو چھلک پڑتے ہیں اور رو لینے کے بعد دل ہلکا ہو جاتا ہے۔
اس سے جذباتی سکون حاصل ہوتا ہے اور ایک روحانی مسرت کا سراغ ملتا ہے۔ غم و
درد کے اندر یہی تنقیح اور تزکیہ کا عنصر قیمتی ہے بشرطیکہ فنکار المیہ کی پیش کش اس سلیقہ
سے کرے کہ دنیائے دل میں ایک انقلاب آجائے۔ ایک غزل میں زیادہ گنجائش تو نہیں
ہوتی۔ ہم میر یا شاد کی غزلوں کو شیکسپیر کی "ٹریجڈیوں" سے تو نہیں ملا سکتے لیکن کیٹس
کے "اوڈس" سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ زیر نظر غزل کا یہ شعر ؎

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار   اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

اور مقطع ملاحظہ ہو۔ کتنا شاعرانہ اور پُر اثر ہے ؎

شاد کچھ پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ٹمٹماتا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

مقطع کے ساتھ آخری دو اشعار کو پڑھئے اور غزل کے مرکزی تاثرات میں گم ہو جایئے۔
شاد کی اکثر و بیشتر غزلیں اپنا ایک تخلیقی محرک رکھتی ہیں اور وہ تحریک،
وہ ہیج، خوبصورت اور پُر اثر استعاروں اور اسالیب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔
آپ غزل کے اندر بعض بھرتی کے شعر بھی پاسکتے ہیں۔ مگر بیشتر اشعار مرکزی محرک کے
ساتھ وابستہ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ شاد کی شاعری میں یہ بہت اہم بات ہے۔ اس سے
پتہ چلتا ہے کہ شاد محض قافیہ پیمائی کیلئے نہیں بلکہ ایک تجربہ شاعرانہ سے متاثر ہو کر غزل
لکھتے تھے اور بقول کولرج (I sing because I must)
وہ اس لئے نغمہ بار ہیں کہ ان کا محرک انھیں مجبورِ نوا بناتا ہے۔ زندگی کی ناپائداری،
رازہائے فطرت کی حیرت سامانی، قلب انسانی کی بیقراری، حسن کی تجلیاں اور عشق
کی وارفتگیاں، یہ وہ چند اہم تجربے ہیں جو شاد کی غزلوں میں مختلف زاویوں سے

پیش ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور غزل میخانۂ الہام کے اواخر سے لی
جاتی ہے۔ اس غزل کے مرکزی تجربے کے استعارے نے جو تفصیلات اختیار
کی ہیں ان کا حسن بھی قابلِ دید ہے، دیکھئے ؎

ترے مہماں ہیں جہاں بچھا، سرِ عرش و رہ دوئے زمیں سہی
مجھے بیٹھ رہنے سے کام ہے کوئی جا نہیں تو نہیں سہی
صفِ اولیں تو ہے خاص صف، وہاں پاؤں جا یہ کہاں شرف
صفِ آخریں سے بھی دور تر، جو اشارہ ہو تو وہیں سہی
نہ مٹے گی دل سے یہ آرزو کہ لگا کے آنکھوں سے چوم لوں
ترے پاؤں تک نہیں دسترس، ترے آستاں کی زمیں سہی

اور پھر یہ شعر ؎

جسے پاک رکھنے کی تھی ہوس، وہ تو تیرے در پہ پہنچ گئی
یہ جو مشتِ خاک زمیں پہ ہے، اسے پھینک آؤ کہیں سہی

شاد کا ردِ عمل اپنے اندر صوفیانہ میلان رکھتا ہے۔ میری مراد صوفیت
سے یہ ہے کہ شاد فطرت اور کائنات کے پردے کے پیچھے حسنِ مشترک کی تجلی دیکھتے
ہیں اور اس تجلی میں حسن کے جلوۂ بیقرار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی بے ثباتی
کو بڑی دردمندی سے محسوس کرتے ہیں لیکن اس درد کا درماں یہ ہے کہ تجلیٔ
حسن کے لئے دردِ عشق پیدا کیا جائے۔ یہ علاج بالمثل ہے۔ عشق صوفی کے لئے راہ
بھی ہے اور منزل بھی۔ شاد ایک ایسا صوفی ہے جو ہر وقت کھویا ہوا رہنا نہیں
چاہتا بلکہ وہ تماشائے عالم کرتا ہوا تماشائے حسن کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شاد
نے صاف صاف اس اندازِ فکر کو مربوط رنگ میں پیش کر دیا ہے بلکہ میخانۂ الہام
کے مجموعی مطالعہ سے مجھ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ شاد کا ایک مخصوص طرزِ فکر اور اندازِ
نظر ہے۔ اس کے واردات کی نیرنگیوں میں ایک والہانہ یک رنگی پائی جاتی ہے۔
شاد کی شاعری کا وسطی دھارا بہت ہی رواں اور شفاف ہے۔ شاد نے زندگی کو
خاص طرح سے سمجھنا چاہا ہے اور اس کو اپنے مخصوص شاعرانہ تعبیروں کے ساتھ
پیش کیا ہے۔ اس تعبیر میں صوفیانہ کیف و حال موجود ہے۔

درد کی صوفیانہ شاعری، آتش کی صوفیت اور اقبال اور اصغر کی صوفیت
میں فرق ہے۔ دیوانِ درد اور بالِ جبریل کی غزلوں کو سامنے رکھ کر مطالعہ
فرمائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ درد اور اقبال کی طبیعتوں کی افتاد الگ الگ ہے۔
ہم دونوں کے اندر صوفیانہ میلانات پاتے ہیں۔ درد کے یہاں یاس و حسرت کے ساتھ
سپردگی اور راضی برضا رہنے کی کیفیت ملتی ہے اور اقبال کی محبت میں سپردگی نہیں
پندار اور جوش ہے۔

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل   یہی ہے فصلِ بہاری یہی ہے بادِ مراد

اور پھر اقبال کا یہ شعر

زوالِ آدمِ خاکی، زیاں تیرا ہے یا میرا

مختصر یہ کہ صوفیانہ رنگ میں بھی الگ الگ شیڈ ہو سکتے ہیں۔ شاد کی صوفیانہ
شاعری کا بھی مزاج منفرد ہے اور یہی اس کے بڑے پن کی دلیل ہے۔

درد نے صوفیانہ نگاہ سے عالم و آدم کو دیکھا اور اس تجربے کے نتیجہ میں ان پر
واردات طاری ہوئے۔ ان واردات میں شدت ہے، غم و اندوہ کی بھی شدت
اور علاجِ غمِ دوراں کے لئے غمِ عشق اختیار کرنے کی بھی شدت۔ درد کی شاعری
میں جذبات کے عنصر بہت نمایاں ہیں بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ درد کی شاعری کو
شدتِ جذبات سے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔ بہرحال شدتِ جذبہ اور وارفتگی
کے ساتھ انتہائی دردمندی، درد کا امتیاز ہے۔ اقبال کے یہاں جذباتیت نہیں
ملتی۔ تنقید کے ساتھ جذباتیت کا گذر نہیں۔ اقبال آدم، یزداں اور عالم تینوں
پر تنقید کرتا ہے۔ اس کے باوجود اقبال کی صوفیانہ شاعری کے اندر عشق کی لہر بھی
ملتی ہے۔ اقبال کا عشق باشعور اور صاحبِ پندار ہے۔ اقبال کی صوفیانہ شاعری
میں ادراکی اور ذہنی بلندی ملتی ہے جو درد کے یہاں مفقود ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے
ہیں کہ درد کے یہاں جذبہ نمایاں عنصر ہے اور اقبال کے یہاں تخیل نمایاں حیثیت
رکھتا ہے۔ شاد نے جس طرح زندگی اور ماورائے زندگی کو دیکھا اور محسوس کیا
اس کی ترجمانی میخانۂ الہام میں ملتی ہے۔ شاد کے مزاج میں نہ تو جذباتیت ہے
اور نہ تخیل کی بے پناہ اڑان۔ شاد کے مزاج میں ٹھہراؤ ملتا ہے۔ اس کے یہاں
نہ تو درد کی شدت ہے، نہ اقبال کی رفعت اور نہ ورڈس ورتھ کا عمق لیکن
شاد کی شاعری کی متانت، صبر اور سنجیدہ روانی ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔
شاد میں شوخی اور طرحداری بھی نہیں لیکن ان کے یہاں شیرینی اور روشنی ہے۔
شاد کی شاعری میں لطافت کے ساتھ نیرنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ شاد کا [illegible]
سنجیدہ اور متوازن ردِعمل ہے کبھی یہ سنجیدگی پھیکا پن بھی پیدا کر دیتی ہے لیکن
عام طور پر شاد کی شاعری میں بڑی انسانیت ملتی ہے۔ شاد کا ردِعمل ایک [illegible]
نارمل آدمی کا ردِعمل ہے۔ اگر آرٹ میں اڑان اور نفوذ کی اہمیت ہے تو اس کے
ساتھ ساتھ کچھ رچے اور بسے رہنے کی بھی اہمیت ہے۔ شاد کی شاعری

اس شعر میں ملاحظہ ہو شاد کے پیکار تخیل کی کارفرمائی۔ ایک صوفی کس [illegible] کے رموز کو سمجھ کر لذت وصال حاصل کرتا ہے۔ اسی غزل میں بے تعلقی کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کہ بجھ کے بڑھا دست آرزو اے مست نہ میکدہ، نہ صبوحی، نہ خُم، نہ جام ترا

شاد کی متوازن طبیعت ہر پہلو پر نگاہ رکھتی ہے۔ ایک طرف اگر انسان کی خوش آمدید کے لئے چاند ستاروں کے کنول کھلے ہوئے ہیں، تو دوسری جانب وہ انتہائی طور پر بے بس و بیکس ہے۔ صبر اور قناعت کا مقام ملاحظہ ہو ؎

عطا کرے جسے تو ہے، وہ اُٹھ کے لے ساقی ادب شناس کو لازم ہے احترام ترا

شاد ادب شناس حیات ہے اور ادب شناس فن بھی۔ وہ زندگی کی اصل یوں پیش کرتا ہے ؎

وہ آہ کیا جو زباں تک نہ لائے نام ترا وہ درد کب ہے، جو دل کو نہ دے پیام ترا

شاد کی شاعری کی فنکارانہ اہمیت خاصے کی چیز ہے۔ وہ اپنے تجربوں کو شعریت عطا کرتے ہیں اور اس شعریت کا اظہار زبان و اسلوب کے حسن کے ساتھ ہوتا ہے۔ شاد کی زبان بہت رچی اور منجھی ہوئی ہے۔ ان کے رچاؤ اور معنویت کے نکھارنے میں راسخ عظیم آبادی اور انیس لکھنوی کی روایت نے بڑا حصہ لیا ہے۔ شاد کی طرز نگارش ایک الگ موضوع سخن ہے اور پھر شاد کی صناعی کا مضمون ایک تیسرے مقالے کا متقاضی۔ شاد الفاظ کا مصور ہے۔ وہ لفظوں سے پیکر تراشی اور صنم سازی بھی کرتا ہے۔ شاد کی غزلوں کا غنائی عنصر اتنا نمایاں ہے کہ وہ ہمیں مسحور کئے دیتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ شاد اپنے تہذیبی روایات کے اندر ایک بڑی تخلیقی فنکاری پیش کرتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ، ان کے نکتہ چینوں کی جھنجھلاہٹ کے باوجود شاد کو فراموش کرکے اپنی تکمیل نہیں کرسکتی۔ شاد اردو غزل کی تاریخ میں صرف سنگِ میل ہی نہیں، مینار ہدایت بھی ہیں۔

[illegible] ملتی ہے۔ شاد زندگی [illegible] کو خوب سمجھتے [illegible] رنگ و نشاط کا چمن بھی [illegible] زندگی کے عام جلووں کو دیکھتے ہوئے اس کے ماورا کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اردو کا ایک صوفی شاعر کہتا ہے ؎

چشم مست میری جبیں ہر دم دکھاتی ہے تجھے ہاتھ ہے تیری طرف ہر گیسوئے خمدار کا

[illegible] دستور ہے یعنی شاد بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں۔ ان کے لئے زندگی [illegible] نہیں مگر جائے عبرت ضرور ہے۔ میں اپنے خیال کی وضاحت کے لئے چند اشعار پیش کرکے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور اہل شوق کو دعوت مطالعہ دیتا ہوں ؎

[illegible] جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس پہ شک تیرا

ساقی کی چشم مست پہ مشکل نہیں نگاہ مشکل سنبھالنا ہے دلِ بے قرار کا

شاد نے ہمیشہ "دلِ بے قرار" کو "سنبھالنے" کی کوشش کی اور اس سعی میں شاد کی انسانیت پسندی مضمر ہے۔

دل اپنی طلب میں صادق تھا، گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا، دریا ہی میں جاکر ڈوب گیا

کچھ دکھائی نہ دیا اپنے سوا حیرت ہے کیوں میں عالم میں لئے دیدۂ بینا آیا

اسی غزل میں بڑے نیرنگ ساماں اشعار ہیں ؎

دل نے دیکھا مجھے اور میں نے فلک کو دیکھا بیچ کے ساحل پہ اگر کوئی سفینہ آیا

کنول ہیں چاند ستاروں کے جا بجا روشن شب وصال میں اللہ رے اہتمام ترا

آوارہ

ماضی کے چند اوراق الٹیے اور اس دور کا ایک سین دیکھیے جب یہ لکھنؤ اختر نگر تھا۔ چیت کا مہینہ، گنندہ بہار کا موسم۔ دن کے دس گیارہ کا عمل ہوگا۔ لکھنؤ سے کانپور جانے والی سڑک پر دور دور تک سناٹا ہے۔ البتہ قسم کھانے کے لئے ایک سوار صاحب ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ ران تلے کمیت رنگ کا یابو ہے۔ خود کلاہ پگڑی باندھے، لال بانات کی انگرکھی پہنے ہیں۔ کمر کسے، چمڑے کے پرتلے میں تلوار پڑی ہے۔ ناک نقشے سے مرد اشراف، اور وضع قطع سے سپاہی پیشہ جان پڑتے ہیں۔ پرتل کے ایک ٹٹو پر کھاروے کی بڑی سی خورجین لدی ہے، اور ٹٹو کی باگ ڈور، یابو کی دمچی میں پھندے سے اٹکی ہے۔

اچانک ربیع کے کھیتوں بیچ اور تین حضرات برآمد ہوئے۔ تیز گام بڑھے اور سوار صاحب کے قریب پہنچ گئے۔ باتوں کا سلسلہ پہلے سے جاری ہوگا۔ اب لہجہ اونچا ہوگیا۔

ایک۔ (خوشامد کرتے ہوئے) "دے دے بھائی دے دے۔ میں تیری بلا کھاتا ہوں"۔

دوسرا۔ (اسی انداز سے) "اور آج آٹھ دن سے میں جو ہات جوڑ رہا ہوں، پاؤں پڑ رہا ہوں، یہ کچھ نہیں"۔

تیسرا۔ (نرمی سے) "میں کہتا ہوں بھائی، کیوں ہات جوڑتے ہو، کیوں پاؤں پڑتے ہو۔ ایک نہیں ہزار بار کہہ چکا، لاکھ بار کہہ چکا، نہیں دوں گا، نہیں دوں گا۔ کر لو کیا کرتے ہو"۔

ایک۔ "توبہ توبہ، ہم کیا کریں گے۔ تیری چیز تیری مرضی۔ ہم تو بابا تیری منت خوشامد کرتے ہیں"۔

دوسرا۔ لے بھئی تجھی۔ ہزار روپئے لگا چکا ہوں چل سو روپئے اور سہی"۔

ایک۔ "او رُسنئے!۔ انھیں بسنت کی خبر نہیں۔ میں کل شام ہی کو پندرہ لگا چکا ہوں"۔

تیسرا۔ "کہے جاؤ، کہے جاؤ، میں دونوں کی سُن رہا ہوں، میرا کیا خرچ ہوتا ہے، تمھارا گلا ہی تھک رہا ہے"۔

دوسرا۔ (سینے پر ہات مار کر) "اور اس میں دم ہے تو یوں ہی تھکتا رہے گا۔ چلو ہٹاؤ، سولہ سو سہی۔ جھگڑا ختم کرو"۔

ایک۔ "بہت اچھے! جیسے کہ میں دو چار سو کو بیٹھا ہوں (تیسرے سے) لے مہربان مجھ سے اٹھارہ کھنا کھن گنا لو"۔

تیسرا۔ "جی اور کیا۔ ہنس ہنس کھٹے پھوہڑ کا مال۔ نیلام ہی جو ٹھہرا"۔

ایک۔ "پخ پخ! تم سمجھے نہیں بھائی۔ میں تو اس کی چوٹ پہ کہہ رہا تھا، جو کیا ہے وہاں سے بڑا دھنا سیٹھ بن کے اور بکے جا رہا ہے سولہ سو سولہ سو"

دوسرا۔ "پھر نہیں! کھرے ساہوکار کا ہے تو دکھا دے اٹھارہ پیسے ہی نکال کے۔ ہوا لیہ کہیں کا! میرا تو اس پہ زور چلتا ہے، چھٹپن کا یار ہوں۔ روپیہ چھوڑ، حق بھی کوئی چیز ہوتا ہے!"

ایک۔ "ہونہہ! تیرا زور اور حق تو سب کچھ، اور ہم کوئی نہیں؟ کیوں بانکا اور ہمارا پیڑھیوں سے ناتا جو چلا آرہا ہے وہ کچھ نہیں؟ ذیں؟ جانتا ہے میں کون ہوں؟ ارے اس کے لکڑ دادا اور میرے پرنانا کی خالہ ساس رشتے کے بھائی بہن تھے۔ آیا سمجھ میں؟ اور سن لے کہ اب اٹھارہ سو کی بجگہ پورے دو ہزار دیتا ہوں اور چھتا بھی ابھی گنے دیتا ہوں، بڑھ کہاں تک بڑھتا ہے"۔

دوسرا۔ "دیکھنا۔ میں کبھی کہ بڑھا تو آندھی پانی کی طرح بڑھوں گا" اور

کہ اس چیز کی طرح دو بھائے گا" (تیسرے سے) سو بھی لاکھ کی ایک بات' اس کا تانا نہ اپنا یارانہ (ر پیسے کی تھیلی نکال کر) گن لو' یہ ہیں پیسے دو ہزار ایک سو ننانوے پندرہ آنے پائی پائی نقد۔ ہنا ؤ جھنجھٹ' کرو سودا۔ اور نہیں تو کیا۔"

تیسرا۔ "اُنھہ۔ ہٹ جاؤ تم دونوں' تماشا میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ مجھے جو کہنا تھا وہ مرد کی ایک بات کہہ چکا۔ اب اس میں آسمان ٹوٹ کر زمین پھٹے۔ تم لوگوں کو تو یہ چیز نہ دوں گا' کبھی نہ دوں گا"

(ایک سے) "بھلا تم سوئی بیچک بیچنے والے اسکی قدر کیا جانو۔ اور (دوسرے سے) یہ تیل پھلیل کے دکندار اس کی قیمت کیا پہچانیں"

ایک۔ (زِچ ہو کر) "جاؤ نہ دو' ٹھینگے سے۔ دیکھوں گا چھین کر دو کی چوتھائی کون تھمائے دیتا ہے"

دوسرا۔ "جی اور کیا۔ میں بھی دیکھتا ہوں' وہ کون سا مائی کا لال ہے جو انھیں سونے کے سوا لاکھ ٹکے گنوا دے گا"

تیسرا۔ "جاؤ جاؤ بھئی اپنا رستہ لو۔ کہہ دیا' توڑ دوں' بہا دوں' جلا دوں اور تمھیں نہ دوں"

ان تینوں کا یہ جھگڑا سُنتے' سوار صاحب خاموش چلے جا رہے تھے پیچھے آواز سنائی دی۔ "اجی صاحب! اے میاں سوار صاحب! ایک ذرا ٹھیلی کیجیے' میری دو باتیں سُن لیجیے"

سوار۔ (گھوڑا روک کر) "کیوں میاں کیا ہے؟"

تیسرا۔ (پاس آکر) "سلامت رہیے۔ ہے کیا دو ملّا میں مرغی حرام ہو رہی ہے۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کون ہیں' کہاں سے آرہے ہیں۔ کدھر جارہے ہیں؟"

سوار۔ "کوئی نہیں بھائی پردیسی ہوں۔ سرکاری جلوسیوں میں چہرہ ہے۔ لکھنؤ سے آرہا ہوں' گنگا پار کرکے کیپو میں ٹھہروں گا' اور وہاں سے قنوج کی سڑک پکڑوں گا۔ بڑی مشکل سے پانچ چھ برس کے بعد مہینہ بھر کی چھٹی ملی ہے"

تیسرا۔ "ٹھیک۔ وہ تو میں آپ کی دھج دیکھ کر ہی بھانپ گیا کہ سپاہی آدمی ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ آپ اتنی دیر سے ان دونوں کی اور میری تُو تُو میں میں سُنتے چلے آرہے ہیں نہ؟"

سوار۔ "ہاں میاں دیر سے"

تیسرا۔ "خدا بھلا کرے آپ کا۔ رستہ تو بے شک کھوٹا ہو گا پر آپ کو اپنے بال بچوں کا واسطہ' مجھے ان گدھوں کے پنجے سے چھڑاتے جائیے' جو مجھے مردار سمجھ کر بوٹیاں نوچ کھانے پر تلے ہوئے ہیں"

سوار۔ (ایک اور دوسرے) "ارے! کیوں بھائیو کیا بات ہے؟"

ایک۔ "کیا بتائیں صاحب کچھ بھی نہیں۔ ان کے پاس ایک بڑا نایاب تحفہ ہے جسے یہ الگ کرنا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں مجھے دو اور منھ مانگے دام لو"

دوسرا۔ "اور میں کہتا ہوں مجھے دو اور دو چار ہزار اس سے بڑھ کر مجھ سے لو۔ یہ نہیں دیتے"

ایک۔ "جی ہاں' میں کہتا ہوں ایسی انمول چیز گھر کے گھر ہی میں رہے باہر نہ جائے' ان پر بھوت سوار ہے کہ دنیا تلپٹ ہو جائے مجھے نہ دیں گے"

دوسرا۔ "میں ان سے بڑھ کر دام لگاتا ہوں' یہ ہیں کہ ایک تنکے کی ہزار نہیں ہے۔

سوار۔ "بھائیو سودا تو راضی خوشی کا ہوتا ہے۔ اس میں زور زبردستی کا ہے کی۔ نہیں دیتے' جانے دو"

تیسرا۔ "آپ کے منھ میں گھی شکر۔ کیا خدا لگتی بات کہی ہے آپ نے اب پوچھیے کہ میں کیوں نہیں دیتا۔ تو بات یہ ہے کہ چیز انکے کام کی نہیں۔ ایک بساطی ہیں۔ دوسرے گندھی"

سوار۔ "بھئی دنیا سے اوپر وہ ایسی کیا چیز ہے؟"

تیسرا۔ "ٹھہریئے بتاتا ہوں۔ بُرا نہ مانیے گا ایک بات پوچھتا ہوں' دیکھیے آپ سپاہی پیشہ ہیں۔ بھلا تلوار کی جگہ میں آپکے ہات میں سارنگی دے دوں تو آپ کیا کریں گے؟"

سوار۔ (تیکھے ہو کر) "کروں گا کیا۔ تلوار سونت کر تمھارا اور مسرنگی دونوں کا سر بھٹا سا اڑا دوں گا"

تیسرا۔ "جیتے رہیے' یہ بات کہی آپ نے" (پہلے اور دوسرے سے) "سُن لیا؟ بس اب ٹھنڈے ٹھنڈے یہاں سے سدھاریئے"

پھٹ ہوگیا۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی۔"

ایک۔ "کیا مطلب؟"

تیسرا۔ "بالکل صاف۔ یعنی شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ بس اب میرا پیچھا چھوڑیے، یہاں سے نو اور دو گیارہ ہو جایئے۔"

ایک۔ "ہا! کم بخت، نصیب کے کھوٹے۔"

دوسرا۔ "واہ رے کرم کے پھوٹے۔"

یہ کہہ کر دونوں حضرات ناک بھوں چڑھائے، کھیتوں کی طرف بڑھے، اور کھیتوں ہی کھیتوں غائب ہوگئے۔

تیسرا۔ "گئے مُرچڑے! لے حضرت اب سنئے۔ آپ نے پوچھا وہ ایسی کیا انمول چیز ہے؟ دیکھئے یہ ہے۔" یہ کہہ کر بغل میں دبا ہوا ڈبا نکالا۔ اور ڈھکنا کھولا۔

سوار۔ "ارے یہ کیا؟"

تیسرا۔ (ہنس کر) "ارے غضب! سپاہی ہو کر پوچھتے ہیں آپ۔ صاحب۔ تلوار ہے تلوار۔"

سوار۔ "تلوار! یہ کیسی تلوار؟ قبضہ تو بے شک تلوار کا ہے مگر یہ پھل کیسا؟"

تیسرا۔ "اصیل ذات کا ہتیار، موم فولاد کا ہے۔"

سوار۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

تیسرا۔ "کہہ نہیں رہا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ دیکھ ہی جو لیجئے!" یہ کہہ کر قبضہ پکڑا اور ہاتھ کے ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ تلوار ڈبے سے نکالی۔"

سوار۔ "ایں۔ اوہ! بھئی سچ کہا، بے نشان قبضے میں پھل کیا ہے۔ کنڈلی مارے ناگن بیٹھی تھی، ہاتھ لگاتے ہی بپھر پڑی۔"

تیسرا۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) سنئے جناب، جھوٹ بولنا اور بری چیز کھانا برابر ہے۔ اس ناچیز کے دادا کے والد نادر شاہ بادشاہ کے مچھلی منک چیشوں میں تھے، دن رات حضوری میں رہتے تھے۔ ایک روز بادشاہ خاصہ تناول فرمائیں اور یہ کمبخت مکھیاں جھلیں۔ نہ جانے ایک قحبہ مکھی کو کیا ضد کہ بار بار آئے اور بھنبھنا کر حضور کی ناک پہ ڈیرہ جمائے۔ لاکھ لاکھ اڑائیں۔ وہ کہاں ٹلنے والی۔ اس پر آیا غصہ، مجھ کو تاؤ، کمر سے کھینچ خنجر ایک ہاتھ جو دیتے ہیں پیچ سے تو جناب مکھی کے دو پر کاٹے اور ناک تلوے جوں کی توں اپنی جگہ پہ چپکا رہا۔"

سوار۔ "ہاں میاں ہاں۔ اگلوں کے ہاتھ ایسے ہی سجے ہوئے تھے۔ سچا تانا پیٹ پہ پان کا پتا رکھوا کے پٹے سے کاٹ دیا کرتے تھے۔ مجال تھی کہ بال برابر بھی کھال پر چرکا آئے۔ ہاں میاں پھر؟"

تیسرا۔ "بس تو اس پہ خوش ہو کے بادشاہ نے اپنی کمر کی دلائتی کھول ان کے باندھ دی۔ تب سے یہ اصیل پیڑھی در پیڑھی ہمارے گھر میں چلی آرہی ہے۔"

سوار۔ "تو بھائی ایسی عجوبہ چیز کو الگ کرنا کیا معنی؟"

تیسرا۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) "سنئے۔ آج آٹھ دن ہوئے پڑا سو رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پیر مرد میرے سرہانے کھڑے کہہ رہے ہیں، "اٹھ، اور تلوار جس کی امانت ہے اسے ڈھونڈھ کے سونپ دے، ورنہ روز حشر میرا ہاتھ ہوگا اور تیرا دامن۔ آنکھ کھل گئی۔ سارا گھر خوشبو سے مہک رہا تھا۔ تب سے حیران پریشان گھوم رہا ہوں۔ نہ جانے وہ کون اللہ کا بندہ ہوگا، کب اور کہاں ملے گا۔ یہ دونوں چڑی مار مجھے لاسے پر لگا رہے تھے، اور میں دم دبائے بھاگ رہا تھا۔"

سوار۔ "چلو شکر کرو کہ پیچھا چھوٹا۔ دیکھو کس کے بھاگ جاگتے ہیں۔"

تیسرا۔ "کس کے! ارے صاحب تلوار تو اب آپ کی نذر ہوگی۔ بحق پاک کیلئے یہ ہدیہ قبول فرمایئے۔ ورنہ یہ دونوں تاک میں ہیں، مجھے مار ڈالیں گے۔"

سوار۔ "کیا کہتے ہو میاں۔ میں غریب تین کوڑی کی آبرو کا سپاہی، کیا کھا کے لے سکتا ہوں ایسی انمول چیز؟"

تیسرا۔ "کیا کروں۔ میرے کام کی بھی تو اب یہ چیز نہیں رہی۔ بزرگوں کا حکم ٹال کر جہنم میں گھر بناؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ اسکے جوہر تو دیکھئے، ہاتھ چوم لے کاری گر کے۔ دامن پہ گلزار بنا ہے کہ جنت کی بہار کا سماں کھینچا ہے۔ پھر قبضہ کا دم اور

...... پانی بھر جائے۔"

سوار۔ "...... سے سونو موتی فولاد کی تعریف سنی ہے۔"

تیسرا۔ "آپ آنکھوں سے دیکھئے، بیٹھی ہے تو چلئے بیٹھی ہے۔ قبضے کو ہات لگا نہیں کہ ...... ہائے آسانی تڑپی نہیں۔ بجلی ہے کہ چمکی اور گری تو سر کو تراشتی، گردن کاٹتی، سینہ چیرتی زمین پر، اور اب جو دیکھا تو زمین کو چوم رہی تھی، دشمن کے دو پرکالے ایک اِدھر گرا، ایک اُدھر گرا۔ اور خون چاٹ کر جو پلٹی تو پھر کمر کی کمر میں۔"

سوار۔ "بابا، یہ سب ایمان کی برابر، مگر اتنے دام دھڑے کہاں سے لاؤں۔ میرے پاس تو اس کی رونمائی کو بھی کچھ نہیں، یہ تو جہاں پناہ کی کمر کو زیب دیتی ہے۔ میرے پاس کچھ روپیہ تھا چھاونی سے چلتے وقت اس کی ہنڈی کرا چکا۔ اب یہ دو راس ٹٹو ہیں اور رستے کے خرچ پانی کے لئے ہمیانی میں پانچ چھ روپے۔"

تیسرا۔ "آپ بھی غضب کرتے ہیں، نذر کے دام ہوا کرتے ہیں کہیں۔ ہاں اپنی یادگار کے طور پر آپ کچھ بخش دیں، اس کی اور بات۔"

سوار۔ "ارے ہاں میاں، بازو پر چار تولے سونے کا کڑا ہے، وہ بھلا..."

تیسرا۔ "بس بس نشانی کے لئے یہی بہت ہے۔"

سوار۔ "تم رضامند ہو تو لے لو۔ حاضر ہے۔"

تیسرا۔ (کڑا لے کر ڈبہ دیتے ہوئے سسکیاں بھر کے) "لیجئے" "کیا یاد کیجئے گا۔ آج باپ دادا کی آبرو آپ کی نذر کر دی۔ اب آپ جانیں اور یہ اصیل۔ مجھے اجازت دیجئے!"

اس لین دین کے بعد دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ ایک کھیتوں کی بہار میں۔ دوسرا سڑک کی گرد و غبار میں۔

سپاہی صاحب خیر سلّا سے گھر پہنچ گئے۔ مدتوں کے بچھڑے ملے تھے، دلھن نے خوش آمدید کہی۔ اعزا، اقربا سے گھر بھر گیا۔ ڈومنیاں آئیں اور مبارک بادی کی تانوں سے گرد و پیش کی فضا مترنم ہو گئی۔ آپ بھی سنئے!

ایک وے بدھاوا کہیو آئے لالنا
ستا پانی نتھارو
رانی جون اتارو
دیا چوکھ بارو، وارو، آئے لالنا

ڈھولک کی گرگڑیوں میں کہاروں نے دروازے پہ ڈولی اتاری۔
اور گھر کی نند ہنستی کھلکھلاتی داخل ہوئیں۔"

نند۔ (آتے ہوئے) "مبارک بھابی۔ اصل خیر سے اللہ نے شوہر دکھائے۔"

بھاوج۔ "ہاں بہن تمہیں بھی سلامت۔"

تیسری بولیں۔ "برسوں کے بعد خالو جان کو دیکھا۔"

چوتھی بی بی نے کہا۔ "ہاں بوا، خدا ایسے ہی سب کے بچھڑے ملائے۔"

نند۔ "ہیں کہاں، تیل ماش کے سوپ کو ہات لگا دیتے۔"

بھاوج۔ "وہاں کوٹھڑی میں بھائی صاحب سے باتیں کر رہے ہیں گھر میں قدم رکھا۔ خیر نہ خیر سلّا۔ بولے نہ چالے، چراغ لے کے اندر چلے گئے۔ نہ جانے دونوں میں کیا کھاسُنی ہو رہی ہے۔"

آیئے دیکھیں تو سہی کوٹھڑی میں کیا ہو رہا ہے، دو حضرات باتیں کر رہے ہیں۔ ایک ہماری داستان کے ہیرو ہیں۔ دوسرے ان کے رشتے کے ایک بھائی۔

بھائی۔ "تو یہ ہوا بھائی صاحب۔ پر دکھایئے تو سہی کیا چیز ملی ہے کوڑیوں کے مول؟"

سوار۔ "تو دیکھو۔" یہ کہہ کر کمر میں کسا ہوا ڈبہ نکالا۔ اور تلوار نکالی۔

بھائی۔ (الٹ پلٹ کر) "واہ واہ کیا چیز ملی ہے۔ بھئی بڑے دھنی ہو تم قسمت کے۔ چار تولے سونا تو اس کی دکھائی کا مول ہے۔ نچھاور کیا اس پر۔ اور دیکھئے یہ آپ کی ناگن لپٹتے لپٹتے ٹوٹتی بھی ہے تو یوں۔ یہ لیجئے اپیلا، اور یہ رہا گھاٹ، اور یہ گئی کھٹی۔"

اب جو دیکھا تو موتی فولاد کی اصیل ٹکڑے ٹکڑے زمین پر بکھری پڑی تھی۔ سوار صاحب دم بخود آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔

سوار۔ "ارے ارے یہ کیا۔ ہائے ہائے یہ تو قبضہ ہی قبضہ ہات میں رہ گیا۔"

بھائی۔ "جی، وہ بھی نہ رہے گا۔" یہ کہہ کر چوکھٹ پر کھٹ سے مارا۔ "مٹی کا کھلونا تھا، چور چور ہو گیا!"

غزل

سراج لکھنوی

جو غنچہ چپ لگا تھا وہیں مسکرا دیا
تم نے تو ہر قدم پہ اُجالا بچھا دیا

جینے کا اس نظر نے سلیقہ سکھا دیا
مجھ کو مری حیات کا جلوا دکھا دیا

ہر غم کو میں نے آہ جو دوزخ سے کم نہ تھا
تیری خوشی خرید کے جنت بنا دیا

شائستگیٔ عشق کے قربان جائیے
دنیا کی ہر خوشی کو غمِ دل بنا دیا

اے دوست شکریہ ترے حسنِ سلوک کا
جب دل ہی توڑنا تھا تو کیوں آسرا دیا

معصوم ہر خطا مری، ہے عیب ہر قصور
کس نے گناہگارِ محبت بنا دیا

پلکوں پہ میری دیکھ کے آنسوؤں کے کچھ دیئے
اس نے بھی اک چراغِ تبسم جلا دیا

یہ بات اور ہے ہمیں خود نیند آ گئی
افسانہ ہم نے سوتے ہوؤں کو جگا دیا

حسنِ پسِ حجاب کی شوخی تو دیکھیے
ہر دل میں اک چراغِ تمنا جلا دیا

نیرنگیٔ ثباتِ غمِ عشق دیکھیے
ہر ہر گھڑی کو ایک زمانہ بنا دیا

جب سامنا ہوا تو یونہی سامنا ہوا
ہم رو دیے سراج کوئی مسکرا دیا

ہمایوں کے دربار کی مصوری اور صناعی کے کچھ نایاب شاہکار

سیّد اطہر عبّاس رضوی

ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ علوم و فنون، صنعت و حرفت، مصوری، نقاشی، غرض کہ تہذیب تمدن کے سبھی گوشوں کی سرپرستی کے لئے مشہور ہیں۔ ان میں سے کئی بادشاہوں نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود خود بھی اعلیٰ درجہ کی تصنیفیں چھوڑی ہیں اور شاہزادوں اور اُن کے درباریوں نے بھی علم و ادب کی بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ یہاں تک کہ شہزادیاں اور حرم کی چہار دیواری میں رہنے والی خواتین بھی کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ سوانح نگاری میں بابر کی تُوزک آج تک عدیم المثال سمجھی جاتی ہے۔ گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ اپنی نوعیت کی ایک عجیب غریب تصنیف ہے۔ ہمایوں کو ریاضی و نجوم کے علاوہ مصوری اور صناعی سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ تاج و تخت سے محروم ہو جانے کے بعد صحرا نوردی کے عالم میں بھی قدرت کی بے پناہ دلکشی اُسے اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ جس وقت وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر سنہ ۱۵۴۲ء میں (اکبر کی پیدائش کے قبل) امرکوٹ کے قلعہ میں ٹھہرا ہوا تھا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے پاس غالباً زیادہ کپڑے بھی نہ رہ گئے تھے۔ اُس کا آفتابچی جوہر لکھتا ہے کہ "حضرت بادشاہ اپنے کپڑے دُھلنے کے لئے دے کر حمام کے کپڑے پہنے ہوئے ایک خیمہ میں بیٹھے تھے کہ ایک عجیب غریب پرند اُڑ کر خیمہ میں پہنچ گیا۔ بادشاہ نے خود کھڑے ہو کر خیمہ کے دروازے بند کر لئے اور اُس پرند کو پکڑ لیا۔ قینچی منگوا کر اس کے پر کاٹے اور مصور کو بلوا کر کہا کہ اس جانور کی کاغذ پر تصویر بنا کر اُسے جنگل میں چھوڑ دو۔"[1]

اس قصہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس پریشانی کے عالم میں بھی جو تھوڑے سے ساتھی اُس کے ساتھ رہ گئے تھے ان میں مصور بھی شامل تھے اور بادشاہ کی نگاہیں فطرت کی دل آویزیوں کا اس عالم میں بھی مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ ایران میں بھی مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے اُس کی نظریں عالموں، مصوروں اور صناعوں کو ہی ڈھونڈھتی رہتی تھیں۔ شوال سنہ ۹۵۹ھ (ستمبر اکتوبر سنہ ۱۵۵۲ء) میں "سیادت مآب فضیلت ایاب نادر العصر" میر سید علی مصور اور "فضائل مآب فرید الدہر" مولانا عبد الصمد[2] مصور شیریں قلم ہمایوں کے بلانے پر کابل پہنچے[3]۔ ملا فخر مجلد بغیر بلائے ہی اُن کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ ایران میں علوم و فنون کی سرپرستی کے فقدان کی وجہ سے کچھ ایرانی خود کابل میں آکر ہمایوں سے مل گئے تھے۔ ملا دوست جو اپنے عہد کا مانی سمجھا جاتا تھا بغیر شراب کے ایک لمحہ بھی نہ رہ سکتا تھا۔ شاہ طہماسپ صفوی کے شراب سے توبہ کر لینے کی وجہ سے اُس کا ایران کے دربار میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ پہلے ہی سے کابل میں مرزا کامران کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ملا دوست نہایت کامیاب مصوّر اور بڑا ماہر فن تھا اور اُس عہد کے تمام بلند پایہ مصور اُس

---

[1] تذکرۃ الواقعات مصنفہ جوہر آفتابچی۔ یہ اہم کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن پروفیسر شعبۂ تاریخ علی گڑھ یونیورسٹی اس کو ایڈٹ کر کے شائع کر رہے ہیں۔ اس کا ہندی ترجمہ میری ہندی تالیف "مغل کالین بھارت حصہ دوم" میں شائع ہو رہا ہے۔ مندرجہ بالا واقعہ ڈاکٹر نورالحسن کی مرتبہ کتاب کے صفحہ ۵۶ پر ہے۔

[2] عبد الصمد اور ہمایوں سے تبریز میں سنہ ۹۵۱ھ (۱۵۴۴-۴۵ء) میں ملاقات ہو گئی تھی۔

[3] ابوالفضل کے اکبرنامہ کی جلد اول سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ سنہ ۹۵۶ھ (۱۵۴۹ء) کے آخر یا سنہ ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) کے شروع میں کابل پہنچے۔ اکبرنامہ جلد اول۔ کلکتہ ۱۸۷۳ء صفحہ ۲۹۲

بات پر متفق تھے کہ ملا دوست پہاڑوں اور درختوں کی تصویر آئی سے بخوبی بناتا ہے۔ ملا دوست کی مصوری کے شاہکار اُس کی وہ تصویریں ہیں جو اُس نے چاول اور خشخاش کے دانوں پر تیار کئے تھے۔

بایزید بیات نے تذکرہ ہمایوں و اکبر میں لکھا ہے کہ ملا فخر نے ایک چاول پر ایک سوار کی تصویر بنائی تھی جو اپنے ہاتھ میں ایک پرندہ لئے ہوئے تھا اور اُس کے گھوڑے کی زین کے سامنے ایک طبل باز تھا۔[1] چاول پر مصوری کے اس سے بھی حیرت انگیز نمونے ہمایوں نے قاشغر کے بادشاہ نواب رشید خان کو تحفتاً بھیجے تھے۔ ان تحفوں میں میر سید علی کا ایک شاہکار بھی تھا جس میں اس نے ایک چاول پر چوگان بازی کا میدان دکھایا تھا۔ اس میدان میں ایک طرف سے ایک سوار گھوڑا دوڑاتے ہوئے آتا دکھلایا گیا تھا اور ایک سرے پر دوسرا سوار کھڑا ہوا دکھایا گیا تھا جس کے ہاتھ میں ایک پیادہ چوگان دے رہا تھا۔ چاول کے ہر سرے پر چوگان کے گول کے دو کھمبے تھے اور اسکے ہر کونے پر مندرجہ ذیل بیت لکھی تھی

درزدن دانۂ مدخرمن آمد ‏ ‏ ‏ ‏ جہانے در دل یک ارزن آمد

نیچے "العبد سید علی فی شہر رجب ۹۵۹ھ" لکھا تھا۔[2]

مولانا عبدالصمد مصور شیریں قلم کا شاہکار تمام دوسرے شاہکاروں سے بازی لے گیا تھا۔ اس نے ایک چاول پر ایک بڑا لمبا چوڑا میدان دکھلایا تھا جس میں بہت سے لوگ چوگان کھیلتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ چوگان کے گول کے دو کھمبے ایک طرف اور دو کھمبے دوسری طرف تھے۔ سات سوار چوگان کھیلتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ سواروں کے پیچھے پیادوں کے سر دکھائی دے رہے تھے۔ جو سواروں کے ہاتھ میں چوگان دیتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ میدان کے درمیان میں قبق کی لکڑیاں تھیں۔ ایک دوسرے چاول پر اُس نے ایک بڑا نفیس اور بہت بڑا کمرہ بنایا تھا۔ کمرے کے اندر دو آدمیوں کی تصویریں بنائی تھیں۔ یہ دونوں جو ایک حوض کی طرف دکھائے گئے تھے اُن کے سامنے ایک ایک انگیٹھی تھی جن پر وہ ایک ایک پرند بھون رہے تھے۔ کمرے کے پیچھے چار آدمی کھڑے ہوئے اور دو بیٹھے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ اوپر ان طرف ایک باہر جانے کا دروازہ اور کوٹھے کے چکر میں ایک اندر آنے کا دروازہ تھا۔ حوض کے اندر ایک نارنج بھی دکھایا گیا تھا۔ مولانا عبدالصمد کا ایک اور شاہکار جو نواب رشید خاں کو بھیجا گیا تھا خشخاش کا ایک دانہ تھا جس پر ایک سوار کی تصویر بنائی گئی تھی۔[2]

صناعی کے کچھ دیگر دلچسپ نمونوں کا بھی ذکر بایزید نے کیا ہے ان میں ملا فخر کی صنعت کا یہ حیرت انگیز شاہکار ہے کہ اُس نے ایک خشخاش کے دانہ میں ۲۵ سوراخ کئے اور ان تمام سوراخوں میں سے چاندی کے تار اس طرح پرو کر نکالے کہ لوگ اُس دانے کو دیکھ کر چاندی کے تار کو الگ الگ گن لیتے تھے سونے اور چاندی کے تار تیار کرنے میں استاد وسیں زرکش کو بڑا کمال حاصل تھا۔ یہ اُسی کے سونے چاندی کے تار تھے جنھیں ملا فخر نے خشخاش کے دانہ کے ۲۵ سوراخوں میں پرو دیا تھا۔[3]

افسوس ہے کہ صناعی اور مصوری کے ان حیرت انگیز شاہکاروں میں سے کوئی شاہکار اب نہیں ملتا۔ انقلابات زمانہ اور موسم کی تباہ کاریوں نے نہ جانے کب اُنھیں ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین لیا اور اب اُن کا ذکر ہی تاریخ کی زینت بن سکتا ہے

---

[1] تذکرہ ہمایوں و اکبر مصنفہ بایزید بیات (طبع کلکتہ ۱۹۴۱ء) صفحہ ۶۶۔ بایزید بیات ... کے صرف ایک ہی نسخہ کا پتہ چل سکا ہے جو انڈیا آفس (کامن ویلتھ ریلیشنز آفس) لندن میں ہے ...

[2] تذکرہ ہمایوں و اکبر مصنفہ بایزید صفحہ ۶۸۔۶۹

[3] تذکرہ ہمایوں ...

مادام کاما

حامد اللہ افسر

[illegible] سے ملک میں جن لوگوں نے آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لیا اور طرح طرح کی قربانیاں کیں [illegible] ت میں مادام کاما کا نام سنہرے حروف سے لکھا جانا چاہئے تھا مگر حیرت ہے کہ ہمارے اکثر تعلیم یافتہ حضرات بھی ہندوستان کی [illegible] ن کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ مادام کاما وہ ہندوستانی خاتون تھیں جنہوں نے سب سے پہلے ہمارے قومی جھنڈے کی ایک غیر ملک میں ۱۸ اگست سنہ ۱۹۰۸ء کو پرچم کشائی کی۔ اُن کی پُرآشوب اور طوفان خیز زندگی، اُن کی انقلاب پسند روش، ان کی ادبیت وہ جلاوطنی اور اُن کی قربانیاں ان سب چیزوں کی داستان بڑی ہیجان خیز اور جوش انگیز ہے۔

مادام کاما بمبئی میں پیدا ہوئیں وہ ایک پارسی خاندان کی چشم و چراغ تھیں اُن کے والد سہراب جی فرام جی پٹیل بمبئی کے مشہور تاجر تھے۔ انھوں نے اپنی پیاری بچی "بھیکھو" کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور اپنے مقدور بھر اُس کے لئے تمام عیش و آرام کی چیزیں مہیا کی تھیں مگر نو عمری کے زمانے ہی میں بھیکھو کو غریبوں کی خدمت کرنے میں جتنی دل چسپی تھی اُتنی اور کسی چیز میں نہ تھی اور اس وقت بھی اُن کا زیادہ وقت عورتوں کی معاشرتی اصلاح کے لئے وقف تھا۔

جب سنہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تو بھیکھو پر بھی اس کا بڑا اثر پڑا اور قومی [illegible] اور قومی آزادی کے خیالات اُن کے دل میں موجیں مارنے لگے۔ افسوس یہ ہے کہ وہ اپنی مصروف زندگی اور کثیر الانواع سرگرمیوں کی وجہ سے اپنے امارت پسند خاوند کو خوش نہ رکھ سکیں اور دونوں میں نباہ نہ ہو سکا۔ اُن کے خاوند کا نام رستم کاما تھا وہ مشہور ماہر علوم مشرقی مسٹر کے، آر کاما کے فرزند تھے۔

مادام کاما خدمتِ خلق کو ذاتی آرام و آسائش پر ترجیح دیتی تھیں اور اس مقصد کے لئے وہ گھر گھر جاتی تھیں۔ وہ بہت نحیف و نزار تھیں اور یہ کام بڑی جاں فشانی، جفاکشی اور محنت کا تھا۔ اُن کا کمزور جسم اس کا بار برداشت نہ کر سکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار پڑ گئیں۔ جب یہاں خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا تو علاج کے لئے انھیں لندن جانا پڑا۔ کیا خبر تھی کہ وہ محض علاج کے لئے یہ سفر نہیں کر رہی ہیں بلکہ ۳۵ سال کی طویل مدت تک انھیں جلاوطنی کی تلخ زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

انگلستان پہنچ کر ان کا آپریشن کیا گیا، ابھی پورے طور پر آرام نہیں ہوا تھا کہ اُن کی ملاقات سری کرشن ورما اور ویرساورکر سے ہوئی۔ یہ دونوں بڑے کارآزمودہ اور انتہا پسند انقلابی تھے۔ ان لوگوں سے ربط ضبط پیدا ہوتے ہی وطن کی محبت کا شعلہ پھر مادام موصوفہ کے دل میں بھڑک اٹھا اور اس کو آزاد کرانے کی لگن بڑے جوش کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ صحت حاصل ہوتے ہی مادام کاما نے لندن کے ہائیڈ پارک میں قریب قریب روزانہ ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کے خلاف پرجوش اور پُراثر تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہاں کی پبلک ہندوستان میں انگریزی راج کے مظالم اور لوٹ کھسوٹ کے واقعات بڑی حیرت اور تعجب سے سنتی تھی اور بعض اوقات تو سننے والوں کے دلوں میں اپنے ہم قوموں کی حیاسوز حرکتوں کے خلاف اچھی خاصی برہمی پیدا ہو جاتی تھی۔

انڈیا ہاؤس کے ضابطہ پرست حکام بھلا یہ کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ پہلے تو انھوں نے ڈرا دھمکا کر کام نکالنا چاہا مگر جب اس کا کوئی اثر نہ دیکھا تو مادام موصوفہ کو اپنے ملک سے نکل جانے کا حکم دیا، چنانچہ وہ فرانس چلی گئیں۔ پیرس میں مادام کاما نے ایک بورڈنگ ہاؤس میں کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اس کمرے میں وہ لگاتار تیس سال تک رہیں اور وہ کمرہ یورپ میں ہندوستانی انقلابی تحریکوں کا مرکز بن گیا اور ہردیال، ساورکر، ایم، پی، ٹی اچاریہ

اور یورپ میں چھپا رہا، یہ سب مشہور انقلاب پسند لیڈر یہاں مشورہ دینے کے لیے جمع ہونے لگے۔

یورپ کے سب حصوں سے مشہور انقلاب پسند، سیاسی جلاوطن اور آزادی کے علمبردار مادام کاما سے مشورے اور امداد کے لئے ان کے پاس آتے تھے اور مادام موصوفہ اُن سے اپنے قریب ترین عزیزوں کی طرح پیش آتیں، اُن کے قیام و طعام کا انتظام کرتیں، ان کے لئے لباس مہیا کرتیں، انہیں روپیہ دیتیں، ان کو پاسپورٹ دلاتیں اور ان کے پیرس میں چھپ چھپ کر آنے اور اسی طرح پیرس سے جانے کا انتظام کرتیں۔ مختلف انجمنیں اور سیاسی ادارے انہیں تقریریں کرنے کی دعوتیں دیتے رہتے تھے۔ وہ یورپ کے مختلف ملکوں میں جاتی رہتی تھیں اور آزادی اور مساوات کا پیغام لوگوں تک پہنچاتی تھیں۔

ادھر برطانیہ برابر خفیہ طریقے سے اُن کی تمام سرگرمیوں کا حال معلوم کر رہا تھا۔ پہلے تو اُس نے مادام موصوفہ کے ہندوستان میں داخلے پر پابندی لگائی۔ اس کے بعد جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ نے فرانس کو مجبور کیا کہ وہ مادام کاما کو گرفتار کرے۔ چنانچہ فرانسیسی پولیس نے انھیں گرفتار کر کے پیرس کے مضافات میں ایک قلعہ کے اندر نظربند کر دیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب انھیں رہا کیا گیا تو مسلسل بیمار رہنے کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ اوّل تو وہ تھیں ہی دھان پان، بیماری نے اور نحیف و زار کر دیا مگر اُن کی روح اب بھی مغلوب نہیں ہوئی تھی۔ قیدِ بند سے رہائی پاتے ہی سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ چند روسی انقلاب پسندوں کو اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ ہندوستانی انقلاب پسندوں کو بم بنانا سکھا دیں۔

مشہور انقلابی شری ایم، پی، ٹی اچاریہ دو مرتبہ مادام کاما سے اُن کے بورڈنگ ہاؤس والے کمرے میں ملے۔ اچاریہ جی کا بیان ہے کہ "وہ مجھ سے دونوں مرتبہ بڑی محبت سے پیش آئیں اور ہندوستان کے حالات خاص طور پر تحریک آزادی کی ترقی کے متعلق سب باتیں بہت کُرید کُرید کر پوچھیں۔ وہ ہندوستانی کھانوں کے لئے ترس رہی تھیں، ہرین چٹوپادھیا جی جو اکثر مادام موصوفہ کے پاس جاتے رہتے تھے کہتے ہیں کہ "وہ مجھ سے ہمیشہ ہندوستانی میں باتیں کرتی تھیں اور مجھے بیٹا

کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ اسی طرح وہ سب نوجوان ہندوستانیوں کو بیٹا کہہ کر پکارتی تھیں۔ یہ سوچ کر میرا دل جذبات سے لبریز ہو جاتا تھا کہ خدا نے مجھے کیسی بلند خیال اور انسان دوست مشفق ماں عطا کی ہے۔"

یہ تجویز پہلی مرتبہ مادام کاما ہی کے ذہن میں آئی کہ ہمارا ایک قومی جھنڈا ہونا چاہیئے۔ یہ جھنڈا ہمارے دلوں میں جوش پیدا کرے گا اور ہم سب متحد ہو کر اُس کے سایہ میں آجائیں گے۔ صرف یہی ایک بات ہمارے دلوں میں اُن کی یاد تازہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں مشہور فرانسیسی سوشلسٹ جین جورس نے مادام کاما کو دعوت دی کہ وہ اسٹٹ گارٹ (جرمنی) میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی سوشلسٹ کانفرنس میں تشریف لا کر ہندوستان کی نمائندگی کریں۔ وہ اس کانفرنس میں شریک ہوئیں اور نہایت پر جوش تقریر کی جس میں ساری دنیا سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی حمایت کرے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ہندوستان میں برطانوی راج کے مظالم کی نہایت زوردار الفاظ میں مذمت کی۔ اسٹٹ گارٹ ہی میں جب انہوں نے ہندوستان کے سب سے پہلے قومی جھنڈے کی ۱۸ اگست ۱۹۰۸ء کو پرچم کشائی کی تو تعریف و توصیف اور اظہار مسرت کے نعروں سے ساری فضا گونج اٹھی جس جھنڈے کی پرچم کشائی انہوں نے کی تھی وہ بھی ترنگا جھنڈا تھا۔ سبز، زعفرانی اور سُرخ یہ تین رنگ اُس میں تھے۔ آٹھ کنول کے پھول سبز پٹی پر کڑھے ہوئے تھے۔ زعفرانی پٹی پر ہندی میں "بندے ماترم" لکھا ہوا تھا اور سُرخ پٹی پر سورج اور چاند بنے ہوئے تھے جو گویا ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔

عجیب قسم کے جذبات کی ایک پُر جوش لہر دل میں پیدا ہونے لگتی ہے جب ہم تصور کی آنکھ سے ایک دُبلی پتلی عورت کو جو ساری اور بلاؤز پہنے ہوئے ہے ایک غیر ملک میں بے خوف و خطر بڑے فخر و ناز کے ساتھ اپنا قومی جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھتے ہیں اور جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی اور پنڈت نہرو کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا تو مادام کاما کی عظمت کا صحیح طور پر ہمیں احساس ہوتا ہے۔

مادام کاما، لگاتار پینتیس ۳۵ برس تک پیرس میں بیٹھی ہوئی، عزیز وطن کی تحریک آزادی میں روح پھونکتی رہیں۔ پیرس سے انہوں نے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کا نام "بندے ماترم" تھا۔

مادام کاما برطانوی پاسپورٹ پر ہندوستان آنا نہیں چاہتی تھیں۔ ایک دفعہ انھوں نے ہری چند پادھیا جی سے کہا تھا "لوگ کہتے ہیں تم ہندوستان کیوں نہیں جاتیں؟ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اُن ہندوستانیوں کے دل میں جو بیرونی ملکوں میں رہ کر کام کر رہے ہیں اپنے وطن کی فضا اور طرز زندگی کی کوئی لگن باقی نہیں رہتی۔ یہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔ شاید ہی کسی قوم کے افراد کے دل میں اپنے وطن کی اتنی محبت ہو جتنی ہندوستانیوں کے دل میں اپنے وطن کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں برطانوی پاسپورٹ پر ہندوستان جانا پسند نہیں کرتی۔ ایک غیر ملکی پروانۂ راہداری لے کر خود اپنے ملک کو جاؤں، یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ جب میرا ملک آزاد ہو جائے گا تب ہندوستان کے پاسپورٹ پر میں ہندوستان جاؤں گی۔"

مگر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اب مادام کاما کا بڑھاپا تھا، نحیف و کمزور وہ ہمیشہ کی تھیں، جلاوطنی کی زندگی میں صحت بہت خراب ہوگئی۔ ادھر ہندوستان سے خریدو تار برابر آ رہے تھے۔ مجبور ہو کر انھوں نے ہندوستان جانے کا ارادہ کر ہی لیا مگر برطانوی حکومت نے کہا کہ ہم صرف اس شرط پر پاسپورٹ دے سکتے ہیں کہ آپ ہمیں یہ تحریر دیں کہ وہاں جا کر آپ کوئی تقریر نہیں کریں گی۔ دوست احباب کے سمجھانے بجھانے پر یہ تحریر بھی انھوں نے دے دی اور ہندوستان واپس آ گئیں مگر یہاں وہ زندہ رہنے کے لئے نہیں بلکہ مرنے کے لئے آئیں۔

بمبئی میں جہاز سے اترتے ہی وہ پارسی جنرل ہسپتال میں داخل ہو گئیں۔ جہاں آٹھ مہینے بیمار رہنے کے بعد ۱۶ اگست ۱۹۳۶ء کو اس بہادر محب وطن خاتون کا انتقال ہو گیا اس طرح کہ کسی کو خبر تک بھی تو نہ ہوئی کہ آج ایک ایسی ہستی ہم سے چھن رہی ہے جس کا بدل ہمیں کبھی نہیں مل سکے گا۔

تعجب یہ ہے کہ اس بے لوث خدمت گزار خاتون کی آج تک کوئی یادگار قائم نہیں ہوئی۔ پیرس کے "پیرے لاشیز" قبرستان میں تھوڑی سی جگہ انھوں نے اپنی قبر کے لئے محفوظ کر لی تھی، اُن کے فرانسیسی مداحوں نے اُس جگہ ایک کتبہ لگا دیا ہے جس پر یہ الفاظ منقوش ہیں: "ظلم و استبداد کی مزاحمت خدا کی اطاعت و فرماں برداری ہے۔"

✡

چلمنہ

(بہ سلسلہ صفحہ ۲۴)

سوار۔ "مار ڈالا ہائے ہائے میں نے ...."

بھائی: "چکمہ کھایا اور بہت خوبصورتی سے کھایا۔"

یہ من گھڑت نہیں، واقعہ ہے۔ سوار صاحب راقم الحروف کے نانا ہوتے تھے۔ گورے میاں کہلاتے تھے۔ میں نے لڑکپن میں ان کو دیکھا تھا۔ اگر بھول نہیں رہا تو شاید حضرت کے وصال کو ساٹھ ایک برس ہوئے ہوں گے۔ ان کے بڑے بیٹے آج بھی بقید حیات ہیں۔ ہنسی ہنسی میں یہ واقعہ ان سے پوچھئے تو کانپتے ہاتوں سے لاٹھی لے کر مارنے کو تیار ہوتے ہیں۔

مثنوی سراپا سوز

ذوالحسن ہاشمی

لکھنؤ کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی کاوشیں ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکی ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی سراپا سوز بھی ہے جو قاضی محمد صادق خاں اختر کی تصنیف کردہ ہے۔ قاضی صاحب موصوف ہگلی (بنگال) کے رہنے والے تھے۔ باپ کا نام قاضی لعل محمد تھا۔ وطن چھوڑ کر لکھنؤ آبسے تھے۔ چونکہ فارسی کا ذوق بہت تھا اس لئے یہاں آکر مرزا محمد حسن قتیل کے شاگرد ہوگئے تھے۔ یہاں مرزا صاحب موصوف کا فارسی انشا پردازی میں طوطی بول رہا تھا۔ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ مرزا حاجی یہاں کے ایک رئیس زادہ کی وساطت سے قاضی محمد صادق اختر دربار میں پہنچ گئے اور غازی الدین حیدر نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب مرحمت فرمایا۔ اس زمانے میں مصحفی، جرأت، انشا وغیرہ کا دور آخر تھا۔ ناسخ میدان میں آچکے تھے۔ ان سب کے ساتھ مشاعروں میں اختر بھی شرکت کرتے تھے۔ ان کا وہ قطعہ آج بھی بہت مشہور ہے جس کے شروع کے دو شعر یہ ہیں :-

کل بن کے شیخ مجتہد العصر ساقیا دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا
کہنے لگا ز راہ تمسخر مجھے بہ طنز معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

قاضی صاحب موصوف نے متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں سے زیادہ تر فارسی میں ہیں۔ غالباً ان کا سب سے اہم کارنامہ ان کا مرتب کردہ تذکرہ آفتاب عالمتاب (فارسی) ہے جس میں چار ہزار دو سو چھ سو فارسی شعرا کا حال اور انتخاب کلام فراہم کیا ہے۔ یہ تذکرہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں :-

۱۔ مجالس حیدریہ۔ غازی الدین حیدر کی تعریف میں ہے۔
تحفۂ ہشت بہشت۔ اس میں لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین کی ملاقات کا ذکر ہے جو ۱۸۱۴ء میں ہوئی تھی۔
۲۔ صبح صادق۔ یہ خود نوشت سوانح عمری ہے۔
۴۔ لوامع النور فی مجموعۃ المنثور۔ فارسی انشا پردازی
۵۔ نور الانشا۔ ۶۔ گنجینۂ دل ۷۔ بہار بے خزاں
۸۔ بہار اقبال۔ ۹۔ هفت زنجیر ۱۰۔ دیوان فارسی
۱۱۔ دیوان ریختہ۔ ۱۲۔ مثنوی سراپا سوز۔

غرض اختر ایک جامع کمالات اور اپنے زمانے میں لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں سے تھے۔ تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ "مشہور ہے کہ واجد علی شاہ نے ان کا تخلص ان سے مانگ لیا تھا اور اس کے صلے میں بہت کچھ انعام و اکرام دیا تھا۔ تھوڑے عرصہ میں واجد علی شاہ ان سے ناراض ہوگئے جس کی وجہ سے انھیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور ۱۸۵۰ء کے تحصیلدار ہوگئے جہاں ۱۸۵۵ء میں انتقال کیا"۔ لیکن تذکرۂ گل رعنا اور خمخانۂ جاوید میں ہے کہ لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔

مثنوی سراپا سوز کے متعلق تاریخ ادب اردو کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ فارسی میں ہوگی لیکن اب دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اردو میں ہے البتہ اس کے مختلف عنوانات فارسی میں ہیں۔ اس مثنوی میں تقریباً ساڑھے چھ سو اشعار ہیں۔ شروع میں عشق صادق کے موضوع پر کوئی اسّی شعر کا ایک دیباچہ ہے جس کا نام "ترانۂ عشق" رکھا گیا ہے۔ اس میں عشق کی تعریف اسی انداز پر کی گئی ہے جس طرح میر نے اپنی مثنوی "شعلۂ عشق" میں کی ہے۔ اس کی ابتدا اس طور پر ہوتی ہے :

خلق و عالم ہے مدعائے عشق مظہر ذات کبریا ہے عشق
عشق ہے ایک نا معلوم زماں اس دا غ سے ہوا ہے عیاں

عشق سے ہے بلندی و پستی   عشق ہے شاہ عالم مستی
عشق وحدت طراز کثرت ہے   عشق کثرت نمائے وحدت ہے

اٹھارہ اشعار میں اسی طرح عشق کی تعریف کرنے کے بعد عشق کی صفات واضح کی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عشق ہے گرچہ آب و رنگ جہاں   اس کے نیرنگ میں ہے آفتِ جاں
لیکن ہنگامۂ مصیبت ہے   کہیں محفل طراز عشرت ہے
ہے کہیں سوز اور کہیں ہے ساز   کہیں ہوتا ہے صرفِ ناز و نیاز
کہیں شبنم نط بگل ہم دوش   کہیں بلبل صفت ہے نالہ فروش
کہیں دیہیم فرقِ شاہی ہے   کہیں خاکِ سرِ تباہی ہے
کہیں یہ مستی لب خسم ہے   کہیں سوزِ لب تبسم ہے

اسی طرح عشق کی متضاد اور مختلف کیفیتیں تفصیل سے اور بڑی خوبی سے بتانے کے بعد آخر میں شاعر کہتا ہے۔

الغرض عشق موجدِ بیداد   ایک ہے اپنے کام میں استاد
بہ تقریب اس کے ہو جیو زنہار   یہ ہے مجنوں یہ کار خود ہشیار
بلکہ ہے اس کی طبع عربدہ جو   آشتی میں ہے اس کی جنگ کی خو
پہ یہ عادت ہے اس ستمگر کی   فکر کرتا ہے دو تن ہمسر کی
شمع ساں گر گناہ نے عاشق سر   جلے پروانہ ساں تن دلبر

اس کے بعد داستان شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا عنوان ہے " داستان سراپا سوز نا جزائے عجب و واقعۂ غریب " اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ

تھا بنارس میں اک جوانِ حسیں   سرو قد گل عذار ماہ جبیں
آفتاب سپہر حسن و جمال   بدر تابانِ اوجِ فضل و کمال
مطلعِ طور تھی جبیں اس کی   موجِ دریائے نور تھیں اس کی

اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنے کے بعد یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

اپنے گھر کا امیر زادہ تھا   اور بزرگ اس کا خانوادہ تھا

پھر ایسا ہوا کہ

ایک دن اتفاق سے وہ جواں   سر بازار کو ہوا تھا رواں
ہر طرف پھینکتا تھا تیرِ نگاہ   تاکہ ہو صید کوئی غیرتِ ماہ
ناگہاں ایک خانۂ زرگر   جو اس کی خود پیش نظر
در کی جانب جو غور سے دیکھا   نظر اک آئی دخترِ زیبا

اس دخترِ زیبا کی تعریف بھی ملاحظہ ہو۔

روکشِ آفتاب و غیرتِ حور   سوز عارض فراز شعلۂ طور
بلکہ گیسو کے موج بالِ پری   چال رشکِ خرام کبک دری
ابروانِ خمیدہ ہوش ربا   ناوک انداز مثل عقرب قضا
چشم وہ نیم باز عشوہ طراز   ایک چشمک میں جس کے سو سو ناز
بھی مہر ہے کہ یہ حشر انگیز حسن کیا کچھ نہ قیامت ڈھاتا رہا۔ نوجوان عاشق
یک بیک اس سے جو دوچار ہوا   تیرِ غمزہ جگر کے پار ہوا
حیرت آکر نگہ سے یار ہوئی   جان بلا خیز اضطرار ہوئی
دل میں سخت اس کے اضطراب ہوا   جگر آتشِ غم کباب ہوا

اور آخر کار

بے خودی ہو گئی جو دل کے قریں   گر پڑا کھا کے غش روئے زمیں

شاہ راہ عام پر اس طرح غش کھا کر گرنا تھا کہ ایک مجمع اکٹھا ہو گیا اور ہر ایک شخص قیاس آرائی کرنے لگا۔ کوئی کہتا تھا کہ اس کو سکتہ ہو گیا ہے کوئی کہتا تھا کہ اس کو لو لگ گئی ہے۔ اسی مجمع میں ایک شخص جہاں دیدہ اور صاحب عرفاں تھا۔ اس نے کہا کہ یہ ضرور کسی کی نگاہ کا مارا معلوم ہوتا ہے اور اس کی دوا بجز شربت دیدار اور کچھ نہیں ہے۔ غرض ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر

دخترِ زرگر جو سامنے تھی کھڑی   تھی نظر اس کی اس جواں سے لڑی
وہ بھی کہتی ہے یہ عاشقِ زار   میری ہی چشم کا ہے بیمار
دل میں آیا کہ اس پہ رحم کرے   دلِ مشتاق کو تسلی دے
پر نہ دی اس کو ناز نے رخصت   بلکہ مانع ہوئی اسے غیرت
کہ ابھی گر کریں گے اس کا علاج   اس میں ماں باپ کی رہے گی نہ لاج

یہ سوچ کر گھر کے اندر چلی گئی لیکن چونکہ وہ بھی چوٹ کھا گئی تھی پردہ کی اوٹ میں کھڑی رہی اور حالت یہ تھی کہ

دلِ شوریدہ غم سے مضطر تھا   سر زانو ہی بالشِ سر تھا
تھی عیاں رخ سے بے حواسی سی   چھا گئی دل پہ اک اداسی سی
پر خموشی سے اس نے ربط کیا   عشق کو اپنے خوب ضبط کیا

اب اس نوجوان عاشق کا حال سنیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آ... پہلے تو بدحال پڑا رہا اتنے میں غیب سے الہام ہوا کہ کب تک یونہی پڑے رہو گے یہ تو عشق ہے اس کے آداب برتنا ہوں گے۔ یہ سنتے ہی وہ اٹھ بیٹھا اور

[illegible] کسی طرح گھر کی طرف روانہ ہوا۔ حالت یہ تھی کہ چہرہ سرخ تھا لب خشک اور آہوں کے شعلے دل اور ہونٹوں کو جلائے دیتے تھے۔ غرض گھر پہنچنے کے بعد اس کے دوستوں نے جو یہ حالت دیکھی تو اس کی غمگساری کی۔ پہلے تو اس نے کچھ نہ بتایا اور ضبط کئے رہا لیکن دو چار روز بعد [illegible] اور سارا ماجرا اس نے اپنے دوستوں سے کہہ سنایا۔ دوستوں میں سے ایک شخص بہت خوش تقریر تھا اس کو اپنا قاصد بنا کر معشوقہ دل نواز کے پاس پیغام بھیجا کہ

کہیو اس سے کہ اے سراپا ناز — ہے کوئی دل سے تیرا اہل نیاز
ایک دن دیکھ کر تجھے سر راہ — ہو گیا زخمی خدنگ نگاہ
سر بازار تھا جو اس پہ ہجوم — حال اس کا تجھے بھی ہے معلوم
اب وہ جینے سے ہے بہت عاری — عشق کی حالت ہے روز و شب طاری

حالت زار کی تفصیل بتانے کے بعد شکوہ و شکایت کی بھی تاکید کی۔

دیکھ کر تو تو گھر میں جا بیٹھی — حال پر میرے اعتنا بھی نہ کی
سن تو اے آہوئے شکار افگن — وحشت آموز دیدۂ پُر فن
صید سے منہ کبھی موڑتا ہو کوئی — نیم بسمل کبھی چھوڑتا ہے کوئی

اس کے بعد آرزوئے دیدار کی درخواست کرنے کو کہا۔ غرضیکہ قاصد گیا اور کسی طرح موقع و فرصت پاکر نوجوان عاشق کا حال زار من و عن کہہ سنایا۔ اس پہ اثر تو بہت ہوا لیکن کچھ تو بدنامی کے ڈر سے اور کچھ امتحان لینے کی غرض سے اس نے ایسا جواب دیا جس میں تجاہل عارفانہ اور ناز و انداز کو دخل تھا یعنی اس نے کہلا بھیجا کہ ہاں میں نے دیکھا تو تھا کہ کسی سے تیری آنکھ لڑی تھی اور تو بیخود ہو گیا تھا لیکن میں سمجھی کہ تو کس کی نرگس چشم کا بیمار ہوا۔ تو تو خود نام خدا حسین ہے تجھ پہ خود ہی لوگ فدا ہوں گے، تجھے کیا ضرورت ہے کہ تو دوسروں کی طرف اپنا دھیان لے جائے۔

دیکھ تو آئنہ میں اپنا جمال — اور کا کیوں عبث ہو تجھ کو خیال
عشق بازی کر اپنی ذات سے تو — رکھ نہ کام اور کے صفات سے تو
دل نہ دینا کسی کو اے ناداں — اس میں بیشک ہے تیرے جی کا زیاں

قاصد واپس آیا اور نوجوان عاشق اس کے جواب سے کچھ خوش اور کچھ اداس ہوا۔ لیکن سمجھ گیا کہ اس جواب میں صلح و آشتی کا طور ہے۔ چنانچہ بہ شوق تمام پھر قاصد کو محبوبۂ دل نواز کے پاس بھیجا کہ میری حالت تباہ بتانے کے بعد

کہہ دینا کہ

سوچ تو میں شکار کس کا ہوں — کشتۂ اختلاط کس کا ہوں
تجھ سوا اور کون ہے قاتل — کہ کرے اس طرح مجھے گھائل
نہیں شرط مروت اے دلدار — اپنے بسمل سے ذبح کا انکار

قاصد پھر گیا اور عاشق جاں باز کی حالت بڑی تفصیل اور کچھ اس انداز سے بتائی کہ اس محبوبہ کے دل پر بہت اثر ہوا۔

مضطر آرزو ہوا دل زار — محو حیرت وہ دیدۂ خوں بار
آہ لب پہ ہوئی شرر افشاں — ہوا شور سینۂ سوزاں
دم بدم آہ آہ کرنے لگی — حالت اپنی تباہ کرنے لگی
دل کی کلفت سے دم جو گھبرایا — جی میں اس ماہ وش کے یہ آیا
کہ کدھر ننگ اور کہاں کا نام — چلئے عاشق کے اپنے تا بہ مقام

لیکن ہم مذہبی کی آواز پر صبر و ضبط کیا اور کہا کہہ دینا کہ تو مجھے مفت کیوں بدنام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میرا مذہب اور تیرا مذہب اور دونوں ایک کیونکر ہو سکیں گے۔ عاشق یہ جواب سن کر کہتا ہے کہ عشق میں کفر و اسلام کی کوئی تمیز نہیں۔

عشق کو یک دلی سے ہے سروکار — ہے دوئی اس میں نخوت و پندار
ان کے آگے جنہیں ہو عشق سے کام — دین کیا چیز کفر کس کا نام
انہیں اسلام ہے رخ جاناں — کفر ہے اس پہ خال مشک فشاں
غور کیجے تو ہیں یہ دونوں ایک — ان میں کیا ہے تفاوت بد و نیک
ہے حرم کی اگر اذاں ناموس — دیر کا پردہ دار ہے ناقوس
خانۂ کعبہ ہو کہ خانۂ دیر — یاں سوا ایک کے نہیں ہے غیر
نہیں طالب میں کفر و ایماں کا — میں تو بندہ ہوں تیرے [illegible] کا

غرض قاصد پھر کہنے جاتا ہے کہ عاشق مذہب اسلام ترک کر دینے کو تیار ہے۔ معشوقہ پہلے ہی سے انتظار میں کھڑی تھی۔ قاصد عاشق کا جواب اسے بتا ہی رہا تھا کہ اتنے میں اس گلی میں شور ہوا۔ معلوم ہوا کہ فلاں نوجوان اور خوبصورت رئیس زادے نے جوگیانہ لباس اختیار کر لیا ہے اور اسی طرف آتا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے دوست احباب اور تماشائی چاروں طرف ساتھ ہیں۔ رئیس زادہ زنار ڈالے ہے اور چہرے سے بدحواس معلوم ہوتا ہے۔ سب لوگ متحیر اور حیران ہیں کہ اس کو کیا ہو گیا ہے اور کس کی خاطر یا کس وجہ

[illegible] تمام رات وہ اعجاب ویکھ کے [illegible] ہو جاتا ہے اور اپنے سب دوستوں سے [illegible] احباب روتے ہیں اور وہ دریا پر آسن جا کر [illegible]

ادھر وہ لڑکی اس وقت تک تو سب ماجرا دیکھا کی جب تک عاشق اس کے دروازے پر بیٹھا تھا لیکن جب اس کے در کی طرف آنے لگا تو شرم و حیا کے باعث وہ گھر کے اندر چلی گئی۔

گھر میں جا بیٹھی وہ سراپا ناز — تا نہ ظاہر کسی پہ ہو یہ راز
دل میں تھا اس کے گو جوشِ کا جوش — پر حیا سے لب و دہان خاموش

ادھر جب عاشق اس کے دروازے پر آکر بیٹھ گیا تو اسے خیال تھا کہ اب وہ اس کو بلائے گی یا خود آئے گی لیکن ان دونوں باتوں میں سے کوئی ظہور میں نہیں آئی تب وہ بہت گھبرایا اور نالہ و زاری کرنے اور معشوقہ کی شکل کو سامنے تصور کر کے اس سے شکوہ و شکایت کرنے لگا۔ وہ اس خیالی تصویر سے گلہ زاری کر ہی رہا تھا کہ ادھر لڑکی کے جتنے برادر و خویش تھے سب آکر اکٹھا ہو گئے اور حیا و غیرت کے تقاضے کے باعث ان لوگوں نے طے کیا کہ کسی طرح اس کو ہٹانا چاہیے ورنہ مار ڈالنا چاہیے۔ لیکن ایک بوڑھے شخص نے مشورہ دیا کہ پہلے اسے سمجھا کر دیکھو اگر یہ نہ مانے تو پھر جو جی چاہے کرنا۔ چنانچہ وہ بوڑھا آگے آیا اور اس نے بہت کچھ سمجھایا اور ڈرایا بھی کہ اگر تو نہ اٹھا تو تیرا خون ہو جائے گا مگر عاشق تو سر سے کفن باندھ کر آیا تھا وہ کیا مانتا کہنے لگا۔

میں ہوں سو جاں سے عاشقِ صادق — خوف اس کو ہے جو کہ ہو فاسق
ہوں فقط میں تو طالبِ دیدار — تم مرے کیوں ہو در پئے آزار
نہ اٹھوں گا میں جب تلک ہے دم — کہیں دیکھا ہے اٹھتے نقشِ قدم
ظلم جو ہو گا سب سہوں گا میں — خاک ہو کر بھی میں رہوں گا میں

غرض جب عاشق کسی طرح نہ اٹھا تو لڑکی کے اعزا نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور قتل کر ڈالا۔

رشکِ گلشن ہوئے در و دیوار — عشق نے اور ہی دکھائی بہار
خوں سے گلگوں ہوا جو اس کا بدن — بن گیا نخلِ ارغواں ہمہ تن
تن جو زخموں سے چور تھا اس کا — لب ہر زخم پہ تھا شکرِ خدا

اب ادھر لڑکی کا حال سنیئے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ عاشق جاں باز جان سے مارا گیا تو بے قرار ہو گئی۔ گریبان چاک کر ڈالا اور [illegible] بیٹھی باہر نکل آئی اور بین کرنے لگی:

اے مرے جاں نثارِ راہِ وفا — کشتۂ تیغ و غمزۂ اعدا
اے مرے وقفِ حسرت و ارماں — اے مری جان میں ترے قرباں
اے عجوبۂ گل و بہ تازہ بہار — لٹ گئی یوں خزانِ عشق بہار
گر تو یک عدم کا عازم تھا — چھوڑ جانا مجھے نہ لازم تھا
بیکسی تو یوں سفر کر جائے — میں رہوں جیتی اور تو مر جائے

اسی طرح بڑے کرب و بے چینی سے آہ و زاری کرتے کرتے عاشق کی لاش کے پاس جا بیٹھی اور اس کی بلائیں لینے لگی۔ اتنے میں غیب سے آواز سنائی دی کہ یہ موقع وقت کھونے کا نہیں عشق میں نام کر جانے کا ہے۔ یہ سن کر اس کے دل میں آگ کا ایک شعلہ ایسا موج زن ہوا کہ خود بخود اس کے جسم میں آگ لگ گئی اور وہ شعلہ جوالہ بن کر اپنے عاشق کی نعش سے لپٹ گئی۔ چنانچہ دونوں اسی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔

شوق سے مل گئے گلے دونوں — ایک ہی آگ میں جلے دونوں
دیکھنے والے حیران رہ گئے اور سب لوگ کفِ افسوس ملنے لگے۔

ہوئے اس واقعے سے پیر و جواں — مثلِ آئینہ صورتِ حیراں
دشمنوں کو ہوئی پشیمانی — دوستوں کو بہت پریشانی
عشق کا تو یہ ایک ہے نیرنگ — جس سے یاں کفر و دین ہو یک رنگ
سیکڑوں اس کے ایسے ہیں قصے — صرف حیرت ہو عقلِ کل جس سے

آخر میں شاعر اس طرح قصے کا اختتامیہ لکھتا ہے۔

آخر اب تا بکے ترانۂ عشق — تھکے کب تک قلم فسانۂ عشق
سوزِ عشق اس نے کچھ کیا جو رقم — شمع سوزاں ہوئی زبانِ قلم
عشق وہ شعلہ ہے شرارت کیش — جس سے ہیں سب جگر جلے دل ریش
جب خوش آئی ہے اسکو آگ کی سیر — دیر کیجے حرم نہ خانۂ دیر
ہے وہ کافر یہ عشقِ تیغ گزار — کفر و دیں کا ہے جس سے سینہ فگار
زور اپنا جہاں دکھاتا ہے — کوہ کو کاہ کر دکھاتا ہے
جہاں بستے ہیں اس کے دیوانے — ایسے لاکھوں ہوئے ہیں افسانے
ہے غرض عشق کا مقام بلند — فکر کی واں سے نارسا ہے کمند
شرح بیدادِ عشق ہے دشوار — ہے یہ وادی کٹھن حسب گفتار

ہمارا پلان

اسرار اکبرآبادی

دیئے پریم کے ہر سو جلائے جاتے ہیں
بجھے دلوں کے اندھیرے مٹائے جاتے ہیں
قدم قدم پہ نئے راگ گائے جاتے ہیں
روش روش پہ نئے گل کھلائے جاتے ہیں
ہم اپنے دیش کو جنت بنائے جاتے ہیں

بنایا دیش کو جنت نئے پلانوں نے
مٹائی دیش کی غربت نئے پلانوں نے
بڑھائی دیش کی عزت نئے پلانوں نے
خوشی کے آج یہاں گیت گائے جاتے ہیں
ہم اپنے دیش کو جنت بنائے جاتے ہیں

نئے پلان کی تخلیق بھاکرہ ننگل
نئے پلان سے شاداب ہو گئے جنگل
نئے پلان سے جنگل میں ہو گیا منگل
نئے پلان سے گلشن بسائے جاتے ہیں
ہم اپنے دیش کو جنت بنائے جاتے ہیں

یہ ماتا ٹیلہ، یہ ہیرا یہ باندھ چمبل کا
یہ کارخانے، یہ مل، اپنی محنتوں کا صلا
بدل رہا ہے شب و روز دیش کا نقشا
زمیں سے نخلِ محبت اگائے جاتے ہیں
ہم اپنے دیش کو جنت بنائے جاتے ہیں

ہوائیں مست چلی ہیں نئے پلانوں سے
دلوں کی کلیاں کھلی ہیں نئے پلانوں سے
ہمیں بھی خوشیاں ملی ہیں نئے پلانوں سے
دلِ فسردہ بھی مسرور پائے جاتے ہیں
ہم اپنے دیش کو جنت بنائے جاتے ہیں

ہم اپنے وطن کو سجا کے چھوڑیں گے
قدم قدم پہ نئے گل کھلا کے چھوڑیں گے
آج دیش سے ظلمت مٹا کے چھوڑیں گے
ارادے اب یہی ہر دل میں پائے جاتے ہیں
ہم اپنے دیش کو جنت بنائے جاتے ہیں

نیا گاؤں

کشمیری لال ذاکر

میرا نام شمس آباد ہے۔

شمس فارسی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی سورج ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلمان فقیر کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ وہ فقیر جوہڑ کے کنارے بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے اپنی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آیا اور پھر کچھ مدت کے بعد ایک رات کہاں چلا گیا۔ بہت دنوں تک کسی کو بھی علم نہ ہوا کہ اُس برگد کے درخت کی چھاؤں میں کسی نے ڈیرہ بھی ڈالا تھا۔ یہ تو اچانک ایک دوپہر کو جب ایک کسان کھیت میں کام کرتے کرتے تھک گیا تو درخت کی چھاؤں میں آگیا۔ اُس کے ساتھ اُس کے دو بیل بھی تھے۔ ناگوری بیل، جن کے سینگوں پر پیتل مڑھا ہوا تھا اور دھوپ میں اس طرح چمکتے تھے جیسے کسی مندر کے کلس چمکتے ہیں۔ کسان کا مندر اُس کے بیل ہی تو ہیں۔ وہ انہی کلسوں کی چمک سے اپنے جیون کے اندھیارے میں اُجالا پیدا کرتا ہے اور اُس کی روشنی میں اپنے مستقبل کے حسین جال بُنتا ہے۔ جب اُس کی آرادھنا مکمل ہوتی ہے تو اُس کے کھلیان پر اولے نہیں گرتے اور ساہوکار کے لمبے ہاتھ اُس کے گرد گھیرا ڈال کر اُسے ہڑپ نہیں لیتے اور تیز تیز آندھیاں نہیں اُٹھتیں اور بجلی نہیں گرتی۔ ہر طرف سکون ہوتا ہے اور شانتی ہوتی ہے اور کسان کی بیوی کی چوڑیاں کھنکتی ہیں اور اُس کے بچے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے اور اُس کی دھول بھری آنکھوں میں نئی صبحیں جاگتی ہیں۔

ہاں تو میں کسان کی بات کر رہا تھا جب وہ دھوپ سے جھلستا ہوا برگد کی چھاؤں کی طرف بڑھا تو اُس نے دیکھا کہ ایک فقیر درخت کے تنے سے پیٹھ ٹیکے اور آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ کسان کو بڑی حیرت ہوئی۔ یہاں اُس نے کبھی کسی اجنبی آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن یہ اجنبی آدمی اُسے اچھا لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اُس سے پوچھے کہ وہ کون ہے لیکن پھر اُس نے فوراً یہ خیال چھوڑ دیا۔ اُس نے اُس کی توجہ ملانا ٹھیک نہ سمجھا۔ لیکن ٹھیک اُسی لمحہ اُس کے سفید ناگوری بیل نے زور سے گردن ہلائی۔ شاید کسی مکھی نے تنگ آکر اور اُس کی گردن میں پڑے رنگ برنگی منکوں میں بنی ہوئی گھنٹی بج اُٹھی اور اُس کی گھنٹی کی آواز سے فقیر کی توجہ بٹ گئی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ کسان سہم گیا۔ کتنی چمک تھی اُن آنکھوں میں۔ اتنی چمک تو اُس کے بیلوں کے پیتل مڑھے سینگوں میں بھی نہیں تھی۔

فقیر کسان کو گھورتا رہا۔

"بیل تیز دھوپ میں گھبرا گئے ہیں" کسان نے عاجزی سے کہا۔

کسان کی بات سُن کر فقیر مسکرا دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ آج کسی نہ کسی کو ادھر آنا ہی تھا۔ بیٹھ جاؤ۔"

کسان بیٹھ گیا۔

"چھاچھ لے آؤں آپ کے لئے؟" کسان نے پوچھا۔

"نہیں۔" فقیر پھر مسکرا دیا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" کسان نے پوچھا۔

"دھرتی سے۔" فقیر نے جواب دیا۔ "ہم سب دھرتی سے جنم لیتے ہیں۔ دھرتی ہم سب کی ماں ہے۔"

کسان فقیر کی بات سُن کر خاموش ہو گیا۔

"کتنے دن ٹھہروگے؟"

"جتنے دن اس درخت کی چھاؤں ٹھنڈی رہے گی۔"

"درخت کی چھاؤں تو سدا ہی ٹھنڈی رہتی ہے بابا۔"

"جب لوگ جھوٹے اور خود غرض ہو جائیں تو چھاؤں بھی کالی تب بھی جاتی ہے۔"

[illegible] ابھی نہیں آئی۔ وہ اپنی کملائی ہوئی آنکھیں [illegible]

"کیا نام ہے تمہارے گاؤں کا؟" فقیر نے پوچھا۔

"یہ گاؤں نہیں ہے بابا' یہ تو ویسے ہی کچھ جھونپڑے ہیں۔ گاؤں [illegible] چار کوس دور ہے۔ اُتر' دکھن' پورب اور پچھم چاروں طرف ایک ایک گاؤں ہے ادھر تو گاؤں والوں کی زمینیں ہیں" کسان نے بات صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تو یہ جھونپڑے بنا کسی نام کے ہیں؟"

"ہاں بابا"

"تو آج سے اس کا نام شمس آباد ہوگا"

"شمس آباد!" کسان نے حیرت اور خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔ ان ویران اور بے نام جھونپڑیوں کو آج ایک نام مل گیا تھا۔ جیسے ایک لاوارث بچے کو کسی نے اپنے سینے سے لگا لیا ہو۔

اور اس شام جب وہ کسان لوٹ کر اپنے گھر گیا تو اُس نے دوسرے جھونپڑے والوں سے فقیر بابا کی بات کہی۔ اگلی صبح جھونپڑوں میں رہنے والے سبھی مرد اور عورتیں برگد کی چھاؤں میں اکٹھے ہوگئے۔ سب خوش تھے۔ فقیر گویا ایک گھٹا بن کر آیا تھا اور دھوپ سے جھلسی ہوئی اُس دھرتی پر جل تھل کر دیا تھا۔ مرد اور عورتیں مل کر لوک گیت گاتے رہے اور اُن گیتوں کی لے میں لے ملاتی ہوئی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی جو دھیرے دھیرے موسلادھار بارش میں بدل گئی۔ پانی میں بھیگتے ہوئے اُن جھونپڑوں کے باسی خوش ہو رہے تھے اور سوکھے ہوئے جوہڑ میں پڑی چوڑی چوڑی دراڑوں میں پانی بھرتا جا رہا تھا۔

اور پھر پانی برسنا بند ہوگیا اور فقیر مسکرا دیا۔

"تم دھرتی کی حفاظت کرو' دھرتی تمہاری حفاظت کرے گی' جاؤ تمہارے کھیت تمہارا انتظار کر رہے ہیں" فقیر بولا۔

لوگ اپنی جگہ سے ہٹے نہیں۔ وہ اُسے دیکھے جا رہے تھے بڑی عقیدت کے ساتھ۔

"جاتے کیوں نہیں تم؟ جاؤ" وہ گرجا اور انھیں لگا جیسے آسمان کی بلندیوں میں کہیں کوئی بھٹکے ہوئے بادل آپس میں بہت زور سے ٹکرائے تھے۔ لوگوں نے ایک دم اپنے قدم کھیتوں کی طرف بڑھا دئے۔

چھ مہینے کے بعد جب نئی فصل کٹی اور اناج جمع ہوا تو وہ گزشتہ برسوں کی نسبت چار گنا زیادہ تھا۔

میلوں پھیلا نام شمس آباد پیرے بیٹوں اور بیٹیوں کے لئے ایک دردانی بن کر آیا۔

اور جب گاؤں کے بیٹے اپنا اناج سمیٹ چکے تو ایک بار پھر جوہڑ کے کنارے برگد کے درخت کے نیچے جمع ہوئے۔ فقیر بابا انھیں دیکھ کر مسکراتا رہا اور بیلوں کی گردنوں میں پڑی گھنٹیوں کا سنگیت گونجتا رہا اور اُس روز پہلی بار لوگوں کو احساس ہوا کہ فقیر بابا کے رہنے کو کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ دن رات برگد کے تنے کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ جوہڑ میں پانی تھا' اس کے کنارے کی مٹی بہت مضبوط تھی۔ لوگ اُس مٹی سے اپنے گھروں کی چھتوں اور دیواروں پر لپائی کرتے تھے۔ اس مٹی سے کیوں نہ فقیر بابا کے لئے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنا دی جائے اور رات کی رات لوگوں نے فقیر بابا کے لئے کوٹھڑی تیار کر دی۔ دوسری صبح جب سورج نکلا تو اُس کی کرنیں مٹی سے بنی کچی کوٹھڑی کی گیلی دیواروں پر رقص کر رہی تھیں اور رات بھر کام کرنے والے جوان اور بوڑھے جوہڑ کے پانی میں نہا کر گھر لوٹ رہے تھے۔

کوٹھڑی بن گئی۔ فقیر بابا اُس میں رہنے لگا اور آس پاس کی دھرتی سونا اُگلنے لگی۔

اور پھر ایک دن اچانک ہی فقیر بابا کہیں چلا گیا۔ میں اُس دن بڑا اداس رہا۔ میں ہر پگڈنڈی اور راستے پر کھڑا ہو کر اُسے دیکھتا رہا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک کسان نے اپنا فاضل اناج ایک ضرورت مند پڑوسی کو تو مناسب دام پر نہیں دیا تھا لیکن اُسے ایک ساہوکار کے ہاتھ زیادہ داموں پر بیچ ڈالا تھا۔ اس خبر سے فقیر بابا کو بہت دکھ ہوا اور وہ اُسی رات اپنی کوٹھڑی چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ لوگ اُسے اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ اُس کے جاتے ہی جوہڑ کا پانی سوکھنے لگا اور کھیتوں میں آگ گھاس جلنے لگی۔ ڈھور ڈنگر بلبلانے لگے۔ گاؤں کے تنوروں میں دود کم ہو گیا اور مکانوں کی چھتوں پر چیلیں چیخنے لگیں۔

[illegible] بہت [illegible] لیے چلے گئے۔ [illegible] سے اُن کے ہاتھ نکل گئے۔
[illegible] دس بیس نہیں، پچاس ہل ایک دوسرے [illegible] بیلوں کی گردنوں میں پڑی گھنٹیاں گونج [illegible] سے اُٹھوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، درختوں کی [illegible] کی مائیں، بہنیں اور بیویاں چھاچھ کی مٹکیاں اور [illegible] کی روٹیاں لئے بیٹھی تھیں اور لوک گیت سُر سے سُر ملا کر گا رہی تھیں۔ یہ لگ رہا تھا جیسے فوجی بینڈ بج رہا ہو اور سپاہی بڑے عزم کے ساتھ [illegible] اُٹھاتے لڑائی کے میدان جا رہے ہوں۔

[illegible] فصلوں میں وہ رقم بچ گئی جا سکی جو شمس آباد کے مالک کو ملنے تھی۔ وہ فصلیں اور اُگائی گئیں، ایسے ہی جیسے پہلی فصلیں اُگائی گئی تھیں رقم کا اندازہ پورا ہو گیا اور سہاگن کی سنکرانت کو گاؤں کے سبھی مرد اور عورتیں مل گیت گاتے ہوئے چار کوس دور اُس گاؤں میں گئے جہاں وہ ساہوکار رہتا تھا جس نے مجھے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ وہ اتنا بڑا ہجوم دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس کا غلام اُس کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا لیکن سوتنترتا کے اس یُگ میں کون کسی کو بنا اُس کی مرضی کے غلام بنا سکتا ہے۔ غلامی کا بندھن توڑنے کے لئے ہی تو اتنے ڈھیر سے لوگ جمع ہوئے تھے۔ بندھن ٹوٹ گیا۔ ساہوکار کو اُس کی قیمت دے دی گئی۔

اُس رات سارے جوان لڑکے جنہوں نے دو برس کھیتوں میں ہل چلائے تھے جوہڑ کے کنارے برگد کے درخت کے نیچے جمع ہوئے اور گھروں کی دیواروں پہ جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی میں ایک اور مسئلے پر سوچنے لگے۔ سمسیا بڑی گمبھیر تھی۔ بڑے سوچ وچار کی ضرورت تھی۔ ڈھلتی رات تک بحث ہوتی رہی اور جب گھروں میں چکی گھمانے کی آواز آنے لگی اور پربھات کا اُجالا آنکھیں ملنے لگا تو آخری فیصلہ ہو گیا۔

سوچ سکتے ہو آخری فیصلہ کیا تھا؟

تم نہیں سوچ سکتے۔

ٹھہرو میں بتاتا ہوں۔

اُنھوں نے بہت بحث و مباحثے کے بعد آخری فیصلہ یہ کیا کہ شمس آباد کے تمام گھروں کو گرا دیا جائے اور اُن کی جگہ نئے گھر بنائے جائیں پکے، اُجلے اور ایک دم نئے نمونے کے۔

اس اسکیم کے سلسلے میں سب سے اہم فیصلہ یہ تھا کہ شمس آباد میں بسنے والے ہریجن لوگوں کو کچھ بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ دوسرے لوگ ہی اُن کا حصہ ادا کر دیں گے اور اُن کے لئے مکان بنا دیں گے۔

اس عظیم فیصلے کے طے ہو جانے کے اگلے ہی روز مکان گرائے جانے لگے اور لوگوں نے پھوس کی عارضی جھونپڑیاں بنا لیں جن میں وہ کچھ سمے گزار سکیں

جس روز سارا گاؤں ڈھ گیا اور ہر طرف مٹی کے ڈھیر نظر آنے لگے تو میں بہت خوش تھا۔ میرے سینے پر ہزاروں من مٹی کا بوجھ تھا لیکن مجھے رتی بھر وزن محسوس نہ ہو رہا تھا۔ مجھے تو ایسے لگ رہا تھا جیسے بہت سے پنکھ میرے جسم پر جمع ہو کر مجھے تھپک رہے ہوں۔

اُس روز جیون میں پہلی بار میں بھی مسکرا دیا تھا۔ اُس کے بعد تو پھر مسکراتا ہی رہا ہوں۔ میری مسکراہٹیں ہی تو بکھری پڑی ہیں قدم قدم پر اِن راستوں میں۔

مکانوں کو ڈھانا تو مشکل کام نہیں تھا۔ یہ کام تو بھونچال اور سیلاب بھی کر سکتے ہیں۔ مشکل کام تو اُنھیں دوبارہ بنانا تھا۔ اُنھیں ایک نیا روپ اور نئی زندگی دینا تھا۔

یہ کام بہت کٹھن تھا۔ اگر گاؤں کے نوجوان ہر ایک بات کی طرف خود ہی دھیان نہ دیتے تو شمس آباد پانچ برس میں بھی نیا جیون نہ پا سکتا۔ نوجوانوں کے ارادے کی دھوم بہت دور تک پھیل گئی۔ دیش کے کئی نیتا اُس کے اُتساہ کی کہانی سُن کر مجھے دیکھنے آئے۔ سبھی خوش تھے۔ سب نے اُن کا ہاتھ بٹانے کا وچن دیا۔ سرکار اُنھیں روپیہ بھی دے گی، مکانوں کے نمونے بھی دے گی، سیمنٹ اور بجری بھی مہیا کرے گی۔ گاؤں والوں نے سوچا اگر سب کچھ سرکار ہی دے گی تو وہ خود کیا کریں گے۔ اُنھوں نے پکی اینٹیں بنانے کے لئے خود ہی ایک بھٹہ تیار کر لیا۔ مکانوں کے لئے وہ اینٹیں خود بنائیں گے۔ جوہڑ کی مضبوط مٹی جس سے ایک دن [illegible] کی کوٹھری بنی تھی اینٹوں کے لئے بہت ٹھیک رہے گی۔ دوسرے گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ جوہڑ کے قریب اینٹوں کے بھٹے سے دھواں [illegible] تھا۔

دھڑادھڑ اینٹیں بن رہی تھیں، گارا بن رہا تھا، سڑکوں کی پیمائش ہو رہی تھی، نئے خاکے کے مطابق گھروں کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔

جانتے ہو پہلا مکان کس کا شروع ہوا تھا؟

گاؤں کے سب سے غریب ہری جن کا جس کے کوئی لڑکا بالا نہ تھا، کوئی کمانے والا نہ تھا، بے چارا محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا تھا۔ اُس کی بیوی چرخہ چلاتی تھی اور سوت کاتتی تھی لیکن گاؤں کے سب لوگ اُن کی عزت کرتے تھے۔

گھر بوڑھے ہری جن کا بن رہا تھا مگر اُسے کوئی کام نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ صرف پاس کھڑا مسکرا رہا تھا اور اُس کی بیوی نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سوت کات رہی تھی۔ جس روز اُس کا مکان مکمل ہوا اُس شام بوڑھے برگد کے درخت کی جڑوں میں گھی کے دیئے جلائے گئے اور فقیر بابا کی یاد میں بھجن گائے گئے۔ جانے فقیر کو مرے کتنا سمے ہو گیا تھا لیکن اُس کی جلائی ہوئی جوت اب تک جل رہی تھی۔

اور پھر ایک ساتھ ہی غریب ہری جنوں کے سارے مکان بن گئے۔ دو کمروں کے کھلے اور ہوا دار مکان۔ اناج رکھنے کے لئے الگ جگہ ڈھور ڈنگر باندھنے کے لئے ایک علیحدہ کوٹھا۔ نئے ڈھنگ کا رسوئی گھر۔ شہروں میں کیا رہتے ہوں گے لوگ۔ یہاں تو ایک چھوٹا سا شہر بسنے جا رہا تھا۔ جب تک کہ دوسرے لوگوں کے تین کمروں کے بڑے مکان مکمل نہیں ہوئے ہری جن بیٹھے سڑکیں بنانے میں جُٹ گئے۔ گاؤں کے باقی مکان مکمل ہونے تک اچھی خاصی سڑکیں بن گئیں۔ بجلی کا انتظام سرکار نے کر دیا۔ پکے کوئیں بن گئے۔ گاؤں کے باہر والا پُرانا کنواں اب پہچانا ہی نہ جاتا تھا۔ اس کی تو جیسے صورت ہی بدل گئی تھی۔ سیمنٹ سے پٹ رہا تھا کم بخت۔ نئی گراری پڑ گئی تھی۔ جب عورتیں پانی بھرنے آتیں تو گراری اپنا ہی راگ شروع کر دیتی جیسے اُن سب کا شکریہ ادا کر رہی ہو جنھوں نے اُسے نیا روپ دیا تھا اور پھر جب سارے مکان بن گئے تو وہ عارضی جھونپڑیاں توڑ دی گئیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں آ گئے۔ اُس رات کا منظر دیکھنے والا تھا۔ لگتا تھا جیسے میرے بیٹے کا بیاہ ہو اور برات چڑھنے والی ہو۔ ہر گلی میں دیئے جل رہے تھے۔ ہر دیوار پہ روشنی تھی۔ گاؤں بھر کی عورتیں رنگدار کپڑے پہنے گیت گاتی ہوئی برگد کے درخت کی طرف چلیں۔ ایک دم برات کا سا نظارہ تھا۔ قہقہے لگ رہے تھے، چہلیں ہو رہی تھیں، مذاق کئے جا رہے تھے۔

اس سارے جلوس کی رہنما کون تھی بھلا؟

وہی سوت کاتنے والی ہری جن بڑھیا اور کون!

وہ تو یوں خوش ہو رہی تھی جیسے اُس کے اپنے بیٹے کا بیاہ ہو رہا ہو۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس کے تو ایک ہی بیٹا تھا اور وہ بھی کئی برس ہوئے پرلوک سدھار گیا تھا۔ لیکن سپنوں کی دنیا تو ایک دم خوبصورت اور نرالی تھی اور وہ سپنوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی سوچ رہی تھی اُس رات کی بات جب اُس کا خاوند دور کے کسی گاؤں سے اُسے بیاہنے آیا تھا۔ اتنا ہنگامہ تو خیر کیا ہوتا، اس کا دسواں حصہ بھی نہیں تھا۔ وہ غریب لوگ تھے۔ اُن کی شادی تو بس نام ہی کی شادی تھی۔ پل بھر میں ہو بھی گئی، حالانکہ اُس کے گھر والے اس فکر میں کئی راتوں سے پریشان ہو رہے تھے۔ وہ اپنے خیالات میں ڈوبی دوسروں کے سُر میں اپنی آواز ملا رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ وہ کدھر جا رہی تھی۔

جب ایک زوردار قہقہہ گونجا تو وہ چونک اُٹھی۔ باقی عورتیں رُک گئی تھیں اور وہ آگے چلتی ہی گئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو تم؟ نہانا ہے تو کوئیں کے پانی سے نہاؤ، جوہڑ کا پانی تو اب ڈھور ڈنگروں کے کام آتا ہے۔" ایک جوان بہو نے طعنہ کسا تھا۔

بوڑھیا کھسیانی ہو کر رُک گئی۔

"اری اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا!" اُس نے اپنی جوت گنوائی آنکھوں کو تیزی سے جھپکتے ہوئے کہا، حالانکہ اس وقت اُسے اتنی ساری باتیں یاد آ رہی تھیں کہ اُس کا ذہن بھٹکنے لگا تھا۔ پھر سب نے اپنی اپنی تھالیاں جن میں آٹے کے دیئے جل رہے تھے، سوت کے رنگے ہوئے دھاگے تھے، تل چاول تھے، برگد کے نیچے رکھ دیا۔ لوٹوں سے درخت کی جڑوں میں پانی گرایا، اس کے تنے کے گرد رنگدار سوت کے دھاگے لپیٹے، اُس پہ تل اور چاول پھینکے۔ اُس کے گرد چکر لگائے اور پھر اُسی طرح جلوس کی شکل میں واپس گاؤں میں چلی گئیں۔ گاؤں سے مردوں کے ناچنے اور گانے اور ڈھول اور مجیروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

جب سارے لوگ تھک ہار کر سو گئے تو میں جاگا۔ گھروں کی بیساؤں

کو دھیرے سے اسے پار کیا۔ پھر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور بڑے دھیان سے اپنے نئے روپ کو دیکھنے لگا۔ میں آج پہلی بار اپنے روپ سے شرما رہا تھا۔ جیسے کوئی نئی نویلی دلہن سج دھج کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر لجا رہی ہو۔ میں تنہا کھڑا تھا اور ہلکی ہلکی چاندنی ہر طرف پھیل رہی تھی۔ کسی گھر میں ایک مرغ نے وقت سے پہلے ہی بانگ دے ڈالی۔ میں وہاں سے ہٹ کر برگد کے درخت کے نیچے آ گیا جہاں آٹے کے دیئے ابھی تک جھلملا رہے تھے اور اُن کی روشنی میں سوت کے دھاگے چمک رہے تھے اور درخت کی جڑوں میں ڈالا ہوا پانی دھیرے دھیرے دھرتی میں رچ گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ سارا پانی میرے سینے میں رچ کر مجھے بڑی پیاری ٹھنڈک پہونچا رہا ہو اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں خود فقیر بابا ہوں۔ فقیر بابا کہیں نہیں گیا تھا وہ یہیں تھا۔ وہ دھرتی کی گود میں سو گیا تھا۔ دھرتی کے گرم گرم انگوں سے لگ کر اُس میں سما گیا تھا۔ وہ تازہ امنگیں اور جوان ارادے بن کر میرے بیٹوں کے خون میں تحلیل ہو گیا تھا۔ وہ آشیرواد بن کر سہاگنوں کے سیندور میں رچ گیا تھا۔ وہ مسکراہٹیں بن کر بچوں کے ہونٹوں پر پھیل گیا تھا۔ وہ ہل کی لکیروں کی سندرتا بن کر کھیتوں کے سینوں میں پیوست ہو گیا تھا۔ وہ کہا کہیں نہیں تھا۔ یہیں تھا گاؤں میں، برگد کے پاس، اپنی گری ہوئی کوٹھری کی بنیادوں کے نیچے! اب صرف اُس کا روپ بدل گیا تھا۔ وہ پھیلتے پھیلتے فقیر بابا کی جگہ شمس آباد بن گیا تھا۔ آزاد بھارت کا ایک نیا گاؤں۔ سوتنتر جیون کا نمائندہ اپنے مستقبل کا امانت دار۔ اور جب پورب سے سورج نے جھانکا تو اُس کی کرنوں میں ایک نئی سندرتا کھل رہی تھی۔ میں اُسے پرنام کرتا ہوا اپنی سیماؤں میں لوٹ گیا۔

پھر گاؤں کے بچوں کے لئے کھیلنے کی ایک چھوٹی سی جگہ بنائی گئی جہاں سب بچے بنا کسی بھید بھاؤ کے کھیلتے تھے اور ہنستے تھے اور گاتے تھے۔ ان کے لئے ایک پاٹھ شالا کھولی گئی جہاں اُنھیں ایک اچھا شہری بننے کی سکشا دی جانے لگی۔ اور پھر ایک دن شہر کی کچھ عورتوں نے آ کر عورتوں کے لئے ایک مرکز کھول دیا جہاں وہ خالی وقت میں کاتنا، بُننا، کاڑھنا سیکھ سکتی تھیں۔ رات کو بالغوں کے پڑھانے کا کام چالو ہو گیا۔ مجھے تو یوں نظر آنے لگا جیسے میرے بچے صبح سے لے کر گئی رات تک کام ہی کرتے رہتے ہیں بے چارے کہیں تھک نہ جائیں، میں سوچنے لگا۔ کام اُنھیں ہی سے کیا کم ہے!

اتنے کام سے اگر یہ تھک گئے تو پھر کیا ہوگا؟ یہی بات سوچتے سوچتے میں ایک شام برگد کے درخت کے نیچے چلا گیا۔ کاش مجھے فقیر بابا مل جائے۔

تم جھوٹ مانو گے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا فقیر بابا جو بڑ کی طرف سے میری سمت آ رہا تھا۔ میں حیرت سے سن ہو گیا فقیر بابا کدھر سے آ گیا؟ میں کچھ سہم سا گیا تھا لیکن پھر اُس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر میری ہمت بندھی۔

"ارے تم! یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تمھارا انتظار کر رہا ہوں فقیر بابا!"

"کیوں؟"

"بہت ضرورت تھی تمھاری!"

"میری تمھیں اب بھی ضرورت ہے۔"

"تمھاری ضرورت سدا رہے گی میرے بچوں کو!" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اب تو تمھارے بچے خوش ہیں!"

"خوش تو ہیں، لیکن کام بہت کر رہے ہیں، تھک جائیں گے" میں نے کہا

"ارے بھائی کام ہی جیون ہے۔ کام جیون کے بہاؤ کو تیز کرتا ہے، رکتا نہیں۔ جیون بہتی ہوئی ندی ہے۔ اسے روکنا تو اسے نشٹ کرنا ہے"

"لیکن اُنھیں کچھ دیر آرام بھی تو کرنا چاہئے، فقیر بابا!"

"آرام وہ کرتے ہیں جن کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا" "ہمارے پاس تو ابھی کرنے کو بہت کچھ پڑا ہے" یہ کہہ کر فقیر بابا ایک طرف ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو بابا؟" میں نے پوچھا۔

"ذرا اپنی کوٹھری دیکھنے"

یہ سُن کر میرا دل دہل گیا۔ وہاں تو کوٹھری کا نام و نشان تک نہیں۔ کسی کو خیال ہی نہیں آیا اُسے سنبھالنے کا۔ فقیر بابا بے حد ناراض ہوگا۔ یہ بہت بُرا ہوا۔ اب کوئی آفت ٹوٹے گی۔

میں بابا کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ پل بھر میں ہی تو غائب ہو گیا۔ کہاں چلا گیا ایک دم؟

یہیں تو تھا ابھی۔ میں چکرا گیا۔ میں نے آہستہ سے پکارا بھی لیکن وہ تو جیسے دھرتی ہی میں سما گیا تھا کہیں نظر نہ آیا۔ میں سر جھکائے اُداس واپس لوٹ گیا۔

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

ہندستان اور دُنیا ۱۹۵۹ء میں

عشرت علی صدیقی

پچھلے سال ۱۹۵۹ء کے اہم ترین واقعہ کی نشان دہی جواہرلال جی کے اس فقرے سے ہوتی ہے کہ بین اقوامی کشاکش کا مرکز یورپ سے ایشیا کی طرف منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ راجیہ سبھا میں چین ہند سرحدی تنازعے پر تقریر کر رہے تھے اور ان کے لہجے میں جہاں ایک طرف ہندستان کی سرحدوں کے تحفظ کا تہیہ جھلکتا تھا وہاں دوسری طرف ایک طرح کی تشویش اور تکلیف بھی محسوس ہوتی تھی۔

اس تشویش اور تکلیف کی وجہ یہ ہے کہ ایک ایسا ملک جسے ہندستان اپنا دوست سمجھتا رہا ہے، جس کے جائز حقوق کی وہ دنیا بھر میں وکالت کرتا رہا ہے اور جس کے ساتھ اب بھی وہ دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے، اس کے خلاف توسیعی ارادوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ہندستانی حدود میں چین کی بے جا مداخلت سے اس ملک کے لئے دفاع کا ایک ایسا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے جو اگر کچھ اور بڑھتا ہے تو یہاں کے تعمیر و ترقی کے کاموں پر جو رقم اور توجہ صرف ہو رہی ہے اس کا ایک خاصا بڑا حصہ دفاع کے استحکام پر لگانا پڑے گا۔ اس صورت حال کا اثر ایشیا کے دوسرے ملکوں کے خارجہ اور داخلہ معاملات پر بھی پڑ سکتا ہے۔ یہ بات اس براعظم میں امن کے استحکام کے لئے مُضر ہوگی۔ اور اس کے لئے یہ خطرہ ایک ایسے وقت رونما ہوا ہے جب دنیا کے وہ دو بڑے گروہ جو عرصے تک ایک دوسرے کے خلاف فوجی تیاریاں کرتے رہے ہیں، ان تیاریوں کو روکنے اور بین اقوامی کشاکش کو کم کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت پر آمادہ ہو رہے ہیں۔ چوٹی کانفرنس کے بڑھتے ہوئے امکانات سے چین ہند تنازعے کا بے تکاپن بہت نمایاں ہو گیا ہے۔

چین ہند تنازعے کی ابتدا

اس تنازعے کی جو تفصیلات حکومت ہند نے 'وہائٹ پیپر' (قرطاس ابیض) کی شکل میں شائع کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا کوئی پانچ سال پہلے ہوئی تھی جب چین کے فوجی اور غیر فوجی کارندے اتر پردیش کے سرحدی علاقے باراہوتی کے علاقے میں آئے تھے اور چین نے اس علاقے کو اپنی مملکت کا جزو بنا لیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں دونوں ملکوں کے درمیان یہ طے ہو گیا تھا کہ جب تک اس مسئلے کا تصفیہ نہ ہو جائے اس وقت تک دونوں میں سے کوئی اپنے کارندے اس علاقے میں نہ بھیجے، اگرچہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی ہندستانی وزارت خارجہ کو ہندستان میں چین کے سفارت خانے سے اس بات کا احتجاج کرنا پڑا کہ چین کے فوجی اور غیر فوجی کارندے پھر باراہوتی میں آ گئے ہیں۔

جس سال جولائی میں باراہوتی کا قضیہ اُٹھا، اسی سال (۱۹۵۴ء کے) اپریل میں ہندستان اور چین میں تبت کے چینی علاقے اور ہندستان کے درمیان تجارت اور آمد و رفت کا ایک معاہدہ ہوا اور امن کے وہ پانچ اصول جو پنچ شیل کہلاتے ہیں اس معاہدے میں پہلی بار درج کئے گئے۔ اس معاہدے میں دونوں ملکوں کے کسی سرحدی تنازعے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ایسا کوئی تنازعہ اُس گفتگو میں اُٹھا جو ۱۹۵۶ء میں چینی وزیر اعظم کے ہندستان آنے پر ان کے اور ہندستانی وزیر اعظم کے درمیان ہوتی تھی۔ اس موقعہ پر، جیسا کہ جواہرلال جی نے اپنے ۱۴ دسمبر ۱۹۵۹ء کے خط میں مسٹر چو۔ این لائی کو یاد دلایا ہے۔ چینی وزیر اعظم نے برما اور چین کی سرحد کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کی حکومت نے میک ماہن لائن کو ایک سرحدی خط کی طرح تسلیم کر لیا ہے اور ہندستان اور چین کے دیرینہ دوستانہ تعلقات کی بنا پر اسی لائن کو جو بھوٹان تک چلی آئی ہے ان دونوں کی سرحد ماننے کے لئے بھی تیار ہے، اگرچہ اس سے پہلے وہ تبت کے حکام سے مشورہ کر لینا چاہتی ہے۔

اس گفتگو کی روداد سے (جو ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی) معلوم ہوتا تھا کہ چین کے تبتی علاقے اور ہندستان کی شمال مشرقی سرحد کا مسئلہ کچھ ایسا زیادہ پیچیدہ نہیں تھا۔ مگر ۲۳ر جنوری ۱۹۵۹ء کو چین کے وزیر اعظم نے ہندستان کے وزیر اعظم کو جو خط لکھا اس سے ایک کسی قدر مختلف صورت حال کی نشان دہی ہوتی تھی۔ اگرچہ اس خط میں میک ماہن لائن کے بارے میں چین کی طرف سے "ایک حقیقت پسندانہ رویہ" اختیار کرنے کی بات کہی گئی تھی مگر اس پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے تھے اور مغربی سرحد کے متعلق ہندستانی نقشوں کو غلط قرار دیا گیا تھا۔ چین کے نقشوں پر ہندستان اس سے پہلے اعتراض کر چکا تھا اور چین نے ان نقشوں کے صحیح ہونے پر کوئی اصرار نہیں کیا تھا۔ چین کے وزیر اعظم کو اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے جواہر لال جی نے ان کے اعتراضات کے جواب میں جغرافیائی حالات، تاریخی واقعات اور پرانے کاغذات کے حوالے بھی دیئے۔ مگر دوا کے ساتھ ساتھ مرض میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

مغربی سرحد کے متعلق وزیر اعظم چو این لائی کی تحریر سے بہت پہلے ہندستانی وزارت خارجہ کے سکریٹری نے نئی دہلی میں چینی سفیر سے اس بات پر احتجاج کیا تھا کہ کشمیر کے علاقے لداخ میں چین نے ہندستان سے پوچھے بغیر ایک سڑک بنالی ہے۔ یہ علاقہ چونکہ بہت بلندی پر اور غیر آباد ہے اس لئے ہندستان وہاں اپنی مستقل چوکیاں قائم کرنے کے بجائے وقتاً فوقتاً اپنے گشتی دستے بھیجتا رہتا تھا اور جب چینیوں کے سڑک بنا لینے کی خبر سن کر ایک گشتی دستہ متعلقہ علاقے میں بھیجا گیا تو اُسے چینی حکام نے گرفتار کر لیا اور اُلٹے ہندستانی پر چینی علاقے میں مداخلت کرنے کا الزام لگایا۔ لداخ کے علاقے میں ہندستانی سپاہیوں اور قلیوں وغیرہ کی گرفتاری کی اطلاع چینی حکومت نے ۵ ہفتہ تک ہندستان کو نہیں دی اور اس کے بعد بھی چینی وزارت خارجہ نے پے کنگ میں ہندستانی سفارت خانے کو ۳ر نومبر ۱۹۵۸ء کی تحریر میں یہ اطلاع دی کہ ۲۲ر اکتوبر کو ہندستانی قیدی سرحد پار بھیج دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ جس علاقے میں یہ واقعہ ہوا وہ بہت ہی دشوار گذار ہے اور جیسا کہ ہندستان کے سفیر نے چینی حکومت سے کہا "یہ محض اتفاق تھا کہ ہندستانی قیدی زندہ رہ گئے"۔

اس واقعہ کے کوئی ایک سال بعد ۲۱ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کو اسی علاقے میں اسی قسم کا اس سے بہت زیادہ سنگین واقعہ رونما ہوا۔ جب ہندستانی حدود کے اندر ایک مورچہ بند چینی فوجی دستے نے ہندستانی پولیس کے ایک گشتی دستے پر جو اپنے کچھ ساتھیوں کی تلاش میں نکلا تھا اور معمولی اسلحہ لئے ہوئے تھا بندوقوں اور مشین گنوں سے حملہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ۹ ہندستانی ہلاک ہو گئے اور باقی گرفتار کر لئے گئے۔ ۲۴ر اکتوبر کو چینی حکومت نے ہندستانیوں کی لاشیں اور قیدی واپس کرنے کی پیش کش کی۔ ان کو واپس لانے کے لئے ایک ہندستانی دستہ فوراً روانہ کر دیا گیا مگر واپسی کی نوبت ۱۴ر نومبر سے پہلے نہیں آسکی اور ہندستانی سپاہیوں پر قید کے دوران بے جا سختی بھی کی گئی۔

تبت کی بغاوت اور اُس کی بازگشت۔

اگرچہ سرحد کے مسئلے پر ہندستان اور چین کا اختلاف جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کوئی پانچ سال پہلے رونما ہوا تھا مگر دونوں ملکوں کے تعلقات کی تلخی تبت کی بغاوت کے بعد سے بہت بڑھ گئی۔ یہ بغاوت اپنی پوری شدت کے ساتھ دنیا کے سامنے پچھلے سال کے ابتدائی مہینوں میں آئی مگر تبت میں بے چینی کچھ عرصہ پہلے سے پائی جاتی تھی۔

تبت کی بے چینی دراصل وہاں کے مقامی حالات اور چینی حکام اور تبتی عوام کے اختلافات پر مبنی تھی۔ مارچ ۱۹۵۹ء میں اس نے مسلح بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور اس مہینے کے آخری دن دلائی لاما اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ پناہ کی تلاش میں ہندستان آگئے۔ ہندستان کی حکومت نے بین اقوامی رواج اور دلائی لاما کی پوزیشن کا احترام کرتے ہوئے ان کو اور کچھ اوپر تیرہ ہزار دوسرے تبتیوں کو پناہ دینا منظور کر لیا۔ لیکن یہ سب ہندستان پہنچنے پر غیر مسلح کر دئے گئے، تبت کی سرحد سے کافی دور رکھے گئے اور ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کریں جس سے ہندستان اور چین کے دوستانہ تعلقات پر آنچ آئے۔ جواہر لال جی نے تبت کا مسئلہ انجمن متحدہ اقوام میں اُٹھائے جانے کی بھی مخالفت کی۔ لیکن چین نے ہندستان میں ان کے پناہ دئے جانے کو پسند نہیں کیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ دلائی لاما کو کچھ رجعت پسند اغوا کر کے ہندستان لے گئے ہیں۔ دلائی لاما کے بعض بیانات پر جن میں چین کی تبتی پالیسی کی مذمت کی گئی تھی اور ہندستان میں بعض پارٹیوں نے دلائی لاما کی حمایت میں جو مظاہرے کئے ان پر بھی چین نے اعتراض کیا۔ اگرچہ حکومت ہند نے چینی حکومت کو متعدد بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہندستان میں دستور کے تحت اخبارات اور افراد کو اظہار رائے کی پوری آزادی ہے اور وہ خود اس ملک کی حکومت پر کڑی

نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن بہ ظاہر چین کی حکومت اس بات کو سمجھ نہیں سکی۔ اس کے رویّہ کی سختی خط و کتابت کے علاوہ بعض سرحدی واقعات میں بھی جھلکتی ہے۔

مغربی سرحد پر ایسے واقعات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مشرقی سرحد پر اس قسم کا سب سے بڑا واقعہ لانگ جو کی ہندستانی چوکی پر چین کا قبضہ ہے۔ یہ مقام ہندستان کی شمال مشرقی سرحدی ایجنسی (نیفا) میں واقع ہے اور دلائی لاما نیز تبت کے بیشتر پناہ گزیں اسی طرف سے ہندستان میں داخل ہوئے تھے۔ اسی علاقے کے سرحدی خط کو میک ماہن کہا جاتا ہے۔ دلائی لاما کے ہندستان کے آنے کے بعد اس سرحدی خط کے جنوب میں چینی فوجیوں نے متعدد چھاپے مارے اور آخر ۲۶ اگست ۵۹ء کو انھوں نے لانگ جو سے ہندستانی پہرے داروں کو ہٹا کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ اس سے پہلے ۲۳ جنوری کو چینی وزیر اعظم نے ہندستانی وزیر اعظم کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ سرحدی جھگڑوں کی روک تھام کے لئے سرحد کے قطعی تصفیہ تک موجودہ صورت حال کو عارضی طور پر جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔

عارضی سمجھوتے کی تجویزیں۔

ہندستان کے وزیر اعظم نے اپنے ۲۲ مارچ کے جواب میں اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے اس میں یہ اضافہ کیا تھا کہ اگر کسی فریق نے پرانی سرحد پار کر کے کسی جگہ قبضہ کر لیا ہے تو وہ یہ قبضہ ہٹا لے۔ بعد کو حکومت ہند نے یہ بھی کہا کہ لانگ جو میں کسی فریق کی فوج نہ رہے۔ اور اس کی آڑ لے کر چینی وزیر اعظم نے اپنے ۷ نومبر ۵۹ء کے خط میں ہندستانی وزیر اعظم کو لکھا کہ سرحدی جھگڑوں کی روک تھام کے لئے دونوں طرف کی فوجیں مشرق میں میک ماہن لائن سے اور مغرب میں اس خط سے جہاں تک ان کا قبضہ ہے ساڑھے بارہ میل پیچھے ہٹ جائیں لیکن وہ تخلیہ شدہ علاقے میں غیر فوجی نظم و نسق کے لئے غیر مسلح پولیس رکھ سکتے ہیں۔

یہ پہلا موقع تھا جب چین کی طرف سے سمجھوتے کی کوئی تجویز آئی اور اس کے جواب میں جواہر لال جی نے لکھا کہ میک ماہن لائن کے جنوب کا علاقہ اتنا دشوار گذار ہے کہ ہندستان کے لئے کوئی نئی چوکیاں بنانا ناممکن ہوگا۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں سرحدی جھگڑوں کا امکان اس طرح ختم ہو جائے گا کہ کسی طرف کی فوجیں گشت پر نہ نکلیں اور یہی طریقہ سرحد کے وسطی خطے پر بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مغربی حصہ کا تعلق ہے اس کے متعلق ہندستانی نقشوں کی صحت پر اصرار کرنے کے باوجود وزیر اعظم نہرو نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندستان اپنی فوجیں اور کارندے ہند چین کے نقشوں میں دکھائی ہوئی سرحد کے مغرب تک اور چین اپنی فوجیں اور کارندے ہندستانی نقشوں میں دکھائی ہوئی سرحد کے مشرق تک ہٹا لے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تجویزیں ہندستان اور چین دونوں کے لئے باعزت ہیں جب کہ وزیر اعظم چو کی تجویزوں سے ہندستان کے کچھ حصہ پر چین کا قبضہ برقرار رہتا۔

ہندستان کے وزیر اعظم کے ۱۶ نومبر والے خط کا چین کے وزیر اعظم نے ۱۷ دسمبر کو جو جواب دیا اس میں انھوں نے اپنے ملک میں شائع ہونے والے نقشوں کی صحت پر اصرار کیا، ہندستانی وزیر اعظم کی تجویز کو رد کر دیا اور لکھا کہ دونوں وزرائے اعظم ۲۶ دسمبر کو یا کبھی اور تاریخ کو چین میں کسی جگہ یا رنگون میں مل کر بات چیت کریں۔ نہرو جی نے اپنے جواب میں مسٹر چو این لائی سے ملنے اور بات چیت کرنے پر آمادگی ظاہر کی مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ جب واقعات ہی کے بارے میں اختلاف ہے تو اصولوں پر سمجھوتہ کیسے ہو سکتا ہے اور بات چیت سے کیا حاصل ہوگا۔ واقعات پر اختلاف اور ہندستان کے علاقے پر چین کا دعویٰ اور قبضہ ابھی باقی ہے۔

ہندستان کی پالیسی۔

ہندستان اس قبضے کو برداشت کرنے کے لئے نہیں تیار ہے لیکن وہ گفت و شنید کے ذریعے سمجھوتے کے لئے پہلے کی طرح آج بھی تیار ہے۔ یہ بات وزیر اعظم نہرو کی تقریروں اور بیانوں کے علاوہ ان کی پالیسی میں بھی جھلکتی ہے۔ انھوں نے سردست چین کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کی مخالفت کی ہے، اس مسئلے کو انجمن متحدہ اقوام میں لے جانے یا اس پر غور کرنے کے لئے بنڈونگ کانفرنس کی طرح کا کوئی اجتماع کرنے یا باہر سے فوجی امداد لینے کی تجویزوں کو بھی ہندستان کی حکومت رد کرتی رہی ہے۔ اور ہندستان کے کسی فوجی جتھے بندی میں شامل ہونے کا سوال نہ پہلے پیدا ہوتا تھا نہ اب پیدا ہوتا ہے۔

فوجی جتھے بندیوں سے الگ رہنے کی پالیسی کی بنا پر ہندستان نے پاکستان کے ساتھ مشترکہ دفاع کی تجویز بھی رد کر دی ہے۔ لیکن اس پالیسی میں کوئی بے جا عصبیت نہیں ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ امریکا اور

ہندستان میں معض مسئلوں پر اختلاف رائے رہا ہے اور ہندستان ناٹو سیٹو اور سینٹو جیسے معاہدوں کو جن میں امریکا شامل ہے پسند نہیں کرتا، جب امریکا کے صدر امن کا پیغام لے کر دورے پر نکلے اور ہندستان آئے تو یہاں ان کا خیر مقدم نہ صرف سرکاری بلکہ قومی پیمانے پر ہوا۔ دوسری طرف صدر آئزن ہوور نے بھی ہندستان کی امن پسندی کا اعتراف کیا اور کہا کہ امن کی جد و جہد کے رہنماؤں میں ہندستان ہمیشہ شامل رہے گا

امن کی جد و جہد۔

یہ جد و جہد پچھلے سال کے شروع ہی سے خاصی تیز ہو گئی تھی اسلئے کہ بڑی طاقتوں نے جو اسلحہ بندی کی دوڑ میں معروف تھیں یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو برباد کرنے کی کوشش میں خود بھی برباد ہو جائیں گی اور اس طرح کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ ایسے حل کے لئے باہمی گفتگو ایک واحد ذریعہ ہے۔ فروری میں برطانیہ کے وزیر اعظم نے روس کے دورے سے بڑی طاقتوں میں براہ راست بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سے پہلے روس کے نائب وزیر اعظم امریکا گئے اور پھر امریکا کے نائب صدر نے روس کا دورہ کیا۔ ایسے دوروں کی چند مہینے پہلے تک کوئی امید نہیں کی جاتی تھی اور وزیر اعظم خروشچوف کا امریکا جانا یا صدر آئزن ہوور کا روس جانے کی بات مان لینا تو قیاس کے حدود سے بھی باہر تھا۔ لیکن ستمبر ۱۹۵۹ء میں ایک دن ایسا آگیا جب روس کے وزیر اعظم امریکا کے دورے پر وہاں پہنچ گئے۔ یہ ان کے اور امریکیوں دونوں کے لئے ایک نئی بات تھی۔ اسی لئے امریکا کے بعض شہروں میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں جن سے شری خروشچوف کو ناراضگی ہوئی مگر بہت سی باتیں ایسی بھی ہوئیں جو ان کی خوشی کا باعث بنیں۔ واپس جانے سے پہلے انھوں نے نہ صرف صدر آئزن ہوور سے موسم بہار میں روس کے دورے کا وعدہ لے لیا بلکہ متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے چار سال کے اندر مکمل تخفیف اسلحہ کا ایک منصوبہ بھی پیش کر دیا جس میں نہ صرف فوجوں کو کم کرنے بلکہ جنگی وزارت ختم کرنے اور فوجی کالج بند کرنے کی باتیں بھی شامل تھیں۔ اس مکمل منصوبے کے ساتھ ہی روسی وزیر اعظم نے ایک جزوی سمجھوتے کا خاکہ بھی پیش کیا۔

مکمل تخفیف اسلحہ کی روسی تجویز متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی میں بھی پیش ہوئی اور اسمبلی نے اپنی تاریخ میں پہلی بار مکمل اتفاق رائے سے ایک رزولیوشن منظور کیا جس میں کہا گیا کہ ممکن حد تک کم سے کم مدت میں عالمگیر پیمانے پر مکمل تخفیف اسلحہ کے لئے ضروری کارروائیاں کی جائیں۔ ایسی کارروائیاں تجویز کرنے کا کام متحدہ اقوام کی تخفیف اسلحہ کمیٹی کے سپرد کیا گیا جس میں کمیونسٹ اور مغربی طاقتوں کے پانچ پانچ ممبر شریک ہیں۔ اس سلسلہ میں انجمن متحدہ اقوام میں ہندستانی وفد کے لیڈر شری کرشنا مینن نے رزولیوشن پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کمیٹی میں کسی مسئلے پر تعطل کی صورت پیدا ہو تو وہ مسئلہ فوراً ہی بڑی طاقتوں کے پاس طے کرنے کے لئے بھیج دیا جائے۔ انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ سنہ ۱۹۶۰ء کے وسط میں متحدہ اقوام کا تخفیف اسلحہ کمیشن جو اس انجمن کے پورے ۸۲ ممبروں پر مشتمل ہے اس مسئلے پر غور کرے۔

اسمبلی نے اس سلسلے میں کئی اور تجویزیں بھی منظور کیں۔ ایک میں کہا گیا ہے کہ ایٹمی تجرباتی دھماکوں پر مکمل امتناع کے لئے جلد سے جلد ایک ایسا سمجھوتہ کیا جائے جس میں بین اقوامی کنٹرول کا بندوبست بھی شامل ہو۔ اس رزولیوشن کی کسی ممبر نے مخالفت نہیں کی۔ صرف فرانس اور افغانستان غیر جانبدار رہے اور ۸۰ ممبروں نے اس کی موافقت میں ووٹ دئے۔ ایک دوسری تجویز میں جس کی مخالفت اکیلے فرانس نے کی دنیا کی تمام قوموں سے کہا گیا ہے کہ وہ ایٹمی اور ہائیڈروجنی اسلحہ کے تجربے نہ کریں۔ اس تجویز پر رائے شماری میں انجمن اٹلانٹک کے کچھ ممبر اور جنوبی امریکا کے بعض ملک غیر جانبدار رہے۔ آئرلینڈ کی پیش کی ہوئی یہ تجویز بھی جنرل اسمبلی میں منظور ہو گئی کہ جن طاقتوں کے پاس ایٹمی اسلحہ نہیں ہیں وہ ایسے اسلحہ نہ بنائیں اور جن طاقتوں کے پاس ایسے اسلحہ ہیں وہ ان کا کنٹرول غیر ایٹمی طاقتوں کے حوالے نہ کریں۔

کگارے سے واپسی۔

تخفیف اسلحہ کے متعلق انجمن متحدہ اقوام کی ان تجویزوں سے پہلے جرمنی اور خاص کر اس کی سابقہ راجدھانی برلن کا مسئلہ بین اقوامی کشاکش کا ایک بڑا مورچہ بن گیا تھا۔ جنگ کے بعد سے جرمنی کی طرح اس کی راجدھانی بھی دو منطقوں میں بٹ گئی ہے۔ مشرقی برلن روس کے زیر اثر ہے اور مغربی برلن میں مغربی طاقتوں کا عمل دخل ہے۔ ان کو اپنے منطقے تک جانے کے لئے مشرقی جرمنی سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ مشرقی جرمنی کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتیں۔ اس حکومت کو روس کی حمایت حاصل ہے اور روس نے پچھلے سال مغربی طاقتوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ مشرقی برلن کا نظم و نسق مشرقی

جرمنی کی حکومت سے حوالے کر دے اور مغربی برلن کو ایک آزاد شہر قرار دے دیا جائے۔ اس تجویز کو مغربی طاقتوں نے لپنے اور روس کے اس سمجھوتے سے خلاف قرار دیا جس میں برلن پر چار طاقتی کنٹرول کی بات طے ہو گئی تھی۔ لیکن روس نے اپنی تجویز پر عملدرآمد کی تاریخ تک مقرر کر دی۔ یہ بحث اتنی بڑھی کہ کئی ہفتے تک دنیا بالکل جنگ کے کنارے پر کھڑی رہی۔ لیکن پھر روس نے اپنی تجویز کی یہ تشریح کی کہ اس کی نوعیت الٹی میٹم کی نہیں بلکہ بات چیت کے لئے ایک بنیاد کی ہے اس طرح جنگ کا خطرہ ٹل گیا اور بین اقوامی کشاکش کم ہو گئی۔

اس اثنا میں ایٹمی اسلحہ کے تجربے روکنے کی بات چیت جو امریکا برطانیہ اور روس کے درمیان جنیوا میں ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو شروع ہوئی تھی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ سمجھوتے کی کئی دفعات منظور ہو گئیں اور کنٹرول کی قرارداد جس کے متعلق شروع میں کمیونسٹ اور مغربی طاقتوں کے درمیان خاصے شدید اختلافات تھے، عام طور پر تسلیم کر لی گئی۔

ایٹمی دھماکوں کو روکنے اور اسلحہ میں تخفیف کرنے کے متعلق ابھی کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا ہے اور جرمنی کے اتحاد اور برلن کے نظم و نسق کے مسئلے بھی طے نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ راکٹ سازی میں روس کی مزید کامیابی، جو روسی سیارے کے سورج کے گرد چکر لگانے اور روسی راکٹ کے چاند تک پہنچ جانے سے ظاہر ہو گئی ہے، امریکا کو اس میدان میں اپنی کوششیں تیز تر کرنے کے لئے اکسا رہی ہے اور فرانس ایک ایٹمی طاقت بننے کے لئے الجیریائی صحرائے اعظم میں تجرباتی دھماکے کرنے پر اصرار کر رہا ہے۔ اگرچہ اس پر افریقی ملکوں نے اعتراض کیا ہے اور انجمن متحدہ اقوام میں بھی اسے ٹوکا گیا ہے۔ اسی طرح جتھے بندی کا رجحان ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ یورپ میں کمیونسٹ ملکوں کا معاہدہ وارسا اور مغربی طاقتوں کا معاہدہ اٹلانٹک باقی ہے۔ مشرقی ایشیا میں سیٹو اور مغربی ایشیا میں سینٹو کو (جو معاہدہ بغداد کا نیا نام ہے) حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دفاع کے نام پر کی جانیوالی ان تنظیموں کی فوجی قوت بڑھانے پر زور دیا جا رہا ہے۔

مصالحت کی طرف۔

صدر آئزن ہوور نے بھی اپنے دورے میں ان تنظیموں میں شریک ملکوں کو انکے لئے امریکا کی تائید کا یقین دلایا ہے مگر ان کا زیادہ تر زور اس بات پر رہا ہے کہ قوموں کے مابین خوف کے اسباب دور ہوں، تخفیف اسلحہ کے مسئلے پر کنٹرول کے بندوبست کے ساتھ سمجھوتہ ہو، اختلافات قوت کے استعمال سے نہیں بلکہ گفت و شنید کے ذریعے طے ہوں اور سائنس کو انسانیت کی بربادی کے بجائے انسانوں کے خوش حال بنانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ امریکی صدر نے اپنے امن کے پیغام کی جو وضاحت کی اس میں خلوص کی جھلک واضح طور پر موجود تھی۔ دوسری طرف روس نے بھی امن کے لئے ایسے ہی خلوص کا اظہار کیا ہے۔ اور اس طرح دنیا کی دو بڑی طاقتیں جو کچھ عرصہ پہلے ایک دوسرے کو سخت سست کہتی رہتی تھیں ایک دوسرے کی نیک نیتی کا اعتراف کر رہی ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دوستی اور مصالحت کا ہاتھ بڑھا رہی ہیں۔ ان کے درمیان سائنسی تعلیمی اور تہذیبی امور میں تعاون کا ایک معاہدہ بھی ہو گیا ہے او. ایسا ہی ایک معاہدہ پچھلے سال برطانیہ اور روس کے درمیان بھی ہوا ہے۔

چار بڑی طاقتوں، امریکا، برطانیہ، فرانس اور روس کے سربراہوں کی چوٹی کانفرنس اگرچہ عرصے سے ٹلتی آ رہی ہے مگر اس کا انعقاد اب یقینی ہو گیا ہے۔ دسمبر میں تینوں مغربی طاقتوں کے سربراہوں نے اپنی پیرس کانفرنس میں تجویز کیا تھا کہ یہ کانفرنس آخر اپریل میں بلائی جائے لیکن روسی وزیر اعظم کے کہنے سے ۱۶ مئی کی تاریخ طے ہو گئی ہے اور اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے دونوں طرف سے پرخلوص ارادوں کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

چار بڑوں کی چوٹی کانفرنس سے یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ وہ برلن اور جرمنی کے مستقبل یا اسلحہ میں تخفیف جیسے مسئلے چند روز میں طے کر دے گی، یا یہ کہ اس کے انعقاد سے قوموں کا باہمی خوف ایک دم سے ختم ہو جائے گا یا یہ کہ مختلف قوموں کے تمام تنازعوں کے تصفیہ کی کوئی فوری تدبیر نکال لی جائے گی۔ پھر بھی پچھلے سال کے آخر میں دنیا کے جو حالات تھے ان کی بنا پر سرد جنگ میں روز افزوں کمی کی امید ضرور کی جا سکتی ہے۔ اور جیسے جیسے یہ کمی رونما ہوتی جائے گی ویسے ہی ویسے باہمی خوف گھٹتا جائے گا اور خوف کے تحت کئے جانے والے اقدامات اور انتظامات غیر ضروری بنتے جائیں گے۔ جس طرح جنگ کی فضا میں ہر تنازعے کو قوت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اسی طرح امن کی فضا میں تنازعوں کا حل پرامن گفت و شنید کے ذریعے تلاش کیا جانے لگے گا۔۔ جو حکومتیں اس راہ سے ہٹ کر چلنا چاہیں گی وہ عالمی رائے عامہ کو اپنا مخالف بنا لیں گی۔ بظاہر اسی احساس کے تحت جواہر لال جی چین اور ہندستان کے تعلقات کی خرابی کے ساتھ عام طور پر بین اقوامی فضا کے سدھار کا بھی ذکر کرتے رہتے

ہیں۔ اس وسیع تر پس منظر میں ہندستان کے خلاف چین کی زور دستی اور زیادہ تشویشناک ہی نہیں بلکہ افسوسناک بھی بن جاتی ہے۔

بین اقوامی کشاکش کو جہاں ایک طرف چھوٹے چھوٹے جھگڑوں سے تقویت ملتی ہے وہاں دوسری طرف یہ کشاکش چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو پیدا کرتی اور بڑھاتی بھی رہتی ہے چنانچہ مغربی ایشیا کے بعض ملکوں کے باہمی اختلافات کی جڑیں جیسا کہ ہندستان کی طرف سے کہا جاتا رہا ہے معاہدہ بغداد تک جاتی ہیں اور مشرقی ایشیا میں لاؤس اور شمالی ویٹ نام کے اختلافات نے پچھلے سال کے وسط میں جو سنگین صورت اختیار کرلی اس میں 'سیٹو' کے اثرات خاصے نمایاں تھے۔ یہ دوسرا جھگڑا لاؤس کی شکایت پر اور روس کی مخالفت کے باوجود متحدہ اقوام کے سامنے بھی آیا اور سلامتی کونسل نے دریافت حال کے لئے ایک کمیٹی وہاں بھیجی کمیٹی کی اس رپورٹ سے کہ شمالی ویٹ نام کی طرف سے لاؤس پر فوج کشی کی کوئی واضح شہادت اسے نہیں ملی یہ جھگڑا محدود ہوگیا ہے اور لاؤس دوسرا کوریا بننے سے بچ گیا ہے۔ مگر یہ گتھی ابھی سلجھی نہیں ہے۔

مغربی ایشیا میں صدر ناصر اور وزیراعظم قاسم اور ان کی حکومتیں پچھلے سال بھی ایک دوسرے سے اتنی ہی دور رہیں جتنی کہ پہلے تھیں اور وزیراعظم قاسم پر قاتلانہ حملے کے بعد سے جو ایک عراقی ہی کے ہاتھوں ہوا ان دونوں ملکوں کے اختلافات خاصے بڑھ گئے۔ لیکن متحدہ عرب جمہوریہ نے سنہ ۱۹۵۹ء میں اردن سے اپنے تعلقات سدھار لئے' سوڈان سے دریائے نیل کے پانی کی تقسیم پر ایک سمجھوتہ کرلیا اور برطانیہ کے ساتھ بھی سفارتی تعلقات جو سنہ ۱۹۵۶ء میں سوئیز پر حملے کے بعد سے ختم ہوگئے تھے بحال ہوگئے۔

الجیریا کا مسئلہ:-

افریقی ایشیائی ملکوں کے لئے الجیریا کا مسئلہ بدستور فکرمندی کا باعث بنا رہا۔ فرانس کے صدر جنرل ڈی گال نے پچھلے سال اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک منصوبہ پیش کیا جس کا انداز خاصا جرأت مندانہ تھا۔ انھوں نے الجیریا کے لوگوں کا حق خود ارادیت مان لیا اور اس بات کا فیصلہ ان ہی پر چھوڑ دیا کہ آیا وہ اپنے ملک کو فرانس کا ایک جزو بنانا چاہتے ہیں یا اس کے زیر سایہ ایک خود مختار علاقہ رکھنا چاہتے ہیں یا اس سے بالکل ہی قطع تعلق کرلینا چاہتے ہیں لیکن انھوں نے الجیریا والوں کے اس حق کے استعمال پر یہ شرط لگا دی کہ وہ آزادی کی لڑائی بند کردیں اور کئی سال تک تشدد آمیز وارداتیں رکی رہیں۔ جنرل ڈی گال نے الجیریا میں بسے ہوئے فرانسیسیوں کے حقوق کا ذکر بھی کچھ اس طرح کیا تھا کہ آزادی کے فیصلے کے بعد تقسیم کا سوال اٹھنے کا امکان باقی رہتا تھا۔ ان باتوں کو الجیریا قوم پروروں نے شک کی نظروں سے دیکھا اور اس بات کی واضح ضمانت طلب کی کہ حق خود ارادیت کے استعمال میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ اس کے جواب میں فرانس لڑائی بندی کے فوجی پہلو کے متعلق بات چیت پر اصرار کرتا رہا لیکن جب قوم پروروں نے بات چیت کے لئے اپنے ان ساتھیوں کو نامزد کردیا جو پہلے ہی سے فرانس کی قید میں ہیں تو فرانس نے ان کو رہا کرنے اور اس کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھنے سے انکار کردیا۔

اس تعطل کو دور کرنے کی ایک کوشش انجمن متحدہ اقوام میں بھی افریقی ایشیائی ملکوں کی طرف سے ہوئی اور ایک رزولیوشن اس مطلب کا پیش کیا گیا کہ فرانس کی حکومت الجیریائی نمایندوں سے بات چیت کرے۔ جنرل اسمبلی میں اس رزولیوشن کو اکثریت تو حاصل ہوگئی مگر یہ اکثریت دو تہائی سے جو اس طرح کے رزولیوشن کی منظوری کے لئے ضروری ہے کم رہی۔ اور فرانس اپنی اس دلیل کے رد کردئے جانے کے باوجود کہ الجیریا کا مسئلہ اس کا گھریلو مسئلہ ہے اسی دلیل کی بنا پر الجیریائی مباحثے کا بائی کاٹ کئے رہا۔

یہی دلیل دے کر جنوبی افریقہ کی حکومت نے ہندستانی اور پاکستانی نسل کے لوگوں کے متعلق اپنی نسلی تفریق کی پالیسی پر متحدہ اقوام کے مباحثے کا بائی کاٹ کردیا لیکن جنرل اسمبلی نے خاصی بڑی اکثریت سے ایک رزولیوشن پاس کرکے اس سے کہا ہے کہ وہ اس مسئلے پر بقیہ دونوں حکومتوں سے بات چیت کرے۔ چونکہ بعض بڑی طاقتیں اپنی خاموشی سے جنوبی افریقہ کی حکومت کی ہمت افزائی کرتی رہتی ہیں اور چونکہ متحدہ اقوام کے پاس اپنے فیصلوں کو منوانے کے لئے کوئی طاقت اور اختیار نہیں ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ انجمن متحدہ اقوام کے اگلے اجلاس تک یہ مسئلہ جوں کا توں بنا رہے لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس اثنا میں بعض ایسی باتوں کی اہمیت بہت کم ہوجائے جن کی بنا پر بعض بڑی اور چھوٹی طاقتیں فرانس اور جنوبی افریقہ کی پالیسیوں سے اصولی اختلاف رکھنے کے باوجود ان پالیسیوں میں تبدیلی کے لئے اپنے اثرات استعمال نہیں کر رہی ہیں۔

ہندستان اور پاکستان:-

الجیریا اور جنوبی افریقہ کے مسئلوں پر انجمن متحدہ اقوام میں زیادہ تر ایشیائی افریقی ملکوں نے ایک ساتھ ووٹ دیا اور اس سے ان کے مفادات

اتر پردیش میں ترقیاتی سرگرمیاں

وزیر اعظم جواہر لال نہرو، پچ پوری (آگرہ) میں ۱۰ر نومبر ۱۹۵۹ء کو اتر پردیش میں
خدمتی امداد باہمی انجمنوں کا افتتاح کر رہے ہیں

ڈاکٹر سمپورنانند، ۱۲ر مارچ ۱۹۶۰ء کو ریہاند بجلی گھر میں پہلے ٹربائن کے اسپیڈرنگ کو ایک
کرین کی مدد سے نیچے اترتا دیکھ رہے ہیں،

رودرپور ضلع نینی تال کا زیر تعمیر زرعی کالج

صنعتی ریاست نینی (الہ آباد)

مراد آباد سے ۲۰ میل پر دریائے بان کا نو تعمیر پل

قدوائی میموریل اسپتال بارہ بنکی
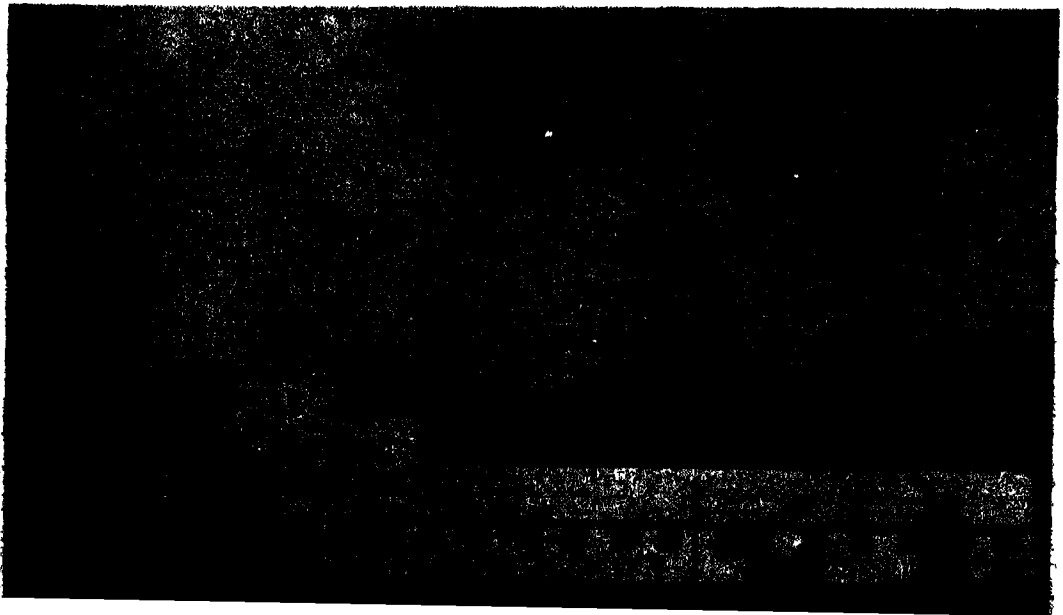
اترپردیش کے سرحدی علاقہ میں پرائمری اسکول کی نو تعمیر عمارت

روڈویز کی نئی بسیں

ضلع اٹاوہ میں ایک پنچایت کی تعمیر کردہ پلیا

امداد باہمی دودھ یونین لکھنؤ میں پاسچری کا شعبہ

کی یکسانیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی باہمی یگانگت کی نشان دہی انجمن متحدہ اقوام کے مباحث کے علاوہ بعض دوسری باتوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً افریقہ میں غانا نے برطانیہ سے اور گنی نے فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنی ایک یونین بنالی اور ہندستان نے مشرقی ایشیا کے کچھ ملکوں سے اپنے پُرانے تعلقات کی تجدید کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ہندستانی جمہوریہ کے صدر نے سابقہ ہندچین کے ملکوں کمبوڈیا شمالی ویٹ نام، لاؤس اور مغربی ویٹ نام کا دورہ کیا اور وزیر اعظم نہرو افغانستان اور ایران گئے۔ ان سب ملکوں کی خارجہ اور داخلہ پالیسیاں ہندستان کی پالیسیوں سے مطابقت نہیں رکھتیں بلکہ ان سب سے کچھ کا رویّہ تو بنیادی سوالوں پر بھی ہندستان سے مختلف ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہندستان کے ساتھ اور ہندستان نے ان کے ساتھ تہذیبی روابط اور معاشی تعاون بڑھانے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔

اس سلسلے کا سب سے زیادہ خوش گوار واقعہ ہندستان اور پاکستان کا ایک دوسرے سے قریب آجانا ہے۔ پاکستان کے صدر جنرل (اب فیلڈ مارشل) ایوب خاں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے دہلی کے ہوائی اڈّے پر ہندستان کے وزیر اعظم سے ملاقات کرنے کے لئے رُکے اور اس مختصر سی ملاقات کے نتائج خاصے دور رس نکلے۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں حکومتوں کے وزیروں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں ہندستان اور مشرقی پاکستان کی سرحد کے بعض مسئلے جو مہینوں نہیں برسوں سے چلے آرہے تھے اور متعدد بار جھگڑیوں کا باعث بن چکے تھے ایک دم سے طے ہوگئے۔ اس سے پہلے مارچ میں ہندستان نے پاکستان اور امریکا کے فوجی امداد کے معاہدے پر احتجاج کیا تھا اور اپریل میں ہندستانی ہوائیہ کے ایک ہوائی جہاز کے، جو راستہ سے بھٹک کر پاکستان چلا گیا تھا، وہاں گرا لئے جانے پر دونوں ملکوں کے تعلقات خاصے کشیدہ ہوگئے تھے۔ مگر ایوب نہرو ملاقات نے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پُرانی ناخوشگوار باتوں کے اوراق الٹ کر دونوں ملکوں کے تعلقات کا ایک نیا اور خوشگوار باب شروع کردیا۔ یہ صحیح ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا ہے اور مالیاتی امور پر سمجھوتے کی گفتگو کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ملتوی ہوگئی ہے مگر یہ گفتگو ختم نہیں ہوئی ہے اور نہری پانی کی تقسیم پر سمجھوتے کے روشن امکانات سے دوسرے مسئلوں کے گفت و شنید کے ذریعے طے ہوجانے کی اُمید پائی جاتی ہے۔ ہندستان کی طرف سے ایسی امید کا اظہار پہلے بھی کیا جاتا تھا اور پچھلے چند مہینوں کے واقعات سے ظاہر ہوگیا ہے کہ ہندستان کا اندازہ کسی خوش فہمی پر نہیں بلکہ دوربینی پر مبنی تھا۔

✡

نیا گاؤں

(بسلسلۂ صفحہ ۴۲)

اور پھر دوسری دوپہر کو میں نے دیکھا لوگ فقیر بابا کی جھونپڑی کے استھان پر نئے گاؤں کا چوپال بنا رہے تھے جہاں گاؤں کی پنچائت بیٹھا کرے گی۔ انھوں نے ایک اونچی جگہ بنا کر اُسے خالی چھوڑ دیا۔ وہاں صرف کچھ تازہ پھول رکھ دیے۔ یہ فقیر بابا کا آسن تھا۔ اُس آسن پر کوئی دوسرا نہ بیٹھے گا۔ وہ سدا خالی رہے گا لیکن فقیر بابا کی آتما اُس کو کبھی نہ چھوڑے گی۔ فقیر بابا کی آتما اس دھرتی کی ہر دھڑکن کے ساتھ تھی جیسے سنگیت دنیا کے ساتھ ہوتا ہے جس روز گاؤں کی پنچایت کی پہلی بیٹھک ہوئی برگد کے پیڑ کے پکے ہوئے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں پھل گرے جیسے آسمان سے بتاشے برس رہے ہوں اور سواگت کررہے ہوں نئے پنچایتی نظام کا۔

سالک لکھنوی

ہم تیری عطا ظرف سے کم دیکھ رہے ہیں
دل میں ابھی گنجایشِ غم دیکھ رہے ہیں

یہ بھی اسی دنیا میں ہوئی ایک نئی بات
ظالم کو پشیمانِ ستم دیکھ رہے ہیں

میخانے میں ساقی سے ملائے ہوئے نظریں
شیشے مری توبہ کا بھرم دیکھ رہے ہیں

انجامِ کرم بھی کسی دن دیکھ ہی لینگے
ہم تو ابھی آغازِ کرم دیکھ رہے ہیں

جب چاہیں فضاؤں سے قفس لیکے گذر جائیں
اتنا پرِ پرواز میں دم دیکھ رہے ہیں

دل کشمکشِ حسرتِ دیدار میں گم ہے
وہ دیکھنے پاتے ہیں نہ ہم دیکھ رہے ہیں

کیا آپ نے بھی مول لیا دردِ محبت؟
کچھ روز سے ہنستے ہوئے کم دیکھ رہے ہیں

کیا ان کے لئے صبحِ تمنا کبھی ہوگی؟
ابتک جو سکوتِ شبِ غم دیکھ رہے ہیں

اُڑتا ہوا تدبیر کی تصویر کا ہر رنگ
آئینۂ تقدیر میں ہم دیکھ رہے ہیں

راہوں کے خم و پیچ میں الجھے ہوئے رہبر
سالک کے نشاناتِ قدم دیکھ رہے ہیں

ہندوستانی کھانے ـــ تاریخ کی روشنی میں

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول سے ہندوستانی معاشر میں مختلف قسموں کے جو کھانے رائج ہوئے ان پر ایک نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ زیر نظر مضمون میں زیادہ تر فارسی تاریخوں سے مدد لی گئی ہے کچھ معلومات اردو کی بعض مستند تصانیف اور کچھ زبانی روایتوں سے بھی فراہم کی گئی ہیں۔ افسوس ہے کہ ہندی زبان کے لٹریچر سے استفادہ نہیں کیا جا سکا ہے، لیکن بعض ہندو دوستوں نے جن خاص خاص کھانوں، ترکاریو اور مٹھائیوں کے نام بتائے ہیں ان کا ذکر ان ہی کے بیان پر کیا گیا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں اہل نظر مزید معلومات فراہم کریں گے تو راقم ان کا ممنون ہوگا۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں اور ان کے امراء کا کھانے کا ذوق بہت اعلیٰ اور لطیف رہا۔ اس لئے ان کے دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے ہوتے۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات کے وقت دعوت کی جو تفصیل لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی دعوتوں میں ایک ہزار سے زیادہ اقسام کے کھانے ہوتے، شربت قند کے سینکڑوں پیالے رکھے جاتے، منہ کا مزہ بدلنے کے لئے شربت گلاب ہوتا، پلاؤ کی کئی قسمیں ہوتیں، ایک قسم خرمے اور انگور ڈال کر پکائی جاتی، بکرے، دنبے اور ہرن کے بھنے ہوئے گوشت کی مختلف شکلیں ہوتیں، پرندوں میں تیتر، بٹیر، تیہو وغیرہ کے گوشت ہوتے۔ آخر میں پان تقسیم کیا جاتا۔ امیر خسرو کے نانا عماد الملک میر عرض کے عہدے پر مامور تھے۔ وہ اپنے ماتحتوں اور ملازموں کو روزانہ دوپہر کو کھانا کھلاتے اور پچاس طشت پر بہترین کھانے آتے۔

تیموریوں کے زمانے میں ترکستانی، ایرانی اور ہندوستانی ذوق کی آمیزش سے طرح طرح کے کھانوں کی ایجاد ہوتی رہی۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے دسترخوان پر کھانوں کی بے شمار قسمیں ہوتیں۔ ان ہی کی تقلید میں امرا بھی اپنا دسترخوان اسی شان سے سجاتے۔ ابوالفضل ایک وقت میں ۲۲ سیر کھاتا، اس لئے اس کے دسترخوان پر طرح طرح کی چیزیں ہوتیں۔ جہانگیری عہد کے ایک فوجی سردار باقر خاں نجم ثانی کے باورچی خانے کے لئے دو سو بکرے، چالیس اونٹ اور ایک ہزار دوسرے جانور روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ خانخاناں آصف خاں کے لڑکے اعتقاد خاں کے یہاں کھانوں کے اتنے اقسام ہوتے کہ کوئی اور امیر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ آخری دور میں قلعہ معلیٰ کے اندر اتنی قسموں کے کھانے پکائے جاتے کہ ان کی گنتی آسان نہیں۔ کھانے کے اس غیر معمولی شوق کی وجہ سے ہندوستانی کھانوں میں بڑی رنگا رنگی پیدا ہوتی رہی۔

ہندوستان کی عام اور اصل غذا چاول ہے۔ عام طور سے یہ ابال کر پکایا جاتا ہے جس کو بھات کہتے ہیں، یا کبھی اس میں دال ملا کر کھچڑی پکائی جاتی ہے۔ یا دودھ اور قند ملا کر کھیر تیار کرتے ہیں، اور دودھ کے بغیر جو پکاتے ہیں، وہ بھجیر کہلاتی ہے۔ مسلمانوں نے چاول پکانے میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کیں۔ شاہی دسترخوان پر نمکین اور میٹھے چاول کے ستر اقسام ہوتے۔ ان کی بعض قسموں کے نام آئین اکبری میں یہ ہیں :-

(۱) خشکہ ۔ اس میں چاول کے ساتھ نمک بھی ملا دیتے۔

(۲) قبولی ۔ گوشت، چاول، چنے کی دال، گھی، پیاز، ادرک، دارچینی، کالی مرچ، زیرہ، الائچی اور لونگ ملا کر تیار کی جاتی۔

(۳) زرد بریان ۔ یہ چاول اور گوشت ملا کر پکایا جاتا لیکن اس میں زیادہ سے زیادہ گھی دیا جاتا جو ضروری مسالوں میں بالکل پیوست ہو جاتا۔

(۴) قیمہ پلاؤ ۔ چاول میں قیمہ ڈالتے اور چنے کی دال بھی ملا دیتے۔

سالے میں پیاز ادرک اور کالی مرچ وغیرہ بھی دیتے۔

(۵) شُشلہ۔ اس میں اگر ساڑھے تین سیر چاول ہوتا تو دس سیر گوشت ملایا جاتا اور دو سیر گھی اور ضروری مسالے ہوتے۔

(۶) قیمہ شُشلہ۔ اس میں اگر دس سیر قیمہ ہوتا تو ایک سیر چاول اور آدھ سیر چنے کی دال ہوتی۔

مغل بادشاہوں کے آخری دور میں پلاؤ کی بہت سی قسمیں ہو گئی تھیں۔ مثلاً

(۷) ایرانی پلاؤ۔ اس میں سیر بھر چاول کے ساتھ چھ عدد انڈے خوبانی، بادام، پستہ، کشمکش، دہی اور دودھ دیا جاتا۔

(۸) کوکو پلاؤ۔ یہ دو سیر گوشت، ایک سیر چاول، پاؤ بھر دودھ، آدھ پاؤ بالائی اور آدھی چھٹانک کوکو دے کر پکاتے۔

(۹) کوکو قیمہ پلاؤ۔ اس میں گوشت کے بجائے قیمہ دیتے، لیکن آدھی چھٹانک گوشت کی یخنی بھی دی جاتی۔ یہ دیگچی کا منہ آٹے سے بند کر کے پکایا جاتا۔

(۱۰) کوکو قورمہ پلاؤ۔ اس میں جو گوشت ڈالا جاتا اس میں شوربا بھی ہوتا۔

(۱۱) موتی پلاؤ۔ عبدالحلیم شررؔ نے اپنی کتاب گذشتہ لکھنؤ میں اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ اس چاول کے ساتھ آبدار موتی ہوتے۔ موتیوں کے تیار کرنے کی ترکیب یہ تھی کہ تولہ بھر چاندی اور ماشہ بھر سونے کے ورق انڈے کی زردی میں خوب حل کر دیے جاتے۔ اور اس محلول کو مرغ کے نرخرے میں بھر کے نرخرہ کے ہر ہر جوڑ پر باریک دھاگے کس کے باندھ دیے جاتے اور اس کو تھوڑا سا جوش دے کر چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کر دی جاتی جس سے سڈول آبدار موتی نکل آتے، جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کر دیئے جاتے۔ بعض رکابدار پنیر کے موتی بناتے اور اس پہ چاندی کا ورق چڑھا دیتے۔

(۱۲) پلاؤ انار دانہ۔ اس میں ہر چاول آدھا تو یاقوت کی طرح سرخ اور چلا دار ہوتا اور آدھا سفید، مگر اس میں شیشے کی سی چمک ہوتی۔ جب دسترخوان پر لگایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ پلیٹ میں ابلق رنگ کے جواہرات سکے ہوئے ہیں۔

(۱۳) نورتن پلاؤ۔ اس میں نورتن کے مشہور جواہرات کی طرح نو رنگ کے چاول ملا دیئے جاتے اور مختلف جواہرات کے رنگ کی آب و تاب بڑی نفاست اور لطافت سے قائم رکھی جاتی۔

(۱۴) واجد علی شاہ کی خاص محل صاحبہ کے لئے ایک قسم کا پلاؤ ایسا بھی پکتا جس میں ۲۴ سیر گوشت کی یخنی تیار کر کے مقطر کر لی جاتی۔ اس میں چاول دم کیے جاتے اور جب پک کر تیار ہوتے تو کھاتے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ سب چاول خود ہی حلق سے اتر رہے ہیں اور کھانے کے بعد کوئی گرانی محسوس نہیں ہوتی۔

(۱۵) بعض رکابدار گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بناتے اور ان کو اس احتیاط سے پکاتے کہ ان کی صورتیں بگڑنے نہیں پاتیں اور ان کو پلاؤ میں چھوڑ دیتے۔ پھر قابوں میں اس طرح سجاتے کہ معلوم ہوتا کہ پلیٹ میں تیلی دانے چگ رہی ہیں۔

(۱۶) عبدالحلیم شررؔ ہی کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب کے یہاں ایک قسم کا پلاؤ ایسا پکتا جو صرف دو تین لقمے کھائے جاتے۔ ایک بار انھوں نے ایک پہلوان کو مدعو کیا جو صبح کو بیس سیر دودھ پیتا اور تین سیر بادام اور پستہ کھاتا۔ کھانے میں ڈھائی سیر آٹے کی روٹیاں اور پورے ایک بچھڑے کا گوشت کھا جاتا تھا۔ حکیم صاحب نے اس کو ایک طشتری میں پلاؤ کھلایا جس کو کھانے کے بعد وہ کچھ اور نہ کھا سکا۔ دوسرے دن آیا تو حکیم صاحب سے کہنے لگا کہ مجھ کو زندگی بھر ایسی توانائی اور چوچالی نصیب نہیں ہوئی تھی، جیسی کہ کل سے آج تک رہی۔

(۱۷) عبدالحلیم شررؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ نواب شجاع الدولہ کے سالے نواب سالار جنگ کا ایک باورچی تھا جو صرف ان کے لئے کھانا پکاتا اور بارہ سو روپیئے ماہوار پاتا تھا۔ وہ ایسا بھاری پلاؤ پکاتا تھا کہ نواب سالار جنگ کے سوا کوئی اور ہضم نہ کر سکتا تھا۔ ایک روز نواب شجاع الدولہ نے ان سے کہا کہ تم نے مجھ کو کبھی وہ پلاؤ نہیں کھلایا جو خاص اپنے لئے پکوایا کرتے ہو۔ نواب سالار جنگ نے ان سے وعدہ تو کر لیا لیکن جب اپنے باورچی کو پلاؤ زیادہ پکانے کے لئے حکم دیا تو اس نے کہا کہ میں تو صرف آپ کے خاصے کے لئے نوکر ہوں کسی اور کے لئے نہیں پکا سکتا۔ نواب سالار جنگ نے اس کو راضی کیا تو اس نے کہا "بہتر، مگر شرط یہ ہے کہ حضور خود لے جا کے اپنے سامنے کھلائیں، اور چند لقموں سے زیادہ نہ کھانے دیں اور احتیاطاً

آبدار خانے کا انتظام بھی کر کے اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ پلاؤ تیار ہوا تو اس کو سالار جنگ خود لے کر پہنچے۔ اور دسترخوان پر پیش کیا نواب شجاع الدولہ نے کھاتے ہی بہت تعریف کی اور بڑی رغبت سے کھانے لگے، مگر دو چار لقمے کے بعد ہی نواب سالار جنگ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نواب شجاع الدولہ نے کہا کہ ان چار لقموں سے کیا ہوتا ہے، اور یہ کہہ کر زبردستی دو ایک لقمے اور کھا گئے۔ لیکن کھانے کے بعد ان کو اتنی پیاس معلوم ہوئی کہ جتنا زیادہ پانی پیتے اور شدت بڑھتی جاتی۔ نواب سالار جنگ اپنے آبدار خانے سے پانی منگوا کر پلاتے رہے، اور بڑی مشکل سے ان کی پیاس ختم ہوئی۔

(۱۸) نرگسی پلاؤ۔ اس میں انڈے کی یخنی دی جاتی ہے۔

(۱۹) مرغ پلاؤ۔ یہ مختلف طریقوں سے پکایا جاتا ہے۔ کبھی تو اس کے گوشت کی یخنی دے کر پکاتے ہیں، کبھی مرغ کے پیٹ کو آلائش سے پاک کر کے اور اس میں قیمہ، ادرک اور کشمش بھر کر۔ اس کو اچھی طرح گھی، دہی اور لہسن میں بھون لیتے ہیں اور چاول کو دم دے کر اس کو اس میں چھوڑ دیتے ہیں۔

(۲۰) سہ رنگا پلاؤ۔ پلاؤ میں زعفران، شنجرف اور سبز رنگ دے کر اس کو سہ رنگا بناتے ہیں۔ عبدالحلیم شررؔ نے وزیر پلاؤ، چنبیلی پلاؤ اور گلزار پلاؤ کے نام لئے ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت معلوم نہ ہو سکی۔

حسب ذیل پلاؤ کی نوعیت ان کے ناموں سے ظاہر ہوگی:

(۲۱) کوفتہ پلاؤ (۲۲) انگوری پلاؤ (۲۳) نارنج پلاؤ (۲۴) خاصی پلاؤ (۲۵) خرمہ پلاؤ (۲۶) مٹر پلاؤ (۲۷) بونٹ پلاؤ (۲۸) گری پلاؤ (۲۹) قیمہ پلاؤ (۳۰) مچھلی کا پلاؤ (۳۱) کیلے کا پلاؤ (۳۲) قورمہ پلاؤ (۳۳) سوہا پلاؤ (۳۴) گیہوں کا پلاؤ (گیہوں کے دلئے، چاول اور گوشت کی یخنی سے تیار ہوتا ہے) (۳۵) آم کا پلاؤ (۳۶) انناس کا پلاؤ (۳۷) تہاری مرغ پلاؤ (۳۸) بریانی، بریانی اور پلاؤ دونوں قریب قریب ایک ہی چیز ہیں، لیکن بریانی میں مسالے کی زیادتی سے سالن ملے ہوئے چاولوں کی شان پیدا ہو جاتی ہے، پلاؤ میں نسبتاً مسالہ کم ہوتا ہے (۳۹) تہری چاول کے ساتھ کبھی آلو اور کبھی لوکی دے کر پکاتے ہیں جس میں ہلدی کا رنگ تیز ہوتا ہے (۴۰) کھونی کھچڑی، یہ کھچڑی اور پلاؤ کی درمیانی چیز ہے (۴۱) کھچڑا۔ چاول اور چنے کی دال ملا کر پکاتے ہیں۔

میٹھے چاول کی حسب ذیل قسمیں تیار ہوتی ہیں۔

(۱) زردہ۔ اسے ابوالفضل نے آئین اکبری میں زرد برنج لکھا ہے۔ اس کی تحریر کے مطابق اگر اس میں دس سیر چاول ہوتا تو پانچ سیر قند، تین سیر گھی، آدھ سیر کشمش، آدھ سیر بادام، پستہ، پاؤ بھر نمک، ڈیڑھ دام زعفران اور ڈھائی مثقال دار چینی دی جاتی۔ زردہ مختلف چیزوں سے بھی بنایا جاتا، مثلاً شکر قند کا زردہ، انڈوں کا زردہ، کھوپرے کا زردہ، گاجر کا زردہ، نخی کا زردہ، انناس کا زردہ۔

(۲) مزعفر بھی میٹھے چاول کو کہتے ہیں۔ زردہ سے اس کی تفریق اس طرح کی جاتی ہے کہ زردہ کو زرد رنگ دے کر رنگین بنایا جاتا ہے، لیکن مزعفر کو زعفران ڈال کر رنگین اور خوشبودار کیا جاتا ہے۔ میوہ دار مزعفر میں کشمش، پستہ، چھوہارا اور چرونجی وغیرہ بھی دی جاتی ہے۔

(۳) سپیدہ۔ یہ بھی میٹھا چاول ہوتا ہے لیکن اس میں زعفران یا زرد رنگ نہیں دیا جاتا ہے، بلکہ اس کو سپید ہی رکھا جاتا ہے۔ یہ عموماً چاول اور شکر ہی سے تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض رکابدار پیڑوں اور برفیوں سے بھی سپیدے تیار کرتے ہیں۔

(۴) متنجن میٹھے چاول میں گوشت ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ اس کو لذیذ بنانے کے لئے اس میں زعفران، بادام، کشمش اور دہی ڈال دیتے ہیں۔

(۵) بعض رکابدار میٹھے چاول پکانے میں خاص خاص صنعت دکھاتے۔ مثلاً ایک رکابدار زردہ پکا کر اس پر شکر سے بیلے اور چنبیلی کے پھول بنا کر اس طرح چھڑک دیتا کہ معلوم ہوتا کہ اصلی پھول چھڑکے ہوئے ہیں۔

چاول کی طرح گیہوں کے آٹے سے تیار کی ہوئی چیزیں بھی ہندوستانی کھانے کے ضروری اجزا ہیں۔ ہندوؤں کا اونچا طبقہ روزمرہ کھانے میں تو گیہوں کے آٹے کی روٹی کھاتا ہے، لیکن ان کی دعوتوں میں پوری، کچوری، لچوی، برھئی، دال پوری اور نون بڑی وغیرہ ہوتی ہیں۔ بعض پوریاں پستہ، بادام، چرونجی، کھوپرہ اور چھوہارہ بھر کر پکائی جاتی ہیں۔ ہندوؤں کے یہاں شکر قند، کیلے، آلو، اروی اور سنگھاڑے کی پوریاں بہت اچھی بنتی ہیں۔ بعض ہندو گھروں میں دہی کی کچوریاں بھی بہت لذیذ بنائی جاتی ہیں۔ ہندوؤں کے یہاں کی آٹے کی میٹھی چیزوں میں مال پوا، گجھیا اور گلگلے مشہور ہیں۔

مسلمانوں نے گیہوں کے آٹے سے بھی چیزیں پکانے میں طرح طرح سا کی

جدتیں کیں۔ آئینِ اکبری میں گیہوں کے آٹے سے بنی ہوئی چیزوں میں حسبِ ذیل کھانوں کا ذکر ہے۔ چکیی۔ گیہوں کا آٹا خمیر کر کے اس کو دھوتے، اور جب تھوڑا خمیرہ رہ جاتا تو اس میں چاول اور مسالے ملاتے۔ پھر اس کے اوپر قیمہ لپیٹ دیتے اور اس میں گھی پیاز، زعفران، لونگ، الائچی، دھنیا وغیرہ ڈالتے۔

تھولی۔ گیہوں کے آٹے میں آدھا گھی، کالی مرچ، دارچینی، الائچی اور لونگ وغیرہ دے کر پکاتے۔

باوجان۔ خمیری آٹے میں گھی اور زیادہ سے زیادہ پیاز، عرقِ لیمو اور کالی مرچ وغیرہ ڈال کر تیار کرتے۔

ہریسہ۔ گیہوں کے آٹے میں گوشت، گھی اور دارچینی دے کر پکاتے۔

کشک۔ پانچ سیر آٹے میں دس سیر گوشت، ایک سیر چنا، ڈیڑھ سیر پیاز، آدھ سیر ادرک اور کچھ دارچینی ڈال کر تیار کرتے۔

قطاب۔ یہ سنبوسہ کی ایک قسم تھی۔ چار سیر میدہ میں دس سیر قیمہ دیا جاتا اس کی بہت سی قسمیں ہوتیں

تنوری۔ دس سیر میدہ میں پانچ سیر گائے کا دودھ، ڈیڑھ سیر گھی اور پاؤ بھر نمک ڈال کر پکاتے۔

تنک تابگی۔ ایک سیر میدہ کی پندرہ یا اس سے زیادہ تیار کی جاتیں۔ روٹی کے پکانے میں جدتیں برابر بڑھتی گئیں۔ ان میں سے بعض کی قسمیں یہ ہیں: شیرمال، باقرخانی، کلچے، تافتان۔ آبی شیرمال اور باقرخانی تنوری روٹیوں ہی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ شیرمال میں گھی جتنا زیادہ دیا جاتا ہے اتنی ہی وہ اچھی ہوتی ہے۔ شیرمال کو تنور میں پکا لیتے ہیں۔ اچھی باقرخانی دھیمی آنچ سے تیار کی جاتی ہے۔ شیرمال میں تہ کا ہونا ضروری نہیں لیکن باقرخانی میں متعدد پرتیں اور تہیں ہوتی ہیں۔ شیرمال کا حجم چھوٹا کر دیا جاتا ہے تو وہ کلچہ کہلاتا ہے۔ تافتان بھی روٹی کی ایک قسم ہے جو لکھنؤ میں اب بھی بہت شوق سے بالائی کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ آبی روٹی خمیری آٹے سے تنور میں پکتی ہے۔ اس میں گھی نہیں ہوتا۔ بعض رکابدار آٹے کو پانی کے بجائے کیلے سے گوندھتے ہیں اور اس میں شکر ڈال کر لذیذ باریک روٹی پکاتے ہیں۔

ہندوؤں کو پوریاں تلتے دیکھ کر مسلمانوں نے توے کی روٹیوں میں گھی ملا کر طرح طرح کے پراٹھے ایجاد کئے۔ بناتے وقت آٹے کی تہ ربر کی طرح کھینچ کر پھیلا دی جاتی ہے پھر اس میں متعدد پرتیں دی جاتی ہیں جس کے بعد یہ گھی میں تلے جاتے ہیں۔ کبھی یہ چوکور، کبھی گول، کبھی مثلث اور کبھی مستطیل بنائے جاتے ہیں۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: ورقی بیگماتی، مغلئی، حیدرآبادی، پشاوری، پھینی، زعفرانی، پنیری وغیرہ۔ اچھے پراٹھے وہی ہوتے ہیں جن میں اندر باہر گھی زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اچھے پکانے والے سیر بھر آٹے میں پورا سیر بھر گھی کھپا دیا کرتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ شاہ غازی الدین حیدر کو پراٹھے بہت پسند تھے۔ ان کے لئے چھ پراٹھے پکائے جاتے جن میں تیس سیر گھی خرچ ہوتا۔ میٹھے پراٹھے محبوبی اور نان جلیبی کہلاتے۔ محبوبی بہار میں زیادہ پکتی ہے، اور نان جلیبی لکھنؤ کی خاص چیز ہے۔ میٹھے سموسے بھی گیہوں کے آٹے سے بنائے جاتے ہیں۔

روغنی روٹیاں روزمرہ کے کھانوں میں داخل ہیں۔ بعض کاغذ کی طرح پتلی ہوتیں اور اس میں چتیاں مطلق نہ پڑتیں اور بعض اتنی خستہ ہوتیں کہ ذرا سا چھونے پر ٹوٹ جاتیں۔ لیکن رکابدار اپنا فن اس طرح دکھاتے کہ توے سے اتار کر دسترخوان پر بالکل صحیح سالم لاتے۔ چپاتیاں بھی مختلف قسموں کی ہوتی ہیں۔ بعض اتنی پتلی اور ہلکی ہوتی ہیں کہ پھونک سے اڑ جاتی ہیں۔ بعض توے سے اتار کر آگ پر پھلائی جاتی ہیں جو پھلکا کہلاتی ہیں اور بعض دو ملا کر پکائی جاتی ہیں۔ ان کے بیچ میں کچھ گھی دے دیا جاتا ہے، جس کے بعد یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ایک ہے یا دو لیکن وہ علیحدہ علیحدہ کر لی جاتی ہیں۔ ایسی چپاتیوں کو دو پٹی کہتے ہیں۔ چپاتیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور اس میں گھی شکر ملا کر میدہ بنا لیتے ہیں۔ بعض ملیدے اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ منہ میں لقمہ لیتے ہی شربت بن جاتا ہے۔ چبانے یا منہ چلانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

گیہوں کے آٹے ہی سے مسلمانوں نے میٹھی اور نمکین کھجوریں بنانی شروع کیں جن کی مختلف قسمیں ہیں، مثلاً ورقی، تنکی، جالی، کشتی، بادامی، ٹکڑے وغیرہ۔ بہار میں گیہوں کے آٹے سے کلیجہ بھی بنتا ہے، جو اعلیٰ قسم کے بسکٹ کا مزہ دیتا ہے۔ پوا اور گلگلہ ہندوؤں کی خاص چیزیں ہیں، لیکن پوا پکانے میں بھی مسلمان باورچیوں نے بڑی لطافت پیدا کی۔ واجد علی شاہ کا باورچی ایک سیر گھی میں صرف ایک پوا پکاتا اور جب کڑاہی میں سے پوے کو نکالتا تو گھی کو پھینک دیتا، اور اگر اسی میں اس کو دوسرا پوا پکانے کو کہا جاتا تو وہ کہتا کہ یہ بادشاہ کے کھانے کے لائق پوا نہ ہوگا۔ گنواروں کے لئے ہوگا، کیونکہ ایک

پھا پکانے کے بعد گھی نہیں رہتا بلکہ تیل ہو جاتا ہے۔

مسلمان گوشت کے بغیر کھانا پسند نہیں کرتے ہیں اس لئے ان کے یہاں گوشت کی اتنی قسمیں تیار ہوتی ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جانوروں میں عموماً بکرے، دنبہ، اونٹ اور ہرن کا گوشت پسند کرتے ہیں۔ پرندوں میں قاز، بط، تغدری، کلنگ، چرز، دراج، کبک، پودنہ، لوہ، کرواننک، کبوتر، مرغ، تیتر، بیٹر، کنجشک اور ہریل کا گوشت کھاتے ہیں۔

مغل بادشاہوں کے عہد میں گوشت کی حسب ذیل چیزیں تیار ہوتی ہیں
بغرا۔ گوشت میں گیہوں کا میدہ، چنا، کچھ گاجر، چقندر، شلجم اور پالک ملا دیتے اور اس میں ایک سیر قند بھی ڈال دیتے پھر گھی اور ضروری مسالے دیکر پکاتے۔ کچھ سرکہ بھی چھوڑ دیتے۔

یخنی۔ دس سیر گوشت کی یخنی تیار کرتے تو ایک سیر پیاز ڈالتے۔

یولمہ۔ مسلم بکرے کو یخنی کی طرح پکاتے۔

دوپیازہ۔ دس سیر گوشت کا دوپیازہ پکاتے تو اس میں دو سیر پیاز اور دو سیر گھی اور ضروری مسالے دیتے۔

مطنجنۂ گوسفند۔ دس سیر گوشت میں آدھ سیر چنا، دو سیر گھی اور ضروری مسالے دے کر تیار کرتے۔

دم پخت۔ دس سیر گوشت میں دو سیر گھی اور ایک سیر پیاز دیتے۔

ملغوبہ۔ دس سیر گوشت میں دس سیر دہی دے کر پکاتے۔

مرغ کی مختلف چیزیں پکتی رہیں مثلاً قورمہ، مرغ مسلم، اور مرغ مغنی مرغ کے قورمے اور مرغ مسلم تو عام طور سے پکتے رہتے ہیں، لیکن مرغ مغنی اس طرح پکتا کہ ذبح کرنے کے بعد اس کے جسم سے تمام ہڈیاں نکال لی جاتیں اور اس کا گوشت کوٹ کر اور اس میں پانچ انڈے پیاز، دھنیا، ادرک کالی مرچ اور زعفران دے کر پکاتے یہ کباب کی ایک قسم ہوتی۔ مرغ کو مشک اور عنبر بھی کھلایا جاتا تا کہ ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت خوشبودار ہو۔ واجد علی شاہ کے مرغ کو کبھی کبھی سانپ بھی کھلایا جاتا۔ سانپ کھانے والے مرغ کے گوشت سے جنسی قوت بڑھ جاتی اور پرندوں کے گوشت کم و بیش اسی طرح پکائے جاتے۔

کباب کی قسمیں تو بے شمار ہیں۔ ہر حلال پرندہ کے گوشت کا کباب بنایا جاتا۔ اس کے علاوہ حسب ذیل کباب عام طور سے بنتے ہیں:۔ شامی کباب، گولر کباب، نرگس کباب، سیخ کباب، پسندے کے کباب، ران کباب، کباب کلیجی۔ اس کے علاوہ اور بھی چیزوں کے کباب بنائے گئے، مثلاً آٹے کے کباب، دہی کے کباب، آلو کے کباب، ناریل کے کباب، اروی کے کباب، اور انڈے کے کباب۔

مسلمانوں کو گوشت سے کچھ ایسا شغف رہا کہ وہ بعض اوقات شلجم وغیرہ پکاتے ہیں تو اس میں گوشت ہی کی لذت ہوتی ہے۔ بعض رکابدار بادام کا سالن پکاتے ہیں جو مزے میں گوشت سے بڑھا ہوتا ہے۔ گوشت کے ساتھ گیہوں، چنا، شلجم، گاجر اور پالک وغیرہ ملا کر بھی پکاتے ہیں جس کو حلیم کہا جاتا ہے۔

انڈے مختلف طریقوں سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ تل کر اس کی پھلکی، خاگینہ، چلہ اور خاگینہ وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ اس کے کباب بھی بنتے ہیں اور پلاؤ بھی تیار کئے جاتے ہیں۔ حلووں کی مختلف قسمیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ انڈوں کے پکانے میں بھی بڑی صنعت دکھائی جاتی ہے۔ عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ لکھنؤ کا ایک رکابدار دسترخوان پر بڑے بڑے سیر سیر بھر کے انڈے لیلے اور تلے ہوئے پیش کر دیتا جن میں سفیدی اور زردی اسی نسبت سے قائم رہتی جو چھوٹے انڈوں میں ہوا کرتی۔

ترکاریاں جتنی اچھی اور لذیذ ہندوؤں کے یہاں پکتی رہی ہیں مسلمانوں کے یہاں نہیں ہوتیں ہندوؤں کو ساگ اور ترکاری کھانے کا بے حد شوق رہا۔ جن جن چیزوں سے وہ ترکاری یا ساگ بناتے ہیں ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

آلو، اروی، بنڈہ، ترئی، لوکی، بھنڈی، نینوا، کھیکسا، پونی، ٹینڈے، خرفہ، کاسنی، کندرو، چچینڈا، کریلا، ککوڑا، کوہڑا، چقندر، ٹماٹر، شلجم، گوبھی، گانٹھ گوبھی، پرول، بیٹھا، لوبیا، رام ترئی، کنڈولا، املی کے پھول، ولایتی سیم، گوار کی پھلی، سیم، چولی کی پھلی، کدو، بیگن، ٹنڈہ، ارہر کی پھلی، کٹھل، پپیتہ، باقلا، کھم، کچنال کی کلیاں، کچنال کی پھلی، مولی، بورٹ، گاجر، سانگری کی پھلی، گوندنی، سر... پالک، میتھی، چولائی، بتھوا، سرسوں کا ساگ، اروی کے پتے، مٹر کا ساگ، چنے کا ساگ، خرفہ کا ساگ، مکوئی کا ساگ، سرخ چولائی، کرمہا کا ساگ، سنجنے پھول کا ساگ، پتھر چٹے کا ساگ، خشخاش کے پھول کی ترکاری، چکوڑ، چکور کا ساگ، کوترسے کا ساگ، کینڈوئی کا ساگ، مرسا کا ساگ، فراش بین وغیرہ ان ترکاریوں میں سے آلو، ٹماٹر، اور فراش بین باہر سے آتے ہیں۔

اوپر کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں عموماً ترکاریاں اچھی نہیں پکتی ہیں لیکن وہ ہندوؤں کی ترکاریوں سے متاثر ہو کر ترکاری پکانے کی طرف مائل

ہوئے تو اس میں بھی آرٹ دکھانے کی کوشش کی۔ عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے بعض رکابدار سلم کریلے ایسی نفاست اور صفائی سے پکاتے کہ معلوم ہوتا کہ ان میں بھاپ تک نہیں لگی ہے اور بظاہر بالکل ہرے اور کچے دسترخوان پر لاکر رکھے جاتے لیکن کاٹ کر کھائے جاتے تو بہت ہی لذیذ ہوتے۔ راقم نے بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ واجد علی شاہ جب مٹیا برج میں مقیم تھے تو ایک انگریز نے ان کو اپنے یہاں مدعو کیا اور انگریزی کھانے کھلائے۔ اثنائے گفتگو میں انگریز نے انگریزی کھانوں کی فوقیت ظاہر کر کے ہندستانی کھانوں پر طنز کیا۔ واجد علی شاہ سن کر ملول ہوئے کہ اب وہ اس انگریز کو ہندوستانی کھانوں کی برتری نہیں دکھا سکتے ہیں۔ یہ گفتگو ان کا ایک رکابدار بھی سن رہا تھا۔ واجد علی شاہ اپنی قیامگاہ پر آئے تو وہ مصر ہوا کہ انگریز کو کسی روز مدعو کیا جائے۔ واجد علی شاہ بادل ناخواستہ راضی ہوئے اور جب انگریز آیا تو رکابدار نے دسترخوان پر صرف ایک بڑا سا کدو لاکر رکھ دیا۔ انگریز کو غصہ آیا کہ اس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے لیکن واجد علی شاہ نے انگریز کے ہاتھ میں چھری دی اور جب اس نے اس کو کاٹا تو اس کو حیرت ہوئی کہ اس کے اندر طرح طرح کے ہندوستانی کھانے تھے۔ عبدالحلیم شرر نے بھی لکھا ہے کہ لکھنؤ کے ایک رئیس نواب علی نقی خان نے اپنے ایک دوست سید علی اوسط کو ایک خوان بھیجا۔ جب انھوں نے اس کو کھولا تو اس میں صرف ایک پلیٹ تھی، جس پر ایک کچا کدو رکھا تھا اس کو دیکھ کر ان کی طبیعت مکدر ہوئی اور اپنے ماما سے کہا کہ اس کو لے جا کر رکھ دو کل پکا لینا۔ خوان لانے والا یہ سن کر ہنسنے لگا، اور بولا کہ اس کو کاٹ کر یوں ہی کھائیے پکانے کی ضرورت نہیں۔ جب انھوں نے کاٹا تو عجیب لذیذ چیز نظر آئی۔ حیدرآباد میں اب بھی بیگن کی ترکاری ایسی لذیذ پکائی جاتی ہے کہ لوگ اس کو گوشت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اہم سی اہم دعوتوں میں بھی یہ ترکاری ضرور ہوا کرتی ہے

دال بھی نسبتاً ہندوؤں کے یہاں اچھی پکتی ہے اور یہ خاص ہندوستان کی چیز ہے۔ نادر شاہ ہندوستان آیا تو اس کو یہاں کے لوگوں کو چاول اور روٹی کے ساتھ دال کھاتے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا اور بولا کہ "این ہندیاں غلہ را بغلہ می خورند" لیکن مسلمانوں نے دال کو اپنے دسترخوان کا ضروری جز بنا لیا ہے۔ عام طور سے وہ مونگ، ماش، ارد، موٹھ ارہر، چنے، مسور، اور کیوٹی کی دال استعمال کرتے ہیں۔ بعض رکابداروں نے دال پکانے میں بھی بڑی مہارت پیدا کی۔ واجد علی شاہ کا ایک رکابدار ان کے خاتمہ سلطنت کے بعد ایک رئیس کا نوکر ہوا اور ان کے لئے مسور کی دال پکائی تو وہ دسترخوان کی اور چیزوں کو کھانا بھول گئے اور دال ہی کو کھا کر انگلیاں چاٹتے رہے۔ باورچی سے بے حد خوش ہوئے۔ لیکن جب انھوں نے دال پکانے کی ترکیب پوچھی تو اس نے تمام اجزا اور ان کے اخراجات کی تفصیل بتائی۔ مسور کی دال صرف تین پیسے کی تھی اور اس کے اجزا میں چھتیس روپے خرچ ہونے تھے۔ رئیس صاحب چلا اٹھے کہ تین پیسے کی مسور میں ۳۶ روپے خرچ ہوئے! یہ سن کر رکابدار اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا "یہ منھ اور مسور کی دال!" اسی وقت سے یہ محاورہ بھی رائج ہو گیا۔ عبدالحلیم شرر نے بھی نواب آصف الدولہ اور ماش کی دال پکانے والے ایک باورچی کا قصہ لکھا ہے۔ لکھنؤ کا ایک اور مشہور باورچی ارہر کی دال اتنی لذیذ پکاتا کہ اس کا نام ہی سلطانی دال پڑ گیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو مونگ کی دال بہت پسند تھی اس لئے ان کے باورچی خانہ میں یہ اکثر پکا کرتی اور شاہ پسند کہلاتی تھی۔ ایک بار بادشاہ نے مرزا غالب کو یہ دال بھیجی تو انھوں نے حسب ذیل رباعی کہی۔

بھیجی ہے جو مجھ کو شہ جمجاہ نے دال ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

اچار بھی ہندوؤں کی خاص مرغوب چیز ہے لیکن مسلمان بھی اسکو لذیذ چیز سمجھ کر استعمال کرنے لگے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں کے دسترخوان پر بھی یہ رہا کرتے تھے۔ آئین اکبری میں حسب ذیل اچاروں کا ذکر ہے:۔

اچار لیمو، اچار آم، اچار ادرک، اچار شلجم، اچار بانس، اچار سیب، اچار بہی، اچار بیگن، اچار کشمش دمنقی، اچار کچنار، اچار شفتالو، اچار گل کریل، اچار سورن، اچار سرسوں، اچار توری، اچار سہجنہ، اچار لکڑی، اچار مولی، اچار کچالو، اچار استرخار، اچار زردک۔

مٹھائیاں بھی ہندوؤں کے یہاں بہت اچھی بنتی ہیں اور جتنی مزیدار وہ امرتی، سندیش، چم چم، رس گلا، موہن بھوگ، لونگ لتا، چندر کلا، رس ملائی، مٹی دانے، مگدل، کھیر موہن، گھیور، پیڑے، لڈو، پن توا، تلکٹ، ادکھرچن وغیرہ بناتے ہیں۔ مسلمان نہیں بناتے لیکن ان تمام مٹھائیوں کو مسلمان بھی بڑی رغبت سے کھاتے ہیں خصوصاً وہ امرتی کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ رجب علی سرور نے لکھنؤ کی

امرتی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "امرتی مسلسل کا ہر پیچ ذائقہ کو پیچ و تاب دیتا ہے۔ یا قوتی مفرح کا مزا جب منہ میں رکھا۔ اصل تو یہ ہے کہ یہ عسل مصفیٰ"۔ ہندوستانی مٹھائیوں میں مسلمانوں نے بھی بعض خاص مٹھائیاں بنا کر اضافے کئے۔ جلیبی، برفی، قلاقند، گلاب جامن بالوشاہی، گوجھی، پیاؤ بھرے، خرمے، کھتیاں، بونٹ پچے اور موتی چور کے لڈو ان ہی کی جدتیں ہیں۔ ادنیٰ مٹھائیوں میں ریوڑی اور بتاشے بھی ان ہی کی اختراع ہے۔

شاہی خاندانوں میں میٹھی چیزیں پکانے میں فن کا پورا کمال دکھایا جاتا۔ گذشتہ لکھنؤ میں مرزا آسماں قدر فرزند مرزا اخرم بخت اور واجد علی شاہ کی دعوتوں کے دلچسپ قصے بیان کئے گئے ہیں۔ واجد علی شاہ کے دسترخوان پر قورمہ کو مربہ کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ بعد میں مرزا آسماں قدر نے جب واجد علی شاہ کی دعوت کی تو دسترخوان پر متعدد اقسام کے کھانے نظر آئے مگر وہ سب شکر کے تھے۔ حیدر آباد میں اب بھی مختلف پھلوں کی شکل میں مٹھائیاں بنائی جاتی ہیں۔

ہندوستانی کھانوں میں فیرینی خاص مسلمانوں کی جدت ہے یہ عام طور سے چاول کے آٹے سے بنتی ہے۔ لیکن اس کے بنانے میں اتنا تنوع پیدا کیا گیا ہے کہ پھلوں میں سیب، ناشپاتی، انناس، شکر قند، گاجر وغیرہ کی بھی بننے لگی ہو۔ مونگ کی دال سے جو فیرینی بنتی ہے وہ ماوتی کہلاتی ہے۔ آلو کی کھیر، لوکی کی کھیر، شریفے کی کھیر، ناریل کی کھیر، گیہوں کی کھیر، پیاز کی کھیر، مکا کے بھٹے کی کھیر، رس کی کھیر، پکانے میں بھی مسلمانوں کے یہاں بڑی جدتیں ہوئیں۔

بالائی کی روٹی اور گلوری بھی مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ فالودہ اور نمش بھی مسلمانوں ہی کے آوردہ ہیں۔ فالودہ کا ذکر سلاطین دہلی کے عہد کی تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ ربڑی، دہی، لسی، مٹھا، رائتہ، مکھن، سری کھن ہندوؤں کے یہاں قدیم زمانہ سے استعمال ہوتا رہا ہے جن کو مسلمان بھی اپنے کھانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ "بالائی" کا نام اودھ کے نواب آصف الدولہ کا رکھا ہوا ہے۔ نان خطائی کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ بیرونی چیز ہے۔

حلوے خاص مسلمانوں کی چیزیں ہیں۔ وہ بادام، چلغوزہ، پستہ، اخروٹ اور کشمش وغیرہ سے طرح طرح کے حلوے بنانے کے عادی تھے لیکن بعد میں ہندوستان کی ترکاریوں اور سبزیوں سے بھی حلوے بنانے گئے۔ کدو، گاجر اور پیٹھے کے حلوے تو بہت عام ہیں۔ کیلے سے جو حلوہ بنایا جاتا ہے وہ حلوائے کیلائی کہلاتا ہے۔ مسلمانوں نے آلو، شلجم اور آم کے بھی حلوے بنائے۔ حتیٰ کہ مچھلی کا بھی حلوہ تیار کیا۔ حلوہ سوہن کا نام بتاتا ہے کہ شاید ہندوؤں ہی نے اس کو شروع کیا تھا لیکن مسلمانوں نے اس میں تنوع پیدا کیا۔ حلوہ کی قسموں میں جوزی، حبشی، دودھیا اور پپڑی بہت ہی رغبت سے کھائی جاتی ہے۔ اس کے بنانے والے ماہر سیر بھر سمنک میں کبھی تیس سیر یا کبھی چالیس سیر تک گھی کھپا دیتے ہیں اور اس کی ٹکیوں پر عجیب عجیب قسم کے خوبصورت طغرے بناتے ہیں

سوئیاں بھی خاص مسلمانوں کے دسترخوان کی چیز رہی۔ موٹی اور باریک سی باریک سوئیوں کے علاوہ ان کے لچھے اور ٹکیاں بھی تیار کی جاتی ہیں۔ سادہ سوئیاں پانی میں ابال کر پکتی ہیں لیکن قوامی سوئیاں کھوئے میں ڈال کر مختلف شکلوں میں پکائی جاتی ہیں جیسے شیر خورمے، حلوے، زردے، مزعفر، سپیدے اور قتلیاں بھی بنتی ہیں۔ حیدر آباد کے شیر خورمے اور بنارس کی قوامی سوئیاں مشہور ہیں بنارس کی سوئیاں اتنی باریک ہوتی ہیں کہ ان کو کسی باریک شے سے مثال نہیں دے سکتے۔

مربوں کی صنعت بھی مسلمانوں ہی کے یہاں رہی۔ وہ آم، لال املی، فالسہ، ادرک، بادام و پستہ، کرونده، ثعلب مصری، گاجر، انولہ، ہڑ، کیلا، کمرکھ، بہی، سیب، گکرونده، بیر، بینگن، سونٹھ، ترنج، لسن، بانس، بلیلہ زرد، ناریل اور شقاقل مصری کے مربے بہت ہی لذیذ اور اعلیٰ قسم کے تیار کرتے رہے ہیں۔ بعض صناع آموں کی کیریوں کے مربے ایسے تیار کرتے کہ معلوم ہوتا کہ کیریاں ابھی توڑ کر لائی گئی ہیں اور شیرے میں ڈال دی گئی ہیں۔ آگرہ کے پیٹھے کے مربے شاہی زمانے کی یادگار ہیں۔ بعض مربوں کے شیرے اتنے پتلے بنائے جاتے کہ ان کو سفید طشتری میں انڈیل دیا جاتا تو معلوم نہیں ہوتا کہ طشتری میں شیرہ ہے۔ چھونے ہی سے پتہ چلتا۔

ہندوستانی کھانوں میں چٹنیوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ایک چٹنی شاہجہانی کہلاتی ہے جو غالباً شاہجہاں کو بہت مرغوب رہی ہو۔ یہ سرخ مرچ، ادرک، پیاز، پودینہ، عرق لیمو سے ملا کر تیار کی جاتی ہے۔ ایک چٹنی راحت جاں کہلاتی ہے جو گاجر، کمرکھ، عرق لیمو اور پودینہ سے بنتی ہے۔ چٹنی نورتن غالباً ہندوؤں کی خاص چیز ہے جو کھٹائی، نمک، گڑ، پیاز، پودینہ، کلونجی، مرچ سیاہ اور ادرک ملا کر تیار کی جاتی ہے۔ بعض خاص خاص چٹنیوں کے نام یہ ہیں چٹنی اعجوبہ، چٹنی عرق نعناع، چٹنی لوزاق، پھانکوں کی چٹنی (جس میں کیری کی پھانکیں ہوتی ہیں۔

اوپر کے کھانوں کی جو تفصیل لکھی گئی ہے وہ زیادہ تر اونچے طبقے میں رائج رہی۔ غربا کے یہاں چنے، مٹر، مکئی اور جوار کا عام رواج ہے یا پھر ان ہی چیزوں کے آٹے کی روٹیاں اور ستو استعمال ہوتے ہیں۔ تنوع کی خاطر ان ہی کی گھنگھنیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ یا ان ہی کی پھلوری، پکوڑی، گھنگھری اور چترہ بنا کر کھائی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے پھلوری میں طرح طرح کے مسالے دے کر رمضان شریف میں اس کو افطاری کا ضروری جز بنا لیا ہے۔ اور روزے میں امرا اور غربا سبکے دسترخوان پر یہ سجنے لگی ہو۔ بیسن کی روٹی پکانے میں اتنی لطافت پیدا کی گئی کہ دہلی کے لال قلعہ میں بھی وہ پکنے لگی تھی اور جب بہادر شاہ ظفر نے غالب کو تحفۃً بھیجی تو انھوں نے حسب ذیل رباعی کہی۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

نوابان اودھ کے وزیر روشن الدولہ کا باورچی پکے بھٹوں کے بھٹے اس نفاست سے کاٹتا کہ کہیں ٹوٹنے نہ پاتا اور اس کا رائتہ ایسا بناتا کہ لوگ کھا کر دیر تک چٹخارے لیتے رہتے۔ سیو، دل موٹھ اور سنبوسے آٹے کے گلگلے، ہندوؤں کے یہاں بہت اچھے بنتے ہیں اور مسلمان بھی عموماً ان کو عام طور سے انھیں استعمال کرتے ہیں۔

صدر الدین آزردہ

کوثر چاند پوری

صدر الدین آزردہ، غالب و شیفتہ کی دہلی کے جسے مولانا حالی کی زبان میں "دلّیِ مرحوم" کہنا چاہیے، ممتاز ترین عالم تھے۔ ان کے والد کا نام مولوی لطف اللہ کشمیری تھا جو کشمیر سے تجارت کے سلسلہ میں دہلی آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو گئے تھے۔ آزردہ سنہ ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) میں دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔ لفظ "چراغ" سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے تذکرہ گلشن بےخار میں بہت سے القاب و آداب کے بعد ان کا پورا نام مولانا محمد صدر الدین خاں بہادر لکھا ہے۔

آزردہ مولوی فضل امام خیرآبادی اور شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے۔ نواب صدیق حسن خاں نے شمع انجمن میں انھیں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور مولوی فضل امام کا شاگرد لکھا ہے۔

مولانا حامد حسن صاحب قادری نے آزردہ کو علوم عقلیہ اور نقلیہ میں مولانا فضل امام اور مولوی فضل حق کے تلامذہ میں شامل کیا ہے (داستان تاریخ اردو صفحہ ۱۹۶) مولوی فضل امام، فضل حق صاحب کے والد تھے۔ اگرچہ ایک شخص باپ اور بیٹے کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر سکتا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ آزردہ اور فضل حق دونوں ہم سبق تھے اور ساتھ ہی ساتھ پڑھتے تھے۔ ان میں استادی شاگردی کا تعلق بالکل نہ تھا۔

مولانا آزردہ کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ فنون عقلی و نقلی اور ادب و اصول میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے امین اللہ کے نام جو کلکتے میں رہتے تھے ایک فارسی خط لکھا ہے جس میں انھیں دہلی کے فضلائے نامدار میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ فنون عقلی و نقلی اور ادب و اصول میں مہارت تام رکھتے ہیں۔ آزردہ اپنی ذات میں ایک ادارہ اور انجمن تھے اور دہلی میں بزم علم و عمل کی ایسی جگمگاتی شمع کی حیثیت رکھتے تھے جس کے گرد ہمیشہ پروانوں کا ہجوم رہتا ہو۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے علم و فضل کے اعتبار سے آزردہ کو شاعر کہنے میں جھجک محسوس کی ہے۔ شیفتہ نے تو محض ان کے علمی مراتب ہی کو دیکھتے ہوئے اپنے تذکرے میں انھیں شامل نہیں کیا تھا۔ مرزا غالب کو اس بات پر تعجب ہوا اور انھوں نے شیفتہ کو متوجہ کرنے کے لئے لکھا: "گہر نہ سفتنِ خامہ ...... در ردیف الف بنگارش اشعار پرویں نثار حضرت آزردہ از چہ است۔ ہر چند ذکر خدّام برجیس مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوار شان فضیلت باشد لیکن اگر بمقتضائے فرط محبت نجرا رستے بہ کاری رفت گناہے بنود و در تلافی آں بہ پوزش نیاز می افتاد۔" (کلیات نثر غالب کشوری صفحہ ۱۰۶)

چنانچہ یہ کمی پوری کر دی گئی۔ اس وقت میرے پیش نظر گلشن بےخار کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس میں آزردہ کا تذکرہ موجود ہے۔ شیفتہ نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ آزردہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "اگرچہ مجامد ذکر شریف ایشاں را دریں جریدہ آوردن شاید اما ایں نامۂ گرامی را بے نام نامیش کہ تا قیام قیامت بر جریدۂ روزگار ثبت باد در نظر اولوالابصار ضعف می نماید۔ لاجرم بگذارش لختے از جلائل مآثر ایشاں مے پردازد۔" (تذکرہ گلشن بےخار قلمی۔ ذکر آزردہ)

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں: "آزردہ تخلص مفتی صدر الدین خاں بہادر دہلوی است۔ استاد محرر سطور بود و شاگرد شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین دہلوی و مولوی فضل امام والد مولوی فضل حق خیرآبادی ...... از معاصرین و یاران غالب و مومن و حسرتی بود۔ در ہر سہ زبان تازی و فارسی و ریختہ دستگاہ بلند داشت و در سحر بیانی و سحر نگاری

پانچ ادیب (مرتبہ شیخ ...) صفحہ ۱۰ - ۱۱)

تذکرۂ کریم الدین میں مرقوم ہے :۔ "آزردہ گنجینۂ علم ذکاء علم بحر سخا، گوہر نظم لطف وجود و عطا، بیدودراں، حساب ہندوستان، عالم کامل، فاضل بے بدل، فقیہ بے مثل، عالم باعمل۔ مدح میں ان کی جو لکھوں سو کم ہے کیونکہ وہ ایسا عالم ہے۔ ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرۂ شعرائے اردو میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا ان کا نام لکھوں مگر اتنا جانتا ہوں محض ان کا نام ہی ان کے کہ یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور پسند احباب نہ ہوگی کیونکہ اس زمانہ کے شعراء اردو گویوں میں وہ مثل شاہنشاہ کے ہیں۔"

سرسید نے بھی اپنے استاد محترم کا ذکر عقیدت کے ساتھ کیا ہے :۔

"مخزن بند صدائق فضل و افضال مظہر دغات جلال وجمال، جامع محاسن صوری ومعنوی، مجمع کمالات ظاہری و باطنی، کاشف دلائل معقول ومنقول، واقف حقائق فروع و اصول، توانگر صورت، درویش سیرت، انسان پیکر، ملک سیرت، مرجع آب جہان و جہانیاں۔" (آثار الصنادید صفحہ ۳۱)

تذکرہ نویسوں نے آزردہ کے لئے جو کچھ لکھا ہے اس میں بہ ظاہر مبالغہ نظر آتا ہے مگر حقیقتاً اس مبالغہ سے بھی آزردہ کے علمی کمالات اور اخلاقی خصوصیات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ واقعی یکتائے روزگار تھے اور ان کی ذات صحیح معنی میں تمام اوصاف کی حامل تھی۔

جس زمانہ میں انگریزی حکومت دہلی میں قائم ہوئی ہے، علماء انگریزی ملازمت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور عہدے قبول کرنے سے گریز کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ گریز باقی نہ رہا۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنے داماد مولوی عبدالحئی کو میرٹھ میں انگریزوں کی ملازمت کی اجازت دے کر راستہ صاف کر دیا۔ انگریز چاہتے تھے کہ ممتاز خاندانوں کے قابل افراد صدارت وغیرہ کے عہدوں پر رکھے جائیں اور اس طرح ان کی حکومت شمالی ہند میں مضبوط اور ہر دلعزیز ہو جائے۔ صدر الصدوری کا عہدہ ہندوستانیوں کے لئے بہت بڑا اور اہم منصب تھا اس کے لئے انھیں حضرات کو موزوں خیال کیا جاتا تھا جو اپنی خاندانی وجاہت اور ذاتی علم وفضل کے اعتبار سے امتیاز خاص رکھتے ہوں۔ دہلی کی صدارت اس لئے اور زیادہ اہمیت رکھتی تھی کہ یہ شہر پرانے زمانہ سے ہندوستان کا دارالسلطنت تھا۔ چنانچہ کلکتہ سے ریذیڈنٹ کو ہدایت کی گئی کہ ایسے آدمی کو دہلی کا صدر الصدور بنایا جائے جو ذاتی

وقار اور علمی مرتبہ کے اعتبار سے مسلمانوں میں سربلند ہو۔ آخر شہر کے امراء سے مشورہ کرنے کے بعد مفتی صدرالدین صاحب کو صدارت کا منصب پیش کیا گیا۔ بادشاہ اور اکابر شہر کے اصرار سے مفتی صاحب نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور چالیس سال تک نہایت نیک نامی اور عدالت گستری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دئے۔ انھوں نے قانون کے مقابلہ میں دوستی اور دشمنی کے جذبات سے الگ رہنے کی کوشش کی۔ ان کی ذمہ داریاں بہت وسیع تھیں اور فرائض میں بھی کافی نزاکت تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے عدل و انصاف کا ہمیشہ خیال رکھا اور غالب ایسے دوست کے مقابلہ میں بھی اپنا فرض پورا کیا اور تعلقات کے پیش نظر قانون میں ذرا سی لچک بھی پیدا نہ کی۔

صدر الصدور کی حیثیت سے انھیں جو اختیارات حاصل تھے اس کا تذکرہ مفتی صاحب نے ایک خط میں کیا ہے۔ اسی خط سے ان کی گوناگوں ذمہ داریوں اور مشاغل کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے "مقدمات اصلی کا فیصل کرنا، منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتوی دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبائے مدرسۂ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزارہا کاغذ کا دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کا پڑھانا اور اطراف وجوانب کے سوالات شرعی کا لکھنا، فہمائیوں اور بد معاملگی کے جھگڑے میں حکم ہونا، مجالس شادی وغمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا، باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا، اکثروں کو ساتھ لے جانا اور ان کی دعوت کا اہتمام ....." آگے چل کر لکھتے ہیں :۔ "اس چالیس برس کی نوکری میں ہزارہا کو جتایا اور ہزارہا کو ہرایا۔ سیکڑوں ببوہ داریاں ہمارے حکم سے نیلام ہوئیں۔ صدہا آدمیوں کے قتل کا فتوی دیا اور صدہا قید ہوئے۔" مقدمات کے تصفیہ میں وہ قوانین انگریزی کے پابند تھے اور فتاوی نویسی میں قواعد شریعت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ملازمت کی مذہبی حیثیت سے مطمئن نہ تھے اور اس کی پابندیوں سے آزاد ہو جانے پر انھوں نے کوئی افسوس نہ کیا بلکہ ایک قسم کی مسرت محسوس کی۔ ۱۸۵۷ء میں مفتی صاحب کے بہت سے احباب پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا۔ مولوی فضل حق صاحب کو کالے پانی بھیجا گیا۔ نواب مصطفٰی خاں

شیفتہ کو سات برس کی قید ہوئی۔ خود مفتی صاحب بھی محفوظ نہ رہ سکے اور انھیں بھی قید و بند کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مرزا غالب سنہ ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "حضرت مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گذارے کو کافی ہے اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی، تیس چالیس روپے مہینے کی آمدنی، لیکن امام بخش کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ فراغ بالی سے نہیں گذرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں۔ خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں۔" (خطوط غالب)

غالب، مفتی صاحب کے قریبی دوست اور ہم نشین تھے، بلکہ آزردہ ان کے ممدوح اور محسن بھی تھے۔ اُن سے زیادہ آزردہ کے حالات سے اور کون واقف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس خط میں مرزا صاحب نے صرف امام بخش کی اولاد ہی کے بار کا ذکر کیا ہے۔ آزردہ پر یہی ایک بوجھ نہیں تھا بلکہ ان کے طالب علموں کے مصارف بھی انھیں کے ذمہ تھے جو ملک کے مختلف حصوں سے محض حصولِ علم کے شوق میں مفتی صاحب کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہی وہ ذمہ داریاں تھیں جن کی بنا پر انھوں نے نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور سے امداد کی درخواست کی حالانکہ ان کے والد نواب یوسف علی خاں علوم عربیہ میں مفتی صاحب کے شاگرد تھے اور چاہتے تھے کہ مفتی صاحب کا منصب مقرر کریں مگر مفتی صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان سے درخواست ہی نہیں کی بلکہ مالی امداد بھی قبول نہیں کی۔ ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد وہ تھوڑی سی آمدنی میں طالب علموں کے مصارف کا بار نہ اُٹھا سکے اور مجبوراً اس مقصد کے لئے نواب کلب علی خاں سے اعانت طلب کرنا پڑی۔ چنانچہ وہاں سے دو سو روپے ماہانہ مقرر ہو گئے۔ انھوں نے نواب کلب علی خاں کو جو خط لکھا تھا اس کا اقتباس یہ ہے: "اب فی الحال مختصر حال اپنا التماس کرتا ہوں کہ اب عمر اس خاکسار کی قریب بہ ہشتاد سال پہنچی ہے۔ ابتدائے جوانی سے تا ایام پیری کبھی خالی مشغلہ

درس و تدریس سے نہیں رہا اور اس عرصہ میں صدہا طلبائے علوم ہر دیار و رہنشین زادگان والا تبار کو استفادہ حاصل ہوا۔ اب تک بھی باوجود پیری و بیماری کے طالب علم جو مکان پر سکونت پذیر ہیں و بعض اطراف و جوانب سے آتے ہیں بطور تحقیقات استفادہ حاصل کرتے ہیں اور مجھ کو بھی ایک دم بدون اس شغل کے کہ قدیم سے خوگر اس کا ہوں چین نہیں آتا اور اخراجات ضروری ولابدی طلبائے مذکورین میرے ذمہ ہیں۔ علاوہ اس کے عزیز و اقارب بھی میرے ہیں کہ ان کی مایحتاج ضروری کا بھی کفیل ہوں۔ اگرچہ اب تک مجھ کو خاص اپنی ذات کے واسطے کسی امر کی حاجت چنداں نہیں تھی الا بسبب خانہ نشینی و زیر باری و بیکاری سالہا سال کہ محض باتفاق لیل و نہار پیش آئی ہے فی الحال اس اخراجات کا انصرام مجھ سے محض دشوار ہے اور تکلیف طلبا و عزیزان دیکھی نہیں جاتی۔ خواہی نخواہی باعث گذارش حال ہے۔

من کجا و ذوقِ گل چیدن کجا اے باغبان
نالۂ بلبل بزور ایں جا مرا آوردہ است

اگر خدام والا مقام از راہ سرداری و قدر شناسی ارباب کمال کچھ وظیفہ مقرر برائے چندے کہ جس سے گذارہ اوقات طلباء علوم و عزیزاں ہووے تعین فرما دیں تو باعث نیک نامی کا دنیا میں موجب اجر عظیم کا آخرت میں ہوگا۔

با کریماں کارہا دشوار نیست"

اسی خط میں مفتی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ نواب غفران مآب محمد یوسف علی خاں بہادر مرحوم کو ان سے بہت زیادہ اخلاص اور اعتقاد تھا، انھوں نے اکثر چاہا کہ وظیفہ مقرر کر دیں مگر میں نے انھیں تکلیف نہ دی۔ یہ خط ۱۷ر جنوری سنہ ۱۸۶۹ء کو لکھا گیا تھا۔

آزردہ سلطان جی میں رہتے تھے۔ مرزا غالب، مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم۔" (خطوط غالب۔ از مہیش پرشاد صفحہ ۱۲۸)

آزردہ پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اس لئے عتاب نازل ہوا تھا کہ انھوں

...کے فتوے پر دستخط کئے تھے ... زمانے میں وہ گوشہ نشین ہوگئے تھے لیکن کچھ دنوں اس روش پر قائم نہ رہ سکے دیا۔ قلعہ کی آمد و رفت جاری رہی ... میں بھی شرکت کرنی پڑتی تھی مگر عدالت کا کام حکم ... دیا تھا۔ جب بخت خاں بریلی سے دہلی آیا تو اس نے علما اور مشائخ سے جہاد کا فتویٰ حاصل کیا۔ مفتی صاحب نے بھی اس پر دستخط کئے مگر وہ اسے پسند نہ کرتے تھے۔ اسی لئے آخر میں انھوں نے "کتبت بالجبر" کے الفاظ لکھ دئیے اور "بالجبر" پر نقطے دانستہ نہیں لگائے۔ ایسی صورت میں یہ لفظ "کتبت بالخیر" بھی پڑھا جا سکتا تھا اور "کتبت بالجبر" بھی۔ پہلا جملہ عربی عبارت کے آخر میں اکثر لکھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کسی کو خیال نہ ہوا۔ دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو مفتی صاحب پر مقدمہ چلا۔ کچھ دنوں حوالات میں بند رہے۔ تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد ضبط ہو گئی۔ تحقیقات کے سلسلہ میں پیشی کی نوبت آئی تو مفتی صاحب کو فتویٰ دکھا کر سوال کیا گیا۔ انھوں نے جواب میں کہا دستخط میں نے ضرور کئے ہیں مگر خوشی سے نہیں، چنانچہ فتوے پر میں نے صاف لکھ دیا ہے "کتبت بالجبر"۔ مفتی صاحب کو بری کر دیا گیا لیکن جس قدر جائداد فروخت ہو چکی تھی اس کا معاوضہ نہ ملا۔ باقی جائداد واگذاشت کر دی گئی۔

آزردہ اپنے احباب میں کافی مقبول تھے۔ ان کے دیوان خانہ میں دہلی کے منتخب افراد جمع رہتے تھے۔ رات کو محفل جمتی تھی جس میں ہر فن کے اکابر اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ یہ محفل کسی موسم میں بے رونق نہ ہوتی تھی۔ جاڑا ہو یا گرمی یا برسات، ارباب کمال کی یہ مجلس بلاناغہ گرم ہوا کرتی تھی۔ غلام رسول مہر نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رُخ کرتا۔ (غالب از مولانا مہر صفحہ ۷۹)

مفتی صاحب نہایت فراخ دل انسان تھے۔ ان کی آمدنی کا زیادہ حصہ طلبا پر صرف ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ تنخواہ کے علاوہ انھیں رجسٹری سے بھی روپیہ ملتا تھا مگر یہ سب رقم خود انھیں کے الفاظ میں "ریوڑیوں کی طرح بٹ جاتی"۔

مرزا غالب مفتی صاحب کے گہرے دوست اور ہم نشین تھے اور غالب کو ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف تھا۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

ہمہ ناخوش نفسانند من و ذرہ بوئیم
بادہ در خلوت شان مشک فشان اندر دم شان

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ
حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شان

اس دور کے تمام مشاہیر شعراء کے نام گناتے ہوئے غالب نے آزردہ کو سب سے بڑا قرار دیا ہے۔ یوں بھی وہ اُن کے بہت زیادہ عقیدت مند تھے، مصطفیٰ خاں شیفتہ ایک مشاعرے کی شرکت کے متعلق لکھتے ہیں:

"مخدوم معظم و صدر اعظم مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر کے دیدار سے نگاہ کامیاب ہو گئی (پنج آہنگ کشودی صفحہ ۲۰۱) ایک اور مشاعرے کے سلسلہ میں شیفتہ ہی کو لکھتے ہیں: "حضرت آزردہ اگرچہ دیر میں آئے لیکن انھوں نے آکر دل کو رونا اور زبان کو قوا بخشی اور میں نے کوسیتی کی زمین میں اپنا فارسی قصیدہ پڑھا۔" (پنج آہنگ کشود۔ صفحہ ۲۰۲)

مرزا غالب نے آزردہ کی مدح بھی کی ہے۔ ان کا ایک فارسی قصیدہ مفتی صاحب کی تعریف میں موجود ہے:

زاں نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروز من فردائے من

صدر دین و دولت و صدر الصدور روزگار
میر و مخدوم و متاع و والی و مولائے من

گویم واز نکتہ چیناں در دلم نبود ہراس
کیقباد و قیصر و کیخسرو و دارائے من

درکیش چوں مرجع عام ست با غیرم چہ بحث
پرسشے دارد ارسطو مید و دہیائے من

عاجزم چوں در ثنائے دوست بارشکم چہ کار
میروم از خویش تا گیرد عطارد جائے من

خاک کویش خود پسند افتاد در جذب سجود
سجدہ از بہر حرم نگذاشت در سیمائے من

مفتی صاحب بھی مرزا غالب کو عزیز رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے اجلاس پر غالب کے خلاف قرض کا ایک مقدمہ بھی پیش ہوا تھا۔ غالب حاضر ہوئے مگر انھوں نے کوئی قانونی موشگافی نہیں کی بلکہ یہ شعر پڑھ دیا ...

تجربہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب نے غالب کے مقابلہ میں ڈگری دیدی مگر روپیہ اپنے پاس سے ادا کر دیا۔ (غالب از مولانا مہر صفحہ ۲۸۴) بعض اوقات دونوں میں لطیف قسم کا مذاق بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اس میں تنقیدی پہلو ہوا کرتے تھے۔

مولانا آزردہ مرزا غالب کی شاعری کے ابتدائی اسلوب کو پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کی غزل گوئی کے متعلق آزردہ نے شروع میں جو رائے قائم کر لی تھی اس کا اثر آخر تک اُن کے دماغ میں موجود رہا۔ غالب نے آزردہ کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں اس خیال کی جھلک ملتی ہے کہ وہ ان کی شاعری کے معترف نہیں ہیں۔ تمہید میں غالب نے مصائب و آلام کا بیان کرتے ہوئے وقت کی شکوہ سنجی کی ہے، پھر گریز کر کے مدح کا آغاز کیا ہے

باچنیں اندہ کہ بگفتیم و دل خالی نہ شد
خواجہ گر اندہ گسار من نبودے وائے من
آنکہ در یکتائی وے در فن فرزانگی
متفق گردیدہ رائے بوعلی با رائے من
آنکہ چوں خواہد بنامش نامہ نامی ساختن
بر نگارد عقل نقاش کرم فرمائے من
دل بدیں وصفم نیاساید سخن کوتہ کنید
آنکہ ننگ اوست بودن در سخن ہمتائے من

آخری شعر میں بڑے بلیغ انداز سے مرزا نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ممدوح ان کی شاعری کو پسند نہیں کرتا۔ اگرچہ اس میں غالب نے اپنے ممدوح سے زیادہ اپنے آپ کو سراہا ہے تاہم ان کے عدم اعتراف کا شکوہ یا اشارہ بھی موجود ہے۔

ایک روز نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی کے مکان پر آزردہ اور غالب بیٹھے ہوئے تھے، مولانا حالی بھی شریک مجلس تھے، وہاں غالب کے فارسی دیوان کے کچھ اوراق پڑے ہوئے تھے۔ ان میں جو غزل تھی اس کے مطلع میں غالب نے اپنے منکر یعنی کو خطاب کیا تھا۔

نشاط معنویاں از شراب خانۂ تست — فسون بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

غالب نے اوراق اٹھا لئے اور آزردہ سے مزاحاً کہا: ”دیکھئے کسی بے ایمان شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے۔“ اس کے بعد انھوں نے غزل پڑھی۔ آزردہ نے دو تین ابتدائی اشعار کی تعریف کی۔ پھر یہ سمجھ کر کہ کلام کسی اور کا نہیں خود غالب ہی کا ہے، انھوں نے حسب عادت مسکرا کر فرمایا: ”کلام مربوط ہے مگر نو مشق کا کلام معلوم ہوتا ہے۔“ یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ غالب نے آزردہ کی جانب مخاطب ہو کر دردناک انداز سے مقطع پڑھا۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی — مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

لہجہ اتنا موثر تھا کہ سناٹا چھا گیا۔ آزردہ بھی شرما کر چپ ہو گئے۔ (یادگار غالب۔ صفحہ ۱۹۴)

آزردہ جب ملازمت سے الگ ہو گئے تو انھیں کسی قسم کا ملال نہ ہوا اور اس کا اظہار اُن کے ایک خط کے آخری حصہ سے ہوتا ہے: ... جب بجا وہ ہے تو کیسا انعام و احسان اس کا ہے کہ مجھ سے گرفتار علائق کو ان بلیات سے ایسا الگ کر دیا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں اور اگر اسی حال میں موت آ جاتی تو نفس انھی آفات میں مبتلا رہتا اور کس وقت میں علیحدہ کیا جب عمر ستر کی پہنچی اور پھر نجات کس مصیبت سے دی کہ کوئی مصیبت دنیا کی اس سے بڑھ کر نہ تھی اور رزق کا ڈھنگ ایسا پیدا کر دیا جس کی حلت میں کچھ شبہ نہیں۔“ (یعنی جائداد واگذاشت شدہ کا دس چالیس روپیہ ماہانہ تھا)۔

آزردہ پر ۱۱ دسمبر ۱۸۶۲ء کو فالج کا حملہ ہوا تھا۔ وہ پانچ چھ برس تک اس مرض میں مبتلا رہے۔ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے تھے۔ اچھی طرح بول بھی نہ سکتے تھے۔ نواب یوسف علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ”حال مزاج احقر کا یہ ہے کہ صاحب کمشنر بہادر بہت مہربانی کرتے ہیں اور آپ عیادت کو تشریف لائے اور ڈاکٹر ولایتی کو ساتھ لائے۔ انھوں نے دوا کھانے اور مالش کی تجویز کی، چنانچہ استعمال اس کا ہے اور بہت تخفیف حاصل ہے۔“ مگر یہ تخفیف صحت کی منزل تک نہ پہنچ سکی اور وہ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکے۔ جولائی ۱۸۶۸ء میں تیز بخار بھی اس میں شریک ہو گیا اور آزردہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ زندگی کی دستی تاریک فضا اور عالم یاس میں انھوں نے انتقال کیا۔ صرف ایک رشتے کی اپنی بیوی (لاڈو بیگم) اور ان کے بھانجے احسان الرحمن (غالب نے اپنے ایک خط میں ان کا نام امین الرحمن لکھا ہے) کی خبر گیری کے سلسلہ میں نواب کلب علی خاں کو خط لکھا تھا اور وہاں سے دہلی دو روپیہ آزردہ کو ملا

کہ اس خط کو لکھے ہوئے ... پانچ سال آزردہ کی عمر کے ... کے لئے ...
بھی ... سے ... ۱۸۶۸ء کو یہ خط لکھا گیا تھا اور اگلے دن یعنی
۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو ... انتقال ہو گیا۔ مولانا غلام رسول مہرؔ نے تاریخ
انتقال ... بیان کی ہے مگر ... درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اسی تاریخ
کو ... نواب صاحب رام پور کو خط لکھا ہے جس کے نیچے یہ الفاظ درج ہیں
"... عرضداشت۔ زود تر برسد۔" خط کے آخر میں قمری اور عیسوی تاریخیں
بھی ... لکھی گئی ہیں۔ "مورخہ پانزدہم جولائی ۱۸۶۸ء مطابق بست و سوم
ربیع الاول ۱۲۸۵ھ۔ نیاز نامہ محمد صدر الدین خاں صدر الصدور سابق دہلی۔"
شمس الشعراء مولوی ظہور علی نے جو تاریخ انتقال نظم کی ہے اس میں
"ربیع الاول بست و چہارم" منظوم کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ
۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کے مطابق ہوگی جبکہ ۱۵ جولائی کو ۲۳ ربیع الاول تھی۔
پوری منظوم تاریخ انتقال یہ ہے ؎

چو مولانائے صدر الدین دہ عصر
امام اعظم آخر زماں بود
نبہ صدر الصدور نیک محضر
بعدل و داد چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت
کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاول و بست و چہارم
و داع ۱۲۸۵ او سوئے دار الجناں بود
چو افشی بست تاریخ ولادت
کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود

آزردہ کی زندگی کے آخری بارہ برس عسرت اور تکلیف میں بسر ہوئے۔
مولانا حالیؔ "غالب کی فراغ حوصلگی" کے ذیل میں لکھتے ہیں، "ایک صاحب
جو مرزا کے دلی دوست تھے غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہو گئی تھی۔ ایک دن
چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ
پاجامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا چھینٹ
کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا یہ چھینٹ آپ نے
کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے، آپ جیسے ہی

فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ انھوں نے کہا یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے
اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔
مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا
شدت سے پڑ رہا ہے، آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟۔
پھر ادھر ادھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اتار کر انھیں پہنا دیا
اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا (یادگار غالب۔ صفحہ ۶۰)
غلام رسول صاحب مہرؔ نے اس واقعہ کو مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کے حوالہ
سے آزردہ سے منسوب کیا ہے۔ آزاد مرحوم سے خود حالی نے کہا تھا کہ میں نے
نام اس لئے نہیں لکھا کہ مبادا آزردہ کے عزیزوں کو ناگوار ہو۔ (غالب
از مہر صفحہ ۳۵۱)

مفتی صدر الدین آزردہ نے جامع مسجد کے قریب ایک
مدرسہ قائم کیا تھا۔ اکثر طالب علموں کی غذا اور لباس کی ذمہ داری خود
انھوں نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ ان کے شاگردوں کی فہرست میں ہندوستان
کے بعض مشہور اکابر اور علماء کے نام نظر آتے ہیں۔ مثلاً نواب صدیق حسن خاں
نواب یوسف علی خاں، سرسید احمد خاں، مفتی سعد اللہ رام پوری وغیرہ۔
مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کے والد محترم بھی آزردہ ہی کے شاگرد تھے۔

تصانیف میں عربی و فارسی کی چند تالیفات اور فتاویٰ ان کی یادگار
ہیں۔ ایک تذکرۂ شعراء بھی فارسی زبان میں لکھا تھا مگر وہ نایاب ہے۔ غالبؔ
شیفتہؔ اور امام بخش صہبائیؔ سے گہرے مراسم تھے۔ ان حضرات سے اور چند دیگر
شاگردوں سے اردو میں خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ وہ خطوط بھی آزردہ کی یادگار
کہے جا سکتے ہیں۔ بعض خطوط ریاست رام پور کی دار الانشاء میں موجود بعض اشلہ
میں شامل ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے ان کے متعدد خطوط کلاسیکی ادب میں شائع
کر دئیے ہیں۔ کچھ خطوط نقوش میں اور دوسرے میں چھپ چکے ہیں۔ ان مکتوبات سے
ادب و انشاء کے کسی بلند معیار کی نشان دہی نہیں ہوتی البتہ آزردہ کی زندگی
کے بہت سے واقعات روشنی میں آ جاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، آزردہ اردو، عربی اور فارسی زبانوں میں
شعر بھی کہتے تھے۔ اردو میں انھوں نے شاہ نصیرؔ، میر ممنونؔ، اور میاں حکیمؔ
اکبرآبادی سے مشورہ کیا تھا۔ (داستان تاریخ اردو۔ صفحہ ۱۹۱) جہاں تک
اردو اور فارسی اشعار کا تعلق ہے انھیں سامنے رکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل

نہیں کہ آزردہ نہایت صاف، رواں اور دل نشیں انداز میں شعر کہتے تھے۔ ان کے بعض اشعار تو ضرب المثل کے طور پر زبان زد ہیں۔ مسند صدارت پر وہ قانون، عدل اور سنجیدگی کے یقیناً پابند ہوں گے لیکن بزم شعر و سخن میں ایک رند بادہ خوار نظر آتے ہیں اور بعض اشعار کو دیکھ کر تو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مفتی اور مولوی کی زبان سے نکلے ہوں گے۔ وہ اپنے زہد و اتقا کے باوجود میخانہ میں مینا بہ کف اور صراحی در بغل نظر آتے ہیں ؎

بایں تقویٰ درون میکدہ آزردہ را دیدم
صراحی در بغل مینا بہ کف پیمانہ در پہلو

اور شب وصل میں تو آزردہ بالکل ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں ؎

آزردہ زمن حالِ شبِ وصل نچہ پرسی
نے دل خبرم داشت نہ از دل خبرم بود

صحبتے بود عجب دوش میانِ من و یار
صد شکایت بہ لبِ رخصتِ اظہار نہ بود

آزردہ کا تعلق "فرقۂ زہاد" ہی سے تھا لیکن وہ رندانِ قدح خوار کو زیادہ باکمال سمجھتے ہیں ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

آزردہ ان لوگوں میں ہیں جو دوست کی کم نگاہیوں سے مجروح ہو کر بزمِ شراب کا رخ کرتے ہیں ؎

میں اور ذوقِ بادہ کشی، لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

آزردہ کے اردو کلام کا ایک مختصر سا انتخاب نواب مصطفیٰ خاں نے گلشن بے خار میں پیش کیا ہے۔ کچھ اشعار دوسری کتابوں میں بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں۔ ان کا دیوان ہاتھ نہیں آتا۔ ان چند اشعار سے اُن کی رسائی طبع اور بلندیٔ خیال کا اندازہ لگائیے ؎

مر کر بھی ہمارا دلِ بیتاب نہ ٹھہرا
کشتہ بھی ہوا تو بھی یہ سیماب نہ ٹھہرا

اس دردِ جدائی سے کہیں جان نکل جائے
آزردہ مرے حق میں ذرا تو بھی دعا کر

ہو نہ دامن گیر کوئی جان کر قاتل مجھے
تو بھی روتا چل جنازے کو ہمارے دیکھ کر

برگشتہ بخت و جذبۂ دل تم کو آفریں — آ کر وہ پھر گیا مرے بیت الحزن کے پاس

آمد آمد ہوتی یہ موسمِ گل کی شاید — ان دنوں چاک کو پاتے ہیں گریباں سے نفس

ناصح یہاں یہ فکر ہے سینہ بھی چاک ہو — ہے فکرِ بخیہ تجھ کو گریباں کے چاک میں

گیا کون سا صید افگن ادھر سے — کہ خالی پڑے آشیانے بہت ہیں

گو اسیری میں ہوں پر شب اسیرِ تصویر — نہ غمِ قید نہ پروائے اسیری مجھ کو

ترے مجروح کے سینہ میں کچھ گرمی سی باقی تھی — وہیں بس ہو گیا ٹھنڈا جو کھینچا تم نے پیکاں کو

اس شوخ سے مربوط بہت سہل سے بچتے — گر ہم بھی سبک حرکتِ نااہل سے بچتے

دامن اُس کا تو بہت دور ہے اے دستِ جنوں — کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گیا — دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے

مکھڑا وہ غضب، زلفِ سیہ فام یہ کافر
کیا خاک جئے کوئی شب ایسی سحر ایسی

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

ملنا ترا اغیر سے ہو بہرِ مصلحت — ہم کو تو سادگی سے تری یہ گماں نہیں

اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ — اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی جان

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

آزردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں

گھر سے گھبرا کے کھلے بالوں پر آ نکلے یہ — کیوں نکل آئے ہو دھوکے میں جو بیتاب نہیں

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر — کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں

چند فارسی اشعار بھی سن لیجئے ؎

زاہد بیاد موت شہیدانِ عشق بیں — کیں موت را نہ زندگیٔ جاوداں رسد

عالمے کشتہ شد و چشمِ تو در ناز نہاں — صد قیامت شد و حسنِ تو در آغاز ہماں

روزِ ہجرانِ تو می سوخت مرا حسرتِ وصل — در شبِ وصل تو اندیشۂ ہجرانم سوخت

مست در گوشۂ میخانۂ وحدت بودیم — کارِ ما بادہ کشی بود دگر کار نبود

بود سررشتۂ کارم بسرِ زلفِ سیاہ — قصۂ کشمکشِ سبحہ و زنار نبود

از علاجِ دلِ بیمار چرا دست کشید — گر مسیحا بہ تمنائے تو بیمار نہ بود

یا رب نگاہِ بوالہوسم دہ کہ شد مرا — در بزمِ او حجاب تماشا گریستن

در باغ جورِ تازہ کہ از باغباں رسد — اول بہ بلبلانِ کہن آشیاں رسد

آزردہ کا اردو کلام صاف اور سلیس ہے اور فارسی میں مرزا بیدل کا رنگ نہیں پایا جاتا۔ مشکل پسندی سے ان کی بیزاری اسی سے ثابت ہے کہ وہ مرزا غالب کے ابتدائی رنگ کو پسند نہ کرتے تھے اور غالب کے اسلوب میں جو تبدیلی ہوئی ہے اس میں مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین کی دوستانہ اصلاح اور مخلصانہ تنقید کا اثر شامل ہے۔ آزردہ کی فارسی شاعری کی اہمیت ان کے فاضل معاصرین کی نگاہ میں غالب سے کم نہ تھی۔ مولانا صہبائی نے اپنے ایک مقطع میں دونوں کو ہندوستان کے ان فارسی گو شعراء میں شمار کیا ہے جو دلوں سے ایران کی یاد محو کر دیتے ہیں۔

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاکِ ایرانم نمی آید

یہ غزل غالب اور آزردہ کی موجودگی میں صہبائی نے ایک مشاعرہ میں سنائی تھی اور مرزا غالب کو اس کے دو تین شعر پسند آئے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "غزل مولانا صہبائی در زمین طرحی دو سہ بیت دل نشیں داشت۔" (کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۱ (پنج آہنگ) خط موسومہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ)

بہرکیف آزردہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت اچھے اشعار کہتے تھے۔ اگر شعر گوئی کو ان کے کمالات علمی کے منافی خیال نہ کیا جاتا تو غالباً تذکروں میں ان کے زیادہ اشعار مل سکتے۔ آزردہ نے جو کچھ کہا اسے دیوان کی شکل میں جمع نہ کیا جا سکا، پھر بھی ان کے جس قدر منتشر اشعار مل جاتے ہیں وہ انھیں ایک نغز گفتار شاعر ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

✡

خوابِ حسیں

مسعود اختر جمال

بزمِ دل آج ہے ویرانئ تب و تاب لئے
گرمئ ساز لئے، شعلۂ مضراب لئے
جاوداں آج ہے تابندگئ عصرِ رواں
فکر ہے رونقِ خورشیدِ جہاں تاب لئے

موجِ احساس میں پاکیزگئ نورِ سحر
جذبِ دل تازگئ لالۂ شاداب لئے
آج تاریک خلاؤں میں سفر کرتی ہے
جراتِ عزمِ جواں، مشعلِ شب تاب لئے

راہِ اربابِ وفا دیکھ رہی ہے کب سے
انجمستاں کی فضا دیدۂ بے خواب لئے
جام اٹھاؤ کہ نئے دور کا آغاز ہوا
بزم ہے تابشِ رعنائی مہتاب لئے

نفس مژدۂ عرفانِ حیاتِ ابدی
ہے نظر عشرتِ صد لمحۂ نایاب لئے
جانبِ منزلِ نو آج قدم اٹھتے ہیں
اے ہمالہ تری عظمت کا حسیں خواب لئے

زمین سے چاند تک

محمد اسحٰق صدیقی

چاند تک پہنچنا انسان کی دیرینہ تمنا تھی جو ابھی تک پوری ہوتے نظر نہ آتی تھی لیکن اب وہ زمانہ قریب آگیا ہے جب انسان کی یہ آرزو بھی پوری ہوگی اور جس طرح آج ٹرین کے سفر کے لئے ریلوے اسٹیشن بنے ہوئے ہیں اسی طرح دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں چاند اور سیاروں کے سفر کے لئے اسٹیشن تک قائم ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی آپ بھی چاند کے مسافر ہوں اس لئے منزل تک پہنچنے سے پہلے آپ کو خلا (چاند تک پہنچنے کے راستے) کے حالات اور سفر کے انتظامات سے بھی بخوبی آگاہ ہو جانا چاہیئے۔

خلا سے مراد وہ جگہ ہے جو زمین، چاند، سورج، سیاروں اور ستاروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ خلا میں نہ تو ہوا ہے، نہ پانی اور نہ خشکی۔ اس لئے ہم نے اب تک جو سفر کئے ہیں چاند تک کے سفر کی صورت اُن سے بالکل مختلف ہوگی۔ ہمیں اپنے ساتھ ہوا اور پانی لے جانا ہوگا۔ اس کے علاوہ اُن تمام خطروں سے بچنے کی تدبیر کرنا ہوگی جو راستے میں پیش آسکتے ہیں۔

خلا کے خطرے۔ ہماری زمین کے چاروں طرف ہوا کا غلاف چڑھا ہوا ہے جسے فضا یا "کرۂ باد" (ATMOSPHRE) کہتے ہیں جیسے جیسے زمین کی سطح سے بلند ہوتے جائیے، ہوا ہلکی ہوتی جاتی ہے۔ پانچ میل کی بلندی پر جانے کے بعد ہوا کا تین چوتھائی حصہ نیچے رہ جاتا ہے اس کے بعد ہوا کے ذرّوں کی تعداد تیزی سے گھٹنے لگتی ہے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن ہوا کے یہ ذرّے ۶۰۰ میل کی بلندی تک پائے جاتے ہیں اور اس کے بعد خلا شروع ہو جاتا ہے۔

ہوا کئی گیسوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ایک آکسیجن ہے۔ جب ہم سانس لیتے ہیں تو آکسیجن خون میں مل جاتی ہے اور اُسے صاف کرکے باہر آجاتی ہے جو سانس کے ذریعہ خارج کی ہوئی ہوا زہریلی ہوتی ہے۔ اُسے کاربن ڈائی آکسائیڈ کہتے ہیں۔ ہوا کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس کے دباؤ سے سانس لینے میں مدد ملتی ہے۔ اونچے پہاڑ کی چوٹیوں پر بلندی کی وجہ سے ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہے اس لئے سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے اسی واسطے کوہ پیما اپنے ساتھ آکسیجن لے جاتے ہیں جو خاص طرح کی بوتلوں میں بند ہوتی ہے اور مصنوعی دباؤ کے ذریعہ نلکیوں سے ہوکر ناک تک پہنچتی ہے۔ سطح زمین پر ہوا کا دباؤ ہر مربع انچ پر تقریباً ۱۴ پونڈ ہے۔ ہمارے جسم پر ہوا کا جتنا دباؤ باہر سے ہے اتنا ہی اندر سے ہے۔ ہوا کے اندرونی اور بیرونی دباؤ کے برابر ہونے کی وجہ سے ہمیں اُس کا وزن نہیں معلوم ہوتا۔ خلا میں جہاں ہوا کا بیرونی دباؤ نہیں ہے ہمارا جسم اندرونی ہوا کے دباؤ سے غبارے کی طرح پھولنے لگے گا یہاں تک کہ پھٹ جائے گا۔ پانی کے اُبلنے اور ہوا کے دباؤ میں گہرا تعلق ہے۔ سطح زمین پر پانی ۲۱۲ درجہ فارن ہائٹ پر اُبلتا ہے۔ جیسے جیسے آپ زمین کی سطح سے بلند ہوتے جائیے ہوا کا دباؤ کم ہوتا جائے گا اور پانی جلد اُبلے گا۔ خون بھی سیال ہے اس لئے وہ بھی اُبل سکتا ہے۔ زمین سے ۶۳۰۰۰ فیٹ کی بلندی پر ہوا کا دباؤ اس قدر کم ہو جاتا ہے کہ ہمارا خون خود بخود کھولنے لگے گا۔

ہوا میں پانی کی بھاپ بھی ملی رہتی ہے جو سانس لینے کے لئے ضروری ہے لیکن بلندی کے ساتھ ساتھ ہوا میں نمی کی کمی بھی ہوتی جاتی ہے اس لیے بلندی پر پہنچ کر پھیپھڑے سوکھ جائیں گے اور ہم سانس نہ لے سکیں گے۔

سورج کی گرمی، جسے ہماری زمین دن میں جذب کرتی ہے، ہوا کی وجہ سے نکلنے نہیں پاتی۔ ہوا اس گرمی کو زمین پر چاروں طرف پھیلا دیتی ہے۔ اگر زمین پر ہوا نہ ہوتی تو دن میں اتنی گرمی ہوتی کہ پانی خود بخود اُبل جاتا اور رات کو حرارت صفر سے سیکڑوں درجے نیچے گر جاتی۔ ہوا جتنی ہلکی ہوتی

جاتی ہے اس میں سورج کی گرمی کو روکنے کی طاقت بھی گھٹتی جاتی ہے اس لئے آپ زمین سے جتنا بلند ہوئیے گا سردی بڑھتی جائے گی یہانتک کہ آپ کا جسم برف کی طرح منجمد ہو جائے گا۔

خلا میں پہنچنے کے بعد دن رات کا فرق مٹ جائے گا کیوں کہ دن رات کا تعلق ہماری زمین سے ہے۔ زمین کے جس حصے پر سورج کی روشنی پڑتی ہے اس طرف دن ہوتا ہو اور جس حصے پر روشنی نہیں پڑتی اس طرف رات ہوتی ہے۔ خلا میں پہنچنے کے بعد سورج ہر وقت چمکتا نظر آئے گا اور زمین کے مقابلے میں کہیں تیزی سے۔ کیونکہ جب سورج کی کرنیں زمین کی طرف آتی ہیں تو ان کی کافی مقدار ہوا میں جذب ہو جاتی ہے لیکن خلا میں ان کے جذب ہونے کا سوال نہیں اٹھتا۔

آسمان کا نیلا نظر آنا ہوا کی وجہ سے ہے۔ خلا میں آپ کو آسمان بجائے نیلے کے کالا نظر آئے گا۔ اگر آپ وہاں سے زمین کو دیکھیں تو وہ آپ کو ہلکے نیلے اور بھورے رنگ کا ایک چمکدار گولا نظر آئے گی جو آہستہ آہستہ گھوم رہا ہو۔ اگر آپ سورج کی طرف سے منہ پھیر کر خلا میں نظر ڈالیں گے تو آپ کو بے شمار ستارے چمکتے ہوئے دکھائی دیں گے، زمین کے مقابلے میں کہیں زیادہ اور چمکدار، کیونکہ ہوا کی وجہ سے وہ زمین پر صاف دکھائی نہیں دیتے اور جھلملاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

ہوا ہمیں سورج کی مضر کرنوں سے بچاتی ہے۔ سورج کی روشنی ہوا سے چھن کر ہم تک پہنچتی ہے لیکن اس کی نقصان دہ کرنیں زمین تک پہنچتے پہنچتے کافی کمزور ہو جاتی ہیں۔ سورج کی روشنی جو ہم کو سفید معلوم ہوتی ہے دراصل سات رنگوں سے مل کر بنی ہے۔ تین پہلو والے شیشے سے دیکھنے پر اس میں سات رنگ نظر آتے ہیں۔ بنفشئی سے اوپر اور سرخ سے نیچے جو کرنیں ہوتی ہیں وہ دکھائی نہیں دیتیں۔

انھیں ماورا بنفشئی شعاعیں (Ultra Violet Rays) اور زیر احمریں شعاعیں (Infra Red Rays) کہتے ہیں۔ اگر یہ زیادہ ہوں تو جانداروں کے لئے خطرناک ہیں لیکن ہوا کے غلاف سے گزرتے ہوئے یہ کمزور ہو جاتی ہیں۔

سورج سے عکس ریز شعاعیں (X. Rays) بھی نکلتی ہیں۔ یہ ہمارے جسم سے گزر جاتی ہیں۔ اگر یہ کافی مقدار میں ہوں تو ان کی وجہ سے ہمارا جسم شفاف نظر آئے گا جیسا کہ آپ نے ایکسرے کی پلیٹوں میں دیکھا ہوگا۔ یہ کرنیں بھی مضر ہوتی ہیں لیکن کرۂ باد سے گزرتے ہوئے کمزور ہو جاتی ہیں۔

سب سے خطرناک کائناتی شعاعیں (Cosmic Rays) ہوتی ہیں۔ وہ کہاں سے آتی ہیں۔ اس کا ہمیں پتہ نہیں ہے۔ تحقیق کرنے سے اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ یہ شعاعیں دراصل ایٹم کے مرکزی حصے (Atomic Nuclei) ہوتے ہیں جو روشنی کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ زمین پر انکی بارش ہوتی رہتی ہے اور جب یہ ہوا کے ذروں سے ٹکراتے ہیں تو ان کے بے شمار ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ جب یہ شعاعیں کسی جاندار کے جسم سے ٹکراتی ہیں تو وہاں کے خلیئے مر جاتے ہیں۔ ان کی زیادتی سے انسان کی تولیدی قوت فنا ہو سکتی ہے اور دماغ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ان کی طاقت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ سورج کی کرنیں تو کاغذ کی آڑ سے رک جاتی ہیں لیکن سیسے کی موٹی چادر سے گزر جاتی ہیں۔ کرۂ باد کو پار کرنے میں ان کی طاقت بھی بڑی حد تک زایل ہو جاتی ہے۔

آپ نے اکثر رات کو آسمان پر ایک روشن لکیر کھنچ جاتے ہوئے دیکھی ہوگی۔ لوگ اسے ٹوٹنے والا تارا کہتے ہیں۔ لیکن یہ شہاب ثاقب (Meteor) ہوتا ہے۔ دراصل یہ ٹھوس مادے کے ٹکڑے ہوتے ہیں جو بہت تیزی سے سفر کرتے ہیں۔ جب یہ زمین کے قریب سے گزرتے ہیں تو اس کی قوت کشش انھیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور جب یہ ہوا کے غلاف سے گزرتے ہیں تو اس کی رگڑ سے جل اٹھتے ہیں۔ یہ بیشتر بالو کے ذروں کے برابر ہوتے ہیں لیکن بعض مٹر کے دانوں کے برابر اور بعض منوں وزنی ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جلنے کے بعد بھی ان کا کافی حصہ بچ رہتا ہے اور یہ اس طرح زمین پر پھٹ پڑتے ہیں۔ عجائب گھروں میں آپ نے انھیں دیکھا ہوگا۔ شہابوں کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ یہ زیادہ تر پتھر کے ہوتے ہیں لیکن بعض میں لوہا اور بعض میں نکل ملا ہوتا ہے اور بعض میں دونوں دھاتیں پائی جاتی ہیں۔

خلا اس قدر وسیع ہے کہ اس کا امکان بہت کم ہے کہ اگر ہم بھی خلا میں ہوں تو ہماری مڈبھیڑ کسی شہاب سے ہو جائے۔ تاہم ایک ننھا سا شہاب بھی ہمارے پرخچے اڑا سکتا ہے کیونکہ ان کے ننھے ننھے ٹکڑے بھی بندوق کی گولی کی طرح تیزی سے سفر کرتے ہیں۔ چاند کے سفر میں ان آسمانی گولیوں

سے بچنے کے لیے انہیں معقول انتظام کرنا ہوگا۔

خلائی جہاز کی اڑان۔ چاند کا سفر معمولی ہوائی جہاز پر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ۱۲ میل کی بلندی پر ہوا اتنی ہلکی ہو جاتی ہے کہ ہوائی جہاز اس میں اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ اس سفر کے لئے ایک ایسی سواری کی ضرورت ہے جو اڑنے کے لئے ہوا کی محتاج نہ ہو اور جس کی رفتار بہت تیز ہو۔ جب تک اس کی رفتار ۲۵۰۰۰ میل فی گھنٹہ نہ ہوگی، زمین اسے اپنی طرف کھینچ لے گی۔ یہ سواری راکٹ (Rocket) کی ایک ترقی یافتہ صورت ہوگی۔ راکٹ میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنا ایندھن اور اسے جلانے کے لئے آکسیجن اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کے مقابلے میں اسکی رفتار ہزاروں گنا تیز ہوتی ہے۔

خلا میں اڑنے والے جہاز کو ہم خلا کی رعایت سے خلائی جہاز (Space - Ship) کہیں گے۔ اس کی صورت کیسی ہوگی۔ کچھ یقین کے ساتھ کہا نہیں جا سکتا۔ اصولاً اس میں کئی منزلیں ہوں گی۔ سب سے اوپر کی منزل میں مسافروں کے رہنے کا انتظام ہوگا۔ پیچھے کے حصوں میں ایندھن اور اس کے جلانے کا انتظام ہوگا۔ جب یہ ایندھن تیزی سے جلے گا تو اس دھواں اور شعلے لپکتے ہوئے باہر نکلیں گے۔ جتنی تیزی سے وہ برآمد ہوں گے اتنی ہی تیزی سے ہمارا یہ جہاز آگے بڑھے گا۔ جب اس کے ایک حصے کا مسالہ ختم ہو جائے گا تو وہ کٹ کر گر جائے گا اور پھر دوسرے حصے کے انجن چالو ہو جائیں گے اور جب اس حصے کا بھی ایندھن ختم ہو جائے گا تو وہ بھی کٹ گر جائے گا۔ خلائی جہاز کی ہر منزل اسے ہزاروں میل کی دوری تک لے جائے گی لیکن اس کا سب سے اوپر والا حصہ ہی (جس میں مسافر ہوں گے) منزل تک پہنچ سکے گا۔ خلائی جہاز کی بناوٹ میں خلا کے مخصوص حالات کا لحاظ رکھا جائے گا۔ راستے میں جو جو خطرے پیش آ سکتے ہیں ان سے بچنے کے لیے پہلے ہی سے انتظام کر لیا جائے گا۔

خلائی جہاز میں ہوا بنانے اور صاف کرنے کا انتظام ہوگا۔ اس کے رہائشی کمرے میں ہوا کے دباؤ، درجۂ حرارت اور نمی وغیرہ کی بالکل وہی صورت پیدا کی جائے گی جو زمین پر ہے۔ ہوا کے ساتھ پانی بھی لے جانا ہوگا۔ سانس کے ذریعہ خارج شدہ پانی کی بھاپ اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو کیمیاوی طریقوں سے دور کیا جا سکے گا۔ ممکن ہے، خلائی جہاز میں خاص طحلب کے پودے بھی لے جائے جائیں مثلاً کائی (Algae) جس کے ننھے ننھے پودے خلائی جہاز کے حوضوں میں رکھے جا سکتے ہیں۔ وہ مسافروں کی خارج کی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ جذب کر لیں گے اور حیات بخش آکسیجن اُگلا کریں گے۔

خلائی جہاز کا بیرونی خول اس طرح کا ہوگا کہ وہ سورج کی مضر شعاعوں نیز کائناتی شعاعوں کو روک سکے۔ اس کی دیواروں کی بناوٹ تھرماس سے ملتی جلتی ہوگی یعنی دیواریں دوہری ہوں گی اور ان کی درمیانی جگہ میں خلا (Vacuum) ہوگا۔ خلائی جہاز کی بیرونی سطح سفید پوت دی جائے گی یا پالش کی ہوئی ہوگی تاکہ سورج کی کرنیں منعکس ہو جائیں۔

اگرچہ خلا کا کوئی درجۂ حرارت نہیں ہے تاہم خلائی جہاز کا جو رُخ سورج کی طرف ہوگا (اور خلا میں سورج ہر وقت چمکتا رہے گا) اِدھر کھولا دینے والی گرمی ہوگی اور جو حصہ دوسری طرف ہوگا اُدھر منجمد کر دینے والی سردی ہوگی۔ خلائی جہاز کے گرم حصے کو ٹھنڈا رکھنے اور ٹھنڈے حصے کو گرم کرنے کا انتظام ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلائی جہاز کی مشینوں کو چلانے کے لئے سورج کی طاقت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

شہاب ثاقب سے بچنے کے لئے خلائی جہاز کا بیرونی خول کافی مضبوط بنایا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ بجائے ایک کے دو یا کئی خول ہوں۔ اگر جہاز میں شہاب سے سوراخ ہو گیا تو اس کی ساری آکسیجن نکل جائے گی اور مسافر دم گھٹنے کے باعث مر جائیں گے۔

وزن میں اضافہ۔ خلائی جہاز کی رفتار شروع سے اخیر تک یکساں نہیں رہے گی۔ اس کے پہلے حصے کی رفتار دوسرے سے اور دوسرے کی تیسرے سے مختلف ہوگی۔ جب خلائی جہاز کی رفتار بڑھے گی تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا جیسے آپ کا وزن بڑھ رہا ہو۔ ہر مرتبہ جب اس کے انجن چالو کئے جائیں گے آپ کو یہی احساس ہوگا۔

وزن نام ہے زمین کی قوت کشش یعنی کھنچاؤ کا۔ اگر زمین کی کشش دگنی ہوتی تو ۱۵۰ پونڈ کے آدمی کا وزن ۳۰۰ پونڈ ہوتا اور اگر تگنی ہوتی تو ۴۵۰ پونڈ۔ زمین کی کشش کو انگریزی میں (Gravity) کہتے ہیں۔ ایسے اکائی مان کر ایک جی (1g) کہا جاتا ہے۔ اس کی دگنی

کشش کو ۲ جی اور تگنی کو ۳ جی کہتے ہیں۔ خلائی جہاز کی رفتار بڑھنے آپ کا وزن ۹ جی تک پہنچ سکتا ہے۔

وزن بڑھنے سے آپ کو ایسا معلوم ہوگا جیسے آپ کے جسم کا ہر عضو من من بھر کا ہو گیا ہو، پسلیاں ٹوٹی جا رہی ہوں اور دم گھٹ رہا ہو۔ لیکن یہ تکلیف صرف چند منٹ رہے گی کیونکہ خلائی جہاز کو زمین کی کشش کو توڑ کر باہر نکلنے میں چند ہی منٹ لگیں گے۔

خلائی جہاز میں روانہ ہوتے وقت بجائے بیٹھنے یا کھڑے ہونے کے لیٹنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اس طرح بوجھ جسم کے کسی ایک حصے پر نہیں پڑے گا بلکہ برابر برابر تقسیم ہو جائے گا اور اس کیلئے سانچے نما کوچ (Contour Couches) استعمال کئے جائیں گے۔ یہ خاص طرح کی کرسیاں ہوں گی جو مسافروں کے جسم کے پچھلے حصے کی بناوٹ کے مطابق بنائی جائیں گی اور جب وہ ان میں بیٹھیں لیٹیں گے تو ان کا آدھا جسم (پیچھے کی طرف کا) اُن میں سما جائے گا۔

بے وزنی کی حالت۔ جب ہمارا جہاز خلا میں پہنچے گا تو اس کے انجن بند کر دئے جائیں گے اور وہ کافی دور تک حرکت کے زور (Momentum) سے چلا جائے گا۔ اسی طرح جیسے سائیکل دو چار پیڈل مار دینے پر کچھ دور تک چلتی رہتی ہے۔ ہوا کی مخالفت اور زمین کی رگڑ سے سائیکل کچھ دور چلنے کے بعد رک جاتی ہے لیکن خلا میں ہوا یا کسی دوسری طرح کی رکاوٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے جہاز کی ایک بار جو رفتار قائم ہو جائے گی وہ عرصے تک قائم رہے گی اور اس دوران میں جبکہ جہاز حرکت کے زور یا جھٹکے میں آگے بڑھا چلا جا رہا ہوگا ہمیں بے وزنی کا احساس ہوگا اور وہی آدمی جو کچھ دیر پہلے اپنے کو منوں وزنی محسوس کر رہا تھا۔ اب اس کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی چیز کی حرکت کی رفتار زمین کی قوت کشش کے برابر ہو جاتی ہے اسے صفر جی (Zero-Gravity) کہتے ہیں۔ صفر جی کی نوبت پہنچنے سے پہلے اگر مسافر نے اپنے کو مضبوطی سے اپنی سیٹ سے باندھ نہ لیا تو اپنی جگہ سے خود بخود اٹھ کر جہاز میں تیرنے لگے گا اور اپنے کو ایسا ہلکا محسوس کرے گا گویا ایک ننھا سا پر یا صابن کا بلبلہ ہو۔

ایسی حالت میں اعضا دماغ کو غلط خبریں بھیجتے ہیں اور آدمی پریشان ہو جاتا ہے۔ اسے ہر وقت "گر پڑنے" کا اندیشہ لگا رہتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اوپر کدھر ہے اور نیچے کدھر ہے۔ اگر وہ چاہے تو جہاز کی دیواروں پر چل پھر سکتا ہے۔ بے وزنی کی یہ کیفیت وقتی نہ ہوگی بلکہ مستقل ہوگی اور انسان کو اس کا عادی بننا پڑے گا۔ جہاز کا سامان اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے بنایا جائے گا۔ اس کا سارا فرنیچر مضبوطی سے اپنی اپنی جگہ جڑا ہوا ہوگا۔ راستے کے کنارے کنارے کٹہرے لگے ہوں گے تاکہ انھیں پکڑ کر چلا پھرا جا سکے۔ کھانے کے لئے خاص طرح کی خوراک ساتھ لے جانا ہوگی۔ اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ وہ کم سے کم جگہ گھیرے اور زیادہ سے زیادہ طاقت پہونچائے یہ خوراک لپ اسٹک کی طرح چھوٹی ڈبیوں میں اور ٹوتھ پیسٹ کی طرح ٹیوب میں بند رہے گی۔ بے وزن آدمیوں و کھانے میں کوئی دقت نہ ہوگی کیونکہ چبانا اور نگلنا عضلات پر منحصر ہے۔ ان کا قوت کشش سے کوئی تعلق نہیں۔ لوگ سر کے بل کھڑے ہو کر بھی نگل سکتے ہیں۔

جہاز میں سیال چیزوں کو انڈیلنے میں البتہ دقت ہوگی کیونکہ وہاں کشش نہیں ہے اور انڈیلنے کے لئے کشش درکار ہے۔ سیال چیزوں کو رکھنے کے لئے پلاسٹک کی بوتلیں استعمال کی جائیں گی۔ انھیں دبا کر نکالا جائے گا یا نلکیوں کے ذریعہ کھینچ کر پیا جائے گا۔

بے وزنی کا توڑ یہ نکالا گیا ہے کہ جہاز کے فرش میں لوہے کی پٹیاں جڑ دی جائیں اور لوگ ایسے جوتے پہنیں جن کے تلوں میں مقناطیس (چمبک پتھر) لگے ہوں۔ یہ صورت ممکن ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں پاؤں تو بھاری معلوم ہوں گے لیکن باقی جسم بے وزن معلوم ہوگا۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ جہاز کا ایک خول ایک خاص رفتار سے گردش کرتا رہے۔ اس طرح مصنوعی کشش پیدا ہو جائے گی جو مسافروں کو جہاز کے اندر تیرنے یا معلق ہونے سے روکے گی۔

خلائی لباس۔ ہو سکتا ہے کہ خلائی جہاز میں کچھ خرابی پیدا ہو جائے اور اس کی مرمت کرنے کے لئے آدمیوں کو باہر نکلنا پڑے۔ اس صورت میں لوگ خلائی لباس (Space-Suit) پہن کر باہر نکلیں گے۔ وہ خلا میں چلیں پھریں گے۔ جہاز سے ان کا تعلق ایک رسی کے ذریعہ قائم رہے گا۔ جب وہ کام کر چکیں گے تو انھیں اندر گھسیٹ لیا جائے گا۔

اگر کسی طرح یہ رسی ٹوٹ جائے تو وہ زمین پر نہ گر پڑیں گے بلکہ خلا میں معلق ہو کر رہ جائیں گے۔ ان کے پاس ردِ عمل کے اصول پر کام کرنے والے پستول ہوں گے۔ اگر وہ اس کا رخ دائیں طرف کرکے لبلبی دبائیں گے تو بائیں طرف پہنچ جائیں گے اور اگر اس کا رخ بائیں طرف کرکے فائر کریں گے تو دائیں طرف پہنچ جائیں گے۔ اگر وہ خلا میں پہنچ کر اپنے ہوش و ہواس بحال رکھ سکے تو بغیر کسی سہارے کے خلا میں چل پھر سکیں گے۔

بہت اونچے اڑنے والے ہوابازوں کے لباس سے ہم اس کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ خلائی مسافر کا لباس کیسا ہوگا۔ ان ہوابازوں کا لباس لچکدار لیکن مضبوط ربڑ کا ہوتا ہے۔ اس میں ہوا بھری ہوتی ہے تاکہ اس کا دباؤ وہی کیفیت پیدا کرسکے جو زمین پر ہوا کے دباؤ سے ہے۔ اس طرح یہ ہوا باز اپنی ایک علحدہ فضا رکھتا ہے۔ جن لوگوں نے یہ لباس پہنا ہے ان کا کہنا ہے کہ اسے پہننے پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارا جسم غبارے کے اندر بند ہو۔ ران گھٹنے، کہنی، اور کندھے کے مقام پر چُنٹیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ پیر آسانی سے حرکت کرسکتے ہیں۔ چہرہ چھپانے والی ٹوپی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ آدمی اپنا سر ادھر ادھر گھما سکتا ہے۔ یہ لباس کافی مضبوط ہوگا تاکہ اس میں کسی چیز کے چھیلنے سے سوراخ نہ ہو۔ اگر اس میں سوراخ ہوگیا تو ساری ہوا نکل جائے گی اور خلائی مسافر فوراً مر جائے گا۔

لباس کے ساتھ آکسیجن کا ذخیرہ بھی رہے گا جو پیٹھ پر لدا ہوگا اور یہ آکسیجن نلکیوں کے ذریعہ ناک تک پہنچے گی۔ سانس کے ذریعہ خارج کی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی کی بھاپ کو جذب کرنے کے لئے بھی انتظام ہوگا۔ جسم کی فاضل گرمی کو باہر نکالنے کے لئے لباس میں ٹوٹ کے پنکھے لگے ہوں گے جو ضرورت کے مطابق کھل سکیں گے یا بند ہو جائیں گے بات کرنے کے لئے ریڈیو سیٹ بھی ساتھ رہے گا کیونکہ آواز نام ہے۔ ہوا میں خاص طرح کی لہروں کے پیدا ہونے کا اور خلا میں ہوا نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلائی جہاز میں تو ہم شہابوں اور مضر شعاعوں سے بچ سکیں گے لیکن جہاز کے باہر ان سے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی؟ کیا ہمارا لباس ہمیں ان سے بچا سکے گا۔ جہاں تک ماورا بنفشی یا دوسری مضر شعاعوں کا تعلق ہے ایسی عینکیں ایجاد کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو مضر شعاعوں کو منعکس کردے تاکہ ان کے اثر سے آنکھوں کو صدمہ نہ پہنچے۔

ایک تجویز یہ ہے کہ جہاز سے باہر نکلنے کیلئے خلائی مسافر کو ایک خاص طرح کے صندوق (Capsule) میں بند کر دیا جائے۔ جب آدمی اس کے اندر کھڑا ہو جائے گا تو وہ اسے اندر سے بند کرلے گا۔ یہ صندوق راکٹوں کی مدد سے چلے گا جو اس کے اوپر نیچے اور اردگرد لگے ہوں گے۔ ان کی مدد سے اسے جس طرف چاہیں گے لے جاسکیں گے۔ صندوق سے باہر چند مشینی ہاتھ نکلے ہوں گے جو حرکت دینے پر انسانی ہاتھوں کی طرح کام کرسکیں گے۔

انسان پر خلائی سفر میں کیا بیتے گی اور وہ سفر کی تکلیفیں کہاں تک برداشت کرسکے گا۔ یہ مسائل خلائی طب (Space Medecine) سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ طب کی ایک بالکل نئی شاخ ہے تاہم اس میں بڑی تیزی سے ترقی ہو رہی ہے۔ چاند کے سفر کے سلسلے میں بہت سے مسائل ہیں جن کا ابھی حل دریافت کرنا ہے۔ ابھی تک ایسا جہاز بھی نہیں بن سکا ہے جو خلائی سفر کے لئے موزوں ہو۔ بہرحال روس نے دوسرے اور تیسرے لیونک کو چاند تک بھیج کر یہ امکان پیدا کر دیا ہے کہ جلد ہی ایسا جہاز بھی تیار کرلے گا جو انسان کو نہ صرف چاند تک لیجائے بلکہ واپس بھی لاسکے۔

✡

تصویرِ وطن

(ایک ہندی دوست کے نام جو لندن میں مقیم ہے)

سعید اختر نعمانی

رشکِ صد انجمنِ سرو و سمن ہے کہ جو تھی
غیرتِ خلد بریں ارضِ وطن ہے کہ جو تھی
حسنِ کشمیر وہی جادوئے بنگال وہی
وہی رعنائیِ پنجاب و دکن ہے کہ جو تھی
کرشن بھگوان کی ہر سمت وہی لیلا ہے
آج بھی گوکل و متھرا پہ پھبن ہے کہ جو تھی
پردۂ ظلمتِ شب چاک کرے جو پیہم
وہی تابندہ و رخشندہ کرن ہے کہ جو تھی
آج بھی ہے وہی شائستگیِ صبحِ بہار
مسکراتی ہوئی تقدیرِ چمن ہے کہ جو تھی

جس پہ قرباں ہے ملاحت تو صباحت ہو نثار
ہاں وہی شامِ وطن صبحِ وطن ہے کہ جو تھی
آج بھی زہرہ جبینوں کا ہے پنگھٹ پہ ہجوم
زیست چوپال کے دوہوں میں مگن ہے کہ جو تھی
آج بھی بارشِ الطاف و کرم ہوتی ہے
وہی سلمائے وفا جلوہ فگن ہے کہ جو تھی
مے اخلاص و عنایت کی ہے تقسیم وہی
اور وہی مستیِ صہبائے کہن ہے کہ جو تھی
نہ بل ابرو پہ کسی کے نہ جبیں پر ہے شکن
لبِ انساں پہ تبسم کی کرن ہے کہ جو تھی

گوتم و چشتی و نانک کے ترانے ہیں وہی
آدمیت بھی اسی دھن میں مگن ہے کہ جو تھی
وہی شیریں سخنی، گل بدنی، سیم تنی
وہی تصویرِ بتِ غنچہ دہن ہے کہ جو تھی
وہی کاکل میں شکن وہی رخسار پہ رنگ
اور وہی مستیِ نظر، زہد شکن ہے کہ جو تھی
ہے رواں قافلۂ زیست عجب آن کے ساتھ
آج بھی زہرۂ منزل کی لگن ہے کہ جو تھی

حاملِ عزم و یقیں ہے دلِ ہر پیر و جواں
آج بھی روحِ حسیں جزوِ بدن ہے کہ جو تھی
اب بھی ہے خاکِ کفِ پائے شہیداں میں اثر
اب بھی وہ سرمۂ اربابِ وطن ہے کہ جو تھی
نغمۂ غالبؔ و میرؔ اب بھی ہیں لب پر رقصاں
آج بھی قدرِ سخن، عظمتِ فن ہے کہ جو تھی
فکرِ نو زینتِ عنوانِ قلم آج بھی ہے
وہی رنگینیِ گلزارِ سخن ہے کہ جو تھی
کیسے دیکھیں بہ نگاہِ غلط انداز اغیار
ملتفت چشمِ زلیخائے زمن ہے کہ جو تھی
پنجۂ دستِ خدا شانہ کشِ گیسو ہے
یہ زمیں اب بھی جواں سال دلہن ہے کہ جو تھی

اُتر پردیش میں تعمیرِ نو کے ہمہ گیر اقدامات

سنہ ۱۹۵۹ء کے ترقیاتی کاموں پر ایک نظر

جمہوریت کے گذشتہ سال یعنی ۲۶ رجنوری سنہ ۱۹۵۹ء سے ۲۵ رجنوری سنہ ۱۹۶۰ء تک اتر پردیش میں ہر سمت تعمیراتی سرگرمیاں جاری ہیں اور ترقی کے ہر میدان میں نئی منزلیں طے کی گییں۔ اس امر کے پیش نظر کہ ملک کے دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں صنعتی ترقی کو کلیدی اہمیت حاصل ہے ریاست میں اس سلسلہ میں موثر اقدامات کئے گئے۔ اقلیتوں کے تحفظ کے لئے بدستور اقدامات کئے گئے اور حکومت نے اُردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے وقتاً فوقتاً ہدایات جاری کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندی کو مقبول بنانے کے لئے بھی کوشش کی گئی۔

گذشتہ اکتوبر میں کارپوریشنوں کے انتخاب سے کاوال شہروں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ انتخابی مہم میں ہماہمی کے باوجود انتخابات پُرامن طریقہ سے انجام پاگئے عوام نے چھوٹی بچت اسکیم میں گہری دلچسپی لی۔ زیر نظر سال میں چھوٹی بچت میں ۱۳۳۸۸۴۹۲ روپیہ جمع ہوا۔ آئندہ سطروں میں مختلف شعبوں میں جو ترقیاتی کام کئے گئے ان کی کچھ تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔

صنعتی ترقی

زیر نظر سال میں ریاست میں پبلک امداد باہمی اور نجی سیکٹروں میں متعدد صنعتی واحدوں کا قیام عمل میں آیا جن میں سے ضلع نینی تال میں بازپور کی امداد باہمی شکر فیکٹری نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔ اس فیکٹری میں روزانہ ۵۰۰ ٹن گنے کی پیرائی ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی مزید تین فیکٹریوں پر کام جاری ہے اور موجودہ سیزن میں غالباً پاپت کی فیکٹری میں کام ہونے لگے گا۔

نجی سیکٹر میں دو فیکٹریاں قائم ہوئیں۔ ان میں سے ایک سوڈا ایش اور امونیم کلورائیڈ فیکٹری ہے جو وارانسی میں ۵ کرور روپیہ کی لاگت سے قائم کی گئی اور دوسری بجے ۔کے ریاں طرز ہے جو کانپور میں ۳ کرور ۵۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے قائم ہوئی۔ ریاستی حکومت نے ان کارخانوں کے قیام کے لئے ۲ کرور ۲۵ لاکھ روپیہ کی مالی امداد دی۔ وارانسی کی فیکٹری کو سوڈا ایش اور امونیم کلورائیڈ کی سالانہ پیداوار جو اس وقت ۴۰۰۴۰ ہزار ٹن ہے۔ دگنی کرنے کے لئے لائسنس جاری کئے گئے۔ نجی سیکٹر میں دو صنعتی واحدے یعنی بریلی میں مصنوعی ربر کی فیکٹری اور ریہاند بند کے قریب پپری میں امونیم پلانٹ قائم کرنے کے لئے اقرارنامے تحریر کئے گئے۔

تیس کرور روپیہ کی لاگت کی مصنوعی ربر کی فیکٹری میں جس کی سالانہ پیداواری صلاحیت ۳۰ ہزار ٹن ہوگی دوسرے منصوبہ کے آخر تک کام شروع ہو جانے کی امید ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ امونیم پلانٹ جس کی پیداواری صلاحیت ۱۰ ہزار ٹن ہوگی تیسرے منصوبے کے دوسرے سال تک چالو ہو جائے گا۔

ریاست میں مختلف پارٹیوں کو نئی صنعتیں شروع کرنے اور موجودہ صنعتی واحدوں کی توسیع کے لئے تقریباً ۴۰ لائسنس دئے گئے۔

الہ آباد کے قریب پبلک سیکٹر میں ریت صاف کرنے کے کارخانہ کا قیام اہم ہے۔ علاوہ ازیں الہ آباد اور بریلی میں لکڑی پختہ کرنے کے پلانٹ چالو کئے گئے۔ اور مرادآباد میں الیکٹرو پلیٹنگ پلانٹ لگایا گیا ہے۔

گورنمنٹ پریسیزن انسٹرومنٹس فیکٹری کے قیام کے دس سال پورے ہو گئے۔ فیکٹری نے دوسرے منصوبہ کے تحت واٹر میٹر اور خوردبینیں تیار کرنے کے مقررہ نشانہ کو مقررہ میعاد سے دو سال قبل پورا کر لیا۔ فیکٹری میں نئے سامان یعنی دیوار گھڑیاں اور کیمرے وغیرہ بھی تیار کئے جا رہے ہیں۔

سرکاری چرک سیمنٹ فیکٹری کی پیداواری صلاحیت دگنی کرنے کے لئے کام زوروں پر جاری ہے۔ فیکٹری کی توسیع سے مزید ۱۵۰۰ اشخاص کو روزگار مہیا ہوگا۔

ریاستی حکومت نے تیسرے منصوبہ کے دوران میں پبلک سیکٹر میں تین اہم کارخانے قائم کرنے کے لئے مرکزی حکومت سے لائسنس حاصل کئے۔

زیر نظر سال کا دوسرا اہم کام ریاست میں صنعتوں کی ترقی سے متعلق تیسرے منصوبہ کے مسودہ کی تیاری ہے۔

بھاری صنعتوں سے متعلق ورکنگ گروپ نے تیسرے منصوبے کے لئے ۲۰۵ کروڑ روپیہ کی لاگت کے صنعت کاری کے پروگرام کی تجویز پیش کی ہے۔ گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے لئے ۴۱ کروڑ روپیہ کی لاگت کی اسکیموں کی تجاویز پیش کی گئیں۔ اور فنّی تعلیم کی توسیع کے لئے تقریباً ۵۴ کروڑ روپیہ صرف کرنے کی سفارش کی گئی۔

نجی صنعت کاروں اور ریاستی حکومت کو بھاری صنعتوں سے متعلق امور کے بارے میں صلاح اور مشورہ دینے کے لئے تین مشیر کار مقرر کئے گئے۔

ریاست کے نجی صنعت کاروں اور ریاستی محکمہ صنعت کے افسروں کی دو پارٹیوں نے ملک کے مختلف مقامات میں صنعتوں کے جدید طریقوں کا معائنہ کیا تاکہ ان طریقوں کو ریاست میں رائج کیا جاسکے۔ ان پارٹیوں نے اپنی سفارشات حکومت کو پیش کر دی ہیں۔

کانپور کی صنعتی ریاست کی تقریباً ۱۲ فیکٹریوں میں کام شروع ہوگیا ہے۔ پس ماندہ علاقوں کی ترقی کے لئے پہاڑی اضلاع میں مزید تین صنعتی ریاستیں قائم کی جارہی ہیں۔

ریاستی حکومت کی جانب سے ریاست میں صنعتی ترقی کے امکانات اور محکمہ صنعت کی مختلف اسکیموں کے اثرات کا جائزہ لیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ ریاست میں بہت زیادہ قدرتی اور مادّی وسائل دستیاب ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

فنّی تعلیم کے لئے اکتوبر ۱۹۵۹ء تک تقریباً ۶ لاکھ روپیہ کے قرضے منظور کئے گئے جب کہ عام طور پر ہر سال دو لاکھ روپیہ کے قرضے دیئے جاتے ہیں۔

بجلی کی فراہمی

زیر نظر سال کے دوران محکمہ بجلی کی نمایاں سرگرمیوں میں گذشتہ اپریل سے ریاستی بجلی بورڈ کا قیام اور تمام صنعتوں کو بجلی محصول سے مستثنیٰ کرنا شامل ہیں۔

بجلی بورڈ نے ریاستی محکمہ بجلی کی ازسرنو تنظیم کرنے کے علاوہ گنگا اپر دیلی بجلی سپلائی کمپنی لمیٹیڈ کو اپنے انتظام میں لے لیا تاکہ مراد آباد اور بجنور کے اضلاع کو براہ راست بجلی مہیا کی جاسکے۔

ضلع علی گڑھ میں ہردوا گنج بجلی منصوبہ پر عملدرآمد کی رفتار تیز تر کر دی گئی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ یہ منصوبہ ۱۹۶۲ء تک مکمل ہوجائے گا۔ اس منصوبہ کے تحت ہردوا گنج میں ۶۰ ہزار کلوواٹ کا ایک اسٹیم پاور اسٹیشن قائم کیا جارہا ہے تاکہ اس کے ذریعہ مغربی اضلاع کی بجلی کی مزید ضرورت پوری کی جاسکے۔

ریاستی حکومت ضلع جھانسی میں ماتا ٹیلہ بند منصوبہ کے بجلی کے شعبہ پر کام شروع کرنے کے اقدامات کر رہی ہے۔ ضروری غیر ملکی زرمبادلہ کی عدم دستیابی کی بنا پر اگست ۱۹۵۸ء میں اس منصوبہ پر عملدرآمد ترک کر دیا گیا تھا۔ مرکزی حکومت نے حال میں اس منصوبہ کے لئے غیر ملکی زرمبادلہ کی فراہمی کے لئے کہا ہے۔ اس منصوبہ کے ذریعہ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ۱۵ ہزار کیلوواٹ سے بڑھا کر ۳۰ ہزار کیلوواٹ کرنے کی تجویز ہے۔

جمنا ہائیڈل اسکیم کے پہلے اور دوسرے مرحلوں پر بھی کام شروع کرنے کے اقدامات کئے جارہے ہیں۔ پہلے مرحلہ میں ۱۷ ہزار اور ۳۴ ہزار کیلوواٹ کے دو ہائیڈل اسٹیشن تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ دوسرے مرحلہ کی نظر ثانی شدہ اسکیم کے تحت ۲۲۰ اور ۶۴ ایم۔ ڈبلیو کے دو بجلی گھر تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔

قصبوں اور مواضعات میں بجلی کی فراہمی کی اسکیم کے تحت موجودہ منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں ۱۴۸ قصبوں کو بجلی مہیا کی جاچکی ہے اور منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں مزید ۴۳ قصبوں کو بجلی فراہم کرنے کی اُمید ہے۔ شروع میں اس اسکیم کے لئے ۵ کروڑ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی تھی بعد میں منصوبہ بندی کمیشن نے اسے کم کرکے ایک کروڑ روپیہ کر دیا۔

دوسرے منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں تقریباً ۱۷۰۵ سرکاری ٹیوب ویل کو بجلی مہیا کی گئی اور منصوبہ کی بقیہ مدت میں مزید ۶۲۸ ٹیوب ویل کو بجلی فراہم کرنے کی اُمید ہے۔ زیر نظر سال میں مزید ۱۱۰۰ ٹیوب ویل کو بجلی بہم پہنچائی گئی۔

غذائی صورتِ حال

ریاست میں زیر نظر سال میں غذائی صورت حال بحیثیت مجموعی تسلی بخش رہی فصل کی کٹائی کے سیزن میں بازار میں گیہوں کی آمد میں کمی اور ریاست کے کچھ علاقوں میں خشک سالی سے خریف فصلوں کو نقصانات پہنچنے سے غذائی صورت حال پر اثر پڑا لیکن صورت حال بعد میں بہتر ہوگئی اور اناج کی قیمتیں گرنے لگیں۔

غذائی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت کی جانب سے دیہی

اور شہری علاقوں میں ۴۵۶۴ سستے اناج کی دکانیں کھولی گئیں۔ ریاست میں لازمی اشیا قانون نافذ کیا گیا جس کے تحت حکومت کو گیہوں۔ چاول۔ دھان۔ چنا۔ جو اور مٹر وغیرہ کے اسٹاک کو اوسط بازار بھاؤ پر حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا اور گیہوں کی نقل اور حرکت پر پابندی سے متعلق آرڈر مجریہ ۱۹۵۹ء کے تحت اناج اور اس سے بنی ہوئی اشیا کی نقل اور حرکت پر پابندیاں عائد کی گئیں۔

ریاست میں اناج کی تھوک تجارت پر بہتر کنٹرول اور گیہوں اور چاول کی سرکاری تجارت کی اسکیم کی کامیاب تکمیل کے لئے اناج کے بیوپاریوں کو لائسنس جاری کئے گئے۔ اب تک ایسے ۱۹۴۰۰ لائسنس دئے جا چکے ہیں۔

ریاست کی دھان ملوں کو دھان مل (اجرا لائسنس اور کنٹرول) آرڈر ۱۹۵۹ء کے تحت تقریباً ۲۵۰۰ لائسنس جاری کئے گئے۔

چاول کے حصول سے متعلق آرڈر مجریہ ۱۹۵۹ء جو گذشتہ دسمبر میں ریاست کے ۳۲ اضلاع میں نافذ کیا گیا تھا بعد ازاں مزید سات اضلاع میں نافذ کر دیا گیا۔ اس کے تحت گذشتہ نومبر کے آخر تک حکومت کے ذریعہ کل ۱۱۵۹۱۶ ٹن چاول خریدا گیا۔ گیہوں کی خریداری کے لئے گیہوں کے حصول سے متعلق آرڈر مجریہ ۱۹۵۹ء گذشتہ ۵ مئی سے ریاست کے ۴۳ اضلاع میں نافذ کیا گیا۔

گیہوں پیدا کرنے والوں کو اپنی مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے ذریعہ حکومت کے ہاتھ مقررہ نرخ پر گیہوں فروخت کرنے کی سہولتیں دی گئیں۔ ایسے ۱۲ اضلاع میں جن پر گیہوں کی خریداری سے متعلق آرڈر کا اطلاق نہیں کیا گیا تھا۔ گیہوں کا انتہائی نرخ مقرر کیا گیا۔ حکومت کے ذریعہ نومبر کے آخر تک ۲۸۱۰۷ ٹن گیہوں خریدا گیا۔

ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے محفوظ ذخیرہ جمع کرنے کے لئے نومبر کے آخر تک کھلے بازار میں ۲۰۲۵۹ ٹن موٹا اناج خریدا گیا۔

ریاست میں شکر ملوں کے ذریعہ شکر کی ناکافی سپلائی کی بنا پر گذشتہ مئی سے شکر کی قیمت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ صورت حال کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے حکومت کی جانب سے شکر کے بیوپاریوں کو اجرا لائسنس آرڈر مجریہ ۱۹۵۹ء ریاست میں ۳۱ مئی سے نافذ کیا گیا۔ جس کے تحت شکر کے ہر بیوپاری کے لئے جس کے پاس کسی وقت ۱۳۷ من سے زیادہ شکر کا اسٹاک رہتا ہے لائسنس لینا ضروری قرار دیا گیا۔

مرکزی حکومت کی جانب سے جون ۱۹۵۹ء میں ریاست کو ۳۰۵۰ ٹن شکر کا عارضی کوٹہ ملا جو ریاست کے آٹھ شہروں میں سستے اناج کی دکانوں کے ذریعہ تقسیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ جولائی ۱۹۵۹ء میں ۵،۵۹ ٹن شکر کا کوٹہ ملا جو ۵۰ ہزار سے زیادہ آبادی والے ۲۱ قصبوں میں تقسیم کیا گیا۔

زرعی ترقی

ریاست میں اس سال زراعت کی ترقی کے سلسلہ میں جو نمایاں کام ہوئے ان میں خریف اور ربیع کی مہمیں شامل ہیں جن کے ذریعہ پیداوار کو بڑھانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔

ربیع اور خریف مہموں کے تحت جو ہماری دیہی زندگی کا ایک مستقل جزو بن گئی ہیں نہ صرف غذائی پیداوار میں اضافہ کیا گیا بلکہ فیلڈ ورکروں کی ایک کثیر تعداد کو تربیت دی گئی اور کسانوں کو کم سود پر قرضے کی سہولتیں بہتر بیج کیمیاوی کھاد اور زراعتی آلات فراہم کئے گئے۔ اس کے علاوہ دس لاکھ سے زیادہ گرام سہالکوں کو کاشتکاری کے جدید طریقوں کی تربیت دی گئی۔

اس سال غلہ گوداموں کے قائم کرنے کا جو نشانہ مقرر کیا گیا تھا وہ پورا کر لیا گیا اور ۵۰۳ غلہ گودام کی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ علاوہ ازیں تقریباً ۵۰ لاکھ من بہتر قسم کا بیج کسانوں میں تقسیم کیا گیا اور زیر نظر سال میں تقاوی کے لئے مقررہ رقم ۷۰ لاکھ روپیہ سے بڑھا کر ۱۸۰ لاکھ روپیہ کر دی گئی۔

پودوں کے تحفظ سے متعلق ریاستی اسکیم کی تو تنظیم کی گئی اور تحفظ کے مرکزوں کی تعداد ۱۲ سے بڑھا کر ۴۸ کر دی گئی۔ اس سلسلہ میں ۲۴۲۲۶۹ ایکڑ اراضی میں حفاظتی تدابیر اختیار کی گئیں جبکہ مقررہ نشانہ ۱۲۵۰۰۰ ایکڑ تھا۔ مشرقی اضلاع خاص طور سے بلیا میں چوہے مار مہم بھی زوروں سے چلائی گئی۔

ریاست میں جوٹ کی پیداوار اور اس کی کوالٹی کو بہتر بنانے کی جانب بھی خاص توجہ کی گئی۔ اس سال اس کی پیداوار ۲،۹۷۰ لاکھ گانٹھ کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں ۴۲،۱ لاکھ گانٹھ ہوئی۔

ریاست کی خاص تجارتی فصل گنے کی فی ایکڑ پیداوار میں مزید اضافہ کرنے کے لئے بھی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس سال ریاست کی ۶۹ گنا ملوں میں ۲۵،۱۷ کروڑ من گنے کی پیوائی کی گئی جس سے ۲،۴۲ کروڑ من شکر تیار ہوئی اور ریاستی حکومت کو ۴۲،۷ کروڑ روپیہ گنے کے ابواب اور مرکزی حکومت کو ۲۵،۸ کروڑ روپیہ بطور اکسائز ڈیوٹی وصول ہوا۔

گنا امداد باہمی سوسائٹیوں نے جن میں ۲۴۰۰۰ مواضعات کے ۱۲۴۵۰۰

گنا کاشتکار ممبر ہیں، اپنے ممبروں کو بیج، کھاد اور زرعی آلات وغیرہ خریدنے کے لئے کم سود کے قرضے کی سہولتیں مہیا کیں۔ اس کے علاوہ ان سوسائٹیوں کے تحت ۶۲ بیج گودام، ۵۷ پرائمری اور سکنڈری اسکول اور چند ڈگری کالج چل رہے ہیں۔

ریاست میں گنّے کی فی ایکڑ اوسط پیداوار ۳۵۰ من سے بڑھ کر ۴۱۹ من ہو گئی۔

نگہداشت مویشیان

افزائش نسل مویشیان کا کام سائنسی طریقہ پر کرنے کے لئے ریاست کو ۹ منطقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر منطقہ میں مویشیوں کی افزائش نسل کے کم سے کم ایک فارم کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ اس وقت اتر پردیش میں ایسے ۱۴ فارم ہیں جہاں بہتر نسل کے سانڈوں کی پیدائش اور پرورش ہوتی ہے۔

مویشیوں کی بیماریوں کی روک تھام پر خاص توجہ کی گئی چنانچہ ۱۸۴۵۷۸ مویشیوں کو بیل روگ کا ٹیکہ لگایا گیا۔ اس سال مزید ۵ مویشیوں کے اسپتال قائم کئے گئے جس سے ان کی تعداد بڑھ کر ۳۰۷ ہو گئی۔ ڈسپنسریوں کی تعداد بھی ۴۴۰ تک بڑھا دی گئی جن کے ذریعہ ۲۵۷۸۸۲ مویشیوں کا علاج کیا گیا۔ ۳۴ گئوشالاؤں کو بہتر نسل کے مویشی اور ڈیری کا سامان خریدنے کیلئے امداد دی گئی اور ۱۴ تعلیمی اداروں کو ڈیری میں تربیت دینے کی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے ۲۰۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد دی گئی۔

اس کے علاوہ بھیڑوں اور اُون کی ترقی۔ سور پالنے۔ مرغبانی اور مچھلیوں کی افزائش کے کام کی رفتار کو اس سال تیز تر کر دیا گیا۔

امداد باہمی

زیر نظر سال میں تحریک امداد باہمی کا اہم ترین کارنامہ ریاست میں دو ماہ کی ریکارڈ مدت میں ۱۰ ہزار سے زیادہ خدمتی امداد باہمی انجمنوں کا قیام ہے۔ وزیراعظم پنڈت نہرو نے ضلع آگرہ میں نج پوری کے مقام پر اُتر پردیش کی خدمتی امداد باہمی انجمنوں کی تحریک کا افتتاح کرتے ہوئے اس نمایاں کارگذاری کو ایک عظیم اقدام سے تعبیر کیا تھا۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ قومی ترقیاتی کونسل نے سارے ملک کے لئے ۲۰ ہزار خدمتی امداد باہمی انجمنوں کے قیام کا نشانہ مقرر کیا تھا۔ اتر پردیش نے ۱۰ ہزار خدمتی امداد باہمی انجمنوں کے قیام کی ذمہ داری لی۔ ریاست میں یکم نومبر تک مقررہ نشانہ سے زائد انجمنوں کا قیام عمل میں آگیا۔ ان انجمنوں کے دائرہ اثر میں ۱۱۲۹۰ گرام سبھائیں آگئی ہیں۔ ان انجمنوں کے لئے ممبر سازی کی مہم کے تحت ۸ لاکھ سے زیادہ اشخاص ممبر بنائے گئے اور ان انجمنوں کے سرمایہ حصص کے طور پر مجموعی طور پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ جمع ہو گیا اور جو رقم نصف صدی میں جمع نہ ہو سکتی تھی وہ رضاکارانہ طور پر دو مہینوں میں جمع ہو گئی۔

آبپاشی کی سہولتیں

ریاست میں اس سال آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلہ میں جو کام کئے گئے ہیں ان میں سے اہم خریف فصل کی ریکارڈ آبپاشی، جرگو ذخیرہ آب کی تکمیل، پس ماندہ علاقوں میں آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے ۹۰ لاکھ روپیہ اور انسداد سیلاب کے لئے ۸۳ لاکھ روپیہ کی منظوری شامل ہیں۔

ریاست میں گذشتہ گرمی کے موسم میں خشک سالی سے متاثر کسانوں کو امداد بہم پہنچانے کے لئے ریاست بھر میں نومبر کے آخر تک آبیانہ کے بقایا کی وصولی ملتوی کر دی گئی۔

ریاست میں گذشتہ خریف سیزن کے دوران ۳۹ لاکھ ایکڑ خریف فصلوں کی آبپاشی کرکے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا گیا۔

دوسرے منصوبہ کے تحت آبپاشی کے دس بڑے منصوبوں میں سے پانچ منصوبوں یعنی ضلع جھانسی میں ماتاٹیلہ، باندا میں بالیکی مانسرور، بستی میں کوانو پمپڈ نہر اور مرزاپور میں اپر کھجوری اور جرگو خزانۂ آب کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا تھا یا قریب تکمیل تھا۔

زیر نظر سال میں مزید ۲۵۰ ٹیوب ویل کی تعمیر شروع کی گئی۔ دوسرے منصوبہ کے تحت شروع میں ۱۵۰۰ ٹیوب ویل تعمیر کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جو بعد میں کم کرکے ۶۷۰ کر دیا گیا ان میں سے ۴۶۰ ٹیوب ویل کی تعمیر مکمل کی گئی۔

ریاست میں ۱۰ لاکھ روپیہ کی لاگت کی انسداد سیلاب اسکیمیں مکمل کی گئیں جن کے ذریعہ ۵ لاکھ ۵۰ ہزار ایکڑ زمین کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ کیا گیا۔ منصوبہ بندی کمیشن نے انسداد سیلاب کے اقدامات کے لئے ۸۳ لاکھ روپیہ مخصوص کیا۔ ریاستی حکومت نے مالی سال رواں کے دوران اس مقصد کے لئے ۸۱ لاکھ روپیہ کی منظوری دی۔

آبپاشی کے چھوٹے کاموں کی تکمیل کے لئے مرکزی حکومت نے مزید ۹۰ لاکھ روپیہ دیا۔ اس سلسلہ میں ریاست کے مشرقی اضلاع بندیلکھنڈ، الہ آباد، مرزاپور اور پہاڑی اضلاع میں آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں پر عملدرآمد شروع

کیا گیا۔ زیر نظر سال میں ریاست کے مغربی اضلاع میں پانی کی نکاسی کے نظام کو بہتر بنانے کے اقدامات کئے گئے۔

اجتماعی ترقی

اجتماعی ترقیاتی پروگرام ریاست کے کل رقبہ اور آبادی کے نصف کا احاطہ کرتا ہے۔ ریاست میں سنہ ۱۹۵۹ء تک، ۴۹ بلاک قائم کئے گئے۔

بلاک کے علاقوں میں معتدبہ ترقی ہو چکی ہے خاص طور سے زراعت اور سینچائی کے سلسلے میں نمایاں کام انجام پا چکے ہیں۔ تقریباً ۱ لاکھ ایکڑ آراضی میں جاپانی طریقہ سے دھان کی کاشت کرائی گئی اور ۴۴۳۱۲۵۸ من کیمیاوی کھاد اور دوسری کھادیں اور ۳۸۸۳۵ جدید زرعی آلات کسانوں میں تقسیم کئے گئے۔ اس کے علاوہ مزید ۱۴۷۰۰۰ ایکڑ آراضی کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں اور مواضعات میں ۳۳۸۸ نئی امداد باہمی انجمنیں قائم کی گئیں۔

علاوہ ازیں ان بلاکوں میں چھوٹی بچت مہم کے تحت ۳۳۸۵۴۹۲ روپیہ اندوختہ جمع کیا گیا اور ۱۸۳۱۶۰۰۹۸ روپیہ کی لاگت کی ترقیاتی اسکیموں کو شرم دان کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا۔

اصلاحات آراضی

حکومت نے اس سال ریاست میں جوتوں کی انتہائی حد مقرر کرنے کے بارے میں ایک اہم فیصلہ کیا اور اس سلسلہ میں جوتوں کی انتہائی حد مقرر کرنے کا بل مجریہ سنہ ۱۹۵۹ء اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ یہ بل جس کے تحت جوتوں کی حد ۴۰ معیاری ایکڑ مقرر کرنے کی تجویز ہے مجالس قانون ساز کی مشترکہ منتخب کمیٹی کے زیر غور ہے۔ اس بل میں باغات کی زمین، مذہبی اوقاف، خیراتی ٹرسٹ، منظور شدہ تعلیمی اداروں اور گئوشالاؤں وغیرہ کی زمینیں مستثنیٰ کی گئی ہیں۔

گذشتہ اپریل میں ایک نئی اسکیم کا نفاذ کیا گیا جس کا مقصد مالگذاری کے کاغذات کی درستی کرنا ہے۔ اُمید ہے کہ اس اسکیم سے حکومت کو تقریباً ۲ کروڑ کی غیر متواتر آمدنی ہوگی اور مالگذاری میں سالانہ تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوگا۔

اس سال چک بندی کا کام مزید ۹ ضلعوں کی ایک ایک تحصیل میں مکمل ہو گیا اور ۵ نئے ضلعوں کی ایک ایک تحصیل میں اس کی ابتدا کر دی گئی۔ سال کے ختم ہونے تک ۲۳۰۲۔ اضلاع کی ۴۸ تحصیلیں اس اسکیم کے تحت آگئی ہیں۔ مذکورہ مدت میں ۹۴۳۸۴ مواضعات میں چکوں کی حد بندی کی گئی۔

گذشتہ نومبر کے آخر تک سابق زمینداروں کو خاتمہ زمینداری کے معاوضہ کے طور پر ۱۶۶۱۷۸۲۵ روپیہ نقد اور بانڈوں کی صورت میں ادا کیا گیا جس سے ان کو ادا کی گئی کل رقم ۴۸۳۴۹۵۶۳۶ روپیہ ہو گئی۔ ایسے سابق زمینداروں کو جن کی سالانہ مالگذاری ۱۰ ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں تھی، امداد بحالی کے طور پر ۹۹۱۸۰۹۱۸ روپیہ ادا کیا گیا جس سے اس ضمن میں ان کو ادا کی گئی کل رقم ۲۲۶۳۸۸۰۱۸ روپیہ ہو گئی۔

مذہبی اور خیراتی اوقاف کو عارضی سالیانہ کے طور پر ۱۷۰۳۸۵۰ روپیہ دیا گیا اور سابق ادی واسیوں کی زمین کے کھاتہ داروں کو معاوضہ کے طور پر ۱۹۲۷۲۱۹۹ روپیہ نقد اور ۱۱۷۸۷۰۰ روپیہ بانڈوں کی صورت میں ادا کیا گیا۔

زیر نظر سال میں ۱۵ اضلاع کے ۱۷۰۱ مواضعات میں سروے اور کاغذات کی درستی کا کام جاری رہا اور چھ اضلاع میں کام کی تکمیل ہوئی۔ کمایوں ڈویژن کے پہاڑی اضلاع میں نینی تال کی تحصیل میں سروے اور کاغذات کی درستی کا کام مکمل ہوا۔

ڈسٹرکٹ گزیٹیر کی نظر ثانی کا کام تیزی سے جاری رہا۔ ضلع لکھنؤ کا نظر ثانی شدہ گزیٹیر شائع کر دیا گیا اور بارہ بنکی، سیتاپور، اور فیض آباد کے ضلعوں کے نظر ثانی شدہ گزیٹیروں کا مسودہ تکمیل کے آخری مرحلہ پر پہنچ گیا۔ اسی طرح آگرہ اور زدار النسی ضلعوں کے نظر ثانی شدہ گزیٹیروں کے لئے سال کے ختم ہونے تک ضروری معلومات فراہم کی جا رہی تھیں۔

خشک سالی اور سیلاب سے متاثر اضلاع کے عوام کی پریشانیاں دور کرنے کے لئے حکومت نے فوری اقدامات کئے۔ جن علاقوں میں روپیہ میں آٹھ آنہ سے زیادہ فصل برباد ہو گئی تھی وہاں آئندہ ربیع کی کٹائی تک کے لئے مالگذاری کے بقایا کی وصولی ملتوی کر دی گئی۔ تمام نہروں اور ٹیوب ویلوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا گیا اور ٹیوب ویلوں کے ذریعہ

آبپاشی کی شرح ۱۹ ہزار گیلن کے بجائے ۳۰ ہزار گیلن فی روپیہ کردی گئی۔ اس کے علاوہ حکومت نے ۸۷۳۶۰۰ روپیہ مفت مالی امداد، ۵۰۰۰ ۳۵ روپیہ دوسرے امدادی کاموں کے لئے، ۵۰ ہزار روپیہ مکانات کی تعمیر، ۱۳۵۰۰۰۰ روپیہ ٹسٹ ورک اور ۸۶۹۸۰۰۰ روپیہ تقاوی کے طور پر کسانوں کو تقسیم کیا۔

توسیع تعلیم

زیر نظر سال میں مفت اور لازمی تعلیم کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے اقدامات کئے گئے۔ اس اسکیم کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تربیت یافتہ مدرسین کی کمی تھی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے ریاست میں ۴۸ نئے سرکاری نارمل اسکول جن میں چھ لڑکیوں کے اسکول شامل ہیں کھولے گئے اور موجودہ ۶۹ نارمل اسکولوں میں تربیت پانے والوں کی تعداد میں ۵۰ ۳ کا اضافہ کیا گیا جن میں سولڑکیاں شامل ہیں۔ اس اسکیم کو ۱۹۶۱ء کے آغاز سے نافذ کرنے کے لئے تقریباً ۸۹ ہزار مدرسین کی خدمات حاصل ہوں گی۔ مدرسین کی تربیت کے پروگرام کی توسیع کئی برسوں تک جاری رہیگی۔

غیر سرکاری امدادی ہائر سکنڈری اسکولوں اور ڈگری کالجوں کے مدرسین کی تنخواہ کے نظر ثانی شدہ اسکیل یکم جولائی ۱۹۵۹ء سے نافذ کئے گئے جس سے سکنڈری اسکولوں کے ۴۰ ہزار مدرسین اور ڈگری کالجوں کے تقریباً ۲ ہزار لکچرر مستفید ہوئے۔ زیر نظر سال میں انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن ایکٹ بھی نافذ کیا گیا جس کے ذریعہ مدرسین کو ملازمت کے تحفظ علاوہ دیگر بنیادی حقوق دیئے گئے۔

تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو کام پر لگانے کے لئے زیر نظر سال میں ایک اسکیم پر عملدرآمد کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت دو مدرسین والے ۴۲۵ ۱ پرائمری اسکول کھولے گئے جن کے ذریعہ ۲۸۵۰ اشخاص کو روزگار مہیا کیا گیا۔ مذکورہ پرائمری اسکولوں کے قیام سے ریاست میں ایسے اسکولوں کی تعداد ۳۷ ہزار سے زیادہ ہوگئی۔

لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے لئے زیر نظر سال میں خاص طور پر کوشش کی گئی۔ دیہی علاقوں میں کام کرنے کے لئے خواتین مدرسین کی ہمت افزائی کے پیش نظر تقریباً ۶۸۵ رہائش کوارٹروں کی تعمیر کی اسکیم شروع کی گئی جن میں سے تقریباً ۳۲۰ کوارٹر مالی سال رواں کے دوران تعمیر ہوجائیں گے۔ ایسے مواضعات میں جن کی آبادی دو ہزار سے زیادہ ہے اور جہاں کوئی نارمل اسکول نہیں ہے لڑکیوں کے پرائمری اسکولوں کے قیام کے لئے موثر اقدامات کئے گئے۔

توسیع تعلیم کے سلسلہ میں نچلے ثانوی درجہ تک بنیادی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ کثیر مقصدی اسکولوں کا قیام عمل میں آیا اور سائنس اور فنی تعلیم کی توسیع کے لئے اقدامات کئے گئے۔ علاوہ ازیں پس ماندہ علاقوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسکولوں کے لئے عمارتوں کی تعمیر پر بھی توجہ دی گئی۔ اس سلسلہ میں زیر نظر سال میں ۱۱ ہائر سکنڈری اسکولوں اور نو نارمل اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر جاری تھی۔ اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے عارضی ضلع پریشدوں کو مالی امداد دی گئی۔

سنسکرت یونیورسٹی وارانسی میں جو دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد یونیورسٹی ہے موجودہ تعلیمی سال سے پانچ غیر ملکی زبانوں کی تعلیم شروع کی گئی۔ اس یونیورسٹی کا نصاب جدید تقاضوں کے مطابق تیار کیا گیا اور بین اقوامی ہوسٹل قائم کئے گئے۔

طبی سہولتیں

ریاست کے تین میڈیکل کالجوں میں زیر نظر سال کے دوران تعلیمی سہولتوں میں مزید توسیع کی گئی۔ کانپور میڈیکل کالج میں سماجی اور انسداد دواؤں کا ایک نیا شعبہ اور سینہ کی سرجری کا مرکز قائم کیا گیا۔ آگرہ میڈیکل کالج میں طلبا کے داخلہ کی گنجائش ۷۵ سے بڑھاکر ۱۰۰ کردی گئی۔ اور ملحقہ اسپتالوں میں پلنگوں کی تعداد میں ۱۵۰ کا اضافہ کیا گیا جس سے پلنگوں کی مجموعی تعداد ۵۷۶ ہوگئی۔ اس کے علاوہ تپ دق کی تعلیم اور مظاہرہ مرکز کے قیام کے لئے عمارتوں کی تعمیر کا پروگرام شروع کیا گیا۔ لکھنؤ میڈیکل کالج میں بچوں کی رہنمائی کا کلینک قائم کیا گیا اور خون کی سپلائی بڑھانے کے لئے بلڈ بینک کی نو تنظیم کی گئی۔

ریاست کے منتخب ضلع اور علاقائی ہیڈ کوارٹروں کے اسپتالوں کا درجہ بلند کرنے کے لئے فیض آباد اور دہرہ دون میں ماہرین کے علاج کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ بریلی اور گورکھپور میں دانت کے مخصوص شفاخانے۔ جھانسی، بستی، بریلی اور لکھنؤ میں صحت عامہ کی تجربہ گاہیں اور بریلی اور سہارنپور میں بچوں کے کلنک قائم کئے گئے۔ پوڑی اور مرزاپور میں نئے ضلع اسپتالوں کی

عمارتوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ آگرہ اور سہارنپور کے ضلع اسپتال نئی عمارتوں میں منتقل ہو گئے۔

دیہی علاقوں میں علاج معالجہ کی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلہ میں مزید ۵۰ ابتدائی صحتی واحدے قائم کئے گئے جس سے ایسے واحدوں کی کل تعداد ۲۱۸ ہو گئی اور مزید ۱۵۰ واحدوں کے قیام کے احکام جاری کئے گئے۔

دیہی ڈسپنسریوں کے ڈاکٹروں کو ۷۰ روپیہ ماہانہ کی مخصوص تنخواہ دی گئی۔ ان ڈاکٹروں کی نجی پریکٹس ختم کر دی گئی اور اس کے لئے انھیں الاؤنس دیا گیا۔

زیر نظر سال کے دوران اسپتالوں کی عمارتوں اور عملے کے کوارٹروں وغیرہ کی توسیع کے لئے ۱۲ لاکھ روپیہ کی لاگت کی کئی اسکیمیں منظور کی گئیں۔

دیہی علاقوں میں عورتوں کو طبی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے عورتوں کے لئے مزید تین ڈسپنسریاں قائم کی گئیں۔ آنکھ کے علاج کے کیمپوں کے اخراجات کے لئے ۵۰ ہزار روپیہ کی مالی امداد منظور کی گئی۔

ریاست میں بی سی جی کے ٹیکے دینے والی ۱۶ جماعتوں نے بالترتیب ۱۹ لاکھ ۶۸ ہزار اور ۵ لاکھ ۱۰ ہزار اشخاص کی جانچ کی اور ٹیکے دئے۔

اسپتالوں میں تپ دق کے مریضوں کے لئے پلنگوں کی تعداد بڑھا کر ۱۳۱ کر دی گئی۔ سہارنپور میں تپ دق سینے ٹوریم کے لئے عمارتوں کی تعمیر کی منظوری دی گئی۔

کوڑھ کے مریضوں کے علاج کے لئے مزید تین گشتی واحدے قائم کئے گئے جس سے ریاست میں ایسے واحدوں کی کل تعداد ۱۱ ہو گئی۔ زیر نظر سال میں ایسے غیر سرکاری اداروں کو جو کوڑھ کے علاج کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں ۲ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ کی مالی امداد دی گئی۔

ملیریا کی روک تھام کی اسکیم کے تحت زیر نظر سال میں انسداد ملیریا کے مزید ۲۷ واحدے قائم کئے گئے جس سے ایسے واحدوں کی کل تعداد ۲۷ ہو گئی۔

ریاست کے مشرقی اضلاع میں جہاں فائلیریا کا زور ہے فائلیریا کی روک تھام کے دو واحدے قائم کئے گئے۔ جس سے ریاست میں ایسے واحدوں کی کل تعداد ۸ ہو گئی۔

ریاست کے دیہی علاقوں میں زچہ اور بچہ کی فلاح کے مزید ۲۰۰ مرکزوں کے قیام کی منظوری دی گئی۔ جن کے قیام سے ریاست میں ایسے مرکزوں کی کل تعداد ۱۱۹۸ ہو جائے گی۔ دیہی علاقوں میں منتخب زچہ اور بچہ مرکزوں میں دائیوں کی تربیت کی اسکیم بھی شروع کی گئی۔ ریاست میں زچہ اور بچہ کے ۳۹۲ فلاحی مرکزوں میں زیر نظر سال کے دوران دوائیں اور مکھن نکالا ہوا دودھ کا پاؤڈر حاملہ عورتوں کو تقسیم کیا گیا۔ ریاست کے دس شہروں میں اسکولی بچوں کو دودھ کا پاؤڈر تقسیم کرنے کی اسکیم شروع کی گئی۔

ریاست میں کنبہ منصوبہ بندی کے پروگرام کو آگے بڑھایا گیا اور شہری اور دیہی علاقوں میں کنبہ منصوبہ بندی کے سرکاری کلنکوں کی تعداد بڑھ کر بالترتیب ۱۵ اور ۹۰ ہو گئی۔ کنبہ منصوبہ بندی کی سرگرمیوں کی رفتار تیز کرنے کے لئے ایک ریاستی کنبہ منصوبہ بندی بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔

زیر نظر سال میں ملازمین کی ریاستی بیمہ اسکیم ریاست کے مزید چار مقامات پر شروع کی گئی جس سے اس اسکیم کے دائرہ اثر میں ۱۵ شہر اور ۱۳۱۰۰۰ اشخاص آگئے ہیں۔

لوکل سلف گورنمنٹ

یو۔ پی نگر مہاپالیکا ایکٹ وضع ہو جانے کے بعد ریاست کے کاوال شہروں میں کارپوریشنوں کے قیام کا راستہ ہموار ہو گیا۔ ان کارپوریشنوں کا صرف افتتاح کرنا باقی ہے کیونکہ وہاں انتخابات بھی بحسن و خوبی انجام پا چکے ہیں۔

اس سال دو نئے میونسپل بورڈوں کا قیام عمل میں آیا جس سے ریاست میں ان کی تعداد بڑھ کر ۱۲۷ ہو گئی ہے۔ اس وقت صرف ۵ میونسپل بورڈ معطل ہیں۔

نوٹیفائڈ اور ٹاؤن ایریا کمیٹیوں نے سڑکوں اور نالیوں کی درستی اور دوسرے مفاد عامہ کے کاموں کے سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دیں اور عوام کی صحت اور صفائی کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔

گاؤں پنچایتیں خریف اور ربیع مہموں اور دوسرے دیہی ترقیاتی کاموں میں حسب معمول ہاتھ بٹاتی رہیں۔ ان پنچایتوں نے ستمبر ۱۹۵۹ء تک ۳۶۹۲ نئے پکے پنچایت گھر، ۶۱۵۰ پکے کنوئیں، ۱۰۸۰ پکی نالیاں، ۴۲۰ میل لمبی پکی سڑکیں تعمیر کیں اور ۲۶۱۰ میل لمبی گلیوں میں کھڑنجہ لگوایا

اس کے علاوہ ۰ ۵۴ لائبریریاں قائم کیں اور ۱۰۵۱ ریڈیو سیٹ لگائے اور ۷۵،۹ پینے کے پانی کے کنوؤں کی مرمت کی اور ۱۰۶۵۱ ایکڑ مین باغات اور ۳۲۱ ایکڑ میں جنگلات لگائے۔

پنچائت عدالتوں نے ۴۹ ۸ ۳ ۱۱ مقدمات فیصل کئے جن میں سے ۱۴ ۰ ۲۵ مقدمات میں باہمی تصفیہ کرادیا۔

اس سال یوپی عارضی ضلع پریشد (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۵۹ء وضع کیا گیا جس سے عارضی ضلع پریشدوں کی میعاد میں دسمبر ۱۹۶۰ء تک کی توسیع ہوگئی۔

شہری علاقوں میں نالیوں کی تعمیر اور پانی کی فراہمی کی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے مالی سال رواں میں ۱۱۵ لاکھ روپیہ منظور کیا گیا جس کو پانی کی فراہمی کی ۳۴ اور نالیوں کی تعمیر کی پانچ اسکیموں پر صرف کیا جائے گا۔ امید ہے کہ موجودہ منصوبہ کے ختم ہونے تک ریاست کے ۴۲ قصبوں میں نل کے ذریعہ پانی فراہم ہو سکے گا اور ۲۷ قصبوں میں پانی کی نکاسی کی سہولتیں مہیا ہو جائینگی۔

دیہی علاقوں میں پانی کی فراہمی اور صفائی کے لئے مالی سال رواں میں ۴۰ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی۔

تعمیر مکانات

صنعتی مزدوروں کے لئے مکانات کی اسکیم کے تحت ریاست کے مختلف شہروں میں ۵۶-۱۹۵۵ء میں ۱۳۲۲۶ مکانات تعمیر کئے گئے تھے۔ موجودہ منصوبہ کے تحت ۲۵ ر ۷۲ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے ۱۴۲۲۲ مکانات تعمیر کرنے کی تجویز ہے جن میں سے اس وقت تک ۴۱۴، ۳ مکانات بن کر تیار ہو چکے ہیں۔

کم آمدنی والوں کے لئے تعمیر مکانات اسکیم کے تحت موجودہ منصوبہ میں ۵۵ ر ۲۶۲ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے جس سے ۵۲۷۵ مکانات تعمیر کئے جائیں گے اور ۷۵۶ ر ۱۸۶ ایکڑ زمین ہموار کی جائے گی۔ مرکزی حکومت اس وقت تک ۵۰ ر ۲۸۷ لاکھ روپیہ دے چکی ہے جس میں سے ۲ ر ۲۴۳ لاکھ روپیہ ۱۵۱۴ مکانات کی تعمیر اور ۱۸۵۶ ایکڑ زمین ہموار کرنے پر صرف ہو چکا ہے۔

دیہی علاقوں میں تعمیر مکانات اسکیم کے تحت موجودہ منصوبہ کی مدت میں ریاست کے ۸۵۰۰ مواضعات میں ۲۰ ہزار مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں نومبر ۱۹۵۹ء تک ۷ لاکھ روپیہ دیا جا چکا ہے اور ۴۰ لاکھ روپیہ کی رقم اضلاع کیلئے مخصوص کر دی گئی ہے۔

گندی بستیوں کی صفائی سے متعلق مرکزی حکومت کی اسکیم کے تحت اس وقت تک ۲۳۷۸ کوارٹر تعمیر ہو چکے ہیں اور کاروال شہروں میں ۱۰۸۴ کوارٹر تعمیر کے مختلف مرحلوں میں ہیں۔

مزدوروں کی فلاح وبہبود

مزدوروں کی فلاح وبہبود کے سلسلہ میں زیر نظر سال نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال ریفریشر کورسوں، معلوماتی دوروں اور مالی امداد کے ذریعہ ٹریڈ یونین تحریک کو تقویت پہنچائی گئی۔ مزدوروں سے متعلق قوانین پر بہتر طور پر عملدرآمد کے پیش نظر لیبر کمشنر کے دفتر کو لا مرکزی بنانے کے اقدامات کئے گئے اور ریاست کے چھ منطقوں میں اتنی ہی تعداد میں اسسٹنٹ لیبر کمشنر مقرر کئے گئے۔

کانپور اور نینی تال میں زیر نظر سال کے دوران دو ریفریشر کورس کا بندوبست کیا گیا جن میں ریاست بھر کے تقریباً ۵۰ ٹریڈ یونین ورکروں نے شرکت کی۔ علاوہ ازیں جنوری ۱۹۵۹ء میں ٹریڈ یونین ورکروں کی ایک جماعت کو معلوماتی دورہ پر بمبئی، احمد آباد اور اندور بھیجا گیا۔ ریاست کی ۱۴ ٹریڈ یونینوں کو اپنے ممبروں کی تعلیم اور فلاح وبہبود کے لئے ۱۰ ہزار روپیہ کی مالی امداد دی گئی۔

مزدوروں کے تعلیمی مرکز کانپور میں، جو مرکزی حکومت کی جانب سے قائم کئے گئے دس مرکزوں میں سے ایک ہے، زیر نظر سال کے اگست سے کام شروع ہو گیا۔ اس مرکز میں کانپور کی آٹھ کپڑے کی ملوں سے منتخب ۲۵ مزدور ٹیچروں کو تربیت دی جا چکی ہے۔

ریاست کے مزدوروں کی فلاح کے مرکزوں میں بدستور مفت طبی امداد، تفریح اور زچہ اور بچہ کی بہبودی وغیرہ کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔

کارخانے کے مالکوں اور مزدوروں کے باہمی تعلقات خوشگوار بنانے کے لئے حکومت کی جانب سے اقدامات کئے گئے۔ اس سلسلہ میں کپڑے اور شکر کی صنعت سے متعلق سہ جماعتی کمیٹی نے قابل تعریف کارگذاری پیش کی۔ علاوہ ازیں ریاست کی شکر ملوں کے مزدوروں کو

بونس کی ادائیگی کے سوال پر غور و خوض کرنے کے لئے حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی۔

پیرانہ سالی پنشن کے ضوابط اور زیادہ نرم اور آسان کر دئے گئے۔ اس اسکیم نے گذشتہ نومبر کے آخر تک ۵،۶۲ ۱ شخاص مستفید ہوئے۔

ریاست میں زیر نظر سال کے دوران چھ نئے روزگار دفتر قائم کئے گئے۔ روزگار دفتروں کو زیر نظر سال میں کل ۶۶۲۳۱ خالی جگہوں کو اطلاع ملی جبکہ اس سے پہلے سال یہ تعداد ۶۱۵۴۴ تھی۔ روزگار دفتروں کے ذریعہ نومبر تک ۴۸۹۵ اشخاص کو روزگار مہیا کیا گیا جبکہ اس سے پہلے سال میں ۵،۰۰۴ اشخاص کو روزگار فراہم کیا گیا تھا۔ پیشہ ورانہ رہنمائی کی اسکیم کی رفتار ترقی تسلی بخش رہی۔ روزگار اور پیشے کے انتخاب کے سلسلہ میں یونیورسٹی کے طلبا کی رہنمائی کرنے کے لئے زیر نظر سال میں وارانسی اور علی گڑھ یونیورسٹیوں میں دو روزگار بیورو قائم کئے گئے۔

نظامت تربیت اور روزگار کی جانب سے انجینیرنگ اور غیر انجینیرنگ پیشوں میں تربیت کی مزید سہولتیں فراہم کی گئیں۔

روڈویز

دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے تحت ریاست کی مزید ۲۱۶ میل لمبی سڑکوں پر سرکاری بسیں چلائی جائیں گی جس کے لئے ساڑھے ۸۵ لاکھ روپے ۱۰۱ ڈیزل سے چلنے والی بسیں۔ مشینیں اور زمین خریدی جائیں گی اور عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔ اس وقت ریاست میں ۲۸۴۳ سرکاری بسیں۔ ۱۵۸ ٹرکیں اور ۹۴ ٹیکسیاں ہیں جو ۵،۰ راستوں پر چل رہی ہیں۔ روڈویز میں کام کرنے والوں کی تعداد تقریباً ۱۵۰۰۰ ہے جس میں سے ۱۰۰۰ اشخاص سنٹرل ورکشاپ کانپور میں کام کرتے ہیں۔

یو۔پی روڈویز کے ذریعہ میلہ اور تہوار جیسے خاص موقعوں پر بھی مسافروں کو سواری کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ ڈرائیوروں فنی عملہ اور دوسرے کم تنخواہ پانے والے عملہ کو ان کی بہتر کارکردگی کے صلہ میں انعامات اور اعزازی رقومات بھی دیجاتی ہیں۔

تعمیرات عامہ

محکمہ تعمیرات عامہ نے اس سال ریاست کے پسماندہ علاقوں کی ترقی کے پیش نظر نئی سڑکیں اور پل تعمیر کرکے نمایاں کام انجام دیا۔ ہند تبت اور اتر پردیش۔ نیپال سرحدوں سے ملحقہ علاقوں میں آمد ورفت کے ذرائع کو بہتر بنانے پر خاص توجہ دی گئی۔

ان تعمیر شدہ سڑکوں میں خاص خاص یہ ہیں، ضلع گورکھپور میں ۲۹ میل لمبی نکلول تو تنوا سڑک اور ۲۰ میل لمبی گولہ بازار کھجانی سڑک، ضلع گڈھوال میں ۱۹ میل لمبی سڑک۔ ۲۰ میل لمبی بیبل کوٹی، جوشی مٹھ سڑک اور ۱۴ میل لمبی اگست منی گپت کاشی سڑک۔

اس سال کچھ اہم پلوں کو آمد و رفت کے لئے کھولدیا گیا۔ ان میں سے لکھنؤ میں ککوا نالہ پل، ضلع گونڈہ میں ٹہری ندی کا پل ضلع بارہ بنکی میں رام سینہی گھاٹ، حیدر گڈھ سڑک پر گومتی کا پل، ضلع بستی میں بوڑھی رائن ندی کا پل اور ضلع بہرائچ میں سرجو کا پل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان بڑے پلوں میں جو زیر تعمیر ہیں گڈھ مکتیشر میں گنگا کا پل، بریلی متھرا سڑک پر رام گنگا کا پل اور اجودھیا میں سرجو کا پل شامل ہیں۔

محکمہ تعمیرات عامہ کے ذریعہ زیر نظر سال میں متعدد دنئی عمارتوں کی تعمیر شروع کی گئی جن میں سے رُدرپور زراعتی یونیورسٹی کے کالج اور ہوسٹل کی عمارتوں کی تعمیر قابل ذکر ہے۔ علاوہ ازیں صنعتی مزدوروں کیلئے ۲،۲۲ ایک، اور ۲۲۴۶ دو کمرے والے مکانات کی بھی تعمیر شروع کی گئی۔

محکمہ تعمیرات عامہ کے ادارہ تحقیقی نے مٹی کے مکانوں کے لئے سستا واٹر پروف پلاسٹر تیار کیا گیا۔

سماجی فلاح

عورتوں اور بچوں کا معیار زندگی بلند کرنے اور عصمت فروشی کی برائی ختم کرنے کے مقاصد کے حصول کے لئے زیر نظر سال میں اہم اقدامات کئے گئے۔ اس سلسلہ میں ریاست کے مزید تین اضلاع میں قانون انسداد عصمت فروشی نافذ کیا گیا۔ علاوہ ازیں حکومت نے قانون کے ذریعہ یہ اختیار حاصل کیا کہ وہ یتیم خانوں اور بیواؤں کی پناہ گاہوں کی بدانتظامی کے معاملات میں مداخلت کر سکے۔

معذور اور مجبور اشخاص کی بہبودی اور دیہی علاقوں میں عورتوں کی سماجی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے کامیاب اقدامات کئے گئے۔

لکھنؤ میں اندھوں کے دو اسکولوں اور آگرہ اور بریلی میں گونگوں کے لئے دو اسکولوں کے ذریعہ ۲۰۰ معذور بچوں کو تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کی سہولتیں

فراہم کی گئیں۔ دیہی علاقوں میں عورتوں کو ریاست کے ۴۴ اضلاع میں قائم عورتوں کی فلاح کے ۲۹۶ مرکزوں کے ذریعہ تعلیم تفریح اور دستکاری اور امور خانہ داری کی تربیت کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ علاوہ ازیں محکمہ کلیان سمیتوں نے ۲ ہزار محلہ سمیتوں کی مدد سے فلاحی اسکیمیں وضع کرنے اور ان پر عملدرآمد کے سلسلے میں عوام کا تعاون حاصل کیا۔

ضلع کی سطح پر قائم ۱۲ پناہ گاہوں اور استقبالیہ مرکزوں کے تحت کام کرنے والے چند بعد کی دیکھ بھال کے مرکزوں میں گمراہ عورتوں اور مردوں کو پناہ دی گئی اور ان کی بحالی کیلئے اقدامات کئے گئے۔ دہرہ دون کی پناہ گاہ میں عصمت فروشی کے اڈوں سے چھڑائی گئی نابالغ لڑکیوں کو باعزت زندگی گزارنے کے لئے مختلف پیشوں کی تربیت دی گئی۔

ہریجنوں کی فلاح وبہبود

ہریجنوں کی فلاح کی اسکیموں کے تحت زیر نظر سال میں چھوت چھات ختم کرنے کو نمایاں اہمیت دی گئی۔ حکومت کی جانب سے اس سلسلہ میں ہریجنوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی متعدد ملی جلی بستیوں کی تعمیر شروع کی گئی۔ یہ بستیاں کربیبی (باندا)۔ رام کولا اور کیدوار (دیوریا) جینہٹ (لکھنؤ) اور دہرہ دون میں تعمیر کی جارہی ہیں۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کو جو ان بستیوں میں آباد ہو رہے ہیں گے وہی سہولتیں دی جائیں گی جو ہریجنوں اور دوسرے پسماندہ طبقوں کو دی جاتی ہیں۔

بہرائچ اور اٹاوہ کے اضلاع میں سابق جرائم پیشہ قبائل کی آبادکاری کا کام شروع کیا گیا۔ ان قبائل کے مزید ۴۰ کنبوں کو سرکاری چرک سیمنٹ فیکٹری کے آس پاس کے علاقوں میں بسایا جارہا ہے اور تقریباً ۱۴۰ کنبوں کو متھرا میں بسانے کی اسکیمیں قطعی کردی گئی ہیں۔

سابق جرائم پیشہ قبائل کے بچوں کی تعلیم کے لئے الہ آباد اور کاکوری (لکھنؤ) میں ایک ایک آشرم نما اسکول قائم کیا گیا۔ ان اسکولوں میں ۶ سال سے لے کر ۱۲ سال تک ۱۰۰ بچوں کو تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائی جارہی ہیں۔

زیر نظر سال میں تقریباً ۳۸۵ دستکاروں کو ملدھان ضلع نینی تال میں بسانے کی اسکیم شروع کی گئی۔ ان دستکاروں کو اب تک تقریباً ۱۶۰۰ ایکڑ زمین الاٹ کی جاچکی ہے اور تقریباً تمام دستکاروں کو بسایا جاچکا ہے۔

ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کے افراد کے لئے لکھنؤ۔ الہ آباد اور مرادآباد کے تعلیمی اداروں میں اسٹینوگرافی اور ٹائپ رائٹنگ کے مفت کلاسوں کا بندوبست کیا گیا۔ زیر نظر سال میں ۱۵۴۰۰ سے زیادہ طلباء کو وظائف اور مالی امداد دی گئی۔

ضبط ونظم

ریاست میں اس سال بحیثیت مجموعی جرائم کی صورت حال تسلی بخش رہی۔ قتل کی وارداتوں کو چھوڑ کر جن میں ۱۹۵۹ء کے مقابلہ میں کچھ اضافہ ہوا دوسرے تمام جرائم میں کمی ہوئی۔ زیر نظر سال میں ڈاکوؤں کے بہت سے اہم گروہوں کا قلع قمع کیا گیا۔ پولیس کے ذریعہ جو بدنام ڈاکو ہلاک کئے گئے وہ یہ ہیں۔ جہان سنگھ۔ نائب سنگھ جھنگی رام لوٹا لائق سنگھ اور گراج گرجو۔ علاوہ ازیں پولیس کی مستعدی سے میرٹھ مرادآباد۔ بلیا۔ ہردوئی۔ نینی تال۔ گورکھپور اور بدایوں میں متعدد ڈاکوؤں کو گرفتار کیا گیا۔ پولیس نے ڈاکوؤں کے متعدد بین اضلاعی اور بین ریاستی بہت سے گروہوں کا بھی قلع قمع کیا۔

زیر نظر سال میں کانپور اور الہ آباد کے ہنگاموں اور لکھنؤ مرادآباد بہرائچ اور مبارک پور میں ہولی کے دوران فرقہ وارانہ نوعیت کے فسادات میں پولیس نے مستعدی سے اپنے فرائض انجام دئے۔

دیہی دفاعی انجمنوں نے بھی جرائم کی روک تھام کے سلسلہ میں اہم رول ادا کیا۔ ان انجمنوں کے ممبروں نے ۱۰۲ مواقع پر ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا۔ ان مقابلوں میں ۲۳ ڈاکو ہلاک اور ۱۲۰ ڈاکو گرفتار کئے گئے۔

زیر نظر سال کا نمایاں کارنامہ ایک لاکھ روپیہ سے زائد مالیت کی افیون برآمد کرنا ہے جو غازی پور کی سرکاری افیون فیکٹری سے چرائی گئی تھی۔ علاوہ ازیں پولیس نے تقریباً ۶ ہزار گم شدہ بچوں کا پتہ لگایا اور ان کے والدین کے پاس پہنچا دیا۔

کانپور میں کنپٹی مار قاتل گرفتار کیا گیا جس نے کئی مہینوں سے دہشت پھیلا رکھی تھی۔ ریاستی پولیس کا یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔

جیل اصلاحات

اترپردیش میں زیر نظر سال میں جیل کی اصلاحات کی مہم کے تحت سرگرمیاں تیز تر کردی گئیں اور ۱۹۵۸ء میں منعقدہ قیدیوں اور سابق قیدیوں کی کانفرنس کی چند اہم سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے اقدامات کئے گئے۔ جن کے ذریعہ قیدیوں کو مزید سہولتیں فراہم کی گئیں۔ مرکزی جیلوں میں ایسے قیدیوں کو جن کا طرز عمل بہتر رہا باہر سونے کی اجازت دی گئی۔ اور قیدیوں کے لئے اتوار اور چھٹی

سے کے دنوں میں صحت مند کھیلوں کا انتظام کیا گیا۔ جیلوں میں پنچایتوں کے قیام کی سفارشات پر بھی عملدرآمد کیا گیا۔ کھلی جیلوں کے قیدیوں کے جیب خرچ کی رقم ۱۲ کے بجائے ۲۵ نئے پیسے کر دی گئی۔ قیدیوں کو اپنے تمام خطوط وصول کرنے کی اجازت دی گئی اور اُن سے ملاقات کرنے کا وقفہ ۲۰ منٹ سے بڑھا کر ۳۰ منٹ کر دیا گیا۔

کھلی جیلوں کا تجربہ جا[illegible] با ضلع نینی تال میں نانک ساگر، مرزاپور میں گھوسا مارکنڈی اور چلی بھیت میں جھولا کے مقامات پر سمپورنانند کیمپ کی اسکیم زیر عمل رہی۔ سمپورنانند کیمپ کے چھ قیدیوں کو گورنمنٹ سیمنٹ فیکٹری میں ٹکنیکل اور مکینیکل کاموں کی تربیت حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ لمبی سزا کے پچاس قیدیوں کو دو جماعتوں میں ایک سال کے پیرول پر ترائی اسٹیٹ فارم میں کام کرنے کے لئے بھیجا گیا۔

ریاست میں زیر نظر سال کے آخر میں جیلوں کے سپرنٹنڈنٹوں اور جیلروں کی کانفرنس ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ قیدیوں کو خواندہ بنایا جائے اور ان کے اندر باعزت زندگی گزارنے کا جذبہ بیدار کیا جائے اور اس سلسلہ میں ان کی ہمت افزائی کی جائے۔

جیلوں کو کپڑے کے معاملہ میں خود کفیل بنانے کے لئے وارانسی۔ نینی۔ فتح گڈھ۔ بریلی اور آگرہ کی مرکزی اور لکھنؤ۔ سیتاپور اور میرٹھ کی ضلع جیلوں میں امبر چرخہ اور کھادی کی بنائی کی اسکیم کی رفتار تیز تر کر دی گئی۔

جیل کی صنعتوں سے متعلق تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش کے مطابق جیلوں میں مزید سات دستکاریاں شروع کی گئیں۔ گاندھی جینتی کے موقعہ پر قیدیوں کی سزاؤں کی تخفیف کے نتیجہ میں ۲۴۵۰ قیدیوں کو رہا کیا گیا۔

زیر نظر سال میں آگرہ اور وارانسی میں تجربہ کے طور پر ریاستی قانون اطفال مجریہ ۱۹۵۱ء پر عملدرآمد کے سلسلہ میں ابتدائی امور کی تکمیل کی گئی۔ اور ریاست کے دو اضلاع میں بچوں کی رہنمائی کے کلنک قائم کرنے کے احکام جاری کئے گئے۔ مذکورہ قانون کے تحت نابالغ مجرموں کے لئے عدالتوں، منظور شدہ اسکولوں اور مشاہدہ گاہوں وغیرہ کے قیام کے سوال پر بھی غور و خوض کیا گیا۔

جنگلات

کمایوں ڈویژن کے پس ماندہ علاقوں کی ترقی کے پیش نظر زیر نظر سال میں جنگلات لگانے کی ایک نئی اسکیم شروع کی گئی۔ اس اسکیم کے تحت ۲۲۲۰ ایکڑ میں صنعتی اہمیت کے درخت اور ۱۰۰ ایکڑ میں جڑی بوٹیوں کے پودے لگانے کی تجویز ہے۔ گذشتہ نومبر کے آخر تک اسکیم کے تحت جڑی بوٹیوں کے ۴۳۵۰ پودے لگائے گئے۔ ۱۳۷۰ پودگھر قائم کئے گئے اور ۳۰۰ گڑھے کھودے گئے۔

کمایوں میں پھلوں کے درخت لگانے کی اسکیم کے تحت یکم اپریل سے ۳ نومبر تک ۵۴۷۰ درخت لگائے گئے جن سے پھلوں کے درختوں کی مجموعی تعداد ۱۵۱۲۰۸ ہو گئی جب کہ دوسرے منصوبہ کی مدت میں ۲۵۰۰۰ درخت لگانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ لاکھ کی کاشت کے سلسلہ میں ۱۹۲۰۰ درختوں کی شاخوں کی کانٹ چھانٹ کی گئی اور ۴۵۵ من لاکھ پیدا ہوئی۔ زیر نظر سال میں ۱۱۸۵۶ ایکڑ میں صنعتی اہمیت کے درخت جن میں دیا سلائی کی لکڑی بھی شامل ہے لگائے گئے۔ اور مزید ۲۱۰۵ ایکڑ میں سال کے درخت لگائے گئے۔ جنگلات میں رسل و رسائل کے ذرائع کی فراہمی کی اسکیم کے تحت گذشتہ نومبر کے آخر تک ۲۵ میل لمبی ٹیلیفون لائنیں لگائی گئیں۔ موجودہ منصوبہ کے آغاز سے ۳۶۱ میل لمبی موٹر سڑکیں تعمیر ہو چکی ہیں اور ۲۲۳ میل لمبی ٹیلیفون لائنیں لگائی جا چکی ہیں۔

مٹی کے تحفظ کی تین بڑی اسکیموں کے تحت کام جاری رہا۔ اس سلسلہ میں تقریباً ۱۷۰۰ ایکڑ میں درخت لگائے گئے۔

عدالتوں کا نظم و نسق

ریاست میں گذشتہ مارچ میں ریاستی حکومت کی جانب سے ماتحت عدالتوں میں بدعنوانی کے معاملات اور مقدمات کے فیصلہ میں تاخیر کے اسباب کی جانچ کے لئے ہائی کورٹ کے جج کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے جو مجالس قانون ساز کے ممبروں، ریاستی وکلا کانفرنس کے نمائندوں، ممتاز شہریوں اور جوڈیشنل حکام پر مشتمل ہے۔ ایک جامع سوال نامہ مرتب کیا اور اسے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے جاری کیا گیا۔ کمیٹی نے گواہوں کا بیان لینے کے لئے اور مقامی تحقیقات کے لئے چند اضلاع کا انتخاب کیا۔ اس کمیٹی کی جانب سے مقرر کی گئی ذیلی کمیٹیوں کے ممبران اب تک گورکھپور، وارانسی، میرٹھ اور دہرہ دون کا دورہ کر چکے ہیں۔

دق کا علاج گھر پر

دق کے مریضوں کو اب علاج کے لئے اسپتال میں رکھنا ضروری نہیں رہ گیا ہے۔ ان کا علاج ان کے گھروں پر ہو سکتا ہے۔

گھر پر رہ کر علاج کے طریقے اور انسدادی تدبیروں نے جو نمایاں ترقی کی ہے اس کے باعث اب اسپتالوں اور صحت گاہوں کے مقابلے میں کلینک کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ان سروسوں کی افادیت ہمارے عوام کے ذہن نشین کرائی جائے۔ اس میں ٹی بی سیلوں کی فروخت کی مہم سے مدد ملتی ہے۔

ٹی بی سیل زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدیئے
ایک سیل کی قیمت صرف دس نئے پیسے

ٹی۔بی سیل حسب ذیل جگہوں پر مل سکتی ہیں:-

۱۔ آنریری سکریٹری، اترپردیش ٹیوبرکلوسس ایسوسی ایشن ملا اے۔ پی سین روڈ لکھنؤ سے۔
۲۔ اترپردیش کے ہر ضلع میں سیل فروخت کمیٹی سے۔
۳۔ اترپردیش کے ہر ضلع میں میونسپل اور۔ یا ضلع میڈیکل افسر آف ہلتھ سے

ہندستان میں ٹی بی سیل فروخت کی دسویں مہم
منجانب
ٹیوبرکلوسس ایسوسی ایشن آف انڈیا
اشتہار ہذا کی یہ جگہ ہدیہ منجانب
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ حکومت اترپردیش لکھنؤ

نیا دور لکھنؤ

جلد ۱۴ نمبر ۱۲

پھالگن ۱۸۸۱
مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

چندہ سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: ۲۵ نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
بھگوتی شرن سنگھ
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات، اترپردیش

پرنٹر
ایم۔ جی۔ شوم
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یو۔پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

اپنی بات

اتر پردیش کے وزیر مالیات شری سید علی ظہیر نے ۱۲ فروری کو اتر پردیش کی مجلس قانون ساز میں ۶۲-۱۹۶۱ء کا بجٹ پیش کرتے ہوئے جو تقریر کی اس سے اس بجٹ کے کئی روشن پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ یہ بجٹ خسارہ کا بجٹ ہے اور خسارہ پورا کرنے کے لئے اکثر نئے ٹیکس عائد کردیے جاتے ہیں۔ یوں بھی پنجسالہ منصوبہ کی اسکیموں کے اخراجات کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے نئے ٹیکس لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس بجٹ میں نہ تو کوئی نیا ٹیکس لگایا گیا ہے اور نہ ترقیاتی کاموں پر جو اخراجات ہو رہے ہیں ان میں کوئی کمی کی گئی ہے۔ بجٹ تقریر میں حکومت اتر پردیش کے ان کاموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو گذشتہ سال سرانجام پائے ہیں اور ان نئی اسکیموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو مالی سال رواں میں بروئے کار لائی جائیں گی۔ نئی اسکیموں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بجٹ میں زراعت اور صنعت وحرفت دونوں شعبوں پر کافی توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۶۰ء سے ریاستی زرعی یونیورسٹی اپنا کام شروع کردیگی اور مالی سال رواں میں ۱۲ ہزار ایکڑ میں باغات لگائے جائیں گے۔ صنعت وحرفت کے شعبہ میں علاوہ دوسری ترقیوں کے ایک اہم ترقی یہ ہوگی کہ گورنمنٹ پری سیزن فیکٹری لکھنؤ کیمرے، دیوار کی گھڑیاں اور ٹائم پیس تیار کرنے لگے گی اور چرک سیمنٹ فیکٹری کی پیداوار میں بھی کافی اضافہ ہو جائے گا۔ آبپاشی کے شعبہ میں بالائی گنگو رائی ذخیرۂ آب عنقریب پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا، نل کنوؤں کی کل تعداد ۴۰۰ اتک پہنچ جائے گی۔ دوسرے منصوبہ میں سیلاب کی روک تھام کے لئے جو اسکیمیں بنائی گئی تھیں انھیں جلد ہی مکمل طور سے بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے گی۔ رہیند باندھ پر سیمنٹ کا سارا کام ختم ہو جائے گا اور جنوب مشرقی اتر پردیش میں ساڑھے چار لاکھ کیلوواٹ کا ایک تھرمل اسٹیشن قائم کیا جائے گا۔ فنی تعلیم کے لئے بھی کافی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں گی۔ ہارکورٹ بٹلر انسٹی ٹیوٹ کی توسیع کے علاوہ فنی تعلیم کے ۵ نئے ڈپلوما ادارے بریلی، جھانسی، کانپور، مرزاپور اور فیض آباد میں قائم کئے جائیں گے۔ آیندہ جولائی سے کانپور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں بھی کام شروع ہو جائے گا۔ پنچایتوں کی ذمہ داریوں اور فرائض میں اضافہ کردیا گیا ہے۔ پانچ ہزار مزید خدمتی امداد باہمی انجمنوں کی تشکیل کی بھی پوری توقع کی جاتی ہے۔ ان ترقیاتی کاموں کے ساتھ حکومت نے ایک اور مسئلہ کو بھی جو نہایت اہم ہے، نظرانداز نہیں کیا ہے اور وہ مسئلہ ہے شمالی سرحد کے تحفظ کا۔ ظاہر ہے کہ بہ حالات موجودہ سرحد کے تحفظ کے سوال نے بڑی اہمیت اور نزاکت اختیار کرلی ہے۔ اس طرف سے غفلت برتنا ہندوستان کے دفاع سے غافل ہو جانا تھا۔ اسی چیز کے پیش نظر بجٹ میں ایک طرف سرحد کے ذرائع مواصلات کو ترقی دینے کے لئے ۶۱،۶۴ لاکھ روپیہ رکھا گیا ہے اور دوسری طرف سرحدی علاقہ کی عام ترقی کے لئے ۲۸،۳۶ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کردی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک نئی اسکیم کے ماتحت ۱۶ ہزار کیڈٹوں کو فوجی ٹریننگ دی جائے گی، پراونشل ایجوکیشن کور کی ۵۰ فی صدی جگہوں کو مستقل کر دیا جائے گا اور ایک ابتدائی فوجی اسکول بھی کھولا جائے گا۔

"نیا دور" جنوری ۱۹۶۰ء میں حضرت جگر مرادآبادی کی تازہ ترین غزل شائع کی گئی تھی اُس غزل کا آخری شعر اس لئے درج نہیں کیا گیا تھا کہ اس وقت جگر صاحب شعر کے پہلے مصرع کے متعلق کچھ فیصلہ نہ کرسکے تھے۔ بہرحال ان کے فرمانے کے مطابق اب اس غزل میں یہ شعر آخر میں بڑھا لیا جائے

مآلِ غم کہیں جاتا ہے ضائع چمن شاداب ہے شبنم نہیں ہے

——— (ایڈیٹر)

اترپردیش بجٹ ۶۱-۱۹۶۰ء — چند نمایاں پہلو

بجٹ ——— تقابلی مطالعہ

کروڑ روپیوں میں

	سال ۶۱-۱۹۶۰ (تخمینی)	سال ۶۰-۱۹۵۹ (بعد نظر ثانی)	سال ۵۹-۱۹۵۸ (اصل)
محاصل	۱۲۰،۹۰	۱۲۲،۳۳	۱۱۷،۲۳
مصارف	۱۲۳،۲۲	۱۲۲،۵۰	۱۱۶،۱۴
خسارہ	۲،۳۲	خسارہ ۱۷،۰	فاضل ۱،۵۹
مصارف اصل	۲۶،۹۹	۳۲،۴۲	———

اترپردیش کے وزیر مالیات شری سید علی ظہیر نے ۱۲ فروری ۱۹۶۰ء کو مجلس قانون ساز میں ۶۱-۱۹۶۰ء کا بجٹ پیش کیا۔ اس بجٹ کے بعض نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں۔

——— ریاست کے سرحدی علاقہ میں نقل و حمل کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے ۶۴،۱۱ لاکھ روپیہ اور دیگر ترقیاتی کاموں کے لئے ۲۶،۲۰ لاکھ روپے کی رقم مقرر کی گئی ہے۔ وقت اور حالات کے پیش نظر ان علاقوں کے لئے اور زیادہ رقم کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس لئے آئندہ سال کے بجٹ میں اس مقصد کے لئے سو روپیہ کی علامتی رقم رکھی گئی ہے۔

——— ابتدائی فوجی تعلیم کے لئے ایک ملٹری اسکول کھولا جائیگا۔

——— مرکزی حکومت کی جانب سے چلائی جانے والی این سی سی رائفل اسکیم کے تحت ۱۶ ہزار جوانوں کو تربیت دی جائے گی۔ پی۔ ای سی (پراونشل ایجوکیشنل کور) کی پچاس فی صدی جگہیں مستقل کر دی جائیں گی۔

——— ریاست کے جنوبی علاقہ میں ایک بجلی گھر قائم کیا جائے گا جس کی پیداواری صلاحیت ساڑھے چار لاکھ کیلوواٹ بجلی ہوگی۔

——— ۴۵ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والے درجہ چہارم کے اور دیگر سرکاری ملازمین کے سفر بھتہ کے قواعد میں ترمیم کی جائے گی جس کے مطابق ان کو صدر مقام سے باہر جانے پر زیادہ یومیہ سفر بھتہ مل سکے گا۔ علاوہ ازیں ان کو دیگر سرکاری ملازمین کی طرح خاص موقعوں پر اپنے کنبہ کے افراد کے لئے بھی سفر بھتہ ملے گا۔

——— ڈائرکٹر محکمہ صنعت کے دفتر میں بھاری صنعتوں کا شعبہ

قائم کیا جائے گا۔

— ریاستی پری سیزن انسٹرومنٹ فیکٹری میں ۶۱-۱۹۶۰ء سے فلم کیمرے۔ دیوار گھڑی۔ اور ٹائم پیس تیار کرنے کی اسکیم ہے۔

— جمنا ہائیڈل اسکیم کے ملتوی شدہ کام کو سن ۶۱-۱۹۶۰ء سے دوبارہ شروع کیا جائے گا۔

— سن ۶۱-۱۹۶۰ میں رہیا ند بند کے جائے وقوع پر کنکریٹ ڈالنے، بجلی گھر کی تعمیر اور دیگر کام مکمل ہو جائیں گے اور مشین لگانے کا کام شروع ہو جائے گا۔

— میکنیکل تعلیم کے لئے بجٹ میں ۶۶،۲۲۱ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

ریاست کے ۲۵ فنی اور صنعتی تعلیم کے اداروں کا درجہ بلند کرنے کی تجویز ہے۔

— چرک سیمنٹ فیکٹری کی پیداواری صلاحیت دگنی کرنے کے مقصد کے پیش نظر وہاں ایک نئی بھٹی جولائی کے مہینہ سے شروع ہو جائے گی۔

— شیرکوٹ (بجنور) کے قریب رام گنگا کے پل کی تعمیر مکمل ہو جائے گی۔

— دوسرے پنچسالہ منصوبہ کے تحت انسداد سیلاب کی اسکیمیں مارچ ۱۹۶۱ء تک پایۂ تکمیل کو پہونچ جائیں گی۔

— سن ۶۱-۱۹۶۰ء میں ریاست کے کسانوں کے مفاد کے لئے آراضی رہن بینک کی ۲۵ شاخیں قائم کرنے کی تجویز ہے۔ یہ بینک کسانوں کو ۲،۷۵ کرور روپیہ تک کے قرضے دے سکے گا۔

— امداد باہمی قرضہ سوسائٹیاں اپنے ممبروں کو آج کل ۱۵ کرور روپیہ کے قرضے دیتی ہیں۔ سن ۶۱-۱۹۶۰ء میں یہ سوسائٹیاں ۳۶ کرور روپیہ تک کے قرضے دے سکیں گی۔

— امداد باہمی انجمنوں کی بہتر کارکردگی کے لئے آئندہ سال ۲۸ نئی مارکٹنگ سوسائٹیاں قائم کی جائیں گی۔ اس طرح ان کی تعداد بڑھ کر ۱۰۸ ہو جائے گی۔

— ریاستی گودام کارپوریشن جو اس سال ۱۲ منڈیوں میں کام کر رہا ہے آئندہ سال مزید ۱۰ منڈیوں میں کام شروع کر دے گا۔

— باجنت اور سرسوا میں امداد باہمی شکر ملیں کام شروع کر دینگی۔

— بجٹ کے سال میں تین نئی صنعتیں کوالٹی مارکنگ اسکیم کے تحت آجائیں گی اور ۴۸۲ ہتھ کرگھوں کو بجلی سے چلایا جائے گا۔

— گنے کی کاشت اور اس کی پیداوار کے علاقوں کی ترقی کے لئے بجٹ میں ایک کرور ۱۹ لاکھ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے۔

— پینے کے پانی کی فراہمی، پانی کی نکاسی، صفائی، نقل وحمل کے وسائل، اسکولوں کی عمارتوں اور پنچایت گھروں وغیرہ سے متعلق تعمیراتی کاموں کو بروئے کار لانے کے اختیارات گاؤں سبھاؤں کو دیے جائینگے۔

— جولائی ۱۹۶۰ء سے رودرپور (نینی تال) کی زراعتی یونیورسٹی میں کام شروع ہو جائے گا۔

— بریلی۔ جھانسی۔ کانپور۔ مرزاپور اور فیض آباد میں ڈپلوما انسٹی ٹیوٹ قائم کئے جائینگے۔

— اس سال پہلے مرحلے کے ۲۰ ترقیاتی بلاک کھولے جائیں گے۔

— اس سال نہروں کی لمبائی بڑھ کر ۲۵۴۰۰ میل ہو جائے گی اور ٹیوب ویل کی تعداد ۶۴۰۰ ہو جائے گی۔

— پانچ ہزار مزید خدمتی امداد باہمی انجمنوں کا قیام

— چکن اسکیم کی مضافات لکھنؤ میں توسیع۔

— رہیا ند باندھ پر سیمنٹ کے تمام کاموں کی تکمیل

— چیچک کی خشک ویکسین کی تیاری تاکہ ویکسین زیادہ عرصہ تک کام آسکے۔

— پانچ مزید ٹی بی کلینکوں، دانت کے دو کلینکوں، تین زچہ بچہ، پانچ آیورویدک اور یونانی دواخانے، دس شہری اور ساٹھ دیہی فیملی پلاننگ کلینکوں اور ایک مرکز کا قیام

— پانچ ڈسٹرکٹ اسپتالوں کی میڈیکل اور سرجیکل سہولتوں میں اضافہ۔

✡

اردو قصائد اور تشبیب

اطہر علی فاروقی

قصیدہ نگار، قصیدہ میں اپنے موضوع کو سامع یا قاری کے سامنے یک بہ یک ذرا مشکل سے ہی رکھتا ہے بلکہ اُسے کئی منزلوں سے گزارتا ہوا لاتا ہے اور اس طرح اُس کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔ اس ڈھانچے کی تیاری اور مقصد رسی کے لئے وہ ایسی مرتب اور ہموار منزلیں نہیں اختیار کرتا جس طرح ایک کہانی کار اپنے موضوع کے پلاٹ کے لئے اختیار کرتا ہے، پھر بھی اس کے سامنے کچھ اشارات ہوتے ہیں، کچھ نشانات معین کر لئے جاتے ہیں۔ ان منزلوں میں سے پہلی منزل تشبیب یا تمہید کی ہے تشبیب قصائد کے اُن ابتدائی اشعار کو کہتے تھے جن میں عرب شاعر زیادہ تر حسن و عشق اور شبابیات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ عرب کے مشہور نقاد ابن رشیق اور ابن قدامہ دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ تشبیب کے اشعار مدح یا ہجو کے اشعار سے زیادہ نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں اس کی وہی صورت سمجھئے جو ڈاکٹر بلیر ایک مضمون (ESSAY) کی تمہید کے بارے میں سوچتے ہیں یعنی: ”کسی معمولی عمارت کے لئے ایک بڑا عالی شان پھاٹک کھڑا کر دینے سے زیادہ بھدا اور بدنما کوئی دوسری چیز نہ ہوگی.......“

لیکن اُردو کے شاعر منزل کی اس رکاوٹ کو توڑتے ہوئے چلے جانے کے عادی نظر آتے ہیں۔ اگر آپ سوداؔ کا ایک مشہور قصیدہ ملاحظہ فرمائیں جس کا مطلع ہے

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک دی وہیں آ کے خوشی نے در دل پر دستک

تو اندازہ ہوگا کہ قصیدے میں کُل اشعار ۱۲۰ ہیں اور ۵۰ فی صدی سے زائد یعنی ۶۲ شعر صرف تمہید کے ہیں۔ اسی طرح ہر قصیدہ گو کے دہاں اس کی خلاف ورزی نظر آئے گی۔

تشبیب کا اصل موضوع، جیسا کچھ اُس کے نام سے ظاہر ہے، حسن و عشق ہے لیکن عشقیہ جذبات کی ترجمانی پر بھی ایک پابندی عائد ہوتی ہے اور وہ یہ کہ قصیدہ گو جذبات کی ترجمانی اس طرح نہ کرے کہ قصیدہ گوئی کے اسلوب پر تغزل کی پرچھائیاں پڑنے لگیں ـــ اگر بفرض محال اُس نے غزل کا لب و لہجہ اختیار کر لیا ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بعد والے اشعار میں قصیدے کی جزالتی شان پیدا کر لے تاکہ ایک مخصوص ربط پیدا ہو جائے۔ مثال کے طور پر غالبؔ کے یہ عشقیہ اشعار لیجئے جو انھوں نے آخری تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفرؔ کے ایک مدحیہ قصیدے میں لکھے ہیں۔ یہ اشعار اگرچہ غزل کے رنگ میں سموئے ہوئے ہیں مگر ان کا لب و لہجہ قصیدے کا ہم آہنگ ہے:

ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

کنج میں بیٹھا رہوں یوں دَر کھلا کاشکے ہوتا قفس کا دَر کھلا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں کب کمر سے غمزے کے خنجر کھلا

نامہ کے ساتھ آ گیا پیغام مرگ رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

- -

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

اسی طرح برگزیدہ متورّع اور مقدّس ہستیوں کی مدح میں عاشقانہ اور رندانہ تشبیہیں لکھنا معیوب قرار دیا گیا ہے لیکن اردو قصیدہ گو اس حدبندی کے بھی زیادہ پابند نظر نہیں آتے۔ سودا کا ایک قصیدہ لیجئے جو اُنھوں نے جناب فاطمہؑ کی شان میں لکھا ہے اور ملاحظہ فرمائیے کہ وہ کس طرح اس حدبندی کو ڈھاتے ہوئے نکل جاتے ہیں :-

خورشید رہ گیا ہے خجالت سے سر چھپا — دیکھا ہے جب سے مُنہ کا ترے نور اے صنم
صورت کو تیری دیکھ گھٹا بدر دلربا — ابرو کو تیری دیکھ چھپا ابر میں ہلال
اَلّاہ آج سرو سے لپٹا ہے اژدہا — قمری نے یوں کہا تری کاکل کو دیکھ کر

یہی حال ضامن علی جلاؔل اور محسنؔ کاکوروی کا ہے۔

ایرانی شعرا نے عربوں کی طرح تشبیب کو صرف حسن و عشق میں محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کا دائرہ وسیع کر دیا۔ ایرانی قصیدہ نگاروں کی ہمنوائی کرتے ہوئے اردو قصیدہ نگاروں نے بھی تشبیب میں ہر قسم کے مضامین داخل کئے، چنانچہ بہار کا مضمون بھی اس ضمن میں شامل ہوا۔ لیکن اس بہار کے سلسلے میں ہمارے لئے ایک قباحت یہ درپیش ہے کہ ہم آج تک شائد یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ ہمارے ملک کی بہار کیا ہے اور کب سے کب تک رہتی ہے۔ شاعروں اور ادیبوں نے ایسے دو شعبوں میں الگ الگ رکھ دیا ہے۔ ہندی شاعر بسنت اور بہار کو بالعموم ایک اور ہم معنی چیز سمجھتے رہے ہیں۔ یہ موسم آخری فروری (پھاگن) سے اوائل اپریل (چیت) تک صرف دو ڈھائی مہینے رہتا ہے۔ جنگلوں میں ڈھاک (پلاس) اور سینبھل پھولتا ہے۔ پھولوں کی سرخی اور نارنجی رنگ سے جنگل میں انگارے سے دہکتے نظر آتے ہیں۔ کچنار کی کلیوں اور پھولوں پر بلا کا جوبن ہوتا ہے۔ جنگلوں میں خودرو کالی کالی مکوء اور سرخ سرخ اور زرد زرد جھڑبیری بیروں سے لد جاتی ہے۔ کالے کالے کروندے[1] بہار دکھاتے ہیں۔ کھیتوں میں سرسوں پیلے پیلے پھولوں سے لد جاتی ہے۔ کُسم اور سرسوں کے یہ پھول کھیتوں کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ باغوں میں آم پھولتا ہے اور بَور لاتا ہے۔ کوئل کوکتی ہے، پپیہا بولتا ہے۔ کہیں کہیں سطح زمین کے کچھ چپّے کوڑیالے کے سفید سفید خوشنما پھولوں اور دودھیا[2] کے باریک باریک گلابی پھولوں سے پٹ جاتے ہیں۔ کنٹیلے کے زرد زرد پھول اپنی نمائش کرتے ہیں۔ کھیتوں کی مینڈوں یا کھنڈروں اور گھوروں پر روسا اپنی بہار دکھاتا ہے جسے ہم بلا پس و پیش 'خودرو بیلا' کہہ سکتے ہیں۔ سہجن سفید سفید پھولوں اور نرم نرم پھلیوں سے لد جاتا ہے جسے ہندی کے مشہور شاعر رحیمن (عبدالرحیم خان خاناں) حدِ ادب سے بڑھ جانے کے الزام میں گردن زدنی سمجھتے ہیں: "اپنی حد سے آگے نہ بڑھو اور حیثیت نہ بھولو ورنہ وہی حال ہوگا جو سہجن کا ہوتا ہے کہ ڈال اور پات کاٹے جاتے ہیں۔" لیکن سچ پوچھئے تو کچنار، ڈھاک اور کنٹیلے کو چھوڑ کر ان سب میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ایک راہرو کو خود بخود اپنی طرف متوجہ کر لے اور نہ وہ اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ انسان از خود اُن کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جنگلوں اور جھابروں میں ایک چیز اور ہوتی ہے جو اگرچہ کسی خاص دلکشی کی مالک تو نہیں ہوتی مگر ہوتی ہے بڑی کثرت کے ساتھ۔ وہ ہے کانس۔ بیاوہ[3] (جس سے سرکنڈا نکلتا ہے) پھولتی ہے اور جھاڑو کی سینک کے پودے بھی پھولتے ہیں۔ (رامائن میں تلسی داس جی نے کانس پھولنے کا ذکر بڑے منتانہ انداز میں کیا ہے) بسنت کے گیتوں میں سرسوں اور آم کے بور کے سوا کہیں کہیں پیوڑی کا بھی ذکر آجاتا ہے۔

ہندی شاعری میں بسنت رُت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن نقشہ مکمل نہیں ہے۔ سبب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں دیہی فضا اور جنگلوں سے وابستہ ہیں اس لئے شہری شاعروں سے یہ امید رکھنا فضول ہے کہ وہ اس بہار کے ایسے بیانات دے سکیں جو حقیقی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ اردو کے قصیدہ نگاروں نے تقلیدی اور تخیلی طور پر بسنت پر بکثرت نظمیں لکھیں، لیکن بہار کا یہ رُخ اُن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا اور انھوں نے بہاریہ تشبیبوں میں یہ رُخ بہت دھندلا سا دکھایا ہے۔ کوڑیالے کے پھول، کوئل کا کوکنا اور پپیہا کی پی کہاں کی رٹ لگانا ضرور دکھائی دے جاتا ہے۔

اس بہار کا دوسرا رُخ برشگالی بہار ہے۔ اردو قصیدہ نگار اسی کو

---

[1] یہ کروندے بستانی کروندوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور صرف جنگلوں میں ملتے ہیں۔ [2] یہ اور اس طرح کے دوسرے نام اودھ کے قصبات کے لکھے گئے ہیں۔
[3] اسے پوربی ضلعوں میں پنلو کہتے ہیں۔

بہار سمجھتے رہے اور سچ پوچھئے تو ہمارے ملک میں، اگر کشمیر اور دوسرے کوہستانی علاقوں کو شامل نہ کیجئے تو، عام طور پر برسات کا موسم ہی بہار کا سماں پیش کرتا ہے، گھنگھور گھٹائیں، کالے کالے بادل، ہلکی ہلکی پھوار، موسلا دھار بارش، کوندے کی لپک، بجلی کی چمک، دھلا ہوا نیلگوں آسمان، ست رنگا دھنش (شفق کی سرخی)، آسمان پر جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے تارے، دھلا ہوا چاند، اڑتے اور پھدکتے ہوئے جگنو، آنکھوں میں کھپے جاتے ہیں۔ ہر طرف سبزہ اور ہریالی، درختوں کے پتوں کا نکھار من کو موہ لیتا ہے۔ خود رو پودے اور پھول کچھ تو دوران بارش میں اور کچھ برسات ختم ہوتے ہوتے اپنا جوبن دکھاتے ہیں۔

اردو قصیدہ نگاروں کو اسی لئے یہ احساس تھا کہ ان کے ملک کی بہار یہی برسات ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے قصائد کی بہاریہ تشبیبوں میں برشگالی بہار کے بھرپور بیانات دئیے ہیں اور اس کے مناظر بڑی خوبصورتی سے پیش کئے ہیں۔ مثلاً

لے ہوا جا کے بنارس سے اڑا لا بادل
چاہئے ہندوی سوسن کے لئے گنگا جل

دم بدم رعد کی آواز چلی آتی ہے
شیشہ و جام سے خالی نہ تہ دعوت و بغل

امان علی سحر

کبھی چھایا ہے سفید ابر کبھی ابر سیاہ
گہ فرنگی کا عمل ہے کبھی زنگی کا عمل

دب کے سال اٹھتے ہیں اس درجہ بخارات سیاہ
کہ تمام ابر کا کالا ہوا اجلا کمبل

قدر بلگرامی

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

محسن کاکوروی

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

سودا

اس سلسلے میں قوت نامیہ کی فزودگی، جوش رویدگی، ترادت ہوا، تاثیر بہار، فیض ہوا، جوش شگفتگی وغیرہ کے مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔ قصیدہ گو بھرپور مبالغے سے کام لیتا ہے اور قاری کے سامنے حقیقی تصویریں نہیں آتیں، پھر بھی یہ مرقعے بڑے دل چسپ اور دل فریب ہوتے ہیں۔ مثلاً

حد ایام کے پیش از مدد نامیہ سے
بچۂ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل

جوش رویدگی خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گلاؤ زمیں کے بھی جو گھٹنے کونپل

کیا عجب ہوگی ہتھیلی پہ جمالیں سرسوں
کیا عجب ہاتھ کے تل سے کوئی پھوٹے کونپل

لالہ و نرگس، سنبل و ریحاں، نسرین و نسترن وغیرہ کے علاوہ ہندوستانی پھول مثلاً بیلا، چمبیلی، کنول، گیندا وغیرہ اور ہندوستانی پرند مثلاً مور، توتا ہریل، شاما کے ساتھ مور کا ناچنا وغیرہ بھی اردو شاعروں کے سامنے رہا ہے۔ مثلاً :

جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں
لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

قرص خورشید تہ آب نظر آتا ہے
جیسے ندی میں بھنور یا کسی پانی میں کنول

آن کر پیڑوں کے تھالوں میں نہاتے ہیں لال
سو کھتے سوکھتے ہو جاتے ہیں بالکل ہریل

کچھ نظر کام نہیں کرتی ہے ہریالی میں
پاس سے بھی نظر آتے نہیں توتے، ہریل

اسی طرح برساتی موسم کے ہندوستانی تیوہاروں جیسے رکشا بندھن اور میلوں بڑھوا منگل، ہنڈولے کا میلا کی تصویریں نعتیہ قصیدے کی ایک بہاریہ تشبیب میں دیکھئے :

راکھیاں لے کے سلونو کی برہمن نکلے
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

اب کے میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

برسات کی اس سے زیادہ حقیقی اور خوبصورت تصویریں شاید ہی کہیں اور مل سکیں :

گھانس ہی گھانس ہو اُلاّد عنی فیض نمو
چھپلیے تھپلیے مالی ہوئے جاتے ہیں مثل

شام تک خاک بھی چھپ جاتی ہو دو دو بالشت
صبح تک سبزہ ابھر آتا ہے دو دو انگل

تہ دیا لا کے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل

کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہِ نو کی کشتی
بحر اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہلچل

شب کو مہتاب نظر آئے نہ دن کو خورشید
ہے یہ اندھیر مچائے ہوئے تاثیر زحل

اردو قصائد کی تشبیبوں میں بہار کا یہ رخ بہت درخشاں اور کامیاب نظر آتا ہے۔

تشبیبوں کا ایک مضمون شکایت فلک، گردش زمانہ، آلام اور مصائب، پریشاں حالی اور بے اطمینانی، اور مصیبتوں کا دکھڑا رونا بھی ہے۔ ان پریشاں حالیوں کا تعلق زیادہ تر کسی فرد سے ہوتا ہے اس لئے ایسی تشبیب حالیہ کہلاتی ہے۔ اپنی ان پریشانیوں، مصائب اور آلام بیان کرنے کے

لئے نہ تو کوئی جنچا تلا اُصول ہے اور نہ زبان پر تالا ہی لگا ہے پھر بھی زیادہ بہتر پیرایۂ بیان وہ سمجھا جاتا ہے جس میں گیرائی اور گہرائی کی کچھ نہ کچھ جھلک ضرور ہو اور پیرایۂ بیان سنجیدہ اور وزن دار اور گمبھیر ہو۔ حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں سوداؔ کے قصیدے کی تشبیب حالیہ ہے جس کا مطلع ہے:

ہوائے خاک نہ کھینچوں گا منت دستار　　کہ سرنوشت لکھی ہے مری بہ خطِ غبار

استاد ذوقؔ کے ایک قصیدے کی حالیہ تشبیب کے چند اشعار پڑھیئے :

ہوں وہ گرفتہ دل کہ مژہ پہ ہجومِ اشک　　ہوتا ہے شکل خوشۂ انگور آ گرہ
میں عکس اپنا دوں تو ہو جوہر سے آئینہ　　جوں دام موج دشکل خطِ بور یا گرہ
رجعت سے نجم بد کی مری ماہیٔ سپہر　　خرچنگ بن کے بیٹھ ہے ایک جا گرہ

میرؔ شکوہ آبادی کے ایک قصیدے کی تشبیب سرتاپا حالیہ ہے۔ اس کا عنوان "فریادِ زندانی" ہے اور یہ تشبیب اِس نوعیت کے لحاظ سے بے پناہ بلند پایہ ہے :

بگڑنا بھی ہے بننا بھی ہے نہرم اپنی قسمت میں　　مگر ہے تختہ مشقِ طفلِ مکتب لوحِ پیشانی
چنے کھانے کو ترسیں صاحبانِ گوہرِ عالی　　صدف کو دے نوالہ موتیوں کا ابرِ نیسانی

سحرؔ لکھنوی کے ایک قصیدے کی تشبیب حالیہ تشبیبوں کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں دوسروں کی بہ نسبت گیرائی اور گہرائی دونوں ہی زیادہ ہیں :

گردشِ چرخ سے بہتر ہو زمانے کا حال　　ذرۂ خاک ہیں پستی سے نجومِ اقبال

اِسی قصیدے کے دو شعر اور ملاحظہ فرمائیے :

نیستی پھیلی ہے اب شہر میں کنگلوں کی طرح　　لوگ واقف نہیں دینے سے بجز حرفِ سوال
دینے والا نہیں ملتا کوئی اب نددوں میں　　جمع ہیں قبرِ حاتم کے ہزاروں کنگال

بعض اوقات قصیدہ گو صراحتًا یا خواب کی حالت میں اپنے علم و فضل اور فن پر فخر کرتا ہے۔ ایسی تشبیب کو فخریہ کہتے ہیں۔ فخر و مباہات کا مضمون اُردو قصائد کی تشبیبوں میں ملتا ضرور ہے، مگر ایسا فخر جس کی حد رجز کے ہم پلّہ ہوں اردو میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اپنی قوم، اس کی شجاعت کے رعب اور ہیبت، علم اور فضل کی قدر دانی، شرافت اور نجابت پر فخر کر قاری یا سامع کی مُردہ رگوں میں جوشیلا خون بھرنا اور اُن کے جذبات میں برانگیختگی پیدا کرنا، رجزیہ تشبیبوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ہندوستان کی زبانوں میں بنگلا کے چنڈی منگلوں میں، یا پھر کچھ سین خاندان کے راجاؤں کے مدحیہ اشعار میں، عبدالکریم نامی بنگالی شاعر نے یہ وصف پیدا کیا ہے اور اُن میں عربی قصائد کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اُردو قصائد میں یہ رنگ بہت ہلکا اور پھیکا ہے اُردو میں نصرتیؔ کے قصائد میں اس کی جھلکیاں ضرور ملتی ہیں۔ باقی شعراء کے کلام میں اس فخر و مباہات پر تعلّی محض کا اطلاق ہوتا ہے۔

پند و موعظت اور اخلاقی نظریات بھی تشبیب کا ایک مضمون ہیں۔ کبھی قصیدہ گو، اپنے ذاتی تجربوں کو پیش کرتا ہے جنھیں مخصوص سماجی نظام اور سیاسی حالات کی دین سمجھنا چاہیئے۔ مثلًا جب وہ یہ کہتا ہے کہ

نکل وطن سے ہے غربت میں زور کیفیت　　کہ آب بحث ہے جب تک ہے تاک میں صہبا
ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہر کی　　تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر
عجب نادان ہیں جن کو ہے عُجب تاجِ سلطانی　　فلک بالِ ہُما کو پَل میں سونپے ہے مگس رانی

تو اِسے سیاسی خلفشار اور ماحول کے حالات کا نتیجہ ہی کہنا پڑے گا۔

قصیدہ گو کبھی مذہب اور توہمات کا سہارا لے کر سامع یا قاری کے سامنے چند نظریات رکھتا ہے، جن میں کچھ کرنے یا نہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی نصحیہ تشبیبوں میں قصیدہ گو وہ تمام روایتی چیزیں پیش کرنیکا عادی نظر آتا ہے جو ہمارے مخصوص معاشرتی نظام، فلسفۂ زندگی اور مذہبی اقدار نے ہمیں بخشی ہیں۔ صوفیانہ غزلوں کے مانند یہاں بھی آپ کو ایک ذہنی اضطراب ملے گا، احساسِ کمتری ہوگا، یاس اور قنوطیت کی فراوانی ہوگی، فنا اور بقا کے تصورات ہوں گے۔ بے ثباتیٔ دنیا، ہستیٔ بے بود، طمع و حرص کے نتائجِ بد، صبر و توکل، تحمّل، تسلیم و رضا، علم اور فن کی بے قدری، شرفا گردی، گردشِ روزگار وغیرہ کے مضامین ملیں گے۔ انھیں ہم صرف فارسی شاعری کی خوشہ چینی نہیں کہہ سکتے۔ اگر ان شاعروں کے سامنے فارسی شاعری کے صوفیانہ نظریات نہ بھی ہوتے، تو بھی اس قسم کے تصورات ضرور اُبھرتے۔ جو ہمارے ملک کے سیاسی انقلاب خلفشار، بے چینی اور سماجی نظام کی دین ہوتے۔

اس سلسلے میں قصیدہ گو جو بات آپ کے سامنے رکھے گا یا جس چیز کا دعویٰ کرے گا مثال کے طور پر اس کے ثبوت میں یا تو وہ آپ کی دیکھی بھالی کوئی چیز پیش کرے گا یا مذہبیات سے کوئی نظریہ ثبوت میں رکھے گا۔ یہاں تک کہ وہ اُن توہمات کا بھی سہارا لے گا جو مذہب سے کوئی وابستگی

نہ رکھنے پر بھی مذہب کا جز بن چکے ہیں اور اگر کچھ اعر نہیں تو وہ صرف اُن مفروضات سے کام لے گا، جو اُصول موضوع کے طور پر ہمارے معیشتی نظام میں تسلیم ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس قسم کی تشبیب میں ہمیں مثالیہ شاعری یا السٹریٹیڈ پوئٹری کے بڑے خوبصورت اور دل فریب نمونے مل جاتے ہیں اور یہاں اردو اور ہندی شاعری کے ڈانڈے ملتے دکھائی دیں گے۔ سودا کی مثالیہ شاعری ہندی کے شاعروں گردھر، کبیر اور رحیمن کی مثالیہ شاعری کی ہمنوائی کرتی نظر آئے گی۔ رحیم نے ایک دعویٰ کیا "جو رحیم اُتم پرکرت کا کر سکت کوسنگ" اور اس کے ثبوت میں "چندن وش ویاپت نہیں لپٹے رہت بھجنگ" پیش کر دیا۔ اسی طرح سودا نے ایک دعویٰ کیا "نکل وطن سے ہو غربت میں زر کیفیت" اور اُس کے ثبوت میں کہ "آب بچٹ ہے جب تک ہے تاک میں صہبا" کی مثال پیش کر دی۔ اسی طرح آپ کو صدہا اشعار ملیں گے جو مثالیہ شاعری کے بہترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ البتہ یہ طرز ادا ذوق تک تو ملے گا، لیکن ان کے بعد سے یہ رجحان کم ہوتا چلا گیا۔

تشبیبوں کا پیرایۂ ادا عام طور پر سیدھا سادا اور بیانی ہوتا ہے، جہاں تشبیہ اور استعارے اپنا اپنا کام کرتے نظر آتے ہیں۔ صنائع لفظی اور معنوی کی بھی کارفرمائی رہتی ہے۔

بعض اوقات شاعر مکالماتی پیرایہ اختیار کرتا ہے اور اس میں کبھی وہ خوشی سے ہم کلام ہوتا ہے اور کبھی عقل و خرد سے۔ کبھی یہ ہم کلامی جیتے جاگتے ہوتی ہے اور کبھی خواب کے عالم میں۔ سودا اور ذوق کے وہاں اس قسم کی مکالماتی تشبیبوں کے بڑے دل فریب نمونے ملتے ہیں متاخرین قصیدہ نگار اس کی طرف بہت ہی کم متوجہ ہوئے ہیں۔ عزیز لکھنوی کے قصائد میں یہ رجحان پھر نظر آتا ہے۔ سودا کے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

سودا پہ جب جنوں نے کیا خواب و خور حرام — لائی مجھ اُس طبیب کنے ہے عقل جن کا نام
احوال اُس کا دیکھ کے کہنے لگا طبیب — اب فصد و مسہل اُس کے لئے ہے حفید کام
کہنے لگا سُن اُس کو وہ دیوانہ در جواب — مجھ میں لہو کہاں یہ ترا ہے خیال خام

کبھی کبھی تشبیب کی مختلف صورتوں کا اجتماع ایک ہی قصیدے کی تشبیب میں ہو جاتا ہے، اگرچہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا کرتا ہے سودا نے اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں یہ اجتماع بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے قصیدے کا مطلع ہے:

پرشش سخن کی مجھے اپنی جان تلک — جوں شمع زندگانی ہے میری زبان تلک

اس قصیدے کی تشبیب میں اُنھوں نے ۸ اشعر نصیحیہ اور شکایت روزگار میں نکالے ہیں اس کے بعد یہ رُخ اس طرح مُڑتا ہے

ایسی غزل کہو کہ پڑھیں بلبلاں تلک — کیفیت بہار ہے گلشن یہاں تلک
ساقی اُٹھائے شیشہ و ساغر کو تا بیاض — ملک اس غزل کو پڑھتے چلیں گلستاں تلک

یہ سلسلہ ۱۳ شعروں تک چلتا ہے اور پھر وہ اس پر مکالماتی رنگ چڑھاتے ہیں۔

تھا مجھ کو رات کنج قناعت میں فکر شعر — ناگہ طمع کے حرص نے جنبش دی یاں تلک

وہ سوچتے رہتے ہیں اور ۱۹ اشعار اس پیرائے میں ڈھال کر پھر عقل کا سہارا لیتے ہیں

کہنے لگا وہ مجھ سے کہ سودا ہزار حیف — اتنا میں نے تجکو نہ سمجھا تھا یاں تلک
یہ قصد ہو ترا کہ میں لے کر بیاض ہاتھ — پہنچا کروں گا ہر در و ہر آستاں تلک

یہ ہے اُردو قصائد کی تشبیب کا ایک سرسری خاکہ اب اگر ہم یہ خاکہ گریز، دعا اور مدح کے خاکوں کے سامنے رکھیں تو اندازہ ہوگا کہ دعا اور مدح میں بجز دُور از قیاس باتوں کے کچھ اور نہیں ہوتا۔ ہزار برس سلامتی کی دعا ہوگی اور ہر برس میں پچاس ہزار دن ہوں گے، گھوڑے کی تیز رفتاری ہوگی، ہاتھی کی بادہ پیمائی ملے گی، سخاوت کی مبالغہ آمیز داد ہوگی، غرضیکہ کیا کچھ نہیں ہوگا اور سب کچھ ہونے پر بھی تشبیب کے خاکے کے سامنے سارے خاکے دھندلے ہوں گے۔ اس کی جانداری کے سامنے سب بے جان نظر آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قصیدے کی تمام منزلوں اور اُس کے عناصر میں تشبیب ہی ایک ایسی منزل ہے جو افادیت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس عنصر میں وہ درخشانی ہے جس کے سامنے دوسرے عناصر ماند پڑ جاتے ہیں۔

✡

سیرِ دکن کا ایک تاثر

جگن ناتھ آزادؔ

ہر اک طرب ہے درد فزا چار دن کے بعد
یہ راز دل پہ کھل ہی گیا چار دن کے بعد

جتنا سرور و کیف ملا تجھ سے چار دن
اتنا ہی دل اداس ہوا چار دن کے بعد

جو وقت کٹ گیا وہ ترے ساتھ کٹ گیا
پھر مجھ سے وقت کٹ نہ سکا چار دن کے بعد

اللہ کیا بہشت کا نقشہ نظر میں تھا
نقشہ مگر وہ پھر نہ رہا چار دن کے بعد

"خمیازۂ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج"
مفہوم اس کا مجھ پہ کھلا چار دن کے بعد

دیوانہ پن مجھے یہ کہاں لے کے آ گیا
اپنا نشاں بھی مل نہ سکا چار دن کے بعد

وہ کارواں کہ جس کو بڑا ناز ہوش تھا
راہِ جنوں میں لٹ ہی گیا چار دن کے بعد

حیرت ہے چار دن ہی وہی مستجاب وہ
پھر کام آ سکی نہ دعا چار دن کے بعد

جنت خود اس فضا پہ دل و جاں سے تھی نثار
آزاد جس فضا سے چلا۔ چار دن کے بعد

بس ایک چار دن کے گزرنے کی دیر تھی
ہر لمحہ اک پہاڑ بنا چار دن کے بعد

گردوں کی رفعتیں تھیں نگاہوں کے روبرو
پھر میں تھا اور تحتِ ثریٰ چار دن کے بعد

اے دل تو چار دن تو بڑے ہوش میں رہا
پھر کیوں یہ ہوش رہ نہ سکا چار دن کے بعد

مایوسیٔ خیال کا عالم نہ پوچھیے
اٹھ ہی سکے نہ دستِ دعا چار دن کے بعد

بادِ سموم ہے کہ یہ موجِ نسیم ہے
دونوں میں فرق کچھ نہ رہا چار دن کے بعد

آنسو اگر ٹھہر نہ سکے ان سے کیا گلہ
جب دل مرا ٹھہر نہ سکا چار دن کے بعد

جس کی تجلیوں سے منوّر تھے جان و دل
وہ ماہتاب چھپ ہی گیا چار دن کے بعد

جو تھا نگاہ میں وہ تصور میں رہ گیا
حسنِ کلام و حسنِ ادا چار دن کے بعد

آخر لباسِ موجۂ صرصر پہن کے آئی
میرے چمن میں بادِ صبا چار دن کے بعد

جیسے کوئی حجاب تجلی کو ڈھانپ لے
ایسا ہی اک طلسم ہوا چار دن کے بعد

یا اس طرح کہوں کہ نظر پر تھا اک طلسم
اور وہ طلسم ٹوٹ گیا چار دن کے بعد

قدیم ہندوستان اور ایران میں تہذیبی اور سیاسی روابط

فردوسی اور فرشتہ کی نظر میں

امیر حسن نورانی

ہندوستان اور ایران کے تہذیبی اور سیاسی تعلقات بہت قدیم ہیں اور اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ آریوں اور ایرانیوں میں نہ صرف نسلی تعلق تھا بلکہ مذہبی اور لسانی اعتبار سے بھی ان میں قریبی تعلق رہا ہے۔ دبستانِ مذاہب کے مصنف نے ایران اور ہندوستان کے مذہبی اور لسانی تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ کی مستند کتابوں میں بھی ان تعلقات کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ لیکن مستند تاریخی حقائق سے قطع نظر کر کے ہمارے پاس بعض ایسے ذرائع بھی ہیں جن سے ہندوستان اور ایران کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے اور ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جن کو تاریخی کتابیں تو محفوظ نہیں کر سکی ہیں لیکن قرائن سے ان کو کسی حد تک باور کرنا ہی پڑتا ہے۔

ہمارے پیش نظر ایران کے شہرۂ آفاق شاعر فردوسی طوسی کا شاہنامہ ہے۔ شاہنامہ کی تاریخی اور نیم تاریخی حیثیت پر محققین نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس کے ماخذوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ تاہم اتنا مسلّم ہے کہ شاہنامہ کوئی مستند تاریخ نہیں ہے اور فردوسی نے جو واقعات نظم کئے ہیں وہ ان لوگوں سے سن کر یا پوچھ کر جو پرانے حالات اور انساب زبانی یاد رکھتے اور سناتے تھے۔ ایسے مخصوص لوگوں کا ایک گروہ ایران میں وہاں کی روایات کے مطابق شاہنامہ کی تصنیف کے وقت موجود تھا۔

بہرحال، فردوسی نے شاہنامہ میں ہندوستان اور ایران کے حکمرانوں اور بہادروں کے حالات اور دونوں ملکوں کے تعلقات پر بہت سے اشعار میں روشنی ڈالی ہے اور بعض ایسی باتوں سے باخبر کیا ہے جن کے متعلق تاریخ خاموش ہے۔ اگر محققین و مورخین فردوسی کے بیانات کی روشنی میں تاریخ کی درمیانی گمشدہ کڑیوں کو ملانے کی کوشش کریں تو شاید دنیا کے سامنے بعض نئی تاریخی حقیقتیں جلوہ گر ہوں گی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ فردوسی کی لکھی ہوئی بہت سی چیزیں تاریخی کسوٹی پر پوری اتر چکی ہیں کیا تعجب کہ زال و رستم کے ان تعلقات اور واقعات کا استناد بھی حاصل ہو جائے جو قدیم ہندوستان کے ساتھ فردوسی نے ظاہر کئے ہیں۔

فردوسی نے شاہنامہ میں شنگل ہندی کا ذکر کیا ہے۔ شنگل، نیپال اور تبت کے راستے سے خاقان چین کے ہمراہ افراسیاب بادشاہ توران کی مدد کے لئے وہاں پہنچا۔ ان لوگوں کے ساتھ چین، تبت اور ترکستان کی فوجیں تھیں جنھوں نے کوہ ہندوکش کو عبور کر کے خراسان (موجودہ افغانستان جو ایران کا صوبہ تھا) پر حملہ کیا۔ خود افراسیاب اس حملے کے وقت ان فوجوں کے ساتھ نہ تھا۔ لیکن اس کا وزیر اعظم پیرانِ ویشہ موجود تھا۔ ایرانیوں کی طرف سے رستم نے ان کا مقابلہ کیا۔ دو مشہور سردار کاموس اور اشکبوس رستم کے ہاتھ سے مارے گئے تو پیرانِ ویشہ نے رستم سے صلح کر کے لڑائی ختم کر دینے کا قصد کیا۔ اس وقت شنگل نے پیرانِ ویشہ سے جو کچھ کہا اس کو فردوسی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

چنیں گفت شنگل کہ اے سرفراز   چہ باید کشیدن سخن با درازہ
بیاری افراسیاب آمدیم   ز دشت و ز دریائے آب آمدیم
بسے بارہ و ہدیہ ما یافتیم   ز ہر کشورے تیز بشتافتیم
چو شیر ندیم و چو رو بہ شویم   ز پیکار از دست کوتہ شویم
بیک مرد سکزی کہ آمد بجنگ   چرا شد چنیں بر شما کار تنگ

شنگل کی اس تقریر کے بعد صلح کی تجویز ملتوی ہوئی اور شنگل نے رستم سے لڑنے کا ارادہ کیا۔ میدان میں نکل کر اس نے رستم کو اس طرح للکارا:

برآمد اسپ تا جائے گاہ نبرد   در آمد بمیدان و آواز کرد
کہ آں جنگجو مرد سکزی کجاست   ہمانا گر آید بجنگم رواست
چو آواز شنگل بہ رستم رسید   ز لشکر نگہ کرد و او را بدید

رستم شنگل کی آواز سن کر مقابلہ کے لئے نکلتا ہے:

بہ شنگل آمد بآواز گفت   کہ اے بد نژاد و فرومایہ جفت
مرا نام رستم کند زال زر   تو سکزی چرا خوانی اے بد گہر
نگہ کن کہ سکزی کنوں سر گرفت   کفن بیگماں جوشن و ترگ لشت

فردوسی کے بیان کے مطابق شنگل بار بار رستم کو مرد سکزی (پہاڑیہ) کہتا تھا کیونکہ رستم سکستان یا سکزستان کا رہنے والا تھا لیکن خود کو سکزی کہلانا پسند نہ کرتا تھا بلکہ اس نام سے اپنی توہین محسوس کرتا تھا۔ رستم جمشید کی نسل سے تھا اور سیستان کے لوگ اس کی رعایا تھے اس لئے وہ اپنے کو رعایا کی اولاد کہلانا اپنی توہین سمجھتا تھا۔

رستم اور افراسیاب کی جنگ کے سلسلہ میں اشکبوس نامی سردار کا ذکر آیا ہے۔ یہ سردار راجہ کنشک کی فوج کا افسر تھا۔ سلطنت کشان ہندوستان کے بڑے حصے میں عرصہ تک قائم رہی، خصوصاً شمالی ہندوستان پر اس کا اقتدار مسلم تھا۔ اس کے علاوہ کشمیر سے بلخ تک یہ حکومت پھیلی ہوئی تھی۔ مشہور مورخ اور جغرافیہ نویس المسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھا ہے کہ ترکوں کی ایک قوم کا نام کشک تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہی کشان قوم مراد ہے جس کا ایک مشہور راجہ کنشک تھا اور جس کی حکومت حضرت مسیح سے ڈیڑھ سو سال قبل قائم تھی۔ راجہ کنشک کا دارالحکومت پشاور تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجہ کنشک نے بھی افراسیاب کی مدد کے لئے کوئی فوج بھیجی تھی جس کا سپہ سالار اشکبوس تھا۔ اور وہ رستم سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ لڑائی میں پہلے رستم نے ایک مشہور بہادر رہام کو اشکبوس سے لڑنے کے لئے بھیجا

برآمد ز ہر دو سپہ بوق و کوس   برآویخت رہام با اشکبوس
زمیں آہنیں شد سپہر آبنوس   بگرز گراں دست برد اشکبوس
کلہ خود او گشت زان زخم خورد   بزد گرز بر ترگ رہام گرد
بپیچید از و روئے و شد سوئے کوہ   چو رہام گشت از کشانی ستوہ

جب رستم نے دیکھا کہ رہام مغلوب ہو رہا ہے تو وہ خود اشکبوس کے مقابلہ کے لئے پیدل نکلا۔ اس حالت اور معرکہ کا حال فردوسی نے اس پرجوش انداز میں لکھا ہے

خدنگ برآورد پیکاں چو آب   نہادہ برو چار پر عقاب
بمالید چاچی کماں را بدست   بچرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست   خروش از خم چرخ چاچی بخاست
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ   فلک گفت احسن ملک گفت زہ
کشانی ہم اندر زماں جان داد   تو گفتی کہ او خود ز مادر نزاد

فردوسی کی اس داستان کے پردے پر یقیناً تاریخ کے حقائق کی کچھ چمک نظر آتی ہے۔ کیونکہ دیگر قرائن کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ کہ سمرقند کے قریب اب تک "کش" کے نام سے ایک بستی آباد ہے جس کو عام طور پر شہر سبز بھی کہتے ہیں اور امیر تیمور گورگان کی جائے پیدائش بھی ہے۔ کیا عجب اس آبادی کا تعلق بھی "کشان" قوم سے ہو۔

ہندوستان اور ایران کے ان قدیم تعلقات پر فرشتہ اور دوسرے مورخین نے اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں فرشتہ کا یہ بیان بھی قابل ذکر ہے۔

کیشوراج جو کشن کا پوتا تھا ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ دکن کے زمینداروں نے اس سے بغاوت کی اور مقابلہ کے لئے آمادہ ہوئے۔ کیشو نے اپنی قوت کم پا کر ایران کے بادشاہ منوچہر کو تحائف بھیجے اور مدد طلب کی۔ منوچہر نے سام بن نریمان کی قیادت میں فوج بھیجی کیشو نے اس فوج کا جالندھر (پنجاب) تک جا کر استقبال کیا اور

اسکو کیکردکن چلا دہاں کے لوگ ڈر کر منتشر ہوگئے (ترجمہ تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۷ ، ۲۶)

اس کے بعد فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب گیشو کے بعد اس کا بیٹا مینزرائے بادشاہ ہوا جو نہایت مدبر، عالم اور عقلمند تھا اس نے ایک بڑی غلطی کی۔ وہ یہ کہ جب سام بن نریمان مرگیا تو منوچہر کی سلطنت کمزور ہوگئی اور ایران کے قدیم دشمن افراسیاب نے جو موقع کا منتظر تھا ایران پر چڑھائی کردی اور فتح حاصل کرلی۔ اس وقت مینزرائے نے پنجاب پر چڑھائی کردی اور اس حصہ کو زال بن سام کے قبضہ سے نکال لیا۔ اور بہت سے تحائف اور ایلچی افراسیاب کے پاس بھیجے۔ اس وقت سے کیقباد کے زمانہ تک پنجاب راجگان ہند کے تصرف میں رہا۔ لیکن جب رستم پہلوان اپنے باپ دادا کے منصب پر مقرر ہوا تو اس نے پنجاب پر حملہ کیا۔ مینزرائے مقابلہ کی تاب نہ لاکر بھاگ گیا۔ رستم نے اس کی جگہ ایک ہندوستانی سردار سورج کو حکمراں بنادیا۔ یہ بڑا زبردست راجہ تھا۔ اس نے اپنا دارالحکومت قنوج کو بنایا۔ یہ راجہ ایران کے حکمراں کیقباد کا ہم عصر تھا۔ اسی لئے اس نے رستم کے ساتھ اپنی بھانجی کا عقد کر دیا تھا (تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۷، ۲۰)

سورج کے بعد اس کا بیٹا بہراج راجہ ہوا جس نے بہرایچ آباد کیا) اسکو کیدار نامی ایک برہمن نے شکست دی اور حکومت کرنے لگا۔ اسی زمانہ میں کوچ بہار سے شنکل نامی ایک شودر پشت نے کیدار برہمن کو شکست دی اور حکمراں بن بیٹھا (تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۱) یہ وہی شنکل ہے جس کا ذکر ہم رستم کی جنگ میں کرچکے ہیں۔

سکندر کے حملہ سے قبل ایران کے خاندان کیان کی سیادت ہندوستان پر مسلم ہے۔ لیکن تاریخوں سے اس کا پتہ کم چلتا ہے کہ سکندر کے حملہ کے وقت ایران اور مغربی ہندوستان کے تعلقات کس قسم کے تھے۔ آیا ہندوستان کا کوئی حصہ ایرانی حکومت کے اثر میں تھا یا نہیں۔ مگر فردوسی نے اس وقت کے حالات لکھے ہیں جب دارا شکست کھاکر آوارہ پھر رہا تھا اور اس نے ہندوستان کے ایک راجہ سے مدد مانگی تھی:

چو یادر بنودش ز نزدیک و دور یکے نامہ بنوشت نزدیک فور

پر از نالہ و زیہ دستی د درد یسے آفریں بر جہاں دار کرد

دگر گفت لے مہتر ہندواں خردمند و دانا و روشن رواں

چنانکہ نزد تو آمد خبر کہ ما را چہ آمد ز اختر بسر

سکندر بیاورد لشکر ز روم نہ بر ماند ما را نہ آباد بوم

نہ پیوند و فرزند و تخت و کلاہ نہ دیہیم شاہی نہ گنج و سپاہ

جب سکندر کو خبر ملی کہ دارا نے فور ہندی (یعنی راجہ پورس) سے مطلب کی ہے تو وہ دارا کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مگر اتفاق سے اسی زمانہ میں دارا کو اس کے دو ہمراہی وزیروں نے قتل کر دیا۔ بہرحال، سکندر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ٹکسلا کے راجہ نے اس سے صلح کر لی اور اپنی فرمانبرداری کا یقین دلا دیا۔ مگر راجہ پورس (فور ہندی) نے جو دوآبۂ جہلم و چناب کا ایک زبردست راجہ تھا مقابلہ کی تیاری کی اور راجہ ٹکسلا کے برخلاف، اطاعت گذاری سے انکار کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورس یا فور اس راجہ کا خاندانی لقب تھا اور اس خاندان کا ہر راجہ پورس کہلاتا تھا کیوں کہ فردوسی نے لکھا ہے ؏ ہر آمد بر فور فوراں نژاد۔ اسی طرح ایک جگہ راجہ کی زبان سے یہ مصرع ادا ہوا ہے ؏ منم فور داز فور دارم نژاد۔ بہرحال راجہ پورس نے راجہ ٹکسلا کی طرح نہ تو بزدلی دکھائی نہ سکندر کی فتوحات سے مرعوب ہوا جب سکندر نے اس کو لکھا کہ راجہ ٹکسلا کی طرح تم بھی اطاعت کر لو تو اس نے انکار کر دیا اور جواب دیا کہ راجہ ٹکسلا کی اطاعت نے تم کو مغرور کر دیا ہے، میری تعظیم تو شاہان کیانی بھی کرتے تھے۔ فردوسی کے الفاظ میں پورس کا جواب سنئے :-

منم فور داز فور دارم نژاد کہ از قیصراں کس نکردیم یاد

بدانگہ کہ دارا مرا یار خواست دل و بخت بادے ندیدیم راست

ہمی زشہ پیلاں فرستادمش ہمیدوں بیاری زباں دادمش

چو بر دست آں بندہ بر کشتہ شد ترا زہرۂ بردہ تر پاک شد

گر اورا ز دستور بد بد رسید چنا شد خرد در سرت تا پدید

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ پورس نے دارا کی امداد کے لئے فوج اور ہاتھی روانہ کئے تھے مگر ان کے پہنچنے سے قبل ہی دارا اپنے دو وزیروں کے ہاتھوں قتل ہوچکا تھا اور وہ امدادی فوج راستے سے واپس آگئی۔ فردوسی نے اس کے بعد پورس اور سکندر کی جنگ کے حالات بیان کئے ہیں جن کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔

فردوسی نے شاھنامہ میں رستم اور زال کے ہندوستان آنے کا ایک ایسا واقعہ بھی لکھا ہے جو بے حد دلچسپ ہے لیکن تاریخی کتابیں اسکی تصدیق نہیں کرتی ہیں۔ یوں تو رستم کا پنجاب پر اقتدار اور جالندھر مرکز قرار دینے کا ذکر تفصیل کے ساتھ فرشتہ نے بھی کیا ہے لیکن جس واقعہ کو ہم شاھنامہ سے نقل کر رہے ہیں اس کی نوعیت ایسی ہے جس سے بعض ان واقعات کی تنقیص ہوتی ہے جو فرشتہ نے لکھے ہیں۔ فردوسی کی داستان اس طرح ہے۔

جس زمانہ میں رستم کا باپ زال سیستان کا حکمران تھا اور رستم کا عالم شباب تھا قنوج کے راجہ نے زال کے پاس قاصد کے ذریعہ سے ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں ایک عجیب خوفناک بلا ظاہر ہوئی ہے جو آدمیوں اور جانوروں کو سانس کے زور سے کھینچ کر نگل جاتی ہے۔ (غالباً بڑا اژدہا مراد ہے) آپ جلد یہاں تشریف لاکر اس کو ہلاک کر دیجئے ورنہ میرا ملک اس طرح ویران ہو جائے گا۔

ہندوستان کا ایلچی دربار ایران میں پہنچا:

درآمد غلامے بدرگاہ شاہ　　پرستندہ خسروی پیش گاہ
زمین را ببوسید در پیش زال　　چنیں گفت کے خسروا بے ہمال
کہ آید جہاندیدہ مردے زہند　　بدست اندروں نامۂ بر پرند
بدو گفت دستاں کہ بکشائے راہ　　بیارش بدیں نامور بارگاہ
برشاہ زابل رہے برکشاد　　بیامد مرا او رازمیں بوسہ داد

خط کے مضمون سے متعلق چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اگر زانکہ نائی بریں رزمگاہ　　زہندوستاں باج دیگر مخواہ
کہ بر جائے ویراں روا نیست باج　　بہ ہندوستاں بر سرایں ہست تاج

زال نے رستم کو بلاکر راجہ قنوج کا یہ خط سنایا اور خود ہندوستان جانے کی خواہش ظاہر کی۔ رستم نے کہا کہ آپ خطرہ کی جگہ جائیں اور میں یہاں آرام کروں، یہ کیسے ہو سکتا ہے:

تو گرچہ دلیرے و نام آورے　　جہاں پہلوانے و کند آورے
نہ زیبد ترا رزم با پشت کوز　　تو پیری و گر من جوانم ہنوز

اس طرح دونوں میں بحث ہوتی رہی ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ میں ہندوستان جاؤں لیکن آخر میں یہ طے پایا کہ دونوں جائیں۔ اس طرح زال اور رستم ہندوستان روانہ ہوئے۔ یہاں کے راجاؤں نے انکا شاندار استقبال کیا اور قیمتی تحائف پیش کئے۔ دونوں قنوج پہنچے۔ اژدہے کا پتہ معلوم کیا اور رستم تنہا اس کے مقابلہ کے لئے جنگل گیا اور اژدہے کو قتل کر دیا۔ قنوج میں اس کی بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ان تقریبات میں رستم کی نگاہ اچانک راجہ قنوج کی لڑکی پر پڑگئی اور دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے:

پس پردۂ شاہ ہندوستاں　　یکے دخترے بود بس دلستاں
بروں آمد از پردہ آں پرخرد　　کہ تا زال را باپسر منگرد
چو بر لشکر زال بکشاد چشم　　بر رستمش ناگہہ افتاد چشم

رستم نے زال سے خواہش ظاہر کی کہ راجہ کی بیٹی سے اس کی شادی کرادی جائے۔ زال نے راجہ کو پیغام دیا اور اس نے خوشی سے منظور کر لیا۔

زگفتار او شاد ماں گشت رائے　　بدو گفت برمن کرم از خدائے
کہ پشت کیاں رستم نامدار　　زمن دخترم را بود خواستگار
اگر شوئے رستم شود دخترم　　فروزاں شود بر سپہر اخترم

اس کے بعد دونوں کی شادی ہو گئی اور رستم اور زال سیستان واپس ہوئے۔ قنوج کے اس راجہ کی بیٹی کے بطن سے رستم کا بیٹا فرامرز پیدا ہوا۔ فردوسی کی زبانی سنئے:

چنیں گفت گویندۂ ایں سخن　　چو نہ ماہ بگذشت بر سیم تن
یکے پور زائید آں نو بہار　　ببالا و چہرہ چو سام سوار
بسے شاد شد رستم پہلواں　　بیامد دواں پیش آں دلستاں
چو فرزند را دید دلشاد گشت　　ز درد و غم دہر آزاد گشت
مر او را ببردند نزدیک زال　　کہ تا بنگرد بچہ بے ہمال
چو روے و را دید دستان سام　　مر او را فرامرز یل کرد نام

فردوسی کے انتقال کو ایک ہزار سال سے زیادہ زمانہ ہو چکا ہے اس وقت اس کے سامنے کچھ قدیم نوشتے ہوں گے اور کچھ داستان سراؤں کے بیان کئے ہوئے حالات، جن کی بنیاد پر اس نے یہ داستان لکھی ہے۔ اس لئے اس کو یکسر غلط تو نہیں کہا جا سکتا

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر)

غزل

زیب غوری

لالۂ و گل کے جلووں ہی کا رنگ نہیں ہو بہاروں میں
ننھے منے جگنو ایسے پھول بھی ہیں گلزاروں میں

کیا کیا ولی پوشیدہ ملے گا مستوں میں میخواروں میں
آپ کہاں اے حضرتِ ناصح آن پھنسے ہشیاروں میں

جوشش طلب، روزِ محرومی، سوزِ تمنّا، سازِ جنوں
کتنے دریاؤں کا سنگم ہے مستی کے دھاروں میں

تہہ در تہہ کتنے ہی جہاں، کتنے ہی عالم نکلے ہیں
میں دنیا کو بھول گیا اک ذرّے کے نظّاروں میں

کیسے کیسے پھول کھلے ہوں گے، کیا کیا خوشبو ہوگی
کتنا حسن پریشاں ہوگا ان سنسان ستاروں میں

جب اس مست نے پیمانہ ٹکرایا مرے پیمانہ سے
دل کی صدا بھی ڈوب گئی ہو شیشوں کی جھنکاروں میں

یوں وہ بہارِ کیف و مستی نظروں کی آغوش میں ہے
جیسے گلِ تازہ لہرائے ساون کی بوچھاروں میں

اے آوارہ پھول کی بیلو، کوئی فرق تو رکھنا تھا
گلشن کی دیواروں میں اور زنداں کی دیواروں میں

حیف اس جنسِ گراں مایہ کا کوئی بھی گاہک نہ ملا
اپنا تبسم بیچ رہی تھیں کلیاں غم کے ماروں میں

مجھ کو روتا چھوڑ چلا آخر یہ صبح کا تارا بھی
ایک یہی غم خوار بچا تھا لاکھوں ہی غم خواروں میں

زیب آخر دیوانے یونہی خاک اڑاتے لوٹ آئے
اپنے جنوں کا سودا کرنے نکلے تھے بازاروں میں

✡

خاندان والاجاہی کے اردو شاعر

محبوب پاشا

مضافات لکھنؤ میں گوپامئو ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے، جسے خاندان فاروقیہ کی ایک شاخ نے بسایا تھا۔ اس خاندان کو ابتدا ہی سے مذہبی، علمی

مدراس میں دارالامارۂ والاجاہی کا صدر دروازہ　عکس: ناصر

اور ادبی عظمتیں حاصل تھیں۔ بقول مولانا شبلی نعمانی "گوپامئو ہمیشہ سے مردم خیز خطہ رہا ہے۔" شہنشاہ شاہجہاں کے عہد میں اس قصبہ کے ایک نوجوان محمد انور نے تحصیل علم کے شوق میں گوپامئو سے دلی کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر اس درجہ علمی کمال حاصل کیا کہ شاہ جہاں کے دربار تک رسائی حاصل کرلی اور مہتمم تسبیح خانہ کے ممتاز عہدہ پر فائز ہوگئے۔ شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب نے انھیں "حاجی مقدس انورالدین خاں" کے خطاب اور جاگیر سے نوازا۔ حاجی مقدس کے انتقال کے بعد اورنگ زیب ہی نے ان کے فرزند جان جہاں کو باپ کے عہدے اور ان کے تمام اعزازات کے ساتھ "نواب سراج الدولہ محمد جان جہاں انورالدین خاں شہامت جنگ"[1] کے مزید خطابات عطا کئے۔ انورالدین خاں شہامت جنگ محمد شاہ کے عہد تک دربار شاہی سے وابستہ رہے۔

نادر شاہی ہنگاموں کے فرو ہونے کے بعد انورالدین خاں نے اپنے بڑے فرزند بدرالاسلام خاں کو دربار شاہی میں اپنا قائم مقام کرکے نظام دکن، نظام الملک آصف جاہ اول نظام حیدرآباد کے دربار کا رُخ کیا۔ وہاں جلد ہی اُن کی کافی قدر و منزلت ہونے لگی۔

جب ۱۷۴۴ء میں کرناٹک کے صوبہ دار حسین دوست خاں عرف چندا صاحب (نائطی) نے فرانسیسیوں سے ساز باز کرکے سارے صوبہ میں بغاوت کی آگ پھیلا دی اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کی

---

[1] تزک والاجاہی مولفہ برہان خاں ہاندی

محل کا نقار خانہ ۔ تصویر اصغر

سیاسی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے سارے صوبہ میں بدامنی پھیل گئی، تو نواب آصف جاہ نظام الملک نے کرناٹک کے اس سیاسی بحران کو مٹانے کے لئے انورالدین خاں گوپاموی کو کرناٹک کا صوبہ دار مقرر کیا اور ایک کثیر فوج بھی اُن کے ساتھ کر دی۔

کرناٹک کا مستقر اُن دنوں آرکاٹ تھا۔ یہاں انورالدین خاں کو پہنچے ہوئے کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ آصف جاہ نظام الملک نے سلطنت دہلی سے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ لیکن کرناٹک میں نورالدین خاں کو چین سے پُرامن زندگی بسر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ انھیں وہاں پہنچتے ہی فرانسیسیوں، حیدر علی، اور حسین دوست خاں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ بالآخر آمبور (ضلع شمالی آرکاٹ) میں حسین دوست خاں سے جنگ کرتے ہوئے ۱۷۴۹ء میں قتل ہو گئے۔ محمد علی خاں، انورالدین کے تیسرے فرزند تھے اور علم و دانش اور فضل و کمال میں اپنے دیگر بھائیوں سے افضل تھے اس لئے انورالدین خاں نے اپنی زندگی ہی میں انھیں اپنا ولی عہد بنا کر صوبۂ کرناٹک کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اپنے فرزندوں میں سے ہر ایک کو، ایک ایک علاقہ کا گورنر بنا کر روانہ کر دیا تھا۔

(۱) محفوظ خاں ۔ ترچناپلی (۲) محمد علی خاں ۔ شمالی آرکاٹ (۳) عبدالوہاب خاں ۔ نیلور (۴) نجیب اللہ خاں ۔ جنوبی آرکاٹ۔

انورالدین خاں آخر دم تک نظام الملک آصف جاہ کے وفادار رہے لیکن آصف جاہ کے انتقال کے بعد جب ان کے فرزند ناصر جنگ اور اُن کے نواسے ہدایت محی الدین میں جھگڑا شروع ہوا تو اس وقت کرناٹک میں بھی کچھ ایسی سیاسی صورت پیدا ہو گئی کہ محمد علی خاں نے اپنی جانشینی کے فوراً بعد اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ دلّی احمد شاہ بادشاہ نے محمد علی خاں کی حکومت کو منظور کرتے ہوئے انھیں "والاجاہ" کے خطاب سے نوازا۔ والاجاہ ابتدا ہی سے انگریزوں کا ساتھ دیتے رہے اور انھیں کے اشارے سے انھوں نے اپنا دارالحکومت آرکاٹ سے ترچناپلی اور پھر ترچناپلی سے مدراس کو اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد منتقل کر دیا۔ نواب والاجاہ کا ۱۷۹۴ء میں مدراس میں انتقال ہوا۔ ان کی جگہ ان کے خلف اکبر عمدۃ الامراء ممتاز جانشین ہوئے۔ انھوں نے صرف ۷ برس حکومت کر کے ۱۸۰۱ء میں وفات پائی۔ ان کے فرزند تاج الامراء علی حسین خاں ماجد کو انگریزوں نے ماہوار پنشن دے کر تخت و تاج سے الگ کر دینا چاہا۔ تاج الامراء نے انگریزوں کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ آخر انگریزوں نے انھیں بالجبر معزول کر کے نظربند کر دیا اور والاجاہ کے دوسرے پوتے عظیم الدولہ ابن امیرالامراء کو "رئیس کرناٹک" کا خطاب دے کر ایک لاکھ روپیہ ماہوار بطور "نائیٹل گرانٹ" مقرر کر دیا، تمام ملکی انتظام اپنے قبضہ میں کر لئے اور انھیں برائے نام تخت پر بٹھا دیا۔ ان کے بعد نواب اعظم جاہ اور پھر ان کے بعد ان کے فرزند نواب غلام غوث خاں المتخلص بہ اعظم تک انگریزوں نے اپنا وعدہ نبایا۔ اعظم کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لئے ان کے بعد انگریزوں نے کرناٹک کی مسند نشینی اور وظیفہ کو ختم کرنے کی ٹھان لی۔ اس سلسلے میں غلام غوث خاں اعظم کے چچا نواب عظیم جاہ نے ملکہ وکٹوریہ سے اپیل کی۔ مقدمہ کی پیروی کے لئے مسٹر ڈاسن کو (جو ان دنوں مدراس کا مشہور و معروف یورپین وکیل تھا)

انگلستان روانہ کی گئی۔ ایک مدت کی تگ و دو کے بعد پارلیمنٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ "کرناٹک کی مسند نشینی ختم کردی جائے، اور نواب عظیم جاہ کو "پرنس آف آرکاٹ" کا خطاب دے کر بطور تائیش گرانٹ پچیس ہزار روپیہ ماہوار مقرر کردئیے جائیں۔" آخر نواب عظیم جاہ اور انگریزوں سے یہ معاہدہ ہوا کہ "خود ان کی زندگی تک پچیس ہزار روپیہ انھیں ماہوار ملتے رہیں اور ان کے بعد تا بقائے سلطنت انگلیسیہ ماہوار ساڑھے بارہ ہزار ان کی اولاد میں تقسیم ہوتے رہیں۔" یہ معاہدہ ۱۷ اپریل سنہ ۱۸۵۵ء کو ہوا تھا۔ عظیم جاہ کے بعد ظہیر الدولہ، انتظام الملک، منور خاں، اور محمد علی خاں یکے بعد دیگرے پرنس آف آرکاٹ ہوتے رہے۔ آزاد ہند کی حکومت بھی اس معاہدے پر قائم ہے اور ماہوار ساڑھے بارہ ہزار روپیہ موجودہ پرنس آف آرکاٹ نواب غلام محی الدین خان بہادر رئیس امیر محل (مدراس) اور اُن کے خاندان میں تقسیم کر رہی ہے۔

مدراس کو تاریخی، تمدنی اور ثقافتی اہمیت چونکہ نواب محمد علی خاں والاجاہ کے عہد سے حاصل ہوتی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہر مدراس کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ جنوبی ہندوستان کا یہ مشہور و معروف شہر جو خلیج بنگالہ کے کنارے کنارے میلوں پھیلا ہوا ہے، جسے اپنے ساحل کے حسین نظاروں پر بجا ناز ہے، کوئی قدیم شہر نہیں ہے۔ دراصل آج کا مدراس دو شہروں چنا پٹن اور مندراس کا مجموعہ ہے۔ موجودہ شہر کا شمالی حصہ وجیا نگر آندھرا کے مہاراجہ چنا مہاراج کی ریاست میں شامل تھا۔ انگریزوں نے سنہ ۱۶۳۹ء میں اِس شہر پر قبضہ جمایا۔ اِسی عہد میں چنا پٹن سے اس شہر کا نام چینا پٹن اور چینا پٹنم ہوگیا۔ چنانچہ آج بھی شہر مدراس کے شمالی اور مرکزی حصّہ (براڈوے) کو اُردو داں طبقہ "پٹن" کہتا ہے اور ٹامل میں شہر مدراس کو "چنپٹنم" بھی کہا جاتا ہے۔ موجودہ شہر کا جنوبی حصہ زمانۂ قدیم میں ماہی گیروں کے ایک چھوٹے سے قصبہ کی شکل میں تھا اور دراوڑی عہد کے مشہور راجہ "مندراج" کے نام سے منسوب تھا۔ چنانچہ اظفری دہلوی نے اپنی تصنیف **واقعات اظفری** میں شہر مدراس کو "چینا پٹن مندراس" لکھا ہے۔ اس شہر کا موجودہ نام "مدراس" انگریزوں کا دیا ہوا ہے۔

نواب والاجاہ نے سنہ ۱۷۴۹ء میں مدراس کو اپنا مستقر بنایا۔ یہاں انھوں نے اپنا دارالامارہ (کلس محل) اسی سن میں تعمیر کیا۔ یہ شاندار محل مدراس میں مسلمانوں کے فنِ تعمیر کی واحد مثال ہے۔ مدراس میں والاجاہ کے قیام کے بعد ان کے خاندان کا ہر فرد جو گوپامئو سے باہر نکلتا تھا، مدراس کا رُخ کرتا تھا۔ یہ سلسلہ کم و بیش ایک صدی تک جاری رہا۔ (اس کی آخری کڑی میرے والد مرحوم خان بہادر نواب تجمل حسین خاں ایمان شاگرد جلال لکھنوی کی ذات گرامی تھی)۔ تاریخی حیثیت سے اہل گوپامئو کی مدراس کو ہجرت ایسی ہی تھی جیسی اہل دہلی کی لکھنؤ کو ہجرت۔ دلّی کی بربادی جس طرح لکھنؤ کی آبادی کا سبب بن گئی اسی طرح نواب والاجاہ اور ان کے جانشینوں کی قدر دانی اور اقربا پروری کی وجہ سے شہر مدراس اہل گوپامئو سے بس گیا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مدراس میں آج بھی جس قدر اردو کلچر اور مغلیہ تہذیب کے دُھندلے نقوش ملتے ہیں اس کا زیادہ تر سبب اہل گوپامئو اور خاندان والاجاہی کا فیض ہے۔ بہرحال، نواب والاجاہ کے دورِ حکومت میں شہر مدراس متعدد مشاہیر صوفیا اور علما کا مرکز بن گیا تھا۔ ان میں حضرت دستگیر صاحب سادی، حضرت داداشاہ، حضرت فتح شاہ، مولانا بحرالعلوم عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی، ان کے فرزند مولانا عبدالرب اور ان کے داماد مولانا علاءالدین قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جنوبی ہند کے مختلف شہروں مثلاً آرکاٹ، ویلور اور ترچناپلی وغیرہ کے مشاہیر نے بھی مدراس میں سکونت اختیار کرلی۔

نواب والاجاہ علم و فضل کے بڑے قدر دان تھے۔ مولانا بحرالعلوم عبدالعلی جب ان کی دعوت پر لکھنؤ سے مدراس پہنچے تو والاجاہ خود ان کے استقبال کے لئے محل سے باہر نکلے۔ مولانا جس پالکی میں سوار تھے آگے بڑھ کر یہ بھی کہاروں کے ساتھ اسے سہارا دیتے ہوئے محل تک لے آئے۔ اسی طرح اپنے دربار کے ایک شاعر اسمٰعیل خاں ابجدی کو انوار نامہ (فارسی) کی تالیف کے صلہ میں سر و ریار چاندی میں تلوا دیا اور اس کی رقم شاعر کو عطا کردی۔ والاجاہ کے عہد میں جن مشاہیر نے مدراس کا رُخ کیا تھا، ان میں مولانا باقر آگاہ ویلوری ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ آگاہ ویلور میں سنہ ۱۷۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۶۲ سال کی عمر میں سنہ ۱۸۰۷ء میں وفات پائی۔ آگاہ اپنے وقت کے جیّد عالم، باکمال شاعر اور نامور

ادیب تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو کی بے شمار مذہبی علمی اور ادبی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے "مدراس میں اردو" میں آگاہ کی کل (۲۰۳) تصانیف بتائی ہیں جن میں (۱۶) اُردو میں۔ آگاہ کی اکثر تصانیف طبع ہو چکی ہیں۔ بقیہ یا تو ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں یا مدراس اور حیدرآباد دکن میں اُنکے خاندان کے گھروں میں دفن ہیں۔ آگاہ کی علمی و ادبی کاوشیں مدراس میں قصر اردو کی بنیادیں تھیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اُردو میں اصلاحی لٹریچر کا اضافہ کیا اور خصوصًا عورتوں کے عقائد فقہ اور سیر کی بے شمار نثری بیں اردو نظم میں تصنیف کیں۔ آگاہ کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر نواب والاجاہ نے انھیں اپنے دونوں فرزندوں عمدۃ الامرا اور امیر الامرا کا اتالیق مقرر کیا۔ ان دونوں شاگردوں نے اپنے باکمال استاد کی رہبری میں علم و ادب میں اچھی کمال حاصل کیا۔ بالخصوص عمدۃ الامرا بہادر ممتاز کا شاعری میں ایک امتیازی مقام تھا۔

ممتاز والاجاہ کے خلف اکبر تھے۔ سنہ ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ سات برس حکومت کی اور باون سال کی عمر میں سنہ ۱۸۰۱ء میں وفات پائی۔ ممتاز اردو کے صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ ان کے دیوان کا ایک نہایت قیمتی اور مطلا قلمی نسخہ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ ممتاز کے کلام کی صفائی، محاورہ بندی اور خصوصًا زبان کی روانی سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ ان کے عہد میں مدراس میں اردو اپنی ارتقا کے مدارج طے کر چکی تھی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

یہ دل، تو جان تجھے آشنا سمجھتا ہے
خدا ہی جانے تو بیگانہ کیا سمجھتا ہے
میں اس کے آگے تو کچھ بات کر نہیں سکتا
یہی ہے ڈر کہ میں کیا بولوں کیا سمجھتا ہے
بھلے بُرے سے میں واقف نہیں مرے حق میں
وہی بھلا ہے جو کچھ تو بھلا سمجھتا ہے
اُٹھاؤں کس لئے ممتاز دست بہر دعا
ہمارے دل کا وہ سب مدعا سمجھتا ہے

میں بچائے ہوئے اس دل کو لئے پھرتا ہوں
آہ کیا عقدۂ مشکل کو لئے پھرتا ہوں
دل جو کہتا ہے سو کرتا ہوں، ملامت نہ کرو
ساتھ میں مرشد کامل کو لئے پھرتا ہوں

تیرے ہی واسطے اے رونقِ آبادیٔ دل
آکے ویرانۂ دنیا کو بسایا ہم نے

ہے اپنے دل میں عشق رُخِ گلعذار کا
باندھا ہے ہم نے گانٹھ میں موسم بہار کا

مجھ سے نہ رکھیو کوہ کنی کی کبھی اُمید
میں حالِ بے وفائی شیریں شنیدہ ہوں

بلبل جو کرے ہماری تقلید
بینائی دل کہاں سے لادے

شراب ہو چکی مینا ئے دل سے بُو نہ گئی
ہمارے دل سے جوانی کی آرزو نہ گئی

والاجاہ کے پوتے نواب تاج الامرا علی حسین خاں ماجد، جنھیں انگریزوں نے معزول کر دیا تھا، فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ وہ سنہ ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ اور عین عالم شباب یعنی ۲۱ سال کی عمر میں سنہ ۱۸۰۱ء میں فوت ہو گئے۔ ماجد کا اردو کلام ابھی تک دستیاب نہیں ہوا لیکن گمان غالب یہی ہے کہ اس عہد میں جب کہ ہر طرف اردو شاعری کا چرچا تھا اور خود اُن کے والد نواب عمدۃ الامرا ممتاز کو اردو شاعری میں کافی دلچسپی تھی۔ ماجد نے بھی اُردو شاعری کی طرف توجہ کی ہو۔

نواب غلام غوث خان اعظم کے عہد میں شعر و شاعری کو اور بھی ترقی ہوئی۔ ان کے زمانے میں مدراس میں بے شمار مطبع قائم ہو چکے تھے۔ ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہوار جرائد شائع ہوا کرتے تھے۔ خود نواب

اعظم کا ایک سرکاری مطبع تھا جہاں سے عربی فارسی اور اُردو کی کتابیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ نواب غلام غوث خان اعظمؔ، نواب اعظم جاہ کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی یہ کم سن ہی تھے کہ ان کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا اس لئے ان کے بالغ ہونے تک عظیم جاہ (چچا) کی سرپرستی میں رہے۔ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد حکومت نے انھیں گدی پر بٹھایا۔ اعظم نے بہ عمر ۳۲ برس سنہ ۱۸۵۵ء میں انتقال کیا۔

نواب اعظم کو سوائے علمی و ادبی مشاغل سے دل چسپی لینے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ چونکہ بڑے فیاض اور ادب نواز واقع ہوئے تھے اس لئے متعدد ادیب اور فضلا ان سے منسلک رہے۔ ان کے عہد میں گویا مدّت سے جن مشاہیر نے مدراس کا رُخ کیا ان میں محمد قدرت اللہ خاں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ تذکرۂ نتائج الافکار ان کی شاہکار تصنیف ہے۔ شعرائے فارسی کا یہ مستند تذکرہ انھوں نے مدراس میں اپنے دوران قیام میں مرتب کیا اور اُس کو نواب اعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ آج سے ایک صدی پہلے یہ کتاب نواب اعظم کے سرکاری مطبع میں طبع ہوئی۔ اس کا دوسرا اڈیشن حال ہی میں بمبئی سے شائع ہوا ہے۔

نواب اعظم کے درباری مشاعرے مدراس کی ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مشاعروں کی روداد بزرگوں سے سُن کر اور تذکروں میں دیکھ کر ہمیں اس دور کے سلجھے ہوئے ادبی مذاق اور اس عہد کے شعرا کی علمی قابلیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مشاعرے فارسی زبان کے ہوتے تھے اور اس لحاظ سے ایک مخصوص نوعیت رکھتے تھے۔ ان مشاعروں میں بھری محفل میں شاعر کے کلام پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی تھی۔ شاعر نہایت سنجیدگی کے ساتھ معترضین کے بیانات سنتے تھے اور ان کی تردید میں قدیم اساتذۂ سخن کے کلام سے مثالیں دے کر معترضین کو مطمئن کرتے تھے۔ یا اگر اپنی غلطی واضح ہوجاتی تھی تو نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ اس کا اعتراف کرلیتے تھے۔ محفل مشاعرہ میں دو حَکَم فیصلہ کرنے کے لئے اور روئداد مشاعرہ لکھنے کے لئے منشی مقرر ہوتے تھے۔ نواب اعظم کی تصنیف "تذکرۂ گلزارِ اعظم" ان ادبی معرکہ آرائیوں کی مکمل دستاویز ہے۔

نواب اعظم کے انتقال کے بعد انگریزوں نے اُن کے محل اور ان کی کُل جائداد پر قبضہ کرلیا۔ سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اعظم کو گورنمنٹ ایک لاکھ روپیہ ماہوار پنشن دیتی تھی لیکن ان کی دریادلی اور فیاضی کے آگے ایک لاکھ زیادہ نہیں تھا اس لئے وہ اپنی جائداد رہن رکھ کر اپنے دربار کے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ساہوکاروں اور مارواڑیوں کے مقروض مرے۔ یہی سبب تھا کہ ان کے ورثا اور اعزا نے ان کا جنازہ اٹھانے سے بھی غالباً اس خوف سے انکار کردیا کہ کہیں مرحوم کے قرضہ کی ادائیگی ان کے ذمہ کردی جائے۔ بہرحال اُن کا جنازہ انگریزوں نے بڑے تپاک کے ساتھ خوشی خوشی اُٹھایا مگر اس کے فوراً بعد ان کے محل اور اسباب و جائداد پر قبضہ کرلیا۔ قرضہ چکانے کے لئے محل کے سازوسامان کے ساتھ انگریزوں نے نواب اعظم کے تاریخی کتب خانے کا بھی نیلام کیا۔ کتابوں کی مکمل فہرست چھاپی گئی اور شہر کے اہل علم حضرات میں تقسیم کی گئی۔ اس مطبوعہ فہرست کے مطابق کتب خانہ میں تقریباً ہر فن کے متعلق مختلف مصنفین کی ہر فن کی دس دس بارہ بارہ جلدیں موجود تھیں۔ علم عروض و قافیہ کے بارے میں سولہ کتابیں تھیں۔ کتب خانہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اُس میں مطبوعات کم مگر قلمی نسخے سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ مطبوعہ فہرست کے سرورق پر ذیل کی عبرت ناک عبارت خون رُلاتی ہے:

"اشتہار دیا جاتا ہے"

"نواب مرحوم کرناٹک کے کتب خانے کے چند جلدیں قرآن مجید کی اور کتب فارسی و ہندی و انگریزی وغیرہ موافق فہرست ذیل حسب الحکم ریسور آف کرناٹک پراپرٹی آشٹین رچرڈسن ان کو کی شاپ میں جو کہ مونٹ روڈ پر واقع ہے۔ روز اتوار یکشنبہ غرّہ مارچ سنہ ۱۸۵۹ء کو بوقت مقررہ نیلام ہوں گے۔"

فہرست میں عربی، فارسی، ترکی، دکھنی اور انگریزی کے علاوہ ٹامل کتابوں کے نام بھی درج ہیں۔ فہرست کتب مطبع رحمانی، صبح صادق، مدراس میں طبع ہوئی ہے۔

نواب اعظم فارسی کے علاوہ اُردو کے بھی زبردست شاعر تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

کہیں جو رزم میں اسکے زباں نکل آئی ۔ زبانِ مرگ سے بھی الاماں نکل آئی

پیوے اگر وہ ہاتھ میں ساغر شراب کا
ہو جائے پانی شرم سے دل آفتاب کا

عشق میں یار کے دل اپنا لگا کر دیکھا
خوب اُس شمع کو میں نے بھی جلا کر دیکھا

فائدہ کچھ بھی ہوا تجھ کو بھلا اے اعظم
دل جو تو اُس بتِ ناداں سے لگا کر دیکھا

تاک لے یک بار گر اُس چشم سے گوں کو تو پھر
کیا عجب ہے پانی پانی ہو جو دل انگور کا

اب تک جن شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سب مسند نشین امرا تھے۔ اب والاجاہی خاندان کے کچھ اور شاعروں کا مختصر حال پیش کیا جاتا ہے۔

نواب والاجاہ کے بھائی نواب عبدالوہاب خاں نصیر الدولہ کے فرزند نواب دلیر جنگ بھی اچھے شاعر تھے۔ دلیرؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے کلام کی صفائی اور روانی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عصرِ حاضر کے کسی شاعر کا کلام ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

دیکھنا ان کو ہے ممنوع، صنم خانوں کا
کچھ خفا ہو گیا اللہ مسلمانوں کا

دیکھئے عاشق و معشوق کی کیفیت کو
شمع کیا جلتی ہے دل جلتا ہے پروانوں کا

ایک گردش سے کیا مست تری آنکھوں نے
کام مے خانوں میں ہے ایسے ہی پیمانوں کا

نواب عظیم جاہ کے داماد نواب رفعت الملک رفعتؔ بھی ایک ممتاز شاعر تھے۔ ان کے دیوان خانے کے مشاعرے مدراس میں شعر و شاعری کا ذوق پھیلانے میں نہایت کارآمد اور مفید ثابت ہوئے۔ ان کا نعتیہ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ ذیل میں ان کی ایک غیر مطبوعہ نعت ان کی ایک بیاضِ خاص سے پیش کی جاتی ہے۔ ؎

مرضِ دل کا تو ہی شافی ہے
رحم کی اک نگاہ کافی ہے

نہیں جس کو ترے حبیب کا حُب
واں اُسے حشر میں تنافی ہے

ہے کدورت سے پاک دل میرا
عشقِ احمد میں سینہ صافی ہے

قیدِ غم سے جو ہو پناہ گزیں
پھر رہائی میں میرے کیا نفی ہے

ہے جو رفعتؔ شفیع تیرا نبیؐ
جرم کی سب وہاں معافی ہے

نواب رؤف احمد خاں پرتوؔ نواب رفعت الملک رفعتؔ کے پوتے تھے۔ حکومت کی طرف سے انھیں معقول خاندانی پنشن ملتی تھی، جس کے باعث بڑی بےفکری اور آرام سے زندگی بسر کرتے رہے۔ انھیں سوائے شعر و شاعری اور موسیقی کے کوئی کام نہ تھا۔ بڑے زندہ دل اور باغ و بہار آدمی تھے۔ پہلے پہل شریفؔ مدراسی سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد میں داغؔ دہلوی کے شاگرد ہو گئے۔ دیوان فارسی کے علاوہ سات اردو تصانیف ان کی یادگار ہیں، جن میں نغمۂ پرتو، اور مثنوی حرزِ جاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نغمۂ پرتو میں چھند، ہولی، ٹھمریاں وغیرہ ہیں جو زبان کی صفائی اور روانی کے لحاظ سے بےمثال ہیں۔ مثنوی حرزِ جاں ایک طویل عاشقانہ مثنوی ہے۔ شاعر نے اس میں اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ ذیل کا اقتباس مثنوی حرزِ جاں سے پیش کیا جاتا ہے جو "صنعتِ عاطلہ" کا بہترین نمونہ ہے ؎

اگر صدمہ ہو دل کو ہوگا ملال
مرادِ دل دکھاؤ، دکھاؤ کمال

ڈرا کر کرو دم ہمارا ہوا
کرو ہم کو دھمکا کر اور گل ادا

روا ہو ہر اک کام مالا کلام
کہو والسلام اور کہو والسلام۔

اگر ہوگا آرام سُکھ ہوگا رام
اگر ہوگا سُکھ رام، دکھ ہوگا دام

غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

پہلو سے میرے تنگ جو ہو کر یہ دل گیا
نامِ آبروئے عشق کا مٹی میں مل گیا

وہ گُل جو کھِل کھِلا کے ہنسا باغ میں صبا
دِل کی طرح چمن میں ہر اک غنچہ کھِل گیا
مجھ بے گنہ کے قتل سے حاصل ہوا نہ کچھ
مقتل سے قاتل آج بہت منفعل گیا

لسان الحکمت شمس العلماء عبدالرحمٰن خاں شاطر عبدالغنی خان بہادر کے فرزند تھے۔ عربی، فارسی اور انگریزی میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ حکومت مدراس کے چیف ٹرانسلیٹر تھے۔ شاطر ایک فلسفی شاعر تھے۔ اعجازِ عشق ان کی واحد یادگار ہے۔ یہ ایک قصیدہ ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی بھر کے مطالعہ کا نچوڑ دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔ شاطر ۱۹۴۲ء میں تقریباً ۷۵ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

اعجازِ عشق کے متعلق مشاہیرِ ادب نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :۔

"قصیدہ آپ نے بڑے زور کا کہا ہے اور نئے نئے نادر مضامین پیدا کئے ہیں۔" (حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی ۲۰ راگست ۱۹۰۴ء)

"نہایت تعجب ہوا کہ احاطۂ مدراس میں ایسی صاف اور فصیح اردو ایسی پاکیزہ نظم و نثر اور ایسا لطیف اور صحیح مذاق کیونکر پیدا ہوا اور کہاں سے آیا۔ بلا مبالغہ و بلا تصنع آپ کے بعض شعروں کو دیکھ کر رشک ہوتا ہے کہ کیوں یہ پیرایۂ بیان ہمارے ہاتھ نہ لگا علی الخصوص اس شعر کی تعریف مجھ سے نہیں ہو سکتی ؎

بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پہ سوار اے ابلق لیل و نہار

یہی ایک شعر اعلیٰ درجہ کی قابلیت شاعری پر دلالت کرنے کے لئے کافی ہے۔" (خواجہ الطاف حسین حالی۔ پانی پت ۱۱ر نومبر ۱۹۰۴ء)

"اس قصیدے کا کچھ حصہ مخزن میں شائع ہو چکا ہے اور پنجاب میں عموماً پسندیدگی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے ایک کرم فرما جالندھر میں ہیں سنا ہے کہ وہ اس کو نہایت پسند کرتے ہیں اور اس کے اشعار کو انھوں نے اتنی

بھاگلپور ۱۸۸۱

دفعہ پڑھا ہے کہ اب ان کو وہ تمام حصہ جو مخزن میں شائع ہو چکا ہے از بر یاد ہے۔ اکثر اشعار نہایت بلند پایہ اور معنی خیز ہیں بندشیں صاف اور ستھری ہیں اور اشعار کا اندرونی درد مصنف کے چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہایت نمایاں کر کے دکھا رہا ہے۔ آپ کا اسلوب بیان واقعی نرالا ہے اور آپ کی صفائی زبان آپ کے ہم وطنوں کے لئے سرمایۂ افتخار ہے میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ اصل میں ہندوستان کے رہنے والے ہوں گے مگر یہ معلوم کر کے کہ آپ کی پرورش بچپن سے مدراس میں ہوئی ہے مجھے تعجب ہوا۔" (محمد اقبال۔ لاہور۔ ۲۲ر فروری ۱۹۰۵ء)

"آپ کا قصیدہ میں نے دیکھا۔ اس سے پہلے آپ کی مختلف نظمیں نظر افروز ہوئی تھیں۔ میں مدت سے آپ کی قادر الکلامی اور خوش فکری کا معترف ہوں۔ آپ کے کلام میں فلسفیانہ خیالات جس خوبی اور برجستگی سے ادا ہوتے ہیں اس کی مثالیں اردو میں بہت کم ملتی ہیں۔" (شبلی نعمانی۔ اعظم گڑھ۔ ۱۷ر مارچ ۱۹۰۵ء)

شاطر کے قصیدۂ اعجازِ عشق سے یہاں صرف چند شعر بطور نمونۂ کلام پیش کئے جاتے ہیں۔

بے محل اُٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلق لیل و نہار
گورکن کے چھوٹے بچے مر رہے ہیں بھوک سے
کوئی مر جائے تو جی جائیں گے یہ پروردگار
کون آتا ہے سرِ گورِ غریباں بعدِ مرگ۔
ڈھیر سے مٹی کے بندوں کو بھلا کیا کام یار!
دھوپ میں جلتے ہیں، بارش میں پڑے ہیں بے نیاز
جو نہ واقف تھے کہ کیا ہے گرم و سردِ روزگار
آہ وہ خود ہو گئے ہیں خاک، رل کر خاک میں
پاؤں رکھ دینا بھی جن کو خاک پر تھا ناگوار
قلزمِ عشق اور سما جائے حبابِ عقل میں
پا نہیں سکتا ہو مطلق کو مقید زینہار

اس سلسلہ کی آخری کڑی اور گوپامئو سے مدراس کو ہجرت کرنے والے آخری فرد میرے والد سراج العلما خان بہادر نواب تجمل حسین خاں

ایمان مرحوم تھے۔ وہ ۱۸۵۸ء میں گوپامئو میں پیدا ہوئے۔ حافظ ولی احمد کے چھوٹے فرزند تھے، مولانا اکرم گوپاموی اور مولانا خیرالدین گوپاموی سے تفسیر و اصول کی سندیں حاصل کیں۔ سولہ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد اپنی والدہ بیانز فاطمہ کے ساتھ حیدرآباد دکن پہنچے۔ حیدرآباد میں ان دنوں نواب محسن الملک وزارت کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کی ترغیب پر حیدرآباد میڈیکل کالج میں داخل ہوگئے۔ چند ہی مہینے گذرے تھے کہ اپنے چچا نواب رفعت الملک بہادر رفعت گوپاموی سے ملنے کے لئے مدراس آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مدراس اپنی تاریخ کے سنہرے دور سے گذر رہا تھا۔ عربی اور فارسی کے جیّد عالم اور زبردست ادیب یہاں کثیر تعداد میں موجود تھے اور اپنے بیش بہا علمی خزانوں کو کمال فراخدلی سے لٹا رہے تھے۔ ایمان نے اس فضا سے متاثر ہو کر تحقیق مزید کے شوق میں پھر سے متعلمانہ زندگی اختیار کی اور مولانا طرازش خاں، مولانا غلام دستگیر ہمت، اور مولانا الحاج عبدالوہاب بانی مدرسۂ باقیات الصالحات ویلور سے ایک مدت تک درس لیتے رہے۔ ۲۳ سال کی عمر میں نواب انتظام الملک بہادر پرنس آف آرکاٹ سوم کی صاحبزادی سے بیاہ ہوگیا۔ شادی کے بعد انھیں فکر معاش سے آزادی مل گئی اور یہ اپنے علمی و ادبی دھندوں میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ شاعری میں سید ضامن علی جلال سے بھی تلمذ حاصل تھا۔ ابتدا میں خطوط کے ذریعہ اپنا کلام ارسال کرتے رہے مگر بعد میں کئی مرتبہ لکھنؤ اور رامپور جاکر استاد کی ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

ایمان ۱۹۰۵ء تک عموماً غزلیں ہی کہا کرتے تھے۔ بعد میں نعت و منقبت کے سوا تادم آخر کچھ نہیں کہا۔ ۱۹۴۰ء میں ۸۲ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

تذکرۂ شہدائے بدر و احد کے علاوہ ان کا نعتیہ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ غزلوں کا مجموعہ عنقریب شائع ہو جائے گا۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

دل ایک ہے سینے میں پر ارمان بہت ہیں
مشکل ہے کہ گھر تنگ ہے مہمان بہت ہیں

گردشِ چشم دکھا جامِ شراب آنے دے
مجھ تک اس دور میں ساقی مے ناب آنے دے

عشق میں کچھ تو دلِ خانہ خراب آنے دے
صبر آنے دے قرار آنے دے تاب آنے دے

ذیل کی غزل ایمان کی آخری غزل تھی اس کے بعد انھوں نے غزل گوئی ترک کر دی ملاحظہ ہو ؎

بُلا لائے گا تم سے دل لگانا میں نہ سمجھا تھا
بدل جائے گا یوں مجھ سے زمانا میں نہ سمجھا تھا

میں سمجھا تھا کہ دم نکلے گا قدموں پہ ترے قاتل
سسکتا چھوڑ کر ہوگا روانا میں نہ سمجھا تھا

خبر کیا تھی تری فرقت کلیجہ چھان ڈالے گی
بنے گا تیرِ غم دل نشانا میں نہ سمجھا تھا

مجھے بھٹکائے گا صحرا بہ صحرا صورتِ مجنوں
جنونِ عشق کا یہ کارخانا میں نہ سمجھا تھا

حسینوں سے بھلائی کی توقع اُٹھ گئی ایماں
بُرا ہے یہ گھرانے کا گھرانا میں نہ سمجھا تھا

✿

غزل

سلام مچھلی شہری

شعلوں کی زد میں پھولوں کا دامن سنبھالنا
اے اندر دیوتا! مرا گلشن سنبھالنا

جو بجلیاں کہ ہونے لگی ہیں گلے کا ہار
ان بجلیوں سے اپنا نشیمن سنبھالنا

مہکے ہوئے گلاب ہیں مچلے ہوئے رباب
سپنوں کا باغ گیتوں کا مدھوبن سنبھالنا

اس رت میں میرے جیب و گریباں کے ساتھ ساتھ
تازہ سمن بروں کی بھی چلمن سنبھالنا

تم اپنی بجلیوں کی نزاکت کو دیکھ لو
ہم جانتے ہیں اپنا نشیمن سنبھالنا

شعلوں کا وار میرے لئے موجِ بوئے گل
پھولوں کا وار اے حسیں دشمن سنبھالنا

ہم منزلِ عوام ہیں اے تازہ فلسفو!
تم بھی ذرا غریبوں کا جیون سنبھالنا

ان ناقدوں کی یورشِ پیہم کے باوجود
معبودِ شعر و نغمہ! مرا فن سنبھالنا

سلیمان اریب

دنیائے کائنات کا مارا ہوا ہوں میں
اک حسنِ بے ثبات کا مارا ہوا ہوں میں

جس نے ہر ایک دوست کو دشمن بنا دیا
اس چشمِ التفات کا مارا ہوا ہوں میں

جن گیسوؤں کی رات میں پائی تھی زندگی
ان گیسوؤں کی رات کا مارا ہوا ہوں میں

دشنام دہر سے تو نہ کچھ ہو سکا مگر
تیرے دہن کی بات کا مارا ہوا ہوں میں

کون و مکاں کی وسعتیں زنجیر بن گئیں
حدِ تعینات کا مارا ہوا ہوں میں

ہوں گے غمِ حیات کے مارے ہوئے تو سب
کس سے کہوں حیات کا مارا ہوا ہوں میں

خواب کے مجسمے

اقبال مجید

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"ہٹیے" وہ آہستہ سے بولی اور یہ کہکر اپنی آنکھیں جھکالیں۔ کچھ عجیب تاثرات تھے اس کے چہرے پر جسے نہ خوشی کہا جاسکتا تھا اور نہ غم۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود بھی ایک کشمکش میں مبتلا تھی، جیسے وہ خود بھی نہیں سوچ پائی تھی کہ اس کے ان جذبات کو کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس نے دھیرے سے میری ٹائی کی گرہ کھولی۔ کوٹ کو ہینگر میں ٹانگا۔ میں تھکا تھکا سا پلنگ پر دراز ہوگیا۔

وہ ایک الجھن کے ساتھ بولی۔ "کیا مصیبت ہے"

"ہونہہ مصیبت کیلئے" میں نے بناوٹی طور پر غصے کا اظہار کیا۔

"مجھے نہیں اچھا لگتا" وہ بولی۔ اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے اور اگر مل رہے تھے تو وہ جان کر انھیں کوئی شکل دینا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن میں نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ مجھے اس پر یک بارگی پیار آگیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور اس کا چہرہ ایک لمحے کے لئے شرم سے تمتما کر رہ گیا۔ میں پیار سے بولا۔

"کوئی پروا نہیں۔ نپٹ لیں گے" وہ پھر شرما گئی اور اس بار قدرے کھل کر بولی۔

"کیسی کیسی دعائیں مانگی تھیں مگر ابھی چار مہینے بھی تو نہیں گزرے۔

یہ کہہ کر وہ پھر چھپ گئی۔ اور اس نے گردن جھکا کر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ میں نے اس کی چاندی جیسی ہتھیلیوں کو دیکھا۔ سرخ سرخ رچی ہوئی مہندی جسم سے ابھی تک ابٹن کی خوشبو اور کپڑوں سے سہاگ کے عطر کے جھونکے آرہے تھے۔ اماں جی جب کسی عزیز کے یہاں لے جاتیں تو اسے پھر سے گوٹہ لچکا سرخ غرارہ پہننا پڑتا ناک میں وہی بڑی سی نتھ۔ امت باجی اسی طرح مانگ میں افشاں بھرتیں اور پھر سے اسے ڈیڑھ ہاتھ کا گھونگھٹ کاڑھنا پڑتا۔ دھیمے دھیمے پیر اٹھانے پڑتے اور عورتوں کے بیچ گٹھری بن کر بیٹھنا پڑتا۔

میں نے جب دیکھا کہ واقعی وہ بہت زیادہ گھٹ رہی ہے تو آہستہ سے بولا۔

"اتنا اداس ہوجاؤگی تو معاملہ کیسے بنے گا"

وہ چپکے سے بولی۔ "اور لوگوں کے یہاں تو دو دو سال تک کچھ نہیں ہوتا۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے" میں نے اس کے چٹکی لی۔

وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتی رہی ایسی نگاہوں سے جس میں اس وقت حیا کی نرمی اور گداز نہ تھا۔ وہ نگاہیں بالکل سیدھی اور بے لوچ تھیں۔ سپاٹ اور سادہ سی نگاہیں۔ میں کچھ ایسا بن گیا جیسے میں نے ان نگاہوں کو قطعی نہ پہچانا ہو اور مسکرا کر بولا۔

"دیکھو پارٹنر، بزنس میں دونوں کا ساجھا ہے۔ تم اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کرسکتیں" وہ پھر چھپ گئی۔ مگر اس طرح جیسے جھینپنے کی رسم ادا کر رہی ہو۔ جیسے یہ ایک فطری عمل نہیں ایک فرض ہے جو اسے ایک عورت کے ناتے جبراً ادا کرنا پڑ رہا ہے۔

میں نے کہا۔ "دیکھو رشتہ یہ کونپل جو پھوٹ رہی ہے ایک دن تناور

درخت بھی تو بے نگی۔ اس وقت ہماری زندگی جیٹھ بیساکھ کی گرمیوں کی طرح تپتی ہوگی، ہمارے سروں پر کوئی چھت نہ ہوگی۔ وقت ہم سے ہمارا سب کچھ چھین چکا ہوگا تب اس درخت سے ہمیں تھوڑا سا سایہ ہی مل جائے گا۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے کہا۔

"شاپنگ کرنے نہیں چلوگی؟"

"ہونہہ" وہ مختصر سی ہونہہ کرکے رہ گئی۔ میں پھر بولا۔

"مجھے تو پارٹی میں جانا ہے۔"

"ضرور جائیے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کچھ چیزیں ہیں وہ تم لا دینا۔"

وہ پھر کچھ نہ بولی۔ میں نے کہا۔

"ایسا کرو کہ رکشا منگوا لو اور نوکر کو ساتھ لیکر گنج چلی جاؤ۔"

"ارے ہاں! ٹوائلٹ پاؤڈر بھی تو ختم ہو گیا ہے۔ نہا کر یونہی کپڑے پہن لیتے ہیں آپ۔ اندھوریاں پڑ جائیں گی بدن میں۔"

میں مسکرا دیا۔

"ہاں تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ہی یہ سب لے آؤ۔"

"اور آپ نہیں چلیئے گا؟"

"نہیں مجھے تو پارٹی میں جانا ہے۔"

"تو میں اکیلی جاؤں؟ اکیلی تو نہیں جاؤں گی۔" اسے تاؤ آ گیا۔

"کیا حرج ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ کچھ برا مانتے ہوئے بولی۔ "شادی سے پہلے تو بڑی امنگیں تھیں آپ کو، اب کیا ہو گیا ہے؟"

"یہ بات نہیں بھئی۔" میں اسے منانے لگا۔ "معاملہ یہ ہے کہ...!"

"معاملہ وا ملہ کچھ نہیں۔ آپ چلئے۔ پھر میں آپ کو اسی طرف سے پارٹی میں چھوڑتی ہوئی گھر آ جاؤں گی اور ہاں!" اسے کچھ یاد آ گیا۔ "نیلے سوٹ کی ٹائی تو حضرت نے لی نہیں ابھی تک۔ چلئے وہ بھی ادھر سے لے لیں گے۔"

میں پھر مسکرا دیا۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے پھر وہ دھیرے سے بولی۔

"دو روز سے کہہ رہی ہوں یہ قمیص اتار دیجئے، پھٹی قمیص پہن کر باہر جاتے ہیں۔" میں نے قمیص کے پھٹے شانے کی طرف دیکھا اور سامنے دیوار کے اکھڑے ہوئے پیڑ کی طرف یونہی دیکھنے لگا۔ پھر یک بارگی میں اس سے غیر متوقع سوال کر بیٹھا۔

"وہ زمانہ جاڑوں کا ہی ہوگا۔"

"کون زمانہ؟" اس نے پوچھا۔

"آنے والا۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر منہ ہی منہ میں کچھ حساب لگا کر بولی۔

"ہاں۔"

"تو پھر" میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "تو پھر اُون بھی خرید لینا ــــ بیٹھے بیٹھے کیا کروگی۔ کچھ چیزیں ہی تیار کر لوگی۔"

"کیسی چیزیں؟" وہ چونک کر بولی۔

"بھئی ننھے منے موزے۔ کنٹوپ وغیرہ۔"

اس نے میری طرف دیکھ کر گردن جھکالی۔

تین سال پیشتر رشو میری زندگی میں آئی تھی۔ وہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ جب میرے خاندان میں رشو سے میری دلچسپی کا حال معلوم ہوا تو اماں جی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کوئی خوش بھی کیوں ہوتا۔ اماں جی کہتی تھیں۔

"لڑکا میرا لاکھوں کا ہیرا ہے۔ اس سے کم میں نہ بھناؤں گی محل والی لاؤں گی محل والی۔" وہ پچاس بار کہہ چکی تھیں۔ "میرے گھر جو آئی، چندے آفتاب چندے ماہتاب آئی۔" رشو نہ محل والی تھی نہ چاند کا ٹکڑا۔ میں نے اس سے پیار کیا تھا۔ اور پیار دلوں کے دروازوں پر دستک دے کر نہیں آتا۔ وہ اپنا اتا پتہ بھی نہیں بتاتا۔ وہ دبے پاؤں خاموشی سے کسی دلآویز خواب کی طرح ایک موج کے مانند ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ تین سال تک ہم دونوں ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہے۔ اب میں تعلیم ختم کر چکا تھا اور رشو میری بیوی تھی۔ صرف چار مہینے کی نئی نویلی دلہن۔

رشو دھیرے دھیرے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی اور بولی۔

"کتنی بار منع کیا ہے۔ مگر سنتے نہیں۔"

"اوں۔" میں دھیرے سے بولا۔

"اوں کیا۔" وہ چڑھ کر بولی۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ تو ضرور سوچ رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"کوئی خاص بات تو نہیں۔"

"نہ خاص نہ عام۔" وہ تنک کر بولی۔ "سوچنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ صبح کے نکلے اب گھر میں آئے ہیں تو سوچنے بیٹھ گئے۔ کئی بار کہہ چکی ہوں کہ یوں مارے مارے گھومنا چھوڑ دیجئے۔"

"مارے مارے گھومنا۔" میں نے ایک طنز کے ساتھ دہرایا۔ اور پھر ہم دونوں کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئے۔ میں پھر سامنے دیوار کے اکھڑے ہوئے پیڑ کو دیکھنے لگا تھا۔ رشو پہلو میں بیٹھی ہوئی میرے بالوں سے کھیل رہی تھی۔ یک بارگی میں پھر بول اٹھا۔

"اس کمرے میں مورنگ کا فرش کروا دینا چاہئے۔ اور دیواروں پر پلاسٹر کروا کر ہلکے نیلے رنگ کا پینٹ کرا دیا جائے۔ نیچے سے ایک گز کی بلندی تک چاروں طرف بڑے بڑے نقش و نگار والی چٹائی کی گوٹ کیسی رہے گی؟"

اس نے میری پوری بات کو غور سے سنا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر بولی۔

"اچھی رہے گی۔ لیکن ایک چیز تو بھول ہی گئے آپ! بجلی کے راڈ کا کیا ہوا۔ وہ بھی میں لینے جاؤں؟"

"بجلی کا راڈ۔" میں چونک پڑا۔ "ارے ہاں۔" میں نے کہا۔ "خوب یاد آیا۔ میں نامی جنتا الکٹرک ورکس تک گیا اور پھر بھول گیا۔"

"اور ریڈیو کا کیا ہوا؟"

"ایک الجھن میں مبتلا ہوں"

"لو کوئی اور الجھن پیدا ہوگئی!"

"بات یہ ہے کہ ایک اچھا ریڈیو ساڑھے سات سو کا مل رہا ہے لیکن گیارہ سو کا ایک خوبصورت ریڈیوگرام بھی بُرا نہیں۔ اب سوچتا ہوں کہ ان دونوں میں......"

"جی ہاں بس چل نکلے۔" وہ بیچ میں ہی بول اٹھی۔ "مجھے نہیں چاہئے ریڈیوگرام اور پھر ابھی اور بھی ساری چیزیں پڑی ہیں۔"

"تو پھر جیسا تم کہو۔"

"کہو کی بات نہیں آپ کل ہی چل کر میرے ساتھ وہ ریڈیو خرید لیجئے! جو آپ نے پسند کیا ہے۔"

ہم لوگ پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئے۔

"ابھی کل ہی رعنا کے میاں اتوار کے بازار سے ایک گراموفون خرید کر لائے ہیں صرف ۶۰ روپے میں۔" اس نے خاموشی توڑی۔

"ساٹھ روپے میں۔" میں چونک پڑا۔

"ہاں پرانا ہے لیکن آواز اچھی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ پھر بولی۔

"ابا میاں کا لحاف پھٹ گیا ہے۔ جاڑا سر پر آگیا ہے۔" وہ بھی میرے ابا میاں کو ابا میاں کہتی تھی۔ ابا میاں کی عمر ۶۱ سال کی تھی۔ انہیں اپنی ملازمت سے رٹائر ہوئے تین سال ہوگئے تھے۔ میں سوچ میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر بعد رشو میرے لئے چائے لیکر آئی۔ میں دھیرے دھیرے چائے پینے لگا۔ اور چھت پر لگے ہوئے مکڑی کے جالے کو دیکھنے لگا۔ رشو میرے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی اور بولی۔

"جی چاہتا ہے ایک ڈال فی گوڑی بنا دوں۔"

"یہ کیسی ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت خوبصورت۔" وہ بولی۔ "پندرہ روپے لاگت آتی ہے ایک فی گڑیا پر۔"

"تو اس کے لئے سو روپے کا سیٹ بھی ہونا چاہئے۔" میں نے کہا۔ وہ ہنسنے لگی۔ پھر ایک خاص تیور کے ساتھ بولی۔

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ اکیلا ریڈیوگرام ہی نہیں ہے۔ ابھی اور بھی کام ہے۔" میں نے گردن جھکالی۔ تبھی دیکھا میری چائے کی پیالی میں لمبا سا بال پڑا ہوا تھا۔ اور اس کے کناروں کی چینی جگہ جگہ سے اکھڑ گئی تھی۔ میں نے رشو سے کہا۔

"یہ کون سی پیالی میں چائے لے آئی ہو تم۔" اس نے پہلے پیالی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف اور ہنسنے لگی۔

"کیوں ہنسی۔؟" میں نے پوچھا۔

"یوں ہی۔" وہ پھر ہنسنے لگی۔ میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"یہ کرسی یہاں سے ہٹوا دینا۔" میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا جسکا بید تقریباً سڑ چکا تھا۔

"میں نے جان کر نہیں ہٹائی تھی۔"

"کیوں۔"

"صوفوں کا انتظار کر رہی ہوں۔ کل بھی نیو اینڈ سنس کے یہاں آدمی

کو بھیجا تھا [illegible] کھلوا دیا دو دن کے اندر اندر پہنچ جائیں گے۔ چھوٹا موٹا یہاں ڈال دوں گی۔"

"بہت خوب۔ ماشاءاللہ کافی ذہین ہو۔" میں نے شرارت سے کہا۔

"آپ ہی نے سکھایا ہے سب۔" اس نے شرارت سے جواب دیا۔

اور میں کمرے کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کی طرف دیکھنے لگا۔ پرانی ساریوں کو زبردستی پردوں کے کام میں لایا گیا تھا۔ ان میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے اور جگہ جگہ میل جم گیا تھا۔

"کیا یہ پردے گلے رہنا ضروری ہیں؟" میں نے رشو سے کہا۔ رشو نے ایک بار نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر کچھ نہ بولی۔ جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ پھر کچھ دیر بعد وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

"ابا میاں کے پیروں میں اب طاقت نہیں رہ گئی ہے۔ بیماری کے حملوں نے انھیں اور بھی کمزور کر دیا ہے مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ جب مہینے کی پہلی کو وہ کچہری پنشن وصول کرنے جاتے ہیں۔"

"امی جان آج پھر صبح سے رو رہی تھیں۔" وہ میری امی کو امی کہتی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا آپ سے کچھ باتیں ہوئیں؟"

"ہاں۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"کہتیں کیا۔۔۔ اور کہنے کو ہے ہی کیا۔" میں قدرے اداس ہو گیا۔ رشو میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اور اس نے پیار سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دھیرے دھیرے سہلانے لگی پھر چونک کر بولی۔

"انگوٹھی کیا کی۔؟"

"ہے۔" میں نے کہا۔

"کہاں ہے۔؟"

"ایک دوست نے پہن لی ہے۔"

"کون سے دوست نے۔"

"ہے ایک دوست۔" میں نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

"نہیں آپ کو میری جان کی قسم بتلایئے۔" وہ جیسے مچل اٹھی۔

"کیا بتاؤں؟" میں نے خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ جیسے تلملا کر کہہ اٹھی۔ "آپ میرا مردہ دیکھیں جو مجھ سے جھوٹ بولیں۔ بتلایئے انگوٹھی کیا کی۔" میں چپ رہا۔ وہ بھی میرے جواب کا انتظار کرتی رہی اور اس طرح چند لمحوں کے لئے ایک سناٹا سا پھیل گیا۔

"بولیے۔" گھٹی ہوئی آواز میں اس نے پھر سناٹا توڑا۔

"اماں جی کو دے دی۔" میں نے تھکے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کیوں؟" یہ "کیوں" قطعی غیر ارادی طور پر اس کے ہونٹوں سے گر پڑا لیکن اس نے جلد ہی اپنے کو سنبھال لیا اور بولی۔ "اچھا کیا جو دے دی۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں بہت آہستہ سے کہا۔ "وہ ہمارے نکاح کی انگوٹھی تھی رشو! لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اماں جی صبح سے کیوں رو رہی تھیں۔" اور پھر میں نے دیکھا رشو اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے چبا رہی تھی۔ لیکن اب میرے جذبات کا باندھ ٹوٹ چکا تھا۔ میں جو اس ناٹک کا دوسرا اداکار تھا اپنے ساتھ کی اداکارہ کا بہت دیر تک ساتھ نہ دے سکا اور کہہ اٹھا۔

"گھر میں گیہوں ختم ہو گئے تھے۔ ابا میاں کی ستر روپیوں کی پنشن سے کیا کیا ہوگا۔ میری بے روزگاری نہ جانے کب ختم ہوگی۔" رشو تڑپ اٹھی۔ اس نے میرے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور آہستہ سے بولی۔

"ہراساں ہوئیے۔ اللہ نے علم دیا ہے تو روزگار بھی دے گا۔ ہمیشہ ایک ہی سے دن تھوڑے رہیں گے۔ آپ اس سے اچھی انگوٹھی خرید لائیے گا۔ اور میں نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ وہ منزل تھی جہاں خواب کے مجسمے مسمار ہو چکے تھے۔

☆

جدید ہندوستانی آرٹ

دیویندر اِسر

ہندوستانی آرٹ کی تاریخ ہزاروں برس پرانی ہے۔ اس آرٹ کی نشو و نما اجنتا، ایلورا، کھجوراہو اور کونارک کے کلاسکی آرٹ کی عظیم روایات میں

اُروپ داس کی انعامی تصویر "یسوع مسیح"

ہوئی۔ مغل آرٹ اور راجپوت آرٹ نے ان روایات کو اور آگے بڑھایا۔ انگریزی

تسلط کے بعد ہندوستانی آرٹ پر مغربی روایات کا اثر پڑا لیکن چونکہ اب مغرب کی محض نقالی ہونے لگی تھی اس لئے ہندوستانی آرٹ کا یہ دور اس کا انحطاطی دور تھا۔ بہرحال یہ دور زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ بنگال میں آرٹ کے نشاۃ ثانیہ نے ان انحطاطی رجحانات کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ اوبنندرناتھ ٹیگور

گجرال کی تصویر۔ "اب ہم کیا کریں"

اور ہاویل کے مخلصانہ مساعی کے باعث مشرقی آرٹ کا احیا شروع ہوا فنکاروں نے مغرب کے انحطاط پرور اثرات سے منہ موڑ کر مشرق کی فنی تحریکوں کو اپنی تخلیقات کا سرچشمہ بنایا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مغربی ممالک استحصال اور

سامراج کے ہم معنی ہوگئے تھے اور مشرقی ممالک میں ان کے خلاف جذبۂ بغاوت کی نمو ہونے لگی تھی۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مشرق میں قومی تحریکوں کا دور دورہ شروع ہوگیا اور جذبۂ آزادی سے سرشار فنکاروں نے ماضی کی شاندار روایات سے پھر فیضان حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مشرق کا کلچر اور فن مغربی کلچر اور فن سے کسی بھی طرح پسماندہ نہیں بلکہ اس کی اپنی شاندار روایات ہیں۔ اور اس میں آج بھی تازگی، حیات اور شگفتگی ہے۔ ہندوستانی فنکاروں نے اب روحِ مشرق کو بھی اپنے آرٹ میں پیش کرنا شروع کر دیا اور اجنتا وغیرہ کے علاوہ وہ چین اور جاپان کی فنی طرزوں سے متاثر ہونے لگے۔ بہرحال، نشاۃ ثانیہ کی جو بھی خامیاں رہی ہوں اس سے ہندوستانی آر...

پرستی کا اثر بھی اس دور کی مصوری پر پڑنے لگا۔ راجہ روی ورما نے اس رجحان کی ترویج میں بڑا اہم حصہ لیا۔ نئے فنکار زیادہ وسیع کینوس میں اظہاریت پرست میلانات کو آرٹ میں پیش کرنے لگے۔ بمبئی کے مصور اپنے عالمی (Cos-mopolitan) پس منظر کے باعث آرٹ میں عالمیت پر زور دینے لگے۔ نئے فنکار مغربی ممالک بالخصوص فرانس کی نئی طرزوں سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی روایات کا بھی احترام کرنے لگے اور اس طرح بنگال کی روایت پرست مصوری اور بمبئی کی عالمیت پرست مصوری کی شکل میں جدید ہندوستانی آرٹ کا جنم ہوا۔ اس جدید آرٹ کے نمائندہ مصوروں میں گگنیندر ناتھ ٹیگور، رابندر ناتھ ٹیگور، ...

سدھیر خاستگیر

تفریح۔

کی تمہید میں مدد ملی۔ نندلال بوس، شاردا چرن اکل، اشت بالدار وغیرہ اس نشاۃ ثانیہ کے بڑے علم برداروں میں تھے۔ اس دور کی مصوری میں جذبات و احساسات کے اظہار، چینی اور جاپانی طرز کی سادگی اور شاعرانہ تخیل کی آمیزش تھی اور غیر روحانی مصوری کے بجائے انفرادی جذبات اور شعور کا اظہار کیا گیا تھا۔

ہندوستان کے روایتی طرز کے احیاء کے ساتھ ساتھ مغرب کی جدید حقیقت

رائے اور امرتا شیرگل قابلِ ذکر ہیں۔ گگنیندر ناتھ ٹیگور نے کیوبسٹ طرز (ہندسانہ نقاشی — Cubism) کے کئی اہم نمونے پیش کئے۔ رنگوں اور خطوط کو نئے موضوعات سے روشناس کرایا اور انھیں پُراثر طریقے سے پیش کیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی شبیہوں میں فکر انگیز انفرادیت اور لاشعور کی گہرائی کا احساس ملتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے طرز اور موضوعات روایتی انداز کے نہیں۔ ان کے آرٹ میں ابتدائی انسان کے لاشعور کی گہرائی

گوالا۔ ڈی۔ بدری

اور دل کی دنیا کے نہاں گوشوں کا اظہار ملتا ہے۔ ٹیگور اظہاریت کے نمائندہ فنکار ہیں جیمنی رائے نے لوک کلا سے انسپریشن لے کر نئی مصوری کو ایک ابدی اور شاندار روایت سے جوڑ دیا جو ہمیشہ نئی اور تازہ نظر آتی ہے۔ جیمنی رائے نے رنگوں اور خطوط کا بلیغ استعمال دیہی زندگی کی تصویر کشی کے لئے کیا ہے۔ کلکتہ اسکول کے نوجوان مصوروں میں رتھن مترا، پرداش داس اور گوپال گھوش نے قدامت پرستی اور نقالی سے انحراف کیا اور اپنے منفرد تجربات اور احساسات کو آرٹ میں پیش کیا۔ امرتا شیر گل میں قوتِ تخلیق اور گہرا انسانی احساس ہے۔ روایت کے تاریخی شعور اور روحِ عصر کے پس منظر میں امرتا شیر گل نے ہندوستانی روح، المیہ احساس، انفرادی شعور اور جذبات کی گہرائی کے امتزاج سے جو تصویریں پیش کی ہیں وہ جدید ہندوستانی آرٹ کے بیش بہا نمونے ہیں۔

جدید آرٹ میں ایسا کوئی رجحان البتہ نہیں ہے جسے ہم جدید آرٹ کا نمائندہ یا غالب رجحان قرار دے سکیں یا یہ کہہ سکیں کہ ہندوستانی آرٹ میں یہ رائج رجحان ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ ہندوستان میں اس وقت گوناگوں رجحانات کا اثر ہے۔ جدید فنکاروں کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے آرٹ میں تنوع پیدا کیا۔ وہ آرٹ میں کسی مخصوص نظریے یا طرز یا رجحان کی پیروی نہیں کرتے وہ ہر تجربے کو اپنی شخصیت میں سمو کر پیش کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ابھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ہیں لیکن ان کے آرٹ میں نئی زندگی کا خون سرایت کر رہا ہے۔ انھیں تجربات سے فیضان پا کر نیا آرٹ پختگی حاصل کرے گا اور نئی روایت کو جنم دے گا۔

ان باتوں کے باوجود بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید آرٹ میں اظہاریت اور تاثریت کے رجحانات میں زیادہ دلچسپی پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خالص تجریدی فن (Pure Abstract Art) کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ ذکر کو شک، اکبر پدمسی، رائٹو رتے اس طرزِ فن میں کافی مہارت حاصل کر لی ہے۔ کچھ فنکار ابھی تک علمی موضوعات کو اپنے

آرٹ میں پیش کر رہے ہیں جو اب زیادہ مرغوب نہیں۔ اسی طرح ساکت زندگی کی تصویر کشی بھی بہت کم نظر آتی ہے۔ حقیقت پرستی کے ساتھ ساتھ قدیم ناٹکا بھید اور دیو مالا کی تمثیلوں کے ذریعے کچھ مصوروں نے اپنے فن کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ جدید آرٹ میں ادبی مواد کی کمی ہوتی جا رہی ہے اور فطرت پرستی کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے۔ بیرونی مناظر کی تصویر کشی میں فنکار اپنے ذاتی احساس سے انفرادی طرز کو نمود دینا چاہتے ہیں۔ فطرت کے تغیر پذیر اور انحطاط پذیر مناظر کی تصویر کشی بھی آرٹ میں ملتی ہے۔ پھولوں اور جانوروں کی کچھ تصویروں میں پختگی ہے۔

میں اس کو تصویر کے پیکر میں پیش کرنا فنکار کا فریضہ ہے۔

جدید آرٹ اپنے اسکوپ میں عالمیت پرست ہوتے ہوئے بھی قومیت کے عنصر سے عاری نہیں۔ اس لئے جدید آرٹ نہ محض آدرشش پرست ہے اور نہ ہی اس کا نقطۂ نظر محدود ہے۔ اسی طرح نیا آرٹ روایت پرست نہ ہو کر بھی روایت سے تواریخی اور روحانی طور پر مربوط ہے۔

"آلٹی میرا کے عہد حجری کی تصویروں کی قوت اور سادگی مصر کے حیداری نقش و نگار میں شبیہوں کی ایک مخصوص طرز میں نقاشی، روزنیک مورتیوں کا گہرا اثر ابتدائی کوشک

تیلی تصویر کا کنارا۔

دنکر کوشک

ان مساعی سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ جدید ہندوستانی آرٹ زندگی کے مسلسل مرقع (Panaroma of Life) کو پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جدید مصوروں کی بصیرت (Vision) ذاتی، انفرادی اور نفسیاتی عوامل کی حامل ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ جدید فنکار اپنے سماجی ماحول سے اپنے آپ کو جلا وطن پاتے ہیں اور ان کا احساسِ تنہائی ان کے آرٹ میں غم کی پرچھائیں کو مسلسل قائم کئے ہوئے ہے۔ نیا آرٹ درحقیقت گہرائی کی تلاش کا نام ہے۔ یہ گہرائی چاہے بیرونی دنیا کے مناظر اور واقعات میں ملے یا روح کی پہنائیوں اور دل کے تاریک گوشوں

آرٹ کی فکر انگیز گہرائی، امنگ دور کے فطری خاکوں میں تخیل کی وسعت، ہیر وشنگلے کی نرم لیکن سنجیدہ شاعرانہ طرز، تبتی تصویروں کی داستانوی اور واقعاتی تصویر کشی، حبشی آرٹ کی لاشعوری اشاریت ان سبھی اثرات نے جو زمان و مکان میں ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ جدید آرٹ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔" (ہندوستانی آرٹ کا جائزہ)

آزادی کے بعد ہندوستانی مصوروں کو غیر ممالک جانے کے کئی مواقع ملے جہاں انھوں نے عظیم فنکاروں کی اصلی تصویریں دیکھیں۔ کئی فنکاروں نے

..یورپ کے جدید فنکاروں کا قریب سے مطالعہ کیا اور ان کی تخلیقات کو سمجھا اور پرکھا۔ مغربی مصوروں کی شخصیت، ان کے انسپریشن کے سرچشموں، انکے تخلیقی عمل اور ان کے نظریات نے ہندوستانی فنکاروں کو متاثر کیا اور ان کی نظر وسعت اور گہرائی سے روشناش ہوئی۔ زیادہ فنکار فان گو اور گوگاں کے فن سے متاثر ہوئے۔ ستیش گجرال میکسیکو کے فنکار ڈگو دیویرا اور اوریجکا سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے آرٹ میں (Epical Touch) ہے اور وہ پرشکوہ اور ڈرامائی تاثر کا حامل ہے۔ اس نے دیومالا کی تمثیلوں
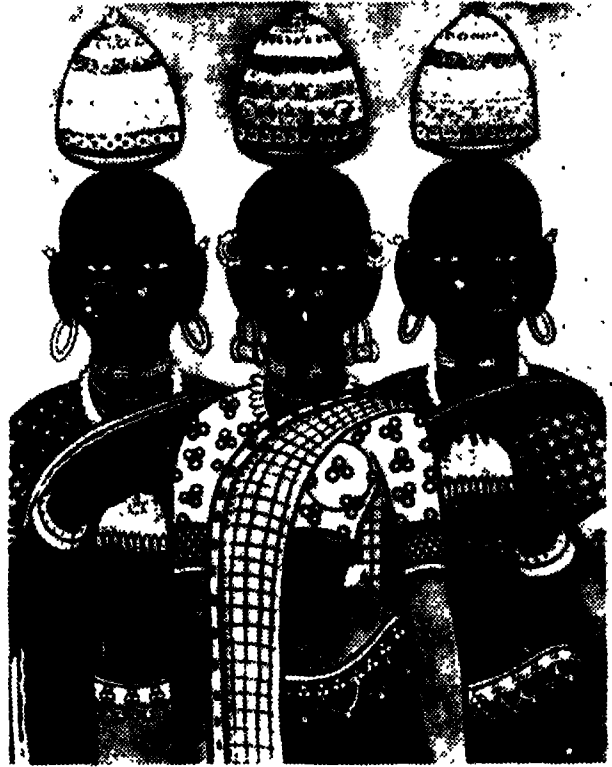
دیہاتی عورتیں

سے ڈرامائی اثر پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ اس کی مشہور تصویر پرومتھیس (Pro-matheas) سے ظاہر ہے۔ ستیش گجرال کے آرٹ میں سماجی حقیقت پرستی کا بڑا ہی پراثر اظہار ملتا ہے۔ برن ڈے نے بھی ڈرامائی تاثر کو اپنی تصویروں میں پیش کیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ہندوستانی مصور اپنے ثقافتی ورثے سے غافل ہیں۔ بلکہ انھوں نے نقالی کے بجائے اپنی تخلیقی قوت کو زیادہ اہمیت دی ہے اور زندہ روایات کی زیادہ قدر کی ہے مُردہ پرستی چھوڑ کر انھوں نے قدیم عناصر کو نئی بصیرت عطا کی ہے۔

جدید آرٹ کے نمائندہ فنکاروں میں شیلوج مکرجی، ستیش گجرال، کے۔ ہیبر، شوکشن چاوڈرا، رام کمار، شیلا آڈین، حسین، ایچ۔ رضا، بیندرے، آر۔ سی راول، کے۔ نواسلو، اے۔ اے۔ المیلکر، کلکرنی، سانیال، بھگت، کنول کرشن، برن ڈے، کرشن کھنہ، شانتی دیو، کنو دیسائی، سامنت، رام کنکر، سدھیر خاستگیر، ذکر کوشک ہکے۔ راٹھور، منارام وغیرہ شامل ہیں۔ شیلوج مکرجی ہماری زندگی کے جانے پہچانے موضوعات کو پیرس طرز فن میں پیش کرتا ہے۔ اس کے آرٹ میں ذہنی ماحول کی جاندار اور دل کو چھولینے والی عکاسی ملتی ہے۔ ہیبر میں رنگ روپ کی سادگی ہے۔ وہ بھی پیرس کے طرز فن سے متاثر ہے۔ چاوڈرا میں خطوط کے ذریعے تاثر کی گہرائی پیدا کرنے کی قوت ہے۔ اس نے روز مرہ کی زندگی کے عام مناظر کی تصویر کشی بڑی کامیابی سے پیش کی ہے۔ اس کے خطوط میں ہندوستانی رقص کی لے کا اثر ہے۔ شیلا آڈین پر بنگال کے لوک چتروں کا اثر ہے۔ نواسلو اندھرا کے نتر پور ضلع کے مندروں کی جداری نقاشی سے متاثر ہوا ہے۔ المیلکر نے ہندوستانی آرٹ کے مختلف روپوں بالخصوص مہاراشٹر کی روایت اور جنوب کے فن سے انسپریشن لیا ہے۔ مادھو ساتویلکر نے فطری خوشی اور جنون کو بڑے پر اثر انداز سے پیش کیا ہے۔ حسین نے امورت اشکال کی تخلیق کی ہے اس کی طرز دروں بین اور احساس عکاسی کا حامل ہے۔ منا کے آرٹ میں قدرتی دیہی اور شہری مناظر کی تصویر کشی بڑی خوبصورت ہے۔ وہ بمبئی کے جدید آرٹ کے نمائندہ مصوروں میں ہے۔ اس کی منظر کشی میں احساس اور نظری حقیقت کی آمیزش ہے۔ اس کے مناظر (Landscape) میں تفصیلات کی باریکیوں کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ اس نے رنگوں کی صداقت کو پا لیا ہے۔ اس کا فن منفرد رنگ لئے ہوئے ہے اور غیر روایتی ہے۔ اس نے ہندوستانی انسپریشن کو پیرس کے فارم میں پیش کیا ہے۔ ابھ کھٹاؤ کی تصویروں میں اوپیرا (Opera) کا سا انداز ہے۔ اس کی تمثیلوں میں موسیقی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لکشمن پائی کا آرٹ زندگی کی تمثیل ہے۔ روندر ناتھ دیو نے آرٹ میں کئی اہم تجربے کئے ہیں۔ وہ سرریلزم سے کافی متاثر ہوا ہے۔ بیندرے نے متوازن انداز میں خالص فن کو پا لینے کی کوشش کی ہے۔ رام کمار بہت سے دوسرے فنکاروں کی طرح پیرس

کے طرز فن سے متاثر ہے۔ اس نے جدید زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں کے رقت انگیز خاکے پیش کئے ہیں۔ یوگیش شکل نے چینی آرٹ کی رومانٹک اور شاعرانہ نقاشی کو اپنے فن میں شامل کیا ہے۔ گوردھن لال جوشی نے بھیلوں کی جاندار اور جذبات سے لبریز روزمرہ زندگی کو بڑے خوبصورت فارم میں پیش کیا ہے۔ مادھومین نے مناظر فطرت اور چرند اور پرند کے بڑے فنکارانہ نمونے پیش کئے ہیں۔ سامنت کے قدیم داستانوں کے علامات (symbols) کو یوروپی تکنک میں پیش کیا ہے۔ رام کنکر نے روایت سے آزاد ہو کر صداقت کی تلاش کی ہے اور فطرت کے جوہر کو پانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے آرٹ میں روح کی مسرت اور رقص و موسیقی کا آہنگ ملتا ہے۔ دوجین سین کے انسپریشن کا سرچشمہ عوام کی زندگی ہے۔ رنگوں کی گہرائی سے گہرے جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس کا نقطۂ نظر غور و فکر لئے ہوئے ہے۔ پرودمن تانا نے شبیہوں میں اندرونی آہنگ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہندوستانی چہروں کا بڑا حساس نقاش ہے۔ اس کے خیال میں آرٹ تخلیق نہیں، انسان کے اندرونی آہنگ کا ابلاغ ہے۔ راول کے فن میں خطوط اور فارم کا گہرا احساس ملتا ہے۔ ان میں فطری امیجری کو پیش کرنے کی قوت ہے۔ جمالیاتی تجربے کی کئی اہم تصویریں اس نے پیش کی ہیں۔ اس کے آرٹ میں آفاقی اپیل اور جاذبیت ہے۔ المیلکر نے ہندوستان کی سرزمین سے اپنے فن کا مواد اخذ کیا ہے اور اسے نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ منا رام مغرب کے بجائے چینی اور جاپانی طرزوں کو پسند کرتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں اس نے مخصوص ٹیکسچر (Texture) کا استعمال کیا ہے۔ پرولا جوشی میں اظہار کی بے پناہ قوت ہے۔ وہ فطرت کی دلدادہ ہے اور اسکے آرٹ میں مابعد التاثریت کے رجحانات کا اثر ہے۔ اسکا نظریہ ہے (Lure from within) اس ضمن میں لنکا کے ممتاز مصور جارج کیٹ کا ذکر ضروری ہے۔ اس کے آرٹ میں ہندوستانی آرٹ کا بھی جوہر ہے۔ وہ پکاسو سے متاثر ہے۔ اس نے لوک کلا اور دور وسطیٰ کی ہندوستانی بت تراشی سے فیضان حاصل کیا ہے۔

ہندوستان کے جدید فنکار اپنے فن میں ہندوستانی اور یورپین طرز فن کا فنکارانہ امتزاج پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جدید ہندوستانی آرٹ اشاراتی طور پر اثر انگیز ہے۔ لیکن ہر طرز فن پر مصور کی شخصیت کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ جدید آرٹ میں بال کلا کی سادگی، لوک کلا کی تازگی اور ابتدائی آرٹ کی قوت کا امتزاج ملتا ہے۔ بعض مصوروں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ زندگی کا شعور بچے کے ذہن کی سطح پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ نفسیات کے جدید نظریوں نے نئے آرٹ کو نئی حقیقتوں سے روشناس کرایا ہے۔ نئے فنکار ذہنی طور پر آزاد ہو کر شخصیت کے اظہار اور عمومی جذبات کی بجائے اپنے ذاتی احساسات کی عکاسی پر زور دیتے ہیں۔ اس لئے ان کے فن میں ابلاغ کی قوت کم ہے۔ لیکن انھوں نے گہرائی کو پالینے کی کوشش میں کافی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ رنگ، خط اور روپ میں اظہار اور طرز میں جدید ہندوستانی آرٹ قدیم آرٹ سے کم اور جدید یورپی آرٹ سے زیادہ قریب ہے۔ جدید دور کا ذہن آفاقی ہے اور جدید مصوری نئی ذہنی سطح پر تکمیل شخصیت کی تمثیل ہے۔ ہندوستان کا نیا فن نئے اقدار کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ جدید آرٹ نئے اور پرانے کی ابدی جد و جہد میں مبتلا ہے۔ جدید آرٹ اس جد و جہد کا احساس روعمل ہے اور مکمل زندگی پر اعتقاد رکھتا ہے جو اس کے تابندہ مستقبل کیلئے از حد ضروری ہے۔

✡

حدیثِ وطن

ملیتی صدیقی

مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من
مرے وطن کی سرزمیں جمیل و دلکش و حسیں
مرے وطن کا آسماں عظیم و عزم آفریں
یہ پرخلوص بستیاں، فلاح و خیر کی امیں
سکوں پسند و صلح جو، بلند ظرف و پاک بیں
یہ زر فروش کھیتیاں ستارہ خیز و خور جبیں
شگوفہ بار و گل چکاں نظر نواز و نازنیں
رواں دواں ہے چار سو فضا میں روح انگبیں
مذاق دید چاہیئے تجلیاں کہاں نہیں
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

مٹا مٹا سا ہے شب سیاہ کا ہر اک نشاں
اڑی اڑی سی ہیں اجل کی قوتوں کی دھجیاں
افق افق ہیں مریم سحر کی دلستانیاں
جہاں جہاں ہے زندگی کی دلبری کی داستاں
جفاکشی و تندہی کی معترف ہیں کھیتیاں
خلوص کار کی گواہ ہیں ملوں کی چمنیاں
اچھل رہے ہیں دیوتا مچل رہی ہیں دیویاں
ابل رہے ہیں زمزمے ہمک رہی ہیں مستیاں
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

یہیں پہ رام و لکشمن پٹے بڑھے جواں ہوئے
یہیں پہ نانک و کرشن و بدھ گہر فشاں ہوئے
یہیں پہ سور و تلسی و کبیر نغمہ خواں ہوئے
یہیں معین و وارث و نظام حق بیاں ہوئے
یہیں سلیم و صابر و کلیم نکتہ داں ہوئے
یہیں نظیر و میر و میرزا رباب جاں ہوئے
حقائق و بصائر و نظر کے ترجماں ہوئے
رسول زندگی ہوئے پیمبر زماں ہوئے
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

یہ سادھوؤں کی جنم بھوم، صوفیوں کا یہ وطن
تمدنوں کا مدرسہ ثقافتوں کی انجمن
یہ سبز پوش وادیاں حریف خطۂ ختن
یہ چشمہ ہائے جانفزا یہ گنگ اور یہ جمن
کہیں بہار مضطرب، کہیں شباب موج زن
لطافتیں روش روش۔ نفاستیں چمن چمن
یہ دلبرانِ شعلہ رو۔ سحر جمال و سیم تن
اشارتیں ادا ادا، عبارتیں سخن سخن
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

یہ کاشمر کی نزہتیں، ہمالیہ کی رفعتیں
یہ صبح و شام کاشی و اودھ کی ہماہمیتیں
یہ دہلی اور لکھنؤ کی یادگار عظمتیں
یہ ارض تاج کا علو، یہ سیکری کی شوکتیں
یہ پرشکوہ مقبرے، یہ ذی وقار تربتیں

یہ ... زیب باغیچے، یہ دلکشا عمارتیں
یہ ... زر کی بخششیں، یہ بحر و فن کی برکتیں
یہ عاشقی کے معجزے، یہ حسن کی کرامتیں
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

یہ امن کا پیامبر، یہ آشتی کا دیوتا
موافقت کا راہبر، مصالحت کا رہنما
یہ بے بسوں کا خیر خواہ بےکسوں کا ہمنوا
رفیقِ اہلِ یوروپ و انیس آل ایشیا
اٹھا تو لے کے دعوتِ نشاط و خرمی اٹھا
بڑھا تو ہمرا انتظام صلح و دوستی بڑھا
ملا تو سب سے عاجزی و انکسار سے ملا
رہا تو سب میں ہو کے سرفراز و سرخرو رہا
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

یہ فلسفے کا آستاں، حریم دانش و خبر
کہیں یہ اجتماعِ شب کہیں یہ محفل سحر
جنوں یہاں کا محترم خرد یہاں کی مقتدر
یہ باغ و بن یہ بحر و بر یہ کاخ و کوئے دشت و در
یہ گیانیوں کا آشرم یہ عارفانِ حق کا گھر
تلاوتیں نفس نفس۔ عبادتیں نظر نظر
یہاں کی خاکِ راہ بھی ہے طیش کیمیا اثر
یہ لالہ زار بیکراں، یہ ایک خلدِ مختصر
مرا وطن مرا وطن حیات و کائنات من

قدیم ہندوستان اور ایران کے سیاسی اور تہذیبی تعلقات — فردوسی اور فرشتہ کی نظر میں

(بسلسلہ صفحہ ۱۴)

ہاں نوعیت کا فرق ضرور ہو سکتا ہے۔ رستم کے ہندوستان آنے کا ذکر فرشتہ نے بھی کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ پنجاب کے ایک بڑے حصہ پر عرصہ تک اس کی حکمرانی بھی ثابت ہوتی ہے فرشتہ کے حوالے سے ہم نے سطور بالا میں بتایا ہے کہ سورج نامی راجہ رستم کی مدد سے حکمران ہوا تھا اور اس کا پایۂ تخت قنوج تھا۔ یہ راجہ بادشاہ ایران کیقباد کا معاصر تھا۔ اس نے اپنی بھانجی کی شادی رستم کے ساتھ کر دی تھی۔ رستم کا ہندوستان کے ایک راجہ کی لڑکی یا بھانجی سے شادی کرنے کا ذکر فردوسی نے بھی کیا ہے۔ فردوسی نے قنوج کے راجہ شنگل کے متعلق لکھا ہے کہ وہ افراسیاب کی مدد کے لئے ایران گیا تھا اور رستم سے مقابلہ کیا تھا۔ مگر فرشتہ نے لکھا ہے کہ شنگل نے افراسیاب کو باج دینا بند کیا تو افراسیاب نے اس کی سرکوبی کے لئے پہلے پیران دیسہ کو بھیجا، پھر ایک بڑے لشکر کے ساتھ خود ہندوستان آیا۔ شنگل کو شکست دی اور پھر اس کی جگہ دوسرا راجہ مقرر کر کے شنگل کو اس کی خواہش پر ایران لے گیا۔ غرض فردوسی اور فرشتہ کے بیانات میں یہ اختلافات ضرور پائے جاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں ہندوستان اور ایران میں اس قسم کے کچھ نہ کچھ تعلقات ضرور تھے۔ اب ضرورت اس بات کی معلوم ہوتی ہے کہ مورخ ان بیانات کو تاریخی کسوٹی پر پرکھیں اور دیکھیں کہ ان میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے۔

صنف مقالہ

سیّد محمد حسنین

زندگی میں باتوں کی کثرت ہے۔ یہاں افکار و عقاید اور نظریات و تصورات کا ایک بھاری میلا لگا ہے۔ مجھے اس بحث سے غرض نہیں کہ یہ میلا کب لگا، کس نے لگایا، اور کیسے لگایا؟ ــــ مگر یہ میلا بڑھتا ہی جاتا ہے اور لیل و نہار کی گردش کے ساتھ ہر لمحہ پھیلتا ہی جاتا ہے۔ انسان، ہر ذی شعور انسان کو اس میلے میں گھومنا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ ہر سمت اس کے قدم اٹھتے رہتے ہیں۔ اہم و غیر اہم مفید و غیر مفید اور عجیب و غریب بھانت بھانت چھوٹی بڑی باتوں کے انبار سے اس کی متجسس نگاہیں ٹکراتی پھرتی ہیں ــــ لیکن نگاہوں کی یہ آوارہ گردی احسن نہیں۔ انھیں ٹھہراؤ اور سکون کی حاجت ہے۔ پر وقت کم ہے۔ زندگی بے حد مختصر اور پیمانۂ فہم و فراست بھی محدود، انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ اتنی کثیر مجبوریوں کے ساتھ اس میلے کی سیر کر سکے۔

ایسے دشوار موقع پر مقالے ہمارے کام آتے ہیں۔ یہ ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ مقالوں کے ذریعہ افکار و عقائد اور نظریات و تصورات کو ہاتھ لگانا ممکن ہے۔ ان کے ذریعہ ادق سے ادق، بلند سے بلند اور نازک سے نازک باتوں کی گرہیں کھولی جا سکتی ہیں۔ ان کی مدد سے حیات کی کثرت، انتشار اور اضطراب سے نپٹنا آسان ہے۔ بات کی نوعیت حقیقت یا افادیت کی آگاہی، واقفیت یا پرکھ میں مقالے ہمارے کام آتے ہیں۔ اچھے اور بلند مقالے ہمارے ذہن کے بند دریچے کھول دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ شعری اور افسانوی اصناف بھی اس مقصد میں ہمارے کام آ سکتے ہیں۔ ان کے ذریعہ بھی مسائل حیات کو ہاتھ لگانا ممکن ہے۔ مگر ان سانچوں میں افکار و عقائد اور نظریات و تصورات کے بار گراں کو سمونا اور حسن و خوبی کے ساتھ سمونا ممکن نہیں۔

مقالہ مضمون کی ایک مہتم بالشان قسم ہے۔ عام زبان میں ہر بات یا خیال جو نثر میں پیش کر دیا جائے مضمون سے موسوم کر دیا جاتا ہے مگر وہ مقالہ نہیں کہا جا سکتا۔ مقالہ نگار ایک بھرپور علمی اور ادبی شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہ اہل قلم ہوتا ہے اور اہل بینش بھی۔ مقالہ میں کسی سنجیدہ بات یا خیال پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ ادب مختلف علوم فلسفہ اور سائنس کے کسی پہلو یا رخ پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ مثلاً آج روس کا اسپٹنک انسان کی ذہنی کاوش کا ایک سب سے حیرتناک اور جیتا جاگتا کرشمہ نظر آتا ہے ــــ ہم سے ہزاروں میل کی بلندی پر کرۂ ارض اور قمر کے درمیان انسان کا بنایا ہوا ایک مصنوعی چاند قدرت کے بنائے ہوئے دیگر اجسام فلکی کی طرح اپنے قائم کردہ مدار پر گردش کرتا رہا ہے۔ کتنی استعجاب انگیز اور عقل میں نہ سمانے والی بات ہے یہ۔ لیکن یہ بات ایک ٹھوس حقیقت ہے اور عقل کو اسے سمجھانا ضروری ہے۔

یہ کیسا چاند ہے؟ کس طرح یہ گردش کر رہا ہے؟ کون سی طاقت نے اسے زمین سے ہزاروں میل کی اونچائی پر پہنچا دیا؟ اس میں ایک ذی حیات مخلوق کیونکر زندہ رہی؟ بینائی سے روپوش ہو کر بھی کیوں کر یہ انسانی قوت مشاہدہ سے روپوش نہ ہو سکا؟ اس قسم کے سوالات، عقل میں نہ سمانے والے بے شمار سوالات ہمارے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں۔

ایسے موقع پر ایک سادہ سا علمی مقالہ ہماری آسودگی کا سبب

ہوتا ہے۔ طبیعیات، فلکیات اور دیگر متعلقہ سنجیدہ اور سائنٹفک مضامین کے پس منظر میں اس موضوع پر ایک مختصر سی تحریر انسان کے اس مصنوعی چاند کے تعارف کے لیے کافی ہوگی۔ اس تحریر کے مطالعہ سے ان سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جانا یقینی ہے۔ آپ خود غور کریں، اس نوع کی تحریر ہمارے لیے کتنی مفید ثابت ہوگی۔ ایک ناقابل فہم اور بے حد دشوار بات جو بے حد سنجیدہ بھی ہے، سنجیدگی کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ یہ مثال ایک علمی مقالہ کی تھی جس کی روح سائنس کے چند اونچے نکات سے معمور تھی۔ اسی طرح دیگر سنجیدہ امور بھی مقالوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ یہ ملک کا تیسرا پنج سالہ پلان ہو یا کالجوں میں جنسی تعلیم کی اہمیت، ڈی ڈی سی کے زرعی امکانات ہوں یا نظریۂ حیات بعد الموت، نالندہ کی ثقافتی زندگی کا ایک رخ ہو یا اشتراکیت میں انفرادی آزادی، یا اس قسم کی کوئی بات مقالوں کا موضوع ہو سکتی ہے۔ ایک ذی علم اہل قلم ان عنوانات پر سیر حاصل گفتگو و بحث کر سکتا ہے۔ اس کے مطالعہ میں جس قدر گہرائی اور وسعت ہوگی، اسی قدر مقالہ بصیرت افروز اور مفید ہوگا۔

علمیت مقالہ کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ مقالہ کا نفس کسی مخصوص بات یا خیال سے معمور ہوتا ہے۔ ایسی بات، خیال، مثلاً نکتہ یا پہلو جو ہماری ذات یا حیات سے بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق رکھتا ہے۔ جس کی جان پہچان اس چلتی پھرتی، بنتی اور بدلتی دنیا میں ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ ایسی خاص بات جس سے ہم میں فرزانگی اور تہذیب آتی ہے۔ اچھا مقالہ ایسا روشن چراغ ہے جس کا کام تاریک گوشہ میں اجالا پیدا کرنا اور پھیلانا ہے۔ مقالہ نگار کے مطالعہ میں وسعت اور پائداری ہوتی ہے۔ نفس تحریر پر مقالہ نگار کا جس قدر ذاتی مطالعہ اور اپنی نگاہ ہوگی مقالہ اسی قدر پر از معلومات، اثر بخش اور مفید ہوگا۔ یہی ایک کامیاب مقالہ کی شان ہے۔

اچھے اور کامیاب مقالہ سے ہم کچھ سیکھتے ہیں یا کچھ پاتے ہیں۔ ان مقالوں کی باتیں اپنے اثر و کیف کے بموجب مختلف وضع کی ہوتی ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مقالوں میں علمیت کی کئی نوعیتیں ہوتی ہیں۔ وہ مقالے جو سائنس یا علوم سے متعلق ہوتے ہیں وہ معلوماتی (Informative) مقالے کہلاتے ہیں۔ ان کا سب سے نمایاں جزو معلومات ہے، کیونکہ ان کا کام ہمارے دائرہ عمل کو کشادہ اور وسیع کرنا ہوتا ہے۔

مقالہ کی دوسری نوعیت تاثراتی (Impressionistic) ہوتی ہے۔ تاثراتی مقالے ہمیں ایسی باتوں سے واقف کراتے ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں، پر ذاتی طور سے پہچانتے نہیں اور جن سے ہماری علمیت میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ معلوماتی مقالے سے ہماری آنکھیں کھلتی ہیں، تاثراتی مقالے سے ہماری چشم دا کو قوت بینائی نصیب ہوتی ہے۔ معلوماتی مقالوں میں خارجیت ہوتی ہے تاثراتی مقالے میں داخلیت ہوتی ہے اور اس کی مقدار خارجیت سے دوگنی ہوتی ہے۔ معلوماتی مقالے ہمیں تعلیم یافتہ بناتے ہیں۔ علمی تاثراتی مقالے ہماری قوت ادراک کی نشو و نما کرتے ہیں۔

علمیت کی ایک نوعیت اور بھی ہے جو مقالوں کو فکری (Philosophical) بنا دیتی ہے۔ یعنی تحریر کا موضوع فلسفہ نہیں ہوتا مگر انداز تحریر فلسفیانہ ہوتا ہے۔ مقالہ نگار کی قلم کاری کسی دانائے راز کی نکتہ رسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ ایک ماہر نباض کی طرح حیات اور اس دکھتی رگوں پر اپنی رمز شناس انگلیاں رکھ دیتا ہے اور بے حد موثر انداز میں ان نازک کیفیات حیات کی ترجمانی کر دیتا ہے جو ستر حجابوں میں مستور ہوتی ہیں۔ فکری مقالے دراصل قیمتی دستاویزیں ہیں جن کے سمجھنے والے بھی خواص ہی ہو سکتے ہیں۔

مقالہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت سنجیدگی اور متانت ہے۔ نثری ادب کے تمام اصناف میں اس لحاظ سے اس کا وجود منفرد ہے۔ مقالہ نگار کسی امر پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ روشنی صاف و شفاف ہوتی ہے۔ نہ یہ نگاہوں کو بھٹکاتی ہے اور نہ یہ نظروں کو خیرہ کرتی ہے۔ اس کی براق شعاعیں نفس تحریر کے مختلف گوشوں کو منور و نمایاں کر دیتی ہیں۔ ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں اور ہمارا ذہن باتوں کے اتار چڑھاؤ اور خیالات کے پیچ و خم کا شکار ہوئے بغیر ہموار سبک روی کے ساتھ بات کی تہہ تک جا پہنچتا ہے۔ سنجیدگی اور متانت شروع سے اخیر تک ہماری ممد و معاون رہتی ہے

مقالہ نگاری میں قلم پر دل کا نہیں دماغ کا قبضہ رہتا ہے۔ مقالہ نگار خیالات و قیاسات کے گھوڑے نہیں دوڑاتا۔ اس کی قلم کاری نہ صنف

انشائیہ کی طرح ذہنی ترنگ ہوتی ہے اور نہ صنف کیفیہ کی طرح لطیف و رقیق تاثرات کی جولانی۔ یہ قلم کاری بے حد پرسکون ذہنی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مقالوں کو جذبات، 'شدت جذبات' سے اتنا ہی بیر ہے جتنا نظم کو انتشار خیال سے یا افسانہ کو کثرتِ واقعہ سے۔ مقصد کسی بات یا اس کی نوعیت، حقیقت یا افادیت کا بیان ہوتا ہے۔ اور موضوع کی تشریح، تفسیر، تقریظ یا تبصرہ یا تنقید میں 'جذباتیات' سے پرہیز لازمی ہے۔ پوری تحریر میں صرف ایک ہی رنگ اختیار کرنا اور ایک ہی وضع برتنا ہوتا ہے جو سنجیدگی اور متانت ہے۔ سنجیدگی سے قارئین کی توجہ میں بیداری اور استواری قائم رہتی ہے اور متانت سے ان کی فرزانگی یا خردمندی کو اعتماد حاصل ہوتا ہے۔

سنجیدگی یا سنجیدہ بیانی سے مقالہ نگار کے لب و لہجہ میں خطابت کا انداز بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ خطابت اور اچھی خطابت اپنے محدود مفاد کے لحاظ سے ایک لائق تحسین اور عمدہ وصف قرار دیا جاتا ہے۔ پر یہ خیالات کا ہنگامی اظہار ہے۔ صرف ہنگامی ہی نہیں یہ اظہار جذباتی بھی ہے۔ مقالہ میں جذباتی نگاری مناسب نہیں۔ اس کی آمیزش سے تحریر میں داخلیت تو آتی ہے پر اس کی شدّت و رقت سے مقالہ کی علمیت بے جان و بے نفس بھی ہو سکتی ہے۔ مقالہ معلوماتی ہو یا تاثراتی یا فکری، اس میں اگر علمیت کا جز معدوم ہے تو یہ نہ مشعل ہدایت بن سکتا ہے اور نہ خضر راہ۔ مقالہ نگار کو نہ آپ بیتی سے غرض ہے نہ جگ بیتی سے۔ جو وہ جانتا ہے اور جتنا جانتا ہے اسے الفاظ کے ذریعہ نہ جاننے والوں یا کم جاننے والوں تک پہنچا دیتا ہے۔

مقالہ نگار کی شخصیت کسی رطب اللسان خطیب کی نہیں ہوتی جو غرض خاص کے ساتھ برسر ممبر آتا ہے اور سامعین کو اپنی مسحور کن اور ولولہ انگیز تقریر سے اپنا ہم خیال و رفیق کار بنا لیتا ہے۔ اچھے مقالہ میں نہ چرب زبانی کا موقع ہے اور نہ بلاغت و فصاحت کی شان و شوکت کی گنجائش۔ یہ وہ انشار پردازی بھی نہیں جو خیالات کو خوش رنگ و پرتکلف مرصع تحریری جامہ میں ملبوس کر دیتی ہے۔ خطابت اور انشار پردازی دراصل زبان اور قلم کے کھیل ہیں۔ خطابت سے موثر اظہار خیال کی قدرت کا پتا چلتا ہے اور انشار پردازی سے تحریر میں ادبیت کی شان پیدا ہوتی ہے۔ غرض، مقالہ نگاری میں کسی جذباتی کیفیت کی تیزی مناسب نہیں ہے۔

دیانت و اخلاص۔ مقالہ نگار کوئی قصہ یا جذبہ سپرد قلم نہیں کرتا۔ اس کی شخصیت کا پہلا رخ ایک عالم یا مفکر کا ہوتا ہے۔ اس کا کام درخشانی علم یعنی (Enlightenment of Knowledge) ہے۔ مقالہ نثری ادب کی وہ مخصوص تحریر ہے جو قلم کار سے راست گفتاری کی توقع رکھتی ہے اور اس سے محنت، صبر اور سکون کی طالب ہوتی ہے۔ خیالات و افکار کی قلم بندی میں اسی لئے مقالہ نگار کو بڑی ذمہ داری کا پاس رکھنا ہوتا ہے۔ ایسی ذمہ داری جو براہ راست اس کی دیانت و اخلاص سے رابطہ رکھتی ہے۔

مقالہ نگار راست گفتاری اور بے نفسی کو اجزائے ایمان تصور کرتا ہے اور بخل و اغماز اور کذب و فریب کو ممنوعات شرعیہ قرار دیتا ہے جو ذہن کو باتوں کے پیچ و خم میں الجھانا یا مد و جزر کے ہچکولے لگانا وہ بدعت خیال کرتا ہے۔ الجھنوں کو سلجھانا اور گرہوں کو کھولنا اس کی دیانت و اخلاص کا تقاضہ ہے۔ اس کا ضمیر پاک ہوتا ہے اور بے لوث۔ وہ ظاہری آنکھوں سے چھپی اہم باتیں ہمیں بتاتا ہے۔ جتنا وہ جانتا ہے بتاتا ہے اور جو وہ جانتا ہے کہتا ہے۔ باتوں کے اظہار میں وہ کتر و بیونت کو بالکل ناجائز سمجھتا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر نہ کسی مسلک یا پالیسی کی چھاپ ہوتی ہے اور نہ اس کی تحریر کسی مطلب یا غرض کی آئینہ دار۔ راست گفتاری اور حق گوئی اس کی صفات ہیں۔

تنقیدی اور تحقیقی مقالوں میں خصوصاً دیانت اور اخلاص کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو مقالہ نگار کو کبھی تنگ نظری، جانب داری، عجلت پسندی اور تساہل سے محفوظ رکھتی ہے۔ تنقید میں مقالہ نگار موضوع پر حق کی روشنی ڈالتا ہے اور حسن و عیب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ محاسن و معائب کی عکاسی میں وہ کسی طرح کی رعایت و مروت کا خیال نہیں کرتا۔ وہ غیر جانب دار رہ کر بے لاگ اور دوٹوک باتیں کہتا ہے اور اس اعتماد و تیقن کے ساتھ کہتا ہے جو اس کی دیانت و اخلاص کے استحکام کی شہادت دیتی ہے۔ تنقیدی مقالے ہماری قوت تمیز و استدلال کی نشو و نما میں حصہ لیتے ہیں۔ ان سے ہماری قوت نقد کی بالیدگی ہوتی ہے۔ نگارشات 'فنی' اور معیاری نگارشات کی پرکھ میں اگر دیانت و اخلاص سے رابطہ نہ رکھا جائے تو تنقیدی قدروں کی تو

لازمی ہے۔

اسی طرح تحقیقی مقالے میں مقالہ نگار کا یہ فرض ہوتا ہے اور یہ اس کا اہم ترین فرض ہے کہ وہ اصلیت سے قریب ہو اور پڑھنے والوں کو بھی قریب لانے کی کوشش کرے۔ اپنے ثمرہائے تحقیقات کی پیشکش میں وہ نہ بخل و اخفا سے کام لے اور نہ کذب و فریب کی رنگ آمیزی سے انھیں نادر الوجود بنائے۔ تحقیقی مقالے بڑی کد و کاوش اور بے حد صبر و استقلال کا حاصل ہوتے ہیں اور حق بینی و راست گفتاری سے انکی قدروں میں پائیداری آتی ہے۔ تحقیقات اور ادبی تحقیقات کے سربلند روشن مینارے کمزور بنیاد پر تعمیر نہیں کئے جا سکتے۔ قیاس و مفروضات سے ان کو استادہ رکھنا حماقت ہے۔ سنی سنائی باتوں سے نہ ان کی بلندی میں اضافہ ممکن ہے اور نہ ناقص و اسفل مواد سے ان کی روشنی کو صاف رکھا جا سکتا ہے۔

اسلوب۔ شروع میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مقالہ نگار کی باتیں عموماً بلکہ بیشتر ادب سنجیدہ سے متعلق ہوتی ہیں، یعنی مقالوں میں زیادہ تر سائنس اور علوم یا ادب کے سنجیدہ امور و نکات پیش کئے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، یوں کہئے کہ اس صنف میں دل کا نہیں دماغ کا قبضہ رہتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی یہ قلم بے قابو ہو کر دل کے اشارے پر بھی چلنے لگتا ہے۔ اور یہ کوئی نقص نہیں۔ قلم کی یہ چال اس تحریر کے صنفی تقاضہ کا مظہر ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر تحریر میں جو ادب میں کوئی صنفی مرتبہ رکھتی ہے، خیال (idea) اور اظہار (expression) کی دو منزلیں ہوتی ہیں۔ صنف مقالہ میں پہلی منزل پر قلم کار کی شخصیت ایک عالم کی ہوتی ہے اور دوسری منزل پر ایک باشعور انشا پرداز کی۔ وہ صرف بلند و اعلیٰ ادق و ارفع سنجیدہ بات ہی نہیں کہتا بلکہ اسے عام فہم بنا کر قابل قبول بھی بنا دیتا ہے۔ یہ مقالوں کی صاف و رواں زبان اور دلنشین انداز بیان کا سبب ہے کہ ہم اس کی علمیت کو بغیر درد سر اور بڑی آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ مقالہ کے معلوماتی یا فکری عنصر کو اپنی علمی شخصیت کا ایک جزو بنا لیتے ہیں۔ اس طرح اساسی لحاظ سے مقالہ نگار کے لئے دو شرائط لازمی ہیں، اس کی عالمانہ شخصیت اور ادبی مزاج۔ اگر وہ کسی بات کو اچھی طرح جانتا ہے اور سمجھتا ہے اور اسے دوسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا سکتا ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔

اچھے اور مفید مقالوں میں ادبی رنگ و آہنگ کا وجود لازمی ہے۔ مقالہ نگار کے لئے انداز بیان میں فصاحت و سلاست سے واسطہ رکھنا شرط ہے، ایسی فصاحت جو نقش تحریر کے ہر پہلو کو مانند رخ تاباں دکھاتی ہو اور ایسی سلاست جو خیال اور الفاظ کو موصل کر دیتی ہو۔ اور اس کام کے لئے تھوڑی انشا پردازی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اعتدال کے ساتھ ورنہ قلم کا شتر بے مہار بن جانا عین ممکن ہے۔ مقالہ نگار کے لئے طریقۂ کلام یا اسلوب میں ادبی پیرایہ اختیار کرنا روا ہے پر تمثیلیہ نگار (allegory writer) کی طرح بحر رمز و کنایہ میں دل و دماغ کی غرقابی روا نہیں۔ اسے تشبیہ و استعارہ کی خوش رنگی کی اجازت ہے پر افکار و خیالات کو عروس تو جیسا سنوارنے کی اجازت نہیں۔ مقالہ میں جو باتیں قلم بند کی جائیں، صاف و روشن اور واضح ڈھنگ اور الفاظ میں پیش کی جائیں۔ قارئین کی نگاہوں کے سامنے نقش تحریر رواں رہے اور ذہن پر خیالات کا سایہ پڑنا چاہیئے۔

انشا پردازی کا سہارا لینے سے مقالہ نگار کا قلم کبھی کبھی دل کے قبضے میں چلا جاتا ہے اور اس کی چال میں ایک نمایاں اور ناگہانی تبدیلی آجاتی ہے۔ اس غیر سنجیدگی یا خوش خرامی کا لازمی نتیجہ تحریر میں کسی جذبی کیفیت کا نمود ہوتا ہے۔ خیال یا بات کی سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی کے باوجود مقالوں کے قالب سے گوناگوں رنگ کا شعاع شروع ہو جاتا ہے۔ تاثراتی اور فکری مقالوں میں یہ کیفیت اکثر و بیشتر نظر آتی ہے۔ اس نوع کے مقالوں میں طنز و طعن (satire and irony) یا رقت و اشتعال یا درد (Pathos) کے رنگ جھلک پڑتے ہیں۔ ان رنگوں سے مقالوں میں دل گیری آجاتی ہے اور ان کی اثر انگیزی و فکر خیزی میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ خصوصاً فکری مقالوں کی جذبی کیفیت ہماری وارفتگی سے مس ہو جاتی ہے۔ یہ ہمیں بات کی تہ تک پہنچا دیتی ہے کبھی کبھی تو یہ ہمارے شعور کی گہرائیوں تک کی خبر لے آتی ہے۔ ایسے مقالے صف اول کے مقالوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ان گراں قدر اور قیمتی دواؤں کا کام کرتے ہیں جو خوش نما، جاذب نظر رنگا رنگ کیپسوں (Capsules)

میں سر بلند ہوتی ہیں اور حلق سے اترتے ہی اپنا اثر دکھاتی ہیں
اختصار و جامعیت۔ اختصار و جامعیت مقالوں کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ یہ وہ تحریر نہیں ہوتی جو ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر سکے۔ مقالہ ایسی صنف ادب ہے جس کا پیمانہ مختصر ہوتا ہے۔ جس کا طول و عرض نہ سینکڑوں صفحات تک جاتا ہے اور نہ متعدد جلدوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ طویل مقالے مقالے نہیں رہتے یہ کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ ان کو پڑھنے اور سمجھنے میں زیادہ وقت اور زیادہ محنت درکار ہے۔

مقالہ نگار کے لئے طول بیانی سے احتراز لازمی ہے۔ اس کی باتیں جامع ہوتی ہیں۔ ان میں تسلسل معانی کا حسن و سلیقہ ہوتا ہے۔ مقالہ ادب کی وہ مختصر اور جامع تحریر ہے جو کم از کم وقت کی طالب ہوتی ہے اور اچھی سے اچھی بات یا خیال سے روشناس یا واقف کار کر دیتی ہے۔
تنوع۔ مقالوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا تنوع ہے۔ مسائل حیات کی کثرت اور خیالات و افکار کے انبوہ نے موضوع کے لحاظ سے صنف مقالہ کو بے حد کشادہ بنا دیا ہے۔ پڑھے لکھے افراد کی حیات اور مسائل حیات یا افکار و عقاید اور نظریات و تصورات سے لاعلمی خطرناک بلکہ مہلک ہے۔ ہر فرد کے لئے ان باتوں سے باخبری و آگہی لازمی ہے زمانہ اور اس کی چال نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم مختلف باتوں کو سمجھیں۔ انھیں سوچیں اور ان کے اچھے، مفید اور صحت مند اجزا کو اپنی انفرادی یا اجتماعی بقا کے لئے تجویز کریں۔ اس لحاظ سے مقالہ نگاری وقت کا تقاضا ہے۔ مقالہ نگار کیلئے کوئی حد بندی نہیں۔ وہ کوئی تاریخ [illegible] اصناف، سائنس اور اس کے شعبے، علوم اور اس کے مضامین [illegible] اس کے اصناف، غرض تہذیب و ثقافت کا ہر گوشہ اس کے لئے کھلا ہے۔ اگر وہ باتوں کو سمجھ سکتا ہے اور اپنی سمجھی بوجھی بات کو دوسروں تک اچھی طرح پہنچا سکتا ہے۔ اگر اسے باتوں کی پہچان اور پرکھ کی تمیز ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

اس تنوع اور وسعت نے مقالوں کو خیال یا بات کی نوعیت کے بموجب مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفس تحریر کے بموجب مختلف مقالے مختلف گروپ میں داخل ہیں مثلاً ادبی مقالے یعنی وہ سنجیدہ تحریریں جو ادب، شاعری، تنقید، تحقیق وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ علمی مقالے، یعنی وہ سنجیدہ تحریریں جو تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، نفسیات، اقتصادیات وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ سائنٹفک مقالے، یعنی وہ سنجیدہ تحریریں جو اضافیات، کیمیات، حیاتیات، فلکیات سے تعلق رکھتی ہیں۔

مقالوں کی مقبولیت اور مقالہ نگاری کے فروغ کا ایک اہم سبب جرائد و رسائل ہیں۔ طباعت و اشاعت کی جدید سہولت نے اس صنف ادب کی نشوونما میں بڑا حصہ لیا ہے۔

مشکلاتِ عروض

شعور بریلوی

دسمبر ۵۹ء کے ماہنامہ نیا دور میں اشفاق علی خاں صاحب شاہجہاں پوری کا ایک مضمون "عروضی مغالطے" شائع ہوا ہے جس میں رشید حسن خاں صاحب شاہجہاں پوری کے مضمون "چند عروضی غلطیاں" مطبوعہ نیا دور ماہ جون ۵۹ء پر کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اشفاق علی خاں صاحب موصوف کا مضمون اُن کی نکات فن سے کما حقہ، واقفیت کا روشن ثبوت ہے۔ مگر موصوف بعض مقامات پر بعض عروضی مسائل کی وضاحت فرماتے ہوئے کچھ اس طرح اُلجھ گئے ہیں کہ اپنے پیش کردہ اُصولوں کی تفصیلات و تشریحات کو ناقابل فہم اور ناقابل قبول بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں فن عروض کی متعدد کتب عروض سیفی، بیان عروض مشمولۂ غیاث اللغات، بحر الفصاحت مصنفۂ نجم الغنی خاں صاحب، اور حدائق البلاغت کو مبتدیانہ اور غیر معتبر کہہ دینے میں جس دریا دلی اور عجلت سے کام لیا ہے اس میں، اصلیت سے کہیں زیادہ جذبات کارفرما نظر آتے ہیں۔

کوئی شبہ نہیں، کہ ان کتابوں میں غلطیاں موجود ہیں، مگر ان کے باوجود ان کو مبتدیانہ اور یکسر ناقابلِ اعتبار کہہ دینا، مضمون نگار کی زیادتی ہے۔ صاحب بحر الفصاحت نے علم العروض و علم البیان اور صنائع و بدائع پر بارہ سو چودہ صفحات میں جو تفصیلی و تشریحی اور سیر حاصل بحث کی ہے اُسے یقیناً عالمانہ بحث کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو کی یہ تمام کتابیں عربی و فارسی کی مستند ترین کُتب عروض ہی کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں۔ پھر بھی اگر ان میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں تو انھیں سہو کتابت کہا جا سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ بعض جگہ فن عروض کے بعض اُصولوں کو غلط سمجھ لینے کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے جن کی اصلاح ارباب نظر کے لئے کوئی زیادہ مشکل امر نہیں۔ لیکن اس قسم کی چند غلطیوں کی پاداش میں ان کتب کے مصنفین کے علم و فضل پر پانی پھیر دینا اور ان کتابوں کو مبتدیانہ ناقابل اعتبار اور ناقص قرار دیدینا قرینِ انصاف نہیں اب میں اشفاق علی خاں صاحب کے بعض اعتراضات کا ذکر کرونگا۔

اشفاق علی خاں صاحب، رشید حسن خاں صاحب کے پیش کردہ ایک وزن "فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن" پر جس کو رشید حسن خاں صاحب نے بحر ہزج مثمن اشتر ظاہر کیا ہے، یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اس وزن کو بحر ہزج مثمن اشتر کہنے کا یہ مطلب ہوا کہ دونوں "فاعلن" اشتر اور دونوں "مفاعیلن" سالم ہیں حالانکہ دوسرا "فاعلن" اشتر ہے" نہ پہلا "مفاعیلن" سالم۔" ان کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ "اشتر" خرم اور قبض دو زحافوں کا مجموعہ ہے۔ خرم صدر و ابتدا کے لئے مخصوص ہے حشو یا عروض و ضرب میں نہیں آتا۔ اس لئے "اشتر" بھی صدر و ابتدا میں آتا ہے۔ حشو یا عروض و ضرب اس کی سرحد سے باہر ہیں۔ اسی طرح پہلا "مفاعیلن" مزاحف ہے اور دوسرا سالم ہے۔" فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن"

اصل میں بحر ہزج مثمن اشتر، مکفوف، مقبوض مجبق ہے۔ جس میں پہلا مفاعیلن شتر کے عمل سے فاعلن، اور دوسرا "مفاعیلن" کف کے عمل سے "مفاعیلُ" اور تیسرا "مفاعیلن" قبض و تجبیق کے عمل سے "فاعلن" اور چوتھا "مفاعیلن" سالم ہے۔ اس طرح پہلا فاعلن اشتر اور دوسرا مفاعیلُ مکفوف تیسرا فاعلن مقبوض مجبق اور چوتھا مفاعیلن سالم ہے۔

میری رائے میں جس طرح رشید حسن خانصاحب نے اپنے مضمون "چند عروضی غلطیاں" میں ضابطۂ تقطیع کے سلسلے میں تحریک ساکن کے متعلق اپنا ذاتی نظریہ پیش کرکے اصول تقطیع میں انقلاب پیدا کرنے کی جو صورت اختیار کی تھی بالکل اسی طرح اشفاق علی خانصاحب نے بھی بحر ہزج میں زحاف تجبیق کا عمل روا رکھ کر "زحاف" کی عروضی تعریف کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کی بھرپور کوشش فرمائی ہے۔

زحاف شتر کے متعلق اشفاق علی خاں صاحب کا یہ فرمانا کہ وہ دو زحافات خرم و قبض کا مجموعہ ہے۔ یقیناً صحیح ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ "شتر" میں خرم کا عمل شامل ہونے کی وجہ سے "شتر" پر صدر و ابتدا میں استعمال ہونے کی تخصیص عائد ہوتی ہے اس لئے کہ "شتر" پر قبض کو بھی اتنا ہی حق پہنچتا ہے جتنا کہ خرم کو۔ خرم اگر صدر و ابتدا سے تعلق رکھتا ہے تو قبض ایسا زحاف ہے جو شعر کے ہر حصے میں استعمال ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں "شتر" کو کسی ایک زحاف کی تخصیص کا پابند نہیں سمجھا جا سکتا۔ صحیح یہ ہے کہ "شتر" خود ایک علٰحدہ زحاف ہے اور وہ خرم یا قبض کا پابند نہیں بلکہ خود خرم و قبض اس کے پابند ہیں۔ "شتر" کی تعریف یہی ہے کہ اس کے حکم سے رکن "مفاعیلن" پر خرم و قبض اپنا اپنا عمل کرتے ہیں۔ خرم اپنے عمل سے "مفا" کا (میم) اور قبض اپنے عمل سے "عیلن" کی (ی) گرا دیں گے اس عمل کے بعد رکن کی شکل "فاعلن" ہو جائے گی جس کو مفاعیلن کی "اشتر" فرع کہیں گے اس پر خرم یا قبض کی کوئی پابندی عائد نہ ہوگی بلکہ "شتر" خود اُن مخصوص زحافات میں ہے جو صدر و ابتدا سے مختص ہیں۔ یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ "شتر" پر صدر و ابتدا کے لئے مخصوص ہونے کی پابندی صرف اس لئے ہے کہ چونکہ اس کے عمل میں خرم کا عمل بھی شامل ہے، بلکہ شتر کو ان مخصوص زحافات میں سمجھنا چاہیئے جو صدر و ابتدا کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔

شتر کے علاوہ بھی متعدد زحافات ایسے ہیں جن کا عمل دو دو زحافات کے مشترک عمل کے برابر ہے اور ان میں خرم کا عمل بھی شامل ہے مگر خرم کے عمل کی شمولیت کے باوجود بھی اُن مخصوص زحافات کی فہرست میں نہیں ہیں جو صدر و ابتدا کے لئے مقرر کئے گئے ہیں مثلاً عَقَص خود ایک ایسا زحاف ہے جس کا عمل خرم و نَقص کے مشترک عمل کے برابر ہے قَصم بھی ایسا ہی زحاف ہے جس کا عمل خرم و عَصَب کے مشترک عمل کے برابر ہے۔ اسی طرح زَلَل بھی ایک ایسا زحاف ہے جس کا عمل خرم و ہتم کے مشترک عمل کے برابر ہے۔ اگر شتر میں خرم کے عمل کی شمولیت، شتر کو صدر و ابتدا کے لئے مخصوص کر سکتی ہے، تو مذکورہ بالا زحافات عَقَص، قَصم اور زَلَل پر بھی یہ پابندی ہو جانا چاہیئے تھی مگر ایسا نہیں ہے۔

اس کے علاوہ، وزن "فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن" کو اشفاق علی خانصاحب نے بحر ہزج مثمن اشتر، مکفوف، مقبوض مجبق، سالم الآخر ظاہر کرنے کی جو توضیح فرمائی ہے اس کے تحت، پہلے (فاعلن) کو اشتر دوسرے (مفاعیلن) کو مکفوف اور تیسرے (فاعلن) کو مقبوض مجبق، اور چوتھے (مفاعیلن) کو سالم قرار دیا ہے۔ بلا شبہ پہلا فاعلن اشتر اور چوتھا (مفاعیلن) سالم ہے۔ لیکن دوسرے رکن (مفاعیلن) کو مکفوف اور تیسرے رکن (فاعلن) کو مقبوض مجبق سمجھنے اور ماننے میں تکلف ہو سکتا ہے۔

اشفاق علی خانصاحب نے اس سلسلے میں زحاف تجبیق یا (تخبیق) کے عمل کی جو تعریف ظاہر کی ہے وہ بالکل درست ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی ایسے وتد مجموع اول سے پہلے حرف متحرک آجانے سے تین حرکتیں متوالی آجائیں جو صدر و ابتدا میں نہ ہو تو وتد مجموع کے پہلے حرف کو قطع کرکے ساکن کر دے اور اسے پہلے متحرک میں شامل کر دے۔ چنانچہ اس وزن میں دوسرے رکن "مفاعیلن" پر پہلے کف نے عمل کیا اور اپنے عمل سے رکن کے ساتویں حرف کو گرا دیا اور رکن کی شکل (مفاعیلُ) بضم لام باقی رہی جس کو رکن کی مکفوف فرع کہیں گے اور تیسرے رکن "مفاعیلن" پر پہلے قبض نے عمل کیا اور اپنے عمل سے رکن کا پانچواں حرف جو سبب خفیف کا ساکن ہوتا ہے گرا دیا یعنی رکن سے (ی) گر گئی اور رکن کی شکل (مفاعلن) باقی رہی

جس کو رکن کی مقبوض فرع کہیں گے اب اس مقبوض شکل پر تجبیق نے اپنا عمل کیا [illegible] اپنے عمل سے تیسرے مقبوض رکن (مفاعلن) کا (میم) قطع کر کے [illegible] ساکن کر دیا اور دوسرے رکن مکفوف (مفاعیلُ) کے (لام) متحرک سے ملا دیا اور اس طرح تجبیق نے اپنے عمل سے دوسرے مکفوف رکن (مفاعیلُ) کو مفاعیلم اور تیسرے مقبوض رکن (مفاعلن) کو فاعلن بنا دیا۔ مفاعیلم چونکہ مستعمل رکن نہیں ہے، لہذا دوسرے ہموزن مستعمل رکن (مفاعیلن) سے بدل لیا۔)

لیکن یہاں دو باتیں محل غور ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ "مفاعیلن" کی مکفوف شکل مفاعیلُ ہے۔ مفاعیلُ کے بجائے (مفاعیلن) مزاحف کو مکفوف کہنا قرین قیاس نہیں۔ بلکہ جس طرح تیسرے رکن (مفاعلن) مقبوض کو تجبیق کے عمل نے (فاعلن) بنایا اور اس فاعلن کو مقبوض مجبق کہا گیا۔ تو اسی طرح دوسرے رکن (مفاعیلُ) مکفوف کو بھی تجبیق کے عمل نے (مفاعیلم) بنایا جسکو (مفاعیلن) سے بدلا گیا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایسی شکل میں ہم اس مزاحف (مفاعیلن) کو مکفوف مجبق نہ کہیں صرف مکفوف کہنا صحیح نہ ہوگا۔

دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ زحاف تجبیق بحر ہزج کے متعلقہ زحافات سے تعلق نہیں رکھتا۔ جس طرح زحاف "تسکین" جو کسی بحر سے مخصوص نہیں سمجھا جاتا بلکہ تین متحرک متوالی آ جانے کی شکل میں ہر جگہ استعمال ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح زحاف "تجبیق" [illegible] مجموع اول سے پہلے متحرک آ جانے کے سبب تین متحرک [illegible] جمع ہو جانے کی شکل میں ہر جگہ استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن محقق [illegible] ایسے زحافات کے لئے یہ کلیہ بنا دیا ہے کہ اس قسم کا زحاف کسی ایسے رکن پر استعمال نہ کیا جائے گا جس کے عمل سے وزن کی شکل دوسری بحر کے وزن کے مطابق ہو جائے۔ اس جگہ "تجبیق" کا عمل، اصل رکن اور اس کی فرع میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھتا بلکہ اصل رکن کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو زحاف کی تعریف کے منافی ہے۔ زحاف کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے عمل سے متعلقہ رکن کی اصل میں فرق پیدا کر دے یعنی شکل تبدیل کر دے۔

ظاہر ہے کہ بحر ہزج کا اصل رکن "مفاعیلن" ہے۔ چنانچہ اس رکن کی مزاحف شکل کبھی بھی زحاف کے عمل کے بعد اپنے اصل رکن کی ہیئت اختیار نہیں کر سکتی۔ اگر بحر ہزج میں زحاف "تجبیق" کے عمل کو روا رکھا جائے گا، تو زحاف کی تعریف کو بھی بدلنا ہوگا۔ جب تک زحاف کی موجودہ تعریف ہمارے پیش نظر ہے، بحر ہزج میں زحاف "تجبیق" کا عمل، زحاف کی تعریف کا مقصد فوت ہو جانے کے مترادف ہوگا۔ اس جگہ "تجبیق" کا عمل یقیناً غور طلب ہے۔ عروضی ضابطہ کے تحت اصل رکن اور اس کی فرع کی صورت ہیئت میں امتیازی فرق ہونا امر مسلّم ہے۔

رشید حسن خاں صاحب نے اپنے مضمون میں نشورؔ صاحب کی غزل کے ایک مصرع ؎ "جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی" کا وزن (فاعلن مفاعلن فاعلن مفاعلن) قرار دے کر اس کی بحر کا نام بحر ہزج مثمن اشتر، مقبوض ظاہر کیا ہے۔

اشفاق علی خاں صاحب اس پر بھی معترض ہیں اعتراض یہ ہے کہ "........ یہاں پھر وہی غلطی کی ہے کہ حشو کے پہلے فاعلن کو بھی اشتر کہہ دیا ہے۔ حالانکہ اشتر صدر و ابتدا کا رکن ہو سکتا ہے حشو کا نہیں۔ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ اس کو مثمن کے بجائے مشطور (مربع) کہا جائے یعنی فاعلن مفاعلن" کا ایک مصرعہ مثلاً اس صورت میں نشورؔ کا یہ مصرعہ ایک شعر سمجھا جائے گا۔ (جب کوئی سنور گیا؎ زندگی سنور گئی) اس طرح حشو کے "اشتر" ہونے کا عیب دور ہو جائے گا اور بحر ہزج مشطور (مربع) ہوگی۔ بحر ہزج کی اصل، دائرہ میں فارسی اور اردو عروض کے لحاظ سے مثمن ہے یعنی آٹھ بار مگر مشطور بھی آتی ہے۔ بحر ہزج کو وافی کے بجائے مشطور استعمال کرنا جائز ہے۔ اگر اس وزن کو مثمن استعمال کرنا چاہیں، جیسا کہ نشورؔ کی غزل میں ہے، تو اس صورت میں اس وزن کو مشطور اشتر مقبوض کا مضاعف کہنا چاہیئے۔ مضاعف المشطور کہنے کی صورت میں دونوں فاعلن جو اشتر ہیں بدستور صدر و ابتدا کے برابر رہیں گے اور دونوں مفاعلن جو مقبوض ہیں عروض و ضرب کے برابر رہیں گے لیکن فنی احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اس وزن کو مضاعف المشطور کے بجائے صرف مشطور کی شکل میں استعمال کیا جائے۔ نشورؔ صاحب کے مصرعے کے وزن کو مثمن اشتر مقبوض لکھنا بالکل غلط ہے اور فنی لاعلمی کا ثبوت ہے۔"

اشفاق علی خاں صاحب کا یہ اعتراض، اعتراض برائے اعتراض

کے مصداق یہ ظاہر ہے کہ نشور صاحب کی غزل موجودہ صورت میں مشطور (مربع) کی شکل نہیں رکھتی۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے کہ ہم اس وزن کو اشفاق علی خاں صاحب کے مشورے کے مطابق "بحر ہزج مضاعف المشطور اشتر مقبوض" ہی صحیح مان لیتے، مگر موصوف نے خود ہی یہ ظاہر کر کے کہ "......... فنی احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اس وزن کو مضاعف المشطور کے بجائے صرف مشطور کی شکل میں استعمال کیا جائے۔" نہ صرف اپنے مشورے کی تردید فرمائی ہے بلکہ اس وزن کے تعین بحر کو ناقابل حل معمہ بنا دیا ہے۔

فاضل مضمون نگار کے نزدیک اس وزن کو بحر ہزج مثمن اشتر مقبوض سمجھنا غلطی ہی نہیں بلکہ فنی لاعلمی کا ثبوت پیش کرنا ہے اور اتفاق سے نشور صاحب کی غزل بشکل موجودہ مشطور (مربع) کی صورت میں پیش نہیں کی جا سکتی، اس لئے موصوف کے مشورے کے مطابق مضاعف المشطور ہی ایسی شکل تھی جس کو نشور صاحب کے مصرعے کی صحیح بحر قرار دیا جا سکتا تھا مگر وہ خود موصوف کے ارشاد کے تحت فنی احتیاط کے خلاف ٹھہرا دی گئی۔ اس پوری بحث کا جائزہ لینے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رشید حسن خاں صاحب نے اس وزن کی جو بحر قائم فرمائی ہے وہ تو غلط ہے ہی مگر اشفاق علی خاں صاحب بھی اس وزن کی کوئی ایسی بحر قائم نہ فرما سکے۔ جو ضابطہ عروض کی پابندیوں کے ساتھ ان کی نظر میں مناسب ہوتی۔

میرے خیال سے موصوف کو بحر ہزج کا پیچھا چھوڑ کر کسی دوسری بحر میں اس وزن کی گنجائش تلاش کرنا چاہئیے۔ میں اس سلسلے میں فی الوقت دو ایسی مختلف بحور پیش کرتا ہوں جن سے ایسی جملہ غزلوں کا صحیح وزن اور صحیح بحر قائم کرنے میں کوئی فنی دشواری نہ ہوگی۔ ایک تو بحر رجز مثمن سالم جس کے ارکان "مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن" ایک شعر میں دو بار آتے ہیں۔ اس کے متعلقہ زحافات میں سے دو زحافات "رفع" اور "خبن" کو استعمال کر کے دیکھئے۔ رفع کا فعل یہ ہے کہ جب دو سبب خفیف متوالی آ جائیں تو ایک سبب خفیف کو ساقط کر دے۔ اگر "مستفعلن" سے اس کا ایک سبب خفیف "مس" ساقط کر دیا جائے تو رکن کی شکل باقی رہے گی "تفعلن" جس کو حسب قاعدہ عروض "فاعلن" سے بدلیں اس طرح رکن "مستفعلن" کی فرع "فاعلن" مرفوع ہوگی۔ خبن کا فعل یہ ہے کہ وہ رکن متعلقہ کے سبب خفیف اوّل کے حرف ساکن دوئم کو گرا دیتا ہے چنانچہ "مستفعلن" سے سبب خفیف اوّل کے حرف ساکن دوئم یعنی "مس" کے (س) کو ساقط کر دیں تو رکن کی شکل باقی رہے گی۔ "متفعلن" اور اس کو بھی ضابطۂ عروض کے تحت اس کے ہم وزن مستعمل رکن "مفاعلن" سے بدل لیں تو اس مزاحف شکل "مفاعلن" کو مخبون کہیں گے اور اس طرح وزن قرار پائے گا (فاعلن مفاعلن فاعلن مفاعلن) اور بحر کا نام "بحر رجز مثمن مرفوع مخبون" ہوگا اور اس میں کوئی فنی قباحت بھی نہ ہوگی۔ دوسری بحر "مدید مثمن سالم" ہے جس کے ارکان ہیں (فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن) اس میں صرف ایک زحاف کف کو استعمال کر کے دیکھ لیجئے۔ کف کا فعل یہ ہے کہ اپنے رکن متعلقہ کے ساتویں حرف کو جو سبب خفیف کا ساکن ہو گرا دے۔ چنانچہ "فاعلاتن" کا (ن) گرا دیا جائے تو رکن کی شکل (فاعلاتُ بضم (ت) باقی رہے گی اور "فاعلاتُ" [rukn] "فاعلاتن" کی مکفوف فرع کہلائے گی اس طرح وزن ہو جائے گا (فاعلاتُ فاعلن فاعلاتُ فاعلن) جو زیر بحث مصرعے کا صحیح وزن ہوگا اور بحر کا نام "بحر مدید مثمن مکفوف" ہوگا۔ یہ عمل بھی کسی طرح فنی احتیاط کے خلاف نہ ہوگا۔

اشفاق علی خاں صاحب نے تحریک ساکن اور اسقاط ساکن کے متعلق جو پانچ قاعدے پیش فرمائے ہیں وہ قاعدے صحیح تو ہیں لیکن ان کے سمجھانے میں بہت الجھاؤ پیدا کر دیا گیا ہے۔ اسقاط ساکن کے مقامات سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جب کسی لفظ میں تین ساکن پے در پے جمع ہو جائیں تو تیسرے ساکن کو ساقط کر دیتے ہیں۔ جیسے دوست یا پوست وغیرہ میں (ت) ساقط ہو جاتی ہے۔

ایک غیر طرحی مشاعرہ

یوم جمہوریت کی تقریبات کے سلسلہ میں دفتر کمشنر لکھنؤ ڈویژن کے زیر اہتمام چھوٹی چھتر منزل میں [illegible]ر فروری کو ایک غیر طرحی مشاعرہ زیر صدارت شری سلطان عالم خاں ڈپٹی منسٹر پلاننگ، حکومت اترپردیش منعقد ہوا جسکا انتخاب مندرجہ ذیل ہے ہمیں افسوس ہے کہ گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے مکمل غزلیں نہیں شائع کر سکتے۔ ترتیب شعرائے کرام کے تخلص کے حروف تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ اڈیٹر

امتیاز ادیب

بہک رہے تھے تو حاصل تھا اک وقار جنوں
سنبھل گئے تو جنوں کے وقار سے بھی گئے

کچھ اپنی ذات سے وابستہ ہی تھے الزامات
کچھ ان کی بزم میں ہم شرمسار سے بھی گئے

امین سلونوی

ڈھل رہی ہے شراب آنکھوں سے
پی رہا ہوں گلاب آنکھوں سے

اپنے اظہار آرزو کی قسم
مل رہا ہے جواب آنکھوں سے

آج وہ بے نقاب آئے ہیں
لوٹ لوں یہ ثواب آنکھوں سے

اندر ناتھ سکینہ

مستقل جیب دردِ دل اور گریۂ پیہم رہے
چین کی صورت کہاں سے مجھ کو شام غم رہے

مجھ کو رحمت پر بھروسہ شیخ کو طاعت پر ناز
وہ رہے مسجد کے اندر میکدے میں ہم رہے

رشید فیض آبادی

اسی زندگی پہ غرور ہے جو رہین مہر و کرم ہوئی
کوئی زندگی ہے وہ زندگی جو قدم پہ فیر کے ختم ہوئی

نہ سکوں ملا نہ قرار ہے، مری زندگی کا یہ حال ہے
کبھی میکدے میں بسر ہوئی کبھی صرف دیر و حرم ہوئی

ساحر لکھنوی

اب تو ان تاروں کو بھی نیند آ گئی
جو شریک شام ہجراں تھے کبھی

ایک تیرے دم سے اے ذوق جنوں
کتنے ویرانے گلستاں تھے کبھی

سروش طباطبائی

موڑا ہے ہم نے وقت کا دھارا کبھی کبھی
طوفاں کو کر دیا ہے کنارا کبھی کبھی

غم کی قسم، کہ تیری نگاہ کرم کے بعد
غم ہو گیا ہے اور بھی پیارا کبھی کبھی

اس چشم بے نیاز سے آنسو گرا لیا
توڑا ہے ہم نے عرش کا تارا کبھی کبھی

شارب لکھنوی

دیوانے کو کیوں دنیا پہناتی ہے زنجیریں
کیا زلفِ جنوں ساماں زنجیر نہیں ہوتی
نشتر ہے کہ مرہم ہے شعلہ ہے کہ شبنم ہے
کچھ دردِ محبت کی تفسیر نہیں ہوتی

شایاں رام پوری

وجد میں جام و سبو رقص میں پیمانہ ہے
منتظر کس کی اب اے لغزشِ مستانہ ہے
کوئی شیشہ ہے نہ ساغر ہے نہ پیمانہ ہے
جس جگہ تو نظر آئے وہی میخانہ ہے

شعور بریلوی

گماں یہ تھا کہ بہل جاؤں گا ترے غم سے
ستم یہ ہے کہ ترا غم بھی سازگار نہیں
چمن کی تازہ بہاروں سے کھیلنے والو
یہ رنگِ خونِ تمنا ہے لالہ زار نہیں

ابوالفضل شمس لکھنوی

فلک پہ تارے ہیں محفل میں شمعیں طور پہ برق
مگر چراغ نکے قابل مرا مزار نہیں
ہے دردِ دل میں ابھی حالِ دردِ دل نہ سنو
مجھے تھمے ہوئے اشکوں کا اعتبار نہیں
نہ لگنے پائے ہوائے چمن اسیروں کو
جنوں پسند مزاجوں کا اعتبار نہیں

طیش لکھنوی

کیا روزِ ازل شمع سے اقرار ہوا تھا
جلتا ہے سرِ بزم جو پروانہ ابھی تک
یہ سالگرہ ہے مری توبہ شکنی کی
اور بند ہے ساقی درِ میخانہ ابھی تک

عادل لکھنوی

دوست کیوں پرسشِ پیہم ہے کوئی بات نہیں
بس یونہی آنکھ مری نم ہے کوئی بات نہیں
میرے رونے پہ جو وہ ہنستے ہیں تو ہنسنے دو
یہ تو رسمِ گل و شبنم ہے کوئی بات نہیں

عرشی لکھنوی

شمس و قمر کو ہی نہ سمجھو نتہائے دید
ہیں جنتِ نگاہ نظارے کچھ اور بھی
کیوں نرگسِ بتاں ہی سے الجھی رہے نگاہ
ہیں زیست کے حسین اشارے کچھ اور بھی

عشرت لکھنوی

دولت کی تمنا تو رکھتا ہے ہر اک انساں
ہے کون یہاں ایسا مجبور سے غم لے لے
میخانے کے میخانے تھے میرے اشارے پر
اک بوند کبھی پی ہو تو مجھ سے قسم لے لے

عمر انصاری

تیری یادوں کی گھنی چھاؤں جہاں پاتی ہے
دو گھڑی گردشِ دوراں بھی ٹھہر جاتی ہے
زندگی نام تھا جس کا کوئی شے تھی تو ضرور
یاد کرتا ہوں مگر یاد نہیں آتی ہے
ہو نہ ہو تم سے جہاں کو کوئی نسبت ہے ضرور
تم سنورتے ہو تو ہر چیز سنور جاتی ہے

سید فاضل حسین فاضل

نو شگفتہ گل کی شاخوں سے بجائے کنجِ قفس
گر خیالِ بے زفشانی بھی کبھی آیا مجھے
باغِ عالم میں بہار آئی ہے شاید ہم سفر
ہر دم آتا ہے خیالِ وحشتِ صحرا مجھے

فضل الرحمٰن فضلی

عہدِ فصلِ بہار آ جائے
پھر گلوں پر نکھار آ جائے
آپ دیکھیں جو مسکرا کے مجھے
میرے دل کو قرار آ جائے

فیروز نظامی

نظارے کی چاندنی سمٹ جائیگی
کشتی مرے ارماں کی پلٹ جائے گی
کاجل ذرا آہستہ لگا آنکھوں میں
ڈرتا ہوں کہ انگلی تری کٹ جائے گی

قرار لکھنوی

گزر کے دیر و حرم سے بہ احتیاطِ تمام
جبینِ شوق ترے آستاں پہ ٹھہری ہے
اب اس حیات کی قیمت نہ مجھ سے پوچھئے دوست
جو حسرتِ کرمِ ناگہاں پہ ٹھہری ہے

کشفی لکھنوی

رند سرشار ہیں اور دور میں پیمانہ ہے
آج سرگرمِ کرم ساقیِ میخانہ ہے
کیا قیامت ہے کہ سنتا ہے جو افسانہ مرا
وہ پکار اٹھتا ہے یہ تو مرا افسانہ ہے

کنول بھارتی

ہمیں دین و دنیا سے آزاد رہ کر
تماشائے دیر و حرم دیکھنا ہے
یہ بے نور آنکھیں ہیں پر نور کر دو
تمھیں کو تمھاری قسم دیکھنا ہے

متھرا پرشاد

محو ہے اب ساقی مدہوش ہے میخانہ
اب کون سمجھتا ہے پیمانے کو پیمانہ

میں چونک سا پڑتا ہوں وحشت کا یہ عالم ہے
رہ رہ کے کوئی جیسے کہہ دیتا ہے دیوانہ

ماہر جھانسوی

آنسو چھلک نہ جائیں، دامن نہ بھیگ جائے
اہلِ چمن نہ دیکھو تم بے بسی ہماری
صیاد ہے زمیں پر اور آسماں پہ بجلی
دو دشمنوں کی زد میں ہے زندگی ہماری

مظہر شوانی

مجھ سے گمراہ زمانہ بھلا کیا سمجھے گا
زلفِ ہستی کو سنوارا ہے مسلسل میں نے
دعوتِ دشمنِ جاں کو بھی میں ٹھکرا نہ سکا
پی لیا ہنستے ہوئے زہرِ ہلاہل میں نے

منظر لکھنوی

سب غلط، دو ہر خلش موجبِ آلام نہیں
راس آئے تو محبت سے بھلا کام نہیں
دل جو روتا ہے تو رو لینے دو بیچارے کو
میری آنکھوں میں تو آنسو کا کوئی نام نہیں
کل بڑے چین سے کانٹوں پہ بھی نیند آتی تھی
دل نہیں آج تو پھولوں میں بھی آرام نہیں
دامن و جیب و گریباں کا نہیں کوئی ملال
غم یہ ہے دستِ جنوں کل کے لئے کام نہیں

ندیم نانپاروی

اک آگ میں جلتے ہیں اک رنگ میں ملتے ہیں
سچ پوچھو تو انساں سے پروانے غنیمت ہیں
ہم جیسے تہی دامن کیا دیتے تجھے دنیا
بے ہوش و خرد لے جا نذرانے غنیمت ہیں

نہال لکھنوی

ہر اک نظر کو شعورِ جمالِ یار نہیں
بہار، اہلِ ہوس کے لئے بہار نہیں

بہت ہے حوصلۂ عرضِ مدعا لیکن
کچھ ان سے کہہ بھی سکوں گا یہ اعتبار نہیں

والی آسی

زمانے والوں نے پھینکے ہیں ہم پہ انگارے
مگر ہمارے تبسم نے پھول برسائے

تری تلاش میں اے دوست تیرے دیوانے
ہزار بار غمِ زندگی سے ٹکرائے

ہزار لکھنوی

غم کا جب تک مقابلہ نہ کرے
آدمی کام کا نہیں ہوتا

جس کے ہاتھوں میں تیرا دامن ہو
اس کے قبضے میں کیا نہیں ہوتا

ہزلیات

جھنجھٹ لکھنوی

بات اس نے کبھی ہم سے نہ کی ہو نہ کرے گی
ہم ایسوں کی کاہے کو بھلا دال گلے گی

اندھی بھی ہے بہری بھی ہو دنیائے محبت
اپنی ہی کہے جائے گی میری نہ سنے گی

ہم جانتے ہیں شیخ کا جنت میں بھی انجام
حور دے تو بنتی نہیں حوروں سے بنے گی؟

عطا لکھنوی

ابھرے ہیں جو آنکھوں میں صفر تین بٹا پانچ
کم ہو گئی اس بت کی نظر تین بٹا پانچ

عشاق کے جذبات میں ہلچل ہے یہ سن کر
ہوتا ہے سنگر میں مگر تین بٹا پانچ

واقف نہیں اس بات سے خود محوِ نظارہ
ہوتی ہے نظارے میں نظر تین بٹا پانچ

ناوک لکھنوی

یہ جنس کی تبدیلی لاحول ولا قوۃ
شرمیلے سے شرمیلی لاحول ولا قوۃ

اسٹیج پہ آتے ہیں موش بھی ہناتے ہیں
کچھ شاعر تمثیلی لاحول ولا قوۃ

✡

چھوٹے پیمانے کی صنعت کو اوّلیت • • • دریائے راپتی پر پل • • • غذائی حالت پر مکمل قابو • • • چھوٹی صنعتوں کو قرضہ کی سہولتیں • • • انکحل کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کا پروگرام • • • متفرقات

ریاستی روزگار کمیٹی نے یہاں اپنے جلسہ میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی ہمہ گیر ترقی کے اقدامات کی سفارش کی، جن کے ذریعہ بڑی تعداد میں لوگوں کو روزگار فراہم کیا جا سکتا ہے۔

یہ نو تشکیل کمیٹی ریاست میں روزگار کی صورت حال بہتر بنانے کی تدابیر پر غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی کہ ریاست میں روزگار کی فراہمی کے مسئلہ کو تسلی بخش طریقہ پر حل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تیسرے منصوبہ کے تحت چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کے لئے ۶۰ کروڑ روپیہ صرف کرنے کی تجویز کی منظوری مرکزی حکومت سے حاصل کی جائے۔

کمیٹی نے یہ رائے قائم کی کہ بڑے صنعتی اداروں کو چاہیئے کہ وہ اپنے گرد و پیش ضمنی صنعتوں کے قیام میں مدد دیں جن کے ذریعہ بہت زیادہ اشخاص کو روزگار مہیا کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں امریکہ اور جاپان کی مثالیں پیش کی گئیں جہاں چھوٹے صنعتی واحدے ۹۰ سے لے کر سو فیصدی تک پرزے تیار کرتے ہیں اور بڑے صنعتی ادارے صرف ان پرزوں کو جوڑتے ہیں۔

کمیٹی نے زراعتی معیشت کو بہتر اور مستحکم بنانے کے لئے امدادِ باہمی اصول کو اپنانے کی سفارش کی کیونکہ ریاست کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے۔ کمیٹی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ تیسرے منصوبہ کے آخر تک اتر پردیش کے ہر ایک کسان کو ایک جدید قسم کا ہل فراہم کر دیا جائے۔

بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کمیٹی نے اس امر پر بھی زور دیا کہ ریاست بھر میں آبپاشی اور رسل و رسائل وغیرہ کے وسائل کی توسیع کے امکانات کا جائزہ لیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان ذرائع سے کس حد تک روزگار فراہم ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی کہ ریاست کے شہری اور دیہی علاقوں میں بیروزگاری کے رجحانات کا پورے طور پر جائزہ لیا جائے۔ کمیٹی کے خیال میں اس قسم کے جائزہ کے ذریعہ بیروزگاری کا مسئلہ زیادہ موثر طریقہ پر حل ہو سکتا ہے

کمیٹی نے پرائیویٹ سیکٹر کے منصوبوں کے لئے ایک رابطہ کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کی۔ یہ کمیٹی اس امر کا جائزہ لے گی کہ مختلف منصوبوں کی تکمیل کے بعد کتنے اشخاص بیروزگار ہو جائیں گے اور ان میں سے کتنے اشخاص کو نئے منصوبوں میں کام پر لگایا جا سکتا ہے۔ فوجی عملہ کو جو تخفیف میں آ جائیں روزگار کی فراہمی کے سلسلہ میں مشورہ دینے اور امداد بہم پہنچانے کے لئے مناسب طریقے معلوم کرنے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔

تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑھتی ہوئی بیروزگاری کے پیش نظر کمیٹی

نے اس امر پر زور دیا کہ ریاست بھر میں پیشہ ورانہ رہنمائی کے پروگرام کی توسیع کی جائے۔

• • •

اتر پردیش نیپال سرحد سے تقریباً ۲۰ میل دور بلرامپور کے قریب دریائے راپتی کے اوپر ۹ لاکھ ۲۱ ہزار روپیہ کی لاگت سے ایک پل تعمیر کیا جا رہا ہے جس کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے۔

پانچ سو فیٹ لمبا یہ پل ریاستی حکومت اور سرحدی علاقہ کے عوام کے باہمی اشتراک سے تعمیر ہوگا۔ اس پل کی تعمیر کا نصف خرچ عوام رضاکارانہ طور پر دیں گے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں تین لاکھ سے زیادہ روپیہ جمع کر کے حکومت کو دے دیا ہے۔ ملک بھر میں کسی ایک منصوبہ کے لئے مقامی عوام کی جانب سے دی جانے والی غالباً یہ سب سے بڑی رقم ہے۔

اس پل کی تعمیر کے ذریعہ اتر پردیش اور نیپال میں کولا باڑہ کے درمیان سڑک کے ذریعہ ہر موسم میں آمد و رفت ہو سکے گی اور ترائی کے علاقہ سے بلرامپور اور گونڈہ کو گنا، عمارتی لکڑی اور اناج وغیرہ برابر سپلائی ہو سکے گا۔ علاوہ ازیں اس کے ذریعہ دو بڑی ریاستوں کے سرحدی علاقوں کی اہم ضروریات بھی پوری ہو سکیں گی۔

پل کا سنگ بنیاد وزیر اعلیٰ اتر پردیش ڈاکٹر سمپورنانند نے رکھا۔ اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے اس پل کو اپنی اقتصادی ترقی کے لئے عوام کے عزم مصمم اور جذبہ تعاون کا آئینہ دار قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقہ کے لوگوں نے جس حوصلہ اور امنگ کا اظہار کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مشعل راہ ہوگا۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ انتہائی کوششوں کے باوجود عوام کی تمام ضروریات فوری طور پر پوری نہیں کی جا سکتیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کے پاس کافی سرمایہ نہیں ہے۔ اسکے وسائل محدود ہیں اور تربیت یافتہ عملہ کی بھی کمی ہے۔ تاہم ہم کو یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم نے محدود وسائل کے باوجود آزادی حاصل کی کیونکہ عوام نے ثابت قدمی اور اتحاد عمل کے ساتھ جدوجہد کی۔

انھوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ موجودہ محدود وسائل کے باوجود عوام اس عزم راسخ اور باہمی تعاون کے جذبہ سے اقتصادی ترقی کے مقصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہوں گے۔ اور یہ خوشی کی بات ہے کہ اس پل کی تعمیر کا عزم اسی جذبہ کا مظہر ہے

حصول آزادی سے ابتک ۳ کرور روپیہ کی مجموعی لاگت سے ۶۴ بڑے پل تعمیر ہو چکے ہیں اور آمد و رفت کے لئے کھول دیئے گئے ہیں اور ۴ کرور ۷۰ لاکھ روپیہ کی تخمینی لاگت سے ۲۵ بڑے پل زیر تعمیر ہیں۔ ریاست کے مشرقی اضلاع میں رسل و رسائل کی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے گزشتہ آٹھ برسوں میں گونڈہ، بستی، بہرائچ، گورکھپور اور دیوریا کے اضلاع میں ۶۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے دس پل تعمیر کیے جا چکے ہیں اور ان اضلاع میں ڈھائی کرور روپیہ کی لاگت سے دوسرے پل زیر تعمیر ہیں۔ ان پلوں کی تعمیر سے مشرقی اتر پردیش کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ اجودھیا میں سرجو ندی پر ڈھائی کرور روپیہ کی لاگت سے ایک پل کی تعمیر کے لئے مرکزی حکومت کی جانب سے حال میں منظوری حاصل ہو چکی ہے اور اس سال کے آخر تک اس کی تعمیر شروع ہو جائے گی۔

• • •

اتر پردیش میں جنوری ۱۹۶۰ء میں غلہ کے جو نرخ تھے وہ جنوری ۱۹۵۹ء کے مقابلہ میں بہت زیادہ کم تھے۔ اس سے ہماری غذائی حالت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

۲۰ جنوری ۱۹۶۰ء کو اوسط درجہ گیہوں کا نرخ ۱۵ روپیہ سے ۲۰ روپیہ فی من تک تھا جبکہ ۲۰ جنوری ۱۹۵۹ء میں ۲۲ روپیہ ۰۰ نئے پیسے سے ۳۰ روپیہ فی من تک تھا۔ اسی طرح ۲۰ جنوری ۱۹۶۰ء میں تیسرے درجہ کے چاول کا نرخ ۱۷ روپیہ سے ۲۲ روپیہ فی من تک اور چنے کا نرخ ۱۰ روپیہ ۸۰ نئے پیسے سے ساڑھے ۱۲ روپیہ فی من تک تھا جبکہ ۲۰ جنوری ۱۹۵۹ء میں تیسرے درجہ کے چاول کا نرخ ۱۸ روپیہ سے ۲۶ روپیہ ۲۵ نئے پیسے فی من تک

اور چنا کا نرخ ۱۸ روپیہ ۸۱ نئے پیسے سے ۲۲ روپیہ ۷۵ نئے پیسے فی من تک تھا۔

دوسری جانب سرکاری اعداد و شمار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ریاست کی ۱۲ بڑی منڈیوں میں اپریل ۱۹۵۸ء سے ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء تک غلہ کی آمد گزشتہ سال کے انھیں دنوں کے مقابلہ میں تقریباً نصف رہ گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت نے غذائی حالت پر قابو پانے کے لئے جو تدابیر اختیار کی تھیں ان کی وجہ سے بازار میں غلہ کی آمد کم ہونے پر بھی گزشتہ سال کے مقابلہ میں قیمتوں میں کمی رہی۔

غذائی حالت اب اتنی بہتر ہوگئی ہے کہ حکومت نے عوام کے لئے ان مہینوں میں بھی جبکہ غلہ کمیاب ہوتا ہے سرکاری سستے غلہ کی دوکانوں میں کچھ مزید سہولتیں فراہم کی ہیں۔ دیہی علاقوں کے لوگ ان دوکانوں سے اب مزید غلہ خرید سکیں گے۔ کیونکہ ان کا ہر روز کا کوٹہ ۲۵ من سے بڑھا کر ۳۰ من کر دیا تھا جسے اب ۴۰ من کر دیا ہے۔ اب ان دوکانوں سے راشن کے علاوہ ایک روپیہ کے بجائے ۲ روپے تک کا چنا خریدا جا سکتا ہے۔ یہ سہولتیں مشرقی اضلاع کے شہری علاقوں کے ان لوگوں کو بھی ملنے لگیں جنھیں گیہوں اور چاول پہلے ہی سے برابر برابر مقدار میں ملتا تھا۔ اس کے علاوہ جہاں چاول پہلے ۲۵ فی صدی ملتا تھا اب اس کو بڑھا کر ۳۰ فیصدی کر دیا گیا ہے۔

غذائی حالت پر قابو پانے کے لئے حکومت نے جو تدابیر اختیار کیں ان میں ایک خاص تدبیر یہ تھی کہ ریاست کی ان رولر آٹا ملوں پر جن کی ماہواری کھپت ۵ لاکھ ۴۰ ہزار من تھی بازار میں گیہوں خریدنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اب ان ملوں کو مرکزی حکومت کی جانب سے درآمد شدہ گیہوں کا کوٹہ ملتا ہے۔ جولائی ۱۹۵۹ء سے جنوری ۱۹۶۰ء تک ان ملوں کو ۲۴۱،۵،۹ من گیہوں کا کوٹہ مل چکا ہے جس سے انہوں نے ۱۰۰۱۸۰۰۸ من میدہ سوجی اور ۲۲۴۱۵۰۷،۱ من آٹا تیار کیا اور اس کو حکومت کی ہدایات کے مطابق فروخت کیا۔ اس طرح گیہوں کے زبردست خریداروں پر پابندی عائد کر کے غذائی حالت کافی بہتر ہوگئی۔ اس کے علاوہ وعدہ بیوپار پر پابندی لگانے اور اتر پردیش ضروری اشیا ایکٹ ۱۹۵۵ء اتر پردیش گیہوں (نقل و حمل پر پابندی) آرڈر ۱۹۵۹ء وغیرہ کو نافذ کرنے سے بھی غذائی حالت پر بہت اچھا اثر پڑا۔

ان مذکورہ تدابیر کے علاوہ ریاستی حکومت نے ریاست کے قلت زدہ علاقوں میں غلہ کی قسم کا بار اپنے اوپر لے کر ان قوتوں پر بھی قابو حاصل کر لیا جو غلہ کے بازار پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ اس وقت ریاست میں ۹ جنوری ۱۹۵۹ء کو سستے غلہ کی دوکانوں کی تعداد ۴۵۰۵ تھی جہاں پر ۱۰۵۶۶۲۴۲ من غلہ فروخت کیا گیا۔

• • •

تمام ماہرین معاشیات اس امر پر متفق ہیں کہ کسی کثیر آبادی والے نیم ترقی یافتہ ملک کی متوازن اقتصادی ترقی کے لئے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی اشد ضروری ہے۔ علاوہ ازیں بیروزگاری کے مسئلہ کو بھی حل کرنے کا یہ ایک موثر ذریعہ ہے۔

ریاستی حکومت نے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کی اہمیت کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے اور اس سلسلہ میں ضروری سہولتوں کی فراہمی کے لئے برابر کوشاں رہی ہے۔

نجی صنعت کاروں کی راہ میں سرمایہ کی کمی زبردست رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔ ریاستی حکومت کی جانب سے مختلف ذرائع سے صنعت کاروں کو جو مالی امداد دی جا رہی ہے اسکے پیش نظر چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کی راہیں ہموار ہوگئی ہیں۔

مرکزی حکومت نے حال میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتی واحدہ کے سائز کی وضاحت کی ہے جس کے مطابق چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدہ سے مراد ایک ایسا واحدہ ہے جس میں ۵ لاکھ روپیہ تک اصل سرمایہ لگا ہو۔

چھوٹے پیمانہ کی نئی صنعتوں کے قیام اور نئے واحدوں کی توسیع کے لئے ریاستی حکومت کا محکمہ صنعت (۱۵ ہزار روپیہ تک کے قرضے) ریاستی مالیاتی کارپوریشن (۱۵ ہزار روپیہ سے زائد کے قرضے)۔ اسٹیٹ بینک آف انڈیا (اگر کاروباری سرمایہ کے لئے قرضہ کی ضرورت ہو)، ریاستی صنعتی امداد باہمی بینک (امداد باہمی اصول پر کاروبار کے لئے) اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے قومی کارپوریشن

نئی دہلی (قسطوں پر مشینوں کی خریداری کے لئے) کے ذریعہ قرضے دیئے جاتے ہیں۔

قرضوں اور مالی امداد کی فراہمی کی اسکیم کے تحت افراد اور امداد باہمی انجمنوں کو رعایتی نرخ پر قرضے دیئے جاتے ہیں۔ ضلع مجسٹریٹ ضلع صنعتی کمیٹیوں کے مشورہ سے ایسے پروجیکٹوں کے لئے قرضے منظور کرتے ہیں جن کی مجموعی لاگت ۱۰ ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ریاستی قرضہ اور مالی امداد کمیٹی کے ذریعہ ایک فرد کو ۱۵ ہزار روپیہ تک قرضہ دیا جاتا ہے۔ سستے قرضے کی اسکیم کے تحت ریاستی مالیاتی کارپوریشن کی جانب سے ۱۵ ہزار روپیہ اور ایک لاکھ روپیہ کے درمیان قرضے دیئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت افراد کو دیئے گئے ۲۵ ہزار روپیہ یا اس سے کم رقم کے قرضوں پر ۳ فی صدی سالانہ اور ۲۵ ہزار روپیہ سے زیادہ اور ۵۰ ہزار روپیہ تک کے قرضوں پر ۴ فی صدی سالانہ سود لیا جاتا ہے۔ ۵۰ ہزار روپیہ سے زیادہ کے قرضوں پر بازار کی شرح پر سود لیا جاتا ہے۔

دس ہزار روپیہ تک کے قرضے شخصی ضمانت اور اس سے زیادہ رقم کے قرضے معقول ضمانت پر دئے جاتے ہیں۔ ضمانت کی مالیت کا ۷۵ فیصدی تک قرضہ کے طور پر دیا جاتا ہے۔ ۱۵ ہزار روپیہ تک کے قرضے سات سال کی مدت میں ششماہی قسطوں میں وصول کئے جاتے ہیں اور اس سے زیادہ رقم کے قرضے دس مساوی سالانہ قسطوں میں وصول کئے جاتے ہیں۔ قرضہ لینے والوں کیلئے یہ لازمی ہوتا ہے کہ وہ قرضہ کے ۲۵ فیصدی کے برابر رقم خود اپنے وسائل سے متعلقہ کاروبار میں لگائیں۔

ریاستی مالیاتی کارپوریشن خود اپنے وسائل سے انفرادی طور پر ایک لاکھ روپیہ سے زائد کے قرضے دیتی ہے۔ ایسے قرضوں پر ساڑھے چھ فیصدی سالانہ سود لیا جاتا ہے۔

اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی تمام شاخوں سے صنعتی اغراض کیلئے خام مال یا تیار مال وغیرہ کی کفالت پر قرضے دئے جاتے ہیں۔ ان قرضوں پر ۵ فیصدی سالانہ سود لیا جاتا ہے۔

ریاستی امداد باہمی بینک کے ذریعہ امداد باہمی اصول پر چلائے جانے والے کاروبار کے لئے قرضے دئے جاتے ہیں۔

ان قرضوں کی سہولتوں کے علاوہ حکومت کی جانب سے چھوٹے پیمانے کے صنعتی واحدوں کو قسطوں پر ملکی اور غیر ملکی مشینوں کی خریداری کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ ضروری مشینیں آسان شرائط پر نیشنل اسمال انڈسٹریز کارپوریشن (پی) لمیٹڈ رانی جھانسی روڈ نئی دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ عام اور مخصوص اغراض کی مشینوں کے لئے بالترتیب ۲۰ اور ساڑھے تینتیس فیصدی رقم بیعانہ کے طور پر لی جاتی ہے۔ بقیہ رقم سات سال کی مدت میں وصول کی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں مزید تفصیلات ڈسٹرکٹ انڈسٹریز افسروں یا اسٹیٹ بینک، کی مقامی شاخ کے ایجنٹ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

• • •

اتر پردیش میں الکحل کی کثیر پیداوار کو پورے طور پر بروئے کار لانے کے لئے اس سے بہت سی مفید اشیا تیار کی جائیں گی جو اس وقت درآمد کی جاتی ہیں۔

یہ انکشاف ریاستی حکومت کی جانب سے مقررہ ورکنگ گروپ کی رپورٹ میں کیا گیا ہے۔ یہ گروپ تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے لئے الکحل کی پیداوار اور اس کی کھپت کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

الکحل سے ایسی ٹوٹ۔ ایسڈ پاور الکحل اور سائٹرک ایسڈ وغیرہ تیار کرنے کے لئے بریلی میں مصنوعی ربر کی فیکٹری کے علاوہ تقریباً ۸ کروڑ روپیہ کی لاگت سے درمیانی اور بڑے پیمانے کے ۱۵ واحد قائم کرنے کی تجویز ہے۔ مصنوعی ربر فیکٹری میں جس کی پیداواری صلاحیت شروع میں ۲۰ ہزار ٹن ہوگی تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے آغاز سے کام شروع ہونے کی امید ہے۔

اتر پردیش میں اس وقت سالانہ تقریباً ایک کروڑ ۲۰ لاکھ گیلن الکحل تیار ہوتا ہے جو تمام دوسری ریاستوں کی الکحل کی مجموعی پیداوار کے برابر ہے۔ ریاست میں الکحل کی پیداوار دُگنی کرنے کے

امکانات ہیں۔ ورکنگ گروپ کے اندازہ کے مطابق آئندہ منصوبہ کی مدت میں تقریباً ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ گیلن الکحل کی ضرورت ہوگی۔ صرف مصنوعی ربڑ فیکٹری کو شروع میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ گیلن الکحل کی ضرورت ہوگی۔ اور بعد میں اس کی ضرورت بڑھ کر ۲ کروڑ گیلن ہو جائے گی۔

الکحل کی پیداوار بڑھانے کے لئے حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ سکریٹری محکمہ صنعت اس کمیٹی کے کنوینر ہیں۔ یہ کمیٹی ایسی تدابیر اور طریقے معلوم کرے گی جن کے ذریعہ الکحل کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔

ایک اندازہ کے مطابق دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے آخر تک صنعتی الکحل کی سالانہ پیداوار ایک کروڑ ۹۰ لاکھ گیلن ہو جانے کی امید ہے۔ ریاست میں مجوزہ چھ امداد باہمی شکر ملوں کے قیام تیسرے منصوبہ کے دوران میں موجودہ شکر ملوں کی توسیع اور شکر کے شیرہ کو گودام میں رکھنے اور اس کے نقل و حمل کی بہتر سہولتوں کی فراہمی کے اقدامات سے امید کی جاتی ہے کہ الکحل کی سالانہ پیداوار بڑھ کر تقریباً ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ گیلن ہو جائے گی۔

ریاست میں اس وقت صنعتی الکحل کی پیداوار کا بیشتر حصہ پاور الکحل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ورکنگ گروپ نے یہ سفارش کی ہے کہ پاور الکحل کی پیداوار صرف ہنگامی حالات کیلئے محدود کر دی جائے کیونکہ اس سے ایسی اشیا تیار کی جا سکتی ہیں جن کو درآمد کرنے کے لئے بہت زیادہ غیر ملکی تبادلہ زر صرف کرنا پڑتا ہے۔

متفرقات

آئندہ مردم شماری۔ دوسری دس سالہ مردم شماری جس کی اصل تاریخ یکم مارچ سنہ ۱۹۶۱ء ہے اس بار بہت بڑے پیمانے پر شروع کی جائیگی۔ محض آبادی کی گنتی کے علاوہ آئندہ مردم شماری میں ہندوستان کے باشندوں کے طرز رہائش اور انفرادی طور پر زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں گی تاکہ قوم کی زندگی کے بارے میں مجموعی طور پر صحیح جائزہ لیا جا سکے۔ ان اعداد و شمار کے بغیر ملک کی ترقی کے لئے صحیح منصوبہ تیار نہیں کیا جا سکتا اور نہ مختلف مالی سطح کے اشخاص کی تعداد معلوم کئے بغیر جن میں قومی آمدنی تقسیم کی جائے گی مناسب بجٹ تیار کیا جا سکتا ہے۔

مردم شماری کا کام دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ایک کے تحت ملک کی آبادی کے ہر فرد سے متعلق ۱۴ سوالات کے جوابات جمع کئے جائیں گے۔ ان سوالات میں عمر، جائے پیدائش، قومیت، مذہب، ذات، تعلیم، مادری زبان، دیگر زبانوں کا علم اور پیشہ وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے کے تحت ہر کنبہ کا پیشہ یعنی کاشتکاری یا گھریلو صنعت اور ان میں کام کرنے والوں کی تعداد وغیرہ شامل ہوگی۔ اسکے علاوہ ہر گھر اور مکان کے بارے میں مواد جمع کیا جائے گا یعنی مکان میں کتنے کمرے ہیں دیواریں اور چھت کس چیز سے تیار کی گئی ہے نیز کیا مکان نجی ہے یا کرایہ پر ہے وغیرہ وغیرہ۔

بے گھر اور خانہ بدوش افراد کی مردم شماری کے لئے مخصوص انتظامات کئے جائیں گے۔ وزارت دفاع اور ریلوے وزارت نے اس کام کو سرانجام دینے میں کلی تعاون کا وعدہ کیا ہے۔

گورنمنٹ گرانٹس ترمیمی بل۔ ریاستی حکومت نے گورنمنٹ گرانٹس ترمیمی بل سنہ ۱۹۶۰ء کے انگریزی و ہندی ترجمے جو ریاستی ودھان پریشد کے آئندہ اجلاس میں پیش کئے جائیں گے غیر معمولی سرکاری گزٹ میں شائع کر دیئے گئے ہیں۔

مذکورہ ترمیمی بل کا مقصد انتقال آراضی منجانب حکومت یا دیگر انتقال آراضی یا حق واقع جائیداد جو ریاستی حکومت، حکومت کی جانب سے کسی شخص کے نام تاحال کی گئی یا آئندہ کیا جائے گا کو انتقال جائیداد ایکٹ سنہ ۱۸۸۲ کے قواعد سے مستثنیٰ قرار دینا ہے نیز اس بل کے پاس ہونے سے قبل یا مابعد حکومت کی جانب سے کسی شخص کے نام آراضی کو ٹھیکہ پر دینے سے جو اختیارات حاصل تھے انھیں بھی یو۔پی ٹھیکہ داری ایکٹ سنہ ۱۹۳۹ء یا آگرہ ٹھیکہ داری ایکٹ سنہ ۱۹۲۶ء سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔

گورنمنٹ گرانٹس ایکٹ کا جوتوں کی آخری حد مقرر کرنے سے متعلق بل سنہ ۱۹۵۹ء پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

آخری سنیچر کو تعطیل۔ اترپردیش حکومت نے اس امر کے احکام جاری کئے ہیں کہ یکم فروری ۱۹۶۰ء سے تمام سرکاری دفتروں اور اداروں میں مہینہ کے پہلے اور تیسرے سنیچر کو نصف دن چھٹی کے بجائے اب آخری سنیچر کو عام تعطیل رہے گی۔

اس حکم کا اطلاق ریاستی حکومت کے خزانوں اور ذیلی خزانوں پر نہیں ہوگا جہاں بدستور ہر مہینہ کے پہلے اور تیسرے سنیچر کو نصف دن کی چھٹی ہوا کرے گی۔

ان سرکاری ملازموں کو جو علاقائی فوج میں بھرتی ہیں ہر ماہ کے آخری سنیچر کو پوری چھٹی کے علاوہ پہلے اور تیسرے سنیچر کو بھی نصف دن کی چھٹی ملتی رہے گی۔

حادثات سے متعلق ترجیحی تار۔ محکمۂ ڈاک اور تار کے ڈائرکٹر جنرل کے ایک حالیہ فیصلہ کے مطابق انسانی جانوں کے حادثات سے متعلق ترجیحی تار بک کرنے کی سہولت سرکاری تاروں کے لئے بھی فراہم کر دی گئی ہے۔ یہ ترجیحی تار صرف سڑک۔ ریلوے۔ آتشزدگی کے حادثات۔ سیلاب بجلی سے ہلاکت۔ مکان کے گرنے فیکٹری کے حادثات۔ کسی شخص کی نازک حالت یا موت سے متعلق ہونا چاہیئے۔ عوام کو یہ سہولت پہلے سے حاصل ہے۔

ان تاروں میں حادثہ کے شکار یا بیمار اشخاص کی حالت کے علاوہ کوئی اور تفصیل نہیں دینا چاہیئے۔ لیکن تار میں متعلقہ شخص کے اعزا یا احباب کو بلانے کی درخواست کی جاسکتی ہے۔

یہ تار اکسپرس شرح پر بک کئے جائیں گے بشرطیکہ تار کے پتہ سے پہلے "پرائرٹی" کا لفظ درج ہو۔ ان تاروں کو تمام اکسپرس اور ارجنٹ تاروں پر اولیت دی جائے گی۔

طالبات کے لئے ۵۰۰ وظائف۔ حکومت اترپردیش نے مالی سال رواں میں طالبات کو ۵۰۰ وظائف دینے کے لئے ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ منظور کیا ہے۔ نویں اور دسویں درجہ کی ان طالبات کو ۲۰ روپیہ ماہانہ کا وظیفہ دیا جائے گا جو ریاست کے دیہی علاقوں کے اسکولوں میں بطور ٹیچر کام کرنے کا وعدہ کریں گی۔

مرکزی حکومت کی جانب سے چلائی جانے والی تعلیم نسواں کی توسیع اور خواتین مدرسین کی تربیت کی اسکیم کے تحت ان طالبات کو ترجیح دی جائے گی جو دیہی علاقوں کی رہنے والی ہوں گی اور جن کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ ہوگی۔ لیکن ایسی صورت میں جبکہ مقررہ عمر کی لڑکیاں کافی تعداد میں درخواستیں نہیں دیں گی ۱۶ سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی درخواستوں پر بھی غور کیا جائے گا۔

جو طالبات ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں انھیں اپنے تعلیمی اداروں کے اعلےٰ افسروں سے رجوع کرنا چاہیئے اور مقررہ فارموں پر اپنی درخواستیں فوراً پیش کر دینا چاہیئے۔ درخواست کے مقررہ فارم اور دیگر تفصیلات تعلیمی اداروں کے اعلیٰ افسروں سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

چارہ کے وسائل۔ اترپردیش میں چارہ کے موجودہ وسائل کو پورے طور پر بروئے کار لانے اور اس کی پیداوار میں اضافہ کے پیش نظر، ریاستی حکومت نے سکریٹری محکمہ جات زراعت اور نگہداشت مویشیان کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔

یہ کمیٹی جس کا جلسہ سال میں کم سے کم دو بار ہوگا چارہ کی ترقی کی اسکیموں کی رفتار ترقی پر نظر رکھے گی۔ اور چارہ کے موجودہ وسائل میں اضافہ کرنے اور اس کو پورے طور پر بروئے کار لانے کی مختلف تدابیر پر غور و خوض کرے گی۔ علاوہ ازیں یہ کمیٹی دور افتادہ جنگلات میں سیلاب گھاس کو محفوظ رکھنے کی تدابیر اور دیہی علاقوں میں چراگاہوں پر کنٹرول رکھنے اور ان کو بہتر بنانے کے طریقوں پر بھی غور کرے گی۔ ریاست کے مختلف دیہی علاقوں میں فصلوں کی بوائی کے طریقوں پر غور کرنے کے علاوہ کمیٹی پھلی دار اور بغیر پھلی کے چارہ کی باری باری سے بوائی کے بارے میں مناسب مشورے دے گی۔

کمیٹی کے ممبروں میں ڈولپمنٹ کمشنر۔ محافظ اعلےٰ جنگلات، ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ زراعت۔ ڈائرکٹر نگہداشت مویشیان۔ ڈائرکٹر پنچایت اور آگرہ فتحپور کے ترقی پسند کسانوں کے نمائندے شامل ہیں۔ یو۔ پی کے چارہ کی ترقی سے متعلق افسر اس کے سکریٹری ہوں گے۔

توضیحات

(۱) "پچھلے ماہ (دسمبر ۱۹۵۹ء) کے شمارے میں عروضی مضمون پڑھا۔ صاحب مضمون نے عجیب ستم ظریفی سے کام لیا ہو۔ بہت سے فیصلے صادر کردیئے لیکن حوالہ کسی کتاب کا نہیں دیا، حدایق، بحر الفصاحت "اغلاط سے پُر" اور "طفلانہ" کتب ہیں، لیکن ان کے مقابلے میں خود کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا جو ان کے معیار صحت کا اندازہ ہوتا۔ یوں تو ہر شخص مختار ہو کہ جس بات کو چاہے غلط کہہ دے۔ میں نے سوچا کہ معیاری اشعار کو ثبوت میں پیش کروں لیکن پھر خیال آیا کہ اگر اس کو بھی اسی فہرست میں گن دیا گیا تو میں کیا کروں گا۔

موصوف کی بدخیالی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہو کہ انھوں نے ایک شعر کو غلط نقل کرکے اس کی تقطیع کر ڈالی۔ سحر حلال کا شعر یہ ہو (ملاحظہ ہو شمارہ ماہ جون ۱۹۵۹ء)

ہر کہ شد در طاعتِ حق پیشتر فیض دے از رحمت حق بیشتر

لیکن فاضل نقاد نے "در" کو "از" سے بدل کر مصرع کو ذو بحرین کرلیا اور کس انداز سے دروغ گوئی فرمائی کہ "مصرع اول میں از کے الف کو نہ گرایئے اور طاعت کے کرۂ اضافت کو اشباع سے پڑھیئے تو وزن بحر رمل مسدس محذوف کا ہوگا یعنی فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔ اگر از کے الف وصل کو گرا کر اور طاعت کے کرۂ اضافت کو بغیر اشباع کے پڑھیئے تو وزن بحر سریع مسدس مطوی کشوف کا ہوگا یعنی مفتعلن مفتعلن فاعلن"۔ بہت خوب! اسی ایک کارنامے سے پورے مضمون کی گلکاریوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہو۔ اصول تو یہ ہو کہ کسی دعوے کو باطل کرنے کے لئے دلائل واسناد پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں کہاں کچھ ثبوت کسی قول کا نہیں کہ آخر یہ ماخوذ کہاں سے ہو۔ کہیں سے ماخوذ ہو تو لکھا جائے۔ خانہ ساز تفصیلات و تصریحات کو حوالے سے کیا علاقہ۔

رشید حسن خاں

(۲) نیا دور نومبر ۱۹۵۹ء میرے سامنے ہے جس میں جذبات محمود کے متعلق راز صاحب کا مراسلہ میں نے پڑھا میرے پاس ہر زیر بحث غزل کا ریکارڈ مع حضرت فصیح الملک کی تحریروں کے موجود ہو تحریری ریکارڈ کے مقابلے میں راز صاحب کا محض یہ کہہ دینا کہ یہ غزل یا یہ شعر اشک کا ہو بالکل غلط ہو جبتی قریب سے اشک کو میں نے دیکھا ہو راز صاحب بیچارے کیا جانیں۔ راز صاحب کا ایک غلط چیز پر ضد کرنا اور ان کی محض زبانی شہادت غیر دقیع ہو اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ ہر زیر بحث غزل حضرت محمود کے قلم سے لکھی ہوئی اور حضرت فصیح الملک کی تحریروں کے ساتھ موجود ہی نہیں بلکہ حضرت محمود کے قلم کی لکھی ہوئی غزلوں کا عکس تک موجود ہے اب جبکہ راز صاحب کے قول کی تحریری ثبوت سے تردید ہو جاتی ہو تو اس معاملے میں جو کچھ راز صاحب فرماتے ہیں قابل اعتبار نہیں رہتا اور راز صاحب کے پیش کردہ اشعار کی اشک سے نسبت کی تحریری ثبوت کے ذریعہ تردید ہو جاتی ہے۔

ابراہیم علی خاں تھہر رامپوری

تصحیح

۱۔ نیا دور جنوری ۱۹۶۰ء (صفحہ ۶۴) کے آخر میں "ایک توضیح" کے ماتحت مثنوی گل و صنوبر کے متعلق ایک توضیح شائع ہوئی تھی۔ سہواً صاحب تحریر کا نام درج ہونے سے رہ گیا تھا۔ یہ توضیح مشتاق حسین صاحب (یونیورسٹی لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی تحریر کردہ تھی۔

۲۔ نیا دور (جنوری ۱۹۶۰ء) کی فہرست مضامین اور ایک مضمون کے عنوان میں لفظ "مستشرقین" کتابت کی غلطی سے "مشتشرقین" شائع ہوگیا ہے۔

۳۔ اس اشاعت کے صفحہ ۱۳ کالم ۲ پر ایک شعر (چو بردست.... الخ) غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح یہ ہے

چوں بردست آں بندہ برگشتہ شد سر بخت ایرانیاں گشتہ شد

REGD. No. A-319

(مرتبہ: سید علی جواد زیدی)

رائل سائز کے ۳۳۴ صفحات پر مشتمل' آزادی اور حب الوطنی کے جذبات سے مملو' اردو نظموں کا بیش بہا مجموعہ جس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کی تقریباً وہ تمام نظمیں جمع کر دی گئی ہیں جو کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتیں۔ گزشتہ سو سال کے اندر ہماری تحریک آزادی جن منزلوں سے گزری ہے' اور خود آزادی کا مفہوم جس طرح عہد بہ عہد تبدیل ہوتا رہا ہے' اس مجموعہ سے اسکے ادراکِ صحیح میں مدد ملے گی۔

اس کتاب کی تیاری میں لکھنؤ' دہلی' رام پور وغیرہ کے کتب خانوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ متعدد قلمی نسخوں سے بھی مواد فراہم کیا گیا ہے اور اس طرح یہ کتاب نہ صرف جامعیت کے لحاظ سے ایک خصوصی اہمیت کی حامل ہے بلکہ اُس میں متعدد ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو مطبوعہ شکل میں نہیں ملتیں۔

قیمت: ۵ روپیہ

ملنے کا پتہ

محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

لکھنؤ